فلپس

کی

مصنوعات

۱۲۵ ملکوں میں

مقبول ہیں

بلب سازی

کا

۷۰ سالہ
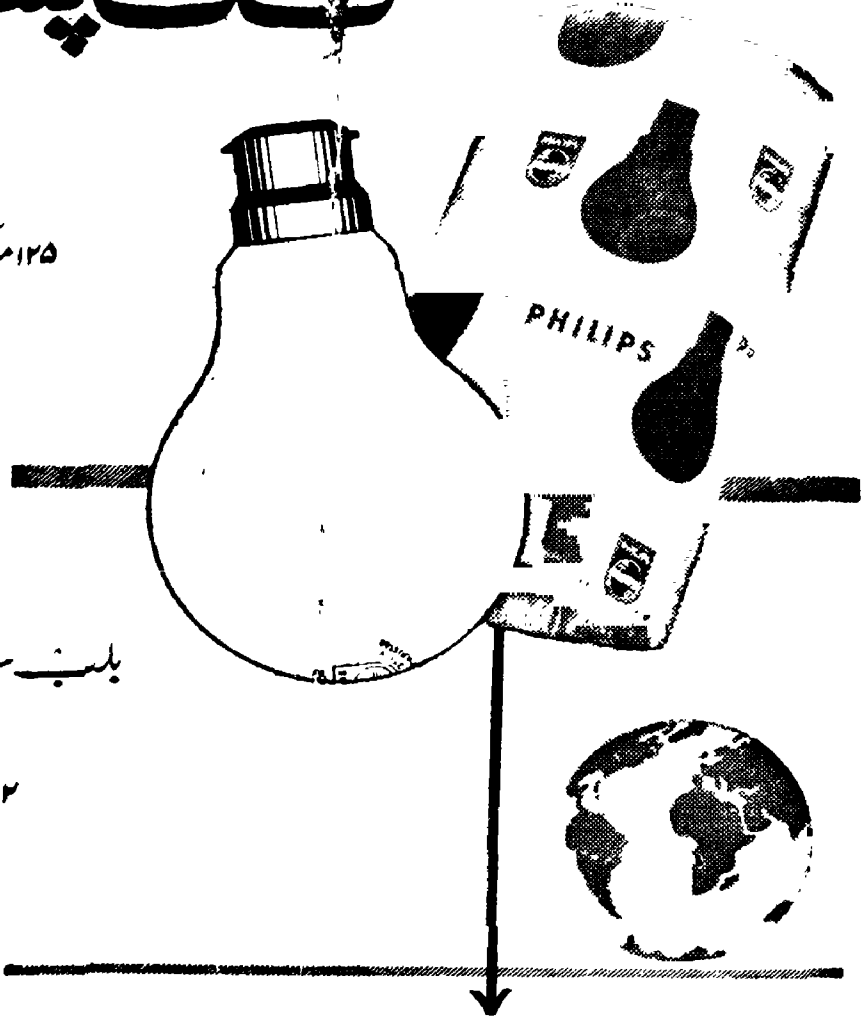
تجربہ

ہمیشہ فلپس کے اعلیٰ کوالٹی کے بلب خریدیئے

فلپس کے بلب کی اعلیٰ کوالٹی اور معیاری حیثیت بلب سازی کے ۷۰ سالہ تجربہ پر مبنی ہے۔ فلپس کے تین ہزار سے زائد سائنسداں ہمہ کوشش کرتے رہتے ہیں کہ فلپس کی اشیا فنی طور پر بالکل صحیح ہوں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ فلپس کی اشیا ترقی یافتہ اور لاثانی سمجھی جاتی ہیں اور دنیا کے ۱۲۵ ممالک میں فروخت ہوتی ہیں۔ بلحاظ ساخت فلپس کے بلب کی ہر مرحلہ پر سختی سے آزمائش کی جاتی ہے۔ اور کارخانے سے نکلنے سے پہلے اچھی طرح ان کی آخری جانچ کر لی جاتی ہے۔ اس طرح اس کا اطمینان کر لیا جاتا ہے کہ خریدار کو اس کی ادا کردہ قیمت کا صحیح بدل مل سکے یعنی روشنی کی صحیح قوت کا بلب۔

ایک ۷۵ واٹس کا ایسا بلب کیوں خریدا جائے جس کی روشنی صرف ۶۰ واٹس کی ہو۔؟

زیادہ روشنی - جلنے میں دیرپا

فلپس الکٹریکل کمپنی آف پاکستان لمیٹڈ

کراچی - لاہور - ڈھاکہ - چٹاگانگ

اردو ادب کا ڈائجسٹ

جنوری ۱۹۶۴ء

ادارہ

شاہد احمد دہلوی ۔ شمس زبیری

قیمت	سالانہ
ایک روپیہ	بارہ روپے

کاشانۂ اردو، پوسٹ بکس ۳۰۲ کراچی ۔

فون:۔ ۷۰۱۵۶

ترتیب

افسانے

تراجم افسانے

طنز ومزاح

مَنظُومات

مضامین

نقش۔ کراچی

ابوالفضل صدیقی

میرا رسالہ۔ کراچی

ممتا

بہت چھٹپن سے ہم اپنے باپ کے ساتھ شکار کو جایا کرتے تھے۔ اور وہ ہمیں نینی تال کی ترائی میں پندرہ پندرہ بیس بیس روز شکار میں ساتھ رکھا کرتے تھے۔ ہماری عمر تو دس برس کی تھی اور آٹھ دن سے ہم اُن کے ساتھ جنگل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ویسے اتنے چھٹپن میں ہم شکار بھی کرلیا کرتے تھے۔ اور ہوائی بندوق سے نہیں اپنی بڑی بندوق سے۔ جس سے ہمارے ابا جان کھیلا کرتے تھے۔ فرق اتنا تھا۔ کہ ابا جان تو اُسی بندوق سے اور انھیں کارتوسوں سے بڑے بڑے جانور ہرن، نیل گائے مارا کرتے تھے۔ اور ہم کبوتر، ہریل اور کبھی کبھی مور۔ تو اس جنگل میں ابا جان تو شیر کا شکار کھیلنے گئے تھے۔ اور کیمپ لگا تھا۔ ہاتھی ساتھ تھا۔ میں اور میرا بھائی نواب میاں اُن کے ساتھ گئے تھے۔ اور جب پہلے روز وہ شکار کو گئے تھے تو اُن کے ساتھ ہاتھی پر ہم بھی تھے۔ نیچی نیچی جھل بیریوں کی جھاڑیوں کا سوکھا سوکھا سا جنگل تھا۔ اور جھاڑیوں کے نیچے خشک گھاس تھی۔ نکلتے جاڑوں یہ گھاس بالکل سوکھ جایا کرتی ہے۔ اور جھاڑیوں کے پتے بھی گر جاتے ہیں۔ اور جا بجا ٹکڑوں پر لال لال بیر ہی بیر نظر آتے ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دُور پر جھاڑیوں کے ایسے ہی قطعے تھے۔ اور درمیان درمیان میں سو سو گز دو دو سو گز کے فاصلے چوکور مستطیل، ٹیڑھے بیڑھے چٹیل میدان تھے۔ جن میں گھاس بھی نہ تھی۔ شاید ہاتھی کی بے چینی پاکر ایک گلدار شیرنی اپنے ایک بچے کو منھ میں دبائے دُور سے ایک قطعہ سے دوسرے قطعہ کو جاتی نظر آئی۔ بالکل اسی طرح جس طرح بلی اپنے بچے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منھ میں دبا کر لے جایا کرتی ہے۔ جس قطعہ میں وہ بچے کو لے کر داخل ہوئی وہ کوئی بہت بڑا نہ تھا۔ بہت سے آدمی ساتھ تھے۔ پہلے تو ہاتھی کو ایک سمت کو کھڑا کرکے، تین سمت سے ہانکا کرایا۔ آدمیوں نے تھوڑے فاصلہ تک گھس گھس کر بہتیرا شور مچایا مگر وہ اندر ہی اندر گھوم کر رہ گئی۔ اور باہر نہ نکلی۔ بڑی دیر ہوگئی۔ صبح سے دوپہر تک ہاتھی ایک سمت پہاڑ کی طرح کھڑا رہا۔ اور ہودج پہ ابا جان رائفل بھرے منتظر بیٹھے رہے کہ کب نکلے اور کب گولی ماردں۔ تین طرف سے ڈھول اور کنستر بجا بجا کر چلّا چلّا کر شکاری اور قلی ادھم مچاتے رہے۔ اور ایک دفعہ تو اتنا شور ہوا کہ جنگل گونج گیا۔ مگر وہ دی شیرنی قطعہ سے باہر نہ نکلی اور سب تھک کر عاجز ہوگئے۔ ابا جان اور سب یہ سمجھے کہ شیرنی سمجھ گئی ہے کہ جس کنارے سے شور نہیں ہو رہا ہے اُس طرف جو ہاتھی کھڑا ہے اُس پر شکاری بندوق بھرے بیٹھے ہے۔ اور نکلی۔ اور گولی پڑی۔ لہٰذا ابا جان چپکے سے نیچے اُتر آئے۔ اور جہاں پر ہاتھی کھڑا تھا اس میدان میں ذرا پرے ہٹ کر ایک جھاڑی کی آڑ لے کر بیٹھ گئے۔ اور فیل بان کو حکم دیا کہ وہ ہاتھی اس قطعہ سے بھی پرے لے جاکر کھڑا کرے۔ اور پھر بڑے زور زور سے شور ہوا۔ تمام جنگل میں قیامت مچ گئی۔ اور ذرا مدھم ہوکر پھر شورِ قیامت اُٹھا۔ اور اب تو ہاتھی بھی سامنے نہ تھا۔ اور میدان بھی خالی تھا اور ابا جان

یکی ایک سمت کو جھاڑی میں دبکے بیٹھے تھے۔ پھر بھی نہ نکلے اور ہارہ نک گئے۔ نہ معلوم کتنے حیلے، بھانت بھانت کے شور کئے جنگلی مزدوروں سے کیے، مگر بے سود، تاہم شیرنی تھی تو اس قطعہ میں، نکل کر تو نہ گئی تھی۔ ہاتھی پر سے ہم سب کچھ دیکھتے رہے تھے کہ ــــ منہ میں کچھ لیے ایک جانب سے گھسی۔ اور پھر کسی جانب سے نکلتی نہ دکھائی دی۔ اب جو ہم دونوں نے ہاتھی کی پیٹھ پر سے غور کیا تو اس قطعہ کے بیچوں بیچ میں سے شیرنی نکل کر گئی تھی جھاڑیوں میں ہیں کچھ کھجاہٹ سی محسوس ہوئی۔ فیل بان سے پوچھا اور بہتیرا انگلیاں اٹھا اٹھا کر بتایا کہ وہ جھاڑیوں میں کیا چیز ہے چمک رہی ہے مگر وہ نہ دیکھ سکا۔ جب خاصی دیر ہو گئی تو ہم نے کہا کہ ہم جا کر دیکھیں گے ہاتھی بٹھاؤ۔ مگر اس نے کہا کہ سرکار خفا ہوں گے اس وقت تمھیں نہیں اتاروں گا۔ ہم نے پھر کہا۔ "بھئی اتار دو۔"

"نہیں۔"

پھر بڑی خوشامد کی، مگر نہیں۔

اور پھر خفا بھی ہوئے مگر "نہیں" ہی رہا۔ ہم سمجھ گئے کہ یہ نہیں اتارنے کا۔ اور میں نے ہودج سے جھک کر دیکھا کہ بلندی کتنی ہے۔ لیکن کودنے کی ہمت نہ پڑی۔ نواب میاں نے ہاتھی کی دم کی جانب جھانکا۔۔۔۔ ویسے تو عمر میں چھوٹے تھے اور جسم و جثہ میں بہت کم۔ مگر تھوڑے پھرتیلے اور ہمت والے تھے۔ ہاتھی کھڑا جھومتا ہی رہا۔ اور فیلبان گردن پر بیٹھا چلم پیتا ہی رہا۔ اور نواب میاں نے دوبارہ جھانک کر پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ میں سمجھ تو گیا تھا۔ مگر ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ انھوں نے ہودج میں سے گلہری کی طرح ہاتھی کے پٹھوں پر جست کی اور پٹھوں سے رانوں تک رسّے کے سہارے اترے اور رانوں پر پہنچ کر دم کا سہارا لیتے بندر کی طرح دم در میں سرک کر نیچے جا کھڑے ہوئے۔ اور مسکرا کر مجھے بلایا۔ اور فیل بان اگر مگر کرتا ہی رہا کہ میں نے بھی تقلید کی، اور نیچے پہنچ کر مجھے تو نواب میاں اور سہارے کے لیے بھی ہاتھ بڑھائے کھڑے مل گئے۔ اور چڑیوں کے بچے چرانے کو ہم دونوں بیسیوں مرتبہ ایسے ہی چڑھے اترے تھے۔ اور فیل بان گڑگڑاتا ہی رہا اور ہم دونوں نیچے جا کھڑے ہوئے۔ اور اب وہ جھاڑی اور وہ چیز ہاتھی پر سے تو دکھائی پڑ رہی تھی۔ مگر نیچے پہنچ کر تو بس ہم سے اور بانس بھر اونچی جھاڑیاں اور کمر کمر سوکھی گھاس۔ مگر ہم نے جگہ کا اندازہ کر لیا تھا اللہ کا نام لے کر گھس پڑے۔ گھاس میں بھٹکتے، کانٹوں میں الجھتے بڑی مشکل سے پہنچ ہی گئے۔ اور جب جا کر دیکھا تو شیرنی کا دوسرا بچہ پڑا رہا ہے۔ جس کی آنکھیں بھی نہیں کھلی ہیں۔ پہلے تو ہم کچھ جھجکے۔ مگر نواب میاں آدمی دست دراز تھے۔ سب سے پہلے گلگلیوں کے گھونسلوں کے سوراخوں میں اپنا پتلا پتلا سوکھا سوکھا ہاتھ ڈال دیا کرتے تھے۔ بغیر ذرا بھی جھجکے کہ کہیں اس میں سانپ نہ ہو۔ ایک لمحہ تو وہ بھی ذرا جھجکے مگر پھر جھٹ سے اٹھا کر دبا لیا۔ تھوڑا بہت بلبلایا، غرایا، باریک باریک پنجے باہر آ گئے۔ پھر ان کی بغل میں سکھیا گیا۔ اور ہم لپکتے ہوئے باہر آ گئے۔ اور فیل بان تو ہاتھی پر بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ بولا۔ "ارے شیرنی کا بچہ!" اور اپنی خورجی سے تمباکو کا تھیلا نکالا۔ تمباکو اور ایک علیحدہ جھاڑن میں پوٹلی بنا کر باندھی۔ اور تھیلا خالی کر کے نیچے پھینکا۔ اور بولا۔ لو اس میں بند کر لو۔ اور نواب میاں نے نہایت احتیاط کے ساتھ خالی تھیلے میں بند کر لیا۔ اب فیل بان نے ہاتھی بٹھا دیا۔ اور ہم مع بچے کے اوپر پہنچ گئے۔ اور بار بار تھیلا کھول کر اندر جھانکتے رہے۔ اور فیل بان نے ہاتھی اور پرے لے جا کر کھڑا کر دیا۔ ایک جگہ پانی کے کنارے جا کر ہم نے کھانا کھایا۔ اور ابا جان نے تو آج کھانا بھی نہ کھایا تھا۔ صبح کا ناشتہ کیے ہوئے تھے۔ اور صبح سے سہ پہر ہو گئی۔ اِدھر قلی چلاتے چلاتے تھک گئے تو پھر ہم نے دور سے دیکھا کہ تین طرف سے اس قطعہ میں دھواں اٹھا۔ قلیوں نے تینوں جانب سے آگ لگا دی۔ اب شیرنی کا ادھر کو نکلنا لازمی تھا جدھر کو آگ نہیں لگی تھی۔ اور ابا جان بھی رائفل سیدھی کیے دبکے ہی ہوئے تھے۔ مگر ہمارے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی، جب ہم نے دیکھا کہ شیرنی شعلوں کو پھاندتی دھوئیں کو چیر کر قلیوں کے درمیان ہوتی الٹی نکلی اور جس میدان کی جانب سے بچہ منہ میں لے گئی تھی اس میں جستیں بھرتی پلٹتی نظر آئی اور اسی قطعہ میں گھس گئی جس

گئی تھی۔ اور اس میں سے ابھی ہم دو مرا بچہ لے کر آئے تھے۔ دُور سے دیکھ کر نواب میاں نے تھیلا اچھی طرح بغل میں دبایا۔ اور میرا دل دھک دھک کرنے لگا جیسے ہو رکا۔ مگر وہ تو ہم سے بہت دور تھی۔ اور ہم ہاتھی پر تھے۔ اور فیل بان نے ہاتھی اور پرے بڑھا دیا۔

اب سب کے سب سمٹ کر اس قطعہ پر آ گئے۔ کچھ دیر مشورہ ہوا اور پھر سب تین سمت میں بٹ گئے۔ اور ابا جان بدستور چوتھی سمت میں ایک جھاڑی کی آڑ لے کر دبک گئے۔ اور قطعہ بھی نسبتاً بڑا تھا۔ اور پچھلے قطعہ ہی پر تمام دن ڈنڈا ہیٹ کر بھی باہر نہ نکال سکے تھے اور اس سے چھوٹا بھی تھا بگلا بھی۔ اور ایک مرتبہ پھر بڑے زور سے شور کیا۔ پٹاخے چلائے۔ ڈھول کنستر پیٹے۔ مگر بے سود۔ اور سب کے سب میدان میں ابا جان کے گرد جمع ہو گئے۔ شام ہو رہی تھی۔ آگ لگانے کا وقت نہ تھا۔ اور پھر اتنے بڑے قطعہ میں آگ لگانا بھی بیکار سا تھا۔ کیونکہ تینوں سمتوں پر یک دم آگ بھڑک بھی نہ سکتی تھی۔ اور شام کے وقت نمی پیدا ہو گئی تھی اور یہ بھی تھا کہ جب تک آگ لگاتے کے لیے پھیلیں گے اندھیرا ہو جائے گا۔ لہٰذا کل صبح پر اُٹھا کر واپس ہو گئے۔

یہاں سے میل بھر کے فاصلے پر ہمارا کیمپ تھا۔ تمام دن کے تھکے تھکائے بھوکے پیاسے ابا جان چپ چاپ ہاتھی پر آ کر بیٹھ گئے۔ ڈر کے مارے نواب میاں نے چپکے سے تھیلا بغل سے کھسکا کر رانوں میں دبا لیا۔ اور ہاتھی ذرا دیر میں لپک کر کیمپ پہنچ گیا۔ اُترتے وقت ابا جان نے تھیلا دیکھ لیا۔ اور بولے "ایں، یہ کیا دبائے پھرتے ہو؟" اور تھیلا ٹٹولا۔ اور اندر کوئی چیز پہچانی۔ "ارے یہ کیا وبال پکڑ لائے؟" اور اب بات کھل گئی۔ مگر ابا جان تو ہماری کارگزاری پر خوش ہونے کے بجائے کچھ فکرمند سے ہو گئے۔ اور بولے۔ "یہ تو اس وقت پورا وبال ہے یہاں کیمپ میں"

"کیوں؟"

"تمام رات شیرنی یہیں منڈلائے گی اور نہ جانے کتنے چھاپے مارے گی۔"

"تو پھر پھینک دیں؟" میں نے کہا۔

"واہ پھینک کیسے دیں؟ - خیر دیکھو ابھی انتظام کرتا ہوں۔"

اور وہ بغیر کسے اندر گئے۔ اور کپڑے اتارے۔ دو تین جنگلی شکاریوں کو بلوایا۔ اور صورتِ حال بتائی۔ اور میں نے پوچھا "کیا ابا جان کیا اس کی بُو لے کر کیمپ میں پہنچ جائے گی۔؟"

"نہیں بُو تو نہیں، ناک تو شیر کی بہت کمزور، بلکہ یوں سمجھ لو کہ ہوتی ہی نہیں۔ ظالم اس کی آواز لے کر پہنچے گی۔"

"مگر یہ بول کب رہا ہے؟"

"ارے میاں یہ سمجھ لو کہ اس کی سانس سن کر پہنچے گی۔ اور سات تہوں میں دباؤ یہ کمبخت اس کی آہٹ سن کر بولے گا۔ یوں سمجھو کہ شیر کا رونگٹا رونگٹا کان ہوتا ہے۔"

"تو پھر؟"

"پھر یہ کہ اسے رات کے رات کہیں چھپا لیں۔ اور صبح کو تو اسے گھر بھیج دیں گے۔"

"تو ایسی بھی کیا آفت ہے ایک رات بھر یہاں کیمپ میں نہیں رکھ سکتے۔؟"

"وہی کیمپ تو کیمپ، یہاں زمین کے اندر سے بھی کھود نکالے گی۔" اور پھر کچھ سوچ کر شکاری قلیوں سے مشورہ کیا۔ جنگل میں جگہ جگہ گائیوں کے باڑے تھے جن کے گرد بانس بھر اونچی دیواروں کا چوطرفہ کمپونڈ تھا۔ کئی باڑوں کے متعلق بات چیت ہوئی۔ اور آخیر پہ یہ طے پایا کہ یہاں سے پانچ میل پر ایک بڑا محفوظ باڑا ہے۔ جس کی باڑھیں بھی زیادہ اونچی ہیں اور اس میں بیچوں بیچ ایک کوٹھری بھی

بچی ہے اور وہاں چونکہ گائے کھانے والے گنتے کے ہی بہت سے ہیں۔ اور بڑے گنڑ۔ بس آج کی رات اس کو کوٹھری میں بند کر دیا جائے۔ بس ایک ہی رات کی تو بات تھی۔ مگر مجھے بڑا تعجب ہوا، جب بجائے فیل بان اور شکاری قلیوں کے سپرد کر دینے کے ویسے تمام دن کے تھکے تھکائے ابا جان پھر ہاتھی پر بیٹھ کر خود بند کرانے گئے۔ میں اور نواب میاں تو ہاتھی پر بیٹھے رہے۔ باڑے کا مضبوط دروازہ کھلا اور ابا جان ہاتھی سے اُتر کر تھیلا اپنے ہاتھ میں لیے شکاری قلیوں کی رہنمائی میں اندر گئے۔ اور ویسے چوڑے کمپاونڈ میں گائیں چھوٹی ہوئی تھیں۔ کوٹھری کے دروازے پر کواڑ تو نہ تھے، مگر مضبوط پتلی پتلی لوچدار جھوڑ جنگلی بید کی ٹٹی لگی ہوئی تھی۔ مضبوط سے مضبوط کواڑوں سے بھی کم مضبوط نہ تھی۔ اندر سوکھی گھاس بھری ہوئی تھی۔ تھیلے سے نکال کر بچے کو کوٹھری میں نرم نرم گھاس کے گٹھوں میں چھوڑ دیا۔ اور اپنے سامنے ٹٹی کی رسیاں مضبوطی کے ساتھ بندھوا کر نکل آئے۔

دو بجے رات شیرنی نے چھاپہ مارا۔ اور چار بجے صبح کیمپ پر ایک باڑے کے حلقے نے اطلاع دی کہ دو بجے رات کو بڑے زور سے کتے بھونکے اور شیرنی ڈیڑھ بانس اونچی دیوار پھاند کر باڑے کے صحن میں آ گری۔ اور اس باڑے کے اندر تو گائیں بڑی بہادر ہوتی ہیں اور خطرے پر ایک ایک گائے ایک ایک شیرنی سے کم نہیں ہوتی۔ اور کوئی درندہ اگر جنگل میں کسی گلّے پر حملہ کرتا ہے تو سب مل کر ایک دم یورش کر دیتی ہیں۔ اور پھر یا یہ نہیں یا وہ نہیں۔ دو چار گائیں تو ضرور زخمی ہو جاتی ہیں مگر اس درندے کی دھجیاں سینگوں پر ہی بیٹھی نظر آتی ہیں۔ اور اُس نے بتایا کہ جب تک گائیں جمع ہو کر یورش کریں شیرنی ٹٹی کی رسی توڑ کر کوٹھری میں گھس گئی۔ وہ گائیں سینگ سیدھے کیے سب کی سب دروازے پر جمع ہو گئیں۔ اور اتنی دیر میں محافظوں کو موقع ملا۔ شیرنی اندر تھی، گائیں دروازے پر تیار دیوار کی طرح اٹل، شیرنی کی طرح بپھری ہوئیں، اور گایوں کے گلّے کو چیر کر محافظوں نے ٹٹی مضبوطی کے ساتھ لگا دی اور دو بڑے بڑے پتھر لڑھکا کر دروازہ بالکل ہی بند کر دیا۔ اور اب شیرنی اور بچہ دونوں کوٹھری میں بند ہیں۔

ابا جان بستر سے ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور ہم دونوں بھی۔ ہاتھی تیار کرنے کا حکم دیا۔ اور جب تک وہ کپڑے پہن پہنا کر اور رائفل لے کر نکلیں ہم پہلے ہاتھی پر جا بیٹھے۔ ہمیں ہاتھی پر بیٹھے دیکھ کر بولے۔ "نہیں، تم لوگ نہیں" اور نواب میاں نے خوشامد کی اور میں نے بھی تائید کی تو آہستہ سے بولے۔ "خیر، اب آ بیٹھے ہو تو چلو، ہاتھی کا تو کوئی کام نہیں۔ دور سے پیٹھ پر بیٹھے بیٹھے تماشہ دیکھتے رہنا"

باڑے کی دیوار کے قریب پہنچ کر ہم نے جو سین دیکھا وہ کسی نے کاہے کو ہی دیکھا ہوگا۔ نہ معلوم سو دو سو کتنی گائیں، لمبے چوڑے صحن میں سے جمع ہو کر کوٹھری کے دروازے پر سینگ سیدھے کیے تیار تھیں۔ ایک ایک کی آنکھ سے ایک ایک شیرنی سی جھپر رہی تھی۔ لال لال شعلہ سی دہکتی آنکھیں۔ اور نتھنے پھولے ہوئے نتھنے۔ غصے میں چکرا چکرا کر دھا دھم پاؤں پٹختی تھیں اور شیرنی کو چیلنج کرتی تھیں کہ "نکل باہر!" اور ہر ایک اوروں کو چیر کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتی تھی۔ اور نوک دار سینگ برچھوں کی طرح لہرا رہے تھے۔ اور ایک دفعہ تو یہ گایوں کا مجمع، شیرنی سے زیادہ بپھرا ہولناک انداز دیکھ کر ہمیں مزا آ گیا۔ الامان چرندوں کا اتفاق! بپھری شیرنی بھی ڈر کے مارے اندر دبک گئی۔ ورنہ محافظ ٹٹی بند کر کے پتھر کیسے لگا پاتے۔ اور اگر نکلنے کی ہمت کرتی تو اُس وقت قیمہ قیمہ ہو کر اُن کی سینگوں میں لپٹ جاتی۔ الغرض اب معاملہ طاقت سے بڑھ کر عقل پر آ گیا تھا...... ابا جان نے منصوبہ بنایا کہ کوٹھری کی چھت میں سوراخ کیا جائے اور اس سوراخ میں سے گولی مار دیں۔ اور بغیر اس کے کوئی شکل نہ تھی۔ خوب صبح ہو گئی تھی۔ اور سورج نکل رہا تھا۔ باڑے کا پھاٹک کھول دیا گیا۔ اور پھر فوراً بند کر دیا گیا، ہاتھی کو ایک جانب ذرا فاصلے پر کھڑا کرنے کا حکم دیا گیا۔ اور ہم دونوں ہودج پر کھڑے ہو کر تماشا دیکھنے لگے۔ کوٹھری کے ایک پاکھے سے ایک چھوٹی سی سیڑھی لگائی گئی۔ چار مزدور کدالیں اور پھاوڑے لے کر اوپر چڑھے اور پھر ابا جان، رائفل لیے تیار چھت کے ایک کونے پر کھڑے ہو گئے۔ کوٹھری کے بیچوں بیچ کدال سے چھت کاٹنی شروع کی۔ اور ذرا دیر میں سوراخ ہو گیا۔ ابا جان نے کہا۔ "ذرا اور بڑا کر دو"

اور دو تین ضربوں میں سوراخ اتنا ہوگیا کہ ایک بلی نکل سکے۔ "ٹھہرو!" ابا جان نے کہا اور الفل تلنے ادھر ایک ذرا بڑھے ہی تھے کہ یکدم شیرنی جیسے سوراخ کے اندر سے اُبل پڑی، اور محافظ کی کدال اُٹھی کی اُٹھی رہ گئی۔ "دھبایا" (طمانچہ) رسید کرکے ناک کے گھسے کا ہاتھ اچھل کر چھت سے نیچے گاہوں کی پیٹھ پر آگری وہ جب تک گائیں سنبھلیں سنبھلیں پیٹھ پر سے پنجے نکال کر اچھل کر جو گری ہے تو باندے کی دیوار کے باہر میدان میں۔ اور بس ہیں تو منہ میں بچہ لیے ایک جھلک سی نظر آئی اور جنگل میں غائب۔

ادبِ لطیف۔ لاہور

قدرت اللہ شہاب

سرودِ رفتہ

سہسرام کا شہر کئی لحاظ سے تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک تو یہاں شیر شاہ سوری کا مقبرہ ہے۔ دوسرے یہاں آغا جانی کا بازار ہے۔ اور تیسرے اسی شہر میں ایک بار رانو کی موٹر کار کے دو ٹائر پنکچر ہو گئے تھے۔

جس طرح شیر شاہ سوری کی عظمت آغا جانی کے بازار کے پس منظر کے بغیر ادھوری رہ جاتی ہے۔ اسی طرح رانو کی کار کے پنکچروں کے بغیر سہسرام کا شہر بھی اپنی تاریخی اہمیت کھو بیٹھتا ہے۔ آغا جانی کے بازار کا قصہ یوں ہے۔ کسی زمانے میں اس مقام پر ایک قصبہ آباد تھا۔ یہاں کے سردار کا لقب آغا خان تھا۔ اس کی ایک بیٹی تھی جسے لوگ جانی کہتے تھے۔ غالباً جانی اس کا نام نہ تھا۔ بلکہ اس کی دلفریب شانِ محبوبیت سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ بے حد خوبصورت اور جمیل لڑکی تھی، جس پر بہت سے لوگ دل و جان سے فدا تھے۔ ان میں سے ایک فرید خاں بھی تھا۔

فرید خاں خواب دیکھنے کا شوقین تھا۔ خوبصورت خواب، بھیانک خواب، جنگ و جدال کے خواب، ہندوستان کی بادشاہت کے خواب، جانی کی آنکھوں، جانی کے بالوں، جانی کی مسکراہٹوں کے دلفریب سپنے۔ اور جب اس کے خوابوں کی تعبیر نکلی اور شیر شاہ نے ہندوستان کی بادشاہت کا تاج پہنا، تو ایک تیز رفتار قاصد ایک پیغام لایا کہ "جانی میرا انتظار کرنا۔ میں بہت جلد اپنی ملکۂ عالم کے حضور میں آ رہا ہوں" شیر شاہ بادشاہت کرتا رہا۔ اور جانی انتظار۔ انجام کار، شیر شاہ پر ایک سنگلاخ، تاریخی مقبرہ تعمیر ہو گیا۔ اور جانی کے نام پر جانی بازار کی بنیاد پڑ گئی۔ جہاں ہر روز اس شہیدِ وفا کی یاد میں بیسیوں جانیاں بن سنور کر، سولہ سنگار کر کے سو سو کینڈل پاور کے برقی قمقموں کے عین نیچے کرسیاں جما کر۔۔۔۔ خیر، یہ تو ایک دوسری کہانی ہے۔ یہاں پر تو ایک قصہ رانو کی موٹر کار کا تھا۔ جسے پنکچر بھی ہونا تھا۔ تو سہسرام میں اب اگر وہ شیر شاہ کے مقبرے یا جانی کے بازار کی طرف جا نکلتی تو اسے کون روک سکتا تھا؟ اگر وہ شیر شاہ کے مزار پر چلی جاتی، تو شاید وہاں پر سوئی خاک کی چٹکی میں ایک لمحہ کے لیے آگ سی بھڑک اٹھتی۔ اور اگر وہ جانی کے بازار کی طرف جا نکلتی تو۔۔۔۔۔ خیر، یہ بھی حسنِ اتفاق تھا۔ کہ وہ شیر شاہ کے مقبرے یا جانی کے بازار کی طرف جانے کی بجائے کچہریوں کی طرف چلی آئی۔

اس وقت عدالت کے سامنے چوری کا کوئی معمولی سا مقدمہ زیرِ سماعت تھا۔ پنڈت کیسری ناتھ شرما بڑے جوش و خروش سے ایک گواہ پر جرح فرما رہے تھے۔ وہ مقامی عدالتوں کے سب سے سربرآوردہ خرانٹ اور کہنہ مشق وکیل تھے۔ جب وہ گواہ سے کوئی مفیدِ مطلب بات کہلوا لیتے تھے تو بصد ادب و احترام جھک کر چرب زبانی سے فرماتے تھے کہ "عالی جناب عدالت اس فقرے کو نوٹ کرے" لیکن ان کی ایک بھینگی آنکھ جو مدعی، مدعا علیہ، گواہ اور مجسٹریٹ کو ایک ہی ترچھے زاویے سے دیکھنے کی عادی تھی پکار پکار کر کہتی تھی کہ "اے او مجسٹریٹ کے بچے

اس فقرے کو یاد رکھنا۔ گواہ کی جرح پورے طور پر ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ عدالت نے اچانک مقدمے کی سماعت اگلی پیشی تک ملتوی کردی۔ پنڈت کیسری ناتھ شرما نے کہا "حضور ابھی صفائی کے دو گواہ اور موجود ہیں۔ جناب عالی وہ بڑی مشکل سے کلکتہ سے بلائے گئے ہیں۔ سرکار والا' وہ آج رات کی گاڑی سے واپس جانے پر مصر ہیں۔۔۔۔۔ ان کی بھینگی آنکھ نے بھی اپنی مخصوص زبان میں بہت سے اُلٹے سیدھے وار کیے۔ لیکن عدالت کا فیصلہ اٹل تھا۔ ابھی ابھی عدالت نے ملاحظہ فرمایا تھا کہ آج اس کی سرزمین پر سرخ حاشیوں کے سینڈلوں والے دو خوبصورت اور نازک پاؤں یوں محو خرام تھے۔ جیسے کسی ستار پہ دو حنائی انگلیاں مدھر مدھر سُر میں درباری کا الاپ بجا رہی ہوں۔ کچہری کے احاطے میں اچانک ایک مدہوش سی شمیم بس گئی تھی۔ اور سفید جارجٹ پر بڑے بڑے گلابی پھولوں والی ایک ساڑی نے ساری فضا کو گلنار کر دیا۔ چاروں طرف ایک سناٹا سا چھا گیا۔ جیسے کمشنر صاحب اچانک کسی ہنگامی معائنے پر نمودار ہو گئے ہوں۔ عدالت کو ایک حسین مقدمے کے تخیل نے سرشار کر دیا۔۔ عبدالوہاب پیشکار کچھ عرصے کے لیے پان کی پیک نگلنا بھول گیا۔ اور اُس کے چند قطرے سامنے پڑی ہوئی تعزیرات ہند کی جلد پہ ٹپک گئے۔ جو اُس نے نظر بچا کر اپنے کرتے کے دامن سے پونچھ ڈالے۔ پنڈت کیسری ناتھ شرما نے بھی اپنی آنکھ کا زاویہ بدلا، اور اس دھڑکتی ہوئی خاموشی میں ساری دنیا نے سنا کہ اک موسیقار کسی اردلی سے پوچھ رہی ہے۔ "کیا یہاں کسی کے پاس موٹر کار ہے؟"

یوں تو سہسرام کے مقدمہ بازوں، وکیلوں مجسٹریٹوں، کلرکوں اور چپراسیوں کو اکثر یہ خیال آیا ہوگا کہ دنیا میں موٹر کار بھی ایک نعمت ہے لیکن اس وقت اُنھیں اس وقت یہ احساس نہایت شدت سے ستانے لگا کہ موٹر کار کا نہ ہونا بھی ایک ناقابلِ عفو جرم اور ناقابلِ تلافی گناہ ہے۔ اس جنسِ نایاب کے فقدان نے کچہری کے احاطے میں ایک حیرانی اور پشیمانی کا ماحول سا پیدا کر دیا۔ اور ہر شخص اپنی اپنی جگہ ایک زبردست احساسِ بے مائگی سے آب آب ہونے لگا۔ "ہائے عجب جنگلی شہر ہے یہ۔ ارے بھئی اگر موٹر نہیں تو پنکچر لگانے کا سامان تو ہوگا۔ کسی کے پاس ٹائر لیور پنچ جیک، ربر سلوشن وغیرہ" رانو بات تو اردلی سے کہہ رہی تھی، لیکن ہر شخص محسوس کر رہا تھا، کہ وہ خاص اُسی سے مخاطب ہے۔ اور اُن کے پشیمان چہرے' زبانِ حال سے فریاد کر رہے تھے، کہ میری جان' یہ ایک موٹر ہی ہمارے بس کا روگ نہیں ورنہ تم کہو تو ہم آسمان سے تارے نوچ لائیں۔ چاند اتار کر تمھارے پاؤں پر رکھ دیں۔ ساری گھٹاؤں کو تمھارے گیسوؤں سے لڑا دیں۔ شیرشاہ سوری کا مقبرہ تمھاری ٹھوکر میں لا بچھائیں۔ جانی کا بازار تمھارے آگے پیچھے بسا دیں، لیکن اے جان یہ موٹر کار کا جوتا ہمارے منھ پہ نہ مارو۔ ہم روسیاہ......

رانو جلدی میں تھی، اِس لیے وہ اپنے آگے پیچھے، دائیں بائیں ملبلاتے ہوئے، کسمساتے ہوئے فریادی چہروں کی آواز نہ سن سکی۔ اور نہ اُس نے حسرو یاس، شرمندگی اور بے بسی کا وہ امتزاج دیکھا جو الیشر داس سائیکل ڈیلر کے منھ پہ گرم گرم کول تار کی طرح تہہ بہ تہہ بچھا جا رہا تھا۔ وہ دن بھر مقدمہ بازوں، منشیوں اور مختاروں کی سائیکلوں کے پنکچر درست کیا کرتا تھا۔ لیکن اے وائے کہ زندگیٔ عزیز کے اس انمول لمحے اس کا سارا کمال بیکار، بے سود، رائگاں تھا۔ اگر خالی ربر کی بات ہوتی تو خیر وہ تو اپنی کھال تک کھینچ لیتا۔ لیکن اس کے پاس نہ کوئی بڑا رینچ تھا، اور نہ جیک، چنانچہ اب وہ اپنی ماڈل سائیکل ورکشاپ کے سامنے ایک بے یار و مددگار اپاہج کی طرح کھڑا تھا۔ جس کا مال و متاع اُس کے سامنے لوٹا جا رہا ہو۔ اب قسمت سے یہاں آگئی ہو تو اپنا نور پھیلاتی جاؤ۔ تمھارے نور میں تو کوئی کمی نہ ہوگی، لیکن یہ زندگیاں غیر فانی ہو جائیں گی۔ یہ گھر آباد ہو جائیں گے۔ آنے والی نسلیں تمھارے گیت بھی اسی شوق، اسی سوز اسی حسرت سے گائیں گی۔ جس طرح اب جانی کے قصے گائے جاتے ہیں۔۔۔

کوئی ہوٹل، کوئی ڈاک بنگلہ؟ کوئی ریسٹ ہاؤس؟ ہائے یہ بھی کیا مجبوری ہے۔ اس نگوڑی کار کو بھی اسی جنگل میں پنکچر ہونا تھا۔ پھر ایک بھی نہیں بیک وقت دو ٹائر پنکچر ہو گئے ہیں۔ شاید ایک ٹیوب بالکل ہی پھٹ گئی ہو۔ اب اس اجاڑ بیابان میں نئی ٹیوب کہاں سے ملے گی بھلا؟ ہائے دن بھی ڈھلتا جا رہا ہے۔ بنارس یہاں سے کوئی پچاس ساٹھ میل ہی تو ہوگا۔ اگر یہ کمبخت کار پنکچر نہ ہوتی' تو اب تک وہاں پہنچ بھی گئی ہوتی۔ بنارس پہنچ کر اُس کو ابھی کتنے کام کرنے تھے۔ ایک بادشاہ کا مقبرہ۔ ہماری آغوش میں آج بھی ایک جلیل القدر بادشاہ محوِ استراحت ہے۔ لیکن' یہ

قدرناشناس لوگ۔ پھر بھی اس کے لیے کتنے سو کتنے برس انتظار کرنا پڑے۔ اور پھر ہربنس نے اس موقع پر خاص طور پہ مدعو کیا تھا۔ ہربنس اُس کا منگیتر تھا، بڑا البیلا، خوش باش، خوش دل جوان تھا۔ اور ناچتا بھی کیا خوب تھا۔ خصوصاً آج کی رات جب گرینڈ ہوٹل کا آرکسٹرا نئی نئی سریلی دھنیں بجائے گا۔ جب بال روم کی فضا میں عطر اور لیونڈر، شمپین، قہقہے اور خوبصورت اور نازک اندام سیمیں اجسام ایک تیز و تند خمار کی طرح چھا جائیں گے۔ جب رات کے بارہ بجے ہزاروں سال کے انتظار کے بعد آزادی کی دیوی دسکی ــــ جن ــــ شیری کے گلاسوں کی خوشنما جھنکار کے ساتھ زمین پر اُترے گی، تو ہربنس کے رقص میں کیا کیا ترنگ نہ ناچے گی۔ اُس کے سبک قدم رقص گاہ کے شفاف اور چمکیلے فرش پر یوں پڑیں گے جیسے کسی جھیل کی لہروں میں کنول کے پھول تیرتے پھر رہے ہوں، اور اُس کے گرسنہ، بے قرار بازو رانو کو ایک شعلۂ بے قرار کی طرح اپنی لپیٹ میں لیے ناچ گھر کے جمگھٹے میں یوں رقصاں جیسے دیا سلائی کو بھڑکتی ہوئی آگ میں چابک دستی سے تیز تیز گھمایا جائے۔ اور اُسے آگ نہ لگنے پائے لیکن تقدیر کا نوشتہ کس نے مٹایا ہے۔ اور کون مٹائے گا۔؟ عین اس وقت جب کلکتہ میں ہربنس اپنے ڈنر سوٹ کے کالر میں لگانے کے لیے سفید گلاب کے ایک بڑے سے پھول میں پہ لائن پیرس کا عطر "پنشن" سوئیوں سے چھو چھو کر لبھا رہا تھا۔ رانو گرینڈ ٹرنک روڈ پر ایک خیراتی سرائے کی طرح بسے ہوئے چھوٹے شہر سہسرام میں سب ڈویژنل مجسٹریٹ کے چھوٹے سے تاریک سے بنگلے میں ایک ناقابل بیان، بے کسی بیزاری اور مایوسی کے عالم میں اپنا سامان اُتروا رہی تھی۔ لیکن اس مہمان کی آمد پر صدیوں سے سویا ہوا بنگلہ انگڑائی سی لے کر بیدار سا ہوگیا۔ اُس کی اونگھتی ہوئی بے جان دیواروں میں زندگی کے آثار لہرانے لگے۔ بجی ہوئی کھڑکیاں اور فرسودہ دریچے نو دمیدہ کلیوں کی طرح کھلنے لگے۔ تاریک چھتوں پر جیسے چاند اور تارے طلوع ہوگئے۔ اور جب رانو نے اپنے لاجواب ہاتھوں سے ڈرائنگ روم کی کرسیوں اور میزوں پر بکھری ہوئی کتابوں کو الماری میں رکھ کے صوفے کا رُخ ذرا سے بدل کر رکھا تو اس بھوے بسرے پریشان حال کمرے میں نشاط اور شالامار کی گلپوش روشیں آراستہ ہوگئیں۔ اور پھر آج کی تاریکی رات کلکتہ نہ پہنچ سکنے کا غم غلط کرنے کے لیے رانو نے اپنے پکنک بکس سے جن، رم، اور وسکی نکال کے چند تیز عنابی رنگ کے کاک ٹیل بنا کے نوش جان فرمائے۔ ان کا خمار گلابی ڈوروں کی صورت میں اُس کی غزالی آنکھوں میں چھلک آیا۔ اور اُس کے گالوں پر آتش بازی کی مہتابیاں، انار سے پھوٹنے لگے۔ آدھی رات کے قریب جب ہم شیر شاہ کے مقبرے کی چھت پر جا کر بیٹھ گئے، تاکہ سہسرام کی گلی کوچوں میں آزادی کا نفوذ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ تو اس وقت وہ ویران مقبرہ گرینڈ ہوٹل سے زیادہ منور اور بارونق محسوس ہونے لگا۔ اور اُس کے سناٹے میں ایک عجیب سماوی سا آرکسٹرا سا بجنے لگا۔ سہسرام کی سرزمین پر ایک نئے شیر شاہ نے جنم لیا جس پر تاریخ کبھی کوئی یادگار مزار تعمیر نہ کر سکے گی۔ اور ایک نئی جانی نے ظلمت شب کو اپنے گیسوئے عنبریں سے تابانی عطا فرمائی۔ لیکن اس کے نام پر غالباً کوئی بازار قائم نہیں ہوا..... گھڑی کی سوئی بارہ بجنے سے کچھ منٹ ادھر دھیمے دھیمے لرز رہی تھی۔ جیسے کسی حسینہ کے دہکتے ہوئے ہونٹ انکار اور اقرار کے مابین تھرتھرا رہے ہوں۔ شیر شاہ سوری کے مقبرے کے گرد جو تالاب ہے اُس کی سیڑھیوں پر بہت سے بچے خوشی اور جوش سے کلکاریاں مارتے ہوئے انار، مہتابیاں، پھلجھڑیاں اور پٹاخے جمع کر رہے تھے۔ اور انھیں تالاب کے گرد اس خوبی اور کوشش سے سجا رہے تھے، جس پر رانو نے میوے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر اپنے پیچیدہ کاکلوں کو آراستہ کیا تھا۔ کلکتہ کے گرینڈ ہوٹل میں بال روم اپنے جوبن پر تھا۔ ہربنس رانو کی آمد سے مایوس ہو کر مس پرمیلا کو اپنی باہوں کے حلقے میں لیے آزادی کا رقص ناچ رہا تھا۔ "ڈارلنگ مجھے دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھو۔" رانو اپنی مخمور موسیقار آواز میں کہہ رہی تھی۔ "بائی گاڈ۔ میں اس مقدس رات کو آسانی سے برداشت نہیں کر سکتی۔ بائی گاڈ، میں وفور جذبات سے مر جاؤں گی۔" آزادی کے انتظار میں رانو بھی ان بچوں کی طرح بے خود اور بے قرار ہو رہی تھی جو نیچے تالاب کی سیڑھیوں پر یہیں سہسرام ہی کیسے جاتے ہیں۔ جاہل، پاگل، احسان فراموش۔ دیکھو تو سہی تمھاری کار کے پنکچر تک نہیں جوڑ سکتے ــــ گنوار ــــ نالائق ــــ نکمے ......

کیا یہاں پر رات گزارنے کے لیے کوئی اچھا ہوٹل ہے ؟

ارے ہوٹل میری جان، تجھے ہوٹل کی کیا حاجت ؟ یہ دل دیکھو، یہ سینہ دیکھو، یہ آنکھیں دیکھو، یہ سارے پٹ تمھارے لیے ہی وا ہیں ! آؤ، یہ کاشانے تمھارے ہی منتظر تھے۔ اب تم کہاں جاؤ گی ؟ یہ سب تمھارے ہی گھر ہیں۔ وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے......

"ہائے نہیں ! میں کسی کے پاس ٹھہرنا نہیں چاہتی۔ کیا یہاں کوئی ڈاک بنگلہ بھی نہیں ؟ کوئی ریسٹ ہاؤس ؟"

سہسرام کچہری کے احاطے میں جتنے دل دھڑک رہے تھے۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ ہوٹل یا ڈاک بنگلہ یا ریسٹ ہاؤس کا رتبہ حاصل کرنے کی سرتوڑ کوشش کرنے لگے۔ اور اُن کے کواڑ بے قراری سے بار بار کھلتے تھے۔ اور دامن پھیلا پھیلا کر فریاد کرتے تھے، کہ آؤ گھڑی دو گھڑی ان ویرانوں کو آباد کرتی جاؤ۔ اگر یہ لاجواب ساعت بیت گئی تو کون جانتا ہے پھر دوبارہ واپس آئے نہ آئے۔ اگر تم یونہی چلی گئیں تو تاریک دہر انگلی تک نہ ہلا سکے گا۔

"خاک !" رانو جھلا سی گئی۔ "کیا نام ہے اس شہر کا ؟"

سہسرام کا ذرہ ذرہ پکارنے لگا کہ ہمیں سہسرام کہتے ہیں۔ پہلے ہمارا نام شہ سرام تھا۔ بادشاہوں کے آرام فرمانے کی جگہ وہ دیکھو سامنے جو ایک سنگلاخ عمارت نظر آ رہی ہے، وہ ایک مقبرہ ہے۔

اس روز اچانک موٹر سائکل کو بار بار اچانک دھچکے لگتے تھے۔ اسرافیل رہ رہ کے اپنا صور پھونکتا تھا۔ جیسے پہاڑ ٹکرا گئے تھے۔ زمین اور آسمان ایک دوسرے سے مل گئے تھے۔ اور اس نفسا نفسی کے عالم میں رانو کے مرمریں بازو میری کائنات پہ ایک مرغولۂ نور کی طرح آویزاں ہو رہے تھے۔ لیکن پھر وہ بگڑنے لگی۔ غصیلی ناگنوں کی طرح بل کھاتی ہوئی تیوریاں اُس کی پیشانی پر یوں تلملانے لگیں جیسے برفانی بادلوں کے آنچل میں بجلیاں تڑپ رہی ہوں۔ جیسے مرمر کی سلوں پر چاندی کے تار سیلاب کی طرح جھلملا رہے ہوں۔ غصے میں بھی ایک کیف ہوتا ہے۔ کیسی رعنائی۔ چنانچہ اگر اس روز قدم قدم پر ٹھوکروں اور ہچکولوں نے ہمارا استقبال کیا تو اس میں نہ میرا قصور تھا نہ موٹر سائکل کا، نہ سڑک کا، بلکہ ساری کائنات اس شہابی غبار کو دیکھنے کے لیے بے قرار تھی جو غصے کی تمازت میں رانو کے گالوں پر قوس و قزح کی طرح چھا جاتا ہے۔ اور بخدا وہ کیا ہی لاجواب، لافانی، انمول لمحہ تھا، جب اُس کے ڈرائیور نے قطعی طور پر کہہ دیا کہ "میم صاحب پنکچر لگانے کا سامان نہیں مل سکا۔ جب تک یہ سامان نہ ملے، گاڑی بے کار ہے"۔

رانو کی کار سڑک کے کنارے اس خاموش گائے کی طرح کھڑی تھی جس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہو۔ اور بیس بیس کوس تک کسی سلوتری کا پتا ملنا محال ہو۔ ڈرائیور کا فیصلہ سن کر رانو کے گالوں کا شہابی رنگ غبار آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کی طرح اس کی آنکھوں میں جوالا مکھی کے شعلے بھڑکنے لگے۔ اور اُس کے نازک پاؤں سہسرام کی اس خوش نصیب سرزمین کو غصے سے یوں پٹخنے لگے، جیسے فرید خان ہندوستان کا تخت پانے کے خواب بن بن کر بے چینی سے ادھر سے ادھر ادھر سے ادھر پاؤں مارتا تھا۔ اور جیسے جانی انتظار کی گھڑیوں میں بے بس، پریشان، ہجو ایڑیاں رگڑتی تھی۔ آج شام تک رانو کا کلکتہ پہنچنا لازمی تھا۔ اس کا احساس نہ ڈرائیور کو تھا نہ موٹر کار کو جو ایک اپاہج گائے کی طرح سڑک کے کنارے دم توڑے پڑی تھی۔ حالانکہ یہ اشد ضروری تھا کہ وہ شام تک کلکتے ضرور پہنچ جائے۔ کیونکہ آج رات جشن آزادی کی رات تھی۔ اور رات کے عین بارہ بجے جب آزادی کی دیوی آکاش سے اُتر کر اس دھرتی پر آئے گی اُس وقت گرینڈ ہوٹل کا بال روم اپنے پورے جوبن کے ساتھ اس کا استقبال کرے گا۔ یوں تو گرینڈ ہوٹل کا بال روم ہر شب شب برات مناتا ہے۔ لیکن آزادی کی رات بھی کوئی روز روز آتی ہے۔ اگر رانو نے یہ زریں موقع کھو دیا تو نہ جانے اسے یہ جشن دوبارہ منانے کا موقع ملے یا نہ ملے بچے گھروں میں آتش بازی کی قطاریں سجا رہے تھے۔ اُف ایک بچہ دھڑام سے پھسل کر سنگلاخ فرش پر گر پڑا۔ اُس کے ہاتھ کا انار تڑاخ سے پھٹ گیا۔ اُس کا چہرہ گرم گرم دھوئیں کے غبار میں لپٹ گیا۔ اُس کی آنکھیں جھلس کر مند گئیں ـــ

اب وہ اپنی آنکھوں سے اس دیوی کی شانِ نزول نہ دیکھ سکے گا۔ جس کا استقبال کرنے کے لیے اُس نے اپنی توتلی زبان سے انقلاب زندہ باد کے نعرے لگانے سیکھے تھے۔ آسمان پر ایک تارا ٹوٹا۔ اور دور تک ایک خطِ نور کھینچتا ہوا غائب ہو گیا۔ جانی کے بازار میں میلے پر زور کی تھاپ پڑی گھنگرو ناچے۔ شیرشاہ کے مقبرے کے پتھر سنگِ مرمر بن گئے۔ چھت کے اندھیرے میں ایک شمع فروزاں بھڑکی، آزادی کی دیوی سوا نیزے پر اُتر آئی تھی۔ اور میرے کانوں میں ایک نازک سی مترنم سی آواز کہہ رہی تھی — "چاکلیٹ سر؟"

میں نے آنکھ کھول کر دیکھا تو ہلکے نیلے فراک والی ایر ہوسٹس بسکٹوں، چاکلیٹوں، چوسنے والی مٹھائیوں کی ٹرے لیے میری سیٹ پر جھکی ہوئی تھی۔ اُس کے احمریں بالوں کی ایک لٹ ٹرے پر بے پروائی سے لہرا رہی تھی اور اس سے یاسمین کے سینٹ کی ہلکی ہلکی سی شمیم یوں آ رہی تھی جیسے پھولوں کے کنج سے ٹھنڈی ٹھنڈی نسیم کے جھونکے چھن رہے ہوں۔

بی۔ اے۔ او۔ سی کا ایک طیارہ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر اپنے چار انجنوں کی طاقت سے پوری رفتار پر پرواز کر رہا تھا۔ راوی گزر چکی تھی۔ اور اُس کے روماں بھی۔ اب ہم دریائے سندھ کے پاس پرواز کر رہے تھے۔ جس پر فقط سکھر بیراج ہی تعمیر ہو سکتے ہیں۔ اور گنگا اور جمنا اور سون اور ہگلی کے مرغزار بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ جہاں کے صنم خانوں میں رام ازل تک راج کرے گی۔ لیکن آزادی کی دیوی اب کبھی دھرتی پر نہ اُترے گی —
سہسرام کی سڑک پر کسی کار کو پنکچر نہ ہوں گے شیرشاہ کا مقبرہ اب پھر آباد نہ ہوگا۔ اس کے سنگلاخ پتھر مرمر نہ بن سکیں گے۔ اس کی چھت پر کوئی شمع فروزاں نہ بھڑکے گی۔ سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید۔

نقش، کراچی

ضمیر الدین احمد

ادبِ لطیف، لاہور

اے محبّت زندہ باد

کیوں نہ کرداروں کا تعارف کرانے سے پہلے راوی کا تعارف کرادوں۔ راوی میں ہوں۔ میں ایک پرانے شریف کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ ہوں۔ مگر اب اس آنکھ کی بینائی کم ہوگئی ہے۔ اور اس دیے کی روشنی مدھم۔ یعنی میں جو فارسی کا ایم۔ اے۔ ہوں۔ ایک تیل کے کارخانے میں چار سو روپیہ ماہوار پر ملازم ہوں۔ میری شریک حیات کپڑے دھوتی ہے۔ گھر کی صفائی کرتی ہے اور کھانا پکاتی ہے اور میں نوکری کرنے کے علاوہ بازار سے سودا سلف لاتا ہوں۔ یہ سب باتیں — یہ نوکری کرنا۔ کپڑے دھونا۔ جھاڑو دینا۔ کھانا پکانا، اور سودا سلف لانا — میری عظیم خاندانی روایات کے برخلاف ہیں۔ اس خاندان میں آج تک کسی نے — میرا مطلب ہے مجھ سے قبل — نوکری نہیں کی — اور اس خاندان کی کسی خاتون نے آج تک نہ کپڑے دھوئے۔ نہ جھاڑو لگائی اور نہ کھانا پکایا۔

میرا بچپن اور لڑکپن ایک بہت بڑی حویلی میں گزرا۔ جہاں خاندان کے افراد سے زیادہ نوکر چاکر ہوا کرتے تھے۔ لڑکے، لڑکیاں، مرد، عورتیں، بڈھے، بڑھیاں، پشتہا پشت سے یہ لوگ ہمارے گھرانے کی خدمت کرتے آئے تھے۔ شاید اسی لیے ان کے ساتھ نوکروں کا سا سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ بلکہ انھیں خاندان کے غریب افراد کا رتبہ حاصل تھا۔ ایک بڑی بی تھیں جن کا پوپلا منھ ہر وقت چلتا رہتا تھا۔ اور جو بیٹھے بیٹھے سو جانے کی عادی تھیں۔ میں انھیں دادی اماں کہا کرتا تھا۔ کیونکہ انھوں نے میرے والد صاحب کو پالا تھا۔ وہ انھیں بیٹا کہا کرتی تھیں۔ اور والد صاحب ہمیشہ انھیں بوا کہا کرتے تھے۔ گھر کے ہر اہم معاملے میں میری والدہ اُن سے مشورہ لیا کرتی تھیں۔ بڑا رعب تھا اُن کا سارے خدمتگاروں پر۔ ایک دفعہ ڈانٹ دیتیں تو ڈانٹ کھانے والا نوکر کئی کئی دن تک اُن کے سامنے آنے سے کتراتا۔ ستر کے پیٹے میں تھیں۔ مگر نظریں ابھی تک عقاب کی سی تھیں۔ کیا مجال تھی کہ کوئی نوکر یا نوکرانی کوئی ایسی ویسی حرکت کر جائے۔ اور انھیں پتہ نہ چلے ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ایک نوجوان نوکرانی کی کوٹھری کے سامنے سے پچھلے پہر ایک سایہ سا لہرا کر گزر گیا۔ میرا مطلب ہے کہ بقول اُن کے انھوں نے ایک سایے کو نوکرانی کی کوٹھری کے سامنے سے لہرا کر گزرتے دیکھ لیا۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ بڑی بی کی، آنکھوں یا اُن کے ذہن کا قصور تھا۔ یا واقعی کوئی سایہ کوٹھری کے سامنے لہرایا تھا۔ مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نوکرانی کو کھڑے کھڑے نکال دیا گیا۔ اور گھر کے بزرگ بہت عرصے تک ایک قبول صورت نوکر کو مشکوک نظروں سے دیکھتے رہے میری والدہ کہا کرتی تھیں کہ شادی کے بعد جب تک میں پیدا نہیں ہوا تھا اُن کی اتنی ہمت نہ پڑتی تھی کہ بغیر لمبا سا گھونگھٹ نکالے بڑی بی کی موجودگی میں اپنے شوہر یعنی میرے والد صاحب کے سامنے آجائیں۔

مگر یہ سب تو اب بھولی بسری باتیں ہوگئیں۔ اب نہ وہ حویلی ہے، نہ وہ نوکر چاکر اور نہ وہ بڑی بی کی عقابی نظریں۔ اب میں اس اتنے

بڑے شہر میں ایک گنجان آباد علاقے میں ایک دو کمرے کے فلیٹ میں اپنی شریک حیات اور تین بچوں کے ساتھ رہتا ہوں۔ سب سے بڑی لڑکی ہے، جو جوانی کی طرف بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے اور جس کو دیکھ کر ہم اکثر خاموشی سے ایک دوسرے کی نظروں میں جھانکنے لگتے ہیں ——— میرا مطلب ہے میں اور میری نیک بخت۔

جس بلڈنگ میں ہم رہتے ہیں اس میں بیس فلیٹ ہیں۔ اور تین منزلیں۔ میں بیچ والی منزل میں سڑک کے رخ رہتا ہوں۔ جو فلیٹ ہمارے فلیٹ کے نیچے ہے۔ اس میں ایک بمبئی کے تاجر رہتے ہیں۔ جن کے گھر سے ہمہ وقت ریڈیو کی آواز آتی رہتی ہے۔ اتنی بلند کہ مجھے اپنے گھر میں ریڈیو کی کمی کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ جو فلیٹ میرے فلیٹ کے اوپر ہے اس میں ایک انگریزی دوا فروش رہتے ہیں۔ ان کے دو بچے ہیں۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ لڑکی بڑی ہے اور لڑکا چھوٹا۔ لڑکی جوان ہے۔ سولہ سترہ حد سے حد اٹھارہ برس کی ہوگی۔ میرے ہاں آتی جاتی ہے۔ میری لڑکی سے اس کی دوستی ہے۔ گہری یا سطحی۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ میری لڑکی مجھ سے شرماتی ہے۔ اور کبھی کھل کر میرے سامنے بات نہیں کرتی۔ بس "اچھا اباجی" "بہت بہتر اباجی" "نہیں اباجی" میں اس کی شرم و حیا کا لحاظ کرتا ہوں۔ اور کبھی اس سے زیادہ باتیں نہیں کرتا۔

میری بلڈنگ کے سامنے یعنی سڑک کے اس پار ایک اور رہائشی بلڈنگ ہے۔ یہ بلڈنگ بھی سہ منزلہ ہے۔ اس بلڈنگ میں جو فلیٹ دوا فروش کے فلیٹ کے بالکل سامنے ہے اس میں ایک دفتری سپرنٹنڈنٹ رہتے ہیں۔ ان کے کئی بچے ہیں۔ سب سے بڑا لڑکا ہے۔ بائیس تئیس برس کا ہوگا۔ کالج میں پڑھتا ہے۔ اکثر کالی تنگ پتلون، چوخانے والی قمیص اور کالا نوکدار جوتا پہنتا ہے، اس کے بال لمبے ہیں جن میں وہ کافی تیل لگاتا ہے۔ سامنے سے بال کچھ اس طرح بناتا ہے کہ چڑھتی ہوئی موج یاد آجائے۔

یہ سب کے سب شریف اور نیک لوگ ہیں۔ میری مراد ہے ان لوگوں سے جو میری بلڈنگ میں، سامنے والی بلڈنگ میں اور آس پاس کی بلڈنگوں میں رہتے ہیں۔ نہ جانے کیوں، یہ سب لوگ میری بہت عزت کرتے ہیں۔ یا یوں کہئے کہ میرا انھیں بہت لحاظ ہے۔ ان میں سے اکثر عمر میں مجھ سے بڑے ہیں۔ اور کئی تو اتنے معمر ہیں کہ اُن کی بھوؤں تک سپید ہوگئی ہیں۔ مگر یہ سب مجھے بھائی جان کہتے ہیں۔ حالانکہ میری عمر صرف پینتالیس برس کی ہے۔ اور یہ طرزِ تکلم اتنا رواج پا گیا ہے کہ میں سارے محلے کا بھائی جان بن گیا ہوں۔ یعنی چھوٹے سے لے کر بڑے تک سب مجھے بھائی جان کہتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ایک حضرت منوں نے ابھی چند ہفتے ہوئے اپنی زبان کا استعمال برائے گفتگو سیکھا ہے۔ وہ بھی مجھے "بائیدان" کہہ کر پکارتے ہیں۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ کیسا راوی ہے، جو اپنی تعریفوں کا پٹارہ کھول کر بیٹھ گیا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا مقصد خودستائی ہرگز نہیں۔ ہماری حویلی میں خودستائی کو بہت بری چیز سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے خودستائی کی مجھے بالکل عادت نہیں۔ ہاں، یہ ممکن ہے کہ ناتجربہ کار ہونے کی وجہ سے میں ایسی باتیں کہہ گیا ہوں جن کا کہانی سے کوئی خاص تعلق نہیں۔ یا جن سے خودستائی کی بو آتی ہو۔ اگر ایسا ہوا ہے تو میں معافی کا خواستگار ہوں۔ اور امید ہے کہ آپ یہ مدنظر رکھتے ہوئے کہ میں افسانہ نگار نہیں، میری ان باتوں کو نظر انداز کر دیں گے۔

اگر آپ نے مجھے معاف کر دیا ہو تو ایک بات اور کہہ دوں۔ وہ یہ ہے کہ محلے والے نہ صرف مجھے بھائی جان کہتے ہیں۔ بلکہ اکثر معاملات میں مجھ سے مشورہ بھی کرتے ہیں۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ خالص نجی قسم کے معاملات میں بھی مجھ سے رائے لینے سے یہ لوگ نہیں جھجکتے۔ میرے اور اُن کے درمیان ایک رشتۂ اعتماد قائم ہو گیا ہے۔ اس کا عمر اور بزرگی سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ نئی پود بھی اکثر بلا جھجک مجھ سے اس طرح صلاح مشورہ کرتی ہے گویا میں بھی اسی پود کا ایک فرد ہوں۔ حد تو یہ ہے کہ معاملات قلب و نظر میں بھی یہ لوگ۔ میرا مطلب ہے نئی پود کے لوگ میری رائے لینے سے نہیں جھجکتے۔ یہ دوسری بات ہے کہ میں اُن کی اس ذیل کی مشکلوں کا حل ڈھونڈنے سے قاصر رہتا ہوں۔ کیونکہ ان معاملات میں

میرا تجربہ صفر ہونے کے برابر ہے ۔ یعنی صفر ہے ۔

ایک دن کا ذکر ہے، میری طبیعت خراب تھی۔ اس لیے دفتر نہیں گیا تھا۔ میری شریک حیات غسل خانے میں کپڑے دھو رہی تھیں۔ بچے اسکول جا چکے تھے۔ محلے میں نسبتاً امن تھا۔ کام پر جانے والے کام پر اور اسکول اور کالج جانے والے اسکول اور کالج جا چکے تھے۔ صبح کا وقت تھا۔ میں بالکونی میں ایک آرام کرسی پر نیم دراز اخبار پڑھ رہا تھا کہ ایک پتھر آکر میرے سر پہ لگا۔ اور اتنی زور سے لگا کہ اخبار میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ پتھر اگر ننگا ہوتا تو یقیناً میرے سخت چوٹ آتی۔ آپ کہیں گے ننگا پتھر اور ملبوس پتھر کیا بات ہوئی۔ مگر بات کچھ ایسی ہی تھی۔ میرا مطلب ہے کہ پتھر ایک کاغذ میں لپٹا ہوا تھا پتھر پہ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کاغذ پر جس میں پتھر ملبوس تھا ایک نظر ڈال کر میں نے فوراً سڑک کے اس پار دیکھا۔ کیونکہ پتھر ادھر ہی سمت سے آسکتا تھا۔ مگر وہاں پتھر پھینکنے والے کا نام و نشان تک نہ تھا۔ میں نے پتھر اٹھا لیا۔ اور وہ کاغذ کھول کر جس میں وہ لپٹا ہوا تھا پڑھنے لگا۔ القاب و آداب کچھ اس قسم کے تھے۔ "میری جان منیسفیلڈ، میری میریلین منرو، جیو" القاب و آداب پر نظر پڑتے ہی اندازہ ہو گیا کہ مکتوب الیہ میں نہیں ہوں۔ بلکہ نامہ راستہ بھول گیا ہے۔ مگر فوراً ہی خیال آیا کہ خدا ناخواستہ یہ خط میری بیٹی کو تو نہیں لکھا گیا ہے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ میں دوسروں کا خط نہ پڑھنے والی نصیحت جو مجھے بار بار حویلی میں کی گئی تھی یکسر بھول گیا۔ اور جلدی جلدی خط پڑھنے لگا۔

> "مجھے تمھارے بھائی نے بتا دیا تھا کہ آج تم اسکول نہیں جاؤ گی اس لیے میں بھی آج
> کالج نہیں گیا۔ درد سر کا بہانہ کر دیا۔ ویسے یہ سچ بھی ہے۔ میرے سر میں سچ مچ درد ہو رہا ہے۔
> پوچھو۔ کیوں؟ میری سرکار اس لیے کہ میں رات بھر نہیں سو پایا۔ پھر پوچھو۔ کیوں؟ میری جان
> اس لیے کہ رات بھر تم۔ نہ پوچھو۔ کس کس طرح سے یاد آتی رہیں۔ اور میں کروٹیں بدلتا رہا۔ نیند
> نہیں آئی۔ آنکھوں میں کانٹے اُگ آئے تھے۔ ہائے کیا عالم ہو جاتا ہے جب میں اپنی ڈورس ڈے
> سے دو تین دن تک نہیں مل پاتا ــ"

خط کے اس حصے پر پہنچ کر میں ٹھہر گیا۔ میں فلم نہیں دیکھتا۔ اس لیے نہیں کہ میں فلموں کے خلاف ہوں۔ بلکہ اس لیے کہ گھر کے بجٹ میں اس خواہش کو پوری کرنے کی گنجائش یا تو نکلتی نہیں یا بہت کم نکلتی ہے۔ لیکن پھر بھی میں میریلین منرو کے نام سے واقف ہوں۔ اور مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ جین منیسفیلڈ بھی میریلین منرو قسم کی کوئی شخصیت ہے۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے یا تھا۔ لیکن جب مسماۃ ڈورس ڈے کا ذکر آیا تو میں ٹھٹھک گیا کیونکہ یہ نام میں نے اس سے قبل کبھی نہیں سنا تھا۔

لیکن یہ ٹھٹھکنا مجھے بہت مہنگا پڑا۔ کیونکہ پھر میں آگے نہیں پڑھ سکا۔ اس ایک لمحہ توقف میں انگریزی دوا فروش کی صاحبزادی جن کا نام نسیمہ انجم جاوید ہے۔ اور جنھیں ان کے گھر والے اور میرے گھر والے مع میرے صرف نسیّ کہہ کر پکارتے ہیں آن دھمکیں۔

اگر میں کہانی کو اس مقام پر چھوڑ کر آپ سے یا کسی افسانہ نگار سے کہوں کہ میرے بھائی اب تم اسے آگے بڑھاؤ تو مجھے یقین ہے کہ آپ یا اور افسانہ نگار صاحب سلسلہ یوں جاری رکھیں گے کہ نسیّ بیٹی کو دیکھتے ہی میں نے خط کو چھپا لیا۔ اس پر بیٹھ گیا یا اس کی پڑیا بنا کر یا اسے اپنے جیب میں رکھ کر، یا منہ میں ڈال کر۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ہوا یہ کہ نسیّ بیٹی بس ایک لمحہ بھر کے لیے جھجکیں۔ یعنی انھوں نے دو ایک بار پلک جھپکائیں۔ گردن کو ایک بہت ہی خفیف سا خم دیا جو جھک جانے کی بہت ہی ابتدائی شکل تھی۔ ایک ہاتھ کو ذرا سا اوپر اٹھایا۔ اس انداز سے کہ دیکھنے والا اگر ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ تجربہ کار بھی ہو تو وہ اندازہ لگا لے کہ اگر یہ حرکت درجۂ تکمیل کو پہنچ جائے تو دانتوں سے بلا وجہ ناخون کاٹنے کی حرکت بن سکتی ہے۔

اور پھر بولیں۔ "ہائے اللہ! بھائی جان آپ میرا خط پڑھ رہے ہیں "۔
سچ تو یہ ہے کہ اگر نسیّ بیٹی خط پر اپنا حق نہ جتاتیں تو مجھے ہرگز پتہ نہ چلتا۔ کم از کم اندازہ تو نہ ہوتا کہ مکتوب الیہ وہ ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ بھی نہ معلوم ہوتا کہ لکھنے والا کون ہے؟ کیونکہ خط کے اختتام پر لکھنے والے کا نام درج نہیں تھا۔ جی ہاں! آپ کا قیاس درست ہے۔ میں نے القاب و آداب کے بعد سب سے پہلے خط کے اختتام پر نظر ڈالی تھی۔ لیکن اس سے آپ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ مجھے اسی وقت لکھنے والے کا نام معلوم ہو گیا۔ نہیں۔ یہ تو بعد کی بات ہے۔
میں نے کہا۔ "تمھارا خط!" میرے لہجے میں حیرت کا شائبہ تھا۔
"کہہ جو دیا میرا خط ہے"۔ وہ اٹھلائیں۔
اور قبل اس کے کہ میں یہ سوچتے ہوئے کہ حق بحقدار رسید خط اُن کی طرف بڑھاؤں۔ انھوں نے جھپٹ کر خط میرے ہاتھ سے چھلیا بلکہ چھین لیا۔ اور یہ جا وہ جا۔ مگر یہ جا وہ جا کا فعل مکمّل کرنے سے قبل اُنھوں نے رُک کر میری طرف دیکھا۔ اور بولیں۔ "کسی سے کہئے گا نہیں میرے اچھے بھائی جان!"
میں نے کسی سے نہیں کہا۔ مگر اس واقعہ کے کئی ماہ بعد ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ میری خاموشی بے سود ثابت ہوئی۔
ایک رات جبکہ محلّے کا شور و غل قریب قریب ختم ہو چکا تھا۔ یعنی سب لوگ بستروں میں گھسنے والے تھے یا گھس چکے تھے۔ اچانک کچھ ایسی آوازیں میرے کان میں آئیں جن پر نہ کسی ریڈیو پروگرام کا شبہ ہو سکتا تھا، نہ سودا بیچنے والوں کے لحنوں کا۔ نہ میاں بیوی کے جھگڑے کا۔ نہ پڑوسیوں کی لڑائی کا اور نہ آوارہ لڑکوں کی تفریح کا۔ کئی آوازیں تھیں۔ ایک مرد کی، ایک عورت کی، ایک لڑکی کی۔ آہستہ آہستہ میرے ذہن نے نہ صرف ان آوازوں کی سمت کا تعین کر لیا، بلکہ یہ اندازہ بھی لگا لیا کہ ان کے خالق کون ہیں۔ آوازیں نسیّ کے فلیٹ سے آرہی تھیں۔ اور یہ آوازیں نکل رہی تھیں۔ اُس کے والد صاحب اُس کی والدہ اور اُس کے چھوٹے بھائی کے حلق سے۔
میرے فلیٹ کی بالکونی کے سرے پر کھڑے ہو کر اگر اوپر کی طرف دیکھا جائے تو نسیّ کے فلیٹ کی بالکونی کا منظر بخوبی نظر آجاتا ہے۔ میرا مطلب ہے۔ اگر وہاں کوئی منظر ہو تو۔ اس لیے میں دوڑ کر اپنی بالکونی میں آگیا۔ اور اوپر کی طرف دیکھنے لگا۔ اس خاندان کے تین افراد نسیّ، اُس کے والد صاحب اور اُس کی والدہ۔ بالکونی میں تھے۔ نسیّ کو دوا فروش صاحب اور اُن کی اہلیہ پکڑے ہوئے تھیں۔ اور وہ چلّا چلّا کر کہہ رہی تھی۔ "مجھے چھوڑ دو۔ مجھے چھوڑ دو" جہاں میں آسمانی بلاؤں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے والے کتّے کی طرح منہ اوپر کیے کھڑا تھا وہاں سے نسیّ کا بھائی نظر نہیں آرہا تھا۔ مگر اس کی آواز صاف آرہی تھی۔ وہ رو رہا تھا زور زور سے جیسے ڈر گیا ہو۔ سہم گیا ہو۔ آس پاس اور دوسری بلڈنگ فلیٹوں میں سے بھی لوگ اس منظر کو کھڑکیوں میں سے جھانک کر یا کھلے عام بالکنیوں میں کھڑے ہو کر دیکھ رہے تھے۔ ایک بار جو نسیّ نے زور لگایا تو تقریباً اپنے والد اور والدہ کی گرفت سے آزاد ہو گئی اور میرے پیروں تلے سے بالکنی کا فرش کھسک گیا۔ کیونکہ مجھے ایسا لگا کہ گویا وہ بالکنی میں سے چھلانگ لگا کر نیچے سڑک پر گرا چاہتی ہے۔ مگر فوراً ہی دوا فروش صاحب اور اُن کی اہلیہ نے دوبارہ اُسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اور اُس کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ لگا کر۔ یہ میں ٹھیک نہیں دیکھ پایا کہ طمانچہ ماں نے مارا تھا یا باپ نے۔ اُسے گھسیٹتے ہوئے فلیٹ میں لے گئے۔ تھوڑی دیر تک نسیّ کے چیخنے اور چلانے اور اُس کے بھائی کے رونے کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر یہ بھی بند ہو گئیں۔ اور فلیٹوں کی کھڑکیاں ایک ایک کر کے بند ہونے لگیں۔ میں بھی آکر بستر پر لیٹ گیا۔ اور اپنی شریکِ حیات سے اس مسئلے پر تبادلۂ خیالات کرنے لگا۔ کہ آیا مجھے اس وقت نسیّ کے فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہیے یا نہیں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ مناسب وقت نہیں ہے۔ اس لیے 'میں۔' "مجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو" کے زریں مقولے پر عمل پیرا ہوا۔

اور لمبی تان کر سو گیا۔

مگر دوسرے دن ممبئی والے صاحب مجھے زینے پر مل گئے۔ سلام دعا کے بعد یوں گویا ہوئے۔

"رات کا تماشا دیکھا آپ نے بھائی جان؟"

"کیسا تماشا؟" میں نے اُس کے سوال کا مفہوم کچھ سمجھتے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے اظہار لاعلمی کیا۔

"وہی جو اوپر والے مالے میں ہوا تھا۔" ان کے تعلقات انگریزی دوا فروش صاحب سے کشیدہ تھے۔ اس لیے وہ اُن کا نام لینے سے حتی القدور گریز کرتے تھے۔ اور اگر ان کا ذکر آ ہی جاتا تو "اوپر والا مالا" قسم کے اشاروں سے کام چلاتے تھے۔

"جی ہاں۔" میں نے کہا۔ "کچھ شور و غل ہو رہا تھا۔"

"آپ سور و گل بولتے ہیں۔" اُنھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ساری بلڈنگ نہیں سارا محلہ جاگ پڑا تھا۔"

"جی ہاں۔ جی ہاں۔ آواز تو ہم نے بھی سنی تھی۔"

"ضرور سنی ہوگی۔" اُنھوں نے مسکراہٹ کو چہرے کے بقیہ حصّوں پر پھیلاتے ہوئے کہا۔ "بائی بچ گئی۔" اُن کی مراد نسیّ سے تھی۔

میں نے پہلی مرتبہ اُن کی گفتگو میں دلچسپی کا اظہار کیا۔

"کیوں۔ اُسے کیا ہو گیا تھا؟"

"کھُدکُشی کر رہی تھی۔"

"سچ!"

"اور کیا۔ بالکنی پر سے کود رہی تھی۔ میں نے کھُد دیکھا تھا۔ آدمی سے جیاستی لٹک گئی تھی۔"

"مگر کیوں؟"

"یہ اپن کو ٹھیک سے نہیں معلوم۔ سنا ہے کہ عاسکی والی بات ہے۔"

میں نے اُنھیں زیادہ نہیں کریدا۔ کیونکہ اول تو یہ میری فطرت نہیں۔ اور دوسرے مجھے دفتر جانے کی جلدی تھی۔ لیکن سورج ڈھلے نسی کے والد صاحب نے میرے فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ پریشان اور متفکر نظر آرہے تھے۔ کہنے لگے۔ "آپ سے ایک معاملے میں مشورہ کرنا ہے۔"

میں نے کہا۔ "فرمائیے۔"

بولے۔ "کل رات نسیّ خودکشی کا اقدام کر بیٹھی تھی۔"

میں چپ رہا۔

"یہ جو سامنے ماما بلڈنگ ہے نا۔" اُنھوں نے بلڈنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس میں وہ جو سپرنٹنڈنٹ صاحب رہتے ہیں۔ اُن کے صاحبزادے نے اُسے......"

یہاں پہنچ کر وہ ٹھٹھک سے گئے۔ اس لیے میں نے کہا۔ "جی میں سمجھ گیا۔"

میری بات نے وہ مرحلے کرا دیا جس پر وہ ٹھٹھک گئے تھے۔ بولے۔ "بھائی جان آپ ہی بتائیے۔ یہ رشتہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے؟"

جب تک میں اس رشتے کے ناممکن ہونے کی توجیہہ نہ سن لیتا۔ کیا کہتا۔ اس لیے چپ رہا۔

"وہ لوگ پٹھان ہیں۔ اور اگر سید بھی ہوتے تب بھی ہمیں ان کے طور طریقے پسند نہ آتے۔ اور بھائی جان سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ لڑکا ہمیں بالکل پسند نہیں۔ آوارہ ہے۔"

میں "ہوں" کر کے تھوڑی دیر چپ رہا۔ پھر بولا۔ "مگر ظاہر ہے کہ نسی بیٹی کو اس سے بہت گہرا اور بہت مخلصانہ لگاؤ ہے۔ ورنہ وہ اتنا بڑا قدم کیسے اٹھاتی؟"

"یہی تو مشکل ہے۔ ابھی کم عمر ہے۔ بُرے بھلے کی تمیز نہیں۔ جذبات سے مغلوب ہو گئی ہے۔ اگر آپ اسے سمجھائیں تو۔"

"آپ نے سمجھایا۔؟"

"ہم لوگ تو کئی دن سے سمجھا رہے تھے۔ اسی دن سے جس دن اُس نے بلا جھجک اپنی والدہ سے کہہ دیا تھا کہ اس کی شادی اس لڑکے سے کر دی جائے۔ ہمارے تو وہم و گمان میں بھی نہ آسکتا تھا کہ وہ اتنی جرأت کرے گی۔ اور وہ بھی اس عمر میں۔ کل رات یہی سلسلہ جاری تھا کہ یہ اقدام کر بیٹھی۔ اب آپ ہی بتائیے ہم کیا کر سکتے ہیں۔ نہ جانے کون سی اُلّو کی لکڑی پھیر دی ہے۔ اس لونڈے نے میری معصوم بیٹی پر۔ شاید آپ کے سمجھانے سے مان جائے۔"

میں حامی نہ بھرتا تو کرتا کیا۔ "آپ اُس پر زیادتی نہ کریں۔ میں موقع دیکھ کر اس سے گفتگو کروں گا۔" زیادتی نہ کرنے کی بات میں نے اس لیے کی تھی کہ وہ دورانِ گفتگو میں مجھے بتا چکے تھے کہ کل رات سے اُنھوں نے نسی کو ایک کمرے میں بند کر رکھا ہے۔

نسی سے گفتگو کرنے کا موقع مجھے تین چار دن بعد ہی مل گیا۔ موقع خود اسی نے فراہم کیا۔ یعنی اس بارے مجھ سے صلاح و مشورہ کرنے آ دھمکی ترشے ہوئے بال، تنگ شلوار، تنگ قمیص، آنکھوں میں سرمہ، ہونٹوں پر ہلکی سی لپ اسٹک، پہلے تو ذرا جھجکی۔ پھر بولی۔ "بھائی جان آپ ہمارا ایک کام کر دیں تو ہم آپ کی غلامی لکھ دیں۔"

"فرمائیے۔" میں اُسے چھیڑنے کے لیے ہمیشہ اُس سے نیم سنجیدہ لہجے میں گفتگو کرتا ہوں۔ آخر میری بیٹی سے صرف چند سال ہی تو بڑی ہے۔ "میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

"ہٹائیے بھی بھائی جان۔ آپ کو تو ہر وقت مذاق سوجھتا ہے۔"

"ارے بھئی۔ اس میں مذاق کی کیا بات ہے۔ میں خدمت کے لیے حاضر ہوں۔"

"جائیے، ہم آپ سے نہیں بولتے۔" اور اُس نے سچ مچ منہ پھلا لیا۔

"ارے پگلی۔ ناراض ہو گئی۔" میں نے اُس کے رخسار پر ہلکے سے تھپڑ لگاتے ہوئے کہا۔

وہ مسکرا دی۔ "آپ بابا سے بات کیجیے۔" وہ اپنے باپ کو بابا کہتی ہے۔

"میں تمھارے بابا سے اکثر بات کرتا ہوں۔"

اُس کا منہ پھر پھولنے لگا۔ تو میں نے فوراً لہجہ بدل کر کہا۔ "اچھا بھئی مذاق بند۔ کہو کیا کہنا چاہتی ہو۔"

اُس کی فرمائش صرف اتنی تھی کہ میں اُس کے باپ پر اپنا اثر ڈال کر اُن سے اس رشتے کی منظوری حاصل کر لوں۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ اور اُس کا دلکش چہرہ بے حد سنجیدہ ہو گیا تھا۔ مجھے اچانک احساس ہوا کہ میرے سامنے ایک رس سے بھری چلبلی شاخ نہیں، بلکہ ایک خشک ٹہنی ہے۔ جسے اگر زیادہ جھکانے کی کوشش کی گئی تو ٹوٹ جائے گی۔ جھکے گی نہیں۔ اُس کی آواز میں ارادے کی پختگی تھی۔ اور اُس کے لہجے میں لگن کا کرب تھا۔ اس لڑکی کو سچی محبت ہے۔ میں نے سوچا۔ اور یکلخت اس وعدے کو بھول گیا جو میں نے اُس کے باپ سے کیا تھا۔ اُس نے مجھے جیت لیا تھا۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ کس طرح اس کے باپ سے بات کروں کہ وہ مان جائیں۔

میں نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "تم فکر نہ کرو نسی۔ میں ضرور تمھارے والد سے بات کروں گا۔"

"وعدہ؟" وہ ابھی تک سنجیدہ تھی۔

"پکا وعدہ" میں بھی سنجیدہ ہوگیا تھا۔
وہ مسکرائی۔ پھر ہنسنے لگی۔ "میرے اچھے بھائی جان!"
"میرے اچھے بھائی جان" میں نے اُس کی نقل کی۔
وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور مٹک کر چل دی۔
"مگر......"
وہ رک گئی اور مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔
"مجھے کیا دو گی؟"
"کیا دوں گی!"
"ہاں بھئی۔ حق محنت"
اُس نے لمحے بھر رُک کر سوچ کر کہا۔ "منہ مانگا انعام" اور یہ جا وہ جا۔
اتفاق ایسا ہوا کہ نسیّ سے وعدہ کرنے کے بعد کئی دن تک میں اس کے باپ سے بات نہ کر سکا۔ کسی دن مجھے دفتر سے آنے میں دیر ہو گئی کسی دن انھیں۔ کسی دن اُن کے ہاں مہمان آگئے۔ کسی دن میرے ہاں۔ کسی دن وہ باہر چلے گئے۔ کسی دن میں۔ اس عرصے میں کئی مرتبہ نسیّ سے مڈبھیڑ ہوئی۔ اور ہر دفعہ اس نے مجھے میرا وعدہ یاد دلایا۔ شروع شروع میں تو وہ شاید میرے وعدہ پورا نہ کر سکنے کے اسباب کو قبول کرتی رہی۔ مگر بعد میں مجھے کئی بار شبہہ ہوا کہ وہ مجھے جھوٹا سمجھ رہی ہے۔ یا یہ سمجھ رہی ہے کہ میں اُسے ٹال رہا ہوں۔
"دیکھیے بھائی جان۔ آپ وعدہ خلافی کر رہے ہیں" اُس نے ایک دن منہ پھلا کر کہا۔
"نہیں نسیّ۔ موقع نہیں ملا۔ بس کچھ دن اور انتظار کرو"
اُس کا منہ بدستور پھولا رہا۔ اور اُس کے ماتھے پر فکر کی شکنیں بدستور پڑی رہیں۔ تو میں نے اُسے چھیڑا۔ "اور میرا انعام؟"
پھر ایک دن جب کہ میری شریک حیات مع میرے بچوں کے اپنی بہن کے گھر گئی ہوئی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ چھٹی کا دن تھا۔ نسیّ میرے فلیٹ میں آن دھمکی۔ میں لیٹا ہوا تھا۔ آکر میرے سامنے کھڑی ہوگئی۔
میں نے کہا۔ "بیٹھ جاؤ"
وہ پلنگ پر میرے پاس بیٹھ گئی۔ چپ تھی۔ اور مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
"کیا بات ہے؟" میں نے اُس کی طرف کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔ "مجھے ایسے کیوں گھور رہی ہو"
وہ پھر بھی چپ رہی۔
"کیا چپ کا روزہ رکھا ہے"
اس کا سکوت پھر بھی نہیں ٹوٹا۔
"مجھ پر رعب ڈال رہی ہو کیا؟"
وہ اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔
"آپ نے انعام مانگا ہے۔ حق محنت۔!"
"مانگا تو ہے"

"اور جب تک آپ کو انعام نہیں مل جائے گا۔ آپ میرا کام نہیں کریں گے ۔؟"
ظاہر ہے کہ اس کا خیال بالکل غلط تھا۔ مگر میں نے اُسے چھیڑنے کے لیے کہا۔ "بالکل درست!"
"اسی لیے آپ ٹال مٹول کر رہے ہیں؟"
"بالکل اسی لیے۔"
"ہوں۔"
اس طویل "ہوں" کے بعد لمحے بھر خاموشی رہی۔ اور پھر ہنستی ہنستی بولی۔ "میرے پاس آپ کو دینے کے لیے اور تو کچھ نہیں سوائے"
وہ رُکی۔ اور اس لمحہ توقف میں اُس کا دایاں ہاتھ اُس کی پوشاک کے ایک گرہ دار بند کی طرف بڑھا۔ اور پھر اُس نے جملہ مکمل کیا۔
"سوائے اس کے۔"
اور بمبئی والے صاحب کے فلیٹ سے کسی نئے فلمی گانے کی فلک شگاف آواز آ رہی تھی۔
"اے محبت زندہ باد!"

واجدہ تبسم

میرا رسالہ۔ کراچی

پچھتاوا!

عام طور پر ہوتا یوں ہے کہ جب باپ کا انتقال ہو جاتا ہے تو اولاد کے لیے زندگی کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ ہمارا حال ساری دنیا سے الگ تھا میرے ابا لڑکیوں کی تعلیم کے سخت مخالف تھے، امی جب تک زندہ رہیں ہم سب بہنیں اتنی چھوٹی چھوٹی تھیں کہ بات کرنی بھی نہ آتی تھی۔ اسکول جوائن کرنے کا سوال ہی نہ اُٹھتا تھا۔ مگر امی کی موت کے بعد جب اسکول میں داخل کروانے کی عمر ہوئی تو ابا نے صاف کہہ دیا کہ وہ اپنی ایک بھی بٹیا کو اسکول نہ بھجوائیں گے۔ قسمت نے ہمارے ساتھ ہر زیادتی روا رکھی تھی۔ امی کی موت کے دو سال بعد ابا بھی ہم آٹھ بہن بھائیوں کو چھوڑ کر چلتے بنے۔ اُس وقت میری عمر تین سال تھی۔ اور میں نے ابھی ابھی بات کرنی سیکھی تھی۔

امی، ابا کے بعد ہم بہن بھائیوں کی تعلیم و تربیت کا بار تمام تر نانی اماں پر آ پڑا۔ وہ گاؤں کی رہنے والی تھیں۔ مگر ہم لوگوں کی خاطر اپنی جاگیریں چھوڑ کر شہر (امرادتی) آ بسی تھیں۔ خود پڑھی لکھی نہ تھیں۔ مگر تعلیم کی اہمیت اور ضرورت کو سمجھتی تھیں۔ انھوں نے لوگوں کی مخالفتوں کے باوجود بھی ہم تینوں بہنوں کو اسکول میں داخل کرا دیا۔

۱۹۴۷ء تک ہماری تعلیم بڑی باقاعدگی سے ہوتی رہی۔ پھر ملک تقسیم ہوا۔ اور ہم بے گھرے ہو گئے۔ یہ الگ داستان ہے کہ ہم کس طرح حیدرآباد آئے۔ اور کن کن کٹھنائیوں سے دوچار ہوئے۔ مجھے تو اپنی تعلیم کے بارے میں کچھ سنانا نہیں ہے۔ یہاں میرا مقصد اپنے ماضی اور اپنی غربت کا دونا رونے سے نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں اس وقت جو واقعہ لکھنے بیٹھی ہوں اُس میں غریبی کا ذکر اپنے آپ چلا آیا ہے۔

حیدرآباد آ کر ہم بہنیں سٹی گرلز ہائی اسکول میں داخل ہو گئیں۔ چھوٹی بہن افروز بہت چھوٹی تھی۔ اس لیے بچپن ہی سے اُس کی تربیت کا ذمہ میری نانی اماں کی چھوٹی بہن نے لے لیا تھا۔ بہرحال ہم تینوں بڑی بہنیں یہاں پڑھنے لگیں۔ گھر چھوڑنے میں ہمارا بہت خسارا ہوا تھا۔ اور حالت جو پہلے ہی تباہ تھی اور بھی تباہ ہو کر رہ گئی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اب زندگی کی ضروریات پوری کرنے کا مسئلہ بھی ناممکن سا معلوم ہونے لگا تھا۔ ایسے میں تعلیم تو ظاہر ہے ذیلی چیز بن جاتی ہے۔ مگر نانی اماں نہیں چاہتی تھیں کہ ہماری تعلیم ادھوری رہ جائے۔ اور لوگ کہیں "نانی خود جاہل تھیں، بیٹی کی اولاد کو بھی جاہل رکھا" اس طعنے سے بچنے کی خاطر نانی اماں نے جو جو مصیبتیں جھیلیں ہیں۔ وہ مجھے خون رُلوانے کے لیے کافی ہیں۔!!

ہونے کو اسکول میں داخل ہو تو گئے، مگر دلوں پر جو گزرتی تھی خدا ہی جانتا تھا، یا پھر ہمارے اپنے دل۔ میں کچھ ضرورت سے زیادہ حساس واقع ہوئی ہوں۔ اپنی آنکھوں پر مجھے بارہا جھرنوں کا گمان ہوتا ہے، جو بہے ہی جاتے ہیں۔ میں شاید کبھی نہ لکھ سکوں کہ ان دنوں یہ جھرنے کس قدر روانی سے بہتے تھے۔

یہاں اسکول میں ذہین لڑکیوں کی فیس معاف کر دی جاتی تھی اور وظیفہ بھی ملتا تھا۔ اگر کسی گھر سے تین چار بہنیں، ایک ساتھ بس میں آیا کرتیں تو ایک بہن کا بس کا کرایہ بھی معاف ہو جاتا تھا۔ ذہین ہونے کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ میری فیس معاف ہو گئی تھی۔ اس سے کچھ سہولت ہو گئی۔ مگر بس کا کرایہ کم نہ کیا گیا۔ حالانکہ ہم تین بہنیں ایک ساتھ آیا کرتی تھیں۔

یہ پتہ نہ چلا کہ کس وجہ سے کرایہ کم نہ ہوا تھا۔ غالباً اسکول کے مصارف کچھ بڑھ گئے تھے۔ اور طالبات کی یہ سہولت ختم کر دی گئی تھی۔

جس زمانے میں ہم اسکول جاتے تھے جغرافیہ پڑھانے والی ایک ٹیچر تھیں —— خدیجہ آپا —— یوں اُن کی اصل کلاس تو جغرافیہ ہوتی تھی۔ مگر وہ اُردو تواریخ بھی پڑھایا کرتی تھیں۔ میری اُردو ساری لڑکیوں سے اچھی اور خوبصورت ہوا کرتی تھی۔ (خدیجہ آپا ہی کے الفاظ میں) وہ مجھے اور میری بہنوں کو بہت چاہتی تھیں۔ اُن کی یہ بات میں سمجھتی ہوں بجا بھی تھی۔ کیونکہ جب ہم پہلے پہل اسکول میں داخل ہوئے تھے —— تو "مہاجرین" کہہ کر ہمارا مذاق اُڑایا جاتا تھا۔ ہم پر طعنے کیے جاتے تھے۔ اور لڑکیاں یہ کہتی تھیں کہ ان مہاجروں کی وجہ سے دیکھ لینا۔ اب کے اپنے کلاس کا رزلٹ بہت گر جائے گا۔ پتہ نہیں ان کی اس بات میں کہاں تک سچائی تھی۔ مگر ہوا یوں کہ جب نویں کلاس کا امتحان ہوا اور نتیجے کی رپورٹ ملی تو خدیجہ آپا نے پرنسپل کے پاس کھڑے کھڑے کہا تھا۔

"عام خیال تھا کہ مہاجرین لڑکیاں کلاس کے نام کو بٹہ لگا دیں گی۔ مگر بڑے دُکھ کی بات ہے کہ اب کے سب سے اونچے مارکس اِن مہاجرین لڑکیوں ہی کے ہیں۔"

خدیجہ آپا نے رپورٹ میرے ہاتھ میں دی تو میں نے دیکھا کہ میرے نمبر سب سے زیادہ تھے!

ظاہر ہے خدیجہ آپا کی چاہت بے جا نہ تھی۔ ہم ہمارے مجبور اور بے بس چہروں سے وہ یہ اندازہ بھی لگا چکی تھیں کہ ہماری حالت اچھی نہیں ہے۔ اور اس بات پر وہ کڑھتی بھی تھیں۔ ایک دن اُنھوں نے ذرا رکتے رکتے کہا۔

"واجدہ، فی الحال تو اسکول کے مصارف زیادہ ہو جانے کی وجہ سے کرایے میں کمی نہیں ہو سک رہی ہے۔ اگر تم کہو تو میں تمھارا کرایہ اپنی طرف سے بھر دیا کروں۔"

مجھے ایسا لگا کہ گویا میں زمین کے اندر دھنس گئی ہوں۔ میں آپ سے بتاؤں۔ میرا باپ شہر کا سب سے بڑا وکیل تھا۔ جس نے فیس کے طور پر سونے کی اینٹیں وصول کی تھیں۔ تین چار سالوں میں کئی لاکھ روپیہ کمایا تھا۔ اور وہ سیّد تھا۔ نانی اماں پانچ گاؤں کی مالک تھیں۔ میری اماں جہیز میں ڈھیروں سونا لائی تھیں۔ میں اس وقت ساڑھے گیارہ برس کی تھی۔ مگر کس قدر سمجھدار، حسّاس اور غیور —— حماقت کی حد تک!

میں نے کچھ غصّے اور حقارت سے خدیجہ آپا کو دیکھا۔ شاید وہ یہ نہیں سوچتیں کہ میں کس قدر بڑے گھرانے کی بیٹی ہوں۔ مجھے اکدم اپنی نانی اماں کا خیال آیا۔ ایک بار میرے ماموں نے مجھے ایک پیسے کی برف کی گڑیا دلا دی تھی۔ میں برف کی لال گڑیا ہاتھ میں لیے گھر میں آئی تھی تو نانی اماں نے چھوٹتے ہی پوچھا تھا۔

"یہ برف کہاں سے لائی۔؟"

میں نے جب ماموں کا نام بتایا تو نانی اماں جلتا شعلہ بن گئیں۔ انھوں نے برف کی گڑیا تو میرے ہاتھ سے چھین کر پھینک دی اور خود جوتی لے کر میری اتنی مرمت کر دی کہ کئی دنوں تک میری پیٹھ کے زخم مندمل نہ ہو سکے۔

"تجھے معلوم ہے کسی کا پیسہ نہیں لیا کرتے۔ تیرا باپ سیّد تھا۔ تو اتنے بڑے گھرانے کی لڑکی۔ تجھے شرم نہیں آتی۔ کسی کے آگے ہاتھ پھیلاتے؟"

میں نے آنسو روکتے ہوئے کہا تھا۔ "نانی اماں میں نے اُن سے مانگا تھوڑی تھا۔ وہ تو انھوں نے خود ہی دیا تھا۔"

"تو نے لیا ہی کیوں ——؟" اور انھوں نے پھر سے پٹائی شروع کر دی تھی۔

میں نے ایک دم زور سے سرہلا کر انکار کر دیا۔

"نہیں نہیں، ایسا آپ سوچیے بھی نہیں۔" مجھے اچانک ہی اپنا سبب ہو نا اس قدر شدت سے یاد آیا کہ میں نے بڑی ڈھٹی سے اُنہیں ڈانٹ دیا۔

اُن کا چہرہ ذرا سا ہو کر رہ گیا۔ مگر جیسے خود کو سنبھال کر بولیں۔

"مجھے تمہارا دل دکھانا تو نہیں ہے واجدہ۔ میں نے تو آگے ہی ڈرتے ڈرتے کہا تھا۔"

بات آئی گئی ہو گئی۔

اگلا مہینہ آیا تو فیس کی آخری تاریخ گزر گئی۔ ہماری فیس خدیجہ آپا ہی وصول کیا کرتی تھیں۔ سب لڑکیوں نے اپنی اپنی فیسیں بھر دیں مگر ہماری فیس نہ گئی۔

"تمہاری فیس ۔۔؟" ایک دن خدیجہ آپا نے کلاس سے جاتے جاتے پوچھا۔

"جی ۔۔ جی ۔۔" میں ہکلا کر رہ گئی۔ مگر آنسوؤں نے بات پوری کر دی۔

پھر دو ایک دن بعد گاؤں سے روپیہ آیا تو ہم نے خوشی خوشی اپنی فیس بھر دی۔ مگر ہمارے ساتھ یہ مشکل تھی کہ پیسہ جتنی تیزی سے آتا اُسی تیزی سے ختم بھی ہو جاتا اور ہر ماہ پہلے سے بُری حالت ہو جاتی۔ اور بس کا کرایہ الگ ڈراتا رہتا۔

ایک دن جب میں انٹرول میں نماز پڑھنے جا رہی تھی کہ گملوں کے پاس سے گزرتے گزرتے ایک دم خدیجہ آپا نے روک لیا۔ ان کے چہرے پر خوشی چمک رہی تھی۔

"ارے واجدہ سنو ۔۔۔ اب تمہارا بس کا کرایہ معاف ہو جائے گا۔"

میں نے خوشی سے اُن کی طرف دیکھا۔ "سچ ۔۔۔؟"

"ہاں ۔" وہ بازو سے کاغذ نکالتی ہوئی بولیں۔ "آج ہی یہ کاغذات ہمیں ملے ہیں۔"

بس کا کرایہ آدھوں آدھ کم ہو گیا۔ اس طرح ہمیں بہت آسانی ہو گئی۔ اب اسکول آتے شرم نہ آتی تھی۔ اور غریبی کا احساس جی کو کچھ کہنے نہ دیتا تھا۔

ہم اطمینان سے پڑھتے رہے اسکول جاتے رہے۔ اب فیس ہوا بن کر نہ ڈراتی تھی۔ اور بس کا کرایہ دیتے رونا نہ آتا تھا۔ پھر اس دن کے بعد سے خدیجہ آپا کی ہمت نہ پڑتی تھی، کہ پیسوں کے متعلق مجھ سے کسی قسم کی بات کرتیں۔ اسی لیے میرا دل خدیجہ آپا کی عزت پہلے سے دونی کرنے لگا تھا۔ کہ وہ اتنی بڑی ہو کر، میری استاد ہو کر بھی کس نرمی سے میری بات مان گئی تھیں۔ اور ذرا تو غصہ نہ ہوتیں ۔۔!

پھر ایک دن خدیجہ آپا نے دُکھی مسکراہٹ کے ساتھ بتایا کہ اُن کا تبادلہ کسی اور اسکول میں ہو گیا ہے۔ اور لڑکیوں کے دل کا حال مجھے نہیں معلوم۔ مگر مجھے اس خبر سے بڑا دکھ ہوا۔ وہ نہ صرف ایک اچھی ٹیچر تھیں بلکہ ایک شفیق اور مہربان ہستی بھی تھیں جن کی بزرگی میں دوستی کی جھلک بھی ملتی تھی۔

خدیجہ آپا چلی گئیں۔ اُن کی جگہ دوسری ٹیچر خورشید آپا آگئیں۔ اب ہیڈ مسٹرس بھی ادلا بدلی ہو گئی۔ اور اس طرح اُردو ہیڈ مسٹرس کے نصیب میں گئی۔ اور فیس بھی وہی وصول کرنے لگیں۔

خدیجہ آپا کے بعد جب پہلی بار فیس اور کرائے کی بات نکلی تو ہیڈ مسٹرس نے کہا۔

"تم نے اب تک اپنا بس کا کرایہ نہیں دیا ہے۔ یاد ہے۔"

میں اپنی سیٹ پر کھڑے ہو کر بولی :

" کرایہ ــــ کیسا کرایہ ــــ کرایہ تو معاف کر دیا گیا ہے۔ ہم نے اِدھر پچھلے کئی مہینوں سے کرایہ نہیں دیا ہے"

ہیڈ مسٹریس نے کچھ حیرت سے اور کچھ اُلجھن سے میری طرف دیکھا ۔ پھر خاموش رہ گئیں۔

اس واقعہ کو کتنے دن گزر گئے ؟ میں نویں سے نکل بھی گئی ـــ بی اے ہو گئی۔ ایم اے کی تیاری کرنے لگی۔ کبھی خدیجہ آپا سے ملنا نہ ہوا۔ ایک بار نمائش میں وہ ملیں۔ میں جلدی جلدی قدم اُٹھاتی اُن کے پاس گئی۔ سوچا تھا کہ اُن سے بہت کچھ کہوں گی۔ اُن کے سامنے عقیدت سے سر جھکا دوں گی۔ اپنی گستاخیوں اور کوتاہیوں کی معافی مانگوں گی کہ میں آپ کو کیا سمجھتی تھی۔ اور آپ کس قدر عظیم ـــ کتنی اونچی نکلیں ـــ مگر جب میں اُن کے قریب پہنچی تو وہ گھبرا سی گئیں۔ شاید انھوں نے سوچا ہو کہ اب جب کہ اُن کی چوری کھل گئی ہے۔ میں اُن کو تاڑنے آ گئی ہوں۔

میں نے اُنھیں سلام کیا۔ اُنھوں نے مسکرا کر، کچھ گھبرا کر کہا ـــ " اچھی تو ہو ـــ" پھر ایک دم اپنی ساتھی سے مڑ کر بولیں ۔

" جلدی چلو رات ہو رہی ہے ۔"

میں نے دیکھا کہ وہ مجھ سے کترا رہی ہیں۔ پہلو بچا رہی ہیں۔ انھوں نے مجھے خدا حافظ کہا۔ اور تیز تیز قدم اُٹھاتی چلی گئیں۔ میرے دل کا سارا درد میری آنکھوں میں سمٹ آیا۔ اور میری آنکھیں جھر جھر برسنے لگیں۔

رحمان مذنب ادبی دنیا۔ لاہور

حسینۂ فلک

دُور مغرب میں چوپ ساگر کی سکون آفریں ملہاریں آرہی تھیں۔ یہ چنگاریاں اُچھٹ رہی تھیں لیکن یہ چنگاریاں کب تھیں ؟ اُلمپس کی لازوال بلندیوں سے یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے گلاب کی شنگرفی پتیاں رقص کر رہی ہیں۔ فانیوں کے لیے اس میں تسکین کا سامان پنہاں تھا۔ یہ رقص شاید اُس تکان کو دور کرنے کے لیے تھا جو دن کی مصروفیت کے بعد زمین والوں کو لاحق ہوتی ہے لیکن اُلمپس کی لافانی ہستیاں اس تکان سے ناآشنا تھیں۔ وہ تو ایک ایسی گردش حل کی خوگر تھیں جسے رات اور دن سے سروکار نہ تھا جو زمانی و مکانی فاصلوں سے ماورا تھی۔ سرِ شام گلابی چنگاریوں کا یہ رقص اُن کی تخلیق کا کرشمہ تھا اس پر وہ نازاں تھے۔

تکان دور کرنے کے بعد لوگ پھر خود کو ہنگاموں کے سپرد کر دیتے۔ ہنگامے کے بغیر وہ زندگی کو چوبِ خشک کہتے اور اسے اُس اَلاؤ کے لائق بھی نہ سمجھتے جو ربّ الشمس کے اعزاز میں روشن کیا جاتا اور جس پر مقدس سانڈ جلائے جاتے۔ زندگی وہی تھی جو آگ سے لبریز اور حرکت سے آراستہ ہوتی۔

خداؤں کے ایوانوں میں گہما گہمی کے آثار ہویدا ہوئے۔ اُلمپس کی پاکیزہ چوٹیوں پر جشن کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ ایسی ہی تیاریاں، ایسے ہی ہنگامے اور ایسے ہی جشن اہلِ یونان کا بھی چلن تھے۔ ان کے معمولات اپنے معبودوں کے معمولات سے مختلف نہ ہوتے۔ وہ ہر قیمت پر اپنی زندگی کو اپنے معبودوں کی زندگی سے ہم آہنگ اور ہم رنگ رکھتے۔ یہی اُن کے جینے کا ڈھنگ تھا اور یہی جینے کا مقصد۔

اس وقت یہ فانی انسان تخیل و تصوّر کی وسعتوں میں رفیع الشان اُلمپس کو سمیٹے بیٹھے تھے۔ اور وہی کچھ کرنے کو تھے، ان کے معبود جس کا تہیّہ کیے ہوئے تھے بلکہ سچ تو یہ ہے۔ کہ خدا وہی کچھ کرتے جو اہلِ یونان کرتے کیونکہ سب سے پہلے انہی نے اپنی شکل و صورت پر خوش اندام خدا تراشے، یہ ان کی صداقت پرستی، صاف گوئی اور حقیقت پرستی کا کمال تھا کہ انہوں نے نہایت بے باکی اور کشادہ دلی سے اپنے خداؤں کو اپنا سا چلن دیا۔ جہاں انہیں اپنے نیک اوصاف دیے وہاں اپنی خامیاں اور کوتاہیاں بھی تفویض کیں۔ وہ خود بھی چھوٹے پیمانے پر خدا تھے چنانچہ انہوں نے اپنے لیے اپنے جیسے بڑے پیمانے پر خدا بنائے۔ ان کا ہر معبود ہر اعتبار سے مکمل ہوتا۔ انہوں نے علیحدہ طور پر ابلیس تراشنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ انہوں نے اِن خداؤں کو اپنا سا معاشرہ بھی دیا۔ تاکہ وہ انہی کی طرح زندگی بسر کریں۔

تمام خدا نہایت وجیہہ و شکیل اور خوبصورت تھے۔ ایک صنّاع دیوتا ہی بدشکل رہ گیا۔ لیکن وہ بھی ظاہر میں، وہ عالی دماغ تھا اور بے مثال ہنرمند۔ اس کے فنی کمال اور ذوقِ جمال کا جواب نہ تھا۔ یوں عدمِ توازن جاتا رہا۔

خداؤں کا ابدی مسکن ۔ اُلمپس قابلِ رشک تھا۔ لوگ اُسے ہر وقت اپنے دل میں سمائے بسائے رکھتے تھے۔ اور اس کے خیال سے اپنے خوابوں کو آراستہ پیراستہ کیے رکھتے۔ فلک شگاف اُلمپس کائنات کا بلند ترین مقام تھا۔ ویسے یہ ہموار اور دائرہ نما مقام زمین کا مرکزی نقطہ تھا۔ زمین کا طبق دو حصّوں میں بٹا ہوا تھا۔ اس کے بیچوں بیچ بحیرۂ روم مغرب سے مشرق کو بہتا۔ زمین کو چاروں طرف سے ایک عظیم دریا جو سدا پرسکون رہتا تھا محیط کیے ہوئے تھا۔ ندی نالے اس میں دنیا بھر کا پانی سمیٹ لاتے لیکن پھر بھی اسے برہم ہونا نہ آتا۔ اور یہ تلاطم سے ناآشنا رہتا۔

زمین کے شمال سے زبردست ہوائیں آتیں اور اُلمپس کے حوصلہ مند عقیدت والوں کو ٹھٹھرا جاتیں۔ کوئی اس شمال تک نہ پہنچ پاتا جہاں کے لوگ بے حد خوش نصیب تھے۔ نہ بوڑھے ہوتے، نہ بیمار، جنوب میں حبشہ تھا۔ یہاں کے باسی بھی خوش نصیب تھے۔ ان پر خدا اس حد تک مہربان تھے کہ وہ کبھی المپس چھوڑ کر اہلِ حبشہ کے یہاں چلے جاتے ان کی قربانیوں اور ضیافتوں میں شرکت فرماتے۔

بہترین زمین مغربی کنارے پر واقع تھی۔ اور پرسکون ابدی دریا کے کنارے سے متصل۔ یہیں وادیٔ ایلیزیم یعنی جنت تھی جس میں مسرت یافتگان کے جزیرے تھے۔ المپس کے خدا جن فانیوں پر کرم کرتے انہیں موت کا ذائقہ چکھائے بغیر یہاں پہنچا دیتے۔ یہاں آکر فانی بقائے دوام پاتے۔ اُلمپس کا ہر عقیدت مند اس سرزمین میں پہنچنے کی آرزو کرتا۔

سحر، سورج اور چاند دریائے عظیم میں سے طلوع ہوتے۔ خدا بہ نفس نفیس انسانوں کو روشنی مہیا کرتے۔ ستارے بھی یہیں سے طلوع ہوتے۔ ربّ الشمس اپالو کشتی میں بیٹھ کر عظیم دریا میں پہنچتا۔ اور روشنی کی کرن کلیوں سے دن کا آغاز فرماتا۔

دن تمام کرنے کے بعد ربّ الشمس اپنے درخشندہ رتھ میں بیٹھ کر فلکی قیام گاہ پر لوٹ آیا۔ رُت دیویوں نے بادلوں کے دروازوں پر خیر مقدم کیا۔ کبھی یہ رُت دیویاں آزاد تھیں۔ قدیم یونانی انہیں موقر ترین خیال کرتے۔ لیکن پھر جب خدائے زیوس کا کنبہ برسرِ اقتدار آیا، تو رُت دیویاں نئے خداؤں کے تابع ہو کر رہ گئیں۔ اب وہ پھاٹکوں پر متعین رہتیں۔ وہ ان پھاٹکوں کو کھولتیں، موندتیں، یوں تو المپس دنیا کی طرح موسمی گردش میں مبتلا نہ تھا۔ تاہم دنیا کے لیے موسموں کا اہتمام یہیں سے ہوتا۔

المپس امورِ کائنات کے انتظام کا صدر دفتر تھا۔

ربّ الشمس برق رفتاری سے اپنے ایوان میں داخل ہوا۔ ربّ الشمس خدائے زیوس کا محبوب پسر تھا۔ اور پرانے خداؤں کے معبودوں پر قبضہ جمانے میں نہایت کامیابی سے عزم و استقلال کا مظاہرہ کر چکا تھا۔ اس کا ایوان باقی خداؤں کے ایوانوں کی طرح فلک بوس ستونوں پر کھڑا تھا۔ پورا ایوان، سونے، چاندی اور جواہرات سے جگمگا رہا تھا۔ اس کی چھت ہاتھی دانت کی تھی۔ اور دروازے چاندی کے۔ دروازوں پر غیر مرئی پردے آویزاں تھے۔ جس کا لمس تازہ پھولوں کی مہک سے رچی ہوئی ہوا کے لمس سے بھی زیادہ لطیف تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ خام مال سے زیادہ مرصع نگاری اور صنعت گری قابلِ تعریف اور قابلِ دید تھی۔ ہر تعمیر میں صنّاع دیوتا، ہیفیس طس کی تخلیقی ذہانت کارفرما تھی۔ شاید یہ حسنِ ذوق کے طفیل تھا۔ کہ افرو دائتی جیسی حسین دیوی اس کی شریک حیات ہوئی اور یوں اسے اپنی بدنصیبی کا صلہ ملا۔ صنّاع دیوتا نے دیواروں پر زمین سمندر اور آسمان کی تصویریں کھینچیں، سمندر میں خاص طور پر دلفریبی پیدا کی۔ اسے جل پریوں کے حسن سے چمکایا، دمکایا۔ کچھ جل پریوں کو لہروں پر رقص فرما دکھایا۔ اور کچھ کو غرقاب چٹانوں پر جلوہ فگن کیا۔ یہ جل پریاں زمین سے متعلق تھیں۔ اور اپنے عہد زریں میں دھرتی دھرم کی رو سے بڑا اونچا مقام رکھتیں۔ فلک نشینوں کو کھٹکیں لیکن کیا کیا جاتا۔ ادھر زمین پرستوں کی طلب تھی۔ وہ ان پر دیوانہ وار فدا تھے۔ اور اُدھر ربّ البرق والرعد کا جمالیاتی ذوق اس حد تک متاثر ہوا کہ وہ انھیں گاہے بہ گاہے المپس پر آنے کی دعوت دیتا۔ وہ انہیں اپنے کنبے میں شریک تو نہ کر سکا اور نہ انہیں اپنے عزیزوں کے ہم مرتبہ کر سکا تاہم انہیں ثانوی درجے پر لے آیا وہ المپس کے خداؤں کا دلآویز کھلونا بن گئیں۔ ان ہی کے عکس نے ہی فیس طس کے موقلم کو حرکت دی اور نقش آب بن گئیں۔

الغرض المپس کے ایوانوں کے معمار صنّاع دیوتا کی ہنرمندی نے ہر گوشے کو نکھار سنوار دیا۔

فلکی خداؤں کی دلفریب بستی میں ہر شب آرزوؤں کے فانوس جلتے، جذبوں کی جوالا مکھی بھڑکتی۔ خدا اپنی ہی آتش رواں اور دلکشی سے آسمانوں کو جگمگاتے، کہکشائیں سلگاتے، کائنات کی انجمنیں گرماتے اور ستاروں کے راستے روشن کرتے۔

ہر شب المپس پر جشن منایا جاتا، ہر شب مسرتوں کی جھڑی لگتی۔ آج بھی یہی کیفیت تھی۔ سونے، چاندی اور زمرد کے کنول کٹوروں کے غباروں کی مانند فضا میں آویزاں تھے۔ ان میں تیز خوشبو والی شراب لبالب بھری تھی شراب میں گلاب اور چنبیلی ادھ کھلی کلیاں اور پھول تیر رہے تھے۔ ایک عجیب دغریب قسم کی مہک اُٹھ رہی تھی۔

زمین اپنے دامن میں شہروں اور قصبوں کو سموئے ہوتی تھی۔ اس کے مقابل فلک جاہ و جلال دکھا رہا تھا۔ زمین اور آسمان دونوں آرزوؤں کی تماشاگاہ تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ آسمان و زمین کبھی بھی آرزوؤں سے خالی نہ رہے آدمی کے جذبوں اور خیالوں کی حرارت ہر وقت اور ہر کہیں فروزاں رہی۔

آج شب ایک تقریب خاص تھی۔ چنانچہ صف اوّل کے تمام خدا سرِ شام ہی گھر آ گئے۔ اور کائنات چھوٹے خداؤں کے حوالے کر آئے یہ چھوٹے خدا کیکر کے نیفر ٹھہرے، اپنی بساط کے مطابق کاروبارِ حیات سنبھال سکتے۔ بڑے خداؤں کے نافذ کئے ہوئے آئین کو زیر و زبر کرنے سے یکسر قاصر تھے۔ رات کے وقت چھوٹے خداؤں کو کچھ اس لیے بھی اختیار مل جاتا۔ کہ بالعموم دنیا کا کام ہلکا ہو جاتا۔ اندھیرے زمین کو چاروں طرف سے گھیر لیتے، نیند کا نشہ خلاؤں سے تیرتا تیرتا زمین پر نازل ہوتا۔ اور اس کی رگ و پے میں سرایت کر جاتا۔ گو یونان کے منچلے اور مہمات کے خوگر لوگ رات کو دیر تک جشنِ شراب مناتے اور یوں گویا فلکی خداؤں کی پیروی کرتے۔ تاہم نیند سے مفر نہ تھا۔ ویسے دن کی بہ نسبت رات کی ہنگامہ خیزیاں سبک رنگ اختیار کر لیتیں اور حرکت و حرارت سے معمور دنیا سمٹ سکڑ کر دم لینے لگتی۔

رات ہوتی کہ دن ہوتا لوگ اپنی زندگی کو اپنے خداؤں کی زندگی سے ہم آہنگ رکھتے خدا انہیں آگ اور طوفان کا پیکر بنا تصور کرتے وہ انہیں سمندروں کے ناہموار، ہولناک سطح پر دوڑائے دوڑائے پھرتے

رات کا دہانہ اور کھلا۔ تارامنڈل کی کرن کلیاں شفاف، درخشاں اور ریشمیں جال بُننے لگیں۔ خدا اپنے اپنے ایوانوں میں زرق برق، لباس زیب تن فرمانے لگے۔ اور جب بن سنور کر کمتر دیوی دیوتاؤں کے جلو میں جشن گاہ پر آئے۔ تو گویا جلال و جمال کا نیا دن شروع ہوا۔ کس فانی کی مجال تھی۔ کہ اس جلال و جمال کو نظر بھر دیکھ سکتا۔ یہ تو لافانی المپس ہی تھا۔ کہ اسے جھیل لیتا۔ خداؤں کے جلال و جمال کی خفیف سی کرن پورے تارامنڈل اور سورج کی پوری تابانی سے فزوں تر تھی۔

آج کا جشن پیلیوس اور جل پری تھیٹس کے بیاہ کی تقریب کے لئے تھا۔ وسیع و عریض طعام گاہ اور رقص گاہ اپنی دلآویزیوں میں کسی دوسری تعبیر سے کم نہ تھی۔ یہاں بھی صنّاع دیوتا کے تخلیقی کارنامے قدم قدم پر منتشر تھے۔ ہر نقطہ بہاروں سے زیادہ فرحت ناک تھا۔ اور پوری کائنات کے حسن پر بھاری۔ جب انسان نے اس جنتِ سماوی کو جنم دیا تو اس نے بروئے عقیدت اسے اپنی دنیا سے خوب تر بنایا۔ تاکہ یہ ارفع ہستیوں کے شایانِ شان ہو۔

بڑے دیوتا کا محبوب خوبرو گینی می ویز جسے بڑا دیوتا بہ نفسِ نفیس آئیڈا پہاڑ سے اُڑا لایا تھا۔ اور دھرتی دیوی ہی بی کو برطرف کرنے کے بعد ساقی بنایا۔ اس وقت شراب کے ظروف کے قریب کھڑا تھا۔ ظروف کیا تھے، پھولوں کو ڈھال کر ظروف کی شکل دے دی گئی تھی۔ انہیں صنّاع دیوتا نے وہ رنگ دیئے کہ دیکھے گئے، نہ سنے گئے۔ ان ظروف کے ہجوم میں کنول کٹورے دھرے تھے۔ یہ پیالے تھے گینی می ویز کے عارضوں پر وہی، چمک تھی۔ وہی دلفریبی تھی۔ جو سنہری اور گلابی شراب سے چھلکتی، ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ تھی۔ جو لبریز پیالوں کے کناروں پر رقص کرتی رہتی،

وہ تو بلکہ خود جوانی کا چھلکتا ہوا پیالہ نہ تھا۔ بڑا دیوتا یونہی تو اُسے آئیدا پہاڑ سے اُٹھا کر نہیں لایا تھا۔ اُس کی آمد سے المپس کی رونق بڑھی۔ وہ خداؤں میں شہد و مستی بانٹتا۔

جشن گاہ میں سب آ گئے۔ لیکن فساد کی دیوی ایرس نہ آئی۔ کیسے آتی؟ اسے کسی نے بلوایا ہوتا تو آتی۔ بھلا ایسے موقعوں پر اسے کون بلواتا؛ خوشی کے موقعوں پر اسے نظر انداز ہی کیا جاتا۔ کسی کو کیا پڑی تھی۔ کہ ایسی خوبصورت تقریب کو غارت کرنے کی تدبیر کرتا۔ لیکن فساد کی دیوی بھی کب نچلی بیٹھتی وہ بھی تو چھلاوا تھی۔ کسی نہ کسی طرح اس کے کان میں بھی جشن کی بھنک پڑ گئی۔ تمام خدا مقدس ماکولات اور مشروبات نوش کرنے میں مشغول تھے۔ شہد اور شراب کے خاص امتزاج سے تیار کیا ہوا مشروب — نیکٹر بہ کثرت پیا جا رہا تھا۔ سامنے دیو داسیاں رقص کر رہی تھیں۔ ہبی اس طائفے کی رہبر تھی۔ تارامنڈل جھوم رہا تھا۔ سرمستی کے عالم میں دیو داسیوں کی نس نس میں نشہ اتر گیا۔ پوری انجمن میں جوش و خروش سرور و مستی کی ایسی کیفیت پیدا تھی۔ جس کا ہلکا سا لطف فانی اس دن اُٹھاتے جس دن رُت میلہ مناتے۔ اور ربِّ لحمز کی یاد میں اپنی روح کو شراب سے تر کرتے اور خدا کو اپنی ذات میں حلول کر لیتے اُس روز وہ خود خدا بن جاتے مگر کچھ لمحوں کے لئے۔

سرور و مستی کی یہ کیفیت رگِ سنگ تک میں اتر گئی۔ اور پورا المپس شراب سے غسل کرنے لگا۔ پورا ماحول حاصلِ کائنات بن گیا۔ آتش فشاں پہاڑ کے دہانے سے شعلوں کی جھڑی لگی۔ تو وہ بھی شراب کے ہم رنگ ہوئی۔ اتنے میں ایک ہنستی، مسکراتی۔ گاتی۔ گنگناتی ہوئی سوخ و شریر کہکشاں نے المپس کی پاکیزہ سرزمین پر پاؤں دھرا۔ ایک دم مسرت کی دیوار میں دراڑ پڑ گئی۔ المپس کے پہلو سے چیخ نکلی۔ اور کائنات میں پھیل گئی۔ ناچنے والوں کے قدم، لوچدار، خم کھائے ہوئے بدن اور متحرک بانہیں وہیں تھم گئیں۔ پیالوں کی گردش رُک گئی۔ خداؤں نے قہرناک نگاہوں سے اس فتنہ مجسم کو دیکھا۔ یہ فساد کی دیوی تھی۔

"اس وقت تم کیوں آئی ہو؟" ربِّ ارباب نے برق و رعد کے لہجے میں کہا۔

فساد کی دیوی پہلے تو مسکرائی، پھر اس نے ہوا میں سنہری سیب لہرایا۔ اور پھر ملائم لہجے میں بولی "بندی اس در کو کیسے چھوڑ سکتی ہے؟"

"آدابِ مجلس بیکار تو نہیں؟"

"سرکار کی کنیز اتنی بدتمیز بھی نہیں۔"

"یعنی تم بلا وجہ نہیں آئیں؟"

"مجھے اس سنہری سیب کی وجہ سے یہاں آنا پڑا۔"

"ہوں۔"

تمام خدا سنہری سیب کو دیکھنے لگے۔ جو فجر کے شنگرفی آفتاب کی طرح نصف النہار پہ رقص کر رہا تھا۔ وہ اسے بڑی پھرتی سے نہایت انوکھے انداز میں اچھال رہی تھی۔ ایسا نایاب سیب تو خداؤں کا ہی عطیہ ہو سکتا تھا۔ اس پر اس وقت خداؤں کی نگاہیں مرکوز تھیں۔ اس کا عکس رہ رہ کر شراب کے پیالوں پر پڑتا۔ یہ سیب خوبصورتی کا بے مثال نمونہ تھا۔ اور المپس کے خدا حسن پرستی میں اپنی مثال آپ تھے۔ انہوں نے اپنے جذبے کی تسکین کی خاطر کائنات میں حسن ارزاں کیا۔ حسین مخلوق پیدا کی۔ اور اپنی نگرانی میں حسین پیکر ترشوائے۔ بعض عورتوں کو انہوں نے اپنے خاص اوصاف سے آراستہ کیا۔ انہیں خاص فنون کی تربیت دی۔ اور بعض کو اس قدر خوبصورتی بخشی کہ انہیں دیکھ کر آپ ہی ان پہ فریفتہ خوبصورتی ان کا مزاج تھی، پسند تھی!

اس وقت سنہری سیب خداؤں کی للچائی ہوئی نگاہوں کے سامنے فضا کو چمکا رہا تھا۔ فساد کی دیوی نے سیب نیچے پھینک دیا اس پر لکھا تھا۔

"حسینہ اسے قبول کرے!"

یہ سیب حسینۂ فلک کا انعام تھا۔ عبارت پڑھتے ہی خداؤں کے حلقے میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ کھسر پھسر ہونے لگی۔ اور خدا ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ رب زیوس کے لب لرزے اور اس نے گینی می ویز سے کہا "پیالوں میں آگ بھر دو۔"

گینی می ویز نے پیالوں میں آگ بھری اور بڑے قرینے سے ایک پیالہ دیوتا کی خدمت میں پیش کیا۔ بڑا دیوتا مسکرایا۔ لیکن اس کے بعد وہ گمبھیر خاموشی میں گم ہو گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ فساد کی دیوی نے انتقام کی آگ بھڑکائی ہے۔ اور آئندہ دو ہائی میں یہ آگ دو ملکوں اور کئی نسلوں کو بری طرح اپنی گرفت میں لے لیگی۔ یہ آگ اتنی زبردست ہوگی۔ کہ شراب بھی اسے سرد نہ کر سکے گی۔ اسے ایک خونی انقلاب کی بو آئی۔ تاہم وہ چپ رہا۔ سمندر کی اتاہ گہرائیوں کی طرح وہ خود ایک خونی انقلاب کی پیداوار تھا۔ اس لئے وہ انقلاب کو ماتھے کی خفیف سی شکن کے برابر بھی اہمیت نہ دیتا۔ وہ تو بلکہ خوش تھا۔ کہ بیکاری کا علاج پیدا ہوا۔ اور خداؤں کے لئے سرگرمیوں کا نیا ریلا آیا۔ سرگرم عمل رہنے ہی میں زندگی تھی۔

تین دلآویز بانہیں آگے بڑھیں۔ تین دیویوں نے سیب پکڑنا چاہا۔ لیکن فساد کی دیوی نے ٹوکا اور کہا "گستاخی معاف، پہلے مقابلۂ حسن تو ہو لے، پھر اس پر حق بھی جتایا جا سکے گا۔"

گوری گوری تابدار بانہیں سمٹ سکڑ کر پیچھے ہٹ گئیں۔ ہی دی دختر ہیرا جو اب تک رقص کے انگ میں پتھر بنی کھڑی تھی، سیدھی ہو گئی اور حیرانی کے عالم میں یہ منظر دیکھنے لگی۔ کبھی اپنی ماں ہیرا کو دیکھتی۔ کبھی دوسری دیویوں کو جن کے تعلقات ابھی تک باہم خوشگوار تھے۔ ادھر خلفشار سے نامحرم، تینوں دیویوں کے چہروں پہ جذبات کی قوس قزح رنگ بدل بدل کر ناچنے لگی۔ ہی بی جو ناچتی ہوئی دھنک تھی۔ سہم سی گئی، اور چپ چاپ شراب کے ایک بڑے سے ظرف سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے ساتھ اس کا منگیتر گینی می ویز کنول کٹوروں سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں ہستیاں پیالوں کے انبار میں پیالہ ہو کر رہ گئیں۔ اصل میں دونوں ہستیاں ایک تھیں۔

ہیرا، ایتھ ای نی اور افرودائتی ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ سب خدا انہیں تکنے لگے۔ سب کی آنکھوں میں دیویاں اور سیب جھلکنے چمکنے لگے۔ بڑا دیوتا ایک اعتبار سے خوش تھا، دیویوں کے معاملے میں وہ غیر جانب دار تھا۔ اس نے دل ہی دل میں کہا "اچھا ہوا کہ دیویوں کی ایک سہیلی ہی نے شرارت کا بیج بویا۔"

مدت کے بعد بڑے دیوتا کی مراد پوری ہوئی۔ دراصل حقیقت یہ ہے کہ ہیرا، ایتھ ای نی اور افرودائتی قدیم تر زمانے میں دھرتی کی دیویاں تھیں۔ ان میں اختلاف سے زیادہ تنوع تھا اور یہ ایک تھیں۔ لیکن ایک میں تین نہ تھیں۔ ان کے زمانے میں تثلیث کا تصور پیدا نہ ہوا تھا۔ یہ فقط دو دو کی ٹولی میں زمین پر راج کرتیں۔ ایک دیوی ہوتی اور ایک کوری یعنی دختر۔ یہی کوری کنیز بھی ہوتی۔ ان دو کے علاوہ، تیسری کسی ذات کی گنجائش نہ تھی۔ زرعی معیشت کے انتظام و انصرام کے لئے یہی دو دیویاں کافی تھیں۔ ان دو کی بدولت دو کا ہندسہ متبرک ہوا۔ المپس کے بڑے دیوتا کو تینوں دیویاں عزیز تھیں۔ تاہم وہ فساد کی دیوی کی شرارت سے مطمئن تھا۔ دو کا طلسم ٹوٹ کر تثلیث کا جادو چلنے کو تھا۔ بڑے دیوتا کے دل میں انتقام کی ہلکی سی آنچ بھی بھڑک رہی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ دیویوں میں پھوٹ پڑ جائے۔ تاکہ اس کی گرفت اور بھی مضبوط ہو جائے اور پھر ہیرا سے تو وہ بہت جلتا۔ کیونکہ وہ اُسے دوسری عورتوں کے ساتھ رنگ رلیاں منانے پر احتجاج کرتی اور اسے من مانی کرنے سے روکتی ٹوکتی رہتی۔ بڑا دیوتا باقی دیوتاؤں بلکہ انسانوں کی طرح خیر و شر، نیک بد اور شرارت و شرافت کا مجسمہ تھا۔ وہ بے روک ٹوک ہر کام کرنا چاہتا تھا۔

بڑے دیوتا کو اچھی طرح معلوم تھا کہ جب یونان میں المپس کے خدا آئے تو ان کی معیت میں اُن کے ماننے والے غیر ملکی بھی آئے۔ بلکہ دل میں بڑا دیوتا یہ بھی کہتا تھا کہ آکیائی فاتح بن کر یونان میں وارد ہوئے تو اپنے ہمراہ اپنے فلکی خداؤں کو بھی لائے، اِن فلکی خداؤں کا آنا تھا کہ

دھرتی دھرم پر آفت ٹوٹی اور دھرتی دیویاں زوال کی نذر ہوئیں۔ مادری نظام شکست ہوا اور اس کی جگہ پدری نظام برسر اقتدار آیا۔ المپس کے دیوتا نے وقت کے تقاضے سے مجبور ہو کر دھرتی دھرم سے سمجھوتہ کیا۔ اور ان تینوں دیویوں — ہیرا، ایتھا ای نی اور افرودائتی کو اپنے کنبے میں شریک کیا یہ یونان کا پہلا پدری کنبہ تھا۔ تاہم اس سمجھوتے سے رقابت کی آگ سرد نہ ہوئی۔ المپس کے خدا بہت اونچے ہو گئے۔ پران پرانی دیوی دیوتاؤں کو پوری طرح نیچا نہ دکھا سکے۔ جن کی جڑیں دھرتی کی کوکھ تک چلی گئی تھیں اور جن کے پاؤں تلے زمین سرکنے کا نام نہ لیتی

بڑے دیوتا نے چاہا۔ کہ تماشا ہو جائے۔ دو کا طلسم ٹوٹے اور دو کی جگہ تثلیث نمودار ہو۔ دیویوں کی باہمی خلفشار سے بڑے دیوتا کے کنبے کو فائدہ پہنچا۔ فساد کی دیوی نے اپنوں میں پھوٹ ڈالنے کی تدبیر کی اور پھر وہ بھی ایسی پھوٹ کہ ماں بیٹی — ہیرا اور ایتھا ای نی لپیٹ میں آ گئیں۔

سب منتظر ہوئے کہ کب بڑا دیوتا لب کشائی کرے حسینۂ فلک کا نام لے اور اسے سنہری سیب تھمائے۔ اور پھر اس کے بعد اس آن جشنِ طرب از سرِ نو آغاز پذیر ہو۔ پوری محفل چپ تھی۔ کیونکہ المپس پر بہت بڑا اور اپنی نوعیت کا پہلا اقدام ہونے کو تھا۔ سانس رک گئے اور اتنی بھی آواز پیدا نہ ہوئی۔ جتنی ستارے کے آنکھ جھپکنے سے پیدا ہوتی ہے۔ آخر چپ کی مہر ٹوٹی اور بڑا دیوتا بولا "روئے زمین پر ہم نے وہ آنکھ کسے دی ہے جو حسن کی پرکھ میں یکتا ہو؟"

سب نے بڑے دیوتا کی طرف دیکھا اور انتظار کیا۔ یہ سوال، جواب کی نعمت سے محروم رہا۔ سچ تو یہ ہے کہ بڑے دیوتا کے سوا کسی کو خبر نہ تھی۔ کہ یہ شرف کسے ملا تھا۔ آخر بڑے دیوتا نے خود ہی فرمایا "ہم نے یہ آنکھ دنیا میں اُسے دی جو دنیا والوں میں سب سے زیادہ حسین ہے الیون کے شہزادے سے بڑھ کر دنیا میں نہ کوئی حسین ہے۔ اور نہ حسن شناس۔ اس کو اس پہلے مقابلہ حسن کا منصف مقرر کیا جائے"

سب حیران ہوئے۔ دنیا کا پہلا مقابلہ حسن پھر وہ بھی المپس کی ہستیوں کے درمیان اور فیصلے کے لئے فانی کو مقرر کیا جائے۔ اس پہلی روایت کے قیام کے سلسلے میں خود بڑے دیوتا کو منصف بننا چاہئے تھا۔ لیکن وہ کترا گیا۔

منصف کے تقرر سے بات قدرے صاف ہوئی اور بڑے دیوتا کے علاوہ دوسرے خدا بھی کچھ کچھ سمجھنے لگے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھ رہا ہے۔

غیب دان دیوتا پرومی تھیوس جو الگ کھڑا یہ سب حرکتیں دیکھ رہا تھا۔ دھرتی دیویوں کے خلاف سازش دیکھ کر دانت پیس کر رہ گیا۔ پھر مقابلہ حسن کے لئے ایک فانی کے تقرر پر تو وہ بھی بہت حیران ہوا۔ اس نے چپکے سے کہا۔ "یہ خدا بھی کتنے عجیب ہیں۔ جو کام خود نہیں کر سکتے۔ وہ انسان کو سونپ دیتے ہیں"

"یہ چالاکی ہے" اس کے بھائی، پسین دان نے کہا۔

"خیر انسان بھی چھوٹے پیمانے پر خدا ہی ہے۔ جو کام بڑے خدا نہیں کر سکتے۔ وہ یہ چھوٹا خدا کر لیتا ہے" پرومی تھیوس نے دل کو جھوٹی تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"کیسے کر لیتا ہے"

"خیر ہمیں اس سے کیا؟ بڑا دیوتا جانے اور اس کا کام"

غیب دان دیوتا تاڑ گیا۔ کہ انسان کے سپرد ایک خطرناک خدمت سونپ کر اس کی تباہی کا بندوبست کیا جا رہا ہے اسے مستقبل کے بارے میں پورا پورا علم تھا۔ اسے خوب خبر تھی۔ کہ ایک قدیم مگر عظیم شہر بلکہ تہذیب کو مٹا دیا جائے گا۔ پھر دھرتی دھرم کا نام لیوا نہ رہے گا۔ پھر وہ دل کو تسلی دینے کی غرض سے بولا۔ "ہاں۔ اس شہر آرزو کو تباہ ہونا ہی چاہئے۔ آخر نئے خداؤں کی نئی نسل بیکار رہنے کو تو پیدا نہیں کی گئی۔ اس کے ہتھیار کیوں زنگ آلود ہوں؟ یہ شہر آرزو خداؤں کے توسیعی منصوبوں کی راہ میں سنگِ گراں ہی تو ہے، اسے راستے سے ہٹائے بغیر آگیائی سورما کیوں کر آگے

پھیلائیں گے۔ اور کیوں کر باقی دنیا کو اپنی گزرگاہ بنائیں گے ؟ دھرتی، دھرم کے اس اہم ترین مرکز کو باقی تمام مرکزوں کی طرح جل کر راکھ ہو جانا چاہئے۔"

ویسے غیب دان خدا پرومی تھیوس نے اس دس سالہ جنگ میں خداؤں کی نئی نسل کا ساتھ دیا تھا جو بزرگ خداؤں سے اقتدار چھیننے کے سلسلے میں چھڑی اور جس نے زمین و آسمان کی دھجیاں بکھیریں۔ غیب دان خداؤں میں ملے جلے جذبات سمیٹے ہوئے تھا۔ نئے خداؤں کا برسرِ اقتدار آنا مقدر تھا۔ تاہم اسے ان کے چلن پسند نہ تھے۔ ان میں خود غرضی کا عنصر کچھ زیادہ ہی تھا۔

ایلیون کے شہزادے کا نام سن کر رب الشمس اپالو نے کہا۔ "شاید وہ نہ مانے۔ شاید اسے دیویوں میں انصاف کرنے میں تکلف ہو۔ یہ معاملہ بڑا ٹیڑھا ہے۔"

"کچھ بھی ہو ہمارا فرمان یہی ہے اور البیس کی طرح اٹل۔ نہ البیس ٹلا ہے اور نہ ہمارا فرمان۔"

ایک اور خدا بولا۔ "انسان نافرمان بھی تو ہوتا ہے۔ شرارت کا مادہ بھی تو ہمیں نے اس کے خمیر میں گوندھا تھا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمیں نے اپنی مخلوق کو خوبی اور خرابی دی لیکن کوئی بات نہیں۔ ہرمیز دیوتا ایلیون کے شہزادے کو منائے۔"

ایک فانی کو منانے کے لئے ہرمیز دیوتا کا انتخاب برمحل تھا۔ دھرتی دھرم میں اسے قابلِ رشک مقام حاصل تھا۔ خدائے زیوس کا کنبہ برسرِ اقتدار آیا تو اسے دھرتی کے دوسرے خداؤں کی طرح نچلے درجے پر آنا پڑا۔

ہرمیز نے بڑے دیوتا کا فرمان سنا تو کہا۔ "حضور کا ارشاد سر آنکھوں پر ! بندہ بید کی تازہ چھڑی کی طرح ایلیون کے شہزادے کے ارادے کو خم دے لے گا۔"

"جاؤ اور اسے مناؤ ! آئیدا کی چٹان پر دنیا کا پہلا مقابلۂ حسن ہوگا۔"

ہرمیز اسی آن چلا گیا۔ اُدھر دیویوں کو حکم ملا کہ مقابلۂ حسن کے لئے تیار ہو جائیں۔

جشن ادھورا رہا اور فساد کی دیوی کی حرکت سے شگون اچھا نہ رہا۔ سانسوں کی گرم گرم آہٹیں مدھم پڑ گئیں۔ تمام خدا سوچ ساگر میں ڈوب گئے۔ نرم ہوائیں سرسرائیں اور ان میں کہیں کہیں سرگوشیوں کی دبی دبی آوازیں تیر گئیں۔

دیویوں کے چہرے کی دھنک غائب ہو گئی۔ ان پر سنجیدگی کی کیفیت طاری ہو گئی اور وہ اُٹھ کر چلی گئیں۔

اگرچہ دیویاں حسن، جلال اور شان کے معاملے میں اپنی نظیر آپ تھیں۔ ہر ایک کی آب و تاب منفرد تھی۔ پھر بھی سنہری سیب سب کے حصے میں نہ آ سکتا۔ ہر رُوئے آتشیں پر شادابی لپک رہی تھی۔ آج ان کا حسن معرضِ بحث میں پڑ گیا۔

تینوں دیویوں نے مقابلے میں شرکت کے لئے تیاری شروع کی۔ وہ چشمۂ حیات پر گئیں۔ جس کا پانی نئے سرے سے شادابی بخشتا اور حسن کو ابدی نکھار عطا کرتا۔ گردشِ زمانہ سے بدن پر جو گرد چڑھ جاتی، وہ غسلِ دوشیزگی سے دُور ہو جاتی۔ اور پھر ایسی سجری، سجیلی تابانی میسر آتی کہ شبنم سے نہانے والے پھولوں تک کے نصیب میں نہ ہوتی۔ اگرچہ ایتھ ای نی کے علاوہ باقی دونوں دیویاں بیاہتا تھیں۔ ہیرا بڑے دیوتا کی بیوی تھی۔ اور افرودائتی لنگڑے دیوتا ہی فیس طس کی تاہم سدا کی کنواریوں میں شامل ہوتیں۔ کیونکہ ان کے حسن اور شباب کو زوال نہ تھا۔ ان کا سا حسن اور شباب تو کنواریوں کو بھی نہ ملا تھا۔ ہیرا مادرگیتی تھی۔ اس لئے اس کا احترام سب سے بالا تھا۔ اس نے اپنے مقام اور وقار کی مناسبت سے لباس زیب تن کیا۔ ہی بی اس کی دختر یا کنیز تھی ہمراہ آئی۔ ہی بی خود بھی موقر تھی۔ دیوی کے وقار کا اندازہ اس کی دختر یا کنیز کے مقام اور وقار سے معلوم ہو سکتا۔ ہی بی بڑے اہتمام سے سجتی اور غلام اور مجرم اس کی خانقاہ پر پہنچ کر محفوظ و مصئون ہو جاتے۔ قیدی اپنی بیڑیاں کاٹ کر خانقاہ کے پیڑوں سے لٹکا دیتے۔ پھر وہ آزادی کا سانس لیتے۔

ایتھ ای نی نہ فقط علم و فضل کی دیوی تھی۔ بلکہ ایک نہایت اہم اور تہذیبی مرکز کی نگہبان تھی۔ اسی مرکز سے علم و فن کے زبردست سوتے پھوٹے اور رہتی دنیا تک اپنی نم چھوڑ گئے۔ وہ حرب و ضرب کے آداب سے بھی آشنا تھی۔ کسی شہر کی نگہبان دیوی ان سے کیوں کر نا آشنا رہ

سکتی؟ اس نے آلات حرب آراستہ کئے۔ کسی زعیم کو مل جاتے تو تنِ تنہا پورے لشکر کا صفایا کر سکتا۔ شبل دوشیزگی اسے فجر کی سنہری لکیر سے بھی زیادہ [illegible] اور تاب ناک کر گیا۔

افرودائتی نے کام دیو کو مدد کے لئے بلایا، کام دیو جو محبت کے تیر پھینک کر انسان کے دل میں عشق کا شعلہ پھونکتا۔ اسے پستی سے بلندی پر لے جاتا۔ اور اس کے دل میں ہنگامہ خیز امنگوں کی چنگاریاں بھڑکاتا۔ افرودائتی کو کیوں پوری کائنات کے لئے قابلِ رشک نہ بناتا؟ اس لئے افرودائتی کی شوخ اداؤں کو بھڑکایا۔ اس کی گوری گوری باہوں پر بازو بند باندھا۔ یہ باہیں تو بلا کی خوبصورتی سمیٹے ہوئے تھیں۔ بت تراش انہیں بناتے وقت سانس روک لیتے۔ ان سے لپٹ لپٹ جاتے۔ ان میں دلآویزی کی اصل اور حقیقی [illegible] رواں دواں تھی۔ اور ان باہوں کو کبھی کل نہ پڑتی۔ کام دیو کے بازو بند نے ان پر سونا چڑھا دیا۔ اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ تاب دار ہوگئیں۔

تینوں دیویاں تیار ہوگئیں۔ لیکن دل میں ڈر سہم گئیں۔ ہر ایک اپنی خوبصورتی پر نازاں تھی۔ اور کسی کو یقین نہ آتا۔ کہ دوسری اس سے کمتر ہے۔ اس وقت تو افرودائتی بھی ڈر سہم گئی۔ حالانکہ وہ بڑے جوڑ توڑ والی تھی۔ بڑی شریر اور سازشی تھی۔ پھر ایک معاملے میں وہ باقی دیویوں سے زیادہ خوش بخت تھی۔ گو اس میں وقار کی کمی تھی۔ تاہم وہ ایک ایسی دولت سے بہرہ ور تھی۔ جس کی خاطر لوگ خشک و تر سے بے خطر سے گزر جاتے اور جان لیوا مہمات سر کرتے۔ اور تو دیوی پر جان دیتے۔ وہ پیار کی دیوی تھی۔ اور وہ بھی عام پیار کی نہیں۔ بلکہ جنسی پیار کی۔ ہر دیوداسی اس کی خوشنودی کو زندگی کا حاصل سمجھتی۔ وہ از روئے عقیدت اور بروئے احکام دین اس کی خانقاہ پر اپنا کنوارپن نچھاور کر لے آتی۔ یوں اپنا کنوارپن دیوی کے حوالے کر کے وہ اپنی نسائیت کو محفوظ اور مطہر کر لیتی۔ پھر اس کی نسائیت کو گھن نہ لگتا۔ اس سلسلے میں اسے جو نقد معاوضہ ملتا۔ وہ دیوی کی پروہتنی کو دے آتی۔ مرد اور عورت ہر کوئی دیوی کا قدردان تھا۔ اور اس کی نظرِ عنایت کا طلب گار۔ وہ اس ہتھیار سے پوری دنیا کو بیکل کئے رہتی۔ گویا ایک اعتبار سے پوری دنیا اس کے بس میں تھی۔ دنیا کا اہم ترین اور محبوب ترین مشغلہ سدا کے لئے جنسی پیار قرار پایا۔ وہ کہ اس ہتھیار کی کارکردگی سے کماحقہٗ واقف تھی۔ لپک کر منصف کے پاس گئی۔

ایلیون کا گڈریا شہزادہ شاہ زور اور جوان تھا۔ اس کا دل امنگوں کا ساگر تھا۔ ہر جوان کی طرح اُس کی پہلی کمزوری عورت تھی۔ افرودائتی نازل ہوئی تو اس کی آنکھیں اپنے آپ مُند گئیں۔ اُس نے آنکھوں کے سامنے نقاب تان لیا۔ وہ دیوی کے حسن و جمال کی تاب نہ لا سکا۔ ایسی دلفریب اور جلال آفرین تھی، اس نے زندگی میں کبھی نہ دیکھی تھی۔ البتہ اس کا نام ضرور سنا تھا۔ اور لوگ دیوی دیوتاؤں کے نام لے کر ہی جیا کئے۔ دیکھنے کا شرف کسے حاصل ہوا؟ ایلیون کے شہزادے ایسا خوش نصیب دنیا میں کون تھا؟ وہ افرودائتی کا ماننے والا تھا۔ افرودائتی اس کے دیس کی قدیم دیوی تھی۔ اور دھرتی دھرم کی اساس۔

افرودائتی مسکرائی اور بولی۔ "مجھ سے یوں چہرہ نہ چھپاؤ! میں تمہیں بارہا دیکھ چکی ہوں۔ کون فانی مجھ سے چھپ کر رہ سکتا ہے؟ چاہو تو چہرہ ذرا ترچھا کرو۔"

"جی۔"

پیرس نے نقاب اُٹھا کر چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ اور آنکھیں کھول لیں۔ گو پہلی سی قاتل چمک سے پالا نہ پڑا تاہم گرد و پیش اجالا ہی اجالا تھا۔ یہ تو دیوی کے حسن کی کم سے کم کیفیت تھی۔ اسے بھی وہ جھیل نہ سکا۔ ورنہ دیوی سامنے ہوتی تو دیکھنے کی قوت سلب ہو جاتی۔ دیوی کو اس بات کا افسوس بھی تھا۔ کہ وہ اسے اپنا جلوہ پوری طرح دکھانے سے قاصر تھی۔ اور پورا جلوہ دیکھے بغیر وہ کیفیتِ حسن کے بارے میں صحیح رائے کیوں کر قائم کر سکتا؟

"شہزادے میں ایک کام سے آئی ہوں۔" افرودائتی نے کہا۔

"کام ہے؟" پیرس حیران ہوا۔ وہ اور دیوی کو اس سے کام ہو۔ یہ ناقابلِ یقین سی بات تھی۔ گھبرا کر بولا "واقعی آپ کو مجھ سے کام ہے"۔
دیوی کی بات کا یقین نہیں تمہیں۔ وقت تنگ ہے اور بات اہم ہے۔ مجھے فوراً بتاؤ! تمہاری نظر میں دنیا کی سب سے دل فریب عورت کون ہے؟
"ہیلن"۔
"وہی زہیمہ جو دیویوں کی ہم پلہ ہے اور جسے فاتح آگیا ڈس نے اُس کے پجاریوں اور حواریوں سے چھین کر بس میں کر رکھا ہے۔ اور جو اس وقت بڑے دیوتا کے ماننے والے" شاہ مینی لے آس کی بیاہتا ہے؟
"وہی بالکل وہی!"
"تمہارا ذوق بہت بلند ہے۔ کیا تم اسے قبول کرو گے؟"
"ہیلن سے کون منہ موڑے گا، اس وقت اُس ایسی دنیا میں حسین کوئی عورت نہیں۔ وہ تو حسینۂ عالم ہے"۔
"تم بھی تو زعیمِ عالم ہو۔ تم سا بھی دنیا میں کوئی خوبرو نہیں"۔
"یہ تو آپ کا کرم ہے ورنہ میں تو کچھ بھی نہیں"۔
"میں ہیلن تمہارے حوالے کر دوں گی"۔
"لیکن کس خوشی میں؟"
"یہ گتھی بھی سلجھ جائے گی۔ ابھی اس کے سلجھنے کا وقت نہیں آیا"۔
"آپ کی مرضی"۔
دیوی نے بات کی اور غائب ہو گئی لیکن حسن کی ایک لکیر فضا کو تابناک کئے رہی۔ یہ لکیر اس کی نگاہوں میں نقش ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں جو جلوہ سمایا وہ اُسی میں پیوست ہو کر رہ گیا۔ اور دیوی کے تقدس سے اس کا دل لبریز ہو گیا۔ اس کا جی چاہا کہ دیوی کے تصور میں سر جھکاتے رہے اور اس پر اپنی حقیر ذات کو نثار کر دے۔

ابھی وہ پوری طرح ہوش میں آیا تھا کہ ہیرا نازل ہوئی۔ اس کے جلال و جمال کا کیا کہنا؟ وہ بھی کسی سے کم نہ تھی۔ وہ تو بلکہ دیویوں کے سلسلے کی اہم کڑیوں میں سے تھی۔ پیرس اور اس سے پہلے کی نسلیں اسے پوجتی آئیں۔ دھرتی دھرم کا زبردست ستون تھی۔ پیرس میں اتنی تاب کہاں تھی۔ کہ اسے ایک نظر دیکھ پاتا۔ وہ چاہتی تو اس کا قرب فانیوں کے لیے مہلک ہوتا۔ دیوی اس وقت پوری طرح جلال میں نہ آئی۔ جلال میں آتی تو پیرس کو اپنے جلال کی تپش سے جلا جھلسا دیتی۔ لیکن اس نے ایسا نہ چاہا۔ وہ بے پایاں صلاحیتوں کی مالک تھی۔ بڑے دیوتا کی بیاہتا ہونے کے باعث الیس کی رانی تھی۔ پرانی نسلیں اسے تھیسالی کی رانی مان کر پوجتیں اور غایتِ حیات سمجھتیں۔ وہ تو زیوس سے بھی پہلے معزز و محترم تھی۔ اس کا معبد بڑے دیوتا کے معبد سے پہلے بنا۔ گو بیاہ کے بعد وہ بڑے دیوتا کے بندھن میں آگئی۔ تاہم بھرپور کہلانے لگی۔ خودسر تھی اور بڑا دیوتا کبھی اسے پوری طرح تابع نہ کر سکا۔ کیونکہ وہ پدری نظام کی ضد تھی۔ اور بیاہ کو مادری نظام کے حق میں مہلک خیال کرتی۔
دیوی نے پیرس سے کہا۔ "میں تم پر مہربان رہوں گی۔ تمہیں زندگی بھر آنچ نہ آنے دوں گی۔ کہ میں زندگی کا سرچشمہ ہوں۔ تمہیں اس قدر دولت اور قوت دوں گی۔ کہ تمہیں اس سے زیادہ کی امنگ نہ ہو"۔
"آپ نے بجا ارشاد فرمایا۔ آپ سے کچھ بھی بعید نہیں لیکن عنایت کس کارگزاری کے عوض ہے؟"
"بھید کھلنے کا وقت آگیا ہے۔ صبر کرو! ضرورت کے وقت میرا ساتھ دینا، میں تمہارا ساتھ دوں گی"۔
پیرس نہ تو آنکھ ملا سکا اور نہ وعدہ کر سکا۔ وہ تو شش و پنج میں پڑ کر رہ گیا۔ پہلے افرودائتی آئی اور اُس نے حسینۂ عالم کا لالچ دے کر اسکے

قلب کو جھنجوڑا۔ ابھی وہ قرار نہ پاسکا تھا۔ کہ ہیرا نے آکر اس کا نظام ذہنی درہم برہم کیا۔ ہیرا چلی گئی اور وہ ایک لاینحل کش مکش میں مبتلا ہوگیا۔ ہیرا نے اسے صبر کرنے کو کہا۔ لیکن وہ کیسے صبر کرتا۔ اور پھر صبر نہ کرتا تو کیا کرتا۔ اُسے تو کچھ خبر ہی نہ تھی۔ تاہم اتنا تو وہ سمجھ گیا۔ کہ دیویوں میں کھٹ پٹ ہوئی ہے۔

ابھی اس کی سوچ تیزی سے سلگ رہی تھی۔ کہ تابانی کا نیا ریلا آیا۔ اور اس کے پہلو میں آکر رکا۔ پہلے کی طرح پھر اس کی آنکھیں بے اختیار مند گئیں۔ اس کی روح جلن محسوس کرنے لگی۔ یہ ایتھ ای نی دیوی تھی۔ پارتھی نوس یعنی کنواری تھی۔ اور اس کے کنوارپن کے بارے میں کسی قسم کا شک و شبہ پیدا نہ تھا۔ اس کے کنوارپن کی نسبت سے اس کا معبد پارتھی نون کہلاتا۔ ویسے وہ زعمار اور عظمار کی رضاعی ماں بھی کہلاتی۔ یہ فقط اس کی عظمت کے لحاظ سے تھا۔ اس نے بعض زعمار کو بہ نفسِ نفیس پروان چڑھایا۔ ہرکولیز اُن میں سے ایک تھا، وہ شہر ایتھنز کا تجریدی روپ تھی۔ رقص میں اس کا جواب نہ تھا کنوارے لڑکے اور کنواری لڑکیاں اس کے نقشِ قدم پر چلتے۔ یا یوں کہا جائے کہ وہ کنوارے لڑکوں اور لڑکیوں کی نقالی کرتی۔ وہ ان ہی کی زندگی کا عکس تھی۔ انہی کی طرح ہتھیاروں سے لیس ہوکر ناچتی۔ جب وہ لڑتے تو وہ بھی لڑتی۔ اس نے رب البحر پوسائیدون سے اقتدار چھینا جب کہ وہ ایتھنز کے اشرافیہ کا دیوتا تھا۔ جمہوریت نے ایتھ ای کو برسرِ اقتدار کیا۔ وہ تقدیرِ شہر اور خاتونِ شہر تھی۔

ایتھ ای نی مسکرائی اور بولی۔ "ہر نوجوان نام چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہیرو بن جائے۔ اور پُجنے لگے۔ اُس کے بت تراشیں ـــ اور سرِ عام گڑیں۔"

"بے شک۔"

"ہر نوجوان چاہتا ہے کہ تاریخ کے اَوراق میں اُتر جائے۔ اس کی ہستی سنور جائے، وہ ارضی خدا بن جائے۔"

"بے شک۔"

"ہر نوجوان چاہتا ہے۔ کہ دوسرے نوجوان پر سبقت لے جائے۔ اور دنیا بھر کو اَپنے کارناموں سے حیرت میں ڈال دے۔"

"بے شک۔"

"ہر نوجوان چاہتا ہے کہ جنگ کے میدان میں دشمن کے دانت کھٹے کرے۔ اس کی صفیں تتر بتر کرے۔ تلوار کو حرکت میں لائے۔ تو گردنوں کی فصل اپنے آپ کٹتی جائے۔"

"بے شک۔"

"ہر نوجوان ہرکولیز بننے کے خواب دیکھتا ہے۔"

"بے شک۔"

"اور چاہتا ہے کہ میں ہرکولیز کی طرح اس کی نگہبانی کروں اور ہرکولیز کی طرح اس کی بھی کنواری کہلاؤں۔"

"بے شک۔"

"اگر تم نے میرا ساتھ دیا تو میں تمھاری شان بڑھاؤں گی، تمھیں آن بان دوں گی، میدانِ جنگ میں ناموری دوں گی۔ اور تمہاری کنواری بن جاؤں گی۔"

"اے پیاری دیوی! یہ فضل و کرم مجھ پر کیوں ہوگا؟"

"وقت آنے کو ہے۔ بھید کھلا ہی چاہتا ہے۔ ذرا توقف کرو اور یاد رکھو، میرا ساتھ دیا، میرے زیرِ سایہ رہے تو نام و نمود پاؤ گے۔ میں تمھیں چھو کر لافانی بنا سکتی ہوں۔"

پیرس کی ذہنی پریشانی سوا ہوئی۔ اس کا ذہن اشتیاق کی آگ سے جلنے لگا۔ جذباتی بحران نے اسے دیوانہ کر دیا۔ دیویوں نے اپنے اپنے

مطلب کی باتیں تو کہیں لیکن اسے اصل حقیقت سے بے خبر رکھا۔ وہ اسے انتظار کے الاؤ پر لٹکا کر چلی گئیں۔
اُچھالے کبھی ماند پڑتے اور کبھی چمک جاتے۔ کبھی تو یہ حالت ہوتی۔ کہ ایلیون کے شہزادے کے تصور میں بجلیاں کوند جاتیں اور کبھی وہ اندھیاری کی اتاہ گہرائیوں میں جا گرتا۔ وہ سخت حیران و پریشان تھا۔
اسے رشوت کے طور پر جن چیزوں سے للچایا گیا۔ اُسے وہ سب مطلوب تھیں وہ چاہتا کہ کسی طور سے تینوں کی رشوتیں اور خوشنودی مل جائے پھر وہ دنیا میں سب سے بڑا انسان ہو جائے۔ لوگ اسے زندگی ہی میں دیوتا مان لیں۔ اور پوجنے لگیں۔ ہیرا کے انعام میں کوئی الجھن نہ تھی۔ ایتھنا کی کا انعام بھی زبردست کشش رکھتا۔ وہ اس کی کنواری بننے کو تیار تھی۔ افرودائتی کا انعام ان دونوں کے خلاف ٹیڑھی کھیر تھا۔ ہیلن ہیاہتا عورت تھی۔ پرانی مگر مفتوح نسل کی یہ معزز و محترم دختر دھرتی دھرم میں مقام خصوصی رکھتی۔ اس کی بہن کلائی طیم نیسٹرا بھی منفرد تھی۔ دونوں بہنیں غضب کی دلفریبی رکھتیں۔ دونوں کی پہلے سے اپنی برادری میں منگنی ہو چکی تھی۔ کہ فاتحین کے ریلے لے آیا۔ آکیائی فاتحین نے یونان کا پرانا مادری نظام اور شیرازہ منتشر کر دیا۔ انہوں نے فتح و نصرت کے طبل بجائے۔ یونان کو اپنی ملک بھی بنایا اور اپنا ملک بھی۔ پورا یونان ان کی ملک میں شامل ہوا تو وہ عورتیں بھی شاملِ املاک ہوئیں۔ جو اُن کے دینی سلسلے کی عورتوں کے برعکس اپنے پالنے نظم و نسق کے تحت دوم درجے کی معبود سمجھی جاتیں۔ جو کہ نام پر نسل چلتی جو حکمرانی کرتیں۔ کنبے قبیلے کی سربراہی کے لئے مقدر تھیں جنہیں قدرت کے اسرار و رموز کی آگاہی کا شرف حاصل تھا۔ آکیاؤں کی آمد پر پدری نظام برسرِ اقتدار آیا۔ اور باپ کو فوقیت حاصل ہوئی۔ عورت کی پہلی حیثیت تمام ہوئی۔ اور وہ بہ استثنائے چند جنسی جذبات کی جولا نگہ بن کر رہ گئی۔ آکیائی شہزادے جس پیلا زجی حسینہ پر سب سے زیادہ لٹو تھے وہ ہیلن تھی۔ ہیلن کی جان انہوں نے عذاب میں ڈال دی۔ لیکن پھر خود ان کی اپنی جان بھی عذاب کی نذر ہوئی۔ ہر آکیائی اسی کو چاہتا، طے نہ ہو سکتا۔ کہ اسے کون بیاہے۔ بالآخر اوڈی سی اس " سے تجویز کیا کہ ہیلن خود ہی اپنے چاہنے والوں میں کسی کو بیاہ لے۔ اور اس بیاہ کو سب قبول کریں۔ کوئی شہزادہ جھگڑا نہ کرے اور اگر کسی قسم کا جھگڑا ہو تو ہیلن کے شوہر کی امداد کی جائے۔ سب نے تجویز مان لی۔ اور اس پر عمل پیرا ہونے کی قسم کھائی۔
پیرس کا دماغ پھٹا پڑتا تھا۔ وہ لاکھ جتن کے بعد بھی نہ جان سکا۔ کہ دیوی دیوتا کیا انقلاب لانے اور گل کھلانے کو ہیں۔ وقت گذرتا گیا، پریشانیوں کا تانا بانا الجھتا گیا۔ اور وہ اس میں بری طرح جکڑتا چلا گیا۔
سُورج کی کرنیں ترشول بن گئیں۔ اور زمین کو ڈسنے لگیں۔ لیکن ایلیون کے شہزادے کو کچھ پتہ نہ چلا۔ اس کے لئے آفتاب تو کیا ساری دُنیا ناپید ہو کر رہ گئی۔ وہ تو اس وقت المپس کے سیاسی جھمیلوں میں مبتلا تھا۔ وہ سمجھ نہ سکا کہ اب تک جو کچھ بیتا وہ اصلیت تھا کہ خواب —؟ اس کے لیے تو زمان و مکان کی قید ٹوٹ گئی۔ وقت کے اندازے تمام ہو گئے۔ دیویوں نے اسے جلووں کی بھول بھلیوں میں بھٹکا دیا۔ اور اسے اُس کی برداشت سے سوا، ذہنی کوفت دی۔
وہ سخت جھنجلایا۔ اُسے وہ سرا نہ ملا۔ جسے پکڑ کر آگے بڑھتا۔ اور بات کی تہہ تک پہنچتا۔ اتنے میں ہرمیز دیوتا وارد ہوا۔ ایک بار پھر اس کی آنکھیں اپنے آپ مُند گئیں۔ اب پھر اس نے منہ کے آگے نقاب تان لیا۔ کیونکہ وہ فانی تھا۔ اور دیوی دیوتاؤں کے جلال کی تاب نہ رکھتا۔ ہرمیز دیوتا نے کہا ۔ "اُمید ہے تم المپس کی اس حکمتِ عملی کے بارے میں کچھ جان گئے ہوگے جو نئی کروٹ لینے کو ہے۔" پیرس! تمہیں ہیرا، ایتھنا ای نی اور افرودائتی میں سے حسین ترین دیوی کی نشان دہی کرنی ہوگی۔"
یہ بہت بڑا کام تھا۔ اور سخت خطرناک بھی۔ اس نے کہا۔ "مجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آئی کہ میں دیویوں کے معاملات میں پڑوں۔ اور حسینہ کائنات کا انتخاب کروں؟ یہ کام خود بڑے دیوتا کے کرنے کا ہے۔"
ہرمیز نے جھنجلا کر کہا۔ "پیرس! یہ بڑے دیوتا کا حکم ہے۔ تم ربّ البرق والرّعد کا حکم ٹال نہیں سکتے۔"

"لیکن اس پر عمل کرنا میری طاقت سے باہر ہے"
"تمھیں تینوں دیویوں سے ایک انعام قبول کرنا پڑے گا"
"ہر انعام مجھ پر ہلاکت کے دروازے کھولے گا"
"ہلاکت فانیوں کا ناگزیر انعام ہے"
"یہ تو بہت بڑی ستم ظریفی ہے"
"تم نہیں جانتے۔ کہ نظام کائنات چلانے والے خدا کس فکر میں ہیں۔ اور انسانوں کے مستقبل کو کیا شکل عطا فرمانا چاہتے ہیں۔ تمھیں وہی کرنا پڑے گا۔ جو بڑے دیوتا کی آرزو ہے"
"آرزو تو میری بھی ہے"
"دیوتا کی آرزو میں تمھاری آرزو شامل ہے تمھاری آرزو اس کی آرزو سے باہر نہیں"
پیرس چپ ہو رہا۔ اور ہرمیز اُسے پکڑ کر آئیڈا پہاڑ پر لے گیا۔
پیرس نے آخری بار احتجاجاً کہا۔ "یہ آرزو تو شاید مجھے ختم کر کے رہے"
"کچھ بھی ہو، تمھیں میری بات ماننی پڑے گی۔ میں تمھارا اصل اور حقیقی معبود ہوں۔ آسمانی خداؤں سے پہلے میں ہی خاص و عام میں پُجتا تھا"
"سمجھ لیا۔ دیوتا ہمیں مٹانے پر تلے ہیں"
ہرمیز نے کچھ نہ کہا۔ اور پیرس کو تنہا چھوڑ کر چلا گیا۔

بڑے دیوتا کے حکم سے دیویوں کا جلوس مرتب کیا گیا۔ ہرمیز اُن کا رہبر ہوا۔ اُلمپس کے تمام خداؤں نے سانس روک لیا۔ آج کا دن بڑا اہم تھا۔ کیونکہ آج کے دن سے پیرس کے فیصلے کے بعد مصروفیتوں کا نیا مگر نہایت ہول آفرین سلسلہ شروع ہونے اور نئے مستقبل کی نیو رکھی جانے کو تھی۔ خدا قدرے فکرمند بھی تھے۔ کیونکہ ان میں اعصابی جنگ چھڑنے کا قوی احتمال تھا۔ اس اعصابی جنگ میں انسان پستا تھا۔ دیوتاؤں کے مشغلے میں انسان کو بڑی مہنگی قیمت ادا کرنی پڑتی۔ خدا انھیں کھلونا بنانے اور کھلنڈرے پن کا خطرناک مظاہرہ کرنے کے درپے تھے۔ اس نے دل ہی دل میں کہا: "جنگ کے میدان میں انسان نہیں خدا لڑتے ہیں۔ انسان کی تقدیر تو خداؤں کے ہاتھ میں ہوتی ہے خدا باقی رہتے ہیں۔ انسان مٹ جاتا ہے"
پیرس کے چہرے سے شادابی غائب تھی۔ سورج کی ارغوانی کرنیں بھی اس کے چہرے کو درخشاں نہ کر سکیں۔ کوئی امید، کوئی اُمنگ اس کے دل میں موجزن نہ ہوئی۔ وہ ایک گمبھیر سوچ میں گھرا تھا۔ اس کے دھیان میں بار بار دیویوں کے وعدے آتے۔ دیویوں کے انعامات کے تصور سے اس کی سوچ میں چکاچوند آتی۔ لیکن وہ رہ رہ کر سنجیدگی کی نذر ہو جاتا۔ دیویوں کا انعام ایک سے ایک بڑھ کر سجیلا، دلفریب اور لائق صد اعتنا تھا۔ حسینۂ عالم، دولت اور قوت، شان اور جنگجویانہ نام وری سب کی اسے ضرورت تھی۔ پھر ایتھ ای نی تو اس کی کنواری بیٹی بننے کو تیار تھی۔ ان انعامات کے تصور سے اس کے جذبات میں چنگاریاں اُچٹنے لگیں۔ تاہم فکر کا دھارا تیز، شدید اور گہرا تھا۔ اس نے دیویوں کو قریب دیکھا تو پوری شدت سے حواس کو یکجا کیا۔

تمام خدا ہجوم کئے ہوئے تھے۔ اور اس آن ایلیون کے چرواہے شہزادے پر پوری کائنات کا بوجھ پڑا تھا۔ اتنا بڑا بوجھ وہ فقط آسمانی خداؤں کے فضل و کرم سے اُٹھا سکا۔ اس نے اپنی گم شدہ قوتِ ارادی بحال کی۔ اور پھر جذبات کی آگ نے اس کی رگ رگ کو بھڑکا یا۔ اس کی نگاہوں میں ہیلن تحریر برق کی مانند تیر گئی، پورا یونان، آکیاؤں کی ساری شان اس کی ٹھوکر پر سمٹ آئی۔ یونان اس کی رقابتوں کا گہوارہ اور اس کے

انتقام کا ہدف تھا۔ ہیلن یونان ہی نہیں، بلکہ دنیا کا حسین ترین تحفہ تھا۔ اور اسے پاکر ایلیان کی سرزمین بجا طور پر اپنا سر فخر سے اونچا کر سکتی تھی۔ یونان سے انتقام لینے اور اس کا سر نیچا کرنے کا موقعہ تھا ــــ اس کے سامنے دیویاں کھڑی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں سنہری سیب چمک رہا تھا۔ اور دیویوں کی نگاہیں اُس کی کرن کلیوں سے الجھ رہی تھیں۔ اُس نے وہ سیب ازدواجی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ایک شورِ محشر بپا ہوا۔ دنیا کے حسین ترین مرد نے دنیا کی حسین ترین عورت کی خاطر حسینۂ فلک کا انتخاب کیا۔

دیوی دیوتاؤں میں کھلبلی مچ گئی۔ ایک بزرگ خدا نے کہا: "یہ انصاف نہیں، پسند ہے۔" دوسرے نے کہا، "احمق نے اپنی نسل کو مٹانے کی تدبیر کی ہے۔"

پیرس نے انعام کا تقاضا کیا۔ یہ تقاضا زیب کی نذر ہوا۔ اس نے ایک نئی داستان کی شیرازہ بندی کی۔ ہیلن اور پیرس کی ذات داستان کی سب سے بڑی چیستان بن کر رہ گئی۔

حمید کاشمیری

سیپ کراچی۔

کھلونے

گیلی گیلی یونیفارم پہن لینے سے اُسے اپنا جسم اجنبی سا معلوم ہو رہا تھا۔ یونیفارم بھی کیا تھی، ادنیٰ درجے کی ملیشیے کی قمیض شلوار۔ یہی اس کے اسکول کے تمام لڑکوں کی وردی تھی۔ اسکول بھی ایک گندے سے نالے پر واقع تھا۔ جس میں زیادہ تر تنگی والوں، چپراسیوں، ٹھیلے والوں، اور بے روزگاروں کے بچے پڑھتے تھے۔ اسی لیے اسکول کے منتظمین نے وردی کے لیے ملیشیا کا انتخاب کیا جو کہ اسکول کے طلباء کی حیثیت کے عین مطابق تھا۔

اس کے پاس اگرچہ ایک ہی جوڑا تھا۔ لیکن اس کی ماں ہمیشہ کوشش کرتی کہ اُس کا بچہ صاف ستھرے کپڑے پہن کر اسکول جائے۔ اسی جذبے کی تسکین کے لیے اُس نے رات سوتے میں اُٹھ کر اُس کی یونیفارم دھو ڈالی تھی۔ جو کہ صبح تک نہیں سوکھ سکی۔ اور اُسے مجبوراً گیلی ہی پہن لینی پڑی۔ اور اُسے اپنا جسم اجنبی سا معلوم ہونے لگا۔ جیسے اُس کا وزن ایک دم بڑھ گیا ہو۔ اور وہ نیچے زمین میں دھنستا جا رہا ہو۔ وہ یونہی جھرجھری سی محسوس کرتا بستے کو گلے میں پھندے کی طرح لٹکائے اور لکھائی کی تختی بغل میں دبائے صحن کے دروازے سے باہر نکلا۔ اور سڑک کے کنارے کھڑا ہو کر اپنے باپ کا انتظار کرنے لگا۔ جو کہ ابھی تھوڑی دیر میں تیار ہو کر نکلے گا۔ اور دفتر جانے سے پہلے اپنے بیٹے کو اسکول چھوڑتا ہوا جائے گا۔ اُس نے گھوم کر کوارٹر کی طرف دیکھا۔ ابھی تک اُس کا باپ کہیں باہر نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ زیرِ لب کوئی پہاڑہ گنگناتے ہوئے سامنے سڑک کی دوسری سمت قلعہ نما بنگلے کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں اندرون دیوار ایک فٹ بال بار بار اُوپر خلا کی طرف بلند ہوتا تھا۔ وہ بڑی دلچسپی سے لٹو کی طرح گھوم گھوم کر اوپر جانے والے فٹ بال کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے سوچا کہ کاش کوئی اُسے زور سے کک مار دے تاکہ فٹ بال دیوار سے باہر سڑک پر آن گرے۔ پھر بڑا مزا آئے گا۔ جب کوئی لڑکا اُسے لے بھاگے گا۔ پھر اچانک اُس نے دیکھا کہ فٹ بال کو واقعی بڑے زور کی کک لگی۔ اور اُس نے عقاب کی طرح فضا میں ایک طویل اُڑان لگائی۔ وہ کھڑے کھڑے غیر ارادی طور پر فٹ بال کی اُڑان کے ساتھ پتنگ کی جھونک کی طرح بل کھا گیا۔

"چھی چھی چھی ....." وہ مایوس ہو کر پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اتنی بلندی پر جانے کے باوجود فٹ بال پھر بھی چاردیواری کے اندر ہی گرا تھا۔

"اُفوہ! کتنا بڑا مکان ہے۔" مکان کی وسعت نے حیرت سے اُس کا منہ کھول دیا۔ اور ساتھ ہی اُس کی گردن پیچھے اپنے مختصر سے کوارٹر کی طرف گھوم گئی۔ جہاں ایک دن اُس نے گیند ہاتھ میں ذرا سی اوپر اُچھالی تو برابر والوں کے صحن میں گر گئی۔ جو آج تک اُسے واپس نہیں مل سکی۔ اُس نے ناک چڑھالی۔
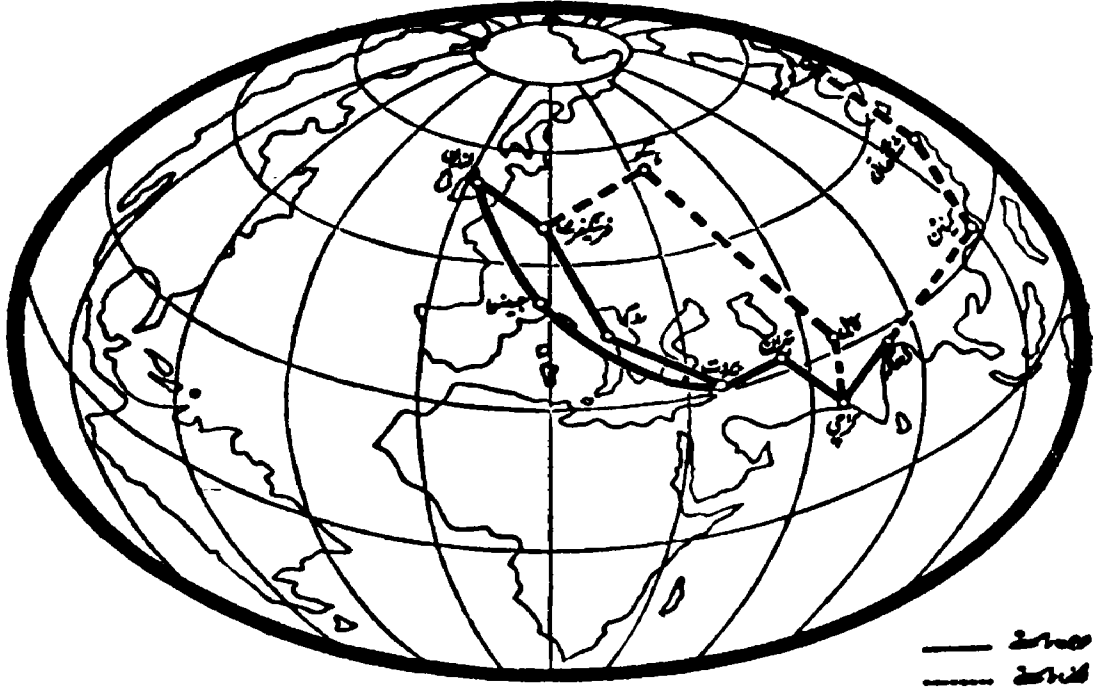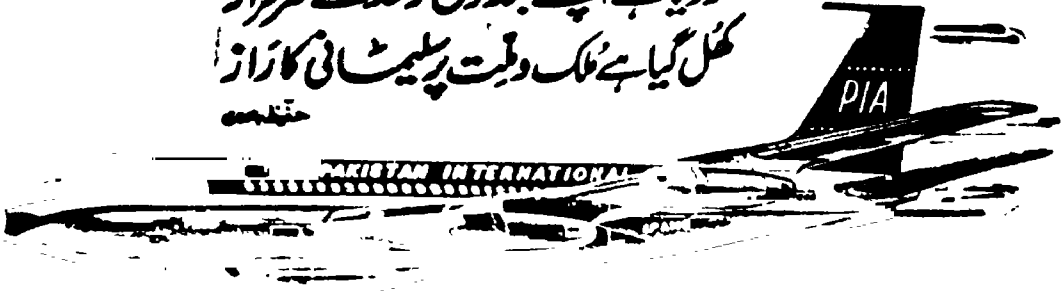
آج طیارے ہمارے خوبیٔ پرواز سے | امن کا گہوارہ، ہر طیارہ، پاکستان کا
جلوہ آرا ساری دنیا پر ہیں فخر و ناز سے | فیض جاری ہے ترقی اور اطمینان کا

الحمدللہ ہمارے تیز رفتار ہوائی جہاز، اپنے عملے کی فنی مہارت اور شریفانہ کردار کے سبب ساری دنیا سے مبارک باد لے کر آتے ہیں۔
اس مبارکباد میں ہر پاکستانی بچہ، بوڑھا جوان، مرد، عورت سب حصہ دار ہیں مبارکباد برکت ہے حرکت ہی میں برکت

PIA

پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز
باکمال لوگ لاجواب پرواز

"اوہنہ، اپّا نے کتنا چھوٹا مکان بنایا ہے"۔ اُسے یہ کوارٹر خواب معلوم ہونے لگا۔ اُس نے پھر سامنے بنگلے کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ ہرے بھرے درختوں میں گھرے ہوئے محل نما بنگلے کو دیکھ کر اُس کے چہرے پر شادابی سی چھا گئی۔ فٹ بال ابھی تک وقفے وقفے سے اوپر خلا میں بلند ہوتا تھا۔ اور ساتھ ہی اُسے ہنسی اور کھیل کود کا شور بھی سنائی دیتا تھا۔ پھر اچانک فٹ بال غائب ہو گیا۔ اور کھیل کود کی آوازیں بھی بند ہو گئیں۔ اُس نے پھر گھوم کر پیچھے اپنے کوارٹر کی طرف دیکھا۔ نہ جانے اس کا باپ آج اندر سے نکلتا کیوں نہیں تھا۔ اُس کی نظریں پھر سامنے خوش نما بنگلے کی طرف اُٹھ گئیں۔ جہاں پھاٹک سے دو لڑکے نمودار ہوئے۔ ایک تقریباً اُسی کی عمر کا تھا۔ اور دوسرا کچھ بڑا لگتا تھا۔ دونوں کی بغل میں کچھ کتابیں تھیں۔ وہ آسمانی رنگ کے نیکر اور سبز بلیزر کے کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ اور دونوں کے کوٹ کی اوپر والی جیب پر سنہری رنگ کے خوبصورت بیج بنے ہوئے تھے۔ ان کے چہروں کے رنگ صاف اور آنکھیں شوخ تھیں۔ بال چمک دار اور سلیقے سے سنورے ہوئے تھے۔ تیز لہجے میں انگریزی بولتے ہوئے اُنھوں نے سڑک پار کی۔ اور اُس کی طرف دھیان دیے بغیر اُس کے قریب کھڑے ہو گئے۔ وہ منھ کھولے انھیں اس طرح سر سے پاؤں تک دیکھنے لگا جیسے کوئی دیہاتی پہلی مرتبہ قطب مینار کو دیکھ رہا ہو۔ اُن کے سر کے بالوں سے لے کر پاؤں تک ہر شے پر وہ حسرت سے نظر ڈال رہا تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر ان کے کوٹ پر بنے ہوئے بیج کو بڑے اشتیاق سے دیکھا۔ اُن کی گوری گوری پنڈلیاں اور نیکر کے اندر سے جھلکتی ہوئی صاف اور شفاف رانیں اُسے بڑی پیاری معلوم ہوئیں۔ اُس نے غیرارادی طور پر اپنی شلوار کے پائنچے بھی گھٹنوں سے اوپر کر دیے اور شلوار کو نیکر سا بنا کر اپنی پنڈلیوں اور رانوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ اُسے اپنی ٹانگیں بھی خوبصورت اور چمک دار معلوم ہوئیں۔ اُس نے ایک نظر پھر اُن کی طرف ڈالی۔ اور پھر اپنی ٹانگوں کی طرف۔ جیسے دونوں کا مقابلہ کر رہا ہو۔ اُس کا جی چاہا، وہ بھی شلوار کو کاٹ کر نیکر بنا دے۔

"لک ایٹ دِس اسٹوپڈ بوائے!" اُن میں سے ایک نے اُس کی حرکت پر غصّے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

وہ اگرچہ اس بات کے مفہوم کو نہیں سمجھ سکا۔ لیکن لہجہ سے اُس نے اندازہ کر لیا، کہ انھوں نے خفگی کا اظہار کیا ہے۔ اُس نے سہم کر پائنچے نیچے چھوڑ دیے۔ اور قدرے پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ گھوم کر ایک نظر پھر اپنے کوارٹر کی طرف دیکھا۔ اُس کا باپ ابھی تک نہیں نکلا تھا۔ وہ مایوس ہو کر پھر اُن کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ وہ دونوں بھی بے چینی سے کسی چیز کے منتظر معلوم ہوتے تھے۔ اور ایک کے چہرے پر تو سخت غصّے کے آثار نمایاں تھے۔ وہ سڑک کے دونوں جانب دیکھتے ہوئے نفرت بھرے لہجے میں بولا:

"آئی ڈونٹ نو وھاٹ ہیپنڈ ٹو دیٹ ایڈیٹ ڈرائیور"۔ اُسے اس کا غصّے کے عالم میں انگریزی بولنا بہت اچھا معلوم ہوا۔ اُس نے دل ہی دل میں اُس کے جملے کو دُہرانے کی نادان سی کوشش کی۔

"آئی ڈونٹ نوں نٹ فیٹ ٹو ٹیٹ ڈین مین"۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ بھی ایسی ہی انگریزی بولنا سیکھ لے۔ لیکن ابھی اُس نے اے۔ بی۔ سی پڑھنی شروع کی تھی۔ جانے انھوں نے کیسے اتّی جلدی سیکھ لی ہے۔ اُسے حیرت ہونے لگی۔ وہ اُن کے منھ سے اور انگریزی سننے کے لیے اُن کے منھ دیکھنے لگا۔

"وھائے ہی از گیزنگ ٹو ورڈس می؟" اُسے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر ایک نے دوسرے سے پوچھا۔

"ہی از میڈ۔" دوسرے نے جواب دیا۔ پھر دونوں ہنس دیے۔ اور اس پر انکشاف ہوا کہ انگریزی میں بھی لوگ ہنستے ہیں۔ وہ بھی ساتھ ہنس دیا۔ اور وہ دونوں سنجیدہ ہو گئے۔ اور ایک نے دوسرے سے پھر دریافت کیا "ناؤ وئش رانگ وِدھ ہم"

"ہی از کریزی" دوسرے نے نظر انداز کرتے ہوئے جواب دیا۔

"شیل آئی گو ہِم اے فسٹ؟" پہلے نے بے چینی سی محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"اونو بوائے ۔ ڈونٹ بی فول!" دوسرے نے امن پسندی کا مظاہرہ کیا۔
وہ اُن کے اور زیادہ قریب ہو گیا۔ اور اُن کا اس طرح تیز تیز انگریزی بولنا اُسے بہت اچھا معلوم ہونے لگا۔ اُس نے اور زیادہ حیرت و استعجاب سے اُن کے منھ کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ وہ اس بات سے قطعی بے خبر تھا کہ اُن کی گفتگو کا موضوع وہ خود بنا ہوا ہے ۔ ان میں سے ایک جو مزاج کے اعتبار سے چڑچڑا تھا اُسے اُس کا ٹکٹکی باندھے دیکھنا سخت ناگوار گزرا۔ اور وہ آپے سے باہر ہو گیا۔
"ٹیل ہم ٹاٹ ٹو ٹک ایٹ ہی" ———— "لیٹ ہم بی بواتے" دوسرے نے میانہ روی اختیار کی۔
"آئی ول بلاسٹ ہم" وہ خشم آلود لہجے میں بولا۔ اور جب تک دوسرا کچھ سمجھتا وہ جذبات کے ہاتھوں بے قابو ہو چکا تھا۔ اُس نے گھما کے ایک بھر پور ہاتھ اُس کے نتھنوں پر دے مارا۔ تختی اُس کے بغل سے چھوٹ گئی۔ ناک سے خون پھوٹ پڑا۔ اور وہ چکرا کے پیچھے نالی میں جا گرا۔ پھر نہایت بے بسی کے عالم میں جسم سہلاتا ہوا زمین سے اُٹھا مسکین سی صورت بنائے پیچھے اپنے کوارٹر کی طرف دیکھا۔ اُس کا باپ ابھی تک کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ دونوں اُس کے پاس کھڑے تھے۔ اور اب وہ ڈر کے مارے اُن کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ البتہ اُس کے اندر نفرت اور حقارت کا ایک طوفان بپا تھا۔ اُس کا جی چاہا کہ ایسے ہی چند گھونسے وہ بھی اُس کے منھ پر رسید کرے۔ لیکن شکست خوردگی، بے بسی اور احساس کمتری کے جذبے نے مسلسل اُس کی گردن کو جھکائے رکھا۔ اور وہ دوسری طرف مڑ کے ناک سے بہتے ہوئے خون کو صاف کرنے لگا۔
"وھاٹ یو ڈڈ یو ڈیم فول" اُس کی حالت دیکھ کر ایک نے دوسرے کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "ہی از بلیڈنگ"
"اِٹس ہز فالٹ ناٹ مائن" دوسرے نے بے رخی سے جواب دیا۔
تبھی ایک خوبصورت کار اُن کے قریب آ کر کھڑی ہوئی۔ اور دونوں جست بھر کے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی روانہ ہو گئی۔ اور اُس کی ارمان بھری نگاہیں گاڑی کے اوجھل ہونے تک اُس کے تعاقب میں رہیں۔ زمین پر گرنے سے اُس کی گیلی شلوار اور قمیص کا کچھ حصہ گرد آلود ہو گئے تھے۔ اور اُسے اپنے نتھنوں کی چوٹ سے زیادہ اب وردی خراب ہونے کا افسوس ہو رہا تھا، جو اُس کی ماں نے نصف شب کو اُٹھ کر دھوئی تھی۔ اُس نے بے بسی کے عالم میں ایک بار پھر کوارٹر کی طرف دیکھا تو اس کا باپ بغل میں کھانے کا برتن دبائے تیز تیز چلا آ رہا تھا۔ باپ جب قریب آیا تو بیٹے کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے پھوٹ آئے۔ باپ نے لپک کر اُسے اپنے سینے سے لپٹا لیا۔ پھر اُس کے چہرے اور کپڑوں کی طرف دیکھ کر حیرت اور دُکھ کے ملے جلے جذبے کے ساتھ پوچھا۔
"کیا ہوا بیٹے؟"
"ایک لڑکے نے مارا ہے۔" وہ سسک کر بولا۔
"تم نے مجھے کیوں نہ بلایا — تم بھی تو مارتے ناں اُس کو — تم نے نہیں مارا —؟" باپ نے تڑپ کر پوچھا۔
بیٹا چپ رہا۔ اور باپ کو غصہ آ گیا۔ میں کہتا ہوں تم نے کیوں نہیں مارا اُسے —؟
"وہ بنگلے میں رہتے ہیں۔ اُن کے پاس موٹر بھی ہے۔" بچے نے نہایت معصومیت سے اپنی شکست کا جواز پیش کیا۔
اب باپ چپ رہا۔ اور بیٹے کو غصہ آ گیا۔ "تم نے کیوں نہیں بنگلہ بنایا۔ تمھارے پاس موٹر کیوں نہیں ہے؟"
باپ نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ پہلے سے زیادہ سنجیدہ ہو گیا۔ اُس نے بیٹے کے کپڑوں کی گرد جھاڑی۔ آنسو پونچھے۔ نتھنوں سے خون صاف کیا۔ اور ہاتھ پکڑ کر دونوں چپ چاپ چلنے لگے۔ کچھ دُور ایک چوک پر پہنچے تو باپ رُک گیا۔ اور نیچے زمین پر بیٹھ کے

قد کے برابر بیٹھ گیا۔ اور اُس کے گال تھپتھپا کر نہایت محبت بھرے لہجے میں پوچھنے لگا۔

"تم نے کیا کہا تھا بیٹے، کہ میرے پاس موٹر کیوں نہیں ہے؟"

بیٹا خاموش رہا۔ اور کافی دیر پہلے اپنے کیے ہوئے سوال پر غور کرنے لگا۔

"میرے پاس بہت موٹریں ہیں۔ میں نے کبھی تمھیں ان میں بٹھایا نہیں۔" اُس کا باپ حوصلہ افزا لہجے میں بولا۔ بیٹا خوش بھی ہوا۔ اور حیران بھی۔ باپ کی یہ بات اُس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ وہ ٹکٹکی باندھے باپ کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

"دیکھ......" باپ نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھ یہ جتنی پیلی چھت والی موٹریں ہیں یہ سب میری ہیں ــــ ابھی تمھیں بٹھاتا ہوں ــــ دیکھ۔" ایک پیلی چھت والی ٹیکسی جو قریب سے گزری تو اُس کے باپ نے ہاتھ کھڑا کر دیا۔ ٹیکسی رک گئی۔ وہ بیٹے کو لے کر شاہانہ طریقے سے اُس میں داخل ہو گیا۔

"چلو......" وہ ڈرائیور سے مخاطب ہوا۔ اور ڈرائیور نے فوراً گاڑی اُس کے اشارے پر روانہ کر دی۔ "دیکھا......؟" اور وہ پھر بیٹے سے مخاطب ہوا۔ اور فاتح مندانہ انداز میں پیچھے ٹیک لگائی۔ خوشی سے بیٹے کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ فرطِ محبت سے باپ کے ساتھ لپٹ گیا۔ بیٹے بیٹے اُس کی نگاہ باہر سڑک پر جو پڑی تو وہ ایک دم چونک پڑا۔ اُس کے برابر سے ایک پیلی چھت والی گاڑی اور گزر گئی تھی۔

"ابّے جی کی ایک اور موٹر!" وہ اُچھل کر بولا۔ معاً اُسے دوسری نظر آگئی۔

"وہ ایک اور ــــ" وہ دوبارہ اُچھلا ــــ پھر وہ باہر ہی دیکھتا رہا۔ اُسے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ابّے جی کی ایک آدھ موٹر نظر آتی رہی۔ اور اُس کا چہرہ لحظہ بہ لحظہ مسرّت و شادمانی سے سرخ ہوتا گیا۔ اُس نے اپنی مسرت کی داد وصول کرنے کے لیے ایک بار گھوم کر جو باپ کی طرف دیکھا تو ٹھٹک سا گیا۔ "ابّا جی روتے ہو؟" اُس نے سہم کر پوچھا۔

"نہیں بیٹے، میری آنکھ میں کوئی تنکا پڑ گیا ہے۔" باپ نے چوکس ہو کر جواب دیا۔ "تُو ذرا پھونک مار آنکھ میں۔"

بیٹے کی جان میں جان آئی۔ اور وہ نہایت پیار سے باپ کی آنکھوں میں پھونک مارنے لگا۔

"ایک بات بتاؤں تمھیں ــــ؟" باپ نے مشفقانہ لہجے میں پوچھا۔

"کیا؟" بیٹے نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

"میں تمھارے لیے بنگلہ بھی بنوا رہا ہوں۔ معلوم ہے؟"

"کدھر ہے ــــ؟" بچّے نے بے تابی سے پوچھا۔

"ابھی بتاتا ہوں۔" اُس نے سرگوشی میں جواب دیا ــــ پھر چند لمحوں کے بعد ایک زیرِ تعمیر عمارت کے پاس ٹیکسی رکوا دی۔ بچّے کو لے کر نیچے اُترا۔ اور زیرِ تعمیر عمارت میں داخل ہو گیا۔

"یہ ہے تمھارا بنگلہ۔" اُس نے بچّے کی پیٹھ تھپتھپائی۔ بچہ خوشی سے پھولنے لگا۔ اور حیران ہو کر چاروں طرف کام کرتے ہوئے مزدوروں کو دیکھنے لگا۔ وہاں ایک جان پہچان کے منشی سے اُس کے باپ کی علیک سلیک ہوئی۔ مصافحہ کیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی خیر و عافیت دریافت کی۔ پھر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اُس کے باپ نے منشی سے قدرے اونچی آواز میں پوچھا:

"ہاں بھئی منشی صاحب بنگلہ کب تک تیار ہو جائے گا ــــ؟"

"بس جی، اب تو انشاء اللہ جلد ہی تیار ہو جائے گا۔" منشی نے اپنے طریقِ کار پر اعتماد ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ وہ بیٹے کو لے کر جلدی

جلدی باہر نکل آیا۔

"دیکھا، منشی کہتا ہے جلدی تیار ہو جائے گا۔ پھر ہم یہاں آجائیں گے۔ ہاں!" اُس نے بیٹے کو مزید اطمینان دلایا۔ بیٹا خوشی سے اُلٹی چھلانگیں لگاتے ہوئے باپ کے ساتھ چلنے لگا۔

اگلے روز حسبِ معمول وہ لبِ سڑک کھڑا باپ کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس کے ذہن میں آج بے شمار سوالات کلبلا رہے تھے۔ جن کی باپ سے وضاحت چاہنے کے لیے وہ بے چین تھا۔ وہ کل شام ہی پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کا باپ رات بہت دیر سے آیا تھا۔ جب کہ وہ سو گیا تھا۔ کھڑے کھڑے اُس کی نگاہ پھر سامنے وسیع و عریض، سرسبز و شاداب بنگلے پر پڑی، جس میں رہنے والے لڑکے نے کل اُسے ذلّت آمیز طریقے سے پیٹا تھا۔ وہ لگاتار اُس بنگلے کی طرف دیکھتا رہا۔ لیکن آج اُس کے نزدیک بنگلے کی نہ جانے اہمیت کیوں ختم ہو گئی تھی۔

"ہونہہ ....." اُس نے نتھنے پھلا کر ایک جھٹکا سا دیا۔ "اس سے اچھا تو ہمارا بنگلہ بنے گا۔" وہ دوسرے ہی لمحے چوکس ہو گیا۔ اُس نے دیکھا کہ پھاٹک سے وہی کل والے دو لڑکے نکل رہے تھے۔ ان دونوں نے کل ہی کی طرح تیز تیز انگریزی بولتے ہوئے سڑک پار کی اور اُس کے قریب آکر کھڑے ہو گئے۔ اُس نے پیشانی پر حقارت سے پُر ایک سلوٹ ڈال کر اُس لڑکے کی طرف دیکھا جس نے اُس کی ناک سے خون جاری کر دیا تھا۔ اور غیر ارادی طور پر اُس کا ہاتھ خود بخود اپنے دُکھتے ہوئے نتھنے کی طرف اُٹھ گیا۔ اُس کے اندر انتقام کا ایک شعلہ سا بھڑکا۔ گلے میں پھندے کی طرح لٹکے ہوئے بستے کو اُس نے پشت کی طرف کر دیا۔ اور لکھنے والی تختی کو مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ احساسِ کمتری کی کینچلی اُس کے جسم سے اُترتے ہی اُس کا سینہ تن کے باہر نکل آیا۔

"لُک ایٹ دس ایڈیٹ، وٹس ہی ڈوئنگ؟" ایک نے حقارت سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے دوسرے سے کہا۔

وہ لہجے سے سمجھ گیا کہ کچھ اُس کے متعلق بات ہوئی ہے۔ اُس نے منہ چڑا کر بھونڈی سی نقل اُتار دی۔ "لوکیٹ دِس ایڈوٹ ہی ڈُون۔" لڑکا چراغ پا ہو گیا۔ اور منہ سے کف جاری کرتے ہوئے بولا۔ "یو ڈیم فول۔ سن آف اے بچ۔ آئیل بلاسٹ یو باش ٹر۔" پھر جوش میں آکر اُس نے کل کی طرح ایک مکّا گھما کے اُس کے نتھنوں کی طرف بڑھایا۔ مگر مکّا ابھی خلا ہی میں تھا کہ زنّاٹے سے ایک تختی اُس کے سر پر لگی۔

"او گاش۔" اُس کی چیخ نکل گئی۔ وہ ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ دوسری تختی اُس کے سر پر آن بجی۔ اُس کی دوسری چیخ حلق میں اٹک گئی۔ اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

"ہیلپ رنی۔" اُس نے گھٹی ہوئی آواز میں دوسرے کو مدد کے لیے پکارا۔ اور دوسرا بھی ایک قدم آگے لپکا ہی تھا کہ تختی نے بڑھ کر اُس کی بھی پیشانی پر استقبال کیا۔ اُسے چکر آ گیا۔ اور کانوں سے سائیں سائیں کی آوازیں نکلنے لگیں۔ پھر ایک اور زوردار تختی جو اُس کی گردن پر پڑی تو سائیں سائیں کی آوازیں بھی بند ہو گئیں۔

"رن ہوائے رن۔" اُس نے خوف زدہ ہو کر دوسرے کا بازو جھنجھوڑا۔ اور دونوں سرپٹ بنگلے کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہ بھی گھما گھما کے تختیاں مارتے ہوئے پھاٹک تک اُن کے پیچھے گیا۔ اور ہر تختی پر اُس کے منہ سے ایک نئی انگریزی گالی نکل رہی تھی۔

"یوں ٹینٹ سینٹ۔"

"ڈین مین فول۔"

"باش ٹاپ۔"

ونّس زمری
سیپ ۔ کراچی

شیرف

اس کا نام تو شریف تھا۔ لیکن تمام گھر والے اسے شیرف "Sharrif" کہتے تھے اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ہمدانیز کے گھر میں خالص امریکہ اور لندن کا امپورٹڈ ماحول تھا۔ چھوٹے لڑکے اسکیٹ شوز پہن کر دھما چوکڑی کرتے تھے اور جوان لڑکیاں فیشن میگزین پڑھ کر کپڑے سلوا کے نیوایئر اور بار وسٹ بال ناچنے کی تیاری کیا کرتی تھیں، انگریزی بولتی تھیں، انگریزی میں ہی عبادتی جملے دہراتی تھیں۔ انگریزی میں ہی سوچتی اور شاید ڈریم بھی کیا کرتی تھیں۔ بال ترشواتی تھیں میکس فیکٹر کا میک اَپ استعمال کرتی تھیں۔ اور نائٹی پہنتی تھیں۔ ثریا ہمدانی سب سے بڑی تھی۔ گداز جسم، بھرے بھرے رخسار اور سُرخ ہونٹوں، مَرمَریں شانوں اور بھُورے بالوں والی لڑکی جس کی شادی اس کے اسکنڈلز سے گھبرا کر مسز ہمدانی نے ایک کیمسٹ سے کردی تھی۔ اور وہ اپنے کیمسٹ شوہر سے سوگز کا فاصلہ اس لیے برقرار رکھتی تھی کہ اس کے کپڑوں سے دَواؤں کی بو آتی ہے ۔ اور نگزیب اس کا نام نہاد شوہر تھا جو ہر حال میں بیوی کو شریک دیکھ کر خود تالیاں بجاتا۔ اور لوگوں سے مخاطب ہو کر کہتا...... "کتنی سوئٹ ہے ثریا دیکھا تم نے کتنے اچھے اور نیچرل انداز میں اس نے سونی کی کمر میں ہاتھ ڈال رکھا ہے۔ رقص اس کو کہتے ہیں مسٹر!" اور اسے رقص گاہ میں چھوڑ خود اپنی کار میں بیٹھ کر تمام رات اونگھتے ہوئے گزار دیتا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ اسے کار سے اتار کر لابی میں بٹھا دیتی اور خود اس کی گاڑی میں اپنے ہم رقص کو چھوڑنے چلی جاتی ۔

دُوسری لڑکی صفیہ ہمدانی تھی ــــــــــ جو ٹیپ ریکارڈ آن کرکے انگریزی موسیقی پر رقص کیا کرتی تھی، سینما دیکھتی، لڑکوں کے ساتھ پک نک پر جاتی تھی، کار چلاتی تھی اور سو میل کی رفتار سے گاڑی چلا کر خاندان میں ریکارڈ قائم کر چکی تھی۔ مسز ہمدانی کے تینوں لڑکے امریکہ پلٹ تھے، ایک کی بیوی جرمن تھی اور دوسرے کی ایرانی اور تیسرا لڑکا مولوی مشہور تھا اس لیے کہ امریکہ میں بلاناغہ نمازیں پڑھی تھیں۔ رُوزے رکھے تھے چنانچہ سب سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ خاندان کی ایک جاہل اور غریب لڑکی سے شادی کرلی تھی اور ایک زراعتی فارم کو چلا رہا تھا۔ گھر کے تمام لوگوں کی نگاہ میں وہ کنٹر روٹیو، اور بور تھا۔ خود مسز ہمدانی بھی اسے اچھی نظروں سے نہیں دیکھتی تھیں۔ یہاں تک کہ ہائی بروز سوسائٹی میں بھی اس کا تذکرہ نہیں کرتیں اس کی ذات کچھ ایسی تھی جیسے کسی نفیس سوٹ پر کوئی داغ یا دھبہ نمایاں نظر آنے لگے ۔

چنانچہ تمام گھر والے شریف کو شیرف کہا کرتے تھے۔ اور شیرف کو یہ نیا نام بہت عزیز تھا۔ وہ خود کو بال روم میں چھوڑے جانے والے غبارے کی طرح پھولا ہوا محسوس کرتا تھا۔ اس نے دھیرے دھیرے انگریزی کلچر اور زبان سے بھی واقفیت پیدا کرلی تھی۔ مثلاً وہ سوئٹر کو پُل اور چادر کو بیڈ کور، اور تصویر کو پوٹریٹ، کہنا سیکھ گیا تھا۔

وہ صبح سویرے اٹھتا ــــــ بقول اکبر ہمدانی کے لائٹ ہاتھ لیتا۔ بیلے زین کی پتلون پہنتا، جوتوں کو چمکاتا، کلف والے کالر کی قمیض پہنتا۔ اور کچن سے چائے کی ٹرالی ڈھکیلتا ہوا سب سے پہلے اکبر ہمدانی کے کمرے میں آتا۔ اس کی جرمن وائف کو گڈ مارننگ کہتا۔ دھیرے سے مسکراتا۔ کمرہ میں پھیلی ہوئی خوشبو کو سونگھتا۔ سگرٹ کا نیا ٹن اکبر ہمدانی کے سامنے لا کر رکھتا۔ اور تھوڑی دیر کھڑے ہو کر نئے حکم کا انتظار کرتا۔

اس کیلیے یہ بڑا ہی قیمتی لمحہ ہوتا تھا۔ اس عرصہ میں وہ ترشے ہوئے سرخ بلوری ہونٹوں کی ڈریسنگ گاؤن کی شکنوں اور کھلے گلے سے طلوع ہونے والے چاند کے ہالوں کے اور بالوں کے آبشار کے متعلق سوچتا۔ اور اس کا دل ایک عجیب سی ترنگ سے بھر جاتا۔ اس کا جی چاہتا وہ کچھ دیر یونہی کھڑا رہے۔ لیکن کوئی نیا حکم نہ پا کر وہ دوسرے کمرہ میں چلا جاتا ــــــ وہی چائے کی ٹرالی۔ صبح کا اخبار، سگرٹ کی ڈبیا۔ اور ان کمروں میں آتے وقت جیسے اس کے دل میں بھی ٹرالی کے پہیوں کی سی تیزی آجاتی تھی۔ اصغر ہمدانی، کثرت شراب نوشی کی وجہ سے اکثر اسے نیم عریاں حالت میں پڑا ہوا نظر آتا، اور اس کی ایرانی بیوی آئینے میں بال سنوارتی اور گنگناتی نظر آتی ــــــ وہ ایک ماہر وائلنسٹ تھی۔ جب وائلن بجاتی تو شیرف دم بخود رہ جاتا۔ وہ اس کے وائلن سے ابھرنے والی موسیقی کو فلمی دھنوں سے ملاتے ملاتے تھک جاتا۔ لیکن کبھی کامیاب نہ ہوتا۔ اور پھر تھک ہار کر وہ اس کی انفرادی دھن میں کھو جاتا۔ وہ اصغر کی طرف بڑھتا تو اسے اکثر جگانے سے منع کر دیتی ــــــ آقا خفتہ است ــــــ اس کے جملے مشکل سے اس کے پلے پڑتے، بس اندازے سے ہی وہ اس کی باتیں سمجھ پاتا تھا۔ انگریزی وہ محض ٹوٹی پھوٹی بولتی تھی۔ اور جب بولتی تو شیرف سوچتا۔ ایسی انگریزی تو وہ خود بھی بول سکتا ہے ــ ویسے مریم اکبر کی جرمن وائف سے کہیں زیادہ خوبصورت تھی۔ اور شیرف کا خیال تھا کہ یہ جو آئے دن گھر میں مہمانوں کی اتنی بھیڑ ہوا کرتی ہے اس کی وجہ صرف مریم کی ذات ہے۔

پھر وہ ثریا ہمدانی کے کمرہ میں آتا ــــــ جو جگانے پر اکثر لات رسید کر دیتی ــــــ صفیہ ہمدانی البتہ سویرے اٹھ جاتی تھی۔ اور رقیہ ہمدانی جو اٹھاوین میں تھی بے بی فراک پہنتی تھی۔ نیند سے جگانے پر اتنے زور کی چٹکیاں بھرتی کہ شیرف تلملا جاتا۔ اور اکثر اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔

صبح کی چائے کی فراہمی کے بعد وہ جوتوں کی پالش کرتا۔ یکساں میکانیکی انداز میں گھنٹہ بھر تک اس کے ہاتھ چلتے رہتے۔ اور اس کوشش میں اکثر وہ اپنے کپڑے خراب کر لیتا تھا۔ جوتے بھی بھانت بھانت کے ہوتے تھے۔ اور ان کا کیئر اس کے ذمہ تھا۔ اٹیلین شوز، جرمن شوز، دیسی جوتے، گلیشن، کلڈز کوبرا، فز اور نہ جانے کیا کیا الم غلم اس پر رقص کے جوتے بیلے اینا شوز، وہ تھک سا جاتا۔ مگر جوتوں کے چمکانے پر اسے انعام بھی دل کھول کر ملا کرتا تھا۔ اکبر اسے اکثر جیبوں میں پڑی ہوئی ریزگاری روپے دینار، اور اصغر جوتوں کی اکثر انگیز پر خوش ہو کر ایک ایک روپیہ تک اسے انعام دے ڈالتا ہر بڑے چھوٹے انعام پر اس کے ہونٹ انعام کی رقم کے تناسب سے پھیلتے سکڑتے اور مسکراتے تھے۔

اور جب ہمدانیز بھائیوں کی گاڑیاں پورٹیکو سے گزر کر دھیرے دھیرے شہر کے ہنگامہ میں کھو جاتیں۔ تب گھر میں گہرا سناٹا ہو جاتا ہے، بڑا دبیز اور گہرا سناٹا، موسم خزاں کے قدموں کی گہری چاپ کی طرح ــــــ اور سناٹے میں جب وہ مکینوں کے کمرہ کی جانب دیکھتا تو اسے محسوس ہوتا کہ سب کے سب انگوٹھی میں جڑے ہوئے جھوٹے اور نقلی پتھر کی چمک سے معرا ــــــ گھر کی وہ حالت ہوتی جیسے رنگین غبارے سے اچانک ہوا نکل گئی ہو۔ پھر مگر شیرف کے تو نکلے بندھے کام تھے۔ الف اینڈ لر الف سے کپڑے سلوا کر لاتا جس کے ماہر ٹیلر سے تقریباً اس کی دوستی ہو گئی تھی۔ دوستی کی اساس وہ لذتیت کا گھروندہ تھیں جس کی تشکیل میں ثریا، رقیہ، صفیہ، مریم اور مسز اکبر کے جسم کی قوسیں اور دائرے شامل تھے۔ اور پھر دونوں ان قوسوں اور دائرے والے گھروندے میں چھپ کر آنکھ مچولی کھیلنے لگتے۔ ماسٹر اس سے کرید کرید کر لڑکیوں کی تفصیل دریافت کرتا اور ان کی قربت پر رشک کیا کرتا تھا۔ ماسٹر کی انگلیوں میں خون کی گردش بڑھ جاتی۔ جب وہ ویسٹ لائن کا ماپ اسے بتاتا۔ کس کی کمر کتنی ہے۔ ریشم اور عورت کی کمر میں کتنی لچک ہوتی ہے اور جب وہ لڑکیوں کے کپڑے لے کر لوٹتا۔ تو تمام راستہ ان کپڑوں کے لمس سے محظوظ ہوتا رہتا۔ اور تصور میں رقیہ ہمدانی کو ان کپڑوں میں جھلکتے ہوئے دیکھتا۔ صفیہ کے جسم کے نشیب و فراز کو پھیلتے سمٹتے ہوئے دیکھتا۔ اور پھر وہ ان ریشمی کپڑوں میں چھپ کر بڑے بڑے نرم سے اطلسی خواب

دیکھنے لگتا۔ واپسی پر چاکلیٹ یا اسی قسم کی الم غلم چیزیں خریدا کرتا تھا ان میں وہ چیزیں بھی شامل تھیں جنھیں وہ دہراتا نہیں تھا۔ بلکہ پیڈ پر لکھا ہوا کاغذ دوکاندار کی طرف بڑھا دیتا تھا۔ اور دوکاندار تحریر کردہ اشیا کے ساتھ اپنی مسکراہٹ بھی باندھ کر اس کے حوالے کر دیتا تھا۔ اور تب وہ سوچ سوچ کر تھک جاتا تھا کہ پیکٹ میں اس دوکاندار نے اپنی مسکراہٹ کیوں بھر دی ہے۔ وہاں سے واپسی پر کسی نہ کسی صاحبزادی کے ساتھ اسے مارکٹنگ کے لیے جانا پڑتا تھا۔ کار کا دروازہ کھولنے اور سامان سنبھالنے کے لیے یہ لمحات اس کے لیے بڑے صبر آزما ہوتے تھے جب وہ کار کا دروازہ کھول کر کھڑا ہوتا اور رقیہ ہمدانی کھٹ سے اترتی تو یہ چوٹ سیدھی اس کے دل پر لگتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بہت سے نوجوانوں کی نگاہیں اسے ایسے گھورتی تھیں جیسے وہ باتھ ٹب میں ننگی لیٹی ہو جسم سے کپڑوں کا حجاب یہ آنکھیں اس طرح مٹا دیتی ہیں جیسے جسم پر پھیلنے والے صابن کا نرم اور ملائم جھاگ ہو۔ اور اس لمحہ اسے اپنے اوپر غصہ آتا کہ وہ اسے ایسی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا۔ اس لئے کہ وہ ان کا ملازم شریف ہے، میم صاحب میگزین پکارنے والا نوجوان ہاکر اسے کسی بھی زاویہ سے دیکھ سکتا ہے مگر اس کی آنکھیں آہن پوش ہیں۔ پھر شام کو اچانک بہار آجاتی تھی حسین ہونٹوں کی ٹھنڈی مسکراہٹ کی طرح آپس میں یودال اور ہمالیہ پر دھیرے دھیرے پگھلنے والی برف کی طرح ٹھنڈی شام بس ایک نرتکی کے چھم کی طرح پاؤں جھاتی تھی۔ اور مسز اکبر ہمدانی کے ابروؤں کے ہلال میں روشنی آجاتی۔ مریم کے تارنگ ٹوگ اور پرٹوگ میں رشتہ پیدا کرنے لگتے۔ اور زلفوں کی کمندیں کتنی ہی دیواروں کو چھونے لگتی تھیں۔ اور شریف انھیں دیکھتا رہ جاتا تھا۔ لان پر بیٹھی ہوئی یہ لڑکیاں اسے بھرے بھرے میدان کی طرح معلوم ہوتی تھیں۔ جانے اس میدان سے پرے کیا ہے۔ شاید یہیں سے زمین و آسمان گلے ملتا ہے۔ چاند کا جھومر جھلے ہوئے چمکتا ہے اور سورج کی کرنیں ماضی حال ——— وقت اور لمحہ کو چراغ دکھاتی ہیں۔ اس وقت کو جوامر ہے اس لمحہ کو جو جادو سا ہے۔ اس مسرت کو جو عورت کا پہلا بوسہ ہے۔

لان میں بیٹھی ہوئی تمام لڑکیاں اس کے لیے چاند سورج کا سماں تھیں۔ جن کی جانب بھولا بالک ہاتھ بڑھائے کچھ نہ پائے، کچھ نہ پاسکے ہماری اتنی پیاری پیاری سی دنیا خانوں میں تقسیم ہے جس میں انسان کتنی ہی موت مرنے کے باوجود زندہ رہنا چاہتا ہے۔

اتنے میں نوجوانوں کی بھیڑ لگ جاتی۔ جسے ہمدانیز سوشل گیدرنگ کہتے تھے۔ اور سب کی فرمائشات پوری کرتے کرتے شریف تھک جاتا۔ لیکن اس کے باوجود ان کے درمیان چلتے پھرتے اسے یک گونہ طمانیت محسوس ہوتی تھی۔ مریم کے چہرے تک پہنچنے کے لیے کتنی نگاہوں نے پل بنائے کس کی انگلیوں کے لمس نے صفیہ ہمدانی کی ہتھیلی پر گلاب کھلا دیئے۔ کون سی خوشبو نے بڑھ کر مسز اکبر کے لبوں کو چوم لیا۔ وہ سب جان سکتا تھا۔ اور شریف کا خیال تھا کہ یہ تماشا تمام ان ڈور اور آؤٹ ڈور کھیل تماشوں سے دلچسپ ہے؛

کبھی کبھی ان کی چھوٹی بڑی حماقتوں پر اسے ہنسی بھی آتی تھی۔ کبھی کبھی کتنے بھیانک اور بدصورت چہرے ان خوبصورت لڑکیوں کو گھورا کرتے تھے بدصورت اور بھیانک چہروں کے گھورنے کے حق کو وہ پہچانتا تھا۔ اس لئے کہ ان چہروں پر لگی ہوئی آنکھیں رئیس زادوں کی تھیں۔ پیسوں والوں کی تھیں لیکن یہ بات لگتی تھی مضحکہ خیز ——— اور اس لمحہ وہ اپنے وجود کو تحلیل کر کے کسی رئیس زادے کی ذات میں بدل دیتا۔ مگر اس جون میں آنے کے بعد وہ محسوس کرتا کہ اس کے جسم پر اللہ والے کا انگلش سوٹ ہے، علی جی کی حسین ٹائی ہے۔ اور پیروں میں اکبر ہمدانی کے شوز ہیں۔ جن پر شریف نے پولش کیا تھا اور تب وہ لڑکیوں کو ایسی ہی نگاہوں سے دیکھتا ——— اور نہال ہو جاتا، اس دھرتی کی طرح جس پر بارش بلا امتیاز ہوتی ہے۔ لیکن رقیہ ہمدانی جب قہقہہ کے دریا اس سے مزید اسکوئش لانے کو کہتی تو وہ اس جون سے نکل کر اپنے جون میں آجاتا۔ وہ جون جو شریف کا تھا۔ جس کے جسم پر معمولی قمیص تھی۔ اور خود سے دھو کر استری کی ہوئی پتلون تھی۔ اور پیروں میں پھٹا پرانا جوتا جو اس کی اوقات کے مظہر ہوتے تھے۔ پھر وہ مختلف وارڈ روب سے کپڑے نکالتا۔ اور اکبر اور اصغر کو کپڑے پہنانے میں مدد دیتا۔ اور اس وقت اس کا جی چاہتا کہ کاش ایسا ہی سوٹ اگر وہ پہن لے تو کیسا لگے گا۔ اس کے بھی تو نقش و نگار تیکھے ہیں۔ اس کے ہونٹ بھی اصغر کی طرح گلابی ہیں۔ اور بقول ٹیلر ماسٹر لڑکیوں کی طرح ہیں ——— ان کی رنگت بھی گندمی ہے۔ وہ معمولی چھینٹ قمیص میں بھی ٹوٹے ستارے کی طرح چمکتا ہے۔

مگر وہ سوٹ کیسے پہن سکتا ہے اس گھر میں جہاں وہ بچپن سے ملازم تھا جس گھر میں اس کی ماں ملازم تھی ـــــ اور باپ خدمت کرتے کرتے مرچکا تھا ـــ

مگر دھیرے دھیرے سوٹ پہننے کی تمنا اس کے دل کا داغ بن گئی۔ کبھی کبھی سوچتا اس کا فائدہ بھی کیا ہے۔ جب وہ کلب میں فاکس ٹراٹ اور چاچا نہیں ناچ سکتا، بال رُوم میں کسی کا ہم رقص نہیں بن سکتا ـــــ لیکن اس کے باوجود وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ سوٹ پہن کر کیسا دکھتا ہے علی جی اور اللہ والے سے تو ہزار گنا اچھا دکھے گا ـــــ

اور تب سرزیمان کی آپا سے عشق جھاڑ دے گا۔ جو اکڑ اکڑ کر پرام ڈھکیلتی یوں گذرتی ہے۔ جیسے شہزادی کی سواری گزر رہی ہو۔ اسے خود فخر ہے کہ وہ سرزیمان کی آپا ہے ـــ سفید یونیفارم پہن سکتی ہے۔ سلکن سکارف باندھتی ہے۔ جس کی کمر میں ریشم کی سی لچک ہے۔ شانوں میں اکڑ ہے اور سینوں کے کلس پر چندر مائی جوت جاگتی ہے۔ رخساروں پر گلاب کھلتے ہیں۔ اور ان کی خوشبو سے شیرف ہی نہیں بلکہ برانٹ سٹریٹ کے تمام نوکر نہال ہوجاتے ہیں۔ وہ تصور ہی میں اسے رقیہ اور صفیہ بنا کر پیار کرنے لگتا، کبھی اسے بیلے ایناشوز پہنا کر اپنے ذہن میں رقص کراتا۔ اور کبھی بال رُوم میں اس کی کمر کے گرد اپنے ہاتھ کا حلقہ ڈالتا ـــ اور تب اسے محسوس ہوتا کہ اس کے ہاتھ کے حلقہ میں رنگ و بو کی یہ حسین ہی دنیا اچانک سما گئی ہے۔ اور بال رُوم کی گردش میں بہت سے آفتاب ابھرنے لگے ہیں۔ بہت سے چاند چمکنے لگے ہیں۔ اور ستاروں کے دل دھڑک اٹھے ہیں۔ خوشبوؤں کے پل کی تعمیر ہو رہی ہے۔ جو قوس و قزح کی طرح اس کنارے سے اس کنارے تک پھیلی ہوئی ہے۔ اور پل کے پار زندگی کا سب سے پیارا سنگم ہے۔ اور کبھی وہ اسے اپنے خیالوں میں مریم کی سی نائٹی پہنا کر سینے سے لگالیتا۔ اور رات کے ویرانے میں بہت سے پھول کھل اٹھتے اور وہ انھیں ہاتھوں میں سمیٹ کر ہواؤں میں اچھال دیتا اور پھولوں کی منتشر پنکھڑیاں اس پر یوں برسنے لگتیں جیسے برف گر رہی ہو اور اس کا سارا وجود اس سے ڈھک گیا ہے۔ اور ایک دن اس نے سوچا آخری ونٹر سیزن کا ایک سوٹ وہ ضرور کسی دن اڑائے گا ـــــ اور اس نے ایسا ہی کیا۔ اکبر کے وارڈروب کو اس نے کھولا ـــــ اس لمحہ اس نے پہلی بار انگلیوں میں کپکپی محسوس کی۔ اس نے زندگی میں کبھی چوری نہیں کی تھی۔ اس نے محسوس کیا پورے وارڈروب میں اس کی ماں کی آنکھیں جڑی ہوئی ہیں۔ اور اسے گھور رہی ہیں۔ باپ کی وفاداری لکڑی ٹیکے کھڑی ہے۔ مگر اس نے ان آنکھوں کو نوچ لیا۔ اور باپ کی وفاداری کی عمارت کو ڈھا دیا۔ وفاداری کی عظیم عمارت ہو نہ ہو ـــــ وہ خود ایک ویرانے میں ایک معمولی سی قبر میں پڑا تھا جس کے جنازے میں گھر کے کسی فرد نے شرکت نہ کی تھی۔ اس نے مختلف سوٹوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ یہ وارڈروب اسے الف لیلیٰ کے شہر بغداد کی نئی دکان معلوم ہوئی، اور وہ شہزادہ ابوالحسن کا محسن اعظم جسے شہزادے نے کھلی اجازت دے دی ہو کہ جو چاہے لے لے ـــــ جو چاہے خرید لے ـــــ اور اس نے ایک سوٹ خرید لیا۔ اور جلدی جلدی اسے لے کر اوپر کی منزل میں پہونچا۔ ایک جیکٹ میں ٹھونسا۔ اور اسے دھواں نکلنے والی چمنی میں رکھ دیا۔ اور پھر اپنے کمرے میں آکر لیٹ گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے دل کے ناسور نے رسنا بند کر دیا ہے جنم جنم کی تمنا مٹ گئی ہے۔ اور پھر وہ سو گیا، بڑی میٹھی نیند ـــ

دُوسرے رُوز اتفاق سے اکبر ہمدانی نے خود ہی اپنا وارڈروب کھولا۔ سوٹوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اور جب اسے بلایا تو اس کے پیروں کے نیچے سے زمین سرکنے لگی۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ کسی سمندر میں پایاب ہوگیا ہے۔ اور دوسرے ہی لمحہ اس کی لہریں اسے دُور بہالے جائیں گی ـــ ہر قدم پر اس کا دل دھڑکتا رہا۔

اور جب وہ اس کے قریب پہنچا تو اکبر ہمدانی نے ایک سوٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اسے نکال کر پریس کر دو ـــــ اور تب اس کی جان میں جان آئی ـــــ اور سب سے بڑی طمانیت کی بات یہ تھی کہ اکبر نے وارڈروب دیکھ لیا تھا۔ اور اس نے اس سوٹ کا کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔ اس کا بھی یہی خیال تھا۔ آخر بیسیوں سوٹ میں ایک کا کیا پتہ چلے گا۔ وہ دھڑکتے دل سے رات کا انتظار کرنے لگا۔ جب وہ چھت پر

جاکر سوٹ پہنے گا۔ اور اصغر ہمدانی کا پائپ پی پی کر اس کی طرح ٹہلنے لگا۔ اور ایک دن اس کی مریم کی طرح سرزریان کی آپا۔ اسے محبت بھری نظروں سے دیکھے گی۔ اور وہ اس کی آنکھوں کو بہت دھیرے سے چوم لے گا۔

رات آگئی۔ اور اسے اسی رات کا انتظار تھا۔ رات کے بارہ بجے وہ چھت پر پہونچا۔ چمنی سے سوٹ کو نکالا۔ اور جب اس نے بائیں ٹانگ ڈالی تو اسے محسوس ہوا جیسے وہ اس کی نہیں، اکبر ہمدانی کی ٹانگ ہے۔ پھر اس نے دوسری ٹانگ ڈالی اور لپک لپک کر جلدی جلدی کوٹ پہننے لگا۔ آستین جلدی میں پھنس گئی۔ اور اس لمحہ اسے لگا۔ جیسے اس کا ہاتھ کوٹ کی آستین نے پکڑ لیا ہے، اور آستین کی گولائی ہتھکڑی بن گئی ہے۔ اس نے ہاتھ کھینچا ——— ایک زوردار جھٹکا دیا اور ہتھکڑی گر گئی۔ آستین نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور اس نے اطمینان کا سانس لیا ——— مگر یہاں آئینہ کہاں ہے جو وہ اپنی شکل دیکھ سکے، نہ کوئی دوست جو سوٹ کی تعریف کر سکے ——— اس لمحہ وہ بڑا ملول اور برگشتہ خاطر ہوا۔ کس چہرے کے آئینے میں وہ اپنی شخصیت کو دیکھے ——— پھر اس سوٹ کا فائدہ ہی کیا۔ ایک بار اس کا جی چاہا کر اپنے بے مایہ سمجھ کے ہنگر سے سوٹ اتار کر واڈروب میں لے جاکر رکھ دے مگر اس کی تمنا ——— سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ شریر اور ضدی بچے کی طرح ——— اور اس نے جلدی جلدی اسے اتار کر پیک کیا اور چمنی میں ٹھونس دیا۔

پھر تو تقریباً ہر رات کا معمول بن گیا کہ وہ رات کے سناٹے میں چھت پر آجاتا۔ اور سوٹ پہن کر سگریٹ یا پائپ کے کش لگاتا ہوا سرزریان کی کوٹھی کی طرف دیکھتا۔ جہاں اس کی جوان آپا رہتی تھی ——— مگر وہ اسے کبھی چھت پر نظر نہیں آئی۔ ورنہ شاید وہ چیخ کر پوچھتا۔ "بتاؤ میں اس سوٹ میں کیسا لگتا ہوں۔"

ہفتوں گزر گئے۔ اور ایک دن جب بقول اکبر ہمدانی کے اس نے Rare Shade والا وہی سوٹ جو اب شیرف کے قبضہ میں تھا ڈھونڈا تو اسے نہیں ملا۔ اس بدنظمی پر اس کے غصہ کا پارہ چڑھ گیا۔ اس نے شیرف سے ڈھونڈنے کو کہا۔ اور اس کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں۔ ڈری ہوئی چڑیا کی طرح مسز اکبر نے بھی گھر کا چپہ چپہ چھان مارا۔ پھر نوکروں کی تلاشی لی گئی۔ شیرف کی ماں کا بکس دیکھا گیا۔ بڑھیا نے آنسوؤں اور بھیگی پلکوں کی گواہی پیش کی۔ لیکن ٹھکرا دی گئی۔ اور جب سوٹ دو روز بعد بھی نہیں ملا تو اکبر نے چوری کا اعلان کر دیا۔ اور اعلان ہی نہیں کیا بلکہ فون پر اپنے ڈی۔ ایس پی دوست ستیا کو اس کی اطلاع دے دی ——— وہ بڑبڑا رہا تھا۔ ہزار روپیہ کا سوٹ تھا۔ پیرس کا سلا ہوا ——— بھلا کوئی مذاق ہے ایسا سوٹ سلوانا۔ شیرف کو تین دن تک چکر آتے رہے۔ ستیا نے تمام نوکروں کی مزید تلاشی لی پوچھ گچھ کی مگر لاحاصل۔

اکبر ہمدانی سے مسٹر ستیا نے کہا: "گھبراؤ نہیں، یہ لوگ پولیس کی زیر نگرانی رہیں گے۔ سوٹ جائے گا کہاں۔"

تین ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ شیرف نے اس عرصے میں کئی بار چاہا کہ اس سوٹ کو آگ لگا دے۔ مگر اس کی تمنا ضدی بچے کی طرح ہمکنے لگتی۔ نہیں، نہیں ایسا نہ کرو ——— ایسا نہ کرو ———

اور وہ نیچے آکر انسانوں کے ہجوم میں گم ہو جاتا۔ اور جب تمام لوگ اس سوٹ کو بھول چکے تھے۔ ایک رات اس نے سوٹ نکالا اور نیچے اکبر ہمدانی کے کمرے میں آگیا۔ اکبر اور مسز اکبر ڈنر اور ڈانس کی دعوت پر اپنے ایک دوست کے یہاں گئے ہوئے تھے۔ اور پروگرام کے مطابق رات وہیں گزارنے والے تھے۔ اس نے واڈروب کے آئینہ کے سامنے بڑے اطمینان سے سوٹ پہنا، سٹف کالر کی قمیض پہنی، ٹائی لگائی اور آئینے میں خود کو دیکھ کر مسکرا پڑا ———

"میں کیسا لگتا ہوں" اس نے سرگوشی کے لہجہ میں آئینہ سے پوچھا۔

"بہت اچھے اللہ والا اور علی جی سے بہتر ——— خوبصورت اور خوبرو ———"

پھر اس نے محسوس کیا کہ وہ اکبر ہمدانی ہے۔ مسز اکبر بال روم سے جب واپس ہوگی تو وہ اسے اپنی آغوش میں لے کر فوم کشن بیڈ پر لیٹ

جائے گا۔

اس نے بڑے اطمینان سے اکبر کی سگرٹ کاٹن کھولا۔ اور ایک سگرٹ جلا کر پینے لگا۔ رات کا ایک بجا تھا۔ اتنے میں اسے کچھ آہٹ محسوس ہوئی۔ اور وہ تیزی سے کمرہ سے نکل کر بھاگا۔ وہ جلد از جلد چھت پر پہنچنا چاہتا تھا۔ مگر دُوسرے ہی لمحہ اکبر سے ٹکرا گیا۔ اور پھر اس نے محسوس کیا۔ کوٹ کی آستین کی گولائیاں ہاتھوں کی ہتھکڑی بن گئی ہیں۔ سارے گھر میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اکبر نے پولیس کو ڈائل کیا۔ اور ایک گھنٹہ کے اندر اندر اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی جھول رہی تھی ـــــــ اس کی ماں نے بڑی داد دہائی دی۔ اپنا سر ہر فرد کے پیروں میں ڈال دیا لیکن لاحاصل۔ پیرس کا سلا ہوا سوٹ، ہزار روپے کا سوٹ شیرف نے چرایا تھا۔ کوئی مذاق نہیں تھا ـــــــ

لیکن شیرف جب اسی پیرس کے سلے ہوئے سوٹ میں ہتھکڑی پہنے پولیس دان میں بیٹھ رہا تھا۔ تو اس کے ہونٹوں میں بڑی دلفریب مسکراہٹ تھی ـــ اس کی مسکراہٹ پر کسی کا پہرہ نہیں تھا، پولیس کی نظریں اس کے سوٹ کو گھور رہی تھی۔ ڈرائیور کی نظریں اسی سوٹ پر لگی تھیں اور تب وہ سوچ رہا تھا کہ آج اس دنیا کے بہت سے لوگوں نے اسے **Rare Shade** میں دیکھ لیا ہے۔ اور اس کی شخصیت بن گئی ہے۔ جو بہت عظیم ہے۔ معاشرے میں ہر سوٹ پہننے والے کی طرح عظیم ـــ

ایک واڈروب کا آئینہ کیا بتا سکتا تھا اسے اپنے بارے میں۔ انسانی چہروں کے آئینے البتہ بتا سکتے ہیں کہ وہ کیسا خوبرُو لگتا ہے اس سوٹ میں' اور اسے کیسی آزادی حاصل ہے اسے پہننے کی ایسی آزادی جو غلام کو اس کا خواب ہی عطا کرتا ہے۔ اس نے اسی سوٹ میں زندگی میں پہلی بار ـــ رقیہ ثریا، صفیہ، مریم اور مسز اکبر کو دیکھ لیا تھا، اللہ والے او رعلی جی کی طرح ـــــــ اور اسے پہلی پیشی پر تین ماہ قید بامشقت کی سزا ہوئی اور اس لمحہ وہ اسی پیرس کے نئے سوٹ میں کھڑا تھا۔ وہ تمام عرصہ مسکراتا رہا، مجسٹریٹ کے فیصلے پر اس نے اپنا سر جھکا دیا۔

لیکن جب جیلر نے اسے سوٹ اتار کر جیل کے کپڑے پہن لینے کو کہا تو وہ معاً اداس پڑ گیا۔ شاید یہ سوٹ' یہ لوگ اکبر صاحب کو لوٹا دیں گے ـــــــ اور اسی لئے جب جیل کے پہرہ دار جیل کے چھوٹے آہنی دروازے کو کھول کر اسے اندر داخل کرنے لگے۔ تو وہ اچانک رک گیا۔ اس نے سہمی نظروں سے پلٹ کر دیکھا ـــــــ

"کیا بات ہے؟" جیلر نے دُور ہی سے اسے ڈانٹا۔'

ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں ـــ" وہ پلٹا۔

"کیا پوچھنا چاہتے ہو ـــ بولو ـــ"

وہ ایک ثانیہ چپ رہا اور پھر سہمے ہوئے لہجے میں رک رک کر بولا۔

"صاحب تین ماہ کی قید بامشقت کے بعد آپ یہ سوٹ مجھے لوٹا دیں گے نا ـــــ؟"

اور اس کے اس جملہ پر جیلر نے اسے بوٹ سے ٹھوکر لگاتے ہوئے کہا۔

"چل حرام کے پلے ـــ"

اور دُوسرے لمحہ جیل کے دروازے نے اسے نگل لیا ـــــ

گربچن سنگھ

تشکیل۔ پشاور

مداوا

ایک چھوٹی سی کالی سڑک اور اس کے دونوں جانب لان سے گھرے ہوئے فلیٹ ستی بالکنی پر کھڑی اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے امل دفتر گیا تھا۔ وہ اسے وداع کہنے کے لیے بالکنی پر آکھڑی ہوئی تھی اور پھر دیر تک کھڑی رہ گئی۔ یہ اس کا معمول ہے۔ پاس پڑوس کے بچے بغل میں بستہ دبائے گھروں سے باہر نکلتے ہیں۔ اور ایک ایک دو دو کی ٹولیوں میں اسکول جاتے دکھائی دیتے رہتے ہیں۔ وہ انہیں دیکھتی رہتی ہے۔ اور جب سڑک سنسان سی نظر آنے لگتی ہے وہ کمرے میں لوٹ آتی ہے۔ سارا مکان اسے بھائیں بھائیں کرتا دکھائی دیتا ہے۔ وہاں کی ہر شے اسے کاٹنے کو دوڑتی ہے۔

دس بجنے کو تھے، اور بچے اسکول جا چکے تھے۔ سڑک ویران نظر آنے لگی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں لوٹ آئی اور نڈھال سی صوفے پر بیٹھ گئی۔ ایک بے قراری اور بے چینی ـــــ اس نے ہمیشہ ہی ایسا محسوس کیا۔ دل کے کسی گوشے میں ایک مقام ایسا بھی خالی رہ گیا ہے۔ جہاں درد اٹھتا ہے اور وہ بے چین ہو جاتی ہے۔

بہت دیر تک آنکھیں بند کئے صوفے پر بیٹھی رہی۔ آیا ایک دو مرتبہ اس کے کمرے میں جھانک کر لوٹ گئی۔ آخری بار اس نے آکر پوچھا: "بی بی جی، طبیعت خراب ہے کیا........؟"

وہ بولی: "نہیں...... ایسے ہی ذرا کچھ سستی سی معلوم ہوتی ہے۔"

وہ اٹھی اور باتھ روم میں چلی گئی۔ غسل کے بعد سنگار میز کے قریب آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ پیشانی پر سیندور کی ریکھا لگاتے لگاتے اچانک اس کی نظر اپنے چہرے پر پڑی۔ اور وہ ایک ٹک دیکھتی رہی۔ گویا اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہے۔

"ہاں ـــ میں ستی ہوں....؟"

"وہ تو میں پہچانتی ہوں۔" اس کے اندر آواز ابھری۔

"کیوں اتنی فکر مند اور پریشان ہو؟"

"تم سے کچھ چھپا ہوا نہیں....."

"ایسا تو ہونا ہی تھا...."

"تو کیا میں نے کوئی غلطی کی...؟"

"نہیں ـــــ کچھ کرنا ہی تھا۔ اتنی لمبی زندگی کیسے کٹتی ....."

"رَوی کو مجھ سے کیوں چھین لیا گیا ؟"

"تمہارا اس پر کوئی حق نہیں تھا۔"

"کیوں ؟ میں اس کی ماں نہیں ہوں کیا۔"

"ہاں تم اس کی ماں ہو....... لیکن امل......."

"امل......."

"آئینہ میں اپنا عکس اسے کیسا دھندلا سا لگنے لگا۔ تازے زخم سے رستے ہوئے خون کی طرح آنکھوں سے آنسو پھوٹ پڑے.... امل سے مجھے کوئی شکایت نہیں۔ اس نے میرے لیے تیاگ کیا ہے۔ گھر والوں سے بغاوت کرکے اس نے میرے ان ہاتھوں کو پھر سجایا، جن کی چوڑیاں ٹوٹ چکی تھیں....... وہ میرا پتی ہے! لیکن رَوی...... ؟"

"اسے بھول نہیں سکتی کیا..... ؟

"کیسے بھول لوں، بولو...... ؟ میرا خون ہے نا...... میں اس کی ماں ہوں......"

"اور بھی تو کسی کا حق ہے اس پر اجن کے بیٹے کا بیٹا ہے وہ اجن کا پوتا لگتا ہے۔

انھیں کیا ماں سے زیادہ محبت ہو سکتی ہے رَوی سے۔

کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی رہی۔ کھڑی رہی۔ پھر وہاں سے ہٹ کر نڈھال سی پلنگ پر آبیٹھی۔

دن کا ایک بج رہا تھا۔ اسکول میں ٹفن کی گھنٹی بج چکی تھی۔ درختوں سے گھرے میدان میں بچے ہنستے کھیلتے دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں گھوم پھر رہے تھے۔ کچھ کھا پی رہے تھے۔ خوانچہ والوں کے نزدیک بھی ایک اچھی خاصی بھیڑ جمع تھی۔ ستی کی نظریں ڈھونڈ رہی تھیں رَوی کو ـــــ رَوی دوڑا چلا آرہا تھا۔

جیسے ہی وہ قریب آیا۔ اس کا دل چاہا۔ اسے گود میں اٹھالے لیکن نزدیک آکر وہ ایک درخت کی آڑ میں رُوٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"کیوں رَوی۔ ہم سے رُوٹھ گئے کیا ؟ آج آنے میں دیر ہو گئی نا..... آؤ، دیکھو میں تمہارے لیے کتنی اچھی مٹھائی لائی ہوں۔"

"میں نہیں آؤں گا ـــــ" رَوی روٹھنے کے انداز میں بولا۔

"کیوں ناراض ہو گئے کیا۔ ؟"

"اور نہیں تو کیا...... میں تم سے مٹھائی نہیں کھاؤں گا ـــــــــــــ" "کیوں نہیں کھاؤ گے ؟..." ستی اُسے درخت کے سائے میں لے گئی

"کیوں نہیں کھاؤ گے، بولو....... ؟" اس نے اپنا سوال دہرایا۔ "تم مجھے مٹھائی کھلا کے کہاں چلی جاتی ہو ؟ گھر کیوں نہیں چلتیں ؟"

"گھر...... ؟" جیسے زخم کے ٹانکے اُدھڑ گئے ہوں۔ "اسی لیے ناراض ہے کیا تو۔ ؟"

"ہاں ـــ"

"مَیں تو تیرے بابوجی کو ڈھونڈ رہی ہوں۔ رَوی، جب وہ مل جائیں گے نا تو گھر لوٹ آؤں گی۔"

"بابوجی تو مر گئے ہیں نا، ماں...... ؟"

"تو، مٹھائی کھاؤ ـــــ" ستی کے ہونٹ کانپے۔ "کھانے کے وقت ایسے سوال نہیں کرنے چاہئیں۔"

"مَیں نہیں کھاؤں گا۔"

"کیوں نہیں کھاؤ گے ؟"

"مجھے بھوک نہیں ہے ماں۔"

ستی نے بھانپا۔ رَوی کا چہرہ کچھ مرجھایا سا نظر آرہا تھا۔ اس نے اس کے گال چھو کر دیکھے۔ پھر گردن پر ہاتھ رکھ کر دیکھا ـــ "تمہیں تو بخار ہے رَوی ......"

"مجھے رات کو بھی بخار تھا۔ ماں۔"

"دادی ماں کو کچھ نہیں بتایا تھا تو نے ؟"

"رات کو ڈاکٹر مجھے دیکھنے کے لیے آیا تھا۔ ماں، اور سویرے بھی۔"

"تجھے اسکول نہیں آنا چاہئے تھا۔ رَوی ......"

"تم آتیں اور لوٹ جاتیں۔ اسی لئے آگیا......"

ستی کا جی چاہا وہ روی کو سینے سے چپٹا لے، لیکن نہیں ...... نہیں ...... اس نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھ ڈالے۔

"تم رُوتی کیوں ہو ماں ؟" رَوی نے ترحم آمیز نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ـــ اسی وقت اسکول کی گھنٹی بجی۔

"جاؤ ـــ اب میں کل پھر آؤں گی ......" ستی نے کانپتے لہجے میں کہا۔

بچے میدان سے ہٹ کر اسکول کی طرف جا رہے تھے۔ رَوی نے ایک مرتبہ ان کی طرف دیکھا۔ پھر ستی کی طرف ـــ پھر اٹھ کر اسکول کی جانب چل دیا۔

ستی بیٹھی دیکھتی رہی ـــ دیکھتی رہی، چند لمحوں میں سارا میدان خالی ہو گیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے جو چہچہاتی چڑیوں جیسا ایک شور اٹھ رہا تھا وہ خاموش ہو گیا تھا۔ ستی گھر لوٹ چلی۔ اداس اور فکر مند سی۔ گھر آ کر اپنے کمرے میں وہ کسی مریضہ کی طرح لیٹی رہی۔ اسے اپنے کھانے پینے کی بھی سُدھ نہیں رہی۔ امل کے لیے کھانا اس کے دفتر میں آیا نے ہی بھجوا دیا تھا۔

شام کے وقت امل دفتر سے لوٹا۔ ستی کو اداس اور فکر مند دیکھ کر اس سے پوچھ بیٹھا "کیا طبیعت کچھ خراب ہے۔؟"

"نہیں تو ......" سنبھل کر بیٹھتے ہوئے وہ مسکرانے کی کوشش کرنے لگی۔ "آج آنے میں دیر کر دی ...... کیوں ..؟"

"نہیں تو ـــ" امل فوراً بولا۔ "میں تو ٹھیک وقت پر آیا ہوں۔ تم شاید دیر تک سوتی رہی ہو۔" امل اپنے کمرے میں کپڑے بدلنے چلا گیا۔ باتھ رُوم سے ہو کر جب وہ واپس لوٹا تو ستی چائے کی میز پر اس کا انتظار کر رہی تھی۔

چائے کے دَوران امل نے کہا۔ "آج سینما دیکھنے کو جی چاہتا ہے ستی۔"

ستی امل کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ اس کی اس چھوٹی سی فرمائش پر انکار نہیں کرے گی۔ پہلے بھی اس نے کبھی انکار نہیں کیا۔ لیکن وہ منہ سے کچھ بھی نہ بول سکی۔ روی نظروں کے سامنے گھوم گیا ـــ وہ چارپائی پہ بے ہوش پڑا ہے۔ بخار سے اس کا جسم تپ رہا ہے۔ ایک سرد لہر اس کے جسم میں دَوڑ گئی۔

چائے کے بعد جب باہر جانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ تبھی ستی بولی۔ "سنا ہے رَوی کی طبیعت خراب ہے۔"

"اچھا ـــ" امل نے پوچھا کب سے ـــ؟"

"یہ پتہ نہیں ـــ آج ہی خبر ملی ہے۔"

"تب تو چل کر اسے دیکھنا چاہیئے۔"

"سینما نہیں جا سکیں گے پھر۔"
"سینما جانا ضروری نہیں ہے۔"
اس کی باتوں سے ستی کو ہمیشہ ایک قسم کی تقویت اور اعتماد ملتا ہے امل نے ہمیشہ اس کے جذبات کا احترام کیا ہے۔ اس کے جواب سے اسے بڑا اطمینان ملا۔

وہ امل کے ہمراہ پرانے مکان کی طرف چل دی ـــــ جہاں ایک دن اس کے سہاگ کا سیندور جگا تھا ـــــ ہاتھوں کے کنگن چھنکے تھے..... اور پھر ایک دن اس گھر کا چراغ گل ہو گیا تھا ـــــ اندھیرا ـــــ اندھیرا ـــــ!
آنکھوں کے سامنے وہی محل کھڑا تھا...... لیکن کتنا ویران، کتنا سنسان۔ وہ سیدھی ماں جی کے کمرے میں چلی گئی۔ ان کے چرن چھوئے ماں اسے دیکھ کر جذباتی ہو جاتی ہیں ـــــ آنکھوں میں آنسو بھر لاتی ہیں۔ گلے میں جیسے آشیرواد کے الفاظ اٹک کر رہ جاتے ہیں۔ انھوں نے صرف اس کی پیشانی پر ہاتھ پھیر دیا۔
ستی روی کے کمرے میں گئی۔ دیکھا وہ بخار میں بے ہوش پڑا ہے۔ پلنگ کے سرہانے ایک چھوٹا سا اسٹول پڑا ہے جس پر دوا کی شیشیاں اور گلاس رکھا ہوا ہے۔ دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ ماں جی نے بتایا "ابھی ابھی ڈاکٹر آیا تھا۔ انجکشن دے گیا ہے۔ کہتا تھا اسے گہری نیند سو جانے دو ـــــ کوئی جگائے نہیں۔"
"سونے دو میرے لال کو"۔ دل میں ستی نے کہا۔ ہونٹ پھڑپھڑائے پر منھ سے کچھ نہیں بول پائی ـــــ
ماں جی بولیں "اسکول سے آتے ہی آج ضد کرنے لگا تھا۔ کہہ رہا تھا مجھے ماں کے پاس لے چلو ـــــ"
"آپ مجھے خبر کرا دیتیں، میں اسی وقت چلی آتی۔"
ماں جی کے جھری دار چہرے پر اداسیوں کے سائے گہرے ہو گئے۔ بولیں "بیٹھو، کھڑی کیوں ہو......؟"
ستی روی کے پلنگ پر ہی ایک سمت بیٹھ گئی۔
"اچھی تو ہو نا ـــــ" دادی ماں نے سوال کیا۔
"ہاں ـــــ"
"اکیلی ہی آئی ہو کیا ۔ ۔ ۔"
"نہیں وہ بھی ساتھ ہیں، باہر بیٹھک میں بابوجی کے پاس بیٹھے ہیں۔"
اسی وقت امل کمرے میں داخل ہوتا ہوا بولا ـــــ "پرنام ماں جی ـــــ"
"آؤ بیٹا" دادی ماں کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "بیٹھو" ـــــ "آپ بیٹھئے ....." کہتا ہوا وہ روی کی طرف دیکھنے لگا۔ "اب کیسی طبیعت ہے روی کی؟" "دیکھ لو سو رہا ہے۔" ماں جی بولیں۔ "اچھا ـــــ بیٹھو میں آرہی ہوں۔" کہتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئیں۔
ستی امل سے بولی "دیکھ رہے ہو نا، روی کتنا دبلا ہو گیا ہے۔"
"ہاں ـــــ"
"مجھے بہت یاد کرتا ہے۔"
"اس کا یہاں دل نہیں لگتا ستی۔"
ستی کی آنکھوں کے آنسو گالوں پر لڑھک آئے۔ وہ رُومال سے انھیں پونچھنے لگا۔ پھر ان کے درمیان بالکل خاموشی رہی۔

چند لمحے اسی طرح بیتے۔ پھر امل بولا "ماں جی سے کہونا، ہم اسے اپنے یہاں لے چلتے۔"
"یہ تو بہت پرانا سوال ہے ——— اور وہ اس کے لیے انکار کر چکے ہیں۔"
"شاید اب مان جائیں۔"
ماں جی نوکر کو ساتھ لیے کچھ کھانے کا سامان اور چائے کا سامان لے کر آئیں۔
"اس کی کیا ضرورت تھی ———" امل بولا۔
"کوئی بات نہیں گھر آئے ہوئے کو کیا کچھ چائے وائے نہیں پلائی جاتی۔"
"لیکن ہم تو ———" امل آگے کچھ اور کہنے کی بجائے ستی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ بہت اداس ہو گیا تھا۔
"لو ——— کھاؤ" ماں جی نے سب کچھ ان کے سامنے چھوٹی سی میز پر رکھ دیا۔ امل پھر ستی کی طرف دیکھنے لگا۔
ستی دھیرے سے بولی۔ "ماں جی کا اصرار ہے، کھالو۔"
کمرے کا ماحول چند لمحات کے لیے بدل گیا۔
"ماں جی نے کہا "تم بھی کچھ کھاؤنا، بیٹی ....."
"نہیں ماں میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے ....." اس نے بات ٹال دی۔ اسی درمیان امل ماں جی سے بولا "ماں جی پھر ایک پرانی بات کہنے کو جی چاہتا ہے۔" "کہو ....."
"کل رُوی کو ہم اپنے گھر کیوں نہ لے جائیں۔ جب ٹھیک ہو جائے گا۔ چھوڑ جائیں گے۔"
"یہ بھی تمھارا ہی گھر ہے بیٹا" ماں جی کمال ہوشیاری سے بولیں "ستی ہی کچھ دن یہاں رہ جائے۔"
ستی نے ماں جی کی طرف دیکھا، پھر امل کی طرف اور پھر اس کی نظر رُوی کے چہرے پر گڑ گئی۔
امل بولا "جیسی آپ کی مرضی ....." اتنے میں بابو جی بھی کمرے میں آ گئے۔ ستی نے اٹھ کر ان کے چرن چھوئے۔
ماں جی، بابو جی سے بولیں "ستی سے میں کچھ دن کے لیے یہاں رہ جانے کو کہہ رہی ہوں۔ جب روی ٹھیک ہو جائے گا چلی جائے گی، کیوں ٹھیک ہے نا؟"
بابو جی بولے "ٹھیک ہی تو ہے۔"
ستی سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ رُوی گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کے سانس لینے سے ایک گھر گھراہٹ سی پیدا ہو رہی تھی۔ وہ آواز ستی کے سینے میں زخم سا کر رہی تھی۔
جانے ماں جی، بابو جی اور امل میں کیا باتیں ہوتی رہیں اس کا دھیان بالکل بھی اس طرف نہیں رہا بس روی اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ سانسوں کے طوفان میں جیسے ڈول رہا تھا۔
امل جب باہر جانے لگا تو بولا "اچھا تو تم یہیں رہو۔ صبح آیا کو بھیج دوں گا گھر سے جو کچھ منگانا ہے، اس سے منگا لینا۔"
وہ چلا گیا۔ ستی کو محسوس ہوا کوئی اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کھینچ رہا ہے۔ اور دوسرا دوسری طرف ...... وہ کچھ نہیں بولی۔
ماں جی بولیں "اس سے کہو بیٹی، کھانا کھا کر جائے۔"
وہ پلنگ پر سے اٹھی اور پیچھے پیچھے گئی۔ "سنو" نزدیک جا کر بولی "دن کا کھانا میں یہاں سے بھجوا دوں گی۔ اور رات کو تم خود آجانا اب بھی کھا کر جاؤ نا۔"

"نہیں آج رہنے دو ــــ کل سے آجاؤں گا۔"

"تکلیف تو تمہیں ہوگی ہی، لیکن..... لیکن روی ....." ستی کچھ آگے کہتے کہتے رک گئی۔ "میں سب سمجھتا ہوں۔" امل پرسکون لہجے میں بولا "تم کوئی فکر مت کرو ــ"

وہ چلا گیا ــــ

ستی برآمدے کے قریب بیلوں کی جھکی ہوئی چھایا تلے کھڑی اسے جاتے دیکھتی رہی۔ پہلے بھی جب رُوی کے پتا کہیں باہر جاتے۔ تو وہ اسی طرح آ کھڑی ہوتی تھی۔ اب وہ ان باتوں کو یاد کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ واپس روی کے کمرے میں چلی آئی۔ رُوی سو رہا تھا۔ رُوی لوریاں سنے بغیر سو گیا تھا۔

آٹھ بجے کے قریب ماں جی بولیں "کھانے کا وقت ہو گیا ہے بیٹی۔"

"میں کچھ نہیں کھاؤں گی ماں جی....... مجھے بھوک نہیں ہے" ستی بولی۔

"نہیں یہ کیسے ہوگا۔ چلو اٹھو، کچھ کھا لو۔"

"نہیں ماں جی..... سچ کہتی ہوں، مجھے بھوک نہیں ہے۔"

ماں جی چند لمحے کھڑی اس کی طرف دیکھتی رہیں پھر بولیں "اس گھر کو پرایا گھر مت سمجھنا۔" اور واپس لوٹ گئیں۔

آواز ستی کے کانوں میں گونجتی رہی۔ پرایا گھر....... اس نے تو کبھی کسی کو پرایا نہیں سمجھا تھا۔ لیکن قسمت نے اسے کہاں پھینک دیا ستی ماضی میں جھانکنے لگی۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا اس نے کھانے سے انکار کر کے کوئی غلطی کی ہے۔ خواہ وہ نہ کھاتی ساتھ تو جاتی۔ ماں جی اور بابو جی کو تو کھلاتی۔ یہ کام تو وہی کرتی آئی ہے۔ آج بھی انھیں اسی طرح کھلاتی۔ پرائی تو وہ خود بن گئی۔ ستی کے من میں ایک درد سا اٹھنے لگا۔

اسی وقت آیا کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔ "چارپائی اسی کمرے میں لگا دیتی ہوں بٹیا۔" ستی گھر کی پرانی آیا کو یوں دیکھنے لگی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو ــــــ آیا بولی۔ "اچھی تو ہو بٹیا" ــــــ "ہاں موسی!"

"تمہارا چہرہ کتنا اتر گیا ہے، جی ٹھیک رہتا ہے نا۔"

"سب ٹھیک ہے موسی۔"

"تمہارے بنا گھر کتنا سونا لگتا ہے......" کہتے ہوئے آیا چارپائی بچھانے لگی۔ ستی چپ چاپ اس کی بات سنتی رہی۔

انجو بولی۔ "گھر کے سب لوگ اداس رہتے ہیں کسی کا یہاں دل نہیں لگتا۔"

ستی بولی۔ "موسی، میرا تو رُوی کے ساتھ سونے کو جی چاہتا تھا۔ لیکن......."

"تب چارپائی نہ بچھاؤں....." انجو بیچ ہی میں بول اٹھی۔ "بچھا دو ـــ" ستی نے گویا دل پر پتھر رکھ کر کہا۔ "میرا اس کے ساتھ سونا ٹھیک نہیں ـــ" آیا چارپائی پر بستر لگاتے لگاتے اسے گھر بار کی باتیں بتانے لگی۔

کھانے کے بعد ماں جی آئیں، اور کچھ دیر بیٹھی دکھ سکھ کی باتیں کرتی رہیں۔ گھر کی ہر بات کے ساتھ ستی کی آتما جڑی ہوئی ہے۔ وہ گھر کے ہر فرد کے ساتھ سکھ کی حصہ دار ہے..... وہ سن رہی تھی اور آنکھوں سے آنسو ابل پڑنے کے لیے بیتاب ہوا ٹھتے تھے۔

ماں جی جب چلی گئیں۔ تو وہ چارپائی پر لیٹ گئی۔ بے شمار یادیں ذہن میں سر اٹھانے لگیں۔ کیسے بھول جائے۔ کیسے اپنے من میں سمیٹ لے۔ کمرے کی، مکان کی ہر شے جانی پہچانی سی لگتی ہے۔ ہر چیز سے کوئی نہ کوئی یاد وابستہ ہے۔ سب اس سے باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ رُوی سو رہا ہے اسی کمرے میں کبھی اس کی ہنسی کی آواز ابھری تھی۔ اسی میں کبھی اس کی سسکیاں گونجی تھی۔ اب بھی گویا یہ کمرہ طرح طرح کی آوازوں سے بھرا پڑا ہے

اگر وہ چارپائی پر لیٹی لیٹی ساری رات بیتے دنوں کی ہنسی خوشی، اور دکھ سکھ کی باتوں کو سوچتی۔ تو بھی وہ ختم نہیں ہوگی۔ ایک بار من پر پتھر رکھ کر وہ سب کچھ بھول کر جانے کا فیصلہ کر چکی ہے۔

جانے کب ستی کی آنکھ لگ گئی۔ سارا مکان اسے دیپ مالا سے منور دکھائی دے رہا تھا۔ شہنائی بج رہی تھی۔ کوئی اس کا ہاتھ چھو کر بولا: "اٹھو" چونک کر اس نے آنکھیں کھولدیں۔ کس نے اسے جگایا؟ کوئی بھی تو نہیں ہے —— رُوی کمرے میں سو رہا ہے۔

آوازوں سے بھرا ہوا کمرہ۔!

"تمہیں رُوی کو چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہئے تھا" جیسے ایک آواز ابھری۔ کوئی دکھائی نہیں دیتا —— ستی رُوی کی طرف دیکھنے لگی۔

"میں رُوی ہی کو کیا، اس گھر کو بھی چھوڑ کر کہیں نہیں جاتی، پر ماں جی اور بابو جی ہی نے تو مجھے سمجھا بجھا کر دوسرا گھر بسا لینے کو مجبور کر دیا تھا۔ ان سے ایک جوان عورت کی بیوگی دیکھی نہیں جاتی تھی۔ بہو تھی تو کیا ہوا محبت تو انھیں مجھ سے بیٹیوں جیسی تھی۔ کاش! میرے ماں، باپ یا کوئی بھائی بہن زندہ ہوتے!"

کمرے میں اور کوئی آواز نہیں ابھری۔ پرانی یادوں سے بھرے کمرے میں نئی آوازوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ رات بیتی جا رہی ہے۔ دھرتی گھوم رہی ہے۔ تاریکی کو آغوش میں سمیٹے جتنا اجالا اپنے اندر بھر لیتی ہے۔ اتنا ہی اندھیرا —— دھرتی پر بسنے والوں کے لئے یہ سب ناقابل برداشت کیوں ہے —— ؟

صبح ہی رُوی کی آنکھ کھل گئی۔ ستی کو دیکھ کر وہ کھل اٹھا۔

"ماں ——" اس کے گلے سے ایک پیاری سی آواز نکلی۔

"روی، میں تو رات سے یہاں ہوں ——"

"ہمارے ساتھ سوئی تھیں نا؟"

"ہاں ...."

ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوا۔ ستی کو دیکھتے ہی بولا: "بیٹی تم آگئیں .... میں نے کل ہی گھر والوں سے تمہیں بلانے کے لئے کہہ دیا تھا"

"میں تو رات سے یہیں ہوں چاچا جی۔"

ڈاکٹر مادھوے گھر کے پرانے ڈاکٹر ہیں۔ ستی ہمیشہ انھیں چاچا جی کہتی آئی ہے۔

"ٹھیک کیا تم نے ——" ڈاکٹر بولے۔ "ابھی تمہیں کچھ دن اس کے پاس ہی رہنا ہوگا۔"

تبھی رُوی بولا: "یہاں سے میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گا۔"

"منہ کھول ...... تو بہت باتیں کرنی سیکھ گیا ہے۔" کہتے ہوئے ڈاکٹر نے اس کے منہ میں تھرمامیٹر رکھ دیا۔ اور تبھی ستی سے پوچھ بیٹھے: "سکھی تو ہونا، بیٹی؟"

"ٹھیک ہوں، چاچا جی۔" وہ بولی۔

"ڈاکٹر ٹمپریچر دیکھتے ہوئے بولے: "بخار تو اب نہیں ہے لیکن اس شیطان کو اب لیٹے رہنے دینا کہیں اٹھ کر جائے نہیں۔" اور وہ بابو جی کو خبر کرنے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ ان کی طبیعت بھی کچھ خراب تھی۔

اچانک پردہ ہلا۔ اور امل کمرے کے اندر آیا۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ قریب آکر اس نے پوچھا: "روی کی طبیعت اب کیسی ہے۔؟"

"بیٹھو ——" وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "ابھی ڈاکٹر دیکھ کر گئے ہیں، کہہ رہے تھے اسے چارپائی سے نہ اٹھنے دیا جائے ——"

امل کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور رُوی کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ روی انجانی نظروں سے اسکی طرف دیکھنے لگا۔

"ناشتہ کرکے آئے ہو کیا۔" ستی نے پوچھا۔

"ہاں ۔"

"اگر نہ کیا ہو، تو لے آتی ہوں۔"

"نہیں۔ نہیں، میں ناشتہ کرکے آیا ہوں۔"

"کھانا نوکر کے ہاتھ بھجوا دوں گی۔"

"ٹھیک ہے اس کی فکر مت کرو۔"

"جانے کتنے دن یہاں رہنا پڑے گا، تمہیں تکلیف ہو گی، میں جانتی ہوں۔ لیکن ......"

"ذرا باہر آؤ نا ــــ تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" امل دھیرے سے بولا۔ اور کمرے سے باہر جانے لگا۔

ستی اس کے پیچھے پیچھے ہولی۔ جاتے جاتے پیار سے رُوی کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہوئی کہتی گئی۔ "میں ابھی آتی ہوں ہاں، لیٹے رہنا۔"

باہر بیٹھک میں کوئی نہیں تھا۔ وہ دونوں وہیں بیٹھ گئے۔

"کیا بات ہے؟" ستی کا دل نہ جانے کیوں دھڑک رہا تھا۔

"بابو جی نے یا ماں جی میرے جانے کے بعد کل رات تم سے کچھ کہا تھا۔؟"

ستی سوچ میں پڑ گئی۔ کیا کہے۔ کافی رات تک ماں جی سے باتیں ہوتی رہی ہیں۔ جانے امل کا مطلب کس بات سے ہے! وہ پوچھ بیٹھی

"کیسی بات ــــ؟"

"یہاں رہنے کی ــــ"

"وہ تو تمہارے سامنے ہی ہوئی تھی لیکن میں زیادہ دن یہاں نہیں رہوں گی۔ تمہیں گھر میں اکیلا چھوڑ کر یہاں کیسے رہ سکتی ہوں۔"

"اتنا تو وہ بھی سمجھتے ہیں، ستی اور اسی لیے وہ بھی فکر مند ہیں۔"

"رُوی کو وہ ہمیں نہیں دیں گے نا ــــ؟"

"دینے کے بجائے، وہ تو مجھ سے کچھ مانگ رہے ہیں۔"

"کیا ــــ؟" ستی امل کی طرف دیکھنے لگی۔

امل بولا۔ "مجھے ...... وہ مجھے بھی یہیں آجانے کو کہتے ہیں۔ بابو جی کہہ رہے تھے ــــ لکشمی کانت مرا، تو اس کی جگہ تم ہو، تم بھی تو میرے بیٹے کی مانند ہو۔ میں رات کو انھیں کوئی جواب نہیں دے پایا تھا۔ تم سے مشورہ کرنا چاہتا تھا، کیا خیال ہے تمہارا؟"

"تم ...... تم ...... یہاں ......" ستی کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ اس کی نظروں کے سامنے امل کا چہرہ دھندلا پڑ گیا۔ آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ وہ روہانسی ہو گئی۔ بڑی مشکل سے بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "نہیں، نہیں، یہ نہیں ہو گا۔ تمہارا اپنا گھر ...... اپنے خاندان کے لوگ ......"

"رو و مت ــــ کوئی دیکھے گا۔ تو کیا کہے گا۔" امل دھیرے سے بولا "میرا کون ــــ؟ نہ ماں نہ باپ، بس ایک بھائی ہے وہ دُور افریقہ میں رہتا ہے۔ برسوں سے اس کا چہرہ نہیں دیکھا۔ بہن اپنے گھر میں بستی ہے۔ مجھے میرے ماں، باپ مل جائیں گے۔ تم ملو گی اور رُوی بھی ــــ میں نے بہت سوچ بچار کے بعد ہاں کہنے کا فیصلہ کر لیا ہے، تم کہو راضی ہو نا ــــ؟"

"میں تمہارے فیصلے کے خلاف کس طرح جا سکتی ہوں ــــ!" ستی صرف اتنا بولی۔ اور آنسوؤں کی دھارا اسکے گالوں پر بہہ چلی ــــ!

نقش کراچی

افسر آذر
سیپ۔ کراچی

نفرت

محرومی کے احساس کو دل میں لئے نرگس جوان ہوگئی۔ اور آج تو یہ احساس کچھ اور بھی شدید ہوگیا۔ سوتیلے باپ کو دیکھ کر تو ہمیشہ وہ دل میں سوچتی، کہ کاش اس میں اتنی ہمت ہوتی کہ وہ اسے جان سے مار سکتی۔ اور اس خیال کے ساتھ ہی کتنی بدعائیں اس کے دل کی گہرائیوں سے اٹھتیں اور حسرت بھرے اس جملے پر (جو صرف اس کے دل و دماغ تک محدود رہتا) ختم ہوجاتیں: "موت بھی تو نہیں آتی کمبخت کو۔"

نہ معلوم کیوں وہ شروع ہی سے اتنی احساس تھی۔ کبھی کبھی وہ اس پر غور کرتی تو اس کو اس احساس کی جڑیں انتہائی ماضی کی گہرائیوں میں مدفون معلوم ہوتیں۔ اور اس کے سامنے اپنے باپ کا مُردہ چہرہ چکرانے لگتا۔ جس کے تصور کے خدوخال بھی زمانے کی رفتار سے بگڑ کر دھندلا چکے تھے۔ یہ اس کے بچپن کا واقعہ تھا۔ لیکن اس دن کی ایک ایک سوگوار تفصیل اسے یاد تھی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس کے باپ کی لاش کو قبر میں اتارنے کے بعد اس کے چاچا نے اس کو گود میں لے کر مُردہ باپ کا چہرہ دکھایا تھا۔ جو سفید کفن میں بڑا عجیب معلوم ہو رہا تھا۔ اور پھر جب قبر بند ہوئی۔ وہ چہرہ، وہ بدن چھپ گیا تو وہ کتنا روئی تھی۔ اور کسی نے کہا تھا: "نرگس سے بھی تو مٹی دلوا دو" اور وہ روتے ہوئے ننھے ننھے ہاتھوں میں مٹی لے کر قبر پر ڈالتی رہی۔ ماضی کی انتہائی گہرائیوں سے صرف یہی ایک واقعہ مُردہ کی طرح سیدھا اٹھ کر اس کے ذہن سے ٹکراتا۔ اور اتنی شدت سے کہ وہ یہ سوچتی کہ اس کے باپ کی موت ہی اس کو حساس بنا دینے میں اہمیت رکھتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ جب وہ ماضی کی اس افسوس ناک گھاٹی سے نکل آتی تو سوچتی: "نہ معلوم وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب اماں بی نے دوسری شادی کی تھی ــــــ میں کتنی بدنصیب ہوں۔"

اور شاید یہ دوسری بدنصیبی تھی اس کی، کہ وہ اپنے سوتیلے باپ پر شروع سے ہی اعتماد نہ کرسکی۔ اس بداعتمادی کی وجہ وہ داڑھی اور مونچھیں تھیں جن کے درمیان سوتیلے باپ کے پیلے دانت، سیاہ ہونٹ اور سرخ مسوڑھے تھے۔ جو اس کے تصور میں غلاظت گھولتے رہتے تھے۔ جن کو دیکھ کر اس کو وہ منظر یاد آجاتا جب ایک رات اس نے اماں کو ابا کے ہاتھوں میں کھلونا بنے دیکھا تھا۔ بڑی دیر تک وہ کھڑکی کی درازوں میں سے یہ منظر دیکھتی رہی۔ اور دوسرے دن جب اس نے سوتیلے باپ کے چہرے پر نظر ڈالی۔ تو یوں محسوس ہوا گویا اماں جان نے شلوار اتار کر پھینک دی ہو اور برہنہ اس کے سامنے آگئی ہوں۔ اور جب ابا جان نے اس کی پیشانی کو چوما تو اسے یوں لگا گویا زمانہ بھر کی غلاظت اس کے چہرے پر مل دی گئی ہے۔

"رات اسی منہ سے تو ابا نے ...." اس سے زیادہ وہ کچھ نہ سوچ سکی اور دن بھر اس کی طبیعت متلاتی رہی۔

اور اس رات وہ اپنے قریب اپنی پیاری بلی کو بھی برداشت نہ کرسکی۔ اس بلی کے بالوں بھرے جسم کے لمس سے وحشت ہونے لگی۔

اماں کی دوسری شادی سے لیکر اپنی منگنی تک بارہ طویل اور اداس سالوں میں ہر ہر لمحہ اس نے سوتیلے باپ سے نفرت میں اضافہ کیا تھا اور اس وقت وہ سوچ رہی تھی کہ اس کے سوتیلے باپ کا ظلم مکمل ہوگیا ہے: " اگر میرا باپ ہوتا تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ میں وہ نہ ہوتی جو اب ہوں اور یہ اماں جان... یہ تو لاش پر بھی قہقہہ لگا سکتی ہیں انھیں تو بس شوہر چاہیئے۔"

" کل کیا ہوگا۔ اف میرے خدا میں کیا کروں۔ کاش وقت یہیں رک جائے۔ کاش کل کبھی نہ آئے۔ کاش سلیم مرجائے۔ یا پھر مجھے موت آجائے نہ معلوم یہ کمبخت سلیم کہاں سے آن مرا۔" لیکن کل ایک مہیب دیو کی طرح سامنے کھڑا تھا۔ اور وقت کے آہستہ آہستہ بہنے کے ساتھ ساتھ وہ تیزی سے اس دیو کے نزدیک آتی جارہی تھی۔

ڈھلتے ہوئے سورج کی ترچھی کرنیں کہیں کہیں اٹک کر رہ گئی تھیں۔ جس چارپائی پر وہ بیٹھی تھی سائے میں آگئی تھی۔ خزاں کے جھونکے نے سسکی لی وہ اٹھ کر کمرے میں آگئی۔ اور پھر سردیوں کا سورج تیزی سے کچھ اور نیچے ہوگیا۔

" ایک اور دن ختم ہوا "۔ کھڑکی بند کرنے سے پیشتر اس نے آسمان کے مغربی گوشے پر لرزتی ہوئی تمازت کی سرخی کو دیکھ کر سوچا اور پھر بے سدھ ہوکر پلنگ پر گر پڑی۔

کمرے میں گہری گہری سسکیاں ابھرنے لگیں۔

جس دن نرگس کی ماں کی دوسری شادی تھی وہ اپنی دادی سے لپٹ کر خوب روئی تھی۔ اور پھر رفتہ رفتہ اس کی آنکھیں ویران ہوگئیں۔ جیسے وہ اس چیز سے مایوس ہوگئیں ہوں۔ جن کو وہ دیکھنا چاہتی تھیں۔ خوف اور نفرت کے تاثرات؛ اس کی آنکھوں میں سمٹ آئے تھے وہ اکثر سوچتی کہ اس کی زندگی کا تاریک ترین دن کون سا تھا وہ جس دن اس کا باپ مرا یا جس دن اس کی ماں نے دوسری شادی کی۔ لیکن وہ کوئی فیصلہ نہ کرپاتی اور اس طور پر سوچنے سے اس کے دل میں اپنی ماں سے بھی تنفر پیدا ہوگیا۔ اور یہ تبدیلی بڑے غیر مانوس اور غیر محسوس طریقے پر اتنے چپکے سے اس میں آئی کہ ایک دن جب اس نے کمرے کی تنہائیوں میں دل ہی دل میں کہا۔

" نہ معلوم اباّ کے مرنے کے بعد اماں جان نے چار سال کیسے گزارے ہوں گے۔"

تو اس نے کمرے کی تنہا اور اداس خاموشی کو توڑ کر زور سے کہا" ہائے اللہ میں کتنی بدل گئی ہوں"! اور پھر خود ہی خاموش ہوگئی گویا کمرے میں پھیلی ہوئی خاموشی کو توڑ کر اس نے کوئی شدید جرم کیا ہو۔

اور اس دن سے اس کی تنہائی کے لمحات میں اور اضافہ ہوگیا۔

محرومی اور خوف کے درمیان وہ بڑھتی رہی۔ وقت بڑھتا رہا۔

بارہ سال کی اس طویل خشک اور اجاڑ زندگی میں، خوشیاں، مسکراہٹیں اور بہاریں اس دن سے شروع ہوئیں جب اس کے سوتیلے باپ کو نمونیا ہوا تھا۔ اس دن جب وہ کراہ رہا تھا تو اس کو اکراہنے سے سکون کا احساس ہورہا تھا۔ پھر یہ بیماری طویل ہوتی گئی: " باپ تو کٹنے کسی طرح " وہ سوچا کرتی۔ ہر رات جب وہ سوتی تو اس امید کے ساتھ کہ صبح کو وہ مرچکا ہوگا۔ ہر صبح جب وہ گھر سے اسکول کے لیے نکلتی تو اس امید کیساتھ کہ واپسی پر اسے باپ کی موت کا مژدہ ملےگا۔

امید و بیم کی اسی کیفیت میں ایک مہینہ اور گزر گیا۔ بیماری بڑھتی گئی" اچھا ہے کمبخت ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرے۔" وہ سوچتی ہائے بے چاری اماں پھر کیا کریں گی وہ " لیکن یہاں پہنچ کر وہ غمگین ہوجاتی اور غور کرتی کہ وہ ایسی باتیں کیوں سوچتی ہے۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آتا تو جھنجلا کر کہتی " آخر کیا ہوجاتا اگر شادی نہ کرتیں تو ــــــ ہونہہ"۔

اسی دوران جب اس کا باپ بیمار تھا۔ خالہ اسے دیکھنے آئی تھیں اور اس دن اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ بھی بنی سنوری رہا کرے۔ اس دن بڑی دیر تک وہ آئینہ میں اپنے عکس کو دیکھتی رہی۔ آج تک اس نے خود کو اتنا خوبصورت نہ پایا تھا۔ زخم کا وہ ہلکا سا نشان جو اس کی تھوڑی کے نیچے تھا آج اسے بہت ہی بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ بات کچھ بھی نہ تھی۔ کمرے میں بیٹھی وہ اسکول کا کام کر رہی تھی کہ اختر دھڑ دھڑاتا کمرے میں داخل ہوا اور اس نے اتنی تیزی سے جذبات سے لڑکھڑاتی زبان میں ایسی بات کہی کہ اس کے سامنے رکھی ہوئی کتاب کے الفاظ چکرا کے رہ گئے۔ وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اور جب وہ بے خودی کی اس کیفیت سے نکلی تو بڑی دیر تک اس کے گالوں اور کانوں کی لوؤں پر انگارے دہکتے رہے۔ اختر جا چکا تھا۔ اس نے کھڑے ہو کر آئینہ میں خود کو دیکھا اور دیکھتی رہی۔ اور پھر اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اختر کو دیکھے لیکن کسی انجانے خوف سے وہ کانپ اٹھی۔۔۔

بڑی دیر تک وہ یونہی بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ انگارے رفتہ رفتہ دھیمے پڑتے جا رہے تھے۔ اور خوف کی جگہ شرم نے لے لی تھی۔ پھر جرأت کر کے وہ کمرے سے باہر آئی۔ گھر میں روشنی بکھری ہوئی تھی۔ اور اس روشن تنہائی میں اختر کا کہیں پتہ نہ تھا۔ کچھ ڈرتی کچھ جھجکتی، کچھ شرماتی وہ اس کمرے میں داخل ہوئی جہاں اس کا باپ پڑا ایڑیاں رگڑ رہا تھا وہ امید جو اسے کمرے میں لے گئی ختم ہو گئی۔ اختر وہاں بھی نہ تھا اور پھر وہ فوراً ہی افسردہ ہو کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اور کتابیں کھول کر بیٹھ گئی۔ لیکن اب تو ہر مرتبہ الفاظ دائرے بن جاتے اور کانوں میں اختر کے الفاظ کی بازگشت ۔۔۔!

اختر بڑی دیر بعد آیا۔ وہ کمرے میں اسی کیفیت میں بیٹھی تھی۔ اور دائرے اس کے سامنے ناچ رہے تھے۔ اختر ہمیشہ کی طرح زور زور سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ کمرے سے باہر آئی اور اس کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ وہ اب اختر سے آنکھیں نہیں ملا سکتی۔ اختر نے ایک مرتبہ اس کو دیکھا اور اس نے گھبرا کر آنکھیں نیچی کر لیں اور چپ چاپ واپس آ گئی۔ اور جب خالہ چلنے لگیں تو اس نے اختر سے کہا تھا۔ لیکن اس کو اپنی آواز اتنی کمزور معلوم ہوئی کہ اس کو خود تعجب ہوا۔

"کیا ۔۔۔" اختر نے بھی شاید کچھ نہ سنا تھا۔
"کل آؤ گے" تھوک اس کے گلے میں اٹک گیا۔
"تم اگر حکم دو تو ۔۔۔"

"تو پھر ضرور آنا" اس مرتبہ اس کی آواز پہلے کی نسبت کچھ زیادہ صاف تھی۔ اور یہ کہہ کر وہ بھاگ آئی۔ وہی اس کا دیرینہ غمگسار کمرہ اس میں پھیلی ہوئی وہی اداس تنہائی جہاں بیٹھ کر وہ گھنٹوں سوچا کرتی تھی اور پڑھا کرتی تھی۔ اس کمرے کی تنہائی میں اس نے ہر ہر لمحہ خود میں ماں، باپ کے لیے نفرت کے جذبات میں شدت پیدا کی تھی۔ پینٹنگ اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ رنگوں سے کھیلنا اس کی عادت بن گئی تھی۔ اس کے ہاں اب تک سُرخ اور پیلے رنگ زیادہ اجاگر ہوتے۔ ہانپتے ہوئے شعلوں کی تصویر جو اس نے بڑی محنت سے تیار کی تھی اس کو نہ معلوم طور پر بے انتہا پسند تھی۔

رات کے تاریک سائے چپ چاپ پھیلتے گئے۔ اور وہ اپنے عکس کو دیکھتی رہی۔ یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی اور عجیب خوشی تھی اختر کے تصور نے اس کے پسندیدہ رنگوں میں ایک اور رنگ کا اضافہ کر دیا اور اس کو یہ رنگ ہانپتے ہوئے شعلوں کے سُرخ رنگ سے زیادہ بھلا سبز رنگ، سبز گہرا رنگ۔ اس کے تصور کا کوئی گوشہ اس رنگ سے خالی نہ رہا۔ شادابی، بہار اور خوشیوں کا اسم، ذہن کے پچھلے گوشوں سے ایک خیال ابھرا "ارے یہ سبز کا ہی رنگ تو دو رنگوں کی تخلیق ہے" اور پھر آہستہ آہستہ یہ رنگ سمٹ گیا۔ چاروں طرف اب صرف نیلاہٹ تھی۔ نیلا رنگ جس میں آسمان کا بیکراں پھیلاؤ تھا۔ سمندر کا عمق اور جھیل کا سکون تھا۔ "یہ میں ہوں" اس نے سوچا۔ "جھیل کی طرح پرسکون، سمندر کی طرح گہری جس میں ہزاروں طوفان پرورش پا رہے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا" اس نے دل میں کہا۔ "کہ میں اختر کے لیے آسمان بن جاؤں۔ نیلگوں سائبان

جس سے آگے اختر کی نظر نہ جا سکے "۔ وہ اختر کا حدود اربعہ بن جانا چاہتی تھی۔ تاکہ اختر ہر چہار طرف اسی کو پائے۔

"اور اگر ایسا نہ ہو سکا" مایوسیوں کے درمیان پلے ہوئے ذہن نے ہمیشہ کی طرح تاریک پہلو پر سوچا۔

" اگر ایسا نہ ہو سکا " وہ سوچتی رہی۔ لیکن نتیجہ اس کے سامنے کچھ نہ تھا۔ یہ سوال یونہی پیدا ہوا۔ اور پھر مسلسل اس کی بازگشت سے نیلا رنگ ختم ہو گیا اور وہ ان تصورات سے نکل آئی۔

رات کچھ اور گہری ہو گئی۔ کتابیں اسی طرح کھلی ہوئی تھیں۔ اس نے کتابیں بند کیں۔ خوشی اور سرمستی کے احساسات سے چور وہ پلنگ پر لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ اور اس کے تصور میں نیلے پیلے اور سبز ہی دوپٹے سرسرانے لگے۔

" خوب ——— یہ بھی عجیب تجربہ ہے " اس نے سوچا " کہ انسان خوشیوں کے بوجھ سے بھی تھک جاتا ہے "۔ اس کا تمام جسم ٹوٹ رہا تھا۔ عجیب سی بے کلی اس کو محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے چاہا اٹھ بیٹھے۔ لیکن خوشیوں کے اتنے بوجھ سمیت وہ کیسے اٹھتی۔ دیر تک اسے نیند نہ آئی پھر اس نے سوچنا شروع کیا۔ کل وہ اختر سے کیا باتیں کرے گی؟ ذہن میں مختلف رنگوں کے دھبے چکر کاٹ رہے تھے اور اس کا وجود بھی ان دھبوں کے چکر میں ایک دھبہ بن گیا۔ جہاں اس کی اپنی کوئی انفرادی حیثیت نہ تھی۔ کوئی اکائی نہ تھی۔

" اوہو " اس نے کروٹ بدلی۔ " آج رات کتنی طویل ہے "۔

دو ماہ بعد اس کا باپ ٹھیک ہو گیا۔ لیکن نفرت اور پدرانہ شفقت سے محرومی کے وہ احساسات کہیں گم ہو گئے۔ ایک طویل محرومی کے بعد اسے ایک سہارا ملا اور اس نے اسے اپنی زندگی سمجھ لیا۔

محبت ——— ! اس کی زندگی میں یہ لفظ نئے رنگ لے کر داخل ہوا۔ اور نیا رنگ اس کو اتنا بھلا معلوم ہوا کہ وہ ہر صورت میں اس کو برقرار رکھنے کے لیے تیار ہو گئی۔ اب یہ محبت صرف الفاظ تک محدود نہ تھی۔ اختر سے اس کی روزانہ ہی ملاقات ہوتی۔ پھر طویل خطوط کا تبادلہ۔ وہ باتیں جو زبان سے نہ کہہ پاتے ان کے ذریعہ کہی جاتیں۔ بڑے اہتمام سے یہ خطوط لکھے جاتے اور پڑھنے کے بعد احتیاط سے جلا دیئے جاتے۔ ان میں رات بھر کی جدائی کا رونا ہوتا۔ ان بوسوں کا ذکر ہوتا جن کے تصور میں راتیں گزر جاتیں۔

اس کو اختر کی باریک مونچھیں پسند نہ تھیں۔ مونچھیں دیکھ کر وہ تصور میں اختر کے چہرے پر داڑھی کا اضافہ بھی کر ڈالتی۔ اور جب اختر اس کو بازوؤں میں جکڑ کر پیار کرتا تو اس کو یوں محسوس ہوتا گویا اختر نے اس کے ہونٹوں کو نہیں چوما بلکہ خود اس نے ——— اور غلاظت اس کے تصور میں بکھر جاتی۔ جھنجھلا کر وہ علیحدہ ہو جاتی۔ آخر ایک دن اس نے ڈرتے ڈرتے کہہ ہی دیا۔

" تم اپنی مونچھیں کیوں نہیں صاف کرا دیتے "۔

" کیوں ؟ "

اس کیوں کا بڑا واضح جواب اس کے پاس تھا۔ لیکن اس نے کہا " اچھی معلوم نہیں ہوتیں "۔

نرگس کے لیے اختر سب کچھ تھا۔ اور اس بنا پر اختر کچھ اتنا آگے بڑھا کہ نرگس کو پیچھے لوٹنا مشکل ہو گیا۔ اختر کے لیے جو کچھ بھی ہوا تھوڑا تھا۔ لیکن نرگس کے لیے یہ انتہا تھی۔ اس نے اختر کو شوہر کے حقوق دیدیئے۔ اور وہ لمحہ نرگس کے لیے انتہائی اذیت ناک تھا۔ غلاظت اور گندگی سے بھرپور۔ اس دن اس نے اتنی گندگی محسوس کی کہ رات بھر اس کا دل متلاتا رہا۔ لیکن اس لمحہ اس نے یہ گندگی اس لئے برداشت کی کہ سبز رنگ اسے بہت عزیز تھا۔ اسے اختر عزیز تھا۔ اور اپنی محبت عزیز تھی۔ وہ خوشیاں عزیز تھیں جو اختر، محبت اور سبز رنگ کی بنا پر اس کو حاصل ہوئی تھیں۔ لیکن پھر بھی بعد میں اس نے کہہ ہی دیا۔ " تم سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ صاف رہ سکو "۔

وہ بے ہودگی سے ہنس پڑا "اچھا بابا۔ جو حکم ـــــ مونچھیں تم نے صاف کرا دیں، توند پیٹ سے تم نے دانت صاف کروانے شروع کردیئے، ہم تو غلام ہیں جو حکم ـــــ یہ بھی سہی۔"

اور اس کے بعد بھی وہ ہر آن ڈرتی رہی کہ کہیں اختر کسی بات پر ناراض نہ ہو جائے۔ بارہ سال کی طویل محرومی کے بعد اس کو ایسی ہستی ملی جو اس سے پیار کرتی تھی، جس کو اس نے چاہا تھا اور اس پیار کو برقرار رکھنے کے لیے اس نے یہ جسمانی تعلق بھی برداشت کیا۔ حالانکہ یہ سب کچھ اس کو قطعی ناپسند تھا۔ ذہنی طور پر وہ اس تعلق کی خواہشمند نہ تھی۔ اکثر وہ اس تعلق پر غور کرتی مگر بے نتیجہ ـــــ نتیجہ پر پہنچنا اور اٹل فیصلہ کرنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ اس کو خوف تھا کہ اگر اس نے انکار کیا تو اختر اس سے ناراض ہو جائے گا اور اختر کا ناراض ہونا اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔

"چھوڑو ـــــ جو کچھ ہو رہا ہے ٹھیک ہے۔ جو کچھ ہونا ہوگا ہو جائے گا۔" اس کا مایوسیوں میں پلا ہوا ذہن ہمیشہ حالات کے سہارے بہنے پر مجبور کرتا۔ اس کا اپنا کچھ نہ تھا اور وہ حالات کے ساتھ ساتھ چلنے پر مجبور تھی۔ "اگر اختر مجھے نہ مل سکا تو ـــــ" کبھی کبھی وہ سوچتی اور سوچتی رہتی کہ کیا ہوگا ـــــ پھر کیا ہوگا" یہ سوال بار بار ابھرتا اور جھنجھلا کر وہ خود ہی کہہ اٹھتی ـــــ "میں اسے حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کروں گی۔"

یہ ایک سال اتنی تیزی سے گزرا کہ جب اس نے اندازہ لگایا تو یہ سب کچھ اسے کل کی ہی بات معلوم ہوئی اور اس وقت کا اندازہ لگانے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ اب اس کی شادی کی بات ہو رہی تھی لیکن وہ اختر نہ تھا۔

"میں سب کچھ کروں گی" اس کے ذہن میں یہ جملہ بار بار ابھرتا اور انجانے خوف تلے دب کر رہ جاتا۔

اختر کے لیے یہ سب کچھ اتنا اہم نہ تھا جتنی اہمیت نرگس نے اس کو دی تھی۔ نرگس بجھے دل سے یہ کہانی سناتی رہی اور جوشیلے لہجے میں کہا "اختر میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کرسکتی۔"

اختر نے سب کچھ سنا اور خاموش رہا۔ اس کو نرگس کی نہیں صرف اس کے جسم کی ضرورت تھی اور جسمانی طور پر نرگس اس کے انتہائی قریب تھی وہ سوچ رہا تھا کیونکر وہ نرگس کو جواب دے۔

نرگس کے لیے یہ لمحات بڑے صبر آزما تھے اس کی سمجھ میں نہ آیا اختر کیا سوچ رہا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اختر یہ سب کچھ سن کر اس کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لے گا اور کہے گا "نہیں نرگس میں تمھیں ان سے چھین لوں گا۔ میں تمھیں نہیں چھوڑ سکتا۔" لیکن اختر تو نہ معلوم اس وقت کہاں کھو گیا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے اختر میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"تمھیں سلیم سے شادی کر لینی چاہیے۔"

اور نرگس کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ اک لمحہ کے لیے وہ بالکل بے حس ہو گئی اور پھر چلا پڑی۔

"یہ تم کہہ رہے ہو اختر۔"

"ہاں اسی میں تمھاری بھلائی ہے۔ میں تم سے شادی نہیں کر سکتا کیونکہ میں تمھیں کوئی آرام نہیں دے سکتا۔"

"مجھے صرف تمھاری ضرورت ہے اور میں کچھ نہیں چاہتی۔"

اور پھر بڑی دیر تک اختر اسے سمجھاتا رہا۔ نرگس دیر تک روتی رہی "میں جانتی ہوں اختر تمھیں مجھ سے محبت ہے، تم صرف یہ چاہتے ہو کہ

میں ایک اچھی زندگی گزاروں۔ مگر تمہیں کیا پتہ ــــ" اگر اختر اسے ذرا سا بھی سہارا دیتا تو شاید وہ اس رشتے سے انکار کر دیتی۔ لیکن جس انداز میں اختر نے انکار کیا تھا اب اس کے لیے ناممکن تھا کہ وہ شادی سے انکار کرتی۔ اس دن پھر اس کو مردہ باپ کا چہرہ نظر آیا۔ خوف، محرومی اور نفرت کے احساسات پھر اس پر مسلط ہو گئے۔ "میں کیا کروں میرے خدا۔"

"اگر میرا باپ زندہ ہوتا تو سب کچھ یوں نہ ہوتا"۔ مایوسیوں کے اس جھٹکے میں وہ رو پڑی۔

دن گھٹتے رہے، راتیں لانبی اور سیاہ ہو گئیں۔ لیکن خواب اس کے اپنے تھے۔ تصور اس کا ابھی جاندار تھا۔ وہ ہمیشہ سے حالات کی تلخی سے بھاگ کر تصورات اور خوابوں میں پناہ لینے کی عادی تھی۔ اور اب بھی اس کے ساتھ یہی ہوا وہ سارا سارا دن اپنے کمرے میں گھسی رہتی۔ پلنگ پر لیٹے ہوئے وہ تصور میں کھوئے ہوئے لمحات کو جاندار کر لیتی۔ وہ تمام محبتیں اور قربتیں جو کبھی اختر کے ساتھ وابستہ تھیں۔ اب بھی اس کے وجود کو اپنا سکتی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر مُردہ بوسوں کے پھول ناچتے تھے اور پھر اس کا دم گھٹنے لگتا حلق عجیب لعاب سے بھر جاتا۔ ہونٹوں پر زبان پھیرتی تو نمکین سا ذائقہ محسوس ہوتا اور بدن کا روم روم تر ہو جاتا۔

سبز کاہی پلنگ اس کے تصور کے افق پر اب بھی موجود تھا۔ پیلے دائرے تعداد میں کہیں بڑھ گئے تھے اور نیلا رنگ کہیں گم ہو گیا تھا ــــ اس کا اپنا وجود ــــ!

وہ دن بھی کتنا عجیب تھا جب اس کی منگنی ہوئی تھی۔ کئی مرتبہ اس نے سوچا کہ وہ ہیرے کی اس کنی کو چاٹ جائے جو انگوٹھی کے درمیان چمک رہی تھی۔ لیکن موت کے تصور سے اس کو جان نکلتی محسوس ہوتی۔

"مبارک ہو" اختر نے اس دن اس سے صرف اتنا ہی کہا تھا۔ اور پھر فوراً چلا گیا تھا۔

"مبارک ہو۔ مبارک ہو" دیر تک یہ الفاظ اس کے کانوں میں گونجتے رہے۔" بے رحم کہیں کا۔ گویا سمجھتا ہے کہ میں خوش ہوں۔ کاش مجھ میں ہمت ہوتی۔ اتنی ہمت کہ میں انکار کر سکتی۔" اور پھر اس نے سوچا کہ انگلی میں چمکتی ہوئی انگوٹھی کو اتار پھینکے اور زور زور سے چیخنا شروع کر دے۔

"میں سلیم سے شادی نہیں کروں گی ــــ اختر میرا ہے۔ میں اسی کی ہونا چاہتی ہوں" اور اس سے پہلے کہ وہ یہ سب کچھ کرتی۔ اماں جان کمرے میں آئیں۔ ان کے چہرے پر مامتا پھٹی پڑتی تھی ان کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جو نرگس نے اس سے پہلے کبھی محسوس نہ کی تھی۔ معلوم وہ کون سا شدید احساس تھا جس کے زیر اثر وہ رو پڑی۔ وہ اماں جان کے سینے سے لگی سسک رہی تھی۔ کہ ابا جان۔ خالہ جان اور اظہر بھی آگئے۔

"کیا ہوا بیٹی نرگس" اس نے باپ کی آواز سنی۔

"اگر آج میرا باپ زندہ ہوتا ــــ" اس نے سوچا۔

"ابا ــــ" وہ چیخ پڑی۔

کل ــــ اس کے سامنے ہیبتناک طور پر سوالیہ انداز میں کھڑا تھا۔

"کاش سلیم مر جائے" وہ تمام دن یہی سوچتی رہی تھی۔ رات سرد تھی۔ سرد ہوا کھڑکی سے سر ٹپک رہی تھی۔ اور وہ پلنگ پر لیٹی نامعلوم کہاں کہاں بھٹک رہی تھی۔ کل اس کی شادی تھی ــــ کل ــــ ؟ کل ؟؟ ــــ کل !"

بے چینی بڑھتی گئی۔ کروٹیں بدلتے بدلتے جب وہ تھک گئی تو اس نے کمرے کی لائٹ جلا دی۔ اس نے قریب ہی پلنگ پر لیٹے ہوئے ننھے اظہر کو دیکھا اور دیکھتی ہی رہی۔

کل اس کی شادی تھی۔ بہت سے لوگ گھر میں جمع تھے۔ خالہ کے ساتھ اظہر بھی آیا ہوا تھا۔ شام کے وقت اسی کمرے میں بیٹھے ہوئے اس نے

صحن سے اختر کی آواز سنی تھی۔ اس نے کہنا چاہا تھا کہ بڑھ کر ایک نظر اختر کو دیکھ ہی لے۔ شاید اس وقت ہی اختر اس کو سہارا دیدے اور پھر وہ کس قدر جھلائی تھی: "آخر یہ لوگ میرے چاروں طرف کیوں جمع ہیں۔" بہرحال وہ اختر کو نہ دیکھ سکی۔

"کتنی مشابہت ہے اختر اور اظہر میں" لیٹتے ہوئے اس نے سوچا۔ کمرے میں سبز بلب کی روشنی میں ہر چیز رنگی ہوئی تھی: "وہی آنکھیں ——— وہی پیشانی ——— وہی بالکل وہی ——— نیلا بیکراں آسمان۔ پیلے زرد اور اداس پھول۔ سبز کاہی شاداب میدان۔ اور اختر کی آنکھیں جو آسمان میں ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہی آنکھیں ——— بالکل وہی آنکھیں ——— جن میں جھانکنے کی وہ خود ہمت نہ کر سکتی تھی۔ جن میں وہ خود اپنے آپ کو کھو دیتی تھی۔ اور پھر اچانک عجیب قسم کی شرم اس پر غالب آجاتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ عجیب سا ——— گھناؤنا تصور جس کے خیال پر وہ ہر لمحہ عجیب سی کراہت محسوس کرتی ——— باوجود ناپسندیدگی کے وہ بجھے دل اور بے کیفی کے ساتھ اس لمحہ کو برداشت کرتی جب اسکو اپنی صاف جلد پر ابھرے ہوئے بال محسوس ہوتے۔

"اب تم یہ نہ کہہ دینا کہ سینے کے بال بھی صاف کردو۔"

بالوں بھرا یہ گھناؤنا لمحہ اسے برداشت کرنا ہی پڑتا۔

آسمان پر چمکنے والی آنکھوں سے یہ بال اچانک ہٹ گئے۔ (اختر تمہیں کیا مزا آتا ہے اسے یاد آیا کہ اختر نے اس سوال پر الٹا اسی سے پوچھا تھا "کیوں تمہیں کچھ محسوس نہیں ہوتا۔" اور اس نے بجائے اس کے کہ کہہ دیتی "مجھے نفرت ہے ان تمام بیہودگی سے"۔ اس ڈر سے کہ کہیں اختر ناراض نہ ہو جائے۔ صرف یہی کہا تھا "مجھے تو کچھ بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا ——— "شریر" اختر نے انتہائی پیار سے کہا تھا اور پھر دوسرے لمحہ اس نے تیزی سے اختر کے ہاتھوں کو اپنے سینے سے جھٹک دیا تھا۔ آخر کیا مزا آتا ہے اس میں وہ اکثر سوچتی۔ لیکن ہمیشہ کراہت کے علاوہ اس کو کچھ اور میسر نہ آتا) وہ بال جو بچپن سے اس کے ذہن پر مسلط ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی اس کے تصور میں ہر طرف بکھر جاتے اور اس وقت بھی یہی کچھ ہوا۔ لیکن آنکھوں کا تاثر اتنا شدید تھا ان آنکھوں کا جو اختر کی تھیں۔ اس اختر کی جو اسے اتنا عزیز تھا کہ اس کے لیے وہ اس نفرت انگیز کیفیت کو بھی برداشت کرتی تھی۔ یہی آنکھیں تھیں جن کے تاثر نے اس گھناؤنے پن کو صاف کر دیا اور اب پھر اس کے سامنے نیلے آسمان پر ستاروں کی جگہ آنکھیں چمک رہی تھیں جن سے لامتناہی دائرے چھلّے اور اسپرنگ نکل کر اس کے وجود کو جکڑتے جا رہے تھے اور پھر رفتہ رفتہ یہ اسپرنگ اپنے مرکز کی طرف لوٹنے لگے اور اب صرف دو آنکھیں تھیں وہ ان دائروں میں جکڑی تیزی سے آنکھوں کی طرف کھنچتی چلی گئی۔ اور ان میں معدوم ہو گئی۔ "اختر"۔ سیاہ اندھیرے میں اس نے آواز دی۔ دور کہیں سے ایک گہرا تاریک سایہ تیزی سے آیا۔ "سلیم" اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ اب اس کے سامنے پیلے لباس میں بے جان اور بے حس اختر کھڑا تھا۔ صرف آنکھیں تھیں جن میں حرکت تھی، زندگی تھی۔ نرگس کا وجود نیلے رنگ میں تحلیل ہو گیا اور سبز نور ہر چہار طرف پھیل گیا۔

"اختر تم نے مجھے پا ہی لیا"

"کیا ہوا باجی" اظہر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ نرگس اس کے پلنگ پر گر گئی تھی۔

"اوہ کچھ بھی نہیں"

وہ اپنے پلنگ پر جا لیٹی۔ دماغ میں خیالات کی مکڑیاں جالے بن رہی تھیں۔ اور بلب سے نکلتی ہوئی سبز روشنی اس کے وجود پر چھائی جا رہی تھی۔ کیف آور نشہ کی ترنگ میں وہ لیٹی رہی اور اس کا ذہن اس کے جسم سے آزاد ہو گیا۔

نہ معلوم اس کے ذہن میں قربانی کا تصور کہاں سے ابھرا۔ جس وقت ایجاب و قبول ہوئے تو اس نے سوچا اب وہ محض ایک تڑپتی ہوئی نعش رہ گئی ہے۔ اور اس کے چاروں طرف خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔ بری کا سرخ جوڑا اسے خون سے تربتر معلوم ہوا۔ اور وہ سہری جھی

پر اس کو سلیم کے گھر میں بٹھایا گیا تھا قربان گاہ معلوم ہوئی۔

"ہانپتے ہوئے شعلوں کی سُرخ لپکتی ہوئی زبانیں" اس نے سوچا یہ تصویر تو اب بھی اس کے کمرے میں رکھی ہوئی ہے۔ اور پھر وہ رات کتنی عجیب تھی کمرے میں سبز ملائم روشنی پھیلی ہوئی تھی سلیم نے اسے بتایا تھا کہ وہ اس کی کئی عادتوں سے پہلے ہی واقفیت حاصل کر چکا تھا اور سبز رنگ کا بلب اس کا ثبوت ہے۔ سلیم نے اس کے علاوہ نہ معلوم کیا کیا باتیں کیں جن کو نہ اس نے سمجھنے کی کوشش کی نہ سننے کی۔ اس کے دل میں تو صرف یہ خیال تھا کہ کاش اس جگہ اختر ہوتا۔ وقت سسکتا رہا۔ ہر ہر لمحہ وہ خود کو خون اور آگ کے درمیان پاتی۔

اور جب سحر کے قریب سلیم سو گیا تو وہ سسک پڑی۔

اور اس کے بعد اس کے فراریت پسند ذہن نے تصورات کی پناہ گاہوں میں سبز وادیاں تخلیق کیں۔ اختر کے تصور کو جاندار کیا اور گزری ہوئی صحبتوں اور یادوں کی گرمی محسوس کی۔

صبح کو جب ایک مرتبہ سب لوگ پھر اسے دیکھنے آئے تو اس نے سوچا اب وہ ایک اور تصویر بنائے گی جس کا عنوان اس کے ذہن میں اچانک آیا تھا "قتلِ عروس"۔

نیا ماحول، نئے لوگ، نئی زندگی جس کی وہ عادی نہ تھی۔ لیکن اپنانے پر مجبور تھی۔ اس تمام ماحول میں اسے اپنا کوئی بھی نظر نہ آتا۔ وہ ایک معمولی گھرانے کی لڑکی تھی۔ اور امیر گھرانے کی بہو۔ مایوسیوں، نفرت اور خوف کے درمیان پلی ہوئی۔ ہر ہر لمحہ اس کو اپنی کمتری کا احساس ہوتا۔ ہر قیمتی چیز کو ہاتھ لگاتے ڈرتی۔ ہمیشہ کی کم گو یہاں پہنچ کر اسے محسوس ہوا کہ اسے بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا۔ نوکروں سے بات کرتے ہوئے اس کا لہجہ بڑا عجیب وغریب ہو جاتا۔

"نوکروں سے اس طرح بات نہ کیا کرو......" "نوکروں کو اتنا منہ نہ لگانا چاہیئے" کوئی نہ کوئی اس سے کہتا لیکن اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ اس ماحول میں خود کو کس طرح سموئے اور یوں احساسِ کمتری کے انجی کی گرفت اس کے ذہن پر مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ پھر اس کی تنہائی اس کی رفیق بنی۔ وہی مانوس تنہائی جس کی وہ عادی تھی۔ کمرے بدل گئے مگر تنہائی اجاڑ اور غمگسار تنہائی.......؟"

ایک مرتبہ پھر پینٹنگ میں وہ غرق ہوگئی۔ ہانپتے ہوئے شعلوں کی تصویر کے ساتھ ساتھ "قتلِ عروس" بھی اس کے کمرے میں رکھی تھی۔ جس کے عنوان پر سلیم نے اعتراض کیا تھا۔ تو اس نے کہا تھا" اس تصویر میں میں اپنی بہترین صلاحیتیں بروئے کار لائی ہوں۔ آپ کو کیا پتہ اس تصویر کو بنانے میں میں نے اپنی زندگی کا خون دیا ہے۔" اس کا لہجہ یہ کہتے ہوئے اس قدر افسردہ اور غمگین تھا۔ کہ سلیم متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔

"نرگس خدا شاہد ہے کہ میں نے کبھی تم کو تکلیف دینے کا خیال بھی نہیں کیا۔ اگر تم اس تصویر کو اتنا ہی پسند کرتی ہو تو مجھے بھی پسند ہے۔"

"آپ —— آپ —— کس قدر اچھے ہیں۔" اور یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

سلیم سے نظریں ملاتے ہوئے اسے شرم بھی آتی اور دکھ بھی ہوتا۔ یہ دونوں احساسات اس کی پشیمانی کا نتیجہ تھے اس پشیمانی کا جو اس کو اپنی پاکیزگی کھو دینے کے خیال سے ہوتی تھی۔ سلیم کی محبت اختر کے مقابلے میں کہیں زیادہ پائیدار تھی، کہیں زیادہ پرخلوص۔ لیکن اسے خود پر اعتبار نہ تھا وہ خود کو سلیم کے لیے پسند نہ کرتی تھی۔

"میں سلیم کے قابل نہیں ہوں" وہ اکثر سوچتی اور تنہائی میں یہ جملہ اس کے ہونٹوں سے بڑے واضح طور پر ادا ہوتا۔ عجیب عجیب مراحل سے گزر کر اس نے خود کو نئی زندگی میں ڈھالا۔ لیکن سلیم کے مقابلہ میں وہ اپنے احساسِ کمتری کو کم نہ کر سکی۔

"سلیم" ایک دن آخر اس نے کہہ ہی دیا۔ "تم دیوتا ہو —— تمھیں معلوم ہے۔ سب کچھ معلوم ہے لیکن ——"

"نرگس" سلیم نے پرخلوص لہجے میں کہا۔ "مت سوچا کرو اس طرح۔ جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ۔ میں تمھارا دکھ جانتا ہوں۔" اور یہ کہتے کہتے سلیم

کی آواز کچھ اور گمبھیر ہوگئی۔

لیکن وہ یہ سب کچھ نہ بھول سکی۔ یہ سب کچھ بھول جانا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ سلیم کے مقابلے میں اس کو اپنا وجود حقیر سے حقیر تر معلوم ہونے لگا۔ وہ ذہنی طور پر سلیم کو شوہر کا درجہ نہ دے سکی۔ سلیم اس کے لیے صرف ایک دیوتا تھا جس سے اس کو عقیدت تھی اور جس سے اس کو خوف بھی محسوس ہوتا۔ اور وہ ایک عقیدت مند پجاری کی طرح اس کو سب کچھ سونپنے کے لیے تیار تھی۔ جسمانی تعلق اس کے لیے محض ایک عقیدت مندانہ نذرانہ ہوتا جو وہ اپنے دیوتا کے حضور پیش کرتی جس میں جذبات کو قطعی دخل نہ ہوتا۔ یوں وہ جذباتی طور پر سلیم سے ہمیشہ دُور رہی۔

اور پھر اچانک اس کی زندگی میں پے بہ پے ایسے حادثات ہوئے کہ وہ خود کو سنبھال سکی۔ اور اب وہ اسی اختر کی ہوی تھی جس کو اس نے چاہا تھا۔ جو ہمیشہ اس کے خیال میں زرد پھول بکھیرتا تھا۔ اس کے وجود سے مل کر سبز وادیاں تخلیق کرتا تھا۔ لیکن اب یہ سب کچھ اس کو ناپسند تھا۔ زرد پھولوں کے مقابلے میں اب اس کے ذہن میں پہلی آکاس بیل کا تصور زیادہ پائیدار تھا۔ سیاہ بالوں نے اکاس بیل کی شکل اختیار کرلی تھی ـــــ اور یہ چیز بھی اسے اتنی ہی ناپسند تھی۔ جتنے سیاہ بال۔ اب وہ صرف یہ چاہتی تھی کہ اس کو کمرے میں تنہا چھوڑ دیا جائے اور سبز ملائم روشنی میں وہ برہنہ لیٹی رہے۔

ڈھائی سال کا وہ عرصہ جو اس نے سلیم کے ساتھ گزارا تھا۔ اب اس کے لیے کتابِ زندگی کا درخشاں ترین باب تھا۔ وہ باب جو سلیم کی موت کے بعد اس نے پڑھا تھا، سمجھا تھا اور محسوس کیا تھا اور جس کو احساس ندامت اور پشیمانی کی بنا پر وہ ہمیشہ پڑھنے سے گریز کرتی تھی۔

اور یہ سب یوں ہوا کہ اختر اس کے خیالی اختر کے مقابلہ میں کہیں مختلف تھا۔ اور ایک مرتبہ پھر سُرخ رنگ نیلے افق کے گوشوں پر ابھرنے لگا

اس کے سڈول مرمریں جسم کا تناؤ کچھ اور بھی شدید ہوگیا۔ یہ تناؤ جذبات کی انتہا کا سبب نہ تھا۔ بلکہ اس کی جذباتی کشیدگی کا مظہر تھا۔ اس کے ساتھ پر ناگواری کی شکنیں کچھ اور گہری ہوگئیں۔ اس کے جسم میں جلنے والے شعلے یونہی خوابیدہ رہے اور وہ اس بوجھ کو ناگواری سے برداشت کرتی رہی۔ بلاشبہ اس کا جسم اس نزدیکی کے باوجود بالکل غیر متعلق تھے۔ جو کچھ بھی تھا ایک طرفہ جذبہ تھا جوش تھا آگ اور برف کا امتزاج۔!

اور کچھ دیر بعد جب یہ ناگوار بوجھ ہٹ گیا۔ دہکتی ہوئی آگ کے شعلے برف پر پگھل گئے۔ تو وہ تھکے ہوئے بھینسے کی طرح ہانپتا کروٹ بدل کر لیٹ گیا اس کا جسم اب بھی یونہی تنا ہوا تھا۔ اعصاب میں کھچاؤ یونہی برقرار تھا لیکن اب کیفیت مختلف تھی۔ اعصاب کا یہ تناؤ اور کھچاؤ لاتعلقی اور ناگواری کا نتیجہ نہ تھا۔ بلکہ یہ تو اس تصور کی وجہ سے تھا جو اس کے لیے تسکین و راحت کا سامان تھا۔ صرف ایک تصور ـــــ ایک تصور جو کبھی حقیقت تھا۔ وہ تسکین و راحت جو خواب اور تصور کے دھندلکوں کی اوٹ سے جھانکتی تھی۔ وہ اپنی سوکھی ہوئی کھیتی کو خواب کے بادلوں کے پانی سے سیراب کرتی تھی۔ اس کے حقیقی گلشن میں بہاریں صرف تصور کے دم سے آتی تھیں۔

اس کے جسم پر سے برف کی سل پگھل کر آگ اور شعلوں میں تبدیل ہوگئی۔ اس کی ایک ایک رگ کا کھچاؤ شدید تر ہوگیا۔ اس کو یوں محسوس ہو رہا تھا گویا اس کی رگیں پھٹنے والی ہیں اس کے روئیں روئیں میں انگارے بھر گئے۔ اور اس کی کھیتی پر گرم گرم خاک اڑنے لگی۔ اور اگلے لمحے خواب کے بادل اس کے جسم پر چھا گئے۔ اور سوکھی ہوئی کھیتی پر پانی پھیلنے لگا۔

جب وہ اس تصور سے نکلی تو اس کا جسم ڈھیلا پڑ چکا تھا۔ اس کے جسم کے روئیں روئیں کی جڑوں سے پسینہ پھوٹ رہا تھا اور کھڑکی سے آتی ہوئی ہوا کے جھونکوں سے اس کو ٹھنڈک اور خنکی کا عجیب پرلطف احساس ہوا۔

کمرے میں تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔

اس نے اپنا لباس ٹھیک کیا۔ باہر رات کی تاریکی میں پہاڑی مکان کی ٹین کی چھتوں کے درمیان دوڑنے والے چوہوں کی کھڑ بڑاہٹ کا شور مرطوب ہوا کے دوش پر ابھر رہا تھا اور کمرے میں اس کو خود کا قطعی احساس نہ تھا۔ بلکہ ان گہرے گہرے سانسوں کا خیال تھا۔ جو اس کے پہلو میں بیٹھے ہوئے مَرد کے نتھنوں اور منہ سے ابھر رہے تھے۔

"یہ اختر ہے —— میرا شوہر —— بھیڑیا" اس نے تنفر آمیز انداز میں اپنے ہونٹ سکوڑ لیے۔

کھڑکی سے بھیگی ہوا فراٹے بھرتی کمرے میں آرہی تھی۔ بوجھل قدم اٹھاتی وہ کھڑکی کے قریب آگئی اور باہر جھانکنے لگی۔ آسمان کا کچھ حصہ بادلوں سے صاف تھا اور اس حصے میں انتہائی بلندیوں پر ستارے جگمگا رہے تھے۔ اور ہلکے ہلکے بادلوں کے گالے مشرق سے مغرب کی طرف بھاگ رہے تھے۔ جن کے پس منظر میں چاند آسمان پر تیرتا معلوم ہوتا تھا۔

"کتنا دل آویز اور پرسکون ہے یہ سب کچھ —— اور اب میرے پاس کیا ہے —— کچھ بھی تو نہیں، صرف یادیں اور پچھتاوے۔" اس نے گہری سانس لی۔ اندرونی جذبے کے تحت وہ پھر پژمردہ اور اداس ہوگئی۔ انجانے بوجھل احساس کے تحت اس نے پردہ کھڑکی پر پھیلا دیا اور بوجھل قدموں سے کمرے سے نکل گئی۔

رات کچھ اور گہری ہوگئی تھی۔ برابر کے کمرے سے اس کو اختر کے خراٹوں کی آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ آرام کرسی سے اٹھ کر اس نے بجلی روشن کردی۔ اور الماری کھول کر اس میں سے البم نکال لی۔

"نرگس کے لیے —— سلیم"

اور وہ پھر اس فوٹو کو دیوانہ وار چومنے لگی "سلیم —— میرے سلیم"۔ سلیم جس کو اس نے مرنے کے بعد پایا تھا۔ جو زمین کی گہرائیوں میں خاک بن گیا تھا۔ "سلیم آخر یہ سب کیوں ہوا —— یہ سب کیا ہوا۔"

اور پھر وہ البم سینے پر رکھے آرام کرسی پر دراز ہوگئی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کے ہونٹوں سے "سلیم سلیم" کے الفاظ نکل رہے تھے۔ سلیم ایک تصوّر تھا کتاب زندگی کا گمشدہ ورق کسی خوبصورت جملہ کا پوشیدہ مطلب۔ اور پھر اس کے اعصاب پر خواب کے بادل امڈ آئے —— !

اس کو اچھی طرح یاد تھا کہ سلیم نے اپنی یہ تصویر کس موقع پر اس کو دی تھی۔ اور اس نے لاپروائی سے ایک طرف پھینک دیا تھا اور پھر نا معلوم کیوں اٹھا کر بکس کے ایک کونے میں ڈال دیا تھا۔ اور سلیم کو تو گویا خبط تھا اس کیلئے چیزیں لانے کا۔ وہ لاکھ کہتی۔ لیکن سلیم باز نہ رہتا۔

"آخر میں پاگل کیوں ہوگئی تھی سلیم۔" وہ ایک مرتبہ پھر بلک پڑی۔

اور آج تو وہ کراسے سلیم کی ایک ایک بات یاد آرہی تھی۔ برابر کے کمرے سے ابھرتے ہوئے خراٹوں کی ہر ہر آواز اس کے زخموں کو کھرچ رہی تھی۔ "یہ اختر۔ یہ بھیڑیا —— مر بھی تو نہیں جاتا کمبخت، بات بات پر طعنہ دیتا ہے۔ اس کو غرور ہے میری محبت پر۔ سمجھتا ہے کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ لہٰذا جیسا وہ چاہے کرے میں اس سے کچھ نہ کہوں گی۔"

اس نے ایک مرتبہ پھر البم کو دیکھا۔ "سلیم کا فوٹو اس کے سامنے تھا۔" نرگس کے لیے —— کون جانتا تھا کہ یہ سب کچھ یوں ہو جائے گا۔

"آخر تم نے قربانی کیوں دی سلیم کیوں میرے لیے زندگی بھر کا جہنم تیار کر دیا۔" اس وقت اس کو سلیم کے خط کے الفاظ پھر یاد آگئے۔ جو صرف ایک مرتبہ دیکھنے کے بعد اس کو ازبر ہوگئے تھے .... جنھوں نے خود اس کو ایک نئی زندگی کا پیغام دیا تھا —— اس زندگی کا جو خود اس کو پسند تھی۔

"تم سے صرف اتنی استدعا ہے کہ میرے بعد اختر سے شادی کر لینا۔"

جس دن صبح اس کو سلیم کا یہ پرچہ ملا تھا وہ خود اس دنیا میں موجود نہ تھا۔ نہ معلوم اس نے مرنے کے لیے کون سا زہر استعمال کیا تھا یہ تو اس کو یاد نہ رہا تھا۔

اور پھر اس نے اختر سے شادی کر لی۔ اور یہ شادی اس کے لیے صرف پچھتاوے لے کر آئی۔ اس ایک مہینہ ہی میں جب کہ ہنی مون منانے کے لیے وہ اس پہاڑی مقام پر آئے تھے۔ اس کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اب اختر کے لیے ایک قصۂ پارینہ بن چکی تھی۔ اس کو کبھی نرگس کے جسم سے محبت تھی۔ لیکن اب اس دولت سے جو سلیم کے مرنے کے بعد اس کو ملی تھی۔

"کیا میں یونہی جلتی رہوں گی ـــــ کیا ـــــ کیا ـــــ" پھر اس نے البم بند کر کے میز پر ڈال دیا۔

وہ کھڑی ہو گئی۔ باہر ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ نرگس نے اپنا منہ کھڑکی سے باہر نکال لیا۔ پھوار کے ننھے ننھے قطرے اس کے جسم پر جم گئے۔ کچھ دیر وہ اسی طرح کھڑی رہی پھوار کی ننھی ننھی بوندیں بارش کے ... موٹے موٹے قطروں میں تبدیل ہو گئیں اس نے اپنے ہاتھ باہر نکال دیئے اور کھڑکی میں جھک گئی۔ اولتیوں کا پانی اس کی ہتھیلیوں پر گرتا رہا اور کھڑکی سے باہر نکلا ہوا بدن پانی میں بھیگتا رہا۔ جب اسی حالت میں کھڑے کھڑے وہ تھک گئی۔ تو اس نے دیکھا کہ کھڑکی کے نیچے کمرے کا فرش دور تک گیلا ہو گیا ہے ـــــ اس کی قمیص بھیگ گئی تھی۔ بدن میں اس نے سردی کی ہلکی سی لہر محسوس کی۔

الماری سے اس نے دوسرے کپڑے نکالے اور گیلے کپڑے اتار دیئے۔ سفید مرمریں جسم پر سبز ملائم روشنی پھیل گئی۔ سنگار میز میں لگے ہوئے قد آدم آئینے میں اپنے عریاں جسم کے خطوط دیکھے اور ٹھٹھک کر رہ گئی۔ دیر تک وہ آئینے میں اپنے جسم کے ایک ایک حصہ کو دیکھتی رہی۔ اور اپنی انگلیوں سے اپنے جسم کو ہولے ہولے سہلاتی رہی اور سلگتی رہی۔ گزرے ہوئے وقت کا ہر ہر لمحہ خار رگِ جاں ہو گیا۔ "میرے پاس جب سب کچھ تھا۔ تو میں سمجھتی تھی کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں اور آج جبکہ میرے پاس وہی کچھ ہے جس کو میں نے حاصل کرنا چاہا تھا تو میرے پاس کچھ بھی تو نہیں رہا ـــــ صرف نفرت اور مایوسیاں جو میرے پاس ہمیشہ سے تھیں اور اب بھی ہیں۔"

اور پھر اس کے بعد اس نے اپنے جسم سے ایک آگ اٹھتی محسوس کی شعلے اور انگارے اس کے چاروں طرف بکھر گئے خون اور آگ اس کے چاروں طرف پھیل گئی۔ خون اس کے ارمانوں کا تھا جن کے درمیان ایک بے کس لڑکی پڑی تھی ـــــ قتل عروس ـــــ پھر ایک سپاٹ چہرہ جس پر نہ آنکھیں تھیں، نہ منہ نہ ناک بس چہرے کا احساس جس کے تصور کے خدوخال زمانہ کی رفتار نے بگاڑ دیئے تھے اور اس چہرے پر مٹی پھینکتے ہوئے ننھے ننھے ہاتھ "کم بخت مر کیوں تو نہیں جاتا" اور اس کے سامنے چاروں طرف بال ہی بال بکھر گئے۔ جن کو آگ کے شعلے چاٹ رہے تھے۔ نفرت اور غلاظت کا شدید احساس اس کے دل میں پیدا ہوا۔ تصاویر یکے بعد دیگرے ابھر ابھر کر مٹ رہی تھیں۔ "کم بخت مر کیوں تو نہیں جاتا۔" ایک سیاہ دھبہ نہ معلوم کہاں سے آیا اور آگ کے شعلوں نے اسے بھی چاٹ لیا۔ یہ دیکھ کر اسے بڑی عجیب سی مسرت ہوئی۔ "کم بخت تم سلیم کے قاتل ہو۔ تم عروس کے قاتل ہو۔ قتل عروس تم نے کیا ہے اختر تم میرے قاتل ہو۔ میری پاکیزگی کے قاتل" وہ اسی سیاہ دھبے سے مخاطب تھی۔ جس کو شعلوں نے چاٹ لیا تھا۔

اور پھر اس کے سامنے اس کی پسندیدہ تصویر رہ گئی۔ اس کی زندگی کی تصویر جل گئی۔ ہانپتے ہوئے شعلوں کی سرخ زبانیں بار بار لپک رہی تھیں۔ "میری پاکیزگی کے قاتل" اس نے پھر یہ جملہ دہرایا۔

اور جب وہ اس کیفیت سے نکلی تو بند کمرے سے اختر کے چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کمرہ شعلوں میں گھرا ہوا تھا۔ کمرے کے دروازے بند تھے اور مٹی کے تیل کا کنستر اس کے قریب پڑا تھا۔

جی۔ایم ناز
زیب النساء۔لاہور

ممتا

"رابرٹ بیٹا۔۔۔ ذرا دوڑ کر گروسری کا سامان تو لے آؤ۔ آج پارٹی ہے نا بیٹا۔۔" مسز ٹوکینی نے اپنے گیارہ سالہ بیٹے کو پیار سے کہا اور رابرٹ نے اپنی ماں کی طرف کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

"اچھا امی" رابرٹ نے جواب دیا۔ اور اپنا ماڈل ہوائی جہاز الماری میں رکھنے چلا گیا۔

"بڑا سعادت مند بیٹا ہے۔" مسز ٹوکینی نے میری طرف مسکرا کر کہا۔

"ہاں۔" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میں تمہارے لیے کافی لے آؤں۔"

"نہیں۔ مجھے کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں ہو رہی۔" میں نے جواب دیا۔ اور وہ بیٹھ گئی۔

"اب پوچھیے۔" اس نے اپنا اپرن اتار کر ایک طرف رکھا اور اپنے بالوں کو ایک ہاتھ سے سیٹ کرنے لگی۔

"آپ کو ایڈی سے کب پیار ہوا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ایڈی مجھے دو سال ہوئے روم میں ملا تھا۔" مسز ٹوکینی نے کہا۔

"آپ کا شوہر جوزف ٹوکینی آپ کے ساتھ ہی تھا۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ وہ یہاں جینوا میں ہی رہ گیا تھا۔ دراصل میری بڑے عرصے سے آرزو تھی۔ کہ میں موسم سرما میں روم جاؤں۔ مگر ہر بار جوزف کو کوئی نہ کوئی کام آپڑتا۔" مسز ٹوکینی نے کہا۔

"اور آپ اکیلے ہی روم چلی گئیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ میں نے جوزف سے کہا کہ رابرٹ کو بھی میرے ساتھ بھیج دے۔ مگر اس نے جواب دیا۔ کہ رابرٹ کی موجودگی میں آرام دہ چھٹیاں نہ گزار سکوں گی۔

"آپ کے اور بھی کوئی بچہ پیدا ہوا؟"

"ہاں ایک لڑکی تھی۔ بے چاری چھٹ پن ہی میں حادثے کا شکار ہو گئی۔"

"آپ کی شادی کو کتنا عرصہ گزرا ہے۔ میرا مطلب ہے جوزف سے طلاق لینے سے پہلے۔" میں نے پوچھا اور مسز ٹوکینی کی بڑی بڑی ارغوانی آنکھیں

پر اداسی چھا گئی۔

"ہم نے پندرہ سال ازدواجی زندگی گزاری ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"اور پندرہ سال بعد آپ کو ایڈی سے محبت ہو گئی۔؟"

"ہاں۔ یہ کتنی عجیب بات ہے نہ جانے یہ کیسے ہوا۔ بس مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ ایڈی میری تمام دنیا پر چھا گیا ہے۔"

"اور غالباً جوزف سے شادی سے پہلے بھی آپ کو یہی محسوس ہوا تھا۔"

"ہاں، مجھے جوزف سے بڑا پیار تھا ـــــ اگر پیار نہ ہوتا تو ہم لوگ یوں پندرہ برس نہ گزار دیتے۔"

"مگر اس پیار کے باوجود آپ کو ایڈی سے بھی محبت ہو گئی۔" میں نے طنزاً کہا۔

"مجھے معلوم ہے تم کیا سوچ رہے ہو ـــــ تم پاکستانی ہو شاید۔ تمھارے ملک میں میری اس جسارت پر مجھے گولی مار دی جاتی۔" مسز ٹوکینی نے کہا۔ اور میں کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"نہیں میرے ملک میں ایسا کوئی رُواج نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ بات یہاں پر بھی حیران کن ہی ہے۔ مگر جب شوہر سے پیار نہ ملے تو پھر بہتر ہے کہ طلاق لے لی جائے دوسرے کو دھوکے میں رکھ کر تو زندگی نہیں گزاری جا سکتی۔" مسز ٹوکینی نے کہا

"یہ سچ ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اب تم ہی بتاؤ کہ میں نے طلاق لے کر کیا اچھا کام نہیں کیا؟" اس نے پوچھا۔

"سَردست تو میں اس کا جواب نہیں دے سکتا۔" میں نے کہا۔

"کیا تمھارے ملک میں جب کسی عورت کو دوسرے آدمی سے محبت ہو جاتی ہے تو وہ طلاق طلب نہیں کرتی۔" اس نے پوچھا۔

"ہمارے ملک میں محبت کا رُواج نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"او ہاں۔ میں تو بھول ہی گئی۔ تم نے پہلے ہی مجھے بتایا تھا کہ وہاں کے رسم و رُواج بالکل الگ ہیں۔" مسز ٹوکینی نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

"کیا تمھیں جوزف کا ذرا بھی خیال باقی نہیں رہا۔" میں نے پوچھا۔

"خیال ـــــ خیال تو ضرور ہے۔ وہ بہت اچھا آدمی ہے۔ لیکن عمر کے ساتھ ساتھ اس کی محبت پر بھی باسی پن چھا گیا تھا۔ اس نے برسوں سے مجھے پیار کے لفظ نہیں کہے تھے۔" مسز ٹوکینی نے اداسی سے کہا۔

"کیا برسوں گزر جانے کے بعد بھی تمھیں اس کی محبت پر شبہ تھا۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں شبہ تو نہیں تھا۔ مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ عورت پیار کے دو لفظ سننا بھی نہیں چاہتی۔" مسز ٹوکینی نے جواب دیا۔

"پیار کے وہ لفظ جو زبان سے کہے جائیں یا پیار کا وہ سلوک جو رویہ سے ظاہر ہو ـــــ ان میں کون سا بہتر ہے۔" میں نے کہا۔

"تم تو مشرقی فلاسفر ہو۔ مجھے پتا ہے تمھارے نظریۂ زندگی کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ مگر پیار و محبت کو بحث سے یا فلسفہ سے ختم تو نہیں کیا جا سکتا نا۔" مسز ٹوکینی نے کہا۔

اتنے میں رابرٹ کھانے پینے کی مختلف چیزیں لے کر آ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے دکاندار کا پورٹر شمپین کی بوتلیں اٹھائے ہوئے آ رہا تھا۔

"اوہ شکریہ ـــــ شمپین فریج میں رکھ دو۔ پیارے رابرٹ شام کو وہ بلیو رنگ کا سویٹر پہننا۔ اگرچہ تم پارٹی میں شامل تو نہ ہو سکو گے ـــ مگر ڈارلنگ لباس ضرور بدل لینا۔" مسز ٹوکینی نے رابرٹ کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"اچھا امی"۔ رابرٹ نے کہا۔ اور اپنے کمرے کی طرف بھاگ گیا۔
"کیا رابرٹ نے اپنے نئے باپ کو پسند کرلیا ہے؟" میں نے پوچھا اور مسز ٹوکینی نے تیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔
"رابرٹ ایڈی سے کئی بار مل چکا ہے۔ مجھے یقین ہے وہ اسے پسند کرتا ہے" مسز ٹوکینی نے کہا۔
"کیا اسے جوزف یاد نہیں آتا" میں نے کہا۔
"جوزف سے اس کے گہرے تعلقات نہ تھے ـــــ لیکن اسے یاد تو ضرور آتا ہوگا" ٹوکینی نے کہا۔
"تمھارے خیال میں کیا یہ بات بچے کے لیے بری نہیں کہ اس سے اس کا باپ جدا کردیا جائے" میں نے وار کیا۔
"تم میرے جذبات سے نہ کھیلو ـــــ تم چاہتے ہو کہ کسی نہ کسی طرح میں جوزف سے دوبارہ رابطہ پیدا کرجاؤں ـــــ مگر یہ مشکل ہے، میرا دل ایڈی کا ہوچکا ہے" مسز ٹوکینی نے کہا۔ اور اپنے لیے جام لے آئی۔
"تم پیوگے؟"
"تمھیں معلوم ہے۔"
"ہاں۔ تم نہیں پیتے۔ تمھارا مذہب بھی بڑا سخت ہے" اس نے گھونٹ لے کر کہا۔
"کیا تمھیں رابرٹ سے پیار ہے۔"
"وہ میرا بیٹا ہے۔"
"تو پھر اسے دکھ دینا تمھارے لیے بھی اچھا نہیں ہے" میں نے کہا۔
"او خدا ـــــ بھئی اب میں تمھاری باتیں نہیں سنوں گی۔ تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ہمارے ملک میں یہ بات اتنی اہم نہیں ہوتی" مسز ٹوکینی نے کہا اور میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔
"تم جارہے ہو؟"
"ہاں"
"شام کو پارٹی پر آؤگے نا؟"
"ہاں۔ صرف اس لیے آؤں گا کہ میں تمھارے منھ سے ایڈی سے شادی کا اعلان سننا چاہتا ہوں۔"
"تم مشرقی لوگ بڑے ظالم ہوتے ہو۔ تمھاری ہر بات میں طنز ہوتا ہے" اس نے مسکرا کر کہا۔
جب میں جانے لگا تو سامنے مجھے رابرٹ اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا نظر آیا۔ میں آہستہ سے اس کی طرف بڑھا۔ وہ اپنے ماڈل ہوائی جہاز کو درست کررہا تھا۔
"رابرٹ!" میں نے آہستہ سے کہا۔
"ہاں انکل" وہ مجھے انکل کہا کرتا تھا۔
"تمھیں پتا ہے یہ پارٹی کیوں ہورہی ہے؟" میں نے پوچھا۔
"ہاں ـــــ آج امی ایڈی سے شادی کا اعلان کریں گی نا؟" رابرٹ نے لاپروائی سے جواب دیا۔ اور ماڈل میں مصروف رہا۔ میں اس کی بے اعتنائی پر حیران ہوکر چلا آیا۔
مسز ٹوکینی سے میری ملاقات شہزادی فیاس کے یہاں ہوئی تھی۔ شہزادی نے مجھے بتایا تھا کہ مسز ٹوکینی ایک کروڑپتی باپ کی بیٹی ہے۔ اور اس

کی شادی بھی ایک اچھے آدمی سے ہوئی تھی۔ ان دنوں مسز ٹوکینی کی طلاق کا مسئلہ عدالت میں چل رہا تھا۔ بیوی میاں کو الگ ہوئے سال بھر گزر چکا تھا۔ چند ہفتوں میں اس کی طلاق کا فیصلہ ہونے والا تھا۔

چونکہ طلاق کی درخواست خود مسز ٹوکینی نے دی تھی۔ اس لیے شوہر سے معاوضہ ملنے کا کوئی سوال نہ تھا۔ مجھے مسز ٹوکینی کی نانگی زندگی سے اس وقت دلچسپی پیدا ہوئی جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ اس کا گیارہ برس کا لڑکا بھی ہے۔ رابرٹ بہت سمجھدار اور ہونہار بچہ تھا۔

مجھے اس سے دل لگاؤ پیدا ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ رابرٹ باپ کے جدا ہو جانے پر مایوس تھا۔ اگرچہ اس کا اظہار اس نے کبھی بھی نہیں کیا تھا۔ وہ اکثر میرے پاس آ کر بالکونی سے جنیوا لیک کا نظارہ کرتا رہتا تھا۔ یو۔ ایس۔ او کی بلڈنگ اور امپائر ہوٹل کے درمیان میرا قیام تھا یہ علاقہ امرا کے لیے مخصوص ہے۔

مجھے سوئٹزرلینڈ آئے ہوئے ابھی صرف ایک مہینہ گزرا تھا مگر اس ایک ماہ میں ہی میرے دوستوں کی تعداد خاصی بڑھ گئی تھی مسز ٹوکینی بھی میرے اچھے دوستوں میں شامل ہو گئی تھی۔ اور اکثر مجھے اپنے یہاں کھانے پر بلوا لیا کرتی تھی۔ آئے دن پارٹیاں ہوتی رہتی تھیں۔ اسی پارٹی میں اس نے مجھے اپنے محبوب ایڈی ٹریگار سے ملایا تھا۔ ایڈی کی عمر مسز ٹوکینی کے برابر ہی تھی۔ مگر اس کے باوجود وہ عمر میں اس سے بڑا معلوم ہوتا تھا۔ مسز ٹوکینی چھتیس برس کی عمر میں بھی نوجوان دکھائی دیتی تھی۔ اطالوی اور فرانسیسی خون نے مل کر اس کے حسن میں چار چاند لگا دیئے تھے۔ اور اسے خود بھی اپنے حسین ہونے کا احساس تھا۔ اگر کسی روز دو پونڈ وزن بڑھ جاتا تو وہ دو دن فاقے کر کے وزن گھٹا لیتی تھی۔ سیاہ بالوں اور عنابی آنکھوں نے مل کر اسے بہت ہی دلکش بنا دیا تھا۔ لباس کے معاملے میں وہ بہت محتاط رہتی تھی۔ میں نے اسے کبھی بھڑکیلے لباس میں نہیں دیکھا تھا۔ قیمتی مگر سادہ لباس اس کے جسم پر بہت بھلا لگتا تھا۔ اس کے شوہر جوزف سے میں نہ مل سکا تھا۔ مگر اس کی تصویر دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا تھا کہ خاصا پُرکشش دلچسپ آدمی ہو گا۔

ایڈی اس کے مقابل بچہ نظر آتا تھا۔ حالانکہ چہرے پر بڑھاپا تھا مگر اس کی آنکھوں اور ہونٹوں کی بناوٹ نے اس کے بڑھاپے پر عجیب بچگانہ تاثر پیدا کر دیا تھا۔ وہ گفتگو میں انتہائی مہذب تھا۔ اور باتوں ہی باتوں میں عورتوں کی تعریف میں شاعرانہ الفاظ استعمال کر دیا کرتا تھا۔ غالباً یہ شاعرانہ ذہن اسے اطالوی ماحول نے دیا تھا۔ مسز ٹوکینی سے وہ بڑے احترام اور پُرتکلف طور پر ملا کرتا تھا۔ غالباً اس کی یہی عادات تھیں جن کی وجہ سے مسز ٹوکینی کے دل میں محبت کا چراغ روشن ہوا۔

میں نے مسز ٹوکینی کو بہت سمجھایا کہ وہ طلاق کا مقدمہ واپس لے لے۔ اور اپنی ازدواجی زندگی خراب نہ کرے مگر وہ ایڈی کی محبت میں اس قدر سرشار تھی کہ اپنے شوہر کی تمام خوبیاں اس کی نظروں میں ماند ہو چکی تھیں۔

بالآخر اسے طلاق مل گئی۔ اور اس نے ایڈی سے شادی کا اعلان کرنے کے لیے پارٹی دے دی۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ لوگ کس قدر ظالم ہیں۔ کہ اپنے پیار کی خاطر اپنی اولاد کی بھی پروا نہیں کرتے۔ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ اگر یہ دونوں میاں بیوی اکٹھا روم جاتے تو شاید اس کی زندگی میں ایڈی کا داخلہ نہ ہوتا۔ روم میں وہ تنہا تھی اسے ساتھی کی ضرورت تھی۔ روم کی رومان پرور فضا میں دل و دماغ پر عشق کا ایک ایسا نشہ پیدا ہوتا ہے کہ آدمی خواہ مخواہ رومان بن جاتا ہے۔ اور غالباً اسی ماحول کے اثر نے مسز ٹوکینی کو ایڈی کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ ایڈی جو عورت کی فطرت کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ مسز ٹوکینی پر بڑی آسانی سے قابض ہو گیا تھا۔ وہ عورت جس کی ازدواجی زندگی ایک عام معمول بن چکی ہو۔ جسے شوہر سے پیار بھرے بول سنے ہوئے مدت گزر چکی ہو۔ جب روم جیسے رومانی شہر میں تنہا جاتی ہے اور اسے ایڈی جیسا ہوشیار آدمی مل جاتا ہے تو پھر اس کی وہ سوئی ہوئی محبت جو شوہر کی بے اعتنائی کی منوں راکھ تلے دب چکی تھی۔ یکدم جاگ اٹھتی ہے۔ روم کی سہانی شامیں نیلا آسمان اور خوبصورت چاند مل کر اس سوئی ہوئی محبت کو جھنجھوڑ کر جگا دیتے ہیں۔

ایڈی نے جو جادو چلایا تھا مسز ٹوکینی اس سے مدہوش ہو چکی تھی۔ وہ نہ صرف اپنے شوہر کو قربان کرنے پر آمادہ ہو گئی۔ بلکہ اپنے بیٹے رابرٹ

وشیوں کا بھی اسے احساس نہ رہا تھا۔ وہ بھی سمجھ رہی تھی کہ رابرٹ اپنے باپ سے چونکہ مانوس نہ تھا اس لیے اس کے جدا ہونے سے بھی اس پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ ایڈمی کو یہ معلوم تھا کہ اسے اپنی محبوبہ کو حاصل کرنے کے لیے اس کے بیٹے کو بھی اپنا ہم خیال بنانا پڑے گا۔ اس لیے اس نے رابرٹ سے ہر ممکن طریقے سے دوستی اور پیار کا رشتہ استوار کر لیا تھا۔

شام کو جب میں مسز ٹوکینی کے یہاں پہنچا۔ تو وہاں پہلے ہی لوگ پہنچ چکے تھے شمپین پی جا رہی تھی۔ میں چپکے سے رابرٹ کے کمرے میں گیا۔ رابرٹ اپنے کمرے میں بیٹھا پڑھ رہا تھا۔

"ہیلو رابرٹ۔" میں نے کہا۔

"ہیلو انکل" رابرٹ نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔

"تم نے لباس نہیں بدلا" میں نے پوچھا۔

"کیا فائدہ؟ ــــ میں پارٹی میں تو شامل نہیں ہوں گا" رابرٹ نے جواب دیا۔

"مگر تمھاری امی کو برا محسوس ہوگا۔"

"ہاں ہوگا تو سہی ــــ اچھا انکل میں لباس بدل لیتا ہوں ـ" رابرٹ نے کہا۔ اور میں اٹھ کر مہمانوں کے کمرے میں چلا گیا۔

مسز ٹوکینی ہلکے نیلے رنگ کے گاؤن میں بے انتہا دلکش نظر آ رہی تھی۔

"آج تم بہت حسین دکھائی دے رہی ہو" میں نے اس کے قریب جا کر کہا۔

"واقعی؟" اس نے پوچھا اور میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"شکریہ" اس نے میرے گالوں پر ــــ بوسہ دیا۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی اور وہ فون کے پاس چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا رنگ کچھ پھیکا ہو گیا تھا۔ اور آنکھوں سے وہ چمک غائب ہو چکی تھی۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جوزف کا فون تھا"

"جوزف کا؟ ...... کیا کہہ رہا تھا؟" میں نے کریدا۔

"وہ ہر دوسرے تیسرے دن رابرٹ سے باتیں کرتا ہے اور ہفتہ میں ایک بار اسے بلواتا بھی ہے"

"پھر؟"

"کہہ رہا تھا کہ رابرٹ کو فون پر بلوا دو۔ مگر میں نے کہہ دیا کہ وہ کہیں باہر گیا ہے"

"کیوں تم نے غلط کیوں کہا" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"تمھیں معلوم ہے آج کیا ہونے والا ہے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ آج رابرٹ سے بات کرے۔" مسز ٹوکینی نے اداسی سے کہا۔

"مگر کیوں؟"

"اس لیے کہ رابرٹ کے دل پر اس کا اچھا اثر نہیں پڑے گا۔ جب کہ اسے معلوم ہے آج میں شادی کا اعلان کرنے والی ہوں ــــ" مسز ٹوکینی نے کہا۔

"ممی ــــ!" رابرٹ نے دروازے سے جھانک کر کہا۔ اور مسز ٹوکینی جلدی سے اس کے قریب گئیں۔

"کس کا فون تھا ممی ــــ" رابرٹ نے پوچھا۔

"کیوں ؟" مسز ٹوکینی نے پریشان ہو کر کہا۔

"میں نے صبح ڈیڈی کو فون کیا تھا کہ وہ شام کو آ کر مجھے لے جائیں میں ذرا گھومنا چاہتا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ وہ شام کو ٹیلیفون کر کے بتائیں گے۔" رابرٹ نے کہا۔

"مگر آج تو پارٹی ہے نا۔ تم کیوں باہر جانا چاہتے تھے ؟" اس کی امی نے پیار اور خوف کے ملے جلے جذبات سے کہا۔

"یونہی امی ۔۔۔ اگر ڈیڈی کا فون آئے تو مجھے بتا دیجئے گا۔" رابرٹ نے کہا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ مسز ٹوکینی اور زیادہ اداس ہو گئیں ۔۔۔!

"دیکھا تم نے۔" میں نے اس کے قریب آ کر کہا۔

"ہاں ڈارلنگ۔" مسز ٹوکینی نے میری طرف اداسی سے دیکھ کر کہا۔

"بہتر ہوتا کہ تم اسے بتا دیتیں۔" میں نے کہا۔

"اگر مجھے پتا ہوتا کہ رابرٹ اس کا انتظار کر رہا ہے تو میں ضرور بتا دیتی۔ مگر جوزف نے غلطی کی کہ آج باہر جانے کے لیے کہا۔" وہ صوفے پر بیٹھ گئی ۔۔۔!

"اب بتا دو۔" میں نے کہا۔

"نہیں ۔۔۔ نہیں ڈارلنگ۔ میں چاہتی ہوں رابرٹ اس وقت یہاں موجود رہے جب میں ایڈی سے شادی کا اعلان کروں ۔۔۔" مسز ٹوکینی نے کہا۔

"شاید وہ اسی چیز سے بھاگنا چاہتا تھا۔"

"نہیں وہ ایڈی کو پسند کرتا ہے اور پھر اسے حقیقتِ حال کا سامنا کرنا ہی چاہئے۔ یوں چلے جانے سے کچھ فرق تو پڑ نہیں سکتا۔" مسز ٹوکینی نے شمپین کا بڑا سا گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

"میں ذرا مہمانوں کو دیکھ لوں۔" وہ اٹھی اور مہمانوں میں جا کر مصروف ہو گئی۔ اور میں اس بچے کے احساسات کا جائزہ لینے لگا۔ مجھ میں یہ ہمت نہ تھی کہ میں اس سے کچھ پوچھتا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ مسز ٹوکینی کی اس خوشی کو اداسی میں بدل ڈالوں وہ پہلے ہی اداس سی ہو گئی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ رابرٹ کو کس قدر چاہتی ہے۔

ہر لمحہ مہمان آ رہے تھے۔ کچھ دیر میں ایڈی بھی آ گیا۔ مسز ٹوکینی نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور ایڈی نے جھک کر اس کے لبوں پر ہلکا سا بوسہ دیا۔ میں بدستور صوفے پر بیٹھا رہا۔ میرا دل نہ جانے کیوں دھڑک رہا تھا۔ مجھے خواہ مخواہ ایڈی سے نفرت سی محسوس ہونے لگی تھی۔ حالانکہ وہ بہت دلچسپ آدمی تھا۔ کچھ دیر بعد مسز ٹوکینی ایڈی کو لے کر میرے پاس آ گئی۔

"بھئی تم کیوں الگ تھلگ بیٹھے تھے ؟" ایڈی نے میرے قریب بیٹھ کر کہا۔ اور مسکرا دیا۔

"یونہی۔" مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

"رابرٹ کہاں ہے ؟" ایڈی نے پوچھا۔

"اپنے کمرے میں۔" مسز ٹوکینی نے کہا۔ اور ایڈی اٹھنے لگا۔

"ایڈی پیارے۔ میرے خیال میں تم ابھی رابرٹ سے نہ ملو۔" مسز ٹوکینی نے اسے بٹھاتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟" ایڈی نے حیرانی سے پوچھا۔

"وہ ــــ وہ شاید اچھے موڈ میں نہ ہو۔" مسز ٹوکینی نے بات نبھانے کی کوشش کی۔

"واہ۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ میں ابھی اس کا موڈ ٹھیک کر لیتا ہوں۔ وہ میرا بڑا پیارا دوست ہے۔" ایڈی نے ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی مگر مسز ٹوکینی نے اس کا ہاتھ نہ چھوڑا۔

"نہیں ایڈی ــــ میں اسے وقت پر خود ہی بلا لوں گی۔"

"جیسے تمہاری مرضی ــ" ایڈی بیٹھ گیا۔ میں نے ایڈی کی طرف بڑے غور سے دیکھا۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ یہ شخص جو اوپر سے انتہائی مہذب ہے اندرونی طور پر نہ صرف چالاک ہے بلکہ مجرم ضمیر بھی رکھتا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ مسز ٹوکینی کو اس چھپے ہوئے شیطانی ضمیر سے آگاہ کر دوں مگر میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ مسز ٹوکینی میری بات کو مداخلت بیجا سمجھ بیٹھے۔ کچھ دیر بعد ایڈی شیمپین لینے کے لئے گیا۔ اور میں نے موقع غنیمت جانا۔

"مسز ٹوکینی۔ کیا تمہیں ایڈی کی مالی حالت کا علم ہے؟" میں نے پوچھا۔

"روم میں اچھا خاصا اس کا کاروبار ہے۔" مسز ٹوکینی نے کہا۔

"کیا تم نے اس کے کاروبار کی تحقیق کی تھی۔" میں نے کہا۔

"نہیں ــ اس کی ضرورت بھی کیا تھی۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ تمہاری دولت کی وجہ سے تمہیں حاصل کرنا تو نہیں چاہتا۔" میں نے آخری وار کیا۔

"تم تو نہ جانے کیسی باتیں کرتے ہو۔ ایڈی کو میری دولت سے کیا سروکار" مسز ٹوکینی کچھ خفا سی ہو گئیں۔

"میں معذرت چاہتا ہوں۔" میں نے ندامت سے کہا۔

"نہیں تم دل میلا نہ کرو۔ مجھے معلوم ہے تم ہر بات میرے بھلے کے لیے سوچتے ہو۔ تمہارے جیسا پرخلوص دوست آج کل نہیں ملتا۔" مسز ٹوکینی کو فوراً اپنے ترش لہجے کا احساس ہو گیا۔

"میں ذرا رابرٹ کو دیکھوں۔" مسز ٹوکینی اٹھ کر رابرٹ کے کمرے میں گئیں۔ اور فوراً ہی واپس بھاگ آئیں۔

"ڈارلنگ رابرٹ اپنے کمرے میں نہیں ہے۔" مسز ٹوکینی نے خوفزدہ ہو کر مجھ سے کہا۔ اور میں فوراً رابرٹ کے کمرے کی طرف بھاگا۔ اس کے ساتھ والا کمرہ دیکھا مگر رابرٹ کہیں پر موجود نہ تھا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ شاید جوزف کے پاس گیا ہو۔" میں نے کہا۔

"مگر وہ ایسا نہیں ہے وہ ہرگز اس قسم کی حرکت نہیں کر سکتا۔" مسز ٹوکینی نے پریشان ہو کر کہا۔

"آپ مجھے جوزف کا نمبر بتائیں۔ میں پتا کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ اور مسز ٹوکینی نے مجھے نمبر بتایا۔ میں نے ٹیلیفون کیا اور ایک بھاری آواز نے جواب دیا۔

"مسٹر جوزف۔" میں نے فون میں پوچھا۔

"جی ہاں میں بول رہا ہوں۔"

"میں ایک مشرقی آدمی ہوں۔ آپ کی بیگم کا دوست اور آپ کا بھی۔" میں نے کہا۔

"میں نے آپ کے متعلق سنا ہے۔ بیگم! نہ اب میری بیگم تو نہیں ہے۔" جوزف نے کہا۔

"جوزف میں آپ سے ایک سیدھا سا سوال کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ سچ جواب دیں گے؟" میں نے کہا۔

"مجھے غلط بیانی سے نفرت ہے۔"

"کیا آپ انز سے محبت کرتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"اب اس سوال کے جواب کا فائدہ۔" جوزف نے کہا۔

"میں اپنے سوال کا جواب چاہتا ہوں۔ فائدہ یا نقصان آپ چھوڑ دیجئے۔"

"اور اگر میں کہوں کہ ہاں۔"

"تو کیا آپ انز سے دوبارہ شادی کرنے پر رضامند ہو جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"آپ مجھ سے مذاق کر رہے ہیں۔ آج انز اپنی نئی شادی کا اعلان کرنے والی ہے۔"

"فرض کیجئے کہ وہ ایڈی سے شادی نہ کرے تو۔"

"وہ ایڈی سے محبت کرتی ہے۔" جوزف نے کہا۔

"شاید آپ کو معلوم نہیں وہ آپ کی عزت کرتی ہے اور عزت محبت کی بنیاد ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ اب بھی آپ سے پیار کرتی ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔"؟

"انز کو رابرٹ سے بے انتہا پیار ہے۔ اسے ابھی ابھی محسوس ہوا ہے کہ رابرٹ اس کی نئی شادی کو ناپسند کرتا ہے۔ کیونکہ وہ چپ چپ کہیں چلا گیا ہے۔" میں نے وضاحت کی۔

"رابرٹ —— وہ کہاں ہے۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ انز اس بچّے کی زندگی تباہ کر دے گی۔ میں اسی لیے اسے آج باہر لے جانا چاہتا تھا۔" جوزف کی آواز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ پریشان ہے۔

"میرے خیال میں انز رابرٹ کی مرضی کے خلاف ہرگز شادی نہیں کرے گی۔" میں نے کہا۔

"آپ کو بہت خوش فہمی ہے۔" جوزف نے جواب دیا۔

"کیا آپ انز کو معاف کر دیں گے۔" میں نے کہا۔

"اگر آپ انز کو دوبارہ مجھ سے وابستہ کر سکتے ہیں تو میں اس احسان کا بدلہ نہیں دے سکوں گا۔ مجھے اس سے اب بھی پیار ہے۔" جوزف کی آواز بھرا گئی۔ اور میں نے ٹیلیفون رکھ دیا۔ جب میں واپس پہنچا تو انز ٹوکینی رو رہی تھی۔ اور ایڈی اس سے بحث کر رہا تھا۔

"اگر اس بچے نے دیوانی حرکت کی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم اپنی زندگی خراب کر لو۔" ایڈی مسز انز ٹوکینی کو سمجھا رہا تھا۔

"نہیں ایڈی۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ جس گھر میں ہم دونوں رہیں وہاں رابرٹ کڑھتا رہے۔"

"وہ نادان اور پاگل ہے۔" ایڈی نے غصّے سے کہا۔

"ایڈی وہ میرا بچہ ہے۔" مسز ٹوکینی بھی خفا ہو گئیں۔

"اس کا یہ مطلب ہے کہ تمھارے دل میں میری کوئی وقعت نہیں۔" ایڈی نے تیر پھینکا۔

"نہیں ایڈی میں تم سے پیار کرتی ہوں۔ مگر اپنے پیار کی خاطر اپنے بچے کو قربان نہیں کر سکتی۔" مسز ٹوکینی نے کہا اور رونے لگی۔

"تم بے وقوف ہو۔" ایڈی اپنا مہذب لبادہ اتار چکا تھا۔

"ایڈی تم میری توہین کر رہے ہو۔ میں اس قسم کے الفاظ برداشت نہیں کر سکتی" مسز ٹوکینی نے جواب دیا۔ اور ایڈی غصے سے اٹھ کر مہمانوں کے کمرے میں چلا گیا۔

"میں نہ کہتا تھا مسز ٹوکینی کہ رابرٹ یہ بات پسند نہ کرے گا" میں نے کہا۔

"مگر اس نے کبھی بھی مجھ سے اپنی نفرت کا اظہار نہیں کیا۔ سال بھر سے وہ اپنے باپ سے الگ ہے۔ پھر یہ یکایک اسے کیا ہو گیا" مسز ٹوکینی نے بے انتہا پریشانی سے کہا۔

"وہ بچہ ہے۔ وہ ان لمحات کو محسوس ہی نہ کر سکا تھا۔ مگر آج جب اسے یقین ہو گیا کہ ایڈی اس کا نیا باپ بننے والا ہے تو وہ اسے اس روپ میں برداشت نہ کر سکا۔ وہ تمہارا دل بھی دکھانا نہیں چاہتا تھا اس لیے چپ چاپ کہیں نکل گیا"

"اب کیا کروں" مسز ٹوکینی نے پوچھا۔

"تم پروگرام کے مطابق اپنی شادی کا اعلان کر ڈالو" میں نے ہوا میں تیر پھینکا۔

"نہیں نہیں۔ میں ہرگز نہیں کروں گی۔ اگر رابرٹ ایڈی کو پسند نہیں کرتا تو میں اس سے شادی نہیں کر سکتی۔ میں اتنی ظالم نہیں ہوں ــــ میں ماں ہوں ــــ" مسز ٹوکینی یک دم کھڑی ہو گئیں۔ اور مجھے معلوم ہو گیا کہ میرا تیر نشانے پر بیٹھا ہے۔ وہ سیدھی مہمانوں کے کمرے میں گئیں۔ میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔

"خواتین و حضرات! میں کچھ کہنا چاہتی ہوں" مسز ٹوکینی نے کہا۔ اور سب مہمان خاموش ہو گئے "میں ایڈی سے شادی نہیں کر رہی" اس نے کہا۔ اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ سب مہمان حیران اور ششدر ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ میں بھی چپکے سے اس کے پیچھے چلا آیا۔ وہ اپنے پلنگ پر سر رکھکر بے تحاشہ رو رہی تھی۔ اور میں خاموش کھڑا مادرانہ محبت کا عروج دیکھ رہا تھا۔ اور خوش بھی تھا کہ میری تمام اسکیم کامیاب ہو گئی۔ کیونکہ خود میں نے ہی رابرٹ کو عین موقعہ پر غائب ہو جانے کے لیے کہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد دریچے کے باہر کار آکر رکی۔ اور رابرٹ ایک ادھیڑ عمر آدمی کے ساتھ اندر آیا۔

"یہ میرے ڈیڈی ہیں انکل" رابرٹ نے کہا اور جوزف نے جوش سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ انز ٹوکینی نے تکیوں سے سر اٹھایا۔

"جوزف ــــ" وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

"میں تمہیں اب بھی چاہتا ہوں انز" جوزف نے آگے بڑھ کر کہا۔ اور رانز اس کے گلے سے لگ کر بے تحاشہ رونے لگی۔ میں رابرٹ کو ساتھ لے کر باہر آ گیا۔ مہمان جا چکے ہیں۔

"تھینکیو انکل" رابرٹ نے میری طرف اتنی پیار بھری نظروں سے دیکھا کہ میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

ناشر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شمس زبیری

سرورق ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اختر ہلال زبیری

کتابت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کاشانۂ کتابت حیدرآباد

طباعت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انٹرنیشنل پریس۔ کراچی

اشاعت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جنوری ۱۹۶۴ء

مقام اشاعت ۔ ۔ ۔ ۔ کاشانۂ اردو ۲/۱۔ اکبر روڈ۔ صدر۔ کراچی

نعیم آروی
الشجاع۔ کراچی

لال گلوبند

گرمیوں کی شام تھی۔

سورج کا تمتایا ہوا لال بھبھوکا چہرہ رتن تلیا میں ڈوب کر بجھ چکا تھا۔ اور ٹھاکر دوارے کے نیچے شیو کنڈ کے گہرے سبز پانی پر اندھیرا پھیل گیا تھا۔ دولت پور کی ٹھنڈی تاریک گلیاں، کچی سڑکیں اور دور دور تک سنسان پڑے کھلیانوں میں زندگی کی چہل پہل جاگنے لگی اور دن بھر کی تھکن، اداسی جانے کدھر چپکے چپکے رخصت ہوگئی۔ قصبے کے گلی کوچوں میں بچوں کی چیخ پکار، ہر وقت کے چلتے ہوئے رہٹ کی گھرر..... گھوں..... گھرر..... گھوں..... اور کھلیانوں میں بیٹھے ہوئے کسانوں کے بیچ گھومتی ہوئی چلم کے دمادم کش زندگی کے بے پناہ حسن اور سادگی کو قصبے میں کھینچ لائے۔

دھیرے دھیرے شام کے سارے ہنگامے جاگ اٹھے۔ پر کمٹ کے چہرے پر ابھی تک کسی ویران دوپہر کی اجاڑ سی اداسی پھیلی ہوئی تھی۔ اور وہ سوچ سوچ کر بے حال ہوا جا رہا تھا، کہ ساون کے میلے میں کیسے ریشم کا لال گلوبند گلے میں ڈالے جھما جھم کرتا وشنو کے اکھاڑے میں تال ٹھونک کر بھیرو کے سامنے جا کودے گا۔ اور پل بھر میں بھیرو کو چت کر کے کشتی مار لے گا۔ پر اب تو اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے بغیر گلوبند کے وہ لڑ ہی نہیں سکتا۔ جیسے اس کی ساری قوت اس ریشمی گلوبند میں بند ہی تھی۔ ایک شام جب وہ مندر سے لوٹ رہا تھا تو لاجونتی نے سندر کاکا کی دکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کمٹ ریشم کا وہ لال گلوبند پرلے والے شیشے کے بکس میں کیسا چمچما رہا ہے۔ ساون کے میلے کے دن جب تم اسے گلے میں ڈالے بھیرو بھیا کے مقابلے میں اترو گے تو کتنے سندر دکھو گے ۔۔ آہا ۔۔ مزا آجائے گا۔" لاجونتی اس کے پاس ہی کھڑی تھی۔ اس کے بھرے بھرے سلونے جسم سے کچے ناریل کی سوندھی سوندھی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ کمٹ کے سارے جسم کا خون سمٹ کر چہرے پر آگیا تھا۔ اس نے بڑی گمبھیر آواز میں کہا۔ "لاجو' میرے پاس اتنا پیسہ نہیں کہ اسے ترنت خرید لوں۔ پر تم کہتی ہو تو خریدنے کی کوشش کروں گا۔" مگر پورا مہینہ سوچتے سوچتے بن برسے بادل کی طرح اوپر ہی اوپر گزر گیا۔ اور ریشم کا لال گلوبند شیشے والے بکس کے اندر ہی بند چمچاتا رہا۔ "کل ساون کا میلہ ہے۔ اور لال گلوبند....."

وہ بڑی اداسی سے پیپل کے نیچے شیو کی مورتی کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بڑبڑایا۔

"بھگوان ریشم کا لال گلوبند اڑتا ہوا میرے گلے میں آجائے۔"

وہ بڑی دیر تک کاہلی کے ساتھ کھیتوں پر گھومتا رہا۔ شنکر کے اکھاڑے پر ایک صبح وہ بیٹھک نکال رہا تھا کہ بھیرو اپنے بازوؤں کی

پھلیاں پھڑکاتے ہوئے بولا ــــ "پنڈت جی، تم تو مندر میں کیرتن کرو۔ رامائن کی چوپائیاں پڑھو۔ پہلوانی تمھارے بس کی بات نہیں۔ یہ تو ہم راجپوتوں کی شان دیتی ہے۔" اس پر اکھاڑے میں ایک زور کا ٹھٹھا پھٹ پڑا۔ اور مکٹ کا چہرہ غصّے سے سرخ ہو گیا۔

بھیرو اُس کے بچپن کا سنگی تھا۔ اور لاجونتی کا بھائی، تینوں ساتھ ہی ساتھ پاٹ شالہ میں پڑھے اور ساتھ ساتھ جوان ہوئے تھے۔ بھیرو قصبے کے سب سے بڑے راجپوت کا لڑکا تھا۔ جس کے دوارے پر ہر وقت کساتوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ آموں کے کئی باغ تھے۔ بہت ساری زمینیں تھیں۔ عزت تھی شان تھی۔ اور ساتھ ساتھ راجپوتی گرد فر۔ اور مکٹ ایک برہمن تھا۔ جس کا باپ مر چکا تھا۔ ماں پوجا پاٹ اور دان دکشنا سے گھر کا خرچ چلاتی۔ مکٹ اور لاجونتی کے بیچ بچپن کی چھوٹی چھوٹی معصوم شرارتیں اب جوانی کی ہلکی ہلکی سرگوشیوں میں بدل چکی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کو بے انتہا چاہتے تھے۔ اور دونوں نے پورنماشی کی رات مندر میں بھگوان کی مورتی کے سامنے ایک ہی ساتھ مرنے جینے کا عہد کیا تھا ــــ یہ سب کچھ بھیرو کی نظروں سے چھپا نہیں تھا۔ وہ راجپوت تھا۔ اور باپ کی ہو بہو تصویر۔ اُسے مکٹ سے بے انتہا جلن تھی۔ بچپن ہی سے وہ مکٹ کے اُلجھے ہوئے بال خشک اور پھٹی ہوئی قمیص پر پھبتیاں کس کس کر اپنے دل کی بھڑاس نکالتا آیا تھا۔ اور اب وہ دونوں جوان تھے۔ مضبوط کلے ٹھلے اور کسے کسے جسم والے خوبصورت جوان۔ مگر جسمانی طور سے بھیرو مکٹ سے کہیں زیادہ صحت مند اور مضبوط ہاتھ پیروں کا تھا۔ بیچ اکھاڑے میں بھیرو کی للکار نے مکٹ کو لہو بھر کے لیے ٹھٹکا دیا۔ وہ لاجونتی کے خیال سے چپ رہا۔ مگر بھیرو کی مسلسل للکار اور اکھاڑے کے گرد بیٹھے ہوئے چیلوں اور چمچوں کے ٹھٹھے نے مکٹ کو گرما دیا۔ اور اُس نے بیچ اکھاڑے میں پہنچ کر بھیرو سے ہاتھ ملا لیا۔ ہوا کی طرح یہ خبر سارے گاؤں میں پھیل گئی کہ ساون کے میلے پر بھیرو اور مکٹ کی کشتی ہوگی۔ جو سنتا مکٹ کے لیے ہمدردی محسوس کرتا۔ کیونکہ ہر شخص جانتا تھا کہ یہ کشتی جوڑ کی نہیں ہے۔ مکٹ اُس کے مقابلے میں تنکا نظر آتا تھا۔ مکٹ کشتی کے لیے پریشان نہ تھا۔ وہ تو ریشم کے لال گلوبند کے لیے جی ہارے بیٹھا تھا جو لاجونتی کی پسند تھی۔ یہ سوچ سوچ کر اُسے بے حد کوفت ہو رہی تھی ــ کہ اکھاڑے میں جب لاجونتی اُسے بغیر گلوبند کے دیکھے گی تو کتنی اُداس ہوگی۔ وہ چپ چاپ پگڈنڈی پر چلتا ہوا گردھر کے آموں والے باغ میں پہنچ گیا۔ جہاں وہ اکثر لاجونتی سے چھپ چھپ کر ملا کرتا تھا۔ اچانک دھپ سے ایک آم کی گٹھلی اُس کے سر پر لگی ــ اُس نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ پیڑ کی ایک شاخ پر لاجونتی بیٹھی ہوئی آم چوس رہی تھی۔

"کدھر چلے مکٹ جی ؟" وہ نیچے اترتی ہوئی بولی ــ "میں مندر میں پرشاد لینے گئی تھی۔ تمھیں وہاں نہ پا کر ادھر چلی آئی۔" شام ختم ہو رہی تھی۔ شہر سے آنے والی مٹیالی سڑک پر ایک بیل گاڑی سستی سے چرخ ـــ چوں ـ چرخ ـــ چوں کرتی ہوئی قصبے والی گرد آلود سڑک پر مڑ رہی تھی۔ کھیتوں پر رات کا اندھیرا اترنے لگا تھا۔ اور پچھوا کی تیز ہوائیں آم کی شاخوں سے لپٹی سنسنا رہی تھی۔ گردھر کے آموں والے باغ کے پیچھے سے کسی رکھوالی کے گیت کی لمبی تان سنسان راستوں سے اُڑ کر آتی ہوئی بڑی اُداس معلوم ہو رہی تھی۔

سانجھ بھئے گھر آنا پنچھی۔

بھور بھئے اُڑ جانا۔

گردھر کے باغ میں وہ دیر تک بات چیت کرتے رہے۔ مکٹ نے لاجونتی سے کہا۔ "لاجو، بھیرو تمھارا بھائی ہے۔ اور ہم دونوں کل ساون کے میلے پر کشتی لڑنے جا رہے ہیں۔ پر مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں یہ کشتی ہار جاؤں گا۔"

لاجونتی اُس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ "ایسا بول مت بولو مکٹ۔ میں بڑی الجھن میں ہوں۔ میں جانتی ہوں بھیرو بھیا کو ہمارا میل پسند نہیں۔ اسی لیے وہ ہر بات میں تمھیں نیچا دکھانے پر تلے رہتے ہیں۔ پر کیا کروں۔ بھیرو میرا بھیا ہے۔ اور تم ..... تم ....."

تم دونوں میں سے جو بھی ہارے گا مجھے دُکھ ہوگا۔ اور تم دونوں میں سے جو بھی جیتے گا مجھے خوشی ہوگی۔ ایک طرف تم ہو، دوسری طرف میرا بھائی ہے۔ بھگوان جانے کل کیا ہوگا ؟"

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے گردھر کے باغ سے باہر نکل آئے۔ لاجونتی مکٹ کو بڑی میٹھی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی "مکٹ کل ریشم کا لال گلوبند گلے میں باندھ کر اکھاڑے میں اُترنا"۔ پھر وہ ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی اپنے گھر کی طرف بھاگ گئی۔

مکٹ کچھ دیر کھڑا چپ چاپ خالی خالی نظروں سے بھاگتی ہوئی لاجونتی کو دیکھتا رہا۔ پھر اپنے گھر کی طرف مڑ گیا۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اُس کے جسم میں بھرا ہوا غبار ذرا سی دیر میں باہر نکل گیا۔ اور وہ ہلکا پھلکا کمتر ہو گیا ہے۔ اپنے کچے گھر میں گھسا تو ماں نے بڑی ممتا سے اُسے دیکھا۔ "کہاں رہ گئے تھے مکٹ۔ برہمن کو سندھیا سے گھر پر ہونا چاہیے"۔ وہ بڑے پیار بھرے لہجے میں بولی۔ پھر تھالی میں گرم گرم بھات سجا کر مکٹ کے آگے رکھتے ہوئے بولی "مکٹ کل ساون کا میلہ ہے۔ اور تم ریشم کے لال گلوبند کے لیے کہہ رہے تھے۔؟"

اُس نے امید بھری نظروں سے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "پھر؟"

ماں اپنے پلّو سے پیسہ کھولتے ہوئے بولی۔ "یہ لو ساڑھے تین روپے میں نے جوڑ کر جمع کیے تھے۔ تم نے پہلی بار اپنے من کی بات کہی ہے تو جاؤ ریشم کا لال گلوبند خرید لو"۔ مکٹ کو محسوس ہوا جیسے اُس کا مردہ جسم دوبارہ انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا ہے۔ اُس کے ارد گرد۔ دور۔ دور تک ریشم کے لال لال گلوبند قطار بنائے چکراتے پھر رہے ہیں۔ اور وہ بھیرو کو اپنے سر سے اونچا اُٹھائے اکھاڑے کے گرد چکر لگا رہا ہے گاؤں والے زور زور سے چیخ رہے ہیں۔ تالیاں بجا رہے ہیں۔ پھر اُس نے تالیوں کی گونج میں بھیرو کو زور سے زمین پر دے مارا۔

بھات کے سوچا لمبے لمبے نوالے حلق سے نیچے اتارے اور پیسے لے کر وہ قصبے کی دوکان کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ بھاگم بھاگ دوکان پر پہنچا۔ تلے اوپر ہوتی ہوئی سانسوں کو درست کرتے ہوئے بولا۔

"سندر کاکا لاؤ وہ ریشم کا لال گلوبند اور یہ لو پیسے گن لو۔ پورے ساڑھے تین روپے ہیں۔ ساڑھے تین روپے"۔ اور ذرا ٹھہر کر جو اُس نے خالی شوکیس پر نظر ڈالی تو گھبرا کر چیخا۔ "کاکا۔ گلوبند کہاں گیا۔؟"

کاکا شیو سے ترشول کی طرح کھڑے ہوتے اپنی مونچھ کے لمبے لمبے سخت بالوں کو دو انگلیوں سے بٹتے ہوئے انتہائی بے رحم لہجے میں بولا۔ "مکٹ وہ تو کل بڑے اچھے دام پر بک گیا۔ میرے پاس وہی ایک آخری ریشم کا لال گلوبند تھا"۔ یہ کہہ کر وہ دوکان کے اندر چلا گیا۔ اور مکٹ وہیں دھم سے بیٹھ گیا۔ جیسے کسی شکاری نے اونچان پر اُڑتے ہوئے پرندے کو زخمی کر کے مار گرایا ہو۔

دوسرے دن ساون کے میلے میں ساون کا بڑا گہرا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ قصبے سے لے کر گردھر کے آموں والے باغ سے پرے شیو کے مٹھ تک بڑی گہما گہمی تھی۔ بڑے باغ کے اکھاڑے پر سارا گاؤں سمٹ آیا تھا۔ گاؤں کا مکھیا، مہاجن، چودھری، قصبہ کا مجسٹریٹ، سیاہ اور چکنے جسم والے نٹ، اہیروں کا نحیف گروہ، لمبی لمبی مونچھوں اور بڑی بڑی پگڑیوں والے راجپوت سبھی جمع تھے۔ مکٹ نڈھال قدموں سے چلتا مکھیا کے پاس آ بیٹھا۔ بھیرو ابھی تک غائب تھا۔ مکٹ کو دیکھتے ہی گنگا دھر چلم کا لمبا دم کھینچتے ہوئے چیخا۔ "ہے پرم دیر۔ دیکھ پربھو کی لیلا۔ برہمن مندر چھوڑ کر اکھاڑے میں آ کودا"۔ پھر وہ مکٹ کی طرف مڑتے ہوئے بولا "مکٹ ماں سے اشیرواد لے کر چلا تھا، یا یونہی چلا آیا۔ جے ہو کالی میا کی"۔

اکھاڑے کے ارد گرد بھیڑ سکے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر بھیرو غائب تھا۔ لوگ چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ بھیرو کے پٹھوں کے طنزیہ جملوں میں زہر گھلا ہوا تھا۔ البتہ گاؤں کے سمجھدار لوگ مکٹ کی بے وقوفی پر افسوس کر رہے تھے کہ اس نے بھیرو جیسے کڑیل جوان کو للکارا۔ ڈنکے پر چوٹ پڑی۔ چھوٹی چھوٹی جوڑیں شروع ہوئیں۔ تماشائی چیخ رہے تھے۔ تالیاں بج رہی تھیں۔ مگر مکٹ اپنے خیالوں میں گم سم بیٹھا تھا۔ نہ جانے کیوں اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اُس کے جسم کا سارا خون خشک ہو گیا ہے۔ وہ ایک بے جان انسان ہے۔ ہر جوڑ کے خاتمے پر بے پناہ شور ہوتا۔ جیتنے والے پہلوان کو لوگ کندھوں پر اُٹھا لیتے۔ اور شکست خوردہ پہلوان خاموشی سے سر جھکائے مجمع میں سے نکل جاتا۔ جب کسی کی جیت کسی کی ہار کا اعلان ہوتا تو اُسے محسوس ہوتا کہ جیسے وہ ہی ہارنے والا پہلوان ہے۔ لگا ہے گا ہے وہ دوسری طرف سامنے بیٹھی ہوئی

لاجونتی کو دیکھتا۔ جس کی نگاہیں اُس کے خالی گلے پر لگی ہوئی تھیں ان متلاشی نگاہوں کو دیکھ کر جانے کیوں اُسے اپنے گلے پر سوئیاں چبھتی محسوس ہوتیں۔ اور اُس کے ہاتھ غیر ارادی طور پر تیزی سے گلے پر پہنچ جاتے۔

"مکٹ، ریشم کا لال گلوبند جب تم گلے میں ڈالے بھیرو سجیلے کے مقابلے میں اُترو گے تو کتنے سندر دکھو گے۔ آہا۔ مزا آجائے گا"

میلے کے شور میں لاجونتی کی آواز اُس کے دل کو کاٹتی ہوئی نیچے بہت نیچے اتر گئی۔ کسی انجانے خوف سے اُس کا دل اندر ہی اندر بیٹھا جارہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی کئی جوڑوں کے بعد آخر اُن کی باری بھی آ گئی۔ وہ لنگوٹ کس کر ڈھیلے ڈھالے انداز سے چلتا ہوا اکھاڑے میں آیا۔ سارے لوگ چپ اُس کے اکہرے سے خوبصورت جسم کو دیکھ رہے تھے۔ ڈنکا ایک مسلسل آواز سے بجے جا رہا تھا۔ ڈرر ڈھپ۔ ڈرر ڈھپ یکایک بھیرو جے کالی کا نعرہ لگاتا ہوا اکھاڑے میں کودا۔ سہ پہر کی ہلکی ہلکی دھوپ میں ریشم کا لال گلوبند بھیرو کے گلے میں لہرا رہا تھا۔ لال گلوبند دیکھتے ہی مکٹ کو محسوس ہوا جیسے اُس کی آنکھوں میں سورج کی سیدھی کرنیں اُتر آئیں۔ اس کا سارا جسم جھنجھنا کر جاگ اٹھا۔ اُسکے تنے ہوئے بازوؤں کی مچھلیاں پھڑ پھڑائیں۔ اور اُس نے جھک کر اکھاڑے کی مٹی اُٹھا کر بدن پر ملی۔ لوگ سانس روکے چپ بیٹھے تھے۔ ڈنکا بجے جارہا تھا۔ ڑ۔ ڈھمپ.... ڑرر ڈھمپ.... ڑرر۔ ڑرر۔ کشتی شروع ہوتے ہی وہ کسی بھوکے شیر کی طرح بھیرو کی طرف لپکا۔ اُس وقت اُس کی آنکھیں انگارے برسا رہی تھیں۔ چہرہ پر شعلوں کی سی سرخی تھی۔ اچانک اُس نے بھیرو کو اپنے دونوں ہاتھوں پر اُٹھا لیا۔ اور اکھاڑے کے تین چکر دے کر اُسے دھم سے زمین پر دے مارا۔۔۔ اور سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ لوگ حیران تھے کہ آخر یہ کیا ہوا۔ انھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ پھر گاؤں کے ایک جیالے نوجوان نے مکٹ کو کاندھے پر اُٹھا لیا۔

سارا میدان جیت کے نعروں سے گونج رہا تھا۔

جے ہو کالی میا کی۔۔۔!

جے ہو مہاویر کی۔۔۔!

مکٹ نے نظریں اُٹھا کر لاجونتی کو دیکھا جو اپنے گھر والوں کے ساتھ بیٹھی اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ اُس وقت لاجونتی کے چہرے پر گلاب کھلے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اور آنکھوں میں آنسو۔۔۔!!

شاہد احمد دہلوی
ساقی۔ کراچی

آبِ حیات

بوڑھا ڈاکٹر حیدر اپنی وضع کا آپ ہی آدمی تھا۔ ایک دفعہ اُس نے اپنے چار معزز دوستوں کو اپنی تجربہ گاہ میں مدعو کیا۔ ان میں تین سفید ڈاڑھیوں والے بزرگ تھے منظور صاحب، کرنل قیصر اور قیوم صاحب۔ اور ایک مُرجھائی ہوئی بیوہ تھیں جن کا نام بیگم وزیر علی تھا۔ یہ سب کے سب بوڑھے اور غمزدہ لوگ تھے، جو زندگی بھر بدنصیب رہے اور انکی سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ انھیں اپنی اپنی قبروں میں دفن ہوئے مدتیں کیوں نہ ہو گئیں۔

جوانی میں منظور صاحب بڑے مالدار تاجر تھے۔ مگر اُنھوں نے جی کھول کر سٹا لگایا۔ اور اب روٹیوں کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ کرنل قیصر نے عمر کا بہترین حصہ پُرعصیاں عیش و عشرت میں ضایع کیا تھا۔ جس کی وجہ سے صحت برباد ہو گئی تھی۔ اور طرح طرح کی تکلیفوں نے اُنھیں گھیر لیا تھا۔ جسمانی اور روحانی عوارض لاحق ہو گئے تھے۔ قیوم صاحب برباد شدہ سیاست داں تھے۔ ان کی شہرت خواب تھی۔ اور اس وقت تک وہ بدنام رہے جب تک کہ موجودہ نسل نہ آگئی۔ نئی پود کی لاعلمی کی وجہ سے زمانے نے اُن کی بدنامی کو ماضی میں دفنا دیا تھا۔ اور اب وہ گمنامی میں پڑ گئے تھے۔ رہیں بیوہ بیگم وزیر علی تو روایت یہ ہے کہ جوانی میں بڑی حسین تھیں۔

مگر مدتِ دراز تک اُنھوں نے تنہائی اور گمنامی میں زندگی بسر کی۔ کیونکہ ان کے متعلق بڑی بڑی روایتیں مشہور ہو گئی تھیں۔ اور آبادی کے سارے شرفا ان سے بدظن ہو گئے تھے۔

یہ واقعہ بھی بتانے کے لائق ہے کہ منظور صاحب، کرنل قیصر اور قیوم صاحب، تینوں بڈھے کسی وقت میں بیوہ بیگم وزیر علی کے ابتدائی عاشقوں میں شامل تھے۔ اور ایک زمانے میں تو یہ نوبت آگئی تھی کہ بیگم کی خاطر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے۔ آگے قصہ سنانے سے پہلے میں یہ بھی اشارۃً کہنا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر حیدر اور اُس کے چاروں مہمان کبھی کبھی اپنے خلافِ مزاج بھی باتیں کرنے لگتے تھے۔ اور یہ کوئی غیر معمولی تبدیلی نہیں تھی۔ کیونکہ جب پریشانیاں رونما ہوتی ہیں یا غمناک تصورات کا ہجوم ہوتا ہے تو سبھی بڈھے خلافِ عادت باتیں کرنے لگتے ہیں۔

ڈاکٹر حیدر نے سب کو بیٹھنے کا اشارہ کر کے کہا۔ "پیارے قدیم دوستو! میں اپنے معمل میں دل بہلانے کے لیے جو تجربے کرتا رہتا ہوں اُن میں سے ایک میں آپ کی امداد چاہتا ہوں۔"

اگر ساری روایتیں سچی ہیں تو ڈاکٹر حیدر کا معمل ایک بڑا عجیب مقام ہونا چاہیے۔ یہ ایک کمرہ تھا پرانی وضع کا۔ جس میں مکڑی کے جالے لٹکے ہوئے تھے۔ اور جا بجا خاک کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ دیواروں سے لگی کئی الماریاں کھڑی تھیں جن کے نچلے خانوں میں موٹی موٹی کتابیں

اور مسودوں کے ڈھیر رکھے ہوئے تھے۔ اوپر کے خانے چھوٹے چھوٹے کتابچوں سے بھرے ہوئے تھے۔ بیچ کے کتاب دان پر ہپوقراطیس کا بھی بت رکھا ہوا تھا۔ بعض ذمہ دار لوگوں کا کہنا ہے کہ جب کوئی پیچیدہ مرض آجاتا تو ڈاکٹر حیدر اُس بت سے مشورہ لیا کرتا تھا۔ کمرے کے سب سے تاریک کونے میں ایک لمبی اور تنگ سی الماری تھی جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس میں ہڈیوں کا ایک ڈھانچا کھڑا ہوا ہے۔ کتاب دانوں کے بیچ میں ایک گرد آلود آئینہ لٹکا ہوا تھا جس کا فریم بدرنگ گلٹ کا تھا۔ اس آئینے کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور تھیں جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ جتنے مریض ڈاکٹر کے زیر علاج مر چکے تھے سب کی روحیں اس آئینے میں رہتی تھیں۔ اور جب ڈاکٹر اس آئینے کی طرف دیکھتا تو وہ سب روحیں اس کی طرف گھورنے لگتی تھیں۔ اُس کے سامنے کے رُخ کمرہ ایک تصویر سے سجایا گیا تھا۔ یہ ایک جوان عورت کی قدآدم تصویر تھی جس کا لباس ریشم ساٹن اور زربفت کا تھا۔ مگر اپنی چمک دمک کھو چکا تھا۔ اُس کا چہرہ بھی لباس کی طرح مدھم پڑ گیا تھا۔ کوئی نصف صدی پہلے ڈاکٹر حیدر اس دوشیزہ سے شادی کرنی چاہتا تھا۔ مگر اُسے کوئی معمولی سی شکایت ہوئی اور اُس نے اپنے چہیتے ڈاکٹر کی بنائی کوئی دوا پی لی۔ اور عین شبِ عروسی کو مر گئی۔ اس کمرے کی سب سے عجیب چیز کا تو ابھی تک ذکر ہی نہیں ہوا۔ یہ ایک بہت بڑی موٹی سی کتاب تھی۔ جس کی جلد کالی تھی اور اس میں چاندی کے مضبوط چھپکے لگے ہوئے تھے۔ اُس کی پشت پر کچھ لکھا ہوا نہیں تھا۔ اس لیے کوئی نہیں بتا سکتا کہ اس کتاب کا کیا نام ہے۔ مگر مشہور تھا کہ یہ کوئی جادو کی کتاب ہے۔ اور ایک دفعہ ملازمہ نے محض اُس کی خاک جھاڑنے کے خیال سے اُسے اُٹھا لیا۔ تو لمبی تنگ سی الماری میں ہڈیوں کا ڈھانچ کھڑکھڑانے لگا تھا۔ دوشیزہ کی قدآدم تصویر فرش پر ایک قدم آگے بڑھ آئی تھی۔ بہت سے بھیانک چہرے آئینے میں سے جھانکنے لگے تھے اور ہپوقراطیس کے مجسمہ نے پیشانی پر بل ڈال کر کہا تھا۔ "خبردار!"

یہ تھا ڈاکٹر حیدر کا محل۔ اب گرمیوں کے دن تھے۔ تیسرے پہر کا وقت۔ ایک چھوٹی سی گول میز اودے رنگ کی کمرے کے بیچ میں رکھی ہوئی تھی۔ اُس پر ترشے ہوئے بلور کی ایک صراحی رکھی ہوئی تھی۔ جس کی خوشنمائی۔ اور کاریگری دیکھنے کے لائق تھی۔ دیوار پر دو بھاری پردے لٹکے ہوئے تھے۔ جن کا رنگ اُڑ چکا تھا۔ اور ان دونوں کے بیچ میں ایک جھری تھی جس میں سے دھوپ کی سرخی آکر صراحی پر پڑ رہی تھی۔ علاوہ اس کا ہلکا سا عکس ان پانچ سن رسیدہ مردوں کے خاکستری چہروں پر پڑ رہا تھا۔ جو میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ میز پر چار بلوری جام بھی رکھے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر حیدر نے دوبارہ کہا "میرے پیارے قدیم دوستو! ایک نہایت عجیب تجربہ کرتے میں کیا میں آپ کی امداد حاصل کر سکتا ہوں؟"

واقعہ یہ تھا کہ ڈاکٹر حیدر ایک عجیب سنکی بڈھا مشہور تھا۔ اور اُس کی سنک کے سیکڑوں قصّے مشہور ہو گئے تھے۔ مجھے ندامت ہے کہ ان میں سے بعض قصّوں کا میں خود ہی موجد تھا۔ اس لیے اگر اس قصّے میں کوئی ایسی بات آجائے جس پر پڑھنے والا یقین نہ کر سکے تو اُسے میری من گھڑت سمجھ لے۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

جب ڈاکٹر کے چاروں دوستوں نے تجربے کی تجویز سنی تو اُنھوں نے قیاس کر لیا کہ یہ تجربہ بھی بس ایسا ہی حیرت انگیز ہوگا جیسا کہ چوہیا کو ہوا سے محروم کر کے مار ڈالنا یا مکڑی کے جالے کا معائنہ خوردبین سے کرنا یا کوئی اور ایسی ہی حماقت ہوگی جس سے ڈاکٹر اپنے ملنے والوں کو مسلسل کوفت پہنچایا کرتا تھا۔ لیکن جواب کا انتظار کیے بغیر ڈاکٹر حیدر ڈگمگاتا ہوا۔ کمرے کے اُس سرے تک گیا۔ اور بڑی اور موٹی سی کتاب اُٹھا لایا۔ جس کی جلد کالے چمڑے کی تھی۔ اور جس کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ جادو کی کوئی کتاب ہے۔ چاندی کے چھپکے کھول کر اُس نے کتاب کھولی۔ اور کالے حرفوں کے صفحے کے اندر سے ایک پھول نکالا جو کبھی گلاب کا پھول ہوگا۔ مگر اب اُس کے سبز پتے اور سرخ پتیاں سب مٹیالے رنگ کی ہو گئی تھیں۔ اور یہ پرانا پھول ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈاکٹر کے ہاتھوں میں ریزہ ریزہ ہوا چاہتا ہے۔

ڈاکٹر نے ایک آہ سرد بھر کر کہا "یہ گلاب، یہ خشک اور کھڑ تک پھول پانچ اوپر پچاس سال پہلے کھلا تھا۔ سلمیٰ وآرث نے جس کی تصویر سامنے لگی ہوئی ہے، مجھے یہ پھول دیا تھا۔ اور میرا ارادہ تھا کہ شادی کے وقت اِسے اپنے سینے پر لگاؤں۔ پچپن سال سے یہ اس جلد میں محفوظ ہے

بھلا کیا تم اسے ممکن سمجھتے ہو کہ یہ نصف صدی پرانا پھول دوبارہ اپنی بہار دکھا سکتا ہے ؟"

بیوہ بیگم وزیر علی نے حقارت سے سر جھٹک کر کہا ۔ "کیا فضول باتیں کرتے ہو ۔ یہی کیوں نہیں پوچھتے کسی بڑھیا کا جھرّیوں کا بھرا چہرہ کیا دوبارہ اپنے حسن کی بہار دکھا سکتا ہے ۔ ؟"

ڈاکٹر حیدر نے کہا ۔ "دیکھو !"

اُس نے صراحی کا منہ کھولا ۔ اور اُس میں گلاب کو ڈال دیا ۔ صراحی میں جو پانی تھا ، اُس پر پھول تیرتا رہا ۔ اور شروع میں معلوم ہوا کہ پھول نمی تو جذب نہیں کر رہا ۔ مگر تھوڑی دیر بعد ایک نمایاں تبدیلی دکھائی دینے لگی ۔ چُڑمُڑی خشک پتیاں متحرک ہوئیں اور اُن میں سرخی بڑھنے لگی ۔ جیسے پھول موت جیسی نیند سے جاگ رہا ہو ۔ ڈنڈی اور پتے سبز ہو گئے ۔ اور نصف صدی کا گلاب کا پھول اتنا ہی تروتازہ دکھائی دے رہا تھا ۔ جتنا سلمیٰ وارث کے پہلی دفعہ اپنے عاشق کو دینے کے وقت پھول پورا کھلا بھی نہیں تھا ۔ کیونکہ اُس کی چند نازک سرخ پتیاں نم آلود سینے سے لگائی ہوئی لپٹی تھیں ۔ اور اُن کے اندر شبنم کے دو تین قطرے چمک رہے تھے ۔

لیکن ڈاکٹر کے دوستوں نے جادوگروں کے تماشوں میں اس سے بھی بڑے اعجاز دیکھے تھے ۔ اس لیے بے پروائی سے بولے "بے شک یہ ایک اچھا خاصہ فریب ہے ۔ مگر یہ تو بتاؤ یہ ہوا کس طرح ؟"

ڈاکٹر حیدر نے کہا ۔ "کیا کبھی تم نے آبِ حیات کا ذکر نہیں سنا جس کی تلاش میں ہسپانوی سیاح پونسی دی لیاں دو تین صدی پہلے گیا تھا ؟"

بیوہ بیگم وزیر علی بولیں ۔ "مگر پونسی دی لیان کو وہ ملا بھی ؟"

ڈاکٹر نے کہا ۔ "نہیں ۔ کیونکہ اُس نے اُسے صحیح مقام پر تلاش نہیں کیا ۔ اگر میری معلومات صحیح ہے تو مشہور و معروف "شباب چشمہ" جھیل مکاسو کے قریب فلوریڈی خاکنائے کے جنوبی حصہ میں ہے ۔ یہ درخت صدیوں پرانے ہیں ۔ مگر اس پانی کی تاثیر سے بالکل تروتازہ رہتے ہیں ۔ میرے ایک شناسا نے جو میری تحقیق و تدقیق سے واقف ہے مجھے بھیجا ہے ، جو تمھیں اس گلدان میں نظر آ رہا ہے ۔"

کرنل قیم کو ڈاکٹر کی بات کا یقین ذرا نہ آیا ۔ اور بولا ۔ "ہوں ، اور انسان کے جسم پر بھلا اس پانی کا کیا اثر ہو گا ۔ ؟"

ڈاکٹر حیدر نے کہا ۔ "میرے پیارے کرنل ۔ اس کا اندازہ تم خود کر لو گے ۔ اور میرے معزز دوستو ۔ آپ سب کے لیے یہ حیرت ناک پانی حاضر ہے ۔ تاکہ آپ اپنی جوانی کی بہار دوبارہ حاصل کر لیں ۔ رہا میں تو بوڑھے ہونے میں مجھے اتنی تکلیفیں اُٹھانی پڑی ہیں کہ دوبارہ جوان ہونے کی مجھے کوئی جلدی نہیں ہے ۔ اس لیے آپ کی اجازت سے میں اس تجربے کے اثرات کا صرف مشاہدہ کرتا رہوں گا ۔"

ڈاکٹر باتیں کرتا جا رہا تھا اور چاروں بلّوری گلاسوں میں آبِ حیات بھرتا جا رہا تھا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس میں کوئی گیس گھلی ہوئی ہے ۔ کیونکہ ننھے ننھے بلبلے گلاسوں کی تہوں میں سے ایک ساں اوپر کی طرف اُٹھ رہے تھے ۔ اور سطح پر پہنچ کر نقرئی غبار کی شکل میں پھوٹ رہے تھے ۔ اس پانی میں خوشگوار خوشبو آ رہی تھی ۔ اس لیے بڈھے دوستوں کو یقین ہو چلا کہ اس میں فرحت و قوت بخش اور مفید خواص ہوں گے ۔ ہر چند کہ انھیں اس کا یقین نہیں آتا تھا کہ اس پانی میں اعادۂ شباب کی تاثیر ہے ۔ پھر بھی اُن کا جی چاہتا تھا کہ اُسے فوراً غٹ غٹ کر کے پی جائیں ۔ مگر ڈاکٹر حیدر نے اُن سے درخواست کی کہ ذرا توقف فرمائیں ۔

ڈاکٹر نے کہا ۔ "میرے معزز پرانے دوستو ! ..... اس سے پہلے کہ آپ اس پانی کو پئیں ، یہ بہتر ہو گا کہ پوری عمر کے تجربے کی روشنی میں آپ چند عام اصول اپنی رہنمائی کے لیے بنا لیں کہ دوبارہ جوانی کے خطرات کا مقابلہ آپ کس طرح کریں گے ۔ ذرا سوچیے تو سہی کہ ان خصوصی مراعات کے حاصل ہوتے ہوئے یہ کتنی شرم کی بات ہو گی کہ آپ اس زمانے کے نوجوانوں کے لیے نیکی اور دانشمندی کا نمونہ اپنی ذات سے پیش نہ کر سکیں ۔"

ڈاکٹر کے چاروں معزز دوستوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف ایک ایک خفیف اور کپکپاتی ہوئی ہنسی سنائی دی، بڑی حقارت آمیز، یہ اچھی طرح جانتے ہوئے کہ لغزش اور پچھتاوے کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ڈاکٹر کا قیاس کس قدر مضحکہ خیز تھا کہ وہ سب کے سب کہیں دوبارہ بھٹک نہ جائیں۔

ڈاکٹر نے ادب سے جھک کر کہا۔ "اچھا تو پیجیے، مجھے خوشی ہے کہ میں نے اپنے تجربے کے لیے ایسے عمدہ حضرات کا انتخاب کیا۔"

لرزتے ہوئے ہاتھوں سے انھوں نے گلاس اُٹھائے اور اپنے لبوں سے لگا لیے۔

اس پانی کے اگر وہی خواص تھے جو ڈاکٹر حیدر نے بتائے تھے تو ان چار انسانوں سے زیادہ اس پانی کا اور کوئی مستحق نہیں ہو سکتا تھا۔ انھیں دیکھ کر یہ لگتا تھا کہ جیسے انھوں نے کبھی جوانی کے لطف اُٹھائے ہی نہیں۔ بلکہ قدرت کے تمسخر اور جبرت کے نمونے ہیں۔ جو ہمیشہ سے ضعیف نحیف اور بے جان سے ذلیل جانور ہیں جو ڈاکٹر کی میز کے گرد جھکے بیٹھے ہیں۔ اور اُن کی رُوحوں اور جسموں میں اس خیال سے بھی جان نہیں پڑتی کہ اب وہ دوبارہ جوان ہونے کو ہیں۔ انھوں نے پانی پی لیا اور گلاس میز پر رکھ دیے۔

ان سب میں فوراً ایک نمایاں تبدیلی نظر آنے لگی۔ یہ تبدیلی ایسی تھی جیسے عمدہ شراب کا ایک جام پیا گیا ہو۔ اور چہرے پر ایک دم خوشی کی گلابی دھوپ پھیل جائے۔ ان کے رخسار پہلے گلابی رنگ کے تھے مگر اب اُن پر صحت کی سرخی دوڑ گئی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ اور سوچتے رہے کہ کسی جادو کی قوت نے ان گہرے نقوش کو مٹانا شروع کر دیا جنھیں بابائے وقت نے طویل مدت میں اُن کی پیشانی پر کندہ کیا تھا۔ بیوہ بیگم نے اپنی دھج بدلنی شروع کی۔ کیونکہ انھوں نے اپنے آپ کو جوان محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔

سب نے بڑے اشتیاق سے کہا۔ "یہ حیرت ناک پانی ہیں اور دو، ہم میں توانائی تو آگئی ہے لیکن اب بھی ہم بہت بوڑھے ہیں۔ لاؤ جلدی سے اور پلاؤ۔"

ڈاکٹر حیدر انھیں فلسفیانہ طمانیت سے دیکھ رہا تھا۔ کہ اس تجربے کے کیا کیا نتائج مرتب ہو رہے ہیں۔ بولا۔ "صبر، صبر۔ تم مدت سے بوڑھے ہو رہے ہو۔ اتنا تو صبر کرو کہ تم آدھ گھنٹے میں جوان ہو جاؤ۔ پانی تو تمھارے لیے حاضر ہی ہے۔"

اُس نے اُن کے گلاس آبِ حیات سے دوبارہ بھر دیے۔ اس پر بھی پانی اتنا باقی تھا کہ بستی بھر کے بوڑھوں کی عمر گھٹا کر اُن کے پوتوں نواسوں کے برابر کر دے ننھے ننھے بلبلے ابھی لبِ جام تک آ کر پھٹنے بھی نہیں پائے تھے کہ ڈاکٹر کے چاروں مہمانوں نے لپک کر گلاس اُٹھا لیے اور ایک ہی گھونٹ میں پانی حلق سے اتار لیا۔ کیا یہ کوئی فریب تھا۔ حلق میں پانی اُتر ہی رہا تھا کہ سارے جسم کی ہیئت بدلتی محسوس ہو رہی تھی۔ اُن کی آنکھوں کا گندلا پن دُور ہو گیا۔ اور اُن میں چمک پیدا ہو گئی۔ سفید بالوں میں سیاہی دوڑنے لگی۔ میز کے گرد اب تین ادھیڑ عمر کے مرد بیٹھے ہوئے تھے اور ایک عورت جس کی جوانی مائل بہ زوال ہوا چاہتی تھی۔

کرنل قیصر کی نظریں بیوہ بیگم کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جس پر سے عمر کے سایے اس طرح غائب ہوتے جا رہے تھے جیسے قرمزی طلوعِ آفتاب کے رُخ سے رات کے اندھیرے۔ بولا۔ "بیگم، تم تو غضب کی لگ رہی ہو۔"

حسین بیوہ جانتی تھی کہ کرنل کی تعریف اکثر مبالغہ آمیز ہوتی ہے۔ وہ لپک کر آئینے کی طرف بھاگی۔ دل میں اب بھی ڈرتی رہی۔ کہ وہی بڑھیا چمرخ آئینے میں دکھائی دے گی۔

اس عرصے میں تینوں حضرات کے ردِ عمل سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ جیسے اس آبِ حیات میں نشے کی کیفیت ہے۔ یا پھر یہ اُن کی روح کی کوئی ترنگ ہو گی جس نے برسوں کا بوجھ ایک دم سے ہٹ جانے کی وجہ سے ایک ہلکا سا دورانِ سر پیدا کر دیا تھا۔ قیوم صاحب کا دماغ سیاسی موضوعات پر چلنے لگا۔ مگر یہ سمجھنا مشکل تھا کہ ماضی کا ذکر کر رہے ہیں یا حال یا مستقبل کا۔ کیونکہ گذشتہ

پچاس سال سے ایک ہی طرح کے خیالات کا اظہار ایک ہی انداز سے کیا جا رہا تھا۔ اب پوری آواز میں حب الوطنی، قومی افراد اور عوام کے حقوق کے فقرے اُن کے منہ سے نکل رہے تھے۔ ابھی وہ کسی خطرناک موضوع پر بولنا شروع کرتے۔ ابھی چالاکی سے مشتبہ انداز میں کچھ چپکے سے کہتے۔ اور اتنی احتیاط کے ساتھ کہ خود اُن کا ضمیر بھی اس راز کو نہیں پا سکتا تھا۔ پھر نپے تلے لہجہ اور بڑی مؤدب آواز میں کچھ ایسی باتیں کرنے لگتے گویا کسی بادشاہ سے دانشمندانہ مخاطبت کر رہے ہوں۔

اس دوران میں کرنل قیصر شراب کی توصیف میں اشعار گنگنا رہے تھے۔ اور اپنے گلاس سے تال دیے جا رہے تھے۔ اور ان کی نظریں بیوہ بیگم وزیر علی کے حسین خد و خال کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں۔ میز کے دوسری طرف منظور صاحب روپے پیسے کا حساب کرنے میں مصروف تھے اور ایک عجیب و غریب منصوبہ بنا رہے تھے کہ مشرق وسطی کو برف اس طرح پہنچائی جائے کہ قطب شمالی اور قطب جنوبی کے تودہ ہائے برف میں وھیل مچھلیاں جوت دی جائیں۔

رہیں بیگم وزیر علی تو وہ آئینہ کے سامنے کھڑی اپنے ہی عکس سے خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آ رہی تھیں۔ اور خوشامدانہ انداز اختیار کر رہی تھیں۔ یہ جتانے کے لیے کہ دنیا بھر میں اس سے زیادہ اُنھیں اور کوئی عزیز نہیں۔ اُنھوں نے اپنا چہرہ آئینے میں بالکل گھسا دیا تھا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ کوئی دیر پا شکن یا گوشۂ چشم کی پرانی جھریاں تو اب باقی نہیں رہیں۔ انھوں نے غور سے دیکھا کہ سر پر جو بڑھاپے کی برف پڑی ہوئی تھی وہ یکسر گھل گئی یا نہیں تاکہ اطمینان سے اُس پر سے دوپٹہ سرکا دیا جائے۔ آخر پھرتی سے پلٹ کر وہ ناچ کے سے قدم اُٹھاتی میز کے قریب آ گئیں۔

بیگم نے اونچی آواز سے کہا۔

"پیارے بوڑھے ڈاکٹر، از راہِ عنایت مجھے ایک اور گلاس دو۔"

خوش اخلاق ڈاکٹر نے کہا۔ "ضرور پیاری خاتون ضرور۔ دیکھیے میں نے گلاس پھر بھر دیے ہیں۔"

اور واقعی چاروں گلاس لبالب بھرے میز پر رکھے ہوئے تھے۔ اور اس حیرت ناک پانی کی سطح پر ننھے ننھے بلبلے اُٹھ کر اس طرح پھوٹ رہے تھے جیسے ہیرے کے کنول بکھر رہے ہوں۔ سورج اتنا نیچا ہو چکا تھا کہ شام کا جھٹ پٹا کمرے میں خاصا بڑھ گیا تھا مگر ایک ملائم اور چاندنی جیسی روشنی پانی کی بلوری صراحی میں سے نکل رہی تھی۔ اور چاروں مہمانوں اور ڈاکٹر کے بزرگ چہرے کو منور کر رہی تھی۔ بلوط کی ایک بڑی سی منقش کرسی پر بوڑھا ڈاکٹر اس وجاہت سے بیٹھا نظر آ رہا تھا جیسے وہ خود بابائے وقت ہے جس کی قوت سے سوائے اس خوش نصیب ٹکڑی کے اور کوئی برسر پیکار نہیں ہو سکا تھا۔ آبِ حیات کا تیسرا گلاس پیتے ہوئے وہ ڈاکٹر کی پُر اسرار شکل سے خاصے مرعوب ہو رہے تھے۔

مگر دوسرے ہی لمحے نئی زندگی کی سرخوشی اُن کی رگوں میں دوڑنے لگی۔ بھرپور جوانی کی مسرت اب اُنھیں حاصل ہو چکی تھی۔ بڑھاپا جس کے جلو میں تفکرات، غم اور امراض تھے، اب اُن کے لیے ایک بھیانک خواب بن چکا تھا جس سے وہ چونک اُٹھنے پر خوش ہو رہے تھے۔ روح کی وہ کھوئی ہوئی چمک جس کے بغیر دنیا کے بدلنے والے مناظر اُترے ہوئے رنگوں کی تصویریں دکھائی دیتے تھے۔ اپنی پوری تر و تازگی کے ساتھ ان کی آنکھوں کے آگے اپنا جادو بکھیر رہی تھیں۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ کسی نئی تخلیق کی ہوئی کائنات میں وہ کوئی نئی مخلوق ہیں۔

وفورِ مسرت سے وہ چیخنے لگے۔ "ہم جوان ہیں۔ ہم جوان ہیں۔" بڑھاپے کی طرح جوانی نے ادھیڑ عمر کی خصوصیات کو مٹا دیا تھا اور اور وہ سب گھل مل گئے تھے۔ یہ ایک ٹکڑی تھی خوش دل نوجوانوں کی جنھیں کھلنڈرے پن کی فراوانی نے دیوانہ بنا دیا تھا۔ اُن کی خوش دلی

تھا ایک خاص نتیجہ یہ نکلا کہ جس کہولت و ضعف کا وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے خود شکار تھے اُس کا مذاق اُڑانے کو اُن کا جی چاہتا تھا۔ اپنی پُرانی وضع کے لباس دیکھ کر وہ قہقہے لگانے لگے۔ ان میں سے ایک اُٹھ کر گٹھیا کے مریض داداؤں کی طرح جھول جھول کر چلنے لگا۔ دوسرے نے اپنی ناک کی پھننگ پر عینک رکھ کر جادو کی کتاب کو اس طرح دیکھنا شروع کر دیا گویا اُس کا مطالعہ کر رہا ہو۔
تیسرے نے آرام کرسی پر بیٹھ کر معزز ڈاکٹر حیدر کی سنجیدگی اور متانت کی نقل اُتارنی شروع کر دی۔ پھر سب نے خوشی سے چیخنا، چلانا شروع کیا۔ اور سب کے سب سارے کمرے میں اُچھلتے کودتے پھرے۔
بیوہ بیگم وزیر علی۔ اگر ایسی تر و تازہ دوشیزہ کو بھی بیوہ کہا جا سکے، اپنے گلابی چہرے پر خوشی، شوخی و شرارت لیے ڈاکٹر کی کرسی کی طرف بڑھی، بولی۔ "ڈاکٹر، پیاری بوڑھی روح اُٹھو اور میرے ساتھ ناچو۔" اور پھر چاروں نوجوان اس تصور پر خوب زور زور سے ہنسے کہ بوڑھے ڈاکٹر کا ناچ کس قدر مضحکہ خیز ہو گا۔
ڈاکٹر نے سکون سے جواب دیا۔ "براہِ مہربانی مجھے معاف کرو۔ میں بوڑھا ہوں اور مجھے گٹھیا ہے۔ مدت ہوئی میرے ناچنے کے دن ختم ہو گئے۔ مگر ان خوش دل نوجوانوں میں سے کوئی صاحب تم جیسی حسینہ کے ساتھ بڑی خوشی سے رقص کریں گے۔"
کرنل قیصر نے کہا۔ "آؤ میرے ساتھ ناچو کلیجہ!"
قیوم صاحب بولے۔ "نہیں نہیں۔ میں ان کے ساتھ ناچوں گا۔"
منظور صاحب چیخ کر بولے۔ "انھوں نے مجھ سے پچاس سال پہلے وعدہ کیا تھا کہ میرے ساتھ ناچیں گی۔"
ان سب نے بیگم کو گھیر لیا۔ ایک نے اُن کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ دوسرے نے اُس کی کمر میں ہاتھ ڈال لیا۔ تیسرے نے اُس کے چمکتے ہوئے سیاہ بالوں میں اپنی انگلیاں دوڑانی شروع کر دیں۔
جھینپتے ہوئے ہانپتے ہوئے، کسمساتے ہوئے، جھٹکتے ہوئے، ہنستے ہوئے باری باری سے وہ اپنے گرم سانس کا پنکھا سب کے چہروں پر جھلتی رہی۔ اپنے آپ کو اُن کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کرتی رہی۔ مگر خود کو ان تینوں کی آغوش کے سپرد کیے رہی۔ نوجوانوں کی رقابت کی اس سے زیادہ پرجوش تصویر ملنی مشکل تھی کہ تینوں اس انعام کو جھپٹ لینا چاہتے تھے۔ لیکن کسی نامعلوم فریب کے باعث کچھ تو کمرے کی تاریکی کی وجہ سے اور کچھ پُرانی وضع کے لباسوں کے سبب سے جو وہ اب بھی پہنے ہوئے تھے، ٹنگے ہوئے آئینے میں تین بوڑھی مرجھائی ہوئی شکلیں دکھائی دے رہی تھیں۔ جن کا چمڑا منڈھی ہوئی ہڈیاں جھرّیوں بھری دادی اماں کے لیے کشمکش کر رہی تھیں۔ مگر وہ جوان تھے۔ ان کے سینوں میں جذبات مچل رہے تھے۔ نوجوان بیوہ کے غمزوں نے ان میں آگ لگا دی، وہ نہ تو انھیں قبول کر رہی تھی اور نہ رد۔ تینوں رقیبوں نے طیش سے ایک دوسرے کو گھورنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے حسین تحفے کو جکڑے بھی رہے۔ اور ایک دوسرے کا گلا گھونٹنے کی کوشش بھی کرتے رہے۔ اسی کشمکش میں میز اُلٹ گئی۔ اور بلوری صراحی گر کر کھیل کھیل ہو گئی۔ بیش بہا آبِ حیات فرش پر چمکدار لکیر بن کر بہہ گیا ایک تیتری رخصتِ بہار کے ساتھ بوڑھی ہو کر گر پڑی تھی۔ اُس کے پروں کو پانی بھگوتے ہوئے گزر گیا۔ تیتری کمرے میں اُڑتی پھری۔ اور بوڑھے ڈاکٹر حیدر کے سر پہ جا بیٹھی۔
ڈاکٹر نے پکار کر کہا۔ "سنئے سنئے حضرات، سنئے بیگم وزیر علی، میں اس بدنظمی کے خلاف احتجاج کرتا ہوں۔"
وہ ساکت ہو کر کانپنے لگے۔ کیونکہ ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ کہ بوڑھا وقت انھیں جوانی کی بہار میں واپس بلا رہا ہے۔ برسوں کی سرد تاریک وادی میں لوٹ آنے کو کہہ رہا ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر حیدر کی طرف دیکھا جو منقش آرام کرسی میں وہ نصف صدی پُرانا گلاب ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا، جسے صراحی کے ریزوں میں سے اُس نے اُٹھایا تھا۔ اُس کے ہاتھ کے اشارے پر چاروں اودھم مچاتے والے اپنی اپنی جگہ

بیٹھ گئے۔ اس وجہ سے بھی کہ ان کی شدید کشمکش نے انھیں تھکا دیا تھا۔ حالانکہ وہ جوان تھے۔

غروب ہونے والے سورج کا عکس جو بادلوں میں پڑ رہا تھا، اُس کی روشنی میں گلاب کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر حیدر نے کہا "بیچارہ سوکھا پھول ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پھر مُرجھا رہا ہے۔"

اور واقعی وہ مرجھا رہا تھا سب کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ مرجھا چلا تھا۔ اور تھوڑی دیر میں خشک ہو کر اسی طرح کھڑ تک ہو گیا۔ جیسا کہ پانی میں ڈالنے سے پہلے تھا۔ چند قطرے جو اُس کی پتیوں میں لگے رہ گئے تھے ڈاکٹر نے جھاڑ دیے۔

ڈاکٹر نے اپنے مرجھائے ہوئے لبوں سے گلاب کو لگاتے ہوئے کہا: "مجھے اس حالت میں بھی یہ اتنا ہی پیارا ہے جتنا کہ اپنی شبنمی تازگی میں تھا۔" ڈاکٹر یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ تیزی پھڑ پھڑاتی ہوئی اُس کے سر سے نیچے گر پڑی۔

اُس کے مہمان پھر لرز گئے۔ ایک عجیب طرح کی خنکی۔ وہ بتا نہیں سکے کہ جسم کی تھی یا روح کی، ان سب کے اوپر رفتہ رفتہ طاری ہو رہی تھی وہ ایک دوسرے کو آنکھیں پھاڑے دیکھتے رہے۔ اور اُنھیں لگ رہا تھا کہ ہر گزرتا لمحہ حسن اُن سے چھین لے جاتا ہے۔ اور ایک گہری لکیر وہاں کھینچ جاتا ہے۔ جہاں پہلے کچھ بھی نہیں تھا۔ کیا یہ کوئی فریب نظر تھا؟ کیا ساری عمر کی تبدیلیاں اتنے ذرا سے وقفے میں سمٹ آئی تھیں۔ لو، کیا وہ اب پھر چار بوڑھے آدمی اپنے بوڑھے دوست، ڈاکٹر حیدر کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔

اُنھوں نے غمناک آواز میں پوچھا۔ "کیا ہم اتنی جلدی پھر بڈھے ہو گئے؟"

وہ سچ مچ بوڑھے ہو گئے تھے۔ آب حیات کی خاصیت شراب کی خاصیت سے بھی کم دیرپا تھی۔ وہ بحران جو اُس نے پیدا کیا تھا ختم ہو چکا تھا۔ جی ہاں! وہ پھر بڈھے ہو گئے تھے۔ بیوہ نے اپنے سوکھے ہوئے ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا اور آرزو کرنے لگی کہ کاش یہ چہرہ کفن ہی میں چھپ جائے۔ کیونکہ اُس کا حسن معدوم ہو چکا تھا۔

ڈاکٹر حیدر نے کہا۔ "ہاں دوستو، تم سب بوڑھے ہو گئے۔ اور لو دیکھو آب حیات سارا فرش پر بہہ گیا۔ خیر! مجھے اس کا افسوس نہیں۔ اگر اس کا چشمہ میری ڈیوڑھی میں بھی بہتا ہوتا تب بھی میں اپنے لب اس میں تر کرنے کے لیے نہ جھکتا ۔۔۔ ہرگز نہیں، چاہے اس کا بحران لمحوں کے بدلے برسوں ہی کا کیوں نہ ہوتا۔ یہ ہے وہ سبق جو تم نے پڑھایا ہے مجھے۔"

لیکن ڈاکٹر کے دوستوں نے ایسا کوئی سبق خود نہیں سکھایا تھا۔ انھوں نے مصمم ارادہ کیا کہ ہم فلوریڈا کا مقدس سفر کریں گے۔ اور صبح، دوپہر اور شام کو آب حیات پیا کریں گے۔ (ترجمہ)

احمد سوید
ضیاء الحسن موسوی

شاقی۔کراچی

کاہر عملیات

شیخ عبدالغفار نے غضبناک نظروں سے آسمان کو دیکھا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس پر اپنی ناراضی کے تیر برسانے والے ہوں۔ ان کو چبوترے پر بیٹھے بیٹھے اتنا عرصہ گزر چکا تھا مگر ابھی تک ہاتھ خالی تھا۔ یوں تو یہ پورا ہفتہ ہی تقریباً خالی رہا مگر آج تو مطلع بالکل ہی صاف تھا۔ اگر آپ کو یقین نہ آیا ہو تو یہ لیجیے حساب کا نقشہ دیکھ لیجیے!

ہفتہ کو فقط تین روپے ملے۔ ایک نوجوان کو دردِ شقیقہ کی شکایت تھی۔ اور اس نے واللہ باللہ قسم کھا کر کہا تھا کہ بس اس کے پاس یہی رقم ہے شیخ نے بھی اس کو تعویذ دیتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اپنا پورا علم صرف کر کے یہ تعویذ تیار کیا ہے۔

اتوار کی آمدنی ایک دُم کٹا ہوا چوزا نما مرغا تھا جس پر شیخ جی کی ہمسائی اُمِ ابراہیم کا مرغا حملہ آور ہوتا تو وہ تو گردن پھلا کے چیلنج قبول کرنے کے بجائے ٹیک پانے لگتا۔ یہ چوزا قریب کے گاؤں کا ایک نوجوان لایا تھا۔ جو ایک لڑکی کی محبت میں گرفتار تھا اور وہ لڑکی اس کو لفٹ بھی نہ دیتی تھی۔ لیکن اس نوجوان کی محبت دیوانگی کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ اس نے شیخ جی کی عظیم روحانی طاقتوں کا سہارا لینا چاہا جن کی بدولت محبوب آپ کے قدموں پر سر رکھ دیتا ہے۔ شیخ جی نے ایک تعویذ دیتے ہوئے کہا "کسی طرح ہو اس کو گھول کر اس لڑکی کو پلا دو' خدا نے چاہا تو وہ تمھارے لیے ماہیِ بے آب کی طرح تڑپے گی۔"

پیر کے دن کی آمدنی فقط ڈھائی سیر مسور کی دال۔ پہلے تو شیخ نے ارادہ کیا کہ وہ اسے قبول نہ کرے۔ آخر اس کے علم و فن کی عزت و وقعت بھی تو ہونی چاہیے، مگر غریبوں کا دل توڑنا عرشِ خدا کو ہلانا ہے۔ اُمِ طمان یعنی ایک ہمسائی کو لے کر آئی تھی جس کا شوہر اس ڈھلتی عمر میں ایک بیوہ عورت کے چکر میں پھنس گیا تھا۔ العیاذ باللہ بھلا شیخ اس کی مدد کرنے سے کیسے انکار کر سکتے تھے۔ آخر انھوں نے ایک "طلسم نفرت" تیار کیا اور اس مظلوم عورت کو ہدایت کی کہ وہ اس کو کسی ویران اور شکستہ قبر میں ڈال آئے۔ اللہ نے چاہا تو اس کا شوہر راہِ راست پر آجائے گا۔

چلتے چلتے شیخ نے ام طمان سے کہا کہ اس عورت سے کہو کسی وقت تھوڑا سا حلوہ لائے میں اس پر کچھ دم کر دوں تاکہ اس کا شوہر کبھی اس کے قبضے سے باہر نہ ہونے پائے۔ سن کر وہ عورت ایسی مست ہو کے روانہ ہوگئی جیسے وہ اٹھارہ سالہ دوشیزہ ہو اور اس اطمینان سے چل رہی تھی۔ گویا تمام طعنہ دینے والوں کو سنانے جا رہی ہو کہ دیکھا اس حالزادی کو کیسی شکست دی۔

منگل: اللہ محفوظ رکھے اس دن تو شیطان نے شیخ کو اپنے جال میں پھانسنا چاہا مگر اللہ کی مدد سے شیخ نے اس کو ناکام کر دیا۔ منھ اندھیرے ایک بدوی نوجوان عورت آئی اور بولی "پانچ سال شادی کو ہو گئے۔ اور میری گود خالی ہے۔"

اس کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی تھی۔ اور رگ رگ سے رعنائی پھوٹی پڑتی تھی۔ ایسی چنچل نار زندگی میں مشکل سے نظر آتی ہے۔ گلاب جیسے رخسار پر کالا کالا تل تو غضب ہی ڈھا رہا تھا۔ پھر وہ نسوانی خوشبو جس سے بڑے بڑے زاہدوں کا تقویٰ ٹوٹ جاتا ہے اس کی لپٹوں سے شیخ کی آنکھوں میں سرور سا آگیا۔ انھوں نے آگے بڑھ کے کہا: "تمھیں دعا کی نہیں، دَوا کی ضرورت ہے۔ آؤ کٹیا میں چلو۔" اور تھوڑی دیر کے بعد شیخ اپنا رخسار سہلا رہے تھے۔ اس امراوتی غزال نے آج پھول سے ہاتھوں سے وہ گستاخی کی تھی کہ اگر حنا آلود ریش مبارک کا پردہ نہ ہوتا تو نیلا نیلا گال دیکھ کر ساری بستی والے معلوم کیا کیا افواہیں اڑاتے۔۔

بدھ یعنی آج کا دن ـــــ تو بہ! فقط پاؤ بھر زیتون کا تیل؟ اُم شندیب نے قسم کھا کر کہا کہ شیخ بس گھر میں یہی تھا جو میں نذر کو لائی ہوں۔ اگر شندیب کے باپ کو اس کا بھی پتہ چل گیا تو اس کا ڈنڈا اُم شندیب کی پیٹھ پر پڑے گا۔ شیخ نے اس کی چھوٹی بچی پر رحم کھاتے ہوئے حال میں گرفتار ہونے سے پہلو تہی کرتے ہوئے چھوڑ دی۔ اور کہا کہ اس پر نظر بد کا اثر ہو گیا ہے۔ اس لئے یہ ایک تعویذ اور اس کے ساتھ ایک زرد کوڑی اس کے گلے میں ڈالی جائے۔ پھر شیخ نے اس کو اچھی طرح سمجھا کہ وہ فقط للّٰہ اور ام شندیب کی پرانی خدمتوں کے پیش نظر یہ توجہ فرما رہے ہیں۔ ورنہ پاؤ بھر روغن زیتون تو ان کے تعویذ کے ایک کونے کی بھی قیمت نہیں۔ ام عائشہ نے چند روز قبل دس روپے دیئے تھے اور کافی دیر تک ان کے پاؤں دبائے تھے۔ تب انھوں نے اس سے کہیں کم درجے نظر بد کا تعویذ اس کو دیا تھا نظر بد ایسی بری بلا ہے کہ ام عائشہ جیسی نوجوان عورت کے سینے میں درد رہنے لگا تھا۔ شیخ نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر کئی دن طلسم کا زور لگایا۔ تب درد دور ہوا تھا۔ اور پھر وہ ایک بکری کا بچہ بھی دے گئی تھی۔ لیکن ام شندیب چونکہ پرانی عقیدت مند ہے اس لئے نہ شیخ پاؤ بھر روغن زیتون واپس کر سکے نہ اچھے سے اچھے تعویذ کو اس سے عزیز رکھ سکے۔ ام شندیب نے شیخ کے قدموں پر عقیدت سے سر رکھ دیا۔ اور شیخ نے اس کا سر سینے پر رکھتے ہوئے کہا۔ "جیتی رہو، تمھارا یہ سر اللّٰہ کے سوا کسی کے سامنے نہیں جھکنا چاہئے۔ اس کی جگہ یہ فقیر کا سینہ ہے۔" ام شندیب رونے لگی تو شیخ نے کہا کہ "روتی کیوں ہو؟ جو کچھ ہوتا ہے اللّٰہ کے حکم سے ہوتا ہے ہم تو کٹھ پتلیاں ہیں۔ تم اس وقت اس منزل میں ہو جہاں سب کچھ تمھارا نہیں کسی اور کا ہے۔"

اور ام شندیب جب لڑکھڑاتے پاؤں سے گھر واپس ہونے لگی تو عقیدت کے نشے سے چور ہو چکی تھی۔ واقعی شیخ کی عنایات کے بدلے میں پاؤ بھر زیتون کا تیل کیا حقیقت رکھتا ہے۔

ام شندیب کو گئے ہوئے گھنٹوں ہو چکے تھے۔ شیخ چبوترے پر بیٹھے ہوئے اپنی کٹیا کو گھور رہے تھے جو جھاڑیوں سے گھری ہوئی تھی۔ سامنے ہی ان کا گدھا گرمی سے بے چین ہو کر زمین پر لوٹ کر رہا تھا۔ شیخ نے اس کو ایک سایہ دار درخت کے تنے سے باندھ دیا اور وہ ان دنوں کو یاد کرنے لگے جب ان کی روحانی حکومت کا دور دورہ تھا۔ جب بھی آس پاس کے علاقے میں کسی کو جنون محبت یا کوئی بیماری ہوتی وہ شیخ کے پاس لایا جاتا یا خود ہی آ جاتا۔ کوئی چوری ہوتی تو اس کی فریاد لے کے لوگ ان کے پاس آتے اور ان سے خواہش کرتے کہ چوروں کے تعاقب میں وہ جنوں کی فوج اور اس اراح کی پولیس لگا دیں اور اکثر شیخ کے تابع جن اور ارواح گردن پکڑ کر چور کو حاضر کرتے اور مال مسروقہ کے علاوہ اس کو شیخ کا نذرانہ بھی دینا پڑتا۔ شیخ کے چیلوں کی خدمت بھی کرنی پڑتی اور یہ وعدہ بھی کرتے کہ آئندہ اس علاقے کا رخ نہ کریں گے۔ اس طرح سارے انتظامی اور عدالتی مراحل شیخ کی روحانی سلطنت میں طے ہو جاتے۔ اور گھر والے اور چور دونوں شیخ کی کرامت کے قائل ہو کے واپس ہوتے۔

شیخ پانچ اشرفیاں لئے بغیر کبھی چبوترے پر آ کے بیٹھتے ہی نہ تھے۔ اس کے باوجود عقیدت مندوں کا ہجوم رہا کرتا۔ لوگ تعویذ لینے، فال رکھوانے اپنی پریشانیوں کا حل تلاش کرنے آتے رہتے۔ اور دور دور کے لوگ انتظار میں گھنٹوں گزار دیتے۔ جب شیخ جھاڑیوں سے جھانک کر کسی کو اشارہ کرتے تو وہ قریب جانے کی ہمت کرتا۔ وہ گئی ان کی کٹیا تو وہ سلیمانی فضا میں تھی۔ اوّل تو خاص خاص مردوں اور عورتوں کے علاوہ کوئی اس میں جا ہی کب سکتا۔ اور جو گیا وہ جب تک باہر نہ آ جائے کسی کو اندر جانا نہ آتا تھا۔ ایک مرتبہ کسی نے قریب سے دیکھنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ کٹیا خالی ہے اور سب میں مشہور ہو گیا کہ علوم سلیمانی کے اثر سے کسی کو کچھ نظر نہیں آتا۔ ایک سنجیدہ آدمی نے یہ کہا کہ ان کے نیچے تہ خانہ ہے مگر سب نے اس کو سخت ملامت کی اور اس کو توبہ کرتے بنی۔

لیکن پھر زندیقوں اور لامذہبوں کی بدولت روحانیت اور مذہب کے تقدس کی دنیا اجڑنے لگی۔ کافروں کے مدارس میں پڑھ کر نکلنے والے لوگوں نے

... بازی، وہم اور علوم کیسے کیسے کفریات کے اعتراضات کیے۔ خاص طور سے پیروں اور کافروں کے ملک میں تعلیم حاصل کر کے پلٹنے والے ایک ... سے جو سوٹ پہنتا تھا اور کنواری لڑکیوں کی طرح صفاچٹ چہرہ لیے پھرتا تھا۔ ان علاقوں کا دَورہ شروع کیا اور لوگوں کو بہکایا کہ وہ تعویذ، عاملوں کے فقط ٹوٹکوں اور دَواؤں سے مریضوں کو اچھا کر سکتا ہے۔ وہ بری اَرواح اور جن بھوت کے مضر اثرات کا صاف صاف منکر تھا وہ بندۂ ناں خدا کے جسم پر اس نظر نہ آنے والی مخلوق کے جو اثرات ہوتے ہیں۔ اپنی لامذہبیت سے کھلم کھلا ان کا انکار کرتا تھا۔ وہ یہ بکتا تھا کہ امراض کا سبب کچھ جراثیم ہوتے ہیں۔ جو انسانی آنکھ کو نظر آ سکتے ہیں۔ اور مناسب دَواؤں سے ان کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ شیخ کا جی چاہتا تھا کہ اس شیطان کی کھوپڑی توڑ دیں۔ مگر اس کو حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔ اور بہت سے لوگ اس کے بہکانے میں آ چلے تھے۔ لوگوں نے اپنی اولادوں کو کافروں کے اسکولوں میں پڑھوا کے گمراہ کر دیا تھا۔ اور دین دار لوگ یہی کہا کرتے تھے کہ آخری زمانے کی یہی علامات کتابوں میں لکھی ہیں اور یہ قربِ قیامت کے آثار ہیں۔

یہ باتیں یاد کرتے ہوئے شیخ عبدالغفار نے چبوترے سے یہ دیکھا کہ سورج ڈھل چکا ہے اور قیلولہ کا وقت آ چکا ہے۔ رزق کا دینے والا اللہ ہے۔ وہ خود بھیجے گا۔ یہ کہہ کے وہ اٹھنے ہی والے تھے کہ ہرموش دور کھڑا نظر آیا۔ انھوں نے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا تو وہ آگے بڑھا اور ادب سے بولا: "حضور دمردشی خاندان کی گزارش ہے کہ آپ جلد ان کی مدد کو پہنچیں، ان کا لڑکا سلمان بہت بیمار ہے۔" شیخ نے پہلے داڑھی پر ہاتھ پھیرا پھر اپنی ململی آستین سے پیشانی کا پسینہ پوچھا۔ اور بولے "یہ دوپہر گرمی کا وقت یہ دھوپ میں آل دمردشی کے لیے قربانی اور زحمت پر آمادہ ہوں مگر کیا وہ اس کا اندازہ کر سکیں گے کہ میں کیا تعب اٹھاؤں گا۔"

ابوحسن ہرموش سمجھ گیا کہ اس کو یہ سوال آل دمردشی تک پہنچانا ہے۔ اور ان کو سمجھانا ہے کہ شیخ کے اعزاز و اکرام کا پورا خیال رکھیں ——

وہ بولا۔

"جی ہاں حضور کیوں نہیں اور پھر میں جوان کو بتلاؤں گا۔ اور حضور مجھے بھی ایک ایسا تعویذ مرحمت کریں کہ جمیلہ ....." اور شیخ نے اس کو سمجھایا کہ جمیلہ کے ... وہ کسی اور کو تعویذ دے چکے ہیں۔ ان کو کیا معلوم تھا کہ ہرموش اس کی زلف کا اسیر ہے۔ اب یہی صورت تھی کہ جمیلہ ان کے پاس آئے وہ پہلے تعویذ کا اثر دور کریں اور پھر ہرموش کی محبت اس کے دل میں پیدا ہو جمیلہ جمعرات کو کبھی کبھی اپنی ماں کے ساتھ آتی ہے۔ اور اس کی ماں شیخ سے پوچھتی ہے کہ کس کا رشتہ منظور کرے۔ لیکن چونکہ خالی خولی عقیدت کی بات ہے اور رشید نے بھی تعویذ مفت حاصل کر لیا ہے اس لیے وہ ابھی اپنی اصلی رُوحانی قوتوں کو مفت ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ البتہ ہرموش کی بات اور ہے۔ وہ پرانا عقیدت مند اور پھر ہمیشہ شہد اور پنیر کے نذرانے لاتا ہے اب اگر وہ جمیلہ کو منگل کے دن علی الصبح بھیجے تو وہ ہرموش کی خاطر سلیمانی عود جلا کے عمل تسخیرِ حُب کر سکتے ہیں۔ اس لیے اس کو بے ہوش کرنا ہوگا، اور اس سارے عمل میں ایک دو گھنٹے لگیں گے۔ اس دَوران میں ہرموش کو اس زیتون کے درخت کے نیچے ایک دائرے میں بیٹھنا ہوگا۔ اور ایک عمل پڑھنا ہوگا اور جو بھی شیخ کے پاس آئے اس کو اشارے سے واپس جانے کے لیے کہنا ہوگا۔ تاکہ جیسے ہی رشید کو دیئے ہوئے تعویذ کا اثر جمیلہ کے دل سے نکلے ہرموش کا تصور دائرے کے عمل سے اس کے دل میں اتر جائے پھر جمیلہ کسی اور کا تصور بھی نہ کرے گی۔

ہرموش نے آگے بڑھ کے شیخ کے ہاتھ چومے اور ان کی عنایت سے آبدیدہ ہو گیا۔ جمیلہ بھی اسی کو چاہتی تھی مگر جب سے رشید بیچ میں آ گیا تھا وہ اس کے باغوں کے تصور سے مذبذب سی ہو گئی تھی اور اس کی ماں بھی اب فیصلہ کرنے میں ٹال مٹول سے کام لے رہی تھی۔ اس کو یقین تھا کہ فقط شیخ ہی اس کے کام آ سکتے ہیں۔

شیخ آل دمردشی کے گھر پہنچے سلمان بخار سے تپ رہا تھا اس کو دیکھنے کے بعد شیخ نے اس کی ماں کے کان میں کہا۔

"اے ام سلمان اس پر سایہ ہے اور اگر صبح سے پہلے اس جن نے اس کو نہ چھوڑا تو اس کی جان بچنا مشکل ہے۔" ام سلمان شیخ کے قدموں پر

گر پڑیں۔ اور کہنے لگیں ۔

"شیخ میرا سب کچھ لے لیجئے، میری آنکھوں کا نور لے لیجئے مگر میرا بچہ اچھا ہو جائے۔"

سلمان کا باپ بھی آگے بڑھا اور بولا "اے خدا کے ولی ہمارا سب کچھ آپ کا ہے جو حکم دیجئے تعمیل ہوگی، مگر سلمان کو اچھا کر دیجئے!"

شیخ نے فلیتے سلگائے عود جلایا دعائیں پڑھیں اور سلمان کے باپ کی آوازیں سنتے رہے جو صحن میں بھاگتے پھرتے مرغ کو پکڑنے اور ذبح کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور شیخ کو اطمینان ہو گیا کہ ہرموش نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اور شیخ کی زحمتوں اور تشریف آوری کی اہمیت سے گھر والوں کو آگاہ کر دیا ہے۔

شیخ بلند آواز سے شاہ جن کو بلا رہے تھے اور سلمان پر سایہ کئے ہوئے جن کو خطرناک دھمکیاں دے رہے تھے یا شمہوخ یا عمر فقی یا جہ نفش یا طنفوش ۔ تم کو سلیمان نبی کی قسم آؤ اور اس شریر عفریت کو سلیمان ابن وردہ کے جسم سے باہر نکالو اور اس کو جہنم واصل کرو!

اے بخاطوش ابن سمالوخ تو سلمان ابن وردہ کے جسم سے دور ہو جا ورنہ میں اسم اعظم کے زور سے تجھ کو بھسم کر دوں گا!

معلوم ہوتا تھا کہ شمروخ وغیرہ بھی آنے میں تاخیر کر رہے تھے۔ اور بخاطوش ابن سمالوخ بھی نہایت ذھیٹ قسم کا شیطان تھا جس نے شیخ کا حکم آسانی سے ماننے سے انکار کر دیا تھا اس لیے شیخ نے کھڑے ہو کے اپنا عود دان گھمایا اور کمرے میں چکر لگا کے۔

"یا شوما ئیل یا خلفائیل یا سخائیل" وغیرہ کا زور سے ورد کرنا شروع کیا۔ کمرے کے قریب دالان میں سلمان کی ماں اور محلے کی ہمدرد عورتیں انتہائی عقیدت اور خوف کے عالم میں چپکے چپکے رو، رو کے دعا کر رہی تھیں۔

آخر سلیمانی جن لبیک کہتے ہوئے آئے اور شیخ نے ان کو تاخیر پر تنبیہ کی اور ان کو مختلف ڈیوٹیاں سپرد کیں، مختلف نئے بخور جلائے جن کے دھوئیں سے کمرہ بھر گیا۔ سخت گرمی کے باوجود کھڑکیاں بند کرا دیں اور سب کو کمرے سے نکل جانے کا حکم دیا اور کچھ دیر سلاطینی جن سے راز و نیاز کے بعد خود بھی پسینہ پونچھتے باہر آ گئے۔ دروازہ بھی بند کرا دیا، تاکہ ملوک جن سکون سے اس شیطان کے اخراج کی کارروائی عمل میں لائیں۔

دالان میں بھنا ہوا مرغ خوشبودار چاول، دہی، پنیر، زیتون، شہد وغیرہ شیخ کے منتظر تھے۔ شیخ نے ان کے استقبال کا گرمجوشی سے جواب دیا۔ اور گھر والوں کے احترام و عقیدت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بطور تعویذات کی رعایتی قیمت بیس روپے وصول کرلی۔ تاکہ ان کا استعمال موثر ہو سکے۔ اور اپنے نذرانے کے متعلق کہا۔ کہ میں تو تمہارا ہوں، بچہ جب غسل شفا کرے گا تو دیکھا جائے گا۔ ابھی تو معرکہ عظیم باقی ہے یہ اس علاقے کا ایک عظیم شیطان ہے جو عقائد کی خرابی کی وجہ سے یہاں بس گیا ہے اور والدین کی کسی مذہبی کوتاہی سے فائدہ اٹھا کے سلمان کے جسم میں حلول کر گیا ہے اور اس کا اخراج آسان نہیں، لیکن ان کو یقین ہے کہ اگر خدا کی مدد شامل حال رہی تو وہ اس کو نکال ہی کے دم لیں گے۔ درحقیقت یہ امتحان ہے اور خدا ہی جانتا ہے کہ وہ کسی پر کوئی مصیبت کیوں ڈالتا ہے۔ شیخ نے دسترخوان کی صفائی کے بعد گھر والوں کو اطمینان دلایا۔ کہ معلوم ہوتا ہے کہ شیطان اتر چکا ہے کیونکہ سلمان کی کراہنے یا چلانے کی آوازیں آنی بند ہو گئی ہیں!

شیخ نے ام سلمان کو کمرے میں جانے اور کھڑکیاں کھولنے کی اجازت دیدی۔ اور ام سلمان گھبرائی ہوئی اندر گئی "بیٹے سلمان میرے پیارے، میرے دلارے" اور گھر والے بھی ام سلمان کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوئے مگر سلمان کا جسم اکڑ چکا تھا اور اس میں کوئی حرکت یا زندگی کے آثار نہ تھے .... روتی اور پچھاڑیں کھاتی ہوئی ام سلمان کو شیخ نصیحت کر رہے تھے "موت و حیات اللہ کے ہاتھ ہے۔ اس طرح رونا اور سر پیٹنا مسلمان کی شان کے خلاف ہے صبر کرو۔ اس ملعون نے جانے سے پہلے سلمان کا گلا گھونٹ دیا۔ انا للہ"

اور شیخ نے ہرموش کے کان میں کہا۔ "ابو سلمان سے کہو ہماری واپسی کا انتظام کرے، کیا معلوم کون بندۂ خدا ہماری خدمت کا منتظر ہو"........!

پرکاش پنڈت

بیسویں صدی۔ دہلی

سب ٹھیک ہو جائے گا

ہیر سیال نے اپنے نکاح کے موقعے پر جب بوکھلا کر "ایں" کہا۔ اور مولوی صاحب نے اُسے "ہاں" قرار دیتے ہوئے فوراً نکاح پڑھا دیا تو ممتا کی ماری ہیر کی ماں نے چھاتی کوٹ لی اور بلک بلک کر مولوی صاحب سے شکایت کی، کہ حضرت آپ نے یہ کیا قہر کر دیا! تو حضرت یعنی سفید ریش مولوی صاحب نے، جن کی ریش ظاہر ہے دھوپ میں سفید نہ ہوئی ہوگی۔ اپنی ریش مبارک پر دستِ مبارک پھیرتے ہوئے فرمایا۔ "آپ فکر نہ کیجیے، سب ٹھیک ہو جائے گا" — اور یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ نکاح کے بعد نہ تو ہیر کو کوئی فکر کرنے کی ضرورت رہی تھی نہ ہیر کی ماں کو۔ یہاں تک کہ خود رانجھے نے مطمئن اور بے فکر ہو کر کان چھدوا لیے تھے۔ بدن پر بھبوت مل لی تھی۔ اور گرد گور کھ ناتھ کا چیلا بن کر الکھ نرنجن کا نعرہ بلند کرنے لگا تھا۔

"آپ فکر نہ کیجیے، سب ٹھیک ہو جائے گا" — قرنوں اور صدیوں سے چلا آرہا ہے یہ جملہ ایک دو بار نہیں۔ آپ نے سینکڑوں بار سنا ہوگا، اس سے کچھ زیادہ بار ہی سب ٹھیک ہو گیا ہوگا۔

میں نے ذاتی طور پر یہ جملہ سب سے پہلے چھ برس کی عمر میں سنا تھا۔ جب میرے والد بزرگوار نے میرے اسکول آکر میرے ماسٹر سے شکایت کی تھی کہ میں کسی کا کہنا نہیں مانتا۔ دن بھر آوارہ لڑکوں کے ساتھ گھومتا رہتا ہوں۔ اور کبھی پڑھنے لکھنے پر توجہ نہیں دیتا — اور میرے ماسٹر صاحب نے کمال ہمدردی سے انھیں اطمینان دلاتے ہوئے کہا تھا "آپ فکر نہ کیجیے سب ٹھیک ہو جائے گا" میرے والد تو مطمئن ہو کر گھر چلے گئے۔ اور میرے ماسٹر صاحب نے بھری کلاس میں مجھے بنچ پر کھڑا کر کے بڑے مشفق تھپڑوں اور گھونسوں سے مجھے ٹھیک کرنا شروع کر دیا۔

میں نے دوسری بار یہ جملہ اُس کے دوسرے دن پھر سنا جب میں نے اسکول جانے سے انکار کر دیا۔ اور سڑکوں پر طلسمی انگوٹھیاں اور منتر پھونکے ہوئے گنڈے تعویذ عطا کرنے والے ایک پہنچے ہوئے رنگ کی شاگردی اختیار کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اور میرے شفیق ماموں نے مجھے اپنی تحویل میں لیتے ہوئے میری والدہ سے کہا "آپ فکر نہ کیجیے سب ٹھیک ہو جائے گا"۔ اور انھوں نے میری ٹانگوں میں لکڑی کا اڑنگا دے کر اور مجھے مرغا بنا کر مجھ سے دریافت فرمایا کہ تم اپنے نیک ارادے سے باز آؤ گے یا میں تمھیں ٹھیک کروں — ؟

وہ دن اور — آج کا دن اس جملے نے زندگی کی راہ میں قدم قدم پر نہ صرف مجھے ٹھیک کیا ہے بلکہ بے فکری کی ایسی گراں بہا دولت بخشی ہے کہ خدا دے اور نا چیز بندہ لے۔

اپنے دل کے مرض کی وجہ سے ہر وقت جہنم کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحبان کے منہ سے یہ جملہ سن کر

ہمیشہ میری باچھیں کھل جاتی ہیں اور میں اُچھلتا کودتا گھر لوٹتا ہوں۔ برسوں سے جدی جائداد کا مقدمہ چل رہا ہے اور ہر پیشی پر جائداد بڑی صفائی سے ہاتھ سے نکلتی نظر آتی ہے۔ مگر دادا اور وکیل صاحب کہ یہ جملہ دہرا کر مجھے غیر متعلقہ جائداد پر بھی قبضہ دلا دیتے ہیں۔
پچھلے برس صاحبزادے نے بتایا کہ امتحان میں اُس کے پرچے اچھے نہیں ہوئے۔ ممتحن سے میرے دیرینہ مراسم تھے۔ تشویش کا اظہار کیا تو فرمانے لگے۔ "آپ بے فکر رہیے سب ٹھیک ہو جائے گا" اور سچ مچ امتحان کا نتیجہ نکلنے کے بعد سب ٹھیک ہو گیا۔ کیونکہ نتیجے کے دن سے صاحبزادے صاحب لاپتہ ہیں اور میں اُن کی تعلیم و تربیت سے بالکل بے فکر ہو گیا ہوں۔

ذاتی واقعات یا واردات سے قطع نظر اس بات کو تو آپ بھی تسلیم کریں گے کہ واقعات اور واردات سے بھری اس دنیا میں اس اطمینان بخش جملے کے بغیر مفر نہیں۔ اور آپ کو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ خود آپ نے نتائج سے قطع نظر کئی بار یہ جملہ دہرایا ہو گا۔ کیسے نہیں دہرائیں گے جب آپ کا چچازاد بھائی جیب تراشی کے جرم میں گرفتار ہو کر اور ضمانت پر رہا ہو کر آپ سے مدد مانگنے آیا ہے۔ جب کہ آپ اپنے خاندان پر اس بات کا رعب جمائے ہوئے ہیں کہ فلاں انسپکٹر آپ کا ہم نوالہ اور فلاں سپرنٹنڈنٹ پولیس آپ کا ہم پیالہ ہے۔ یا آپ کیسے اس جملے سے بچ سکیں گے جب آپ کے سسر صاحب جنہوں نے آپ کی ہیڈ کلرکی سے مرعوب ہو کر اپنی سب گن پوری لڑکی آپ کی نذر کر دی تھی آپ کے سالے صاحب کے ساتھ آپ کے گھر تشریف لائیں گے اور عرصہ تین سال سے اُسے کلرکی تک نہ دلا سکنے کی آپ کو شرم اور غیرت دلائیں گے۔
غیرت کے اسی مقام پر پہنچ کر خود میں نے اپنے سالے صاحب کو اپنے دفتر میں چپراسی کی ملازمت دلا دی تھی۔ اور اس وجہ سے سسرال میں میری عزت کو چار چاند لگ گئے تھے۔ لیکن حیف کہ اسی جملے کی وجہ سے پانچ بچوں کی ماں ہو جانے پر بھی میری بیوی مجھ سے طلاق لینے کے درپے ہے۔

ہوا یہ کہ ملازمت کے تیسرے ہی دن اپنی شاندار ملازمت کے زعم میں آ کر سالے صاحب نے کرایہ دینے کے بجائے پہلے مالک مکان کے دانت کھٹے کیے اور پھر بڑی چابک دستی سے دو عدد دانت توڑ ڈالے۔

گرفتاری پر میں دوڑا دوڑا اپنے عزیز دوست چودھری ہرنام سنگھ کے پاس پہنچا جو کسی معاملے میں بھی اپنے دوستوں کو کبھی فکر نہیں کرنے دیتے۔ قصہ بیان کیا تو بولے۔ "آپ فکر نہ کیجیے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں بے حد گھبرایا ہوا تھا۔ اس لیے اپنی تسلی کی خاطر پوچھ بیٹھا کہ "کیسے ٹھیک ہو جائے گا؟"

"میں علاقے کے تھانیدار سے کہہ دوں گا کہ کیس رجسٹر نہ کرے۔"

دوسرے دن جب کیس رجسٹر ہو گیا تو میں پھر دوڑا دوڑا چودھری صاحب کے پاس پہنچا۔ صورتِ حال بیان کی تو بولے۔ "آپ فکر نہ کیجیے سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"لیکن کیسے؟"

"میں علاقہ مجسٹریٹ سے کہہ دوں گا کہ مجرم کو بری کر دے۔"

پانچ دن بعد جب مجرم یعنی سالے صاحب کو تین مہینے کی بامشقت سزا ہو گئی تو میں پھر دوڑا دوڑا چودھری صاحب کے پاس پہنچا۔ قصہ بیان کیا تو بولے "آپ فکر نہ کیجیے سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کیسے ہو جائے گا؟" میں نے تڑپ کر کہا۔ "اُسے تو بامشقت سزا ہو گئی ہے۔"

بہت اطمینان سے بولے۔ "میں جیلر سے کہہ دوں گا کہ اس سے زیادہ کڑی مشقت نہ لیں۔"

ستندر سنگھ
تلاش۔ نئی دہلی

چالیسواں مٹکا

فلم ایکٹر بننے کا جنون تو ہر شہر میں ہر نوجوان کے سر پر سوار رہتا ہے۔ لیکن ہمارے گورداسپور میں یہ جنون ہمیشہ زوروں پر رہا ہے۔ فلم اسٹار دیو آنند ہمارے شہر کا باسی ہے۔ اسی لیے ہمارا ہر نوجوان یہی سوچتا ہے کہ دیو آنند ایک کامیاب ایکٹر بن سکتا ہے تو میں کیوں نہیں بن سکتا! دیو آنند میں کون سی خوبی ہے جو مجھ میں نہیں؟

میرے دوست امر کمار کے سر پر بھی یہی جنون سوار تھا۔ وہ بانکا گبرو تو تھا ہی اس کے گلے میں سرسوتی کا بردان بھی تھا۔ گانے سے زیادہ واقفیت نہ تھی۔ پھر بھی اُسے اپنی آواز پر ناز تھا۔ وہ ہمیشہ ٹخنوں سے اونچی پتلون اور بڑی کیلی لش شرٹ پہنتا۔ اُس کے بال دیو آنند سے ملتے تھے تو مونچھیں راجکپور کی یاد دلاتی تھیں۔ پھر کسی نے ایک دن دیکھا کہ اس نے مونچھیں بھی صاف کرا ڈالیں۔ تاکہ وہ بھی کسی دیو آنند سے کم نہ رہے۔

میں نے کئی بار دیکھا کہ وہ آئینے کے سامنے دیو آنند کی تصویر رکھ کر اس سے اپنی ناک، آنکھ اور چہرے کا موازنہ کرتا رہتا۔ کبھی بالوں کو ماتھے پر لٹکا لیتا۔ تو کبھی جھٹکا دے کر پیچھے پھینک دیتا۔ اور مجھے یہ دیکھ کر ہنسی آجاتی۔

جب اُس کی شکل دیو آنند سے ملتی جلتی نظر نہ آتی تو کہتا۔ "بھئی امر کمار! تمھیں دیو آنند بننے کی ایسی کیا ضرورت ہے؟ فلم سنسار تو ہمیشہ نئے نئے چہروں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ دیو آنند سے شکل نہ بھی مل سکے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ انسان میں ایکٹر بننے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔ پھر اُسے ایکٹر بننے سے کون روک سکتا ہے!" اُس کا یہ بول کئی بار میرے کان میں بھی پڑ چکا تھا۔

وہ دوبارہ آئینے میں اپنی شکل دیکھنے لگتا۔ ماتھے پر آئے ہوئے بالوں کو پیچھے کی طرف پھینک کر یوں مسکراتا، جیسے کسی خیالی ہیروئن کے سامنے فلمی انداز میں اظہارِ محبت کر رہا ہو۔ پھر وہ یک لخت اُداس ہو جاتا۔ اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بھرائی ہوئی آواز میں کہتا۔

"رادھا! میں تمھاری خاطر سماج سے ضرور ٹکر لوں گا! رادھا! تم میری ہو، صرف میری۔!"

اور پھر آئینے کی طرف دیکھتا اور آنکھیں مٹکا کر کہتا۔ "میں نے ڈائلاگ ٹھیک ادا کیا ہے نا؟"

وہ دوسرے ہی لمحے مسکرا کر آئینے میں دیکھتا جیسے واقعی ایک کامیاب ایکٹر بن گیا ہو۔

ہم اکثر مل کر پکچر دیکھنے جاتے۔ لیکن امر کمار ہر اچھے ایکٹر کے ڈائلاگ یاد کر لیتا۔ اُس کی ایکٹنگ کی نقل اُتارتا اور پھر دوستوں میں بیٹھ کر وہ ڈائلاگ اسی ایکٹر کے انداز میں دُہراتا۔ جس پر کبھی ہم اُسے داد دیتے اور کبھی اُلٹی سیدھی سنا ڈالتے۔ تعریف سن کر وہ خوش ہوتا

اور ایسی ویسی بات سننے کو ملتی تو کہتا۔ "تم لوگ مجھ سے جلتے ہو۔"

ایک بار میں بمبئی کی سیر کرکے واپس گورداسپور پہنچا تو اُس نے مجھ سے ملتے ہی پوچھا۔ "کیا تم نے دیو آنند کو بھی دیکھا؟"

میں نے نفی میں جواب دیا تو وہ بولا۔

"تم پورے گنوار نکلے۔"

اس جنون کے باوجود وہ بمبئی نہ جا سکتا تھا۔ اُس کی تعلیم کی گاڑی میٹرک کے دروازے پر رک گئی تھی اور اُس کے فلمی میگزین پڑھنے اور نئے فیشن کے کپڑے پہننے اور فلمیں دیکھنے سے ہی فرصت نہ ملتی تھی۔

دسمبر کے مہینے میں اُس کے باپ نے اُسے ایک سو پچاس روپے دیے تاکہ وہ اسکول کا بقایا چکا دے اور پھر سے تعلیم کی گاڑی پر سوار ہو جائے۔
امر کمار کے ہاتھ میں یہ روپیہ آنے کی دیر تھی کہ اسے اس رقم نے نجات کی راہ دکھا دی۔

مجھے یاد ہے میں اُسے ریلوے اسٹیشن پر چھوڑنے گیا تھا۔ بمبئی میل روانہ ہونے میں ابھی آدھ گھنٹہ رہتا تھا۔ وہ پلیٹ فارم پر کھڑا ایکٹر بننے کے خواب دیکھتا رہا۔ کبھی وہ پتلون کی کریز درست کرتا۔ کبھی پھولدار ریشمی بش شرٹ کے بٹن کھول دیتا۔ تسلی نہ ہونے پر بٹن دوبارہ بند کر لیتا۔ کبھی کنگھی نکال کر بالوں کو سنوارتا۔ اور پھر جیب سے رومال نکال کر چہرہ صاف کرنے لگتا۔

"تمہارا کیا خیال ہے، میں دیو آنند دکھائی دیتا ہوں یا نہیں؟"

میں نے کہا۔ "ضرور کیوں نہیں؟"

اُس نے مجھے گلے سے لگا لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "یار! تم بھی چلو بمبئی، خوب گزرے گی!"

میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ وہ جا کر میرے لیے بمبئی کا ٹکٹ لے آیا۔

انجن کی تیز سیٹی نے پلیٹ فارم پر ہلچل مچا دی۔ ہم گاڑی کی طرف لپکے اور ڈبے میں ایک طرف جا بیٹھے۔ گاڑی چلی تو امر کمار بولا۔
"تم خود دیکھ لو گے یار، میں دوسرا دیو آنند بن کر فلمی دنیا پر نہ چھا جاؤں تو امر کمار نہیں۔ ہمارے بنگلے پر پروڈیوسروں کا تانتا بندھا رہے گا۔"

"ضرور، کیوں نہیں؟" میں نے کہا۔ "تم اپنی فلم میں جی جان سے کام کرو گے۔ اور جب تمہارے دوست تمہیں فلم کے پردے پر دیکھیں گے تو کہنا چاہیں گے —— واہ امر کمار! کمال کر دیا تم نے، تم تو دیو آنند کو بھی پیچھے چھوڑ گئے۔"

وہ بولا۔ "جب میں اپنی ایکٹنگ کی دھاک بٹھا لوں گا۔ اور کافی روپیہ پیسہ جمع کر لوں گا تو راجکپور کی طرح ڈائرکٹری کے جوہر بھی دکھاؤں گا لیکن اس کی طرح چیپ فلمیں نہیں بناؤں گا۔ جناب میں تو ایسی فلمیں پیش کروں گا جن سے ملک و قوم کی بہبودی ہو سکے۔"

"تمہاری پہلی فلم کا نام کیا ہو گا، امر؟" میں نے جھٹ پوچھ لیا۔

"دلی چلو۔" وہ بڑی بے ساختگی سے بولا۔ "اس سے بڑھ کر بھلا اور کون سا نام ہو سکتا ہے؟"

پاس سے ایک مسافر بولا۔ "دلی نہیں، بمبئی چلو۔ ہم تو رتلام سے بھی آگے نکل آئے۔"

وہ کھسیانا سا ہو کر چپ ہو گیا۔ پھر سنبھل کر بولا۔ "جب رادھا میری فلم کو دیکھے گی تو ہاتھ مل مل کر کہے گی —— میں نے امر کمار کی محبت کو کیوں ٹھکرا دیا؟"

میں نے کہا۔ "ضرور، کیوں نہیں؟"

وہ بڑے والہانہ انداز میں بازو اچھال کر بولا۔ "جب ہم گورداسپور آئیں گے تو بے پناہ ہجوم ہمارے سواگت کے لیے اُمڈ پڑے گا۔ لوگ ہمارے آٹوگراف لیں گے۔ ہمیں ٹی پارٹیاں دی جائیں گی۔ اور جب میری رادھا مجھ سے ملنے کے لیے آئے گی تو میں منہ پھیر کر کہوں گا۔ اب جو آئی ہو، تو

کہیں آئی ہو ؟

"ضرور کیوں نہیں ۔ ؟" میں نے اُس کی ہاں میں ہاں ملانا ضروری سمجھا!

ہم بمبئی سنٹرل اسٹیشن پر اُترے تو ہماری خوشی کی انتہا نہ تھی۔ جیسے یاتری شیش ناگ اور پنج وٹی کو پیچھے چھوڑ کر امرناتھ آپہنچے ہوں۔!
پلیٹ فارم سے باہر نکل کر ہم نے ٹیکسی لی۔ اور ڈرائیور سے کہا۔" سردار جی! ہمیں ڈرائیو کے کسی ہوٹل میں لے چلو "
راستے میں امر کمار ڈرائیور سے ایکٹروں اور ایکٹرسیوں کے پتے پوچھتا رہا۔ ڈرائیور نے اُس کے فلمی مرض کو پہچانتے ہوئے ہمیں "ڈیلا مار"
ہوٹل میں جا اتارا۔ اور جاتے ہوئے آنکھیں نچا کر بولا۔
"سامنے والی ڈیری میں شام کو سب ایکٹر آتے ہیں، سیٹھ بھی اور ایکٹرسیں بھی۔!"
ہم نے اپنا مختصر سا سامان کمرے میں رکھوا دیا۔
غسل کے بعد امر کمار آئینے کے سامنے ہو بیٹھا۔ اُس نے اپنا چہرہ سجایا۔ ایکٹروں والی خوش رنگ بش شرٹ اور نفیس کریز والی پینٹ
پہن کر کھڑکی میں کھڑا ہو گیا۔ اور بولا۔" اب میں دیو آنند نظر آتا ہوں یا نہیں ؟"
"ضرور۔ کیوں نہیں " میں مسکرایا اور نہانے چلا گیا۔
شام اُترنے سے پہلے ہی ہم سامنے والی ڈیری میں ایک میز پہ جا بیٹھے۔
امر کمار نے جھٹ بیرے کو چائے کا آرڈر دیا اور اِدھر اُدھر بیٹھے ہوئے لوگوں کو گھورنے لگا۔ تاکہ کوئی جانا پہچانا فلمی چہرہ نظر آ جائے۔
مگر وہاں تو فٹ پاتھ ایکٹروں، ڈائرکٹروں اور پروڈیوسروں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ امر کمار بہت مایوس ہوا لیکن اگلے ہی لمحے بولا۔" شام تک تو فلمی
چہرے یہاں نظر آئیں گے ہی "
"ضرور۔ کیوں نہیں " میں مسکرایا۔
شام ہوتے ہی رنگ برنگی بش شرٹیں اور نئی تراش کی پتلونیں پہنے اور سر پہ لمبے پٹے سجائے بہت سے نوجوان ڈیری میں آنے لگے۔
ہماری امیدیں بڑھتی گئیں۔
شام ڈھل گئی۔ نہ دیو آنند آیا، نہ نرگس آئی۔ ہمارا دل ڈوبنے لگا۔
امر کمار بولا۔" وہ لوگ کہیں شوٹنگ میں لگے ہوں گے۔ فرصت نہیں ملی۔ آج نہیں آئے تو کیا کل بھی نہیں آئیں گے۔ ؟"
"ضرور۔ کیوں نہیں۔ ؟" میں نے ہاں میں ہاں ملائی۔
ہم نے کئی روز اسی طرح اس ڈیری کے چکر لگائے۔ لیکن جن لوگوں کا ہمیں انتظار تھا وہ کبھی نظر نہ آئے۔
ہم نے دل نہ چھوڑا۔ اور اِدھر اُدھر کئی ہوٹلوں اور ریستورانوں کے چکر لگائے۔
جیب ہلکی ہوتی جا رہی تھی۔ امر کمار بولا۔" پروا نہیں۔ زندگی میں جو شخص داؤ پہ اپنا سب کچھ لگاتا ہے وہی تو ایک روز کامیاب ہوتا ہے۔"
"ضرور! کیوں نہیں ؟" میں نے لڑکھڑاتی سی آواز میں کہا۔
ایک روز ڈیری میں ہماری نظر ایک خوبصورت جوڑے پر پڑی جو شکل و صورت سے ایکٹر ایکٹریس معلوم ہوتے تھے۔
امر کمار نے ایک بیرے کو بلا کر پوچھا۔" بھئی، وہ کونے والی میز پہ کون ہیں۔! کوئی ایکٹر ایکٹریس تو نہیں ؟"
بیرے نے زیرِ لب مسکرا کر کہا۔" سیٹھ، ان کی بھلی پوچھی۔ گھر سے چلے تھے ایکٹر ایکٹریس بننے، اب وہ دھندا کرتی ہے اور بابو جی ایجنٹی!"

ہمیں ایک جھٹکا سا لگا۔ جیسے ہم زینے سے نیچے آگرے ہوں۔ اُس رات ہم نے اپنی جیب کا حساب لگایا۔ واقعی ہماری حالت بہت پتلی ہو گئی تھی۔

ہم نے فیصلہ کیا کہ ہمیں ہوٹل چھوڑ کر کسی سستی جگہ اُٹھ جانا چاہیئے۔

اگلے روز ہم نے سانتا کروز کے "بھارت لاج" میں رات گزارنے کا انتظام کیا۔ یہ گھونسلہ بھی عجیب تھا۔ یہاں کوئی ایک درجن پنچھی رین بسیرا کرتے تھے۔

اب ہم "کڑکی" کے دور سے گزر رہے تھے۔ لیکن امر کمار نے دم نہ چھوڑا۔ وہ ہمیشہ یہی کہتا۔ "یہ سب کامیاب ایکٹر بھی اسی "کڑکی" کے دور سے گزرے ہیں۔"

"ضرور، کیوں نہیں؟" میں نے تھاپ لگائی۔

اب ہم دن رات اسٹوڈیوز کے چکر لگانے لگے۔ ہر فلم اسٹوڈیو کا کم بخت پٹھان دُور سے ہی بھگا دیتا۔ ایک دو بار ہم دربان کے روبرو بری طرح گڑگڑائے۔ لیکن سب بے اثر۔

کئی بار میں واپس جانے کی بات کہتا، مگر امر کمار نعرہ لگاتا "ہماں یاراں دوزخ، ہماں یاراں بہشت!"

ایک روز امر کمار سے آنکھ بچا کر میں نے گورداسپور کی راہ لی۔

پانچ برس تک مجھے امر کمار کی کوئی خبر نہ ملی۔ اب کسی کام کے سلسلے میں مجھے بمبئی جانے کا اتفاق ہوا۔

اسی شام میں میرین ڈرائیو کی اسی ڈیری میں پہنچا اور ایک میز پر بیٹھ کر چائے پیتے پیتے سوچنے لگا، کہ شاید وہ میرا لنگوٹیا یار نظر آ جائے۔

اسی اثنا میں تین چار بے فکرے ساتھ والی میز پر آ جمے۔ اور چھوٹتے ہی فلمی دنیا کی باتیں لے بیٹھے۔

میں نے بڑے غور سے دیکھا۔ ان میں سے ایک کی شکل امر کمار سے ملتی تھی، اگرچہ اس کا چہرہ زرد اور پچکا ہوا تھا۔ لیکن جب اُس نے اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ لگایا تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ تو اپنا امر کمار ہے۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ اور میں اُٹھ کر اُس میز پر جا پہنچا۔

"آپ کا نام امر کمار ہے کیا۔؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"جی ہاں!" وہ بولا۔ "کہیے کیا بات ہے؟"

"بھئی مجھے پہچانا نہیں۔ میں......"

"آہا!" وہ لپک کر مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔

رسمی تکلف کے بعد میں نے پوچھا۔ "بھئی امر، کیا شغل ہے آجکل؟"

امر کمار نے اچھل کر کہا۔ "تو مجھے چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ کوئی بات نہیں۔ لیکن میری فلمیں بھی نہیں دیکھیں۔؟"

"بھئی کون کون سی فلموں میں کام کیا ہے۔؟"

"یہ بھی خوب رہی۔" امر کمار نے آنکھیں نچا کر کہا۔ "ہم نے تو نہ جانے کتنی فلموں میں اپنے جوہر دکھائے!"

میں نے نہایت عاجزی سے کہا۔ "بھئی کوئی تازہ ماسٹر پیس تو بتاؤ۔"

امر کمار نے جوش میں آ کر کہا۔ "کس کس کا نام لیں۔ 'علی بابا چالیس چور' اپنا تازہ شاہکار ہے۔"

میں نے کہا۔ "وہ فلم تو میں نے بھی دیکھی ہے۔ تمہارا کون سا رول تھا؟"

"واہ! کمال کر دیا تم نے" اُس نے سر کو جھٹکا دے کر کہا۔ "تم نے وہ فلم دیکھی، پھر بھی مجھے نہیں پہچانا؟"

"معاف کرنا" میں نے بڑی معذرت سے کہا۔ "اپنا گوردا سپور چھوٹا سا شہر ہی تو ہے۔ وہاں اس فلم کا پٹا ہوا پرنٹ دکھایا گیا تھا۔ تم سے کیا چھپا ہے؟"

امر کمار نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "ہاں تو سنو! ڈاکوؤں کے سردار نے ایک سین میں چالیس مٹکوں میں اپنے ساتھیوں کو بند کیا تھا، یاد آیا تمہیں وہ سین؟"

"ضرور۔ کیوں نہیں؟" میں بے اختیار بول اُٹھا۔

امر کمار معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ اور میرے کندھے پر ہاتھ مار کر بولا۔ "چالیسویں مٹکے میں جسے بند کیا گیا تھا، وہ یہی تمہارا اپنا امر کمار ہی تو تھا۔!"

علامہ سیماب اکبرآبادی

ہم قلم۔ کراچی

ایک مثلث

کیا چارۂ مصیبتِ شام و سحر کریں   حد ہو کوئی تو صبر ترے ہجر پر کریں
آخر ہم ایک حال میں کب تک بسر کریں

تائید میں ہے حسنِ جواں کی خدائے حسن   فطرت ہر اعتبار سے ہے ہمنوائے حسن
آمین تم کہو تو دعائیں اثر کریں

اب یہ تعینات ہیں تیری قسم فضول!   جب تو نہیں تو خلوتِ دیر و حرم فضول
اب کیا یہاں پرستشِ دیوار و در کریں

جائز ہے آہ و نالہ، نہ یارائے صبر ہے   اے اقتضائے ضبط یہ حد ہے کہ جبر ہے؟
کیا آنکھ ہم بحدِ مژہ بھی نہ تر کریں

ممکن نہیں کہ اُن کے تغافل پہ ہو اثر!   انجامِ اطلاع سے واقف ہیں چارہ گر
پھر کیوں ہمارے حال کی اُن کو خبر کریں

پھر خلوتِ جمال میں جلوے سنور چکے   فرسودہ طور ہو چکا، موسیٰ گزر چکے
شاید وہ اب مجھی کو خرابِ نظر کریں

پردے تمام اٹھ گئے تا حدِ جلوہ گاہ   اس مرکزِ جمال پر اب ہے مری نگاہ
جلوے بھی دیکھ لیں تو طوافِ نظر کریں

تم نے تو دل حجاب سے محفوظ کر لیا   تم نے تو اپنے حسن کو محفوظ کر لیا
ہم کس کے ساتھ عمرِ محبت بسر کریں

نقص و کمال پیشِ نظر خود ہیں بے حساب   سیماب ہم میں عیب و ہنر خود ہیں بے حساب
ہم کیا کسی کے عیب و ہنر پر نظر کریں

رباعیات

بھر پور جوانی کا جب ہوا آغاز
پلکوں نے اُٹھا لیا رم و رقص کا ساز
جوبن چٹکا، بدن نے گھونگھٹ اُلٹا
گرداب کی انکھڑیوں میں گونجی آواز

اہلِ علم و نظر کو سمجھو نہ ذلیل
مانا کہ معاش ان کی نہایت ہے قلیل
یہ لوگ کہ ہیں نقش بہ دیوار اس وقت
اک روز مجسموں میں ہوں گے تبدیل

ہر سُر میں خراشِ دل کی پلٹن دیکھی
ہر تان میں بجتی ہوئی دھڑکن دیکھی
کل شب کو نرت کے بیچ و خم میں ہم نے
ٹوٹی ہوئی انگڑائیوں کی الجھن دیکھی

کچھ کان میں کہہ رہی ہے بادِ مغموم
دل میں ہے خیالاتِ پریشاں کا ہجوم
بیٹھی ہے جو آ کر ابھی دامن پہ یہ گرد
کس کی معشوقہ ہے؟ یہ کس کو معلوم؟

وزیر آغا — ادبی دنیا۔ لاہور

عکس

آسماں ہے اِک ردائے نیلگوں
اِک ردائے نیلگوں اور ابر کے ٹکڑے ہزار
ابر کے ٹکڑوں کے پیچھے اِک اکیلا کوہسار
مُہر بر لب —— سوگوار

کوہ کے قدموں میں اِک جوئے رواں
سبز مخمل کی حسیں مسند پہ بل کھاتی ہوئی
کوئی ناگن رینگتی، پھنکارتی جاتی ہوئی
—— جاتی ہوئی دیوانہ وار

تُند خو جوئے رواں کے پاس کھیتوں سے اُدھر
مختصر سا ایک گھر مثلِ خیالِ منتشر
گھر کی چھت پر ایک پیکر، جانے کس کا منتظر
منتظر —— اور بے قرار

کوئی جھانکے اس حسیں پیکر کی آنکھوں میں اگر
نیلگوں پردوں پہ دیکھے ابر کے ٹکڑے رواں
عارضِ سیمیں پہ بہتی آنسوؤں کی ندیاں
ندیاں —— بے اختیار!!

مجید امجد — سویرا۔ لاہور

دِل پتھر کا

اِس پتھر پر اک اِک پل کی گھایل آنچ بھی گھاؤ
اس پنکھڑی کو بہا نہ سکا طوفانوں کا بھی بہاؤ
دل پتھر کا —— پتھر پنکھڑی پھول کی!

دل کیا جانے کہاں ہے وہ بے انت سمے کا پڑاؤ
جہاں پہ جل کر راکھ ہوئے ہیں زندگیوں کے الاؤ
دِل جو سُنے تو جکڑے ہوئے سناٹوں کی یہ کراہ،
اِک سندیس ہے "جینے والو! ہم کو یاد نہ آؤ"

دِل کو یاد کریں وہ سمے، دل بھول چکا وہ سبھاؤ
رات کی میلی کروٹ، آخری سانسوں کا ٹھہراؤ
کسی امر ارمان کی ہچکی، کسی صدا کے شبد۔
کہیں سے ڈھونڈ کے لاؤ اُن شبدوں کو اے بے مہر ہواؤ!
کبھی کھلے پتھر پہ —— پنکھڑی پھول کی!

منیب الرحمان — نقوش۔ لاہور

ایک نظم

جب اس دیار میں دل کا گذر ہوا تو یہاں
قدم قدم پہ تمناؤں کے سراب ملے
خرابہ ہائے جنوں راہ میں نظر آئے
ہر ایک گام پہ زخموں کے آفتاب ملے
رکھا تھا سینے پہ لیکن وفا نے سنگِ گراں
شمارِ سود و زیاں تھا نہ شکوۂ دوراں

ادائے لطف و کرم تھی کہ طرحِ جور و جفا
وہ چشمِ ناز بہر شکل دل کو راس آئی
کرن کا روپ بھرا آنسوؤں میں ڈوب گئی
شفق کا رنگ لیا، شامِ غم کے پاس آئی

سرودِ نیم شبی اور بارشِ مہتاب
کسی کی یاد سے پھر بام و در چمک اُٹھے
ہوائے درد چلی، پھول سے مہک اُٹھے
چلو کہ عام کریں رسمِ غم زمانے کی
سکھائیں اوروں کو وہ سب جو ہم نے سیکھا ہے

خلوصِ تشنہ نظر، کیفِ خود فراموشی
شکستِ خویش نمائی، ہلاکتِ پندار
بہائے کم سخنی، اعتبارِ خاموشی
حلاوتِ خلشِ ہجر، لذتِ دیدار
جگر کی آگ میں برسوں لہو جلایا ہے
پیا ہے زہر تو جینے کا ڈھنگ آیا ہے

شہریار — تلاش۔ نئی دہلی

میرے سوا

کس کی آواز کے شعلہ کی لپک اُٹھتی ہے
کس کی خوشبوئے بدن اُڑتی ہے
کیوں فضا بدلی ہوئی لگتی ہے
کیا کوئی اور بھی ہے میرے سوا
پھیلے ہوئے صحرا میں

رُوح سے جسم ہے باغی جس کا
زیست جس کے لئے تنہائی ہے
جستجو جس کو حقیقت کی یہاں لائی ہے
کیوں فضا بدلی ہوئی لگتی ہے
کیا کوئی اور بھی ہے میرے سوا
پھیلے ہوئے صحرا میں

محمود ایاز

نصرت۔ لاہور

مرگِ نو

سحر دم مہکتی ہوئی بوئے گل بڑھ کے ساکت ہواؤں سے رختِ سفر مانگتی ہے
موذّن اذاں دے رہا ہے
ہر اک رفتہ، آئندہ لمحہ،
ہر اک دیدۂ نادیدہ منظر
خلاؤں کی وسعت میں اِک لوحِ محفوظ پر مرتسم ہے
کسی کو خبر تک نہیں ہے۔

سحر دم،
لہو کی حرارت، تمنا کی گرمی سے خالی بدن
کارخانوں، تجارت گھروں کی طرف چل پڑیں۔
مشینوں کی مانند،
نانِ شبینہ کی خاطر،
تگ و دوئے پیہم میں شامل رہیں۔
تماشا گھروں کے اندھیرے میں،
قحبہ گھروں کے حزیں، نیم تاریک کمروں میں
اپنی امنگوں کی تکمیل دیکھیں۔

کوئی خواب دیکھیں نہ خوابوں کی حسرت کریں
صرف آسائشِ جسم و جاں کی تمنا میں جاں دے کے زندہ رہیں۔
سحر دم اُٹھیں،
کارخانوں، تجارت گھروں کی طرف چل پڑیں۔

سرِ شام بڑھتی ہوئی سرد اُداسی میں،
ساحل سے ٹکراتی موجوں کی گھائل صدائیں سنو۔
شاخساروں سے گرتے ہوئے زرد پتوں کی لاشوں کو دیکھو۔
دمِ نزع رکتی ہوئی سانس کا کرب،
بجھتی ہوئی شمع کی آخری جھلملاہٹ کے اسرار سمجھو۔
سبک پا اجل تند و تیز آرزوؤں کے طوفاں میں اپنی طرف بڑھ رہی ہے
ہر اک آن لمحہ بہ لمحہ، ہمارے رگ و پے میں اُترتی چلی جا رہی ہے
میں اُس موت کا نوحہ گر ہوں جو زندہ دلوں میں مکیں ہے
یہ موت ایسی تقدیر ہے جو نوشتہ نہیں ہے

فارغ بخاری — نقوش۔ لاہور

شہرِ خموشاں

دل کے گلزار میں نومیدہ سی، نورستہ سی کونپلوں کی طرح
کتنی بے نام سی خواہشیں سر اُٹھاتی رہیں
ایک نوخیز غنچے کے انداز میں مسکراتی رہیں
مسکراتی رہیں، لہلہاتی رہیں
خوشبوؤں کے خزانے لٹاتی رہیں
دل میں کیا کیا نہ طوفاں اُٹھاتی رہیں

یہ زمانہ مگر
ایک سفاک گلچیں کے روپ میں
اپنے بے رحم ہاتھوں سے اُن کا گلا گھونٹ کر
دل میں ہی ان کے مرقد بناتا رہا
ایک شہرِ خموشاں بساتا رہا
آج اس اجڑے ہوئے شہر کا گویا داور ہوں میں
آج ان مرقدوں کا مجاور ہوں میں

احمد فراز — فنون۔ لاہور

غریبِ شہر کے نام

غریبِ شہر تری دکھ بھری نوا پہ سلام
تری طلب، تری چاہت تری وفا پہ سلام
ہر ایک حرفِ تمنائے دلربا پہ سلام
حدیثِ درد و سکوتِ سخن ادا پہ سلام
دریدہ دل! ترے آہنگِ سازِ غم پہ نثار
گہر فروش! ترے رنگِ چشمِ نم پہ نثار
جنوں کا شہر ہے آباد فصلِ دار کی خیر،
ہر ایک دل ہے گریباں بھری بہار کی خیر
بجھے ہیں بام مگر شمعِ رہگزار کی خیر!
تمام عمر تو گزرے اس انتظار کی خیر
رُخِ نگار و غمِ یار کو نظر نہ لگے
گلہ نہیں ہے اگر آنکھ عمر بھر نہ لگے
دل و نظر کی شکستوں کا کیا حساب کریں
شمارِ زخمِ عبث ہے نجات سے پہلے
کچھ اور دیدۂ خوں رنگ کو گلاب کریں
صبا کا ذکر قیامت ہے رات سے پہلے
ابھی لبوں پہ حکایاتِ خوں چکیدہ سہی
"بہ سینہ رہ سپرم" دست و پا بریدہ سہی

گوپال متل — **تحریک۔ دہلی**

شعر کہنے کا مزہ ہے اَب تو
دِل کا ہر داغ ہرا ہے اَب تو

اتنا بے صَرفہ نہ تھا دل کا لہو
باغ دامن پہ کھلا ہے اَب تو

بجھ ہی جائے نہ کہیں دل کا چراغ
واقعی تند ہوا ہے اَب تو

زندگی، زندگی ہوتی تھی کبھی!
مَر نہ جانے کی سزا ہے اَب تو

تھا کوئی شخص مرا محرمِ دِل،
وہ مجھے بھول چکا ہے اب تو

خوگرِ شہر ہوئے دیوانے
چاکِ دامن بھی سیا ہے اَب تو

دِل کا یہ حال ہمیشہ تو نہ تھا
جانے کیا مجھ کو ہُوا ہے اَب تو

کرار نوری — **جنگ۔ کراچی**

اِک نیا لہجہ بنایا حرفِ عالمگیر کا
فکر کو گرما گیا شعلہ مری تقریر کا

ولولہ کچھ کم نہ تھا بیتابیٔ تدبیر کا
کِس طرح ہم مان لیتے فیصلہ تقدیر کا

ذہن پر غالب رہا ہے خودستائی کا جنوں
ہم کہ منہ دیکھا کیے خود اپنی ہی تصویر کا

خودشناسی سے ملی ہے زندگی کی آرزو
زندگی خود بن گئی حلقہ مری زنجیر کا

جھوٹ بولے دوسروں کی آبرو کے واسطے
ہم نے ذمّہ لے لیا ہے غیر کی توقیر کا

زندگی خود ساتھ لائی عیش و غم کی جدتیں
کس نے بَدلا پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

ٹھوکریں کھائی ہیں ہم نے زندگی کے واسطے
سامنا ہم نے کیا ہے گردشِ تقدیر کا

میں نے اس انداز سے گلشن میں کی فریاد و فغاں
شور برپا کر دیا گلچیں نے دار و گیر کا

انور منظم

زخمِ نظارہ، خونِ نظر دیکھتے رہو
جو کچھ دکھائے دیدۂ تر دیکھتے رہو

چشمِ صدف کے درد سے صرفِ نظر کرو
کس طرح ٹوٹتے ہیں گہر دیکھتے رہو

شاید کسی کا نقشِ کفِ پا چمک اُٹھے
اے رہنماؤ! راہ گزر دیکھتے رہو

گیسوئے شب سنوارنے والو، کبھی کبھی
آئینۂ نگارِ سحر دیکھتے رہو!

آنکھوں میں گھل نہ جائیں کہیں ظلمتوں کے رنگ
جس سمت روشنی ہے اُدھر دیکھتے رہو!

ذوالفقار احمد تابش

گھنے درخت کے پتوں میں چاند ڈوب چلا
اُداس رات نے کہرے میں چہرہ ڈھانپ لیا
سکوتِ شام میں ابھری ابھی یہ کس کی صدا
کہ تو نے سنتے ہی کھڑکی کے پٹ کو کھول دیا:
حسین شاخوں کو شب بھر میں کر گئی عریاں
تھمی ہوا تو درختوں نے سکھ کا سانس لیا
کھلے کواڑ، کھلی کھڑکیاں، کھلی آنکھیں
تمام شب تیرا ہر شے نے انتظار کیا
ستارے مہر بلب، رات چپ، ہوا خاموش
کسی سے بھی ترے بارے میں کچھ پتا نہ چلا
چلا تھا گھر سے کسی اور ہی ڈگر پہ، مگر
تری گلی کے سوا کوئی راستہ نہ ملا
اُس ایک پتے سے پوچھے کوئی خزاں کیا ہے
زمیں پہ گرنے سے پہلے جو کانپ کانپ گیا
کسے ہیں فرصتیں اب شغلِ سینہ کاوی کی،
فراغتوں کا وہ اک دور تھا سو بیت گیا
کسی خیال سے پہلے ہی دل پریشاں تھا
اداس رات نے کچھ اور سوگوار کیا

نقش کراچی

دیوندر اسر

سریتا۔ نئی دہلی

۱۹۶۳ء کا اُردو ادب

ذہین پڑھنے والوں کی اردو ادب سے بیزاری بڑھتی جارہی ہے۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ پرانے اور مشہور لکھنے والوں نے اب خاصا بڑا لکھنا شروع کر دیا ہے، اور وہ کچھ زیادہ تیز رفتار بھی ہیں۔ اُردو کے ادبی رسالے ایسے لکھنے والوں کو سرفہرست شائع کرنا باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ اُردو کی دوسری بدقسمتی یہ ہے کہ اس زبان میں اتنے زیادہ ادبی رسالے شائع ہوتے ہیں کہ شک ہوتا ہے کہ کہیں ادب کا مفہوم تو نہیں بدل گیا۔ لیکن اُردو کے خدائی خدمتگار رسالوں کی کثیر تعداد کو اس ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ اردو کتنی مقبول زبان ہے، اس میں اتنے زیادہ ادبی رسالے شائع ہوتے ہیں جو کسی دوسری زبان میں نہیں ہوتے۔ لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ ادب میں سوال مقدار یا تعداد کا نہیں، اقدار کا ہوتا ہے۔

اس سال جو نئے رسالے شائع ہوئے ہیں ان میں بھی کوئی جدت نہیں۔ پرانے رسالوں میں روایتی، فسانوں کے سوا اُن کی کوئی اہمیت نہیں ہے، کیونکہ یہ نئے رسالے اُن سے کسی طرح بھی مختلف نہیں۔ اپنی ترتیب میں، ضخامت میں، اپنے اندازِ فکر میں، سب رسالے یکساں ہیں۔ اس برس جو نئے رسالے شائع ہوئے، ان میں قلم کار، فنون۔ اور سیپ قابلِ ذکر ہیں۔

کسی بھی سال کی ادبی تخلیقات کے معیار کا اندازہ اُس سال میں شائع ہونے والی مطبوعات سے نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ مطبوعات کئی برسوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ بہتر یہی ہوگا کہ اس سال رسالوں وغیرہ میں شائع ہونے والی تحریروں پر نظر ڈالی جائے۔ ویسے بھی ایک سال کی تحریروں کی بنا پر یہ کہہ دینا کہ اس سال ادب کی ان حدوں میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے یہ صحیح نہیں۔ ادب کا جائزہ پلاننگ کمیشن کی رپورٹ نہیں، حالانکہ ہمارے ادب میں یہی دستور ہے۔

۱۹۶۳ء میں اردو ادب کے جائزے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اُردو ادب کے زوال میں ایک اور برس کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اُردو ادب نے مقدار میں ترقی کی ہے۔ ایک ہی زمین پر بار بار پالش کی جا رہی ہے۔ نئی سرزمین کھوجنے کی کوشش بہت کم نظر آتی ہے۔

اُردو ادب کے کچھ مہلک رجحانات جو اس برس زیادہ نمایاں ہوتے ہیں اور زیادہ زور پکڑ رہے ہیں، اُن میں سے ایک رجحان تو یہ ہے کہ تحریک کی قدر اور فنی خوبی پر کوئی دھیان نہیں دیا جاتا، بلکہ ادیب کی شہرت اور اُس کے مقام کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ اور ان کی تحریروں کا مقام بھی اس لحاظ سے متعین کیا جاتا ہے۔ اُن کی تحریریں ایک بندھی ہوئی ترتیب سے شائع ہوتی ہیں۔ اور ستم تو یہ ہے کہ ہر رسالے میں ناموں کی یہ ترتیب ایک جیسی ہوگی ہے مگر اس ترتیب میں کوئی تبدیلی آتی ہے تو وہ نئے لکھنے والوں کی ترتیب میں۔ کیونکہ ان کو ابھی وہ شہرت نصیب نہیں ہوئی کہ ان کا مقام فہرست میں متعین کیا جا سکے۔ اس کے لئے نقد و نظر سے بے بس ہیں، اور مدیران کلام کی ادبی قدروں سے ناواقف ہونے کے باعث الم غلم چھاپتے رہتے ہیں۔ یہ بدمذاقی اور بھی زیادہ تکلیف دہ ہو جاتی ہے جب یہ لوگ اپنے آپ کو ادب اور زبان کا مسیحا مشہور کرتے ہیں، ان رسالوں میں شائع ہونے والے خطوط پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اردو پڑھنے والے ادبی ذوق سے محروم ہیں یا ابھی بالغ ہی نہیں ہوئے۔

تخلیقی صلاحیت کی کمی کے علاوہ اردو ادب کی پسماندگی کا باعث یہ بھی ہے کہ نقاد اپنے ادب اس کی رہنمائی کرنے کے اہل نہیں۔ افسانے کی صنف کو ہی لیجئے احتشام حسین صاحب کا ایک مضمون، اردو افسانہ، ایک گفتگو (ادبِ لطیف ادبی جشن نمبر) شائع ہوا ہے۔ پہلا مضمون پڑھ جائیے لیکن افسانے کے فن پر ایک جملہ بھی نہیں ملے گا۔ یہ مضمون چوبیس صفحوں پر پھیلا ہوا ہے لیکن افسانے کے فن اس کے جمالیاتی پہلو اور دیگر بنیادی مسائل پر کچھ بھی نہیں ہے، سوائے اس کے کہ افسانوں کا موضوع کیا ہے۔

نقاد جیسے ادسط درجے کے نام گنوا دے گا لیکن جب اچھے افسانہ نگاروں کا ذکر آئے گا تو ہر جوار پیش کرے گا کہ زمانے کی رفتار کا یہی حال ہے کہ جو شخص میدان میں ہے اور مسلسل اپنے آپ کو منوائے جا رہا ہے۔ اسے مانا جاتا ہے۔ اور جو لوگ ذرا ہٹ جاتے ہیں وہ بڑی آسانی سے بھلا دیئے جاتے ہیں یہ نہیں جان بوجھ کر نظر انداز نہیں کیا جاتا ہے (احتشام حسین)

اب کوئی قابل نقاد سے پوچھے، صاحب نقاد کا فریضہ کیا ہے؟ کیا اس کا یہ فریضہ نہیں کہ اعلیٰ ادب کے لئے ذوق کی تربیت کرے اور پست اور اوسط درجے کی تحریروں کو اہمیت نہ دے۔ جو نام بھلائے جا رہے ہیں اگر وہ اعلیٰ ادب کے ضامن ہیں تو انہیں یاد کرانے کی کوشش کی جائے۔ اردو ادب کے ساتھ یہی تو مصیبت ہے کہ جب تک کوئی رسالوں میں چھپتا رہتا ہے چاہے وہ کتنا ہی پست درجے کی تحریریں کیوں نہ پیش کرے وہ ادیب ہے، کیونکہ وہ نظر کے سامنے ہے اور اسے احساس ہے کہ اس کی پست سے پست تحریر بھی شائع ہو کر منظرِ عام پر آ سکتی ہے۔

لیکن اگر کوئی ادیب رسالوں کی دنیا سے باہر کوئی ٹھوس کام کر رہا ہے تو وہ آسانی سے بھلا دیا جاتا ہے اسے جان بوجھ کر نظر انداز نہیں کیا جاتا، ایسی صورت میں اچھے ادب کی اشاعت کا خدا ہی حافظ ہے۔ دو گھنٹے سے زائد عرصے تک جاری رہنے والی اس گفتگو میں خود احتشام حسین صاحب نے فرمایا کہ میں نے اپنی گفتگو میں افسانہ نویسی کے بنیادی مسائل کی طرف آپ کو متوجہ کرایا ہے۔ صاحب قسم لے لیجئے جو انھوں نے اردو افسانہ کے ایک بھی بنیادی مسئلے پر روشنی ڈالی ہو سوائے یہ بتانے کے کہ اس افسانہ نگار کا موضوع کیا ہے اور اس افسانہ نگار نے کس موضوع پر لکھا ہے۔ ادب کے اس معاشی معاشرتی تجزیئے نے اردو افسانے کی شکل ہی بگاڑ دی ہے۔ ایک نقاد نے تو حد ہی کر دی یہ کہہ کر کہ فلاں افسانہ نگار ادب میں ریلوے کی نمائندگی کرتا ہے ادب نہ ہوا ٹریڈ یونین کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہو گیا۔

اس طرح کچھ افسانہ نگار خواتین کا ذکر کیا جاتا ہے اور ان کی خصوصیت یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ متوسط طبقے کے مسلم معاشرے کی سچی تصویر کشی کرتی ہیں۔ مسلم معاشرہ تو اتنی جلدی بدلنے سے رہا، اب آپ مسلسل سچی تصویر کشی کو برداشت کرتے جائیے، ایسے افسانہ نگاروں اور نقادوں کے نزدیک ناول محض کے سوا کچھ نہیں۔ تھوڑا سا ذکر جاگیرداری نظام کے ٹوٹنے کا کر دیا، کچھ ہندوستان کی تقسیم کا۔ لیجئے افسانہ تیار ہو گیا۔ ہمارے ہاں افسانے کو تجزیۂ معاشیات اور سماجیات کی نظر سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ ادیب کی صنف کی حیثیت سے کم۔ احتشام حسین صاحب نے پریچٹ کی مثال دی ہے کہ اس کے ایک افسانے پر جب بہت سے لوگوں نے اسے تعریفی خطوط لکھے کہ اس نے اسپتالوں کی برائیوں اور مریضوں کی پریشانیوں کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا ہے تو پریچٹ نے انہیں سختی سے جواب دیا اور لکھا کہ میرا مقصد ایک اچھا افسانے کی تخلیق کرنا تھا نہ کہ اسپتالوں کی برائیوں اور مریضوں کی پریشانیوں کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنا۔

احتشام صاحب نے اسے انتہا پسند نظریہ قرار دیا ہے لیکن وہ بھول گئے کہ اردو میں مقصدی افسانے لکھنے والے کتنے ناکام افسانے لکھ رہے ہیں اور پریچٹ کا فن کتنا بلند ہے۔ کاش اسے احتشام حسین صاحب انتہا پسندانہ نظریہ قرار دے کر ہمارے افسانہ نگاروں اور قارئین کی توجہ اس اہم امر کی طرف دلا کہ افسانہ فن کی صنعت پہلے ہے اور باقی سب کچھ بعد میں۔

اس غیر ذمہ دارانہ تنقید کی مثال گذشتہ برس شیرازہ میں اردو افسانے پر احتشام حسین کا ایک اور مضمون ہے جس میں انھوں نے افسانہ نگاروں کی ایک طویل فہرست پیش کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ انھوں نے اردو افسانے میں نقشِ پا چھوڑے ہیں۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر افسانہ نگاروں نے ابھی گھٹنوں چلنا بھی نہیں سیکھا۔ نقشِ پا چھوڑنا تو دور کی بات ہے۔ ہاں اردو تنقید میں نقشِ پا کے معنی بدل گئے ہوں تو معلوم نہیں۔

اگر ۱۹۶۳ء کے اردو افسانوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ نتیجہ نکلے گا کہ دو چار افسانوں کو چھوڑ کر اس برس کوئی ایسا افسانہ شائع نہیں ہوا جسے فخر کے ساتھ پیش کیا جائے اور جس سے ادبی ذوق کی تسکین ہو جائے۔ وہی گھسے پٹے پلاٹ۔ ملاحظہ ہو۔ غلام عباس کا افسانہ سرخ پھول اور عابد تبسم کا افسانہ "ماتم" (سویرا ۳۱) کرداروں کی سیاہ سفید تقسیم

سطحی مطالعہ، صحافتی اندازِ فکر، نام نہاد حقیقت پرستی اور نعرے بازی، پسماندہ ترقی پسندی، خواجہ احمد عباس کے افسانے پڑھئیے، یہ نام تو مثال کے طور پر پیش کئے گئے ہیں یہ صورت حال تو تقریباً ہر افسانہ نگار کے ہاں موجود ہے ان افسانوں کے مخاطب وہ لوگ ہیں، جو نیم تعلیم یافتہ ہیں اور جن کا ادبی ذوق تربیت یافتہ نہیں۔

جہاں پرانے لکھنے والے فرسودہ روایتی اندازِ فکر کی پیروی کرتے ہیں وہاں بعض نئے لکھنے والے بدمعنی کا شکار ہیں۔ وجودیت کا فلسفہ تو سمجھ میں نہیں آیا، کامیو کا نام یاد رہ گیا۔ افسانوں میں اس نام کو دہرا کر فرض کر لیا گیا کہ اونچے افسانے کی تخلیق ہو گئی۔ لیکن افسانے کے مستقبل سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے اعلیٰ ادب کی تخلیق ہمیشہ چند تخلیقی ذہنوں کے باعث ہی ممکن رہی ہے اور اعلیٰ ادب سے لطف اندوز ہونے والوں کا دائرہ بھی محدود ہوتا ہے۔ اس لئے ادب کی رفتار کا اندازہ اگر ان چند تحریروں تک ہی محدود رہے تو ایک متوازن رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ ایسی صورت میں ناموں کی پریڈ بے معنی ہے، صرف وہ چند افسانوں کی نشان دہی کرنا ہی کافی ہے، شہر تمنا (خالدہ اصغر)، سمندر (عبداللہ حسین)، برگد کے آنسو (دیویندر ستیارتھی)، پیغمبر کی موت (رام لعل)، اور گل بانو (غلام الثقلین نقوی) چند اچھے افسانے ہیں جو اس برس شائع ہوئے ہیں۔

انتظار حسین، قرۃ العین حیدر، صادق حسین، راجندر سنگھ بیدی، اور اقبال متین نے بھی اچھے افسانے لکھے ہیں لیکن انہوں نے اپنا معیار قائم نہیں رکھا، قرۃ العین حیدر، اپنے ناولوں کی فضا اور کرداروں کی تکرار کو نئے افسانوں میں پیش کر رہی ہیں جس کی مثال ہاؤسنگ سوسائٹی (نیا دور ۳۱ ـ ۳۲) اور دوسرے افسانے ہیں۔

اس سال افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں، جن میں دکیمیاگر (محمد مجیب)، دیا جلے ساری رات، (احمد عباس)، نروان، (جیلانی بانو) شعلے (احمد علی۔ نیا ایڈیشن) اور دامن دام (راجندر سنگھ بیدی، نیا ایڈیشن) شامل ہیں۔

اُردو میں بچوں کے لئے اچھی کتابوں کی بہت کمی ہے۔ خاص کر جو طباعت کے حسن سے بھی آراستہ ہوں، ویسے بچوں کے لئے بے شمار کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اس سال شائع ہونے والی کتابوں میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی، ابو خاں کی بکری، دلچسپ کتاب ہے، جسے ستیش گجرال نے مزین کیا ہے۔ پھول (بچوں کے رسالے پھول کی ۴۰ جلدوں کا انتخاب، مرتبہ غلام عباس)، بچوں کے ادب کی خصوصیات، (مشیر فاطمہ) میں مصنفہ نے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ بچوں کے لئے ادب کی کیا کیا خصوصیات ہونی چاہئیں تاکہ مختلف عمر کے بچوں کے لئے موزوں ادب کی تخلیق کی جا سکے۔

اُردو میں اچھے ناولوں کی تعداد بھی بہت کم ہے۔ زیادہ تر ناول مارکٹ کے نظریئے سے لکھے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں جاسوسی، رومانی، تاریخی، (؟)، اور جنسی ناولوں کی بھرمار ہو گی۔ پاکٹ بکس کی مقبولیت اور ڈائجسٹ ناولوں کی اشاعت نے اچھے ناولوں کی مانگ کو اور بھی کم کر دیا ہے۔

لیکن اس سال ایک ناول ایسا بھی شائع ہوا ہے جس پر اُردو ادب بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ عبداللہ حسین کا اداس نسلیں، سیاسی طور پر اس کا عرصہ ۱۹۱۳ سے ۱۹۴۷ ہے۔ یعنی آزادی کی تحریک کے اولین اہم سال سے لے کر آزادی کے حصول تک۔ لیکن ذہنی طور پر یہ ناول انسانی زندگی کے بڑے اہم دور اور وسیع دائرے کو محیط کئے ہوئے ہے۔ ہندوستان کی سیاسی اور سماجی زندگی کس طرح کرداروں اور واقعات کے میل سے فن کا درجہ اختیار کرتی ہے۔ عبداللہ حسین کا یہ ناول اس کی شاندار مثال ہے۔ نفسیاتی عوامل اور تہذیبی پس منظر میں انسان کے جذبات اور احساسات، اس کی محبتیں، دکھ، درد، نفرتیں، حسد، اور ایثار، فرض اور خود پرستی، خواب اور خواہشیں، ان سب کے تانے بانے سے انسان کی ذہن کی پستی اور بلندی کی جاندار تصویریں اس ناول میں بکھری ہوئی ہیں، جس میں ہمارے ملک کے مختلف افراد اور اہم واقعات رنگ آمیزی کرتے ہیں۔ ہمارے دور کے پیچیدہ ذہن کی فنکارانہ عکاسی، اداس نسلیں کا موضوع ہے جسے مصنف نے بہ کمال ہنرمندی پیش کیا ہے۔

گزشتہ چند برسوں میں جو اچھے ناول شائع ہوئے ہیں، "آگ کا دریا"، کے بعد "اداس نسلیں"، ان سب میں اہم ترین ناول ہے فنی نقطۂ نظر سے اس کا درجہ، "آگ کا دریا" سے بلند ہے، اس سال احمد علی کے انگریزی ناول کا ترجمہ "دلّی کی شام"، شائع ہوا ہے لیکن یہ آج سے بیسیوں برس پہلے کی تخلیق ہے، "آنگن"، خدیجہ مستور کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے، "راہ عمل" (صالحہ عابد حسین) کا ناول بھی اسی سال شائع ہوا ہے جو کہ "شیخ حقیقت پرستی کی روایت کا حامل ہے۔

اردو میں ڈرامے بہت کم لکھے گئے ہیں، زیادہ تر ڈرامے ریڈیو کے لئے لکھے جاتے ہیں، اور جب کسی تحریر کے معیار کے بارے میں شکایت کیجاتی ہے کہ یہ ادنیٰ ہے تو فوراً جواب ملتا ہے کہ ریڈیو کیلئے لکھی گئی ہے گویا کہ ریڈیو سے نشر ہونے والی تحریروں کیلئے اعلیٰ ہونا شرط نہیں۔ بالخصوص ڈراموں کے بارے میں تو خاص طور پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اسٹیج کا خاطر خواہ انتظام نہ ہونے کے باعث زیادہ تر ڈرامے ریڈیو سے ہی نشر کئے جاتے ہیں۔ مرزا ادیب اور ہاجرہ مسرور کے ڈرامے اوسط درجے کے ہی ہوتے ہیں، ہاجرہ مسرور کا ڈرامہ "حسن و عشق"، اور "نند و میاں"، "دنیا دود ۴۲-۴۱" ایک عامیانہ ڈرامہ ہے جس میں فکر و خیال کی گہرائی، تازگی اور نیا پن موجود نہیں۔ "دروازے کھول دو"، کرشن چندر کا طویل ڈرامہ ہے جو ان کے افسانوں سے بہتر ہے، "موت پر فتح"، حیا سال ساز کا ڈرامہ بھی اسی سال شائع ہوا ہے۔

گزشتہ چند برسوں سے اردو میں نئی شاعری کے رجحان کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ نئی شاعری اب خواہش آزادی کی تکمیل، شخصیت کے المیے کا پرتو بنتی جا رہی ہے شاعر نے یہ آگہی حاصل کر لی ہے کہ حالات جس عظیم فنا کی طرف بڑھ رہے ہیں ان میں اگر وہ کسی چیز کی حفاظت کر سکتا ہے تو وہ اس کا عشق، ذاتی رشتہ، نجی بصیرت اور انفرادی صداقت کے لمحے ہیں جو تغیر ناپائیدار ہیں کہ ان کو ابدیت بخشنے کی کوشش اس کی شخصیت کا المیہ بن جاتی ہے۔ یہ لمحے فنا نہیں ہوتے، بلکہ شاعر کے احساس میں جذب ہو کر منظر پر آتے ہیں۔

ان شاعروں کے لئے زیادہ اہم ان کی داخلی دنیا کے تجربے ہیں۔ ماڈرن آرٹ کی طرح نئی شاعری میں بھی اصلی اور مصنوعی کا فرق کرنا بعض اوقات دشوار ہو جاتا ہے۔ نئی شاعری ابھی ارتقائی عمل سے گذر رہی ہے۔ بعض شعرا کے لئے نئی شاعری دور از کار تمثیلوں اور مہمل بے ربط خیالوں کو ذاتی تجربے کے نام پر پیش کرنے کا نام ہے۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اس میں احساس کی گہرائی ہے۔

اس سال اوسط درجے کی روایتی شاعری کا وزن بھی کچھ کم نہیں رہا۔ نئے شاعروں میں نئی سرزمین کھوجنے والوں میں۔ مجید امجد ناصر کاظمی۔ منیر نیازی، بلراج کومل، عادل منصوری، ساقی فاروقی، ظفر اقبال، بمل کرشن اشک، سلیم احمد، وزیر آغا، محمد سلیم الرحمٰن محمود سعیدی کے نام قابل ذکر ہیں، "کلک موج" (عبدالعزیز خالد)، "دشت وفا"، (احمد ندیم قاسمی)، "تغزل" (ظہیر کاشمیری) "وادی گل" رفعت سروش، "فردوس گوش"، (جوش ملیانی)، "مزدور نامہ"، (حسن شہیر)، "رشتۂ دل"، (بلراج کومل)، کے علاوہ اس سال نظم و غزل کے کئی اور مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں لیکن "رشتۂ دل"، ان میں اہم مجموعہ ہے جس میں نئی شاعری کی بصیرت کو شاعر نے اپنے منفرد حساس طرز میں پیش کیا ہے۔

اس سال اختر الایمان کو ان کی تصنیف "یادیں"، پر ساہتیہ اکادمی نے انعام دیا ہے، اختر الایمان اردو کے چند گنے چنے اچھے شاعروں میں سے ہیں۔

"نظم جدید کی کروٹیں"، ڈاکٹر وزیر آغا، اردو نظم پر ایک مستقل کتاب ہے، ان کا مشہور مضمون "نظم اور اس کا پس منظر" بھی شامل ہے یہ کتاب جدید اردو شاعری پر ایک اہم ناقدانہ تبصرہ ہے، نئی شاعری کی بنیادی اصلیت کو کھوجنے کی مخلصانہ کوشش ہے۔ اور نئی شاعری کیلئے ذوق کی تربیت کا اہم فریضہ سر انجام دیتی ہے، اردو کے ٹیڈی شاعر ظہیر کاشمیری، ڈاکٹر وارڈ اور مولانا حالی سلیم احمد، اردو شاعری پر دلچسپ مگر فکر طلب کتابیں ہیں

چند نظمیں اور کئی اشعار ایسے ہیں جن کو ذہن بار بار دہراتا ہے لیکن عادل منصوری کا ایک شعر معلوم نہیں کیوں بار بار ذہن میں لپک رہا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو۔

جسم کے کالے جنگل میں   لذت کا چیتا لپکا

اُردو میں کوئی ایسا نقاد نہیں جو اوریجنل بھی ہو اور تخلیقی بھی۔ جس نے ادب اور فن کے بارے میں کسی ایسے نئے نظریے کو پیش کیا ہو جو اس سے پہلے رائج نہ ہو یا مغربی نقاد پیش نہ کر چکے ہوں۔ ہمارے نقادوں کو صرف دو نام یاد ہیں۔ مارکس اور فرائڈ۔ اس کے بعد جیسے انسانی فکر پر تالے پڑ گئے ہوں۔

ایک زمانے میں جب ترقی پسندی کا رواج تھا، تو ادب اور حقیقت' ادب اور انقلاب' ادب اور سماج' ادب اور عوام قسم کے مضامین لکھے جاتے تھے۔ لیکن ان مقالوں کا موضوع اور مواد یکساں ہوتا تھا۔ صرف عنوان بدل جاتا تھا۔ اور مختلف نقاد ایک بات کو بار بار دہراتے تھے جیسے ادب اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے، ادب زندگی کا آئینہ دار ہے۔ اگر زندگی میں جمود ممکن نہیں تو ادب میں جمود کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ لیکن جن دو باتوں کا رشتہ بڑے زور شور سے قائم کیا جاتا تھا وہی تشریح طلب تھیں۔ یعنی ادب اور زندگی۔ حسن عسکری نے منفرد انداز نظر پیش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اسے ملعون قرار دیا گیا۔

اُردو میں تحقیق برائے نام ہے۔ تحقیق کے نام پر مردوں کے کفن پھاڑے جاتے ہیں۔ عملی تنقید قریب قریب ناپید ہے۔ جدید ادب پر تنقید جائزے کی حد سے آگے نہیں بڑھتی۔ اور مضمون ناموں کی فہرست کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اور بے چارہ نقاد اس پر بھی معذرت چاہتا ہے کہ فہرست نامکمل ہے، کچھ نام رہ گئے ہیں، جیسا کہ نام گنوانا ہی تنقید کا مقدس ترین فریضہ ہے۔ ہم عصر ادب پر ناقدانہ نظر ڈالنا انتہائی مشکل کام ہے۔ اس لیے نقادوں کو اس میں تن آسانی معلوم ہوتی ہے کہ کلاسکی ادب پر کچھ لکھا جائے۔ اس لیے کلاسکی ادب کے بارے میں جوش بڑھ گیا ہے ہم عصر ادب کے مطالعہ سے تنقید کے اصول اخذ کرنا، اور اُس کی صحیح پرکھ کرنا، بڑی عرق ریزی کا کام ہے۔ چند بندھے ٹکے اصولوں پر ادب کی پرکھ کرنا زیادہ آسان ہے، چاہے کارآمد ہو یا نہ ہو۔

ادب کے کوئی سکہ بند اصول نہیں ہوتے کہ آپ ادبی تحریروں کو ناپتے اور فیصلہ دیتے رہیں۔ فراق گورکھپوری تاثراتی انداز کی تنقید کو رواج دے رہے تھے۔ لیکن اب انھوں نے بھی اسی فرسودہ روایتی انداز تنقید پر عمل شروع کر دیا ہے۔ اس سال اُن کا ایک مضمون شایع ہوا ہے "اُردو ادب کی رفتار" اس میں وہ تمام برائیاں موجود ہیں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ وہی فہرست نگاری' وہی جائزہ قسم کی سطحی و فروعی باتیں۔

فراق صاحب نے اس مضمون میں ایسے کئی ادیبوں کے نام لیے ہیں، جنھوں نے پچھلے کئی برسوں سے لکھنے پڑھنے کا دفتر بند کر رکھا ہے اور ایسے نام جن کے بارے میں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ فراق صاحب نے اُن کی ایک بھی تحریر نہیں پڑھی۔ یہ روایت بڑی مستحکم ہے کہ کتابوں کے دیباچے اور تبصرے بغیر پڑھے لکھے دیے جائیں۔ اور بڑے بڑے نقاد تو اس کام میں اب پیشہ ورانہ ہنر حاصل کر چکے ہیں۔

مصنفین کی انا پست سطح پر آ چکی ہے کہ چند توصیفی جملے سن کر تسکین پا جاتی ہے۔ انھیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ [illegible] کی تنقید رائے رسمی اور جھوٹی تحسین سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ لیکن یہاں لوح و قلم کی تقدیس کا نعرہ لگانے والے بہت ہیں مگر انھیں لوح و قلم کی تقدیس کا پاس نہیں ہے۔ ذکر فراق صاحب کے مضمون کا تھا۔ انھوں نے آزادی کے بعد کے اُردو ادب کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا ہے:-

"ایک نئی حقیقت نگاری کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ان تخلیقات میں نہ صرف ایک نیا لب و لہجہ، نیا خیال، نیا شعور ملتا ہے بلکہ فکر و نظر، ادراک و احساس اور ان کے اظہار کی نئی تکنیک بے حد متاثر کرتی ہے۔"

کیا فراق صاحب کبھی اس پر روشنی ڈالنے کی زحمت گوارا کریں گے کہ جن ادیبوں کے نام [illegible] ایسی نئی تکنیک ہے جو انھیں بے حد متاثر کرتی ہے۔ کون سا نیا لب و لہجہ، نیا خیال [illegible]

صورت دکھائی دیتی ہے جو آزادی سے پہلے کے ادب سے مختلف ہے۔
ادب کی تنقید خارجی، معاشی اور سیاسی واقعات سے کرنا نہایت ہی غیر ادبی طرز تنقید ہے۔ ادب میں رجحانات تو تاریخ کے ادوار کے باعث ہیں ادیب کی انفرادیت کے باعث فروغ پاتے ہیں۔ جن ادیبوں کے نام فراق صاحب نے گنوائے ہیں۔ اُن میں سے کتنے ایسے ہیں جو نئے لفظ کے حق دار ہیں۔ ان کی تحریروں میں حصولِ آزادی سے پہلے کے انداز فکر اور طرز تحریر میں کوئی فرق نہیں۔ اگر کوئی تبدیلی آئی ہے تو وہ ہے ادب اور غیر ادب کے فرق کو مٹا دینے کی کوشش۔ فراق صاحب نے تحریر کیا ہے :-

"ادبی تنقید اور تاریخ ادب کے میدانوں میں بھی نظریاتی اور اخلاقی اعتبار سے اُردو ادب نے شاندار پیش قدمی کی ہے۔
صاحب فکر و نظر نقادوں کی طرح تنقید اور ادبی تنقید کے اصولوں سے عمدہ آگاہی کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ اس سے پہلے کسی زمانے میں
اُردو تحریروں کے اس قدر متاثر کن مظاہر نظر نہیں آتے۔"

فراق گورکھپوری نے اُردو تنقید اور تحقیق کے شعبے میں جو خراج پیش کیا ہے وہ کتنا گمراہ کن ہے۔ یہ رشید حسن خان کے مضمون "علی گڑھ تاریخ ادب اُردو" سے صاف عیاں ہو جاتا ہے۔ یونی ورسٹی گرانٹ کمیشن کی گرانٹ پر علی گڑھ یونی ورسٹی کی اسکیم کے تحت یہ تاریخ ادب اردو مرتب کی گئی ہے۔ جس کے ڈائرکٹر ہیں پروفیسر آل احمد سرور۔ اور اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہیں جناب مجنوں گورکھپوری۔
اپنی طرف سے کچھ کہے بغیر رشید حسن خان کے مضمون سے کچھ اقتباس پیش کرنا ضروری ہے۔ حالاں کہ پورا مضمون اس قابل ہے کہ اسے نقل کیا جائے۔ تاکہ معلوم ہو سکے کہ ادب کے نام پر کیا کیا ستم ڈھائے جا رہے ہیں۔ اور اگر یہی ترقی ہے تو زوال کسے کہتے ہیں۔
رشید حسن خاں رقم طراز ہیں :-

"اس تاریخ کو پڑھ کر پہلا تاثر یہ ہوتا ہے کہ غالباً غلط نگاری کے کسی مقابلے میں حصہ لینے کے لیے اسے مرتب کیا گیا ہے۔
درحقیقت اس (تاریخ) کو ایسے مضامین کا مجموعہ کہنا چاہیے جن میں نہ باہم ربط ہے، نہ تناسب و توافق۔ اس کے بجائے متضاد بیانات، غیر متعلق تفصیلات، غلط سنین اور غیر معتبر اقتباسات کی فراوانی ہے۔ ہمارے یہاں ناموں سے مرعوب کرنے کا اچھا خاصا رواج ہے۔ اس کا نتیجہ بعض وقت بے حد عبرتناک ہوتا ہے۔ کچھ مشہور افراد کا نام لکھ کر یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ ترتیب و تدوین کے سارے تقاضے بھی پورے ہو گئے۔ اور ہر قسم کی بے احتیاطی کے جواز کا منشور ہاتھ میں آگیا۔ یہ کتاب اس کی سب سے اچھی مثال ہے۔"

رشید حسن خاں نے اپنے اشارات کے ثبوت میں متعدد مثالیں پیش کی ہیں۔ کس طرح مختلف مضمون نگاروں نے سن ولادت ......
...... اور سن وفات مختلف اور متضاد دیے ہیں۔ اور ایک ہی مضمون نگار نے مختلف مقامات پر مختلف سنین دی ہیں۔ ایسی غیر متعلق باتوں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جن کا زبان و ادب کے ارتقاء سے کوئی تعلق نہیں۔ بیشتر اشعار غلط درج کیے گئے ہیں۔ افراد و کتب کے نام مختلف مقامات پر مختلف ہیں۔ اشاریہ غلط نگاری کا عبرتناک نمونہ ہے۔ صحیح لفظ کو غلط بتا کر اس کی تصحیح کی ہدایت کی گئی ہے۔ یعنی اُسے غلط قرار دیا ہے۔
اپنے مضمون کے اختتام پر فاضل مصنف نے لکھا ہے:-

"یہ کتاب علی گڑھ یونی ورسٹی کی پیشانی پر ایک بدنما داغ ہے۔ اور طلبہ کو گمراہ کرنے کی منظم کوشش۔ تاریخ ادب کی کتاب میں لکھے ہوئے کسی واقعہ کا اگر حوالہ نہ دیا جا سکے، اس میں درج شدہ تاریخوں پر اعتبار نہ کیا جا سکے، اس کے اقتباسات کی صحت مشکوک ہو، جن تحریروں سے زبان کے آغاز و ارتقاء پر استدلال کیا گیا ہو، اُن کا انتساب ہی محتاج ثبوت ہو اور تضاد بیان سے پوری کتاب بھری ہو تو آخر اس کتاب کا مصرف کیا ہوگا؟"

مشہور اور سکہ بند نقادوں کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ کہنا لا حاصل ہیں۔ ایسی جامد، بے حرکت، بے جان، مردہ روایت پرستی کے مائل بے معنی مسلک تنقید سے بیزار ہو کر کچھ نوجوانوں نے تنقید میں خیال اور طرز کو بدلنے کی ضرورت محسوس کی ہے۔ سلیم احمد کے مضامین اس سلسلے میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ان مضامین کا انداز نام نہاد ادبی ذوق رکھنے والوں کی طبع نازک پر گراں گزرے گا۔ لیکن ان کے پیچھے جو جذبہ ہے اُس کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ادبی بردباری، رواداری، شرافت اور آدابِ مجلس کا مطلب ہے کہ مردے کو گھر میں رکھ چھوڑو اور ریشمی لباس پہنا کر اس کے سڑنے کی بدبو برداشت کرتے رہو۔

ادب اور شعور (سلیم احمد۔ نیا دَور کراچی شمارہ ۳۰۔۲۹) دو جبلتوں کی جنگ میں کلیہ بازی (شمیم احمد۔ نیا دَور کراچی ۳۰۔۲۹) تنقید ہماری کس ضرورت کو پورا کرتی ہے؟ (مظفر علی سید ادبِ لطیف جنوری) ترقی پسند ادب اور شعور ماضی، (مظفر علی سید۔ ادبِ لطیف سالنامہ) نئی تنقید اور آدھا آدمی، (مظفر علی سید۔ سلیم احمد کی کتاب 'نئی نظم اور پورا آدمی' پر تبصرہ وغیرہ میں تنقید کے نئے رجحان کو دیکھا جا سکتا ہے۔ شاید لوگ اُنھیں ٹیڈی نقاد کہتے ہیں۔ لیکن انھوں نے سکہ بند نقادوں کو مدافعت پر مجبور کر دیا ہے۔ ادیب کی ذمہ داری (جمیل جالبی، صباحی (?) کراچی) کفارہ گناہ۔ عورت کا تصور منٹو کے افسانوں میں (ممتاز شیریں۔ ادبِ لطیف سالنامہ) ایک عالم افسانہ نگار ممتاز شیریں۔ (مظفر علی سید نصرت، مارچ) ہاجرہ مسرور کی کتاب "تیسری منزل" پر ممتاز شیریں کا تبصرہ (نیا دَور۔ کراچی ۳۰۔۲۹) جدید شاعری کے جمالیاتی اصول (ممتاز حسین (?) ادبِ لطیف۔ سالنامہ) اس سال کے اہم مضامین ہیں۔ ممتاز حسین کے مضامین غور و فکر کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اور پڑھنے والوں کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔

اس سال کئی تنقیدی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ تاریخی جائزے (محمد یاسین) عکس اور آئینے، اور افکار و مسائل (احتشام حسین) پریمی کے خطوط (مجنوں گورکھپوری) اور [illegible] مطالعہ (اسلام سندیلوی) ادبی تنقید اور ناول، (محمد احسن فاروقی) اس کتابوں میں شامل مضامین رسالوں وغیرہ میں شایع ہوتے رہتے ہیں۔ ادبی مسائل پر جو بحث کی گئی ہے۔ وہ نقادوں کی مخصوص غور و فکر اور طرزِ نگارش کو ہی پیش کرتے ہیں۔ اور ان میں نشوونما کی کیفیت کم ہی نظر آتی ہے۔

سنجیدہ اہلِ قلم حضرات نے ادبی اور کلچرل مسائل پر بھی غور کیا ہے۔ ان کا نقطۂ نظر ایک دوسرے سے الگ اور بعض اوقات متضاد رہا ہے۔ وہ مسائل پر سنجیدگی سے بحث کرتے ہیں۔ اعجاز حسین بٹالوی، محمد حسن عسکری، جیلانی کامران، انتظار حسین، سجاد باقر رضوی فراق گورکھپوری اور وزیر آغا نے کلچرل مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انتظار حسین کے نزدیک پاکستانی قوم کی تہذیب تقسیم کے بعد جنم لیتی ہے۔ اور وہ مسلم جاگیردارانہ نظام کی قدروں اور روایتوں کو مہذب زندگی کے لیے لازمی قرار دیتے ہیں۔ کبوتر بازی اور پتنگ بازی ان کے لیے اخلاقی اور تہذیبی تجربے ہیں۔

'ادبِ لطیف' میں اپنے اداریل اور 'سویرا' ۱۳ میں شایع اپنے مضمون 'ہمارے عہد کا ادب' میں انھوں نے ان مسائل پر غور کیا ہے۔ اسلام اور مائتھالوجی (جیلانی کامران۔ ادبِ لطیف جنوری۔) میں اسلام کے لیے مائتھالوجی کی تلاش یا تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاکہ پاکستانی تہذیب کی نشوونما ہو سکے۔ جب کہ اعجاز حسین بٹالوی ہندوستانی تہذیب کی روایت کو موہن جو دڑو اور ہڑپا سے تلاش کرتے ہوئے نئے ملک پاکستان کی تہذیب کا تسلسل اس سے جوڑتے ہیں۔ ان کا مضمون 'فاقہ کش بدھ' اس سلسلے کا ایک اہم مضمون ہے، جو تہذیبی مسائل پر سنجیدہ اور متوازن فکر کی دعوت دیتا ہے۔ اس سے پہلے حسن عسکری نے اسلامی ادب کا مسئلہ چھیڑا تھا۔ اور فراق گورکھپوری نے اسی پر سیر حاصل بحث کی تھی۔ انتظار حسین کے مضمون کا جواب انور عظیم نے 'چشم زدن میں' (تلاش۔ دہلی میں) بڑی خوبی سے دیا ہے۔ لیکن اس ساری بحث کا تنہا جواب قرۃ العین حیدر کا ناول "آگ کا دریا" ہے۔

ہماری جڑیں کہاں ہیں؟ اس تلاش کا عمل آج کے ادب کے لیے بڑا اہم ہے۔ کلچر کے مسائل پر ثنویت، (وزیر آغا۔ ادبی دنیا، دورِ پنجم، شمارہ نہم) پاکستانی کلچر کا مسئلہ (وزیر آغا۔ سیپ۔ کراچی شمارہ ۱) نظر طلب مطالعہ ہیں۔

چند روشن مثالوں کو چھوڑ کر اُردو ادب کی موجودہ روش اور رفتار دیکھتے ہوئے ہم صرف یہی دعا کر سکتے ہیں کہ خدا ہمیں عزم وقوت دے کہ ہمارے ناتواں کندھے اُردو کی منوں بھاری مردہ تحریروں کے بارِ گراں کو مرگھٹ تک پہنچا سکیں۔ تاکہ ہمارے بچے اس سے نجات پاکر آزاد فضا میں اعلیٰ ادب کی تخلیق کے فریضہ کو سرانجام دے سکیں۔ اور اُن سے لطف اندوز ہو کر روحانی مسرت حاصل کریں۔

عتیق۔ کراچی

ہربنس دوست

سریتا۔ نئی دہلی

موڈ خراب ہے

کیا آپ بھی کبھی ایسے موڈ کا شکار ہوتے ہیں کہ ہر طرف آپ کو تاریکی ہی تاریکی دکھائی دیتی ہے۔ دُور دُور تک روشنی کی کوئی ٹمٹماتی ہوئی شمع نظر نہیں آتی۔ سارے رشتہ دار، سارے دوست احباب اور ساری دنیا آپ کو اپنے خلاف نظر آتی ہے۔ اور ایسے میں اپنی زندگی اپنا وجود بھی بے مقصد اور غیر ضروری محسوس ہوتا ہے۔

میرے ایک دوست ہیں جن کو ہمیشہ یہ شکایت رہتی ہے کہ دنیا میں اُن کا کوئی نہیں ہے۔ اور کوئی انھیں خوش دیکھنا نہیں چاہتا۔ بعض اوقات تو ان کا موڈ اس قدر خراب ہوتا ہے کہ کوئی اُن سے بات کرے تو وہ اُسے کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ اور سارا سارا دن اپنے آپ کو کمرے میں بند رکھتے ہیں۔

اس شام اگر کوئی انھیں ملے تو وہ برسوں کے بیمار لگتے ہیں۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دنیا میں وہ کسی کام کو کرنے کے لائق ہی نہیں ہیں۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ ورثے میں اُن کو اچھی خاصی دولت اور ایک پھلتا پھولتا کاروبار ملا ہے۔ اور دیکھا جائے تو اُن کی مایوسی اور قنوطیت کی کوئی وجہ ہونی ہی نہیں چاہیے

اگر آپ بھی اکثر ایسے موڈ کے شکار ہو جاتے ہیں، تو خدارا اُسے نظر انداز نہ کیجیے۔ یہ بڑا خطرناک وقت ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ آنے والے دن آپ کو کئی ناکامیوں سے دوچار کرائے۔ اور صرف آپ ہی نہیں وہ تمام لوگ جو کسی نہ کسی طرح آپ سے منسلک ہیں اس کا خمیازہ بھگتیں۔

لیکن بجائے اس کے کہ ایسا موڈ آپ پر حاوی ہو، اگر آپ اس موڈ پر حاوی ہو جائیں، اُس کی وجہ سمجھنے کی کوشش کریں۔ اور غور اور کوشش سے اُسے جیت لیں تو یہیں سے آپ کی زندگی کی ابتدا بھی ہو سکتی ہے۔ اور صلے میں آپ کو ایک گونا گوں مسرت، ذہنی آسودگی اور دوستی کی الفت کا خزانہ بھی مل سکتا ہے۔

سب سے پہلے آپ یہ یقین کر لیجیے کہ آپ کے اس طرح کے موڈ کی ابتدا آپ کے تحت الشعور میں یہ خیال ہے کہ آپ کسی کام کے لائق نہیں۔ اور آپ کا وجود بے کار ہے۔

اگر آپ کا ذہنی ایکسرے لیا جا سکے یا آپ بیتے دنوں کے ہر لمحے کو کسی طرح ایک بار پھر دیکھ سکیں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ ایسے ہی کسی خیال کو آپ بچپن سے پال پوس رہے ہیں کہ آپ کی کوئی ضرورت نہیں، آپ نا اہل ہیں، آپ میں کوئی اچھائی نہیں۔ اور آپ ناقابلِ قبول ہیں۔

جن دوست کا میں نے شروع میں ذکر کیا ہے اُن کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ انھیں ہمیشہ یہی یقین رہتا ہے کہ ساری دنیا اُن کے

ہے کوئی اُن کی کامیابی یا خوشی پر خوش نہیں ہوتا۔ تنہائی میں یہ موڈ اُن پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اور لوگوں کی صحبت میں وہ اپنے آپ کو بیگانہ محسوس کرتے ہیں۔

ایک بار اُنھوں نے مجھے بتایا کہ اُن کے پیدا ہوتے ہی اُنھیں ماں سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ کیوں کہ وہ سخت بیمار تھی۔ کئی ماہ تک دیکھ بھال ایک نرس ہی کرتی رہی۔

اس عمر میں ایک بچہ یہ کبھی نہیں سوچتا کہ اگر اُس کی ماں نے اُسے الگ کر دیا ہے تو وہ ایک بُری عورت ہے، بلکہ اُسے ہمیشہ یہی خیال تمنے لگا کہ وہ بُرا اور بے کار ہے۔ اسی لیے اُس کی ماں اُسے پسند نہیں کرتی۔ اگر اس احساس کو مناسب طریقے سے جلد ختم نہیں کیا گیا تو اس کی ساری شخصیت اسی محور پر گھومنے لگتی ہے۔ بچپن میں وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کی ماں اُسے پسند نہیں کرتی۔ بڑا ہونے پر یہ کہ دنیا اُسے پسند نہیں کرتی۔ لوگ اسے حقارت سے دیکھتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو حقارت سے دیکھتا ہے۔

بچپن میں ہی میرے اِن دوست کو اپنی ماں کی علالت کی وجہ سے ہمیشہ ڈانٹ پڑتی تھی کہ وہ اونچا نہ بولے، شرارتیں نہ کرے اور چپ چاپ اپنا کام کرے۔ اُس وقت کسی نے اندازہ بھی نہیں لگایا ہوگا کہ بچّے کی شخصیت پر کیا اثر پڑے گا، جب کہ اِن چند سالوں نے اس کی شخصیت کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔

اب بھی اس کی کیفیت وہی ہے۔ زندگی کا جوش و خروش رنگینیاں ہنسی، خوشی، مسکراہٹ، قہقہے اس کی زندگی میں عنقا ہیں۔ اب تک میرے اِن دوست کی زندگی میں کوئی لڑکی نہیں آئی۔ کیونکہ وہ کبھی اظہارِ پسندیدگی کر ہی نہیں سکا۔ محض اس خوف سے کہ پتہ نہیں اس کا نتیجہ کتنا خطرناک نکلے۔ دیکھا جائے تو اس کی بچپن کی زندگی، اور اب کی زندگی میں ذرا بھی فرق نہیں پڑا۔ اُس کے دیکھنے، سوچنے، اور سمجھنے کا ڈھنگ اب تک وہی ہے۔

اگر بچپن میں بچّے کے دل میں یہ بیٹھ جائے کہ اُس کے ماں باپ، رشتہ دار، پڑوس یا اسکول کے اساتذہ اُسے پیار نہیں کرتے۔ تو اس کے اندر احساسِ نااہلیت کا جنم لے لینا عین فطری ہے۔ اس کے بعد زندگی میں اُسے شکست اور مایوسی کا منھ دیکھنا پڑتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ واقعی نااہل ہوتا ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ وہ شکست کھائے گا۔ کیونکہ کوئی اُسے پسند نہیں کرتا۔

کوئی بھی شخص جو کہ ایسے موڈ کا شکار ہو جاتا ہے۔ اپنی قوتوں کو آگے بڑھنے، سیکھنے اور ترقی کرنے میں صرف نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کی ساری قوتیں اپنے آپ پر ترس کھانے، خیالی قلعے بنانے، ناممکن باتیں سوچنے۔ اندر ہی اندر کڑھنے اور اپنے آپ پر لعنت ملامت کرنے پر صرف ہوتی ہیں۔ یا اُن سے انتقام لینے کے جذبے کو اُبھارنے میں، جن سے اُسے شکایت ہو کہ وہ اُسے نظر انداز کرتے ہیں۔

چوں کہ ایسے موڈ میں ہم کوئی تعمیری بات سوچنے کی بجائے یا تو اپنے پر ترس کھاتے رہتے ہیں یا دوسروں سے انتقام لینے کے ناکام پلان بناتے رہتے ہیں۔ اس لیے ہمیں اس میں مزا آنے لگتا ہے اور دھیرے دھیرے یہ عادت بن جاتی ہے۔

ایسے موڈ میں چاہے آدمی بیٹھا ہو یا لیٹا یا کسی کام کو کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کے خیالات مستقل طور پر یہی رہتے ہیں۔ اور وہ چاہتا بھی یہی ہے۔ حالاں کہ وہ انھیں سے تباہ ہو رہا ہوتا ہے۔ ٹھیک اس طرح جس طرح جھوٹ کی غذا جھوٹ، پاپ کی غذا پاپ ہوتی ہے ویسے موڈ کی غذا بھی ویسا موڈ ہی ہوتی ہے۔

عادت بن جانے کے بعد جب بھی زندگی کے کسی راستے پر ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ ہمیں اس کے لیے زیادہ قابل ہونا چاہیے تھا۔ ہم بجائے قابلیت بڑھانے کے اپنی شکست کا تصور کرنے لگتے ہیں۔ اور دوسروں سے جلنے لگتے ہیں۔

اب جب کہ ہمیں پتہ چل ہی گیا ہے کہ اس قسم کے موڈ کی وجہ احساسِ نااہلیت کے علاوہ کچھ نہیں ہوتی تو ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ اِس

احساس کو ہی دل سے نکال دیں۔

بلاشک اب ہم اپنا بچپن واپس نہیں لاسکتے کہ اسے حسبِ ضرورت گذار سکیں۔ اور جو کمیاں رہ گئی تھیں انھیں پورا کرلیں۔ تاکہ یہ بُرا احساس ہماری زندگی سے نکل جائے۔ لیکن اگر آپ کوشش کریں تو اس احساس کی جڑ تک اب بھی پہنچ سکتے ہیں۔ اور اُسے ختم کرنے کے ذریعے بھی سوچ سکتے ہیں۔

ذہن نشین کر لیجیے کہ آپ کسی سے کم نہیں ہیں۔ بچپن آپ نے کیسے بھی گزارا ہو، اس عہد میں آپ پر پیار کے پھول نچھاور ہوئے ہوں یا نہیں آپ کو عزت ملی ہو یا نہیں، پھر بھی آپ اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کر سکتے ہیں۔ اَن گنت مثالیں ہیں دنیا کے عظیم آدمیوں کی، جن کا بچپن قابلِ رحم تھا۔ لیکن بڑے ہو کر نہ صرف وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوئے بلکہ ساری دنیا کو انھوں نے راستہ دکھایا۔

لہٰذا اگر آپ میں بھی خود اعتمادی ہے اور اپنے حالات کا جائزہ لے کر اگر آپ صحیح اقدام کر سکتے ہیں تو آپ کے پاس بھی دنیا کو دینے کے لیے بہت کچھ ہے۔ آپ کی بھی دنیا کو ضرورت ہے بشرطیکہ آپ دنیا والوں کے کام آنا چاہیں۔

جیسے ہی آپ میں خود اعتمادی کے احساس نے جنم لیا آپ کی صلاحیتیں پہلے سے کئی گنا بڑھ جائیں گی۔ اور ساتھ ہی آپ کی دل کشی بھی۔

یہ حقیقت ہے کہ کوئی آپ کا دل نہیں توڑ سکتا، اگر آپ خود اسے توڑنے پر نہیں تلے ہوئے ہیں۔ فراخ دلی سے اپنے اندر جھانکیے اور صدق دلی سے اقرار کیجیے تو آپ کو پتہ چلے گا کہ اب تک آپ بالکل بچوں کی طرح سوچتے اور جیتے رہے ہیں۔ اب آپ کو بالغ ہونا ہے۔ بچپن کی محرومیوں کو بھول جائیے۔ اور اب آپ کے سامنے جو کچھ ہے اُس کی قدر کرنے کی کوشش کیجیے۔

اس طرح کے خراب موڈ کی عادت آپ ایک دن میں ختم نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے آپ کو مستقل کوشش کرنی پڑے گی۔ اُن اوقات کو نوٹ کیجیے جب آپ خصوصاً خراب موڈ کے شکار ہوتے ہیں، اور اُن لمحوں میں اپنے آپ پر قابو پانے کے لیے اپنی تمام تر قوتیں صرف کر دیجیے۔

صبح کے وقت خاص طور پر ایسے موڈ سے بچیے، کیونکہ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب تحت الشعور کے خیالات ہمیں جکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر ہم اس وقت اپنے آپ کو نہیں سنبھال سکے تو دن کی ابتدا ہی بد دلی سے ہو گی۔ اور دن بھر کوئی کام ہم خوش دلی اور خود اعتمادی سے نہ کر سکیں گے۔

اس لیے ہر دن کو یہی سوچ کر شروع کیجیے کہ یہ بڑا اہم ہے۔ اس میں آپ کل سے بہتر ہوں گے۔ اور یہ دن آپ کو آپ کی منزل کے اور قریب لے آئے گا۔ آپ یقین کیجیے محض یہ احساس ہی آپ کو آدھا کامیاب کر دے گا!

جب بھی آپ کو یہ احساس ہو کہ کوئی دوسرا آپ کی راہ میں روڑا اٹکا رہا ہے۔ اور آپ کو نیچا دکھانے کی کوشش کر رہا ہے تو کڑھنے کی بجائے اپنے آپ میں ہمت پیدا کیجیے۔ اور شکست کھانے سے انکار کیجیے۔ یقین مانیے کہ عام طور پر لوگ اچھے ہوتے ہیں۔ اور اگر آپ انھیں پسند کرنے کا موقع دیں تو وہ آپ کو ضرور پسند کریں گے۔

جتنی قوت اب تک آپ حسد، بغض، انتقام اور خود ملامتی پر صرف کرتے رہے ہیں وہ ساری قوت اب اپنے آپ کو اور حالات کو بہتر بنانے میں لگا دیجیے۔ ہو سکتا ہے بعض اوقات سب کی طرح آپ کے ساتھ بھی ناانصافی ہوئی ہو لیکن آپ کو چاہیے کہ اپنے آپ کو اس احساس سے تباہ نہ کریں۔ بلکہ پورے غور و فکر سے یہ جاننے کی کوشش کریں کہ اس کی وجہ کیا تھی۔ آپ کی کیا غلطی تھی اور آپ اُسے کس طرح دُور کر سکتے ہیں؟

اگر کسی سے آپ کو بالکل جائز شکایت ہے۔ اور اُس کو بھلا دینا معاف کر دینا آسان نہیں ہے تو بجائے کوئی مخالف قدم اُٹھانے کے اُس سے کہہ دینے کی ہمت پیدا کیجیے۔ اگر یہ بھی ممکن نہیں تو مقابلے میں آنے سے پہلے دیکھ لیجیے کہ آپ کا یہ قدم صحیح ہے یا نہیں۔ اور اگر صحیح ہے تو آپ کے پاس مخالفت کے لیے ساری تیاریاں اور ثبوت موجود ہیں یا نہیں۔

کوئی بھی نیا قدم اُٹھانے سے پہلے سب کچھ پلان کر لیجیے۔ اور قدم اُٹھالیں تو کسی طرح کے خوف کو نزدیک نہ آنے دیں۔

اگر آپ نے ایسے خراب موڈ سے چھٹکارا پانے کے لیے کوئی تعمیری طریقہ ڈھونڈ لیا تو آپ کو بہت جلد پتہ چل جائے گا کہ خوشی اور مسرت

کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں۔ مسرت اس طرح سے ہرگز نہیں ملتی۔ اگر آپ خوشی کے لیے دوسروں کی مدد کے طالب ہیں تو آپ کو مایوس بھی کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ اکثر ہوتا ہے۔ تب آپ کو پھر احساسِ شکست یا احساسِ کمتری ہوگا۔ اور نتیجۃً آپ ایسے موڈ کے شکار ہو جائیں گے۔

دوسروں کے سہارے جینے یا آگے بڑھنے کی امید کرنا بالکل ایسے ہی ہے جیسے بچہ ہر چیز کے لیے اپنے بڑوں کی طرف دیکھتا ہے۔

خوشی دراصل کامیابی اور ذہنی سکون سے ملتی ہے۔ بقول ڈاکٹر نارمن وینسینٹ پیلے "خوشی ذہن کی عادت ہے" اور یہ تب ہی مل سکتی ہے جب آپ کی تمام تر قوتیں زندگی کے روشن پہلو سے متعلق ہی سوچیں۔ اور ذہن میں کسی طرح کا احساسِ نااہلیت یا احساسِ کمتری نہ ہو۔ ہنستے کھیلتے مشکلوں سے دوچار ہونے اور ہر موقع پر اپنے آپ میں ہمت اور اعتماد رکھنے سے ہی اس خوشی کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اس لیے ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے آپ کو خراب موڈ میں مبتلا نہ ہونے دیجیے۔ کیونکہ اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو آپ اپنے آپ کو، اپنی شخصیت اپنے ذہن اور اپنی صلاحیتوں کو زہر دے رہے ہیں۔

منظور شدہ محکمہ تعلیمات کراچی بموجب سرکلر نمبر ڈی/۱۶/اے آر بی ای/۸۰۳ [illegible] مورخہ ۲۶ ستمبر ۱۹۶۰

اردو ادب کا ڈائجسٹ

نقش کراچی

۶ — ۶۴

جون ۶۴

ادارہ

شاہد احمد دہلوی ــ شمس زبیری

قیمت
ایک روپیہ

سالانہ
بارہ روپے

کاشانۂ اردو، پوسٹ بکس ۷۳۰۲ کراچی ۱

فون — ۷۰۱۵۶

ترتیب

افسانے

طنز و مزاح

منظومات

مضامین

چند اہم کتابیں

"چند شخصیتیں چند تاثرات"

ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ دورِ عصرِ حاضر کے تنقید نگاروں میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ اور اب تو ان کا نام عظمت و بزرگی کے ساتھ ساتھ پیش ہوؤں میں شامل ہو چکا ہے ہماری زبان ڈاکٹر زورؔ کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی انھوں نے تاریخ و تنقید سے ہٹ کر بھی بعض شعبہ ہائے ادب پر قلم اٹھایا ہے۔ اور زندگی کے مختلف ادوار میں بعض ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ پروفیسر معین الدین انصاری نے ان تاثرات کو یکجا کر کے ایک وقیع اور جامع مقدمہ کے ساتھ پیش کیا ہے اور ناشرین نے اُردو ٹائپ میں کارٹریج پیپر پر مع تصاویر کے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب ایک طرف ڈاکٹر زورؔ کی کاوشِ قلم کا اعلیٰ نمونہ ہے دوسری طرف ناشرین کے معیارِ طباعت کی ایک نظیر بھی ہے۔

قیمت:۔ چھ روپے

"اسلامی تقاریب"

قیدِ مکان و زماں سے ہٹ کر مسلمانوں کی عالمگیر تقریبوں پر مشاہیر اہلِ قلم کی تحریریں جن میں ان تقاریب کی اہمیت اور افادیت کا یہ نگاہِ غائر جائزہ لیا گیا ہے یہ تقریبیں بلاشبہ ہماری تہذیبی اقدار اور تمدنی سطوت و شوکت کی علم بردار ہیں۔ لیکن حقیقتاً ان سے مکارمِ اخلاق اور ارتقائے قومی کو کتنا ربط ہے۔ یہ آپ کو ابوالکلام آزاد، ابوالاعلیٰ مودودی اور دوسرے مشاہیر کا قلم بتائے گا۔ پروفیسر غلام دستگیر رشید نے ان مضامین کو ترتیب دے کر اُردو ادب کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔

قیمت مجلد چار روپے سلسلہ اکیڈمی لائبریری۔ دو روپے

کلیاتِ آتشؔ

خواجہ حیدر علی آتشؔ دبستانِ لکھنؤ کا وہ شاعر ہے جس نے مشکل پسندی اور لفاظی کے ماحول میں سہلِ ممتنع کے جوہر دکھائے۔ اور الفاظ کے پرشکوہ، اور ماہرانہ استعمال کے ساتھ ساتھ گرمیٔ کلام اور سوز و ساز کی وہ نظیریں پیش کیں کہ شیخ ناسخؔ کا استادانہ فن ماند پڑ گیا۔ بالفاظِ دیگر کہا جا سکتا ہے۔ کہ آتشؔ نہ ہوتا تو لکھنؤ کی غزل کا پلہ بہت سبک ہو جاتا۔ "کلیاتِ آتشؔ" مضمون آفرینی اور سادہ طرزِ بیان کا ایک معجزہ ہے جس کو ایک بسیط مقدمہ اور نئی ترتیب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

قیمت مجلد بارہ روپے ۵۰ پیسے سلسلہ اکیڈمی لائبریری ۵۰/۸ روپے

"نیم روز"

تابشؔ دہلوی عصرِ حاضر کے اُن شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے ادبیانہ ماحول میں آنکھ کھولی اور شعر و سخن کی فضا میں پروان چڑھے۔ وہ نہ صرف میرؔ و مرزاؔ کی دلی میں پیدا ہوئے۔ بلکہ شعر فہمی اور سخن گوئی انھیں ورثہ میں بھی ملی غیر منقسم ہندوستان سے لے کر پاکستان کی بزم ہائے مشاعرہ اور بساطِ ارض سے لے کر فضائے آسمانی تک ان کے نغموں سے ناآشنا نہیں۔ اور صاحبانِ ذوق پکارا رہا اُن کے شعروں سے وجدانی کیفیت طاری ہوتی رہی ہے۔ اشعار کے اس مجموعے کو پوری آب و تاب سے شائع کیا گیا ہے۔ اور اس کا نام "نیم روز" رکھا گیا ہے۔ ایک نظر دیکھنے کے بعد آپ بھی، اس نام کو موزوں قرار دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔

قیمت چھ روپے۔

اُردو اکیڈمی سندھ۔ ۱۶ بہادر شاہ مارکیٹ بندر روڈ کراچی ۲

"اُردو مرکز" گنپت روڈ لاہور۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

مولانا حامد حسین قادری

مولانا حامد حسین قادری ان بزرگ ادیبوں میں سے تھے جن کے ادبی فیض نے کئی نسلوں کو پروان چڑھایا تھا۔ پاکستان آنے کے بعد مولانا حامد حسین قادری مرحوم کراچی کے ایک گوشے میں ہنگاموں سے الگ رہ کر زندگی بسر کر رہے تھے۔ روزہ نماز، مطالعہ اور تصانیف یہ ان کی زندگی کی ساری سرگرمیوں کا محور تھیں۔ اس عرصہ میں انہوں نے بہت کچھ لکھا لیکن بہت کم چیزیں ایسی تھیں جو کسی کتابی شکل میں شائع ہو سکیں مولانا حامد حسن قادری کے انتقال سے ایک دور ختم ہو جاتا ہے اسی دور کے لوگ پروپاگنڈا پر اپنی شخصیت کی تعمیر نہ کرتے تھے بلکہ علم و ادب کی بنیادوں پر اپنی شخصیت کے تار و پود بنتے تھے۔ یہ دیو ہیکل علمی و ادبی شخصیتیں اب ایک ایک کر کے اٹھتی جاتی ہیں۔ کاش نئی نسل اس خلا کو پُر کر سکتی؟۔

مولانا نے جو کچھ لکھا وہ ہماری قومی ملکیت ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ جلد از جلد ملک کے ادبی ادارے ان کی غیر مطبوعہ تصانیف کو شائع کریں۔ اور ساتھ ساتھ ان تصانیف کو بھی جو ایک عرصہ سے نایاب ہیں۔ داستان تاریخ اردو کے حقوق آگرہ کے ایک ناشر کے پاس ہیں۔ مولانا کی یہ تصانیف اردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے اور گذشتہ دس بارہ سال سے محروم طباعت ہے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ پاکستان کا کوئی علمی و ادبی ادارہ یہ کتاب آگرہ کے ناشر سے حقوق خرید کر شائع کر دے تاکہ طالب علم اور اہل علم و ادب اس سے آج بھی پہلے کی طرح فیض یاب ہو سکیں۔ مولانا کو فن تاریخ گوئی میں بھی بڑا ملکہ حاصل تھا۔ یہ فن بھی اب دوسرے قدیم فنوں کی طرح تیزی کے ساتھ ختم ہوتا جا رہا ہے اگر مولانا مرحوم کی کہی تاریخیں یکجا کر دی جائیں تو یہ بھی ایک کام ہوگا۔ ہمیں یقین ہے کہ مولانا مرحوم کے فاضل صاحبزادے خالد حسن قادری اس سلسلے میں جلد قدم اٹھائیں گے۔

(ادارہ)

مولانا صلاح الدین احمد

مولانا صلاح الدین احمد کا نام آتے ہی ذہن میں ایک ایسی شخصیت کا تصور ابھرتا ہے جس نے اپنی ساری زندگی ایک مقصد کے لئے وقف کر دی تھی۔ جس نے اقدار، اصول اور قومی جذبہ کو ہمیشہ ہر دوسری مادی ترغیب پر ترجیح دی تھی۔ اب ایسے نڈر بے باک اور اصول پر سر دھڑ کی بازی لگانے والے لوگ کہاں؟۔

مولانا صلاح الدین احمد کے انتقال سے جو جگہ خالی ہوئی ہے اس کا پُر ہونا یا کرنا ممکن نظر نہیں آتا۔ نئی نسل میں نہ یہ جذبہ اور لگن ہے اور نہ اصول و اقدار کے لئے زندگی وقف کر دینے کا یہ حوصلہ۔ مولانا کو مرحوم لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ مولانا ہم سب کو عزیز تھے چھوٹے اور بڑے سب کے چہیتے تھے اب مولانا نہیں ہیں تو رہ رہ کر ان کی شخصیت، ان کی خوبیاں اور ان کی انفرادیت کے اچھوتے پہلو ذہن میں آ رہے ہیں۔ انہیں اپنے نقطۂ نظر، اپنے خیالات پر عقائد کی حد تک یقین تھا اس لئے انہیں کوئی خوف یا مالی نقصان کا ڈر کبھی اپنی جگہ سے نہ ہلا سکا یہ ان کی شخصیت کا وہ پہلو تھا جو آج ہمیں خال خال نظر آتا ہے مولانا کے پاس جو کچھ تھا وہ انہوں نے اردو کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اپنی جائداد، اپنا روپیہ اور خود اپنی ذات تین چار سو صفحوں کا پرچہ "ادبی دنیا" صرف ایک روپے میں فروخت کرتے تھے تاکہ عام آدمی تک اردو زبان کا یہ پرچہ پہنچ سکے۔ اردو زبان کا رسالہ نکالنا ویسے ہی خسارے کا سودا ہے اور پھر اتنا سستا پرچہ اردو کے نام پر اپنا سب کچھ لٹا دینے کا ایسا واضح ثبوت ہے جس کی مثال اس دور میں نہیں ملتی ضرورت اس امر کی ہے کہ مولانا جو ایک صاحب طرز ادیب تھے، کی ساری تحریریں یکجا کر کے جلد از جلد کتابی صورت میں شائع کی جائیں اور ساتھ ساتھ "ادبی دنیا" اردو ادب کے اداروں کی قومی امانت سمجھ کر وسیع تر پیمانے پر چلایا جائے تاکہ مولانا کا لگایا ہوا پودا برگ و بار پھل دے سکے اور ان کا فیض آنے والی نسلوں میں بھی جاری رہ سکے۔

(ادارہ)

عباس حسینی
سرتیا - دہلی۔

مُردوں کا حمّام

کچھ لوگ فطری طور پر ننگے ہوتے ہیں، کچھ کو تربیت اور ماحول ننگا بناتے ہیں۔ کچھ کو اپنے پیشے کے باعث ننگا بن جانا پڑتا ہے۔ منجھو کچھ اسی قسم کا ننگا تھا۔ کام ہی ایسا تھا کہ بغیر ننگا بنے، ننگا کیے اور ننگا بنائے، انجام ہی نہ پاتا تھا۔ منجھو غسّال تھا۔

نہ جانے کیسے کیسے مُردوں کو اس نے نہلایا کفنایا تھا۔ یہ مُردے ہر سن و سال کے ہوتے تھے۔ بچے لڑکے، جوان، ڈھلی عمر والے، بوڑھے کھوسٹ! ایسے بھی جو غنچۂ ناشگفتہ کی طرح بادِ سموم کے ایک جھونکے میں مرجھا گئے۔ ایسے بھی جو ادھ کھلے پھول بن کر سوکھ گئے۔ ایسے بھی جنھوں نے دو دن اپنی بہارِ جانفزا دکھائی۔ اور وہ بھی جو برسوں مرنے کی دعائیں مانگ کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرے۔ چاہے کتنا ہی حسین رہا ہو، مرنے کے بعد ہر ایک چہرہ بھیانک ہو جاتا ہے۔ آنکھیں پتھرائی ہوئی، ہونٹ اکڑے ہوئے۔ دانت کٹکھنے کتے کی طرح نکلے ہوئے۔ زبان باہر لٹکی ہوئی یا سانپ کی طرح پھن نکالے تالو سے چپکی ہوئی۔ صراحی دار گردن کی نازک رگیں سوکھی تانت بنی ہوئی۔ اور کوّا باہر ابھر کر بالکل کپڑے لٹکانے والی کھونٹی جیسا۔

کیسا ہی جوان ہو پسلیوں کے آخری جوڑ کے نیچے گڈھا نہ در پڑتا اور پیٹ کی شکلیں خوفناک بھی ہوتیں، اور مضحکہ خیز بھی۔ کوئی طبل اور ڈھول بنتا ہے کوئی پیپے سا اور بے کسا تاشہ، کوئی خاصا [illegible] اکڑو۔ کوئی رائے بریلی پھوٹا، کمر سے نیچے کا حصّہ بدرجۂ گھناؤنا۔ غلاظت سے بھرا وہ تعفن ہوتی کہ سانس لینا مشکل ہوتا۔ اور وہی پاؤں جنھیں زندگی میں صندل کے پاؤں کہتے، کنول سے تشبیہہ دیتے۔ ہتھوڑا اور ناگ پھنی کے سوکھے پٹ بن جاتے۔

لیکن منجھو کو غسّال ہونے کے ناطے انھیں بدبودار، اکڑی ہوئی، بگڑی ہوئی صورتوں میں اپنے پیشے کا کمال دکھانا ہوتا۔ انھیں آبِ سدر اور بیسن سے دھونا، رگڑنا، مانجھنا پڑتا تھا۔ انھیں ایسا بنانا پڑتا تھا کہ جان چھڑکنے والی بیوی اور جان دینے والی بھائی بہن، بیٹے بیٹیاں، بے جھجکے ڈرے، مرنے والوں کے قریب آ کر اس کا آخری دیدار کر لیں۔ منہ پر رومال رکھیں تو ناک چھپانے کے لیے نہیں، آنسو پونچھنے کے لیے۔ منجھو کو اسی کام کے خاص طور پر پیسے ملتے تھے اسی ہنر کے لیے تو وہ دور دور مشہور تھا۔

کیسی ہی بگڑی ہوئی لاش ہو۔ کیسا ہی اکڑا ہوا مُردہ ہو۔ کیسا ہی کٹا پٹا، پوسٹ مارٹم کیا ہوا جسم ہو، منجھو غسّال کے سپرد کر دو، وہ اسے گھنٹے دو گھنٹے کی محنت میں دولہا سا سنوار دیگا۔ آخری رخصت کے لائق۔

منجھو نے یہ فن ممدو سے سیکھا تھا۔ ممدو نے اپنے اس چہیتے شاگرد پر بڑا احسان کیا تھا۔ منجھو کے باپ کا کسی کو پتہ نہیں تھا۔ اُسے نو برس کے سن میں اس کی خواص کی گندی گلی میں رہنے والی ماں، بے ٹھور ٹھکانے کا بنا کر، اسے روتا چھوڑ کر چل بسی تھی۔ ممدو نے بیکس ماں کے کفن دفن کا بار اپنے ذمّہ لیا اور

بیٹے کو اپنی کو طرح ادب سے ہی جگہ دی۔ منجھو کو اس کی یہ یتیم پروری زیادہ گراں نہ گزری۔ ماں کی زندگی میں وہ اپنے چاروں طرف انسانی جسموں کا خوشی ناخوشی
سے بکنا دیکھتا رہا تھا۔ خود ماں کی حرکتوں اور حرکتوں سے واقف ہو چکا تھا۔ اور ماں کی علالت کے دوران اُس نے ماں کے گاہکوں کے طمانچے بھی کھائے تھے۔ اور
دوسری دست درازیاں بھی سہی تھیں۔ اس لیے پچاس سالہ ممدو کی آغوش میں اسے کچھ راحت ہی ملی۔ پہلی رات اور کئی راتیں منجھو نے اس اجنبی ہیبت ناک
ماحول میں اس طرح گزاریں۔ کہ اگر ممدو کا خاردار سینہ تکیہ نہ بنتا۔ تو شاید خوف اور ڈر سے اس کی پلک سے پلک نہ لگتی۔ اور اس کا دم ہی نکل جاتا۔

غسل خانہ زندان کے حمام کی طرح رات کو بھی چلتا رہتا تھا۔ "مردہ بدست زندہ" مثل مشہور ہے، روپے والے اور کام کاجی دونوں طبقے، مُردوں کو زیادہ
دیر گھر میں رکھنے کے قائل نہیں، دونوں کا سخت ہرج ہوتا ہے۔ ایک کی مزدوری کا، دوسرے کی عیش پرستی کا۔ اس لیے ممدو کو ایک مستعد سپاہی کی طرح فرائض
کی انجام دہی کے لیے ہر وقت تیار رہنا پڑتا۔ اس کے دو اسسٹنٹ تھے۔ ایک مرد اور ایک عورت۔ محلے ہی میں دونوں کے گھر تھے۔ مرد کی میت میں جن مدد کو
بلایا جاتا۔ عورت کی لاش ہوتی تو رحیمن کی طلب ہوتی۔

چوبیس سال کی رحیمن ایک مرحوم غسال کی بیوہ تھی۔ صورت شکل میں بس آدمی کا بچہ، مگر تیزی اور طراری میں آفت کا پرکالہ۔ اس کی باتوں میں بلا کا
رس تھا۔ جیسے چاہے منٹوں میں شیشے میں اتار لے۔ بیوہ ہوتے ہی اس نے ممدو پہ ڈورے ڈالے تھے۔ مگر اس کا شوق کچھ اور ہی تھا۔ پھر رحیمن سے وہ ڈرتا بھی تھا
بوڑھے سفید بالوں میں کہیں داغ نہ لگا دے۔ کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا۔ کہ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ اور منجھو اس کے پھیلے ہوئے ہاتھوں میں آ گرا۔ رحیمن ممدو
کے لیے ایک حقارت آمیز جذبہ لیے بل کھا کر رہ گئی۔

عورتوں کو غسل دینے کا کام وہ اکیلے ہی انجام دے لیتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے کاموں میں اس کی سات برس کی بیٹی کریمن اس کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ بند کواڑ
کے پیچھے سے کبھی کبھی ممدو بھی ہدایتیں دے دیتا تھا۔ اگر کوئی شوقین مزاج اپنی چہیتی کی ....
بگڑی صورت، پھر سے بنانے کی اجازت دے دیتا تو ممدو اپنی صنعت گری دکھاتا اور منہ مانگے دام لیتا، نہیں تو بیشتر سوکھے ہاڑ کفن میں لپیٹ کر توپ
دیئے جاتے۔

شروع شروع میں تو منجھو ممدو کا ہاتھ بٹانے میں جھجکا، گھبرایا، ڈرا، مگر جلد ہی اُسے مساوات سی ہو گئی۔ اس نے بچپن ہی سے ایسے ماحول میں تربیت
پائی تھی جس میں احساسِ لطیف کا گذر نہ تھا۔ نہ جسم اور لباس کی صفائی ملتی تھی۔ نہ خوشبو اور بدبو کی کوئی خاص تمیز۔ اس نے سمجھ لیا تھا۔ کہ انسانی جسم کی ایک
مقررہ قیمت ہے جہاں اُس کے دام ملے۔ پھر وہ ہر طرح کھیلا جا سکتا ہے۔ زخمی اور مجروح بنایا جا سکتا ہے ممدو نے اس کو رہنے دیا۔ بستر اور مکان۔ اس کے
کھانے کو شیرمال اور پلاؤ۔۔ اس لیے کہ مرنے والوں کے ہاں پلاؤ کھائیں گے۔ احباب اور فاتحہ ہوگا، والی مجلسیں ہوتیں تو ممدو غسال کو مولانا کے ساتھ
ساتھ پانچ شیرمالیں اور بھرا قاب ضرور ملتا۔۔۔ اور ان سب پر بالا، ممدو نے اُسے ایک خاص قسم کا پیار اور چاؤ بھی دیا تھا۔ تو پھر منجھو کے لیے
خاموشی سے اس کے ہر اشارے پر چلنا نمک حلالی کا ہم معنی کیوں نہ بنتا؟

انسان کی زندگی میں عادت کو بہت بڑا دخل ہے۔ یہ احساس و جذبے کے نوکیلے دندانوں کو آہستہ آہستہ گھس کر ہر ایک کو ایک مشین جیسا بنا
دیتی ہے۔ ناگوار گوارا بن جاتا ہے کڑوا، میٹھا افیون اور تمباکو کی تلخی سے کون نہیں واقف۔ مگر کسی بھجوا پینے والے سے اس کا لطف پوچھ کر دیکھیے۔ یا
کسی افیونی سے چنیا بیگم کی لذت دریافت کیجیے، تعریفوں کے پل باندھ دے گا۔ چنانچہ منجھو کا ڈر، احساس، بدبو، گندگی سے جھجک، غلاظت سے گھن
ان سب نے چولے بدلے۔ کفن اور کافور کی بو اس کے لیے عطر سہاگ کی خوشبو بن گئی۔ حمام کی نالی کا کیڑا، رفتہ رفتہ غسل خانے کے سفید چوہے
کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔

دیکھنے میں تو وہ پندرہ برس کے سن میں بھی کندنی رنگ۔۔ کرنجی آنکھوں اور کالے گھنگریالے بالوں والا پانچ فٹ چلو اونچے کا گٹھے جسم کا لڑکا
ہی معلوم ہوتا تھا۔ ایسا بھولا بھالا کہ جو دیکھے اسے پیار آئے۔ لیکن ممدو کا چند برس کی تعلیم اور تربیت نے اُس میں انسانی غم اور خوشی سے بے پروائی

صحت سے وہ ساری بے خوفی پیدا کر دی تھی جو ایک غسال کی خصوصیت ہے۔ غسال ہو یا شمشان کا ڈوم۔ دونوں قصائی سے بھی زیادہ سنگدل ہوتے ہیں۔ تو جوان کے مُردہ گوشت کو کاٹتا پیٹتا ہے۔ یہ انسان کے پھول جیسے جسم کو توڑتا مروڑتا ہے۔ منجھو نوجوان ہونے کے باعث بوڑھے ممدو سے کہیں زیادہ ہی سخت دل نکلا۔ اسے اپنے پیار کرنے والے استاد کے پیشے سے سارے گر سیکھ لینے میں زیادہ دقت نہ ہوئی۔ وہ اسکی چابکدستی ... نے لگا کہ ممدو بچارے کام کو فخر کے ساتھ ساتھ رشک سے دیکھنے لگا تھا۔ مگر قبل اس کے کہ گرو اور چیلے میں گرو اور چینی کا فرق نمایاں ہو کر رات پچھلے ممدو کو ایک والی مریض کا مُردہ چلتے چلاتے ایسے جراثیم تحفے میں دے گیا۔ کہ وہ بھلا چنگا اڑتالیس گھنٹے کی بیماری میں لوٹ لگا اس گڑھے میں جا پہنچا، جہاں ایک دن سب کو جانا ہے۔

ممدو نے منجھو کے لیے ورثے میں چھوڑا، ایک سائیں سائیں، بھائیں بھائیں کرتا ہوا غسل خانہ، پیشے کے فرائض ادا کرنے کو اپنی اندھیری کوٹھری اور گندہ دالان رہنے بسنے کو لاشوں پر سے اتارے ہوئے منتخب قیمتی لباس اور چادرے، اوڑھنے پہننے کو عمر بھر کا زمین میں گڑا ہوا اندوختہ، پورے دو ہزار روپے، پھیلنے بڑھنے کو بے حس دل مگر جھنجھناتے اعصاب رنگ رلیاں منانے کے لیے

ممدو کا ترکہ منجھو کا دیکھا بھالا، سمجھا بوجھا تھا۔ وہ انھیں پا کر نہ تو بوکھلایا اور نہ آپے سے باہر ہوا۔ اسے سب سے زیادہ جو فکر تھی۔ وہ تنہائی کی تھی اسی کا اسے سب سے زیادہ ڈر تھا۔ رات کی مدھم روشنی میں اسے غسل خانے میں ہر طرف سائے ہی سائے چلتے پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ اُسے یقین تھا کہ بعد میں جو عورت ہوتیں، پچھل پائیاں بن کر لپٹ جاتی ہیں۔ چنانچہ قوتِ واہمہ ہر آواز کو ایک منمناہٹ میں تبدیل کر دیتی۔ خیال احساس کو متاثر کرتا گیا۔ آنکھ کان کی ذرہ برابر بھی بڑھتی ہی گئی۔ پتہ کھڑکا بندہ دھڑکا، والی پوری کیفیت اس پر طاری ہو گئی۔ اس کا بار بار غسل خانے سے ہیچ کر بھاگ جانے کو جی چاہنے لگا۔ کہ گیارہ بجے ایک لاش آگئی۔ گویا اس کے تنِ بے جاں میں جان آگئی۔ اُس نے جانے بوجھے تجہیز و تکفین میں اتنی دیر لگائی۔ کہ تین بج گئے۔ وہ بستر پر تھک کر گرا تو ایسا غافل سویا۔ کہ آٹھ بجے صبح ہی آنکھ کھلی۔

دوسری رات وہ بارہ بجے شب تک لالٹین جلائے، ڈنڈا ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا۔ غسل خانے کے پھاٹک کے اندر سے کنڈی بند تھی۔ دیواریں بھی کافی اونچی تھیں۔ چور چکارے کا کوئی ڈر نہ تھا۔ رات کو غسل خانے میں قدم رکھتے اُن کا بھی دم نکلتا تھا۔ مگر ذرا ذرا سی دیر میں منجھو کا دل بلیوں اچھلتا اور وہ بار بار زور زور سے پیشے کے سلسلے میں جو دو چار سورے اُس نے یاد کر لیے تھے۔ اُن کی تلاوت کرتا۔ اپنے بازوؤں اور اپنے سینے پر دم کرتا۔ اور تالیاں بجا بجا کر حصار باندھتا۔ مگر ظالم دل کے پنکھے کسی طرح بند نہ ہوتے۔ وہی گھبراہٹ وہی دھڑ دھڑاہٹ رہ رہ کر جاری ہو جاتی۔ پورے بارہ بجے کے قریب کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی۔ تو معلوم ہوا کہ ایک مزدور کی لاش آئی ہے۔ قسمت جاگی بیداری کا بہانہ مل گیا۔ سارے کام اس اطمینان سے کیے کہ صبح ہو گئی۔

جب وہ نہا دھو کر پلنگ پر لیٹا تو اُس نے طے کر لیا۔ کہ ممدو کے فاتحے سے فراغت پاتے ہی وہ رحیمن خالہ سے کہے گا۔ کہ آج ہی کرمن سے نکاح کر کے وہ اُسے شام تک رخصت کر دے۔ رفیقہ کے بغیر اب رات نہیں کٹ سکتی۔ اُسے یقین تھا کہ رحیمن اُس کی بات نہ ٹالے گی۔

ممدو نے اپنی زندگی ہی میں کرمن سے اس کی سگائی کی بات چلائی تھی۔ رحیمن نے دونوں کی کم سنی کا عذر کیا تھا۔ اصل میں تو رحیمن کے دل میں گھاؤ اب تک رس رہا تھا جو ممدو نے خود سے ٹکرا کر لگایا تھا۔ بیوہ ہوتے ہی رحیمن نے ممدو کا سہارا ڈھونڈا تھا۔ ڈھکے پردے اپنے کو اس کی خدمت کے لیے پیش کیا تھا۔ مگر ممدو نے منجھو کو اس پر ترجیح دی۔ اور اس کے نتیجے میں رحیمن کو بڑے بڑے پاپڑ بیلنے پڑے۔ نہ وہ جنبش کی ماری تھی اور نہ اُسے غسال کے کام سے کوئی رغبت تھی۔ مگر پیٹ پالنے کے لیے انسان کو کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ اُس نے اندھیرے اجالے چار پیسوں کے لیے نواب زادوں، رئیس زادوں کو بھی خوش کیا۔ اور ان کے لچے مفت خور ملازموں کو بھی۔ اور وہ کالی کالی راتوں میں ڈراؤنی اور بھیانک میتوں کو دھوتی گنگناتی بھی رہی اور فیس میں سے ممدو کا کمیشن بھی ادا کیا۔ یہ سب کچھ اُس کے دل پر داغ بن کر نقش تھا۔ ممدو نے اُسے اپنا لیا ہوتا تو وہ آج ایک رئیس

کی ڈیوڑھی میں بیگمات کی طرح کیوں پڑی رہتی۔

پھر بھی رحیمن محمد کو ناخوش کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے وہ کریمن سے منجھو کی شادی کی بات کو دونوں کی [illegible] بہانہ کرکے [illegible] اور [illegible] تہیہ کر لیا تھا۔ کہ کریمن سے منجھو کو بیاہ دے گی مزدور، گھر مُردے سے ناک رگڑ دا کر، بیچارے منجھو کو کیا خبر کہ رحیمن کے دل [illegible] ایک [illegible] کو اپنی جگہ یقین تھا کہ رحیمن اب جبکہ وہ پورے غسل خانے کا مالک تھا۔ اس کی بات نہ ٹالے گی۔ وہ کریمن کو پسند بھی کرتا تھا۔ اس کا [illegible] اس کے لیے دلفریب تھا۔ اس کے مزاج رنگ ڈھنگ سے بھی وہ مطمئن تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کریمن کو بھی اس سے تھوڑا بہت لگاؤ ضرور تھا۔ [illegible] پہلے جب رشتے کی بات چلی تھی۔ تو کریمن کو بھی یقینی سن گن مل گئی تھی۔ وہ اس سے تھوڑا بہت شرمانے لگی تھی۔ اور اس نے غسل خانے [illegible] دیا تھا۔ مگر جب بھی منجھو سے کوئی ! – کرتی، تو بڑے گھمنڈ سے اور لہجہ بالکل حاکموں جیسا ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ 'بیوی میں تیرا غلام' [illegible] سات بار کہلا چکی ہے۔

غرض منجھو نے ٹھان لی کہ فاتحہ کے بعد ہی رحیمن سے دو ٹوک بات کرے گا۔ مگر مجلس تمام بھی نہ ہوئی تھی۔ کہ ایک نہیں، دو دو پوسٹ مارٹم کی ہوئی لاشیں آگئیں اور شام تک اسے رحیمن سے ملنے اور باتیں کرنے کا موقعہ ہی نہ ملا۔ وہ اس کے پاس جانے کا ارادہ ہی کر رہا تھا۔ کہ [illegible] سے قبل ایک امیر زادی کا مردہ مہریاں اُٹھا کر لائیں۔ رحیمن بلائی گئی۔ وہ پاس ہی ایک رئیس کی ڈیوڑھی میں اکلوتا ڈانے [illegible] کی اُسے اجازت نہیں تھی۔ مردہ شو کی صورت سے بیگمات کو گھن آتی تھی۔ دل میں ہول اُٹھنے لگتے تھے۔ موت یاد آ جاتی تھی۔ لیکن کرسی [illegible] پوچھی پر مقرر تھی۔ وہ جب سے بیوہ ہوئی تھیں پنڈلیاں اینٹھی رہتی تھیں۔ مجبوراً بیٹی کی خاطر ماں کی ڈیوڑھی تک رسائی ہو گئی۔

رحیمن کی غسل دی ہوئی اور کفنائی ہوئی میت جب لوگ لیکر چلے گئے تو اس نے خود نہانا شروع کیا۔ منجھو کو بھی چونکہ اس کام کے سلسلے میں صندوق [illegible] لگانا پڑتا تھا۔ اس لیے وہ بھی صحن میں تہمد باندھے نہانے کی نیت سے ٹہل رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ رحیمن جیسے ہی فارغ ہو کر نکلے گی۔ وہ اس سے کریمن کے بارے میں بات چیت کرے گا۔ پھر دبی تنہائی کا ڈراؤنا منظر سامنے تھا۔ جس کے سبب دو راتوں سے اس کے دم پر بنی تھی۔ وہ تو چاہتا تھا کہ اگر رحیمن [illegible] کہہ دے۔ تو وہ اسی وقت غسل خانے سے متعلق مولوی صاحب کو بلا لائے۔ نکاح ہو جائے اور اس کے خالی پہلو میں کریمن آ جائے۔ اس نے یہ بھی طے کر لیا تھا۔ کہ اگر رحیمن اس چہلے منگنی پر بیاہ والے سودے کے لیے دو چار سو روپے مانگے تو وہ بھی اُسے بخوشی پیش کر دے گا۔

وہ انہیں خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ کہ رحیمن نے اندر سے آواز دی۔

"منجھو میاں، اللہ، ذرا کوئی صابن کی گھسی پٹی بٹی ہو تو ہاتھ بڑھا کر دیدو!"

جب منجھو نے کواڑ کی آڑ سے صابن کی ٹکیا اندر بڑھائی تو ٹھنک کر بولی۔

"اے میاں، میں پیٹھ پھیرے بیٹھی ہوں اندر آ کر ہی دیدو!"

منجھو اندر گیا تو وہ بولی، "اللہ تمہیں جیتا رکھے، ذرا پیٹھ پر لگا بھی دو۔"

منجھو ہکلا کر بولا۔ "کیا؟ کیا کہا خالہ!"

وہ پلٹ پڑی۔ "خالہ کی دم اب تم ایسے ننھے نادان بھی نہیں!" اور اس نے منجھو کو اس طرح اپنی طرف کھینچا۔ کہ وہ کائی لگے غسل خانے میں پھسل گیا اور پھر پھسلتا ہی چلا گیا۔ رحیمن نے مُردوں کو غسل دینے والے تخت کو سیج بنایا۔ اور بیٹی کی جگہ اپنے ہی سر سہرا باندھ لیا۔

دولہا دولہن میں پورے پندرہ برس کا فرق تھا۔ مگر پُر فن دلہن ایک مشاق کھلاڑی کی طرح مزاجوں اور عمروں کے فرق کی ساری گلیاں پھلانگ چلی گئی۔ اور صبح ہوتے ہی منجھو ایسا رام ہوا۔ کہ اس کا کلمہ پڑھنے لگا۔

صبح ماں کو تلاش کرتی ہوئی کریمن آئی۔ رحیمن نے اس سے کوٹھری [illegible] والی میں جھاڑو دلوائی۔ میل، بال، اگر بتیاں اور [illegible]

...یا اپنا ٹونا کیس منگوایا۔ اور مردہ بیگموں میں سے ایک کا نیا عمدہ جوڑا جو اُس نے کریمن کے جہیز کے لیے رکھ چھوڑا تھا۔ خود پہنا۔ کپڑوں میں ...عطر عروس مَلا۔ کنگھی چوٹی کی۔ اور جمّن کے ذریعے مولوی کو بلا کر دوپہر سے پہلے دو بول بھی پڑھوا لیے۔ کریمن منہ بنا بنا کر، اچھو دل میں کڑھ کڑھ کر ...چونچلوں پر ہنس کر، کچھ اپنی جگہ خجل اور شرمندہ ہو کر خاموشی سے یہ سارا تماشا دیکھتی رہی۔ مگر اس کی آنکھوں میں کبھی کبھی نفرت کی ایک چمک ...پیدا ہو جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ماں کی اس حرکت سے تپ گئی ہے اس لیے اُس سے جو وہ اپنی سرکار میں جا کر بیٹھی تو پھر غسل خانے میں ...کبھی نہ آئی۔

رحیمن بڑی ہوشیار عورت تھی۔ وہ پہلے ہی سے سب کچھ سوچے سمجھے بیٹھی تھی معلوم ہوتا تھا اُس نے ممدو کے مرتے ہی پورا منصوبہ بنا لیا تھا۔ جب ایک ہفتے کے جوار بھاٹے کے بعد مزاجوں میں سکون آیا۔ تو اس نے بھولے منجھو کو "آگم" کا دھیان دلایا۔ اور اپنی اسکیم کے مطابق ممدو کے دفینے کو سڑنے سے بچایا۔ غسل خانے کے قریب ہی ایک دو کی دکان کرائے پر لے کر سارے وہ سامان رکھوا دیے جن کا استعمال غسل اور کفن کے سلسلے میں ضروری تھا۔ مرنے والوں کی تعداد روزانہ پانچ سے کم نہ ہوتی تھی۔ اس لیے اوسطاً تیس روپے روزانہ کی آمدنی اور بڑھی۔ غسل دینے کی اجرت ملا کر ۵۰ — ۶۰ روپیہ روز کی آمدنی اور خرچ کچھ بھی نہیں۔ کھانے کپڑے کی فکر ہی نہ تھی۔ مرنے والوں کے ورثا یہ دونوں چیزیں اس افراط سے بہم پہنچاتے۔ کہ دوسروں کو بانٹی بھی جاتی۔ اور کبھی کبھی بیچی بھی جاتی۔ اس لیے بینک میں اکاؤنٹ کھلا اور روز بروز بڑھتا رہا۔ پہلے تو غسل خانہ تھا ہی، نئی غسل کے لیے ایک حمام بنا، مگر کافی بڑا تاکہ وقت ضرورت مُردوں کے بھی کام آ سکے۔ پھر محلے ہی میں موقع کی ایک زمین دیکھ کر خرید لی گئی۔ اور اس پر ایک مکان بننا شروع ہوا۔ دس مہینے بعد جب پہلا بیٹا شہنشاہ پیدا ہوا۔ تو اسی مکان میں ولادت ہوئی۔ غسل خانے کی ہوا اس کے نازک جسم کو نہ لگنے دی گئی۔

شہنشاہ کی ولادت کے سلسلے میں روٹھی ہوئی کریمن بھی بلائی گئی۔ روٹھی روٹھی، بچہ کھلانے اور گھر کی صفائی میں اُس سے بڑی مدد ملی۔ مگر چند ہی دنوں میں رحیمن کو محسوس ہوا کہ نوجوان میاں کی آنکھیں بڈھی ماں اور جوان بیٹی کو نظروں میں تولنے لگی ہیں۔ کریمن کی چال ڈھال سے بھی لگاوٹ والی چٹک مٹک نمایاں ہونے لگی۔ بیٹی پر کڑی نگاہ رکھنے کے لیے رحیمن نے غسلانے کا کام قطعی چھوڑ دیا۔ پھر جلد ہی ایک رشتہ ڈھونڈ کر ایک دوہاجو پچاس سالہ کلرک کے ہاتھ میں کریمن کا ہاتھ تھما دیا۔

شادی خوب دھوم دھام سے کی۔ اُس کے پاس نہ جوڑوں کی کمی تھی اور نہ کسی اور جہیز کے سامان کی۔ اللہ مرنے والی بیگمات کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ اُن کا اُتارا غسالن کے گھر ہی تو آتا تھا۔ رئیس زادیاں مُردہ ماں بہنوں کے نئے تہہ نہ کیے جوڑے ہوں یا قیمتی سنگھار کی چیزیں چھونا تک پسند نہیں کرتی تھیں۔ اُن کے دلوں میں ان چیزوں پر نظر ڈالتے ہی طرح طرح کے وہم اُٹھتے تھے۔ تخیل ملک الموت کو سامنے لاکھڑا کر دیتی تھی یہی حال رئیسوں امیروں کا تھا۔ مرنے والے باپ بھائی بیٹے کی کوئی چیز گھر میں نہ رہنے پاتی تھی۔ یہ سب حصے میں آتی تھی مولوی کے، غسال کے، یا اُس سے بھی نیچے اتر کر شہدوں کے۔ چنانچہ منجھو اور رحیمن کے گھر میں جہیز کی کمی نہ تھی۔ جہیز دیا گیا۔ اور جی کھول کر دیا گیا۔ چھکڑوں پر لاد کر دیا گیا۔ مگر کریمن جو چاہتی تھی۔ وہ اسے نہ ملا۔ اس کے منہ کا تر نوالا رحیمن نے چھین کر خود کھا لیا تھا اور اُسے پکا ادھ بھی پھینکی تھی شیر مال۔ لاکھ تہہ بے پر الٹو پلٹو، پرانے پن کی مہک نہیں جاتی۔ اس لیے سسرال گئی تو ماں کی طرف سے ایک جذبۂ انتقام لیے ہوئے، طے کر کے کہ تو تو مجھی کو بدلے کر چھوڑوں!"

ایک دن ایک لڑکے نے منجھو کو ایک پرچہ دیا۔
لکھا تھا۔

"اللہ اماں کی طرح آپ بھی طوطا چشم نکلے۔ جھوٹوں خیر ملا پوچھنے بھی نہ آئے۔"

... سب میں رحیمن اور مجبو کے لیے الگ الگ بیڈ روم ہوں۔ ہر کمرے کے ساتھ غسل، پھر نوکروں چاکروں کے لیے کمرے مجبو کے لیے بھی کچن سے الگ ... دو کمرے ہوں۔ موٹر کے لیے ایک گیراج ہو اور لان کے ایک گوشے میں چمن لگانے والے مالی کی کوٹھری۔

اس لیے تیسرے مکان کی نہیں ایک شاندار کوٹھی کی تعمیر ضروری ہوئی۔ رحیمن کے مزاج کی خصوصیت تھی کہ جو بات طے کرتی بس اس کا تذکرہ کرتی رہتی تھی۔ پھر وہ روپے کا منہ دیکھتی تھی۔ اور نہ کوئی حیلہ حوالہ سنتی تھی۔ مجبو تو حکم کا بندہ تھا۔ سارے کام چھوڑ کر اس ڈیوٹی پر لگا دیا گیا۔ اچھے علاقے کے اندر موقع کی زمین دیکھ کر مہنگے داموں خرید لی گئی۔ اندر ایک کا چار لگا کر کوٹھی تین مہینے میں تیار ہو گئی۔ خوبصورت فرنیچر، پردہ اور خوشنما سامان سے سجا دیا گیا۔ سجانے رحیمن نے نئی کوٹھی میں شاندار دعوت ولیمہ دی۔ اور اپنے پورے جاہ و حشم کے ساتھ اس میں منتقل ہو آئی۔ گیراج کو خالی رکھنا پسند نہ آیا اس لیے ایک موٹر بھی خرید لی۔ اس نئے ماحول میں وقار حاصل کر لینا آسان کام نہ تھا۔ ہمسایہ میں سب ہائی کلاس لوگ تھے۔ ان سے پینگ بڑھانے کے لیے گندے ماضی سے رشتہ توڑنا ضروری تھا۔ لڑکے بھی ماشاءاللہ جوان ہو چکے تھے۔ اسکول سے نکل کر کالجوں میں پہنچے تھے۔ اُن کے کانوں میں ابتک بھنک نہ پڑنے دی تھی۔ کہ ماں باپ کا اصلی پیشہ کیا تھا۔ اس لیے مجبو پر قدغن شروع ہو گئی۔

"دکان پر نہ بیٹھو، جس طرح بنے اسے بیچ ڈالو۔ موت کس کا گھر نہیں جھانکتی۔ نئے ہمسایوں میں سے اگر کسی نے تمہیں وہاں دیکھ لیا، یا شہنشاہ، بادشاہ کو پتہ چل گیا تو سارا کیا دھرا مٹی میں مل جائے گا۔ ہماری ناک کٹ جائے گی۔ اور بچوں کا مستقبل برباد ہو جائے گا۔"

مگر مجبو کو تو دکان ہی سے محبت تھی۔ اس کی بُو اس کی مٹی اس کا استراز مجبو کے خمیر میں داخل تھی۔ اُسے نہ تو کارخانے کے شور میں نیند آتی۔ اور نہ نئی کوٹھی کے چمن کی بہاروں، ربڑ کے گدیلے والی اسپرنگ کی مسہری پر چین۔ وہ سوتا تو ہر کروٹ پر اس کی آنکھ کھل جاتی جب سے کوٹھی میں آیا تھا۔ اسے اپنے بیڈ روم میں الگ سونا پڑتا تھا۔ وہ ہمیشہ سے کسی نہ کسی کے پہلو میں سونے کا عادی تھا۔ ماں کی گود سے چھوٹا تھا تو ممدو کا آغوش ملا تھا۔ اس سے بچھڑا تو رحیمن نے کبھی بغل سے الگ نہ ہونے دیا۔ اب جب سے کوٹھی میں آئی تھی، وہ انگریزی قسم کی 'میم صاحب' بن گئی تھی۔ یا اپنے دیس کی کوئی رانی مہارانی۔ جب مرضی ہوئی ایک خاص مشن سے مجبو کے پاس چلی آئی۔ ورنہ وہ اپنے بیڈ روم میں، یہ اپنے بیڈ روم میں۔ خدا نوں کی کینری بولتی گردوں کے پنجرے میں۔

اس نئے مجبو نے اس حکم کے بجا لانے میں ذرا آنا کانی کی۔ سو روپے روز کی آمدنی اس طرح ہاتھ سے کھو دینے کا عذر کیا۔ کوئی اچھا گاہک دیکھنے کا بہانہ کیا۔

بس ایک دن وہ برس پڑی۔ "تمہیں کیا، تم تو لیس مولیوں کا منہ دیکھتے ہو، تمہیں شہنشاہ اور بادشاہ کے انجام کی کوئی فکر نہیں، تم تو ہمیشہ غسل خانے کا کیڑا بنا رہنا چاہتے ہو۔ مگر کان کھول کر سن لو، میں اپنے بیٹوں کے نتھنوں تک اس کی بو بھی نہ پہنچنے دوں گی، جس طرح ہوگا۔ جن داموں بکے گی میں دکان بیچ کر سانس لوں گی۔ یہ نہ بھولو کہ مکان، دکان، کارخانہ، یہ کوٹھی سب میرے نام ہے۔ میرا یہ سب کچھ اپنے بیٹوں پر سے وار دوں گی۔ تم کچھ نہیں کر سکتے۔"

اس لیے ہونا وہی جو رحیمن چاہتی تھی۔ مجبو نے جمن کے ہاتھ ۵۰ ہزار کی مالیت کی دکان دس ہزار میں بیچ دی۔ اور سارے دام خاموشی سے رحیمن کے ہاتھ میں رکھ دیے۔ رحیمن خوشی سے کھل اٹھی۔ اس نے برسوں کے بعد وضو کیا۔ اور دو رکعت نماز شکر پڑھی۔

نہ جانے کارساز عالم کو یہ سجدۂ شکر اس کی حکمت پر طنز معلوم ہوا۔ اس لیے یا یہ کہ مجبو نے آخری قربانی ایک ساتھ بگڑے دونوں دل و جذبے کے ساتھ دی تھی۔ اس لیے ہوا یہ کہ جب دکان کی فروخت کے دام بھی کارخانے میں جھونک دیے گئے۔ اور شیشم، ساگوان کے شہتیروں، بلیوں، دھنیوں، تختوں کا اونچا انبار لگ گیا۔ تو ایک دن ایک بے پروا مزدور کی جلتی بیڑی کا ٹکڑا برادے کی ڈھیری میں گر گیا۔ اور مجبو کے دل کی طرح نظروں سے پوشیدہ سلگتا رہا۔ جب شام کو مجبو کارخانے میں قفل ڈال کر کوٹھی چلا گیا۔ تو برادے سے چنگاریاں اڑیں، پھیلیں، بڑھیں اور آگ لگ گئی۔ کہ

کارخانے میں آگ لگی اور بھی۔ رحیمن کے دل میں آگ لگی اور ٹھنڈا ہو گیا۔ مگر قرض داروں کے کھاتوں میں بھی تو آگ لگی تھی۔ رحیمن کے سودھی کے دو سب اس آگ کو بجھانے والا پانی لینے اُس کوٹھی پر دوڑ پڑے۔ بڑے بزنس کی بنیاد اسی ساکھ پر ہوتی ہے وہ قائم ہے تو لاکھوں کا مال ادھار مل جائے گا۔ وہ جاتی رہی تو کوڑی کا مال بھی لاکھ جتن کرو کوئی ہاتھ نہ لگانے دے گا۔ ہر قیمت ساکھ تھی رحیمن کی۔ منجھو اس کے بہتے گھی گنی شمار میں نہ تھا۔ اب رحیمن نہ رہی تو اس کے ساتھ ساکھ بھی خاک میں مل گئی۔ یہی سبب تھا کہ سب پریشان تھے۔ یہاں بھی یہ پریشانی تھی کہ سب کچھ کیا دھرا تھا منجھو کا، مگر ہر جگہ نام چڑھا تھا رحیمن کا۔ گویا منجھو محض چاکر تھا۔ مالکن وہی تھی۔ مگر اب اس کے مرنے کے بعد اسے زیادہ سے زیادہ روپے میں دو آنہ حق شوہری مل سکتا تھا۔ ورنہ سب کچھ تھا شہنشاہ، بادشاہ کا، قرض ادھار دینے والے یہ سب جانتے تھے۔ اسی لیے لڑکوں کی موجودگی ہی میں آ آ سنے لے کر آ گئے تھے۔ منجھو کو اُن کی جلد بازی پر غصہ آیا، مگر وہ کسی قسم کا جھگڑا نہ چاہتا تھا۔ اس نے بیٹوں کو راضی کر کے پہلے تو موٹر نکالی۔ پھر پانچ سات دن میں ایک لاکھ کی کوٹھی ساٹھ ہزار میں بیچ دی۔ قرض سے سبکدوش تو ہوا مگر اب سب رہیں کہاں؟ نظر اپنے ہی گھر کی طرف گئی۔

کرایہ دار نے پورے ایک ہزار روپے لیے تو مکان خالی کیا۔ منجھو بیٹوں سمیت اس میں اُٹھ آیا۔

شہنشاہ اور بادشاہ تو اپنی اپنی تعلیم میں لگ گئے، مگر منجھو گھر میں پڑا پڑا گھبرانے لگا۔ ایک شخص جو دن بھر مشغول رہتا ہو جس کے قویٰ اب بھی مضبوط ہوں۔ جس کے اعضا سالم اور درست ہوں۔ گھر میں بیٹھ کر مکھیاں نہیں مار سکتا۔ منجھو پڑھا لکھا بھی نہیں تھا کہ دنیا کے بہترین دماغوں کی صحبت میں دل بہلاتا۔ بہت میل ملاپ والا آدمی بھی نہ تھا۔ کہ ادھر ادھر دوستوں، ملنے والوں سے گپیں اڑاتا پھرتا۔ اس لیے اس نے کام ڈھونڈنا شروع کیا۔ مگر وہ کام بھی کیا جانتا تھا، غسل یا کفن دینا یا لکڑیاں پہچاننا۔ کارخانہ تباہ ہو چکا تھا۔ دکان بک چکی تھی۔ پھر بھی اس کا مالک اپنا جمن ہی تو تھا۔ وہاں کے کاموں میں ہاتھ بٹانے لگا۔ بڑی فرحت ہوئی۔ وہی کفن، کافور اور بیری کی ہری پتیوں کی خوشبو وہی جیلی ہوئی دریوں اچاندنیوں، شامیانوں، قناتوں کی دل پسند مہک، وہی دن میں کئی بار میتوں کے گذرنے کا عبرت ناک مگر خوشگوار نظارہ۔ وہی قرآن خواں کی سورۂ رحمان پڑھنے میں خوش الحانی اور خوش آوازی۔ ایسا محسوس ہوتا کہ جو کچھ کھو یا تھا سب سود واپس مل گیا۔

جمن کئی دن تو منجھو کو خاموشی سے دیکھتا رہا۔ نظروں نظروں میں اسے تولتا پرکھتا رہا۔ اس کی بھی ایک حیثیت ہو گئی تھی۔ اس نے مکان بنا لیا تھا۔ بیوی مر گئی تھی۔ بس ایک جوان بیٹی رہ گئی تھی۔ لڑکا پڑھ لکھ کر سرکاری دفتر میں ملازم ہو گیا تھا اُس نے اپنا الگ گھر کر لیا تھا۔ جمن کو لڑکی کی طرف سے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا۔ اسی لیے اُسے دن میں مکان میں اکیلا نہیں چھوڑتا۔ صبح کو جب دکان پر آتا تو اسے غسل خانہ پہنچا دیتا جہاں کی بیوی اس پر نگاہ رکھے گی۔ لونڈیا راہ سے بے راہ نہ ہونے پائے گی۔ رات کو گھر جاتے وقت پھر اسے ساتھ لے جاتا۔ جمن کو یہ ہیرا پھیری پسند نہ تھی۔ اچھے لڑکے کی تلاش تھی۔ کوئی کھاتا پیتا ملے اطوار کا مل جائے۔ تو جمن لونڈیا کا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں پکڑا کر بے فکر ہو جائے۔ ایک دن اُس نے کچھ سوچتے ہوئے منجھو سے کہا۔ "منجھو میاں بہت دنوں سے ہم نے تمہارے ساتھ کھانا نہیں کھایا۔ آج شام کو ہمارے ساتھ دال دلیا کیوں نہ کھاؤ"۔

جب منجھو نے یہ دعوت خوشی خوشی منظور کر لی۔ تو جمن کچھ سویرے ہی دکان بڑھا کر چلا گیا۔ منجھو نے بھی اپنے گھر جا کر چائے پی اور ملازم کو اطلاع دے دی۔ کہ رات کا کھانا۔ وہ گھر پہ نہ کھائے گا۔ صرف شہنشاہ ہی ساتھ رہتا تھا۔ بادشاہ تو علی گڑھ میں تھا۔ کہہ دیا کہ جیسا سے بنا دینا میرا انتظار نہ کریں۔ پھر اُس نے شیو کیا۔ نہایا، کپڑے بدلے، بار بار اپنی صورت آئینے میں دیکھی۔ ۲۵ برس کا ہی مگر شکل سے ۴۵ کا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ رحیمن ہی نہیں، کسی نے بھی اس کی دعوتوں نہ مانی۔ خود شہنشاہ اور بادشاہ کبھی اسکو

باپ سمجھ کر مرعوب نہیں ہوئے۔ اللہ غلام بنائے غلام صورت نہ بنائے۔ اور یہاں تو صورت میں غلام سیرتی بھی جھلک گئی تھی۔ ایسا کوئی ماننے نہیں۔ جو کچھ دوسرے کہیں اسی پر عمل۔

آٹھ بجے کے قریب جب وہ جمن کے گھر پہنچا تو دیکھا۔ اُس کے یہاں خاصی چہل پہل ہے۔ گیس کی کئی لالٹینیں روشن تھیں۔ دالان میں ایک طرف ایک مسہری بچھی ہے، جس پر خوبصورت پلنگ پوش بچھا ہے۔ بقیہ حصے میں دری چاندنی بچھی ہے۔ مسند گاؤ بھی لگا ہے۔ بجھن کی بیوی باورچی خانے میں اور بچھن دسترخوان بچھانے اور کھانا چننے میں مصروف، کھانا سب لذیذ تھا۔ کسی بڑے آدمی کے خانے چالیسویں کا تھا۔ بالکل تورے کا معلوم ہوتا تھا۔

جب کھانا ختم ہوا تو جمن اپنا ڈیڑا ڈنڈا لے کر منجھو کی بغل میں آ کر بیٹھا۔ اور ذرا کھانس کر بولا۔ "منجھو میاں، جب سے تم نے کوٹھی بیچی ہے، میں تمہارے بارے میں یہی سوچ رہا ہوں۔ کہ اب تم کیا کرو گے، کیسے وقت کٹے گا؟"

منجھو نے کہا۔ "یہی تو مجھے بھی فکر ہے۔"

جمن نے پھر ذرا کھانس کر کہا۔ "دیکھو منجھو میاں، مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تمہیں دکان کا کام بہت پسند ہے تو بس ایسا کرو کہ اس میں آدھے کے ساجھے دار بن جاؤ۔"

منجھو نے کہا۔ "چاہتا تو میں بھی ہوں، مگر میرے پاس روپے کہاں ہیں، جس جس سے لکڑی اُدھار آئی تھی۔ سب کا حساب صاف کر کے جو کچھ بچ رہا، میں نے شہنشاہ بادشاہ میں برابر بانٹ دیا۔ اب سب کچھ انھیں کا ہے۔"

جمن نے حقہ منجھو کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ارے تم سے دام کون مانگتا ہے؟ میری ممو کے جہیز میں لے لو۔"

منجھو نے حقے کی نے کی طرف منہ بڑھاتے ہوئے رک کر جمن کی طرف دیکھا۔ پھر کئی کش جلدی جلدی لگائے۔ اور دبی زبان سے اس طرح بولا، گویا اپنے دل ہی سے باتیں کر رہا ہے۔

"مگر۔۔۔ مگر شہنشاہ اور بادشاہ کیا کہیں گے؟"

جمن نے کہا۔ "ارے کہیں گے کیا! تم نے انھیں مکان دے دیا۔ اُن کی پڑھائی کے روپے جمع کرا دیے۔ سال دو سال میں جب وہ ڈاکٹر انجینئر ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں گے۔ تو تمھیں پہچانیں گے بھی نہیں۔ تمہارے بیٹے والی بات تو پھوٹ ہی چکی۔ منجھو خاں کو باپ کہتے ہوئے وہ ابھی سے شرماتے ہوں گے۔ ارے دور کیوں جاؤ، میری گلی میں مل جاتا ہے تو باپ کے سلام کو ہاتھ تک نہیں اٹھاتا۔"

اتنے میں بچھن آ گیا۔ اس نے جمن سے خاص انداز میں کہا۔

"گلی میں مولوی صاحب کھڑے ہیں، بلا رہے ہیں!"

اور جمن کے باہر چلے جانے کے بعد وہ منجھو سے بولا۔ "منجھو میاں! کیا سوچ رہے ہو؟ ارے میاں تم نے ساری جوانی باسی چپاتی چبائی اب تازہ تازہ گرم گرم کڑھائی سے نکلی پوری کھاؤ۔ سچ مانو اس کا مزہ کچھ اور ہی ہے۔"

اور وہ ہنستا ہوا باورچی خانے کی طرف گیا اور وہاں سے ایک لڑکی کو قیمتی دوشالہ اوڑھائے ساتھ لا کر منجھو کی بغل میں بٹھا کر بولا۔ "لو، گھونگھٹ الٹ کر دیکھو، آدھی دکان اور اس پورے مکان کے ساتھ سودا برا نہیں ہے۔"

منجھو نے گھونگھٹ اُٹھا کر دیکھا۔ تو یہ وہی لڑکی نکلی جو غسل خانے میں رحمن کے جنازے کو نہلاتے وقت اس نے چھپ کر دکھائی نظر آئی تھی۔ اور اس کا جوان جسم اسی دوشالے میں لپٹا ہوا تھا۔ جو اس نے جمن کو رحمن کے صندوق پر ڈالنے کے لیے دیا تھا۔ اور دفعتہً ہوا کے ایک

[illegible] کی فضا میں بکھیر دیا اور منجھو کے لیے حجلۂ عروسی بن گئی

منجھو نے چمپو کی طرف اشارا کر کے شرارت سے کہا۔ "ارے ان سے بھی پوچھ لیا ہے ؟"

بجھن ہنس کر بولا "ان سے مولوی صاحب ابھی پوچھ لیتے ہیں" اور اس نے ذرا بلند آواز سے پکارا۔ "جمن چچا، مولوی صاحب کو اندر ہی [illegible]"

اور منجھو نے بجھن کی آنکھ بچا کر چمپو کی ٹھوڑی میں ایک انگلی لگا کر آہستہ سے پوچھا۔ "منظور ہے ؟"

اُس نے جواب میں منجھو کی ران میں اس زور کی چٹکی کاٹی کہ اُس کے منہ سے بے ساختہ اُف نکل گئی۔ مولوی صاحب نے جب دونوں جانب سے وکیل بن کر نکاح پڑھا دیا۔ اور جمن کے دیئے ہوئے دس دس کے پانچ نوٹ جیب میں رکھ لیے تو وہ چلنے کے ارادے سے کھڑے ہوئے اور بولے "جمن میاں میں تو چلا۔ مگر تم بھی جلدی کرو۔"

بجھن نے سوالیہ انداز سے جمن کو دیکھا۔ وہ بولا۔ "مولوی صاحب خبر لائے ہیں کہ مشک گنج والے گونگے نواب چل بسے۔ بیگمات ڈری سہمی بیٹھی ہیں۔ اس لیے راتوں رات اُن کا سب انتظام کرنا ہے۔ آؤ ہم لوگ بھی چلیں۔ بڑے لوگ ہیں اچھے پیسے ملیں گے۔" اور اس کے مسکرانے پر سب کے دانت نکل آئے۔

جب بجھن کی بیوی مولوی صاحب کے لیے سر پر خوان دھرے اور بجھن دو دو لالٹین لیے گھر سے نکلے تو جمن نے منجھو سے باہر جاتے ہوئے کہا "منجھو دولہا ! اندر سے کنڈی بند کر لینا۔" اور قبل اس کے کہ منجھو اپنی جگہ سے اُٹھے، چمپو دلہن جھپٹ کر اُٹھی اور جھپٹ کر کنڈی چڑھا دی۔

قرۃ العین حیدر
سیپ۔ کراچی

میں پوری ڈھونڈن گئی!

رادھیکا پوری آشرم گنگا کنارے بانس کے ہرے بھرے جھنڈ میں چھپا ہوا تھا۔ شاکت اور ویشنو تھائیز کے جدید امتزاج کی وجہ سے آشرم کی تعلیمات بہت مشہور تھیں۔ اتوار کے روز کشتیوں، مضافاتی ٹرینوں، موٹروں اور ٹورسٹ بسوں کے ذریعے گروہ در گروہ عقیدت مند وہاں آتے۔ غیر ملکی سیاح آشرم کے خوش منظر باغات میں ٹہلتے، گایوں اور بھیک مانگتے بچوں کی تصویریں کھینچتے اور غیر ملکی دانشور گیتا اکیڈیمی کے خنک ایوانوں میں سیتل پاٹیوں پر بیٹھ کر ویدانت پر لیکچر سنتے۔

ڈاکٹر سڈنی کمبرلینڈ ان ہی غیر ملکی دانشوروں میں سے تھا۔ اور ہندوستانی فلسفہ پر ایک کتاب لکھنے کی غرض سے آیا تھا۔ جس روز وہ شہر سے رادھیکا پوری پہنچا ایک قومی نیتا وہاں آئے ہوئے تھے۔ ان کی وجہ سے بڑا ہنگامہ تھا۔ ڈاکٹر کمبرلینڈ کچھ دیر تک ادھر ادھر گھومتا رہا۔ گاؤں کے بازار کا چکر لگایا۔ جہاں مٹھائیاں، موتیا پھول اور رادھا کرشنا اور گوری شنکر کی تصویریں بک رہی تھیں۔ اور [illegible] بیچے [illegible] کر رہے تھے۔ پھر وہ آشرم کے عقب میں گنگا کنارے چلا گیا۔ دریا کے چھوٹے پاٹ کے اُدھر بوٹانیکل گارڈن کا سبزہ حد نظر تک پھیلا تھا۔ اور ایک سفید لانچ تیزی سے دور بندرگاہ کی سمت جا رہی تھی۔ وہ گھاٹ کی ایک سیڑھی پر رومال بچھا کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں ایک نوعمر لڑکی نے پیچھے سے آکر اسے مخاطب کیا۔ "ڈاکٹر کمبرلینڈ۔ دیدی آپ کو بلا رہی ہیں۔" وہ فوراً اٹھا اور پورٹ فولیو سنبھال کر لڑکی کے ہمراہ باشا کے ایک خوشنما جھونپڑے میں پہنچا جو آشرم کا دفتر تھا۔

اس دفتر اور کسی اور دفتر میں کوئی فرق نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ یہاں مادی کاروبار کے بجائے روحانی کاروبار کے انتظامات کئے جاتے تھے۔ کونوں میں چند لڑکیاں ٹائپ میں مصروف تھیں۔ وسط میز پر فائلوں کے انبار کے پیچھے دیدی ماں بیٹھی تھیں۔ انھوں نے عینک اتار کر آنکھیں ملیں۔ اور خاموشی سے ایک فارم نووارد کی جانب بڑھا دیا گیا اور اشارہ کیا کہ وہ اس پر اپنے دستخط کردے۔ یہ فارم گیسٹ ہاؤس کے قیام و طعام کے متعلق تھا۔ اس نے دیدی ماں کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور عینک لگا کر پھر لکھنے میں مصروف ہوگئیں۔ ڈاکٹر کمبرلینڈ چند لمحوں تک تذبذب کے عالم میں میز کے سامنے کھڑا رہا۔ گو وہ ہندوستانی روحانیت اور گیان کا دلدادہ تھا مگر وہ یہ نوٹس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ دیدی ماں ایک انتہائی شوخ اور دلکش نوجوان خاتون ہیں۔ وہ اس کی موجودگی کو بالکل نظر انداز کر کے ایک ضخیم رجسٹر میں کھو چکی تھیں۔ ڈاکٹر کمبرلینڈ نے سنا تھا کہ رادھیکا پوری آشرم کے باسی روزمرہ کے کام کاج کو بھی عبادت کا ایک حصہ سمجھتے ہیں اور جس جذب اور استغراق کے عالم میں وہ سنکیرتن کرتے ہیں اسی جذب و استغراق کے ساتھ ہل چلاتے ہیں اور سوت کاتتے ہیں۔ اور چٹائیاں بنتے ہیں۔ ڈاکٹر کمبرلینڈ جھونپڑے سے باہر آگیا۔ اور آشرم کے ایک [illegible] نے اسے اس کے کمرے تک پہنچا دیا۔

سہ پہر کو وہ گیتا اکیڈیمی کی سیڑھیوں پر کھڑا تھا۔ کہ دیدی ماں وہاں آگئیں اور انھوں نے اسے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ اور ساری عمارت کی خاموشی سے

[illegible] ال میں سے گورے تو لڑکوں اور لڑکیوں نے جو نیچی نیچی چوکیوں کے سامنے مطالعے میں مصروف تھے۔ جھک جھک کر دیدی کو پرنام کیا۔ ڈاکٹر کمبرلینڈ کو کیشی کی بوسادی میں چھوڑ کر دیدی ماں ایک طرف کو چلی گئیں

بات کو ڈاکٹر کمبرلینڈ نے ایک جرمن ویدانتسٹ سے پوچھا، جو اس کے پڑوس میں مقیم تھا۔ کہ دیدی ماں اتنی مغرور کیوں ہیں؟ جرمن ویدانتسٹ زور سے ہنسا اور اس نے کہا۔ کہ وہ ہفتے میں ایک دن مرن برت رکھتی ہیں اور آج اُن کے مرن برت کا دن تھا۔

تیسرے روز سڈنی کمبرلینڈ کی ملاقات پھر دیدی ماں سے ہوئی۔ وہ شام کے وقت کتب خانے کی سیڑھیوں پر بیٹھا۔ ایک نیپالی مسودہ پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کہ دیدی ماں اُس کے سامنے آ گئیں۔ اور آکسفوڈ کے لہجے میں اس سے پوچھا کہ میں آپ کی کوئی اعانت کر سکتی ہوں؟ وہ ایک لمحہ کے لیے ہڑبڑا گیا۔ کیونکہ اس انوکھی سی لڑکی سے شام کے جھٹ پٹے میں اس اچانک مڈبھیڑ کی اسے توقع نہ تھی۔ یہ واقعہ تھا۔ کہ بجائے نیپالی سطروں پر غور کرنے کے بجائے وہ پچھلے تین دن سے برابر دیدی ماں کے متعلق سوچ رہا تھا۔ یہ بات بڑی بے ہودہ تھی۔ اور روحانیت کے اس مرکز اور اس مقدس فضاؤں میں اسے ایسا نہ سوچنا چاہیے تھا۔ مگر در اصل حقیقت یہ تھی۔ کہ ایسی مضطرب کرنے والی عورت ڈاکٹر سڈنی کمبرلینڈ نے آج تک نہ دیکھی تھی۔

دیدی ماں بڑی گمبھیرتا کے ساتھ اس سے کچھ فاصلے پر ایک سیڑھی پر بیٹھ گئیں۔ کیس میں سے عینک نکال کر اپنی سرمگیں آنکھوں پر چڑھائی اور دیر سے اس قدیم نیپالی مسودے کے متعلق بتاتی رہیں۔ سڈنی مبہوت اور مسحور ہو کر انھیں دیکھا کیا۔ خدا وندا یہ مجھے کیا ہو رہا ہے اس نے وحشت سے سوچا۔ سامنے سے ایک کشتی گزر رہی تھی۔ مندر میں سندھیا کا کیرتن شروع ہو چکا تھا۔ دیدی ماں نے ایک ادق جملے کی تشریح کرتے ہوئے سڈنی کو ذرا دھیان سے دیکھا۔ اور آہستہ سے اور نرمی سے مسکرائیں۔ اس مسکراہٹ میں اداسی، گہرائی، اور روحانیت، زندگی اور موت، کائنات اور آفاق کے رموز و اسرار اور جانے کیا کیا چھپا ہوگا تھا ہوگا۔۔۔ اگر سڈنی کمبرلینڈ اس تبسم کو ایک عقیدتمند کی آنکھوں سے دیکھتا، مگر اسے محض ایک دلفریب لڑکی کا دلفریب تبسم نظر آیا۔ ایسی لڑکی جو گریٹ ایسٹرن ہوٹل میں بال روم رقص کرنے والے ہندوستانی سوسائٹی گرلز اور شہر کے دانشوروں کی محفل میں شامل ہونے والی سوڈاشلیکول گرلز اور رنگ برنگی ساریوں میں ملبوس گلیمر گرلز سے ایسے انوکھے انداز میں مختلف تھی۔ ساری دنیا سے مختلف تھی۔ مگر اسی دنیا کی اور انھیں لڑکیوں میں ایک ایسی لڑکی تھی۔ جو ایک آشرم میں رہتی تھی۔ اور جس کے اس نام سے وہ واقف نہ تھا۔

اپنے کمرے میں واپس آ کر اس نے اپنے دوست کو کیمبرج خط لکھا: جیری ۔۔۔ کیا تم سوچ سکتے ہو کہ مجھے ہندوستان کی ایک سنیاسن سے عشق ہو گیا ہے ۔۔۔

صبح کو آشرم میں خلاف معمول عجیب سا سناٹا طاری تھا۔ ناشتے کے وقت جرمن پروفیسر نے سڈنی کو آہستہ سے بتایا۔ آشرم کی ایک لڑکی نے جو کئی سال سے یہاں رہ رہی تھی۔ کمیونسٹ دہریے سے شادی کر لی۔ کل آدھی رات کو ایک کشتی گھاٹ پر آ کر لگی۔ اور اس لڑکی کا شوہر اسے اپنے ساتھ بٹھلا کر دوسرے کنارے لے گیا۔ وہ دیدی ماں کی پسندیدہ شاگرد تھی۔ اور دیدی ماں کا خیال تھا کہ وہ روحانی مدارج بڑی تیزی سے طے کر رہی ہے اور وہ ہمیشہ بڑی شردھا سے گایا کرتی تھی۔ آدھی رات پر بھیرو درشن دیجئے۔ پریم ندی کے تیر "

اس کے بعد دیدی ماں کئی روز تک نظر نہ آئیں۔ سڈنی روز شام کو کتب خانے کی سیڑھیوں پر ان کا انتظار کرتا رہا۔ مگر وہ ایک ہفتہ کے لئے "ری ٹریٹ" میں گئی تھیں۔ اُن کے بغیر آشرم سب کو بہت سونا معلوم ہو رہا تھا۔ آشرم کے چار مسن بزرگ کارکن ۔۔۔ باباجی، بڑی ماتا، دادا اور بڑی دیدی ماں کا بہت لحاظ اور خیال کرتے تھے۔ اور اپنی سنجیدگی اور وقار کے باعث وہ اس کم عمری میں بڑے پیار سے دیدی ماں پکاری جاتی تھیں۔

"دیدی ماں کون ہیں؟" اپنے ذہنی اور جذباتی خلفشار سے عاجز آ کر سڈنی نے ایک دن جرمن پروفیسر سے دریافت کیا۔

"کوئی ایسی پراسرار ہستی نہیں۔ شمال کے ایک دولت مند خاندان کی لڑکی ہیں۔ آکسفوڈ میں فلسفہ پڑھا ہے۔ روحانیت کی طرف غالباً لڑکپن سے رجحان تھا۔ ماں باپ نے بیاہ کرنا چاہا۔ مگر انھوں نے ودھیا پیٹھ آشرم میں آ کر رہنا زیادہ مناسب سمجھا۔ چند سطحی لوگوں کا خیال ہے کہ انھیں زندگی میں کوئی مایوسی

ہوتی ہے جس کی وجہ سے دنیا تیاگ دی ہے ہمارے اِن روزن کی قوتیں اپنائیت کے لیے بھی عموماً یہی کہا جاتا ہے کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ ایک خطرناک سیاسی پارٹی سے ان کا کوئی تعلق ہے۔ اور یہاں بھیس بدل کر رہتی ہیں۔ ڈاکٹر مترا کا نظریہ ہے کہ کسی نفسیاتی الجھن کا شکار ہیں اور کسی ماہر نفسیات کے پاس جانے کے بجائے یہاں آگئیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ ...... "اوہ! نمسکار دیدی ماں"

دیدی ماں نزدیک سے گزریں۔ دونوں غیر ملکیوں کے نمسکار کا جواب دیا۔ اور مسکراتی ہوئی آگے چلی گئیں۔

آئندہ ہفتوں میں سڈنی کی دیدی ماں سے روزانہ ملاقات ہوتی رہی۔ دفتر میں دو گھنٹے کام کرنے کے بعد وہ سارے آشرم کا چکر لگاتیں۔ دستی گھر اور ورکشاپ کا معائنہ کرتیں اور گیسٹ ہاؤس کی خیر خبر رکھتیں۔ ان کے لیکچر غیر ملکیوں میں بہت مقبول تھے۔ کیونکہ لب و لہجہ اور انداز بیان کی وجہ سے سامعین کو کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ عجز و انکسار کا مجسمہ تھیں۔ اور سڈنی کے ساتھ خصوصیت سے بہت اخلاق برتتیں۔ اور لیکچر کے بعد دیر تک وقت، ادبیات اور دیگر فلسفیانہ مسائل پر اس سے تبادلہ خیالات کیا کرتیں۔ رفتہ رفتہ سڈنی کیمبرینڈ سے ایک خاص انٹلیکچول سطح پر ان کی دوستی ہو گئی۔ سڈنی ایک روز تالاب کے کنارے ٹہل رہا تھا۔ کہ وہ ورکشاپ کی سمت سے آتی مل گئیں۔ اور انھوں نے نرمی سے پوچھا۔ "کہیے، آپ کا پانچواں باب مکمل ہو گیا؟ یہاں آپ کو کافی بے آرامی ہو گی، کیونکہ یہ بہرحال سادھوؤں کا رین بسیرا ہے۔"

"میں آپ سے کچھ اشد ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"کل تیسرے پہر کو لائبریری میں آجائیے۔" "میں آپ سے ذاتی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"ذاتی ـــ! دادا نے آپ سے بات نہیں کی؟ دادا ہمارے مہمانوں کے مسائل وغیرہ کا حل تلاش کرنے میں ان کی مدد کرتے ہیں، کوئی نظریاتی الجھن ہے آپ کو؟"

"جی ہاں!"

"تو بتائیے میں آپ کی ہر ممکن مدد کروں گی۔"

"میری الجھن یہ ہے کہ ـــ جوان لڑکیاں سنیاس کیوں لے لیتی ہیں؟ یورپ اور امریکہ میں بھی جب کسی حسین اور نوجوان لڑکی کو سر منڈائے واہبہ کو کفن میں لپٹا دیکھتا ہوں تو بہت پریشان اور آزردہ ہو جاتا ہوں۔"

دیدی ماں خاموشی سے اسے دیکھتی رہیں۔ ان کے عقب میں تالاب کی ہری سطح پر سرخ کنول کھلے تھے۔ اور سفید بگلے پانی پر چکر کاٹ رہے تھے قدیم کائی آلود مندر میں سے دیدی ماں کے پسندیدہ بھجن کی آواز بلند ہوئی۔

"ادھر مدھرم، دوتم مدھرم ہنیم مدھرم بلسٹی تم مدھرم۔"

"بتائیے!" سڈنی نے کہا۔

"یہ سری ولبھ اچاریہ کا مدھوراشٹک ہے۔"

"سنیے!" دیدی ماں نے جواب دیا۔

"وچنم مدھرم، چلی تم مدھرم، بھرلی تم مدھرم"

"تبلائیے!" سڈنی نے دہرایا۔

الفاظ پتوں کی طرح آگے پیچھے اڑتے آکر فضا میں بکھرتے رہے ....

"ریفو رمرو، ریفور مدھرو، تریتم مدھرم" "کیتیم مدھرم"

اس کی بانسری مدھر اس ـــ اس کی دوستی مدھر ـ اس کی ـ ـ اس کی ـ دوستی ... مدھر دوھاتا!

معمبد، بلند و بالا سمبل کی خاموش سرسراہٹیں، اپراجیت کی کلیوں نے پتوں میں کروٹ لی۔ کرشن پورہ کی ڈالیاں چاروں طرف سے جھک آئیں۔ شام کے مندر میں جگنو اڑنے لگے۔ دوہا تا ہوا کے زور سے سارا باغ ہل گیا۔
لیکن دیدی تالاب کے کنارے سے جا چکی تھی۔
چار مہینے گزر گئے۔ ڈاکٹر سڈنی کمبرلینڈ کی کتاب مکمل ہو گئی تھی۔ اور وطن واپس جانے والا تھا۔ غروب آفتاب سے ذرا پہلے۔ وہ لائبریری کی کتابیں واپس کرنے کے لیے آیا۔ وہ دھوپ گھڑی کی منڈیر پر بیٹھی تھی۔
"دودھاما!" سڈنی اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ اور اس نے لجاجت سے کہا۔ "ان اعداد کو دیکھو جن پر تم بیٹھی ہو۔"
دودھاما نے گھبرا کر قدیم دھوپ گھڑی کے منقش اعداد پر نظر ڈالی اور جھک کر دھا کی کا پتہ اٹھا لیا جس پر ایک بیر بہوٹی رینگ رہی تھی۔
"ڈارلنگ۔" وہ سر ہاتھوں میں چھپا کر منڈیر پر بیٹھ گیا۔ سندھیا کا وقت آ گیا۔ مندر کے گھنٹے گونجے۔ پجاریوں نے مدھو اشلوک شروع کیا۔ سامنے سے ایک لانچ موجوں کو چیرتی ہوئی گزر گئی۔ سڈنی نے سر اٹھا کر اس سے کہا۔ "دوسرا کنارا۔ ایک مختلف یاترا۔ اور میں۔ ہم تینوں تمہارے منتظر ہیں۔ لیکن ایک دن بہت جلد یہ انتظار بھی ختم ہو جائے گا۔ وقت فلسفیوں کی پروا نہیں کرتا۔"
سڈنی منڈیر پر سے کود کر نیچے پگڈنڈی پر آ گیا۔ جس پر مہکتے ہوئے کرشن پورہ نے سایہ کر رکھا تھا۔
"گنجا دھرا، مالا دھرا، جمنا دھرا، دیتی دھرا۔"
"وقت نکل جائے گا۔ پھر تم بیٹھی ابدیت کو جاتی رہنا۔"
سڈنی نے غصے سے ایک کنکر چڑیوں کے حوض میں پھینکا۔
"گوپی دھرا، لیلا دھرا۔"
سڈنی نے اس کا ہاتھ تھام کر چاہا کہ اسے منڈیر سے نیچے اتار لے۔
"شیشم دھرا۔۔۔ سرشٹی دھرا۔"
ہوا کے تیز جھونکے سے اس کی ساڑی کا آنچل اس کے شانوں سے گر گیا۔
"دلی تم مدھرم اچھلی تم مدھرم۔"
سڈنی نے دہل کر اس پر نظر ڈالی پہلی دفعہ اس نے دیکھا کہ اس دلکش نوجوان عورت کے سر کے بال چھوٹے چھوٹے کٹے تھے! اور اس کا سر پیچھے سے تقریباً منڈا ہوا تھا۔
اس نے کہا تھا۔ "لانچ مجھے لے جانے کے لیے رات کے دس بجے گھاٹ پر آئے گی۔۔۔ میں دھوپ گھڑی کی منڈیر پر ساری رات تمہارے فیصلے کا انتظار کروں گا۔۔۔ یہاں تک کہ دھندلا اجالا گنگا کی لہروں پر پھیل جائے گا۔ اور مندر میں گھنٹے بج اٹھیں گے میں تمہاری راہ دیکھوں گا۔ لیکن لمحوں کے ساتھ یہ انتظار بھی ختم ہو جائے گا۔"
دیدی ماں دھیرے دھیرے چلی کنارے پر آئیں۔ وہ روزانہ کا معائنہ کرنے گیسٹ ہاؤس جا رہی تھیں۔ کل رات کمرہ ۲ کا ڈاکٹر کمبرلینڈ اپنے دیس واپس چلا گیا۔ اور انھیں وہ کمرہ مقفل کرنا تھا۔ کل کی عبادت کے پھول حسب معمول صبح صبح مندر سے لا کر دریا میں بہا دیئے گئے تھے۔ اور بھگوان کے شرنگار کی، سفید کلیاں لہروں پر تیرتی دور نکلی جا رہی تھیں۔ دریا پر جھک کر انھوں نے آہستہ سے کہا۔

جن ڈھونڈا تن پائیاں گہرے پانی پیٹھ
میں بوری ڈھونڈن گئی رہی کنارے بیٹھ

پھر وہ سیدھی کھڑی ہو گئیں۔ دریائی ہوا بہت تیز تھی۔ انھوں نے آنچل سے سر کو اچھی طرح لپیٹا اور جپ مالا کی تسبیح گھماتی گیسٹ ہاؤس کی سمت چلی گئیں۔

صالحہ عابد حسین

صبا حیدرآباد دکن

ماں یا ڈائن؟

اسٹریچر ایک جھٹکے سے آگے بڑھا، نرس نے ساتھ آنے والوں کو ہاتھ کے اشارے سے منع کیا اور سب رک گئے مگر پروین کا باپ سمیع اسٹریچر کے ساتھ ساتھ یوں بندھا ہوا جا رہا تھا۔ جیسے وہ مقناطیس کا بنا ہے۔ اور سمیع لوہے کا۔ پروین کی دادی کا چہرہ سفید پڑا ہوا تھا۔ ہاتھ کی تسبیح کی گردش تیز ہوگئی تھی۔ اور بوڑھی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو تسبیح کے ہر دانے کے ساتھ ٹپ ٹپ گر کر سینے تلے دوپٹے میں جذب ہو رہے تھے۔ اس کی بیقراری سے مانگی دعاؤں نے ڈاکٹروں اور نرسوں کے دل ہلا دیے تھے۔ دو دن اور تین رات کی ہر ممکن کوشش کے بعد اب ایک آخری کوشش پروین کو بچانے کے لئے کی جا رہی تھی ــــ آپریشن! ــــ امید کا ایک باریک سا تارا ابھی تک چاہنے والوں کو سنبھالے ہوئے تھا۔

انوری دو دن سے اسپتال کے کمرے کے ایک کونے میں بے حس و حرکت دیوار سے ٹیک لگائے یوں بیٹھی تھی۔ جیسے وہ انسان نہ ہو، پتھر کی مورتی ہو، نہ وہ روئی پیٹی نہ بچی کے پاس آئی۔ نہ ڈاکٹروں سے اور نرسوں سے سوالات کیے۔ یکساں ٹکٹکی لگائے وہ زمین یا چھت کو تکے جاتی۔ چہرہ پہ وہ دہشت، آنکھوں میں وہ بے حسی کہ دیکھنے والا ڈر جائے۔ ماں، بہن، سسر، نند دوئی، میاں، ہر ایک باری باری یہ کوشش کر چکا تھا۔ کہ وہ کچھ کھا پی لے یا ذرا آرام کرلے۔ مگر ہر ایک ناکام واپس آیا۔ وہ ایسی خونخوار نظروں سے انھیں تکتی جیسے کچا ہی تو کھا جائے گی۔ بھلا اس کے منہ کون لگے۔ جو ڈائن اپنی بچی کا خون کر سکتی ہے اس سے ہر کسی کو ڈرنا چاہیے۔

"ماں ہے یا ڈائن؟ ماں ہے یا ڈائن؟" دبی زبان سے کانا پھوسی میں، اشاروں کنایوں میں کنبے والے، محلے والے آئے گئے یہ جملہ بولنا فرض سمجھتے۔ جو منہ سے نہ کہتا۔ اس کے چہرے اور نظروں میں لفظ ڈائن جلی عبارت میں لکھا نظر آ رہا تھا۔

سمیع نے البتہ کچھ بھی نہ کہا۔ بے قراری میں خون میں لت پت بے ہوش بچی کو اٹھا کر ایک بار اس نے ملامت آمیز نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا ضرور تھا۔ اور پھر سختی سے ہونٹ بند کر لیے تھے۔ پھر بچی کو اپنی ماں کی گود میں ڈال کر ڈاکٹر کو بلانے کے لیے بھاگتا ہوا گھر سے نکل گیا تھا۔ اور دادی جو پوتی کو جان سے زیادہ چاہتی تھی اسے گود میں لیے پلو سے اس کے سر کا خون پونچھتی جاتی۔ اور بلک بلک کر دعا مانگتی جاتی۔ بہو کی طرف اس نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

اسٹریچر جیسے ہی کمرے کے دروازے سے نکلا انوری کے شل ہاتھ پیر میں بجلی کا کرنٹ سا دوڑ گیا۔ آنکھوں میں چمک پیدا،

اور وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل کر اسٹریچر کی طرف لپکی۔ پیچھے سے ایک نرس نے اس کا بازو پکڑ کر روک لیا۔
"بی بی آہستہ آہستہ ——— بچی کو چھونا نہیں۔"
انوری ٹھٹک گئی۔ وہ اپنے ہاتھوں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے ان میں خون بھرا ہو۔
اسٹریچر اب تیزی سے آپریشن تھیٹر کی طرف جا رہا تھا۔ انوری کے لڑکھڑاتے قدم ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ اس کی نظریں اسٹریچر کا پیچھا کر رہی تھیں۔ ننھی پروین کا جسم سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ بس اس کا گلاب کے پھول کا سا چہرہ جو اس وقت بیڑ کے پھول کی طرح زرد تھا۔ کھلا ہوا تھا۔ آنکھیں بند، ہونٹ نیم وا۔ اور ناک اور منہ میں دو پتلی پتلی ربڑ کی نلکیاں لگی ہوئی۔ "ننھی جا رہی تھی ——— اب کبھی نہیں آئے گی ——— کبھی نہیں، کبھی نہیں ———"

آپریشن تھیٹر کا بڑا دروازہ کھلا۔ اندر سفید لباسوں میں ملبوس، منہ پر سفید ماسک چڑھائے ڈاکٹروں اور نرسوں کے جمگھٹ کی ایک جھلک انوری کو نظر آئی۔ "موت کے فرشتے ——— جم موت" کسی نے اس کے دل کے اندر سے کہا۔
تھیٹر کا دروازہ بند ہو گیا۔ ایک لمحے کے لیے ایسا لگا۔ جیسے انوری اپنی بچی کو جم موت سے چھیننے کے لیے دروازے کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گی۔ اس کی آنکھوں میں اس شیرنی کی سی خونخواری تھی۔ جس کا بچہ شکاری چھین لے گیا ہو۔ اور پھر ——— وہ دھم سے زمین پر بیٹھ گئی۔ بند دروازے سے ٹیک لگا لی۔ آنکھیں بند کر لیں۔ دو دن سے جو دماغ سُن تھا۔ اب اس نے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔
"اب میں پنو کو کبھی نہ دیکھوں گی ——— وہ مر جائے گی ——— اچھا ہے مر جائے ——— نہیں تو رُو رُو کر اُسے بھی زندگی بتانی پڑتی ——— پر ——— پر میں نے تو اُسے نہیں مارا ——— وہ تو گر پڑی ——— وہ تو مجھے رونے سے چپ کرانے آئی تھی ——— پھر ——— پھر میں نے اُسے دھکا کیوں دیا؟ ہاں وہ مجھ سے ڈر گئی ——— کیوں نہ ڈرتی ——— کبھی میں نے اسے ماں کا پیار نہیں دیا، محبت سے منہ نہیں چوما، اس کے توتلے بولوں پر میرے دل کے اندر مسرت کے سوتے نہیں پھوٹے ——— میں ہر کسی کا غصہ اور جھنجھلاہٹ اس پر اتارتی رہی۔ میں اسے کوستی، مارتی۔ اپنے پاس سے دھتکارتی رہی ——— کیوں؟ آخر کیا میں سچ مچ ماں نہیں؟ کیا میں سچ مچ ڈائن ہوں؟ کسی ڈائن نے میرے روپ میں جنم لیا ہے؟ ہاں میں ڈائن ہوں ——— جس کو نو مہینے خون جگر دے کر اٹھا کر، مر مر کر جنم دیا، راتوں کو جاگ جاگ کر پالا ——— اسے کھا گئی ——— ڈائن ——— ڈائن!"
آخری لفظ جیسے ایک چیخ کی طرح اس کے منہ سے نکلے اور سمیع نے جو اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ سرد ہاتھ اس کی پیٹھ پر رکھ کر نرم لہجے میں کہا۔
"انوری ——— حوصلہ کرو ——— دعا کرو ——— پنو ابھی ٹھیک ہو جائے گی ———" اور کئی گرم گرم آنسو، انوری کے الجھے، بکھرے، لمبے بالوں میں گر کر جذب ہو گئے۔ انوری کی ساس جو کچھ دور زینے پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھی۔ آہستہ سے اس کے پاس آئی، اپنی تسبیح بہو کے سر پر رکھی اور "یا غفور، یا رحیم" دشافی کے ورد میں اور شدت پیدا ہو گئی۔
انوری کے سلگتے دل، بھڑکتے دماغ اور تپتے ذہن پر کسی نے ٹھنڈے پانی کا چھاپا سا رکھ دیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ ساس اور میاں کے دکھ بھرے چہروں کو چند لمحے دیکھتی رہی۔ پھر آنکھیں بند کر لیں۔ سر دروازے سے جا ٹکا۔ سمیع اس کے برابر بیٹھ گیا۔ اور اس کے گرتے جسم کو اپنی پیٹھ کا سہارا دے دیا۔ "شاید وہ سو گئی ہے ——— یا ——— شاید وہ بے ہوش ہے۔" مگر انوری نہ سوتی تھی نہ جاگتی۔ نہ ہوش میں تھی، نہ بے ہوش ——— اس کے ہاتھ پاؤں اور سارے اعضا بے حس و حرکت تھے۔ مگر دماغ بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ مگر اس کی سوچ کا رُخ حال کی طرف نہیں، ماضی کی طرف تھا۔ گزرے زمانے کی دھندلی اور واضح تصویریں۔ بڑی تیزی سے اس کی بند آنکھوں کے سامنے سے گزر رہی تھیں
اس کی پہلی یاد ہی اتنی رُوح فرسا تھی جس سے وہ آج تک دامن نہ چھڑا سکی تھی۔ ماں نے اس کے منہ سے دودھ چھین لیا ہے۔ اسے زور سے پلنگ پہ پٹخ کر کہتی ہے۔ "منحوس باوا کو کھا گئی" ——— اور بس وہ ڈولتی ٹانگوں سے اس کے پیچھے پیچھے صحن میں آ گئی ہے۔ تو اس کا اپنا باپ پلنگ

پرچپّا دکھائی دیتا ہے۔ جس کے سہرے لال رنگ بہہ رہا ہے ـــ انوری سر سے پیر تک کانپنے لگتی ہے۔ اس کی گھگی بندھ جاتی ہے۔ اس وقت ماں کا ہذ ہنڑ اس کی پیٹھ پر پڑتا ہے۔ مگر فوراً ہی کسی نے اسے گود میں اٹھا کر اپنے گرم و گداز سینے سے لگا لیا۔ "بچاری بچی" اور پھر اسے کچھ خبر نہ رہی۔ یہ تو برسوں بعد اسے معلوم ہوا۔ کہ اس کا باپ جب وہ دو برس کی تھی، کسی حادثہ کا شکار ہو گیا تھا۔ اور اس کو چھاتی سے لگانے والی اس کی خالہ تھی۔

اس کے بعد کی تصویریں دھندلی اور گڈمڈ سی ذہن میں ابھر رہی تھیں۔ ماں کی مار پیٹ، بڑی بہن کا کوسنا کاٹنا، خالہ کی محبت، ماں کا ریشمی کپڑے اور زیور پہن کر اور ڈولی میں بیٹھ کر کہیں جانا۔ خود اس کا لال لال کپڑے میں خوش خوش ماں کے ساتھ پھرنا، ایک لمبے، تڑنگے مرد کا اسے گود میں اٹھا کر منہ چومنا ـــ اس کے مونچھوں کے سخت بال انوری کو اپنے گالوں پر چبھتے محسوس ہونا۔ اس کا رو پڑنا ـــ ماں کا اس مرد سے کہنا، "چھوڑ دو بھی اسے ـــ جنگلی بلّی ہے بالکل" مرد کی خوفناک ہنسی ـــ اس کا ڈر کر ماں کے پلنگ کی پائینتی دبک کر سو جانا ـــ اور پھر جب آنکھ کھلی تو، اس نے اپنے کو اسی خوفناک مرد کی گود میں پایا۔ وہ ماں ماں چلاتی ہے اور اسے کمرے سے باہر لے جانے لگتا ہے۔ وہ ٹانگیں چلاتی ہے۔ چیختی ہے روتی ہے۔ مگر ایک مضبوط گرفت میں ہے۔ اور پھر ایک دم وہ اپنے دانت اس مرد کے کندھے میں گڑو دیتی ہے ـــ ایک زناٹے کا چپت اس کے گال پر پڑتا ہے۔ اور وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔۔۔

انوری کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور گہرے ہو گئے تھے۔ سمیع غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کہیں اسے ہسٹریا کا دورہ نہ پڑ جائے یہاں ـــ اس وقت!

تصویریں اب زیادہ نمایاں اور واضح ہو کر اس کے سامنے سے گزر رہی تھیں۔ وہ خاصی بڑی ہو گئی ہے۔ مگر ماں کی ڈانٹ، مار میں کوئی فرق نہیں آیا سوتیلے باپ کو پہلے دن سے جو اس سے نفرت ہوئی تھی۔ وہ جوں کی توں رہی تھی۔ چھوٹے بہن بھائی پر ماں باپ کی محبت کی برکھا ہوتی وہ ماں کے سینے سے لگ کر سوتے، اور یہ زمین کے سینے میں منہ چھپا کر سو رہتی۔ وہ دنیا بھر کی چیزیں کھاتے، اچھے سے اچھا پہنتے اور یہ بچا کھچا کھا کر، پھٹا پرانا پہن کر دن رات گھر بھر کی خدمت کرتی۔ مگر بدلے میں اسے محبت کے دو بول، تعریف کا ایک جملہ، ہمدردی کی ایک نظر نہ ملی۔ رفتہ رفتہ اس کا مزاج بدلنے لگا۔ سب اسے بدزبان، بدمزاج، لڑاکا، بدتمیز کہتے۔ اور آج ـــ آج پہلی بار اسے احساس ہوا کہ وہ سچ مچ غصہ ور اور بدزبان تھی اور پھر اسے ہسٹریا کے دورے پڑنے لگے۔ وہ اپنے بال خود نوچ ڈالتی، کپڑے پھاڑنے لگتی، ہاتھ پاؤں اینٹھ جاتے۔ منہ سے پھین نکلنے لگتا۔ کچھ لوگوں نے کہا جوان لڑکی ہے بیاہ کر دو۔ ٹھیک ہو جائے گی۔ کچھ نے کہا۔ بھوت پریت کا سایہ ہے۔ جھاڑ پھونک کراؤ۔ مگر ماں کو اس کی فرصت کہاں تھی۔ وہ تو ہر دوسرے سال تخلیق میں مصروف رہتی تھی۔ اس کے دل کے اندر جو، جوالامکھی بھڑکتی رہتی تھی۔ اس کو بجھانے کی فکر کسی کو بھی نہ تھی۔

اور پھر ایک اور تصویر اس کے ذہن پر ابھری۔ اس کی خالہ بڑے چاؤ سے اسے بیاہ کر اپنے گھر لائی ہیں۔ اور اس پر واری نثار ہوئی جا رہی ہیں۔ اس کی بنجر، ویران زندگی میں صرف اُن کی ذات تھی۔ جن کو دیکھ کر جی سے مل کر اس کے دل میں محبت اور نرمی پیدا ہوتی تھی۔

انوری نے آنکھیں کھولیں۔ سمیع پریشان نظروں سے اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھ رہا تھا۔ اور خالہ اسی طرح تسبیح ہاتھ میں لیے دعائیں پڑھ رہی تھیں۔ پل بھر اس کی نظریں ان پر جمی رہیں۔ پھر آنکھیں بند ہو گئیں۔

آہ! وہ پہلی دلکش تصویر! وہ پہلی اور آخری حسین یاد ـــ وجیہہ سمیع سر پر پھولوں کا سہرا لٹکائے اس کے منہ پر سے لال دوپٹے کا گھونگھٹ اٹھا رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں کتنا اشتیاق، چہرے پر محبت و خلوص کا کتنا گاڑھا رنگ تھا۔ اس وقت! اس کے ہونٹوں پر ایسی دلکش مسکراہٹ ابھری، جو سمیع نے پہلی رات اس کے منہ پر دیکھی تھی۔ پھر دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔

مگر ـــ مگر خالہ آخر ماں کی ہی بہن تو ہے ـــ اور سمیع اس کا بیٹا ـــ جانے یہ زہریلا خیال، کب، کیسے اس کے دل میں سانپ کی طرح رینگ گیا۔ اور اب سے خالہ کی ہر بات کا مطلب الٹا نظر آنے لگا۔ وہ پہلے بھی اس کو روکتی ٹوکتی تھی۔ مگر اب جو بات وہ کہتی اُسے کیوں زہر لگنے

تھی۔ ماں بیٹے پر اس قدر واری نثار کیوں جاتی ہے؟ ماؤں کے دلوں میں محبت ہوتی کہاں ہے؟ سمیع اپنی ماں کو اس قدر کیوں چاہتا ہے۔ گھر کا سارا نزلہ اس کے ہاتھ میں کیوں دیتا ہے؟ وہ اپنے گھر میں بھی دوسروں کی دست نگر رہے گی کیا؟ رفتہ رفتہ اس کے مزاج کا اندازہ اپنے پہلے دور سے آگیا۔ روتا جھگڑنا، رونا چیخنا، ساس سے الجھنا، میاں سے بگڑنا۔ پھر ہسٹیریا کے دورے بھی پڑنے لگے۔ ساس بگڑ گئیں "اے لڑکی شریف بہو بیٹیوں کی طرح رہنا ہے تو رہ — یہ چالیں یہاں نہ چلیں گی۔ میرے گھر میں بھوت پریت کا سایہ نہیں ہوتا۔" اور انوری کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ اور ساس سے باقاعدہ ٹھن گئی۔ مگر جب پروین پیٹ میں آئی۔ تو ساس کی محبت کی برکھا پھر ہونے لگی۔ وہ اسے پان پھول کی طرح پھیرتی رہتیں۔ سمیع ہر طرح خاطر خوشامد کرتا۔ اب اس کا مزاج اور صحت ٹھیک ہو گئی۔ اور وہ سنہرے سپنے دیکھنے لگی..... اور جب اس نے پہلی بار پروین کا منہ دیکھا تو جیسے سارے جہاں کی دولتیں اس کے قدموں پر نچھاور ہونے لگیں...

مگر پھر — جانے کیا ہوا — کیسے یہ ہو گیا۔ کہ وہ پروین سے جلنے لگی۔ شاید اس لیے کہ ایک دو بار سمیع نے اُسے بچی کی خاطر غصے سے ٹوکا تھا۔ یا اس لیے کہ ساس بچی پر جان دیتی تھیں۔ اور اس کی ذرا سی تکلیف پر بہو کو ڈانٹتی ڈپٹتی تھیں —۔ اللہ ہی جانے کیا بات ہوئی کہ وہ بچی سے چڑنے لگی — اُس کے رونے پر، بات کو ضد کرنے پر وہ بے تاب غصے سے ہو جاتی — وہ پیار سے ماں کے گلے میں باہیں ڈالتی اور یہ جھٹک دیتی۔ کسی اور سے جھگڑا ہوتا، یا غصہ آتا، وہ سب اس معصوم پہ نکالا جاتا۔ اُسے کوستی کاٹتی "تو مر کیوں نہیں جاتی" یہ تو اس کا تکیہ کلام سا بن گیا تھا۔ مارنا کوسنا ہر ماں کا حق ہے، کوئی اسے کیوں ٹوکتا ہے۔ کیا اس نے بچپن میں ماریں نہیں کھائیں؟ — بچی جتنا اس سے ڈری سہمی رہتی، سمیع جتنا بے تعلق ہوتا جاتا۔ ساس کی ڈانٹ پھٹکار جتنی بڑھتی، بچی سے اس کا سلوک سخت ہوتا جاتا تھا — "میرا کوئی نہیں — کوئی نہیں! — نہ ماں، نہ میاں، نہ خالہ اور نہ اب یہ منحوس بچی — یہ بھی دشمنوں ہی کی لاڈلی ہے۔"

پرسوں کسی بات پہ وہ میاں پر برسنے، ساس سے لڑنے اور سب کو کوسنے کے بعد بیٹھی رو رہی تھی کہ پروین اپنی ڈولتی ٹانگوں سے بھاگتی اس کے پاس آئی۔ اور ماں کے منہ پر منہ رکھ کر بولی — "ماں! تُوتی توں — دادی نے مارا؟" اس نے ایک لمحہ بچی کو دیکھا — پھر انوری بن گئی — "اسے بھی میری ہی طرح زندگی بھر رونا پڑے گا۔ تو پیدا ہی کیوں ہوئی تھی، کم بخت! مری کیوں نہیں" اس نے گرج کر کہا تھا۔ اور جب بچی ڈر کر روتی ہوئی دادی دادی کہتی اونچے تخت سے اُترنے کی کوشش کرنے لگی تو اُسے اور غصہ آیا — "مر کمبخت وہیں جا کر" اُس نے پیٹھ پر ایک دھکا دیا اور ڈھائی سال کی بچی چاروں شانے چت پکی زمین پہ گر پڑی......

انوری کا سارا جسم کانپنے لگا — پروین کا خون آلود چہرہ، ساس کی بھیانک چیخیں، میاں کی بدحواسی، محلے والوں کا ہجوم، اسپتال اور ڈاکٹروں اور نرسوں کا جمگھٹ — اور اب — اب بچی کا آپریشن تھیٹر میں جانا — "اف — وہ گئی — گئی — وہ مر گئی — میں ڈائن ہوں — ڈائن — ڈائن —"

انوری کے منہ سے جھین نکل رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں اینٹھ گئے تھے۔ سمیع نے اُسے اپنے بازوؤں میں سنبھالا! "نوری! انوری ہوش میں آؤ — پروین زندہ ہے — وہ اچھی ہو جائے گی — سنبھلو انوری تماشا نہ بنو!" اور خالہ تسبیح چھوڑ کر ایک کر اس کے پاس آئیں۔ اور اس کا سر چھاتی سے لگا کر آنسوؤں سے ڈوبی آواز میں بولیں "میری بچی دُعا کر — دُعا، اُس رحیم و کریم سے جو ہم سب کے گناہ بخشنے والا ہے — دعا کر — تیری مامتا ٹھنڈی رہے، تیری گود بھری رہے"

انوری ایک دم شانت ہو گئی — آج پھر دہی بیس برس پہلے کی نرم و گرم آغوش اُسے سکون دے رہی تھی۔ تین دن میں وہ

پہلی بار رو پڑی! — شاید زندگی میں پہلی بار اُس کی آنکھیں محبت اور خلوص کے آنسوؤں سے لبریز ہوئی تھیں — وہ خالہ کے پیروں سے لپٹ کر بلک بلک کر رونے لگی۔

اور اُسی وقت آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا — بڑا ڈاکٹر پیشانی سے پسینہ پونچھتا ہوا باہر نکلا۔ اس کے ہونٹوں پر تھکی ہوئی مسکراہٹ تھی — "مبارک ہو مسٹر — آپ کی بچی بچ جائے گی"

اور تین سر ایک ساتھ زمین پر سجدے میں جھک گئے

سویرا۔ لاہور

پیاسی جھیل

ڈلہوزی میں پریم کو دو چیزوں نے بے حد متاثر کیا تھا؛ ایک تو ان زرد پھولوں نے جو ہر موڑ پر مسکراتے ہوئے سامنے آجاتے تھے۔ دوسری پرسندر کور کی بڑی بڑی اداس آنکھوں نے، جنھیں دیکھ کر اسے ان ویران مندروں کا خیال آنے لگتا جن میں کبھی چراغ نہ جلائے گئے ہوں۔

پریم وہاں اپنے دوست سریندر کی کوٹھی میں ٹھہرا تھا، جس کی نچلی منزل میں پرسندر رہ رہی تھی۔ اس کا خاوند، امر سنگھ، امرت سر میں کوئلے اور ڈرائی فروٹ کا کاروبار کرتا تھا اور ان سکھوں میں سے تھا جو داڑھی مونچھ کے بال بھی کترتے ہیں اور پانچوں ’ک‘ بھی سجائے رکھتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی ایک اپنچ کی کرپان دو اپنچ کے کنگھے میں فٹ تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ کڑا اور کچھا بھی اسی میں فٹ کرا لیتا۔

پہلے دن جب پریم اوپر کمرے میں اپنا سامان کھلوا رہا تھا۔ امر سنگھ آگیا۔ معمولی سے تعارف کے بعد ان کے درمیان رسمی سی گفتگو ہوئی۔ اور امر سنگھ واپس چلا گیا۔ تین چار دن وہ عام پڑوسیوں کی طرح ملتے رہے۔ رسمًا دعا سلام ہوتی، خیر و عافیت پوچھی جاتی، پرسندر ایک بار اس کی طرف دیکھتی اور فوراً نظریں جھکا لیتی۔ پریم نے اسے زیادہ تر پڑھتے یا نٹنگ میں محو دیکھا تھا۔ کبھی کبھی وہ اسے سڑک پر اکیلی بھی مل جاتی، لیکن بات نہ ہوتی، وہ اس طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھتے جیسے بہرے ہوں اور انہیں بات کرنے کی ممانعت ہو۔

ایک سہ پہر پریم کمرے میں بیٹھا اس کوئلے والی کی تصویر کو آخری ٹچز دے رہا تھا، جسے وہ روز بکردے کی طرف سے پیٹھ پر کوئلوں کی ٹوکری لادے آتے دیکھا کرتا تھا کہ امر سنگھ آگیا۔ ایزل پر تصویر دیکھ کر اس نے حیرت سے پریم کی طرف دیکھا، پھر تصویر کی طرف دیکھا اور پھر پریم کی انگلیوں پر لگے سیاہ رنگ کو دیکھنے لگا۔ پریم کو امر سنگھ کا یہ انداز کچھ عجیب سا لگا۔ اس نے سگریٹ سلگا کر کہا:

”آئیے، کیسے تکلیف کی؟“

”تو آپ آرٹسٹ بھی ہیں!“ امر سنگھ یہ بھول ہی گیا کہ وہ وہاں فاؤنٹن پن انک لینے آیا تھا۔ ”واہ بھئی! ہمیں پتا ہی نہیں چلا۔“ وہ کھلی داڑھی میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگا۔ ”ویسے میں نے آپ کی داڑھی دیکھ کر سوچا تھا کہ آپ آرٹسٹ ہوں گے۔“

”اس لحاظ سے تو آپ بہت بڑے آرٹسٹ ہوئے۔“

امر سنگھ اس مذاق پر خوب ہنسا۔ وہ خط وغیرہ بھول کر وہیں کشن پر بیٹھ گیا اور تصویر کو غور سے دیکھ کر بولا:

”یہ کسی کوئلے والی کی تصویر ہے۔ پر اس بوڑھی عورت کی تصویر بنانے سے فائدہ! ادھر سے ایک لڑکی گزرتی ہے۔ بڑی BEST چیز ہے۔ اس کی

تصویر بناؤ" بتانے لگا جو بمبئی میں رہتا تھا جس کا STUDIO بہت شاندار
پریم خاموش رہا۔ امر سنگھ اسے اپنے ایک آرٹسٹ دوست کے بارے میں
ہے۔ اس کا اپنا بنگلہ اور کار ہے۔ اور ایک خوبصورت لیڈی سکریٹری ہے۔ آخر میں اس نے زور دے کر کہا:
" بڑی BEST تصویریں بناتا ہے"!
پریم کے انکار کے باوجود وہ اسے اپنے ساتھ نیچے لے گیا پرمندر بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ رسمی سا تعارف ہوا اور امر سنگھ نے بیوی کو چائے تیار کرنے
کے لئے کہا۔ پریم نے میز سے وہ کتاب اٹھالی جو پرمندر چھوڑ گئی تھی۔ ہندی گیتوں کا مجموعہ تھا۔ ہلکے پھلکے رومانٹک گیت تھے۔ اس برہن کے آنسوؤں میں
ڈوبے ہوئے جس کا پریتم پردیس جاکر اسے بھول گیا تھا۔ کتاب رکھ کر پریم کمرے کی چیزوں کا جائزہ لینے لگا۔ آرائش سے سلیقہ اور ذوق سلیم ظاہر تھا۔ میز پوش سے
لے کر ریڈیو تک ہر چیز قیمتی تھی۔ اس نے امر سنگھ کی طرف دیکھا، وہ مسکرا رہا تھا۔ پریم کو متوجہ پاکر وہ پھر اس آرٹسٹ اور اس کی سکریٹری کا ذکر کرنے لگا۔ پریم نے
محسوس کیا کہ اس شخص کو آرٹ سے زیادہ آرٹسٹ اور اس کی سکریٹری میں دلچسپی ہے۔
چائے خاصی پرتکلف تھی۔ جب پرمندر پیالیوں میں چائے انڈیل رہی تھی امر سنگھ اس ٹی سیٹ کے بارے میں بتا رہا تھا کہ وہ انگلش ہے اور اس
نے کلکتے سے خریدا تھا۔ پھر وہ اسے الماری میں رکھے جاپانی TRANSISTER اور TITONI گھڑی کے بارے میں بتانے لگا جو اس نے کلکتے کے
ایک اسمگلر سے خریدی تھی۔
"اپنا یار بن گیا ہے۔ جو چیز چاہو لے لو۔ اس کے پاس لڑکیاں ہیں۔ جو ہانگ کانگ سے مال لاتی ہیں کسٹم والے واقف ہیں۔ شہر کا کوئی پولیس افسر
نہیں جو اس کی کوٹھی پر نہ آتا ہو۔ بڑا BEST آدمی ہے"!
پرمندر خاموش بیٹھی تھی۔ جیسے اسے کسی بات میں دلچسپی نہ ہو کبھی کبھار وہ کوئی پلیٹ اٹھا کر ان کی طرف بڑھا دیتی۔ ایک ثانیہ کو امر سنگھ سے بچا کر پریم اس
کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرتا۔ اور اسے وہ زرد پھول یاد آنے لگتے جو ہر موڑ پر راستہ روک لیتے تھے۔
اس شام وہ کھجیے سیر کرنے گئے۔ پرمندر ان کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی جیسے ساتھ نہیں تھی۔ وہ باتیں کرتے آگے نکل جاتے، پریم پلٹ کر دیکھتا اور
ٹھہر جاتا۔ امر سنگھ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر دھیمی آواز میں کہتا: "آجائے گی"۔ اور باتیں شروع کر دیتا۔ وہ اسے ڈلہوزی کے تمام قابل دید مقامات
کے بارے میں بتاتا رہا اور پروگرام بناتا رہا کہ وہ کب کہاں جائیں گے۔ پریم سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ امر سنگھ ایک دم اس پر اس قدر مہربان کیوں ہو گیا ہے۔
امر سنگھ نے اپنے ہر ملنے والے سے پریم کا تعارف بڑے زوردار الفاظ میں کرایا۔ وہ ہر شخص سے کہتا: "یہ ہندوستان کے عظیم آرٹسٹ ہیں۔
ان کی تصویروں کو کئی انعام مل چکے ہیں۔ اب ان کی تصویروں کی نمائش پیرس میں ہونے والی ہے۔ دلی بمبئی کے بڑے بڑے افسر، سیٹھ اور فلم
لائن کے آدمی ان کے واقف ہیں"۔ پریم تمام وقت بے وقوف بنا کھڑا رہتا۔ اور امر سنگھ اس طرح اسے دیکھتا جیسے منڈی میں فروخت کی غرض سے آیا ہوا
دیہاتی اپنی بھیڑ کو دیکھتا ہے۔ پریم نے محسوس کیا کہ ان تمام باتوں اور تعریفی جملوں سے امر سنگھ کو اس کی عزت افزائی مقصود نہیں، وہ تو صرف اپنے ملنے جلنے
والوں پر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ ہندوستان کا ایک عظیم فن کار اس کا دوست ہے۔
واپسی پر اس نے امر سنگھ سے کہا: "آپ کو غلط نہیں کہنا چاہئے تھا"۔
"وہ کیا کسی سے پوچھنے جائیں گے؟ اس طرح ذرا ٹھاٹھ بندھ جاتا ہے"!
پریم نے کچھ نہیں کہا۔ اس کی گھنی داڑھی مونچھوں کو دیکھنے لگا جن میں اس کے چہرے کے نقوش کہیں گم ہو گئے تھے۔
اب اکثر ایسا ہوتا کہ امر سنگھ اس کے پاس اوپر آ بیٹھتا یا اسے نیچے بلا لیتا۔ اور بڑی تفصیل سے وہ تمام واقعات سنانے لگتا جو اس کے ساتھ
سفر میں پیش آئے تھے۔ اس نے کوئی ایسا سفر نہیں کیا تھا جس میں اسے ایک آدھ لڑکی نہ ملی ہو۔ وہ ان تمام ولایتی شرابوں کے نام گنواتا جو اس نے پی تھیں

بے خبر تھا کہ وہ بمبئی جیسے DRY شہر میں بھی جب چاہے شراب حاصل کر سکتا تھا۔ پرمندر کی موجودگی میں وہ صرف شراب کا ذکر کرتا۔ "لیکن کاؤنٹ کا جواب"، مسکرا کر کہتا "ستر سال پرانی شراب تھی"۔ "یا تیس سال پرانی تھی۔ بوتل فسٹ کلاس۔ لیبل لگا ہوا۔ سیل ابھی نہیں ٹوٹی تھی"۔ اور آنکھ مارتا۔
پریم کچھ جا کر پرمندر اسی نظروں سے ان کی طرف دیکھتی۔ پریم چاہتا تھا کہ وہ باتیں کرے۔ وہ جان بوجھ کر ایسے موضوع شروع کر دیتا جن پر وہ بول سکے۔ لیکن وہ خاموش رہتی۔ پریم کو اکتاہٹ ہونے لگتی اور وہ وہاں سے اٹھ جانے کے بہانے تلاش کرنے لگتا۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ پرمندر اسے باہر کہیں مل گئی، اس نے بات کی اور وہ گھبراہٹ میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اس پر عجیب سا خوف طاری ہو جاتا۔ وہ دو چار باتیں کرتا، وہ نہایت مختصر جواب دیتی۔ اسے خاموش کھڑے دیکھ کر پریم کو وہ پہاڑ یاد آنے لگتے جن پر سارا سال برف جمی رہتی ہے۔ وہ سوچتا اسے بازوؤں سے پکڑ کر اتنا جھنجھوڑے اتنا جھنجھوڑے کہ وہ پھوٹ پڑے، اس کے گرد کھڑی برف کی دیوار پگھل کر گر پڑے۔

ایک دن وہ اپنے کمرے کے باہر بیٹھا تصویر بنا رہا تھا۔ اسے سگریٹ کی ضرورت محسوس ہوئی تو اٹھ کر اندر چلا گیا۔ سگریٹ لے کر نکلا تو اس کی نظر پرمندر پر پڑی۔ وہ شیشے کے قریب کھڑی محویت کے عالم میں تصویر کو دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک سیکنڈ کے لئے دہلیز پر رکا، پھر باہر آ گیا۔ پرمندر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور نظریں نیچی کر لیں۔

"پسند آئی آپ کو؟"

اس کے لبوں میں معمولی سی حرکت ہوئی لیکن اس نے کچھ کہا نہیں اور پاؤں پر بوجھ بدل کر کھڑی رہی۔ پریم نے محسوس کیا کہ وہ چاہ کر بھی نظریں نہیں اٹھا پا رہی۔ وہ ساری میں لپٹے اس کے متناسب جسم کو دیکھ رہا تھا۔ ایک ثانیے کے لئے تمام دنیا کہیں کھو گئی، صرف پرمندر رہ گئی۔ اس کے جی میں آیا اسے بانہوں میں بھر کر لب اس کی آنکھوں پر رکھ دے۔ پھر جیسے ہوش میں آ گیا۔ اس کے سراپے سے نظریں ہٹا کر بولا: "بیٹھئے۔"

"جی، وہ ــــ وہ ــ"

نیچے امر سنگھ کی آواز سنائی دی۔ وہ نوکر کو ڈانٹ رہا تھا۔ پرمندر نے پریم کی طرف دیکھا۔ اور تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی۔ وہ کھڑا سیڑھیوں کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ پرمندر کی آخری نظریں اس کے ذہن کے پردے پر ثبت ہو کر رہ گئی تھیں۔ اسے ان آنکھوں میں کچھ پگھلتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ اس نے مسکرا کر سگریٹ سلگایا اور تصویر میں رنگ بھرنے لگا۔

دوسرے دن سہ پہر کے قریب آسمان پر بادل گھر آئے۔ امر سنگھ نے پریم کو نیچے بلا لیا۔ پرمندر صوفے کے کونے میں بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ پریم سے نظریں ملیں تو اس کا چہرہ ایک دم گلابی ہو گیا۔ وہ کتاب رکھ کر اندر چلی گئی۔ پریم نے کتاب اٹھائی۔ سکاٹ کی IVANHOE تھی۔ امر سنگھ پینے کے موڈ میں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بوتل وہیں منگائی جائے۔ اور اطمینان سے بیٹھ کر پی جائے۔ پریم باہر پینا پسند کرتا تھا۔ امر سنگھ نے الماری سے سولن کی بوتل نکالی۔ اس میں دو ڈھائی پیگ کے قریب بچی تھی۔

"پی کر ہی چلتے ہیں۔" امر سنگھ نے بوتل میز پر رکھ دی اور نوکر سے گلاس اور پانی لانے کے لئے کہا۔ "اس وقت سوڈے کا انتظار نہیں ہو سکتا۔" گلاسوں میں انڈیل کر اس نے بوتل فرش پر لڑھکا دی۔ گلاس ٹکرائے اور اپنا گلاس ایک ہی گھونٹ میں ختم کر کے مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔
"ختم کرو جلدی سے۔"

پریم آہستہ آہستہ پینے کا عادی تھا۔ اس نے تھوڑی سی حلق میں اتار کر کہا: "شراب اور عورت کے معاملے میں جلد بازی نہیں کرنی چاہئے۔"
"ہائے! کیا بات کہہ دی۔ جیو راجہ۔" امر سنگھ شرابیوں کی طرح بولنے لگا۔ "جانی! تمہیں ایک چیز دکھاؤں؟ زندگی بھر یاد کرو گے۔" وہ جا کر الماری میں سے ایک لفافہ نکال لایا اور اس میں سے تصویریں نکال کر پریم کے سامنے میز پر پھیلا دیں۔
وہ سب کی سب ننگی عورتوں کی تصویریں تھیں جسم کی گھٹیا نمائش اور لذتیت کے سوا ان میں کچھ نہیں تھا۔ پریم نے تصویریں لفافے میں رکھ دیں۔

اور سگریٹ سلگا لیا۔

"یہ تصویریں عورت کو دکھا کر بڑا مزہ آتا ہے"۔ امر سنگھ نے کہا۔ اس کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی جو پریم کو سنجیدہ پا کر کہیں مونچھوں میں ہی گم ہو گئی۔ اس نے اٹھ کر لفافہ الماری میں رکھا اور کوٹ پہن کر تیار ہو گیا۔ "آؤ چلیں!"

بارش کی وجہ سے بہت کم لوگ سیر کے لئے نکلے تھے۔ بادلوں کی وجہ سے وقت سے پہلے ہی اندھیرا چھانے لگا تھا۔ کوٹھیوں کی کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔ شیشوں سے روشنیاں جھانک رہی تھیں۔ امر سنگھ نے پھر لڑکیوں کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔ وہ ایک مدراسن کی بات کر رہا تھا جو ہندوستانی بالکل نہیں جانتی تھی اور امر سنگھ اس کی بولی سے قطعاً ناواقف تھا۔ لیکن پھر بھی وہ ساری رات اکٹھے رہے۔

"تم بور نہیں ہو گئے؟" پریم نے حیرت سے پوچھا۔

"بور؟ کیوں؟" وہ ہنسا۔ "وہ تو مدراسن تھی۔ دلی میں مجھے ایک لڑکی ملی جو گونگی اور بہری تھی۔ میں اسے گالیاں دیتا رہا، وہ ہنستی رہی۔ بڑا مزہ آیا۔"

پریم کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ انسان کے ساتھ نہیں درندے کے ساتھ چل رہا ہے۔ اس کی شام بے معانی ہو گئی۔ اس کے بعد امر سنگھ نے اسے کتنا ہی مجبور کیا وہ اس کے ساتھ پینے پر راضی نہیں ہوا۔ اس رات وہ دیر تک کھڑکی میں کھڑا روشنی کی اس مستطیل کو دیکھتا رہا جو امر سنگھ کے کمرے کے باہر بن گئی تھی۔ بار بار اسے اس گونگی لڑکی کا خیال آ جاتا جسے امر سنگھ نے گندی گالیاں دے کر مزہ لیا تھا۔ وہ اس واقعہ کو ذہن سے جھٹکتا تو اسے پرمندر کا خیال آ جاتا اور اس کے ذہن میں اس ریچھ کی کہانی تازہ ہو جاتی جو جنگل میں لکڑیاں تلاش کرتی ایک عورت کو اٹھا لے گیا تھا۔ کہانی سنا کر کرتار نے کہا تھا "بابو جی ریچھ بڑا حرامی ہوتا ہے، نہ عورت کو مارتا ہے نہ چھوڑتا ہے"۔

دو تین روز وہ امر سنگھ سے نہیں ملا۔ اوپر کے راستے سے ہی نکل جاتا۔ اور ان راستوں پر سیر کرتا رہتا جدھر امر سنگھ کے آنے کی امید نہیں ہوتی تھی۔ وہ دیر تک پرمندر کے بارے میں سوچتا رہتا کہ وہ کیسے اس شخص کے ساتھ رہ رہی ہے۔ لیکن پرمندر کے لبوں پر حرفِ شکایت ایک مرتبہ بھی نہیں آیا تھا۔ وہ عام ہندوستانی بیویوں کی طرح رہ رہی تھی۔ جیسے گہرا دریا خاموشی سے اپنے کناروں کے درمیان بہتا رہتا ہے۔

اس روز وادی پر گہری دھند چھائی ہوئی تھی۔ چند قدم کے فاصلے پر ہر چیز گہرے دودھیا پردے میں چھپ گئی تھی۔ پریم نے ڈاک خانے جا کر چند خطوط کا جواب دیا اور باہر آ گیا۔ وہ کمرے سے صرف اس لئے نکل آیا تھا کہ امر سنگھ اسے بلانے آیا تھا۔ اس روز امر سنگھ نے جوئے کا انتظام کیا تھا اور اپنے چند دوستوں کو بھی بلایا تھا۔ ان کا پروگرام اس دن فلاش کھیلنے کا تھا۔ پریم کو فلاش سے کوئی رغبت نہیں تھی اور نہ ہی امر سنگھ کے ساتھ بیٹھ کر پینا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دو پیگ پی کر ہی امر سنگھ بہکی بہکی باتیں شروع کر دے گا۔ لڑکیوں کے عجیب قصے سنائے گا: وہ لڑکی جو ان کے لئے شراب اسمگل کرتی تھی، وہ لڑکی جو شراب پی کر تمام کپڑے اتار دیتی تھی اور جسے دیکھ کر سیاہ چٹان کا خیال آتا تھا۔ پریم کو ان باتوں سے سڑاند آنے لگی تھی۔ اسے احساس ہوتا اس کے گرد لاشوں کا ڈھیر لگا ہے۔ وہ طبیعت خراب ہونے کا بہانہ کر کے کھسک آیا تھا۔

ڈاک خانے کے چوک میں کھڑے ہو کر اس نے تمام راستوں پر نظر دوڑائی۔ وہاں دھند چھائی ہوئی تھی۔ ایک دکان میں بلب روشن تھا اور دھند میں کسی بیمار کی آنکھ کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ دکاندار گڑگڑی لئے، گھٹنوں پر کمبل ڈالے، دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ پریم نے اس کا خاکہ سا لیا اور پھر خالی الذہن ہو گیا۔ اور یونہی واٹر ورکس والی سڑک پر ہو لیا۔

وہ سڑک واٹر ورکس جا کر ختم ہو جاتی تھی۔ جہاں داخلہ بغیر پرمٹ کے ممنوع تھا۔ اس لئے لوگ ادھر نہیں جاتے تھے۔ استعمال نہ ہونے کی وجہ سے سڑک تقریباً کباڑیے کی دکان کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ لید، بسکٹوں اور جیم کے خالی ڈبے، خالی ٹوٹی ہوئی شیشیاں، استعمال شدہ بلیڈ، حاجت کے بعد جو سڑک سے چپک گئے تھے، جھاڑیوں میں اٹکے ہوئے کپڑے جو بارش اور ہوا کی وجہ سے اپنی اصل شکل کھو چکے تھے اور معنی خیز سے لگتے تھے اور کہیں کہیں بیڑیوں کے آدھے جلے ٹکڑے نظر آ جاتے جو واٹر ورکس کے [illegible] کے عملے کے آدمی آتے جاتے پھینک جایا کرتے تھے۔

اچانک ایک موڑ پر اسے پرمندر دکھائی دے گئی۔ وہ سڑک کے کنارے ایک پتھر پر اس کی طرف پیٹھ کئے بیٹھی تھی۔ اور ڈھلوان پر کھڑے گھنے درختوں کو دیکھ رہی تھی۔ دھند کی وجہ سے پریم ایک دم اسے نہیں پہچان سکا تھا۔ لیکن ایک عورت کو اکیلے اس سنسان سڑک پہ بیٹھے دیکھ کر حیران ضرور ہوا تھا۔ قریب پہنچنے پر جب وہ آہٹ پاکر چونکی تو وہ اسے پہچان گیا۔ شاید تنہائی میں ایک غیر مرد کو اس قدر قریب پاکر وہ گھبرا گئی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ کھڑی ہو گئی۔

"آپ تو ڈر گئی تھیں۔"

پرمندر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ قدموں میں پڑے ایک خالی ڈبے کو دیکھتی رہی۔ پریم ایک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ دھند میں لپٹی وہ دیولوک کی کوئی اپسرا معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے سرخ ہونٹ دھند میں گلاب کی بھیگی پتیوں کی طرح ہل رہے تھے۔ اس کے دونوں ہاتھ پہلو میں لٹکے تھے۔

"آپ تو یوں کھڑی ہیں جیسے باس کے سامنے بیٹھی ہوں، بیٹھ جائیے۔"

"جی۔ جی۔ وہ۔" اس نے پریم کی طرف دیکھا۔ پریم کو ان آنکھوں میں پھر وہی کچھ پگھلنے کا سا احساس ہوا۔ "آپ نے مجھے اِدھر آتے دیکھا تھا؟"

"آپ اِدھر آنا کیا پاپ سمجھتی ہیں؟"

"نہیں، یہ بات نہیں، یونہی۔"

"بیٹھ جائیے، کھڑے کھڑے آپ تھک جائیں گی۔"

وہ پتھر پر بیٹھ گئی۔ پریم موسم کا ذکر کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ وہ بھی گفتگو میں حصہ لینے لگی۔ جلدی ہی اس کا خوف اور جھجک دور ہو گئی۔ اب اس کی باتوں میں روانی آ چلی تھی۔ کبھی کبھی وہ مسکرا بھی دیتی۔ جب پریم نظر بھر کر اس کی طرف دیکھتا تو وہ ایک دم شرما جاتی اور بات بھولنے لگتی۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" پریم نے سگریٹ سلگا کر کہا۔ "آپ اس سنسان سڑک پر اکیلی بیٹھی ہیں۔"

"مجھے اچھا لگتا ہے۔"

"کچھ سوچ رہی تھیں؟"

"نہیں۔"

چند منٹ کے لئے ان کے درمیان خاموشی چھا گئی۔ درختوں میں بلبلیں بولنے لگے تھے اور دھند پھر گہری ہونے لگی تھی۔ دور نیچے کسی کوٹھی میں کوئی عورت اونچی آواز میں کسی سے کچھ کہہ رہی تھی۔ سڑک پر کسی کے بھاری قدموں سے چلنے کی آواز سنائی دی۔ پرمندر ایک دم خوف زدہ سی ہو کر سننے لگی۔

"کوئی آ رہا ہے۔"

"پھر کیا ہوا!"

"ڈلہوزی چھوٹی سی جگہ ہے، کوئی دیکھ لے گا تو۔" ایک دم وہ خاموش ہو گئی۔ جیسے کوئی غلط بات کہہ گئی ہو۔

واٹر ورکس کا ایک چوکیدار انہیں سلام کرتا گزر گیا۔ پریم نے مسکرا کر پرمندر کی طرف دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ پرمندر نے جھکتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔ اس کے دونوں ہاتھ گود میں پڑے تھے۔ وہ کبھی انگلیاں پھیلا دیتی کبھی سکیڑ لیتی۔

"خواہ مخواہ نہیں ڈرنا چاہئے۔" پریم نے جذبات سے مغلوب آواز میں کہا۔

وہ ویسے ہی انگلیاں پھیلاتی اور سکیڑتی رہی۔ پریم ایک لمحہ کھڑا اسے دیکھتا رہا، پھر جھک کر اس کے ہاتھ تھام لئے۔ پرمندر کے جسم میں جھرجھری سی ہوئی۔ اس نے پگھلتی ہوئی نظروں سے پریم کی طرف دیکھا۔ اس کے لب کپکپا رہے تھے، ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔ اس نے بہت آہستہ سے ہاتھ پریم کے

ہاتھوں سے نکالنے کی کوشش کی، لیکن پریم نے اپنی گرفت قدرے مضبوط کر دی اور اسے اپنے قریب کر لیا۔ وہ نظریں جھکائے کھڑی رہی۔

"پرمندر۔" اس نے دھیرے سے کہا۔

"جی۔"

"میری طرف دیکھو۔"

بڑی مشکل سے وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ سکی۔ وہ جلدی میں گردن جھکا لیتی لیکن پریم نے انگلی اس کی ٹھوڑی کے نیچے رکھ دی۔ اس کی پلکیں کپکپائیں اور پھر آنکھوں پر بھاری پردوں کی طرح گر گئیں۔ پریم نے ہاتھ اس کی کمر میں ڈال دئے اور اس کے لبوں پر جھک گیا۔ وہ تڑپ کر اس کی باہوں سے نکل گئی۔

"نہیں۔"

"کیا نہیں؟"

"اب چلنا چاہئے۔"

پریم اسے غور سے دیکھتا رہا۔ اس کا رنگ سفید ہو رہا تھا اور وہ بار بار گھبراہٹ کے سے انداز میں ہاتھوں کی انگلیاں مل رہی تھی۔ وہ مسکرایا۔ اس نے سوچا: پہلی ملاقات ہے۔ کوئی ایسی بات یا حرکت نہیں کرنی چاہئے جس سے پرمندر اس کے بارے میں کوئی غلط رائے قائم کرے یا گھٹیا تاثر لے۔

"چلو۔"

وہ ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ وہ اسے ان ناولوں کے بارے میں بتانے لگی جو اس نے پڑھے تھے۔ وہ اس طرح سنتا رہا جیسے پوری دلچسپی لے رہا ہو، حالانکہ وہ صرف یہ سوچ رہا تھا کہ اگلی ملاقات پرمندر کے ساتھ کیسے اور کہاں ہونی چاہئے اور تب اس کا کیا رول ہوگا۔ یہ وہ سمجھ چکا تھا کہ پرمندر کانچ کا برتن ہے جسے نہایت احتیاط سے چھونا ہوگا، غلطی ہونے پر برتن ٹوٹ سکتا ہے یا ہاتھ زخمی ہو سکتا ہے۔

اب وہ اس موڑ پر آ گئے تھے جہاں سے چند قدم کے فاصلے پر سڑک ڈاک خانے کے چوک میں داخل ہوتی تھی۔ پرمندر ایک دم رک گئی۔ پریم اس کا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے بغیر کچھ کہے اس کے ہاتھ تھام لئے اور دھیرے دھیرے دبانے لگا۔ وہ نظریں جھکائے خاموش کھڑی رہی۔ اسے دیکھتے ہوئے پریم کو احساس ہوا کہ وہ عجیب سی ہم سفر ہے۔ جیسے کشتی کے قریب جھیل میں چاند کا عکس ہو۔

"میں کل وہیں پتھر پر تمہارا انتظار کروں گا، اسی وقت۔"

"کل نہیں۔ میں روز اس طرح نہیں آ سکتی۔ پھر کبھی سہی۔"

"کب؟" پریم نے بیتابی سے پوچھا۔ "پرسوں!"

"نہیں، میں خود بتا دوں گی۔"

"میں مر جاؤں گا۔ زیادہ دیر انتظار نہیں ہو سکے گا۔"

وہ مسکرا دی۔ "انتظار میں بڑا مزا ہوتا ہے۔"

پریم نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور ہاتھ چوم کر ڈھلوان پر اتر گیا۔ چند قدم اتر کر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ پرمندر تھوڑی دور جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اور اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پریم نے الوداع کے انداز میں ہاتھ ہلایا اور گنگناتا ہوا نیچے اتر گیا۔

پریم اب امر سنگھ سے ملتا تو اسے عجیب سا احساس ہوتا۔ وہ چاہتا اس کے سامنے بیٹھ کر ہنستا رہے۔ بات کرتے کرتے وہ غور سے امر سنگھ کے

پریم کو دیکھتا۔ امر سنگھ چہرا اس سے پوچھتا: کیا بات ہے؟" وہ مسکرا کر "کچھ نہیں" کہہ دیتا۔ اور باتیں کرنے لگتا۔ امر سنگھ کی باتیں اب اسے بیہودہ لگتی تھیں۔ لیکن وہ برداشت کرتا رہتا۔ اس کی فضول اور بیہودہ باتیں سن کر وہ سوچتا: عورت کے لئے تو اس کے کہنے سے بھی محبت کرنی پڑتی ہے۔ وہ اگر دیکھتا تو پرمندر کو جیسے کچھ ہو جاتا۔ بار بار وہ کتاب سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھتی۔ وہ مسکراتا تو اس کے لئے مسکراہٹ چھپانی مشکل ہو جاتی وہ اٹھ کر اندر چلی جاتی۔ لیکن جلدی ہی لوٹ آتی۔ کسی نہ کسی بہانے سے وہ کمرے میں پریم کے نزدیک رہنے کی کوشش کرتی۔ امر سنگھ اگر اٹھ کر اندر جاتا تو وہ ایک دوسرے کو خاموش سلام کر لیتے۔ پریم اشارے سے اسے اپنے قریب بلاتا۔ وہ شرمانے سے انکار کر دیتی اور اشارے سے سمجھاتی کہ ابھی امر سنگھ آجائے گا۔ پریم کو اس کھیل میں مزا آنے لگا تھا۔ پرمندر بھی محظوظ ہوتی تھی۔ پریم اگر امر سنگھ کی غیر حاضری میں نیچے چلا جاتا تو وہ ایک دم گھبرا جاتی۔ تنہائی میں وہ پریم سے نظریں بھی نہ ملا سکتی اور باہر نکل آتی۔ پریم کمرے میں بیٹھا دو چار منٹ اس کا انتظار کرتا۔ لیکن وہ ریلنگ پر جھکی نیچے بستیوں کے مکانوں کو دیکھتی رہتی۔ پریم جھنجھلا کر لوٹ آتا۔ وہ سوچتا۔ اس ڈرامے کو ختم کر دے گا۔ یہ بے معنی اور فضول کھیل زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا۔ چند منٹ کی محتاط اشارے بازی کے بعد اسے بوریت کا احساس ہونے لگتا۔ پرمندر اسے قریب نہیں آنے دیتی تھی۔ لیکن جب وہ اسے باہر کسی سنسان مقام پر ملتی تو پریم سب کچھ بھول جاتا۔ وہ اس کے ہاتھ تھام لیتا۔ اور پرمندر ان رومانٹک وادیوں کا ذکر کرنے لگتی جو پہاڑوں کے پیچھے دنیا سے دور کہیں چھپی ہوئی تھیں۔ اور جن میں خوبصورت پھول مہکتے تھے۔

پریم کو ایک شام وہ سیڑھیوں میں مل گئی۔

"چار بجے میں وہیں پتھر پر ملوں گی۔"

پریم خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے سے لگتا تھا کہ اسے یہ سن کر کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ پرمندر نے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور قدرے ٹھنڈی آواز میں بولی: کیا بات ہے؟"

"میں سوچتا ہوں کیا فائدہ ہوگا۔ تمہارے پاس بیٹھ کر بھی مجھے یہ احساس رہتا ہے کہ ہمارے درمیان بہت زیادہ فاصلہ ہے۔ تم مل کر بھی نہیں ملتیں!"

"فائدہ!" پرمندر نے پژمردہ سے لہجے میں کہا، "میں تمہیں اوروں سے الگ سمجھتی تھی۔ تم۔ تم۔" اس کا گلا رندھنے لگا۔ وہ تیزی سے نیچے اتر گئی۔

اس شام پریم پانچ بجے تک پتھر پر بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا۔ لیکن وہ نہیں آئی۔ مایوس ہو کر وہ لوٹ آیا۔ ہر موڑ پر وہ سوچتا کہ وہ سامنے سے آتی مل جائے گی۔ سڑک ختم ہو گئی، وہ ڈاک خانے کے چوک میں آگیا۔ لیکن پرمندر دکھائی نہیں دی۔ اچانک پریم کو احساس ہوا کہ وہ چغد ہے، اتنا عرصہ بے وقوف بنتا رہا ہے۔ پرمندر اسے اس دریچے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی۔ جو اس کی زندگی کی کال کوٹھری میں کھل گیا ہے۔ اس نے تازہ سلگایا سگریٹ سڑک پر پھینک کر مسل دیا اور اس طرح HOLIDAY INN کی طرف چل دیا۔ جیسے کوئی آخری فیصلہ کر لیا ہو۔ اندر کھڑکی کے ساتھ امر سنگھ اپنے دو دوستوں کے ساتھ بیٹھا پی رہا تھا۔ پریم ایک لمحے کو ٹھٹکا، پھر آگے بڑھ گیا۔ اس نے سوچا: اگر وہ بیٹھا تو لپٹ پڑے گا۔

چیئرنگ کراس پار کر کے وہ اسما میں جا بیٹھا۔ ہال خالی پڑا تھا۔ کافی کا آرڈر دے کر وہ پرمندر کے بارے میں سوچنے لگا: وہ آخر اس سے کیوں ملتی ہے؟ ان ملاقاتوں کا انجام کیا ہوگا؟ وہ ایک امیر آدمی کی بیوی ہے۔ پھر اسے غیر مرد کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ اچانک دروازہ کھلا اور ایک عورت اندر داخل ہوئی۔ اس نے ہال پر طائرانہ نظر ڈالی اور پریم کے سامنے والے صوفے پر آ بیٹھی۔ پریم اسے دیکھتے ہی پہچان گیا۔ وہ وہی کوگز والی عورت تھی۔ جسے اس نے پہلے روز پٹھان کوٹ اسٹیشن پر دیکھا تھا۔ صبح چھ بجے وہ پورے میک اپ میں گاڑی سے اس طرح نکلی تھی۔ جیسے فریج سے فروٹ کریم برآمد ہوتی ہے۔ انہوں نے ڈلہوزی تک ایک ہی بس میں سفر کیا تھا۔ وہ پہلی نظر میں ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ ان عورتوں میں سے ہے جو باقاعدہ طور پر لائسنس لے کر کوٹھے پر تو نہیں بیٹھتیں، لیکن پیشہ کرتی ہیں۔ وہ اپنے گاہکوں کو یہ محسوس کرانا چاہتی ہیں کہ وہ ایک باعزت عورت کے پاس آئے ہیں، کسی کسبی کے ہاں نہیں۔

عورت نے اپنے لئے آملیٹ منگا لیا تھا۔ اور اب ٹماٹو ساس کے ساتھ کھا رہی تھی۔ پریم نے کافی پیتے ہوئے سوچا کہ عورت کا وجود زندگی کے آملیٹ کے لئے چٹنی کا کام دیتا ہے۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا، وہ بھی مسکرا دی۔ کافی ختم کر کے وہ اس کی ٹیبل پر جا بیٹھا۔ پریم نے بل ادا کیا اور وہ ہاتھ میں ہاتھ دیئے باہر نکل گئے۔

وہ دیر تک سڑکوں پر گھومتے رہے۔ تھوڑی دور چل کر وہ رک جاتی اور مسکرا کر کہتی: "میں تھک گئی ہوں"۔

جب اس نے چوتھی مرتبہ یہ الفاظ دہرائے تو وہ ایک موڑ پر کھڑے تھے۔ سڑک پر دور تک کوئی آہٹ نہیں تھی۔ دور نیچے کشور لوگ کی مختصر سی آبادی میں چراغ جل چکے تھے۔ اور ان کے اوپر ایک درخت کا گھنا سایہ تھا۔ پریم نے اس کے ہاتھ تھام لئے اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اسے لگا جیسے وہ عورت ایک ایسا مکان ہے جس کے تمام دروازے اور کھڑکیاں کھلی ہوں۔ اس کے ہونٹوں کے خم میں بے پناہ جنسی کشش تھی۔ عورت کو بانہوں میں لے کر وہ اس کے لبوں پر جھک گیا۔ وہ مچل کر اس کے بازوؤں سے نکل گئی اور ہنسنے لگی۔

"اوہ!" پریم نے جیسے کچھ سمجھتے ہوئے کہا اور جیب سے دس دس کے دو نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔ نوٹ پرس میں ڈال کر وہ اس طرح اس کے قریب آ گئی جیسے وزن کرنے والی مشین میں سکہ جاتے ہی کھٹ سے ٹکٹ باہر آ جاتا ہے۔ پریم پھر اس کے لبوں پر جھکا۔ لیکن اسے اپنے اندر برف گرتی محسوس ہوئی جیسے سب کچھ ٹھنڈا ہو گیا ہو۔ اس نے اس طرح اس کے لب چومے جیسے کوئی جھوٹی قسم کھانے والا عدالت میں کتاب مقدس کو چھوتا ہے۔

وہ پھر ٹہلنے لگے۔ ایک چھوٹی سی خوبصورت کوٹھی کے سامنے پہنچ کر وہ رک گئی۔

"میں یہاں رہتی ہوں"۔

پریم نے کوٹھی کی طرف دیکھ کر سر کو ہلکی سی جنبش دی اور عورت کا ہاتھ دبا کر جدا ہو گیا۔ عورت نے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ کندھے اچکائے اور کوٹھی میں داخل ہو گئی۔

پریم اب جان بوجھ کر پرمندر سے بھی کترانے لگا۔ اگر وہ اس کے سامنے آ جاتی تو پریم اس طرح پیش آتا جیسے وہ ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہوں۔ پرمندر بڑی اداس اور کھوئی کھوئی سی نظروں سے اسے دیکھتی۔ پریم کو اس پر ترس آنے لگتا، لیکن وہ جی کڑا کئے رہتا۔ وہ نسبتاً زیادہ وقت نیچے امر سنگھ کے ساتھ گذارنے کی کوشش کرتا۔ لیکن جب وہ تنہا ہوتا تو صرف پرمندر کے بارے میں سوچتا۔ اس کی روح اور اس کا جسم سلگتے رہتے اور وہ اکیلا سڑکوں پر گھومتا رہتا۔ جب وہ خود سے بھی بور ہونے لگتا تو HOLIDAY INN میں جا بیٹھتا، اور جب ذہن گھومنے لگتا وہ لڑکھڑاتے قدموں سے باہر آ جاتا۔ وہ دیر سے گھر لوٹتا اور لیٹ کے سو رہتا۔ صبح جب ذہن صاف ہوتا تو وہ اپنی آوارہ گردی اور "ڈیڈ اسپیٹ" پر ہنستا، لیکن شام ہوتے ہوتے اس پر پھر وہی اداسی اور فرار کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ پرمندر کو دیکھ کر یہ کیفیت ایک دم شدید ہو جاتی۔

ایک شام وہ (HOLIDAY INN) میں داخل ہوتے ہی لگا تھا کہ وہی عورت پھر دکھائی دی۔ اسے پرمندر کا خیال آیا۔ اس کے ذہن میں آگ سی سلگ اٹھی اور وہ کچھ سوچے سمجھے بنا عورت کی طرف بڑھ گیا۔ وہ مسکرائی۔

"کہاں جا رہی ہو؟"

"کہیں نہیں۔"

"تو آؤ کہیں چلیں۔"

وہ ہنس دی اور وہ ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ پریم کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کیوں اور کدھر جا رہا ہے۔ وہ صرف پرمندر سے بدلہ لے رہا تھا۔ وہ بار بار سوچ رہا تھا کہ پرمندر مل جائے، وہ دیکھ لے کہ عورت تلاش کر لینا کوئی مشکل نہیں ہے۔ وہ دیر تک اسے لئے ٹہلتا رہا لیکن پرمندر نہیں ملی

سے ایک دم غصہ آنے لگا۔ اندھیرا بڑھ گیا تھا، بہت کم لوگ باہر رہ گئے تھے۔

"تمہارے ہاں چلتے ہیں۔" پریم نے کہا۔

وہ محض ہنس دی۔ پریم جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس کے ساتھ چلتا رہا۔ وہ اس وقت بالکل خالی الذہن تھا، کچھ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ کوٹھی کے گیٹ پر رک کر اس نے سگریٹ سلگایا۔ برآمدے میں بیٹھے نوکر نے ان کے لئے دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ اندر جا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ عورت اس کے ساتھ آ بیٹھی۔ چند منٹ وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ اچانک اس عورت نے ہنس کر پوچھا:

"وہ عورت تمہاری پرانی واقف ہے یا یہاں ملاقات ہوئی ہے؟"

پریم نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ایک منٹ کو وہ کچھ نہیں سمجھ سکا۔

"کون؟"

"وہی سردار کی بیوی۔" اس کے چہرے پر معنی خیز ہنسی پھیل گئی۔

پریم نے دھوئیں کا مرغولہ چھت کی طرف اڑا کر کہا: "ہم ایک ہی کوٹھی میں رہتے ہیں، بس۔"

"میں نے اسے تمہارے ساتھ دیکھا ہے۔"

پریم نے محسوس کیا کہ وہ بھڑک اٹھے گا۔ اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا دیا اور اس عورت کی طرف دیکھ کر قدرے سنجیدگی سے کہا:

"پھر میں تمہارے پاس کیا کرنے آتا؟"

وہ خاموش ہو گئی۔ پریم چند سکنڈ جیسے اپنے اندر اٹھنے والے کسی طوفان سے لڑتا رہا، پھر اس نے جیب سے دس دس کے دو نوٹ نکالے اور میز پر رکھ دیئے۔ عورت نے پریم کی طرف دیکھا اور روپے اٹھا کر الماری میں رکھ آئی۔ لوٹ کر وہ پلنگ کے قریب رک گئی۔

کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ ٹیبل لیمپ کی مدھم سی روشنی گلابی شیڈ میں سے چھن کر عورت کے سراپے پر پڑ رہی تھی۔ کھڑکیاں بند تھیں اور ریشمی پردے بیر پیسے پڑے ہوئے تھے۔ پریم نے سگریٹ سلگا لیا اور صوفے کی پشت پر سر ٹکا دیا۔

وہ ایک منٹ خاموش کھڑی رہی، پھر ایک ایک کر کے اس طرح کپڑے اتارنے لگی۔ جیسے سبزی چھیلی جاتی ہے۔ اب وہ پریم کے سامنے بالکل ننگی کھڑی تھی اور اس مدھم سی روشنی میں اس کا جسم گوشت کا ایک بے ہنگم سا تودہ معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اس طرح اس کے جسم کا جائزہ لے رہا تھا جیسے جغرافیہ دان دنیا کا نقشہ دیکھتے ہیں۔ اس کا پیٹ ڈھلک آیا تھا، چھاتیاں اپنی سختی نہ جانے کب کی کھو چکی تھیں اور اس کے جسم کے زاوئے اور خطوط گوشت کی بھرپور فصل میں گم ہو گئے تھے۔ پریم اپنی جگہ پر جیسے برف ہو گیا تھا۔ اسے وہ جسم گاؤں کے اس کچے راستے کی مانند معلوم ہوا جس پر راہ گیروں کے قدموں کے نشان نظر آتے ہیں۔ وہ اس قافلے میں شامل ہونے آیا ہے؟ اس نے سوچا اور نظریں جھکا لیں۔

وہ کھڑی چند سکنڈ اسے دیکھتی رہی۔ آہستہ آہستہ اس کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا، اس کے لب کپکپا رہے تھے۔ وہ حیران تھی یہ کس قسم کا آدمی ہے۔

وہ سگریٹ بجھا کر اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"ٹھہرو۔" وہ تقریباً چیخی اور تیزی سے اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں یا چہرے پر عریانی کا کوئی احساس یا شرم نہیں تھی، ایک غصہ تھا۔

"اپنے روپے لیتے جاؤ۔" اس کا چہرہ تمتما رہا تھا: "میں نے تم جیسے کئی امیرزادے دیکھے ہیں۔ تم خود کو سمجھتے کیا ہو؟ کیا سمجھ کر مجھ سے ملتے ہو؟ میں نے کوئی مندر نہیں کھول رکھا جہاں تم چند لمحوں کے لئے آتما کی شانتی کے لئے آ بیٹھو۔ میں پیشہ کرتی ہوں۔ لیکن کسی حرامزادے کو میری بے عزتی کرنے کا حق نہیں ہے سمجھے! دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

الماری سے چالیس روپے نکال لائی اور اس کے منہ پر دے مارے۔ پریم نے اس کی طرف دیکھا، وہ ابھی تک ننگی کھڑی تھی۔ اس نے بغیر کچھ کہے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ اس رات وہ دیر تک سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہا۔ آدھی رات کے بعد جب ایک سپاہی نے اسے پتھر پر بیٹھے دیکھ کر ڈانٹا تو وہ اٹھا اور چپ چاپ کوٹھی کی طرف چلا گیا۔

پرمندر کے کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ وہ شاید جاگ رہی تھی۔ پریم بھاری سے دل سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ ساری رات اس نے آنکھوں میں کاٹ دی۔

دوسرے دن وہ تمام وقت کمرے میں ہی رہا۔ اس پر عجیب سی بے حسی طاری رہی۔ امر سنگھ آکر دیر تک بیٹھا رہا۔ اس نے شراب کا لالچ بھی دیا۔ لیکن پریم کہیں جانے کو تیار نہیں ہوا۔ امر سنگھ کے جانے کے بعد وہ دیر تک سوچتا رہا کہ آخر وہ ڈلہوزی میں کیا کر رہا ہے، اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کل ہی مسز سیندر کو لکھ دے گا کہ وہ جا رہا ہے۔ یہ فیصلہ کر لینے کے بعد اس کے شانوں سے جیسے بوجھ اتر گیا۔

اگلے دن ناشتے کے بعد اس نے ڈاک خانے جا کر مسز سیندر کو خط لکھا۔ خط وہ پوسٹ کرنے ہی والا تھا کہ پرمندر آگئی۔ وہ سیدھی اس کے پاس آکھڑی ہوئی۔ نصف پوسٹ کارڈ پوسٹ بکس میں تھا اور نصف باہر۔ پریم نے ٹھنڈی سی نظروں سے پرمندر کی طرف دیکھا۔ پرمندر کی آنکھوں میں التجا اور اداسی تھی۔ ایک لڑکا خط ڈالنے آیا، پریم نے ہاتھ کھینچ لیا۔

"میں اس پتھر پر تمہارا انتظار کروں گی۔" پرمندر نے دھیرے سے کہا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

پریم مبہوت سا کھڑا رہ گیا۔ اسے قطعاً امید نہیں تھی کہ پرمندر چل کر ملاقات کے لئے کہے گی۔ ایک منٹ وہ کھڑا سوچتا رہا، پھر خط جیب میں ڈال کر باہر آگیا۔ پرمندر اسی سڑک پر چلی جا رہی تھی۔ لوگوں کی نظروں سے بچنے کے لئے وہ سگرٹوں کی ایک دکان پر جا کھڑا ہوا۔ اس نے ایک سگرٹ ختم کیا اور پرمندر کے پیچھے چلا گیا۔ اس سڑک پر قدم رکھتے ہی اسے فتح کا سا احساس ہوا اور اس کے دل سے غم کے بادل چھٹ گئے۔ وہ سیٹی پر ایک فلمی دھن بجانے لگا۔

پرمندر پتھر پر بیٹھی سڑک کو دیکھ رہی تھی۔ پریم کو دیکھ کر وہ اٹھ کر اس کے نزدیک آگئی۔ اس کے لبوں میں حرکت ہوئی۔ لیکن وہ کچھ کہہ نہیں سکی۔ پریم ایک منٹ کھڑا اسے دیکھتا رہا، پھر اسے اپنی باہوں میں بھر لیا۔ وہ کسمسائی، پھر جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ پریم نے اس کی ٹھوڑی انگلی سے اوپر کی اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہاں سردیوں کی اس شام کا سماں تھا۔ جب فضا پر دھواں چھایا ہوتا ہے۔ وہ ایک بت کی طرح کھڑی رہی۔ پریم نے محسوس کیا کہ اگر وہ دیر تک ان آنکھوں میں دیکھتا رہا تو ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اس نے جلدی سے لب اس کی آنکھوں پر رکھ دیے۔ دھیرے دھیرے اس کے ہونٹ پرمندر کے چہرے پر پھیلنے لگے اور آخر اس کے لبوں پر پیوست ہو گئے۔ پریم نے سوچا تھا: آج وہ چل کر آئی ہے۔ مکمل خود سپردگی کے عالم میں ہوگی اور اس سے لپٹ لپٹ جائے گی، لیکن وہ ویسے ہی بے جان سی کھڑی تھی۔ اس کے لب ٹھنڈے تھے، جیسے پتھر کے ہوں، اس کے ہاتھ لٹک رہے تھے۔ پریم الگ ہو گیا۔

"کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں۔" پرمندر نے سڑک کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم — تم —" پریم کچھ نہیں کہہ سکا، اس کے سفید چہرے کو دیکھتا رہ گیا۔ اسے ایک منٹ کو احساس ہوا کہ اس کے سامنے لاش کھڑی ہے۔ وہ ایک طرف ہو کر سگرٹ سلگانے لگا۔

"اب میں تمہارے پاس ہوں۔" پرمندر نے اس طرح کہا جیسے سڑک پر جاتا کوچوان آواز دیتا ہے: تانگہ خالی ہے۔

پریم نے حیرت سے پرمندر کی طرف دیکھا۔ اس کا تمام جوش سرد پڑ گیا۔ اس نے دھیرے سے کہا: "بیٹھو۔"

وہ پتھر پر جا بیٹھی۔ پریم اس کے قریب زمین پر رومال بچھا کر بیٹھ گیا۔

"تم نے مجھے غلط سمجھا ہے"۔ پریم نے ایک پتا مسلتے ہوئے کہا۔

"پھر تم اتنے دنوں سے مجھ سے بھاگتے کیوں پھر رہے ہو؟ روز رات کو دیر سے آتے ہو۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جس کی سزا دے رہے ہو؟"

پریم نے محسوس کیا پرمندر کی آواز لرز رہی ہے۔ اس کا دل پرمندر کے لئے ایک دم پگھل گیا۔ اس نے بیٹھے بیٹھے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے اور جذبات سے مغلوب آواز میں بولا: "نہیں، ایسی کوئی بات نہیں"۔

"تم کیا جانو عورت جب پیار کرتی ہے تو اس کے دل پر کیا گزرتی ہے"۔ پرمندر کا گلا رندھنے لگا تھا اور آنکھیں بھیگ رہی تھیں "میں سمجھتی تھی کہ تم مجھے سہارا دوگے۔ لیکن تم مجھ سے ہر سہارا چھین لینا چاہتے ہو۔ تم مرد ہو، آج دل لگایا کل بھول گئے۔"

"نہیں پمی، ایسا مت کہو"۔ پریم کھسک کر اس کے بالکل ساتھ ہو گیا۔ وہ جذباتی سا ہو کر بار بار اس کے ہاتھ دبا رہا تھا۔ اس کا دل سینے میں پگھل کر بہا جا رہا تھا۔ اس ایک لمحے میں اس نے پورے خلوص سے سوچا تھا کہ وہ ہر قیمت دے کر اس عورت کو خوش دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ زندگی کے جوہڑ میں کنول کی طرح مسکراتی رہے۔ "ایسا مت کہو۔ میں نے تم سے محبت کی ہے، اب بھی کرتا ہوں اور سدا کرتا رہوں گا۔ میری آنکھوں میں جھانکو، میرے دل میں دیکھو، تمہیں اپنی ہی تصویر نظر آئے گی۔ میری ہر دھڑکن میں تمہارا نام ہوگا"۔ اس نے سر پرمندر کی گود میں رکھ دیا۔

پرمندر آہستہ آہستہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ وہ دیر تک اسی طرح بیٹھے رہے۔ ان کے چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ درختوں میں مینڈک سے بھی خاموش تھے کبھی کبھی کوئی پہاڑی چڑیا کسی پیڑ میں چہچہانے لگتی۔

پریم نے خود ہی کہا: "تمہیں دیر ہو رہی ہوگی"۔

پرمندر نے اس طرح مسکرا کر اس کی طرف دیکھا جیسے بڑی بہن اپنے معصوم سے بھائی کی طرف دیکھتی ہے۔ واپسی پر پرمندر بہت خوش تھی۔ وہ اسے اپنے بچپن کے واقعات سنانے لگی۔ جب اسے سیر و تفریح کا بہت شوق تھا۔ اور اس کے پتا جی اسے لئے لئے پھرتے تھے۔ خاص کر اسے اونچے اونچے پہاڑوں پر چڑھنے اور یہ جاننے کا شوق تھا کہ ان پہاڑوں کے پیچھے کیا ہے۔ ایک رات وہ صرف اس لئے جاگتی رہی کہ پھول کو کھلتے دیکھ سکے، لیکن وہ دیکھ نہیں سکی۔ شاید وہ ایک آدھ منٹ کے لئے سو گئی تھی۔ اب بھی جب وہ صبح کسی کھلے پھول کو دیکھتی ہے تو خیالات کی وادیوں میں کھو جاتی ہے۔ ان خاموش کھڑے پہاڑوں کو دیکھ کر اب بھی وہی ان کے پیچھے جھانکنے کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ ساری دنیا کا چکر لگائے، نئی نئی جگہیں دیکھے، بس گھومتی رہے، گھومتی رہے۔

پریم خاموشی سے سنتا رہا۔ کبھی کبھی اسے احساس ہوتا کہ اس کے ساتھ کوئی اسکول کی بچی چل رہی ہے۔ وہ اس کی طرف دیکھتا اور اس کا صحت مند متناسب جسم دیکھ کر جیسے حیران رہ جاتا۔

آخری موڑ پر پہنچ کر پریم نے اس کے ہاتھ چومے اور ڈھلوان پر اتر گیا۔ ڈاک خانے کے چوک میں اسے امر سنگھ مل گیا۔ وہ امر سنگھ سے اس طرح ملا، جیسے مدتوں کے بعد مل رہا ہو، اسے خوب لپٹایا اور داڑھی بچا کر اس کی گال چوم لی۔

"کیا بات ہے؟ آج بڑے موڈ میں ہو"۔ امر سنگھ نے ہنس کر پوچھا۔

"آج ایک تصویر مکمل ہو گئی ہے"۔

"تصویر مکمل ہو گئی ہے؟" امر سنگھ نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ "پچھلے کئی دنوں سے تو تم نے برش کو ہاتھ نہیں لگایا"۔

"کینوس پر نہیں، اجان من! دل پر، آنکھوں میں سمجھے!"

"کہاں تیر مارا؟"

پریم کے دل میں آیا امر سنگھ کے دل پر انگلی رکھ دے "یہاں ۔" لیکن وہ ہنس کر ٹال گیا۔ "آؤ تمہیں پلاؤں۔"

"اس وقت! شام کو سہی ۔"

شام کا پروگرام طے کر کے وہ کچھ دیر یونہی ٹہلتے رہے۔ گھر لوٹ کر وہ امر سنگھ کے ساتھ رمی کھیلتا رہا اور ہارتا رہا۔ پرمندر نے کئی مرتبہ اشاروں سے اسے منع کیا لیکن وہ اسے نظر انداز کرتا رہا۔ اس روز دوپہر کا کھانا بھی اس نے امر سنگھ کے ساتھ کھایا۔ سہ پہر کو وہ پھر باہر نکل گئے۔ اور تھوڑی دیر گھومنے کے بعد HOLIDAY INN میں جا بیٹھے۔

امر سنگھ نے "کھجیاڑ" کا پروگرام بنایا، پریم تیار ہو گیا۔ جب وہ گھر پہنچے پریم بے حد خوش تھا وہ دن اسے اپنی زندگی کا بہترین دن محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے کھوئی ہوئی جنت دوبارہ حاصل کر لی تھی۔ پرمندر چل کر اس کے پاس آئی تھی۔ دھیرے دھیرے وہ مکمل طور پر اس کی ہو جائے گی۔ وہ شریف عورت ہے اس کی راہ میں شرم حائل ہے اور یہی اس رشتے کی جان ہے اور نہ پرمندر میں اور ماسو گوگو والی عورت میں کیا فرق ہوتا؟ آج اس نے ہونٹ چومنے کی اجازت دی ہے، کل ۔ ۔ ۔ وہ کھڑکی میں جا کھڑا ہوا اور آسمان پر ہلکے ہلکے بادلوں کے پیچھے بہتے چاند کو دیکھنے لگا، نہ جانے کیوں ان بادلوں کے پیچھے پرمندر مسکراتی نظر آئی۔ اس رات وہ پرمندر کے ساتھ خواب میں اونچے اونچے پہاڑوں پر چڑھتا رہا۔

دوسرے دن شام کو پرمندر اسے پھر ملی۔ وہ اوپر جا رہی تھی کہ پریم اسے سیڑھیوں میں مل گیا۔ پریم نے اس کے ہاتھ تھام کر اسے اپنے قریب کر لیا۔

"وہ کھجیاڑ کا پروگرام بنا رہے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ تم جا رہی ہو؟"

"اگر تم جاؤ گے تو۔" وہ ہنسی۔

"اب تو مجھے چلنا ہی ہو گا۔"

"پرسوں پورنیما ہے، پرسوں صبح چلیں تو بڑے آرام سے شام تک وہاں پہنچ جائیں گے۔ چاندنی رات ہو گی۔"

پریم اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ وہ اچانک شرما گئی اور نظریں جھکا لیں۔ پریم نے اسے اور بھی اپنے قریب کھینچ لیا اور اس کے ہونٹوں پر جھک گیا۔

"وہ نیچے بیٹھے ہیں" کہہ کر وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی۔ پریم اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ سمجھ نہیں سکا کہ پرمندر کے جملے کا کیا مطلب ہے۔ وہ اسے ٹال گئی ہے۔ یا تنہائی میں ملنے کا اشارہ دے گئی ہے۔ کھجیاڑ چل کر دیکھا جائے گا، اس نے سوچا اور اپنے کمرے میں چلا گیا

تیسرے دن وہ صبح جلدی ہی ناشتہ کر کے نکل گئے۔ پرمندر نے کھانا تیار کر کے ساتھ لے لیا تھا، راستے میں انہوں نے کچھ سیب وغیرہ خرید لئے۔ پریم پیاسی نظروں سے پرمندر کی طرف دیکھتا۔ اسے امر سنگھ کا وجود اس روز بالکل فضول معلوم ہو رہا تھا۔ پرمندر اس سے نظر ملا کر مسکرا دیتی۔ کبھی کبھی وہ ان دونوں کو بھول جاتی اور راستے کے حسن میں ڈوب جاتی، بڑے شاعرانہ انداز میں چیل کے جنگلوں اور ان پر طاری سکوت کی تعریف کرتی، راہ چلتی رک جاتی اور انہیں اس کا انتظار کرنا پڑتا۔

لکڑ منڈی پہنچ کر انہوں نے کھانا کھایا، کچھ دیر سستائے اور چائے پی کر آگے بڑھ گئے۔ نہ جانے کتنی بار پریم کے دل میں پرمندر کا ہاتھ پکڑنے، اس کے لب چومنے، اسے باہوں میں لینے کی خواہش پیدا ہوئی۔ لیکن امر سنگھ دیوار کی طرح ان کے درمیان کھڑا تھا۔ وہ اداس اور پیاسی نظروں سے پرمندر کی طرف دیکھ کر رہ جاتا۔ وہ امر سنگھ سے نظر بچا کر اس کی طرف دیکھتی اور وہ محسوس کرتا کہ اگلے لمحے وہ ضرور پاگل ہو جائے گا۔ اس کی نس نس تن کر ٹوٹنے پر آ جاتی۔

شام ہوتے ہوتے وہ کھجار پہنچ گئے۔ چاروں طرف اندھیرا پھیل گیا تھا۔ دیو دار کے اونچے اونچے درخت خاموش کھڑے تھے اور ان کے بیچ میں پلیٹ کی شکل کا ہرا میدان پھیلا ہوا تھا۔ اس وقت چند گھوڑے میدان میں گھاس چر رہے تھے۔ چاند ابھی نہیں نکلا تھا۔

پرمندر ایک درخت کے سامنے کھڑے ہو کر اس کی پیمائش کا بورڈ پڑھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب کا سا جوش تھا۔

"ایک سو پچاس فٹ اونچا، چودہ فٹ گھیرا!" پرمندر نے جیسے خاموش فضاؤں سے کہا اور درخت کی چوٹی کی طرف دیکھنے لگی۔ "کتنا پرانا ہوگا! نہ جانے کتنی آنکھوں نے اسے اتنے سے کو دیکھا ہوگا!" وہ اس طرح درخت کا ذکر کر رہی تھی، جیسے وہ کوئی جیتا جاگتا بچہ ہو۔ "نہ جانے کتنوں کو اس نے اس راہ سے گزرتے دیکھا ہوگا!"

پریم اسے محبت سے دیکھ رہا تھا۔ وہ دوسرے درخت کے سامنے جا کھڑی ہوئی، پھر تیسرے کے۔ امر سنگھ تھکا ہوا تھا۔ سستانے کے لئے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر بیزاری تھی۔ اس نے تلخ لہجے میں کہا: "یہ کیا پاگل پن ہے؟ اب چلو!"

پرمندر ایک دم بجھ گئی۔ اس کا چہرہ لٹک گیا۔ وہ جیسے ایک دم سب کچھ بھول گئی۔ وہ جوش، وہ ولولہ، وہ امنگ — سب کچھ سرد ہو گیا۔ وہ زر خرید غلام کی طرح سر جھکا کر امر سنگھ کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ پریم کو ساری وادی ایک دم ویران نظر آنے لگی۔ پرمندر کے جوش و ولولے نے ہر چیز میں جان سی ڈال دی تھی۔ درخت، پودے، میدان، راہ کے پتھر اور میدان کے ایک سرے پر بنی ہوئی ریسٹ ہاؤس کی خوبصورت چوبی عمارت — ہر چیز جیسے پرمندر کے ساتھ مسکرانے لگی تھی، کھل کھلانے لگی تھی — اور اب سب کچھ ایک دم اداسی میں ڈوب گیا تھا۔

ریسٹ ہاؤس میں پہنچ کر انہوں نے وہاں کے چوکیدار، دیوی سنگھ، سے چائے لانے کے لئے کہا اور برآمدے میں کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے۔ امر سنگھ نے ایئر بیگ سے بوتل نکال کر میز پر رکھ دی اور مسکرا کر پریم کی طرف دیکھا۔ پرمندر نے بجھی بجھی سی نظروں سے بوتل کی طرف دیکھا اور پھر دور تک پھیلے ہوئے میدان کو دیکھنے لگی۔ فضا میں ایک سیٹی گونجی اور گھوڑوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ دوسری سیٹی پر وہ اونچائی کی طرف دوڑنے لگے اور چند سیکنڈ میں برآمدے کے سامنے دوڑتے ہوئے ریسٹ ہاؤس کے پیچھے گم ہو گئے۔

چاند ابھی تک نہیں نکلا تھا۔ وادی پر مکمل سکوت طاری تھا۔ نیچے پانڈوؤں کے مندر کی زرد سی بتی جل رہی تھی اور وہ تینوں خاموش بیٹھے تھے۔ دیوی سنگھ چائے لے آیا۔ چائے پی کر پریم اور امر سنگھ ٹہلنے کے لئے اتر گئے۔ پرمندر نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ پریم نے مجبور کیا بھی، لیکن امر سنگھ نے "اسے پتا نہیں کبھی کبھی کیا ہو جاتا ہے" کہہ کر بات ختم کر دی۔

پچھلی بارشوں کی وجہ سے میدان میں کیچڑ اور پھسلن ہو گئی تھی۔ امر سنگھ کچھ دور جا کر لوٹ آیا۔ پریم جھیل تک گیا اور لکڑی کے پل پر کھڑے ہو کر اس ننھے سے جزیرے کو دیکھتا رہا جو ہوا کے ساتھ پانی میں حرکت کرتا رہتا ہے۔ جھیل میں کشتی پڑی ہوئی تھی۔ پہاڑوں سے مٹی بہہ آنے کی وجہ سے جھیل کا رقبہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ اور دلدل پھیلتی جا رہی تھی۔

پریم جب لوٹنے لگا تو راہ میں اسے ایک پہاڑی نوجوان مل گیا۔ نوجوان نے اسے سلام کیا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے سے ہی پریم سمجھ گیا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ پریم نے سگریٹ سلگا کر اس کی طرف دیکھا۔

"صاحب، ڈلہوزی سے آئے ہیں؟"

"ہاں۔"

"کشتی کی سیر نہیں کی؟"

"مجھے تو اسے دیکھ کر ڈر آنے لگا تھا۔ بڑی شکستہ حالت میں ہے۔ ادھر کوئی انچارج وغیرہ ہے؟"

"ہیں صاحب، سب ہیں، لیکن کوئی ادھر دھیان نہیں دیتا۔ افسر لوگ آتے ہیں، لڑکیاں ساتھ لاتے ہیں، شراب پیتے ہیں، رات رہتے ہیں اور چلے

جانتے ہیں، جھیل میں دلدل بڑھ رہی ہے، کسی دن صرف دلدل رہ جائے گی۔" نوجوان نے حسرت سے شکستہ پل کی طرف دیکھا، جو کسی بھی وقت ٹوٹ سکتا تھا۔

"تم یہاں کیا کرتے ہو؟"

"کشتی چلاتا ہوں صاحب۔"

"ہوں۔" پریم نے اس کی طرف دیکھا اور جیب سے ایک روپیہ نکال کر اسے دے دیا۔ نوجوان نے نوٹ لے کر اسے پھر سلام کیا۔ پریم ریسٹ ہاؤس کی طرف چڑھنے لگا۔

امر سنگھ جیسے بیٹھا بیٹھا بور ہو گیا تھا۔

"وہاں کیا کر رہے تھے؟" اس نے بیزاری سے پوچھا۔ "آؤ۔" اس نے بوتل اٹھا کر کہا۔ "ایسی خوبصورت شام ضائع کئے دے رہے ہو۔"

پریم نے پرمندر کی طرف دیکھا جو برآمدے کے دوسرے کونے میں جا بیٹھی تھی اور ان دیودار دل کی طرف دیکھ رہی تھی جن کے پیچھے روشنی نظر آنے لگی تھی۔ چاند نکل رہا تھا۔

دیوی سنگھ گلاس اور پانی دے گیا۔ وہ پینے لگے۔ چاند ابھرتا رہا۔ امر سنگھ مدہوش ہو رہا تھا۔ وادی پر چاندنی کا غبار اڑ رہا تھا۔ ہر چیز، جو کچھ دیر پہلے اندھیرے میں گم تھی، ایک دم جیسے دودھ میں نہا کر جوان ہو گئی تھی۔ دور کہیں کوئی بانسری بجا رہا تھا۔

امر سنگھ کے قدموں میں لغزش آ گئی تھی۔ آنکھیں پوری طرح نہیں کھل رہی تھیں، زبان میں لکنت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ پیئے جا رہا تھا۔ پونی بوتل پی کر اسے اپنے حواس پر بالکل قابو نہیں رہا۔ اور وہ اناپ شناپ بکنے لگا۔ پرمندر نے انہیں اداس سی نظروں سے دیکھا۔ پریم کو جرم کا سا احساس ہوا، جیسے امر سنگھ کی اس حالت کا ذمہ دار وہ ہو۔ امر سنگھ نے کہا:

"اب سیر کریں گے۔ میں درخت پر چڑھ کر چاند کو پکڑوں گا۔ تم نیچے کھڑے رہنا۔ آؤ۔" وہ اٹھا اور لڑکھڑا گیا۔

پریم نے تعجلاری سے اسے سنبھالا۔ پرمندر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آئی اور امر سنگھ کو سہارا دے کر کمرے میں لے گئی۔ پریم وہیں کھڑا دیکھتا رہا۔ جب دروازہ اندر سے بند ہو گیا تو وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد دیوی سنگھ نے آکر اسے کھانے کے لئے کہا۔ وہ اکیلا ڈائننگ ٹیبل پر جا بیٹھا۔ کھانا کھا کر اس نے سگریٹ سلگایا اور برآمدے میں آ گیا۔ بار بار اس کے جی میں آ رہا تھا کہ وہاں سے اسی وقت چلا جائے، لیکن اس خیال سے کہ امر سنگھ کیا سوچے گا، وہ ایسے عملی جامہ نہیں پہنا سکا۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ الماری سے ایک کتاب نکال کر وہ اپنے کمرے میں آ گیا۔

کافی دیر گزر جانے کے بعد اسے ایسا لگا جیسے برآمدے میں کوئی چل رہا ہو۔ وہ کتاب رکھ کر اٹھا اور آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ پرمندر سیڑھیوں کے قریب کھمبے کا سہارا لئے کھڑی چاند کو دیکھ رہی تھی۔ پریم نے اس کے سائے کو دیکھا، چاروں طرف پھیلی رات کی خاموشی کو محسوس کیا اور اس کے خون کا دورہ تیز ہونے لگا۔ اس نے امر سنگھ کے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا، دروازہ بند تھا۔ نیچے مندر کی بتی جل رہی تھی۔ چاند آسمان کے وسط میں آ گیا تھا۔ وہ دبے پاؤں چلتا ہوا پرمندر کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ چند سیکنڈ وہ اسی طرح کھڑا رہا۔ پرمندر اپنے خیالات میں گم چاند پر نظریں جمائے تھی۔ پریم نے آہستہ سے ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔ پرمندر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا: خوف سے اس کا چہرہ سفید ہو گیا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ لپ اسٹک بہت حد تک مدھم ہو چکی تھی اور ٹھوڑی اور گالوں پر پھیل گئی تھی۔ آنکھوں کے نیچے ہونٹوں کے کونوں تک کجرے کی لکیریں پھیلی ہوئی تھیں جیسے وہ رو تی رہی ہو۔

پریم نے اس کے ہاتھ ہاتھوں میں لے لئے۔ وہ بے جان سی کھڑی رہی۔

"پمی ـ"

وہ خاموش رہی۔

پریم نے ہاتھ اس کی کمر میں ڈال دیئے اور اسے اپنے قریب کر لیا۔ پرمندر نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"یہاں کھڑی ہو!"

"نیند نہیں آ رہی تھی۔"

"میں بھی نہیں سو سکا۔" پریم اس کے لبوں پر جھک گیا۔ پرمندر نے سر پیچھے کر لیا۔

"مجھے یہ پسند نہیں۔"

"میری طرف دیکھو۔"

"میں کہہ چکی ہوں مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔ مجھے اس بات سے گھن آتی ہے۔ مردوں کو عورت کے بدن کے سوا اور کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ تم آتما کے نہیں شریر کے پجاری ہوتے ہو۔"

"آتما بنا شریر کے کچھ نہیں۔ بھگوان نے مرد کے لئے عورت کا جسم بنایا ہے۔ اگر اسے آتما ہی تک محدود رکھنا ہوتا تو جسم کی کیا ضرورت تھی؟ روح تک پہنچنے کے لئے جسم کا رشتہ ضروری ہے۔"

"یہ پاپ ہے۔"

"کیا پاپ ہے؟ عورت اور مرد کا رشتہ؟"

"نہیں، جو ہم کر رہے ہیں اور جو تم چاہتے ہو۔ میں شادی شدہ عورت ہوں، میرے لئے یہ پاپ ہے۔"

"پاپ پن کچھ نہیں، یہ کمزور دلوں کی فضول سی دلیل ہے۔ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ اور محبت میں کوئی پاپ پن نہیں ہوتا، ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔"

"تم محبت کو نہیں سمجھتے۔ تم نے چاند اور چکور کو نہیں دیکھا؟ ہیر رانجھا اور لیلیٰ مجنوں کی کہانیاں نہیں سنیں؟"

"وہ محض کہانیاں ہیں اور بیمار ذہنوں کی پیداوار۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں، تمہارے لئے جان دے سکتا ہوں، لیکن صرف تمہارے خیال سے محبت نہیں کر سکتا۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی جذبیت نہیں ہو سکتی۔ تمہاری محبت کے ساتھ میں تمہارا جسم بھی چاہتا ہوں۔ تمہارا سب کچھ میرا ہونا چاہئے۔ صرف میرا۔"

"محبت لینے کو نہیں دینے کو کہتے ہیں۔ قربانی کے جذبے کا نام محبت ہے۔"

"یہ سب کتابی باتیں ہیں۔ تم سپنوں اور کتابوں کی دنیا میں رہتی ہو۔ حقیقی زندگی میں آؤ۔" اس نے بڑھ کر اسے بازوؤں سے تھام لیا۔

پرمندر نے جھٹکے سے خود کو آزاد کرا لیا۔

"مجھے اس سے نفرت ہے۔ میں تمہیں دنیا والوں سے الگ سمجھتی تھی، میں نے تم سے محبت کی تھی، لیکن تم نے میری محبت کا مذاق اڑایا ہے، تم۔" اس کا گلا رندھنے لگا۔

"تم نے کبھی مجھے نہیں چاہا، کسی کو پیار نہیں کیا۔ تم اس قابل ہی نہیں ہو کہ کسی کو پیار کر سکو۔ تم صرف اپنے تصور سے عشق کرتی ہو۔ تمہارے ذہن میں ایک آئیڈیل ہے جس کی تم پوجا کرتی ہو۔ تم خود کو دھوکا دے رہی ہو۔ اس دھند سے باہر آؤ، ان سپنوں کے جال کو توڑ دو۔"

وہ وہیں لکڑی کے فرش پر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی شال کندھوں سے پھسل کر فرش پر جا گری تھا اور وہ گھٹنوں میں سر دیئے سسکیاں بھر رہی تھی۔ پریم اسے کھڑا دیکھتا رہا، پھر اس کے دل میں اس دکھی روح کے لئے ہمدردی پیدا ہونے لگی۔ اس نے جھک کر اسے اٹھانا چاہا۔

"چھوڑ دو، مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔" وہ آنسوؤں میں ڈوبی آواز میں بولی، "تم سب بھیڑیئے ہو، بھیڑیئے۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ پریم نے آخری مرتبہ اس کی طرف دیکھا اور گردن لٹکا کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

جوگندر پال

محور - ۶۰

نہیں!

شانتی کرن کے گیت کا ریکارڈ بجنا شروع ہوا تو ہم سب نے اپنی آنکھیں گراموفون کی طرف اٹھالیں۔
ڈسک پر ریکارڈ گھوم رہا تھا اور ریکارڈ کی گول لکیروں میں باریک سوئی، اور سوئی کی چبھن محسوس کرکے ریکارڈ کے سینے سے ایک امر گیت پھوٹ رہا تھا۔
مجھ پر وجد کی کیفیت طاری ہونے لگی اور میرے ذہن کے منجدھار میں پانی فراواں ہوگیا۔ اور دھیرے دھیرے خشک کناروں کی طرف پھیلنے لگا۔
"یہ کون گا رہا ہے؟ شانتی کرن؟ اسے مرے ہوئے تو تیس برس ہو چکے ہیں۔ اگر ہمارے جسم کو ثبات نہیں، تو ہماری آواز کیونکر محفوظ رہ سکتی ہے؟ —" لیکن میں نے اپنی لڑکھڑاتی ہوئی فکر کو تھام لیا۔
"منہ سے نکلی ہوئی آواز کو ثبات نہیں۔ لیکن دل کی آواز سدا سنائی دیتی رہتی ہے، الہام کی مانند بیک وقت دائم و معدوم ہے۔"
شانتی کرن کے دل کی آواز کے جادو سے فضا کے منتشر عناصر اپنی اپنی ترتیب میں سمٹ سنبھل کر مسکرانے لگے تھے۔
"زندگی فانی ہے۔" میرے ذہن کے ایک کنارے کا سرا ہنستے ہنستے فراوانی آب میں جھکنے لگا۔ "لیکن زندگی کا سنگیت لافانی ہے۔"
میں اپنی ڈوبتی فکر کا یہ سرا ٹٹولتا رہا۔
"یہ سنسار ایک مرگھٹ ہے۔ جہاں جگہ جگہ مردوں کی ارتھیاں جل رہی ہیں اور چتاؤں کی ان گہری پیلی لپٹوں کے سائے میں زندہ لوگ اپنے مردہ ساتھیوں کا پیغام و عمل سمیٹ سمیٹ کر اس فانی جہان کو باغ ارم بنا رہے ہیں — ہاں، فنا کی جلتی ہوئی خاموشیوں سے ہی زیست کی صوتی شکلیں ڈھلتی ہیں۔"
شانتی کرن کے بوڑھے شوہر کی نگاہوں کی پرسکون چھتریاں ریکارڈ پر ٹکی ہوئی تھیں، مانو اسے وہاں مرحومہ کا نوجوان، شگفتہ چہرہ اپنی بانہوں سے باہر نکل نکل کر دکھائی دے رہا ہو۔
گراموفون کے ڈسک پر ریکارڈ گھوم رہا تھا۔ اور ریکارڈ کی نہایت باریک گول لکیروں میں سوئی، اور سوئی کی چبھن محسوس کرکے ریکارڈ کے سینے سے ایک امر گیت پھوٹ رہا تھا۔
"ریکارڈ کا منہ کہاں ہے؟ — منہ کے بغیر یہ کیونکر بول رہا ہے؟"

"لیکن محسوسات کے منہ ہوتے ہی کہاں ہیں؟ محسوسات تو ہمیشہ بغیر منہ کے ہی گاتے ہیں۔ ان کے بھی منہ ہوتا تو اپنی خاصیت بھول کر محض بڑی بڑی باتیں بنا کر آخر چپ ہو جاتے۔ ذرا محسوس کرنے کی بات ہے کہ بھلا منہ سے بھی محسوس کیا جا سکتا ہے؟"

ہم سب گراموفون کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"ہم آواز کی اور کیا دیکھتے ہیں؟ اور کیوں دیکھتے ہیں؟"

میں نے گراموفون سے نظر ہٹا کر شانتی کرن کا گیت سننا چاہا، لیکن بے چین ہو کر پھر وہیں دیکھنے لگا۔

سبھی ریکارڈ کی اور ٹکٹکی باندھے ہوئے تھے، اندھے، جو اپنی چشم نابینا کو بے اختیار آواز کی طرف گھما لیتے ہیں۔

لیکن اندھیرا اس لئے تاریک نہیں ہوتا کہ اس کے ساتھ روشنی کا ایک تصور وابستہ ہوتا ہے۔ جب میں دس گیارہ برس کا تھا تو ہر روز شام کے وقت ادھر مندر میں آرتی کی گھنٹیاں بجنا شروع ہوتیں۔ ادھر پتاجی شانتی کرن کے گھر جانے کے لئے تیار کھڑے ہوتے۔ میں بھی ان کے ساتھ جانے کے لئے بسورنے لگتا۔

"ارے بابا، چل! چل، تو بھی چل!"

"کہاں جا رہے ہو؟ اس گانے والی کے پاس؟" یہ میرا آج کا اندازہ نہیں، اس وقت بھی یہی اندازہ تھا کہ پتاجی کو ماں کے بگڑنے کا جتنا رنج ہوتا مگر شانتی کرن کی خوشی سے بڑی خوشی۔

"نہیں بھئی، میں ـــ اُس ـــ تم ـــ" پتاجی کو گھبرایا ہوا پا کر میرے کانوں کی لویں بھی گھبراہٹ سے سرخ ہو جاتیں۔

"میں سب سمجھتی ہوں!"

"یہی تو رونا ہے کہ تم کچھ نہیں سمجھتیں۔ میں ـــ میں تو اس کے شوہر سے ملنے جاتا ہوں۔" ماں کی تنگ نظری سے پتاجی اپنی ہی دھڑکنوں سے چور سے بے نظر آنے لگتے: "میرا اس سے کیا واسطہ؟" شانتی کرن کا نام ہونٹوں پہ لانے سے پتاجی ہمیشہ کترا جاتے، لیکن مجھے یقین ہے کہ محبوب کو "وہ" کہہ کر ان کے دل کے تاروں سے بڑی صاف صدا بلند ہوتی: "شانتی کرن!"

جب پتاجی اور میں شانتی کرن کی بیٹھک میں قدم دھرتے تو وہ اور اس کا شوہر ہمارے ہی منتظر ہوتے۔

"میں جانتی تھی کہ تم اپنے وقت پر خود بخود پہنچ جاؤ گے۔" شانتی کرن کی جھکی جھکی پلکوں کے تار ہلکی سی جھن جھن میں کپکپا کر اور زیادہ جھک جاتے۔

"آ گئے؟" اس کا شوہر ہماری آمد پر مسرت سے بے چین ہو کر نصف کھڑا ہو کے پھر بیٹھ جاتا۔

پیار کرنے والے حسد نہیں کرتے، وہ اپنے محبوب کو اس کے ہر چاہنے والے کی آنکھ سے دیکھ دیکھ کر سر دھنتے ہیں، گویا اپنے پیار میں ساری دنیا کا پیار جذب کر کے پتھر کی مورتی کو بھگوان بنا لینا چاہتے ہوں۔ شانتی کرن کا شوہر بھی اپنی بیوی کے لئے ہماری محبت و عقیدت محسوس کر کے بڑا خوش ہوتا۔ شانتی کرن کو پتاجی بھی چاہتے تھے، میں بھی، اور اس کے شہر کے اور ان گنت جانے انجانے پجاری ہوں گے۔ لیکن ہم سب کی چاہ کا تنہا شانتی کرن کا شوہر ہی تھا۔ ہم سب تو شانتی کرن کے شوہر کی چاہ کی چھوٹی بڑی شاخیں تھیں۔ ہماری چاہ کا اپنا کوئی وجود نہ تھا، یا اگر کوئی وجود تھا تو وہ اپنی جڑ اسی تنے سے ہی لیتی تھی۔

بیکار ذکر رہا تھا۔

اور ہم سب گراموفون کی طرف دیکھ رہے تھے۔

کیوں؟

کیونکہ بینائی کی طرح سماعت کی بھی سمتیں ہوتی ہیں، سماعت کی بھی آنکھیں ہوتی ہیں، شفاف جھیلیں، جو اپنے سارے نظارے اپنے ہی اندر اپنی ہی خوبصورتی دیکھ کر پانی سے بھر جاتی ہیں۔

شانتی کرن کی روح ایک دن اچانک کہیں پرواز کر گئی، اپنے گیتوں کی طرح جو سنائی دیتے دیتے چھٹ کر جلتے ہیں۔ اُس کو گڑی ہمارے کانوں میں اُس کے سبھی گیت بیک وقت گونج گونج کر آپس میں گڈ مڈ ہو گئے۔ خاموشیاں ہڑ بڑا کر جاگ اٹھیں اور شانتی کرن کو تڑپ کر سکے پھر سو گئیں۔

مگر ہمیں یقین نہ آیا تھا کہ شانتی کرن واقعی مر گئی ہے، اس کی لاش اپنی آواز کا ایک زندہ، خاموش مجسمہ بن کر دکھائی دے رہی تھی، جیسے راگ وِدیا تپسیا کر کر کے تھک گئی ہو، بس ذرا سی سو گئی ہو۔

اور ہمارا یہ شک بجا ہی نکلا، شاید موسیقی زیست کے خالق کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ وہ سُر کو اپنی ہیئت سے علیحدہ کیسے کر سکتا ہے، اور اس نے گویا تلافی کے طور پر ہمیں اس گمشدہ سُر کا سالم تخیل بخش دیا، اسی لئے شانتی کرن مر کر بھی ہمارے دل و دماغ میں زندہ رہی۔ ریکارڈ کے سینے سے سورگیہ شانتی کرن کی جیوت آواز نکلتی رہی، جیسے وہ ہمارے سامنے جیتی جاگتی کھڑی ہو اور کہہ رہی ہو "میں مر چکی ہوں ——— میں مر چکی ہوں ——— !"

اور مجھے معلوم ہوا کہ میرے سینے میں ریکارڈ چل رہا ہے اور ریکارڈ کی باریک گول لکیروں میں سوئی گھوم رہی ہے اور سوئی کی چبھن سے یہ آواز پیدا ہو رہی ہے۔ "میں مر چکی ہوں ——— میں مر چکی ہوں ——— !"

شانتی کرن کی موت کے دوسرے روز شام کے وقت مندر کی گھنٹیاں بجنا شروع ہوئیں تو پتا جی بیٹھک کے ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھے نہ جانے کہاں پہنچے ہوئے تھے۔

ماں اپنے جاگے ہوئے ضمیر کو مَن ہی مَن میں چوری کھلاتے ہوئے دبے پاؤں پتا جی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

"آج نہیں جاؤ گے ؟"

لیکن پتا جی وہاں ہوتے تو ماں کو جواب بھی دیتے۔

ماں گھبرا کر ان کا کندھا جھنجھوڑنے لگی۔

"آ ——— آں ——— ؟" پتا جی گویا بہت دور سے لوٹے ہوں۔

"آج وہاں نہیں جاؤ گے ؟"

"کہاں ؟ شانتی کرن کے پاس ؟" جب محبوب کی صرف روح ہی روح رہ جائے تو اس کا نام لیتے ہوئے جھجک محسوس نہیں ہوتی۔

"ہاں، جاؤ نیارہ ہو کے، جاؤ نا ———"

اور میں نے روتے ہوئے پتا جی کی کلائی پکڑ لی۔ "آؤ، پتا جی ———"

شانتی کرن ! شانتی کی کرن ! شانتی کرن کی موت پر ہمارے مایوس اور تاریک دل و دماغ کو شانتی کرن کی کتنی ضرورت تھی !

اور اس دن جب ماں نے ہمیں شانتی کرن کے گھر بھیجا تو وہ ہمیں واقعی مل گئی، اپنے شوہر کے باطن میں۔

"آ گئے ؟" شانتی کرن کے شوہر نے معمول کے مطابق بڑی گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا، اس کا بلوریں باطن اس کی آنکھوں سے جھانک رہا تھا اور باطن کی اجلی چٹائی پر شانتی کرن دو زانو بیٹھی صاف نظر آ رہی تھی۔

"میں جانتی تھی، تم اپنے وقت پر خود بخود پہنچ جاؤ گے"۔ اس کی جھکی جھکی پلکوں کے تاریکی سی چھن چھن میں کہہ کر حسب عادت اور زیادہ جھک گئے۔

اس کے بعد کچھ عرصہ شانتی کرن کے گھر ہمارا باقاعدہ آنا جانا رہا۔ لیکن پھر کئی کئی دن کا ناغہ ہونے لگا۔ شام کے وقت مندر کی گھنٹیاں بجتی رہتیں اور پتا جی کان لپیٹے گم صم اپنی جگہ پر جمے رہتے۔ ایسا نہ تھا کہ شانتی کرن کا تصور ان کے ذہن میں دھندلا پڑ رہا ہو، یہی ایک تصور تو وہ اپنی موت پر زندگی کی

میاں جی کر ساتھ لے گئے تھے۔ تو پھر ــ ؟ شانتی کرن کے گھر اس کی عدم موجودگی میں ابھی یہی احساس ہوتا کہ وہ موجود ہے۔ شاید اب اس احساس نے پتاجی کو بھی اس کی موجودگی کے احساس کا عادی بنا دیا ہو۔

لیکن نہیں!

ایک دفعہ اماں نے ان سے کہا۔

" اتنے ونگیر کیوں ہو؟ جاؤ، شانتی کرن کے گھر ہو آؤ!"

" شانتی کرن کے گھر؟" پتاجی نے جھلا کر پوچھا۔" لیکن شانتی کرن کا گھر کہاں ہے؟ شانتی کرن کہاں ہے؟ کئی بار درخت کا تنا ہرا بھرا ہونے کے باوجود اس کی شاخیں سوکھنے لگتی ہیں۔ وہ تو مر چکی ہے! سدا کے لئے جا چکی ہے!"

اُس روز میں اکیلا ہی شانتی کرن کے گھر چلا آیا اور شانتی کرن کے شوہر کی گود میں سر رکھ کر بہت رویا اور وہ میرے سر پر آہستگی سے ہاتھ پھیر کر بڑے چین سے مسکراتا رہا۔

گراموفون کی سوئی ریکارڈ کے سینے کو نصف سے زیادہ چھید کر بدستور دائروں میں گھوم رہی تھی۔

" مورے من میں براجو، راما

من میں ــــ"

ریکارڈ کے یہ بول پتاجی کو بہت پیارے تھے۔ انہیں سُن کر میری آنکھوں میں وہی پرانا سماں آباد ہو گیا۔ یہی کمرہ ہے، وہاں شانتی کرن بیٹھی ہے۔ اس کی انگلیاں آنکھوں کی طرح ٹک ٹک کر اپنے آپ ستار کے تاروں پر چل رہی ہیں۔ لیکن ستار کی موسیقی جھن جھن اس کی لانبی لانبی خمیدہ پلکوں سے نکل رہی ہے، اور اس کی نہایت پتلے ہونٹ ذرا ذرا سے کھل کر بڑے مبہم انداز میں ہل رہے ہیں لیکن یہی لگتا ہے کہ اس کا منہ بند ہے اور اس کے بدن کے سارے انگ باہم، بیک آواز گا رہے ہیں۔

" من میں براجو، راما

مورے من میں ــ"

اس بول پر جھوم جھوم کر شانتی کرن کے بڑے شوہر کی نظر میں نظر، بھیگی بھیگی بشاشت آگئی ہے۔ اور میں گویا اتنے سال بیت جانے پر اپنا عہدِ طفلی پیچھے نہیں چھوڑ آیا۔ بلکہ یہاں لمحوں میں میرا نازک سا، چھوٹا بدن شانتی کرن کا گیت سنتے سنتے اتنا بڑا ہو گیا ہے، اور ــ اور پتاجی بھی دادی مرگ سے یہاں چلے آئے ہیں اور ہم سب سے نظریں بچا کر چپکے سے اپنی اسی پرانی جگہ پر آ بیٹھے ہیں، سنگیت کے جادو سے ان کی آتما نے اپنا وہی پرانا چولا پہن لیا ہے اور مست ہو کر انہیں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ وہ تو ہم سے چھپ کر بیٹھنا چاہتے تھے۔ بیچارے پتاجی! شانتی کرن کی ٹوہ لگانے وہ پرلوک بھی سدھارے، لیکن اسے وہاں نہ پا کر پھر یہاں شانتی کرن کے شوہر کے گھر چلے آئے ہیں ــ شانتی کرن اپنے شوہر کے گھر کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتی۔

پتاجی کو دل کے عارضہ کی پرانی شکایت تھی اور ان کا یہ مرض شانتی کرن کی موت کے بعد دو تین سال میں بڑی گمبھیر شکل اختیار کر گیا۔ کئی ماہ کی علالت کے بعد جب ان کی جان گھر طرف پلنے لگی تو ماں کو روتے ہوئے پا کر کہنے لگے: " روؤ نہیں پگلی، تم ہی تو مجھے شانتی کرن کے گھر جانے کو کہا کرتی ہو۔ میں اسی لئے وہاں جانے سے جھجک جاتا تھا کہ تم روؤ گی ـــ اب مجھے ہنس ہنس کر وداع کر دو ــ!"

اور جب اُن کی سانسیں ڈوب گئیں تو مجھے کھڑکی سے باہر کسی حیوان کی شکل کا سایہ نظر آیا، جو اپنا راستہ سونگھ سونگھ کر، ہوا میں چلتا ہوا آسمان کی طرف جا رہا تھا۔

"کیا پتاجی شانتی کرن کی لَو میں ـــ"

میں نے سنجیدگی اپنے خیال کی چوکھٹ سے باہر آ کر اس جانب نظر اٹھائی جہاں ابھی ابھی پتاجی مجھے شانتی کرن کے ریکارڈ کا بول سنتے ہوئے دکھائی دیئے تھے، مگر اب وہ جگہ خالی پڑی تھی! ـــ شاید گیت سنتے سنتے انہیں ذرا سدھ بدھ آئی ہو تو اپنے آپ کو اس طرح سب کے سامنے چھپا پا کر گھبرا گئے ہوں اور اپنا چولا اتار کر اب بھی وہیں بیٹھے ہوں۔ میں نے آگے بڑھ کر اس خالی جگہ کو ہاتھوں سے ٹٹولنا چاہا۔

"کیا سچ مچ ـــ ؟!"

پھر میں نے شانتی کرن کی جانب نگاہ اٹھائی۔ اُس کا وجود بھی فضا میں گھل مل کر غائب ہو چکا تھا۔

"آدمی اپنی موت کے بعد کیونکر اپنے ماضی کی طرف لوٹ سکتا ہے؟ ـ بھلا کیونکر؟" اعتقاد کی روشن راہوں پر اندھا ہو کر نہ چلا جائے تو کہیں کہیں شک کی پرچھائیں نظر آنے لگتی ہے نـ کیونکر؟ ـــ جیسے وہ جیتے جی اپنے ماضی کی طرف لوٹ آتا ہے۔ اگر چاہ ہونے سے وہ زندگی میں ذرا آنکھیں بند کر کے اپنے ماضی میں گھومنے پھرنے کا اہل کیوں نہیں؟"

میرے شک کی پرچھائیں سمٹنے لگی۔

کوئی شے محض نظروں سے اوجھل ہو کر فنا نہیں ہو جاتی۔ بے شمار اشیا ہمیں نظر نہیں آتیں۔ اس کے باوجود وہ موجود ہوتی ہیں۔

لیکن کہاں؟

ہمارے ذہن میں، ہم، جن سے محبت کرتے ہیں!

"لیکن کیا واقعی ان کی اپنی ذات وہاں موجود ہوتی ہے؟ کیا ـ کیا ـ ؟ ـــ"

لیکن میں نے شبہ کے اس میلے دھبے سے اپنی آنکھیں پرے ہٹا لیں۔

"نہیں، شانتی کرن یہیں ہے، اپنے شوہر کی حویلی میں، ورنہ پتاجی سارا پرلوک چھان چھان کر پھر واپس یہیں کیوں آتے؟ یہی حویلی شانتی کرن کا استھان ہے ـــ"

پتاجی کی موت کے کئی سال بعد ایک روز میں نے جھجک جھجک کر شانتی کرن کے شوہر سے ذکر کیا تھا کہ پتاجی غلطاً مایوس ہو چکے تھے، انہیں یقین ہو چکا تھا کہ شانتی کرن سدا کے لئے کھو گئی ہے، فنا ہو چکی ہے!

جواب میں اس کے بوڑھے چہرے کی جھریاں مسکرانے لگی تھیں اور میرے اندھیارے من میں اس نے یہ کہہ کر شانتی کرن کا اجالا اتار دیا تھا "بھگت کے من میں بھگوان امر ہوتا ہے"!

میں نے سر موڑ کر اپنے شک کی پرچھائیں کی طرف پھر دیکھا تو وہ روشنی میں سمٹ سمٹ کر یکسر غائب ہو رہی تھی۔

شانتی کرن کی مورت پھر میرے بھرے بھرے ذہن سے چھلک چھلک کر باہر آنے لگی، باہر آ کر پھر وہیں بیٹھ گئی اور اس کی لانبی گھنیری پلکوں سے جھن جھن پیدا ہونے لگی۔ اور اس کا انگ انگ گانے لگا۔

"دل سے نہ جائیو، راما

دل سے ـــ"

اور گیت کے جھنکارے سے وہاں پتاجی کے قالب کا سایہ بھی نمودار ہونے لگا، اور ـــ اور ـــ ہائیں؟ یہ کیا؟! ـــ

شانتی کرن کے شوہر کی دونوں آنکھوں میں گنگا امنڈ رہی تھی، آنکھوں کے اندر مندر منعکس ہو رہے تھے۔

"بابو جی۔" شانتی کرن کے شوہر کا پرانا نوکر کمرے کی دہلیز سے سرک کر میرے پاس آ گیا اور میرے کان میں کہنے لگا۔ "مالک کو

سمجھائیے بابو جی !"

میں سراپا سوال بن کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

" بابو جی، مالک چوہدری چودی اپنے گم میں کھل رہے ہیں کل ساری رات حویلی کے چکر کاٹتے رہے۔ ایک ایک کمرے میں کئی کئی بار گئے۔ میں تو جانوں ساتی میا کو ڈھونڈ رہے تھے۔!"

گراموفون ریکارڈ سے گیت کی آواز آنا بند ہو گئی۔

میں نے دیکھا کہ ڈسک پر ریکارڈ کسی بدحواس عاشق کی طرح گھوم رہا ہے اور سوئی ریکارڈ کا سینہ چیر چیر کر صدا بند لکیروں سے باہر آچکی ہے اور بے جان کنارے کی گولائی میں کسی مُردار چیل کی طرح اپنی نوکیلی چونچ رگڑ رہی ہے۔

شانتی کرن کا بوڑھا شوہر کانپ کانپ کر رونے لگا۔

" نہیں! نہیں! نہیں!" گویا لہروں کے تلاطم میں ڈوبے ہوئے مندروں کی بوسیدہ دیواریں گرنے لگی ہوں۔ "تیس سال میں وہ ایک بار بھی یہاں نہیں آئی، وہ مر چکی ہے، میری شانتی کرن مر چکی ہے!"

میں نے گویا بھگوان کو بھگت کے من میں دم توڑتے دیکھ لیا!؟

نقش، کراچی

ادبِ لطیف لاہور

رضیہ فصیح احمد

گم نصیب

یہ صاب لوگ بھی کھوب ہو وے ہیں۔ ہم بیرا لوگ کو شاید سچ مچ کا "بہرا" سمجھے ہیں۔ تبھی تو گلا پھاڑ کر چلاتے ہیں: "بہرہ! سپلائی چلاؤ۔ ڈسکی پیچ لاؤ۔" اور جب حال ایسا ہو جو اس ہوٹل کا ہے کہ "سیجن" (سیزن) کا رش، آدمی پر آدمی اُمڈا آ رہا ہے اور لے دے کے دہی گنتی کے ایک، دو تین بیرے تو آدمی سچ مچ کا بہرا نہ بن جائے تو کیا کرے؟ اور جو اصل معنوں میں پوچھو تو سوائے میرے اِدھر کوئی بیرا ہی نہیں۔ سفید وردی پہن کر اور کمر پہ پٹکا اور پگڑی باندھ کر تو ہر کوئی بیرا نہیں بن سکتا۔ بیرے تو وہی ہوتے ہیں جو پکے پکے بیرے ہوں۔ اب جیسے میں ہوں ساری عمر بیرا گیری کرتے گزر گئی۔ چھوٹا سا تھا تو انگریزوں کے ہاں کام سیکھا۔ بڑا ہوا تو اپنے صاب لوگوں کے ہاں بیرا گیری کی۔ پھر اس ہوٹل میں آ گیا۔ اور یہ جو ہیں دوسرے، جب ہوٹل کے مالک کی پھرنیچر (فرنیچر) کی دوکان تھی تو پھرنیچر بنایا کریں تھے۔ ہوٹل کھل گیا تو وردی پہن بیرے بن گئے۔ پر عادتیں وہی پھرنیچر بنانے والوں کی — گھس گھس کام کریں ہیں۔ مانو لکڑی پر رندا مار رہے ہوں۔ بیرول والی پھرتی تو چھو کر نہیں گئی انھیں کمنٹ میں اِدھر تو منٹ میں اُدھر۔ ایک کو کھانا دیا، ایک کو پانی دیا، کسی کو کھالی ہوں ہاں میں ٹرکایا۔ مگر جہاں پر سوائے جی صاب، آیا صاب اور ابھی لایا حجور، کے سوا اور کچھ نہیں — اور یہ بڑھئی لوگ صاب لوگ کی کدر (قدر) کرنا جانتے ہی نہیں۔ کوئی نیا منیجر آئے گا تو میں یوں دانت نکال کر کھیسی دکھاؤں گا جانو میرا سگا ہو۔ اور یہ لوگ ماتھے پر یوں بل ڈالے رکھیں گے چوبیس گھنٹے جیسے سوکھی لکڑی میں بل پڑ گیا ہو کہ ٹوٹ جائے گی پر بل نہ نکلے گا اس کا۔

تو یہ بات ہے کہ مٹھی کہ جیسا ن جو ہوتی ہے نا سو دل جیتتی ہے۔ یہ بھی مجبور اور جو حکم سرکار کا تعمیل ملے کہ سارے میجوں (میزوں) والے کہتے ہیں کہ بیرا تو ہی ہمیں سرو کیا کر۔ اور میں کہوں ہوں، بہت اچھا حجور، حالانکہ سب ہی جانتے ہیں کہ میں اکیلی جان ساری میجوں کو کیسے سرو کر سکوں ہوں۔ چلتے وخت سالے منیجر، مجھے دگنی بخشش دے کر جاوے ہیں، تو ان پھرنیچر والوں کے آگ لگ جاوے ہے۔ بچے مجھ سے ایسے کھش کہ گھنٹوں اِدھر اُدھر کی بات پوچھیں گے۔ میں آدھی بات کا جاب دے کر کہوں گا "ابھی آیا بابا صاب" اور گائب۔ ان کو جبردستی ہلاؤں گا۔ کاؤن چلیک، اور کھدا بھلا کرے۔ دھیٹ پٹ ان کی جیبوں میں ڈال دوں گا اور یہ دوسرے بڑھئی تر کھان کوئی بچہ ڈائننگ ہال میں گھسا اور انھوں نے جھڑکا۔ اُدھر مت جاؤ۔ وہ مت چھوؤ ٹوٹ جائے گا۔ اللہ کے بندے یہ نہیں سوچیں کہ ٹوٹ جائے گا تو ان کے باپ بھریں گے۔ تو کیوں بے فجول میں ان سے لڑائی کر رہا ہے۔ تو بس یہ دعا ہے کہ سارے میرے سے کھش ہیں۔ مجھ سے ہر طرح کی باتیں کرے ہیں۔ آج ہی کا کھصّہ (قصّہ) لو۔ ایک صاب بولا۔ "بیرا، اِدھر کب سے ہے؟"

میں نے کیا۔ "صاب بیتن سال ہو گئے۔"

صاب حیران ہو گیا، بولا ـــ "کدر کے رہنے والے ہو؟"

میں نے کہا ـــ "صاب مجھے تو کچھ پتہ نہیں، باپ چھوٹا ہی مر گیا تھا، بس رُلتا ملتا اِدھر آ گیا۔"

میری اس بات پر بیگم صاب کا ہنستے ہنستے منہ لال ہو گیا۔ صاب ہنس کر بولا ـــ "باپ چھوٹا ہی مر گیا تھا تو تو کدر سے آ گیا ـــ!"

تب میں سمجھا، بولا "یہ مطبل نہیں ہے سرکار جب میں چھوٹا سا تھا جب باپ مر گیا تھا۔" پھر وہ میرے سے پوچھنے لگے۔ "بسیر تجھے اپنے نام کا تو پتہ ہے؟"

میں نے کہا "ہاں سرکار۔"

بولے۔ "اور جات پات؟"

میں بولا۔ "ایمان کی بات کہوں گا جور کہ میرے کو اپنی جات پات کا کوئی پتہ نہیں۔ اتنا جرور جانوں ہوں کہ جو لوگ جیادہ بولے ہیں نا وہ جاٹ ـ مکھیا تو نائی ہووے ہیں یا میراسی ہووے ہیں۔"

میری اس بات پر صاب اور بیگم اتنا ہنسے کہ ان کو ناستہ کرنا مسکل ہو گیا۔ پر میری سمجھ میں تو آیا نہیں کہ اس میں ہنسنے کی کون بات تھی ـــ پھر نیچے والے جو صاب بیگم صاب کو میرے ساتھ یوں دل لگی کرتے دیکھے ہیں تو جل کر سیخ کباب ہو جاوے ہیں۔ وہ جو ہے نا گورا چٹا سا بیرا جیسے اپنی شکل کا بڑا مان ہے۔ وہ مالک کا جاسوس بھی ہے۔ میرے کھلاف کھوب باتیں لگائے ہے جا کر۔ پر مالک بھی جانے ہے کہ بسیرے کے بگیر اس ہوٹل کا گجارا نہیں ـــ

تج ہی کی بات ہے کہ ایک صاب لوگ پندرہ روج رہ کر جانے لگے۔ صاب میرے سے بولا۔ بسیر جرا ہمارے کمرے سے سامان لا کر نیچے کار میں رکھ دو۔" ان کا کمرہ تھا دوسری منجل (منزل) پر۔ میں نے کیا "صاب بات ایمان کی یہ ہے کہ دو جن (وزن) تو میں دو من اٹھا لوں پر طاکت ہی نہیں اسے مجھ میں ـــ"

اس بات پر بھی صاب ہنسنے لگا۔ اسے بات میری سمجھ میں نہیں آوے ہے کہ جو میں سیدھی سی بات بھی کر دوں ہوں تو لوگ ہنسی کی واسطے پڑے ہیں۔ ساید سمجھے ہیں کہ میں مجاخ کر رہا ہوں۔ یہ جو میں ہنسوں بولوں ہوں اس کا یہ مطبل نہیں ہے کہ میں بڑا جیالا ہوں۔ سچ بات یہ ہے کہ میرے کو گم نے یوں چاٹ رکھا ہے۔ جیسے چیونٹی کیک کو چاٹ جائے ہے۔ میرا سا گم نصیب (غم نصیب) کیا کسی سے مجاخ کرے گا اور وہ بھی صاب لوگوں سے جنھوں نے میری جندگی کو ہی اجاڑ دیا۔ پر ہاں ہنسی کھشی سب سے نباہ جرور کر رہا ہوں۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ یہ صاب جب جانے لگا تو دس کا نوٹ مجھے دیا۔ میں نے سلام کر کے لے لیا۔ تو اُن کا بابا جو دس سال کا تھا جیب سے ایک روپیہ کا نوٹ نکال کر بولا ـــ "بسیر! ٹپ دس۔"

میں نے کیا ـــ "بابا تم سے کیا لے گا۔ تم کھش رہو۔ مٹھائی کھاؤ۔"

پر وہ پیچھے پڑ گیا۔ صاب بیگم صاب بھی بولا ـــ "لے لو بسیر۔"

میں نے کیا۔ "بہت ہے جی ـ اس کا کیا کروں گا؟"

بابا بولا ـ "پچکر دیکھنا۔"

میں نے جواب دیا ـــ "پچکو تو کبھی ساری جندگی میں نہیں دیکھا۔"

اس پر صاب حیران ہو کر بولا ـ "کبھی نہیں دیکھا؟"

میں نے کیا ـ "جی بس ایک دیکھے دیکھا ہے۔ پھر کبھی نہیں دیکھا۔"

صاب پوچھنے لگا۔ پھر کیوں نہیں دیکھا۔! میں نے کسی طرح بات بنا کر ٹالا ۔ پر اسی وخت سے یہ اپنا دل کسی طرح نہیں لگتا۔ ہاں ہر دم وہ سین نجروں کے سامنے آتے ہے۔ کیا اچھا ہوتا جو میں گھوڑے کے ساتھ کھیل دیکھنے نہ جاتا۔ پر جو کسمت میں لکھا ہو وہ کیسے ٹل سکے ہے۔ مگر ٹل سکتا تو کھیراں (خیراں) ولایت ہی کیوں جاتی! ہائے! جب اُس کے جانے کا دن یاد آئے ہے تو کیسا لگے ہے جیسے کوئی دل کے یوں برابر برابر ٹکڑے کر رہا ہو۔ مانو خالنساماں چھری سے ترس کاٹ رہا ہو۔

اس عورت جات کی بات بھی دیکھو، ولایت جانے کی بات سنی تو کیسی نجریں پھیر لیں۔ سارے وعدے جھٹ دینی بھلا دیے۔ رات کو جب صاب بیگم صاب پارٹیوں میں چلے جائیں تھے تو ہم دونوں بچوں کے پاس بیٹھ کر کیسے کیسے کلے (قلعے) بنایا کریں تھے کہ سادی کر کے یہ کریں گے وہ کریں گے۔ پھر صاب کی انگلینڈ کی بدلی ہو گئی۔ تین سال کے لیے۔ انھوں نے کہا کھیراں کو ہم بچوں کی دیکھ بھال کے لیے ساتھ لے جائیں گے۔ یہ بات سن کر میرا تو دل دھک سے رہ گیا۔ ایسا بے کابو ہوا کہ جا کر بیگم کے کدموں (قدموں) میں گر گیا کہ یا تو مجھے بھی ساتھ لے چلو یا کھیراں کو بھی چھوڑ جاؤ۔ بیگم صاب ہنسے تو ہنسے۔ صاب سے جا کر بولی: "دیکھا اس مجنوں کو یہ کیا کہہ رہا ہے!" صاب ہنس کر بولا "اچھا، اچھا، کھیراں سے پوچھ لے اگر وہ کہے گی تو اُسے چھوڑ جائیں گے۔" میں کھش کھش اُس کے پاس بھاگا، اور بولا "بس اب تو نہیں جائے گی۔ صاب نے معاملہ تیری مرجی پہ چھوڑ دیا ہے۔" تو وہ آنکھیں نکال کر کہتی ہے کہ "اے واہ! میں کیوں نہ جاؤں؟ ہوائی جہاج کی اور ولایت کی سیر سپاٹ میں چھوڑ دوں۔" پہلے تو میں سمجھا مجاخ کر رہی ہے نکھرے دکھا رہی ہے عورتوں والے۔ پر بعد میں پتا چلا کہ اسے تو سچ مچ ولایت کا نسہ چڑھ گیا ہے۔ جیسے ہیں تھیں افیون کا نشہ چڑھے ہے نا بالکل اس طریوں۔ میں نے اس کو سمجھایا کہ یہ افسر لوگ تو لالچی ہووے ہیں۔ اس واسطے ولایت جانے سے کھش ہووے ہیں کہ وہاں سے لمبی لمبی کاریں لے آویں گے۔ ٹھنڈی مشین لگانے والے باجے اور اللا بلا۔ پر ہم گریبوں کو تو یاں بھی کھدمت کرنی ہے واں بھی۔ تو ہاتھ پیر توڑنے کے واسطے اپنے سگوں کو چھوڑ کر ہجار میل جانے کا پھائدہ؟ اس بات کا کھیراں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں بہت رویا، پیٹا، کسمیں دیں، کنوئیں میں چھلانگ لگانے کی دھمکی دی۔ پر وہ ہنستی رہی۔ پھر بہت مانی تو آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی "نصیبے! یہ میری کھشی ہے، تو میری کھاطر مان لے۔ مر تھوڑی جاؤں گی۔ تین سال بعد آؤں گی تو تیرے ہی سنگ رہوں گی ساری عمر۔" میں مان گیا اور کیا کرتا۔ پر میں نے کہا کھیراں پہلے سادی کر لے پھر چلی جانا۔ کم از کم تیرے میرے نام کا ساتھ ہو جائے۔ پر اس بات پر صاب اور بیگم راضی نہ ہوئے۔ وہ کیا سمجھیں ہم گریبوں کے دل کی بات۔ بلکہ بڑے لوگ تو یوں جانے ہیں مانو ہمارا دل کھدا نے بنایا ہی نہیں۔

کھیراں چلی گئی۔ ہائے! اُس کے جانے کا دن کوئی میرے تو جلا دے۔ تو ساری عمر کے واسطے اس کا گلام ہو جاؤں۔ ہمیسہ تو بیگم صاب اسے صاف ستھرا رکھنے کا کھیال نہ کریں تھیں۔ پر اس روز تو اپنا اچھا بھلا ریسمی جوڑا اُسے دے دیا۔ کھود اس کے بال بنائے اور سینڈل پہن کر مٹکتی ہوئی جو چلی تو اللہ کسم مالوم ہوا جیسے میرے دل پہ سے گجرے چلی جا رہی ہو۔ بیگم صاب بچوں کی آیا جیسی لگ رہی تھی موٹی بھدی۔ اور کھیراں معلوم ہووے تھی جیسے عین مین بیگم ہو ۔۔۔ صاب نے بھی دیکھا تو بس دیکھتا رہ گیا۔ وہ جو ہوائی جہاجوں میں ہووے ہیں نا۔ سفید فراک کپڑے اور ہری ٹوپی پہنے کیا بولے ہیں انھیں ایئر ہوس دوس، کسم لے لو اس سے بھی اچھی لگ رہی تھی، میری کھیراں۔ میں نے سوچا اگر اس کو یہ کپڑے پہنا دو تو یہاں سے ولایت ملک میں ایک بھی اس کی ٹکر کی ایئر ہوس نہ ملے۔ بس جی میں ٹکر ٹکر دیکھتا رہا۔ سب لوگ اپنے رستے داروں سے مل کر کٹھرے کے دوسری طرف چلے گئے۔

جانے سے پہلے میں کھیراں کا ہاتھ بھی نہ پکڑ سکا۔ بس اتنا کہا "کھیراں مجھے بھول نہ جانا!"

وہ بولی "نصیبے، دل تھوڑا نہ کر، تین سال پتہ بھی نہ لگیں گے۔"

پھر وہ بے بی کو گود میں لے کر جہاج کی سیڑھیوں پر چڑھ گئی۔ دروازے میں سے اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ اور پھر اندر گائب ہو گئی۔ مانو ایک تیر میرے کلیجے میں لگا۔ سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔ سب لوگ اندر چلے گئے۔ دروازہ بند ہو گیا۔ اور دیکھتے دیکھتے وہ اتنا بڑا جہاج چیل بن کر اڑ گیا۔ پہلے تو

نیلے آسمان پر وہ سپید جہاج یوں لگا جیسے نیلے سمندر میں کوئی سپید چکنی چکنی مچھلی تیرائی ہو۔ پھر چھوٹا ہوتا گیا۔ مانو کوئی چھوٹی سی چڑیا دُور اڑ رہی ہو۔ پھر ایک نکتہ جیسا بن گیا۔ اور پھر وہ بھی گائب ہو گیا۔ اور مجھے اس وخت یوں لگا جیسے میں کھیراں کو کبر (قبر) میں اتار کر، اُس کے اوپر مٹی ڈال کر آ رہا ہوں۔ کتنے ہی دن مجھے اپنے تن بدن کا ہوس نہ تھا۔ صاب ہی چلتے وخت مجھے اِس ہوٹل میں رکھا گیا تھا۔ اس جمانے میں اس کا مالک ایک بھلا مانس تھا۔ میں نے اُس سے چھٹی لے لی۔ اور گھر میں پڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ کر کے ہوٹل جانا شروع کر دیا کہ کسی طریوں وخت تو کٹے۔

کئی دن بعد بیگم صاب کے ہاتھ کا لکھا ہوا کھیراں کا کھط پہلا آیا۔ جس میں اُس نے اپنی کھیریت لکھی تھی۔ اور ولایت کی تعریف میں پتہ نہیں کیا کیا لکھا تھا۔ لگتا تھا وہ گوری چمڑی والوں کے دیس کو دل دے بیٹھی۔ مجھے تو اللہ کسم اسی دن سے اس دیس سے نفرت ہو گئی جس دن کھیراں نے اُس پہ کدم رکھے —— میں اُس کو برابر کھط لکھتا رہا۔ وہ بھی کبھی کسی سے کبھی کسی سے جواب لکھا دیتی۔ پر آہستہ آہستہ یہ سلسلہ کم ہونے لگا۔ وہ لکھتی چٹھی لکھنے والا بڑی مسکل سے ملتا ہے۔ پھر دوسرے آدمی سے لکھاؤں بھی کیا۔ سچی بات ہے کہ ایک کھط بھی تو اُدھر کا پچیسیوں میں آئے جائے ہے۔ یہ تو نہیں کہ تین پیسے کا کارڈ لکھ کر ڈال دیا۔ پھر کچھ دن ایک دم سے اُس کے کھط آنے بند ہو گئے۔ میں نے کئی لکھے پر کوئی جواب نہ آیا۔ ایک بیگم کے نام بھی ڈالا۔ پر انھوں نے بھی کوئی پروا نہ کی۔ اب بس میں اُس کا انتجار ہی کر سکتا تھا۔ اور میرا کیا بس تھا۔ پر اب میری مسکل بھی دیکھو۔ صاب لوگوں کے ٹھکانے کا کوئی پتا نہیں۔ اِدھر ادھر پھرنے والے لوگ۔ کھیراں کا بھی میری طریوں کوئی نجدیکی (نزدیکی) رشتے وار نہ تھا۔ جو تھے اُن سے پوچھو تو کہیں ہیں تو یہ بھی نہیں پتا کہ جیتی ہے یا مر گئی —— تین سال بھی گجر گئے۔ پر مجھے پتا نہیں چلا کہ صاب لوگ لوٹے یا نہیں۔ اور اگر آئے تو کہاں ہیں؟ ہوٹل میں آنے والے ہر افسر سے صاب کا نام لے کر پوچھوں پر کوئی بھی کچھ نہ بتائے۔ کوئی پانچ سال گجر گئے کہ ایک دن میں نے انھیں صاب اور بیگم کو ایک لمبی سی کار میں سے اتر کر ایک دکان میں جاتے دیکھا۔ کار میں پیچھے کوئی عورت لال دوپٹہ اوڑھے بیٹھی تھی۔ ہو نہ ہو یہ کھیراں ہے۔ صاب کے بے بی کو لیے بیٹھی ہو گی۔ میں پاگلوں کی طریوں بھاگا —— ایک موٹر کے آگے کچلتا کچلتا بچا۔ درواجا کھول کر چلایا۔ "کھیراں! میری کھیراں!"

اُس عورت نے چیخ کر کہا —— "چل بدمعاس، لفنگے، تو ہے کون؟" اب جو دیکھا تو ایک کالی بھجنگ عورت، چڑیل کی مافک، اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے یوں گھور رہی ہے جیسے کچا ہی چبا جائے گی۔

"بہن ماف کرنا، مجھے دھوکا ہوا۔" کہہ کر میں اُدھر سے چلا آیا اور دکان کے باہر کھڑے ہو کر صاب اور بیگم کا انتجار کرنے لگا۔ جب وہ نکلے تو میں نے سلام کیا۔ صاب مجھے پہچان کر حال احوال پوچھنے لگا۔ پر میں نے کچھ نہ سنا۔ چھوٹتے ہی پوچھا۔ "صاب کھیراں کہاں ہے؟"

"کون کھیراں؟" صاب یوں بولا جیسے اُسے کچھ یاد ہی نہ ہو۔

"ارے وہی بدمعاس جسے ہم اپنے ساتھ انگلینڈ لے گئے تھے!" بیگم بولی اور میرا دل بیٹھنے لگا۔ صاب ہنسنے لگا۔ اور بیگم ماتھے پہ بل ڈال کر بولی۔ "نہ جانے کم بخت کہاں ہو گی۔ وہ آوارہ ہو گئی تھی۔ ہم نے تو انگلینڈ میں ہی اُسے نکال باہر کیا تھا۔"

اُس دن سے مانو دنیا میری نجر میں اندھیر ہو گئی۔ کبھی سوچوں جو بیگم نے کہا ہے سائد ٹھیک ہو۔ کبھی سوچوں نہیں، ہو سکتا ہے بیگم نے اُسے کوئی اور وجے سے نکالا ہو۔ اور یہ الجام (الزام) لگایا ہو۔ سائد بیگم اُس سے جلنے لگی ہو۔ وہ کھوب صورت بھی تو اِتی تھی۔ دل کہے اگر اسے تیرا کھیال ہوتا تو کھط پتر لکھتی۔ اور میں کہوں کیا پتا بے چاری دِ در بھوکی مر رہی ہو۔ ان بڑے لوگوں کی بات تو دیکھو کہ پردیس لے جا کر بے چاری کو نوکری سے نکال دیا۔ پتا نہیں ان کو کھُدا نے دل بھی دیا ہے یا نہیں ——

گنوا میرا یار ہر وخت مجھے سمجھائے۔ کبھی طعنے دے کہ دنیا میں ایک ہی تو لونڈیا نہیں کہ جس کے پیچھے تو یوں ہلکان ہو رہا ہے۔ کہیں اور دل لگا۔ سادی رچا لے۔ پر یہ دل کہیں لگے تو لگاؤں! —— جبردستی سادی کی سوچوں تو یہ کھیال کہ اگر کہیں کھیراں مل گئی تو اُسے کیا منہ دکھاؤں گا۔ دوسرے یہ کہ سادی کر کے بھی اس لونڈیا سے دل نہ ملا تو کیا پھائدہ؟ —— گنوا میری باتوں پہ ہنسے اور کہے کہ تو سڑی ہو گیا ہے۔ ارے اپنے ہوٹل ہی میں دیکھ۔

لوگ کیسے کیسے بیٹھے کرے ہیں ۔ اور تو ہے کہ ایک کی جان کو رو رہا ہے ۔ یہ کھاتے پیتے سریفو (شریف) لوگ ہیں ۔ ان سے سبک سیکھ ۔۔۔ میں کہوں سریفوں میں سرافت ندہی تو اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ دیکھا دیکھی اپن بھی گو کھانا سروع کر دیویں ۔۔۔"

بس اسی طریوں دن گزرتے رہے ۔ ہوٹل میں ہنس ہنس کر بھاگ بھاگ سارا کام کروں ۔ پر جب اپنی کوٹھری میں جاؤں تو ایسا لگے کہ جیسے کھالی کوٹھری کھانے کو دوڑ رئی ہو ۔ ہوٹل میں طریوں طریوں کے آدمی اور نئی نئی باتوں سے دل تھوڑی دیر کو بہل جائے بڑھے ٹھڈے عاسک، لڑکا عورتیں، نئے نئے کنبے، نئے نئے جھگڑے ۔ اس ہوٹل میں اتی باتیں اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ جو ساری لکھوں تو ناول کے ناول بن جائیں ۔ دوسرے بیرے کام سے بچتے، پر میں بیل کی طرح ہر دخت کام میں جُتا رہتا ۔ میرا بس چلتا تو چوبیس گھنٹے ہوٹل ہی میں پڑا رہتا ۔ میرے اس کام سے مالک اتنا کھش ہوا کہ مجھے ہیڈ بیرا بنا دیا ۔ پر دل کی آگ ویسی کی ویسی رئی ۔

انھیں دنوں کی بات ہے جب میں ایک دن بہت بے چین ہوا اور گفورے نے بہت ستایا تو میں پہاڑ کی چوٹی پر بنے ہوئے پیر بابا کے مجار پر گیا اور منت مانی کہ جو کھیراں مجھے مل جائے تو دس روپے کی مٹھائی پر چڑھا کہ دلاؤں گا ۔ اور پھولوں کی چادر چڑھاؤں گا ۔ پھر میرے آنسو آ گئے ۔ اور روتے روتے بولا ۔" پیر صاحب، جو وہ جیتی ہے تو مجھے اس سے ملوا دو اور جو مر گئی تو اس کی کبر (قبر) ہی دکھا دو کہ اس دل مسرے کو صبر تو آوے ۔

ادھر گفورے نے مل کی نوکری چھوڑ سنیما کی گیٹ کیپری کر لی ۔ اور دن رات سر کھانے لگا کہ آ پچکر دیکھ ۔ میں کہوں " ساری عمر نہیں دیکھا تو تصویروں والا مداری کا تماسا تو اب کیوں گنہگار کرے ہے " پر وہ ایک نہیں سنے ۔ یہی کہے جائے کہ تو نے اتنے بچے دار مجے دار کھانے کھلائے ۔ پڈنگ، اور پلاؤ، اور جردہ، اب اگر تو نے آ کر میرے ساتھ پچکر نہیں دیکھی تو تیری میری کٹی ۔ آکھیر ایک دن تنگ آ کر میں نے وعدہ کر لیا ۔ پہنچا تو وہ اوپر گیلری کے گیٹ پر کھڑا تھا ۔ چپکے سے بولا ۔ بس پچکر سروع ہو لے تو ہم پیچھے کی کرسیوں پر جا کر بیٹھ جاویں گے ۔ پر جب میں اسارا کروں جھٹ دینی اٹھ کر باہر نکل آنا ۔ اگر منیجر نے دیکھ لیا تو کم بختی آ جاوے گی ۔ جب اندھیرا ہو گیا اور پچکر سروع ہوئے کچھ دیر گجر گئی تو گفورے نے میرا ہاتھ پکڑا اور سب سے پیچھے کی طرف لے گیا ۔ وہاں ساری کرسیاں کھالی تھیں ۔ مر یہ ایک پر کوئی عورت برکے پہنے بیٹھی تھی ۔ گفورا اس کے ایک طرف کھود بیٹھ گیا اور دوسری طرف مجھے بیٹھنے کا اسارا کیا ۔ میں گھبرایا تو اٹھ کر مجھے جبردستی بٹھلا دیا ۔ اور کھود پھر اسی جگہ بیٹھ گیا ۔ میں سمجھ گیا کہ آج گفورا اپنی جورو کو بھی پچکر دکھانے لایا ہے ۔ اب اس پچکر کی بات کیا کہوں ۔ گفورے نے ٹھیک کیا تھا کہ انگریجی پچکر ہے دیکھے گا تو آنکھیں کھل جاویں گی ۔ ہائے ! یہ اسی ولایت کی پچکر تھی جہاں کھیراں گائب ہو گئی تھی ۔ چھوٹے چھوٹے جانگیے پہنے پوری پوری عورتیں سمندر کے کنارے کلانچیں بھر رہی تھیں ۔ کھدا کی قسم ۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک عورت اور ایک مرد پہلے تو یوں جور جور سے بولیں جیسے ابھی لڑ پڑیں گے ۔ پھر جھٹ دینی ایک دوسرے سے لپٹ جائیں ۔ اس پر گفورے کی جورو ہلکے ہلکے ہنسے ۔۔۔

جب انٹرول ہونے والا ہوا تو گفورے نے میرے کو کہا کہ اٹھ چل ۔ ہم دونوں باہر جا کھڑے ہوئے ۔ روسنی ہوئی ۔ گفورے کی جورو نے نکاب ڈال لی ۔ پوری گیلری میں ایک وہی عورت تھی جو برکے میں تھی ۔ اور برکے بھی کھاکی (خاکی) رنگ کی ہوائی چھتری کا ۔ الگ سے سارے کمرے میں نجر آ رئی تھی ۔ میں نے سوچا بھلا گفورے کو کیا جرورت تھی اسے لانے کی ۔ اور لایا ہی تھا تو نیچے کسی درجے میں بٹھلایا ہوتا ۔ جب میں نے یہ بات کئی تو وہ جور جور سے ہنسنے لگا ۔ بولا " الّو ! یہ تیری بھابی نہیں ہے ۔ یہ تو تیرے واسطے آج میں نے اس کو بلایا ہے ۔ اتی سستی نہیں ہے پر انگریجی پچکر اور گیلری کا لالچ اسے مار جاوے ہے ۔ انگریجی پچکر پہ جان دے ہے جان ۔۔۔ تو دیکھے گا تو حیران ہو جاوے گا ۔ کہ ایک پچکر کے مکابلے میں کیا چیج ہے وہ ۔ اور پھر پچکر بھی تو سالی مہنگی ہے ۔ کون اپن نے دمڑی کھرچ کی ہے "

پھر وہ میرا ہاتھ دبا کر ہنسا ۔ اور بولا ۔۔۔" سارے دوستوں کو اسی طرح مہنگی کراتا ہوں ۔ اس کو کہتے ہیں یاری ۔۔۔ پڈنگ اور پلاؤ اور جردہ کیا چیج ہے ۔۔۔"

"یار تجھے تو پتہ ہے کہ میں ان باتوں میں نہیں ۔۔" میں نے کہا ۔

گھوڑا ہنسا ۔" ارے وہ تجھے سب ٹھیک کر دے گی ۔ بیٹے ۔ تو ابھی تک اُسے اپنی بھابی سمجھ کر سکڑا سمٹا بیٹھا تھا ۔ اب ذرا ہاتھ پاؤں پھیلا ۔۔ پر حیرانی یہ ہے کہ وہ بھی کھوب پارسا بنی بیٹھی رہی ۔"

"ایمان کی بات یہ ہے کہ ایک دفعہ ایسا معلوم ہوا جیسے اُس نے میرا ہاتھ ٹٹولا ۔ پر میں سمجھا کہ ایسے ہی لگ گیا ہوگا ۔ میں نے اپنا ہاتھ جھٹ دینی کھینچ لیا ۔

"اب کے ایسی غلطی نہ کرنا ۔ آؤ چلو پھر سروع ہو گئی ۔۔"

ہم پھر جا کر اسی طرایں بیٹھ گئے ۔ اب کے اُس نے بیچ بیچ میرا ہاتھ پکڑ لیا ۔ کچھ اس کا ہاتھ ایسا نرم گرم تھا اور کچھ پکچر سسری ایسی تھی کہ میں اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوسس ہی نہ کر سکا ۔ کاپھی دیر تک اُس کے ہنسنے کی آواج آئی پھر بند ہو گئی ۔ پھر ہاتھ بھی ڈھیلا ہو کر الگ ہو گیا ۔ تو ایمان کی بات ہے کہ میری ہمت نہ ہوئی دوبارہ پکڑنے کی ۔ پکچر کھتم ہونے والی ہوئی تو گھوڑے نے پھر باہر نکلنے کو کہا ۔ ہم دونوں باہر چلے آئے ۔۔ پکچر ہاؤس میں روسنی ہوئی ۔ کومی ترانہ سروع ہوا ۔ سب لوگ سیدھے کھڑے ہو گئے ۔ اب ایک عجیب تماسا کہ وہ عورت سر ایک طرپھ ڈالے ، تھوڑا سا منہ کھولے بچے سے سوئی ہے ۔ جب لوگ باہر نکلنے سروع ہوئے تو سب اُسے دیکھ دیکھ ہنسیں ۔ پر اُسے کوئی پتہ نہیں ۔ برکع سر پہ سے اتر کر کندھے پر پڑا ہے ۔ دوپٹے کا ہوس نہیں ہے ۔ مجھے بڑی گیرت آئی ۔ میں نے گھوڑے سے کہا ۔" اٹھا نہ اپنی اس سگی کو جا کر ۔"

گھوڑا بولا ۔۔" اگر کسی نے دیکھ لیا تو میری سامت آئے گی ۔ جرا تو اُٹھا دے جا کر نوری نام ہے اس کا ۔"

مجبور ہو کر میں آگے بڑھا ۔ اور اُس کا بازو چھو کر بولا ۔" نوری اُٹھو ۔"

عورت نے آنکھیں کھول دیں ۔ اور منہ اس طرپھ کر کے حیران نجروں سے میری طرپھ دیکھا ۔ اور تب میں نے پاگلوں کی طریں اس کا بازو جو سے پکڑ لیا ۔ اور چلایا ۔" کیراں ! میری کیراں ! ۔۔"

یوں لگا جیسے وہ مجھے پہچان گئی ہو ۔۔ پھر بڑے نکھرے سے ہاتھ چھڑا کر اور انجان بن کر بولی ۔" کیسی کیراں ؟ میرا نام نوری ہے ۔" ہو بہو وہی آواج تھی ۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے کلیجے میں چکو مار دیا ہو ۔۔ اس سے پہلے کہ گھوڑا باہر آئے میں سیڑھیاں پھلانگتا نیچے پہنچا ۔ ایک رکشہ لیا اور سیدھا بابا جی گیا ۔ وہاں سے دس روپے کی مٹھائی اور پھولوں کی ایک چادر کھریدی ۔ اور جا کر پیر بابا کے مجار پر چڑھائی ۔ پھر وہاں بیٹھ کر ایسا رویا کہ بے ہوس ہو گیا ۔ بے ہوس ہونے سے پہلے رو رو کر بس یہی کہے جاؤں ۔

"پیر بابا تمھاری کرامت کے صدکے جاؤں ۔ کیراں مر گئی ۔ پر اُس کی کبر (قبر) تم نے مجھے دکھا دی ۔ اب میرے دل کو صبر آ جاوے گا ۔"

صبح مجار کے مجاوروں نے آ کر مجھے اُٹھایا ۔ وہ دن اور آج کا دن نہ کبھی میں نے گھوڑے کی شکل دیکھی ، نہ کبھی پکچر دیکھی اور نہ کبھی پھر کیراں کی "کبر" ہی مجھے نجر آئی ۔

شمیم درانی

سیپ کراچی

ٹھوکر گلی

گلی ویران ہوئے آج تیسرا دن تھا ——

اور ان تین دنوں میں اس نے صرف ڈھائی روپے کمائے تھے۔ ڈھائی روپے جس میں ایک روپے کی اس نے پاسپورٹ سائز کی تین تصویریں بنائی تھیں۔ اور ڈیڑھ روپیہ میں ایک فلم کی ڈیولپنگ کر کے ان کے پرنٹ نکالے تھے۔

آج سے تین دن پہلے تک، جب یہ گلی یوں ویران نہ تھی۔ تو وہ بہت آسانی سے دس بارہ روپے روزانہ کما لیتا تھا۔ گلی کیا اجڑی وہ خود بھی اس پودے کی طرح اجڑ گیا تھا جسے پانی نہ ملا ہو۔

ٹھوکر گلی جو صبح سے رات گئے تک ہر طرح کے لوگوں سے بھری رہتی تھی اب اجاڑ اور سنسان نظر آ رہی تھی۔ اُسے خود تو خیر اُس چیز سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ جس کے لئے لوگ کشاں کشاں ٹھوکر گلی میں آتے تھے۔ یہ تو زیادہ آمدنی کا لالچ تھا۔ جو اسے ٹھوکر گلی میں کھینچ لایا تھا۔ ٹھوکر گلی میں اپنا "ڈیلائٹ فوٹو اسٹوڈیو" کھولنے سے قبل اس کا خیال تھا۔ کہ شہر کے دوسرے علاقوں کی بہ نسبت اس گلی میں زیادہ شوقین آتے ہوں گے۔ یہاں وہ دوسری جگہ سے زیادہ ہی کما سکے گا۔ اور اسی لیے اس نے یہ علاقہ پسند کیا تھا۔ یہاں پہنچ کر اسے زیادہ آمدنی بھی ہوئی اور مفت میں دلبستگی اور تفریح کا سامان بھی ہاتھ آیا۔ لیکن اب گلی کیا اجڑی۔ کہ ہر چیز ہی نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

گلی ویران ہوئے آج تیسرا دن تھا۔ اور ان تین دنوں میں اُس نے صرف ڈھائی روپے کمائے تھے۔ دوسرے تین دن سے اس کو دلبستگی کا بھی کوئی سامان میسر نہ آیا تھا۔ حکومت نے اخلاقی، روحانی، مذہبی اور تعزیراتی پابندیوں کا سہارا لے کر عصمت فروشی غیر قانونی قرار دے دی تھی۔ اور جبراً ٹھوکر گلی اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ طوائفوں سے خالی کرا لیا گیا تھا۔

ان تین دنوں میں اس نے کئی بار سوچا، کیا حکومت اس طرح اس قبیح تجارت کا سدباب کر سکے گی؟ — اس قسم کی قانونی پابندیاں تو قانون شکنی کی نئی راہیں پیدا کرتی ہیں، جب تک انسان کے لیے معاشی طور پر زندگی کی ضروریات فراہم نہیں کر دی جاتیں۔ اس وقت تک اس کا علاج ممکن نہیں ہے۔ زندگی کی ضروریات میں اگر آدمی آسودہ اور مطمئن ہے تو کبھی ٹھوکر گلی کا رخ ہی نہ کرے گا۔ آدمی کو معاشی طور پر آسودہ اور مطمئن کر دو۔ پھر نہ تو یہ گلیاں آباد ہوں گی۔ اور نہ اجڑیں گی۔ اور پھر عورت تو انسانی ضروریات میں شامل ہے جس سے زندگی اپنی تکمیل کو پہنچی ہے! عورت کے اس تصور کی ناکامی نے ہی تو چکلوں کو تخلیق کیا ہے اور عصمتوں کے بازار سجائے ہیں۔ ان حالات میں پھر اس قسم کے اقدامات کیا معنی! پھر اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ اب ان کا

پیٹ کی دوزخ کا کیا ہوگا؟ یہ کیوں کر اپنی روزی حاصل کریں گی؟ — آج کی روزی کا خیال آتے ہی یکدم اسے اپنے ڈھائی روپے یاد آ گئے۔

آج تیسرا دن تھا۔ یہ ڈھائی روپے تو پچھلے دو دنوں کی کمائی تھی۔ آج صبح سے تو ایک پیسے کی بھی مزدوری نہیں ہوئی تھی۔ اسٹوڈیو میں صبح سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے اسے عجیب سی کوفت محسوس ہو رہی تھی۔ پھر وہ اٹھا اور یوں ہی کچھ کرنے کے خیال سے اسٹوڈیو کی صفائی کرنے لگا۔ الماریوں، شوکیسوں کی گرد جھاڑی۔ فریموں میں لگی ہوئی تصویریں اس نے کئی مرتبہ آرٹسٹک انداز میں لگائیں۔ ایک فریم کا جس میں سوکر گلی کی مشہور گانے والیوں شکیلہ، لالی، قمرن اور زبیدہ کی تصویریں لگی ہوئی تھیں اور جن پہ گرد جم گئی تھی..... شیشہ نکال کر وہ تصویریں بھی صاف کیں۔ لالی کی تصویر پر سے گرد پونچھتے ہوئے اسے خدا بخش یاد آ گیا۔

خدا بخش بھی تو تین دن سے غائب تھا۔ نہ جانے کہاں ہوگا کم بخت؟ تین دن پہلے جب یہ محلہ خالی کرایا جا رہا تھا۔ وہ بھی اپنی بہن لالی اور دوسرے افراد کے ساتھ ہی چلا گیا تھا۔ اور آج تک پلٹ کر نہیں آیا تھا۔ خدا بخش کے متعلق البتہ اس کو یہ یقین تھا۔ کہ وہ ان دنوں بھی بیکار نہیں رہا ہوگا۔ ویسے بھی وہ اپنا کاروبار گلی سے باہر ہی کیا کرتا تھا۔ وہ لالی اپنی چھوٹی بہن تھی جس کا گلی کی گانے والیوں میں خاصا نام تھا۔ ساتھ لے کر روزانہ شہر میں ادھر ادھر نکل جاتا یوں بھی اس کا شمار گلی کے کامیاب اور ہوشیار دلالوں میں ہوتا تھا۔ ہر شخص کا عام طور سے خدا بخش کے متعلق یہی خیال تھا۔ کہ وہ اپنے کام میں کہیں ماند نہیں کھا سکتا۔ حقیقت بھی یہی تھی۔ اس کے طریقہ کار بڑا بہت دلچسپ اور انوکھے ہوتے تھے۔ جب کہ اس کا کاروبار شہر کی تفریح گاہوں اور کچہریاں وغیرہ تک ہی محدود تھا۔ حالانکہ وہ اپنے کام سے کام رکھنے کے سوا اور کسی چیز کا قائل نہیں تھا۔ پھر بھی یاری دوستی تو سب سے رکھنا ہی پڑتی تھی۔ خدا بخش اس کا مستقل گاہک بھی تھا۔ خدا بخش کو فلم میں ہیرو اور لالی کو ہیروئن بننے کا بہت شوق تھا۔ اسی لئے وہ دن میں ایک بار اس کے اسٹوڈیو آکر ایک پوز ضرور دیتا تھا — خدا بخش کو اس نے ایسی بھی بہت سی تصویریں بنا کر دی تھیں۔ جس میں وہ کسی نہ کسی فلم ایکٹریس کے ساتھ چپکا نظر آتا تھا۔ کچھ دنوں سے خدا بخش کی یہ خواہش تھی۔ کہ شکیلہ کے ساتھ فوٹو کھچوائے۔ وہ اکثر کہتا تھا۔ کہ اُسے شکیلہ سے عشق ہے۔ جس فلم میں وہ ہیرو ہوگا۔ اس میں وہ شکیلہ کو ضرور ہیروئن بنوائے گا۔

سوکر گلی میں شکیلہ خوبصورتی کے لحاظ سے نمبر ون تھی۔ گانا تو خیر اسے واجبی ہی آتا تھا لیکن ناچنا خوب جانتی تھی۔ قمرن البتہ گلی کی تمام گانے والیوں میں بہت عمدہ گاتی تھی۔ وہ تین پکچروں میں بقول اس نے پلے بیک بھی دیا تھا۔ لیکن پکچر فیل ہو گئی۔ اور قمرن کا بھی بقول خدا بخش ڈبہ ہو گیا۔ شکل و صورت بس واجبی ہی تھی۔ لہٰذا پوری گلی میں صرف شکیلہ کا طوطی بولتا تھا۔ ادھر خدا بخش کو شکیلہ سے عشق جنون کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ اُدھر شکیلہ تھی۔ کہ خدا بخش کو منہ ہی نہ لگاتی تھی۔ دراصل اسے خدا بخش کی یہ بات قطعی پسند نہ تھی۔ کہ وہ اپنی بہن لالی کو یوں سینماؤں اور تفریح گاہوں میں لئے پھرے۔ شکیلہ کا کہنا تھا کہ جب ناچنے گانے سے اللہ پیٹ بھر دیتا ہے تو پھر اس کام کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن خدا بخش کو تو بس اپنے کام سے کام تھا۔ اسے کسی کی نصیحتیں نہیں چاہئے تھیں۔ اس کی تو ان دنوں صرف یہ آرزو تھی۔ کہ وہ اور شکیلہ ساتھ ساتھ بیٹھے۔ ایک تصویر کھنچوالیں اور بس۔ لیکن اس کی یہ آرزو کسی طرح پوری نہ ہو سکی۔ گلی ہی اجڑ گئی اور شکیلہ سے بھی پولیس نے اس محلہ کو زبردستی خالی کرا لیا۔

بیٹھے بیٹھے تین روز پہلے کا وہ منظر اس کی نظروں میں گھوم گیا جب شکیلہ اور شکیلہ کی ماں نے بہتیرا پولیس والوں سے کہا کہ وہ تو صرف گانے ناچنے کا کاروبار کرتے ہیں۔ انھیں کیوں خواہ مخواہ پریشان کیا جا رہا ہے۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ ان کے یہاں صرف گانے ناچنے کا ہی کام ہوتا تھا۔ بیٹھک نہیں ہوتی تھی کہ عام بیٹھک کے لیے تو سڑک کے کنارے کے کمرے مخصوص تھے۔ لیکن ان کی ایک نہ سنی گئی۔ اور سب کے ساتھ ساتھ انہیں بھی یہ جگہ خالی کرنا پڑی۔

یہ بات وہ آج تک نہیں سمجھ سکا تھا کہ شکیلہ اس کی اتنی عزت کیوں کرتی تھی۔ یہ بہت پرانی بات ہے ایک دن جب شکیلہ اس کے اس اسٹوڈیو میں بالوں کے تازہ فیشن کے ساتھ اپنی تصویر کھنچوانے آئی۔ تو وہ بہت اداس بیٹھا تھا۔ ان دنوں خود اس کی شادی کی بات چیت چل رہی تھی۔ اور لڑکی والے بہت جلد اس فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔ اور اس کے پاس اس فرض کو ادا کرنے کے لیے روپے نہیں تھے۔ اس نے اپنا سارا زور یہ اسٹوڈیو

میں فرنیچر کی نئی فٹنگ میں لگا دیا تھا۔ اور ایک نیا رولی فلیکس کیمرہ بھی خرید لیا تھا۔ شکیلہ نے اسے اداس دیکھ کر پوچھا تھا۔

"کیا بات ہے لالے۔ کیوں سوچا بیٹھا ہے رے ؟"

شکیلہ ہمیشہ اسے "لالے" کہہ کر ہی مخاطب کرتی تھی۔ پہلی بار جب شکیلہ نے اسے لالے کہا تو وہ بہت جھینپا۔ ایک طوائف ایک اچھے گھرانے والے کا دو بھائی کیسے ہو سکتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ اس لفظ کا عادی ہو گیا۔ اور جب شکیلہ نے دوبارہ اس سے اداسی کی وجہ پوچھی تو اس نے بغیر کسی تکلف کے ساری بات اسے بتا دی۔ یہ سن کر شکیلہ نے اس وقت تو کچھ نہ کہا۔ پر تھوڑی دیر بعد اپنے چھوٹے بھائی کے ہاتھ اس کو دو سو روپے بھجوا دیے تھے۔

وہ ان دو سو روپوں کو ہاتھ میں لیے کتنی دیر تک یہی سوچتا رہا تھا۔ کہ آیا وہ ان روپوں کو لے یا نہ لے۔ شادی جیسے نیک کام میں یہ طوائف کی کمائی کے روپے حلال ہوں گے یا حرام۔ ساتھ ہی وہ اس پہ بھی متعجب تھا۔ کہ شکیلہ نے اُسے یہ روپے کیوں دیے ؟ اس وقت تو ضرورت کے تحت اس نے یہ رقم رکھ لی۔ یہ اور بات ہے کہ اُس نے دو مہینے بعد ہی اس کی یہ رقم لوٹا دی۔ جب ہی سے وہ ان دوسری طوائفوں کے مقابلے میں جن کا اس کے اسٹوڈیو میں ہر وقت آنا جانا رہتا تھا۔ شکیلہ کا بہت ہی احترام کرتا تھا۔ دوسروں سے تو اس کی گالی گلوچ اور فحش قسم کے مذاق تک ہوتے تھے۔ لیکن شکیلہ کے سامنے وہ کبھی کوئی ایسی ویسی بات بھی منہ سے نہ نکالتا تھا۔ شکیلہ بھی دن میں دو تین چکر اس کے اسٹوڈیو کے لگا ہی لیتی تھی۔ آج تیسرا روز تھا۔ کہ اس نے شکیلہ کی شکل تک نہ دیکھی تھی۔

دوپہر ڈھلنے لگی تھی۔ اور اسے کسی گاہک کے بھی آنے کے امکانات نظر نہ آتے تھے۔ وہ اس بات پر یقین رکھتا تھا۔ کہ گاہک اور موت کا کوئی بھروسہ نہیں۔ پھر بھی نہ جانے کیوں آج اس کا دل اچاٹ سا ہو رہا تھا۔

"کاروبار کی یہی حالت رہی تو پھر کیا ہوگا"۔ وہ سوچنے لگا۔ کیا وہ اس طرح اپنی بیوی، بوڑھے والدین اور اس اسٹوڈیو کا خرچ چلا سکے گا۔

آج تیسرا دن تھا۔ گزشتہ دو دنوں میں اس نے صرف ڈھائی روپے کمائے تھے۔ اور آج کا دن تو اس کے لیے اور بھی منحوس دن ثابت ہو رہا تھا۔ صبح سے کوئی گاہک بھی تو اس کے اسٹوڈیو میں داخل نہیں ہوا تھا۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ کوئی شخص اگر فوٹو نہ کھنچوائے تو کم از کم ریٹ وغیرہ ہی معلوم کر کے چلا جائے۔ لیکن اس کی یہ خواہش بھی پوری نہ ہو سکی۔

آج سے تین روز پہلے تو اسٹوڈیو میں بھیڑ لگی رہتی تھی۔ صبح سے شام تک لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ اور وہ تمام دن اپنے کام میں جتا رہتا تھا۔ آنے والوں کی تصویریں کھینچتا رہتا تھا۔ یا اندر ڈارک روم فلموں کی ڈیولپنگ، انلارجنگ یا فوٹو پرنٹنگ میں مصروف رہتا تھا۔ گلی کے نکڑ پہ ایک اسٹوڈیو اور بھی تھا۔ اس کی آمدنی بھی معقول تھی۔ لیکن اس کے مقابلے میں بہت کم ہوتی تھی۔ اس کی عمر تو ابھی شاگردوں جیسی ہی تھی۔ پھر بھی اپنے کام میں استاد مانا جاتا تھا۔ اور آج وہی استاد صبح سے ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا تھا۔

دوپہر ڈھل چکی تھی اور شام اپنے اندر سہانا پن لیے آموجود ہوئی تھی۔ وہ اسٹوڈیو سے باہر آ گیا۔ گلی میں دور دور تک سناٹا تھا۔ لوگ بھی اب اس راستے سے گزرتا بھول گئے تھے۔ حالانکہ گلی جو شام ہی سے لوگوں کے اژدہام، شور و غل، گھنگروؤں کی جھنکار اور طبلے کی تھاپ سے گونج رہتی تھی۔ اس وقت خاموش اور ویران پڑی تھی۔ اس نے کوٹھوں کی جانب دیکھا۔ خاموش اور افسردہ کوٹھے۔ اسے یوں نظر آئے جیسے کسی کی میت رکھی ہو۔ پھر اس نے نیچے مکانوں کے دروازوں پر نظر ڈالی۔ کوئی بھی نہ تھا۔ کتنی ہی دیر وہ بڑے دکھ سے مکانوں کو گھورتا رہا۔ جیسے ان سے کسی سوال کا جواب چاہتا ہو۔ جب یہاں والے ہی چلے گئے۔ تو اس کی روزی کا کیا ہوگا۔ کیا اسے بھی یہ گلی چھوڑ دینا پڑے گی۔

گلی چھوڑ دینے کے تصور ہی سے اس نے ایک عجیب سا کرب اپنے دل میں محسوس کیا۔ اسے تو اس گلی میں اسٹوڈیو بنائے کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ اور یہاں اُسے اپنائیت محسوس ہوتی تھی۔ صبح سے رات گئے تک اپنا وقت اس گلی میں اپنے اسٹوڈیو میں گزارتا تھا۔ اپنی شادی سے پہلے تو تہوار ہو چاہے پھر عید ہو یا بقر عید۔ وہ چھٹی نہیں کرتا تھا۔ چونکہ یہی دن تو خاص طور سے اس کے کاروبار کے لیے موزوں ہوتے تھے۔ اور پھر وہ چھٹی کر کے کرتا بھی کیا۔

ان لڑکوں میں سے نہ تھا جو خواہ مخواہ اپنا وقت ادھر ادھر ضائع کرتے پھرتے ہیں۔ البتہ شادی کے بعد اس نے ہفتہ میں ایک دن چھٹی کرنا شروع کر دی تھی۔

"ایسی اجاڑ اور ویران جگہ، اب گاہک کیا خاک آئیں گے" اُس نے سوچا۔ اور پھر اسٹوڈیو سے باہر نکلے ہوئے فریم اور شوکیس آہستہ آہستہ اٹھا کر اندر رکھنے لگا۔ پھر اسٹوڈیو کا دروازہ بند کر کے یوں تالا لگانے لگا جیسے وہ ہمیشہ کے لیے اس دوکان میں تالا لگا رہا ہو۔

تیسرے ہی دن اُس نے اپنے آپ کو سڑک گلی میں عجیب سا محسوس کیا۔ گلی سے اپنائیت کا وہ جذبہ خود بخود ختم سا ہو گیا۔ اس نے سوچا گلی کو اجڑے اور ویران ہوئے آج صرف تیسرا ہی دن تو ہوا ہے۔ آج یہ حالت ہے تو پھر کل کیا ہوگی۔ اور پھر پرسوں اور پھر اس کے بعد —

اس کے قدم خود بخود گھر کی جانب اٹھ گئے۔ اتنی جلدی گھر آنے پر اس کی نوعمر اور حسین بیوی حیران رہ گئی ——————

"خیریت۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اس کی بیوی نے پوچھا۔

وہ خاموش رہا تب اس کی بیوی اس کے قریب آئی اور بڑے پیار سے اور مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنا سوال دہرایا نئی بیوی تھی۔ وہ ابھی سے کاروبار کے متعلق اسے کچھ بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا اس نے صاف بہانہ بنایا۔

"کچھ نہیں۔ آؤ کہیں گھومنے چلتے ہیں۔ میری طبیعت صبح سے کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

اور تھوڑی دیر بعد وہ اپنی نوجوان اور خوبصورت و حسین بیوی کے ہمراہ شہر کے بہترین پکچر ہاؤس میں بیٹھا تھا۔ اس کی بیوی اس کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ اس کے برقعہ کا نقاب الٹا ہوا تھا۔ لوگ تھے۔ کہ خواہ مخواہ اپنی سیٹوں سے اٹھ اٹھ کر ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔

اس حسین اور پرکیف ماحول میں اُس نے تھوڑی دیر کے لیے خود کو بھلا دیا تھا بیوی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بیٹھا رہا۔ فلم شروع ہوئی۔ انٹرول ہوا اور پکچر ختم ہو گئی۔ اور وہ دونوں باہر آ گئے۔ باہر بھی کتنے ہی دل جلے تھوڑی دور تک ان دونوں کا ساتھ دیتے رہے۔

شام اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ شہر پر اتری ہوئی تھی۔ سڑکوں پر متوسط اور ذی حیثیت طبقے کے لوگ تفریح کرنے نکل پڑے تھے۔ کاریں اور ٹیکسیاں آتی تھیں اور گذر جاتی تھیں۔ وہ کتنی ہی دیر اُن کاروں اور ٹیکسیوں کے درمیان سڑک پر گھومتے رہے اور جب رات اپنے مہیب پر پھیلائے بڑھ آئی تو وہ واپس آ گئے۔

دوسرے دن صبح اسٹوڈیو جانے سے پہلے اچانک اسے یہی خیال آیا کہ کیا آج بھی پچھلے تین چار دن کا سا حال تو نہ ہوگا۔ گذشتہ دو روز میں تو اُس نے ڈھائی روپے کی مزدوری بھی کر لی تھی۔ لیکن کل — اور گذشتہ کل کے اذیت ناک تصور کے ساتھ اسے آج کا خدشہ بھی اسی طرح واضح ہو گیا تھا۔

اسٹوڈیو تو بہر حال اسے کھولنا ہی تھا۔ اسٹوڈیو پہنچ کر وہ تالا ہی کھول رہا تھا۔ کہ ایک خوبصورت اور نئے ماڈل کی گاڑی آ کر اسٹوڈیو کے سامنے رک گئی۔ یہ گاڑی اس کی جانی پہچانی تھی۔ گاڑی سے ایک صحت مند جسم کا انسان اترا

یہ گلی جب اس طرح ویران نہ تھی۔ یہ گاڑی روزانہ ہی اس گلی میں آتی اور گھنٹوں کھڑی رہا کرتی تھی۔ اس کا مالک کبھی کبھی گلی کی ناچنے اور گانے والیوں کی تصویریں کھنچوانے اس کے اسٹوڈیو میں بھی آ جایا کرتا تھا۔ وہ ان کے آپس کے مذاق سے بہت محظوظ ہوتا تھا۔ جو گلی کی ناچنے گانے والیاں اور اس کے درمیان ہوتا تھا۔ اور وہ بڑی خوش دلی سے خود بھی اس مذاق میں حصہ لے لیا کرتا تھا۔

اور صبح ہی صبح اسٹوڈیو کھلنے سے پہلے اسے دیکھ کر اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ "اللہ میاں آج صبح یونہی ایک موٹی آسامی سے ٹکرا رہا ہے" اس نے دل میں کہا۔ "اسے مزید کسی کی تصویریں لینا ہوں گی یا پرنٹ انلارج کرائے گا۔ اسکے پیسے تو تقریباً دے ہی دے گا۔ کہ پچھلے چار دنوں کا اوسط نکل آئے۔"

وہ اسٹوڈیو کا دروازہ کھول چکا تھا۔

"السلام علیکم" اس نے کہا۔ اور اندر آ گیا۔

"السلام علیکم": اس نے بھی گھبراہٹ میں سلام دہرا دیا۔
"آئیے سیٹھ صاحب تشریف لائیے۔ بڑے عرصے بعد آئے آپ": اس نے اپنے طور پر کمن لگانا چاہا۔
"ہاں کچھ ذرا مصروف تھا۔" سیٹھ صاحب مسکراتے ہوئے بولے
"اور آج ذرا فرصت ملی تو سوچا، لاؤ تمہارے پاس ہی چلا جائے"
"فرمائیے، فرمائیے کیا خدمت کرسکتا ہوں": ایک ماہر سیلزمین کے انداز میں اس نے پوچھا۔
"خدمت؟"
سیٹھ صاحب خدمت پر زور دیتے ہوئے اس کے بہت قریب ہو گئے اور جیب سے ایک ویزیٹنگ کارڈ اور ایک سو روپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔" وہ کل شام پکچر ہاؤس میں جو تمہارے ساتھ معشوق تھا نا۔ اسے آج رات اس پتہ پر پہنچا دینا۔ بس یہی ایک خدمت ہے"

نگارش۔ کراچی

یونس رمزی

ممتاز بانو ایم اے

ممتاز بانو سے میری ملاقات ایک انٹرویو کے دوران ہوئی تھی۔ بغیر استری کا بلاؤز، میلی سلکن ساڑی، پیروں میں اسپنج کا معمولی چپل اور چپلوں میں جھانکتا ہوا سانولا گرد آلود پاؤں۔ میری نظر سب سے پہلے اس کے پاؤں پر پڑی تھی۔ اور پھر چہرہ پہ۔ چہرہ کی بھی وہی کچھ کیفیت تھی۔ بغیر سنورے ہوئے بال، دو چار بے ترتیب لٹیں، چہرہ پہ پاؤڈر کی دھول، تنگ پیشانی، چوڑا دہانہ، سانولے رخسار۔ بس آنکھیں چمکدار تھیں۔ میں حیرت میں تھا کہ یہ لڑکی انٹرویو دینے آئی ہے یا سالن پکانے۔ وہ میرے بغل ہی والی نشست پہ بیٹھی تھی۔ چنانچہ میں نے دھیرے سے پوچھا۔ "آپ کی تعلیم کیا ہے؟"

"جی۔۔۔ جی میں۔ ایم اے پاس ہوں، سوشالوجی میں۔"

"اچھا! میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"آپ کا شاید پہلا نمبر ہے؟" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"جی!"

"تو پھر ذرا بتاتے جائیے گا۔ کہ یہ لوگ کیا سوال کرتے ہیں۔"

انٹرویو کے بعد میں نے بڑی ہمدردی سے اسے پوری روئداد سنادی۔ وہ "ہوں ہاں" کرتی رہی، تیسرا نمبر اسی کا تھا۔ چنانچہ میں کچھ دیر ٹھہرا رہا۔ وہ جلد ہی انٹرویو سے فارغ ہو چکی تھی۔ پھر ہم نے اکٹھے ہی سیڑھیاں طے کیں۔ اس کی سانس چڑھی ہوئی تھی۔ چھوٹتے ہی بولی: بڑے مہمل سوالات کرتے ہیں یہ لوگ۔ تعلیم کوئی نہیں دیکھتا۔ کہتے ہیں میری پرسنالٹی بالکل زیرو ہے۔ اب کیا میں اللہ میاں سے لڑوں اس کے لئے یا پھر علاج کراتی پھروں۔ کسی کارخانہ میں اگر شکل بنتی ہو تو میں ضرور ایک اچھی سی شکل بنوا لیتی۔ چارمنگ ایورنگ!"

ممتاز بانو کی یہی باتیں مجھے بڑی دلچسپ معلوم ہوئیں۔ اتنی فرینک لڑکی میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ چنانچہ اس کے کردار میں متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا۔ ہم دیر تک سڑک پیمائی کرتے رہے۔ پھر اس نے اپنا ننھا سا پرس بلاؤز سے نکال کر اس کے اندر جھانکا۔ اور کہنے لگی میرے پاس بس کے کرایے کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ ورنہ آپ کو چار ضرور پلاتی۔ میں اس جملے پر بڑا خفیف ہوا۔ اور اسے ایک ریستوران میں لے آیا۔ چائے پینے کے بعد اس نے کچھ تازگی محسوس کی۔ پھر اس نے چپلوں کو پٹخ پٹخ کر جھاڑا۔ کیا کروں ایسے گرد آلود علاقے میں رہتی ہوں کہ دھول اور گرد

تو جسم کا ہی نہیں کھانے کا بھی ایک حصہ بن گیا ہے۔ یہ ایک ریفیوجی کالونی میں رہتی ہوں۔ ایک کمرے کا کوارٹر میرے بھائی کے نام الاٹ ہے۔ دوسرا کمرہ قنات کا ہے۔ تیسرا برآمدہ بھی کمرہ ہے۔ اور ہم سولہ افراد اس چھوٹے سے مکان میں رہتے ہیں۔ ابا جان مرحوم کو شادی کرنے کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ زندگی میں چار شادیاں کیں۔ اور سولہ اولادیں چھوڑ کر مر گئے۔ بڑا حسین اضافہ ہے صاحب سب کے سب ٹیڑھے بانکے ہیں۔ میں سب سے بڑی بہن ہوں۔ شکل تو آپ نے ملاحظہ فرمائی۔ ایسی ہی آٹھ بہنیں اور ہیں اور بھائیوں کا کیا ہے۔ گھی کے لڈو بھی ٹیڑھے ہوئے تو ہرج نہیں۔ اور تو اور آپ سنیں گے تو حیرت کریں گے۔ کہ فی الحال دو مائیں ہمارے ساتھ ہیں۔ وہ ابا جان مرحوم کی عزت ہیں۔ انہیں ہم گھر سے نکال بھی نہیں سکتے۔ ابا جان تو اللہ کے پیارے ہو گئے۔ لیکن ان کے درمیان سوتیا ڈاہ اب بھی نہیں گیا۔ روزانہ تن تن کرتی ہیں۔ اور گالیوں کی بوچھاڑ اردگرد بھی جا پڑتی ہے۔ کہ ایسے ہی ماحول کے سایہ میں ہماری زندگی بھی گذری ہے۔ سب سے بڑے بھائی میٹرک پاس ہیں۔ اور ایک دفتر میں کلرک ہیں۔ دوسرے نے عاجز آ کر پڑھائی چھوڑ دی۔ اور اب ایک کارخانہ میں ملازم ہیں۔ تیسرے صاحب صرف آوارہ لونڈوں کی لیڈری کرتے ہیں۔ چوتھے صاحب چوتھے درجے میں پڑھتے ہیں۔ پانچویں اور چھٹے صاحب کی ابھی ناک بہتی ہے اور دو ہنوز شیر خوار ہیں۔ اب رہیں بہنیں تو سب ماشاءاللہ ہیں۔ کسی کی شادی ہی نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ کچھ تو صورت شکل ہے اور کچھ ہمارا ماحول اور سوشل اسٹیٹس۔"

"پھر آپ نے کیسے تعلیم حاصل کر لی؟"

"ہاں یہ تو میں بتانا ہی بھول گئی۔"

"ایک تو میں پیدائشی ضدی تھی۔ اور دوسرے اتفاق سے ذہین، پہلے سے لے کر آخری درجے تک اسکالرشپ لیتی رہی۔ اور اس رقم سے نہ صرف یہ کہ میں نے اپنے تعلیمی اخراجات پورے کئے۔ بلکہ اس کا ایک حصہ ابا جان بھی چھین لیتے۔ فی الحال بچوں کو پڑھاتی ہوں۔ روزانہ چار چھ میل دور چلنا پڑتا ہے اور جب تھک تھکا کر گھر پہونچتی ہوں۔ تو اپنی دونوں اماؤں کو یا پھر بہنوں کو لڑتے ہوئے پاتی ہوں۔ گواہی یا کبھی صلح صفائی کے لیے میری اپیشی ہوتی ہے۔ میرے مکان پر کوئی بورڈ نہیں ہے۔ اور نہ ہی مکان کی پیشانی پر فلاں منزل لکھا ہے لیکن صاحب اتنا مشہور ہے۔ کہ کچھ نہ پوچھئے۔ مشہور اس طرح ہے کہ آپ اس علاقے میں گزریں اور جہاں آپ کو روتے بسورتے دو چار ننگ دھڑنگ بچے نظر آئیں۔ یا عورتوں کے لڑنے اور چیخم دھاڑ کی آوازیں سنیں تو سمجھ لیجئے۔ کہ وہی ہمارا کوارٹر ہے۔ بڑے مشہور زمانہ ہیں ہم لوگ۔"

میں بڑی خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ مجھے قوی امید تھی۔ کہ یہ ملازمت جس کے لیے ہم دونوں نے انٹرویو دیا تھا۔ میرے ہی حصے میں آئے گی۔ اس لیے کہ وہاں پہلے سے میرے چچازاد بھائی ایک اچھی پوزیشن پر مامور تھے۔ اور ڈائریکٹر نے تقرری کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔ لیکن میں اب سوچ رہا تھا۔ کہ یہ ملازمت اس لڑکی کو مل جاتی تو زیادہ بہتر تھا۔ میں بڑی دیر تک اس سلسلے میں الجھا رہا کہ اپنی جگہ کسی طور سے اسے ملازمت دلوا دوں۔ مگر کسی خاص فیصلے پر نہ پہنچ سکا۔ اس کا پتہ نوٹ کر کے واپس گھر آ گیا۔

میں نے اپنے بھائی صاحب سے اس کا تذکرہ کیا۔ بڑی پرزور سفارش بھی کی۔ لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ اور جو نتیجہ نکلا تو بس اتنا کہ گھر کے تمام افراد زیرلب مسکرائے۔ اپنی بہنوں سے لے کر خالہ زاد، چچا زاد بہنوں کا ایک ہی عالم تھا۔ بس زیرلب مسکرا رہی تھیں۔ اور میں تھا کہ خجل ہوا جا رہا تھا۔

ہفتہ عشرہ بعد مجھے اس جگہ ملازمت مل گئی مگر میں اس سے خوش نہ تھا۔ ایک دن بھائی صاحب کہنے لگے۔ "جانتے ہو انٹرویو میں اس لڑکی کا نمبر بالکل آخری تھا۔ ڈائریکٹروں کو یہ لڑکی بالکل پسند نہ تھی۔"

مجھے یہ جان کر قدرے حیرت ہوئی۔ اور پھر اس کا یہ جملہ دیر تک یاد آتا رہا۔ کہ میری پرسنالٹی بالکل زیرو ہے۔ اب کیا اس کے لئے میں اللہ میاں سے لڑوں یا پھر کسی کارخانے میں خوبصورت شکل بنوا کر لگا لوں۔ کئی بار یہ خواہش ہوئی کہ اسے ایک خط ہی لکھ دوں لیکن ہر بار اس کوشش میں ناکام رہتا۔ مگر ایک دن بس اسٹینڈ پر وہ مجھے بالکل اتفاقیہ طور پر مل گئی۔ سنڈر پر چپل کو گھسیٹتی مجھے دیکھتے ہی قریب آ گئی۔

" ملازمت مبارک ہو۔ ماشاء اللہ آپ کی پرسنالٹی بھی تو کتنی اچھی ہے "

اس کے اس جملے پر تو مجھے ایسا لگا۔ جیسے کسی نے مجھے دہکتی آگ میں جھونک دیا ہو۔ میں چپ رہا۔ آخر اس کا جواب بھی کیا تھا میرے پاس۔

" پان کھائیے!" اس نے آنچل سے پان کی پڑیا نکالی اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی " ایک سہیلی نے زبردستی دے دئیے تھے۔"

" مگر میں!"

" اجی کھا بھی لیجئے۔ ایک آپ کھالیں اور ایک میں!"

" اچھا صاحب!" میں نے پان لے کر کھا لیا۔

" جاوید صاحب ایک بات کہوں؟" وہ پان چباتے ہوئے بولی۔

" جی کہئے!"

" مجھے دو چار ٹیوشن دلوا دیجئے۔ ہو سکتا ہے آپ کے خود بچے ہوں یا پھر بھائی بہن؟" اور میں ممتاز کی اس بے تکلفی پر بالکل ہی سناٹے میں آ گیا۔

" دیکھئے میری شادی تو ابھی ہوئی نہیں پھر بچے، آپ خود سوچ سکتی ہیں"

" تو پھر آپ شادی کر لیجئے!"

" کوئی لڑکی پسند آ جائے تو بیشک کر لوں گا!"

" مجھ سے کر لیجئے شادی، سچ کہتی ہوں زندگی بھر تابعداری کروں گی لونڈی کی طرح"

میں اس جسارت پر سرخ پڑ گیا۔ یا خدا یہ لڑکی ہے یا بلا اتنی منہ پھٹ اور اس کا کردار، تو بس ننگی تلوار تھا۔

" ہاں تو بولئے ــــ میں پسند نہیں ہوں آپ کو ــــ میری شکل و شباہت پر نہ جائیے بھلے آپ!"

" یہ صحیح ہے ممتاز مگر آخر گھر والوں کی مرضی کا بھی تو خیال لازمی ہے"

" اجی انھیں میں منا لوں گی۔"

" تم منا لو گی!!"

" ہاں اور کیا ــــ! مجھے آپ کسی دن اپنے گھر لے چلیں۔ ایمان سے کہتی ہوں۔ دو دن میں سب کو اپنا گرویدہ نہ بنا لوں تو نام بدل دیجئے گا۔"

" ہو سکتا ہے!"

" تو پھر آج چلیں!"

" نہیں بھئی اتنی بھی جلدی کیا ہے!"

میرا اس لڑکی سے پیچھا چھڑوانا مشکل ہوگیا تھا۔ میں پھر اسے ایک ریستوران میں لے آیا۔ اور وہاں زیادہ تر اس کے دکھڑے سنتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر کسی خیال سے چونکی۔

"دیکھیے اگر آپ مجھ سے شادی کر لیتے ہیں۔ تو پھر ہم پہ بڑا احسان ہوگا۔ آپ کے حوالہ اور تعلق سے ہماری چار بہنیں نبھ جائیں گی میری شکل آپ کو پسند نہ ہو یہ الگ بات ہے۔ اس صورت میں آپ چاہیں تو ہماری شبانہ سے شادی کر لیں۔ شبانہ اچھی شکل و صورت کی لڑکی ہے خدا کی قسم میں بک جاؤں گی۔ مگر اسے جہیز بھی پورا دوں گی۔

"دیکھیے اس ذکر کو چھوڑیئے۔" میں نے اسے ٹالتے ہوئے کہا۔

"خیر، میں نے تو آپ کو اپنا ہمدرد سمجھتے ہوئے یہ باتیں بتائی ہیں۔ یہ بتلائیے آپ مجھے اپنے گھر کبھی لے چلیں گے؟"

"پہلے میں تمہارے لئے ٹیوشن ٹھیک کر دوں، پھر خود ہی آنا جانا ہو جائے گا۔"

"اوہ، ونڈرفل!" آپ واقعی کتنے اچھے ہیں۔" وہ بچوں کی طرح چہک کر بولی۔

اس بار اس نے زبردستی ریستوران کا بل ادا کیا۔ اور اس وعدے کے بعد چلی گئی۔ کہ میں اسے ٹیوشن کے متعلق خط سے آگاہ کر دوں گا لیکن جب میں اسے بس ٹرمینس پر چھوڑ کر آگے بڑھا تو ایسا معلوم ہوا کہ خلا میں چل رہا ہوں۔ میرے ارد گرد کچھ بھی نہیں ہے۔ چاروں طرف ایک سناٹا ہے اور میں خود سناٹے اور خلا کا ایک حصہ ہوں۔ پھر ایک ٹیکسی میں چڑھنے کے بعد کوٹ کا کالر جھٹکتے ہوئے میں نے سوچا یہ کیا لغو باتیں ہیں۔ میں بھلا اس لڑکی سے کیسے شادی کر سکتا ہوں۔ میرا اپنا ایک مستقبل ہے۔ کیریر ہے، میرے خاندان کی اعلیٰ روایات ہیں۔ میری آدھ درجن کزن میرے ایک اشارے کی منتظر ہیں۔ میری یہ کزنز پڑھی لکھی اور خوبصورت ہیں۔ میری فیملی میں اعلیٰ عہدہ دار ہیں۔ ہمارا ایک الگ معاشرہ ہے۔ ہاؤسنگ سوسائٹی میں ایک لاکھ کی کوٹھی ہے اور وہ لڑکی ہمارے سرونٹ کوارٹر جیسے مکان میں بھی نہیں رہتی۔ ہماری زندگیاں بالکل الگ ہیں۔ بڑا تضاد ہے اور ممتاز ــــ ممتاز ضرور پاگل ہے۔ اسے یہ سب کچھ سوچنا بھی نہیں چاہئے تھا چنانچہ میں نے اس لڑکی کو کبھی خط نہیں لکھا۔ اور نہ ہی اسے ٹیوشن دلوائی۔ حالانکہ یہ کام میں بہ آسانی کر سکتا تھا۔ میں اس کی مالی امداد کرنے کو بھی تیار تھا۔ لیکن اس دن ٹرمینس پر وہ اپنے حدود سے اتنی آگے بڑھ آئی تھی۔ کہ میرے لئے مستقل خطرہ بن گئی۔

پھر تقریباً دو سال بیت گئے۔ میں نے اس عرصے میں اپنی فرسٹ کزن سے شادی کر لی۔ جو بے حد حسین اور خوبصورت تھی۔ اور ظاہر ہے کہ تمام خاندان والوں کے لئے قابل قبول تھی۔ ممتاز جہاں سے اس عرصے میں کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ اور ہوئی تو تب ہوئی جب میں اپنی بیوی کے فرسٹ ڈلیوری کے موقعہ پر ہسپتال گیا تھا۔ جہاں کے اسپیشل وارڈ میں چند روز پیشتر ہی داخل ہوگئی تھی۔ ممتاز جہاں مجھے ہسپتال کے دروازے پر ٹکرا گئی۔ اس کی گود میں نہایت نحیف و نزار کالا کلوٹا سا ایک بچہ تھا۔ اس کی صحت اپنے آخری حد کو پہنچ چکی تھی۔ آنکھیں دھنسی دھنسی، چہرہ ویران، ڈھیلے ڈھیلے ہاتھ پاؤں۔ مجھے دیکھتے ہی روک لیا۔ "یہ میرا بچہ ہے آصف۔"

"اچھا!" میں نے حیرت کے لہجے میں کہا۔

"ہاں پچھلے سال کی یادگار۔"

"یادگار! کیا معنی ــــ؟"

"بڑی عجیب کہانی ہے۔ میں نے ایک کھاتے پیتے لڑکے سے اپنی چھوٹی بہن کی شادی کر دی تھی۔ مگر وہ اس سے خوش نہ تھا۔ روزانہ مار دھاڑ کرتا۔ اور گھر سے نکال دینے کی دھمکی دیتا۔ میں اس کے ہاتھ جوڑتی، پاؤں پڑتی۔ محنت مشقت سے جوڑے ہوئے پیسے اس کے قدموں میں ڈال دیتی۔ مگر ہفتہ دس دن بعد وہ پھر اپنی حرکتوں پر اتر آتا۔ شبانہ کی زندگی بنانے کے لئے میں نے تن من دھن کی بازی

کا دیا۔ یہاں تک کہ یہ بچی بھی اسی کی یادگار ہے۔ ایک رات جب کہ میں اس کے یہاں ٹھہری ہوئی تھی۔ اس نے میری عزت پر بھی ہاتھ ڈال دیا۔ میں نے شور مچانا چاہا تو اس نے میری بہن کو طلاق کی دھمکی دی۔ اور چنانچہ میں چپ ہو گئی۔"

لیکن جاوید صاحب مجھے افسوس صرف اتنا ہے کہ جس کے لئے میں نے اپنا سب کچھ لٹا دیا۔ وہ اس دنیا میں نہیں رہی۔"

"یعنی کہ ..."

"جی ہاں شبانہ نے جب سنا کہ میں حاملہ ہوں تو اس نے شرم سے خودکشی کر لی۔"

"کتنی اندوہناک کہانی ہے ــــ بس ممتاز بس" میری آنکھوں میں بے ساختہ آنسو آ گئے۔ "آؤ، تمہیں اپنی بیگم سے ملوا دوں۔"

"اچھا تو آپ نے شادی کر لی۔ بہت اچھا کیا۔ میں واقعی آپ کے لائق نہ تھی۔"

وہ بڑے سپاٹ لہجے میں کہتی گئی۔ یہاں تک کہ ہم اسپیشل وارڈ میں پہنچ گئے۔ اس نے رابعہ کو دیکھا تو پھول کی طرح کھل اٹھی۔

"اوہ! کتنی حسین ہیں آپ کی بیگم ــــ سچ اور یہ بچہ ــــ میں گود میں لے لوں؟" اس نے اپنے میلے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں" اور وہ اپنے بچے کو ایک طرف ڈال کر اسے گود میں لے کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

"آج کل کام کیا کرتی ہیں آپ؟" میں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔

"ایک اسکول میں ڈھائی سو روپے ماہوار پہ ملازم ہو گئی تھی۔ مگر آصف کی پیدائش کے بعد"

"اوہ! ہاں ــــ اچھا ــــ اچھا"

میں نے ممتاز ایم اے کا تعارف جب رابعہ سے کرایا۔ تو وہ آئینۂ حیرت بن کر رہ گئی۔

"یہ وہی ممتاز بیگم ہیں جو کبھی ملازمت کے سلسلے میں میرے ساتھ انٹرویو میں شامل ہوئی تھیں؟ اور تم لوگ اس واقعہ پر زیر لب مسکرایا کرتی تھیں آپ جھوٹ بولتے ہیں میں نہیں مسکراتی تھی۔"

"جی سب سے زیادہ آپ ہی مسکراتی تھیں ان کے نام پہ"

"اچھا؟" ممتاز نے حیرت سے پوچھا۔ پھر اس کے لبوں پہ زہر خند ہنسی آ گئی۔ "اور سنا آپ نے کبھی میں نے جاوید صاحب کو پروپوز کیا تھا کہ وہ مجھ سے شادی کر لیں ــــ ہاہا ہاہا ....." وہ پاگلوں کی طرح ہنسنے لگی۔ اس کے ہاتھوں میں رعشہ تھا۔ رابعہ نے گھبرا کر اپنے بچے کو گود میں سمیٹ لیا

"معاف کیجئے گا غلطی ہو گئی۔"

"نہیں بہن کوئی بات نہیں۔" رابعہ نے روتے ہوئے بچے کو تھپکتے ہوئے کہا۔

"جاوید صاحب بہت اچھے انسان ہیں" ممتاز نے رابعہ سے مخاطب ہو کر بڑے مدھم لہجے میں کہا۔ "آج کل میں پھر بیکار ہوں جاوید صاحب کو کتنا عرصہ ہوا ٹیوشن کیلئے کہا تھا۔ اگر آپ سے ہو سکے تو آپ ہی کچھ کریں بڑی مہربانی ہوگی۔"

"ضرور ضرور ــــ میں بے شک آپ کے لئے کچھ کر دوں گا۔" اور میری بیوی نے اپنا وینٹی بیگ کھولا۔ اور میرے پتے کا کارڈ اس کے حوالے کرتے ہوئے بولی۔ "انہوں نے تو واقعی آپ کے لئے کچھ نہیں کیا۔ لیکن میں آپ کے لئے سب کچھ کروں گی۔"

اور اس وعدہ کے بعد میں نے دیکھا۔ ممتاز بیگم کی آنکھوں میں ایسی چمک آ گئی تھی۔ جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی ــــ پھر ممتاز بیگم دھیرے سے اٹھی۔ اور کاریڈور سے اپنا سینڈل چٹخنی گذرنے لگی۔ مگر مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ کہ اس کے سینڈل کی ہر ضرب میرے منہ پر لگ رہی تھی ــــ اور میری بیوی رابعہ ہر بار مسکرا رہی تھی ــــ زیر لب نہیں کھل کر ــــ

مسعود مفتی

نام

ایم اے کے امتحان میں چند روز باقی تھے۔ میں یونیورسٹی لائبریری میں کتابیں ڈھونڈ رہا تھا کہ میری نظر اس پر پڑی۔ وہ میز پر بیٹھی کسی کتاب میں سے کچھ نقل کر رہی تھی۔ جب میں نے دیکھا تو اس نے بھی سر اٹھا کر مجھے یوں ہی دیکھا کہ کسی دھندلی روشنی میں وہ بڑی دلکش نظر آئی۔ پھر جب کتاب درج کرانے کے لئے میں کاؤنٹر پر ہاتھ میں پکڑا تھا تو اس کی پشت میری طرف تھی۔ لمبی گردن میں ہلکا سا خم تھا۔ اور بار یک چنا ہوا سفید دوپٹہ مور کے پروں کی طرح گردن اور سر کی پشت پر پھیلا تھا۔ یہ انداز اتنا اچھا لگا کہ کتاب لینے کے بعد بھی میں نے دو تین بار دروازے میں سے جھانک کر اسے دیکھا۔

ہمارا امتحان شروع ہو گیا۔ میں روزانہ پرچہ دینے یونیورسٹی ہال میں جاتا۔ ایک دن پرچہ ختم کر کے باہر نکلا تو برآمدے میں چند ہم جماعتوں سے سوالات پر بات کر رہا تھا کہ وہ اینتہ کے ساتھ ادھر آتی نظر آئی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اور وہ دھوپ میں آ رہی تھی۔

"ارے اس کی شکل تو کوئی خاص نہیں" میں نے دل میں سوچا۔ اس روز تو بڑی اچھی لگ رہی تھی۔"

اینتہ نے جیسے ہی مجھے دیکھا۔ وہ بھاگی آئی "آپ کے لئے ایک پیغام ہے۔ ہمارے پروفیسر صاحب کہہ رہے تھے کہ آپ ان سے آج ضرور مل لیں۔"

استے میں چند قدم آگے جا کر وہ کھڑی ہو چکی تھی۔ میں نے اینتہ کا شکریہ ادا کرتے کرتے اس کی طرف ایک چھلتی ہوئی نگاہ ڈالی تو اس نے فوراً پلکیں جھکا لیں۔ اتنے میں اینتہ اس تک پہنچ گئی اور وہ دونوں چل دیں۔ آج وہ اتنی اچھی نہ لگی تھی۔ اس لئے میں نے کبھی دوسری دفعہ نہ دیکھا۔ مجھے بالکل علم نہ تھا کہ یہ لڑکی کون ہے۔ کس مضمون میں ایم اے کر رہی ہے۔ آیا پہلے سال میں ہے یا دوسرے میں، یا اس کا نام کیا ہے۔ نہ ہی میں اتنا دلدادہ ہوا تھا کہ یہ سب کچھ پتہ کرتا پھرتا۔ میرا امتحان ختم ہو گیا تھا۔ اور میں کبھی کبھی پبلک لائبریری کتاب لینے یا رسالہ وغیرہ دیکھنے چلا جایا کرتا تھا۔ یا شام کو تھوڑی سی سیر کر لیتا تھا۔

کوئی مہینہ بعد میں صبح کے وقت پبلک لائبریری کے ریکارڈ روم میں جانے لگا۔ تو سیڑھیوں کے پاس آ کر اس نے اپنی سائیکل روکی۔ اور تالا لگانے لگی۔ میں کچھ خیال کئے بغیر اندر چلا گیا اور ٹائمز کے پڑھنے پرچے اٹھا کر میز پر بیٹھ گیا۔

اتنے میں وہ بھی آ گئی اور کاؤنٹر پر کلرک سے باتیں کرنے لگی۔ آپ نے تو پبلک لائبریری کا ریکارڈ روم دیکھا ہو گا۔ اس کے صرف ایک طرف دروازہ ہے۔ درمیان میں ایک بڑی سی گول میز ہے جس کے گرد خالی کرسیاں پڑی ہیں اور دوسری طرف ایک کارنیڈور سا ہے۔ جس کے منہ پر جالا ہے۔ ادھر سے

آتی رہتی ہے۔ مجموعی طور پر کمرہ کافی تاریک ہے۔ جس میں دن کی روشنی یا تو دروازے سے آتی ہے یا جالی سے اور باقی تاریکی دور کرنے کو بلب جلتے رہتے ہیں۔

وہ دروازے کے قریب ہی آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھی۔ میں اندھیرے میں تھا اور دروازے میں سے داخل ہونے والی تیز روشنی کے چوکور فریم میں اس کا تاریک خاکہ نظر آتا تھا۔ نقوش کی تفصیل تو نظر نہ آتی تھی۔ مگر آؤٹ لائن بڑی دلفریب تھی ننھی سی ناک اور ٹھوڑی کی گولائی دوپٹے کی جالی میں سے نظر آتی تھی۔ نیچے سیدھی گردن دوپٹے کے روشن اور نارنجی کنارے کے گرداب میں گھری ہوئی۔ اس سے تلے کمر کا خم جس سے ذرا پرے کندھے سے اٹھ نے والا پلو آبشار کی طرح لٹک رہا تھا۔ میں بار بار دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔

اتنے میں وہ کلرک کے ساتھ اندر آگئی۔ کلرک کوئی کتاب ڈھونڈنے لگا اور وہ ساتھ ہی پھر رہی تھی۔ وہ سیڑھی لگا کر اوپر والے شیلف پر جاتا تو وہ ننھی سی ناک اور ٹھوڑی اپنی سیدھی گردن پر اٹھائے اوپر دیکھنے لگتی اور کمرے کی نیم تاریکی میں بڑی اچھی لگتی۔ تھوڑی دیر بعد اسے کتاب مل گئی اور وہ میرے سامنے میز پر بیٹھ کر پڑھنے لگی۔

ہم کوئی گھنٹہ بھر بیٹھ کر پڑھتے رہے۔ کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ مگر میں کبھی کبھی اسے چوری چوری دیکھ لیتا۔ جالی میں سے آنے والی مدھم روشنی میں اس کے چہرے کے بعض حصے روشن تھے اور بعض تاریک۔ مجھے پہلی دفعہ غور سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ اس کا رنگ کھلا ہوا تھا۔ چہرہ چاند کی طرح گول تھا چھوٹی سی چپٹی ناک تھی۔ آنکھیں لمبی اور بڑی تھیں جن پر پلکوں کا گھنا سایہ تھا۔ چہرے کی جلد زیادہ صاف نہ تھی۔ معلوم ہوتا تھا کسی زمانے میں اس کے بہت زیادہ مہاسے نکلے تھے گو اب نہ تھے۔ اس کے نقوش کو ہم فرداً فرداً خوبصورت نہیں کہہ سکتے تھے مگر لمبی گردن کے ہلکے خم، باریک ہونٹوں کی ہلکی سی مسکراہٹ اور رخساروں کے گالوں میں ننھے ننھے گڑھوں کی وجہ سے وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ ویسے بھی گول چہرہ میری کمزوری ہے۔

تھوڑی دیر بعد اسے بھی احساس ہو گیا کہ میں اس سے متاثر ہو رہا ہوں اور اس کی مسکراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ وہ ایک دفعہ اس نے میری طرف دیکھا بھی، تب ایک اور پیاری چیز کا پتہ چلا۔ گردن کے خم کی وجہ سے وہ آنکھوں کے کونوں کا استعمال زیادہ کرتی تھی اور اس کی پلکیں اٹھنے اور جھکنے میں کانپتی تھیں جیسے ابابیلوں کے پر ہوں۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر چل دی۔ میں بھی برائے نام ہی پڑھ رہا تھا۔ اس لئے اٹھ کر باہر نکلا۔ مگر وہ سائیکل پر جا رہی تھی اور میں پیدل ہونے کی وجہ سے پیچھے رہ گیا۔

چند دن تک وہ وقتاً فوقتاً یاد آتی رہی۔ دل کرتا کہ اسے دیکھوں مگر کہاں ؟ ؟؟ نہ مجھے اس کا گھر معلوم تھا نہ نام۔ نہ کلاس آہستہ آہستہ خود ہی خیال محو ہونے لگا۔

تین ماہ گزر گئے۔ چھٹیوں کے بعد یونیورسٹی کھل گئی۔ لاہور پھر سے جوبن پر آگیا۔ ہر طرف خوش باش جوان چہرے نظر آنے لگے۔ ایک دن میں یونیورسٹی میں سے گزر رہا تھا کہ وہ ایک ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہو رہی تھی۔

" شاید یہ یہاں پڑھتی ہے " میرے دل میں کرید ہوئی اور میں بھی اندر چلا گیا۔ اس ڈیپارٹمنٹ میں صبح کے وقت ایم اے کی کلاس ہوتی تھی اور شام کے وقت ایک ڈپلومہ کورس پڑھایا جاتا تھا۔ میں دو سال پیشتر ڈپلومہ کا امتحان پاس کر چکا تھا اور وہاں کے پروفیسر کلرک اور چپراسی میرے واقف تھے۔ میں بلا جھجک اندر جا سکتا تھا۔ وہاں کی لائبریری اور ریڈنگ روم کے استعمال کی بھی مجھے اجازت تھی۔ اندر جا کر میرا شبہ درست ثابت ہوا۔ اور وہ کلاس روم میں چلی گئی۔ میں دفتر میں کلرک کے ساتھ کچھ گپ لگانے کے بعد باہر نکل آیا۔

اکتوبر کے مہینہ میں میرا ایم اے کا نتیجہ نکل آیا۔ میں فیل ہو گیا تھا۔ ہمیشہ فرسٹ کلاس لینے کے بعد یہ زندگی کی پہلی ناکامی تھی۔ اور گو میں جانتا تھا کہ ایک حادثے کی وجہ سے یہ ہوا لیکن اپنے پر اعتماد اٹھ سا گیا۔ کالج میں داخلہ تو لیا۔ مگر کسی سے ملنے سے گھبراتا تھا۔ خصوصاً یونیورسٹی جانے سے بہت کتراتا تھا۔ حالانکہ میری اس لڑکی سے راہ رسم نہ تھی اور شاید اسے پتہ بھی نہ ہو کہ میں نے ایم اے کا امتحان دیا تھا۔ مگر نہ جانے

کیا بات تھی کہ مجھے ساری دنیا سے بھلی طرح پیاری معلوم نہ آتی تھی۔ جتنی اکیلی اس سے آتی تھی اور مجھے یوں لگتا کہ اس کے سامنے سے ہٹ گئی تو وہ میرے ماتھے سے پڑھ لے گی کہ میں فیل ہو گیا ہوں اس لئے تین چار ماہ تک میں یونیورسٹی نہ گیا۔ جنوری میں جاکر کچھ درست ہوا تو پھر میرا یہ معمول بن گیا کہ کالج سے فارغ ہو کر تیسرے چوتھے روز یونیورسٹی کا چکر ضرور لگاتا۔ کسی بہانے اس ڈیپارٹمنٹ میں چلا جاتا۔ وہ اکثر وہاں ہوتی، کبھی ریڈنگ روم میں کبھی لائبریری میں، کبھی کاریڈور میں سہیلیوں یا لڑکوں کے ساتھ۔ میں وہاں ایک بار گزرتا کہ اسے دیکھ سکوں۔ یا قریب کے نوٹس بورڈ سے جھوٹ موٹ نوٹس دیکھنے کھڑا ہو جاتا۔ لائبریری میں البتہ زیادہ دیکھنے کا موقع ملتا۔

اسے بھی میری دلچسپی کا اندازہ تھا۔ اور وہ لرزتی ہوئی پلکوں کو جھپکا کر آنکھوں کے کونوں سے مجھے دیکھا کرتی۔ اس کا ردعمل کافی حوصلہ افزا ہوتا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ چوکنی سی ہو جایا کرتی۔ ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پر پھیل جاتی اور آنکھوں کے کونوں کا استعمال زیادہ کرتی۔ شروع شروع میں ہمارے دیکھنے میں چوری کا انداز ہوتا تھا۔ مگر آہستہ آہستہ یہ چیز کم ہو گئی گو ٹکٹکی باندھ کر نہ میں نے اسے دیکھا تھا نہ اس نے مجھے ـــــ اتنا البتہ ضرور تھا کہ اگر کسی اور طرف منہ کئے میں بیٹھا یا کھڑا ہوتا، تو وہ مجھے دیکھتی رہتی اور ایسا ہی موقع پا کر میں بھی اسی طرح کرتا۔ کئی دفعہ اچانک مڑ کر دیکھنے میں ہم دونوں ایک دوسرے کا جرم پکڑ چکے تھے۔ لائبریری میں بیٹھے ہوئے تو وہ پڑھنے میں بار بار دوپٹہ کھول کر پھر سے درست کرتی۔ بلا مقصد کتابیں ایک طرف سے اٹھا کر دوسری طرف رکھ دیتی۔ اور کھلی انگڑائی توڑ دیتی۔ زور زور سے کتاب کے ورق الٹتی۔ آنکھوں کے کونوں سے ٹیڑھا ٹیڑھا تکا کرتی اور کئی ایسی چھوٹی چھوٹی حرکتیں کرتی جو خود نمائی کے لئے مخصوص ہیں۔ اور ہر لڑکی فطرتاً جن کو ادا کرتی ہے۔ اور ہر لڑکا بیان کئے بغیر پہچان جاتا ہے۔ اس انداز میں قریباً دو مہینے گذر گئے۔ مگر بد کا بات چیت نہ ہوئی۔ آپ جانتے ہیں لڑکے اور لڑکی کی فوری بات چیت تو افسانوں یا فلموں میں ہوتی ہے۔ اصل زندگی میں تو سو دشواریاں ہوتی ہیں۔

مارچ کی ایک خوشگوار دوپہر تھی۔ جب میں کالج سے فارغ ہوا۔ تو دل میں گدگدی سی ہوئی۔ اور میں اس ڈیپارٹمنٹ کے ریڈنگ روم میں چلا گیا۔ پیریڈ ختم ہو چکے تھے۔ طلباء جا چکے تھے۔ مگر وہ ہمیشہ کی طرح ریڈنگ روم میں بیٹھی تھی اور اکیلی تھی۔ یہ تو میں آپ کو بتانا بھول ہی گیا کہ وہ بہت محنتی تھی۔ کلاس میں بہت لائق تھی اور اس کے کپڑے پہننے کا ذوق بہت اچھا تھا۔ اس روز بھی وہ ریڈنگ روم میں بیٹھی اکیلی پڑھ رہی تھی اور پوری آستین والے کھلتے ہوئے پیلے سوئیٹر اور ہلکے نیلے دوپٹے میں بہت پیاری لگ رہی تھی۔ ہم دونوں کچھ دیر بیٹھے پڑھنے کا ڈرامہ سا کرتے رہے۔ مگر سچی بات تو یہ ہے کہ میں اس خاموش رشتے سے تنگ آ گیا تھا اور اس سے بات چیت کرنا چاہتا تھا۔ مگر کوئی طریقہ نہ سوجھتا تھا۔ اتنے میں وہاں کا چپراسی اندر آ گیا۔ میں نے اس سے پانی مانگا اور پھر اپنے زمانے کی باتیں چھیڑ دیں۔ وہ بھی باتونی تھا۔ بات پہ بات کرتے گیا اور میں دل میں خوش ہوتا رہا کہ اس طرح کم از کم میرا تو تعارف ہو رہا ہے پھر مجھے اچانک ایک چیز سوجھی۔ ریڈنگ روم میں ایک رجسٹر رکھا تھا جس پر ڈیپارٹمنٹ کے ہر طالب علم کو اپنا نام لکھنا ہوتا تھا تاکہ ان کی حاضری کی پڑتال ہو سکے۔ میں چونکہ ان دنوں وہاں کا طالب علم نہ تھا اس لئے کبھی نام نہیں درج کرتا تھا۔ مگر اس روز میں نے اپنی کتابیں اٹھائیں اور چپراسی سے مخاطب ہو کر کہا "لاؤ بھئی آج تمہارے رجسٹر میں ہم بھی حاضری لگا دیں۔" پھر میں نے بڑے صاف حروف میں اپنا نام لکھا اور آ گیا۔ اس روز کی تاریخ میں صرف میرا ہی نام درج تھا۔

دوسرے دن میں پھر وہاں گیا۔ جاتے ہی رجسٹر کھولا ـــــ میری توقع درست تھی۔ میرے نام کے بالکل نیچے اس نے بھی اپنا نام بڑے صاف حروف میں لکھ دیا تھا ـــــ (معاف کریں میں آپ کو اس کا نام نہیں بتاؤں گا۔ ایسا نہ ہو وہ یہ تحریر پڑھ لے اور برا مانے) ـــــ اس طریقے سے ہمارا آپس میں تعارف ہوا۔ میں سارا دن خوشی سے بے خود ہو کر گھومتا رہا اور پروگرام بناتا رہا کہ اب جا کر اس سے بات چیت شروع کرنا چاہئے۔ اس کے سارے رویے سے مجھے یقین تھا کہ وہ بھی مجھ سے اتنی ہی دلچسپی لے رہی ہے۔ جتنی میں اس میں لیتا ہوں اور بات چیت کر کے معاملہ آگے چلانا کافی آسان ہو گا۔

مگر جب خوشی دھیمی ہوئی اور رات کو پڑھنے بیٹھا تو سوچا کہ امتحان قریب آ رہے ہیں۔ لگے ہاتھوں پچھلے سال کے پرچے ہی دیکھ ڈالو۔ اب جناب پرچے جو دیکھے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ خیال ہوا کہ تیاری تو ہوئی نہیں۔ کچھ دنوں کا حساب لگایا کچھ کتابوں کا حساب لگایا۔ کچھ مجوزہ ملاقاتوں کا حساب لگایا تو کانوں پر ہاتھ رکھے۔ بھلا پہلے ہی پچھلے سال فیل ہوئے ہیں۔ اگر اب بھی اس لڑکی کے چکر میں پھنس گئے تو پھر فیل ہو گے۔ اور دو دفعہ فیل ہونے سے اعتماد اتنا چکنا چور ہو گا کہ پھر کچھ ہو ...

چنانچہ رات کو بجلی گل کر کے جب لیٹا تو عہد کیا کہ فی الحال بات نہ کی جائے اور پہلے کی طرح وقتاً فوقتاً نگاہیں ٹکراتی جائیں۔
دو تین مہینے اسی طرح گزارے۔ اس دوران میں کبھی دوسرے چوتھے روز ڈیپارٹمنٹ میں چلا جاتا تھا۔ اگر باہر فلیس کی لیڈی فریم والی سائیکل نظر آتی جس کے پچھلے مڈگارڈ پر مارکہ کے نشان میں شیر بیٹھا ہوتا تو میں اندر چلا جاتا اور تھوڑا وقت لائبریری میں گزار لیتا۔ اس کا خاموش ردعمل ہمیشہ حوصلہ افزا گرم جوشی کا تھا۔ مگر اس نے بات چیت کی کبھی کوشش نہ کی۔ میرا خیال تھا کہ یہ بھی امتحان کی وجہ سے محتاط ہے۔

امتحان کے پہلے پرچے کے روز میں بہت گھبرایا ہوا تھا۔ شیو بڑھی ہوئی، بال پریشان، رنگ فق، منہ پر ہوائیاں اڑی ہوئیں، یونیورسٹی ہال کے باہر لان میں کھڑا اپنی کاپی پر آخری نظر دیکھ رہا تھا۔ اچانک نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ وہ مجھ سے پندرہ بیس گز دور ایک پودے کے ساتھ کھڑی ہے اور بڑی واضح مسکراہٹ سے میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہے۔ میں ایک دم ٹھٹک گیا۔ اور غالباً پہلی دفعہ ہم کافی ثانیوں تک ایک دوسرے کو سیدھے دیکھتے رہے۔ اس کی آنکھوں میں ایسی نعاس اور شفقت تھی جیسے کہہ رہی ہو: "پگلے۔ کچھ حوصلہ کر۔"
میں نے ہڑبڑا کر کاپی بند کر دی اور شاید ایک چھوٹا سا قدم بھی اس کی طرف بڑھایا۔ مگر وہ ایک دم جلدی سے مڑ کر چل دی۔ اس کے بعد میں نے کاپی نہیں کھولی۔ لیکن اللہ قسم وہ پرچہ اتنا شاندار ہوا کہ شاید زندگی میں ایسا امتحان نہیں دیا۔ حالانکہ اس پرچے میں میری تیاری ناقص تھی۔

امتحان ختم ہونے کے اگلے دن میں ڈیپارٹمنٹ میں گیا۔ وہاں صرف پہلے سال کے طلباء تھے۔ مگر وہ نہ تھی۔ میں دفتر میں جا بیٹھا۔ وقت کاٹنے اور بیٹھے کے بہانے بار بار کلرک کو چائے پلائی۔ مگر وہ نہ آئی۔ کلرک اپنا کام کر رہا تھا۔ کبھی ایک چٹھی ٹائپ کرتا کبھی دوسری۔ میں بھی کسی پر سرسری نظر ڈال لیتا۔ ایک چٹھی جو اٹھائی تو دیکھا کہ وہ اس لڑکی کے بارے میں تھی۔ اس کے پروفیسر نے وائس چانسلر کو لکھا تھا کہ اس لڑکی نے فلاں موضوع پر بہت اچھا (THESIS) لکھا ہے اور بڑی محنت کی ہے۔ چند کتابوں کے نہ ملنے کی وجہ سے وہ وقت پر پورا نہیں کر سکی۔ اب کتابیں مل گئی ہیں۔ اس لئے پندرہ دن کی اور مہلت دی جائے۔ میں بڑا خوش ہوا کہ چلو اب وہ پندرہ دن تو ضرور آئے گی۔ کسی روز آ کر مل لیں گے اور پھر بات کرنے کو موضوع بھی مل گیا تھا۔ میں خوشی خوشی واپس آگیا۔

مگر وائے قسمت اگلے روز جو ملیریا ہوا تو مہینہ بھر چارپائی سے نہ اٹھ سکا۔ ہر وقت لیٹا ہوا قسمت کو گالیاں دیتا رہتا۔ خدا خدا کر کے چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو سیدھا ڈیپارٹمنٹ گیا۔ چپراسی کے لئے بیڑیوں کا بنڈل لے کر ہی گیا تھا۔ وہاں اسے چائے کے لئے پیسے بھی دیئے۔ مگر اس نے بری خبر یہ سنائی کہ وہ تو چھٹیوں میں باہر چلی گئی ہے۔ میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ کیونکہ چھٹیوں میں ہم دونوں کے ایم اے کے نتیجہ کا اعلان ہو جانا تھا اور بعد ازاں مجھے تو کہیں ملازمت پر جانا ہی تھا۔ وہ بھی شاید کہیں چلی جاتی۔ میں پریشان سا سوچتا رہ گیا۔ اب ایک ہی راستہ رہ گیا تھا۔ چپراسی کو رشوت دی کہ جب بھی اس کا کچھ پتہ چلے مجھے بتائے۔ پھر میں دل برداشتہ سا گھر آگیا۔ سچ کہتا ہوں جتنی بدمزہ وہ چھٹیاں گزریں، شاید ہی کوئی گزری ہوں۔

چھٹیوں میں ہی ایک روز اس کا نتیجہ اخبار میں دیکھا۔ وہ پاس ہو گئی تھی۔ اب میری رہی سہی امید بھی ختم ہو گئی۔

یونیورسٹی کھلنے کے دس پندرہ دن بعد میں ڈیپارٹمنٹ گیا۔ وہاں چپراسی نے بتایا کہ اس لڑکی کو اس ڈیپارٹمنٹ میں بطور ریسرچ اسکالر ایک سال کے لئے جگہ مل گئی ہے۔ اور اس کے علاوہ اس نے شام کے ڈپلوما کورس میں بھی داخلہ لیا ہے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اگلے روز میرا نتیجہ بھی آگیا۔ میں بھی پاس ہو گیا تھا۔ لاہور سے باہر ایک دو اچھی سرکاری ملازمتیں ہاتھ میں تھیں۔ مگر میں نے فوراً ہی لاہور میں ایک غیر سرکاری کالج میں بطور لیکچرار کام شروع کر دیا۔ اب میں تلا ہوا تھا کہ اس سے راہ و رسم بڑھا کر دو چار ماہ تک شادی کر لی جائے۔ مجھے ذرہ برابر بھی شک نہیں تھا کہ اسے شادی میں کوئی اعتراض ہوگا۔

مجھے علم تھا کہ ڈپلوما کی کلاس شام پانچ بجے ہوتی ہے۔ چنانچہ میں ایک روز عین پانچ بجے یونیورسٹی پہنچا۔ ابھی ڈیپارٹمنٹ سے چند قدم دور ہی تھا کہ سائیکل کی آواز سن کر پیچھے جو دیکھا تو میرے بالکل پیچھے سائیکل کے پیڈل الٹے گھماتی ہوئی وہ مجھے میٹھی نظروں سے تک رہی تھی۔ میرے دیکھتے ہی اس نے سائیکل تیز کی اور آگے نکل گئی۔ مگر ابھی اسٹینڈ پر رکھ کر تالا لگا رہی تھی کہ میں بھی پہنچ گیا

"معاف کیجئے" میں نے قریب جا کر پوچھا۔ "وہ فلاں موضوع پر (THESIS) آپ نے ہی لکھا ہے"۔
"جی ہاں" وہ مسکراہٹیں برساتی ہوئی بولی۔ اس کی لرزتی ہوئی پلکیں اٹھ اٹھ کر گرتیں اور گر گر کر اٹھتیں۔ دونوں گالوں میں گڑھے ناچ رہے تھے۔
"میں بھی اس موضوع پر کچھ کام کر رہا ہوں"۔ میں نے صاف جھوٹ گھڑ لیا "اور مجھے فلاں فلاں کے بارے میں آپ سے پوچھنا ہے"۔
"پوچھئے"۔ وہ میری طرف سیدھا دیکھتی ہوئی بولی۔
"اب تو آپ نے کلاس میں جانا ہوگا۔ اگر کل کوئی وقت دے سکیں تو . . . . . شاید اطمینان سے بات کر سکوں"۔
"ہاں ہاں۔ آپ دس بجے آجائیں"۔
"آپ کا ایم اے کا نتیجہ اخبار میں دیکھا تھا۔ مجھے تھوڑا سا رنج ہوا تھا کہ آپ اوّل نہیں آئیں"۔
اس نے شرما کر سر جھکا لیا اور پھر سائیکل کی چابی انگوٹھے کے گرد گھماتی ہوئی بولی "دراصل دو پرچے کچھ کمزور رہ گئے تھے۔ ان میں تیاری نہ ہو سکی"۔
"بہرحال مجھے بڑا رنج ہوا تھا۔ کچھ یقین سا تھا کہ آپ ضرور اوّل آئیں گی"۔
اتنے میں اس کا پروفیسر دروازے میں نمودار ہو گیا اور وہ وہیں سے گڈ ایوننگ سر کہہ کر اس کی طرف لپکی۔
اس کے اس طرح اچانک جانے پر مجھے حیرت تو ہوئی مگر میں اپنی پہلی کامیابی پر اتنا سرشار تھا کہ زیادہ اہمیت نہ دی۔ میرا رواں رواں ناچ رہا تھا۔ اور اس کی گفتگو کے فقرے دل ہی دل میں دہراتا کئی گھنٹے سڑکوں پر اکیلا گھومتا رہا۔
اگلے دن کالج میں دس بجے کلاس لینا تھی۔ مگر میں نے جاتے ہی حاضری لگا کر لڑکوں کو چھٹی دے دی اور سائیکل لے کر اڑتا ہوا یونیورسٹی پہنچا۔ مجھے یقین تھا کہ پچھلے ڈیڑھ سال کی بے قراری کو آج سکون آجائے گا۔ اور میں آئندہ آنے والا کوئی رنگین سا پروگرام بنانے کے بارے میں سوچتا ہوا یونیورسٹی پہنچ گیا۔
میں نے لائبریری میں جھانکا۔ وہ ایک علیحدہ میز پر بیٹھی ہوئی تھی۔ مگر کمرے میں بہت لوگ تھے۔ اس لئے میں برآمدے میں نوٹس بورڈ دیکھتا رہا تھوڑی دیر بعد موقع دیکھ کر اندر چلا گیا۔
مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک سی آئی۔ اور جب میں نے بات شروع کی تو اس نے اپنی مخصوص مسکراہٹ سے جواب دیئے ساتھ ساتھ وہ اپنی لرزتی پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھتی رہی۔ میں THESIS کے بارے میں بات کرتا رہا۔ کچھ گفتگو اس کے علاوہ بھی ہوئی۔ مگر دوسرے لوگوں کی موجودگی کی وجہ سے بات چیت رسمی ہی رہی۔ اب مجھے اطمینان تھا کہ بول چال شروع تو ہو ہی گئی ہے۔ یعنی سب سے مشکل مرحلہ طے ہو گیا ہے جس کے پیچھے ڈیڑھ برس کی خاموش باتیں ہیں۔ اس لئے اب پھر کسی دن دیکھا جائے گا۔ اور میں کوئی آدھا گھنٹہ بات کرنے کے بعد واپس آگیا۔
میں اپنی کامیابی پر بہت خوش تھا۔ مگر میری حساس طبیعت رہ رہ کر مجھے احساس دلا رہی تھی کہ ایک کرسی پر وہ بیٹھی تھی۔ دوسری پاس خالی پڑی تھی اور میں سارا وقت کھڑا ہوا اس سے بات کرتا رہا۔ مگر اس نے مجھے بیٹھنے کو نہیں کہا۔ "بہرحال دیکھا جائے گا۔ لڑکیوں کو تھوڑا سا نخرہ بھی تو جانتی ہے"۔
خوشی سے میں رات بھر سو نہ سکا۔ بڑے بڑے میٹھے بول لبوں تک آئے جو میں اسے کہنا چاہتا تھا۔ مگر کہہ نہ سکا تھا۔ جب آدھی رات کے بعد تک کروٹیں لیتے لیتے جسم دکھنے لگا تو ارادہ کیا کہ کل پھر اسے جا کر لائبریری میں ملا جائے۔ چنانچہ اگلے دن پھر اپنی کلاس کو چھٹی دے کر میں یونیورسٹی پہنچ گیا۔
وہ سیڑھیوں کے پاس اپنی سائیکل کا تالا کھول رہی تھی۔ شاید کہیں جا رہی تھی۔ میں اس کی طرف بڑھا۔ مگر اس کا چہرہ تاثرات سے خالی تھا جیسے وہ مجھے پہچانتی ہی نہ ہو۔ میں قریب جا کر رکا۔ مگر وہ تالا کھولتی رہی۔ میں بہت کچھ سوچ کر آیا تھا کہ ایسے بات شروع کروں گا۔ اس طرح اس کے ڈمپل کی تعریف کروں گا۔ ایسی تشبیہوں سے گردن کے خم کو سراہوں گا۔ مگر کل والی کرسی کی بات پھر ذہن میں ابھری اور آج کے رویے کی وجہ سے تمام خیالات بھک سے اڑ گئے اتنے میں وہ سائیکل لے کر چلنے کو تیار تھی۔ جلدی میں اور کچھ تو نہ بن پڑا میں نے ویسے ہی بات چلانے کو پوچھا۔

"مس ـــــ کل میں آپ کے پاس اپنی ایک کتاب تو نہیں چھوڑ گیا۔"

"کہاں؟" اس نے لاتعلقی سے پوچھا۔

"جہاں میں آپ سے آدھا گھنٹہ بات کرتا رہا۔"

"پتہ نہیں۔" اس نے لاپرواہی اور درشتی سے کہا اور پیٹھ موڑ کر چل دی۔ میں حیران کھڑا دیکھتا رہا۔ مگر اس نے میری طرف دیکھے بغیر سائیکل کے پیڈل پہ پاؤں رکھا اور چلی گئی۔

سائیکل کے ڈولتے ہوئے ہینڈل کو سیدھا رکھنے کی کوشش میں میں تھکے تھکے پیڈل چلا رہا تھا اور میں اس کے رویے کے بارہ میں سوچ رہا تھا کیا اسے کل میری کوئی حرکت ناپسند آئی تھی؟؟؟ یا شاید اپنی قیمت بڑھا رہی ہے۔ یا کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے مجھ سے دلچسپی ہی نہیں۔ مگر دل کہتا تم ہی پاگل ہو ڈیڑھ سال کے التفات کو ایک ثانیے کی بے رخی سے مٹا رہے ہو۔ بہرحال اسی ادھیڑ بن میں میں کالج واپس چلا گیا۔ وہاں جاکر کوئی کلاس نہ پڑھائی۔ بلکہ اسٹاف روم میں بیٹھا پریشان ہوتا رہا۔

کافی سوچ بچار کے بعد ایک اور طریقہ ڈھونڈا۔ شام کو پیدل سیر پہ نکلتا تو اس طرح پروگرام بناتا کہ عین پانچ بجے یونیورسٹی کے سامنے سے فٹ پاتھ پر گزرتا۔ کیونکہ وہ اسی وقت آیا کرتی تھی۔ خیال تھا کہ اس طرح اتفاقیہ سی ملاقات نظر آئے گی اور میں اسے ہلو کہہ کر یا سلام کر کے ردِعمل دیکھوں گا۔

پہلے دن میں آہستہ آہستہ فٹ پاتھ پر چل رہا تھا کہ سامنے اس کی سائیکل دکھائی دی۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں سلام کرنے کی تیاریاں کرنے لگا۔ اس نے بھی مجھے دور سے دیکھا اور آگے بڑھتی آئی۔ مگر میرے قریب آکر اس نے بڑے مزے سے دوسری طرف منہ پھیر لیا اور مجھے "ہلو" کہنے کا موقعہ ہی نہ مل سکا میں شرمندگی اور غصے سے تڑپ اٹھا۔ مگر کچھ نہ کر سکتا تھا۔

دوسرے دن اور پھر تیسرے دن بھی ایسا ہی ہوا۔ میں نے وہ رات انگاروں پہ کاٹی۔ چوتھے دن میں اسے دور سے آتا دیکھ کر ایک درخت کی اوٹ میں رک گیا۔ اور چھپ کر دیکھنے لگا۔ یقین کریں وہ بے چینی سے ادھر اُدھر گویا مجھے ڈھونڈ رہی تھی۔ یہ دیکھ کر میرے سارے گلے ایک دم ڈھل گئے۔ اور میں کھانس کر اوٹ سے باہر نکل آیا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بے اختیار مسکرا پڑی۔ وہ اس وقت کوئی پچاس ساٹھ گز دور ہوگی۔ میں فٹ پاتھ کے کنارے رک گیا۔ مگر قریب آکر مڑنے کے لئے ہاتھ کا اشارہ دینے میں اس نے مجھے پھر نظر انداز کر دیا۔

میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ جس سے میں اپنی مایوسی بیان کرسکوں۔ لڑکی کے لئے نخرہ اور ناز یقیناً جائز ہے۔ مگر دوسرے کی بے عزتی تو جائز نہیں ہیں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا واپس آگیا اور پھر یونیورسٹی جانا ترک کر دیا۔

کوئی دو ماہ اسی طرح گزر گئے۔ میں یونیورسٹی نہیں گیا۔ مگر ہر وقت ایک الجھن میں پڑا رہتا کہ اس لڑکی کی کانپتی پلکوں اور مسکراہٹوں نے مجھے ڈیڑھ سال سہلایا دیئے رکھا۔ مگر جب میں نے قدم ذرا آگے بڑھایا تو اس نے چلن کیوں بدل لیا۔ رہ رہ کر دل میں خیال اٹھتا تھا کہ شاید اب کسی اور کی طرف مائل ہوگئی ہے مگر وہ کون ہو سکتا تھا۔ میں نے آج تک اسے کسی لڑکے سے گھل مل کر بات کرتے یا سینما جاتے یا تک شاپ میں بیٹھے نہیں دیکھا تھا۔ پھر وجہ کیا تھی؟ ساری سوچ کا نتیجہ یہی نکلا کہ تھوڑا التفات۔ تھوڑا گریز لڑکیوں کی مخصوص تکنیک ہے۔ جھلک دکھا کر چھپ جانا ان کی فطرت میں شامل ہے۔ ممکن ہے وہ بھی پہلی حوصلہ افزائی کے بعد وقتی کھچاؤ برت رہی ہو۔ اس لئے ایک کوشش اور کر دیکھو۔

چنانچہ وہ بھی کر ڈالی اور ایک شام یونیورسٹی پہنچ گئے۔ خوش قسمتی سے وہ بھی اسی وقت آئی۔ اور آتے ہی کلاس روم میں گھس گئی۔ میں نے جھانکا تو وہ اکیلی تھی۔ میں حوصلہ کر کے اندر چلا گیا۔ پھر کسی قسم کی شکایت کئے بغیر میں نے اُسے یاد دلایا کہ اس کے THESIS کے بارے میں پہلے بات کر چکا ہوں اور اب ذرا اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ سپاٹ انداز میں بولی۔

"میں نے اُس کی ایک کاپی پروفیسر صاحب کو دے دی ہے۔ جو انہوں نے لائبریری میں رکھ لی ہے آپ وہاں سے دیکھ لیں۔"

"جی نہیں۔ وہاں نہیں ہے"۔ میں نے ویسے ہی جھوٹ بول دیا۔ "آپ کا پاؤ دو دن میں واپس کر دوں گا۔"

مگر وہ مسکرا کر بولی۔ "جی نہیں ــــــ وہ وہیں ہے۔"

بجز اس کی مسکراہٹ نے پھر مجھے مبہوت کر دیا۔ اور میں نظر نہ ہٹا سکا۔ میرے اس طرح بدتمیزی سے دیکھنے پر وہ کچھ گھبرا سی گئی۔

"آپ دیکھئے تو سہی۔" اس نے ذرا سختی سے کہا۔ میں چونکا۔ اتنے میں ایک لڑکی اندر آ گئی اور میں باہر نکل آیا۔

یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی۔ میں کئی ماہ کڑھتا رہا۔ "اور آپ دیکھئے تو سہی" میرے کانوں میں گونجتا رہا ــــ بلکہ اتنے برس گزر جانے کے بعد اب بھی گونجتا ہے۔ ایک ماہ بعد ہمیں یونیورسٹی سے ڈگری ملنا تھی۔ مجھے صرف کانووکیشن کا انتظار تھا کہ اسے ایک نظر دیکھ سکوں گا۔ مگر انتظار سے زیادہ اپنی بے بسی پر غصہ آتا تھا۔ میں بار بار اپنے طرزِ عمل پر نظر دوڑاتا۔ مگر کوئی بات قابلِ اعتراض نہ لگتی تھی۔ اور مجھے آہستہ آہستہ یقین آنے لگا کہ وہ کسی اور کی طرف مائل ہو چکی ہے۔

پھر کانووکیشن کا دن بھی آ گیا۔ یونیورسٹی ہال جھنڈیوں، قناتوں، پھولوں اور سرخ بناتوں سے دلہن بنا تھا۔ لڑکے اور لڑکیاں کالے کالے گاؤن پہنے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ پرانے ہم جماعت کئی ماہ بعد ملے تھے۔ اپنی پرانی یادوں اور نئی ملازمتوں کا ذکر ہنس ہنس کر سنا رہے تھے۔ کئی ایک اپنی منگنی کی خبر دے رہے تھے۔ ہر طرف عجب چہل پہل تھی۔ مگر میں اپنے آپ کو سارے ماحول سے بیگانہ محسوس کر رہا تھا اور پرانے دوستوں کی بجائے نظریں اس کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد ہمیں ہدایت ملی کہ اپنے اپنے مضمون کے لحاظ سے گروپ بنا لیں۔ اور باری باری ہال میں داخل ہوں۔ ہمارا گروپ مختصر سا تھا کیونکہ انگریزی کے ایم اے میں صرف چودہ لڑکے پاس ہوئے تھے۔ اس لئے ہمارے ساتھ ہی لڑکیوں کا گروپ بھی آگے بڑھا اور اس میں وہ نظر آئی۔

اس نے سفید لباس پہن رکھا تھا۔ سفید شلوار، سفید قمیص، سفید دوپٹہ، کانوں میں سفید ٹاپس۔ اس کے اوپر کالے گاؤن کی سلوٹیں کسی ملکہ کی پوشاک کی طرح اس کی شخصیت ابھار رہی تھیں۔ ہم دونوں دروازے میں اکٹھے پہنچے اور اس نے میری طرف دیکھا۔

یا خدا! میں کانپ سا گیا۔ اس کی نظر میں وہی التفات، شیرینی اور وہ احساس تھا جس نے مجھے ڈیڑھ سال غلط فہمی میں مبتلا رکھا تھا۔ میری کنپٹیاں ایک دم جلنے لگیں اور جب طلباء کے ریلے میں اپنی سیٹ کی طرف بڑھ رہا تھا تو ذہن میں یہی خیال تھا کہ آخر یہ لڑکی چاہتی کیا ہے۔

کانووکیشن پر ایم اے کی ڈگری ملنا طالب علم کی زندگی کی معراج ہے۔ لڑکے سینکڑوں میلوں کا سفر کر کے آتے ہیں۔ اور بشاش چہروں سے کارروائی میں شرکت کرتے ہیں۔ مگر میں مشین کی طرح دوسروں کے ساتھ کھڑا رہا۔ ڈگری وصول کی۔ سر جھکایا اور پھر بیٹھ گیا۔ نہ وائس چانسلر کی تقریر کا کوئی حصہ سنا اور نہ صاحبِ صدر کی تقریر کا۔

جلسہ برخاست ہوا تو میں ہال کے باہر برآمدے کے نکڑ پر کھڑا تھا۔ لان میں بینڈ بج رہا تھا اور وہ برآمدے میں کھڑی ہنس رہی تھی۔ میں سخت اداس اور اس کی طرف حسرت سے تک رہا تھا۔ وہ اپنے سفید لباس، کالے گاؤن اور ہاتھوں میں پکڑی ہوئی سفید ڈگری سے کوئی حور معلوم ہوتی تھی۔ دو چار دفعہ اس نے بھی میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میٹھی نظروں سے مجھے دیکھا اور آنکھوں کے کونوں سے تو کئی بار دیکھا۔ مگر میری انسانیت اتنی مجروح تھی کہ میں بات کرنے کو تیار نہ تھا۔ اگر اب میں نے بات کی اور وہ نہ بولی یا بے رخی برتی تو اتنے لوگوں میں میری بے عزتی ہو جائے گی۔ مگر ساتھ ہی مصیبت یہ تھی کہ اس کی نظروں میں نئی دعوت تھی، جس نے میرے ذہن میں کھلبلی ڈال دی چنانچہ اب میں نے سوچا کہ اسے کہیں ایسی جگہ ملنا چاہئے جہاں یہ بالکل اکیلی ہو تاکہ اس سے ان پہیلیوں کا مطلب پوچھ سکوں۔

خوش قسمتی سے یہ موقعہ بھی جلد ہی مل گیا۔ چند روز بعد کسی سیاسی مسئلے پر تمام کالجوں کے طلباء نے ہڑتال کی تھی اور بہت بڑا جلوس نکالا تھا۔ میں بھی جلوس کے پیچھے چلتا چلتا مال روڈ سے گزر رہا تھا۔ مگر جب یونیورسٹی پہنچا تو دور سے اس کی سائیکل ڈیپارٹمنٹ کے آگے کھڑی نظر آئی۔ دل نے کہا اس وقت یقیناً اکیلی ہو گی۔ اور میں جلوس گزرنے کے بعد ڈیپارٹمنٹ میں چلا آیا۔

میرا قیاس درست تھا۔ وہ اندر بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی۔ مگر ایک لڑکا اور بیٹھا تھا۔ اس کے جانے کے انتظار میں میں نے الماری سے ایک کتاب نکالی اور کھول کر سامنے رکھ لی۔ میرا دماغ تیزی سے پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ اس سے کس قسم کی بات کی جائے جو جلد ختم نہ ہو۔ کوئی موضوع سوجھتا نہ تھا۔ [illegible]

بعد ہم دونوں اکیلے رہ گئے۔
میرا حلق سوکھنے لگا۔ ٹانگیں کانپنے لگیں جسم میں ہلکی ہلکی لرزش چھا گئی۔ مگر میں نے اپنے اوپر قابو پاکر پوچھ ہی ڈالا۔
" دیکھئے۔ آپ نے تو ایم اے میں فلاں موضوع پر بہت کچھ پڑھا ہوگا۔ کسی مصنف کی کوئی اچھی سی کتاب بتا سکتی ہیں؟"
اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور باہر کی طرف اشارہ کر کے بولی: "باہر نوٹس بورڈ پر کتابوں کی مکمل فہرست لگی ہے۔ وہاں سے دیکھ لیں"
میرا سارا جسم اس خشک جواب سے ایک دم سُن ہو گیا۔ ظاہر تھا وہ بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ بھرپور سردی میں بھی مجھے پسینہ آ گیا۔ مگر میں خفت چھپانے
کو ڈھٹائی سے بولا۔
" آج آپ نے اسٹرائیک نہیں کی؟"
اس نے سر جھکا لیا اور پڑھنے لگی۔ شرمندگی سے مجھے کمرے کی تمام چیزیں گھومتی نظر آئیں۔ اور میں نے ڈوبتے آدمی کی طرح میز کے کنارے کو پکڑ لیا۔ مگر
دو منٹ بعد اس نے سر اٹھایا۔
" اسٹرائیک سے کیا مل جائے گا؟"
آج میں دیانت داری سے محسوس کرتا ہوں کہ اس نے یہ جملہ بات چلانے کو کہا تھا اور اس دن وہ خود بھی بات کرنا چاہتی تھی۔ مگر میری حالت اس کے
پہلے رویے سے اتنی دگرگوں تھی کہ مجھے محسوس نہ ہو سکا اور میں نے بھی درشتی سے یہ کہہ کر "جو دوسروں کو ملتا ہے۔ آپ کو بھی مل جاتا" سر جھکا لیا۔ تھوڑی دیر
بعد میں قسمت کو برا بھلا کہتا اور اپنے آپ کو کوستا اٹھ آیا۔
دو چار روز بعد ہوش آیا اور اس کے آخری جملے کا صحیح اندازہ ہوا تو میں نے اپنے آپ کو بڑی گالیاں دیں کہ وہ بے چاری تو بات آگے چلانا چاہتی تھی
مگر میں حواس باختہ ہونے کی وجہ سے مطلب ہی نہ سمجھ سکا۔ چنانچہ از سر نو غصہ چڑھنے لگا۔ مگر یہ اپنے اوپر تھا۔ اور کئی دن یہ تک رہا۔ بالآخر ایک دن ٹھنڈے دل
سے سوچ کر فیصلہ کیا کہ آخری کوشش کی جائے۔
کئی دن کی منصوبہ بندی کے بعد میں شام سات بجے یونیورسٹی کے گیٹ کے پاس چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے علم تھا کہ ڈپلوما کی کلاس سات بجے ختم ہوتی ہے
اور وہ قدرے دیر سے باہر آیا کرتی ہے۔ اتنے میں اکا دکا لڑکے باہر نکل گئے اور میں گیٹ سے نکل کر اندر کی طرف چلا۔
اس روز ستو فروری تھی۔ سات بجے رات گہری ہو گئی تھی اور ساڑھے سات بجے اے، آر، پی یا سول ڈیفنس والوں کی ایک مشق تھی جس میں دو گھنٹہ کے
لیے کرفیو اور بلیک آؤٹ ہونا تھا۔ یہ دن میں نے جان بوجھ کر چنا تھا کہ اسے باتوں میں لگا لوں گا۔ اتنے میں کرفیو لگ جائے گا اور پھر ہم دو گھنٹہ کے لیے اکٹھے ہوں گے
آج میں ٹھانے ہوا تھا کہ اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دوں گا اور صاف صاف کہہ دوں گا کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔
میں جب یونیورسٹی ہال کے پورچ میں پہنچا تو عین اس وقت وہ بھی وہاں آئی۔ وہ سائیکل ہاتھ میں لیے پیدل آ رہی تھی اور بجلی کی روشنی کے نیچے ہم دونوں ملے۔
میں رُک گیا ــــــ اور اس سے کہا۔
" معاف کیجئے۔ ایک منٹ کے لئے کچھ بات کر سکتا ہوں؟"
وہ رکے بغیر آگے بڑھتی گئی۔
" سنئے ــــــ میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں لوں گا"
مگر وہ انکار کے طور پر سر ہلا کر آگے چلی گئی۔
میری حالت اس مسافر کی سی تھی جو کئی دن کے سفر کے بعد جہاز پھٹنے کو سمندر کے کنارے پہنچے۔ مگر بندرگاہ میں داخل ہونے سے پہلے اس کی نظروں کے
سامنے جہاز ڈوب رہا ہو۔ میں نے انتہائی بے بسی اور بے چارگی سے اسے ایک دفعہ پھر آواز دی۔ وہ اس وقت تک پندرہ بیس گز آگے جا چکی تھی۔ چلتے چلتے اس نے

بغیر مجھ سے کچھ کہا، مگر میری حالت اتنی غیر ہو چکی تھی کہ میں سمجھ نہ سکا۔
اور وہ چلی گئی ——

میں نے جنگلہ کے دیوار کا سہارا لیا اور نہ جانے کتنی دیر تک کھڑا رہا۔ سامنے میں بجلی ایک دم گل ہو گئی اور فضا میں سائرن گونجنے لگے۔ میں اپنے جسم کو گھسیٹ کر ہال کی سیڑھیوں تک لے گیا۔ اور وہاں بیٹھ کر اندھیرے میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اگلے دن بستر پر آنکھ کھلی تو سب سے پہلا خیال دماغ میں یہ آیا کہ اس نے جاتے جاتے کیا کہا تھا؟ کئی اندازے لگائے۔ مگر قرین قیاس یہی تھا کہ کرفیو کی وجہ سے وہ جلد از جلد گھر جانا چاہتی تھی۔ اس لئے اس وقت رک نہ سکتی تھی۔ مگر اس کی تصدیق کیسے ہو؟ یہ کیسے پتہ چلے کہ وہ بے رخی نہیں برت رہی بلکہ کرفیو سے پہلے گھر پہنچنے کی مجبوری تھی۔ کافی سوچ بچار کے بعد طے یہ کیا گیا کہ آج لائبریری میں بیٹھا جائے اور اس سے کوئی بات نہ کی جائے۔ اگر تو وہ رات کے رویے کی معذرت کر دے، یا صرف اتنا ہی پوچھ لے کہ کیا بات کرنا چاہتا تھا، تو میں عمر بھر کا غلام ہو جاؤں گا۔

یہ بھی کر کے دیکھ لیا۔ وہ لائبریری میں بیٹھی تھی۔ میں بھی وہیں تھا۔ کتاب میرے سامنے تھی سر جھکا تھا۔ کبھی اس کی گردن کا خم یا ڈمپل کے بھنور، کوئی ایک گھنٹہ وہ بھی بیٹھی رہی۔ میں بھی بیٹھا رہا۔ دو ایک موقع ایسے بھی آئے جب ہم دونوں اکیلے تھے مگر اس نے کوئی بات چیت نہ کی۔ البتہ بے چین بہت نظر آتی تھی۔ بار بار پہلو بدلتی۔ کتاب کے ورق الٹتی رہتی۔ کاپی اور پنسل سے کھیلتی رہتی صاف ظاہر تھا کہ اس کی توجہ پڑھائی کی طرف نہیں۔ مگر میرا مقصد اس کی بے چینی سے پورا نہ ہوتا تھا۔ اس لئے میں بھاری دل سے اٹھ آیا۔

کالج جاتے ہی میں نے استعفیٰ لکھ کر دے دیا کہ قواعد کے مطابق مجھے ایک ماہ بعد فارغ کر دیا جائے۔ جس مقصد کے لئے لاہور رہ رہا تھا جب اس میں ہی ناکام ہو گئے تو یہاں رہنے سے کیا حاصل۔

دو چار روز بعد میں یونیورسٹی سے گزر رہا تھا کہ وہ ہال کے پورچ میں سے میری طرف آتی نظر آئی۔ اس نے بھی مجھے دیکھا۔ مگر میں راستہ تبدیل کر کے دوسری طرف سے نکل گیا۔

کچھ عرصہ بعد میں نے اسے انارکلی میں دیکھا۔ وہ ایک معمر خاتون کے ساتھ جا رہی تھی۔ جب میری نظر اس پر پڑی تو وہ پہلے سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اور جب میں نے دیکھ کر آنکھیں ہٹا لیں تو پھر بھی دیکھتی رہی۔ آپ شاید کہیں گے کہ میں جذباتی ہو کر بات کر رہا ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کی نظر میں اتنی واضح شکایت اور حسرت تھی کہ میں چکرا گیا۔ مگر میں مزید کوشش کرنے کو تیار نہ تھا۔ اگر وہ اپنی قیمت اس طریقے سے بڑھانا چاہتی تھی تو میں خود اس سے زیادہ نہیں گر سکتا تھا۔ عورت کا گریز حقیقت ہے۔ مگر مرد کی انا اس سے بڑی حقیقت ہے۔

کالج سے فارغ ہونے کے بعد مجھے ایک فرم میں بڑی اچھی ملازمت مل گئی۔ قریباً ایک ہزار روپے تنخواہ تھی۔ میں نے جھٹ سے کار خرید ڈالی اور کئی روز یونیورسٹی کے گرد و نواح میں کار پر گھومتا رہا۔ اس نے مجھے کئی دفعہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔

اب اس میں ایک تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ مجھے جہاں بھی دیکھتی، ٹکٹکی باندھ کر گھورنے لگتی اور اس کی آنکھوں میں اتنی واضح دعوت ہوتی تھی کہ اس ساری کہانی سے لاعلم آدمی بھی چلا اٹھتا کہ وہ مجھے چاہتی ہے۔ مگر آپ جانتے ہیں آزمودہ را، آزمودن جہل است۔ ڈیڑھ سال ان نظروں نے میری امنگوں کو پالا۔ اور پھر چھ ماہ میں ہی لڑکی نے مجھے ریجیکٹ کر دیا۔ اب میں ان آنکھوں پر کیا یقین کر سکتا تھا اور اگر اب بالفرض وہ مائل بھی ہے تو میں نے سوچا کہ کار کی وجہ سے ہو گی۔ اسے لگاؤ میری کار سے ہے مجھ سے نہیں ہے۔ چنانچہ وہ جہاں بھی ملی، میں نے بڑی رکھائی سے اسے نظر انداز کر دیا۔ بلکہ ایک دفعہ تو میں پیدل جا رہا تھا اور وہ اتفاق سے بس اسٹاپ پر کھڑی تھی۔ میں نے رک کر اتفاق سے دو چار منٹ بات کی۔ اس دوران میں وہ آنکھیں گاڑ کر مجھے دیکھتی رہی۔ وہ متوقع تھی کہ میں اس سے بھی بات کروں گا مگر میں نے ایک نظر ڈال کر بے رخی سے آنکھیں نیچی کر لیں اور آگے بڑھ گیا۔ میرا رویہ بظاہر سرد ہوتا تھا۔ مگر میں ہمیشہ منتظر رہتا تھا کہ وہ مجھ سے بات کرے۔ بار بار ناکامیوں سے میری خودداری اتنی مجروح ہو چکی تھی کہ اب میں کسی حالت میں بات شروع کرنے کو تیار نہ تھا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ اگر وہ ایک دفعہ بھی بات کرتی تو اتنا شور سے

ہمت ہوتی تو اللہ قسم میں اس کے قدم پکڑ لیتا اور دوسرے دن شادی رچا لیتا۔

میں اپنی طرف سے یہ قصہ ختم کر چکا تھا مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا اس قصے سے پیچھا چھڑانا مشکل ہوتا گیا اور اس کی یاد دن بدن شدت اختیار کرتی گئی۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا کہ میں سڑک پر جا رہا ہوتا کہ میرے منہ سے اس کے کہے ہوئے جملے لاشعوری طور پر نکل جاتے۔ راہ گیر حیران ہو کر مجھے دیکھتے تو میں شرمندہ سا ہو کر رہ جاتا۔ اسی طرح کئی دفعہ اس کا نام زیر لب پکارتا رہتا جس سے بعض اوقات بڑی پریشان کن صورت حال پیدا ہو جاتی۔ کئی دفعہ لوگوں نے سنا اور پوچھا بھی۔ مگر میں ٹال گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے ہر وقت محتاط رہنا پڑتا۔ اور میری شخصیت میں اپنے آپ سے ایک عجیب قسم کا خوف پیدا ہو گیا۔ وہ تو بالآخر قدرت نے مدد کی کہ جب کچھ عرصہ بعد شادی ہوئی تو خوش قسمتی سے میری بیوی کا نام بھی وہی تھا جو اس لڑکی کا تھا۔ اس لئے اب عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں اپنی بیوی پر بہت فریفتہ ہوں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ میری بیوی کو مجھ سے ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ میں اسے پورا پیار نہیں دے سکا۔

کوئی دو سال پہلے کی بات ہے کہ میں رحیم اور سلطان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ یہ دونوں اب ہماری فرم میں ملازم ہیں اور حسن اتفاق سے دونوں یونیورسٹی میں اسی لڑکی کے ہم جماعت تھے۔ ان دنوں تو میرے واقف نہ تھے۔ مگر اب گاڑھی چھنتی تھی۔ دونوں میری عمر کے ہیں اور ہم سب کے بچے کالجوں میں پڑھ رہے ہیں باتوں باتوں میں اس لڑکی کا ذکر چھڑ گیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب رحیم نے اس کے عاشق ہونے کا دعویٰ کیا۔ مگر ساتھ ہی ناکام عاشق ہونے کا اعتراف بھی کیا۔ بات نے طول پکڑا تو اس نے ہمیں اپنی داستان سنائی۔ حیرت والی بات یہ تھی کہ اس کی اور میری داستان تقریباً تقریباً ایک تھی۔ اس لڑکی نے اس کو اپنی طرف بھلایا تھا، عملاً منزل کی تھی، اپنی حرکات سے محبت کا رنگ دکھلایا تھا۔ مگر اس کی ہر عملی پیش کش کو ٹھکرا دیا تھا۔ اور مزا یہ کہ یہ سارا قصہ بھی اسی زمانے کا تھا۔ جب میں بھی اسی چکر میں سرگرداں تھا۔ رحیم میری طرح حساس نہ تھا۔ وہ اس کو بھول گیا تھا۔ اور اب اسے مکار، چالباز، فلرٹ اور ایسے ہی خطابات سے یاد کرتا تھا۔ رحیم کی کہانی میرے قصے سے اتنی مطابقت رکھتی تھی کہ میں نے بھی محض حیرت کی بنا پر اپنا ادھورا رومانس سنا دیا۔ کافی بحث کے بعد ہم دونوں کا متفقہ فیصلہ یہ تھا کہ اس لڑکی کو لڑکوں کے جذبات سے کھیلنے میں مزا آتا تھا۔ جیسے بلی چوہے کو اچھال اچھال کر اور ٹھوکر مار کے مزا لیتی ہے۔

سلطان خاموش بیٹھا ہماری باتیں سنتا رہا۔ جب ہم اپنا غبار نکال چکے تو وہ بولا۔ "تم دونوں بے وقوف ہو اور اس لڑکی کو قطعاً غلط سمجھے ہو۔"

"وہ کیسے؟؟؟"

"وہ ایسے کہ تم دونوں میں سے جو چاہتا اس سے شادی کر سکتا تھا۔ بلکہ یوں کہئے کہ جتنی محبت وہ کر سکتی تھی کہ وہ تم دونوں سے کرتی رہی ہے۔"

"بالکل بکواس۔" رحیم چلایا۔ "یہ محبت کا نرالا ہی طریقہ ہے کہ دور سے ترساؤ اور قریب نہ آؤ۔"

"تم لوگوں کو شاید تعجب ہو گا سن کر، کہ میں بھی اس پر فریفتہ رہا تھا۔" سلطان نے کہا۔

"ہا ہا ہا۔" رحیم ہنسا۔ "ابے الو کے پٹھے تو بھی کسی لڑکی پر فریفتہ ہو سکتا ہے۔ تو تو ہر لڑکی کو پان سمجھ کر چبایا کرتا تھا۔ یونیورسٹی کا راجہ اندر تھا تو۔ تیرے جیسے فلرٹ کو محبت کرنے کی فرصت ہی کہاں ہے۔"

اور یہ حقیقت تھی کہ سلطان اپنے زمانے میں بہت تیز لڑکا تھا۔ اور یونیورسٹی کی ستر فی صد لڑکیوں سے کامیاب رومانس لڑا چکا تھا۔

"ابے سن تو سہی۔" سلطان بولا۔ "میں نے کب کہا تھا کہ تم دونوں کی طرح میں اس کے پیچھے مجنوں بن گیا تھا۔ میرا تو مطلب یہ تھا کہ چند لمحے اچھے گزر جائیں اور بس۔ مگر وہ قابو میں نہیں آئی۔"

"مگر ہوا کیا تھا؟ کچھ بولو گے بھی یا تمہیدیں ہی بناتے جاؤ گے۔"

"تم سنو تو۔ ہوا یہ تھا بس ایک روز اس کے پیلے سویٹر پر اپنا دل آ گیا۔ ہم نے ذرا ہاتھ پاؤں چلائے تو اس نے بھی ایسی غلط فہمی کرا دی کہ ہم نے کہا کہ میاں یہاں تیر [illegible] چلتا ہے۔ مگر ایک دن میں نے اسے کافی شاپ میں چلنے کو کہا تو اس نے مجھے ڈانٹ دیا۔ اب اپنے پاس اتنا وقت تو تھا نہیں کہ اس کے پیچھے پاگل ہو کر گھومتے رہتے۔ یونیورسٹی میں کئی لڑکیاں ایسی تھیں جن کو باقی حصے میں بھگتانا تھا۔ اس لئے ہم نے سوچا کہ پہلے ہی تب چال چلی جائے۔"

" وہ کیا ؟" میں نے پوچھا۔

" وہ یوں کہ کلک تو اپنے ہی ہاتھ میں تھا۔ اس سے لڑکی کے گھر کا پتہ لیا اور ایک شام جا دروازہ کھٹکھٹایا۔"

" اسے ؟" رحیم چونکا۔

" اس کا چھوٹا بھائی باہر نکلا۔ میں نے کہا۔ تمہاری باجی سے ملنا ہے تو باہر آ کر کہنے لگا۔ کہ وہ نام پوچھتی ہیں۔ میں نے کہا کہ اُن ہی کو نام بتاؤں گا۔ باہر آ جائیں۔ تو عرض کر دوں گا۔ خیر مجھے اندر بلا لیا گیا۔ مگر یاد مشکل یہ تھی کہ بھائی بھی اسی کمرے میں تھا اور غالباً آخر تک رہتا۔ اگر میں قینچی نہ چلاتا۔"

" کون سی قینچی ؟"

" یہی کہ اسے بھگایا جائے۔ ہوا یوں کہ وہ اندر سے شربت لانے گیا۔ تو میں نے کہا کہ دیکھو تمہارے ساتھ چند ایسی باتیں کرنے آیا ہوں جن کو تمہارے گھر والے قابل اعتراض سمجھیں گے۔ میں نے وہ باتیں ضرور کرنا ہیں۔ خواہ تمہارا بھائی یہاں بیٹھا رہے یا چلا جائے۔"

ہم بے اختیار ہنس دیئے۔

لڑکی سمجھ دار تھی۔ اس نے اپنے بھائی کو اندر بھیج دیا۔

" پھر تم نے کیا کیا۔" رحیم کرسی سے آگے جھک آیا۔

" کرنا کیا تھا۔ میں نے اُسے صاف صاف کہہ دیا۔ کہ تم مجھے اچھی لگتی ہو۔ پھر اس کے حُسن کی تعریف کی اور وہ سارے گُر آزمائے جن سے پہلے کئی لڑکیاں فتح کی تھیں۔"

" کیا بولی وہ ؟" میں رشک سے بھن رہا تھا۔

" جانتے ہو کیا کہا اُس نے۔"

" کیا ؟" ہم دونوں ایک ساتھ بولے۔

" کہنے لگی اگر تم مجھ سے اتنی ہی محبت کرتے ہو تو شادی کر لو۔ میں نے دل میں سوچا مارے گئے یہ تو۔ نماز بخشوانے آئے تو روزے بھی گلے پڑ گئے۔"

" پھر ؟"

سلطان سگریٹ سلگانے لگا۔ کم بخت کو ہمارے جذبات کا بھی خیال نہ تھا۔

" پھر یہ کہ" اس نے لمبا کش کھینچا۔ "میں نے کہا کہ میں تیار ہوں۔ لیکن بہتر ہے کہ پہلے چند روز ہم اکٹھے گزار لیں تا کہ تم میری طبیعت سمجھ جاؤ۔ مگر وہ نہ مانی کہتی تھی میں بدنام ہو جاؤں گی۔ میں نے بہت زور مارا تو بڑے درد سے کہنے لگی۔ سلطان صاحب! ہم متوسط طبقے والوں کے پاس نام کے علاوہ اور ہے ہی کیا۔ اچھی اخلاقی شہرت کے لئے ہی تو ہم سینکڑوں ذہنی دیواریں بناتے ہیں۔ اور اگر شادی کے وعدوں پر تجربوں میں وہ نام ہی کھو دوں تو کون شادی کرے گا مجھ سے بھئی رحیم میں نے اس کی بات سنی، تو مجھے یوں لگا جیسے اس نے میرے دل میں جھانک کر میری نیت کو گردن سے پکڑ لیا ہے۔ بحث تو ڈھٹائی سے میں پھر بھی کرتا رہا۔ مگر وہ اٹل تھی اور میں اٹھ کر آ گیا۔"

" اس کے بعد پھر کبھی نہیں ملے۔" میں نے پوچھا۔

" اول ہوں۔ میں وقت ضائع کرنے کا قائل نہیں۔ اور کوئی فائدہ بھی نہ تھا۔" اس نے کش لگایا۔ "دراصل اس کا باپ انتہائی غیر ذمہ دار تھا اور توقع نہ تھی کہ وہ لڑکیوں کے لئے رشتے ڈھونڈ سکے گا۔ پھر اس کی چھوٹی تین بہنیں اور تھیں اور تم جانتے ہو کہ ہمارے خاندانی نظام میں گھر کے بڑے بچے کی چھوٹے بچے ہر حال میں تقلید کرتے ہیں۔ اس لڑکی کو اپنی اس ذمہ داری کا احساس تھا...... وہ ہر ایک سے شادی کرنے کو تیار تھی۔ خواہ سلطان ہو یا رحیم ہو یا کوئی اور ہو۔ مگر کسی سے دوستی کا جوا کھیل کر اور بدنام ہو کر شادی کے آئندہ امکانات تباہ نہ کرنا چاہتی تھی ـــــ اپنے بھی اور اپنی بہنوں کے بھی ـــــ نام اس کا مسئلہ نہ تھا۔ سارے متوسط طبقے کا مسئلہ ہے۔

"۔۔۔ مسئلہ تم جانتے ہو شادی ہے۔ اسی کے نام پر وہ اپنا اخلاق تباہ کر سکتی ہے۔ اور اسی کی خاطر وہ اپنا اخلاق بچائے رکھتی ہے۔"

"وہ آج کل کہاں ہے؟" میرے دل میں یہ سوال بڑی دیر سے کھد بد کر رہا تھا۔

"فلاں کالج میں پروفیسر ہے۔ میری لڑکی بھی اسی کالج میں پڑھتی ہے اور وہ ذکر کرتی ہے کہ ہر جگہ نیک اخلاق کی مثال دینے میں اسی پروفیسر کا تذکرہ ہوتا ہے۔ تمہارا پھا نام ہے اس کا!"

اتنے میں دو ایک دوست اور بھی آ گئے اور موضوع ختم ہو گیا۔

آج صبح میں اپنے ڈاکٹر دوست کے پاس بیٹھا تھا جو نفسیاتی معالج ہے اس کا خیال تھا کہ ہمارے ملک میں طبیبوں کی اتنی ضرورت نہیں جتنی نفسیاتی معالجوں کی ہے کیونکہ پابندیوں میں جکڑے ہوئے اس معاشرے میں زیادہ تر بیماریاں نفسیاتی الجھن کی وجہ سے ہوتی ہیں مجھے اس کا نقطۂ نظر تسلیم کرنے میں تامل تھا۔ اور میں کہہ رہا تھا کہ ہر اسپیشلسٹ یہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں اس کے وجود کے علاوہ اور کسی کی ضرورت نہیں۔ بحث ہوتی رہی اور وہ اپنا نقطۂ نظر واضح کرنے کو مریضوں کے ہسٹری کارڈ اٹھا لایا۔ ایک ایک کارڈ پر نظر ڈالتا اور مریضوں کے حالات بتاتا جاتا۔

"ایک مریضہ ہے جس کی ہسٹری دلچسپ ہے۔ جب یہ پہلے روز میرے پاس آئی تھی تو میں میز پر کام کر رہا تھا مغرب کے بعد کا وقت تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھی تھی کہ اتنے میں بجلی چلی گئی۔ ہم نے چند سے انتظار کیا اور پھر میرا ملازم ایک بڑی سی موم بتی اٹھا کے لے آیا۔ جو میں نے اپنے سامنے کی میز پر رکھی اور مریضہ کی ہسٹری لکھنے لگا۔ مجھے حیرت اس بات پر ہوئی کہ مریضہ کی زبان میں ہکلاہٹ پیدا ہو گئی۔ اور اس کی باتیں بے ربط ہو گئیں۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ بڑی وحشت سے موم بتی کو گھور رہی تھی پھر ایک دم وہ اٹھی اور موم بتی کو توڑ پھوڑ کر پھینک دیا۔"

"ارے" میں حیران رہ گیا۔ "مگر یہ کیوں کیا اس نے؟"

ڈاکٹر مسکرایا "میں نے اس کے گھر والوں سے پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ وہ اکثر موم بتیوں کو توڑ پھوڑ دیتی ہے اور انہیں برداشت نہیں کر سکتی۔"

"مگر کیا وہ اسی تکلیف کے علاج کے لئے آئی تھی۔"

"نہیں یہ واقعہ تو اتفاقیہ ہو گیا۔ وہ خود نہیں آئی تھی بلکہ اس کے گھر کے لوگ اسے زبردستی لائے تھے۔ تکلیف اسے یہ تھی کہ برسات کے موسم میں وہ ستونوں سے لپٹ کر رونے لگتی۔ روتے روتے بے ہوش ہو جاتی اور اس کے ہاتھ پاؤں ٹیڑھے ہو جاتے۔ بعض اوقات چاندنی راتوں میں بھی وہ ایسا ہی کرتی۔ اس کے لواحقین کو خاص طور پر ایسا گھر لینا پڑا تھا جس میں ستون کوئی نہ تھا۔ مگر تم جانتے ہو۔ کسی اور جگہ ستون کا ملنا مشکل نہیں۔ اور وہ ادھر ہی بھاگ جاتی۔"

میں دم بخود تھا۔ ویسے ہی ہسٹری کارڈ اٹھا کر دیکھنے لگا۔ مریضہ کے نام پر نگاہ پڑی تو میں ایک دم چونکا۔ یہ وہی تھی۔ عمر پینتالیس سال لکھی تھی اور نام کے ساتھ "مس" کا لفظ دیکھ کر مجھے نہ معلوم کیوں دکھ ہوا۔ میں تھوڑی دیر کو سن سا ہو گیا۔

"اب اسے کچھ افاقہ ہوا ہے۔ تمہارے علاج سے؟" میں نے بالآخر پوچھا۔

ڈاکٹر نے اپنی دونوں ٹانگیں میز پر رکھ دیں اور کرسی کی ٹیک پر پھیل گیا۔ پائپ میں تمباکو جما کر اس نے دیا سلائی دکھائی اور دھواں چھوڑتے ہوئے بولا۔

"اگر ہم اسے عنقریب پاگل ہونے سے بچا سکیں تو یہ ایک معجزہ ہوگا!"

اقبال متین

سیپ، کراچی

مہمان

سونی نگری گونج اٹھی تھی۔ اور اس نے لاکھ جتن کئے کہ اس گونج کو صرف اپنے ہی من مندر میں اس طرح چھپائے رکھے کہ کوئی بھی کچھ نہ سن پائے۔ لیکن یہ گونج تو چھپائے نہ چھپتی تھی۔ خود اس کے اپنے چہرے پر چاندنی بن کر پھیل گئی تھی۔ یہ کیسی آواز تھی۔ یہ تو ان کا کیا جادو تھا۔ یہ کیسی ٹھنڈی چاندنی تھی۔ یہ کیسی صبح کی نرم گرم دھوپ تھی۔ جو اس میں سما گئی تھی اور اس کا سارا وجود بس ناچ رہا تھا۔

کوئی آ رہا ہے — کوئی آ رہا ہے — وہ آ رہا ہے، جس کا اسے برسوں سے انتظار تھا جس نے اس کا سب کچھ اپنے قبضہ میں کر لیا تھا۔ کتنی دعائیں مچا رکھی تھیں اس نے کہ وہ نہ آیا، تو ایسی محبتیں جو اسے حاصل تھیں وہ بھی آہستہ آہستہ اسے چھوڑنے لگیں۔

شنی کی ماں بھی تو اس کی اپنی ماں کے برابر تھیں، لیکن کس سفاکی سے کہہ دیا تھا انہوں نے — بیاہ لانے دو کہیں اور کی، آخر اس کا بھی تو ارمان نکلے — اور وہ سوچنے لگی۔ میری اپنی امی تو بس منہ تکتی رہ گئی تھیں ان کی ماں کا۔

کتنے زخم اس نے اپنے ہی ناخنوں سے نوچ کر ہرے کر لئے۔ کتنے زخم سوکھنے لگے تو کسی نہ کسی نے کر دیا۔

پھر وہ زخم تو بس رستا ہی رہتا تھا۔ جو شنی نے لگایا تھا — شنی بھلا اس کا ہے کو تھی اس کی۔ شنی کی بھاوج بننے سے قبل تو وہ خود شنی کا دل تھی، گھر میں ساتھ کھیلنا، محلے میں ساتھ کھیلنا، اسکول میں ساتھ پڑھنا، گھروندے ایک ہی ڈھنگ سے بنتے۔ گڑیاں ایک ہی چوکی پر سجائی جاتیں۔ کتاب کھو جاتی تو کلاس میں ایک ہی کتاب کے لفظوں کو دو نظریں مل کر گدگداتیں۔ یہاں تک کہ کس سوتی کا دیا ہوا ہم درد کے ایک ہی تحریر سے دو خطوں، نوٹ بکس میں کیا ہوا ملتا۔

اور اب گھروندے بنانے والے نے گھر بسا لئے تھے۔ گڑیوں کی شادی کی خوشیوں نے ٹھکرا کے اندھیرے گوشے میں کہیں۔ خود اس کی شادی سے گھر کا چپہ چپہ چمک اٹھا، سلگ اٹھا۔ اور شنی تو بس باؤلی ہو گئی تھی۔ "میں اس کی نند نہیں ہوں جی۔ تمہاری سالی ہوں۔" وہ اپنے بھائی کو چھیڑتی۔ "سیپ سے نکال کر در نایاب دیا ہے بھیا تجھے۔ ذرا سا طبیعت میں میل آئے گا تو میں حساب چکا لوں گی۔ نینے سے جگانا مت بھیا جی۔ سونی کو اٹھانا مت جناب۔"

شادی کے گھر کا جو حال تھا وہی حال شنی کے دل کا بھی تھا — ایک ایک کی مدارت کرتی پھرتی۔ آنکھوں میں پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔ تو شنی کے حلق میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔

ایسی شنی نے بھلا جب یہ کہہ دیا کہ میرا بھیا تو ایک ایسا طوطا ہے جو بے فکری کی شاخ پر دام بھروسے بیٹھا پھل پکنے کا منتظر ہے — نہ خزاں معلوم نہ بہار کا پتہ۔ بس انتظار ہی انتظار — تو اس کے دل پر چوٹ لگی تھی۔

لیکن وہ دن تھے کہ مہینوں اور برسوں میں تبدیل ہو رہے تھے۔ .. سوچ کو نکلا اور دو بنے سے مطلب۔ وقت کی گاڑی ایسی ہی ایک ڈگر پر چپکے چپکے چھوٹ رہی تھی۔ ہاتھ اُڑنے

دھیمے دھیمے اس نے پھاڑ پھاڑ کر اس لکیر کو دیکھا جو ایک ناہموار راستے کی صورت میں اس کے سامنے تھی پھر یہی راستہ ایک چٹیل میدان بن کر اس کے اطراف پھیل گیا۔ وقت کا ایک ایسا چٹیل میدان، جس میں نہ اپنا تھا نہ پرایا۔ بس ایک ہو کا عالم تھا ایک سناٹا۔ اور اس سناٹے میں اس کا کچھ تھا تو اس کے زخم تھے۔ سوکھے سوکھے بھی، ہرے ہرے بھی۔ اس نے ان زخموں کی فصل کو اپنے آنسوؤں کا پانی دے دے کر سینچا۔

یہ آنسو بھی تو چپ چاپ بہہ نہیں جاتے ہیں۔ رخسار کی شگفتگی، آنکھوں کی جوت، بدن کی تازگی سب اس کھارے پانی سے دھل کر اپنا رنگ روپ کھو دیتے ہیں۔

اس نے بھی اپنا رنگ روپ دھیرے دھیرے کھو دیا۔

جو اس کا تھا نہیں وہ اسے نہ مل سکا تو وہ بھی اس سے چھوٹنے لگا جو اس کا اپنا تھا۔

شفی کے بھیا نے آخر ش گورنمنٹ میں درخواست دیدی کہ انہیں دوسری شادی کی اجازت دی جائے۔ کیونکہ ان کی موجودہ بیوی کے بطن سے سات سال سے کوئی اولاد نہیں ہوئی ہے — وہ تو خیر گذری جو سرکاری عہدہ دار ہونے کے ناطے شفی کے بھیا اس حد تک مجبور تھے۔ ورنہ چٹ منگنی پٹ بیاہ — دیر کس بات کی تھی۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ نہیں تھا تو بس ان کے بعد جائداد کا وارث نہیں تھا۔

شفی نے پوچھا تھا "بھیا دوسری شادی کے لئے حکومت کو درخواست دے رہے ہیں۔ تم بھی رضامندی ظاہر کر کے ان کی مدد کرو گی نا —"

پلکیں جھپک کر اس نے شفی کو اس طرح دیکھا تھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہے۔ پھر یکایک بوکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ پگلی کہیں کی یہ بھی نہ سوچا کہ ہنسی تو پھر بھی ہنسی ہے۔ ہونٹوں کی ہو کہ زخموں کی۔

خاندان بھر میں بات اس طرح پھیلی جیسے جلتی آگ پر کسی نے تیل چھڑک دیا۔ اس نے محسوس کیا کہ جیسے وہ ایک مجرم ہے جس کے جرم کے خاندان بھر میں چرچے ہیں۔

لیکن ہمدردی کے دو چار لفظ جب بھی اس کے حصّے میں آئے۔ اس نے یہ بھی سمجھا کہ بعض ایسے بھی ہیں جو اسے مجرم نہیں سمجھتے اس کا ندامت سے نگوں سر کبھی کبھی اوپر اٹھا بھی تو بس اس سہارے کہ وہ سبھوں کی نظروں میں مجرم نہیں ہے۔

دکھوں کی اس یورش میں جب کہ آسمان پر چمکنے والے ستارے ٹھنڈک نہیں پہنچاتے، چوٹ لگاتے ہوں۔

غم کدے جیسے اس چمن زار میں جبکہ کلیوں کی چٹک سے زخم ہرے ہوتے ہوں — پُروائی کے چلنے سے روح کا کرب جاگ اٹھتا ہو۔

اُس نے ایک آواز سنی۔ اور سونی نگری گونج اٹھی۔

میں آرہا ہوں — میں آرہا ہوں۔

یہ تخلیق کی رنحت تھی۔ جو کسی کی آمد آمد کا پتہ دیتی تھی۔

اس نے اپنے وجود میں ایک ہلکا سا ارتعاش محسوس کیا، اس نے اپنے میں ایک اور زندگی کو کسمساتے ہوئے پہچان لیا۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کا بدن اپنا کھویا ہوا رنگ روپ پھر سے پا چکا ہے۔ اور یہ سب کچھ بس دنوں ہی کی تو بات تھی۔

برسوں کے سناٹے اس کی ہستی کے اس نئے شور سے ٹکرائے اور سونی نگری گونج اٹھی۔ اس نے ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ تو وقت کا چٹیل میدان اب ہری بھری کونپلوں سے جیسے پٹا پڑا تھا۔ ماضی کے کھنڈر میں بھی حال کی گونج سنائی دے رہی تھی۔

اب کیا ہوگا؟ اس کی ساس نے سوچا۔ شفی نے بھی اپنی نئی بھابی تلاش کر لی تھی۔ بات نہ صرف پکی ہو چکی تھی۔ بلکہ کچھ چڑھاوے بھی لے جائے گئے تھے۔ بس حکومت سے منظوری حاصل ہونے کی دیر تھی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ حکومت کی جانب سے اس کا طبی معائنہ بھی کرایا جائے گا۔

لیکن اب تو دیکھتے کے دیکھتے کسی نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ آرہا ہے۔ اور اس اعلان کی گونج جب اس کے دل میں مقید نہ رہ سکی تو پھر

پیشانی پر بن کر پھیل گئی۔

وہ کب یہ چاہتی تھی کہ لوگ اس کے رخساروں پر پھیلی ہوئی شفق کی سرخی سے آنکھیں پھیر لیں۔

وہ کب یہ چاہتی تھی کہ اس کی ساس اس کی شفی شفی کے بھیا اس کی آنکھوں کی وہ جوت دیکھیں جس جوت نے اس کے سامنے کا سارا مستقبل منور کر کے رکھ دیا تھا۔

اپنے ہی من مندر میں اس گوہر کو چھپائے رکھنے کے لئے اس نے جتن کئے تھے تو صرف اسی لئے کہ خود اس کو کسی کی آمد آمد کا بھرپور یقین ہو جائے کہیں ایسا نہ ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ۔ لیکن نہیں ۔ وہ تو آ رہا ہے ۔ وہ تو آ رہا ہے ۔

لیکن اب کیا ہوگا ؟ اس کی ساس نے سوچا۔

شفی نے بھی اپنی نئی بھابی تلاش کر لی تھی۔

لیکن جب شفی کو یقین ہو گیا تو اس نے اپنے ننھے کے گال پر چٹکی بھر کے کہا "لو جی! تمہارے لئے بھی اب ایک گڈا آ رہا ہے ۔ لو۔ تی۔ او۔ ٹو"

اور شفی نے اپنی بھابی کے پیٹ کو گدگدا کر اس کو خوب ہنسایا۔

کھل کر ہنسنا کتنی بڑی نعمت ہے آج اس نے محسوس کیا۔ زخموں کا قبرستان اب تو منہ بند کلیوں کا چمن زار بن گیا تھا۔

شفی کے دل میں بھی سوئی ہوئی محبت انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی۔ اپنی بھابی پر اس کو اتنا بہت سا پیار آیا۔ پیار جو محبت سے زیادہ جذبہ رحم کا غماز تھا۔

بھیا دفتر سے لوٹے تو شفی ان کی گردن میں باہیں ڈال کر جھول گئی۔

"لاؤ جی کر دو منہ میٹھا اور کل ہی اپنی درخواست حکومت سے واپس لے لو۔"

بھیا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

وہ بھی تو انہیں پسند آ گئی تھی جس سے وہ اپنی زندگی کا ناطہ استوار کرنے والے تھے۔

"کیا لڈو منہ میں رکھ لیا ہے ؟" شفی نے بھیا کو پھر چھیڑا تو وہ چونکے۔

"امی نے کیا کہا ؟" وہ کچھ اس طرح بولے جیسے خود کچھ کہنا چاہتے ہوں۔

"اب کہنے کو رہ ہی کیا گیا ہے" شفی نے جھٹ سے جواب دیا۔

خاندان بھر میں یہ بات بھی گلستاں میں بھری بہار کی تازگی کی طرح پھیل گئی۔

کتنی ہی آنکھیں اس کی ہمدردی میں نم ہو گئیں۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔ سانچے بادشاہ تیری دین نرالی ہے۔

شفی کے بھیا حکومت کے ذمہ دار عہدہ دار جو تھے۔ انہوں نے اپنی درخواست واپس لے لی۔

اس کی ماں نے کہا "یوسف شریف بابا کی درگاہ پر میں نے بھی عرضی اسی روز چڑھا دی تھی، بیٹا جس روز تیرے میاں نے حکومت میں درخواست دی تھی۔"

نیاز نذرانہ میں اس کی ماں نے دو ہزار صرف کیا۔ فقیروں نے کھانا کھایا۔ بے کسوں نے کپڑے پہنے۔

اب تو اس کے اطراف ساری فضا چمک اٹھی تھی۔ چاند نکلے کہ نہ نکلے بس سدا چاندنی ہی چاندنی اطراف میں بکھر گئی تھی۔

کھوئی ہوئی جوانی الٹے پاؤں آ کر جیسے اس کے قدموں پر لوٹ گئی۔ اور اس نے اٹھا کر اس کھوئی ہوئی جوانی کو گلے لگا لیا۔

کچھ دلاتوں گذرے کہ ہر کھانے کی نعمت سے اس کی طبیعت اوب گئی۔ اس کے باوجود بھی جانے وہ کون تھا جو دنیا بھر کے کھٹے و

شفی اس کے حصے میں لے آیا تھا۔

میں آرہا ہوں۔ میں آرہا ہوں۔

اس آنے والے نئے مہمان کی پذیرائی کے لئے اس نے اپنا بہت کچھ تج دیا تھا بس دن رات اسی کے خیالوں میں مگن رہنے لگی۔

مو تیوں کے رنگوں کا امتزاج کچھ دل کو بھایا نہیں، جھٹ سے سوئیٹر بننا شروع کردیا۔ لال اون کو سفید اور کالے اُون سے جوڑ جوڑ کر دیکھا۔ سوئٹر تیار ہوگیا۔ تو پھر اسی رنگ کے موزے بھی بُنے جانے لگے۔ کن ٹوپ تیار ہوئی۔ پھر جرسی بنی۔ پھر پھندنے والی ٹوپیاں۔

مشین پر چھوٹے بڑے باباسوٹ سئے گئے۔ فراکیں سلیں۔ شفی نے آکر گدگدایا اور چھیڑا تو مشین پر دوڑتے ہوئے کپڑے سے نظریں اٹھیں، مسکرائیں، شرماکر جھکیں، پھر اپنے ہی تصورات میں گم ہوگئیں۔

شفی کے بھیّا کو بھی اس کی دیوانگی پر ایک دن پیار آگیا۔ جب کہ وہ ڈھیری بھر کھلونا خرید کر گھر لوٹی تھی۔ کار کا دروازہ کھول کر جب انہوں نے سیٹ پر دیکھا تو چونکے بھی تھے۔ ناچنے والا بھالو بھی۔ دوڑنے والا موٹر بھی۔ گول چکر لگانے والی ٹرین بھی، گوئے بھی، بینڈ بھی اور عالم کیا کچھ تھا۔

ایک کمرے کو منتخب کر کے اس نے ایک چھوٹی سی دنیا ہی سجادی۔ ایک کونے میں خوبصورت سا گوڈریج کا پالنا بھی، پلنگ بھی۔ ایک گوشے میں آئینہ لگی الماری۔ بیچوں بیچ چھوٹی سی میز، چھوٹی سی کرسیاں۔

کبھی تو وہ دن دن بھر اسی کمرے کی تزئین و آرائش میں لگی رہتی۔ کبھی اپنے ہی خیالوں میں مگن وہیں فرش پر پڑی پڑی سو جاتی، کوئی خوابوں میں آکر اسے گدگدا جاتا۔

اس کو اپنے پھولے ہوئے پیٹ پر اتنا پیار آتا کہ اس کا جی چاہتا کہ جلدی سے اس ننھی سی جان کو جو اس کی ہستی میں سما گئی ہے جو اس کے پیٹ میں کبھی کبھی علانیہ حرکت کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے باہر نکال کر سینے سے چمٹالے اور خوب خوب چومے۔

پھر ایک رات اس نے تخلیق کا کرب محسوس کیا۔ پھر یہ درد اتنا بڑھا کہ اس کی شدت سے وہ نڈھال ہوگئی۔

ہاسپٹل میں جب اس کی آنکھ کھلی اور اسے ہوش آیا تو اس کے کانوں میں وہی آواز گونج گئی۔ جو نیم بے ہوشی کے عالم میں اسے لمحے بھر کو چونکا گئی تھی۔

اس کا پھولا پھولا پیٹ اب بیٹھ سے آلگا تھا — میرا مہمان کہاں ہے؟

اس کے دل نے خود اسی سے پوچھا — اس نے اپنے پاس دونوں جانب دیکھا۔ وہاں تو کچھ بھی نہ تھا۔

" وہ کہاں ہے — کہاں ہے میرا بچہ؟"

اس کی آنکھوں کے آگے اجالے اور اندھیرے گڈمڈ ہوگئے۔ بڑی دقت سے اس نے اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں کو جنبش دی۔ شفی کے بھیا اس کے پاس کھڑے تھے۔ پلکیں جھپکا کر اس نے پہچاننے کی کوشش کی۔ دھندلا دھندلا چہرہ واضح ہوتا گیا۔ نظریں ملیں اور شفی کے بھیّا نے منہ پھیر کر آنسو خشک کر لئے اور تیزی سے کمرے کے باہر نکل گئے۔

شفی جو ان کے پیچھے کھڑی تھی، آگے بڑھی۔

اس نے بیتاب ہو کر شفی کے دونوں ہاتھ اپنی گرفت میں لے لئے۔

" وہ کہاں ہے — کہاں ہے میرا مہمان۔ میں نے اس کی آواز سنی تھی۔ میں نے صرف آواز ہی تو سنی ہے۔ میری آنکھیں ترس رہی ہیں۔ شفی مجھے بتا دو۔"

لیڈی ڈاکٹر نے شفی کو اس سے الگ کر دیا تو اس نے لیڈی ڈاکٹر کا ہاتھ پوری قوت سے دبا کر کچھ پوچھنا چاہا۔ لیکن اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ پھر اس پر غشی طاری ہو گئی۔

کچھ دن بعد جب اسے گھر لایا گیا تو لوگوں میں گھسری ہوئی بس سب کا منہ تکے جا رہی تھی۔ آنکھوں میں دور دور تک آنسوؤں کا کہیں پتہ نہ تھا ایک وحشت سی موجود تھی۔ جیسے یہ آنکھیں کسی کو تلاش کر کے مایوس اور غمزدہ ہو گئی ہوں۔

رات کو جب شفی اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو بستر خالی تھا۔ وہ بھاگی بھاگی سیدھے اس کمرے میں گئی جو بچے کے لئے سجایا گیا تھا۔ روشنی جل رہی تھی اور وہ کھلونوں اور سامان کو جھٹک جھٹک کر قرینے سے رکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ بڑا مطمئن تھا اس کی آنکھیں پرسکون۔

شفی نے کواڑ کے اوٹ میں ہو کر اس کو سر سے پیر تک غور سے دیکھا۔ وہ بڑی احتیاط سے قدم اٹھاتی کمرے میں ایک ایک شے کو صاف کرتی پھر رہی تھی۔

آخر شفی کمرے میں دبے پاؤں داخل ہو گئی۔ تب بھی اس نے نہیں دیکھا۔

شفی نے کھانس کر اس کو مخاطب کیا تو وہ پلٹ کر ہمیشہ کی طرح مسکرانے لگی۔

شفی نے دیکھا اس کا پیٹ بہت پھولا ہوا تھا، جیسے نواں مہینہ ہو۔ اس نے گدگدانے کے انداز سے چھو کر دیکھا تو ساری کے اندر کپڑے ٹھنسے ہوئے تھے۔

شفی نے جب گدگدایا تو وہ ہمیشہ کی طرح شرما کر ہنسنے لگی۔ لیکن شفی کی چیخ نکل گئی۔ اور وہ پچھلے پاؤں بھاگتی ہوئی اپنے کمرے تک بھی نہ پہنچی تھی کہ سبھوں نے اس کو گھیر لیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں سرد تھے۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ بھابی۔ بھابی۔ لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ تو انگلی اٹھا کر اس کمرے کی طرف اشارہ کیا جو آنے والے مہمان کے لئے سجایا گیا تھا۔ اور جس کی روشنی کھڑکیوں سے باہر نکل کر گھر کے صحن میں پھیل رہی تھی۔

انور عنایت اللہ
الشجاع - کراچی

اُستاد

بات معمولی سی تھی لیکن ہماری برادری میں خوب چہ میگوئیاں ہوئیں۔ اس سے اس کے کاروبار پر بھی برا اثر پڑا۔ لیکن اس کی تو ہر بات نرالی تھی اس کی، جو کراچی کا سب سے بڑا جیب کترا تھا!

جیب کترنے کا فن بھی نہایت قدیم ہے اور بڑا ہی صنعت کارانہ۔ یہ ارسطو کے زمانے میں بھی رائج تھا اور آج کے اسپوتنک کے دور میں بھی۔ انگلیوں کی مہارت اور چابکدستی کا بھی ہمیشہ یہی عالم رہا ہے۔ نظر چوکی کہ استاد کام کر گئے۔

استاد کا نام نہ جانے کیا تھا۔ جب سے انہوں نے کراچی کی سڑکوں کو اپنایا، استاد ہی کہلائے۔ ماں باپ نہ جانے کون تھے اور کیا کرتے تھے۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر یہ جس سرد صبح کو ملا نیازی کو ملے اس دن سردی سے کئی موتیں ہو چکی تھیں۔ لیکن استاد پر اس سردی کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک قیمتی کمبل میں لپٹے لپٹائے انگوٹھا چوس رہے تھے۔ شاید ان کی یہی ادا ملا نیازی کو بھا گئی اور وہ انہیں اٹھا کر گھر لے گئے۔ یہ گھر گیارہ سال تک ان کا رہا۔ پھر ملک تقسیم ہوا۔ وہ ملا نیازی کے ساتھ پاکستان کے حالات کا جائزہ لینے کے لئے لاہور آئے۔ راستے ہی میں ٹرین پر حملہ ہوا اور استاد قافلے سے بچھڑ گئے۔ دو سال کے بعد جب وہ یکایک کراچی پہنچے تو ان کی عمر سترہ سال تھی۔ لیکن وہ اپنے ساتھ اتنا تجربہ لائے تھے جو انسان پچیس سال میں بھی مشکل سے حاصل کرتا ہے۔ لیسے میں سونے پر سہاگہ انہیں پہلے ہی دن سے مخدوم جان محمد کی رفاقت نصیب ہوئی۔ بوڑھے مخدوم کے یہاں ہر وقت کوئی درجن بھر ایسے نو عمر لڑکے زیر تربیت رہتے جو آگے چل کر شہر کے چابکدست جیب کترے کہلاتے۔ استاد کو بھی مخدوم کے یہاں نہ صرف پناہ مل گئی بلکہ بہت جلد انہیں چین کی زندگی گذارنے کے گُر بھی آ گئے۔ جب پانچ سال بعد بوڑھے مخدوم کا انتقال ہوا تو استاد ہی نے سارا کاروبار سنبھالا۔ وہ دن اور آج کا دن، استاد ہمیشہ زینے کے اوپر ہی رہے۔

زینے کے اوپر پہنچنا بھی ایک مشکل فن ہے۔ جیب کاٹنے کے فن کی طرح قدیم اور صنعت کارانہ۔ خاص طور پر پس ماندہ ملکوں میں جہاں کے زینوں پر بڑی پھسلن ہوتی ہے۔ اور نیچے سے ٹانگ پکڑ کر گھسیٹنے والے لاتعداد۔

اپنی چھبیس سالہ زندگی میں استاد نے لاتعداد لوگوں کی جیبیں کاٹی تھیں۔ لیکن اس دن کا تجربہ ان کے لئے بالکل نیا ثابت ہوا۔ مہینے کا پہلا ہفتہ تھا۔ صدر میں خاصی گہما گہمی تھی۔ شکار کی تلاش میں ادھر ادھر پھرنے کے بعد بوری بازار کے نکڑ پر استاد نے حسب معمول شام کا اخبار خریدا، ہاتھی دانت کے ہولڈر میں سگریٹ لگا کر سلگایا اور ایک طرف رک کر اخبار پڑھنے لگے۔ بظاہر ان کی نگاہیں اخبار پر تھیں۔ لیکن در اصل وہ شکار کی متلاشی تھیں انہیں دیکھ کر کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کراچی کے سب سے ذہین اور خطرناک جیب کترے تھے۔ وہ ہمیشہ اپنی شکل صورت، وضع قطع

اور چال ڈھال سے لوگوں کا صفایا کر دیتے۔ وہ بڑی آسانی سے ہر قسم کی محفل میں گھل مل جاتے۔ کبھی تنہا کام نہ کرتے۔ ہمیشہ اپنے ساتھ دو تین شاگرد رکھتے۔ تاکہ آڑے وقت پہ کام لیا جا سکے۔

آڑے وقت کون کس کے کام آتا ہے۔ بُری گھڑی کسی کو نہیں بخشتی۔ ایسی منحوس گھڑیاں تو پلک جھپکتے تباہی کے سیلاب میں سب کچھ بہا لے جاتی ہیں۔

استاد نے ایسے کتنے سیلابوں کا مقابلہ کیا تھا کہ ان کا دل اب بڑے سے بڑے سانحہ پر بھی نہ پسیجتا۔ وہ ہر حالت میں پرسکون رہتے اور موقعہ پا کر اپنا کام کر جاتے۔ اس شام کو یکایک پریڈی اسٹریٹ کی طرف سے ایک شاندار بیوک آکر سامنے رکی تو استاد نے اخبار پر سے نگاہیں اٹھا کر بے اطمینانی سے اس کا جائزہ لیا۔ بڑی گاڑیوں کے نمبر وہ نوٹ کیا کرتے تھے۔ اب وردی پوش ڈرائیور نے دروازہ کھول دیا تھا۔ اور ایک نستعلیق قسم کے بڑے میاں کار سے اتر رہے تھے۔ کار سے باہر آکر بڑے میاں نے اچکن کی جیب میں سے خوب پھولا ہوا بٹوا نکالا اور ایک روپیہ شوفر کو دیا۔ اس کے بعد کار آگے بڑھ گئی۔ اور بڑے میاں فٹ پاتھ پر تنہا رہ گئے۔ اتنی سی دیر میں ان کے لباس اور وضع قطع سے استاد کی تجربہ کار نگاہوں نے بھانپ لیا کہ موٹا آسامی ہے۔ اس کے بعد سارا کام پلک جھپکتے ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد جب استاد بوری بازار کی ایک گلی میں اپنے ایک شاگرد کی جیب میں بٹوا منتقل کر کے ایلفی کی طرف مڑ گئے تو کسی کو کیا خود بڑے میاں کے فرشتوں کو بھی پتہ نہ چلا کہ کیا قیامت گزر گئی۔

قیامت کا احساس بڑا جان لیوا ہوتا ہے۔ خاص طور پر جب امید کے سارے سہارے ٹوٹ جاتے ہیں اور سامنے مکمل تباہی کا گہرا غار منہ کھولے نظر آتا ہے اور واپسی ناممکن ہو جاتی ہے۔

استاد گھنٹہ بھر بعد واپس بوری بازار پہنچا تو وہاں اسے ایک عجیب سماں نظر آیا۔ بڑے میاں اب بھی وہیں کھڑے تھے اور ان کے چاروں طرف ایک خلقت جمع تھی۔ اور وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے۔ ارے ظالمو! میرا بٹوہ واپس کر دو۔ اس میں میری بیمار بیوی کی زندگی ہے۔ میری جوان بیٹی کی آبرو ہے۔ تمہیں خدا کا واسطہ، رسول کا واسطہ، میں لٹ گیا، تباہ ہو گیا۔ خدا کے لئے میرا بٹوہ واپس کر دو ظالمو!

استاد بھی وہیں رک کر تماشہ دیکھنے لگا۔ چند لمحے وہ بھی اوروں کی طرح تفریح لیتا رہا۔ لیکن نہ جانے کیوں اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔ جوانی کسی کی دوست نہیں۔ تب ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے سامنے بڑے میاں نہ ہوں بلکہ وہ خود ہو یا اس کا باپ جسے اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ یہ یکایک یہ کیا ہو رہا تھا؟ سگریٹ کڑوا کیوں لگنے لگا تھا؟ حلق میں جیسے کوئی چیز اٹک کر رہ گئی تھی۔ بڈھا روتا جا رہا تھا اور کبھی سر پیٹتا تھا اور کبھی دوہتڑیں مارتا تھا۔ استاد نے کبھی کسی انسان کو اتنے درد میں، اتنی روحانی تکلیف میں نہ دیکھا تھا۔ آخر اس بٹوے میں تھا کیا؟ اس کی بیمار بیوی کی زندگی اور جوان بیٹی کی آبرو کیسے وہاں ملفوف تھی؟ یہ شخص تو اس شاندار بیوک میں سے اترا تھا جس کا نمبر اسے یاد تھا۔ پھر یہ صرف ایک بٹوے کی خاطر یوں بلک بلک کر کیوں رو رہا تھا؟ یہ کیا ہو رہا تھا اسے؟ مجمع میں اسے اپنا شاگرد نظر آیا تو اس نے اشارے سے اسے پاس بلایا۔ دوسرے لمحے چند ضروری ہدایتیں دیں۔ ٹیکسی لی اور سیدھا اڈے پر پہنچا۔ جہاں بٹوہ پڑا اس کی توجہ کا منتظر تھا۔

بٹوے میں سو سو کے پانچ نوٹ تھے۔ ایک خط تھا اور ایک دستاویز۔ خط سر شفاعت سینی ٹوریم سے لکھا گیا تھا اور بڑے میاں کی بیوی کا تھا۔

"— آپ نے اب تک روپئے نہیں بھیجے۔ کیا انتظام نہیں ہو سکا؟ تین دن سے بار بار تقاضا ہو رہا ہے۔ سرکاری طور پر دوا بھی نہیں ملی۔ اب حالت یہ ہے کہ فوراً انہیں ملے تو بچ نہ سکوں گی۔ قیمتی دوائیں کب تک کوئی مفت دے۔ پچیس سال کا ساتھ ہے۔ اس لئے جی بیٹھا جاتا ہے۔ کاش خدا تین بیٹیوں کی جگہ ایک بیٹا ہی دیتا تو آج یہ نوبت تو نہ آتی۔ ان بیٹیوں کا کیا کروں، خدا کے لئے کہیں سے بھی ہو انتظام کر کے فوراً پانچ سو بھیجئے۔ وہ تاریخ گزر رہی ہے۔ تین مہینے ہو چکے ہیں۔"

دستاویز پر آج ہی کی تاریخ تھی اور ضروری تفصیلات کے بعد لکھا تھا "اس شرط پر مبلغ پانچ سو روپئے دیئے جا رہے ہیں کہ پورے دس دن میں واپس کر دیئے جائیں گے۔ اس وقت تک آپ کی امانت ہمارے پاس محفوظ رہے گی۔ روپئے کی واپسی کے وقت اس دستاویز کا پیش ہونا ضروری ہے۔ ورنہ ضمانت

ضبط بھی جائے گی اور اس کے بعد ۔۔ !"

اس کے بعد استاد نے جو کچھ کیا یہ آج تک کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ تین گھنٹے کے بعد رات کے ساڑھے دس بجے اپنے اوری بازار والے شاگرد کے ساتھ تیرا اندھی اور نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھاننے کے بعد لاوکھیت پہنچا۔ جب ایک گندی، تاریک گلی میں ایک گھر کے سامنے اس کی ٹیکسی رکی تو پہلے وہ اور پھر ایک برقع پوش لڑکی اتری، جو اب بھی سسکیاں لے رہی تھی۔ استاد نے آگے بڑھ کر ایک دروازہ کھٹکھٹایا۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا اور ایک بڑے میاں باہر آئے۔ انہیں دیکھتے ہی لڑکی ابا جان ابا جان چیختی ہوئی تیزی سے آگے بڑھی اور ان سے لپٹ گئی اور دونوں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ لڑکی یہی کہکر روئے جارہی تھی کہ اس فرشتے نے میری آبرو بچالی ابا جان۔ اور بڑے میاں تو جیسے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔ روتے روتے جب انہیں ذرا ہوش آیا تو انہیں وہ بھلا مانس یاد آیا جس نے دروازہ کھٹکھٹا کر پہلے ایک بڑا لفافہ اور پھر ان کی بیٹی کو ان کے حوالے کیا تھا۔ لیکن وہ تھا کہاں؟۔ نہ وہ وہاں تھا اور نہ اس کی ٹیکسی۔ گلی سنسان پڑی تھی اور ان کے ہاتھ میں وہ بڑا لفافہ جل کا توں تھا۔ انہوں نے فوراً اندر جا کر روشنی میں لفافہ کھولا۔ اندر ان کا بٹوہ تھا، ہر چیز اپنی جگہ پر تھی۔ لیکن پانچ کی جگہ پچاس سبز نوٹ رکھے تھے۔ صرف دستاویز غائب تھی!

نئی قدریں حیدرآباد

سلطان جمیل نسیم

وہ آدمی

بیگم مجید کی نظر ایک لمحہ کے لئے اٹھی تو جم کر رہ گئی۔

ریلوے اسٹیشن پر ویٹنگ مشین کے قریب ستون کا سہارا لئے وہ کھڑا تھا۔ بکھرے بکھرے سے بال، خمار آلود آنکھیں، چہرے کے خدوخال میں ایک تیکھا پن، بھرا بھرا جسم اور دمکتا ہوا گندمی رنگ۔ بیگم مجید کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے انہوں نے اپنا سارا کنوارپن اسی نوجوان کے خواب دیکھتے ہوئے گذارا تھا۔ جیسے اب تک ان کی آنکھوں کو، ان کی روح کو، ان کے جسم کو کسی ایسی ہی ہستی کی تلاش تھی جس کو دیکھ کر یہ محسوس ہو کہ اسے کہیں دیکھا ہے۔ اور جب دماغ پر زور ڈالا جائے تو معلوم ہو کہ ارے یہ تو وہی ہے جو اکثر خوابوں کے جھروکوں سے جھانکتا رہا ہے۔ بیگم مجید نے ایک لمحہ کے لئے اس آدمی سے نظریں ہٹائیں اور مجید صاحب کی طرف دیکھا۔ جو گاڑی کے باہر کھڑے اپنا سگار سلگا رہے تھے۔ بیگم مجید نے سوچا میرے خوابوں کا مجید کتنی بوجھل اور رسیا ہے۔ یہ مجید جن کا بھاری بدن گیلے آٹے کی طرح لجلجا ہے۔ جن کا رنگ ان کے لباس کی طرح سیاہ ہے جن کے خدوخال کسی اناڑی کمہار کے بنائے ہوئے کھلونے کی طرح بے ڈھنگے اور بدوضع ہیں۔ یہ مجید۔ جن کے پاس دولت کے سوا کچھ بھی تو نہیں۔ کاش مجید کے چہرے کی تمکنت مجھ اس وقت نظر آجاتی۔ جب وہ چہرے پر سنہری نقاب ڈال کر اپنی نئے ماڈل کی شیورلیٹ میں مجھے منتخب کرنے آئے تھے۔ کاش مجھے ان کا بھاری جسم اس وقت دکھائی دے جاتا جب انہوں نے اسے شارک اسکن کے سوٹ میں لپیٹ رکھا تھا۔ جب وہ بات بات پر مسکرا رہے تھے۔ اس وقت کاش میں یہ سمجھ جاتی کہ یہ اپنی جہالت کو اس مسکراہٹ کے خول میں سمیٹ رہے ہیں۔ اوہ۔ مجید۔ تم تو اتنے جاہل نکلے کہ دل کی بات تک نہیں پڑھ سکتے۔ کاش میں نے تمہیں اسی وقت سمجھ لیا ہوتا۔ پر اب کیا ہو سکتا ہے۔ کاش یہ نوجوان میرے حصے میں آجاتا جو میرے خوابوں کا معیار ہے۔ تو۔ تب۔ میں اس کے ساتھ ہی زندگی ساری اپنی تمام زندگی گذار دیتی۔ میں اس کے میلے بنیان دھوتی۔ میں اس کی قمیض کے پھٹے کالر سیتی۔ میں اس کے تنگ سے مکان میں جہاں یہ رہتا ہوگا اپنی تمام زندگی بتا دیتی۔ میں اس کے بچوں کی ماں کہلاتی۔ ماں۔ اب شاید مجھے کوئی ماں نہ کہے۔ اب شاید میں کبھی ماں نہ بن سکوں۔ اس لئے نہیں کہ میں بانجھ ہوں۔ اس لئے بھی نہیں کہ مجھ میں کوئی خرابی ہے۔ اس لئے کہ مجید کو بچوں کی خواہش ہی نہیں۔ ان کی پہلی بیوی سے جو دو بچے ہیں۔ جو مجھ سے بھی عمر میں بڑے ہیں مجید کے لئے وہی کافی ہیں۔ مگر۔ مگر یہ نوجوان۔ اس کے ستون سے سہارا لے کر کھڑے ہونے کا انداز بھی کتنا دلفریب ہے۔ کتنا ہیرو کا انداز ہے مجھے۔

"آؤ۔ یا یہیں بیٹھی رہو گی؟" مجید صاحب کی بھرائی ہوئی آواز نے ان کے خیالات کے شیش محل کو ایک چھناکے کے ساتھ ختم کر دیا۔ بیگم مجید نے شدید توجہ کے ساتھ اپنے شوہر کو نظر بھر کے دیکھا اور پھر کہا۔

آپ ہو آئیے۔ میرے سر میں درد ہے۔ میں یہاں بیٹھی ہوں۔"
مجید صاحب نے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں اپنے کندھوں کو اچکانے کی کوشش کی پھر پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پتلون سے ذرا سا باہر نکلی ہوئی قمیص کو اندر کیا۔ موڑ میں سے اسٹارٹنگ کی نکال کر پتلون کی جیب میں ڈالی اور کہا۔

"تمہاری مرضی۔ ورنہ میرا خیال تھا پلیٹ فارم کی ٹھنڈی ہوا کھاؤ گی تو سر کا درد بھی ختم ہو جائے گا۔"

بیگم مجید نے کن انکھیوں سے اس آدمی کی طرف دیکھا وہ اسی جگہ اسی اسٹائل سے کھڑا تھا۔

"نہیں۔ میں یہاں زیادہ آرام سے رہوں گی۔ آپ ہی لے آئیے۔"

"ابھی گاڑی آنے میں تو دیر ہے۔" مجید صاحب نے کھڑکی پر کہنی ٹکا کر گردن کار کے اندر کر دی اور پھر کہا۔ جب تک گاڑی آئے میں یہیں ٹھہرتا ہوں۔ کیا خبر وہ کمبخت آئے بھی یا نہیں آئے۔" مجید صاحب نے اس دوست کے لئے کہا جس کو لینے وہ اسٹیشن آئے تھے۔

ان کی اس بات پر وہ تنک کر بولیں۔ "توبہ۔ آپ کی ان ہی باتوں سے تو جی اوبھ جاتا ہے۔ خدا کے لئے آپ جائیے۔ اگر آ جائیں تو لے آئیے گا۔ میں تھوڑی دیر سکون چاہتی ہوں۔ اگر آپ سے ہی باتیں کرنی ہوتیں تو میں پلیٹ فارم پر کیوں نہ چلی چلتی۔"

بیگم کے اس انداز پر مجید صاحب کچھ اور بوکھلا ہو گئے۔ ان کی آنکھوں میں دھندلی دھندلی روشنی عود کر آئی۔ چہرے پر مٹیالے سے رنگ کی ایک تہہ اور چڑھ گئی۔ انہوں نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"تم۔۔۔ تم۔ واقعی عجیب ہو بیگم۔"

"خدا کے لئے۔ اب جائیے بھی۔"

مجید صاحب کچھ ایسی ہنسی ہنسے جس سے ان کا سارا وجود تھلتھلا کے رہ گیا اور مزید کچھ کہے سنے بغیر پلیٹ فارم کی طرف چلے گئے۔

بیگم مجید نے چھٹکارا پانے والی ٹھنڈی سانس بھری اور اس آدمی کی طرف دیکھا۔ وہ اسی طریقے سے کھڑا تھا اور اب بیگم مجید کی طرف دیکھ رہا تھا یہ دیکھ کر کہ وہ انہیں کی طرف دیکھ رہا ہے۔ بیگم مجید زیرِ لب مسکرائیں اور سوچنے لگیں کہ کس طرح اس شخص کو بلایا جائے اور کس طرح اس سے باتیں کی جائیں۔ اور کیسے اسے آئندہ کے لئے ملاقات پر رضامند کیا جائے۔ موٹر میں بیٹھ کر اشارہ کرنا تو سخت معیوب بات ہے۔ اور ان کی پوزیشن کے بھی خلاف ہے۔ پھر کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ کس طرح اس کو اپنی طرف متوجہ کیا جائے کہ اس کو بھی یہ احساس نہ ہو کہ خود ان کی اپنی خواہش ہے۔ وہ بہت دیر تک اسی مسئلہ کو حل کرتی رہیں اور وہ آدمی ان سے کوئی سو قدم کے فاصلے پر ریلوے اسٹیشن کے ستون کا سہارا اسی طرح گم سم کھڑا رہا۔

بیگم مجید اپنی گاڑی میں بیٹھی اسے گھورتی رہیں۔ ان کا ذہن اپنے کنوارپن کے زمانے سے گذرتا ہوا مجید صاحب سے شادی کے حادثے کو عبور کرتا ہوا، انور تک آ پہنچا۔ انور، مجید صاحب کی فرم کا منیجر، جو بڑی حسرت سے انہیں تکا کرتا تھا اور جس کی حسرت بھری نظریں بیگم مجید کے جسم کو ایسا سکون اور ایسی طمانیت بخشتی تھیں جو مجید صاحب کے تین سال کے قرب سے حاصل نہ ہو سکی تھی۔ اسی لئے وہ ضرورت بے ضرورت اکثر مجید صاحب کے دفتر جاتی رہتی تھیں۔ اور ان کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ ایسی جگہ بیٹھیں جہاں سے انور انہیں دیکھ سکے۔ انور۔ ان کی زندگی کی اس راہ کا ساتھی جہاں مجید صاحب کے خیال کا سایہ بھی نہیں تھا۔ اس راہ میں ان کا پہلا ساتھی انور ہی تھا۔

بیگم مجید کی نظریں اس آدمی پر جمی ہوئی تھیں اور ذہن اس دن کی طرف بھاگ رہا تھا۔ جس دن مجید صاحب پہلی بار ان کو تنہا چھوڑ کر لاہور گئے تھے۔ اسی دن دوپہر میں انور کا ٹیلی فون آیا۔

"کوئی کام ہو تو آپ مجھے بتا دیجئے گا۔"

بیگم مجید نے بے اختیار کہا۔

"آج شام کو شاپنگ کرنی ہے۔"

اور وہ جیسے اس جملے کی روح تک پہنچ گیا۔

"بہتر ہے۔ میں پانچ بجے تک حاضر ہو جاؤں گا۔"

اور جب وہ انور کے ساتھ شاپنگ کرنے گئیں تو انہیں وہ گھبراہٹ بالکل محسوس نہیں ہوئی جو مجید صاحب کے ساتھ چلتے ہوئے ہوتی تھی۔ مجید صاحب کے ساتھ جب کبھی وہ باہر جاتیں تو انہیں یہ احساس کھائے جاتا کہ اُن سامنے سے آنے والے لوگ دیکھ کر کیا سوچتے ہوں گے۔ لوگ کچھ سوچیں یا نہ سوچیں انہیں ضرور اس خیال سے گھبراہٹ کا دورہ پڑنے لگتا۔ اسی وجہ سے وہ مجید صاحب کے ساتھ بہت کم کہیں آتی جاتی تھیں۔ لیکن انور کے ساتھ چلتے ہوئے انہوں نے محسوس کیا کہ لوگ کم از کم تعجب آمیز نظروں سے تو انہیں دیکھ رہے ہیں۔ اور جب وہ واپس ہونے لگیں تو انور نے التجا کی۔

"کیا آپ میرے ساتھ چائے پینے کی زحمت گوارا فرمائیں گی؟" اور انہوں نے بے ساختہ کہا

"آیئے۔"

جب وہ دونوں ہوٹل میں پہنچے۔ تو انور نے کہا

"عادت بری ہی۔ بہرحال عادت ہے۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو میں اپنی شام میں شغل کر لوں؟"

ان کو انور کا انداز گفتگو بہت پسند آیا۔ پیار آیا تو خود انہوں نے کہا۔

"دیکھو میرے لئے تو چائے منگاؤ اور صاحب جو کچھ چاہیں وہ ان کے لئے لاؤ۔"

جب شام نے رات کے آغوش میں منہ چھپا لیا۔ اور سرد ہواؤں کا تیکھا پن کچھ اور بڑھ گیا۔ تو وہ دونوں ہوٹل سے نکلے۔

انور نے کوٹھی تک چھوڑنے کے بعد ان سے پوچھا۔

"کل شام بھی آپ کچھ شاپنگ کریں گی؟"

"ہاں۔"

انور نے بغیر کچھ کہے ذرا آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ تھاما اور ہتھیلی پر شراب میں بھیگے ہوئے گرم گرم ہونٹ رکھ دیئے۔ اور ان کے ہونٹ تو جیسے کسی نے سی دیئے تھے۔ کچھ بھی نہ کہا گیا۔ اور جسم تو جیسے اس کے ہونٹوں کی گرمی سے پگھل گیا تھا۔ ذرا بھی تو جنبش نہ کر سکیں۔ خود انور نے ان کا ہاتھ چھوڑ کر اپنا ہاتھ ان کی کمر میں ڈالا۔ اور آہستہ سے کہا۔

"آج سردی کچھ زیادہ ہے۔"

بیگم مجید نے دیکھا کہ ہوا کے ایک آوارہ جھونکے نے اس آدمی کے بالوں کی ایک لٹ پیشانی پر گرا دی ہے جسے اس نے فوراً ہاتھ سے پیچھے کی طرف لوٹا دیا۔ گرمیوں کی پچھلی شام آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی گاڑی پلیٹ فارم پر آنے میں ابھی دس پندرہ منٹ کی دیر تھی۔ لوگ اسٹیشن پر۔ بیگم مجید کے خیالات کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ اس آدمی نے اپنی پتلون کی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ ایک سگریٹ نکال کر پیکٹ کو ٹرک کی طرف اچھال دیا۔ سگریٹ سلگانے کے بعد وہ پھر اسی طرح ستون کا سہارا لے کر ایستادہ ہو گیا۔

بیگم مجید نے سوچا۔ اب یہ شاید جانے والا ہے؟ شاید اس کو کسی کا انتظار ہے لیکن اس کو اپنی طرف کس طرح متوجہ کیا جائے؟ کس طرح۔

انہوں نے ایک نظر اپنے وینٹی بیگ کی طرف دیکھا۔ اور پھر کسی خیال کے تحت ذرا مسکرائیں اور REAR VIEW MIRROR کو اس رخ پر جما دیا کہ اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے وہ اس آدمی کو دیکھ سکیں۔ اپنا بیگ اٹھا کر وہ گاڑی سے باہر نکل آئیں۔ اس شخص کی نظریں ان ہی کی طرف تھیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم رکھتی ہوئی اس کی طرف بڑھتی رہیں۔

جوں جوں وہ اس کے قریب پہنچتی جا رہی تھیں وہ شخص انہیں اسی توجہ سے دیکھتا جا رہا تھا۔ وہ اس کے قریب پہنچ کر ایک لمحے کے لئے رکیں پھر ویٹنگ مشین کی طرف گھوم گئیں۔ اس نے بھی اپنا رخ بدل لیا تھا۔ وہ انہیں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کو اپنی طرف متوجہ پا کے بیگم مجید نے اپنا وینٹی بیگ کھولا۔ اس میں سے سو سو کے، دس دس کے اور پانچ پانچ کے کئی نوٹ نکال کر مٹھی میں دبائے۔ بیگ کو ایک جھکولا دیا۔ تو وہ بج اٹھا۔ انہوں نے بیگ میں سے ایک اکنی نکال کر باقی تمام روپے بیگ میں واپس رکھے۔ اور ویٹنگ مشین پر کھڑے ہو کر اس میں اکنی ڈال دی۔ ذرا سی کھٹ پٹ کے بعد ان کے وزن کا کارڈ باہر آ گیا۔ اس کارڈ پر وزن کے ساتھ قسمت کا حال بھی لکھا ہوا تھا۔

"آپ کا بچھڑا ہوا دوست عنقریب ملنے والا ہے مایوس نہ ہوں۔"

یہ عبارت پڑھ کر ان کا ذہن پھر پانچ سال پیچھے کی طرف پلٹ گیا جب وہ خواب دیکھا کرتی تھیں۔ اس نوجوان کا خواب جو ان سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا انہیں گھور رہا ہے۔ یہی نوجوان یہی شخص تو ان کے خوابوں کا دوست تھا یہی تو خوابوں کے ساتھ بچھڑ گیا ہے۔ اور یہی اب ملنے والا ہے۔ انہوں نے کارڈ کو مٹھی میں بھینچ لیا۔ اس آدمی کی طرف دیکھا وہ انہیں نگاہوں سے جن میں حیرت، اعتراف اور ایک قسم کی بھوک چھپی ہوتی ہے بیگم مجید کو تکے جا رہا تھا اس آدمی کی آنکھوں سے جو روشنی پھوٹ رہی تھی اسے دیکھ کر بیگم مجید کو اپنی کامیابی کا مکمل یقین ہو گیا تھا۔ گاڑی نکلنے ہی والی تھی۔ اسٹیشن پر چند فالتو سے لوگ باقی رہ گئے تھے۔ ورنہ سب پلیٹ فارم پر جا چکے تھے۔ وہ اپنی گاڑی کی طرف بہت دھیرے دھیرے بڑھنے لگیں۔ اور جب وہ گاڑی میں بیٹھ رہی تھیں تو دانستہ اپنا وینٹی بیگ سڑک پر گرا دیا۔ وہ اس نوجوان سے بالکل اس طریقے سے ملنا چاہتی تھیں جس طرح کسی کہانی میں ہیروئن ہیرو سے ملتی ہے۔ انہوں نے اپنی نئے ماڈل کی شیورلیٹ سے اترنے سے پہلے ہی یہ سوچ لیا تھا کہ واپسی میں وہ اپنا وینٹی بیگ گرا دیں گی اور کیونکہ اس شخص کی نگاہیں یقیناً پیچھا کر رہی ہوں گی۔ اس لئے وہ بیگ کو گرتے ہوئے دیکھ لے گا۔ اور وہ لپک کر آئے گا اور کہے گا۔

"مس آپ کا پرس۔"

اور وہ گھبراہٹ کی ایکٹنگ کرنے کے ساتھ ساتھ اس نوجوان سے کہیں گی۔

OH THANK YOU VERY MUCH

پھر وہ کہے گا۔ شکریہ کس بات کا محترمہ یہ تو میرا فرض تھا۔ انسانیت کا تقاضہ تھا۔

اور وہ کہیں گی۔

"اگر آپ نہیں دیکھتے تو نو سو کچھ تر روپے ضائع ہو جاتے۔ میں آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔"

"وہ کہے گا۔"

"ارے صاحب کیوں شرمندہ کرتی ہیں آپ۔ اور وہ فوراً اسی وینٹی بیگ میں سے اپنا وزٹنگ کارڈ نکال کر اس کو دیں گی۔ اور رازدارانہ لہجہ میں کہیں گی۔

یہ میرا پتہ ہے۔ براہ کرم کل شام آپ ضرور تشریف لائیے۔ میں آپ کا انتظار کروں گی۔ وہ وزٹنگ کارڈ کو لے کر پتہ پڑھے گا۔ اور کچھ کہنا چاہے گا تو وہ فوراً روک دیں گی۔

"دیکھئے انکار نہ کیجئے ورنہ میرا دل ٹوٹ جائے گا۔"

اور وہ مسکرا کر کندھا جھٹک کر کہے گا۔

"سر تسلیم خم ہے۔"

یہ تمام باتیں سوچنے کے بعد وہ گاڑی سے اتر کے وینڈنگ مشین تک گئی تھیں گاڑی میں بیٹھتے وقت جان بوجھ کر پرس گرا دیا تھا۔ اور اب ان کی نگاہیں آئینہ پر لگی تھیں۔ وہ نوجوان شرمندہ شرمندہ سی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے کے بعد اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ گھبرا رہا ہے کہ پرس اٹھا کر دے یا نہیں۔ اب وہ ستون کا سہارا چھوڑ کر سیدھا کھڑا ہو گیا اس نے پرس اٹھا کر مجھے دینے کا ارادہ کر لیا۔ اس نے سگریٹ کو فرش پر ڈال کر پیر سے دبا۔ اب اس نے پھر چاروں طرف دیکھا۔ اناڑی معلوم ہوتا ہے۔ غالباً کسی عورت سے زندگی میں پہلی بار گفتگو کرنے کے لئے اپنے اندر حوصلہ کی تعمیر کر رہا ہے۔ اب دونوں ہاتھوں سے اپنے بالوں کو اس نے پیچھے کی طرف سنوارا۔ اور ان کی طرف پہلا قدم اٹھایا۔ اب وہ شرماتا چلا آ رہا ہے۔ اور بیگم مجید بظاہر بے نیاز بنی تھیں۔

BACK VEW MIRROR

میں نظر رکھے اس کی ہر حرکت سے لطف اندوز ہو رہی ہیں۔ اب وہ گاڑی سے صرف چار چھ قدم کے فاصلے پر ٹھٹھک کر رہ گیا۔ وہ یقیناً سوچ رہا ہو گا کہ چند لمحوں بعد میری کتنی حسین عورت سے گفتگو ہونے والی ہے۔

وہ ایک دم بھاگا۔

اور وہ گاڑی کے قریب آتے ہی ذرا سا جھکا۔

بیگم مجید نے گھبرا کر آئینہ سے نگاہیں ہٹا کر سامنے ونڈ اسکرین میں دیکھا۔

وہ نوجوان ان کا بیگ بغل میں دبائے سرپٹ بھاگا چلا جا رہا ہے۔

[illegible]یب سہالوی

آج کل - دہلی

صرف ۲۰ آنے کا سوال ہے

اتوار کا دن تھا۔ گھڑی نے ٹھیک بارہ بجائے تھے۔ میں کھانا کھا کر لیٹا اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں لیٹ کر اخبار یا کتاب پڑھنے کے لیے نہیں بلکہ نیند بلانے کے لیے پڑھتا ہوں۔ اس لیے کہ نیند کو شاید ضد ہے کہ وہ بس پڑھتے ہی وقت آتی ہے۔ ورنہ غالب صاحب کی طرح ہمیں بھی ہمیشہ یہی شکایت رہی کہ "نیند کیوں رات بھر نہیں آتی"۔

ابھی میں "نیند آتی ہے پر نہیں آتی" والی منزل سے گزر رہا تھا۔ بار بار ہاتھ سے اخبار گر جاتا اور آنکھ کھل جاتی۔ اور میں پھر وہی خبر پڑھنے لگتا، جو میں نے بہت پہلے شروع کی تھی۔ اور کئی بار پڑھنے کے باوجود نیند کی وجہ سے کچھ پلے نہ پڑا تھا۔

خبر غالباً یہ تھی کہ حکومت گداگری بند کرنے کے معاملہ پر سنجیدگی سے غور کر رہی ہے۔ ماہرین کی ایک کمیٹی مقرر کر دی گئی ہے۔ یہ کمیٹی سب سے پہلے تو اس مسئلہ پر غور کرے گی کہ ہندوستان میں گداگری کے وجوہ کیا ہیں۔ کیونکہ یہاں گداگری صرف معاشی بدحالی اور جسمانی معذوری ہی کی بنا پر نہیں کی جاتی ہے۔ بلکہ اپنی اس قیمتی وراثت کو محفوظ رکھنے کے لیے کی جاتی ہے۔ جو بزرگوں سے ترکہ میں ملی ہے۔ دوسری بات جس پر کمیٹی کو غور کرنا ہے وہ یہ ہے کہ ایسی صورت میں جب کہ سالہا سال کی ریاضت کے بعد کلاکار گداگروں نے اسے پیشہ کی سطح سے بلند کر کے ایک آرٹ میں تبدیل کر دیا ہے۔ اسے ختم کرنا مناسب ہوگا یا نہیں۔ اور اس کا ملک کے فن کاروں پر کیا ردّ عمل ہوگا۔

ابھی میں یہ خبر ختم بھی نہ کر پایا تھا کہ نیچے گلی سے صدا آئی کہ "دنیا کے مالک کے نام پر صرف ۲۰ آنے کا سوال ہے جو دے اُس کا بھی بھلا جو نہ دے اُس کا بھی بھلا"۔ اس صدا میں بلا کی بے نیازی، خود اعتمادی اور بھولاپن پایا جاتا تھا۔ جس نے میری نیند کافور کر دی۔ اور میں سائیں بابا کی زیارت کے لیے چارپائی سے اُٹھ کر چھجے سے جھانکنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ وہ دھوپ میں سڑک کے کنارے آنکھیں بند کیے منہ آسمان کی طرف اُٹھائے کھڑے ہیں۔ ان کے سامنے ایک بورا کچھ خالی اور کچھ بھرا رکھا ہے اور ایک چھوٹا تھیلا پیروں کے پاس پڑا ہے۔ اور وہ سانس لیے یہ صدا لگا رہے "دنیا کے مالک کے نام پر صرف بیس آنے کا سوال ہے جو دے اُس کا بھی بھلا جو نہ دے اُس کا۔۔۔!

سائیں بابا کا حلیہ ہمارے دیس کی زنگارنگ تہذیب کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھا جس میں ہر فرقے کی جھلک پائی جاتی تھی۔ ننگے پاؤں، اونچے سفید تہبند اس پر بش شرٹ، لیکن کثرتِ استعمال سے دونوں کا رنگ مٹیالا ہو گیا تھا۔ سر پر بڑے بڑے بال جو چٹے اور زلف کی درمیانی منزل سے گزر رہے تھے۔ اور چکٹ جانے کی وجہ سے اُن میں گھنگھریالے ہونے کا رجحان پیدا ہو گیا تھا۔ ڈاڑھی ایک مشت دو انگل سے زائد ہو کر شرعی حدود سے نکل کر رندگی کی حدود میں پہنچ گئی تھی۔ قد لانبا، جسم چھریرا، چہرہ طباقی، رنگ سفید اور دل کا حال خدا کو معلوم۔ یہ تھا سائیں بابا کا حلیہ جو غالباً فقیروں کا

بھیس بدل کر تماشائے اہلِ کرم دیکھنے کے لیے ہماری گلی میں صدا لگا رہے تھے۔

ہماری گلی اپنی رنگارنگ آبادی کی وجہ سے گلی نہیں گلدستہ ہے جس میں ہر قسم کے پھول لگے ہیں۔ لیکن افلاس اور جہالت [illegible] سے میلے اور مرجھائے ہوئے ہیں۔ ایک لائن میں مزدور، ترکاری والے، موچی، بڑھئی، پنساری اور سیدو والے، دوسری لائن میں مہتر، دھوبی، [illegible] اور دودھ والے رہتے ہیں۔ کوٹھوں پر دفتر کے بابو، اسکول کے ٹیچر، پرانے مولوی، نئے وکیل، مریض کے کام میں سو کھے حکیم۔ اور شہر کے اندر [illegible] چھوٹے اخبار نویس رہتے ہیں۔ ہماری گلی کا سب سے دلچسپ مشغلہ لڑائی ہے۔ جس کا زور دن میں بارہ اور دو کے درمیان اور رات میں دس سے بارہ کے بیچ میں ہوتا ہے۔ جب مہتر تاڑی خانہ سے لڑکھڑاتے۔ اور کاروباری کام کے بوجھ سے چور گھر واپس ہوتے ہیں۔ اور اپنا سلسلۂ تکان اپنی گھروالی کی پتلی گردن پر اتارتے ہیں۔ ہماری گلی کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کبھی چوری نہیں ہوتی۔ اور جب کبھی کسی ناتجربہ کار چور نے ایسی گستاخی کی جرأت کی تو ڈھونڈنے سے پہلے گرفتار ہو گیا۔ بات یہ ہے گلی تنگ، گنجان آبادی جس میں سے آدمی سے زائد آبادی سڑک کے کنارے سوتی کم اور لڑتی زیادہ رہتی ہے۔ اس لیے چور بھاگ کے جائے تو کیسے اور چوری کرے تو کیونکر۔

لیکن اس گلی میں رات کے چوروں کے بجائے دن کے سینہ زوروں کا بڑا زور رہتا ہے۔ اور کوئی ایسا ہی منحوس دن ہوگا جس دن کوئی پہنچے ہوئے فقیر اپنی کرامات دکھا کر یہاں کی بھوکی ننگی آبادی سے اپنا ٹیکس نہ وصول کرتے جاتے ہوں۔ ابھی چند ہفتے ہوئے ایک پہنچے ہوئے ملنگ "بھوکا ہوں اور ننگا ہوں کچھ رحم کرو کنجوسو"! کی دھمکی دے کر اپنا خرچ کپڑے اور جنس کی شکل میں وصول کر لے جا چکے ہیں۔ اور آج یہ ملنگ خاص نقدی کا سوال کر رہے ہیں۔ دیکھیے ان کی جھولی کس طرح بھرتی ہے۔

سائیں بابا یوں ہی صدا لگاتے رہے۔ گلی سے گزرنے والے لوگ اُن کی طرف دیکھتے، کچھ دیر ٹھہرتے اور پھر مسکراتے چلے جاتے۔ محلے کے کچھ لڑکے فوراً ان کے پاس جمع ہو گئے تھے۔ لیکن سائیں بابا کے چلیے، پاٹ دار آواز اور انوکھی صدا سے وہ کچھ سہمے ہوئے تھے۔ اور سائیں بابا کے ساتھ انھیں کسی شرارت کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ اور سائیں بابا کو ایک گھنٹے سے دھوپ میں برابر صدا لگاتے دیکھ کر ان کے دل میں ہمدردی اور خوف کے ملے جلے جذبات پیدا ہو رہے تھے۔ کوٹھوں پر سے لڑکیاں سائیں بابا کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔ اور بوڑھیاں انھیں ڈانٹ رہی تھیں۔

سائیں بابا ایک گھنٹے کی لگاتار ریاضت سے کچھ تھک سے گئے تھے۔ اس لیے انھوں نے دنیا کے مالک کے نام پر صرف پیسے کا سوال ہے کے ساتھ کچھ تقریروں اور اشعار کا سلسلہ شروع کر دیا تاکہ دم لے سکیں۔ تقریر میں ربط کم اور جذب زیادہ تھا۔ اور یہی حال اشعار کا تھا۔ ایک مصرعہ ایک شعر کا اور دوسرا مصرعہ دوسرے شعر کا۔ لیکن دیوانہ بکارِ خویش ہشیار، کے مطابق مطلب کے لحاظ سے سب باموقع اور بامعنی تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ انھوں نے سر کو خاص طرح سے جنبش دے کر کہنا شروع کیا۔

'یہ دنیا آنی جانی ہے' یہ دنیا رام کہانی ہے

اور اسی کے ساتھ اُنھوں نے یہ بھی جوڑ دیا کہ

آج وہ، کل ہماری باری ہے

اس کے بعد انھوں نے تقریر شروع کی اور کہنے لگے "دھن ہاتھ کا میل ہے۔ میل چھڑانا پاپ نہیں پن ہے"! اور اسی کے ساتھ انھوں نے جوڑ دیا۔ "رام رحیم ایکئے نام، دان دے وہی بھگوان"! اس کے بعد انھوں نے لوگوں کو مخاطب کر کے بڑے جوش سے سوال کیا۔ "اللہ میاں کیا ہے اور کہاں ہے؟ آنکھ بند کر۔ دل میں ڈھونڈ۔ جو ڈھونڈے گا وہ پائے گا"!

اس کے بعد انھوں نے پھر وہی صدا لگانی شروع کی۔ لیکن تھوڑی ترمیم کے ساتھ۔ یعنی سوال کو چندہ میں تبدیل کر دیا۔ اور اب اس کی شکل یہ ہو گئی :-

دنیا کے مالک کے نام پر صرف جیس آنے کا چندہ،
ایک ایک آنہ کر کے

انھوں نے یہ تبدیلی غالباً آبادی کی معاشی حالت کا اندازہ کرنے کے بعد ضروری خیال کی۔ اور اب انھوں نے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے ساتھ ترمیم شدہ صدا لگانی شروع کر دی۔ اس ترمیم کا خاطر خواہ اثر پڑا۔ اور کوٹھریوں کی چوکھٹ پر بیٹھی عورتیں جو سائیں بابا کی ریاضت سے کافی متاثر ہو چکی تھیں۔ لیکن بیس آنے کی بھاری رقم عقیدت کی راہ میں روڑا بنی ہوئی تھی۔ اس کے ہٹ جانے سے اب وہ چوکھٹ سے اُتر کر سڑک پہ آگئی تھیں۔ اور آپس میں کھسر پھسر شروع ہو گئی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ سائیں بابا کے لہجے میں اور زیادہ جلال پیدا ہونے لگا۔ اور انھوں نے کہنا شروع کیا۔ سمجھتا ہوگی یا میلا دسب چندہ دینے کو تیار ہو جائیں گے۔ لیکن دنیا کے مالک کے چاہنے والے کی کتھا سننے والا کوئی نہیں۔ پھر وہ اس طرح بڑبڑانے لگا۔

"دھن وان کیا دے گا، اس کا دل تھوڑا ہوتا ہے۔"
"غریب دے گا جس کی پونجی تھوڑی اور دل بڑا ہوتا ہے۔"

اس کے بعد پھر انھوں نے صدا لگانی شروع کی۔ "دنیا کے مالک کے نام پر صرف بیس آنے کا چندہ" تھوڑی دیر کے بعد دم لینے کے لیے انھوں نے پھر تقریر شروع کی۔ اور کہنے لگے۔ میں کسی سے بھیک نہیں مانگتا۔ میں جو کچھ مانگتا ہوں اپنے بھگوان اور اللہ سے مانگتا ہوں۔ جس کے دل میں جس کے ہردے میں بھگوان اور اللہ بسا ہوگا۔ وہ دے گا۔ اور جس کے دل میں راون اور شیطان گھسا ہوگا وہ کیا دے گا؟ اس کے بعد انھوں نے پھر گانا شروع کیا۔

یہ دنیا آنی جانی ہے، یہ دنیا رام کہانی ہے۔
اور گلی کے موڑ کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
آج وہ کل ہماری باری ہے۔

اور اسی وقت اُسی طرف سے ایک لڑکا ہائے نانی چیختا ہوا بھاگا۔ اور عورتوں نے جو مڑ کر دیکھا۔ تو ایک بڑھیا زمین پر پڑی ہے۔ اس کے بعد سائیں بابا نے کڑک دار آواز میں کہا۔ جس کو دینا ہو دے ورنہ
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا۔

اور اسی کے ساتھ وہ سامنے پڑے ہوئے لوٹے کو اٹھانے کے لیے جھکے۔ اب عورتوں میں ضبط کا یارا نہ رہا۔ کوئی دوپٹے کے پلو سے پیسے کھولنے لگی۔ کوئی جیب ٹٹول کر اکنی نکالنے لگی۔ اور کوئی پٹاری اُلٹ پلٹ کر کے کچھ ریزگاری تلاش کرنے لگی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے سائیں بابا کے سامنے اکنیوں اور پیسوں کا ڈھیر لگ گیا۔ دو ایک کوٹھے پر سے نیچے ہاتھوں میں ایک روپے کا نوٹ اور چار آنے دبائے سائیں بابا کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

سائیں بابا نے اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے اپنی دو گھنٹے کی سخت ریاضت کی گاڑھی کمائی بٹور کر جھولے میں بھری۔ اور جو دے اُس کا بھی بھلا اور جو نہ دے اُس کا بھی بھلا۔ کہتے ہوئے غائب ہو گئے۔ ساتھ ہی گلی کے موڑ پہ پڑی بڑھیا بھی کھنکار کر کروٹیں بدلنے لگی، اور تھوڑی دیر میں پیچھے لڑکے کے کاندھے پہ ہاتھ رکھے چلی گئی۔

دو گھنٹے سے سائیں بابا کی بک بک سنتے سر میں درد سا ہونے لگا تھا۔ اب جو ذرا سکون ہوا تو میری آنکھ لگ گئی۔

ابرار محسن
سہرسا۔ بہار

ابوالہول کے آنسو

افریقہ کے شمال میں بسا ہوا ہزاروں برس پرانا دیس مصر زمانۂ قدیم میں تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب افریقہ کے اس عجیب و غریب ملک پر وہ بڑے دبدبے اور آن بان والے فرعون حکمران تھے۔ جن کے قدموں سے سرزمین مصر تھرتھراتی تھی۔ اور دریائے نیل کا پانی سہما سہما سا اُن کے محلات کے نزدیک سے دھیرے دھیرے بہا کرتا تھا۔ ان فرعونوں کی آہنی گرفت میں مصری شہریوں کی زندگی کے علاوہ اُن ان گنت غلاموں کی تقدیریں بھی تھیں۔ جو ساری زندگی فرعونوں کی بربریت کا بار اپنے کندھوں پر اُٹھائے پھرتے تھے۔ اور اُن کی موت کے بعد بھی غلامی کی آہنی زنجیروں سے آزاد نہ ہو سکتے تھے۔ اس زمانہ کا یہ دستور تھا کہ جب بھی کوئی فرعون مرتا اُس کی لاش کو عجیب قسم کے مصالحے لگا کر بے شمار ساز و سامان اور بہت سے غلاموں کے ساتھ ایک کمرہ نما قبر میں دفن کر دیا جاتا تھا۔ تاکہ جب فرعون دوسری دنیا میں ایک بار پھر حکمران کی حیثیت سے زندہ ہو تو اُسے کسی چیز کی تکلیف نہ ہو اور ضرورت کی ہر چیز موجود ہو۔

فرعون کی لاش کو دفنانے کے لیے ہزاروں غلام کسی دیو قامت چٹان کو بہت دُور سے لوہے کی مضبوط زنجیروں سے گھسیٹ کر لاتے اور بڑی محنت سے اُس کو تکونی شکل میں تراش کر فرعون کی قبر پر رکھ دیتے تھے۔ یہی تکونی چٹانیں دراصل اہرام کہلاتی ہیں، جو جابجا مصر کے ریگستان میں اُبھری ہوئی کھڑی ان فرعونوں کی سنگدلی اور مظالم کی یاد دلاتی ہیں، جن کے جسم ان کے نیچے بڑے بڑے کمروں کے اندر محفوظ ہیں۔

ان ہی تکونی چٹانوں کے درمیان پتھر کی ایک حیرت انگیز چٹان ہے۔ اس چٹان کو نہ جانے کیوں شیر کے جسم کی شکل میں تراشا گیا ہے اور چہرہ کسی آدمی کا ہے۔ اسے ابوالہول کہتے ہیں۔ ابوالہول ہزاروں برس سے قاہرہ کی پُرشور زندگی سے دُور ویرانے میں نہ جانے کن خیالوں میں کھویا ہوا ہے۔ کہتے ہیں زمانۂ قدیم میں یہ لوگوں کو آنے والے دنوں کے حال بتایا کرتا تھا۔ ابوالہول نے اپنی پتھر کی آنکھوں سے ہزاروں انقلابات دیکھے ہیں۔ ان گنت سلطنتوں کو خاک میں ملتے دیکھا ہے۔ اس نے ان فرعونوں کو بھی تاراج ہوتے دیکھا ہے جو خدائی کا دعویٰ کیا کرتے اور اپنے کو لافانی سمجھتے تھے۔

ابوالہول نے اپنی ان پتھر کی آنکھوں سے اُس فرعون کو بھی مٹی میں ملتے دیکھ لیا جس نے ابوالہول کو بنوایا تھا۔ ابتدائے آفرینش سے ہی انسان کی یہ خواہش رہی ہے کہ اس کے مرنے کے بعد بھی لوگ اُسے یاد رکھیں۔ اپنے نام کو زندہ رکھنے کی خواہش امیر غریب چھوٹے بڑے غرض کہ ہر انسان کے دل میں چھپی رہتی ہے۔ کچھ لوگ جو کسی فن کے مالک ہوتے ہیں اپنے بعد اپنے فن کی کوئی ایسی یادگار چھوڑ جاتے ہیں، جو ہر زمانے میں لوگوں کو اُن کی یاد دلاتی ہے، اور اس طرح وہ امر ہو جاتے ہیں۔ مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے پاس کوئی فن تو نہیں ہوتا

...ہوتی ہے۔ خواہ وہ دولت ہی کی وجہ سے کیوں نہ ہو۔ ایسے لوگ اپنی طاقت کے بل پر ایسی ایسی لرزہ انگیز اور خونریز داستانوں کی ... کہ صدیوں تک ان کے خوف سے زمین تھرّاتی رہتی ہے۔ اور سینکڑوں ہزاروں برس تک لوگ ان کی درندگی اور بربریت کے قصّے دہراتے رہتے ہیں۔ تقریباً پانچ ہزار برس پہلے فرعونِ وقت خافرا پر بھی یہی جنون سوار ہوا کہ اُس کا نام بھی تاقیامت دنیا میں باقی رہے اور لوگ اس کی عظمت اور طاقت کو کبھی نہ بھولیں۔ چنانچہ اُس نے اپنے غلاموں کو حکم دیا کہ وہ ایک بہت بڑی پتھر کی چٹان کو اس طرح تراشیں کہ وہ ایک بہت بڑا مجسمہ بن جائے۔ جس کا جسم تو شیر کی مانند ہو اور سر اور چہرہ ہو بہو خود اسی کا سا ہو۔۔۔ اور اُس دن سے آج تک وہ عجیب وغریب تراشی ہوئی چٹان ریگستان میں اہراموں کے بیچ کھڑی خافرا کی عظمت کی داستانیں ساری دنیا کو سنا رہی ہے۔

ابوالہول ابھی تک وہ دن نہیں بھولا جب مصر کا شہزادہ تھوٹ موز شکار کھیلتے کھیلتے اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر اُس کے پاس آنکلا تھا۔ ایک لمحہ ابوالہول پر نظر ڈال کر وہ اُس کے سائے میں سستانے لیٹ گیا۔ تھکا ہوا بہت تھا اس لیے جلد ہی نیند نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

اور خواب دیکھا ابوالہول اُس سے مخاطب ہے:۔

"اے تھوٹ موز! ذرا دیکھ تو میری کیا حالت ہوگئی ہے۔ ریت نے میرے آدھے جسم کو ڈھک لیا ہے۔ اگر تو یہ ریت ہٹا دے تو میں تجھے مصر کا بادشاہ بنا دوں گا۔"

تھوٹ موز نیند سے چونک پڑا۔

"کیا یہ خواب سچ ہے؟" وہ سوچ رہا تھا۔ "مگر یہ کس طرح ممکن ہے کہ بڑے بھائیوں کی موجودگی میں مصر کا تخت وتاج مل جائے؟" پھر بھی آزمانے میں کیا حرج ہے۔ ہوسکتا ہے خواب سچ ہی ثابت ہو۔" تھوٹ موز وہاں سے چل دیا۔ اور اگلے دن ہی سیکڑوں غلام اس کے حکم سے ریت ہٹانے لگے۔

ابوالہول نے بھی اپنا وعدہ پورا کیا۔ رفتہ رفتہ تھوٹ موز کے بڑے بھائی بیمار پڑ کر مرنے لگے۔ تھوٹ موز تنہا تخت وتاج کا حقدار رہ گیا۔ اور ایک دن مصر کا تاج اُس کے سر کی زینت بنا۔ تھوٹ موز نے یہ تمام داستان پتھر کی ایک تختی پر کھدوا کر اُس کو ابوالہول کی اگلی ٹانگوں کے بیچ میں لگوا دیا۔ یہ تختی آج تک موجود ہے۔

آؤ، ذرا ابوالہول کے قریب آؤ۔ اس سے پوچھیں کہ تو نے اپنی ہزاروں سال کی زندگی میں کیا کیا دیکھا ہے؟ تیری آنکھوں کا دیکھا ہوا سب سے زیادہ دردناک واقعہ کون سا ہے۔ اور قریب آؤ۔ ابوالہول کی پتھر کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھیں۔ شاید کچھ نظر آجائے۔ مگر پتھر کی آنکھوں میں جھانکنا تو دیوانگی ہے۔ بھلا اُن میں کیا نظر آسکتا ہے۔

نہیں نہیں، انھیں پتھر کی آنکھیں نہ کہو۔ کبھی ان ہی بے نور آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے بھی ٹپکے تھے۔ دنیا والوں کے لیے ابوالہول کا جسم پتھر کا سہی، اُس کی آنکھیں پتھر کی سہی۔ مگر ہزاروں برس پہلے کے واقعات ابوالہول کی نگاہوں کے سامنے اس طرح متحرک اور تازہ ہیں جیسے کل ہی کی باتیں ہوں۔ اُسے وہ دن بھی اچھی طرح یاد ہے جب سورج دُور ریت کے سمندر میں آہستہ آہستہ ڈوب رہا تھا۔ کچھ ریت کے سائے غائب ہونے لگے تھے۔ اور مصر کے فرعون کی اکلوتی بیٹی فرعونہ اس سے مخاطب تھی۔

"ابوالہول! سنا ہے، تم لوگوں کو آنے والے دنوں کا حال بتایا کرتے ہو۔ بولو، کیا یہ سچ ہے؟ اگر یہ حقیقت ہے تو آج فرعون کی وہ اکلوتی بیٹی فرعونہ جس نے آج تک کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا، جس کے پاس لاکھوں زیورات ہیں۔ جس کے لبوں کی ایک حرکت پر فرعون دنیا کی قیمتی سے قیمتی چیز اُس کے قدموں پر ڈال دیتا ہے۔ وہی فرعونہ آج دونوں ہاتھ پھیلائے تم سے کچھ مانگ رہی ہے۔"

"بولو، کیا تم اس کی التجا سنو گے۔۔۔؟ اسے صرف یہ بتا دو کہ کیا ہاشم اُس کا ہوسکے گا؟ اس کی اور ہاشم کی محبت کی راہ میں کوئی رکاوٹ تو نہ ہوگی؟"

"ابوالہول! تم تو جانتے ہو کہ ہاشم ایک غلام ہے۔ فرعون کے لاتعداد غلاموں میں سے ایک! فرعون کی بیٹی کی ایک ادنیٰ غلام سے محبت ایک عجیب

سی بات ضرور ہے۔ ہزاروں برس کے فرعونی اصولوں کے خلاف ایک بغاوت ضرور ہے۔ لیکن یہ کس قدر دلکش، کس قدر پرلطف! لیکن کیا یہ دلکشی پائدار ہے۔ کیا یہ لطف دیرپا ہے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ فرعونیت کا میری نازک محبت سے تصادم ہو جائے۔ اور میری تمناؤں کے بلوریں محل چکنا چور ہو کر بکھر جائیں۔

"آؤ تمہیں آج سناؤں کہ میری محبت کا آغاز کیسے ہوا۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ نیل کے کنارے فرعون دنیا کا سب سے زیادہ حسین اور مضبوط محل تعمیر کرا رہا ہے۔ ابھی کچھ ہی دن ہوئے چلچلاتی دھوپ میں حبشی نگراں ایک بوڑھے غلام پر کوڑے برسا رہا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ حبشی نگراں نے بوڑھے غلام سے ایک پتھر اٹھانے کو کہا۔ غریب ضعیفی کی وجہ سے پتھر کا بوجھ سنبھال نہ سکا اور زمین پر گر پڑا۔ نگراں اپنا کوڑا لے کر اُس پر پل پڑا۔ دوسرے غلام اپنے ساتھی کو اس بُری طرح پٹتے دیکھ کر سہم گئے۔ اور جلدی جلدی پتھر ڈھونے لگے۔ وہ اس ظلم کے خلاف احتجاج بھی نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ ان کے لبوں پر فرعونیت کے تالے لگے ہوئے تھے۔ بوڑھے غلام پر کوڑوں کا مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ اچانک بوڑھے کے منہ سے بھیانک چیخ نکلی۔ اور وہ مردہ ہو گیا۔ اُس کی چیخ سُن کر دوسرے غلام ایک لمحہ کے لیے کام کرتے کرتے رک گئے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے حبشی نگراں نے اپنا کوڑا اُن کی طرف لہرایا۔ اور وہ فوراً بے جان مشینوں کی طرح کام میں لگ گئے:

"ارے یہ کیا! میں حیران رہ گئی۔ ایک قوی ہیکل خوبرو غلام ہاتھوں میں بڑا سا پتھر لیے نگراں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ اور طیش سے سارا بدن لرز رہا تھا۔ ادھر حبشی نگراں بھی دم بخود کھڑا اس غلام کی جرأت پر تعجب کر رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوڑا سنبھالتا غلام نے پتھر اُس کے سر پر دے مارا۔ وہ ریت پر ایڑیاں رگڑنے لگا۔ چند ہی لمحوں میں اُس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ حبشی نگراں کا یہ انجام دیکھ کر سارے غلام کام چھوڑ کر اُس کی لاش کے گرد جمع ہو گئے۔ وہ عجیب سی نظروں سے اس غلام کو دیکھ رہے تھے۔ جو ایک فاتح کی طرح فخر سے گردن اونچی کیے نیل کی لہروں کو دیکھ رہا تھا۔ سب غلاموں کو یقین تھا کہ فرعون کے آہنی ہاتھ اُس کی ہڈیاں توڑ پھوڑ کر رکھ دیں گے۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے نگراں کی لاش سے ایک پتھر باندھ کر اس کو نیل کے سپرد کر دیا۔

میں محل کے ایک جھروکے سے یہ سارا تماشا دیکھ رہی تھی۔ چاہتی تو فرعون سے سب کچھ کہہ دیتی۔ لیکن غلام کی دلیری نے میرے دل پر گہرا اثر کیا۔ نہ جانے کیوں مجھے نگراں کی موت سے بڑی مسرت ہوئی۔ وہ غلام مجھے کسی دور دیس کا شہزادہ معلوم ہونے لگا۔ اور اُس نے فرعونہ کو جیت لیا۔ میں اُسے دیر تک دیکھتی رہی۔ اس حسین جوان کی تصویر میرے دل میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئی۔

"اور پھر میں نے اپنی ایک معتمد کنیز کے ذریعہ اس غلام سے کہلوا دیا کہ وہ آج شب کو نیل کے کنارے مجھ سے ملے۔ کنیز نے مجھے آکر بتایا کہ اس کا نام ہاشم ہے اور وہ میرا پیغام سن کر سکتے میں آ گیا ہے۔"

"اس رات میں نیل کی ٹھنڈی اور نرم ریت پر جا بیٹھی۔ آسمان پر دور، بہت دور چودھویں کا چاند اُبھر آیا تھا۔ اور فرعون اور غلاموں پر یکساں بلا کسی امتیاز کے ضو فشانی کر رہا تھا۔ نیل کا پانی دھیرے دھیرے کناروں میں سمٹا سمٹایا بہہ رہا تھا۔ کبھی کبھی ہوا کا کوئی شریر جھونکا دریا کی ہموار سطح پر ایک چھوٹی سی لہر کو ابھار دیتا۔ ہر طرف رات کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں شب کے اس طلسمی ماحول میں گم ہو گئی۔"

"کیا آپ نے مجھے بلایا ہے؟"

"اس آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ ہاشم ہی تھا۔ اُس کے اُلجھے ہوئے بال کشادہ پیشانی پر لہرا رہے تھے۔ چاندنی نے اُس کے چہرے کو ایک عجیب قسم کا نور بخش دیا تھا۔ میں دیر تک اُس کے چہرے پر نظریں جمائے دیکھتی رہی۔ ہاشم بالکل پریوں کا شہزادہ لگ رہا تھا۔

"آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے؟"

"اُس نے پھر سوال کیا۔ اور میں پریوں کے دیس سے لوٹ آئی۔ میری پیشانی پر پسینے کی بوندیں اُبھر آئیں۔ الفاظ حلق میں اٹکنے لگے۔

[illegible] بول ہی اُٹھی۔

"ہاں، میں نے ہی تمھیں بلایا ہے" ہاشم نے۔ ہاشم فرعونہ نے تمھیں بلایا ہے۔"
"ہاشم گھبرایا ہوا تھا۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں اُس کی آج کی حرکت اُس نے دیکھ نہ لی ہو۔"
"گھبراؤ نہیں ہاشم۔ میں فرعونہ ضرور ہوں۔ لیکن میں دقت نہیں۔ فرعونہ کو بھول جاؤ۔ اور مجھے ایک معمولی لڑکی سمجھو۔" میں نے ہاشم سے کہا۔
"ہاشم! تم یقین تو نہ کرو گے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ آج فرعون کی بیٹی تم سے ایک بھیک مانگ رہی ہے۔ بولو کیا تم اس کی خواہش پوری کرو گے؟"
"ہاشم اور بھی زیادہ گھبرا گیا۔ اُس کے اور میرے درمیان ہزاروں برس سے کھڑی ہوئی حاکم و محکوم، ظالم اور مظلوم کی دیوار کو مسمار کرنا آسان کام تو نہ تھا۔"
"بولو ہاشم! مجھے بھیک دو گے؟" میں نے پھر اُس سے دریافت کیا۔
"ہاشم نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن غلامی نے اُس کی زبان پکڑ لی۔ اور صرف ہونٹ ہل کر رہ گئے۔"
"ہاشم مجھے محبت کی بھیک دو۔ ہاشم مجھ سے محبت کر لو۔" میں گڑگڑائی۔
"ہاشم اپنی گھبراہٹ پر قابو پا چکا تھا۔ ظالم اور مظلوم کی دیوار لرزنے لگی۔ اور وہ مسکرا کر بولا۔
"انجام بھی سوچ لیا ہے؟"
"زیادہ سے زیادہ موت۔" میں نے کہا۔ "انجام کی پرواہ کسے ہے۔ لیکن اب ان عالی شان محلوں میں میرا دم گھٹنے لگا ہے۔ عیش و آرام ایک روگ بنتا جا رہا ہے۔ ہاشم مجھے اس زندگی سے آزاد کرا دو۔ مجھے ان محلوں سے اور فرعونی عشرت کی زنجیروں سے چھٹکارا دلا دو۔ چلو ہم کہیں دور چلیں۔ کسی ویرانے میں ہم ایک جھونپڑی بنا لیں گے۔ اور آزاد فضا میں زندگی کا حقیقی لطف اُٹھائیں گے۔"
"ہاشم نے دھیرے سے کہا۔" فرعونہ! میں تمھیں کس طرح آزاد کرا سکتا ہوں جبکہ میں خود ایک غلام ہوں۔ اور ....."
"بس بس ہاشم۔" میں نے اُس کی بات کاٹ کر کہا۔ "غلام تو میں ہوں۔ تم غلام نہیں انسان ہو۔ غلام تو جانور سے بھی بدتر ہوتے ہیں۔ اور انسان تو بہت عظیم ہوتا ہے۔ بس تم مجھے محبت دے دو۔"
ہاشم مسکرا دیا۔ میں بھی مسکرائی۔ اور ظالم و مظلوم کی دیوار دھڑام سے گر پڑی۔ رات گئے تک ہم دونوں چھوٹی سی کشتی میں نیل کی سطح پر تیرتے رہے۔ جب بہت دیر ہو گئی تو میں اگلے دن اسی جگہ ملنے کا وعدہ کر کے ہاشم سے رخصت ہو گئی۔"
"ہماری ملاقاتیں ہر شب کو نیل کے کنارے ہونے لگیں۔ محبت جو شروع میں صرف ایک لطیف سا جذبہ تھی، دن بدن شدت اختیار کرتی گئی۔ سارا دن بے چینی اور بے کلی میں گزرتا۔ اور رات ہوتے ہی میں محل کے خفیہ دروازے سے نکل کر دیوانہ وار نیل کی طرف دوڑتی۔ جہاں میرا ہاشم بھی اسی بے چینی سے میرا انتظار کرتا ہوتا۔ اکثر میں ہاشم کو لہولہان دیکھتی۔ کبھی اُس کی پشت پر کوڑوں کے گہرے نشانات دیکھتی۔ مگر وہ ہمیشہ مسکرا کر میرا استقبال کرتا۔"
"فرعونی عتاب کا خیال آتے ہی میرا رونگٹا کھڑا ہو جاتا۔ آخر ایک دن میں نے ہاشم سے کہا کہ ہمیں یہاں سے فوراً بھاگ جانا چاہیے۔ فرعونی حکومت کی سرحدوں کے اس پار۔ جہاں ہماری محبت کو کوئی دھڑکا نہ ہو۔ ہاشم میری بات مان گیا۔ اور ہم نے اگلے دن سورج نکلنے سے پہلے ہی نکل چلنے کا ارادہ کر لیا۔ بول ابو الہول [illegible]"
فرعونہ ابو الہول کو اپنی [illegible] سنا رہی تھی۔
اگلے دن جب سورج بیچ آسمان سے مصر کے ریگستان میں آگ برسا رہا تھا۔ فرعونہ پھر ابو الہول کے قدموں کے پاس کھڑی اُس سے مخاطب تھی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

"ابوالہول! وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ وہ کنیز جس پر مجھے اتنا بھروسہ تھا، دغاباز نکلی۔ اس نے فرعون کو سب کچھ بتا دیا۔ اور ایک طوفان اٹھا۔ ہاشم کی مشکیں کس دی گئیں۔ اس پر کوڑوں کی بارش ہوئی۔ اور اُسے بے دم کرکے زنداں کے اندھیروں میں پھینک دیا گیا۔ ابوالہول! میری حالت پر ترس کھا۔ مجھے صرف اتنا بتا دے کہ میری محبت کا کیا انجام ہوگا! تجھے میری محبت کی قسم، صرف اتنا بتا دے کہ ہاشم زنداں سے زندہ واپس آجائے گا! کیا وہ میرا ہو جائے گا؟ لیکن تو، کیا جانے محبت کا گھاؤ کتنا گہرا ہوتا ہے۔ تو کیا جانے محبت کی تڑپ کتنی کرب ناک ہوتی ہے۔ اگر تو نے کبھی کسی سے محبت کی ہوتی تو تجھے اندازہ ہوتا۔ لیکن تیرا جسم تو پتھر کا ہے۔ تیرے پاس دل ہی کہاں ہے جو کسی سے محبت کرتا۔ سنگدل میری التماس سن لے۔"

فرعونہ ہچکیاں لے رہی تھی۔ لیکن ابوالہول کی پتھر کی آنکھیں اس سے بے نیاز دُور ریگستان کی طرف کچھ دیکھ رہی تھیں۔ اس کے پتھر کے ہونٹ ساکت تھے۔

فرعونہ ابوالہول کی مسلسل خاموشی سے جھنجھلا اُٹھی۔

"اچھا بے رحم! نہیں بتاتا تو نہ بتا۔ اب میں تیرے پاس کبھی نہ آؤں گی۔ ظالم تجھے مجھ پر ذرا بھی رحم نہیں آتا۔"

فرعونہ روتی ہوئی واپس جانے کے لیے مڑی۔ اُس کے مڑتے ہی ابوالہول کے پتھر کے ہونٹوں میں ذرا سی جنبش ہوئی۔ جسے وہ نہ دیکھ سکی۔

ایک دن آسمان میں شام کے رنگ پھیلتے ہی کوئی ابوالہول کی طرف پاگلوں کی طرح آتا دکھائی دیا۔ یہ فرعونہ تھی۔ چیخ کر بولی۔

"ظالم! بے رحم! سنگدل بول، اب میں ہاشم کو کہاں سے لاؤں۔ اگر تو مجھے پہلے آگاہ کر دیتا تو فرعون کو خبر بھی نہ ہو پاتی۔ اور میں ہاشم کی ملاقات کے اوّل دن ہی اُس کو لے کر دور نکل جاتی۔ آہ! اب اُسے موت کے جبڑوں سے چھڑا کر کیسے لاؤں۔ آج ہاشم کو پچاس دوسرے غلاموں کے ساتھ میرے باپ فرعون کے ساتھ قبر میں دفن کر دیا گیا۔ اف! میرا ہاشم! اس وقت منوں مٹی کے نیچے قید کر دیا گیا ہے۔ تاکہ جب فرعون دوبارہ زندہ ہو تب بھی اُس کا غلام اُس کے ظلم کا بوجھ اٹھانے کے لیے موجود رہے۔"

تھوڑی دیر بعد ہوا سائیں سائیں چل رہی تھی۔ اور ابوالہول کے قدموں کے پاس فرعون کی حسین بیٹی کی لاش پڑی تھی۔ اس سناٹے میں ابوالہول کی پتھر کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر فرعونہ کی لاش پر گر پڑے۔

اس واقعہ کو آج ہزاروں برس ہو گئے ہیں۔ دنیا میں جب سے ہزاروں انقلابات آئے۔ ہر چیز میں تغیر ہو گیا۔ لیکن ابوالہول آج بھی اس ویرانے میں موجود ہے۔

ایڈیٹر بنام ادبا و شعرا

کسی اخبار یا رسالے کا ایڈیٹر بن جانا سب سے بڑی بدنصیبی ہے۔ ایک مرتبہ جب میں ایک رسالے کی ادارت سے فارغ ہوا تو مجھے معلوم ہوا کہ دنیا کی پچانوے فی صد آبادی میری دشمن بن چکی ہے۔ چنانچہ ایک ذہین آدمی کے مشورے پر میں نے جتی ستی ہنومان جی کی مورتی پہ سوا روپے کا پرشاد چڑھایا جب جاکر میرے دشمن کیفر کردار کو پہنچے۔

رسالے کا ایڈیٹر بننا دنیا کا نازک ترین کام ہے۔ ایڈیٹر ایسے نازک کام کو کیسے نبھاتا ہے۔ اس کا مختصر سا اندازہ مندرجہ ذیل خطوط سے لگایا جا سکتا ہے جو ایڈیٹر نے مختلف قسم کے ادیبوں کو تحریر کئے۔۔۔

ایک مبتدی ادیب کے نام

اے مسٹر!

یہ [illegible] کہانی ہر کہانی ہمارے ہی رسالے "آہوئے ادب" کو بھیجتے۔ آخر ہندو پاک میں دوسرے کئی ادبی رسائل بھی شائع ہوتے ہیں۔ ان کو [illegible] کیوں نہیں بنا سکتے؟ ہم تمہارے کوئی خاندانی دشمن تو نہیں ہیں

آج [illegible] ان کہانیوں میں صرف ایک خوبی ہے۔ کہ یہ بڑے حسن اور نفاست سے ٹائپ کی جاتی ہیں۔ تم ادب کے [illegible]

آئندہ اگر [illegible] بھیجی تو میں رسالے کی ادارت اور ہندوستان دونوں کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔

۲۔ ایک اور مبتدی ادیب کے نام ۔

جناب گوہر چند جی!

آج کی ڈاک سے آپ کی مرسلہ مندرجہ ذیل اشیا موصول ہوئیں۔

۱۔ آپ کے ذاتی لیٹر فارم پر لکھا ہوا خط۔ جس کے بائیں کونے میں آپ کی فوٹو بھی چھپی ہوئی تھی۔ د ذوق کی پینٹنگ کافی بھدی تھی،

۲. آپ کی نظم "مینڈک کی فریاد"۔ (یہی نظم آپ نے ایک بار "طوطے کی فریاد" کے نام سے بھیجی تھی)
۳. مشہور ڈرامہ نگار جناب گریا ناتھ بادل کا ایک سفارشی خط (جسے بطور احتجاج بادل صاحب کو واپس بھیج رہا ہوں)
۴. میرے بچوں کے لیے بسکٹوں کا ایک پیکٹ (بسکٹ انتہائی لذیذ تھے۔ جو میں نے سارے دفتر میں بانٹ دیے۔ دفتر کا سارا اسٹاف آپ کی بسکٹ فیکٹری کی بے حد تعریف کر رہا تھا)
۵. نظم لوٹانے کے لیے ڈاک کے ٹکٹ۔

چونکہ ہمارے دفتر کی یہ بہترین روایت رہی ہے کہ کسی کے بھیجے ہوئے ڈاک ٹکٹ ہضم نہیں کیے جاتے لہٰذا اس روایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ کی نظم فوراً ہی لوٹا رہا ہوں۔ آئندہ اگر آپ نظم کی بجائے اپنی بسکٹ فیکٹری کا اشتہار بھیجا کریں۔ تو ہمارے لیے اس کا چھاپنا آسان بھی رہے گا اور اثر انگیز بھی۔۔۔ اشتہارات کا ریٹ کارڈ منسلک ہے۔

۳۔ ایک ابھرتے ہوئے فن کار کے نام ۔۔۔

جنابِ گھائل صاحب!

مجھے انتہائی افسوس ہے کہ میرے اسسٹنٹ ایڈیٹر کی غلطی سے آپ کی کہانی "خوابیدہ سی چاپ" ہمارے گزشتہ شمارے میں شائع ہو گئی۔ اس کہانی کی اشاعت پر ہمیں قارئین کی طرف سے لعن طعن کے اتنے خطوط موصول ہوئے کہ ہم نے مجبور ہو کر اسسٹنٹ ایڈیٹر کو ملازمت سے علیحدہ کر دیا۔ اور شنید میں آیا ہے کہ اب وہ آپ کو قتل کرنے کے درپے ہے۔

اطلاعاً عرض ہے کہ یہ کہانی چوری کی تھی۔ اور ایک مشہور غیر ملکی افسانہ نگار کی کہانی "میگرٹی" کے تھیم اور پلاٹ کو توڑ موڑ کر لکھی گئی تھی۔
انداہ کرم آئندہ خود بھی کہانیاں لکھنے کی کوشش کیا کیجیے کیونکہ اب ہندوستان کے آئین میں خود کہانیاں لکھنے کی آزادی دے دی گئی ہے۔
آپ کی اس مطبوعہ کہانی کا معاوضہ ہم نے یہاں کے ایک یتیم خانے کو بھیج دیا ہے۔

۴۔ ایک نامور ادیب کے نام ۔۔۔

ہندوستانی فنِ افسانہ کے ناخدا!

ہمارے ماہنامہ "غدارِ وطن" کی طرف سے اپنے پچاسویں جنم دن پر مبارک باد قبول فرمائیے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر آپ جنم نہ لیتے تو ہندوستانی فنِ افسانہ نگاری کی حیثیت ایک "ودھوا آشرم" سے زیادہ نہ ہوتی۔
اس سے پہلے ایک سرکلر کے ذریعے آپ کو معلوم ہو چکا ہو گا کہ ہم اس مرتبہ بھی ایک عظیم ضخیم افسانہ نمبر شائع کر رہے ہیں۔ کیونکہ ہم اگر افسانہ نمبر شائع نہ کریں تو قارئین الگ ناراض ہوتے ہیں اور آنے والے مورخ الگ۔ اس لیے قارئین کا رسالہ قارئین کی طرف سے، قارئین کے [illegible] سے درخواست کرتا ہے کہ آپ اپنی تازہ ترین تخلیق بھجوا دیں۔ ہمارے پروپرائٹر اور ہم نے مل کر فیصلہ کیا ہے کہ اگر آپ کی کہانی نہ آئی تو ہم اس مرتبہ افسانہ نمبر کی اشاعت ملتوی کر دیں گے۔ اور مرن برت رکھ لیں گے۔ اور عین ممکن ہے رسالہ ہی بند کر دیں۔ (ہندوستانی ادب کے لیے یہ کتنا بڑا اور درد انگیز حادثہ ہوگا)

اور سنائیے، بھابی جان کی طبیعت کیسی ہے؟ آپ کی کہانی سے معلوم ہوا کہ انھیں ہفتے میں چھ دن زکام رہتا ہے چند دن ہوئے بھابی جان کی بھی ایک کہانی ہمیں موصول ہوئی تھی۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ اُسے چھاپ دیا جائے۔ یا لوٹا دیا جائے؛ کیونکہ وہ کہانی نہیں ہے پورا ناول ہے۔ تکنیک کہانی کی، لمبائی ناول کی۔
سنا ہے آپ کی بچی آپ کے گھر سے بھاگ گئی ہے۔ اختلافِ زمانہ کی وجہ کیا تھی؛ بڑا بے وفا نکلی۔ عورتوں کی بے وفائی تو سنی تھی مگر یہ

[illegible] بھی جا پہنچا۔ کیوں نہ اس موضوع پر ایک کہانی لکھ ڈالیے "بلی کا فرار" اور افسانہ نمبر کے لیے بھیج دیجیے۔
ساہتیہ اکیڈمی کی طرف سے آپ کو جو ایوارڈ مل رہا تھا۔ اُس کا کیا بنا؟ ذرا پالیٹکس لڑائیے نا، آج کل حق اور پالٹیکس میں بڑی ملی بھگت ہے اس ملی بھگت سے فائدہ کیوں نہیں اُٹھاتے آپ؟

۵۔ ایک خاتون ادیبہ کے نام —

محترمہ، تسلیم!

آپ کی کہانی بھی ملی اور فوٹو بھی۔ ہم آپ کی فوٹو شائع کر رہے ہیں لیکن کہانی نہیں۔ کیونکہ ہم اپنے رسالے میں صرف معیاری چیزیں چھاپتے ہیں۔ فوٹو ہمارے معیار پر پورا اُترا مگر کہانی نہ اُتری۔

ہم اپنے اگلے خاص نمبر میں فوٹو کمپیٹیشن کر رہے ہیں۔ اوّل، دوم، سوم آنے والے فوٹوؤں کو ایک لاکھ روپیہ انعام دیا جائے گا۔ کمپیٹیشن کی فیس داخلہ پانچ روپے ہے۔ براہ کرم منی آرڈر سے بھجوا دیجیے (اور ہاں فوٹو گرافر کا نام بھی لکھ دیجیے گا)

یہ جان کر بڑی مسرت ہوئی، کہ آپ کے شوہر محترم ایک بہت اعلیٰ سرکاری عہدے پر متمکن ہیں۔ انھیں کہیے ہمارے رسالے کی سالانہ خریداری قبول فرمائیں۔ سالانہ چندہ صرف دس روپے ہے۔ جس میں دو خاص نمبر مفت دیے جاتے ہیں۔

جب بھی آپ سے اچانک کوئی اچھی کہانی لکھی جائے، بھیج دیجیے۔ نہ لکھی جائے تو بھی کوئی ہرج نہیں ہے۔ آپ کی زندگی یوں بھی مزے سے کٹ رہی ہے۔

۶۔ ریویو کروانے والے ادیب کے نام۔

مہی پلٹا صاحب!

آپ کی مندرجہ ذیل کتابیں ریویو کے لیے موصول ہو گئیں۔

۱۔ صابن بنانے کے پچاس نسخے۔

۲۔ ادب میں مکھیوں کا مثبت و منفی رول

۳۔ زہریلے جانوروں کے فوائد۔

۴۔ ماڈن — ایک تاجر کی حیثیت میں۔

ہم آپ کو یہ اطلاع دینا چاہتے ہیں۔ کہ یہ کتابیں ریویو سے بلند ہیں۔ کیونکہ یہ کتابیں مارکیٹ میں یوں دھڑا دھڑ فروخت ہو جائیں گی جیسے ہمارے شہر کے ملنگے مام کے گول گپے، مگر ہمارا رسالہ صرف اُن کتابوں پر ریویو کرتا ہے جن کی فروخت خطرے میں ہو۔ آپ نے یہ کتابیں لکھ کر ادب پر اتنا احسان نہیں کیا۔ جتنا کپڑے دھونے والی لانڈریوں، میونسپلٹی کے ملیریا یونٹ، بازاری حکیموں اور ماڈن کی دکانیں سونا اگل کرنے والوں پر۔

ہم چاروں کتابیں آپ کو لوٹا دیتے۔ مگر افسوس کہ ہمارے دفتر کے ایک کلرک کو یہ کتابیں اتنی پسند آئیں۔ کہ وہ چرالے گیا۔ آپ کی کتابوں اور گول گپوں کی عوامی مقبولیت کا یہ جیتا جاگتا ثبوت ہے

۷۔ ریویو کروانے والے ایک اور ادیب کے نام۔

مکرمی، تلسی داس جی!

آپ کی کتاب "رام بھروسے" جو چھ ماہ پہلے ریویو کے لیے موصول ہوئی تھی۔ ہمارے پاس محفوظ ہے اور ہمارا خیال ہے محفوظ ہی رہے گی۔
مشکل یہ ہے کہ آپ ہر ماہ اپنی نئی کتاب شائع کر دیتے ہیں۔ اور ہمارے لیے یہ انتہائی مشکل ہے۔ کہ ہر ماہ آپ ہی کی کتاب پر ریویو شائع کرتے

رہیں۔ جبکہ آپ کی ہر کتاب کا مواد ایک سا ہوتا ہے لہٰذا ظاہر ہے کہ ریویو بھی ایک سا ہوگا۔ گذشتہ سال ہم نے آپ کی کتاب "شام بھروسے" پر ایک ریویو شائع کیا تھا۔ آپ اُسے ہی اپنی نئی کتاب "رام بھروسے" کا ریویو سمجھ کر قبول کریں۔ اور اسے اپنی ہر کتاب پر لاگو کر لیجئے۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ آپ بار بار نئی کتاب بھجوانے سے بچ جائیں گے اور ہم ریویو کرنے سے۔

اگر آپ ہماری اس صاف گوئی کا بُرا ماننا چاہیں تو ضرور مانیے، کون جانے اس بُرائی میں سے کوئی بھلائی نکل آئے۔

۸۔ ایک شاعرہ کے نام۔

محترمہ تجلّی صاحبہ!

آپ کی نظم "چڑیا روتی جائے" جو ہمارے اگست نمبر میں شائع ہوئی تھی۔ بہت مقبول ہوئی ہے اس کے متعلق ہمیں روزمرہ درجنوں تعریفی خطوط موصول ہو رہے ہیں لیکن ایک بات ہماری ناقص سمجھ سے بالاتر ہے کہ ہر تعریفی خط میں ایک فقرہ بے حد کامن ہے کہ "محترمہ تجلّی دورِ حاضرہ کی کالیداس ہیں"۔ آئندہ تعریفی خط بھجواتے وقت کامن فقروں سے احتراز کیا کیجئے۔ کیونکہ اس سے ایڈیٹر کے دماغ پر غلط اثر پڑتا ہے۔

آپ کی دوسری نظم "چڑیا کھاتی جائے" بھی موصول ہو چکی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ "چڑیا سیریز" پر آپ جتنی نظمیں لکھ سکتی ہیں۔ وہ سب ہمیں ارسال کر دیجئے۔ ہم اپنے رسالے کا "چڑیا ایڈیشن" شائع کر کے ملک میں تہلکہ مچا دینا چاہتے ہیں۔

یہ معلوم کر کے بڑا افسوس ہوا کہ خاتون ہونے کی وجہ سے آپ اپنا فوٹو شائع نہیں کروانا چاہتیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ چڑیا کے پردے میں کوئی چڑا بول رہا ہو۔

۹۔ ایک ڈرامہ نگار کے نام۔

جناب بے اُنت صاحب۔

آپ کا ڈرامہ "آخری وقت" موصول ہوا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ ڈرامہ پہلے بھی کہیں پڑھ چکا ہوں۔ یہ ڈرامہ ایک بنگالی مصنف نے پہلے اردو میں لکھا تھا۔ اس کے بعد اس کا بنگلہ زبان میں ترجمہ ہوا۔ بنگالی سے یہ انگریزی میں چھپا۔ اور اب انگریزی سے آپ نے اسے پھر اُردو کے قالب میں ڈھال کر اُردو ادب پر ایک بار پھر احسان لاد دیا۔ اور ڈرامہ کولھو کے بیل کی طرح جہاں سے چلا تھا وہیں آ گیا۔

ہم "آخری وقت" کو صرف اس شرط پر چھاپنے کے لیے تیار ہیں کہ اگر اس کے اصل مصنف نے آپ اور ہم پر مقدمہ دائر کر دیا تو مقدمے اور جرمانے کے سارے اخراجات آپ ہی ادا کریں گے۔

احتیاطاً آپ یہ بھی لکھیے کہ آپ کی جائداد اور بینک بیلنس کتنا ہے کہ یہ ہم صرف اس لیے پوچھ رہے ہیں تاکہ مقدمے کی صورت میں آپ کی مالی پوزیشن کے متعلق ہماری پوری تسلی ہو جائے۔

بہر کیف ڈرامہ بے حد نفیس اور اعلیٰ ہے۔ یہ ہمیں پہلے بھی پسند تھا اور آج بھی پسند ہے۔

ناشر	شمسؔ زبیری
سرورق	اختر ہلال زبیری
کتابت	چراغ الہ آبادی
طباعت	انٹرنیشنل پریس
اشاعت	جون ۱۹۶۴ء
مقام اشاعت	کاشانۂ اُردو ۲/۶۔ اکبر روڈ۔ صدر کراچی

قومی آواز، لکھنؤ

مجتبیٰ پاشا

بردکھوے

اتنی خبر ہم بھی رکھتے تھے کہ آج کل خاندان کے بڑے بوڑھوں میں اندر ہی اندر کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ اور اس خاکسار پہ جا بے جا شفقتیں کیوں فرمائی جا رہی ہیں۔ خواتین کی فوج کا خاندانی و غیر خاندانی شادیوں کی کمان میں مختلف لڑکی والوں کے گھروں پر برابر چھاپے مارے جا رہا تھا۔ اور بند کمرے کے خفیہ اجلاس بھی جاری تھے۔ جن کا آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا حال اکثر بند کمرے کے خفیہ سوراخ سے ہم بھی ملاحظہ و سماعت فرماتے رہتے تھے۔ اکثر چوٹی کانفرنس ناکامی پر ختم ہوئیں اور مندوبین کسی فیصلے پر پہنچنے میں ناکام رہے اور رہنے کے لئے ہم نے درپردہ ویٹو کا کردار دیا۔
ان بزرگوں کے نزدیک اس سے زیادہ شرمناک اور باغیانہ حرکت اور کیا ہوسکتی تھی کہ لڑکا اس معاملے میں خود اپنی رائے دے۔ اس لئے ہماری حیثیت محض ایک خاموش تماشائی کی تھی۔ پھر بزرگ بھی آپس میں ہم خیال نہ تھے۔ کوئی جہیز دیکھتا تھا۔ کوئی خاندانی شرافت اور بڑی بوڑھی تلاش کرتا تھا۔ کسی کو پیسے کی تلاش تھی۔ کسی کو تعلیم اور روشن خیالی سے بیڈی گرل تک کی جستجو تھی۔ اور ایسی بھی خواتین مطلوب تھیں جو صوم و صلوٰۃ کی پابند اور مشرقی تمدن کا نمونہ ہوں۔
سلسلے تو بہت کچھ کٹے کچھ ہم نے کاٹے۔ لیکن ایک ایسا پیچ بھی پڑا کہ ہم کو بردکھوے میں بھی جانا پڑا۔
ہوا یہ کہ ہم اپنے دفتر میں انتہائی مصروف تھے کہ اچانک چپراسی نے بتایا کہ ایک صاحب آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔ جا کر دیکھا تو بھائی صاحب کے دوست کھڑے ہوئے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی بولے۔

"ڈیوٹی کب تک ہے؟"

"ساڑھے تین بجے تک!"

"خیر ٹھیک ہے۔ تو آپ ڈیوٹی کر کے فوراً اپنی بھابی کے یہاں چلے جائیے گا۔ چار بجے ہم لوگ آپ کو ایک جگہ بردکھوے میں لے جائیں گے۔"
بھائی صاحب کے دوست تو چل دئے۔ مگر ہم کو شدہ میں مبتلا کر گئے۔ جب ہم غلطاں و پیچاں لوٹے تو ہمارے چیف صاحب نے پوچھا "خیریت؟" جلدی میں اور کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اصل بات بتا کر بات کا بتنگڑ بنانا نہ چاہتے تھے لہٰذا منہ لٹکا کر بولے۔

"خیریت ہی تو نہیں ہے!" پوچھا۔

"کچھ بتائیے گا بھی؟" عرض کیا۔

"وہ عزیز ہمارے جو علاج کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے اور آپ کی مدد سے ان کا میڈیکل کالج میں داخلہ ہو گیا تھا وہ بیچارے۔۔۔۔؟"
چیف صاحب نے کہا "ارے۔۔۔۔ چہ۔۔۔ چہ۔۔۔ انا للہ۔ جائیے صاحب فوراً جائیے۔"

جوش ملیح آبادی

طلوعِ صبح

جب چہرۂ افق سے اُٹھی سُرمئی نقاب — کانپے نجوم، زرد ہوا روئے ماہتاب
کھنکے فلک کے جام، کھلے سُرخیوں کے باب — اُڑنے لگا عبیر، برسنے لگی شراب

رنگوں کی آب و تاب چڑھانے لگی فضا
آہستگی سے ہوش میں آنے لگی فضا

بے چین ظلمتوں میں بہکتی ہوئی فضا — نو کار ضو کی سر سے ڈھلکتی ہوئی ردا
کہرے کی وادیوں سے جھلکتی ہوئی ضیا — جس طور سے کہ بھاپ کی چادر میں آئنا

گویا نقاب، جلوۂ جاناں لیے ہوئے
یا شمع ہے کوئی تہِ داماں لیے ہوئے

نو خاستہ فضاؤں میں اک طرفہ پیش و پس — بجتا ہوا ندی میں ملایم نوا جرس
کھلتی ہوئی زمیں کی کمانی بہر نفس — شبنم کے آب و رنگ میں پگھلے پہر کا رس

گل چہرہ پتیوں پہ نگینے جڑے ہوئے
گوشِ چمن میں اوس کے بُندے پڑے ہوئے

ہلکی سی ٹہنیوں میں زر افشاں سے برگ و بار — اُٹھتی سی چلمنوں سے جھلکتا سا روئے یار
جنباں سی تیرگی میں، سلونے سے مرغ زار — رقصاں سی روشنی میں سہانا سا روزگار

دن ہے کہ رات، ایک تزلزل سا، راتے میں
طفلی کا اضطراب جوانی کے سائے میں

گر دوں ادھر ملائی تو اُس سمت نقرئی — یہ پارہ سردئی ہے تو وہ پارہ سُرمئی
اک گوشہ کنتمئی ہے تو اک گوشہ پستئی — مغرب جو اگرئی ہے تو مشرق ہے چمپئی

کانٹے پہ دل بری کے، فضائیں تلی ہوئی
تا دور زلف و رُخ کی دکانیں کھلی ہوئی

سمٹے افق، بڑھی جو ٹھٹکتی ہوئی ضیا — دوشیزۂ فضا کی مہکنے لگی قبا
آہستگی سے مہر تنک ضو ابھر چلا — بجنے لگا خیال میں سونے کا دائرہ
برسا گلال ذہن پہ، کندن خیال پر
نوبت بجی مشارۂ ذوق جمال پر

کچھ ملگجے سے نور میں سرخی گندھی ہوئی — تھرا کے آسماں سے زمیں پر مچل گئی
پودوں نے سر اٹھائے گلستاں نے سانس لی — سبزے پہ کسمسائی سیہ چشم روشنی
ہر پنکھڑی میں دفتر افسانہ کھل گیا
دوشِ فضا پر ایک صنم خانہ کھل گیا

بڑھنے لگا شکوہ سے پھر کندنی طبق — رہ رہ کے، کروٹیں سی بدلنے لگی شفق
کھلنے لگا فضائے خنک پر نشانِ حق — گردوں کتاب زر کے الٹنے لگا ورق
موتی گرے زمیں پہ شاخیں لچک گئیں
بوسے لیے صبا نے تو کلیاں چٹک گئیں

دل نے نوید آمدِ فصلِ بہار دی — موجِ صبا نے دعوتِ چنگ و رباب دی
انوار نے وہ کسوتِ نقش و نگار دی — سلمے کی آسماں نے دلائی، اتار دی
بالائے چرخ، صبح کا تارا چمک اٹھا
جیسے کسی بلاق کا موتی جھلک اٹھا

خورشید کی جبیں جو ذرا سی چمک گئی — لیلائے تیرگی کی کلائی مڑک گئی
پھر ایک ضو جو درزِ شفق سے جھلک گئی — گویا شراب تند سے مینا درک گئی
بنتِ عنب نے ہنس کے جو گھونگھٹ اٹھا دیا
مشرق نے اک شراب کا دریا بہا دیا

منہ گلستاں میں لیلیٔ شب کا اتر گیا — بھونرا فضائے باغ سے پرواز کر گیا
مہکی زمیں، سطح سے بستاں ابھر گیا — بہرِ نظارہ وقتِ گریزاں ٹھہر گیا
آیا جو لالہ زار میں جھونکا نسیم کا!
اترا غنودہ کنج میں ڈولا شمیم کا

چھوٹی کرن، زمیں کی گھمسٹن دور ہو گئی — شبنم کی بوند بوند خمِ نور ہو گئی
دنیا تمام جلوہ گہِ طور ہو گئی — ہر پنکھڑی جوان ہوئی، حور ہو گئی
تابش، نویدِ شرح، پئے صدر ہو گئی
گویا جہاں میں صبحِ شبِ قدر ہو گئی

ٹھنڈی ہوا دلوں کو جگاتی ہوئی چلی　　پچھلے پہر کے گیت سناتی ہوئی چلی
ہر خواب گاہِ ناز میں گاتی ہوئی چلی　　مکھڑے پہ کاکلوں کو ہلاتی ہوئی چلی

دودِ چراغِ کشتہ کی زلفیں بکھر گئیں!
غرفے جلے، بھووں کی کمانیں اتر گئیں

چونکے نگار، ذہن میں جیسے کوئی قیاس　　ناشستہ عارضوں میں لیے صبح کی مٹھاس
پنڈوں کی گرم بھاپ میں باسی گلوں کی باس　　آنکھوں میں رنگ رنگ میں خوابوں کا انعکاس

خوابوں کا انعکاس، کہانی لیے ہوئے
انگڑائیوں میں کیفِ جوانی لیے ہوئے

بجتی ہوئی ہواؤں میں مہکے ہوئے بدن　　آنکھوں میں فرشِ خواب کی غلطیدہ ہر شکن
ڈوروں کی سرخیوں میں یم بادہ موجزن　　چہروں پہ اینڈے ہوئے سونے کا بانکپن

روندے ہوئے تمام دوشالے پڑے ہوئے
ٹوٹے ہوئے زمین پہ مالے پڑے ہوئے

ڈوبے لبوں کے سائے جبینوں کے ماہ میں　　جیسے یقین کشمکشِ اشتباہ میں
راتوں کے پینگ سایۂ زلفِ سیاہ میں　　بوجھی نہ جائے جو وہ پہیلی نگاہ میں

لب، طعنہ زن، مہارتِ بربط نواز پر
مکھڑے، وہ گیت، بج نہیں سکتے جو ساز پر

اعضا کے پیچ و تاب میں خوابِ گراں کی رَو　　انفاس مشک بار میں سوزِ نہاں کی رَو
رنگیں لبوں پہ آتشِ آبِ مغاں کی رَو　　آنکھوں کی سطحِ سرخ پہ اک داستاں کی رَو

غلطیدہ فصلِ گل کی گھٹا چشمِ ناز میں
روداد شب تموجِ زلفِ دراز میں

انگڑائیاں جو آئیں تو آنکھیں جھلک گئیں　　رگ رگ میں دو دلوں کی کمانیں کڑک گئیں
رخسارِ پُر شباب کی کلیاں چٹک گئیں　　جو چوڑیاں خموش پڑی تھیں کھنک گئیں

موباف میں اسیر شبِ تار ہو گئی
جوڑا بندھا تو صبح نمودار ہو گئی

موجِ نسیم، تان اڑاتی ہوئی چلی　　مرغانِ خوش نوا کو جگاتی ہوئی چلی
پتلی کمر کا لوچ دکھاتی ہوئی چلی　　زریں چھڑا کڑے سے بجاتی ہوئی چلی

کروٹ فضا پہ لی چمن روزگار نے
گل ہنس پڑے، نقاب الٹ دی بہار نے

ٹھٹکی، مڑی، روانہ ہوئی نور کی سپاہ دیکھے کلس، اٹھائی در و بام نے نگاہ
ماتھے پہ آسمان کے کج ہو گئی کلاہ رکھ لی فضا نے سرخ شلوکے میں قرصِ ماہ
سبزے کی روح مست ہوئی، جھومنے لگی،
شبنم کے موتیوں کو کرن چومنے لگی!
صحرا و دشت و وادی و گل زار، گل چکاں گنگ و ترنگ و رنگ، کہر بار و مے فشاں
دراج و کبک و قمری و طاؤس، نغمہ خواں ملاح و موج و قلزم و کشتی، رواں دواں
ساحل کے موڑ سرخ کمانیں لیے ہوئے
موجیں تمام منہ میں زبانیں لیے ہوئے
اوجِ فضا پہ رایتِ زرتار گاڑ کر! نکلی ضیا، افق کا گریبان پھاڑ کر
ذرّے بسائے خاک نے تارے اجاڑ کر انگڑائی لی حیات نے افشاں کو جھاڑ کر
مستی چھٹی لبوں کی چمک دور تک گئی
کنگن گھما دیا تو کلائی دمک گئی
جلووں کا سیل، سوئے گل و یاسمن مڑا ضو کا جلوس، جانبِ گنگ و جمن مڑا
ذرّوں کی سمت، ناقۂ لعلِ یمن مڑا دریائے سور، طن طرف حسنِ ظن مڑا
لے نے کیا سنگار، ترانوں کی چھاؤں میں
گھنگرو بندھے نگارِ خموشی کے پاؤں میں
سرخی بڑھی فضاؤں پہ تابندگی کے ساتھ تابندگی جمال کی، رخشندگی کے ساتھ
رخشندگی شمیم کی بافندگی کے ساتھ بافندگی، رباب و دفِ زندگی کے ساتھ
اور زندگی، تصوّرِ مطلق لیے ہوئے
انفاس میں خروشِ انا الحق لیے ہوئے
دھومیں لیے زمیں کی طرف سرخوشی چلی احساس کی ترنگ، سوئے بے حسی چلی!
غفلت کی سمت ازسرِ نو آگہی چلی سونے کا تھال سر پہ لیے زندگی چلی!
سارنگیاں چھڑیں چمنِ روزگار میں
"حق سرّہٗ" کی گونج اٹھی لالہ زار میں

ظہور نظر

نقوش۔ لاہور

ایک نظم، ایک خواب

رات گہری ہوئی
نیند زہری ہوئی
اپنی زنجیر کو، میری تخئیل سے
توڑ کر چل پڑی بات ٹھہری ہوئی

جتنے الفاظ تھے
میرے افکار کے کنجِ تمہید میں
اُن سُنی، اَن کہی تشنہ لب بات کا تازیانہ بنے
جتنے سنگیت تھے.
میرے جذبات کے سازِ نا دید میں
اُن کہی حسرتوں کی لرزتی ہوئی بیقرار انگلیوں کا نشانہ بنے

شوق کی راہ میں روشنی کی طرح
ناچ کر، گھوم کر، پھیل کر بج اُٹھیں
ایک بےصوت نغمے کی پرچھائیاں
رُوح کی دھند میں بستیوں کی طرح
دھڑکنیں جاگ اٹھیں لے کے انگڑائیاں

دکھ کے پتھریلے رستے پہ دونوں طرف
سکھ کے کچے گھروندوں میں دیپک جلے
ہاتھ اک دوسرے کا سنبھالے ہوئے
اپنے جال اپنے کاندھوں پہ ڈالے ہوئے

خواب جیون کے ساحل کی جانب چلے
دیکھتے دیکھتے کانپ کر کھل گئے
سوچ کے نیلے نیلے بادباں
ڈولتی، جھومتی، گھومتی چل پڑیں
ذہن کے بحر میں فکر کی کشتیاں

جگمگانے لگیں
مسکرانے لگیں
دور تک خواہشوں کی سبھل مشعلیں
دل نے مجھ سے کہا، میں نے دل سے کہا
آؤ ہم بھی چلیں!!

اور پھر ذہن کے بیکراں بحر میں
خواب غوطوں پہ غوطے لگانے لگے
اپنے جالوں میں روتی سسکتی ہوئی یاد کی سیپیاں بھر کے لانے لگے

اس سے پہلے کہ دل،
یاد کی سیپیاں کھول کر اُن سے آشا کے مُوتی چُنے
اس سے پہلے کہ دل
یاد کی سیپیاں کھول کر اُن سے آشا کے موتی چنے
چشمِ نم کھل گئی
راہِ غم کھل گئی

ماحول

ریت میں جھاگ ہیں اور بحر میں صرصر کا خروش
سینۂ کوہ میں بہتا ہوا دریا خاموش
سر بہ زانو ہے سحر، شام کبیدہ آغوش
اپنے ناسور کو ناسور مگر کون کہے!
یہ ہنر ہو تو ہمیں اہلِ ہنر کون کہے

ہم یہ کہتے ہیں کہ خوابیدہ ہے چشمِ بیدار
اور افسونِ خموشی سے خجل ہے گفتار
اب نہ آئینۂ افلاس نہ ذلت کا غبار
عام ہر بزمِ تمنا میں ترانے ہیں یہی،
زخمِ احساس چھپانے کے بہانے ہیں یہی

ان بہانوں میں غمِ زیست کا سودا گم ہے
خوردہ گیروں سے لرزتی ہوئی دنیا گم ہے
بے ضمیروں کی خدائی کا تماشا گم ہے
ایسا ماحول ابھی تک ہے، دلِ غم دیدہ
دشتِ محرومِ نسیم و خورِ شبنم دیدہ

محبت

میں جسم و جاں کے تمام رشتوں سے چاہتا ہوں
نہیں سمجھتا کہ ایسا کیوں ہے
نہ خال و خد کا جمال اس میں، نہ زندگی کا کمال کوئی
جو کوئی اس میں ہنر بھی ہوگا تو مجھ کو اس کی خبر نہیں ہے
نہ جانے پھر کیوں؟
میں وقت کے دائروں سے باہر کسی تصور میں اڑ رہا ہوں
خیال میں خوابِ خلوتِ ذات و جلوتِ بزم میں شب و روز
مرا ہوا اپنی گردشوں میں اسی کی تسبیح پڑھ رہا ہے
جو میری چاہت سے بے خبر ہے
کبھی کبھی وہ نظر چرا کر قریب سے میرے یوں بھی گذرا
کہ جیسے وہ باخبر ہے میری محبتوں سے
دل و نظر کی حکایتیں سن رکھی ہیں اُس نے
مری ہی صورت
وہ وقت کے دائروں سے باہر کسی تصور میں اڑ رہا ہے
خیال میں خوابِ خلوتِ ذات و جلوتِ بزم میں شب و روز
وہ جسم و جاں کے تمام رشتوں سے چاہتا ہے
مگر نہیں جانتا یہ وہ بھی کہ ایسا کیوں ہے
میں سوچتا ہوں وہ سوچتا ہے
کبھی ملے ہم تو آئینوں کے تمام باطن عیاں کریں گے
حقیقتوں کا سفر کریں گے

عزیز حامد مدنی — صدف کراچی

معاشرانِ جنوں پھر بہار آئی ہے
فروستِ سخن پردہ دار ، آئی ہے

نہ ذوقِ وصل کچھ ایسا نہ دردِ ہجر ایسا
مگر کبھی سے نگہ شرمسار آئی ہے

مرے لبوں پہ ترے بوسۂ وصال کی خیر
دعائے شکرِ غمِ تازہ کار آئی ہے

زمیں میں آتشِ نعل بگراں ہوئی جو کرن
لباسِ سنگ میں کیا آشکار آئی ہے

نشاطِ بلبلِ مرگ آشنا کو کیا کہیے
سوادِ رنگ میں دیوانہ وار آئی ہے

ان آئینوں سے جو حیراں تھے تیری خلوت میں
مزاجِ عشق پہ تہمت ہزار آئی ہے

جنوں کی آنکھ میں کھلتی تھی یاسمن کی طرح
وہ برق اب جو سرِ کہسار آئی ہے

میانِ افعی و گل عندلیبِ شعلہ نوا
رگِ گلو میں کوئی نوکِ خار آئی ہے

اِک آدمی سے محبت کے نام پر کچھ دن
جو گفتگو تھی وہی بار بار آئی ہے!

ذرا میں خیمۂ آتش زدہ تھا ابرِ بہار
صدائے طائر و برق ایک بار آئی ہے

کبھی کبھی رُخِ اقرار کی ہوا اے دوست
دلوں میں دشنۂ پنہاں اُتار آئی ہے

اک اور مرحلۂ قرب میں ہے جاں مدنی
گئی ہوئی شبِ منت گزار آئی ہے

سلیم احمد — سیپ کراچی

حُسن ہے ایک محفلِ خنداں
عشق اِک کاروانِ نوحہ گراں

عشق ہے انتظارِ صُبحِ ابد
حُسن ہے ایک عالمِ امکاں

اجنبی ہوں دیارِ غربت میں
زندگی انتظارِ ہم نفساں

میں ہوں ساحل کی طرح افتادہ
ہے تری موجِ التفات کہاں

دل پہ کیا کیا گھٹا برستی ہے
آج ہے کون اس طرف نگراں

داستانیں بنا گیا کیا کیا،
میرا اُلجھا ہوا سا طرزِ بیاں

کرتار نوری

سیپ کراچی

دنیا بدل گئی ترے اقرار کی طرح
رفتارِ وقت ہے تری رفتار کی طرح

عذرِ گناہ ڈھونڈ تو لائے ہیں بے قصور
اب پیش کرنے ہیں یہ خطا وار کی طرح

احساسِ وعدہ دل میں نظر نقشِ پا کیا
رُو میں خیال ہے تری رفتار کی طرح

تھی پرسشِ مزاج تبسم لیے ہوئے
لیکن وہ لب تھے چشمِ عزادار کی طرح

دینا ہے ساتھ تپتی ہوئی دھوپ کا ہمیں
رہتے ہیں ہم بھی سایۂ دیوار کی طرح

برباد کر گئی مرے لہجے کی تمکنت
تھا میرا عرضِ شوق بھی پندار کی طرح

بازارِ زندگی میں یہ سودا بُرا نہیں،
میری نظر ہے ذوقِ خریدار کی طرح

اے دوست میرا چال چلن کچھ بھی ہو مگر
کردار ہے مرا مرے افکار کی طرح

آخر نمائشِ غمِ دوراں بھی کیا ضرور
نوریؔ تو مضمحل ہے غمِ یار کی طرح

احمد فراز

فنون۔ لاہور

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

ڈھونڈ اجڑے ہوئے لوگوں میں وفا کے موتی
یہ خزانے تجھے ممکن ہے خرابوں میں ملیں

تو خدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا،
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

غم بھی نشّہ ہے اسے اور فزوں ہونے دے
جاں پگھلتی ہی شرابیں جو شرابوں میں ملیں

آج ہم دار پہ کھینچے گئے جن باتوں پر!
کیا عجب کل وہ زمانے کو نصابوں میں ملیں

اب نہ وہ ہیں نہ وہ تو ہے نہ وہ ماضی ہے فرازؔ
جیسے دو شخص تمنّا کے سرابوں میں ملیں

احمد ہمدانی — صدف کراچی

حیات آج بھی کہتی ہے رائیگاں گذرے
دلوں سے لاکھ اُجالوں کے کارواں گذرے

پڑی وہ دھوپ کہ یاروں نے ساتھ چھوڑ دیا
صبا کو سونگھ گئے سانپ ہم جہاں گذرے

جفاؤں سے بھی کبھی اہلِ دل ہوئے شاداں
محبتوں پہ کبھی لطف بھی گراں گذرے

دلوں میں لذتِ صحرا لیے ہوئے کب تک
گل دمشق کی امیدوں کا کارواں گذرے

رہی ازل سے محبت دوچار بھی جن سے
وہ حادثے بھی محبت پہ ناگہاں گذرے

کہاں تھا عشق خبر تک نہ آج اسکو ہوئی
بہت قریب سے ہوکر وہ مہرباں گذرے

یہ گردِ رہ، یہ بگولے، یہ راکھ کے کچھ ڈھیر
کہاں ہیں لوگ مگر جو رواں دواں گذرے

باقیؔ — فنون۔ لاہور

رُوح بے چین رہتی ہے اڑنے کو اس خاکداں سے پرے
غالباً اِک جہاں اور آباد ہے اس جہاں سے پرے
ہاں کبھی اپنے سکھ دکھ کا اِک جائزہ عشق لے گا ضرور
آج خود کو سمجھتا ہے لاکھ سود و زیاں سے پرے
کچھ مسافر جنھیں ہم قدم ہو کے چلنا گوارا نہیں
وہ بھی ہیں شاملِ کارواں، گرچہ ہیں کارواں سے پرے
غم کا موسم لیے اپنے ہمراہ، جنگل میں ہم آ بسے!
گلستاں سے پرے، ہر فریبِ بہار و خزاں سے پرے
عشق دیکھا کیا کچھ عجب قربتیں، کچھ عجب دوریاں!
اس قدر کوئی دل کے قریں، اس قدر وہم و گماں سے پرے
وہ بھی اس دورِ رنج حادثہ گاہ کا تو نہیں کوئی عکس!
ایک جنت سُنا ہے کہ آباد ہے آسماں سے پرے
اپنی نظروں میں باقیؔ مقدس تھا راہِ وفا کا سفر
پاؤں ہم نے ہمیشہ رکھا ہر قدم کے نشاں سے پرے

نگار صہبائی — سیپ کراچی

گیت

کس نے بھری لہو پچکاری
سمے کی چھاتی پر دے ماری

اندھیارے تھے یا اُجیالے،
سچ اور جھوٹ کے منہ تھے کالے
اک پل گھر کو جلتے دیکھا
دُوجے پل پھیلا اندھیارا
وہ جگنو تھا یا چنگاری،
جنم جنم کے گھائل من نے
رکھ لی لاج ہماری!
دکھڑا کن بولے
من کے اندر اور اک من ہے
وہ ساجن ہے یا سوتن ہے
بھید نہ کھولے
موہن بولیں میں بلہاری
نا ساجن نہ سوتن من میں
آن بسے ہیں بھگون من میں
کہہ دو جاکر سور داس سے
جھوٹی کویتا ساری تمہاری
میں جوبن رس کی پچکاری

تاج سعید — سیپ کراچی

گیت!

کل کی باتیں بھول بھی جاؤ، آج کا جشن مناؤ

کل کی باتیں دکھ کا کارن، کل کی باتیں زہر کا پیالہ
کل کی باتوں کے چکر نے انہونی کے پھیر میں ڈالا
انہونی کے پھیر سے نکلو، گئے سمے پر مت پچھتاؤ
کل کی باتیں بھول بھی جاؤ آج کا جشن مناؤ

کل جو رات تھا سپنا دیکھا اسے نہ سمجھو جیون میت
آج کے سُندر سپنوں سے تم کر لو سُندر ریت
کل کے جھوٹے سپنوں میں مت کھو کر عمر گنواؤ،
کل کی باتیں بھول بھی جاؤ، آج کا جشن مناؤ!

آج کی مایا آج کی باتیں، جیون گنگیا کی سوغات
آج کے دکھڑے آج سہیں گے کل کو کھا جائیں گے مات
آج اٹل ہے آج کے کام کو آج ہی تم نپٹاؤ
کل کی باتیں بھول بھی جاؤ آج کا جشن مناؤ

جوش ملیح آبادی

کتاب۔ لکھنؤ

شاعری کا مستقبل

" شاعری روز بروز زوال پذیر ہوتی جا رہی ہے!
ہم موجودہ شاعری کو دیکھتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں جدید نظریوں اور تحریکات کے زیر اثر جو شاعری ۱۹۴۳ء کے بعد پیدا ہوئی ہے وہ اپنے اسلوب اور موضوع کے لحاظ سے موجودہ شاعری سے بلند و برتر ہے۔ کیا سبب کسی تحریک یا نظریہ کا فقدان ہے؟ اگر ایسا ہے تو اردو کی قدیم شاعری جس کے سامنے کوئی تحریک بھی نہیں تھی اور نہ کوئی مقبول نظریہ کیسے وہ معیار قائم رکھ سکی۔ جلد جلد کا شاعری میں کم ہوتا چلا گیا ___ ؟"

جواب

اردو شاعری کو بڑی شاعری کہا ہی نہیں جا سکتا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ہماری زبان میں حقیقی شاعری بہت کم ہوئی ہے۔ جس کی ذمہ دار غزل ہے۔ ہمارے پاس شاعری کا جتنا انبار ہے اس کا اسّی فی صدی غزل ہے۔ اور غزل ایک فطری صنف سخن کے اعتبار سے ناقص ہے کسی شاعری میں کچھ شعر نکل آنا اس کی بڑائی کی دلیل نہیں ہے۔

اردو میں چند گنے چنے شاعروں کے علاوہ اگر کوئی عظیم شاعر پیدا نہیں ہوا تو اس کی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے غزل کو شعر سمجھ لیا۔ اور جس شاعر کو نمک حرامی کی وجہ سے فراموش کر دیا گیا وہ ایک ایسا شاعر تھا جس کا تذکرہ بار بار ہونا چاہئے تھا اور اسی کا راستہ اختیار کر کے شاعری پیدا کی جا سکتی تھی۔ مگر ہم لوگ اس کی برسی تک نہیں مناتے۔ میرا اشارہ نظیر اکبر آبادی کی طرف ہے، جسے بھلا دیا گیا۔

جہاں تک بڑی شاعری کا تعلق ہے تو قدرت اس صنف کے بڑے آدمی پیدا کرنے میں ہمیشہ بخیل رہی ہے ڈھائی سو برس کی شاعری میں کبھی ایک آدمی پیدا ہوا ہے۔ نئی شاعری سے نا امید نہیں ہونا چاہئے۔ اگر یہ بڑی شاعری نہیں ہے۔ تو کچھ عرصہ بعد بڑی شاعری پیدا ہو سکتی ہے۔

۱۹۳۶ء کی شاعری کیا ہے یہ ہمیں نہیں معلوم۔ ہم سے نام لے کر بات کیجئے۔ ۱۹۳۶ء کے بعد اگر کسی شخص سے امید کی جا سکتی تھی کہ وہ درجہ اول تک جائے گا تو وہ مجاز تھا۔ وہ بے چارہ خودکشی کر چکا ہے۔ فیض رومانی شاعر ہیں۔ ان میں شاعری کا جوہر ہے۔ ان کی طبیعت میں ابل پڑنے کی کیفیت ہے۔ مگر حالات نے انہیں سیاسی شاعر بنا دیا۔ اسی لئے وہ زیادہ نہیں چلے۔ جب تک وہ رومانی نظمیں کہتے رہے جیسے وہ نظم تھی۔ مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ۔ ان کی شاعری میں رنگ رہا۔ مگر جب وہ سیاست کے رنگ میں بڑے تو پبلک ڈیمانڈ پر شعر کہنے لگے۔ ناموری کی فکر نے

مخاطب کمیدیا ان کے اور ساتھیوں میں جوہر تو ہے مگر ایسا کوئی نہیں ہے جو درجہ اول تک جائے۔

آج کل کی شاعری کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں ان لوگوں کو نہیں جانتا۔ نہ دیکھنے کی فرصت ملتی ہے۔ کبھی کبھی رسالہ اٹھاتا ہوں تو بلینک ورس دیکھ لیتا ہوں۔ یہ لوگ غزلیں اور نظمیں بھی کہتے ہیں۔ مگر سب بچے بچے نظر آتے ہیں۔ ان میں آگ نہیں ہے۔ یہ لوگ اس قابل ہی نہیں ہیں کہ اہم معلوم ہوں یہ پودے ہیں۔ بہت چھوٹے پودے۔ ان کے جل جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ دراصل شاعری کا جائزہ صحیح معنوں میں دو ڈھائی سو سال کے بعد لیا جاتا ہے۔ اس شاعری کے بارے میں کیا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے زمانہ میں باون باون گز کے شاعر تھے۔ مگر آج ان کا ذکر تک نہیں۔ مقبولیت کی بات کیجئے گا تو داغ کا جیسا طوطی بولا وہ ڈھکی چھپی بات نہیں۔ مگر آنکھ بند ہوتے ہی بھلا دیا گیا۔ شاعری پر تقسیم کا اثر بھی بہت پڑا۔ لوگ اپنے اپنے حصے اس لئے دبا کر بیٹھ گئے، کہیں دوسرے لوگ ہمارے حصہ دار نہ بن جائیں۔ شاعری پھیلنے کے بجائے محدود ہو گئی۔

لیکن ایک بات ہے کہ انسان کی ہر بات میں ایک تغیر آرہا ہے۔ وہ اب عقل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ شاعری محسوسات کو سامنے رکھتی ہے اور ہمارا شعور سائنس اور فلسفے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اب وہ شاعری پنپے گی جو اپنا موضوع سائنس اور فلسفہ کو بنائے گی۔ پہلے عشق کرنا بہت مشکل تھا۔ محبوب کی شکل دیکھنا بھی بہت دشوار تھا۔ اسی لئے ہجر کی راتیں بھی اب وہ نہیں رہیں۔ عاشقی آسان ہو گئی ہے۔ عقل کا دور ہے۔ اس لئے شاعر کو شہوانیات سے وابستہ نہیں رکھنا چاہئے۔ یہ بات میں نے پچھلے پندرہ بیس سال میں محسوس کی ہے اور میرے یہاں اس کا گہرا اثر پڑا ہے اس لئے میری موجودہ شاعری پہلی شاعری سے بالکل مختلف ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ عقل کی بات کہتا ہے۔ تو کوک ہو گیا ہے۔ حسن و عشق کی بات کرو تو کہتے ہیں زندہ ہو گیا ہے۔

ہمارے شعراء اور صوفیا نے عقل کو ذلیل کیا ہے اور جنون و عشق کو بڑھایا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم عقل کو شیطانی کام سمجھتے ہیں۔ ہماری شاعری نے عقل اور تفکر کو نظر انداز کر دیا ہے۔ یہ نشہ چار سو برس کا ہے یہ کیسے اتر سکتا ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ عقل سے بڑی فضیلت کوئی نہیں۔ از زمیں تا آسماں عقل ہے اور عشق صرف نسل انسانی بڑھانے کا ایک ذریعہ۔

شاعری عقل کا راستہ اختیار کرے گی تو پنپے گی ورنہ مر جائے گی۔ لیکن عقل کا راستہ اختیار کرنے سے پہلے ایک بات اور سن لیجئے۔ زبان کے انحطاط کے ساتھ شاعری بھی زوال پذیر ہوتی جاتی ہے۔ شاعری الفاظ کے سہارے ہی ہوتی ہے۔ اور آج کی شاعری الفاظ کو بھول رہی ہے۔

نقش کراچی

ڈاکٹر شوکت سبزواری

علاقائی زبانیں اور اُردو

اردو میں عام طور سے انگریزی لفظ پرابلم کا ترجمہ مسئلہ کیا جاتا ہے۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ پاکستان میں زبان کا معاملہ کوئی مسئلہ ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ پاکستان میں کوئی مسئلہ نہیں مسئلے ہو سکتے ہیں اور شاید ہیں اور ان کے حل کرنے کی کوشش بھی کی جا رہی ہے۔ لیکن میں کم از کم زبان کے معاملہ کو کوئی الجھن نہیں سمجھتا۔ زبان خدا کی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ چاہے اس کو لغوی معنی میں لیں یا عرفی معنی میں اس لئے کہ زبان لغت میں چھوٹا سا گوشت کا لوتھڑا ہے اور اس گوشت کے لوتھڑے کا ہمارے معاشرے میں اور ادب میں بلکہ یوں کہئے کہ مذہب میں بہت بڑا مقام ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ انسان اپنے چھوٹے اعضا کی وجہ سے انسان کہلانے کا مستحق ہے، ایک زبان، دوسرے دل۔ اس لحاظ سے اگر میں یہ کہوں انسان زبان کی وجہ سے انسان ہے تو کسی طرح بے جا نہ ہوگا۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ منتظمین نے زبان سے یقیناً گوشت کا لوتھڑا مراد نہیں لیا۔ بلکہ ان کے نزدیک زبان بولی یا نطق و گویائی کے معنوں میں ہے۔ نطق اور گویائی بھی خدا کی بڑی نعمت ہے۔ ہم نطق و گویائی ہی کی وجہ سے انسان اور حیوان میں فرق کرتے ہیں بلکہ خود انسان، انسان میں بھی گویائی ہی کی وجہ سے فرق کیا جاتا ہے۔ ارسطو، یونان کا مشہور فلسفی ہے جب اس سے کہا گیا کہ وہ انسان کی تعریف کرے تو اس نے اس کے جواب میں کہا کہ انسان بولنے والا حیوان ہے۔ نطق کو یونانی زبان میں OCAS کہتے ہیں۔ جس کا عربوں نے کلمہ ترجمہ کیا ہے انسان کی شرافت اس گویائی، نطق اور کلمے کی رہین منت ہے۔ اس لحاظ سے میں نہیں سمجھتا کہ جو چیز انسان کو شرف بخشتی ہے اور اس کے لئے باعث رحمت ہے وہ ہمارے ملک میں ہمارے لئے زحمت بن سکتی ہے۔

یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ مطلق زبان پاکستان میں کوئی مسئلہ نہیں ہاں اس کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ پاکستان میں بسنے والے بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہیں۔ ان مختلف بولیوں میں کس طرح ہم آہنگی پیدا کی جائے اور ملک میں کس زبان کو پاکستان کی اہم زبان قرار دیا جائے۔ میرے خیال میں یہ بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ اس لئے کہ زبانوں کی کثرت اگرچہ بعض لوگ انسان کے اتحاد اور اتفاق کے لئے اور ایک جماعت کو دوسری جماعت کے قریب لانے کے لئے ایک مشکل سمجھتے ہیں، اور وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ جس ملک میں متعدد زبانیں بولی جاتی ہیں اس کے باشندوں میں اتحاد و اتفاق برابر نہیں ہو سکتا۔ یہ خیال غلط ہے زبانوں کی کثرت کوئی دقت نہیں اور نہ کوئی زحمت ہے۔ بلکہ قرآن حکیم کے مطابق زبانوں کی کثرت خدا کی ایک بڑی رحمت ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر خدا نے اپنی نعمتوں کا ذکر

انہوں نے فرمایا ہے کہ تم نہیں دیکھتے کہ ہم نے تمہارے رنگ جدا جدا اور تمہاری زبانیں الگ الگ اور ایک دوسرے سے جداگانہ بنائی ہیں۔ ہمارے یہاں ایک مسئلہ ہے اور وہ یہ کہ جب ملک کے مختلف زبانیں بولنے والے لوگ ایک دوسرے سے ملیں تو کس زبان میں گفتگو کریں۔ لیکن میں اسے بھی کوئی دقت نہیں سمجھتا کیونکہ ملک میں کم سے کم ایک زبان آج بھی ایسی ہے کہ جسے ملک کے بیشتر لوگ سمجھتے ہیں۔ لیکن اس زبان کے بارے میں بعض لوگوں کے دلوں میں کچھ شبہات ہیں وہ غالباً یہ سمجھتے ہیں کہ اگر یہ عام طور سے سمجھی جانے والی زبان مغربی پاکستان میں سرکاری زبان بنا دی گئی تو اس سے ملک کی دوسری بولی جانے والی علاقائی زبانوں کو نقصان پہنچے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ صحیح نہیں۔ اس لئے کہ اردو جو عام طور سے مغربی پاکستان میں سمجھی جاتی ہے۔ ملک کے کسی حصّے کی بولی جانے والی زبان نہیں یا یوں کہیئے کہ مغربی پاکستان کے کسی بڑے حصّے کی بولی جانے والی زبان نہیں۔ اس لئے اگر اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہوگی تو اردو انگریزی کی جگہ لیگی اور کسی علاقائی زبان کی جگہ نہیں لے گی۔ چنانچہ آج بھی دیکھا جا رہا ہے کہ جو لوگ ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آئے وہ جس علاقے میں بھی بسے اور جہاں انہوں نے سکونت اختیار کی وہ اس علاقے اور اسی مقام کی زبان میں اظہار خیال کرتے ہیں جو مہاجر سندھ میں بسے ہیں وہ سندھی بولتے ہیں۔ ادھر جو پنجاب یا سرحد میں رہتے ہیں وہ پنجابی اور پشتو استعمال کرتے ہیں البتہ اس زمانے میں انگریزی کو ملک گیر حیثیت حاصل ہے۔ کاروبار انگریزی میں ہوتا ہے اور سرکاری تحریریں انگریزی میں شائع ہوتی ہیں۔ اس لئے اگر اردو کو سرکاری زبان بنا دیا گیا تو صرف اتنا ہوگا کہ جو کاروبار انگریزی میں ہوتا ہے وہ اردو میں ہو۔ اور جو کارروائی انگریزی میں ہوتی ہے وہ اردو میں کی جائے۔

اس کے برعکس میرا خیال ہے کہ اردو کو اگر انگریزی کی جگہ دے دی گئی تو علاقائی زبانوں کی ترقی کے مواقع آج کے مقابلے میں زیادہ ہوں گے۔ اور اس سے ملک کو بہت فائدہ پہنچے گا۔ مختصر یہ کہ پاکستان میں زبانوں کی کثرت کوئی مسئلہ نہیں اور ملک کی کسی ایک زبان کو سرکاری زبان کی حیثیت دینے سے نہ علاقائی زبانوں کو کچھ نقصان پہنچتا ہے اور نہ ملک کی ترقی میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔

مجتبیٰ حسین

سیپ۔ کراچی

آغا شاعر کی شاعری پر ایک نظر

داغ کے اُٹھ جانے کے بعد ایک خاصا اہم سوال یہ تھا۔ کہ اب شاعری کون سی راہ اختیار کرے گی۔ آزاد اور حالی کی کوششوں اور بدلتے ہوئے معاشرتی اور معاشی حالات نے بڑی حد تک اس راہ کی طرف واضح اشارے کر دیئے تھے جس سے شاعری گزرنے والی تھی۔ پھر بھی لوگوں کے شعری مزاج میں غزل، اس طرح رچ گئی تھی۔ کہ اس وقت مستقبل کی اُردو شاعری کا چہرہ پوری طرح سامنے نہیں آسکتا تھا۔ داغ کی آواز پورے ہندوستان پر چھائی ہوئی تھی۔ ؏ ہندوستان میں دھوم ہماری زباں کی ہے؛ ان کی شاعری کی شوخی، طرّاری، عشوہ گری، اور زبان و محاورے کی دل آویزی، لوگوں کے دلوں کو اس طرح موہ چکی تھی۔ کہ خلوت و جلوت میں اُٹھتے بیٹھتے۔ انھیں کے اشعار پڑھے جاتے۔ داغ کی شاعری تہذیبی زندگی اور مجلس آرائی کا ایک جزو لازم بن چکی تھی۔ یہ اس محفل میں جو دھیرے دھیرے اُجڑتی چلی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر ہی کے لیے سہی، لطفِ سخن اور گرمیٔ محفل کا باعث بن جاتی۔ اسی لیے داغ کے بعد دلدادگانِ شعر کے ذہنوں میں یہ سوال گونج رہا تھا۔ کہ "اب کیا ہوگا؟" "اُٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون؟" یہ سوال دلّی کے شعراء کے لیے جن میں سے بیشتر کو داغ کی شاگردی کا شرف حاصل تھا خاص طور سے اہم تھا۔ اس سوال کے دو پہلو تھے۔ داغ کے بعد داغ ہی کے رنگ میں شاعری کی جائے یا اس سے ہٹ کر۔ اور یہ دونوں پہلو ایسے نہیں تھے۔ کہ آسانی سے جن کا جواب مل جائے۔ پہلی صورت میں داغ کے رنگ میں شعر کہنا۔ اور اپنے کو معتبر بنانا بہت مشکل کام تھا۔ اس کے لیے صرف داغ کی شاگردی یا مشاقی کی ہی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ خود بھی استاد ہونے اور اپنی بات کے لیے اپنا لہجہ پیدا کرنے کی بھی ضرورت تھی۔ داغ کے رنگ سے ہٹ کر کہنا بھی بہت مشکل تھا۔ اس جرأت کے لیے اس عہد کی رائج اور مقبول غزل گوئی سے کچھ آگے کے شعور کی بھی ضرورت تھی۔ آغا شاعر کے یہاں جو داغ کے ممتاز ترین شاگرد ہیں۔ یہ دونوں مشکلیں حل ہوتی نظر آتی ہیں۔ انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں اور غزل کے دائرے سے باہر قدم نکال کر معاشرتی مسائل پر بھی غور کیا ہے۔ اور نظم کو ذریعہ اظہار بنایا ہے۔ غزل سے اور وہ بھی داغ اسکول کی غزل سے قدم باہر رکھنا۔ اور نظم کے خارزار میں پہنچنا۔ بڑی جانکاہی حوصلے اور حقیقت شناسی کا کام تھا۔ آغا شاعر میں بڑی بات یہ تھی۔ کہ وہ زمانے سے بھاگنے کے قائل نہیں تھے۔ داغ کی شاگردی نے ان کی زبان پر دھار ضرور رکھ دی تھی۔ لیکن اس کے بعد وہ جو کچھ تھے۔ اور جو کچھ ہوئے۔ وہ اپنی ہی کوششوں اور جودتِ طبع کے باعث۔ وہ اپنی ایک مستقل ادبی شخصیت رکھتے تھے۔ وہ شاعر بھی تھے مترجم بھی تھے۔ نظم نگار بھی تھے۔ ڈرامہ نگار بھی تھے۔ اخبار نویس بھی تھے اور مضمون نگار بھی تھے۔ ان کی زندگی کے واقعات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بھی یہی تنوع تھا۔ وہ بڑے سادہ دل اور بھولے آدمی تھے۔ دوستوں سے ٹوٹ کر ملتے تھے۔ ان کے لیے بچھ جاتے تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ ان میں بانکپن اور خود داری بھی تھی۔ سپاہیانہ آن بان

[illegible] درویشی کی شان بھی پائی جاتی تھی۔ عاشق مزاج اور رنگین طبع ہونے کے باوصف بڑے مذہبی آدمی تھے۔ گوشہ نشین بھی تھے اور بہادر [illegible] بھی۔ پرانے زمانے کے شیدائی ہونے کے باوجود نئے عہد سے بے خبر نہیں تھے۔ اور آخری بات یہ کہ وہ دلی کے عاشق تھے دلی ان کی معشوق تھی۔ دلی ان کی تہذیب تھی دلی ان کی زبان تھی۔ دلی ان کی جان تھی۔ وہ دلی کے تھے اور دلی ہی نے ان کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ دلی کے بارے میں کس محبت کے ساتھ اور فخریہ طور پر انہوں نے کہا ہے۔

یہ دلی وہ ہے، زمیں آسماں کا دل تھا — یہ دلی وہ ہے کہ تاج و نشاں کا دل تھا
یہ دلی وہ ہے کہ ہندوستاں کا دل تھا — یہ دلی وہ ہے کہ سارے جہاں کا دل تھا

یہیں تو علمی مشاغل سے ہر روش تھی
یہ خاک وہ ہے جو علم و ہنر کا معدن تھی

آغا شاعر کی ادبی اور ذاتی زندگی کا یہ تنوع ہم آہنگی رکھتا ہے۔ اسی لئے اُن کی شاعری میں بیک وقت کئی رُخ ملتے ہیں داغ کی زبان کی شوخی اور بانکپن میں انھوں نے اپنی شخصیت کی شوخی اور بانکپن کو ملا دیا اور اس طرح ان کی غزلیں دو آتشہ بن گئی ہیں۔ یہ شعر دیکھئے قدیم رنگِ سخن کو کس قدر تیز کرکے کہا ہے۔

ابرو نہ سنوارا کرو کٹ جائے گی انگلی — نادان ہو، تلوار سے کھیلا نہیں کرتے

اور اس کے بعد اس شعر میں موسم برشگال کے ساتھ زبان کی مستی بھی دیکھئے ؎

کبھی ساون کی ہڑی ہو کبھی بھادوں برسے — ایسا برسے ترسے اللہ کے پیا جوں برسے

اور پھر یہ شعر بھی دیکھئے۔ جو زبان سے آگے کی چیز ہے۔ اور جس میں آغا شاعر نے اس جرأت سے کام لیا ہے جو داغ کے عہد میں مفقود نظر آتی ہے۔

جو برق و باد پہ قادر وہ اس قدر مجبور — کہ ایک سانس بڑھالے کا اختیار نہیں

خدا کے سلسلے میں یوں سوچنے کے انداز داغ کے بعد ہی بالعموم آسکتا تھا۔ زبان کی دلآویزی اور بندش کی چستی بھی اس شعر کی تلخی کو کم نہیں کرسکی آغا شاعر کی پوری شاعری میں خواہ وہ غزل کہہ رہے ہوں یا نظم دو چیزیں بڑی نمایاں ہیں۔ ایک تو یہی سامنے کی چیز ہے جسے ہم زبان کی صفائی کہہ سکتے ہیں۔ دوسرے اُن کی وسیع النظری، زبان کی پختگی اور قادر الکلامی۔ ان کی غزلوں اور نظموں میں دونوں میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے غزل میں جو زبان، شوخ، صاف اور چلبلی ہے۔ وہ نظموں میں پہنچ کر ایک نئے انداز سے ابھرتی ہے۔ ان کی غزلوں میں بول چال کا انداز یا بول چال کے جو مصرعوں میں پختگی اور برجستگی پیدا کرلینے کے لیے علاوہ ایک ہی شعر کے کئی رنگوں کو بڑی وضاحت سے پیش کر دیتا ہے۔ زبان کے اس بے تکلف انداز اور مصرعوں میں مختلف رنگ کو دیکھئے ؎

حشر میں انصاف ہوگا بس یہی سنتے رہو — کچھ یہاں ہوتا رہا ہے کچھ وہاں ہو جائے گا
تم بھلا کون تھے دل میں مرے آنیوالے — دیکھنا! جان نہ پہچان چلے آئے ہیں
کسی کے روکنے سے کب ترا دیوانہ رکتا ہے — بہار آئی چلا میں یہ دھری ہیں بیڑیاں میری
اک دن برس پڑو گے ہمیں پہ یہ کھل گیا — کب تک بھرو گے روز مری جان بھرے ہوئے

یہی زبان نظموں میں پہنچکر مشاہدے اور مطالب کو کامیابی سے ادا کرنے کا بڑا قوی ذریعہ بن جاتی ہے۔ ایک نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں۔ جس میں انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد [illegible] کے اعتقال امراء اور شرفا کی اولاد کی حالت زار کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ [illegible] بھیک بھی ابتو غریبوں کو نہیں ملتی ہے اب

اسی کے بعد یہ عبرت ناک المیہ بھی دیکھیے —

وہ بد مضطر و بیکار ہماری اولاد   جاہل و کودن و لاچار ہماری اولاد
مفلس و کاہل و نادار ہماری اولاد   جان سے ہو چکی تب بیزار ہماری اولاد

مٹ گئے ایسے کہ اب کچھ بھی نہ چھوڑا باقی
دین ہی خیر سے ان کا ہے نہ دنیا باقی

کوئی چپراس لگائے ہوئے چلمن بردار   کون ڈیوڑھی پہ کھڑا ہے کوئی باندھے تلوار
رات بھر کوئی کہا کرتا ہے جاگو ہشیار   کچھ زمیندار کے تخت بیچتے ہیں برخوردار

کون کہتا ہے کسی بات میں یہ ہیٹے ہیں
چھوٹے سرکار بڑی سرکار کے یہ بیٹے ہیں

اس بند میں "برخوردار" کا قافیہ کس لطف، خوبصورتی، برجستگی اور شائستگی کے ساتھ صرف ہوا ہے۔ زبان کا کمال تو ہے ہی مگر اس میں دیکھنے کی بات یہ بھی ہے کہ دلی اسکول کا شاعر کہاں سے کہاں تک پہنچ چکا ہے۔ اسی نظم کا ایک بند اور دیکھیے، جہاں طنز، افسوس میں تبدیل ہوتا نظر آتا ہے —

تیرہ مرزا کے گھرانے تھے ملک میں مشہور   اُن کے فرزند قلی بن گئے دیکھو، معذور
کچھ ڈبل روٹی پکاتے ہیں چشم بد دور   پیٹ کی آگ بجھاتے ہیں ایسی حسن و ستور

رات دن دیدۂ عبرت سے لہو بہتا ہے
خود یہ رو دیتے ہیں مرزا جو کوئی کہتا ہے

ان مشکل مقامات سے گزرنے کے لیے زبان نے کتنا ساتھ دیا ہے اس کا اندازہ ان بندوں سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ بند صرف اس لیے قابلِ توجہ نہیں ہیں کہ ان میں قادرالکلامی پائی جاتی ہے، ان کی اہمیت اس میں ہے کہ داغ نا شاعر نے اپنی عمر صرف غزل کے حجلۂ عروسی میں نہیں گزار دی۔ انھوں نے اس حجلے سے جھانک کر باہر بھی دیکھا ہے جہاں بڑی بے کیفی، اداسی اور شکن طاری تھی۔ بہار چل میلے بسے پڑے تھے۔ اور ان کی دیانت اور حق شناسی نے یہ گوارا نہیں کیا کہ وہ غزل کے حجلے میں بیٹھے وصل اور ہجر کے تصورات ہی سے کھیلا کریں۔ انھوں نے اس وقت کے ہندوستان پر نظر ڈالی۔ جو غلام اور مجبور کا تھا۔ ان کے سامنے اس کا شاندار ماضی پھر گیا۔ اور پھر وہ دکھ بھرے لہجے میں ماضی اور حال کو یاد کرتے رہے۔ ان کی نظم "بھارت ماتا کی فریاد" ان اشعار سے شروع ہوتی ہے —

وہ اسیرِ دامِ بلا ہوں میں جسے سانس تک بھی نہ آ سکے   وہ قتیلِ خنجرِ ظلم ہوں جو نہ آنکھ اپنی پھرا سکے
مجھے آسماں نے مٹا دیا، مجھے ہر نظر سے گرا دیا   مجھے خاک ہی میں ملا دیا کہ نہ اب تو کوئی اٹھا سکے
مرے سورمیر کہاں گئے، مرے قلعہ گیر کہاں گئے   وہ مہ منیر کہاں گئے جو کبھی پلٹ کے نہ آ سکے

اور آخری شعر میں جوگی کی آواز آتی ہے —

ہے شاعروں کی ہی بانسری نہ رہی کسی کی نہ ہے   یہ بڑی پھسلنی زمین ہے یہاں پاؤں کون جما سکے

آغا شاعر کی اس قسم کی نظموں میں اگر ہم آج کا سیاسی شعور ڈھونڈیں تو وہ یقیناً نہیں ملے گا۔ یہ نظمیں سماجی اصلاح کے نقطۂ نظر سے کہی گئی ہیں۔ اور انھیں حدود میں انھیں دیکھ کر دیکھنا مناسب ہوگا۔ ان کی اس نوع کی نظموں میں بار بار ہندوستان کا شاندار ماضی ابھرتا ہوا نظر آتا

اس کے بعد موجودہ زبوں حالات کا بیان ملتا ہے اور پھر عمل اور اصلاح کی تلقین پائی جاتی ہے۔ ایک ایسے شاعر کے لیے جس کی شاعری غزل کے پھولوں سے معطر ہو اس خزاں رسیدہ باغ کی طرف آنکلنا بڑی بات ہے۔

فنی حیثیت سے ان کی نظمیں بیشتر بیانیہ اور محاکاتی ہیں۔ جن میں اجمال سے زیادہ تفصیل کا حسن ملتا ہے۔ اس دور کے بہت سے نظم گو شعرا کا انداز یہی تھا کہ وہ کسی ایک موضوع کو منتخب کرتے تھے۔ پھر اس کے نمایاں پہلوؤں کو خارجی انداز میں شاعرانہ توجیہات کے ذریعے بالتفصیل بیان کرتے جاتے تھے۔ اس طرح نظم اپنے بیانیہ تسلسل کے باعث فنی تکمیل تک تو فوراً پہنچ جاتی۔ لیکن اس میں کوئی گہری فکر یا گہرا جذبہ کم ہی پایا جاتا تھا۔ ان کی اسی نوع کی نظموں میں ڈیلیا کے چند بند ملاحظہ ہوں۔ جس میں حسن تخیل تفصیل میں جا کر اشعار کے پھول کھلاتی ہے۔

اِک نیا پھول ڈیلیا دیکھا — صدقے اترے ہزاروں لالا
لب معشوق پنکھڑی پہ فدا — خانے خانے میں جیسے شہد بھرا
اللہ اللہ عجیب گل پھولا!
ڈیلیا تو نے دل کو لے لیا

لچھوی پتیاں دو چند سہ چند — شاخ در شاخ نت نئے پیوند
اوس کے موتیوں سے دولتمند — کیا شگوفے ہیں کچھ کھلے کچھ بند
بھا گئی تیری ایک ایک ادا
ڈیلیا تو نے دل کو موہ لیا

آغا شاعر کی منظریہ شاعری میں بھی نیا رنگ ملتا ہے۔ موسموں، برسات کی گھٹاؤں، باغوں اور پھولوں پر صاف ستھری پاکیزہ اور دلکش نظمیں لکھی ہیں۔ اور کبھی کبھی ان نظموں میں ایسے سبق آموز نتائج بھی ملتے ہیں۔ جو اس وقت کے نظم گو شعرا کا ایک مخصوص طریقہ تھا۔ ان کی نظموں میں دلسوزی مشاہدے کی سچائی اور زبان کا لطف ملتا ہے۔ اُن کی نظموں میں خواہ وہ سماجی ہوں یا منظری، ایک مخصوص قسم کی ہندوستانیت پائی جاتی ہے۔ ہندی کے ہلکے پھلکے خوبصورت الفاظ ان کی شاعری میں جا بجا آتے رہتے ہیں۔ اور ہمیں بار بار احساس دلاتے ہیں، کہ شاعر اپنی دنیا، اپنے ماحول اور اپنی زمین سے بڑا انس رکھتا ہے۔ آغا شاعر کی زبان کی طرح اُن کی تخیل بھی نمکین اور شیریں ہے۔ ان دونوں کے امتزاج سے ان کی نظموں میں ایک خاص قسم کی چاشنی پیدا ہوگئی ہے۔ مجموعی حیثیت سے آغا شاعر کے کلام میں لطافت اور محبت کی تلاش ملتی ہے۔ ان کی زندگی اور شاعری دونوں میں لطافت پاکیزگی، حسن اور محبت کی جستجو پائی جاتی ہے۔ ان کی نظمیں ہم سے کہتی ہیں۔ کہ اگر دل کشادہ ہو تو ہر چیز میں حسن مل سکتا ہے اور ہر چیز محبت کے قابل ہو سکتی ہے۔ آغا شاعر کی پوری شاعری میں ہمیں دل کی یہ دولت مل جائے گی

منظور شدہ محکمہ تعلیمات کراچی بموجب سرکلر نمبر ڈی۔ای/آر/جی/ای/ ۳۰۰۵-۲۰۰-۱۰/۶۰ مورخہ ۲۶ ستمبر ۶۲ء

اردو ادب کا ڈائجسٹ

نقش کراچی

۹ - ۶۴

ستمبر ۶۴

ادارہ

شاہد احمد دہلوی ـ شمس زبیری

قیمت	سالانہ
ایک روپیہ	بارہ روپے

کاشانۂ اردو - پوسٹ بکس ۳۰۲ - کراچی ۳

فون - ۷۰۱۵۶

ترتیب

افسانے اور خاکے

طنز و مزاح

منظومات

مضمون

۸ راگست ۱۹۶۴ء کو

میری والدۂ محترمہ

نے چند ماہ کی شدید علالت کے بعد داعیٔ اجل کو لبیک کہا

إنّا لله وإنا إليه راجعون

اس حادثۂ فاجعہ پر جن بزرگوں، عزیزوں اور دوستوں نے بکمال شفقت و محبت اظہارِ ہمدردی کے پیغامات ارسال فرمائے ہیں ان کا فرداً فرداً جواب دینا میرے لئے کسی طرح ممکن نہیں ہے اسلئے میں اِن چند سطور کے ذریعہ ان تمام حضرات کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

شمس زبیری

عصمت چغتائی

فنون۔ لاہور

باچھو

عباس چھوٹی موٹی قسم کا آدمی ہے۔ ایک بار اسے بڑی لمبی سنا چکی ہوں۔ بُری طرح روٹھ گیا تھا۔ چھ سات برس دل میں سینگ کا کانٹا بسائے بیٹھا رہا۔ اوّل تو ملاقات ہی نہیں۔ جو بھولے بھٹکے مڈبھیڑ ہو گئی تو صفا کنّی کاٹ جاتا۔ یا ایسے آرپار دیکھتا جیسے کوئی شیشے کا بنا ہے۔ یہاں تو دس بھائی بہنوں کی سنگت میں عمر گذری۔ مار پیٹ دلچسپ ترین مشغلہ رہا۔ ایک دوسرے کا زبان سے زیادہ دل دکھا کر آٹھ آٹھ آنسو رلانا، طرح طرح کی ذکیں دینا، عین شرافت اور فراخدلی سمجھا جاتا تھا۔ منٹو سے وہ تو تو میں میں ہوا کرتی تھی۔ کہ الٰہی توبہ! بس مار پیٹ کی نوبت نہ آئی۔ ویسے حیا شرم ہو تو دو بول ہی چلّو بھر پانی میں ڈوب مرنے کو کافی ہوتے ہیں۔ جو کبھی ہو پلے۔

تو کہیں پھر کوئی ایسی بات نہ کہہ جاؤں کہ عباس پھر چھ سات سال کو تن جائے۔ اور اب چھ سات سال گنوانے کی مہلت نہیں۔ ان بھاگتے دوڑتے لمحوں کو چن چن کر آنکھوں سے لگا لینے کا سمے ہے۔

میری طرح اور سب کو بھی شاید عباس کے بارے میں کچھ لکھتے ہوئے تکلف ہوتا ہو گا۔ جبھی تو وہ عباس جسے میں نے دیکھا ہے اور جس کے بہت سے دوست جانتے ہیں۔ احاطۂ تحریر میں نظر نہیں آتا۔ خواجہ صاحب کو تو کئی بار دیکھا ہے۔ مگر "باچھو" کو بہت کم لوگوں نے جانا اور جانچا ہے

باچھو! ڈھیر ساری بہنوں کا اکلوتا بھائی، اپنی نسل کا واحد سلطان، جو بے عیب، نہایت معمولی مگر چکنی مٹی کا بنا ہوا ہے۔ عجیب چوں چوں کا مربہ ہے۔ آدمی کیا پنچشاخہ ہے۔ ایک طرف تو ایسا کٹر سید کہ شراب نہیں پیتا سگریٹ جلاتا مگر دھواں پھیپھڑوں تک نہیں کھینچتا۔ پان تمباکو سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ فلیش کھیلتا ہے مگر بے دلی سے صرف نفنگوں کا ساتھ دینے کے لئے۔ پینے پلانے کی دعوتوں میں بیٹھا بور ہوا کرتا ہے۔ "لاحول ولاقوۃ! بھئی حد ہو گئی!" وہ اکتایا ہوا کھانوں کی خوشبو سونگھ سونگھ کے جاتا ہے اور حد کرنے والے اسے دیکھ کر ترس کھاتے ہیں جیسے وہ لنگڑا لولا یا کانا ہو۔ لوگ کہتے ہیں ابھی تک اس کے منہ سے ماں کے دودھ کی بو آتی ہے۔

دوسری طرف اس میں وہ تمام کمزوریاں ہیں جو فرشتہ اور شیطان کے بیچ کی زنجیر میں گندھی ہوتی ہیں۔ اس کی سب سے بڑی کمزوری عورت ہے، ماں، بہن، بیٹی، محبوبہ، غرض ہر شکل میں عورت عباس کو ورغلا سکتی ہے۔ وہ ایک ہی سانس میں سروجنی نائیڈو سے لیکر سنہ پر بھا پردھان تک سے والہانہ عشق کر سکتا ہے۔ محبوبہ کے لئے لازمی نہیں کہ مجسم جسم ہو۔ ساتھ تو عباس کی تحریریں پڑھنے والوں کو بھی اندازہ ہوگا۔ کہ عباس عورت کے جسم کو بیکار فرصت سے زیادہ نہیں ٹٹولتا۔ وہ اس کے سینے کے اتار چڑھاؤ پر قلابازیاں کھاتا نظر نہیں آتا۔ نہ نخشا

کے سائے میں ریشمی آنچل کیلئے واویلا مچاتا ہے۔ نہ خمِ ابرو کا گھائل نہ رسیلے ہونٹوں کا پیاسا، کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی محبوبہ کا نقشہ کچھ یونہی نام چار کو ہے۔

مگر وہ جو کسی نے کہا ہے آنکھ نہ ناک بہو چاند سی۔ عباس کی "عورت" میں نسوانیت کی بھرمار ہے۔ اس کا بڑا طول و عرض ہے۔ اس کا مقام صرف بستر یا باورچیخانہ نہیں۔ عباس اسے ٹک کر بیٹھنے نہیں دیتا۔ تگنی کا ناچ نچاتا ہے۔ یارِ غار کی طرح وہ اسے ہر جگہ دوڑائے پھرتا ہے وہ اسے اپنے ساتھ چلنے کے لئے نہیں پکارتا۔ بس مڑ کے دیکھتا ہے تو اسے پہلو میں پا لیتا ہے۔ اور پھر مسکرا کر چلنے لگتا ہے۔

عباس سے میری کبھی کھل کر بات تو نہیں ہوئی۔ مگر مجھے معلوم ہوا ہے کہ "با ادب با ملاحظہ" قسم کے علاوہ بھی اس نے عشق کئے ہیں۔ مگر جب محبوبہ دل نواز کی بالائی منزل کو یکسر کھوکھلا پایا ہے۔ تو رو کر بھاگ کھڑا ہوا ہے۔ عام طور پر لوگوں کو نہایت الھڑ الو کی پٹھی قسم کی محبوبہ پسند ہے جو مارے بھولپن کے حرام کے بچے جنتی پھرتی ہے اور اپنی کمزوری کا سارا الزام ظالم سماج اور بیوفا مرد پر تھوپ دیتی ہے۔ مگر عباس کی ہیروئن خواہ کتنی بھی جاہل ہو، الو کی پٹھی نہیں ہوتی۔ اس کے اعضا میں کھوپڑی بھی ہوتی ہے جو عموماً خالی نہیں ہوتی۔ عباس مرد یا سماج کو دنیا کی ہر بلا کا ذمہ دار ٹھہرا کر ان کے پیچھے ڈنڈا لے کر پھرنے کا قائل نہیں۔ وہ اصلی دشمن کو عرصہ ہوا ہے پہچان چکا ہے۔ نہ مرد بے وفا اور ظالم ہے۔ نہ عورت ناقص العقل دال چاول بے وفا ہیں۔ گھی دغاباز ہے۔ کوئلے جعل ساز ہیں اور وہ جن کے پاس رزق کی کنجی ہے۔ سب سے زیادہ ناقص العقل اور بے رحم معشوق ہیں۔ ان کی نازبرداریاں جو کم ہیں۔ اور ظلم تو اس نے معشوق کے بھی نہ سہے۔ اول جلول قسم کا آدمی ہے۔ اصول کی بات آن پڑی ہے تو اس نے بڑے بڑے جفادری معشوقوں کی دھتا بتا دی ہے۔ اور کسی نے اس کے دامن پر آنسو کی ایک بوند تک نہیں دیکھی۔ فوراً ملبہ جھاڑ جھوڑ پہلے سے بھی زیادہ تندہی اور منہ زوری سے جینے لگتا ہے۔

عباس ڈھیٹ ہے بے انتہا ڈھیٹ یا ناکامی اور نامرادی کی مجال نہیں۔ جو اسے دھونسیا کر پست کرنے کی کوشش کریں۔ وہ ویسے بھی چار چھ آدمیوں بھر کام کرتا ہے اور جو کہیں دل ٹوٹ جائے، کوئی رکاوٹ سامنے آجائے۔ تو دس آدمیوں کی محنت جھیلنے لگتا ہے۔ پھر عباس کو شدید مغالطہ ہے۔ کہ وہ کوئی عظیم کام نہیں کر سکا۔ دنیا بھر کی خاک چھاننے کے علاوہ اس نے کہانیاں، ناولیں اور مضامین لکھے ہیں۔ ڈرامے لکھے ہیں۔ اور اسٹیج کئے ہیں۔ اور ان میں جسے چاہا گھسیٹ کر اسٹیج کر دیا ـــــ سُپر ہٹ فلم لکھے ہیں۔ اور سپر فلوپ فلمیں بنائی ہیں۔ چار چار ہیرو اور ہیروئن کو لے کر بھی فلم بنائی ہے۔ اور تو اور .... کہ کچھ کر بھی دکھا دیا ہے۔ جب کوئی کام کرتا ہے تو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر سب کی توجہ منعطف کرانا چاہتا ہے۔ لیکن گھبراہٹ اور وحشت کا یہ عالم ہے کہ کوئی تعریف کرے تو یقین نہیں کرے گا۔ منہ دیکھی بات سمجھ کر ٹال جائے گا۔ برائی کرو تو اداس ہو جائے گا۔ مگر عام طور پر جب تک ناقدین اپنا قلم اٹھائیں۔ وہ یکسر پرانی چیز کو بھول کر بالکل ہی ان گھڑ قسم کا کوئی اور سلسلہ کھڑا کر دے گا۔ عجب جنجال قسم کا آدمی ہے۔ لگ جائے تو چھٹائے نہ چھٹے اور چھوٹ جائے تو پھر دنیا کا طاقت ور ترین گوند بھی پانی ہو جائے۔ غرض نہ جانے کتنی انتہائی متضاد شخصیتیں ایک اکیلے انسان میں دھینگا دھم مچا رہی ہیں۔ دنیا کا شاید ہی کوئی چکر ہو جس میں وہ دل و جان سے پھاند پڑنے کا شوقین نہیں۔ قوم ملک اور انسانیت کی بہبودی کے لئے اگر کوئی بندر کا تماشا کرے۔ تو وہ فوراً ڈگڈگی لے کر کھڑا ہو جائے گا۔ اب کوئی لاکھ رسیاں تڑائے، سر پھوڑے وہ پکڑ دھکڑ کر آس پاس کے ہر فرد کو اس ہنگامے میں دھنسا دے گا۔ میں نے تو آج تک کوئی ہنگامہ ایسا دیکھا نہیں۔ جس میں عباس سب سے آگے صلیب اٹھائے نہ چل رہا ہو۔

کبھی کبھی تو عباس کی سیاست بوکھلا دیتی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے وہ کمیونسٹ ہے۔ بلکہ کمیونسٹ بلاک میں ساری اودھم کا بھی ذمہ دار ہے۔ آندھرا سے لے کر ملیں تک دند مچا رکھا ہے۔ مگر کمیونسٹوں نے بارہا اسے چوراہے پر پھانسی دینے کے پختہ وعدے کئے ہیں۔ سب کو چندھیا رکھا ہے۔ تنقید نگار کہتے ہیں۔ وہ صحافی ہے اور صحافی کہتے ہیں۔ وہ افسانہ نگار ہے۔ اب کسے جھوٹا مانیں۔ اس لئے میں تو دونوں کی بات مانے

یقین ہوں کہ جو کچھ کیا ہے بے انتہا ہے۔ بے انداز ہے۔ لامتناہی ہے۔ خدا نہ کرے جو وہ اس سے زیادہ ہو۔ جتنا ہے اتنا ہی ہضم کرنا دشوار ہے۔

کبھی تو عباس کا خلوص اور جوش دیکھ کر ماتھا ٹھنک جاتا ہے یہ جو اتنی محبت کر رہا ہے۔ تمام گڑبڑ یہاں کمی ہے اس میں خود عباس کا کوئی فائدہ ہوگا۔ مگر جب ہر ہنگامے کے ختم پر اس کے ہاتھوں میں صرف خسارہ ہی نظر آتا ہے۔ تو انسان کا جی جل جاتا ہے کہ وہ آخر ایسی روٹ پتا کیوں کرتا ہے۔ اس کی فکر نہیں۔ مگر طوفان کو آپ بجا بجا سکتے ہیں۔ عباس کو دبا نہیں کیجئے۔ عباس کے یہاں تو روز فردا بھی آتی ہی ہے۔

اس بیڑھے میڑھے انسان میں جملہ چھوٹی موٹی برائیوں کے سب سے بھیانک برائی یہ ہے کہ وہ کبھی لائق فائق شوہر نہ بن سکے۔ اور نہ کچھ آثار نظر آتے ہیں۔ وہ ایک لاجواب دوست بن سکتا ہے۔ زنا ٹے دار کہانیاں لکھ سکتا ہے۔ فی البدیہہ دھواں دار تقریریں جھاڑ سکتا ہے جٹ جائے تو دنیا کا تختہ لوٹ سکتا ہے۔ مگر اس میں کسی کا "سرتاج من سلامت" بننے کا بیج ہی نہیں۔ وہ کسی کا ہو کے رہنے کا قائل نہیں خواہ وہ کوئی جذبہ ہو یا پسلی۔ کوئی اصول ہو یا کوئی بت کا ذر۔ اگر اس کا ضمیر کسی بندھن کے خلاف گواہی دیتا ہے۔ تو وہ اسے توڑ پھینکتا ہے۔ اسے کسی یقین یا رواج کی رسیوں میں جکڑنا ممکن ہی نہیں۔ وہ نہ کسی کو اپنی جاگیر سمجھتا ہے اور نہ کسی کی ملکیت بن کر جی سکتا ہے۔

عباس کا ایک خوبصورت سا گھر ہے جہاں سوائے اس کے ہر شخص گھر والا نظر آتا ہے۔ عموماً گھر پہ مہمانوں ہی کا قبضہ رہتا ہے۔ لوگ نہایت دریادلی سے اس کے بستر پر سوتے ہیں۔ تولیہ چادر استعمال کرتے ہیں۔ اس کے کرتے پاجامے پہن جاتے ہیں۔ اور اسے اپنا آبائی حق سمجھتے ہیں۔ کھانے کی میز پر اگر جگہ نہ ہو تو وہ سب سے پہلے کونے میں رکابی تھام کر کھڑا ہو جائے گا۔ اپنے گھر کا صاحب نہیں کوئی اٹھائی گیرا مفت خورہ بن بلایا مہمان نظر آنے لگتا ہے۔ اس کی مرحومہ بیوی بھی میری بڑی پیاری دوست تھی۔ اکثر عباس کی ان بےڈھنگی عادتوں پر سر جوڑ کر باتیں ہوا کرتی تھیں۔ وہ عباس کی بیوی بعد میں، پہلے اس کی دوست ہمدم اور ماموں زاد بہن تھی۔ اسے عباس کی جملہ کمزوریوں اور بے ڈھنگے پن سے شدت سے پیار آتا تھا۔ ایسا احمقانہ پیار جسے جرح اور بحث سے درہم برہم نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جس میں ہوش اور عقل کا کوئی دخل نہیں ہوتا اس کے باوجود وہ بھی عباس کے لاابالی پن سے بوکھلا جایا کرتی تھی۔ بڑی جاں فشانی سے اجڑا ہوا گھر سنوارتی، کھوئی ہوئی چیزوں کا سراغ لگاتی مگر جیسے ہی وہ چار دن کے لئے میکے جاتی۔ عباس پھر گھر کو طبیلہ بنا ڈالتا۔

میں خود عباس کے گھر میں مہمان رہ چکی ہوں۔ میرے سو کر جاگنے سے پہلے وہ کام پر چلا جاتا تھا اور سونے کے بعد واپس لوٹتا تھا۔ کبھی اچانک ملاقات ہو جاتی تھی۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے برسوں کے بچھڑے ملے ہیں اور گھر کا یہ حال تھا۔ کہ جیسے لنگر خانہ کھلا ہے صلائے عام ہے جس نکتہ داں کا جی چاہے بے تکلف آئے۔ ڈٹ کر کھانا کھائے۔ الماری سے کپڑے نکال کر زیب تن فرمائے۔ اور ٹھاٹ سے سو جائے میرا کمرہ بالکل علیحدہ تھا۔ اس لئے ہر آنے والے سے متعارف ہونا ضروری نہیں تھا۔ کبھی بھولے بھٹکے ڈرائنگ روم میں آ جاتی تو ایسا معلوم ہوتا۔ کہ کسی اجنبی گھر میں بھولے سے گھس گئی ہوں۔ ایک سے ایک نیا جانور نظر آتا۔ رات کو گھر کا چپہ چپہ سوائے میرے کمرے کے عوامی خواب گاہ بن جاتا۔ پلنگوں کے بعد صوفہ اور پھر فرش کی باری آتی۔ سونے والے کھانے کی میز پر کتابیں سر کے نیچے دبا کر نہایت میٹھی نیند سو جاتے۔

تب رات گئے عباس تھکا ہارا بینی کی دھول پھانک کر لوٹتا۔ مہمانوں کے جنگل میں بھٹکتا، ٹانگوں میں الجھ کر منہ کے بل گرتا۔ پیر جلانے کی کوشش کرتا۔ کھانا روز ہی اچانک بغیر اطلاع آنے والے مہمان ہضم کر چکے ہوتے۔ اور وہ بھوکے بلاؤ کی طرح باورچی خانے میں پتیلیاں جھانک کر، پیٹ پر فائل باندھ کسی کونے میں آڑا ترچھا سکڑ جاتا۔

میں نے بڑی مستعدی سے عباس کو ان دوستوں سے بچانے کی کوشش کی۔ مگر وہ دوگنی مستعدی سے خود میرے جگری دوست بن گئے ماحول ہی کچھ ایسا تھا۔ کسی کو نوکری کی تلاش ہوتی۔ کوئی گھر سے بھاگ آتا۔ کسی کو فلم کا شوق ستاتا۔ کوئی انقلاب لانے کا تہیہ کرتا۔ یا کسی کو ان گنت قسم کا عشق لاحق ہوتا۔ وہ سیدھا عباس کے گھر کا رخ کرتا۔ عباس ترقی پسند ہے باغی ہے اشتراکیت کا حامی ہے۔ تو بس پھر اسے عشق کا

سب کو جینا چاہئے۔

ٹھیک یاد نہیں، شاید عباس کو میں نے سب سے پہلے علی گڑھ کے کسی مقابلۂ تقریر کے موقعہ پر کوئی فرلانگ بھر کے فاصلے سے چقوں کے پیچھے سے دیکھا تھا۔ ایک نہایت منحنی سا لڑکا سر پہ ڈھیروں بال اٹھائے اپنی زناٹے دار تقریر کے ذریعہ زمین و آسمان ایک کئے دے رہا تھا اور حسب دستور میرے آس پاس بیٹھی ہوئی زیادہ تر لڑکیاں اُس پہ عاشق ہو چکی تھیں یا ہونے والی تھیں۔ اس مجمع میں وہ بت طناز بھی جلوہ افروز تھی جس پر عباس مرتا تھا۔ یا شاید اس کی دوسری یا تیسری بہن ہوگی۔ گرلز کالج کی لڑکیوں میں یہ افواہ گرم تھی۔ کہ عباس بیک وقت کئی بہنوں پہ عاشق تھا۔ حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ وہ سارے خاندان پر بُری طرح فریفتہ تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ کچھ دبا تھی۔ بلکہ صرف اس لئے کہ وہ سارا خاندان ہی نہایت تعلیمیافتہ تھا۔ ہزار بندشوں کے باوجود سب لڑکیوں نے اعلیٰ تعلیم پائی تھی اور نوکریاں کر رہی تھیں۔ اس زمانے میں یہ نہایت باغیانہ اقدام تھا۔ لہٰذا عباس کو لامحالہ ان پر فریفتہ ہونا پڑا۔ اور شاید وہ کسی حسینہ کا نہیں۔ حسین خیال پہ ایک جان چھوڑ ہزار جان سے عاشق تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا۔ جب لڑکیاں سخت بغاوت پر اتر آئیں تو مجاز، سردار جعفری، جذبی، اور عباس وغیرہ کی قسم کے لڑکوں سے شادی کرنے کی دھمکیاں دیا کرتی تھیں۔ اب یہ تو نصیب کی بات ہے کہ یہ لوگ نکھٹو نکل گئے اور ان بچاریوں کو مجبوراً اعلیٰ افسروں سے شادیاں کرنی پڑیں

پھر دوسری ملاقات عباس سے پاٹن والا بلڈنگ میں نہایت نازک موقع پہ ہوئی۔ محسن عبداللہ اور احمد عباس گواہ اور وکیل کی حیثیت سے نکاح کے وقت ایجاب و قبول کے سلسلے میں میری مرضی لینے آئے تھے۔ اس وقت میں بھی بدحواس تھی۔ اور عباس کے چہرے پر بھی ہوائیاں چھوٹ رہی تھیں لیکن اس کے بعد کئی سال ہم مسلسل ایک دوسرے کے پڑوس میں رہے اس وقت بھی عباس کا گھر مہمانوں سے بریز تھا۔ عجب ہنگامہ برپا رہتا تھا کبھی عباس اس گھمسان سے بوکھلا کر میرے یہاں آجاتا مگر مہمانوں کا ایک دور یہاں بھی چل رہا ہوتا عباس بوکھلا کر کام کرنے کسی اور کے ہاں مہمان چلا جاتا۔

عباس کو لوگوں کی ہر طرح سے مدد کرنے کا جنون ہے۔ ہی لوگ بھی خاصی دھونس جما کر مدد وصول کرتے ہیں۔ جیسے الٹا اس کی جان پر احسان کر رہے ہوں۔ قوم کا خادم ہے تو اپنا بھی کوئی غلام ہوا۔ اگر وہ کسی کی پوری طرح خدمت کرنے کا شرف حاصل نہیں کر پاتا۔ تو یہ اس کی انتہائی بدنصیبی ہے۔ صنف نازک تو اس پر اپنا آبائی حق سمجھتی ہیں۔ آخر وہ پروگریسو کس مرض کا جو استعمال نہ کیا جائے۔ اور جب وہ ان کے لئے سر کھاڑی پیر پہیہ کرتا ہے تو وہ سمجھتی ہیں وہ ضرور ان پر عاشق ہے اور وہ اسے اپنے اوپر عاشق ہونے کی اجازت دے رہی ہیں، یہی اس کی محنت کا معاوضہ ہے۔ کچھ ایسی بھی ہیں جو اپنے شوہر یا عاشق سے پٹ کر آنسو بہانے کے لئے صرف عباس کا کندھا ہی موزوں سمجھتی ہیں۔ ایسے آنسو پونچھنے کے لئے عباس کے دامن میں بڑی وسعت ہے وہ ان آنسوؤں میں غوطے کھانے لگتا ہے وہ اس نالائق شوہر سے پیچھا چھڑانے کے مسئلہ کو ایک قومی مہم کا درجہ دے کر شد و مد سے جُٹ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ مظلوم بیویوں کو شبہ ہونے لگتا ہے کہ وہ ان پر عاشق ہو گیا ہے۔ یہ اُس کی سراسر زیادتی ہے۔

میں نے عباس کو دیکھا ہے، دور سے بھی، پاس سے بھی، نفرت بھی کی ہے اور سنگ مرمر کا بت بنا کر طاق میں بٹھانے کی کوشش بھی کی ہے۔ اور جب خاک کا پتلا اوندھے منہ گرا ہے تو اسے مٹا کر خاک کرنے کو بھی جی چاہا ہے۔ مگر جب خاک کے ذرے آنکھوں میں پہاڑ بن کر کھٹکنے لگے ہیں تو جھنجھلاہٹ بھی آئی ہے۔ میں نے اس کے قہقہے سنے ہیں اور آنسو بھی دیکھے ہیں۔ وہ رات جب وہ چار دن کی بیاہی دلہن کو لے کر اچانک ملاڈ میں ملنے چلا آیا تھا۔ اور وہ رات بھی جب بمبئی ہاسپٹل کے سامنے وہ دوستوں کے مجمع میں اکیلا کھڑا تھا۔ دفن کا مسئلہ درپیش تھا۔ کن عقائد کے مطابق ہو اگر سب سہمے کھڑے تھے۔ عباس سے پوچھنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ جیسے خود ان کے دفن کا

مسئلہ ہو۔ اور وہ پوچھ بیٹھے۔ کہ

"کیا موت کا بھی کوئی عقیدہ، مذہب یا ایمان ہے؟" تو کون جواب دے گا۔

اس لئے میں جانتی ہوں عباس حسین سے حسین اور نازک ہاتھ، پیر، کان یا ناک سے عشق نہیں کرتا۔ وہ تو اپنے اس اصول سے عشق کرتا ہے جس کی رو سے ہر پیروں تلے کچلی جانے والی ہستی کو اٹھا کر ماتھے سے لگانا فرضِ انسانیت ہے۔ اس نے زندگی میں عورت کی ہر مشہد میں بے قدری اور گت دیکھی ہے۔ والدین کی موجودگی میں، یتیم، سہاگن ہو کر، بیوہ اور ماں بن کر، بانجھ ہونے کی لعنت میں گرفتار دیکھا ہے اور کلیجے میں بیٹھیں اٹھی ہیں۔

مگر پھر بھی میں یقین سے کہہ سکتی ہوں۔ کہ دنیا کی حسین ترین عورت اگر اس کی گردن میں اپنی باہیں حائل کر دے اور کہے۔

"جانِ من! آج قومی اتحاد کے جلسہ میں نہ جاؤ نہیں تو میں تمہارے فراق میں گھل گھل کر جان دے دوں گی"

تو وہ ٹھنڈی سانس بھر کے موم کی طرح پگھل جائے گا۔ اور کلیجے پر پتھر رکھ کے مرمریں باہیں میلے مفلر کی طرح اتار پھینکے گا اور چلا جائے گا۔ کیونکہ عباس ایک اصول ہے — ایک یقین ہے ایک ارادہ ہے۔

جب ہی تو آج اس کے گلے میں مرمریں باہوں کے ہار کے بجائے سپونسروں کا ہار کالر ہے اور چھاتی پر دھرتی کا بوجھ۔ کہ اس کی یہی سزا ہے۔ اور یہی انعام!

چند اہم کتابیں

ہماری داستان کون ہے جو سید وقار عظیم کے نام سے واقف نہیں کسی نے اگر ان کے نقادانہ کمالات کا جائزہ نہیں لیا ہے تب بھی ان کی کوئی نہ کوئی تحریر ضرور دیکھی ہوگی۔

سید وقار عظیم نے یوں تو مختلف شعبہ ہائے ادب پر قلم اٹھایا ہے لیکن افسانوی ادب ان کا خاص موضوع ہے اس سلسلے میں کئی ہی تصانیف شائع ہو چکی ہیں اور ہماری داستانیں ان کی ایک عظیم کڑی ہے۔ جو نہ صرف مصنف کے وقار کی شایاں شان ہے بلکہ اسے اردو کی ایک گرانقدر تصنیف ہے۔ اس کتاب کو داستان گوئی اور داستان نویسی کی تاریخ کا درجہ حاصل ہے جس میں تنقید کے معیار پر ہر فن کار کی صحیح جگہ متعین نظر آتی ہے نقاد کے قلم کو بے لاگ ہونا چاہئے اس کا ثبوت وقار عظیم کی ہر تحریر دیتی ہے مگر اس کتاب میں تو انھوں نے انصاف پسندی اور معتدل نقد و نظر کی ایک نظیر قائم کر دی ہے اردو کی داستان ہمیشہ جس کی منت کش رہے گی۔ فن داستان گوئی۔ داستان نگاری کی یہ بیش قیمت دستاویز مصنف کی نظر ثانی کے بعد بار دیگر شائع کی گئی ہے اور حسن کتابت وطباعت کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ قیمت دس روپیہ۔

تنقیدی اشارے اُردو تنقید میں چند نام سرفہرست نظر آتے ہیں جن میں ایک نام آل احمد سرور کا بھی ہے ان کی دل آویز اور متوازن تنقید کے اولین نقوش کا یادگار سرمایہ "تنقیدی اشارے" ہے جو مختصر ریڈیائی مضامین پر مشتمل ہے لیکن جس کی ادبی افادیت اور اہمیت کبھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے۔ کہ ہندوستان میں کئی بار چھپنے کے باوجود پاکستان کا نیا ایڈیشن مصنف کی نظر ثانی کے بعد پھر شائع کیا گیا ہے۔ قیمت چار روپے

تنقید کیا ہے؟ اُردو زبان میں ایسی کتابیں کم لکھی گئی ہیں جن میں تنقید پر فنی حیثیت سے قلم اٹھایا گیا ہو۔ آل احمد سرور کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے چند مضامین میں تنقید کا ایک معیار پیش کر دیا ہے۔ کتاب کے آخری مضمون میں فنی اصول متعین کر دیے گئے ہیں اور فن و معیار فن دونوں کی یکجائی کا نام "تنقید کیا ہے" رکھ دیا ہے۔ یہ کتاب بے لاگ تبصرہ کی ایک معیاری تخلیق ہے جس کو اسلوب کی نیرنگی۔ ایک شاداب و زرنگار تخلیق کا درجہ عطا کرتی ہے جو سرور صاحب کی تحریر کا امتیازی وصف ہے۔

قیمت تین روپیہ پچاس پیسے

کالج کی تعلیم تعلیم بالغان پر ایک مفکرانہ اور عالمانہ تصنیف، جو معلمین اور متعلمین دونوں کے لیے یکساں طور پر اہم ہے اس کتاب میں طالب علمانہ زندگی کے مختلف ادوار کا جائزہ لیا گیا ہے اور نو واردانِ بساط مدرسے سے لے کر فارغ تحصیل ہونے والے طلبا تک کے شعور و صلاحیت کا نفسیاتی تجزیہ کیا گیا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ کس درجہ میں طالب علم کی درس و تدریس کے لئے کیا انداز اختیار کرنا چاہئے اور طالب علم کے لئے اکتساب علم کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

رودھرا ایچ گارسین کی یہ تخلیق فن تعلیم پر ایک احسانِ عظیم ہے اور پروفیسر محمد عثمان کا ترجمہ اردو ادب میں اپنی نوعیت کا بیش قیمت اضافہ۔ قیمت چار روپیہ پچاس پیسے

ملنے کا پتہ

اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی

اُردو مرکز ـــــ لاہور

کرشن چندر

شمع۔ نئی دہلی۔

لندن کی شام

انگریزوں کی دو سو سالہ حکومت کی وجہ سے لندن کا بہت رُعب کھاتے ہوئے تھے۔ کیسی حسرت تھی دل میں لندن دیکھنے کی۔ لڑکپن ہی سے کیسے کیسے رومانی نام سُن رکھے تھے۔ بانڈ اسٹریٹ، آکسفورڈ اسٹریٹ، پکڈلی، سوہو، ــــ نام جنھیں انگریزی ناول نگاروں نے بے انتہا جاذبیت عطا کر دی تھی۔ جی چاہتا تھا کسی طرح ایک بار اُڑ کر لندن چلے جائیں اور وہ شہر دیکھ لیں جہاں دنیا بھر کی طاقت اور دولت اکٹھی ہو رہی ہے۔

لیکن جب لندن دیکھنے کو ملا تو دل مٹھ ہو کر رہ گیا۔ اچھا تو یہ ہے لندن! میلگجے اندھیروں، پھیلی ہوئی بدبوؤں، چھوٹی چھوٹی سڑکوں، دُھند اور کہرے کا شہر! ٹیمز کو دیکھ کر راوی یا گومتی کی یاد تازہ ہونے لگی۔ اور ٹیکسیاں کتنی پرانی؟ معلوم ہوتا ہے پرانی بگھیوں سے پہیئے اتار کے ان میں موٹر کے ٹائر فٹ کر دیئے گئے ہیں ــــ!! اور ٹیکسی والے کتنے ٹھنڈے اور سست رفتار؟ معلوم ہوتا ہے رات کو ٹیکسی سمیت کسی بڑے فریجڈیر میں بند کر دیئے جاتے ہیں۔ اپنے وطن کے سردار جی ٹیکسی والے بہت یاد آنے لگے۔ کیا تازہ ترین ماڈل کی ٹیکسیاں ہوتی ہیں! کیا برق رفتاری ہوتی ہے۔ کہ ٹریفک کی روشنیاں اور ٹریفک کے سپاہی دونوں منہ تکتے رہ جاتے ہیں! سردار جی ایک ہاتھ سٹیرنگ پر رکھے، دوسرے ہاتھ سے سپاہی کو ٹاٹا کرتے ہوئے گاتے گذر جاتے ہیں۔ "بلیئے نی گڈی وچوں لت لکے۔ گورا رنگ تے سلیپر کالے بلیئے، بلیئے، بلیئے .....!" ایک یہ انگریز ٹیکسی والے ہیں۔ اس طرح باقاعدگی سے ناپ تول کر آگے پیچھے دیکھ کر چلتے ہیں۔ گویا بجلی کے کھمبوں کو ہی شمار کرنے نکلے ہیں۔ ٹیکسیاں تو پیرس میں لندن سے بھی پرانی ہیں۔ لیکن فرانسیسی ٹیکسی ڈرائیور اپنے وطن کے سردار جی سے بھی دو ہاتھ آگے رہتے ہیں۔ یوں فل سپیڈ سے موڑ کاٹتے ہیں۔ گویا برف کی پھسلوان ڈھال پر اسکاٹنگ کر رہے ہوں۔ ہر سڑک ایک خطرناک مہم معلوم ہوتی ہے ــــ ٹیکسی میں بیٹھنے والے کے لئے بھی اور سڑک کراس کرنے والے کے لئے بھی۔ اسی لئے تو پیرس میں خون گرم ہوتا ہے اور لندن میں ٹھنڈا .....

میری باتیں سن کر میرے میزبان قادر یار نے کہا "معلوم ہوتا ہے تمہیں لندن پسند نہیں آیا"

ہم دونوں بی بی سی کے بغل والے جارجز بار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جارجز بار بی بی سی میں کام کرنے والے درمیانی طبقے کے ادیبوں شاعروں فن کاروں اور انجینئروں کا اڈہ ہے۔ دلی کے انڈیا کافی ہاؤس میں ایسے ایسے چار ریستوران سما سکتے ہیں۔ قادر یار مجھے کبھی تو ابرو کے اشارے سے ادیبوں کے نام بتاتا جا رہا تھا۔ جو اس وقت جارجز میں موجود تھے۔ سب لوگ اپنی اپنی بیویاں یا دوست لڑکیاں ساتھ لئے بیئر پی رہے تھے۔ سگار اور سگریٹوں کے دھوئیں سے کمرہ بھرا ہوا تھا۔ سب لوگ پاس پاس کھڑے تھے۔ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ کہیں بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی۔

"انگریز لوگ وہسکی نہیں پیتے ؟" میں نے قادریار سے پوچھا۔
"وہسکی زیادہ تر باہر بھیجی جاتی ہے۔ وساور کو۔ ساری دنیا میں وہسکی کی مانگ ہے۔ اس لئے انگریز بچارے کو وہسکی بہت کم نصیب ہوتی ہے۔ وہ تو بیر اور تمباکو پر زندہ رہتا ہے!" قادریار نے کہا۔
قادریار۔ اور میں کسی زمانے میں لاہور میں ایک ہی جماعت میں اکٹھے پڑھتے تھے۔ کبھی کبھار میں پاس ہو جاتا اور وہ فیل ہو جاتا۔ میں فیل ہو جاتا تو وہ پاس ہو جاتا، نتیجے میں ــــ جلد یا بدیر ہم لوگ اکثر ایک ہی کلاس میں پائے جاتے۔ ہوشیار طلبار کا کہنا تھا کہ میرا اور قادریار کا مستقبل بہت مشکوک ہے۔ مگر وہ اس وقت بی بی سی کے پاکستانی سیکشن میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ اور میں ہندوستان سے یورپ کی سیاحت کو نکلا تھا۔ برسوں کے بعد لندن میں ہم دونوں مل گئے تو ایسا لگا۔ جیسے کبھی کچھ تقسیم ہی نہ ہوا تھا۔
"انگریز لڑکیوں کے بارے میں تمہارا تجربہ کیا کہتا ہے؟" ــــ میں نے قادریار سے پوچھا۔ اور پھر خود ہی اس کو بتانے لگا۔ "سنا ہے بڑی مادہ پرست ہوتی ہیں۔ خود غرض ہوتی ہیں ہر معاملے میں دولت و دوچارگی گردان کرتی ہیں؟"
اس نے بیئر کا ایک لمبا گھونٹ لیا۔ ایک طنز آمیز مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پہ آئی۔ "اور مشرقی عورت تو بڑی روحانیت پرست ہوتی ہے نا۔ اسے نہ موٹر چاہیئے۔ نہ عمدہ گھر، نہ فرنیچر، نہ اچھا کمانے والا شوہر۔ وہ نہ کپڑے مانگتی ہے۔ نہ زیور، ایک صرف بہشتی زیور پہ قناعت کرتی ہے نا ــــ؟" قادریار نے مجھ سے پوچھا۔
میں نے جھنجھلا کر کہا۔ "میں ان لڑکیوں کی بات نہیں کرتا۔ میرا اشارہ وہ دوسری طرح کی لڑکیوں کی طرف ہے۔"
"اچھا ــــ وہ؟"
قادریار نے 'وہ' پر بہت زور دیا۔ چند لمحے خاموش رہا۔ پھر بولا۔ "حیرت ہے تمہیں لندن میں آئے ہوئے دو دن گزر گئے ہیں۔ اور تم نے آج یہ سوال کیا ہے؛ حالانکہ اکثر دوست تو چھوٹتے ہی یہ سوال کرتے ہیں۔"
اب چپ رہنے کی باری میری تھی۔
اس دوران میں اس نے بیئر کے تین گھونٹ لئے۔ "جیسی لڑکیوں کی تم بات کرتے ہو ویسی لڑکیوں کی پسند بہت عجیب ہے!" قادریار بولا۔ "یہاں پر انگریز لڑکیوں کی پسند کے چار درجے ہیں۔"
"چار درجے؟"
"ہاں! پہلے درجے میں امریکی آتے ہیں۔ دوسرے درجے میں حبشی۔ تیسرے درجے میں عرب۔ چوتھے درجے میں جمیکا کے ویسٹ انڈین ...... ان درجوں سے گزر کر جو لڑکیاں بچ جاتی ہیں وہ پاکستانیوں، ہندوستانیوں کے ہاتھ آتی ہیں ...... اب تم سوچ لو۔ وہ کیسی ہوتی ہوں گی۔"
میں نے ہنس کر کہا۔ "اب یقین آیا کہ ہم واقعی بچھڑے ہوئے ملک ہیں!"
قادریار نے بیئر کا گلاس خالی کرتے ہوئے کہا۔ "مگر یہ سب کلیے دھرے رہ جاتے ہیں۔ ہر کلیئے کی طرح ان میں صرف آدھی سچائی ہوتی ہے۔ دو دن میں تم لندن کو نہیں سمجھ سکتے۔ اور دوسروں کے تجربے سے تو بالکل نہیں سمجھ سکتے۔"
"تو پھر کیسے سمجھ سکتا ہوں؟"
"اکیلے گھومو!"
"تمہارے ساتھ نہیں؟"

"بالکل نہیں ..... بالکل اکیلے گھومو!"

"ممکن ہے کھو جاؤں!"

"تو کھو جاؤ! لندن میں کھو کر ہی شاید تم لندن کو سمجھ سکو گے۔ اتنے بچے بھی نہیں ہو۔ میرے گھر کا پتہ تمہاری ڈائری میں محفوظ ہے۔"

"تو آج شام میں لندن کو کھو جتے لگتا ہوں!" میں نے قادریار سے کہا۔

"اور میں گھر کی بس پکڑتا ہوں۔ جب جی چاہے آجانا۔" قادریار نے بل ادا کیا اور ہم دونوں جارج سے باہر نکل گئے۔

میں اکیلا گھومنے لگا۔ آکسفورڈ اسٹریٹ کے درزیوں کی دکانیں دیکھ کر انارکلی کے درزیوں کی دکانیں یاد آگئیں جو زیادہ تر انارکلی کے بغل کی گلیوں میں کھلتی ہیں۔ وہی کپڑے وہی تراش خراش بلکہ انگریزی درزی فیشن کے اعتبار سے مجھے زیادہ قدامت پسند اور روایت پرست نظر آئے۔ پھر ایک بے حد دلکش انگریز لڑکی نظر آئی۔ بالکل بلانڈ۔ بالکل میدہ اور شہاب، بلکہ شہد اور گلاب۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، برف سے کاٹ کر بنائی گئی ہے اور رخساروں میں کسی چینی مصور نے رنگ بھرا ہے۔ میں مبہوت ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ مجھے دیکھ کر ہلکے سے مسکرائی۔ اور آگے کو چل دی۔ میں بھی دم ہلاتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا ــــ مگر ذرا فاصلے پر۔ کیوں کہ نو وارد تھا۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ جی چاہتا تھا آگے بڑھ جاؤں اور اس سے ہمکلام ہو جاؤں۔ کوئی ایک سو گز کے فاصلے تک ہم یوں ہی چلتے رہے۔ اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ نہ کنکھیوں سے جھانکا۔ گرینڈ سنیما کے قریب پہنچ کر وہ رک گئی۔ اور میں ایک قدِ آدم آئینے میں اپنے آپ کو دیکھنے لگا۔ میرا سوٹ بہت عمدہ تھا اور سو فیصدی انگریزی۔ جیب میں پیسے بھی تھے۔ اور شکل و صورت بھی بری نہ تھی۔ اس لئے ......؟

اتنے میں نکڑ سے ایک لمبا تڑنگا اور چوڑے چکلے سینے والا حبشی ہنستا ہوا آگے آیا۔ اس کی بغل میں ایک لڑکی تھی۔ وہ میری بلانڈ کے قریب آکے ٹھٹھکا، مسکرایا، پھر اس نے اپنا دوسرا ہاتھ آگے بڑھایا۔ بلانڈ اس حبشی کی بغل میں آگئی۔ اب وہ دائیں بائیں دو انگریز لڑکیاں سنبھالے ہوئے تھا اور میں حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ حبشی مجھے دیکھ کر زور سے ہنسا۔ اور بغل میں دونوں انگریز لڑکیوں کو داب کر پکڈلی کی طرف چلا گیا۔

میں گھوم کر فٹ پاتھ کے قریب بیٹھے ہوئے اخبار بیچنے والے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ بلکہ اس طرح منہمک ہو گیا۔ گویا بچھے ہوئے اخبار میری نگاہ میں اس خوبصورت لڑکی سے کہیں زیادہ دل کش تھے۔ میرا چہرہ غصے اور شرم سے تمتما رہا تھا۔ اور ایسا لگتا تھا گویا حلق میں تھوک کے بجائے خون کے گھونٹ اتر رہے ہیں۔ میں نے "آبزرور" خریدا۔ جسے میں صبح پڑھ چکا تھا۔ اور پھر گرینڈ سنیما کی تصویروں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ گرینڈ میں پکاسو کے آرٹ سے متعلق کوئی فلم چل رہی تھی۔ اور میں پکاسو کا پرستار تھا۔ مگر وہ تینوں تو پکڈلی کی طرف گئے تھے۔! تو پکاسو یا پکڈلی ــــ پکڈلی یا پکاسو!؟

پھر قدم خود بخود پکڈلی کی طرف مڑ گئے۔

وہ تینوں آگے جا رہے تھے۔ راستے میں ایک جگہ گھڑیوں کی دکان کے باہر ایک انگریز بھکاری کھڑا تھا۔ حبشی نے اسے ایک سکہ دیا۔ پھر جب میں وہاں پہنچا۔ تو میں نے بھی اس انگریز بڈھے انگریز بھکاری کو ایک سکہ دیا۔ ایک عجیب کمینی سی مسرت محسوس ہوئی جیسے ٹیپو سلطان، سراج الدولہ اور نانا فرنویس کا سارا قرضہ ایک ہی سکے میں چکا دیا ہو۔

ہولے ہولے چلتا رہا اور آگے بڑھتا رہا۔ اور اپنے سے آگے بڑھ جانے والے ان تینوں کو دیکھتا رہا۔ وہ دونوں انگریز لڑکیاں دائیں بائیں اس حبشی سے چمٹ رہی تھیں۔

یہ منظر لندن کے لئے نیا نہیں ہے۔ لیکن آج تک کسی انگریز ادیب نے اسے بیان کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

جوتوں کی دکانیں بہت عمدہ تھیں۔ انگریز جوتے بہت عمدہ بناتے ہیں۔ بے حد بڑھیا اور دلکش اسٹائل والے ــــ انگریز کے جوتوں اور انشا پردازی میں اس قوم کا اصلی رنگ جھلکتا ہے۔ ایک جوتا ضرور خریدنا پڑے گا۔ مگر اس وقت نہیں۔ دیکھوں یہ تینوں کہاں جاتے ہیں؟

پکڈلی سرکس میں پہنچ کر وہ تینوں بائیں طرف کو مڑ گئے۔ اور زمین دوز ٹیوب کے ریلوے اسٹیشن کے اندر چلے گئے۔

خدا حافظ۔ میری بلانڈ! زندہ باد افریقہ!

پکڈلی سرکس اتنا بڑا ہے جتنا کہ بمبئی کا کھڑا پارسی چوک۔ دادر کا خداداد سرکل کا چوک بھی اس سے دوگنا ہوگا۔ تو یہ ہے مشہور و معروف پکڈلی! یہاں سے بہت سی گلیاں پھوٹتی ہیں۔ کچھ سوہو کو بھی جاتی ہیں۔ ایک بار خیال آیا، چلو چل کے سوہو کی فاحشاؤں کا نظارہ کریں۔ اور کسی اطالوی ریستوراں میں چل کر کھانا کھائیں۔ پھر دل نہ مانا۔ دل کچھ عجیب طریقے سے اداس ہوگیا تھا۔ میں پکڈلی سرکس کا چکر لگانے لگا۔ تھیٹروں اور ہوٹلوں پر روشنیاں جگمگانے لگیں تھیں۔ شام گہری ہو چلی تھی۔ گھر یاد آرہا تھا۔ تنواڑی کی دکان یاد آرہی تھی۔ بگھتی پانوں کے نازک نازک سے دل نواز پتے، دل کی شکل کے اور عورتیں گہرے رنگ کی ساڑیاں پہنے ہوئے جُوڑے میں جوہی کے پھول سجائے ہوئے اور کیلے کے پتوں پر سنہری گنڈیریاں رکھے ہوئے ان پر گلاب جل چھڑکتا ہوا گنڈیری فروش۔ بہت چھوٹی چھوٹی سی یادیں ننھی کونپلوں کی طرح اُبھرنے لگیں۔ شاید وہ خط لکھ رہی ہوگی مجھے یا اس وقت میرا خط پڑھ رہی ہوگی۔ کیا میری سانولی کو معلوم ہے کہ ابھی میں نے اکسفورڈ اسٹریٹ سے پکڈلی تک اس سے کیسی بے وفائی کی ہے؟......

چلتے چلتے میں ایک تھیٹر کے باہر رک گیا۔ یہاں بیکٹ کا مشہور ڈرامہ "ویٹنگ فار گودو" چل رہا تھا۔ اس تھیٹر کے بالکل سامنے سرکس کے دوسری طرف "ٹی ہاؤس آف اگسٹ مون" چل رہا تھا۔ یہ دونوں ڈرامے میں دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر کب دیکھوں؟ آج یا کسی اور دن! پھر بائیں طرف بڑے بڑے نیان حروف میں جگمگاتے ہوئے میں نے وہ نام پڑھا۔ لندن فالیز، پیرس کی فالیز تو میں دیکھ چکا تھا۔ ظاہر ہے اس کے مقابلے میں لندن کی فالیز کیا ہوں گی۔ مگر دیکھنے میں کیا حرج ہے؟

شاید اسی بلانڈ کو ننگا دیکھنے کی خواہش تھی جو مجھے لاشعوری طور پر کھینچ کر لندن فالیز میں لے گئی۔ ٹکٹ گھر سے میں نے ٹکٹ خریدا۔ اور نیچے تھیٹر میں چلا گیا۔

یہ تھیٹر ایک چھوٹے سے تہہ خانے کی صورت میں تھا۔ نوّے آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ شو شروع ہو چکا تھا۔ صرف دو سیٹیں خالی تھیں۔ اور وہ بھی کوئی خاص آرام دہ نہ تھیں۔ میں ایک سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سارا ہال تمباکو کے گہرے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ سامنے اونچے اسٹیج پر عریاں اور نیم عریاں لڑکیاں ناچ رہی تھیں۔ تماشائیوں میں ایک عورت بھی نہ تھی۔ زیادہ تر ملّاح تھے اور سیّاح اور ادھیڑ عمر کے انگریز، جو بار بار رومال نکال کر اپنا پسینہ پونچھتے جاتے تھے۔ اسٹیج سے زیادہ دلکش منظر ان چہروں پہ نظر آرہا تھا۔ جو عریاں ڈانس دیکھنے کے لئے آئے تھے۔ رنگا رنگ روشنیاں اسٹیج پر پڑ رہی تھیں اور رنگارنگ کیفیتیں تماشائیوں کے چہروں سے ہویدا تھیں۔ ہائے یہ مفلس خواہشیں۔ یہ فاقہ زدہ آرزوئیں، یہ بھیک منگے رنگ، یہ فریب خوردہ ناآسودگیاں، کیا معلوم یہاں پر کون تھیٹر ہے اور کون تماشائی ہے؟ ــــ میرے آگے بیٹھے ہوئے ایک ادھیڑ عمر کے انگریز نے اپنے ساتھی سے کہا: "وہ سب سے اچھی لڑکی ہے!"

"وہ کون؟"

"وہ ــــ! میبل۔ ۔بیچ والی۔"

میبل جو مرکز میں تھی۔ واقعی سب سے حسین تھی۔ یونانی زہرہ کا سا جسم۔ گویا شفاف بلّور میں ڈھلا ہوا۔ ہر عضو متناسب، ہر ادا معرعہ اٹھاتی ہوئی۔

جلتی ہوئی روشنیوں کے ہالے میں کبھی تو اس کا جسم برف میں ڈھل جاتا کبھی شعلے کی طرح لپک جاتا۔ اس کے ارد گرد کی سب لڑکیاں ننگی تھیں۔ اور اپنی اپنی جگہ رکی ہوئی تھیں۔ صرف مرکز میں میبل ڈانس کر رہی تھی اور اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں شتر مرغ کے پر کے دو بڑے بڑے پنکھے اٹھا رکھے تھے۔ جن سے وہ ناچتے میں ستر پوشی کا کام لیتی تھی۔ ڈانس کی دھن لحظہ بہ لحظہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اور تماشائیوں کا اشتیاق اسے مکمل طور پر ننگا دیکھنے کے لئے بڑھتا جا رہا تھا۔

"واقعی وہ بہت خوبصورت ہے!" ادھیڑ عمر کے انگریز کے ساتھی نے اس سے کہا۔

"مگر تم میبل کو کیسے جانتے ہو؟"

ادھیڑ عمر کا انگریز بڑے فخریہ لہجے میں بولا۔ "یہ لڑکی ہمارے علاقے میں رہتی ہے۔ کلے برن اسٹریٹ میں بے شک وہی لندن فائیز میں سب سے اچھی لڑکی ہے!"

"شش چپ رہو!" قریب سے ایک ملاح گھونسا دکھا کر بولا۔"

اُدھیڑ عمر کا انگریز سہم کر چپ ہو گیا۔

اتنے میں اندھیرے میں لڑکھڑاتا ہوا، ٹھوکریں کھاتا ہوا، ایک بہت ہی بڈھا انگریز داخل ہوا اور ٹٹول ٹٹول کر اس طرف بڑھنے لگا جہاں میرے ساتھ کی ایک سیٹ خالی تھی۔ میں نے اُٹھ کر اس کا ہاتھ پکڑا۔ اور اسے اپنے ساتھ کی سیٹ پر بٹھا لیا۔ بڈھا ہانپ رہا تھا۔ اور اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"میرے بیٹے! میرے بیٹے!" وہ مینڈک کی سی پھٹی ہوئی آواز میں بولا۔ "میں میبل سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ کیا میبل اسٹیج پر ہے؟"

"کیا تم اسے نہیں دیکھ سکتے بزرگوار؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"نہیں بیٹے! میں اندھا ہوں!" وہ آہستہ بولا۔

"تو پھر تم یہ تماشا دیکھنے کیوں آئے ہو؟"

"میں کوئی تماشا دیکھنے نہیں آیا بیٹے! میں میبل کا دادا میبل کو یہ بتانے آیا ہوں کہ ولی مر چکا ہے!"

"ولی کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میبل کا بیٹا، چار سال کا تھا کئی دن سے وہ ڈبل نمونیا سے بیمار تھا۔ میبل کو چھٹی نہیں ملی۔ وہ کہتی تھی۔ اگر میں چھٹی لے لوں گی تو ملازمت سے برطرف کر دی جاؤں گی۔ اور گھر کو میبل ہی چلاتی ہے۔ اس کا باپ مر چکا ہے اور شوہر بھی۔ ماں برسوں سے ادھرنگ سے نیم مردہ پلنگ پکڑے ہوئے ہے۔ اور میں بچاسی برس کا اندھا ہوں ...... میرے بیٹے ...... میں میبل سے بتانا چاہتا ہوں کہ وہ ناچ بند کر دے۔ گھر جائے، جہاں اس کے بیٹے کی لاش رکھی ہے۔ ابھی میں منیجر کے پاس گیا تھا۔ مگر اس نے میبل سے ملنے نہیں دیا ......"

"شش!" آس پاس کے بہت سے لوگ چلائے — وہ یقیناً برافروختہ تھے۔ کیونکہ اس وقت ناچ اس مرحلے پر پہنچ رہا تھا جہاں چند لمحوں کے لئے میبل اپنی باہوں میں اٹھائے ہوئے شتر مرغ کے پروں کے دونوں پنکھے پھینک دے گی۔

"میبل!" بڈھا اپنی سیٹ پر بیٹھا بیٹھا غرایا۔

"چپ رہو۔" اس کے پیچھے بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

بڈھے کو غصہ آگیا۔ وہ اپنی سیٹ سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور دونوں ہاتھ پھیلا کر کہنے۔ "میبل .... میبل! — ولی مر گیا ہے۔ ولی مر چکا ہے

یکایک اسٹیج پر ناچتی ہوئی لڑکی نے اختتامیہ موسیقی کے درمیان شترمرغ کے دونوں پنکھ چھوڑ دیئے ۔ پھر پرشور تالیوں کے درمیان اسٹیج پر اندھیرا چھا گیا۔

پھر اس گہرے اندھیرے اور سناٹے کے وقفے میں مجھے اسٹیج پر ایک عورت کے رونے کی دبی دبی سسکیاں سنائی دینے لگیں۔ پھر ایسا محسوس ہوا جیسے ایک سے زیادہ عورتیں اس اسٹیج پر رو رہی ہیں۔ پھر جیسے سارے لندن کی عورتیں رو رہی ہیں۔

جس وقت میں اس گھٹی گھٹی سیلی ہوئی تاریکی میں اس بچاسی برس کے بڈھے انگریز کو سہارا دے کر ہال کے باہر لے جا رہا تھا۔ تو مجھے ایسا لگا جیسے یہ انگریزی ادیبوں کا لندن نہیں ہے۔ لاہور ہے، دلی ہے، بمبئی ہے، اپنی ہی طرف کا کوئی شہر یا گاؤں ہے۔ جہاں دکھ اور درد کے مارے مجبور انسان رہتے ہیں۔

اس دن سے لندن میرے لیے اجنبی نہیں رہا اس دن سے میں لندن سے پیار کرتا ہوں۔

بقیہ مچھلے وال

پاس اپنے بچے کے پاس گاؤں جا رہا ہوں۔ مجھے سکون کی زندگی بسر کرنے دو" یہ کہتے کہتے وہ ایک کرایے کے تانگے میں بیٹھ گیا۔ اور سب کو خدا حافظ کہنے کے بعد قدرے اونچی اور کرخت آواز میں مخاطب ہوا۔" میں اب کوئی قتل نہیں کروں گا۔ میں نے حلف لیا ہے۔ میں نے قسم کھائی ہے" شہر والوں سے اُس نے اتنا کہا۔ لیکن اس دوران اپنی نظریں اوپر نہ اُٹھائیں۔ ان آنکھوں میں کبھی شعلے لپکتے تھے۔ آج انہیں جلے بجھے اپلوں کی راکھ میں سے اُٹھتا ہوا دھواں محسوس ہو رہا تھا۔ تانگے میں کوچوان کے ساتھ وہ اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ تانگا چل دیا لیکن تصور میں عائشہ سے محو گفتگو تھا۔" عائشہ! میں نے تم سے وعدہ کیا ہے۔ اب میرا وعدہ اس بادہ خوار کی طرح نہیں ہے جو توبہ کرتا ہے اور گھٹا چھا جانے پر توبہ توڑ دیتا ہے۔ اب میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے عائشہ! اب میں صرف تیرے لیے جیوں گا۔ صرف تیرے لیے میں نے اپنے غصے پر قابو پا لیا ہے عائشہ! دیکھو میں نے شہر والوں کو کورا جواب دے دیا ہے۔ اب بھی تم مجھ سے خوش نہیں ہو۔ تمہارے کہنے کے مطابق میں نے پٹھان ہونے کا ثبوت دیا ہے نا۔ میں نے وعدہ کر کے توڑا نہیں —" مچھلے وال گھر پہنچنے تک عائشہ سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ایک نسوانی چیخ نے یہ سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ تانگے والے نے کہا۔" کوئی گڑبڑ ہے خان۔ کسی لڑکی کی آواز ہے۔" مچھلے وال دائیں بائیں دُور دُور تک اپنی نظریں دوڑا رہا تھا۔ لیکن اس کے کچھ پلے نہ پڑا۔ تانگا اسٹیشن والے چوراہے پر پہنچ گیا تھا۔ جہاں ایک چھوٹی سی بھیڑ اکٹھی تھی۔ ایک بوڑھا ہندو دیہاتی رو رو کر کہہ رہا تھا۔" میری لڑکی کو ابھی ابھی اقبال اُٹھا کر لے گیا۔" کوچوان تانگے سے اتر کر مزید معلومات کے لیے بھیڑ تک پہنچ گیا۔ لیکن مچھلے وال نے تو جیسے سب کچھ جان لیا تھا۔ اُس نے تانگے کو شہر جانے والی سڑک پر ڈال دیا۔ تانگا اپنی پوری رفتار سے جیل سے آنے والی سڑک کی مخالف سمت والی سڑک پر دوڑ رہا تھا۔ لوگ حیران تھے کہ مچھلے والے کو کیسے پتہ چلا کہ اقبال لڑکی کو لے کر اسی سڑک پر گیا ہے۔ چند ہی لمحے میں مچھلے وال کے تانگے نے اقبال کو جا لیا۔ اور آگے بڑھ کر اُس کا راستہ روک دیا۔ اقبال کے دوساتھی مچھلے وال کی شکل دیکھتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ لیکن اقبال کی گردن مچھلے وال کے ہاتھوں میں تھی۔ نوجوان اقبال نے ایک جھٹکے سے اپنی گردن کو اس کی جکڑ سے آزاد کرا لیا اور اپنا چاقو کھول کر اُس پر لپکا۔ مچھلے والے کا ہاتھ بھی عادتاً اپنے نیفے کی طرف بڑھا۔ لیکن چاقو اب کہاں تھا۔ اُس نے اقبال کے چاقو کا وار اپنے شانے پر لیا۔ اور پھرتی سے اُس کی کلائی مروڑ کر چاقو چھین لیا۔ اقبال جان بچا کر بھاگنا چاہتا تھا۔ لیکن مچھلے وال کے ہاتھ میں آیا ہوا چاقو خون بہائے بنا آج تک نہ رہ پایا تھا۔ خون سے لت پت اقبال مچھلے وال کے پیروں میں لوٹ گیا۔

مچھلے وال نے اُس کی لاش کو تانگے میں ڈال لیا۔ اور سہمی ہوئی ایک طرف کھڑی لڑکی کو اشارے سے تانگے میں بیٹھنے کے لیے کہا۔ لڑکی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اور مچھلے والے کے پیروں میں اقبال کی لاش اوندھے منہ پڑی تھی۔ تانگا اسٹیشن کو جانے والی سڑک پر اسی رفتار سے پھر دوڑ رہا تھا۔

علی عباس حسینی

بانو۔ دہلی۔

جلتی بجھتی شمع

"بجھتی شمع"

میجر سلیم کو اپنی تنہائی کا احساس شدید ہو رہا تھا۔ دسمبر کا مہینہ تھا۔ کرسمس کو دو ہی دن رہ گئے تھے۔ صبح سے برف میں چھلی ہوئی ہوا چل رہی تھی۔ اتنی ٹھنڈی کہ ہر جھونکے کے بعد رگوں میں خون جم جاتا تھا۔ دفتر سے تھکا ماندہ وہ ابھی اپنے گھر پلٹا تھا۔ گو موٹر کے شیشے ہر طرف سے چڑھے تھے مگر مرکزی سکریٹریٹ کے گرم کمرے کے بعد اس کی قطع بھی برف میں جمی ہوئی قلفی کی تھی۔ اور جب میں اپنے فلیٹ میں پہنچا۔ تو وہ گھر کہاں تھا۔ گھر دیوار و در، چھت اور فرش، قالین اور صوفے، مسہری اور ملازم سے نہیں بنتا۔ نہ اس کی ٹھنڈک بجلی کا ہیٹر لگا دینے سے مل جاتی ہے وہ تو ایک مسکراتی رفیقۂ حیات سے اور کھلکھلاتے ہنستے، اچھلتے کودتے بچوں سے گرماتا ہے۔ یہاں کیا تھا، وہ بوڑھی ماں بھی تو نہ رہ گئی تھی۔ جس کے سہارے وہ گھر کی گرمی محسوس کرتا تھا اور جس کی موجودگی میں وہ ایک تصویرِ خیالی پچیس برس سے دل سے لگائے بیٹھا رہا تھا۔

تھا بھی کتنا پیارا وہ جہاں آرا کا تصور۔ ساتھ کی کھیلی ہوئی، پری چہرہ، گل اندام، وہ بے پئے مست خماری آنکھیں، وہ ناگن کی طرح بل کھاتی زلفِ سیاہ فام، وہ بید کی طرح لچکتا جسم، وہ متناسب اعضا، وہ موتیوں کی لڑی دانت، وہ گلاب کی پنکھڑیاں ہونٹ، وہ پھول بکھیرتی ہوئی ہنسی، کیا کیا دل رُبا تصویریں تھیں۔ جو نظروں کے سامنے اٹھلاتی پھرتیں۔ وہ روٹھنے کا پیارا انداز، وہ منہ چڑانے کی شیریں ادا، اور وہ سلیم کی جھنجلاہٹ پر اسے گدگدانے کی شوخی، کیسے کیسے اس نے وعدے کئے تھے۔ کیسی کیسی سخت قسمیں کھائی تھیں۔ "میں تمہاری ہوں، تمہاری ہی رہوں گی! نہ ماں باپ مجھے مجبور کر سکتے ہیں اور نہ سماج مجھے کسی اور کا بنا سکتا ہے۔"

یوں بات بھی ایسی کوئی انوکھی، انہونی نہ تھی، برابر کا جوڑ تھا۔ دونوں کے باپ ڈپٹی کلکٹر تھے۔ دونوں کے بنگلے ایک ہی احاطے میں تھے۔ دونوں کا لان ایک ہی تھا۔ دونوں کی پھلواریاں ایک ہی تھیں، دونوں بنگلوں کی برسائیوں میں سے گزرتی ہوئی سڑک ایک ہی تھی۔ جو سواری ایک پھاٹک سے آتی۔ اسے دونوں بنگلوں کے سامنے سے ہو کر دوسرے پھاٹک سے گزرنا پڑتا تھا۔ زمین و آسمان ایک ہی تھے۔ ماحول ایک ہی تھا۔ سنوں کا بھی کوئی خاص فرق نہ تھا۔ جہاں آرا سولھویں برس میں تھی اور سلیم نے اٹھارویں میں قدم رکھا تھا۔ وہ سینئر کیمبرج کی تیاری کر رہی تھی یہ انٹرمیڈیٹ کی۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے صورت اور سیرت میں ایک مثالی کردار بن گئے تھے۔

دونوں میں قول و قرار، عہد و پیمان ہوئے۔ دونوں کو یقین تھا مستقبل ہمارے ہاتھوں میں ہے ہم اسے اپنی خواہش کے مطابق بنالیں گے اور

ہم زندگی کو ہمیشہ رنگین عینکوں سے دیکھتے رہیں گے۔

انھیں اس کا کبھی خیال نہ آتا تھا۔ کہ زندگی کی چادر کا تانا بانا خوشی و غم سے بنتا ہے۔ اس جہاں میں کلیاں کھل کر پھول بنتی ہیں، وہیں ناشگفتہ غنچے مرجھاتے اور سوکھتے بھی ہیں۔ جہاں شادی کے چہچہے سنائی دیتے ہیں، وہاں مرنے والوں پر نوحہ و ماتم کی صدائیں بھی آتی ہیں۔ جہاں تندرستوں کیلئے کھیل کے میدان ہیں وہیں بیماروں کے ہسپتال بھی ہیں۔ سلیم اور جہاں آرا بھولے سے بھی غم، جدائی، فراق و ہجر کا دل میں خیال نہ لاتے تھے۔ لیکن دفعتاً سرکاری حکم آیا کہ جہاں آرا کے والد مولوی ابراہیم صاحب بجنور کے کلکٹر بنائے گئے۔

دونوں بنگلوں میں خوشیاں تھیں۔ کیسے ہندوستانی افسر کا جو آئی۔ سی۔ ایس بھی نہ ہو، انگریزی دور میں ضلع کا حاکم کلکٹر بنایا جانا کوئی معمولی اعزاز نہ تھا۔ اس لئے جہاں آرا کے والدین اور بھائی ہی خوش نہ تھے۔ بلکہ سلیم کے والد خان صاحب نعیم الدین اور ان کے گھر والے بھی خوش تھے اخلاص کا تقاضا بھی تھا، دوستی کے یہی معنی ہیں۔ مگر سلیم اور جہاں آرا کے چہرے فق تھے۔ دل رو رہے تھے۔ سب کے سامنے تو سرکس کے مسخروں کی طرح، مصنوعی خوشی کا چہرہ لگا لیتے، مگر جب اکیلے میں ملتے تو آنکھوں میں آنسو ہوتے۔ سرد آہیں ہوتیں اور عہد و پیمان پر باقی رہنے کی بار بار قسمیں کھائی جاتیں۔ بار بار مشورے کے بعد ایک تدبیر ذہن میں آئی۔ سلیم نے ماں کی گود میں سر ڈال کر کہہ دیا۔ کہ بیگم ابراہیم کے یہاں سے جانے سے پہلے میرے لئے ابھی سے بات پکی کر لیجئے۔"

وہ اس بات پر ہنس پڑیں۔ "اچھا ابھی سے عشق لڑانے لگا۔" مگر بیٹے کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ممتا سے کلیجہ پھٹنے لگا۔ منہ بولی بہن کے پاس چلی گئیں۔ بہن گرہستی کا بکھرا ہوا سامان سمیٹنے، بکسوں میں انھیں بند کرانے، فرنیچر پر کاغذ لپٹوانے، غرض سفر کی پوری تیاری میں لگی ہوئی تھیں۔ ان کو سلیم کی ماں کا بے وقت آنا کھلا۔ وہ اب ہونے والے کلکٹر کی بیوی تھیں۔ کون جانے کل ہی نعیم کا بجنور تبادلہ ہو کر وہ ماتحتی میں آجائیں۔ ان کو خود اس کا خیال کرنا چاہئے تھا۔ بے کہلائے نہ آنا چاہئے تھا۔ بہرحال رکھائی سے ملیں۔ مصروفیت کا بہانہ کر کے سادے کپڑوں میں ہونے کی معافی مانگی اور اکھڑی اکھڑی باتیں کیں، مختلف اشاروں سے اپنے بدلے ہوئے رتبہ کا فرق نمایاں کیا۔ ایسے میں سلیم کی ماں کا جی تو نہ چاہتا تھا۔ مگر پھر بھی انہوں نے گھما پھرا کر سلیم اور جہاں آرا کے رشتے کا ذکر کر ہی دیا۔

بہن نے سوکھا سا منہ بنا کر جواب دیا۔ "تم نے بھی کہاں بے وقت کی راگنی چھیڑی بہن! میں تو اس تبادلے کی وجہ سے اسباب سمیٹنے میں لگی ہوں، اور تمہیں سوجھی ہے شادی بیاہ کی بات! پھر اللہ رکھے، جہاں آرا کا سن ہی کیا ہے؟ سولہویں میں قدم رکھا ہے۔ میں اتنی کم سنی کی شادی کی طرف دار نہیں۔ اٹھارہ انیس برس کی ہولے گی تو ایسی باتوں کو سوچوں گی!" اتنے میں ایک ماما نے آکر پوچھا۔ "بیگم صاحب! وہ جو آپ کے دھلے، کپڑے دھوبی نے آج ہی لا کر ڈالے ہیں، وہ کس بکس میں رکھے جائیں گے؟"

وہ سلیم کی ماں سے بولیں۔ "لو دیکھا ان ماں زادیوں پر کسی کام کو چھوڑا ہی نہیں جا سکتا۔" بس اس وقت تو معاف ہی کرو بہن! خدا کرے تمہارے میاں کا بھی بجنور ہی تبادلہ ہو جائے اور ہم تم پھر مل سکیں۔"

ان کے معافی مانگنے کا وہی انداز تھا۔ جو کسی بھکاری کو بھیک نہ دیتے وقت معافی مانگنے میں ہوتا ہے۔ سلیم کی ماں تلملا کر رہ گئیں۔ لیکن کیا کرتیں۔ وہ بھی بیٹے کے لئے بھیک مانگنے ہی تو آئی تھیں۔ جہاں آرا اس پر بھی ہمت نہ ہاری۔ ماں باپ کے ساتھ جاتے ہوئے سلیم کو یقین دلاتی گئی۔ کہ "میں بات پر قائم رہوں گی۔ ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے مگر وعدے سے نہ ٹلوں گی!"

سلیم نے بی اے میں قدم رکھا ہی تھا کہ دوسری جنگ عظیم چھڑی۔ خاں صاحب نعیم نے فوجی بھرتی اور چندہ جمع کرنے میں بڑا کار نمایاں کیا خطاب بڑھا، عہدہ بڑھا۔ اور سلیم کے بی اے ہوتے ہی اسے فوج کے مرکزی دفتر میں ایک اچھا عہدہ دے دیا گیا۔ وہ قصد ہی کر رہا تھا۔ کہ ماں سے کہہ کر اب باقاعدہ جہاں آرا کے لئے رقعہ بھجوائے۔ کہ خبر ملی کلکٹر صاحب کی صاحبزادی ایک دُہاجو پچاس سالہ کمشنر صاحب سے بیاہ دی گئی۔ بس اس نے

بھی وہی کیا جو اس زمانے کے مجنوں کیا کرتے تھے۔ شراب اور عیاشی۔ نہ جانے کتنے ہی ان دونوں کی بڑی صورتیں بنی ہیں۔ ان کو علاوہ جنگ کی وبا بہ افراط سے مہیا کی جاتی تھی۔ اس نے سیمنٹ... پتہ نہیں کس طور پر بے خود بنا لیا۔ لیکن قبل اس کے کہ سنگی لگی عادت بنتی۔ خان بہادر نعیم ... کے انتقال پر وہ سنبھل گیا۔ ماں، بہنوں اور چھوٹے بھائیوں کا بار اس کے سر آ گیا۔ وہ فاقہ ہوا ساندھ بننے کی جگہ مستغرق بن گیا۔ اس نے جو بیتوں بہنوں کو تعلیم دلائی نوکریاں دلوائیں، شادیاں کرائیں، اور بوڑھی ماں کو گلے کا تعویذ بنائے اپنے ساتھ رکھا۔ جنگ ختم ہوتے ہی نہ جانے وہ ڈپٹی کلکٹر بنا دیا گیا۔ آزادی ملنے کے بعد اس کا عہدہ اور بڑھا اور وہ آئی اے ایس بنا کر دلی بلا لیا گیا۔

دلی پہنچ کر اپنے دفتر اور خانگی الجھنوں میں اس طرح پھنسا کہ وہ جہاں آرا کے بارے میں زیادہ سوچ سکا، اور نہ ان سے تاج بہادر ابراہیم کے صاحبزادوں سے ہی تعلقات قائم رکھنے کی کوشش کی۔ یوں بھی نہ وہ ٹوٹے ہوئے رشتے جوڑنا چاہتا تھا۔ اور نہ مندمل زخم کو کریدنا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ جب بہنیں اپنے سسرال سدھاریں اور چھوٹے بھائی اپنی اپنی نوکریوں پر چلے گئے۔ تو گھر سونا سونا سا محسوس ہونے لگا۔ ماں نے بارہا اپنا گھر بسانے پر اصرار کیا۔ اس کے جسم نے بھی کبھی فریاد کی۔ لیکن جہاں آرا کی تصویر جو میز کی دراز میں چھپی رکھی تھی۔ اور جس کی زیارت ہر لمحہ ایک بار ضروری تھی۔ "قول مرداں جان دارد" کا مقولہ ہی یاد دلاتی رہی اور وہ ماں سے یہی بہانہ کرتا رہا۔ "امی ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔ آپ اس گھر کی ملکہ اور رانی ہیں۔ میں بیوی لا کر اسے آپ کی حکومت میں دخل اندازی کا حق نہیں دے سکتا۔" بوڑھی ماں بھی جب بڑھاپے سے یوں بے آس ہوئیں تو انھوں نے ہمیشہ کے لئے اپنا راج چھوڑ دیا۔ وہ دوسری دنیا سدھاریں۔ سلیم نے خالی تخت کو پر کرنے کے لئے جہاں آرا کا فوٹو فریم کرا کے بیڈروم میں لٹکا لیا۔ صبح کو اٹھتے اور رات کو سوتے وقت سب سے پہلی نظر اسی پر پڑتی۔ مگر اسے چند ہی دنوں میں محسوس ہونے لگا کہ یہ زندہ پیر ہی تصویر تنہائی کی شدت کو گھٹانے کی جگہ اور بڑھاتی ہے۔ جسم کی پکار تھی۔ کہ "کھیل کھیلو : مرد پن" کا خیال دامن گیر رہا۔ دلی میں مرکزی حکومت کا معتمد افسر کوئی گری ہوئی بات نہ کر سکتا تھا۔ خودداری کی بنا پر نہ سہی، مہتر کے جرم کی وجہ سے سہی، ڈگمگاتے پاؤں جم جاتے۔ اور وہ فائلوں میں ڈوب جاتا۔

اس وقت بھی وہ چائے پی رہا تھا۔ اور اپنی تنہائی سے الجھ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں تنہائیاں اس احساس کو اور بھی بڑھا دیتی ہیں اس نے اپنے خیالات سے اکتا کر اپنے کمرے میں چھوٹی میز پر فائلوں کے ڈھیر کو دیکھا۔ وہ تو اٹھا کہ کچھ کام ہی کر ڈالے، مگر دل نہ تھا۔ بالکنی میں جا کر کھڑا ہو گیا سامنے کالونی کے بچوں کا پارک تھا۔ وہاں مختلف سن و سال کے بچے دوڑ رہے تھے کھیل رہے تھے۔ کوئی سوئنگ پر چڑھ کر جھول رہا تھا، کوئی لوہے کے جھولے پر جھول رہا تھا، کئی غول بنائے ہوئے کبڈی کھیل رہے تھے۔ کئی گیند اچھال رہے تھے۔ ہنستے تھے۔ چیخ و پکار تھی، دوڑ تھی، مقابلہ تھا۔ زندگی چہل پہل سے بھری بارونق دکھائی دے رہی تھی۔ اسے اپنا بچپنا یاد آنے لگا۔ اور پھر اس سے آگے بڑھ کر وہ زمانہ جب کہ وہ اور جہاں آرا اپنے اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ بنگلوں کے سامنے والے لان پر ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے تھے۔ اچھلتے پھاندتے تھے۔ اور بنگلے کے درختوں کی موٹی موٹی شاخوں میں جھولے ڈلوا کر لمبی لمبی پینگیں لیتے تھے۔ وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کمرے میں پلٹا ہی تھا کہ کسی نے کنڈی کھٹ کھٹائی۔ اور ملازم نے تار لا کر دیا۔ لکھا تھا۔

"میں میڈیکل کالج کے ٹی بی وارڈ میں داخل ہوں، حالت
خواب ہے۔ آخری دیدار کو آ جاؤ۔"

جہاں آرا

اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اس نے مشکل سے تار کے رسیدی پرچے پر دستخط کئے۔ اور کرسی پر بے سدھ گر پڑا۔ دماغ ایک چرخی کی طرح گھومنے لگا۔ نظروں نظروں میں طرح طرح کے رنگ چھوٹنے لگے۔ عجیب عجیب مرقعے دکھائی دینے لگے۔ معلوم ہوا پھیپھڑوں کی رگ میں آگ لگی ہے دھواں اٹھ

رہا ہے شعلے بھڑک بھڑک کر ساری فضا کو لال لال بنا رہے ہیں۔ پھر دکھائی دیا سمندر میں طوفان آیا ہے۔ موجیں بلیوں اچھل رہی ہیں۔ اور وہ جہاز کے ساتھ اس میں غوطہ کھا رہا ہے۔ پھر ایسا محسوس ہوا جیسے زرد سیاہ آندھیاں اٹھ رہی ہیں۔ بالو اور خاک کے ریزے اڑ اڑ کر اس کے سارے جسم میں سوئیوں کی طرح چبھ رہے ہیں۔

پھر فضا سماں بدلا۔ محسوس ہوا کہ وہ سائبیریا کے میدان میں کھڑا ہے۔ ٹھنڈی ہوائیں چیختی چنگھاڑتی چل رہی ہیں۔ اور اسے اولوں سے تڑاتڑ سنگسار کر رہی ہیں۔ غرض کبھی سردی، کبھی گرمی، کبھی آگ، کبھی پانی، کبھی اولے، ایک تلاطم، ایک طوفان بپا ہے۔ اور ان سب میں وہ اکیلا ہی نہیں ہے بلکہ جہاں آرا بھی لیلیں جھٹکائے، قہقہے لگاتی، سسکیاں بھرتی کبھی اپنے پورے حسن و جمال کے ساتھ مست آنکھوں سے دیکھتی۔ گلنار منہ کئے ملکتی، لڑکھڑاتی، سنبھلتی دم کر رہی ہے اور کبھی محض ہڈیوں کا ڈھانچہ بنی۔ آنکھوں کا خانہ خالی، ناک کا بانسہ غائب، عنابی ہونٹ ندارد، بھیانک طور پر دانت نکالے، جسم کی ہڈیاں کڑکھٹ کرتی، سوکھی انگلیاں اس کے دیدے نکالنے کے لئے بڑھاتی چلی آ رہی ہے۔

وہ آنکھیں بند کئے کانپتا رہا اور سسکیاں لیتا رہا۔ آہستہ آہستہ آتشبازی کی طرح جلتی بجھتی اور جہاز کے پہیوں کی طرح پانی میں ڈوبتی ابھرتی چرخی کی رفتار کم ہوئی۔ آندھیوں کا زور، اولوں کی بوچھار بھی گھٹنے لگی۔ ملازم نے گلاس میں پانی بڑھا کر کہا "پانی سرکار؟" سلیم نے اس کی بات کچھ سمجھی کچھ نہ سمجھی۔ مگر ہاتھ گلاس کی طرف بڑھا دیا۔ اور جلدی جلدی پورا گلاس پی گیا۔ دسمبر کا یخ پانی؛ معلوم ہوا کہ جیسے حلق سے معدے تک ایک ٹھنڈی لکیر دوڑ گئی — گلاس واپس کرتے ہی ایک زور کی چھینک آئی۔ چھینک کیا تھی۔ جادوگر کا کوئی منتر تھا۔ آگ بھی بجھ گئی۔ طوفان بھی غائب ہو گیا۔ دل کے پنکھوں کی پھڑپھڑاہٹ بھی ختم ہوئی اور اس کے ہوش و حواس بجا ہو گئے۔

اس نے تار پھر سے پڑھا۔ میڈیکل کالج تو لکھا تھا۔ مگر کہاں کا؟ تار لکھنؤ سے چلا تھا۔ اس لئے وہیں کا ہو گا۔ اس نے اسی رات کی گاڑی سے جانا طے کیا۔ فوراً اپنے سے بڑے افسر کو فون کیا۔ ایک عزیزہ کی سخت علالت بتائی۔ ایک ہفتہ کی چھٹی لی۔ رخت سفر باندھا۔ رزرویشن کے لئے ٹیلیفون کیا اور کلرک کے امید دلانے پر کہ شاید چلتے وقت کوئی برتھ خالی مل جائے اسٹیشن آ گیا۔ دلی لکھنؤ ایکسپریس کھڑا تھا۔ بدقت تمام ایک نیچے کی برتھ فرسٹ کلاس میں مل ہی گئی۔ ڈبے میں دو مرد اور ایک خاتون تھیں۔ مرد اوپر کی برتھوں میں تھے۔ خاتون مقابل کی برتھ پر۔ جب قلی سے اپنا بستر بچھوا کر اس نے ساتھیوں کا جائزہ لیا۔ تو پہچانا کہ ہم سفر خاتون مس رعنا عباسی ہیں۔

مس رعنا، علی گڑھ اور آکسفورڈ کی تعلیم یافتہ یہیں دلی یونیورسٹی میں لکچرار تھی۔ ستائیس اٹھائیس سال کا سن، دبلی پتلی، خاموش، متین، گورا رنگ، ناک نقشہ خاصا، خواہ مخواہ رنگین عینک کے پیچھے آنکھیں چھپائے ہوئے۔ ماں نے مرنے سے پہلے اس کا ذکر بھی کیا تھا۔ اور سلیم کی اس سے دو تین پارٹیوں میں ملاقات بھی ہو چکی تھی۔

سلیم نے اس سے پوچھا۔ "کیا آپ بھی لکھنؤ جا رہی ہیں؟"

وہ جیسے اس سے گفتگو کا بہانہ ہی ڈھونڈ رہی تھی۔ "جی ہاں! — ایک عزیزہ وہاں بیمار ہو کر میڈیکل کالج میں داخل ہیں، بے چاری ٹی بی میں گرفتار ہیں۔ تار آیا ہے۔ ان کی حالت اچھی نہیں .....!"

سلیم نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ "جہاں آرا تو نہیں!"

اس نے کہا۔ "جی ہاں! ..... کیا آپ انھیں جانتے ہیں؟"

سلیم اپنی برتھ سے اٹھ کر اس کی برتھ کے پاس جا کھڑا ہو گیا۔ بولا "جی ہاں! میں بھی انہیں کو پچیس برس بعد دیکھنے جا رہا ہوں۔" اور وہ گاڑی کے پٹری بدلنے کی وجہ سے ڈگمگانے لگا۔

وہ اپنے بستر پر ایک گوشے میں سمٹ کر بولی۔ "ارے تو بیٹھ جائیے نا۔ آپ کھڑے کیوں ہیں؟"

اور رعنا کی زبانی پہلی دفعہ سلیم نے جہاں آرا کی دُکھ بھری کہانی سنی۔ آئی سی ایس بوڑھے دولہا کو شادی کے دوسرے ہی دن قلبی دورہ پڑا۔ تین مہینے مسلسل بستر پر پڑے رہے اور عمر بھر کے لئے طرح طرح کے پرہیز لازمی قرار دے دیے گئے۔ جہاں آرا کو دوسرے ہی سال میں اختلاجی دورے شروع ہو گئے۔ وہ معدے کی بیمار ہو گئی۔ پھر جب شوہر نے پنشن لے کر بہار کے ایک دیہات میں رہنا شروع کیا تو اسے کالا آزار ہوا۔ اس سے مر کر بچی تو حرارت مستقل طور پر رہنے لگی۔ پھول جیسے چہرے والی اور ہر وقت ہنسنے والی جہاں آرا سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ شوہر پر دل کا دوسرا دورہ پڑا۔ وہ چل بسے۔ سوتیلے لڑکوں نے بے رُخی برتی، ہر طرح ستایا۔ جلایا، تڑپایا۔ وہ دق میں گرفتار ہو کر اپنے بھائی وحید کے پاس چلی آئی۔ بھائی نے اس کا گھر میں رہنا مناسب نہ سمجھا میڈیکل کالج میں داخل کرا دیا۔

سلیم نے پوچھا: "آپ کا اس سے کیا رشتہ ہے؟"

وہ بولی۔ "میرے والد اور ان کے شوہر چچا زاد بھائی تھے۔ میں ان کو چچی کہتی ہوں۔ گو وہ رشتے اور عمر میں مجھ سے بڑی ہیں مگر وہ مجھ سے ہمیشہ چھوٹی بہن یا سہیلی کی طرح پیش آئیں۔ میں اُن کی عزت بھی کرتی ہوں۔ اور ان سے محبت بھی۔"

اب رعنا کی باری تھی۔ اس نے پلٹ کر پوچھ لیا۔ "آپ جہاں آرا کو کیسے جانتے ہیں؟"

اور اس کے ہمدردانہ لہجے نے اس آتش فشاں میں سوراخ کر دیا جہاں پچیس سال سے لاوا سلیم کے دل میں پک رہا تھا۔ اس نے رعنا کو اپنی داستان غم سنا دی۔ وہ بہت متاثر ہوئی۔ سلیم کو پہلی دفعہ محسوس ہوا۔ کہ اُستانی کے چہرے کا روکھا پن جاتا رہا۔ اور اس پر نسوانی نرمی اور تازگی جھلکنے لگی وہ رک رک کر بولی۔ "اب میں سمجھی کہ جہاں آرا چچی کے ہنستے میں آنسو کیوں جھلکتے تھے۔ نہ جانے کتنی لڑکیوں کی زندگیاں ہمارے سماج میں اسی طرح برباد ہو جاتی ہیں۔"

سلیم نے پوچھا۔ "اور لڑکوں کی نہیں؟"

وہ بولی "نہیں، سوائے نکموں کے اور کسی کی نہیں! ... اپنے ہی کو لیجئے۔ آپ نے جیسے ان کو دل سے نکال کر اس کے دروازے بند کر لئے اور اطمینان سے دوسرے کاموں میں لگ گئے۔ آپ کو ان کو بھلانے کے لئے ہزاروں بہانے مل گئے!"

سلیم نے ذرا تیکھے پن سے کہا۔ "جی ہاں، جب ہی تو اس کی یاد دل سے لگائے آج تک کنوارا بیٹھا ہوں۔"

رعنا نے اسے کچھ تعجب سے، کچھ شرما کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہلکا سا رنگ آ گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "میرے دل میں آپ کی قدر بہت بڑھ گئی ہے۔"

ممکن تھا گفتگو اور بھی دلچسپ ہو جاتی، مگر اُوپر کی برتھ والوں میں سے ایک نے کہا۔

"اگر آپ لوگوں کو زحمت نہ ہو تو بتی بجھا دیجئے۔ میں سونا چاہتا ہوں!"

سلیم نے۔ "ارے معاف کیجئے گا" کہا اور بتی بجھا کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ نیند کاہے کو آتی۔ ماضی کی یادوں کا آنکھوں پر پہرا تھا۔ پھر دفعتاً اسے کچھ اور ہی خیال آیا۔ رعنا سے بڑی جہاں آرا آ رہی تھی۔ ماں نے مرنے سے پہلے جو رعنا سے رشتہ کرنے کا ذکر کیا تھا۔ یاد آ گیا۔ ماضی و حال جسم و رُوح میں جنگ چھڑ گئی۔ رُوح کہتی۔ "ہائے، وہ جس پر جان چھڑکتے تھے۔ جس کی یاد میں زندگی تج دی وہ دم توڑ رہی ہو گی۔ اور تم ہو کہ کچھ اور سوچنے لگے۔"

جسم کہتا۔ "رعنا تو عینک اتار کچھ اور ہی ہو جاتی ہے آنکھوں میں بلا کا جادو ہے اور وہ جس طرح جھینپتی ہے۔ اس میں تو ساری مشابہت جہاں آرا کی آتی ہے اور پھر جہاں آرا، پچیس برس پہلے والی جہاں آرا، ہنستی، لبھاتی، لپکتی بھاگتی جہاں آرا سامنے آ کر کھڑی ہو گئی، وہ اسی طرح کی ملی جلی تصویریں بند آنکھوں سے دیکھتا۔ بالآخر سو گیا۔

بولی؛ اور اس نے دوسرے سیب میں دانت جما دیے۔ رعنا نے بھی مسکرا کر سیب لے لیا۔ پرس میں سے ایک چھوٹا سا خوبصورت چاقو بڑھا کر کہا۔ "کہاں تک دانتوں کو زحمت دیجیے گا۔ اسے استعمال کیجیے۔" وہ بولا۔ "دانت مصنوعی نہیں، لیکن سیب کھٹا ضرور ہے۔" اور وہ بنا بنا کر اسے کھانے کی کوشش کرنے لگا۔

رعنا نے ایک قاش چکھی۔ اس نے کہا۔ "مگر یہ تو خاصا میٹھا ہے! یہ لیجیے چکھیے۔" اور اس نے دوسری قاش سلیم کی طرف بڑھائی۔ سلیم نے اسے کھا کر کہا۔ "اس میں آپ کے ہاتھ کا اثر آ گیا ہے!"

وہ کچھ شرما گئی پھر بولی۔ "اب اسے پھینکیے اور اسی کو کھائیے۔"

اور اس نے سیب کی پتلی پتلی قاشیں کاٹ کر تولیہ پر رکھ دیں۔ سلیم نے اپنا سیب کھڑکی کا شیشہ اٹھا کر باہر پھینک دیا اور رعنا کی تراشی قاشوں میں حصہ لگایا۔

پھر اس نے سنترے اٹھا کر اس کی طرف بڑھائے۔ "اب انھیں بھی آپ ہی چھیلیے۔ میرا ہاتھ لگتے ہی یہ بھی کھٹے ہو جائیں گے۔"

وہ ایک استانی کی طرح بولی۔ "جاڑے میں تو ہر پھل کا کھٹا ہونا فطری ہے ان کا عرق نہ اچھی طرح پکنے پاتا ہے نہ سوکھنے!"

پھر سنترے کی ایک قاش پکڑ کر سلیم کی طرف بڑھاتی ہوئی بولی۔

"مگر اس کی کھٹاس بہت ہی لطیف ہے۔ بس ایک ہلکی سی چاشنی۔"

سلیم نے کہا۔ "مگر دوسرا بھی چکھ لیجیے۔ اس کی چند قاشیں تو بیسیوں کے لیے ناکافی ہوں گی۔"

اس نے دوسرے سنترے کی ایک قاش کھا کر کہا۔ "جی واقعی میٹھا ہے۔ اس میں ترشی ہی نہیں۔"

سلیم نے کہا۔ "پھر اس کی چاشنی سے آپ لطف اٹھائیے وہ میٹھا سنترا مجھے عنایت کیجیے۔"

وہ ہنس دی۔

جب دونوں سنترے ختم ہو گئے تو سلیم نے کہا۔ "بس ایک پیالی چائے اور مل جاتی تو من و سلویٰ کا مزہ آ جاتا!"

وہ بولی! "جی، چائے تو میرے ساتھ ہے۔"

اور اس نے اپنا بیڈ کا ٹفن کیریر کھول کر اس میں سے تھرماس نکالا اور سلولائیڈ کا ایک گلاس نکالا۔ اور اس میں چائے انڈیل کر سلیم کی طرف بڑھائی۔

وہ بولا۔ "واہ واہ! آپ نے کیا بروقت پیاسے کی پیاس بجھائی!"

پھر وہ رعنا سے اجازت لے کر چائے کے ساتھ ساتھ سگریٹ پیتا رہا۔ اور کنکھیوں سے اس کے بیٹھنے، چائے پینے کے دلکش انداز کو دیکھتا رہا۔ اور دفعتاً اس کے دل میں خیال آیا۔ "کیا اس رات کے دلچسپ سفر کے بعد جب کہ اس مہذب، تعلیم یافتہ دلربا...... " وہ دل رہا کر۔ لفظ پر ٹھٹکا۔ اس نے رعنا پر نظر ڈالی۔ اس وقت اس کے بال بے ترتیب تھے آنکھوں پر چشمہ نہ ہونے سے ان میں نیند کے خمار نے لال لال ڈورے ڈال دیئے تھے۔ اس کے آفتابی چہرے سے بھولا پن برس رہا تھا۔ اور وہ نصف دھڑ سے بسنتی ریشمی لحاف میں لپٹی بہت اچھی معلوم ہو رہی تھی۔

سلیم کو خود اپنے خیالات پر شرمندگی محسوس ہوئی۔ اس نے سگریٹ بجھا کر باہر پھینکی۔ اور اپنی برتھ پر چڑھتے ہوئے کہا۔ "آپ کو اب نیند آ رہی ہو گی۔ معاف کیجیے گا۔ میں نے آپ کو بہت دیر جگایا۔"

وہ بولی۔ "ہاں! اب تو ساڑھے گیارہ کا وقت ہے!"

سلیم نے بتی بجھا دی۔ اور نیند بلانے کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ مگر نیند تو معشوق صفت ہے نہ وہ بلانے سے آتا ہے نہ یہ بلانے سے آتی ہے اس نے تو دماغی سکون اور جسمانی تھکن سے بندھن باندھ رکھے تھے۔ نہ سلیم کے دماغ میں سکون تھا۔ اور نہ اس نے کوئی خاص جسمانی محنت کی تھی۔ دن بھر بھوکے رہنے کی محنت یا لاش ڈھونے والی لاری پر بیٹھ کر قبرستان میں کچھ دیر کھڑے رہنے کی محنت یہ نیند لانے والی محنتیں نہ تھیں۔ بلکہ دماغی سکون چھین لینے والی۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ غیر شعوری طور پر ایک شرمندگی سی تھی۔ جہاں آرا کو وہ وعدہ شکن بے وفا سمجھ چکا تھا۔ مگر وہ بھی زبان پر قائم نکلی۔ اور وہ خود؟ اس نے کیا کیا نہ کیا! کس کس طرح جسم کی بھوک نہ مٹائی۔ اس میں شک نہیں کہ سال دو سال میں وہ سنبھل گیا۔ اور پھر اس کے قدم نہ ڈگمگائے مگر اس میں اس کی کیا تعریف؟ اپنے سے چھوٹے بھائی بہن، مجسم نیکی و شرافت ماں، پھر عہدے کی ذمہ داریاں، ملازمت میں ترقی کی خواہش ان سب نے اسے رنگ رلیاں مچانے، بدنام بننے سے روکا۔ بس لے دے کے اس نے اتنا ہی تو کیا کہ شادی نہ کی۔ جہاں آرا کی جگہ کسی کو گھر کی ملکہ نہ بننے دیا۔ سو اب تو اس کے مرنے سے اس کا بندھن بھی ٹوٹ گیا۔ عہد و معاہدے بھی ختم ہو گئے۔ وہ آزاد ہو گیا۔ مگر اس آزادی کے بعد بھی وہی ناقابل برداشت تنہائی! لیکن کیوں رہے وہ تنہا؟ اچھی خاصی مہذب و شائستہ تو ہے رعنا۔ ماں نے اپنی زندگی میں پسند بھی کیا تھا۔ مگر کیا وہ بھی پسند کرے گی؟ کیوں نہ پوچھ لوں۔ اس سے بہتر اور کون سا موقع ملے گا صاف صاف گفتگو کا۔ اس نے کروٹ لی۔

رعنا کا دل کل رات کو بھی سلیم کو اپنے ڈبے میں دیکھ کر دھڑکا تھا۔ اور آج رات اکیلے کوپے میں اس کے ساتھ سفر کرنے میں تو گویا اس میں پنکھے لگے تھے۔ اس کے دل میں بھی چور تھا۔ ڈیڑھ سال قبل جب وہ یونیورسٹی میں لکچرار مقرر ہو کر دلی آئی تھی۔ تو وہ رشتے کی ایک خالہ کے ہاں ٹھہری تھی۔ جب وہ آکسفورڈ میں تعلیم ہی پا رہی تھی۔ کہ والدین کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ اسی وقت واپس آجاتی۔ مگر سرکاری وظیفہ لے کر گئی تھی۔ اس لئے اس نے تعلیم مکمل کی۔ جون میں ہندوستان آئی۔ اور جولائی میں اسے یہ جگہ مل گئی۔ عزیزوں میں اپنے قصبے میں ایک ماموں تھے۔ اور دلی میں یہ رشتے کی خالہ بے چاری کے کوئی اولاد نہ تھی۔ میاں مرکزی سکریٹریٹ میں سینئر گریڈ کے کلرک تھے۔ اپنا گھر تھا، کشادہ وسیع۔ رعنا جو ان کے گھر آئی تو گویا گھر آباد ہو گیا۔ ان کو فکر تھی۔ کہ اس کی شادی بھی ہو جائے۔ تو اس کے شوہر کو خانہ داماد بنا کر اس سونے گھر میں بچوں کی کلکاریاں سنیں۔ اسی لئے اس کے آتے ہی انہوں نے اس کے لئے موزوں بر ڈھونڈنا شروع کر دیا تھا۔ سلیم سب سے زیادہ موزوں شخصیت دکھائی دی تھی۔ بڑی بی کے سامنے تجویز پیش کی گئی تھی۔ مگر انھوں نے اس معاملے میں اپنی بے بسی ظاہر کی تھی۔ "میری بھی یہی تمنا ہے کہ گھر میں بہو آئے۔ میں بھی پوتا پوتی کھلاؤں۔ مگر سلیم کو جیسے شادی کے نام سے چڑ ہے۔" رعنا سے یہ باتیں چھپی نہ تھیں۔ وہ ایک طرح دل ہی دل میں سلیم سے خفا تھی۔ وہ صورت شکل، تعلیم و تہذیب کے اعتبار سے ایسی تو نہ تھی۔ کہ اس کے معاملے میں اس قسم کی بے رخی برتی جائے۔ اس لئے اس نے جب بھی سلیم کو پارٹی وغیرہ میں دیکھا تو ایک معاندانہ نظر سے دیکھا اور اسے "نرگسی" اور گھمنڈی قرار دیا۔

مگر کل سے وہ خود بیں و مغرور ایک دوسری ہی صورت میں دکھائی دے رہا تھا۔ ملن سار، با اخلاق، درد مند، با وقار، سچا عاشق "بڑی قسمت والی تھی جہاں آرا۔ جو اسے اس جیسا چاہنے والا ملا! اے کاش ....." اور اس نے منہ پر لحاف کھینچ کر اپنے خیالات کو بھی اس طرح چھپانے کی کوشش کی۔ گویا کوئی کوڑا انہیں اس کے چہرے سے پڑھتا جاتا ہے۔

ویسے ہی سلیم نے کروٹ لیکر نیچے جھانکا، برتھ میں جو حرکت ہوئی تو رعنا نے منہ سے لحاف اٹھا کر اوپر دیکھا۔ نائٹ بلب کی ہلکی روشنی میں اس کی آنکھیں جھپکیں۔ سلیم نے ہاتھ بڑھا کر روشنی کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا آپ سو گئیں؟"

رعنا نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ "نیند کسی کی باندی نہیں کہ بلاتے ہی دوڑ آئے۔"

سلیم نے ایک سگریٹ جلائی۔ کئی لمبے لمبے کش لئے اور کہا۔ "میں آپ سے ایک بات دریافت کرنا چاہتا ہوں۔"

رعنا نے کہا " فرمائیے "
اس نے کہا " میرے گھر نہ بسانے کی وجہ سے تو آپ واقف ہی ہو گئیں ۔ میں آپ سے یہ دریافت کرنا چاہتا تھا کہ آخر آپ نے آج تک شادی کیوں نہ کی ؟"
رعنا کا چہرہ سرخ ہو گیا ۔ " آپ کو اس طرح ذاتی سوال کرنے کا کیا حق ہے ؟"
سلیم نے کہا " اسی حق کو حاصل کرنے کے لئے تو پوچھ رہا ہوں !"
وہ خاموش رہی ۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آتا ایک رنگ جاتا رہا ۔ سلیم نے کہا ۔ " کیا آپ بھی میری طرح کسی سے زبان ہار بیٹھی تھیں ؟" وہ پھر بھی چپ رہی ۔ وہ بولا " آپ کو جو سب سے زیادہ پیارا ہو اسی کے سر عزیز کی قسم بتا دیجئے "
وہ بولی " آپ تو بچوں جیسی باتیں کرتے ہیں !"
اس نے مسکرا کر کہا ۔ " اب آپ خدا نخواستہ ایسی بڑھی بھی نہیں کہ میں آپ کے سامنے بچہ معلوم ہوں " رعنا مسکرائی ۔ پھر نظریں نیچی کر کے بولی ۔ " جی ، کسی رشتے میں والدین نے کیڑے نکالے ، کسی میں میں نے "
وہ ہنس کر کہنے لگا ۔ " تو اب تو اکیلے آپ ہی کو فیصلہ کرنا ہے ۔ اس لئے میرے ساتھ رشتہ کرنے میں آپ ہی کیڑے نکالئے !" وہ عجیب بوکھلاہٹ لئے سلیم کا منہ تکنے لگی ۔ وہ بولا ۔ " میں اوپر کی برتھ پر لیٹا یہی سوچتا رہا ۔ میں نے آپ کو مجمع میں بھی دیکھ لیا ، اکیلے بھی دیکھ لیا ۔ آپ نے بھی میرے ساتھ دو راتیں کاٹیں ۔ دن بھر ساتھ رہا ۔ غمی و پریشانی بھی ساتھ جھیلی ۔ اب دونوں خوشی کے ساتھ ساتھ کیوں نہ کاٹیں ؟"
وہ رک رک کر بولی " مگر ۔ مگر ۔ ان چند گھنٹوں کے ساتھ میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہ آپ نے مجھ کو پہچانا نہ میں نے آپ کو "
وہ بحث کرنے والے انداز میں بولا ۔ " کیا کوئی کسی دوسرے کو ایک عمر ساتھ رہ کر بھی پہچان سکتا ہے ؟"
وہ تڑسے بولی ! " کیا جہاں آرا نے آپ کو اور آپ نے جہاں آرا کو نہ پہچانا تھا ؟"
اس نے کہا : " کیا خاک پہچانا تھا ۔ اسے یہ کہاں معلوم کہ میں نے یہ یقین کر لیا تھا کہ وہ اپنے وعدے سے اپنی قسمیں بھول گئی ۔ اور غم و غصہ میں شراب پی کر بے خود رہا اور بیسیوں عورتوں سے دل بہلایا ۔ وہ مجھے وفا کا پتلا سمجھتی رہی ۔ اور میں نہ جانے کتنی دفعہ پھسلا ، گرا ، تب کہیں جا کر سنبھلا ۔ اور وہ بھی اس لئے کہ مجھ پر ذمہ داریاں آپڑیں ۔ ماں کی ، بھائیوں کی ، بہنوں کی اور سب سے زیادہ عہدے کی !"
وہ طنز سے مسکرا کر بولی ۔ " آپ نے ابھی بیسیوں دل بہلانے والیوں کا ذکر کیا ہے ، تو کیا اس وقت کی گفتگو اس لئے چھیڑی ہے ۔ کہ ان کی تعداد میں ایک اور بڑھا کر اکیسویں دل بہلانے والی مہیا کر لیں ؟"
وہ جھنجلا اٹھا ۔ اس نے کہا " جی میں آپ سے دل بہلانے کی باتیں نہیں کر رہا ہوں بلکہ ایک تنہائی سے عاجز آئے ہوئے انسان کی طرح رفاقت حیات کی درخواست کر رہا ہوں "
رعنا نے نیچے کا ہونٹ ہلکے ہلکے چبا کر کہا " میرا رشتہ ایک جگہ طے ہو چکا ہے اور پندرہ دن میں شادی ہونے والی ہے "
وہ چپ ہو گیا ۔ ریت پر بنایا ہوا محل ڈھ گیا ۔ اس نے سگریٹ جلائی ۔ کرسی سے متصل کھڑکی کا شیشہ اٹھا کر تھوڑی دیر باہر دیکھتا ، پھر اس نے آدھی پی ہوئی جلتی سگریٹ باہر پھینک کر شیشہ گرایا ۔ اور " شب بخیر " کہتا ہوا اپنی برتھ پر لیٹ کر روشنی بجھا دی ۔ رعنا کے دل پر اس شکست خوردہ انداز نے بڑا اثر کیا ۔ وہ مجبوراً شوہر سے سلیم کا مقابلہ کرنے لگی ۔ یہ شخص جو باوجود اپنی ذہانت ، اپنی قابلیت ، اپنی جسمانی خوبصورتی ، اپنے بلند عہدے کے اتنے دنوں سے سچی محبت سے محروم رکھا گیا ۔ کیا اس پر قابل ترجیح نہیں جو دوسروں کی پسند سے چنا گیا ہو ۔ جو نہ دنیاوی جاہ و مرتبے میں اس کا ہم پلہ ہے اور نہ مردانہ حسن صورت و سیرت میں ؟ اس کے دل میں جنگ سی ہونے لگی ۔

ادھر سلیم کو اس گھپ اندھیرے میں ستارے کی طرح ایک ذہین چمکتی دکھائی دی۔ وہ فوراً روشنی جلاکر نیچے اتر آیا۔ رعنا نے جواب تک لیٹی تھی اُسے گھبراکر دیکھا۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر بولا: "یہ رشتہ آپ نے خود پسند کیا ہے؟"

رعنا نے کہا۔ "معزز ہی، بزرگوں میں صرف ایک ماموں اور ایک خالہ رہ گئی ہیں یہ انھیں نے طے کیا ہے۔"

اس نے ایک وکیل کی طرح جرح کی: "آپ ان صاحب سے کبھی ملی بھی ہیں؟"

وہ بولی: "نہیں صرف فوٹو دیکھا ہے۔"

وہ کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "آپ نے میرا اور جہاں آرا کا قصہ سُن کر کہا تھا: ہمارا سماج بڑا ظالم ہے اپنے شکنجے میں کس کر نہ جانے کتنی بچیوں کا خون کرتا ہے۔ کیا آپ نے اپنا حق انتخاب چھوڑ کر خود کو اس شکنجے میں نہیں پھنسا لیا ہے؟"

وہ بولی۔ "آپ بیکار بحثیں کرتے ہیں۔ میں نے ہی تو ہاں کر دی۔ پھر اپنا حق کہاں چھوٹا؟"

سلیم نے اپنی وکالت کی: "تو پھر اپنے فیصلے پر نظرثانی کیجئے! ۔۔۔ اُس وقت ایک اکیلا دعویدار تھا۔ اب تو میں بھی سامنے درخواست لئے کھڑا ہوں۔"

وہ ہارتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "لیکن میں اگر اپنی بات سے اب پلٹوں تو لوگ کیا کہیں گے؟"

وہ بولا۔ "اس مسئلے میں لوگوں کا کہنا اتنا اہم نہیں ہے، جتنا کہ آپ کی پوری زندگی کا سوال اہم ہے۔" اور اس نے رعنا کو ایسی فریادی اور عاجزی کی نظر سے دیکھا۔ جیسے وہی اکیلی اس تنہائی کو دور کر سکتی ہے اور ستائیس برس کی رعنا کو اپنی ضرورت کی اہمیت کے احساس نے سپرانداختہ کر دیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا۔ اور سر جھکا کر اسے اُٹھے ہوئے گھٹنوں پر رکھ لیا۔ سلیم نے اس کے جھکے ہوئے سر کو آہستہ آہستہ تھپتھپا کر کہا۔ "ہم دونوں پڑھے لکھے ذمہ دار لوگ ہیں۔ ہم ایک دوسرے پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔ کہ اگر ہم اپنی خوشی سے کوئی نئی ذمہ داری لیں گے تو اسے کامیابی سے نباہیں گے بھی اور ہم یقینی اپنے اپنے فرائض کے ادا کرنے میں پورے اتریں گے۔"

رعنا نے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر اسے بڑی بے بسی سے دیکھا۔ سلیم نے کہا۔ اس میں کوئی جبر و ظلم و تشدد کا پہلو نہیں۔ یہ تو خوشی کا سودا ہے اس لئے اسے تو ہنس ہنس کر طے کرنا چاہیئے۔" رعنا نے مسکرا کر منہ چھپا لیا۔ وہ بولا۔ "اچھا اب آپ آرام سے سوئیے۔ مجھے بھی نیند آجائے گی۔ اب دلی پہنچنے پر مزید باتیں ہوں گی۔"

صبح کو چھ بجے ہاپڑ کے قریب جب سلیم کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا۔ کہ ڈبے کے باتھ روم سے رعنا نہائی دھوئی، نئی خوش رنگ ساڑی پہنے بنی سنوری نکل رہی ہے۔ اُس نے اس کھلے ہوئے پھول کا اچھی طرح نظارہ کرنے کے لئے تیز روشنی جلاکر "گڈ مارننگ" کہا۔ تو وہ شرما گئی۔ اور مشکل سے جواب سلام دے سکی۔ اس شرمانے میں جو خاص کیفیت تھا سلیم اس سے لطف لیتا ہوا برتھ سے اترا۔ اور خود بھی سوٹ کیس سے نیا جوڑا نکال کر، تولیہ صابن وغیرہ لے کر باتھ روم میں گھس گیا۔ اور وہاں سے نکلتے وقت جب اس نے اپنے چہرے پر آئینے میں نظر ڈالی۔ تو اسے اپنے گالوں پر ایک ہلکا سا رنگ دکھائی پڑا۔ جس پر وہ بے ساختہ مسکرا پڑا۔

ہاپڑ کے اسٹیشن پر اس نے ڈبل ٹی، آملیٹ کے ساتھ منگوائی اور ہاپڑ مٹھائی اور پھل کا اس میں اضافہ کر کے رعنا کے ساتھ ناشتہ کیا۔ پھر اسے کرسی پر بٹھا کر اس کا اور اپنا ہولڈال باندھا۔ اور رات کے پھل اس کے ناشتہ دان میں ڈال دیئے۔ ان کاموں سے فارغ ہو کر وہ متانت سے بولا۔ "مجھے یقین ہے کہ آپ نے میرے حق میں فیصلہ کیا ہوگا۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ یہ فریضہ آج ہی انجام پا جائے۔"

رعنا نے پھر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔ "ہائے اللہ اتنی جلدی کیوں؟"

وہ مسکرا کر بولا: "میں بیالیس برس کا ہو چکا، اسپ عمر تیزی سے بھاگا جا رہا ہے اس لئے مجھے جتنے لمحے بھی آپ کی رفاقت کے مل سکیں گے وہ میرے لئے بڑے قیمتی ہوں گے؟"

وہ رک رک کر بولی: "تو آپ یہ باتیں خالہ جان سے مل کر کہئے گا:"

گاڑی دلی اسٹیشن کے پلیٹ فارم میں داخل ہونے لگی۔ وہ خاموش ہو گیا اسٹیشن کے باہر آ کر سلیم نے ٹیکسی کی۔ رعنا کو پچھلی سیٹ پر تنہا بٹھایا۔ خود ڈرائیور کی بغل میں بیٹھ گیا۔ چلتے وقت ڈرائیور کو زور سے "بارہ ہندو راؤ، رعنا کی قیام گاہ چلنے کا حکم دیا۔ مگر راستے میں چپکے سے دوسری طرف گاڑی مڑوا دی۔ جب گاڑی جامع مسجد کے پھاٹک پر رکی تو رعنا نے گھبرا کر پوچھا۔ "یہاں کیا کام ہے؟" سلیم نے کہا۔ "آئیے چلئے، خدا کے مقدس گھر میں ہم دونوں ساتھ ساتھ پہلے داخل ہولیں۔ پھر نئی زندگی میں قدم رکھیں گے:"

جب وہ دونوں اندر پہنچے اور امام صاحب سے ملاقات ہوئی تو سلیم نے اسی وقت نکاح پڑھ دینے کی فرمائش کر دی۔ امام صاحب نے تعجب سے رعنا کی طرف دیکھا۔ اس نے گھبرا کر سلیم سے کچھ کہنا چاہا۔ "مگر..... مگر..... خالہ جان.....:"

وہ بات کاٹ کر بولا۔ "خالہ جان، میرے بارے میں اپنی پسندیدگی کا اظہار بہت پہلے کر چکی ہیں:" رعنا پچھلی سلسلہ جنبانی یاد کر کے پسینے پسینے ہو گئی۔ سلیم اس کے کان کے قریب منہ لا کر بولا۔ "میری عمر کی ڈھلتی دھوپ میں اگر رومان کی تھوڑی سی چمک اور گرمی آ جائے تو کیا برائی ہے رحم کرو رعنا، میں اب پہاڑ سی راتیں تنہا نہیں کاٹ سکتا:"

رعنا کا چہرہ شرم سے گلنار ہو گیا۔ اس نے گردن جھکا لی اور وہ امام صاحب کے سوالات کے جواب میں "ہاں" کے سوا کچھ نہ کہہ سکی۔

انھوں نے خطبہ پڑھا۔ اس جوڑے کے لئے خوش و خرم زندگی بسر ہونے کی دعا مانگی۔ اور ایک سو ایک روپے بطور نذر کے، معمولی عذر کے بعد قبول کر کے انہیں مبارک باد دی اور یہ نئی طرح کے دولہا دولہن اسی ٹیکسی سے سلیم کے فلیٹ پر پہنچے۔

جب ملازم نیچے ٹیکسی سے سامان اتارنے چلا گیا تو سلیم نے رعنا کو گود میں اٹھا کر بیڈ روم والی مسہری پر بٹھا دیا۔

پھر وہ مسخرے پن سے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکا اور بولا۔ "اپنے خاص غلام کا سلام قبول کیجئے! گھر کی ملکہ!"

وہ ہنس کر بولی "آج مجھے ذاتی تجربہ ہوا کہ مرد عورتوں کا کیونکر اغوا کرتے ہیں:" دونوں ہنسے۔ رعنا کی اس ہنسی میں سلیم کو بالکل پچیس برس والی جہاں آرا کی شیریں جھنکار سنائی دی۔

معاً اس کی نظر دیوار پر آویزاں فوٹو کی طرف اٹھ گئی۔ اس نے اسٹول رکھ کر اسے دیوار سے اتارا۔ رعنا نے اسے سوالیہ انداز سے دیکھا۔ وہ بولا "اب اس کی جگہ آپ کی تصویر ہوگی:"

اور تصویر کو دراز میں بند کرتے کرتے اس نے کہا۔ "آئیے! ایک ایک سورۂ فاتحہ پڑھ کر جہاں آرا کو بخش دیں۔ اس نے اپنے آپ کو جلا کر گھر کا چراغ جلایا۔ خود عمر بھر شمع کی طرح پگھلتی رہی، مگر ہمارے دلوں میں ایسی روشنی جلا گئی۔ جو اللہ نے چاہا تو ہماری زندگی بھر نہ بجھے گی:"

رعنا کو پہلی دفعہ اپنے نئے گھر کے ساتھ جہاں آرا کا ذکر برا معلوم ہوا اور جب دونوں نے فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھائے تو رعنا نے خدا سے دعا مانگی۔ کہ "اے اللہ! جس طرح جہاں آرا کا دیوار پر لٹکا ہوا فوٹو اتار لیا گیا ہے۔ اسی طرح میرے شوہر کے دل سے جہاں آرا کی تصویر نکال کر اس کی جگہ میری تصویر آویزاں کر دے!"

اور اس نے اپنی دعا کو مقبول بنانے کے لئے دونوں بلند ہاتھوں کو سر سے اونچا کر کے انگلیوں میں انگلیاں پھنسا کر کھینچا ئیں اور ایک ایسی انگڑائی لی۔ کہ سلیم کی آنکھوں میں شمعیں سی جل اٹھیں۔

ضمیرالدین احمد
فنون - لاہور

شیشے میں بال!

"پانچ ہزار روپے کی ہے!" غفور نے موٹر سائیکل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، جو گھنے نیم کے درخت کے نیچے کھڑی اونگھ رہی تھی۔

"سیکنڈ ہینڈ تو ہے!" غفار نے ناک چڑھاتے ہوئے کہا۔

یہ تو نہیں مگر کچھ اسی قسم کی بات غفور نے اپنے باپ سے اس وقت کہی تھی جب وہ موٹر سائیکل خرید کر لائے تھے۔ اُس نے کہا تھا "آئیں ابا جی۔ نئی ہے نا؟" اور جواب میں انھوں نے ایسی نظروں سے گھورا تھا۔ کہ وہ سہم کر رہ گیا تھا۔

غفور نے غفار کو ویسی ہی نظروں سے گھورنے کی کوشش کی۔ مگر وہ نہ سہما، نہ اپنی بات سے ہٹا۔ "اور نہیں تو کیا، سیکنڈ ہینڈ تو ہی — بس نیا رنگ چڑھا دیا ہے۔"

"واہ! ابا جی کہہ رہے تھے نئی ہے!"

اُس کے باپ نے اپنے منہ سے نہ سہی، اپنی آنکھوں سے یقیناً یہی بات کہی تھی۔

"بالکل جھوٹ!"

غفور کی کنپٹیاں سنسنانے لگیں۔ ابا جان اور جھوٹ۔

"تم خود جھوٹے ہو!"

"میں کیوں ہونے لگا جھوٹا!"

"پھر میرے ابا جان کو کیوں جھوٹا کہتے ہو — وہ بھلا جھوٹ بولیں گے!"

"تو پھر انھوں نے پرانی موٹر سائیکل کو نیا کیوں بتایا۔ یہ جھوٹ نہیں تو اور کیا ہے؟"

"جھوٹے ہو گے تم، تمہارے باوجی، تمہاری اماں، تمہارے سارے خاندان والے۔ ہاں!" سنسناہٹ گڑگڑاہٹ میں تبدیل ہو گئی تھی۔

"زبان سنبھال کر بات کرو۔ خبردار جو میرے باوجی اور گھر والوں کو جھوٹا کہا بتلائے دیتا ہوں — ہاں!"

"تو تم کیوں کہتے ہو میرے ابا جان کو جھوٹا۔ پانچ وقت کی نماز پڑھتے ہیں، پتہ ہے؟"

"اس سے کیا ہوتا ہے!"

"کس سے کیا ہوتا ہے؟"
"نماز پڑھنے سے!"
"آدمی سچ بولتا ہے اور نیک کام کرتا ہے اور......"
"سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل کوئی بتاتا ہے۔"
یکایک غفور کو خیال آیا کہ اس کا دوست حسد کا شکار ہو گیا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس کی کنپٹیوں میں نہ سنسناہٹ باقی رہی نہ گرگراہٹ۔
"تم تو جلتے ہو!"
"کیوں؟"
"تمہارے بابوجی کے پاس موٹر سائیکل جو نہیں!"
غفار نے ہنسنے کی کوشش کی: "انہیں پسند ہی نہیں موٹر سائیکل! وہ تو کار خریدیں گے!"
غفور کی تضحیک سے لبریز ہنسی میں بے ساختگی اور اثر تھا۔ "بڑے آئے کار خریدنے والے سائیکل تک تو نصیب نہیں!"
"سائیکل سے کپڑے خراب ہو جاتے ہیں۔"
"نہ کہیں، ہمارے ابا جان جب سائیکل چلاتے تھے تو دھبہ تک نہیں پڑتا تھا۔"
"مگر وہ تو پتلون پہنتے ہیں!"
"اس سے کیا ہوتا ہے!"
"پتلون سائیکل کی چین سے نہیں لگتا!"
"پتلون تو فرنگیوں کا پہناوا ہے، کافروں کا!"
"جی ہاں! سب بڑے لوگ پتلون پہنتے ہیں۔"
"اخوہ! یعنی تمہارے ابا بھی بڑے آدمی ہیں!"
"اور نہیں تو کیا! ہے پورے محلے میں کسی کے پاس موٹر سائیکل!"
"موٹر سائیکل سے کیا آدمی بڑا ہو جاتا ہے۔"
غفور نے ایک نظر غفار کے چہرے پر ڈالی۔ اُسے وہاں بے بسی نظر آئی۔ بے چارہ! اُس نے سوچا۔ اس کے بابوجی کے پاس موٹر سائیکل جو نہیں۔ ان کے پاس تو سائیکل تک نہیں جلنے نہ تو کیا کرے۔
"آؤ!" اس نے پلنگ پر سے اُٹھتے ہوئے کہا۔
"کہاں؟"
"آؤ تو!"
غفار بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔
"آؤ تمہیں موٹر سائیکل دکھائیں۔"
غفار نے آگے بڑھتے ہوئے قدم کو روک لیا۔ "میں دیکھ چکا۔"
"آؤ ٹھیک سے دیکھیں۔"

"اونہہ!"

اور غفار صحن کو عبور کرکے موٹر سائیکل کے پاس سے گزرتا ہوا باہر چلا گیا۔

غفار کے جانے کے بعد غفور کچھ دیر موٹر سائیکل کے گرد منڈلاتا رہا۔ پھر وہ دالان میں سے اپنے چھوٹے بھائی منّو کی ایک پھٹی قمیض اٹھالایا۔ اور اس سے موٹر سائیکل کو پونچھنے لگا۔ نیم کے گھنے درخت میں کوّے اونگھ رہے تھے۔ اور بیٹ کررہے تھے۔ جن کا نشانہ کبھی موٹر سائیکل کی سیٹ اور کبھی پٹرول کی ٹنکی بن جاتی۔ غفور نے جب تالی بجا کر اور "ہشت ہشت" کرکے کوّوں کو اڑانے کی کوشش کی تو دالان سے "ہونہہ" کی ایک تیز آواز آئی۔ غفور نے دالان کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک چھوٹے سے تخت پر جائے نماز بچھائے اس کی دادی وظیفہ پڑھ رہی تھیں۔ دادی ہر وقت نماز یا وظیفہ پڑھتی رہتی ہیں، اس نے سوچا۔ اور ان کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ انھوں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ اور وہ پھٹی قمیض کو موٹر سائیکل کی سیٹ پر پھیلا کر ان کے پاس چلا گیا۔ انہوں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گیا۔ اور وظیفہ ختم ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ تین چار منٹ بعد وظیفہ ختم ہوا تو انھوں نے پہلے اس کے منہ پر پھونکا اور پھر بولیں۔

"پرندوں کے بھی جان ہوتی ہے ہماری تمہاری طرح — وہ بھی آرام کرتے ہیں، انہیں کیوں بلا وجہ پریشان کررہے ہو آرام کرنے دو۔"

یہ اور اسی قسم کی نصیحتیں اسے اس کی دادی اٹھتے بیٹھتے کیا کرتی تھیں۔ اور وہ ہر نصیحت کو بڑے انہماک اور بڑی فرماں برداری سے سنا کرتا تھا۔

"مگر وہ بیٹ جو کررہے ہیں موٹر سائیکل پر!"

"تو ڈھانک دو اُسے کسی چیز سے۔"

"میں نے منّو کی پھٹی قمیض پھیلا دی ہے۔"

"اچھا کیا۔"

"آئیں دادی!" اس نے چند لمحات کے توقف کے بعد پوچھا — "ابّا جی بڑے آدمی ہیں نا؟"

دادی نے اپنی گندلائی ہوئی آنکھوں سے اسے غور سے دیکھا۔ اور چپ رہیں۔ ان کی خاموشی کہہ رہی تھی۔ کہ پوری بات کہو۔

"وہ غفار کہہ رہا تھا کہ تمہارے ابّا جی بڑے آدمی تھوڑے ہیں۔"

غفار کا نام سُن کر دادی بات کی تہہ تک پہنچ گئیں۔ ان دو کم عمر لڑکوں کے درمیان جو گفت گو تھوڑی دیر قبل صحن میں ہوئی تھی وہ دادی نے باوجود اپنے وظیفے کے تھوڑی بہت سن لی تھی۔

"وہ تو جلتا ہے — اس کے باوا کلارک جو ہیں!"

"اور ہمارے ابّا جی؟"

غفور کو معلوم تھا کہ اس کے ابّا جی کیا ہیں مگر وہ ان کے عہدے اور اس کی بڑائی کا ذکر اپنی دادی کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔ اس کے ابّا جی اس کی دادی کے اکلوتے بیٹے تھے اور اس کی دادی جب اپنے اکلوتے بیٹے کا ذکر کرتیں۔ تو کچھ اس انداز سے کہ غفور کا جی چاہتا۔ کہ وہ کہا کریں اور میں سنا کروں —

"تمہارے ابّا جی تو پیش کار ہیں پیش کار!"

"کلکٹر صاحب کے پیش کار ہیں نا!" غفور نے بات کو فوراً آگے بڑھایا۔

"اور نہیں تو کیا! ڈپٹی صاحب کے تھوڑا ہی ہیں۔"

"اور کلکٹر صاحب ان کی بہت عزّت کرتے ہیں نا!"

غفور کو معلوم تھا کہ اس کے اس جملے کے جواب میں اس کی دادی کونسا واقعہ سنائیں گی۔ انہوں نے وہی واقعہ سنایا۔ کہ پہلے پاندان کھول کر پان کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر کتھا چونا لگا کر اسے اپنے پوپلے منہ میں رکھ لیا۔

"بہت بھیڑ تھی۔۔۔" اس کی دادی کو اس بات کا احساس تھا کہ وہ یہ واقعہ اپنے پوتے کو اتنی بار سنا چکی ہیں۔ کہ اب اسے بیچ میں سے شروع کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑے۔۔۔ "جلسہ شروع ہو چکا تھا۔ کلکٹر صاحب کی نظر اچانک تمہارے ابا جی پر پڑی۔ وہ کھڑے ہوئے تھے۔ کلکٹر صاحب نے فوراً ایک آدمی کو بھیج کر انھیں بلوایا۔ ان کے لئے ایک کرسی منگوائی اور انھیں اپنے پاس بٹھایا۔

"یہ تو بڑی عزت کی بات ہوتی ہے۔۔۔ کلکٹر صاحب کے پاس بیٹھنے کی۔۔۔ ہے نا دادی!"

"اور نہیں تو کیا۔ اور خود کلکٹر صاحب نے ان کے لئے کرسی منگوائی۔"

"یہ غفار تو جلتا ہے۔ ہے نا دادی!" اس کی آواز میں خوشی نرغرا رہی تھی۔

"چھوٹے لوگ جلا ہی کرتے ہیں بیٹے۔ تبھی تو تمہارے ابا جی تمہیں اس کے ساتھ کھیلنے کو منع کرتے ہیں۔ وہ لوگ جُلاہے ہیں جُلاہے۔"

"اور ہم لوگ؟" غفور کو جواب معلوم تھا۔ مگر پھر بھی اُس نے پوچھا۔

"ہم لوگ سید ہیں!"

"آئیں دادی۔ سید پیغمبر صاحب کے۔۔۔" اُس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ کیونکہ اُسے مناسب الفاظ نہیں آتے تھے۔ مگر اس کی دادی اس کی ادھوری بات کا پورا مفہوم سمجھ گئیں۔

"ہاں بیٹے۔ کلکٹر صاحب تمہارے ابا جی کو "ہمیشہ" ویل سید صاحب کہہ کر پکارتے ہیں۔"

گلیارے میں کاکتیہ سلیپروں کی سٹر پٹر سنائی دی۔ اور دوسرے لمحے اس کی ماں چھینٹ کا تنگ پاجامہ۔ آنکھ کے نشے کی قمیض اور رنگی ململ کا دوپٹہ اوڑھے نمودار ہوئیں۔

"تو یہاں دادی کے کولہے سے لگا باتیں گھڑتا رہے گا یا تیار ہوگا؟"

اس کے باپ نے آج شام اسے موٹر سائیکل پر سیر کرانے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر وہ دادی کی مزیدار باتوں میں کھو کر اس وعدے کو تقریباً بھول گیا تھا۔

"ابا جی اُٹھ گئے کیا؟"

"تو کیا جب تک وہ اُٹھ نہیں جائیں گے تو تیار نہیں ہوگا۔" اس کی ماں نے ناراض ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"بس منہ ہی تو دھونا ہے!"

وہ چاہتا تھا کہ ابھی کچھ دیر اور دادی کی باتیں سُنے۔

"منہ ہی تو دھونا ہے!" اس کی ماں نے اس کا منہ چڑایا۔

"اور یہ کپڑے! یہی پہن کر جائے گا۔ ان کے ساتھ۔ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا۔ کہ پیشکار صاحب کا لڑکا اور ایسے کپڑے پہنے ہوئے ہے۔"

اس نے اپنے کپڑوں پر ایک نظر ڈالی۔ قمیض پر سالن کا ایک نمایاں سا دھبہ پڑا ہوا تھا۔ کفوں کے کنارے میل خوردہ تھے۔ پاجامہ گنجلا ہوا تھا۔ وہ کپڑے جمعے کے جمعے بدلا کرتا تھا۔ اور جمعہ ابھی دو دن دُور تھا۔ مگر آج تو اُسے اپنے ابا جی کے ساتھ باہر جانا تھا۔ وہ اپنی ماں کی بات سمجھ گیا۔

"اچھا ابھی بدلتا ہوں!"

اس کی ماں جاتے جاتے تنبیہ کر گئیں: "دیر کی تو یاد رکھنا وہ ہرگز نہیں لے جائیں گے اور پٹھکائی الگ کریں گے۔ ہاں!"

وہ سب لوگ جو چل پھر رہے تھے۔ آجا رہے تھے۔ ادنیٰ انسان تھے۔ ان کے پاس موٹر سائیکل جو نہیں تھی۔ اور اس کے باپ کے پاس موٹر سائیکل تھی۔ وہ اس موٹر سائیکل پر بیٹھا ہوا بازار سے گذر رہا تھا۔ بھیڑ موٹر سائیکل کے سامنے سے ایسی چھٹتی جیسے کائی۔ جب اس کے ابا جی ہارن بجاتے تو لوگ راستہ چھوڑ دیتے۔ اچھل کر ایک طرف ہو جاتے اسے محسوس ہو رہا تھا گویا ہر شخص مڑ مڑ کر اُس کے ابا جی۔ ان کی موٹر سائیکل اور اس کے چھوٹے بھائی منّو کو، جو اس کے ابا جی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ رشک و حسد کی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اور اس کا جی بار بار چاہ رہا تھا۔ کہ راستے میں کہیں غفار نظر آجائے۔ کیسا مزا آئے اگر غفار اسے اور اس کے ابا جی کو اس شان سے موٹر سائیکل پر بیٹھا ہوا دیکھ لے۔ یا اس کے بابو جی ہی کہیں راستے میں نظر آجائیں۔ وہ ضرور جاکر غفار سے کہیں گے۔ اور پھر غفار جلن کے مارے ....

موٹر سائیکل اچانک رک گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کیوں رک گئی۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ آس پاس کسی سبب کا پتا تک نہ تھا۔

"آئیں ابا جی!"

مگر قبل اس کے کہ وہ اپنا سوال پورا کرے اُس کے ابا جی نے اسے ڈانٹ دیا۔ "چپ رہو!"

اور وہ سہم کر چپ ہو گیا۔

پھر اس نے دیکھا کہ پولیس کا ایک سپاہی اپنی وردی کی جیب میں سے ایک چھوٹی سی کاپی نکالتا ہوا اس طرف آرہا تھا جہاں اس کے ابا جی موٹر سائیکل روک کر کھڑے ہیں سپاہی کو دیکھ کر اُسے یاد آیا۔ کہ موٹر سائیکل رکنے سے چند لمحے قبل اس نے سیٹی کی آواز سُنی تھی۔ ضرور اسی سپاہی نے بجائی ہوگی۔ وہ اس سے پہلے بھی کئی بار چوراہوں پر کھڑے سپاہیوں کو سیٹیاں بجاتے دیکھ چکا تھا مگر یہ اس کی سمجھ میں آج تک نہ آیا تھا۔ کہ وہ سیٹی کیوں بجاتے ہیں

"ڈرائیونگ لیسنس دکھاؤ" سپاہی نے کاپی کھولتے ہوئے کہا۔

اُس کے ابا جی نے ایک ایک کرکے کوٹ اور پتلون کی ساری جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور پھر سپاہی کی طرف دیکھنے لگے۔

"میں کہتا ہوں ڈرائیونگ لیسنس دکھاؤ!" سپاہی نے اس بار قدرے سختی سے کہا۔

"گھر بھول آیا"

"لیسنس گھر پر رکھنے کے لئے ہوتا ہے؟"

جواب میں اس کے ابا جی چپ رہے۔

"بنوایا بھی ہے یا ایسے ہی؟"

"بنوایا تو ہے جمعدار صاحب!"

جمعدار صاحب! ابا جی بہت لحاظ سے پیش آرہے تھے اس سپاہی سے، ڈانٹ کیوں نہیں دیتے اُسے۔ ان کی تو کلکٹر صاحب تک ....

"موٹر سائیکل تمہاری اپنی ہے؟"

بے ہودہ کہیں کا!!

"جی!"

"اور تم کو یہ نہیں معلوم کہ موٹر سائیکل پر تین آدمیوں کا بیٹھنا منع ہے!"

"مگر یہ تو!" اس کے ابا جی نے منّو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بہت چھوٹا ہے، بالکل بچہ ہے!"

سپاہی ہنسا۔ اس کی ہنسی دھار دار تھی۔

"بالکل یہ ہے تبھی تو کہہ رہا ہوں — قانون کا نہیں تو اس بالکل بچے کا تو خیال کرو۔ ایکسیڈنٹ ڈکیسیڈنٹ ہو جائے تو — ہے تو اپنا ہی!"
غفور نے اپنے ابا جی کے چہرے پر پشیمانی کے آثار دیکھے۔
"بات یہ ہے جمعدار صاحب کہ مجھے پتہ نہیں تھا۔ اب کبھی ایسا نہیں ہوگا۔"
"اور لیسنس ہمیشہ ساتھ رکھا کرو۔ سمجھے، جاؤ۔ اب کی معاف کر دیا۔ پھر نہیں چھوڑوں گا۔"
سپاہی جا کر پھر چوراہے پر کھڑا ہو گیا۔ اور اس کے ابا جی نے موٹر سائیکل کو ہینڈل سے پکڑ کر ڈھکیلنا شروع کر دیا۔ اس نے منّو کی انگلی پکڑی اور موٹر سائیکل کے پیچھے ہو لیا۔ تھوڑی دور جا کر — جب سپاہی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے ابا جی نے موٹر سائیکل کو اسٹارٹ کیا۔ اُس نے منّو کو ٹینکی کے سامنے بٹھا دیا۔ اور خود پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔
"اُلّو کا پٹھا!" اس کے ابا جی نے انجن کو گیئر میں ڈالتے ہوئے زیر لب کہا۔ اور موٹر سائیکل۔ "اُلّو کا پٹھا۔ اُلّو کا پٹھا" کی گت پر بھاگنے لگی ————

باغ میں اُس کے ابا جی نے موٹر سائیکل اس جگہ پارک کی جہاں کئی عورتیں گھنے درختوں کے نیچے پتھر کی بنچوں پر بیٹھی ہنس بول رہی تھیں۔
"جاؤ تم دونوں جا کر کھیلو!" اُنھوں نے غفور سے کہا اور غفور منّو کی انگلی پکڑ کر اس طرف چلدیا جہاں بہت سے بچے سیمنٹ کے ڈھلوان پر پھسل رہے تھے یا لوہے کے جھولوں میں جھول رہے تھے۔ غفور فوراً ڈھلوان پر چڑھنے اور پھسلنے میں مشغول ہو گیا۔ اور اس وقت تک مشغول رہا۔ جب تک کہ اس کے کان میں "بائی وان، بائی وان" کی آواز نہیں آئی۔ منّو اکیلا کھڑے کھڑے اکتا گیا تھا اور اپنے بھائی جان کو بلا رہا تھا۔ پھر غفور منّو کے ساتھ وہاں گیا جہاں جھولے پڑے ہوئے تھے۔ اور ایک خالی جھولے میں منّو کو گود میں لے کر بیٹھ گیا۔ اور پینگیں بھرنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر اس کی یہ کوشش زیادہ کامیاب نہیں ہوئی۔ کیونکہ اوّل تو اس کی ٹانگیں اچھی طرح زمین تک نہیں پہنچ رہی تھیں اور دوسرے اس کی گود میں منّو تھا۔ عاجز آکر اس نے جھولا چھوڑ دیا۔ اور جیب سے گیند نکال کر اچھالنے لگا۔ وہ گیند اچھالتا اور منّو اُسے لپکنے کی کوشش کرتا۔ پھر منّو نے گیند پر قبضہ جما لیا۔ اب وہ اسے اچھال کم پھینک زیادہ رہا تھا۔ اور غفور دوڑ دوڑ کر اسے اٹھا رہا تھا۔ اسی طرح کھیلتے کھیلتے دونوں بھائی باقی بچوں سے بہت دور چلے گئے۔ اور ایک دفعہ جو منّو نے گیند پھینکی تو وہ اچھلتی لڑھکتی اتنی دور چلی گئی کہ اس کا تعاقب کرتے ہوئے غفور تقریباً اس جگہ پہنچ گیا۔ جہاں اس کے ابا جی کھڑے کسی شخص سے باتیں کر رہے تھے۔ ان کی پیٹھ اس کی طرف تھی۔ وہ ٹھٹک گیا۔ شاید اس لئے کہ اس کے ابا جی اس شخص کی ٹھوڑی میں ہاتھ ڈال رہے تھے۔ یہ حرکت اسے کچھ عجیب سی لگی۔ مگر اس کا مطلب اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ بلا سوچے سمجھے آہستہ آہستہ دبے قدموں آگے بڑھنے لگا۔ اور جب وہ کافی قریب پہنچ گیا۔ تو اس نے اپنے ابا جی کو یہ کہتے سُنا۔
"ایک مہینے کی مہلت اور دے دو۔ اگلے مہینے سارا حساب بے باق کر دوں گا۔"

چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ صحن میں دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک پر غفور لیٹا ہوا تھا۔ دوسری پر اس کی دادی۔ ان کی چارپائی کے پاس ایک آرام کرسی پڑی ہوئی تھی۔ اس کرسی پر تھوڑی دیر قبل تک غفور کے ابا جی بیٹھے ہوئے تھے۔ یہاں کا معمول تھا۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد یا تو وہ صحن میں ٹہلتے یا آرام کرسی پر کچھ دیر بیٹھتے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے۔ دفتر کی باتیں، رشتہ داروں کی باتیں۔ اپنی جوانی اپنے بچپن کی باتیں۔ ایسے قصے سناتے جن میں ان کی ہمت۔ تدبر۔ قابلیت، شرارت وغیرہ کا ذکر ہوتا۔ کبھی کبھار ان کی والدہ بول پڑتیں۔ ورنہ زیادہ تر وہ، غفور اور اس کی اماں سامعین کا کام

دیتیں۔ ابّا جی کے جانے کے تھوڑی دیر بعد غفور کی اماں بھی دوپٹہ سنبھالتی اندر چلی جاتیں۔ پھر غفور اپنی دادی سے قصّوں کہانیوں کے ان ٹکڑوں کے بارے میں سوال کرتا جو وہ اچھی طرح نہ سمجھ سکا ہوتا۔ اور اگر اس رات اس کے باپ نے کوئی قصّہ نہ سنایا ہوتا۔ تو دادی پوتے کو "انبیائے اولیا" کے قصے سناتیں۔ اور وہ اُن سے پوچھتا۔

"آپئیں دادی! یوسف علیہ السلام بہت خوبصورت تھے نا؟"

"داؤد علیہ السلام گاتے تھے تو پہاڑ بھی جھومنے لگتے تھے۔ ہے نا دادی؟"

"کتنی بڑی رہی ہوگی وہ مچھلی جو یونس علیہ السلام کو نگل گئی تھی؟"

مگر آج غفور چپ تھا۔ اُس کی دادی نے اُٹھ کر وضو کیا۔ پھر عشا کی نماز پڑھی۔ اور پھر آکر چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ اُن کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ اور وہ وظیفہ پڑھ رہی تھیں۔ تسبیح کے دانے ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے تھے۔ مگر ان کی نظریں رہ رہ کر اس چارپائی کی طرف اُٹھ جاتی تھیں جس پر غفور خاموش لیٹا ہوا تھا۔

اور جب ان کا وظیفہ ختم ہوگیا اور انہوں نے تسبیح کو تکیے کے نیچے رکھا تو غفور کی آواز آئی۔

"دادی؟"

"کیا ہے بیٹے؟"

غفور نے ایک لمحے توقف کیا اور پھر بولا۔

"کچھ نہیں!"

دادی نے دوپٹہ اتار کر تکیے کے پاس رکھا اور لیٹ گئیں۔ تھوڑی دیر بعد پھر غفور کی آواز آئی۔

"دادی!"

مگر اس بار دادی چپ رہیں۔

"دادی!"

"کیا بات ہے بیٹے؟"

"آپئیں دادی! کلکٹر صاحب ابّا جی کی بہت عزت کرتے ہیں نا؟"

"اور نہیں تو کیا؟"

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر غفور کی آواز آئی۔

"دادی!"

جواب میں دادی نے صرف "ہوں" کی۔

"یہ موٹر سائیکل جو ہے یہ نئی ہے نا؟"

"بار بار کیوں پوچھتے ہو بیٹے۔ ایک دفعہ جو بتا دیا؟"

پھر خاموشی چھا گئی اور بہت دیر تک چھائی رہی۔ اور بہت دیر بعد جب دادی نے آہستہ سے سر اُٹھا کر یہ معلوم کرنے کے لئے کہ آیا وہ سو گیا ہے یا نہیں، غفور کے چہرے پر نظر ڈالی تو انھوں نے دیکھا کہ وہ جاگ رہا ہے اور موٹر سائیکل کو تک رہا ہے جو نیم کے گھنے درخت کے نیچے کھڑی ساھد کا ہے

فاطمہ رشید

الشجاع کراچی

سلاٹر ہاؤس

گھر والوں کی آنکھوں سے مارے رنج کے آنسو بہنے لگے اور میں چور سا بنا ہوا اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں جتنا جتنا اسے سمجھاتا تھا وہ اتنا ہی روتی جاتی تھی، رو رو کر اس نے اپنی آنکھیں لال کر لی تھیں۔

"میں کہتا ہوں خدا کے لئے"

اور وہ میرا جملہ ادھورا کاٹ کر بولی۔

"آخر تمہیں اس پاگل پن کی صلاح کس نے دی تھی۔

اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی جیسے کہ دلی صدمہ اور رنج نے اس کا گلا پکڑ لیا ہو،

"جانتے نہیں ہو کیا کہ یہ پچیس روپے ہمارے کتنے کام کے تھے"۔ وہ ساڑھی کے کونے سے اپنے آنسو خشک کرنے لگی۔

"ہم اس میں نعیم ونذ کی دو قمیض خرید سکتے تھے۔ میں تم سے کہنے ہی والی تھی کہ آمنہ کے پاس اب ایک بھی فراک نہیں ہے، زیادہ نہیں تو دو ہی فراک لادو، اگر ابھی میں اپنی شلوار کے لئے کہتی تو تم گلا پھاڑ کر چلانے لگتے۔

"کیا کہتی ہو پاگلوں کی طرح، کپڑا خریدوں یا مکان کے آٹھ مہینے کے کرایے کی فکر کروں۔ اگر اس مرتبہ کم از کم تین مہینے کا کرایہ نہ دیا تو اس کھولی سے بھی نکلنا پڑے گا۔ مالک مکان میرا باپ نہیں لگتا۔

"ہاں، ہاں تو میں ہی بیوقوف ہوں، غلطی ہو گئی معاف کر دو۔ حماقت سمجھو، میری جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ روپیہ اپنی قسمت میں نہیں ہے میں اس کے چکر میں پھنس کر اپنے پلے کے پچیس گنوا بیٹھا۔

میں جانے کتنی دیر تک اپنی بیوی کو سمجھاتا رہا مگر وہ نہ سمجھی بھلا کم نہ زیادہ پورے پچیس روپے کا غم وہ برداشت بھی کیسے کر سکتی تھی بیچاری۔ اور پھر اس رات اس نے قسم کھانے کو بھی کھانا نہیں کھایا۔ کھایا ہی نہ گیا ہوگا بیچاری سے۔ اور میں بھی بغیر کچھ کھائے پیئے لیٹ رہا۔ بہت کوشش کی کہ سو جاؤں، مگر سو نہ سکا میری نیند بھی ان پچیس روپیوں کے غم میں میری بیوی کی طرح مجھ سے روٹھ گئی تھی رات گئے تک پچیس روپیوں کے غم میں چپکے چپکے آنسو بہاتی رہی۔ آہیں بھرتی رہی اور بار بار میری اس حماقت پر اپنے ہاتھ ملتی رہی۔ اور میں سوچتا رہا کہ واقعی اگر میں نے یہ حماقت نہ کی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔

بات دراصل کیا تھی کہ میرے دوست گرجا شنکر نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں اس بار تنخواہ ملنے پر اس کے ساتھ ریس چلوں۔ وہ ابھی پچھلی ہی ریس میں زیادہ نہیں صرف پچیس روپے کے ریس کورس گیا تھا۔ اور اس پچیس روپے سے کم نہ زیادہ پورے پانچ سو روپے کما کے لوٹے تھے پانچ سو روپے! جو میری چار

مہینے کی پوری تنخواہ ہے۔ وہ صرف ایک دن میں صرف پچیس روپیوں سے بنا کر لایا تھا۔

اور پانچ سو روپے کی بات سوچ کر میرا بھی جی چاہنے لگا تھا کہ میں بھی پانچ سو روپے اگر کما لوں تو کتنا اچھا ہو۔ گنگا شنکر نے ان کمائے ہوئے پانچ سو روپیوں سے اپنے لئے بیس بیس روپے کے چار گرم پینٹ خرید لئے تھے۔ دو کوٹ خریدے تھے اور ایک جوڑ کریپ سول کا فرسٹ کلاس جوتا بھی خریدا تھا اور وہ مجھے بتا رہا تھا کہ اس نے اپنی کھولی کا چار مہینے کا کرایہ بھی چکا دیا ہے۔ بیوی کو چار ساڑھیاں لا دی ہیں اور بچوں کے لئے قمیضیں بھی خرید لی ہیں اور اب دودھ والے کا حساب بھی وہ صاف کر چکا ہے۔

اور اس نے مجھے اچھی طرح سمجھایا کہ دیکھو بے عیسٰے اگر تو بھی یہ چاہتا ہے کہ تیرا بھلا ہو تو میرا کہا مان اور اب کی ریس پر میرے ساتھ چل بیٹھ۔ اور پھر آپ ہی بتلایئے کہ دنیا میں کون ایسا ہوگا جو اپنا بھلا نہ چاہتا ہو۔ لہٰذا میں نے بھی اوروں کی طرح اپنا بھلا چاہا۔ اور انتیس تاریخ کی ہونے والی ریس کے لئے پچیس روپیوں کی فکر میں لگ گیا۔

سب سے پہلے میں نے یہ کوشش کی سیٹھ صاحب سے کہہ سن کر پچیس روپے ایڈوانس لے لوں۔ مگر سیٹھ صاحب ایڈوانس دینے پر راضی نہ ہوئے بلکہ ایڈوانس دینا تو ایک طرف وہ میرے اس مطالبہ پر آگ بگولہ ہو گئے۔

"اپن کو ایسا لفڑا نہیں منگتا۔ یہ ایڈوانس پیڈوانس اپنے کو نہیں پرورشتا۔"

"وہ بات در اصل یہ تھی سیٹھ صاحب کہ میرا لڑکا۔"

بکو مت جی۔ وہ زور سے گرجے۔ لڑکا لڑکا۔ کیا لڑکا۔ اگر ایسے ہی لڑکے کا لفڑا تھا تو تم لڑکا پیدا ہی کاہے کو کیا۔ انہوں نے ناک سکوڑ کر "کوئی ہم تم کو بولا ہوتا کہا کہ تم لڑکا جرور پیدا کرو۔ تم ایسا کھوٹا کام کیا ہی کاہے کو کہ لڑکے کے لفڑے میں پھنس گیا۔"

اور پھر وہ بڑے اطمینان سے گویا سمجھانے کے طور پر بولے۔

"دیکھو اب آگے کو لڑکا نہ پیدا کرنا سمجھے۔ بابا اپن تو ایسا بوجھ سر پر نہیں لیتا۔ جس کے بعد کو واندا آتا پھرے۔"

اور پھر وہ کمرے سے باہر چلے گئے۔ اور میں سوچنے لگا کہ اب پچیس روپے کس سے مانگوں۔ آج جمعہ کا دن تھا۔ جنوری کی ستائیس تاریخ کل سنیچر تھا اور پرسوں انتیس تاریخ تھی۔ گویا ایک دن بیچ میں تھا۔ اتوار کو بمبئی میں ریس ہوتی ہے۔

بڑی فکر تھی۔ بڑی دوڑ دھوپ کی۔ پانچ سو روپئے میرے ذہن کے پردے پر اس بری طرح ناچ رہے تھے کہ بس کچھ مت پوچھئے۔ سوچ رہا تھا کہ اگر مجھے پانچ سو مل گئے تو گویا بادشاہت مل گئی۔ ایک دم سے پانچ سو روپے! باپ رے باپ۔ بس مزا آجائے گا۔ مکان کا کرایہ۔ دودھ والا بچوں کی فیس اور پھر بیوی کی ساڑھی۔ یقین مانئے اپنے پینٹ اور شپ کوٹ کا خیال مجھے ان سب کے بعد تھا۔ من میں جلا لکھی پھوٹ رہا تھا۔ اگر پانچ سو مل گئے تو میں یکدم سے بیٹھے بٹھائے گنگا نہا لوں گا۔ روز روز کا پاپ کٹ جائے گا۔

اور یہی سوچ کر میں پھر پچیس روپوں کی فکر میں لگ گیا۔ شام کو میں گھر میں نہیں گیا بلکہ سیدھا اپنے ایک دوست اللہ رکھے کے پاس پہنچا اور میں نے اس سے بڑی عاجزی، لجاجت اور اپنائیت بھرے انداز میں پچیس روپے کی بات کر دی۔ میں نے اس سے جھوٹ بولا۔ میں نے اس سے کہا کہ میرا بیٹا بیمار ہے اور ڈاکٹر والے نے جو دوائیاں اور انجکشن بتائے ہیں، وہ کم از کم پچیس روپے میں آئیں گے۔

اور اس سے یہ جھوٹ میں نے اس لئے بولا کہ بیٹے کی بیماری سن کر وہ چونکہ خود بیٹے والا ہے اور اپنے بیٹے سے بے حد محبت کرتا ہے۔ لہٰذا اس کا دل پسیج جائے گا اور وہ مجھے بہ آسانی پچیس روپے نکال دے گا۔ آخر جذبات اور سینٹی منٹ بھی تو کوئی چیز ہیں۔ میں اپنے دوست کو سینٹی منٹ میں لے رہا تھا۔

اور میرا دوست اللہ رکھا میری بات سن کر سینٹی منٹ میں آگیا اور اس نے جھٹ سے پچیس روپئے نکال کر مجھے دے دیئے۔ میں نے اس سے

وعدہ کر لیا کہ میں اس کی پے رقم اسے اتوار کے بعد پیر کے دن ضرور واپس کردوں گا۔ اور میری اس جلد بازی پر وہ مسکرا کر بولا۔
"نہیں یار ایسی جلدی بھی کیا ہے تنخواہ ملنے پر دے دینا۔ کوئی بات نہیں جیسا تمہارا بچہ ویسے میرا۔"
اس بچارے کو کیا معلوم کہ میں اس کے ان لئے ہوئے پچیس روپوؤں سے پانچ سو روپئے کماؤں گا۔ وہ تو یہی سمجھ رہا تھا کہ میں بچے کی دوا کے لئے اس سے یہ روپے لے رہا ہوں۔ اور اسے معلوم تھا کہ میری تنخواہ سات کو ملتی ہے۔
نہیں یار میں تمہیں سات سے پہلے ہی لوٹا دوں گا۔ میں پچیس روپے لے کر قدرے پرسکون انداز میں بولا۔
"آخر تم بھی تو لکھ پتی نہیں ہو۔ مل میں دو دو سانچے چلا کر بھی کیا ملتا ہوگا۔ یہی کوئی دو ڈھائی سو اور کیا۔"
اور پھر پانچ سو کا خیال آتے ہی میرے تن بدن میں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی اور میری آنکھوں کے سامنے پانچ سو کا حساب ناچنے لگا۔ بیوی کی رنگین ساڑھی ناچنے لگی۔ بچوں کے رنگین کپڑے ناچنے لگے۔ اور۔ اور۔ پھر میں نے یکبارگی اپنی جیب بڑی مضبوطی سے پکڑلی مجھے ایسا لگا جیسے میری جیب میں پانچ سو روپے پہنچ چکے ہیں۔ اور پھر میں اپنے دوست اللہ رکھے سے بولا۔
"اچھا دوست۔ بہت بہت شکریہ۔ اب میں جا رہا ہوں۔"
"ارے یار چائے جو منگائی ہے۔"
"وہ تم پی لینا دوست" اور یہ کہہ کر میں وہاں سے چل پڑا۔
بمبئی کا ریس کورس بڑی شاندار اور قابل دید جگہ ہے۔ اور میں اس شاندار اور قابل دید جگہ میں پہنچ کر اپنے ایک بنگلہ بنے نیارے کے خواب کو حقیقت کے روپ میں دیکھنا چاہتا تھا۔ بڑے آدمیوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں جتنے اونچے وہ ہوتے ہیں اتنے ہی اونچے ان کے خواب بھی ہوتے ہیں۔ سہگل کو چند ان کا بنگلہ چاہئے تھا جس میں سونے کے جنگلے ہوں اور مجھے صرف پانچ سو روپئے چاہئے تھے جس سے کہ میں بچوں کا تن ڈھاک سکوں، بیوی کی ساڑی خرید سکوں اور مکان دار کا کم از کم تین چار مہینے کا کرایہ چکا سکوں۔ اور اپنے لئے دو پینٹ اور دو بش کوٹ بنوا سکوں۔ اور دودھ والے کا بل ادا کر سکوں۔ اور بس۔
"وہ دیکھو گھوڑے آ گئے" میرے دوست گرجا شنکر نے مجھے دکھایا اور میں ان جاندار اور چکنے، چمکدار گھوڑوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ میں نے اتنے شاندار اور خوبصورت گھوڑے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ ایک سے ایک بڑھ کر جانور تھے۔ اور میں ان گھوڑوں کو دیکھ کر سوچنے لگا کہ میری بیوی کی سہیلی کا شوہر رام نرائن ضرور گدھا ہے جو وہ ریس میں ہمیشہ ہارتا ہے۔ میں نے سوچا نہ جانے وہ کمبخت ان گھوڑوں کو چھوڑ کر کون سے گدھوں پر داؤ لگاتا ہے۔
کہ اتنے میں میرے دوست نے کہا۔
کیا خیال ہے تمہارا۔؟
"اچھا خیال ہے۔" میں اس کے اس اچانک اور بے تکے سوال پر گڑبڑا گیا۔ "مطلب یہ کہ جو تمہارا خیال ہو۔"
"غلیدارا اچھا گھوڑا ہے۔" وہ بولا میرا مطلب نمبر پانچ سے ہے۔"
"ہاں اچھا تو ہے۔"
اس پر شیبا جاکی بیٹھا ہے۔ اگر گھوڑا جیتا تو بھاؤ ملے گا۔"
"اچھا۔!"
نکالو پانچ روپے۔" وہ بولا۔ ساجھے میں کھیلتے ہیں اور میں نے جھٹ سے پانچ روپے دیدیئے اور وہ مجھے ساتھ لے کر گیا اور کھڑکی سے

دس روپے کا ایک ٹکٹ پانچ نمبر پہ لگا آگیا۔

اور پھر ریس شروع ہو گئی لوگ پرنس اور کیپٹن گو کا نام لے کر چلانے لگے۔ یہی دونوں گھوڑے لوگوں نے زیادہ کھیلے تھے اور میرا دل بیٹھنے لگا۔ میرے گھوڑے کا نام یعنی مطلب یہ کہ جس پر میں کھیلا تھا۔ اس کا نام کوئی نہیں لے رہا تھا کہ یکبارگی میرا گھوڑا دکھائی دیا۔ میرے گھوڑے کے جاکی (سوار) کی جرسی پیلے رنگ کی تھی۔ اور یہی پیلا رنگ آگے بڑھ رہا تھا۔ ہرے رنگ والی جرسی پرنس لانے کی تھی۔ اس نے بہت کوشش کی کہ وہ شیلیدر میرے گھوڑے کو اپنے سے آگے نہ بڑھنے دے مگر اسے آگے بڑھانے کے لئے میں زور زور سے چیخ رہا تھا۔ شیلیدر شیلیدر۔ چیخ چیخ کر میرا گلا بیٹھ گیا۔ اور شکر ہے کہ میری چیخ پکار رائیگاں نہیں گئی، میرا گھوڑا اب پرنس لانے سے آگے بڑھ چکا تھا۔ اور اب انہیں دونوں میں معرکے کی ریس ہو رہی تھی اور ان دونوں کے ساتھ ایک گھوڑا اور تھا۔ کیپٹن گو جو برابر اپنی تگ و دم بازیوں میں لگا ہوا تھا۔ اور آخر بڑی جد و جہد کے بعد وننگ پوسٹ آگیا مگر یہ واضح طور پر نہ معلوم ہو سکا کہ پرنس لانے نے ریس جیتی ہے یا میرا گھوڑا شیلیدر ریس جیتا ہے اور یہ میں سوچ ہی رہا تھا کہ ضرور شیلیدر ہی جیتا ہوگا کہ ادھر اناؤنس ہوا کہ چونکہ دونوں گھوڑے ایک ساتھ وننگ پوسٹ تک پہنچے ہیں۔ لہٰذا فیصلہ جج کی آنکھوں سے نہیں بلکہ فوٹو فنش سے ہوگا۔

میرا دل گھبرانے لگا۔ میرے دل کی دھڑکن اس شور و غل کے باوجود مجھے صاف طور پر سنائی دے رہی تھی۔ اور میں دل ہی دل میں شیلیدر کی کامیابی کی دعائیں کر رہا تھا کہ ادھر عجیب کشمکش کے عالم میں اناؤنس ہوا کہ پرنس لانے نے نہیں بلکہ ریس شیلیدر نے جیتا ہے۔

مارے خوشی کے میری باچھیں کھل گئیں۔ اور ادھر میرے دوست گرجا شنکر نے فخریہ مجھ سے ہاتھ ملایا

کیوں پیارے ؟

"مانتے ہیں استاد۔"

میرا گھوڑا شیلیدر ریس جیت کر فخریہ واپس آ رہا تھا۔ شیلیدر کے ٹرینر مدن والا گھوڑے کی لگام پکڑے ہوئے لوگوں کی تالیوں کا جواب فخریہ مسکرا مسکرا کر اپنے سر کی جنبش سے دے رہے تھے۔

شیلیدر نے دس کے چوالیس روپے دیئے تھے اور اس حساب سے اپنے بائیس کھرے ہو گئے تھے سترہ روپے کے فائدے میں تھا۔

اور پھر دوسری ریس ہوئی پھر تیسری ہوئی اور میں نے اپنے دوست گرجا شنکر کی مہربانی سے یہ دونوں ریسیں بھی جیتیں۔ دوسری ریس میں جولیٹ نے دس روپے کے باون روپے دیئے اور میں رسل جاکی کا قائل ہو گیا۔ میں نے پورے دس روپے اس پر کھیلے تھے۔ تیسری ریس میں ہم لوگ گلوریٹ کھیلے تھے۔ اس گھوڑے نے دس کے اٹھتر روپے دیئے تھے اور میں اس پر پورے تیس روپے کھیلا تھا اور اب کل ملا کر میری جیب میں دو سو اٹھاون روپے آ گئے تھے۔ گھر سے چھبیس روپے لے کر چلا تھا۔ اور اب ٹکٹ کے دام جبکہ ساڑھے پانچ روپے تھے نکال کر میرے پاس دو سو اٹھاون روپے تھے گویا ایک بنگلہ بن گیا تھا۔ اور میں سچ مچ ہوا میں اڑ رہا تھا۔ سچ کہتا ہوں کہ ساری زندگی میں ایک بار بھی یکمشت اتنی بڑی رقم میری جیب میں اس سے پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔

میرے تصورات کے پردوں پر میری بیوی کی ارغوانی رنگ کی ساڑھی لہرا رہی تھی۔ بچوں کی قمیض لٹک رہی تھی اور ربیگ جھول رہے تھے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں گرم پینٹ پہنے کھڑا ہوں اور قیمتی بش شرٹ میرے جسم پر سرسرا رہی ہے۔ مکاندار کا کرایہ میں دے چکا ہوں اور اس کی دی ہوئی چار مہینے کی رسیدیں میرے سامنے مسکرا رہی تھیں، دودھ والے کا بل میں ادا کر چکا ہوں اور اب مجھے ایسا لگا کہ جیسے میرے گھر میں دودھ کی نہر بہہ رہی ہے۔

"اچھا یار اب چلو۔ میں نے بیقراری سے کہا۔

"یار تم تو خبطی ہو" وہ برا مان گیا۔ ساتویں ریس میں یلیو سینڈل نہ کھیلو گے۔

"نہیں یار۔"

"عجیب ہو تم۔ ارے پاگل وہ تو یقینی ہے۔ آج دنیا ادھر کی ادھر ہو سکتی ہے مگر کوئی مائی کا لال بلیو سینڈل کو نہیں ہرا سکتا اور پھر سچ پوچھو تو میں وہی ایک گھوڑا کھیلنے آیا ہوں۔ جتنے پیسے ہیں سب کے سب میں اس پر کھیل دوں گا بلکہ بھگوان کی قسم یہ گھوڑا تو ایک لاکھ روپے کھیلنے کا ہے۔"

اور پھر ناکیا نہ کرتا مجھے جبراً رکنا پڑا اور وہ ساتویں ریس آگئی رنگ میں نیچے بکیوں کے پاس ہم لوگ آئے اور میرا دوست ایک ایک بکی کے پاس بلیو سینڈل کا بھاؤ دیکھ کر بوجھا سا رہ گیا۔ وہ پاگل اس گھوڑے کا بھاؤ ایک کے تین لگائے ہوئے تھا۔ حالانکہ ٹوٹ پر یہ دس کے چودہ روپے دے رہا تھا یعنی تقریباً ایک روپیہ کے ایک روپیہ چھ آنے ہیں بھی سچ مچ اس کا یہ بھاؤ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ مجھے بھی یہ یقین ہو چکا تھا کہ اس ریس میں بلیو سینڈل ہی جیتے گا اس لئے کہ سارے اخبارات یہی لکھ رہے تھے کہ دنیا بدل سکتی ہے۔ سورج مشرق کی بجائے مغرب سے نکل سکتا ہے مگر بلیو سینڈل نہیں ہار سکتا اور میں نے سوچا کہ یہ سب کے سب کھیلنے والے پاگل تو ہیں نہیں جو یہی ایک گھوڑا کھیل رہے ہیں اور پھر اخبار والے بھی تو اسی بلیو سینڈل کی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔

گرجا شنکر اس گاودی بکی کی طرف لپکا اور جھٹ سے اس نے تین سو روپے اس کی طرف بڑھائے اور پھر اس کی دیکھا دیکھی میں نے بھی اپنی ساری رقم اس کی طرف بڑھا دی۔

بلیو سینڈل۔

ہم دونوں کی مشترکہ آواز گونجی اور اس نے ہم سے روپے لے لئے۔ ایک کارڈ پر اس نے نیلی پنسل سے گھوڑے کا نام اور بھاؤ لکھ کر ہمیں دیدیا اور پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اس نے جھٹ سے گھبرا کر وہ تین کا بھاؤ ڈسٹر سے بگاڑ دیا اور اب اس نے اس کی جگہ بھاؤ لکھا ۱/۴ یعنی ایک روپیہ پر صرف چار آنے اور دوسرے بکیوں کے پاس بھی بلیو سینڈل کا یہی بھاؤ چل رہا تھا یعنی ایک روپیہ پر چار آنے صرف ہم ہی دو کو تین کا بھاؤ ملا تھا۔

اور پھر گرجا شنکر نے مجھے بتایا کہ یہ بکی پاگل پن میں یہ بھاؤ لکھ گیا تھا وہ بیحد خوش تھا۔ بولا۔

"آج کا دن ہم لوگوں کے لئے بڑا لکی ہے۔ ورنہ اس گھوڑے پر دو تین کا بھاؤ!

اگر بلیو سینڈل جیت گیا تو کتنے روپے ملیں گے۔ ہم لوگوں کو؟

اگر جیت گیا!

گرجا شنکر نے میرا مذاق اڑایا۔

ارے پاگل میں جو کہہ رہا ہوں کہ اس گھوڑے کو آج ایشور کی لیلا بھی نہیں ہرا سکتی۔ یہ سو فیصدی جیتے گا۔ اور ہمیں ہماری خوش قسمتی سے تین گنے دام ملیں گے۔ ایک کے تین۔"

اور پھر ہم لوگ اوپر کی منزل پر پہنچ گئے اس جگہ جہاں ہم لوگ اس سے پہلے تھے ریس شروع ہونے میں تھوڑی دیر باقی تھی۔ گرجا شنکر کی تو مارے خوشی کے باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ مگر میرا دل نہ جانے کیوں ڈوبا جا رہا تھا۔ بار بار میرا دل کہہ رہا تھا کہ حمید تو مارا گیا کہ اتنی بڑی رقم جیت کر بھی تو کھو بیٹھا کمبخت اب ساری زندگی اتنے روپے یکمشت تجھے نہیں مل سکتے۔ یہ گھوڑا جس کا نام بلیو سینڈل ہے۔ مر کر بھی آج یہ ریس نہ جیت سکے گا اور ریس ختم ہونے کے بعد تو اپنی قسمت کو روئے گا اور اپنی اس اتنی بڑی حماقت پر اپنے آپ کو کوسے گا۔ اور پھر ابھی جبکہ میرا دل قابو میں بھی نہ آنے پایا تھا ریس شروع ہو گئی گھنٹی بجنے لگی اور گھوڑے دوڑنے لگے۔ سوا میل کی ریس تھی۔ لوگ ابھی سے دوربین لگائے دوڑ دیکھ رہے تھے اور منہ سے بولتے جاتے تھے۔ پرنسیس اوشا فرسٹ۔ چھوٹا صاحب سکنڈ۔ فردوسی تھرڈ۔ ملا اور ڈس فورتھ، گے رادھا ففتھ، بلیو سینڈل چھٹا۔ لونے چار جر ساتواں۔ اور پھر کئی آوازیں آنے لگیں۔

"کم آن بلیو سینڈل، کم اپ گے رادھا۔ اپ بلیو سینڈل۔ ارے بلیو سینڈل، بلیو سینڈل۔

گھوڑے بنڈ سے گھوم رہے تھے۔ وہ بنڈ سے گھوم کر سکنڈ انکلوزر آگئے اور اب وہ فرسٹ انکلوزر میں داخل ہو رہے تھے اور لوگ بری طرح چلا رہے تھے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ سارے گھوڑوں کے نام دھرائے جا رہے تھے۔ لوگ بلیو سینڈل کا نام لے کے چیخ رہے تھے پاگل ہوتے جا رہے تھے اور بلیو سینڈل

. . . . کہ رنگ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ بلیو سینڈل کے جاکی احمد خاں کی جرسی کا رنگ سرخ تھا اور اس کی آستینوں کا رنگ سنہرا تھا اور یہ سرخ و سنہرا رنگ نہ جانے کہاں گڈمڈ ہو گیا تھا نظر ہی نہیں آ رہا تھا اور جو رنگ نظر آ رہا تھا وہ لوسنیپا جھ کے جاکی ذوذر، کی جرسی کا رنگ تھا اور یہ رنگ سفید تھا آستین سرخ تھی۔ اور سنہری پٹی تھی اور پھر جو رنگ نظر آ رہا تھا۔ وہ لال، آڈس کے جاکی شپا کی جرسی کا رنگ تھا اور یہ رنگ سبز رنگ اور سرخ رنگ کا مجموعہ تھا اور پھر فردوسی کے جاکی کی جرسی کا رنگ تھا جو نارنجی تھا اور بلیو سینڈل جسے کہ آج دنیا کی کوئی طاقت نہیں ہرا سکتی تھی لا پتہ تھا دیکھتے ہی دیکھتے لونے چار جرلے اپل، آدس اور فردوسی کو ایک چھلاوے کی طرح پیچھے چھوڑ دیا اور اب وہ پونے دو لنتھ سے ریس جیت چکا تھا اور بلیو سینڈل جو تھا تھا۔ سارے ریس کورس کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ چہروں پر ہوائیاں تھیں اور آنکھوں سے حیرت ٹپک رہی تھی اور پھر لوگ شور مچانے لگے بھنبھنانے لگے جاکی احمد خاں، ٹرینر بابا خاں اور گھوڑے بلیو سینڈل کو برا بھلا کہنے لگے گالیاں دینے لگے۔

اپن کا تو طویلہ ہو گیا یار۔

احمد خاں جاکی ہے یا حجام۔ یہ بابا خاں سب کو مروا کر دم لے گا۔ بلیو سینڈل گھوڑا ہے گدھا!

بھانت بھانت کی بولیاں تھیں اور بھانت بھانت کی آوازیں تھیں اور میری نہ آواز نکل رہی تھی اور میری پلکیں جھپک رہی تھیں۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے سامنے کچھ نہ دکھائی دینے والے انداز میں دیکھ رہا تھا میری آنکھوں کے سامنے میری بیوی کی پیوند لگی شلوار تھی۔ بچوں کے ننگے پاؤں تھے اور ان کی پھٹی ہوئی قمیضیں اور فراکیں تھیں اور دس دس کے وہ پچیس نوٹ تھے جنہیں میں اپنے ہی ہاتھوں سے قتل کر چکا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے دس دس کے پچیس نوٹ میری حرص و ہوس کی اپنی آگ میں جل رہے تھے اور میں کھڑا ہاتھ مل رہا تھا۔ میری روح بیقرار تھی اور میرا دل بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔

ان روپوں سے خریدی جانے والی میری بیوی کی ارغوانی رنگ کی ساڑھی میری آنکھوں کے سامنے تار تار ہو چکی تھی۔ بچوں کی نئی قمیضیں اور فراکیں ہوا میں کہیں دور اڑ گئی تھیں اور دودھ کی وہ نہر جو اس سے پہلے میری نظر کے سامنے میرے گھر میں بہہ رہی تھی وہ خشک ہو چکی تھی اور اب اس کی جگہ دھول اڑ رہی تھی اور اس میں گدھے لوٹ رہے تھے اور میری گرہستی مالک مکان اپنے بلو سینڈل سے میرے سر پہ تڑاتڑ ضربیں لگا رہی تھی۔ اس کا آٹھ مہینے کا کرایہ واجب الادا تھا اور میرا دوست اللہ رکھا اپنے پچیس روپوں کا مطالبہ کر رہا تھا اور میں اس کے ہاتھ جوڑ رہا تھا اور اس سے کہہ رہا تھا کہ بھیا کچھ دن اور ٹھہر جاؤ۔ اگلی تنخواہ پر تمہارا قرضہ بیباق کر دوں گا۔

گرم پتلون سلوانے کا تصور آنکھوں میں کانٹے چبھو رہا تھا۔ اور چمکتی ہوئی ریشمی شرٹ میرا مذاق اڑا رہی تھی۔ اور میں سوچ رہا تھا وہ بلیو سینڈل کا تین کا بھاؤ دینے والا بکی پاگل تھا یا میں جو اتنا بھی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ ریس میں میرا ایک گھوڑا بھاگ رہا ہے صرف ایک بلیو سینڈل اور اس کے آٹھ گھوڑے دوڑ رہے ہیں۔ میرا صرف ایک چانس ہے اور اس کے آٹھ چانسز ہیں۔

اور پھر میں گرجا شنکر کی راہ دیکھے بغیر بیک وقت دو دو لاشیں اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ریس کورس سے باہر آ گیا۔

ایک نعش میرے ارمانوں کی تھی اور ایک خود میری اپنی تھی جسے میں اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے مری ہوئی چال کے ساتھ چل رہا تھا۔

ریس کورس کے اندر سے آوازیں اسی طرح باہر آ رہی تھیں۔

" نین سنگھ، اشرف کمال، پرنس، شیر خاں، پرنس، ونڈر فل، ایسٹرن جیسر ایسٹرن چیر ایسٹرن چیر"

میں نے گھبرا کر اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان بند کر لئے اور اب میرے قدم بڑی تیزی کے ساتھ اٹھ رہے تھے۔ میں اس سلاٹر ہاؤس سے جتنی جلد ممکن ہو سکے دور نکل جانا چاہتا تھا۔"

پُرانا زخم نیا نشتر

چوٹ کوئی ایسی شدید نہیں تھی۔ لیکن بوڑھے مارکونی کے نحیف جسم کے لئے بہت بھاری تھی، چنانچہ وہ پورے دو گھنٹے تک بے ہوش پڑا رہا۔
اور دو گھنٹے تک بے ہوش پڑا رہنے کے بعد اس نے اپنی بے نور آنکھیں کھولیں اور اپنے بیڈ پر ادھر ادھر کچھ ٹٹولنے لگا۔
پاس ہی بیٹھا شاہد نہایت عقیدت مندانہ انداز میں بولا۔
"میں یہیں ہوں حضور...... یہیں آپ کے پاس .... کیا حکم ہے؟"
"تم کون ہو؟" بوڑھے مارکونی نے نہایت نحیف آواز میں پوچھا۔ "میں کہاں ہوں؟"
"میں آپ کا غلام شاہد ہوں حضور" شاہد کا انداز اور بھی عقیدت مندانہ ہو گیا۔ "شاہد!" جسے حضور نے ترقی کی دعا دی تھی۔ اور دعوے کے ساتھ کہا تھا۔ کہ بس امیدواروں میں سے میں ہی ڈائریکٹر بنایا جاؤں گا..... پرسوں ہی کی تو بات ہے آقائے محترم....."
مارکونی ہنس پڑا۔ اور کچھ دیر ہنستے رہنے کے بعد اس نے ٹٹول کر شاہد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور پوچھا۔
"میں کہاں ہوں؟"
"ہسپتال میں آقائے کرم" شاہد کہنے لگا۔ "حضور کو ایک کار سے دھکا لگ گیا تھا۔ اور حضور بے ہوش ہو گئے تھے۔ پتہ نہیں کون لوگ حضور کو یہاں لے آئے تھے میں اگر موجود ہوتا تو غریب خانے پر لے جاتا۔ جہاں حضور کو یقیناً کچھ زیادہ آرام ملتا۔ لیکن مجھے تو دفتر میں اس حادثے کا پتہ چلا۔ وہیں سے میں بھاگا بھاگا آ رہا ہوں۔ لیکن اب آپ کو کچھ زیادہ تکلیف برداشت نہیں کرنی ہو گی۔ حضور کو ہوش آ چکا ہے۔ میں ڈاکٹر سے اجازت لے کر حضور کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"
"میرے بچے" مارکونی پھر ہنسنے لگا۔ "میں نے تمہیں پہچان لیا، بے شک تم وہی ہو جس نے مجھے ٹھرے کی ایک بوتل فراہم کی تھی اور اپنی ترقی کے بارے میں پوچھا تھا.... تم وہی ہو نا؟"
"جی ہاں آقائے محترم!" شاہد بولا۔ "وہی غلام شاہد جسے حضور نے کیا سے کیا بنا دیا۔ ورنہ دنیا میں میرا کون تھا حضور۔ میرے پاس کسی ریاستی وزیر کے چپراسی تک کی سفارش نہیں تھی۔ جبکہ میرے علاوہ باقی 'انیس' امیدواروں میں کچھ ریاستی وزیروں کے لوگ تھے۔ کچھ اور دوسروں کی سفارش رکھتے تھے اور کچھ بڑے نیتاؤں کے آدمی تھے۔ اور دو چار ایسے بھی تھے۔ جو اس عہدے کے لئے چار پانچ ہزار خرچ کرنے کو تیار تھے۔ لیکن حضور نے......

مارکونی اب کچھ زیادہ زور سے ہنسا اور شاہد اپنی پوری بات پوری کیے بغیر خاموش ہوگیا۔

"میرے بچے!" مارکونی آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ "میں تو ویسے ہی کافی گنہگار ہوں۔ اور میں تمہارے ساتھ فریب کرکے میں اپنے سر ایک اور بھاری گناہ نہیں لینا چاہتا۔۔۔ سچی بات تو یہ ہے میرے بیٹے کہ تو نے مجھے ٹھرّے کی بوتل دلوادی اور میں نے دل سے خوش ہو کر تجھے دعائیں دیں۔ پھر تو نے اپنی ترقی کے بارے میں پوچھا۔ اور میں نے محض تجھے خوش کرنے کے لئے کہہ دیا کہ بے شک تو ہی وہ خوش نصیب ہے۔ جو ڈائریکٹر کا عہدہ پائے گا۔ سوچو میرے بچے اگر تم ڈائریکٹر نہ چنے جاتے تو کیا تم مجھے تلاش کرکے اپنی ٹھرّے کی بوتل واپس مانگتے۔۔۔۔ یا تم مجھے قتل کر دیتے؟۔۔۔

بڈھا مارکونی پھر ہنسنے لگا۔ اور شاہد کی آنکھوں سے عقیدت ٹپک پڑی۔ اس نے حد سے زیادہ احترام کے ساتھ جیسے وہ کوئی مذہبی کتاب اٹھا رہا ہو آہستہ سے مارکونی کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر چوم لیا اور بڈھے مارکونی نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اور ایک لعنت جیسے چیخ اٹھا۔

"پاگل مت بنو۔ اپنے آپ کو گنہگار مت بناؤ۔ تم ایک ایسے آدمی سے عقیدت کا اظہار کر رہے ہو جس سے نفرت کرنے کے لئے تمہارے پاس اتنی نفرت بھی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ نادان لڑکے میں زمانے بھر کا بدکار ہوں، عیاش ہوں، اوباش ہوں، فریبی ہوں، شرابی ہوں۔۔۔ مجھ تم میرے بچے۔۔۔ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں جو مجھ میں نہ ہو۔ یہاں تک کہ میں چور ڈاکو اور خونی بھی ہوں۔ لڑکیاں اور شراب میری زندگی رہی ہیں۔ لیکن اب چونکہ مجھ میں لڑکیوں کو پی جانے کی صلاحیت نہیں۔ اس لئے صرف شراب پیتا ہوں۔۔۔۔۔۔ پاگل مت بنو۔۔۔۔ تم نے مجھے شراب پلائی تھی اسی لئے۔۔۔!"

ایک نرس نے پاس آکر مارکونی کو خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ اور وہ خاموش ہوگیا۔

لیکن شاہد نے آہستہ سے کہا۔

"حضور مجھے معلوم ہے، خدا رسیدہ بزرگ یہی سب کچھ کہہ کر اپنے آپ کو دنیا کی نظروں سے پوشیدہ رکھتے ہیں۔ لیکن میں نے اچھی طرح پہچان لیا ہے کہ آپ کون ہیں اور کیا ہیں؟"

اب کے مارکونی نہ ہنسا اور نہ چیخا۔ البتہ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اور پھر اس نے اپنے آنسو پی جانے کی کوشش کرتے ہوئے بہت ہی آہستہ سے کہا۔ "جاؤ ڈاکٹر سے پوچھو، میں شراب پی سکتا ہوں۔ اگر وہ اجازت دے تو ایک بوتل لیتے آنا۔ اور اگر منع کر دے تو سچ مچ مجھے اس جہنم سے نکال لے جانے کی کوشش کرنا۔ میں شراب کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

شاہد جلدی سے اُٹھ کر چلا گیا۔

لیکن ڈاکٹر نے نہ تو مارکونی کو شراب پینے کی اجازت دی۔ نہ ہی اسے اس وقت تک ہسپتال سے چھوڑنے پر رضامند ہوا جب تک اس کا ایکسرے نہ ہو لے۔ کیونکہ ڈاکٹر کو شک تھا کہ اس کے پھیپھڑے پر چوٹ پہنچی تھی۔

لیکن واپس آکر شاہد نے مارکونی کو تسلی دی کہ کچھ ہی دیر میں اسے شراب بھی مل جائے گی۔ اور شام تک ہسپتال سے واپس جانے کی اجازت بھی۔

اور یہ سب سن کر مارکونی ایک بار پھر بڑے زور سے ہنس پڑا۔ پھر اس نے کہا۔

"میں سمجھ گیا تم مجھے تسلی دے رہے ہو، مجھے شراب پینے کی اجازت ملی ہے اور نہ ہسپتال سے واپس جانے کی۔"

اور شاہد کی آنکھوں میں کچھ اس انداز سے عقیدت جھلک اٹھی۔ کہ اس نے کچھ والہانہ انداز میں مارکونی کے پاؤں چوم لئے۔

مارکونی نے جلدی سے اپنے پاؤں موڑ لئے اور حد سے زیادہ بے بسی سے بولا۔

"میرے بچے! تم مرنے کے بعد بھی میری روح کو چین سے نہیں رہنے دو گے۔ جو ہمیشہ تڑپتی رہے گی۔ کہ میں نے ایک معصوم بچے کو فریب دیا۔۔۔"

"حضور آپ غیب داں ہیں" شاہد نے مارکونی کی بات ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ "آپ نے مجھے ڈاکٹر کے پاس تو فضول ہی بھیجا تھا۔"

"احمق لڑکے!" مارکونی پھر ہنسا۔ "کیا تم جانتے نہیں کہ کسی سرکاری ہسپتال میں کسی بھی مریض کو شراب پینے کی اجازت نہیں دی جا سکتی ہے اور پھر کون نہیں جانتا۔ کسی حادثے کے مریض کو کامل صحت یا باقاعدہ لکھا پڑھی کے بغیر ہسپتال سے جانے کی اجازت نہیں مل سکتی۔"

"میں نے ملا حضور!" شاہد مسکرایا۔ "لیکن اس غیب دانی کے بارے میں حضور کیا تاویل پیش کریں گے جو آقائے محترم نے میری ترقی کے بارے کی تھی۔ میرے آقا! آپ کو معلوم ہے کہ ایک بہت بڑے جوتشی نے اور جو ملک کا سب سے بڑا جوتشی ہے اور جس کا شمار دنیا کے بڑے جیوتشیوں میں ہوتا ہے۔ اس نے کامل ایک ہفتے میں زائچہ بنا کر میرے بارے میں کیا کہا تھا۔"

"کیا کہا تھا؟" مارکونی مسکرایا۔

"میرے حضور!" شاہد کہنے لگا۔ "اس کمبخت نے ڈنکے کی چوٹ اور پورے بھروسے کے ساتھ کہا تھا۔ کہ میری جتنی بھی ترقی ہونی تھی، میرے ابا جان کی زندگی میں ہونی تھی۔ اور ابا جان کو مرے ہوئے دو سال سے اوپر ہو گئے۔ مطلب یہ کہ ڈائریکٹری کی جگہ مجھے نہ مل سکتی تھی..... لیکن حضور کے دعوے نے دنیا کے اس عظیم جیوتشی کو شکست فاش دے دی۔"

"شکست فاش!"

"مجھے ان لغویات پر بھروسہ نہیں" مارکونی نے کہا۔ "اس لئے میں اس سلسلہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں میں تم سے صرف اس قدر درخواست کرتا ہوں کہ تم مجھ پر کرم کرو۔ اور تم میرے حال پر چھوڑ دو۔ اگر تمہیں میری باتوں پر بھروسہ نہیں کہ میں زمانے بھر کا گنہ گار ہوں۔ تو تحقیق کرو کہ مارکونی جان نام کا کوئی آدمی خون کے جرم میں چودہ سال کی سزا کاٹ چکا ہے یا نہیں۔ جیل میں بھی میں مار دھاڑ سے باز نہیں آیا تھا۔ اور اسی میں میری آنکھیں چلی گئیں!"

"حضور!" شاہد مسکرایا۔ "خدا رسیدہ بزرگوں نے اس سے بھی بھیانک اذیتیں برداشت کی ہیں۔ یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ کو سولی پر چڑھا دیا گیا۔"

"خدا رسیدہ بزرگ" مارکونی نے جیسے بڑے کرب سے دہرایا۔ "میرے بچے کم سے کم یہ جو کہ تو تو مجھ سے نفرت کر سکتا ہے، کہ میں خدا کے وجود ہی کا سرے سے قائل نہیں۔ میں ہمیشہ یہی سوچتا رہا کہ طرح طرح کی شرابوں کی بوتلوں سے میری الماری بھری پڑی ہے اور میرے ساتھ ہر روز کوئی نئی لڑکی ہوتی ہے تو بے شک میں ہی خدا ہوں۔"

"سبحان اللہ!" آواز جیسے شاہد کے دل سے نکلی۔ "حضور میں منصور کے بارے میں بھی جانتا ہوں اور اس کی انا الحق صدا کے بارے میں بھی جانتا ہوں۔ اسی حد تک خدا میں مدغم ہو گیا تھا۔ کہ وہ اپنے آپ کو خدا کہنے لگا تھا۔"

مارکونی ہنس پڑا۔ لیکن وہ کچھ زیادہ دیر تک ہنستا نہ رہ سکا۔ جلد ہی اس کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی نمایاں ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس سنجیدگی پر بے پناہ حزن کا رنگ غالب آ گیا۔ اور پھر اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑنے کو لرزنے لگے۔ جنہیں شاہد نے اپنے خوبصورت رومال میں جذب کر لیا.....

"میرے بچے!" مارکونی نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن ابھی وہ کچھ کہنے کے لئے سنبھل ہی رہا تھا کہ ایک نرس نے شاہد کے پاس آ کر بتایا کہ مریضوں سے ملاقات کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ اب پھر شام کے پانچ بجے وہ مارکونی سے مل سکے گا۔

شاہد با دلِ ناخواستہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ بڑی خاموشی سے وہ مارکونی کے بیڈ کے پائنتی پہنچ کر بڑے احترام سے جھک کر اس نے ایکبار پھر اس کے قدموں کو بوسے دیے اور بھاری بھاری قدم اٹھاتا ہوا وارڈ سے باہر نکل گیا۔

شام کے پانچ بجے شاہد مارکونی کے پاس آیا۔ تو اس کے ساتھ اس کی ماں بھی تھی۔
شاہد اپنی ماں سے مارکونی کی کرامتیں بیان کرنے لگا اور وہ بالکل سب کچھ سنتی رہی اور بڑے غور سے مارکونی کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔
اور پھر شاہد کو یہ دیکھ کر حد سے زیادہ خوشی ہوئی، کہ اس کی ماں بھی مارکونی کے چہرے کے پرجلال نور سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔
اس کی ماں کی آنکھوں سے بھی آنسو ٹپکنے پڑتے تھے۔
اور تب شاہد دنیا کے اس عظیم جیوتشی کی تضحیک کرنے لگا۔ جس نے اسے بتایا تھا کہ اس کی جو بھی ترقی ہوئی تھی۔ اس کے باپ کی زندگی میں ہوئی تھی۔ اور جس عظیم جیوتش کو اس کے آقائے محترم۔ نرشکست فاش دی تھی۔
شاہد اس جیوتشی کے لئے کسی قدر بُرے الفاظ استعمال کرنے لگا۔
اور اس کی ماں اُٹھ کھڑی ہوئی۔
پھر مارکونی کے بیڈ سے کچھ دور جا کر اس نے اشارے سے شاہد کو اپنے پاس بلایا اور جب شاہد اس کے پاس پہنچا۔ تو اس کی ماں نے بہت ہی آہستہ آہستہ کہا۔
"بُری بات ہے بیٹے۔ اس جیوتشی کو گالیاں نہ دو، وہ بہر حال انسان ہے اور انسان، اس سے بھی زیادہ بڑی بڑی غلطیاں کر لیتے ہے اور سنو انھیں گھر مت لانا۔ کون جانے ہم لوگوں سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے اور یہ ناراض ہو جائیں ۔۔۔۔۔ میں جا رہی ہوں۔ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔"
شاہد حیران سا کھڑا تھا اور اس کی ماں مزید کچھ کہے بغیر وارڈ سے باہر نکل چکی تھی

مسعود مفتی

فنون۔ لاہور

دُعا

صدر بازار میں میری دکان ہے۔ چند سال پہلے تو میں منیاری والا کہلاتا تھا۔ مگر اب ترقی کرتے کرتے جنرل مرچنٹ بن گیا ہوں۔ کیونکہ مجھے اپنا کاروبار وسیع کرنے کا خبط ہے اور میں نت نئے تجربے کرتا رہتا ہوں۔ جس چیز سے ذرا بھی منافع کا امکان ہوتا ہے وہ لاکر دکان میں رکھ لیتا ہوں۔ اگر چل نکلی تو بہتر ورنہ چھوڑ دی۔ اس وجہ سے میری دکان پر ہر قسم کے لوگ آتے ہیں۔ بچے، بوڑھے، مرد، عورتیں، امیر، غریب وغیرہ۔

چند لوگ میرے مستقل گاہک ہیں۔ ان میں زیادہ تر پاس پڑوس والے ہیں۔ دکان سے چند قدم آگے جو موڑ ہے وہاں ایک گرجا ہے یا شاید کانونٹ بھی ہے۔ ان میں بہت سے پادری اور نن عورتیں رہتی ہیں۔ یہ سب لوگ بھی میرے مستقل گاہکوں میں سے ہیں۔ اور وقتاً فوقتاً آتے رہتے ہیں یہ ایک دوسرے سے بات کرنے میں کسی کو فادر کہتے ہیں اور کسی کو برادر۔ اسی طرح عورتیں آپس میں مدر یا سسٹر کہہ کر خطاب کرتی ہیں۔ مجھے علم نہیں کہ کون کیا ہے۔ میں تو ہر پادری کو "سر" اور ہر نن کو "مس صاحبہ" کہتا ہوں۔ کیونکہ مجھے اتنا پتہ ہے کہ نن عورتیں ساری عمر کنواری رہتی ہیں۔

میری دکان پر عموماً یہ گروپ میں آتی ہیں۔ ایک تو ویسے ہی یورپین ہونے کی وجہ سے گوری چٹی اور خوبصورت ہیں۔ اور پھر ان کا ڈھیلا ڈھالا سفید اور کالا لباس بھی خاص طرز کا ہے اس لئے اردگرد سے بچے یا دوسرے لوگ بھی اُس وقت آجاتے ہیں اور میری تجارت کو اس طرح فائدہ پہنچتا ہے۔ ویسے یہ خود بڑی سنجیدہ ہوتی ہیں ضرورت سے زیادہ بات نہیں کرتیں۔ زیبائشی چیز خریدنا ان کے لئے بالکل حرام ہے صرف چند ایک گنی چنی اشیا سے ان کو دلچسپی ہوتی تھی۔ بس ان کے دام پوچھے، پیسے دیے یا اپنے ادھار کے حساب میں درج کرائے اور چل دیں۔ سوائے ایک نن کے جو ان سب سے ذرا مختلف ہے۔

یہ اُن میں نسبتاً چھوٹی عمر کی ہے کوئی بیس بائیس برس کی ہوگی۔ لیکن ان سب میں زیادہ خوبصورت اور صحت مند ہے۔ یہ جب بھی اپنے گروپ کے ساتھ ہوتی ہے تو بہت سنجیدہ اور کم گو ہوتی ہے۔ اور ان کے ساتھ ہی چیزیں خرید کر جلدی سے واپس چلی جاتی ہے۔ مگر جب اکیلی آتی ہے تو سودا خریدنے کے علاوہ بھی مجھ سے بات چیت کرلیتی ہے اور مزا یہ کہ اسے واپس جانے کی جلدی بھی نہیں ہوتی۔ بلکہ کافی دیر کھڑی رہتی ہے۔ اس وجہ سے یہ مجھے ان سب سے زیادہ پسند ہے

ایک روز یہ میری دکان پر آئی۔ تو گاہک کوئی نہ تھا۔ اور میں اپنے سامنے کاؤنٹر پر تصویریں پھیلائے بیٹھا تھا۔ یہ تصاویر فلمی رسالوں سے کاٹی تھیں۔ تاکہ البم بناؤں جس میں میری پسندیدہ ایکٹرسوں کے اچھے اچھے پوز ہوں۔ کوئی اور گاہک ہوتا تو شاید میں چھپا دیتا مگر اسے دیکھ کر میں نے

تصاویر ویسے ہی رہنے دیں۔ اور پوچھا۔

"کیا چاہئے مس صاحبہ؟"

"ادنالی"۔ وہ میرا سوال نظرانداز کرکے بولی: "یہ کیا کرتا ہے؟"

"مس صاحبہ ایم بناتا ہے!"

"ایم؟؟؟ وہ کیوں؟"

"مس صاحبہ دل خوش کرنے کو" میں نے ہنس کر کہا۔

"نہ ۔۔ نہ ۔۔ نہ" وہ شہادت کی انگلی سے منع کرتی ہوئی بولی: "دل کھوش کرنا بوری (بُری) بات ہے ۔۔ باہوت بیڈ۔ بہت بکلا"

"بری کیوں ہے مس صاحبہ؟" میں اس سے مذاق کے موڈ میں تھا۔

"باہوت بری" اس نے پھر کہا۔ اور گلے میں لٹکی ہوئی صلیب کو ہاتھ میں پکڑ کر بولی۔ "دل پر کنٹرول کرو ۔۔ بڑا اکسٹرا ملتا"

"اور مس صاحبہ اگر دل نہ مانے؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"تو دعا پڑھو"

"کون سی دعا؟"

"ہمارا بائیبل میں باہوت دعا ہے ۔۔ دل نہ مانے تو ہم فوراً پڑھتا ہے"

"مس صاحبہ ہمیں بھی بتلائیے"

"تم اپنا دعا پڑھو ۔۔ اپنا ریلجن کا ۔۔ مگر دعا ضرور پڑھو ۔۔ اس سے بورا بات دل سے نکل جاتا ہے"

اور اس نے ساری تصویریں اکٹھی کرکے کونے میں ڈال دیں۔ مگر اس کے جانے کے بعد میں نے اٹھائیں اور سجانے لگا۔

اس قسم کی باتوں کی وجہ سے وہ مجھے پسند تھی۔ اور میں کئی ایسی چیزیں درگذر کر دیا کرتا تھا۔ جو کسی دوسرے گاہک کے لئے میں برداشت نہ کرتا مثلاً اس کی عادت تھی کہ جب اکیلی آتی تو اپنی چیز خرید چکنے کے بعد وہ دکان میں اِدھر اُدھر گھومتی رہتی اور چیزوں کے بھاؤ پوچھتی رہتی۔ حالانکہ مجھے بھی علم ہوتا تھا۔ کہ اس کا خریدنے کا ارادہ نہیں ہے۔ اگر کوئی دوسرا گاہک یہ حرکت کرتا۔ تو مجھے سخت غصہ آتا۔ مگر اس سے مجھے کبھی گلہ نہیں ہوا میں جانتا تھا۔ کہ نن عورتیں کبھی سُرخی پوڈر وغیرہ نہیں خریدتیں۔ مگر جب وہ ان کے متعلق کچھ دریافت کرتی ۔ تو میں تفصیل سے بتایا کرتا۔ اور مزے کی بات یہ تھی۔ کہ اس کے زیادہ تر سوالات انہی کے بارے میں ہوتے تھے۔

"وہ کیا ہے؟" وہ شیلف کی طرف اشارہ کرکے کسی خوبصورت سے ڈبے کی طرف اشارہ کرتی۔

"وہ کوٹی ہے مس صاحبہ"

"کوٹی کیا؟"

"یہ پاؤڈر ہوتا ہے"

"اچھا! ذرا دیکھاؤں"

میں شیلف کا شیشہ ہٹاتا۔ ڈبہ نکالتا۔ جھاڑن سے صاف کرتا۔ اور اس کو دے دیتا۔ وہ اسے الٹ پلٹ کر دیکھتی۔ پسندیدگی سے اس کی صاف سطح پر ہاتھ پھیرتی۔ قیمت پوچھتی۔ اور پھر بے دلی سے واپس کر دیتی۔

"کوئی اور بھی برینڈ ہے؟" وہ پوچھتی۔

میں بڑی خوشی سے کٹی کیورا، یا ایوننگ ان پیرس کا ڈبہ نکال کر اسے دے دیتا۔ جو وہ دیکھنے کے بعد واپس کر دیتی۔ اس طرح اس نے میری دکان میں پڑی ہوئی قریباً ہر لپ اسٹک، سرخی اور خوشبو وغیرہ کا معائنہ کیا تھا اور دام پوچھ کر واپس کر دیے تھے۔ اور پھر باہر نکلتے وقت ایک نظر اس شیلف پر ضرور ڈالا کرتی تھی۔

اُسے چھوٹی بچیوں سے بہت پیار تھا۔ اس کی موجودگی میں اگر کوئی بچی آ جاتی اور حیران ہو کر اس کے کالے لباس، سفید گریبان اور گلے میں لٹکتی ہوئی چمکتی صلیب کو دیکھتی۔ تو وہ نن بے اختیار مسکرا دیتی۔ اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتی اور پوچھتی۔

"بچہ کیا دیکھتا ہے"

بچی شرما کر ادھر ادھر ہو جاتی

ایک دن میری دکان پر چھ سات سال کی ایک بچی آئی۔ وہ بڑی خوبصورت اور گول مٹول تھی۔ اس کے نیم سنہری بال سونے کی جھالر کی طرح لٹک رہے تھے اور کچھ بے ترتیب بھی تھے۔ ابھی وہ سودا لے ہی رہی تھی۔ کہ وہ نن بھی آ گئی۔ اور کچھ دیر بچی کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے میرے شوکیس میں سے لال ربن ڈھونڈ نکالا۔ آدھ گز کا ٹکڑا مجھ سے خریدا اور لڑکی کے بالوں میں باندھ دیا۔ وہ شاید بچی کو پیار بھی کرتی۔ مگر وہ اپنا لال ربن سہیلیوں کو دکھانے کے لئے اتنی بے تاب تھی۔ کہ ہاک کر اس کے بازوؤں میں سے نکل گئی۔ اور دکان سے باہر بھاگ گئی۔

کچھ عرصہ بعد ایک اور مزے دار سا واقعہ ہوا۔ میں دکان کے لئے کافی مقدار ٹافی اور ڈراپس لایا۔ مگر ان کی فروخت کی رفتار قدرے سست تھی۔ چنانچہ بچوں کو لبھانے کے لئے میں نے ایک نیا طریقہ سوچا۔ گاڑھے لال رنگ کے گھٹیا سے ناخن پالش کی ایک شیشی کھولی۔ اور جو بچہ کوئی بھی سودا خریدنے آتا۔ میں اس کی ایک انگلی کے ناخن پر پالش کر دیتا۔ شرط یہ تھی کہ جب اگلی بار بچہ آئے گا۔ تو دوسری انگلی بھی رنگی جائے گی۔ بچے اپنی دس انگلیاں رنگنے کے لئے بار بار آتے اور ان کے لئے سب سے آسان خرید ٹافی یا ڈراپس ہوتے۔ میرا اسٹاک جلد جلد ختم ہونے لگا

ایک دن وہ نن اکیلی شاپنگ کرنے آئی تھی۔ کہ اتنے میں چھ سات بچوں کا گروپ آ گیا۔ اور سب نے اپنے اپنے ہاتھ کی انگلیاں میرے سامنے پھیلا دیں۔ میں ہر ایک کی انگلی پر پالش کرتا۔ مگر انہوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ کہ دو دو ناخن رنگے جائیں۔ میں انکار کرتا رہا۔ اور وہ شور کرتے رہے۔ اس سارے تماشے کو نن بڑی دلچسپی سے دیکھتی رہی۔ اور ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتی رہی۔ بالآخر اس نے سفارش کی۔ کہ اتنے گاہک اکٹھے آنے کی وجہ سے دو انگلیوں کا مطالبہ جائز تھا۔ اب اس سفارش کو کون کافر رد کر سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے فوراً سب کی دو دو انگلیوں پر پالش کر دی۔ بچے تالیاں بجا کر شور کرنے لگے۔ اس سرور ماحول میں مجھے نہ جانے کیا سوجھی کہ میں نے کہا "مس صاحبہ! لائیے آپ کے ناخن پر بھی رنگ کر دوں"

وہ ہنسی سے دوہری ہو رہی تھی۔ اور ہنستے ہنستے اس نے بے ساختگی سے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ مگر جب میں نے برش ڈبو کر باہر نکالا۔ تو اُس نے ایک دم ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اور وہ ہونٹ ہلانے لگی۔

میں نے ہنس کر کہا۔ "مس صاحبہ آپ اپنی بائیبل کی دعائیں پڑھ رہی ہیں کیا؟"

مگر اس نے خوف زدہ سی ہو کر گلے میں لٹکی ہوئی صلیب کو تھاما۔ انگلی کے اشارے سے سینے پر اس کا نشان بنایا اور تقریباً دوڑتی ہوئی دکان سے نکل گئی۔

اس کے بعد وہ کافی دن تک غائب رہی۔ دو ایک مرتبہ دوسری نن عورتوں کے ساتھ گروپ میں آئی۔ اور سنجیدگی سے سودا خرید کر سب چلی گئیں۔ اب اس نے آنا بہت کم کر دیا تھا اور اکیلے آنے کا تو شاید کبھی خیال ہی نہیں آتا تھا۔

کافی عرصہ بعد ایک دن گاہک کوئی نہ تھا۔ اور میں دیوار میں چھوٹا دروازہ کھول کر اندر گودام میں چیزیں درست کر رہا تھا۔ وہاں

نسبتاً تاریکی تھی۔ مجھے اندر سے مکان کا کافی حصہ نظر آتا تھا۔ سامان رکھتے میں نے ایک دفعہ نگاہ اٹھائی۔ تو وہ کالا لباس پہنے شوکیس کے سامنے نقلی موتیوں کا ایک ہار دیکھ رہی تھی۔ میں اندر کھڑا اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے ساتھ والے شیلف سے ایک شیشہ اٹھایا۔ اور اس میں اپنا چہرہ دیکھنے لگی۔ پھر آہستہ سے سر کا کپڑا ذرا اوپر کھسکایا تاکہ شیشے میں اپنے بال دیکھ سکے۔ مگر جیسے ہی میری آہٹ سنائی دی اس نے شیشہ رکھ دیا۔ اور گودام کے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ میں باہر آیا تو اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ غالباً زیر لب دعا پڑھ رہی تھی پھر اس نے بڑی خاموشی سے کچھ سوئیاں اور دھاگے خریدے اور چلی گئی۔

میں اپنے کاروبار کو وسیع کرنے کے تجربے ہمیشہ کرتا رہتا تھا۔ چند ایک دوستوں کی صلاح پر مکھن ڈبل روٹی۔ کیک رس اور بسکٹ وغیرہ بھی اپنی دکان پر رکھ لئے ان سے بھی کافی آمدنی ہونے لگی۔

ایک روز وہی نن دکان پر آگئی۔ اس کو جو اشیاء درکار تھیں وہ لانے کے لئے میں نے ملازم کو گودام میں بھیجا۔ اور وہ کاؤنٹر کے پاس کھڑی انتظار کر رہی تھی اتنے میں ایک فوجی سپاہی دکان میں داخل ہوا۔ اور اس نے مجھ سے ڈبل روٹی مانگی۔

میں نے بکس کھول کر نکالی اور پتھر کی سل پر رکھ کر توس کاٹنے کے لئے چھری اٹھائی۔ مگر اس نے مجھے اشارے سے روک دیا۔ ہاتھ سے ڈبل روٹی کو دبایا اور کہنے لگا کہ یہ ڈبل روٹی سخت ہے کوئی دوسری نرم سی دی جائے۔ میں نے ایک اور نکالی۔ فوجی نے اسے ہاتھ میں پکڑ کر دبایا۔ تو اس کی انگلیاں اندر دھنس گئیں۔ وہ کہنے لگا۔

"دراصل مجھے یہ کل استعمال کرنی ہے اور یہ کل تک بالکل لوہا بن جائے گی۔ اس لئے کوئی اور ڈھونڈو۔ شاید اس سے بھی نرم مل جائے۔"

دوسرا بکس کھول کر میں بالکل تازہ ڈبل روٹی نکال لایا۔ جو بہت نرم تھی۔

فوجی نے اسے ہاتھ میں پکڑ کر دبایا۔ تو اس کی انگلیاں اس میں قریب قریب غائب ہو گئیں۔ ڈبل روٹی بالکل پچک گئی۔ سوائے اس ابھار کے جو شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان سے باہر جھانک رہا تھا۔ اس نے اپنی گرفت ڈھیلی کی اور ایک دو بار پھر دبا کر کہنے لگا۔

"یہ ٹھیک ہے!"

جب اس نے ڈبل روٹی میز پر رکھی تو اس کے پچکے ہوئے حصے آہستہ آہستہ باہر کو ابھرنے لگے۔

جتنی دیر فوجی سپاہی اپنے مضبوط ہاتھوں کی سخت گرفت میں نرم ڈبل روٹی کو بھینچتا رہا۔ وہ نن ٹکٹکی باندھے اس کے ہاتھ کو دیکھتی رہی۔ اور اس کے رخساروں پر سرخی ابھرنے لگی۔

میں نے لفافے میں ڈبل روٹی ڈالی۔ فوجی کو دی اور وہ چل دیا۔ جب میں نن کی طرف دوبارہ متوجہ ہوا۔ تو اس کا چہرہ سرخ تھا اور ہونٹ تیزی سے ہل رہے تھے۔

سودا لے کر اُس نے مجھے پیسے دیئے تو اس کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔ اور وہ نگاہیں چرا رہی تھی۔

اس کے جانے کے بعد میں دوسرے گاہکوں میں مصروف ہو گیا۔ اور اس کو بھول گیا۔

اگلے دن آ کر میں نے دکان کھولی ہی تھی۔ کہ اتنے میں وہ سامنے سے موڑ مڑتی دکھائی دی۔ سڑک پار کرکے وہ سیدھی دکان کی طرف آئی تو مجھے تعجب ہوا۔ کیونکہ وہ کبھی اتنا سویرے نہ آتی تھی۔

"میں نے ہنس کر کہا۔ "مس صاحبہ گڈ مارننگ۔"

اس نے بولنے کی بجائے صرف سر ہلا کر جواب دیا۔ عام طور پر جب وہ اکیلی آتی تھی۔ تو کھل کر بات چیت کرتی تھی۔ مگر اس روز وہ کچھ خاموش

…سراسیمہ سی تھی۔ جب کاونٹر کے قریب آئی، تو اس کا چہرہ ایسے لگا جیسے صدیوں سے مریض ہو۔ آنکھوں میں شب بیداری کے اثرات تھے۔ اور ان کے گردکالے حلقے رخساروں کو چھو رہے تھے۔ میرے قریب آکر اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اور اپنے ذمے ادھار کا حساب پوچھا۔ میں کاپی نکال کر واجب الادا رقم دیکھنے لگا۔ تو وہ گھبراہٹ میں انگلیاں چٹخ رہی تھی۔

"مس صاحبہ آپ کو ہمارے گیارہ روپے پچیس پیسے دینا ہیں!"

اس نے اپنے ڈھیلے لباس میں سے ایک رومال نکالا۔ اسے کھولا تو اندر نوٹوں کا بنڈل تھا۔ اس کے پاس اتنی رقم دیکھنے کا میرا پہلا اتفاق تھا۔ ان روپوں میں سے اس نے ایک دس روپے کا نوٹ اور ایک پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور انہیں کاونٹر پر رکھدیا۔

دراز کھول کر باقی پیسے نکالتے نکالتے میں نے پوچھا۔

"اور کچھ چاہئے مس صاحبہ؟"

اس نے ایک جھرجھری سی لی اور جواب دینے کی بجائے ہونٹ بھینچ کر نفی میں سر ہلادیا۔

میں نے باقی پیسے واپس کئے تو پچاس پیسے کا ایک سکہ اس کے ہاتھ سے گرا۔ اور کنارے کے بل لڑھکتا ہوا سرک گیا۔ وہاں سے نیچے گرا اور لڑھکتا لڑھکتا اس شیلف سے جا ٹکرایا جس میں پوڈر اور سرخی وغیرہ رکھے تھے۔ میں وہاں تک گیا۔ جھک کر سکہ اٹھایا۔

اور جب مڑنے لگا تو نن اس شیلف کی طرف غور سے دیکھ رہی تھی۔ کاونٹر کے پاس واپس آکر میں پچاس پیسے کا سکہ اسے دینے لگا۔ مگر اس نے لینے کے لئے ہاتھ نہ بڑھایا۔ بلکہ ایک بڑی عجیب سی حرکت کی۔

اس نے نوٹوں کے بنڈل سے دس روپے کا ایک اور نوٹ نکال کر کاونٹر پہ رکھدیا۔ باقی نوٹ تہ کر کے لباس کی سلوٹوں میں کہیں چھپائے اور پھر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ میری طرف بڑھی۔ کاونٹر کے پاس والا تختہ اٹھا کر اندر گھس آئی۔ میرے پاس سے گذر کر شیلف تک گئی۔ جلدی سے شیشے کا دروازہ کھولا۔ پاوڈر کے دو ڈبے، عطر اور ناخن کی پالش کی دو شیشیاں اٹھائیں۔ الماری کھلی چھوڑ کر جلدی سے واپس مڑی۔ اور بھاگتی ہوئی دکان سے باہر نکل گئی۔

اس واقعہ کو کئی ماہ گذر چکے ہیں۔ مگر اس دن کے بعد وہ اس علاقے میں مجھے نظر نہیں آئی۔ نہ معلوم کہاں چلی گئی ہے۔ میں نے کئی دفعہ دوسری نن عورتوں سے اس کے متعلق دریافت بھی کیا۔ مگر جب بھی اس نن کا ذکر کرتا ہوں۔ وہ مجھے کوئی جواب نہیں دیتیں۔ بلکہ گلے میں لٹکی ہوئی صلیب کو تھام لیتی ہیں۔ شہادت کی انگلی سے سینے پر کراس کا نشان بناتی ہیں۔ اور ان کے ہونٹ تیزی سے ہلنے لگتے ہیں

نسیم درانی

آثار۔ کلکتہ

کچّی دیواریں

بڑی سخت گرمی پڑ رہی تھی۔

فضا میں صبح ہی سے غضب کا حبس ہو گیا تھا۔ جھلستی ہوئی گرمی سے پریشان ہو کر برسات کی نرم اور ٹھنڈی پھواروں کے لئے میں نے امید بھری نظروں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ لیکن برسات کی نرم اور ٹھنڈی پھواروں کی بجائے آسمان کی سپیدی مجھے منہ چڑاتی نظر آئی برسات کا موسم تھا مگر آسمان پر کہیں بدلیاں نہ تھیں۔ ہوا بالکل بند ہو گئی تھی۔ اور جسم سے پسینے کی ندیاں پھوٹی پڑ رہی تھیں۔ گرمی کی وجہ سے لوگ تھے کہ بوکھلائے جا رہے تھے۔ ہر شخص صرف بارش کی دعا مانگ رہا تھا۔

آنگن میں دروازے کے کنارے تھوڑا سا کواڑ کھولے چوکی پر بیٹھی بیا دال بین رہی تھیں بوا کو گرمی سے سخت نفرت ہے لیکن وہ اس وقت اپنے بائیں ہاتھ سے پنکھا جھل جھل کر دال بیننے میں مشغول تھیں۔ البتہ کبھی کبھی گرمی سے گھبرا کر پہلو بدل لیتیں۔ بادلوں کی امید پر آسمان کو تکتیں اور پھر تھوڑی دور چارپائی پر بیٹھی ہوئی نوری کو ایک نظر دیکھ کر پھر دال میں لگ جاتیں۔

نوری گرمی سے بے نیاز صبح ہی سے تارکشی کے گوٹے اور کروشیا ہاتھ میں پکڑے میز پوش بن رہی تھی۔ کچھ دنوں سے اس کا کام موٹے بُننا کاڑھنا اور سینا تھا۔ اس کی شادی میں اب دن ہی کتنے رہ گئے تھے اور اپنے جہیز کا سامان اسے خود ہی تیار کرنا تھا۔ بوا تو صرف اسے مشورے دیا کرتی تھیں۔ اور وہ دن و رات اپنے جہیز کی تیاری میں لگی رہتی۔

اس وقت بھی وہ میز پوش بن رہی تھی۔ پسینے کے قطرے اس کے چہرے سے ٹپک کر ہاتھوں پر پھیلے ہوئے دوپٹہ میں جذب ہو رہے تھے۔ مجھے بھی اپنے چہرے پر پسینے کا احساس ہوا۔ میں نے انگلی سے اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھا۔ اور پھر باہر گلی میں نظریں دوڑائیں۔ جہاں محلے کے لڑکوں نے صبح ہی سے اودھم مچا رکھا تھا۔ چھوٹے بڑے لڑکے چہروں پر توے کی سیاہی لگائے چھوٹے چھوٹے لنگوٹ باندھے کئی ٹولیوں میں ادھر ادھر شور مچاتے پھر رہے تھے۔

کالے بھی ڈنڈے پیلے بھی ڈنڈے
برسیں گے برسائیں گے ٭ کوڑی ڈھیر لگائیں گے
کوڑی گئی ریت میں ٭ پانی گیا کھیت میں

کیچڑ میں لت پت لڑکے ٹین کے کنستروں کو ڈنڈوں سے بجاتے، شور مچاتے محلے کے ہر گھر کے سامنے دھرنا دے کر کھڑے ہو جاتے ایک

گاتی
والی ایک گھر سے کچھ نہ کچھ لئے بغیر نہ ٹلتی تھی۔ لیکن ایک ٹولی ٹلنے نہ پاتی تھی۔ کہ دوسری ٹولی۔

برسو رام دھڑاکے سے
بڑھیا مر گئی فاقے سے

گاتی ہوئی آجاتی۔ بوا ان لڑکوں کو آتا دیکھ کر تھوڑا سا کھلا ہوا کواڑ بھی بند کر دیتیں اور دروازے سے آتی ہوئی سسکتی ہوا بھی بند ہو جاتی۔ اس پر محلے کے لڑکے دروازے کو پیٹنا شروع کر دیتے اور بوا کو آ تا یا کچھ پیسے انھیں دینا ہی پڑتے جو پھر اور پوریاں پکا کر بارش کی دعا کرنے والے تھے صبح سے کئی ٹولیاں آچکی تھیں۔ اور بوا پیسے دیتے دیتے تنگ آچکی تھیں۔ میں آنگن میں چھوٹے سے نیم کے پیڑ کے نیچے لیٹ گیا۔ جوں جوں دن بڑھتا جاتا تھا۔ گرمی میں تیزی آرہی تھی۔ نیم کی ٹہنیوں میں سے چھنی ہوئی سورج کی ہلکی ہلکی شعاعوں سے میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ میں نے کروٹ لی۔ آنکھوں کو کلائی پر رکھ کر سر چٹ پر ٹیک دیا۔

"کیوں کیسی طبیعت ہے؟" بوا نے گھبراتے ہوئے میرے قریب آکر پوچھا۔

"کچھ نہیں" میں نے آنکھوں سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔ "آج تو گرمی بہت سخت پڑ رہی ہے۔"

"ہاں آج تو، روزانہ سے زیادہ ہی گھمس ہے۔" بوا بولیں۔ "اور تو آج دفتر نہیں جائے گا کیا؟"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "گرمی کی وجہ سے آج جانے کو جی نہیں چاہ رہا ہے۔"

بوا چپ ہو گئیں اور میں نے لیٹے ہی لیٹے سامنے دیوار کو دیکھا۔ یہ چھ فٹ کی کچی مٹی کی دیوار تھی۔ جو زمین سے چار فٹ سیدھی اٹھنے کے بعد ٹیڑھی ہو گئی تھی۔ دیوار کے سہارے سے ایک چھوٹی سی کیاری تھی۔ جس میں کئی طرح کی بیلیں لگی ہوئی تھیں اور جس کی وجہ سے دیوار کے آدھے حصے پر ہریالی چھائی ہوئی تھی۔ اس دیوار سے ملی ہوئی دو کچی دیواریں اور تھیں ان دیواروں پر لمبے لمبے بانس رکھے ہوئے تھے۔ جن پر چٹائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ جس نے آنگن کے اس کونے میں ایک کمرے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ کمرے میں ایک طرف ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ اس کے نیچے کئی زنگ آلود ٹرنک پڑے ہوئے تھے۔ جن میں نوری کے جہیز کا سامان رکھا تھا۔ کمرے کی دوسری جانب لکڑی کی بغیر دروازوں کی ایک الماری کھڑی تھی۔ جن میں کچھ تانبے پیتل اور شیشے کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ الماری سے ملا ہوا ایک چھوٹا سا ٹرنک اور تھا۔ جس میں ہر وقت تالا لگا رہتا تھا۔ جس کی چابی بوا کے کمر بند میں بندھی رہتی تھی۔ اس ٹرنک میں بوا کا پورا خزانہ بند تھا۔ گھر کے خرچ اور نوری کی شادی کے لئے جمع کئے ہوئے روپوں کے علاوہ، زیورات میں نوری کی چمپا کلی، کانوں کی مچھلیاں اور پیروں کے توڑے رکھے ہوئے تھے ایک چھوٹے سے مخملی کیس میں نوری کے دولہا کے لئے ایک سونے کی انگوٹھی بھی رکھی تھی، بوا جب بھی ٹرنک کھولتیں۔ تو کتنی ہی دیر تک وہ انگوٹھی کو پیار بھری نظروں سے دیکھا کرتیں۔ اور ٹرنک بند کر کے نوری کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرتی ہوئی پھر کسی کام میں لگ جاتیں۔

بھٹکے ہوئے بادلوں کا ایک ٹکڑا گھر کے اوپر سے گزرا اور چند منٹ کے لئے دھوپ بھاگ گئی۔ میں نے چونک کر آسمان کی جانب دیکھا

"بادل آرہے ہیں۔ آج بارش ضرور ہو گی۔" نوری چاول دھوتے ہوئے بولی۔

"نہیں ری۔" بوا اداس سے بولیں۔ "ہمیں بارش وارش نہیں چاہیئے۔ ہمارے لئے گرمی ہی اچھی ہے۔"

"کیوں؟" میں نے تعجب سے بوا کو دیکھا۔

بوا جواب دینے کی بجائے حسرت بھری نظروں سے کمرے میں رکھے ہوئے ان ٹرنکوں کو اس طرح دیکھنے لگیں۔ جیسے ان میں نوری کا جہیز نہیں ان کی ممتا اور بیٹی کا سہاگ بند ہو۔

میرے دل میں کانٹا سا چبھ گیا۔ میں نے کمرے کی چھت پر پڑی ہوئی ان چٹائیوں کو دیکھا۔ جن کے تنکے بکھر کر کسی پاگل فقیر کی داڑھی

غضب کا حبس ہو گیا تھا۔ پسینے میں اور تیزی آگئی تھی جسم پر گرمی دانوں میں خارش ہونے لگی۔ اور لاکھوں چیونٹیاں جسم پر رینگتی محسوس ہوئیں۔ سڑک پر چلتے ہوئے اس قیامت کی گرمی سے پریشان ہر شخص کی نظریں تعجب سے آسمان کی جانب اُٹھ گئیں۔ ایک ہفتہ کی سخت گرمی کے بعد آج تو آسمان پر اس طرح ابر چھایا تھا۔ کالے کالے مٹیلے بادل جو ایک دوسرے میں مدغم ہو کر اور بھی کالے ہو رہے تھے۔ کچھ لوگوں نے بادلوں کو دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا۔ اور کچھ لوگوں نے اس طرح برا سا منہ بنایا جیسے انھیں خدا کی اس رحمت پر بالکل یقین نہ ہو۔ اور میرا دل بھی نہ جانے کیوں زور زور سے دھڑکنے لگا۔ آسمان پر روئی کے گالوں کی طرح پھیلے ہوئے بادل اور گہرے ہو گئے۔ تاریکی اور بڑھ گئی۔ مکانوں دکانوں میں بجلی کے قمقمے روشن ہو گئے۔ اور ایسا معلوم ہونے لگا۔ جیسے رات آج اپنے وقت سے بہت پہلے چلی آئی ہو۔ بجلی بڑے زور سے کڑکی بادل ڈر کر اور بھی زور سے چیخے اور پھر بادلوں نے بے اختیار رونا شروع کر دیا۔ آسمان سے روتے ہوئے بادلوں کے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی اور زمین پر ہر طرف خوشیوں کی لہریں بکھر گئیں۔

لیکن میرا دل اداس ہو گیا۔ بارش کی بوندیں میرے جسم پر چنگاریاں بن کر گرنے لگیں اور میری آنکھوں میں میرا گھر گھومنے لگا۔ گھر کے کونے میں بنا ہوا کچی دیواروں کا اور چٹائی کی چھت کا کمرہ اور کمرے میں رکھا ہوا نوری کا جہیز۔ اور نوری کے جہیز کو خراب ہونے سے بچانے کی فکر میں ابا کا غمگین چہرہ میری آنکھوں میں تیزی سے گردش کرتا ہوا نظر آیا میں نے مارکیٹ کی جانب تیز تیز قدم بڑھانے شروع کر دیے۔ سڑکوں بازاروں، مکانوں دکانوں میں ہر طرف ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ لوگ بارش سے خوش ہونے کے باوجود اس سے بچنے کے لئے ادھر اُدھر دوڑنے لگے۔ فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے دکان داروں نے جلدی جلدی اپنا سامان ڈھکنا شروع کر دیا۔ رکشے، سائیکلیں، بسیں اور کاریں اپنی اپنی منزل پر پہنچنے کے لئے بے چین نظر آنے لگیں۔ بارش اور تیزی سے ہونے لگی۔

بھیگی ہوئی قمیص کی سیل جب بنیان سے گزرتی ہوئی میرے جسم کو لگی۔ تو میرے افسردہ ذہن کو بارش کا احساس ہوا۔ میں نے پناہ کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ قریب ہی ایک بلڈنگ کے دروازے پر بارش سے بچنے کے لئے بہت سے لوگ کھڑے نظر آئے۔ میں نے دو تین قدم تیزی سے اٹھائے اور خود بھی وہاں پہنچ گیا۔

ایک کونے میں اطمینان سے کھڑے ہونے کے بعد جیب سے نیم گیلا رومال نکال کر میں نے اپنا چہرہ خشک کیا۔ پھر چشمے کے شیشوں پر بیٹھی ہوئی، ننھی ننھی کمزور بوندوں کو میں نے رومال سے مسل ڈالا۔ بارش کی ننھی اور کمزور بوندیں ــــــ

سامنے سڑک پر میں نے نظر ڈالی۔ بارش میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔ پندرہ منٹ کے عرصہ ہی میں سڑک نے تالاب کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ہر طرف سڑک پر پانی ہی پانی تھا۔ ڈھلان کی طرف بہتا ہوا پانی فٹ پاتھ کے اوپری کناروں کو چھو رہا تھا۔ سڑک کے درمیان بہتے ہوئے پانی میں سے جب بھی کوئی بس یا کار تیزی سے گزرتی۔ پانی فواروں کی طرح اچھلتا۔ بس گزر جانے کے بعد پانی کی سطح پر غریبوں کی طرح سینکڑوں بلبلے پیدا ہوتے اور چند سیکنڈ بعد ہی اپنی ہستی اسی گندے پانی میں فنا کر دیتے۔ فٹ پاتھ پر چھوٹی چھوٹی دکانوں کے تین چار ڈھیر ٹاٹ اور ترپالوں سے ڈھکے اس طرح نظر آتے تھے۔ جیسے پرانے قبرستان میں بگڑی ہوئی قبریں۔ دکانوں کے ڈھیر کے علاوہ فٹ پاتھ کے کنارے تین چار ٹھیلیں بھی کھڑی تھیں۔ جو بالکل ننگی تھیں۔ ایک غریب مزدور کی طرح جن پر نہ ٹاٹ تھا نہ ترپال، ٹھیلوں پر رکھی ہوئی کھجوریں ناشپاتیاں آم اور سبز سبز خوبانیاں بارش میں دُھلنے کے بعد بھوکی اور پیاسی نگاہوں میں چکاچوند پیدا کر رہی تھیں۔

بارش ہوتی رہی ابا کا غمگین چہرہ، معصوم نوری اور اس کا جہیز میری نگاہوں میں گھومتا رہا۔ گھومتا رہا۔ آنگن کی کچی دیواروں کو رکھنے کے لئے تکیاں اور بلیوں پر ٹین کی چادروں کے سو روپے میری جیب میں پھڑپھڑاتے رہے اور میں نے سوچا، کاش! بارش بند ہو جائے اور میں جلد سے جلد کمرے کی چھت کے لئے ٹین کی چادر خرید کر گھر لے جاؤں۔ اور نوری کے جہیز کو خراب ہونے سے بچالوں، نوری جس کی

کی طرح نظر آتے تھے۔

"اگر بارش ہوگئی تو؟" میں نے سوچا۔ نوری کے جہیز کا سارا سامان خراب ہو جائے گا۔ نوری جس کی شادی میں صرف تین مہینے ہی تو تھے اور کمرے میں رکھا ہوا جہیز ہی کا تو تھا۔ جہیز جو شادی کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ میں نے لیٹے لیٹے پھر کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ الماری کے قریب تالہ لگے ہوئے ٹرنک پر میری نظریں جم کر رہ گئیں۔

"بوا!" میں نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے پکارا۔ جو گرمی سے پریشان ہونے کے باوجود اسی طرح کام میں منہمک تھیں۔

"کھانا لاؤں بیٹا؟" بوا نے میرے قریب آتے ہوئے پوچھا

"نہیں" البتہ مجھے سو روپے چاہئیں۔"

"کس لئے؟" بوا نے میرے چہرے کو غور سے دیکھا۔

میں نے پہلے کمرے کی چھت پر پڑی ہوئی چٹائیوں پھر آسمان اور پھر بوا کی طرف دیکھا۔ جو میرے جواب کی منتظر تھیں۔

"آج بارش ضرور ہوگی بوا!" میں نے کہا۔ "میں سوچ رہا ہوں ٹین کی چادریں اور دو بلیاں خرید لاؤں۔ اپنی ان کچی دیواروں پر بلیاں رکھ دیں گے اور ان پر چادریں آجائیں گی۔"

"لیکن نالتو روپے تو ہیں ہی نہیں؟" بوا بے دلی سے بولیں۔

"نوری کے روپوں میں سے دے دو۔ میں ایک مہینہ میں ضرور واپس کر دوں گا۔"

میں نے اطمینان دلایا۔

بوا وہیں کھڑی چند منٹ تک سوچتی رہیں پھر آہستہ آہستہ بوجھل قدموں سے کمرے کی جانب بڑھیں۔ تالا لگے ہوئے ٹرنک پر سے بستر اٹھا کر قریب پڑی ہوئی چارپائی پر ڈالے اور نیفے میں سے اُڑسے ہوئے کمربند سے چابی کھول کر تالا کھولا۔ ٹرنک میں ہاتھ ڈال کر چھوٹا سا ایک ٹین کا ڈبہ نکالا۔ اس میں سے مڑے تڑے نوٹوں کی گڈی نکال کر ہاتھ میں پکڑ لی۔ پھر دس دس روپے کے ایک ایک نوٹ کو اس طرح ہاتھ کے انگوٹھے سے سلتیں، جیسے وہ نوری کے سہاگ کے پھول مسل رہی ہوں اور گن گن کر زمین پر پیر کے انگوٹھے سے دبا دیتیں۔

سو روپے کے نوٹ بوا سے لے کر میں نے جیب میں رکھے اور آنگن پار کر کے دروازے کی طرف چلا۔

"کھانا تو کھا لے؟"

بوا نے ٹوکا۔

"بھوک نہیں ہے" میں جواب دیتا ہوا گھر سے نکل گیا۔ گلی میں چاروں طرف دھوپ ہی دھوپ تھی۔ آسمان پر نہ کہیں بدلیاں تھیں۔ اور نہ زمین پر سائے۔ محلے کے لڑکے اسی طرح چلچلاتی دھوپ میں اودھم مچا رہے تھے۔ گلی کے نکڑ پر راستہ روکے لڑکوں کی ایک اور ٹولی۔

کال کلوٹا، بگلا لوٹا ⁂ کالے میگھا پانی دے

اک بکری دو بیل پیاسا ⁂ کالے میگھا پانی دے

بڑے زور زور سے گا رہی تھی۔ ایک لڑکا ایک تھالی لئے ہر راہ گیر کے آگے پیش کرتا تھا۔ اور اسے بغیر کچھ دیے آگے راستہ نہیں ملتا تھا۔ میں نے ایک آنہ ان کی تھالی میں ڈالا ــــ اور آگے بڑھ گیا۔

شہر کے بڑے بازار میں پہنچتے ہی یکایک آسمان پر کالے کالے بادل چھا گئے۔ ہر سو اندھیرا سا پھیل گیا۔ میں نے بے اختیار آسمان کو دیکھا۔ چمکتی ہوئی دھوپ دھندلکے میں تبدیل ہو گئی تھی۔ آگ برساتے ہوئے سورج کے سامنے بادل سپر بن گئے تھے۔ ہوا بند ہو گئی۔ اور فضا میں

شادی میں صرف تین مہینے رہ گئے تھے۔ اب بھی نوری کا جہیز بچایا جا سکتا ہے۔ میرے دل نے چپکے سے کہا۔

بارش اسی طرح ہو رہی تھی۔ میں نے بلڈنگ کے دروازے میں اپنے اطراف میں کھڑے ہوئے لوگوں پر نظر ڈالی۔ جو کافی دیر خاموش رہنے کے بعد اب ایک دوسرے کے کھسر پھسر کر رہے تھے۔ میں نے وقت دیکھنے کیلئے گھڑی دیکھی۔

"کیا بجا ہے؟" میرے قریب کھڑے ہوئے ایک شخص نے مجھ سے پوچھا۔

"چار"۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مختصر سا جواب دیا۔ اس کی میلی اور چیکٹ قمیض اس کے جسم سے چپٹی ہوئی تھی۔ اس کا گریباں کھلا ہوا تھا۔ بارش کی وجہ سے سارا جسم بھیگ رہا تھا۔ وقت پوچھ کر اس نے کھڑے کھڑے پہلو بدلا۔ اس کے کھلے گریبان سے پسینے کی بو کا ایک بھبکا آیا اور میری ناک میں کھٹے دہی کی سی بو گھستی چلی گئی۔

فٹ پاتھ پر دوکان کے ایک ڈھیر پر سے ہوا نے ترپال ہٹا دی، سامان بھیگنے لگا۔ بلڈنگ کے دروازے میں کھڑے ہوئے ایک شخص نے تیزی سے بھاگ کر ترپال کو پھر سے ڈھک دیا ۔۔۔ اور جیسے اس نے میرا بھولا سبق یاد دلا دیا ہو ۔۔۔ نوری ۔۔۔ اور بارش میں بھیگتا ہوا اس کا جہیز ۔۔۔

میں نے جیب میں پڑے ہوئے سو روپوں کو مضبوطی سے پکڑا۔ اور بلڈنگ کے دروازے سے نکل کر بھیگتا ہوا مارکیٹ کی جانب بڑھنے لگا۔ آسمان پر اسی طرح کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے بارش اسی طرح تیزی سے برس رہی تھی۔ میں آگے بڑھتا گیا۔

مارکیٹ پہنچ کر میں نے چادریں خریدیں دو بلیاں خریدیں لیکن بارش میں کوئی گاڑی والا سامان لے چلنے کو تیار نہ تھا اور بارش رکنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ کیا کروں۔ میں پریشان ہو گیا۔

"دو کے بجائے چار دو گے بابو سب تیار ہو جائیں گے"۔ دکاندار نے مجھے پریشان دیکھ کر کہا۔

اور پھر تھوڑی ہی دیر میں گاڑی پر خریدا ہوا سامان رکھ کر میں گھر کی جانب جا رہا تھا۔ بارش میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تمام دنوں کی کسر آج ہی پوری ہو جائے گی۔

گاڑی چلتی رہی ۔۔۔ چلتی رہی ۔۔۔ بارش اسی طرح ہوتی رہی۔ میں سوچتا رہا۔

اب نوری کا جہیز بارش سے خراب نہیں ہوگا۔ اب نوری تین مہینے بعد دلہن بن کر اپنا سارا جہیز اپنی سسرال لے جائے گی۔ پھر اب کبھی بارش نہ ہونے کی دعا نہیں مانگیں گی۔ بارش کی ایک بھی بوند اب اس کمرے میں کبھی نہیں آئے گی۔ کبھی نہیں .... گاڑی کا پہیہ پانی بھرے ہوئے ایک گڑھے میں پھنس کر اچھلا۔ اور میں چونک پڑا۔ سامنے ایک مکان میں چھپر کے نیچے بیٹھے ہوئے لڑکے جو صبح

کالے بھی ڈنڈے، پیلے بھی ڈنڈے

برسیں گے برسائیں گے ✦ کوڑی ڈھیر لگائیں گے

کوڑی گئی ریت میں ✦ پانی گیا کھیت میں

۔۔۔۔ گا کر پیسے جمع کر رہے تھے۔ اس وقت انھیں پیسوں کی پکائی ہوئی کھیر ایک دوسرے سے چھین چھین کر کھا رہے تھے۔ مجھے یاد آ گئیں آج تو بیمار کی وجہ سے انھوں نے چولھے میں آگ بھی نہ جلائی ہوگی۔ روٹی بھی نہ پکائی ہوگی ۔۔۔ روٹی ۔۔۔ کتنی گولائی ہوتی ہے اس روٹی میں۔ میں نے سوچا دنیا کا ہر انسان اسی گولائی کے گرد ہی تو گھومتا ہے

"بس یہیں روک دو"

میرا گھر آ گیا تھا۔ میں نے گاڑی والے سے کہا تھا۔

بارش میں دھیرے دھیرے کمی ہو رہی تھی۔ گھر کے باہر ہر طرف کیچڑ ہی کیچڑ تھی۔ کیچڑ سے گذر کر میں نے آہستہ سے کواڑ کھولے گھر دھندلا، دھندلا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ آنگن میں پیر رکھتے ہی میرا پاؤں بھرے ہوئے پانی میں ڈوب گیا۔ میں نے آنکھوں کو اندھیرے سے مانوس کرتے ہوئے ادھر اُدھر دیکھا۔ بوا اور نوری چٹائی کے باورچی خانہ میں سکڑی ہوئی بیٹھی تھیں اور سامنے کمرے کی کچی دیواریں گر چکی تھیں۔ نوری کی شادی کا جہیز زنگ آلود ٹرنکوں میں کچی دیواروں کے نیچے دبا نظر آرہا تھا۔ میری نظریں خود بخود آسمان کی جانب اُٹھ گئیں۔ جہاں اتنی بڑی چھت بغیر کسی دیوار کے کھڑی تھی۔ کالے کالے مٹیالے بادل بدستور موجود تھے۔ میں نے بادلوں سے پار آسمان کو دیکھنے کی کوشش کی مگر اس میں ناکام رہا۔

بارش میں دھیرے دھیرے کمی ہو رہی تھی۔ گھر کے باہر پر شفقت کیچڑ ہی کیچڑ تھی۔ کیچڑ سے گذر کر میں نے آہستہ سے کواڑ کھولے گھر دھندلا دھندلا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ آنگن میں پیر رکھتے ہی میرا پاؤں بھرے ہوئے پانی میں ڈوب گیا۔ میں نے آنکھوں کو اندھیرے سے مانوس کرتے ہوئے ادھر اُدھر دیکھا۔ بوا اور نوری چٹائی کے باورچی خانہ میں سکڑی ہوئی بیٹھی تھیں اور سامنے کمرے کی کچی دیواریں گر چکی تھیں۔ نوری کی شادی کا جہیز زنگ آلود ٹرنکوں میں کچی دیواروں کے نیچے دبا نظر آرہا تھا۔ میری نظریں خود بخود آسمان کی جانب اُٹھ گئیں۔ جہاں اتنی بڑی چھت بغیر کسی دیوار کے کھڑی تھی۔ کالے کالے مٹیالے بادل بدستور موجود تھے۔ میں نے بادلوں سے پار آسمان کو دیکھنے کی کوشش کی مگر اس میں ناکام رہا۔

تنقیدی نقوش

ملنے کا پتہ مشتاق بکڈپو۔ شلڈرن روڈ۔ کراچی۔

ایڈیٹر:- نسیم درانی -

تیسرا شمارہ شائع ہوگیا -

افسانے • راجندر سنگھ بیدی • احمد علی • سہیل عظیم آبادی • جیلانی بانو • ساجدہ تبسم • محمد احسن فاروقی • رام لعل • پرکاش پنڈت • اقبال متین • اختر آذر • آمنہ ابوالحسن • نعیم آروی • سلیم اختر • گربچن سنگھ • نجم الحسن رضوی • نسیم شاد • شفقت رضوی -

مضامین • ڈاکٹر محمد احسن فاروقی • ڈاکٹر عبدالسلیم ناقی • مجتبیٰ حسین • ڈاکٹر عبدالقیوم • ابن حنیف • عبدالسلام • بشیر زیدی • [illegible]

خصوصی مضامین • مولانا صلاح الدین احمد • مولانا حامد حسن قادری کے مضامین اور ان کی شخصیت پر ابوالخیر کشفی • صہبا اختر • رئیس امروہوی • ابن انشا • مبشر علی صدیقی • راشد حسن قادری کی نظمیں اور خاکے

نظمیں • اختر الایمان • جاں نثار اختر • فارغ بخاری • باقر مہدی • احمد علی • انجم اعظمی • جون ایلیا • ساقی فاروقی • شہاب جعفری • ادیب سہیل • شہریار • صلاح الدین محمد • زبیر رضوی • جعفر منصور • شاہد منصور • عرش صدیقی • قاضی سلیم • بلقیس جہاں • عادل منصوری • حمید الماس • عارف عمادی • مثال رضوی • رضی فاروقی • انور شعور • افضل منہاس • خالد شیرازی • ماجد رضوی •

سرگزشت • ابوالخیر کشفی • **منظوم ڈرامہ** • عبدالعزیز خالد -

غزلیں • غلام ربانی تاباں • خلیل الرحمٰن اعظمی • منور لکھنوی • سرشار صدیقی • رسا چغتائی • اطہر نفیس • احمد ہمدانی • ادیب سہیل • اختر ہوشیارپوری • عبیداللہ علیم • ناصر شہزاد • کیف انصاری • شبی فاروقی • انور شعور • رفعت سلطان • انوار انجم • رئیس فروغ • شفقت کاظمی • محسن احسان

میری غزل • صہبا اختر کی ۱۴ غزلیں •

آج کا شاعر • سحر انصاری پر، جون ایلیا، اور انجم اعظمی کے مضامین اور سحر انصاری کی نظمیں • غزلیں -

فنون لطیفہ:- ادیب سہیل، بلدیو مرزا •

دوہے گیت:- تاج سعید • زبیر رضوی • اسد محمد خاں • ناصر شہزاد • بلدیو مرزا •

تبصرے:- سید احتشام حسین • ڈاکٹر ابواللیث صدیقی • شاہد عشقی • عرش صدیقی • نعیم آروی • صبیحہ آذر • اسد محمد خاں • نسیم شاد

سرورق:- عمل:- جمیل نقش • کہانی - غازی صلاح الدین -

صفحات ۳۶۲ —— قیمت تین روپے

سہ ماہی "سیپ" بلاک ڈی رشید شاد کالونی - کراچی نمبر ۲۸ -

آثم مرزا

نیا جنم

کلینر نے دو چھوڑ لیا تھا۔ منور ہنوڈی کی دکان کے سامنے بنچ پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ مصنوعات کے اشتہار میں مسکراتی ہوئی عورت پر اس کی نظریں جم کر رہ گئیں۔ کلینر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "بٹ صاحب۔ وقت ہو گیا ہے"۔ منور چونک پڑا "آں۔ اوہ! وقت ہو گیا ہے"! اس کی آنکھوں میں پہلے چکا چوند سی پیدا ہوئی۔ اور پھر دھندلکے پھیل گئے۔ وہ بس کی طرف بڑھا۔ تو ماضی اس کے قدموں سے لپٹا سسک رہا تھا۔ اس نے گردن گھما کر بنچ پر پڑے ہوئے اخبار کی طرف یوں دیکھا۔ جیسے زندگی کے ویرانوں میں کھلے ہوئے پھول کی پتیاں گرم فضا میں منتشر ہو رہی ہوں۔ اس کے سینے میں پھانس سی چبھنے لگی۔ "اس عورت کی تصویر عارفہ سے کیسی مشابہت رکھتی ہے! کاش! یہ کاش" تند بگولے کی مانند اس کے شعور میں آتشیں دائرے بنانے لگا۔ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر جب اس نے اسٹیرنگ پکڑا۔ تو شکست کے احساس نے اسے تڑپا دیا۔ کلینر نے پائیدان پر کھڑے ہو کر بلند آواز میں کہا "بٹ صاحب۔ دس سواریاں کم ہیں"۔ منور نے بس اسٹارٹ کی۔ گیئر بدلا۔ اور بس کو اڈے سے باہر لے آیا۔ سڑک پر دو آدمیوں نے ہاتھ اٹھا کر بس کو ٹھہرانا چاہا۔ مگر منور نے بس نہ روکی۔ کلینر دروازے پر کھڑا تھا۔ بس کو رکتے نہ دیکھ کر اس نے سر اندر کر کے تیز لہجہ میں کہا "بٹ صاحب۔ دس سواریاں کم ہیں"۔ منور کے جلتے ہوئے تصورات کو جھٹکا سا لگا۔ اور یادوں کے آبگینے چکنا چور ہو گئے۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ "دس سواریاں کم ہیں اور میں کہاں بھٹک رہا ہوں۔ روزی کا معاملہ ہے"۔ اب وہ محتاط ہو گیا تھا۔ تھوڑی دور جا کر تین سواریاں مل گئیں۔ کلینر نے گھنٹی بجائی اور بس پھر چل پڑی منور کو پھر عارفہ کا خیال آ گیا۔ میں اتنا برا تو نہ تھا پھر عارفہ نے مجھے کیوں ٹھکرا دیا۔ مجھ سے نفرت انگیز سلوک کیوں کرتی رہی تھی۔ ترک اس سے یوں کترایا کرتی تھی۔ جیسے وہ خطرناک پھوڑے سے بہنے والا زہریلا مواد ہو۔ منور کی جذباتی اداکاری نے عارفہ کو یقین دلایا تھا کہ وہ گرم ہوا کا جھونکا ہے جس سے شگفتہ پھول جھلس جاتے ہیں۔ شادی کی تقریب میں گونجتی ہوئی وحشی چیخ ہے جس سے رونقیں دم توڑ دیتی ہیں۔ منور جتنا اس کے قریب ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ اتنا ہی اس سے دور بھاگتی رہی تھی۔ یہ دوری بڑھتی گئی۔ قریب ہو کر بھی ان میں ایسی خلیج حائل تھی۔ جو افق تا بہ افق پھیلی ہوئی تھی۔ منور شہر کے ایک مشہور بیوپاری ملک صاحب کے پاس ڈرائیور تھا اور عارفہ ان کے مالی کی نوجوان بیٹی تھی۔ ایک ہی کوٹھی میں رہتے ہوئے وہ ایک دوسرے کو ایسے پہچانتے تھے جیسے ملک صاحب کے بچے اپنے کھلونوں کو۔ مگر پھر بھی عارفہ اسے اجنبی ہی سمجھتی تھی۔ اور منور ہزار کوشش کے باوجود اسے اپنی طرف مائل نہ کر سکا تھا۔ کرم دین مالی اگرچہ منور سے ہنس کر بات کر لیتا تھا۔ لیکن اس بول چال میں ایسی بے تکلفی پیدا نہ ہوئی تھی کہ قرب کی خواہش دیوانہ بنا دے۔ شاید عارفہ نے اپنے باپ سے منور کی بڑی بڑی آنکھوں میں ابھرے ہوئے سرخ ڈوروں سے اپنے خوف کی کیفیت بیان کر دی تھی۔ یا خود کرم دین نے بھانپ لیا تھا کہ منور کی نیت میں فتور آ گیا ہے اس لئے وہ ہنس کر تو بات کر لیتا تھا مگر ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے منور کو اپنے کوارٹر میں مدعو کرنے کی ضرورت محسوس کی ہو۔ یا خود اس کے پاس حقّہ کا

کفن لگانے کے لئے بیٹھ گیا ہو۔ آہستہ آہستہ خود منور کو احساس ہونے لگا تھا کہ اس کے جذبات کی چیخ و پکار اور اشاروں کنایوں کا بے باک پن اس کے عشق کو کاروباری شکل دے رہے ہیں۔ وہ خود پر قابو پانے کی کوشش میں ناکام رہتا تھا۔ اور عارفہ کو دیکھ کر دیوانہ وار عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتا تھا جیسے وہ کوئی لوک بھرا کھلونا ہو۔ جب وہ اپنے جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو گیا تو اس سے نہ رہا گیا۔ ایک دن اس نے کرم دین کے پاؤں پکڑ لئے۔ جلد ہی کرم دین نے انجان بن کر پوچھا: "بیٹا یہ کیا حرکت ہے؟ کیوں مجھے گنہگار کر رہے ہو؟" منور کا دل نرم کانچ کا ٹکڑا بن گیا تھا۔ "چچا میں لاکھ برا سہی۔ مگر عارفہ کی خوشیوں کی خاطر جان قربان کرنے سے بھی دریغ نہ کروں گا۔" کرم دین کے جواب نے نرم کانچ کے ٹکڑے کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ "بیٹا۔ میں تو ایک اور شریف آدمی کو زبان دے چکا ہوں۔ اب یہ میرے بس کی بات نہیں رہی۔" منور دل برداشتہ ہو کر اب انتقامی انداز سے کرم دین کے متعلق سوچنے لگا تھا وہ اب اس کی طرف یوں دیکھتا جیسے قتل کرنے کا ارادہ ہو کرم دین بھی اس کے بدلے ہوئے رویہ سے الجھن محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کی موجودگی اب کرم دین کے لئے خوف کی علامت بن گئی تھی۔ اس الجھن اور خوف سے نجات حاصل کرنے کی خاطر اس نے ملک صاحب سے اس کی شکایت کر دی۔ اس کی داڑھی میں الجھے ہوئے آنسوؤں میں ایسی التجا تھی۔ ایسا تقاضا تھا کہ ملک صاحب کا دل پسیج گیا۔ اور منور کو نوکری سے جواب مل گیا۔ اس کے نزدیک ملازمت چھوٹ جانے کا خیال اتنا روح فرسا نہ تھا۔ جتنا عارفہ سے دور ہو جانے کا احساس اذیت ناک تھا۔ اس نے اپنے دوستوں سے مل کر عارفہ کو اغوا کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ سارے انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ لیکن عین وقت پر وہ موقع پر نہ جا سکا۔ یونہی اسے خوف پیدا ہو گیا تھا کہ دوستوں کی دست درازی کی بدولت عارفہ کے نازک جسم پر خراشیں نہ پیدا ہو جائیں۔ یہ بظاہر تو معمولی سا خیال تھا مگر منور کے نزدیک اس نے بہت اہمیت اختیار کر لی تھی۔ وہ تذبذب میں پڑ گیا تھا نہ تو وہ عارفہ کو اپنے سے دور دیکھنا چاہتا تھا اور نہ ہی اسے قریب لا کر اس کے سنگار کو اجاڑنے کا حامی تھا۔ اس نے اپنی بیوہ ماں کو کرم دین کی بیوی کے پاس جانے پر رضامند کر لیا۔ اس دن وہ امید و بیم کے سنگم پر کھڑا کبھی مضطرب ہو جاتا تھا۔ اور کبھی مسکرا پڑتا تھا۔ یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی۔ البتہ اسے عارفہ کے ہونے والے شوہر کا پتہ چل گیا۔ وہ لڑکا بھی ملک صاحب کے پاس کلرک تھا۔ اور کرم دین کی برادری میں سے تھا۔ منور اب اسے عارفہ سے بدظن کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے ڈرایا دھمکایا بھی۔ مگر اس پر منور کی کسی بات نے کوئی اثر نہ کیا۔ نوکری کی تلاش میں گھومتے ہوئے وہ دن میں ایک دو بار ملک صاحب کی کوٹھی کے ارد گرد بھی چکر لگا لیتا تھا۔ اسے وہم سا ہو گیا تھا کہ شاید اب بھی کامیابی کی راہ نکل آئے۔ کرم دین کو جب اس کا علم ہوا تو اس کا خوف پھر اس کے حواس کو دبوچنے لگا۔ ملک صاحب سے پھر اس نے شکایت کر دی۔ ایک دوپہر کو وہ دیوار کے پاس کھڑا پکڑا گیا۔ ملک صاحب نے ڈانٹا۔ "اگر چاہوں تو ابھی پولیس کے حوالے کر دوں۔ مگر میں نہیں چاہتا کہ تمہاری بیوہ ماں سسک سسک کر دم توڑ دے۔ انسان بن کر جینا سیکھو۔ آئندہ کبھی اس طرف دیکھ لیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔" امید کی آخری کرن بھی اس کے سامنے دم توڑ گئی تھی اور وہ کچھ بھی نہ کر سکا تھا۔ ماں کے بار بار مجبور کرنے پر اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس کے پاس بھاری گاڑیاں چلانے کا بھی لائسنس تھا۔ شروع میں وہ جس بس کمپنی میں ملازم رہ چکا تھا وہیں پر اسے دوبارہ نوکری مل گئی۔ وہ عارفہ کو اب بھی نہ بھلا سکا تھا۔ اسی دوران میں جب اسے عارفہ کی شادی کی اطلاع ملی۔ تو وہ دو دن بس نہ چلا سکا تھا۔ سارا وقت گھر میں چھپ کر گزار دیا تھا۔ انتقامی جذبہ اسے بے چین کر دیتی تو نہ جانے کیوں وہ کوئی عملی قدم اٹھانے سے گریز کرتا۔ اس جذبے کو وہ خود بھی نہ جانتا تھا۔ تیسرے دن جب وہ نوکری پر آیا تو وہ برسوں کا مریض دکھائی دیتا تھا۔ اس میں اسٹیرنگ پکڑنے کی بھی سکت نہ رہی تھی۔ کئی دنوں تک دل و دماغ کی جنگ جاری رہی تھی۔ اور بیوہ ماں کی التجاؤں نے آخر کار اسے سنبھالا دے دیا تھا۔ عارفہ کی یاد اب بھی دل میں یوں ابھر آتی تھی جیسے پتھر کو چیر کر جھرنا پھوٹ پڑے اور اب بھی اشتہار میں عورت کی تصویر دیکھ کر اسے بے اختیار عارفہ کی یاد آ گئی تھی اور بس شہر کے بھرے بازار میں سے گزر رہی تھی اور کلینر بار بار اسے یاد دلا رہا تھا کہ ابھی سواریاں کم ہیں۔ پٹرول پمپ کے پاس منور نے بس روک لی۔ ڈھیر ساری سواریاں بس کے انتظار میں کھڑی تھیں۔ کلینر دروازہ سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ "پہلے وہ سواریاں آئیں جنہوں نے آخری منزل تک جانا ہے۔" چار سواریاں جن میں ایک عورت تھی۔ آگے بڑھیں کلینر نیچے اتر آیا۔ منور ونڈ سکرین کے اوپر لگے ہوئے مستطیل شکل کے آئینہ میں سواریوں کو اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھنے لگا۔ دو سواریوں کے بعد ایک خوبرو صحت مند نوجوان اندر داخل ہوا۔ منور نے ایکدم گردن گھما کر پچھلے حصہ کی طرف دیکھا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی

منور کی آنکھیں پھٹنے لگی تھیں۔ اس کی پیشانی پسینے سے تر ہو گئی تھی۔ اس نوجوان کے بعد ایک برقعہ پوش عورت داخل ہو گئی اور منور کو محسوس ہوا۔ جیسے وہ کھولتے ہوئے سیال میں بیٹھا ہو۔ پہلی ہی نظر میں اس نے نوجوان کو پہچان لیا تھا، وہ یوسف تھا۔ ملک صاحب کی فرم میں ملازم کلرک۔ جو عارفہ کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ بس چلاتے ہوئے منور یوں محسوس کرنے لگا جیسے کوئی انگوٹھے سے اس کی شہ رگ دبا رہا ہو۔ "ہو نہ ہو۔ تو شکار خود جال میں پھنس گیا ہے۔ عارفہ کے سامنے کبھی خوشیاں منانے جا رہا ہے۔" اس کا ذہن چکرانے لگا۔ ایک بار جب اس نے آئینہ کی طرف دیکھا تو یوسف سے نظروں کا تصادم ہو گیا۔ اس کے چہرے پر تبسم پھیلا اور اس کا سر جھک گیا۔

منور کو محسوس ہوا کہ یوسف اس کی شکست پر خندہ زن ہے۔ اور اسے ایسی اذیت دے رہا ہے جیسے گرم توے پہ پانی کی بوند چھن سے گر پڑے۔ انتقام کی جلن نے اس کی شریانوں میں زہر بھر دیا۔ اس کے حواس پر اپنا گہرا سایہ ڈال دیا۔ "ہو نہ ہو یہ بہت مسرور ہے۔ اب یہ مزید خوشیوں کا مظاہرہ نہ کر سکے گا۔" ایک خیال حرکت کر کے اس کے ذہن پر غالب ہو گیا۔ اس کا جی چاہا کہ وحشیوں کی مانند قہقہے لگانے لگے۔ سواریاں اپنے اپنے خیال میں مگن تھیں اور منور کی آنکھوں میں دھند سی پھیل رہی تھی۔ اس کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی بوڑھی عورت خوفزدہ آواز میں چلا اٹھی۔ "ارے بیٹا۔ اللہ سلامت رکھے۔ آہستہ لاری چلا۔" منور دانت پیسنے لگا۔ انتقام کی آگ اور تیزی سے بھڑک اٹھی تھی۔ "اب یہ بچ کر نہیں جا سکتا۔ اس کا حلیہ بگڑ جائے گا۔ اس کی جوانی جھلس جائے گی۔" بس کی رفتار اور تیز ہو گئی تھی۔ بوڑھی عورت پھر چلائی۔ "ارے بیٹا، خدا رسول کا واسطہ۔" منور نے آئینہ میں بوڑھی عورت کے چہرے کی دھڑکتی ہوئی جھریوں کی طرف دیکھا۔ اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی جوان عورت بچے کو سینے سے چمٹائے زرد ہو رہی تھی۔ منور نے غیر شعوری طور پر رفتار کم کر دی۔ اس کا جی چاہنے لگا کہ خدا کرے ٹائر اڑ ہی ٹوٹ جائے۔ اور بس کسی درخت کے ساتھ ٹکرا جائے۔ منور سے ٹکرائے کہ یوسف کی زندگی کا سارا حسن چھن جائے۔ اس کا سانس دھونکنی کی مانند چلنے لگا تھا۔ دوسری سواریوں کو بھی موت کا خدشہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ چہ میگوئیاں کرنے لگی تھیں۔ بوڑھی عورت نے نرم لہجہ میں کہا: "اے بیٹا! ماں صدقے۔ لاری چلاتے وقت دوسروں کا بھی خیال کر لیا کر۔ دو منٹ دیر سے پہنچ جائیں گے۔ تو کوئی حشر تو نہ ٹوٹ پڑے گا اور اگر تیز چلانے سے کوئی حادثہ ہو جائے تو اتنی ساری جانوں کا کیا بنے گا۔" "اتنی ساری جانیں!" پہلی بار منور کو احساس ہوا کہ یوسف کے علاوہ بس میں کوئی اور بھی ہے۔ اتنے مسافر، جھریاں، چاہت اور بے شمار تمناؤں کے ساتھ اپنی اپنی منزل پر پہنچنے کے منتظر۔ کوئی بیٹا! کوئی بھائی! کوئی ماں! کوئی باپ، اتنے سارے لوگ۔ اتنے سارے ارمان، امنگیں، ولولے۔ "تو کیا یہ سب ختم ہو جائیں گے؟" اس کے بدن میں جھرجھری سی پھیل گئی۔ "تم تو عارفہ کے جسم پر ہلکی سی خراش بھی برداشت نہ کر سکتے تھے؟" اس نے سر کو جھٹک کر آئینہ کی طرف دیکھا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی جوان عورت کی گود میں کھیلتا ہوا بچہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ "رقیب یوسف نہیں۔ تم خود ہو۔ جو چیز حاصل نہ ہو سکے اسے توڑ دینا کہاں کا انصاف ہے۔ زندگی کا معیار کیا یہی ہے کہ جس تک رسائی نہ ہو اسے مٹا دیا جائے۔" اس کی سوچ میں بھنور پڑنے لگے تھے۔ "مجھے کیا ہو گیا تھا؟ مجھے کیا ہو رہا ہے؟ عارفہ کو مجھ سے نفرت تھی اسے اپنا کر بھی میں خوش نہ رہ سکتا تھا۔" اس نے بائیں ہتھیلی سے آنکھوں کو صاف کیا۔ دھندلکے مٹ گئے تھے۔ گہرا سانس بھر کر اس نے پھیلے ہوئے رستہ پر نظر ڈالی۔ مسافروں کے چہروں پر اب سکون تھا۔ بوڑھی عورت اسے دعائیں دے رہی تھی۔ اس کے پاس بیٹھی ہوئی عورت کے ہاتھوں میں بچہ اچھل رہا تھا۔ بچے نے آئینہ کی طرف ہاتھ بڑھا کر منور کو ہنسی کا انمول تحفہ دیا۔ اور منور کو دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے ایک نئے منور کے جسم پر ہر طرف رنگ برنگی روشنیاں ناچ رہی ہیں۔

عطیہ پروین

نگارش کراچی

کوئی بھی منزل نہ ملی!

"ہائے ہے! جیسے جبراتی فقیر ہو!" آپا نے ریمارک پاس کیا۔ اور نشو کھلکھلا کر ہنسی تو حجاب کے اندھیرے خواب میں ڈوبی ہوئی سمی چونک پڑی۔

"توبہ ہے نشو! ہزار بار کہا خدا نیچے ہنسا کرو" ناگواری سے منہ بنا کر اس نے کہا۔ مگر نشو بدستور حلق پھاڑ کر ہنستی رہی۔

آپا نے اسے مخاطب پایا تو پھر اپنی بات دہرائی۔

"ہائے ہے! جیسے جبراتی فقیر ہو!" ان کے اشارے پر سمی کی نظر نے لپک کر دروازہ چھو لیا۔

"مہتاب تیرا چہرہ! کس خواب میں دیکھا تھا.....؟" سمی کا دماغ جھنجھنا اٹھا۔ وہ سب کچھ بھول سکتی ہے لیکن یہ آنکھیں.....؟؟؟ سفید چہرہ! روکھے روکھے ٹوکلا بھرا بال۔ کالا ڈھیلا ڈھالا پھر پھراتا ہوا کرتہ! تنگ موری کا پائجامہ، ان سب میں نمایاں دو بڑی بڑی بھیگیں آنکھیں جو ٹکر ٹکر دیکھے جا رہی تھیں، کبھی اسے کبھی ہنستی ہوئی نشو کو اور کبھی ناک بھویں چڑھاتی ہوئی آپا کو۔

"یہ کون ہے آخر اللہ مارا اندھا؟" اماں بڑبڑا کر چیخیں۔ "پردہ دار گھر میں یوں اونٹ کی طرح گردن اٹھائے چلا آیا....."

"مارو اس جانگلو کو!" نشو نے آستین چڑھاتے ہوئے ڈپٹ کر کہا۔

سہمی سہمی آنکھیں گھبرا کر جھک گئیں۔ پتلے لب کپکپائے۔ سمی کے ذہن میں کوندے لپک رہے تھے۔

"مہتاب تیرا چہرہ.....اور تو کون ہے؟ میں کون ہوں؟"

"ارے آگ لگے تیری صورت کو! رکتے جا موئے کاٹے ....." بوا جھاڑو پکڑ کر دوڑیں۔ اور وہ بے بس ہو کر بجلی کی مانند مڑا ہی تھا۔ کہ سمی بے تحاشا چلا پڑی۔

"رک جاؤ بوا! یہ کیا بے ہودگی ہے...."

"یہ تو اپنا یوسف ہے نگی ....." بھائی جان تیزی سے اندر آکر بولے۔ انہوں نے ایک ہاتھ سے اس کا بازو پکڑ کر گھسیٹا۔ "اپنا یوسف چچا فراز والا۔" "چچا فراز والا!" شائیں سے کوئی چیز سمی کے کان کے پاس سے گزر گئی۔ پلٹ کر اس نے دیکھا۔ یوسف نے شیشے کی گولی غلیل میں رکھ کر چلائی تھی۔ "اور اگر لگ جاتی تو ....؟" وہ یوسف کو کھانے دوڑی۔

"نہیں نہیں! کیسے پڑ جاتی سمی بیری!" یوسف سہم کر بولا۔ "میرا نشانہ اتنا کچا نہیں ہے۔"

"فرض کرو چوک جاتا تب!"

"کیسے فرض کروں؟ ..." وہ دھیرے سے کہتا اور سمیٰ آنکھیں نکال کر کہتی۔

"نہیں کرو فرض ...؟"

"اچھا بابا! غلطی ہوئی۔" یوسف بے بس ہو جاتا۔ "یہ تو غلیل اور یہ گولی، مار دو مجھے!" ...

"بے وقوف!" سمیٰ تمکنت سے مسکراتی اور یوسف اس آتش نشاں کو تکتا ہی رہ جاتا۔ دبلا پتلا سہما سہما یوسف! جسے پیار میں سب سنّی پکارتے تھے۔ گدرائے بدن کی گہرے سلونے رنگ کی سلمہ بانو، پیاری سی گڑیا جیسی، لمبی تڑنگی گھٹنوں تک پائینچے چڑھائے آپا نکہت، ناک بہاتی نشو، سیاہ فام کلو۔ اور جامنی رنگت والی کلثومن یہ چچا فراز کا خوبصورت باغیچہ اور دلچسپ کھیل! ہائے کیا دن تھے وہ بھی!

"باغوں میں ہم آتے ہیں، کس کو لینے آتے ہیں؟ ... تم کو لینے آتے ہیں ....!"

اُفّوہ! کیسا پیارا کھیل تھا۔ بیچوں بیچ زمین پر کوئلہ کی لکیر کھینچ دی۔ ایک طرف آپا نکہت پروین نشو اور سنّی، دوسری جانب سمیٰ، کلثومن، کلّو اور انجم ایک پارٹی کا کوئی فرد لکیر کے پاس آکر بڑی دُھن کے ساتھ مخالف پارٹی سے کہتا۔ "باغوں میں ہم آتے ہیں!"

دوسری طرف سے سب یک زبان ہو کر اسی دھن میں پوچھتے۔ "کس کو لینے آتے ہو؟"

جس کو لینا ہوتا اس کا نام لے کر کہا جاتا۔ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑتے اور قوت آزمائی کرتے جو کمزور پڑ جاتا وہ کھنچ کر دوسری پارٹی میں داخل کر لیا جاتا، فاتح پارٹی شور مچاتی، تالیاں بجاتی، دوسری طرف والوں کے منہ اتر جاتے ــــ اور یہ یوسف یعنی سنّی، اللہ کی قسم دیکھنے میں سوکھا پتہ لگتا، ذرا تیز ہوا چلے تو دس گز دور جا کر گرے۔ مگر کھیل میں اسکو جانے کہاں سے طاقت آجاتی کہ جم کر کھڑا ہو جاتا، کھینچنے والا پسینہ پسینہ ہو جاتا، مگر کیا مجال جو اسے جنبش بھی ہو۔ اپنی پارٹی مضبوط بناتا چلا جاتا۔ آخر میں صرف سمیٰ رہ جاتی ــ اور وہ جس وقت خم ٹھونک کر میدان میں اترتی سنّی میاں کی سٹّی گم ــ ساری اکڑفوں ختم ہو جاتی ــ

"دیکھوں اب رستم پہلوان کو؟" سمیٰ دلیری سے اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں جھانکتی۔ سنّی بوکھلا کر اپنی آنکھیں نیچی کر لیتا یا ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ہاتھ پھیلا دیتا۔ پتلی کلائی پر سمیٰ اپنا گٹھا ہوا سانولا ہاتھ رکھتی اور "یا علی مدد" کہہ کر جو زور لگاتی، سنّی ایک جھٹکے سے اس کی پارٹی میں آگرتا۔ اللہ وہ ادھم اٹھتا۔ کہ توبہ بھلی۔ آپا نکہت روٹھی ہو کر کہتیں۔

"میں جانتی ہوں۔ دونوں کی ملی بھگت ہے سنّی جان بوجھ کر کھنچ جاتا ہے"

حالانکہ سنّی قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتا۔ کہ ایسا نہیں ہے وہ عمداً مات نہیں کھاتا ہے اب اس کا کیا علاج سمیٰ ہر بار اسے مات کھلا دیتی ہے۔

سمیٰ شریر، ضدی، بے باک اور انتہائی غصہ ور تھی!! ــ اس کے نزدیک سنّی محض ایک مرغی چھوکرا تھا۔ اس سے چھ سال بڑا ہوتے ہوئے بھی چھ سال چھوٹا لگتا۔ پتلا دبلا ناٹے قد کا شرمیلا سنّی اور گدازبدن کی انتہائی غصہ ور اور ــ بے باک سمیٰ! سنّی تو سمیٰ کے آگے بس بھیگی بلی ہی بنا رہتا۔ وہ اسے چاہے مارے یا توڑے، مذاق اڑائے، الو اور الّو بنائے، مجال کیا جو منہ سے بھاپ بھی نکالے۔ سمیٰ نت نئے احکام لگایا کرتی۔ اور وہ اس کے اشارے پر یوں ناچتا، جیسے زرخرید غلام اور زرخرید غلام ــ یہ خطاب انجم بھائی نے دیا تھا۔ اور اس زمانے میں سمیٰ فخریہ لہجے میں سنّی سے کہتی۔ "ارے تم تو میرے زرخرید غلام ہو، ذرا سوں چوں کی اور ننگی پیٹھ پر بیسیوں کوڑے لگائے!"

سنّی اس کی اس تلخ بات کو شہد کے گھونٹ کی طرح نگل جاتا اور ایسی ادا سے مسکراتا کہ بس!!

ایک بار کھیل ہی کھیل میں سمیٰ نے سنّی کی کلائی پر جھپٹا مار کر کہا۔

"بے تاسنّی! اگر میں پوری طاقت سے تمہارے بکوٹا بھر لوں تو تم کیا کرو گے؟"

"چپ رہوں گا!" سنّی نے ملائمت سے جواب دیا۔

"اور جو مر ہو گا تب ؟"

"پھر بھی چپ رہوں گا !"

"آخر کیوں ؟" سمی کے معصوم ذہن نے کریدا۔

"جانے کیوں ! میں خود نہیں جانتا۔ جانے کیوں !!" سنی نے بے چارگی سے کہا اور سمی جھٹ پوری طاقت سے بھینچ کر سنی کی کلائی میں چٹکی بھری۔ سنی نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے داب لیا۔ لیکن جنبش نہیں کی۔

"اور زور سے ؟" سمی نے بیدردی سے کہا۔

"جتنا جی چاہے !"

سمی نے پوری طاقت لگا دی۔ سنی کی بڑی بڑی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ مگر منہ سے اف بھی نہ نکلی۔ سمی نے کھسیا کر ہاتھ ہٹا لیا۔

"توبہ ہے سنی تم تو جیسے پتھر کے ہو !"

سنی نے اپنی کلائی کی طرف دیکھا۔ ناخنوں کے بڑے گہرے نشان پڑ گئے تھے، چھوٹا سا دائرہ، جس کے کنارے اب نیلاہٹ کے بجائے، سرخی جھلکا رہے تھے۔

"ہائے ! خون نکل آیا !" سمی سہم کر بولی تو سنی نے اُسے تسلی دی۔ "ڈرو مت ! بھیگا کپڑا باندھ لوں گا۔ ٹھیک ہو جائے گا۔"

مگر وہ زخم ٹھیک نہیں ہوا۔ برسات کا زمانہ تھا۔ اور وہ ناخن کا خشگاف ! جلد ہی دن میں پک کر مواد پڑ گیا۔ علاج ہوا، مہینے بھر تک پٹی باندھے گھومتا رہا لیکن کیا مجال جو سنی نے کسی وقت بھی تکلیف کا اظہار کیا ہو۔ اماں سے بہانہ بنا دیا کہ یس کھیلتے ہوئے شیشہ لگ گیا تھا۔ بس آپا اور کلثوم جانتی تھی۔ کہ یہ سمی کی کارستانی ہے۔ جب پٹی اتری تو سنی کی کلائی پر چھلّے جیسا خوب گہرا داغ بن گیا تھا۔ جو بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ نمایاں ہوتا رہا۔ جب سنی چھٹیوں میں لکھنؤ آتا۔ تو پان دیتے وقت، ناشتہ یا کھانا کھاتے وقت یا نہانے کے لئے قمیض اتارتے وقت سمی کی نظر اس کی کلائی پر پڑتی۔ وہ نشان اب بے حد شوخ ہو گیا تھا...... اس کی بچپن کی شوخیوں کی مانند۔ ایکبار دھیرے سے ہنستے اور دھیرے دھیرے پلکیں اوپر اٹھاتے ہوئے سنی نے دھیرے سے سمی سے کہا۔ "سمی تم نے جو داغ دیا ہے مجھے ...... وہ ہر دم مجھے تمہاری یاد دلاتا رہتا ہے ...."

"چلو کبھی وقت سے پہلے کنگنا باندھ دیا میں نے !" وہ ہنس کر بولی تو جانے کیوں سنی کی آنکھیں جگمگا اٹھیں۔ اور جب تک وہ دونوں ساتھ رہتے سنی کی آنکھیں یوں ہی روشنی اگلا کرتیں۔ لیکن اِدھر سنی کا سامان بندھا اور اُدھر اس کی آنکھیں تاریک ہو گئیں۔

سمی سے وداع ہوتے وقت وہ روہانسا ہو جاتا۔ "کمال ہے سنی !" سمی مذاق اڑانے لگتی۔ "اچھے خاصے ڈھو ایسے مردوئے کیسا عورتوں کی طرح روتے ہو۔ مجھے دیکھو۔ کوئی مر بھی جائے تو آنکھ نہ بھیگے !" "خدا سمجھے تجھے ! موئی بیدرد، سنگدل ! دیکھو تو کس دیدہ دلیری سے کہہ ہی ہے کہ کوئی ...." اماں بکنے لگتیں۔ اور سمی نقرائی ہنسی بکھیرتی ہرنی کی مانند قلانچیں لگا کر یہ جا وہ جا۔

سنی دیکھتا ہی رہ جاتا۔ مڑ مڑ کر جب تک دروازہ نظر آتا دیکھتا رہتا، پر سمی ساری باتوں سے بے نیاز آپا کے بچوں کے ساتھ کہیں کونے کھدرے میں چھپی چھلی چھلیا کھیل رہی ہوتی۔ یا دولہا بھائی کے ہارمونیم پہ لیٹے سیدھے ہاتھ مار کر فلمی گیتوں کی گردن مار رہی ہوتی۔ کچھ بھی کرتی بہرحال وہ وہاں نہ ہوتی، جہاں سنی کی مشتاق نگاہیں پھر پھر کر دیکھتیں۔ اسے تو سنی کے جانے کا اتنا بھی دکھ نہ ہوتا۔ جتنا اپنے بلّا چندا کے کہیں بھٹک جانے کا۔

آپا نکہت کہتی تھیں۔ "سمی جتنی سخت دل اللہ نہ کرے کوئی لڑکی ہو !" ان کو جس قدر سنی کی مسکینیت پہ پیار آتا۔ اتنا ہی سمی جل اٹھتی۔

"اللہ توبہ ایسی رونی صورت مردوں کو دیکھ کر تو مجھے جلن چھوٹتی ہے۔ جب [illegible] تب ریں ریں ! کیا مجال جو کھُل کر ہنسے، کھُل کر بات کرے۔ یہ بھلا مردوے کی شان ہے .... ایک دولہا بھائی ہیں، ایک وہ پرویز ہیں ..... کیسے اچھے لگتے ہیں۔ !" ایک روز دیکھتے ہی دیکھتے سنی کی کلائی کے

اس طرح کنگنا بندھ گیا۔ نصرو، ناچے کا دوپٹہ اوڑھے، لہک لہک کر سمی نے گیت گائے کنگنا باندھنے کا وقت آیا تو نفیس کے ہاتھ سے چھین کر بھی۔ اور جگ مگ جگ مگ کرتا ہوا۔ کنگنا سنی کی کلائی پر بندھ گیا۔ سنی سر جھکائے چوکی پر بیٹھا تھا۔ جیسے ہی کھل کھل کرتی ہوئی سمی نے اس کی کلائی تھامی۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ اس کے چہرے پر دنیا بھر کی مایوسیاں سمٹ آئی تھیں۔ بڑی بڑی آنکھوں میں اداسی کا غبار بھر گیا تھا۔ اس نے دھواں دھواں سمی کی طرف دیکھا۔ پتلے پتلے لب کانپے، کنگنے والا ہاتھ لرزا۔ اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔

پھوٹ پھوٹ کر ——— بالکل بچے کی مانند ——— معصوم بچے کی طرح بلک پڑا وہ۔

سمی کو برا لگ گیا۔ "لو اور سنو! اتنا مبارک دن اور ٹسوے بہانے بیٹھ گئے۔" سنی نے ایسی شکوہ بھری نظروں سے اسے دیکھا کہ بقول نشو اگر پتھر بھی ہوتا تو پسیج جاتا۔ مگر یہ سمی، ہائے اسی نے تو جیسے اپنے ہاتھ کا بے پایاں کھلونا اپنی بے پیاری دوست جمالہ کو دے ڈالا تھا۔ سچ مچ اس نے دے ڈالا تھا بیش قیمت کھلونے کو، جانے کیوں اس نے قدر نہ کی اس کی!!

سنی پھوٹ پھوٹ کر سسکیاں بھر بھر کر رونے لگا۔ اس نے سمی کی درشتی پر ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ لیکن آنسوؤں کے سیلاب اور چہرے کی بے تحاشا اداسی میں بڑے خاموش شکوے تھے۔

سمی منہ سکوڑ کر الگ جا کھڑی ہوئی۔ پھر اس نے روتے ہوئے سنی کی طرف اشارہ کر کے انجم، رقیہ، گلشن اور پرویز سے سرگوشی کی۔

"ذرا دیکھو تو اس ننھے چوزے کو! دنیا سے نرالا مرد دیکھا ہیں نے۔ لوگ ایسے موقع پر کیسا خوش ہوتے ہیں۔ ظاہر نہ کریں مگر دل میں من من بھر کے لڈو پھوڑا کرتے ہیں۔ اس سے تو اچھا تھا۔ یہ لڑکی ہوتا۔"

سب کی سب کھلکھلا کر جو ہنسیں تو سنی نے نیچی نیچی نظروں سے ادھر دیکھا اور پھر سمی کے تھرکتے ہوئے سفید سینڈل پر نظر جما کر اس نے نچلا ہونٹ، دانت تلے دبا لیا۔ "یہ ہونٹ کاٹنے کی عادت نہیں جائے گی اس سنی کی۔" سمی ہنسی روک کر بولی۔ "مجھے تو ڈر لگتا ہے کٹ کر گر نہ پڑیں۔ یہ نازک لونڈیوں جیسے لب!"

اور سنی قہقہوں کی بوچھار میں شرابور ہو کر اور سراسیمہ ہو گیا۔

جس روز برات جا رہی تھی۔ تو سنی کو زبردستی پکڑ کر چوکے پر بٹھایا گیا۔ اور دولہا بھائی چم چم کرتا خلعت پہنا کر سرخ صافہ باندھنے لگے تو سمی کو پہلی بار اس معصوم صورت سنی پر بے ساختہ پیار آ گیا۔ ایسا سہما ہوا بیٹھا تھا۔ جیسے ننھا سا بچہ، وہی مسکین چہرہ، جھکی جھکی آنکھیں، لرزتے ہوئے ہونٹ، اور آئینہ کی مانند چمکتی ہوئی پیشانی!

"اے دولہا کی بہن کہاں گئیں؟" خالہ جانی نے آواز لگائی۔ "بلائیں تو لو آ کر بھائی کی!"

نفیس اپنے بچے کو دودھ پلانے لگی تھی۔ اور انیس کو بوڑھیوں کی طرح چٹ چٹ بلائیں لیتے شرم لگ رہی تھی۔

"ہٹو ادھر، میں لوں گی اس گڈے کی بلائیں!" سمی مچل کر دوڑی تو ایک قہقہہ اڑا اور دولہا بھائی بولے۔

"اب کہاں رہا تمہارا گڈا! اس کو الگ ایک گڑیا مل گئی۔"

"کچھ بھی ہو رہے گا میرا ہی ....." سمی سنی کے آگے دو زانو ہو گئی!

سرخ ریشمی چوڑیوں سے بھری ہوئی کلائیاں سنی کے چہرے کے قریب آ گئی ہی تھیں۔ کہ سنی نے مہکتا ہوا سہرہ ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔ سمی رک گئی۔

"کیوں دولہا میاں ایسی بے غیرتی ....."

مگر سنی نے آنکھیں نہیں جھکائیں۔ اس نے پہلی بار بڑی بے باکی سے سمی کی آنکھوں میں جھانکا۔ سمی کے سارے جسم میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔ عجیب سی لہر ..... عجیب سی کپکپاہٹ ——— جانے یہ کیا ہو رہا ہے اس نے سنی کی طرف دیکھا ..... وہ بڑی بڑی آنکھیں جو شدت گریہ سے سوجی

کر اور بھی خوبصورت ہو گئی تھیں۔ لال لال ڈورے والی یہ آنکھیں، سمی کی کاجل بھری شربتی نگاہوں میں پیوست ہو کر رہ گئیں۔

اُف جانے کیا تھا ان آنکھوں میں! یہ کیسی اداسی تھی۔ یہ کیسی شکایت تھی...... دن رات کی دیکھی بھالی آنکھیں، کیسی اجنبی اجنبی سی لگ رہی تھیں۔ سمی ان کی گہری جھیلوں میں ڈوب کر رہ گئی۔

"اللہ اتنی پیاری ہیں اس سنی کی آنکھیں......" کچھ دیر قبل کی یہ بات، سمی کے کان کے پاس سرگوشیاں کرنے لگی۔ یہ بات پروین نے کہہ کر جانے کیوں بڑی ٹھنڈی سانس بھری تھی۔

شاید زندگی میں پہلی بار سمی نے جھجک کر اپنی نظر نیچی کر لی۔ اس کا دل ڈولنے لگا۔ سنی کے چہرے کے گرد ہالہ کئے ہوئے تھا پھر تھا اس نے ہٹا لئے اور تیزی سے گھوم کر غائب ہو گئی۔ سب پکارتے رہے! ہنستے رہے مگر وہ ایسی بھاگی کہ پھر سنی کے سامنے ہی نہیں آئی۔ جھم جھم کرتی بارات دلہن لینے چلی گئی۔ خاندان بھر کی لڑکیاں کوٹھے چڑھی دیکھ رہی تھی۔ دروازے پر عورتوں کا جمگھٹا تھا۔ لیکن سمی کا کہیں بھی پتہ نہ تھا۔ کلثوم نے ہر جگہ ڈھونڈ ڈالا۔ ہر لڑکی کو جھانک جھانک کر دیکھا۔ چیخ چیخ کر آوازیں لگائیں۔ کونہ کونہ دیکھ ڈالا۔ مگر کہیں نہ ملی۔ کلثوم گھبرا کر اماں سے کہنے دوڑی۔ بیچ میں سنی کا کمرہ پڑ گیا۔ جگ مگ جگ مگ کرتا ہوا۔ دلہن بنا کمرہ۔ صبح ہی سمی، انجم، پروین اور کلثوم نے مل کر سنوارا تھا۔

سمی بڑے چاؤ سے مسہری پر ریشمی تکیہ لگا رہی تھی۔ اور بڑے مزے سے گنگناتی جا رہی تھی۔ گلابی ریشمی شلوار دوپٹہ میں لپٹی ہوئی سلونی گداز شربتی چہرے والی سمی۔ سنی کا ایک پیر دہلیز کے اندر تھا۔ ایک باہر کہ وہ پتھر کی طرح جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔ اس کی آنکھیں سمی پر جم کر رہ گئیں۔ جو بڑے چاؤ سے اس کی سہاگ کی مسہری سنوار رہی تھی۔ انجم کے ہنسنے پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

جھینپا جھینپا، سہما سہما، کھویا ہوا سنی! شکنیں پڑا ململ کا کرتہ، ہاتھ میں مہندی، کلائی پر کنگنا بکھرے ہوئے بال!

"جانے کیوں اتنا پیارا لگ رہا ہے" سمی نے گردن کے گرد لپٹ جانے والی چوٹی کو پشت پر جھٹکتے ہوئے سوچا۔

"معائنہ کرنے آئے ہیں سنی بھیا" انجم نے ہنس کر سمی سے کہا۔

"ہیں! ہیں! نہیں تو ......" سنی بوکھلا کر بولا۔ "سینہ پر ملنے والی دوائی لینے آیا تھا۔ کہاں رکھدی تم نے؟" اس نے سمی سے آنکھ چرا کر کلثوم سے پوچھا۔

"سمی بٹیا نے رکھی ہے بھیا"

سنی نے سمی کی طرف دیکھا۔ تو سمی نے تیزی کے ساتھ لیکن محبت آمیز لہجہ میں پوچھا۔ "کیوں؟ درد کیا ہو گی؟"

"پھر درد معلوم ہو رہا ہے سینہ میں ......" اس نے بڑے کرب سے ہونٹ بھینچ لئے۔

"یہ آخر نعوذ روز درد کیسا ہونے لگتا ہے؟" نجمہ سنجیدہ ہو کر بولی۔ "سنی بھیا علاج کر دو جم کر یہ روز روز کا دکھ......"

"روز روز کا دکھ!" سنی تڑپ گیا۔ "ہاں نجمہ! عاجز آ گیا ہوں اس روز روز کے درد سے!"

"جانے کیوں یہ نامراد مرض لگ گیا تم کو" سمی میز کی دراز سے شیشی نکال لائی۔ "کہاں پر ہوتا ہے؟"

"یہاں دل میں!" سنی نے گلوگیر لہجے میں سینہ پر دل کے قریب ہاتھ رکھ کر بتایا۔ "آج تو ایسی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں جیسے دم ہی لے کر رہیں گی"

"ہے ہے اللہ نہ کرے" سمی نے بگڑ کر کہا۔ "خبردار جو اب ایسی بدفالی نکالی زبان سے!"

سنی کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ رینگ گئی بڑی حسرت سے اس نے سمی کی طرف دیکھا۔ شیشی لی اور چپ چاپ سر نہوڑائے چلا گیا۔

"عجیب پگلا آدمی ہے" سمی الجھ کر بولی۔ "مجھے تو ڈر ہے کہ میری بھابی کی زندگی نہ اجیرن کر دے ...... ہاں اور کیا......!"

یہ تو سمی کو بعد میں معلوم ہوا۔ کہ سنی شیشی محض اُسے دکھانے کو لے گیا تھا۔ دوا نہیں لگائی۔ اور درد کے مارے تڑپتا رہا۔ بس جل بھی کر رہ گئی وہ!۔

سنی کو ڈانٹنے کا موقع نہ مل سکا۔ ورنہ وہ تو خار کھائے بیٹھی تھی۔

بس جس وقت وہ دولہا بنا اس وقت سامنا ہوا۔ اور وہ بھی یوں کہ سمی سنی کی آنسوؤں سے لبریز، سوجی ہوئی سرخ آنکھوں میں نامعلوم درد کی اس واضح تکلیف اور اس خوشی کے موقع پر اس قدر ویرانی دیکھ کر دل میں ایک عجیب سی خلش لے کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ اس کی ہمت نہ پڑی۔ کہ وہ پھر سنی کے سامنے جائے اور اس کی آنکھوں کو دیکھے۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا۔ کہ وہ اس دبلے پتلے خاموش مسکین صورت والے سنی سے یوں مرعوب ہوگئی تھی۔ پہلی بار اس نے اس طرح جھک کر اپنی آنکھیں جھکالی تھیں۔ یہ کیا تھا آخر؟ یہ سب کیا ہو رہا تھا، یہ کیسی کسک تھی۔ جو رہ رہ کر اس کے سینہ میں اُٹھ رہی تھی۔ یہ کیسی کپکپاہٹ تھی جو اس کے سارے جسم میں دوڑ گئی تھی، یہ رہ رہ کر سنی کی اداس آنکھیں کیوں اسے یاد آ رہی تھیں، گھر کا یہ ہنگامہ، یہ سہانے گیت، یہ قہقہے سب ایکدم کیوں پھیکے پڑ گئے تھے۔ کیا تھا یہ آخر! یہ سب کیا ہو رہا تھا اسے؟

وہ سنی کے کمرے میں گھس کر سنی کی مسہری پر گر کر سہاگ کے سرخ معطر تکیوں میں منہ دیکر بے اختیار پھپک پھپک کر رونے لگی بے اختیار ..... وہ خود نہیں جانتی تھی کیوں رو رہی ہے، بس آنسو تھے کہ بہے چلے جا رہے تھے۔ دل تھا کہ نیچے ہی نیچے بیٹھا جا رہا تھا۔ کلثومن نے گلابی پردہ ہٹا کر دیکھا۔

"سمی بٹیا!"

سمی نے چونک کر سر اٹھایا۔ اس کھلنڈری گڑیا کی شریر آنکھوں میں آنسو اور چہرہ پر اداسی کی ریکھائیں دیکھ کر کلثومن حیران رہ گئی۔

"کیا ہوا ہی بٹیا! .... رو کیوں رہی ہو؟"

"کچھ نہیں کلثومن! کچھ نہیں!" سمی نے تڑپ کر اپنے ہونٹ کاٹ لئے۔

"کچھ تو ضرور ہے!" کلثومن بے قرار ہو گئی۔ "یہ آنسو تو بلاوجہ نہیں ہیں بٹیا!"

"آپ ہی آپ رونے کا جی چاہ رہا ہے .... کلثومن .... جانے کیوں؟"

"روئیں تمہارے دشمن! اللہ بی! .... اے مبارک دن نہیں رویا کرتے۔ تم تو سنی بھیا پر غصہ ہوا کرتی تھیں۔ آج خود...."

سمی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پلو سے آنکھیں پونچھیں اور کھڑی ہو کر بولی۔

"چلو، یہاں میرا دم گھٹ رہا ہے۔"

دوسرے روز سنی دلہن بیاہ لایا۔ سرجھاڑ جھنکار لئے میلے کچیلے کپڑے پہنے سمی لپک کر دروازے پر گئی۔ ڈولا ابھی دور تھا۔ بہنوں کے جھرمٹ میں پھنسا سنی الجھ الجھ کر مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"سنی!" ایک دم سمی کے منہ سے نکلا۔ "دلہن بیاہ لائے؟"

سنی نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا ہر دم پھولوں کی طرح کھلا رہنے والا مکھڑا، الجھے بکھرے گیسوؤں کے درمیان، بیاروں کے مانند ستا ہوا نظر آنے لگا تھا۔ یہ کیسا انقلاب تھا...... سنی کے چہرے پر ہزاروں سائے رینگ گئے۔ بے چین ہو کر وہ بڑھا۔ آنچل پھیلا کر نیگ مانگتی ہوئی نفیس اور انیس کو سامنے سے ہٹا کر وہ سمی کے آگے کھڑا ہو گیا۔

سمی نے سر اٹھایا۔ ساری رین کا جاگا بنا۔ پھول عطر اور ابٹن کی خوشبو میں بسے ہوئے کپڑے۔ سنوری بکھری زلفیں۔ مسلی ہوئی اسی بدھی گلے میں، رات کی جاگ کا نشہ آنکھوں میں اور پان کی لالی کی پپڑی لبوں پہ....... اونچا باوقار خوبصورت اور اجنبی سا وجود ...!!

سمی کے سارے بدن میں سن سن کر کے عجیب سی لہریں دوڑ گئیں

"بیکلی سی میری! تم یوں سب سے الگ کیوں کھڑی ہو .... کیا مجھ سے نیگ نہیں مانگو؟"

سمی نے کہنا چاہا "ہاں!" لیکن جانے کس قوت نے زبان کو حرکت دے دی۔

"نہیں!"

سنی ساکت و صامت رہ گیا۔ اس کی گہری گہری آنکھیں سمی کے چہرے پر جم گئیں۔ سمی پریشان ہو کر بولی۔

"سنی! میرا کچھ کھو گیا ہے!"

"کیا؟" سنی گھبرا کر بولا۔

"جانے کیا — مجھے پتہ نہیں۔ بس یوں لگتا ہے میری کوئی بہت ہی قیمتی شے گم ہو گئی ہے۔"

سنی کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ کراہ کر وہیں کھڑے کھڑے ایک دم بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟ سنی بھیا۔ سنی بیٹا! سنی، میرا چاند! میرا لال!" ایک قیامت اٹھ گئی۔ سنی کے سینے میں پھر درد شدید ہو گیا اور اس آہ و بکا میں سہمی سہمی کھڑی سمی سوچ رہی تھی — میرا کیا کھو گیا ہے۔ جس کی مجھے تلاش ہے اور یہ سنی کے سینہ میں کیا شے ہے۔ جو اسے وہ رہ کر تڑپا دیتی ہے۔ سمی کی اس پریشانی کو کوئی بھی دور نہ کر سکا۔ سنی تو اس کے سامنے ہی نہ آتا۔ اور خود سمی کو اب اس کی صورت دیکھ کر دحشت ہونے لگتی۔ وہ ایک دم جیسے بجھ کر رہ گئی۔ اس کی ہنسی، شرارت، تیزی، غصہ اور ضدیں نہ جانے کس کونے میں جا چھپی تھیں۔ اور وہ اپنے سکون کی تلاش میں رواں دواں الجھی گھبرائی گھوما کرتی۔ جاکر ...... اس کی بے حد پیاری سہیلی ...... گوری بھبھوکا، ریشمی کپڑوں اور زیوروں میں لدی پھندی جمالہ بھی اس کے دکھ کو دور نہ کر پائی۔ سمی اس کے پاس جاتی چپ چاپ بیٹھتی۔ اس کی صورت دیکھا کرتی، باتیں سنتی، ادائیں دیکھتی پر خود کچھ نہ بولتی، ہنستی۔ بیٹھے بیٹھے اوبھ جاتی تو خاموشی سے چلی جاتی۔

لوگ حیران تھے ..... عجیب بیماری تھی سمی کی — بڑی بوڑھیوں کا خیال تھا۔ اس پر کسی بری ہوا کا اثر ہو گیا ہے۔ سمی سنتی تو بڑی کھوکھلی ہنسی ہنس دیتی اور بس!

کچھ دن بعد وہ اماں ابا کے ساتھ گھر چلی آئی۔ رخصت ہوتے وقت اس نے سنی کو دیکھا۔ دھیرے سے وہ سمی کے پاس آیا۔ اور ڈوبی ہوئی آواز میں بولا — "سمی! اپنے آپ کو اس طرح زندہ درگور کرنے سے کیا حاصل۔ تم ہمیشہ ہی مجھے کھلونا سمجھ کر کھیلتی رہیں .... تم نے کبھی میرے جذبات کی قدر نہیں کی۔ تم نے کبھی کچھ کہنے کا موقعہ نہیں دیا ...... اور تم ہی نے زندگی بھر تڑپنے اور سلگنے کے لئے اس دنیا میں دھکیل دیا۔ اور آج تم خود اس آگ میں جل رہی ہو۔ تمہاری وہ ہنسی، وہ زندہ دلی کیا ہوئی سمی! اس پھول سے چہرے کی تازگی کہاں گئی .... ان لبوں کی پیاری مسکراہٹ کو کس کی نظر لگ گئی۔ سمی میری! یہ کیا ہو گیا؟ تم نے یہ کیا کر دیا؟ تم یہ کیا کر رہی ہو؟"

اسے اس درجہ کرب کے ساتھ، اس طرح لرز لرز کر، ایسے شکوہ بھرے رونے لہجے میں سنی نے ایک بار اور سمی سے فریاد کی تھی — پر سمی نے اسے جھڑک دیا تھا۔ وہ سنی کی اسراسیمگی کو ایک ادا سمجھی تھی۔ اس نے سنی کو جھڑکا تھا۔ اور پھر منہ چڑا کر بھاگ نکلی تھی۔

سمی کے ذہن کے گوشوں میں سے دھیرے دھیرے کر کے وہ گزری ہوئی باتیں ابھرنے لگیں۔ وہ بچپن کے دن، وہ اماں اور چچا زاد کی سرگوشیاں وہ معنی خیز انداز میں سنی اور سمی کو ایک ساتھ دیکھ کر مسکرانا، اس زمانے میں تو خیر وہ بچہ تھی۔ کیا خاک سمجھتی۔ لیکن جوانی کی سرحد پہ آ کھڑی ہونے کے باوجود اس نے ان باتوں پر کان دھرنے کی زحمت نہ گوارا کی۔ ایک دن کہیں انجم بھیا نے مذاق میں سنی اور سمی کی جوڑی کو بنا رہنے کی دعا دے دی تھی تو سمی نے سب کے سامنے ہی انگوٹھا دکھا کر منہ بچکا دیا تھا۔

"اے ہے انجم بھیا! کمال کرتے ہیں آپ! اس مٹی کے مادھو سے تو میں پانی بھی نہ بھرواؤں گی!"

اس کی اس صفائی پر اور تو سب ہنس پڑے۔ لیکن سنی کے چہرے پر اداسی مظلومیت چھا گئی۔ اس نے چپکے سے سمی کو دیکھنا چاہا۔ پر سمی کی تیز نظروں سے گھبرا کر وہ صحن میں دوڑتے بھاگتے مرغی کے بچوں کو دیکھنے لگا۔

بچپن کے ساتھیوں میں جمالہ بھی تھی۔ شہزادہ خالہ کی اکلوتی خوبصورت جمالہ! گوری صورت، چم چم کرتا سانچے میں ڈھلا جسم اور ڈھیر بھر ریشم

جیسے طائم بالوں والی جالہ جس کے بارے میں گھر کے لڑکے لڑکیوں کا خیال تھا۔ جنت کی کوئی معافی ہوئی کوئی حور خالہ شہزادہ کے گھر اتر پڑی ہے۔ وہی حسین جالہ سفی کو بڑی عجیب نظروں سے دیکھا کرتی تھی۔ سفی کو دیکھ کر جس کے مکھڑے پر پیارے پیارے رنگ بکھر جایا کرتے تھے۔ سمی نے کئی بار اس کی چوری پکڑی تھی۔ اور جالہ چھوئی موئی کی طرح لپک کر شرما گئی تھی۔ جب کبھی خالہ شہزادہ اس کے گھر آتیں، جالہ ساتھ ہوتی۔ اور جس بار سفی بھی موجود ہوتا۔ سمی کی چاندی ہوجاتی کبھی جالہ کو چھیڑا، کبھی سفی پر فقرے کسے، کبھی زبردستی جالہ کو سرخ دوپٹہ اوڑھا کر دلہن بنانے لگی۔ سفی یہ سب دیکھتا، سنتا اور جب انجم بھیا کی شادی، آپا نگہت کے ساتھ ہوگئی۔ تب چچا فراز نے اماں کو ایک سنہری خط بھیجا۔ سمی اپنے کمرے میں جالہ کے دل کا حال کرید رہی تھی۔

"کیوں تمہیں اتنا اچھا لگتا ہے سفی؟ شادی کرادوں تمہارے ساتھ!"

جالہ خوشی کے مارے دیوانی ہوگئی شرم کے مارے دوہری ہوگئی۔ بڑی دھیمی آواز میں بولی "زندگی بھر تمہارا احسان نہ بھولوں گی سمی!"

"ارے!! تو کیا سچ مچ تم اس احمق پہ اس درجہ واری قربان ہو؟"

"تم کیا جانو وہ کیا ہیں؟ سمی ڈیر!! میرا تو جی چاہتا ہے ان کی آنکھوں کی گہری جھیلوں میں ڈوب......"

"ڈوب مرو......" سمی بات کاٹ کر کھلکھلائی۔ "مجھے کہو یہ کھلونا زندگی بھر کے لئے دے ڈالوں تمہیں......!"

ہائے!!! کس بھولے پن اور ہٹ کے ساتھ اس نے چچا فراز کو خط لکھا۔ جالہ کی ڈھیر سی تعریفیں اور ہزاروں قسمیں....."

جواب میں چچا فراز خود آن پہونچے۔ سفی بھی ہمراہ تھا۔ سمی لپک کر چچا کی گردن میں جھول گئی۔ بڑی سے بڑی خوفناک مونچھوں والے چچا فراز کی بھولی بھالی صورت اور زندگی سے بھرپور مسکراہٹ اسے بچپن ہی سے بھاتی اور چچا فراز بھی سمی پر کچھ زیادہ ہی شفقت کرتے تھے۔ سمی اور سفی کو ایک ساتھ دیکھ کر ان کی آنکھیں چمک اٹھتی تھیں۔ ان کے لبوں پر بڑی پیاری مسرت و محبت سے بھرپور مسکراہٹ کھیلنے لگتی تھی۔ اور ان کی شفقتوں سے سمی کو یقین تھا۔ کہ اس کی نہیں ٹالیں گے۔ ناشتہ اور چائے کے بعد سمی اور سفی کو پکڑ کر اپنے کمرے میں دھکیل آئی سفی کے احتجاج کے باوجود اس نے اوپر سے کنڈی چڑھالی۔ پھر وہ بڑے بوڑھے انداز میں چچا کے پاس بیٹھ گئی۔ چچا کچھ متفکر تھے۔ اور اماں چپ تھیں اور بھائی جان کے چہرے پر برہمی کے آثار تھے۔ سمی نے دو تین بار تعجب سے اپنی آنکھیں جھپکائیں۔ اور پھر چچا فراز سے جڑ کر بیٹھ گئی۔ چچا نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر محبت آمیز لہجہ میں کہا۔

"یہ آخر تم نے مجھے کیا لکھ مارا تھا بیٹی؟"

"لکھ مارا تھا......... واہ نیکی کا پھل....." سمی تنک کر بولی۔ "میں نے تو اتنی اچھی بات لکھی اور آپ کہتے ہیں..... واہ چچا جان!"

"مگر بیٹی....... یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ......"

"ہو کیسے نہیں سکتا....." وہ اچھل کر کہنے لگی۔ "ارے چچا جان پیارے......... یوں چٹکی بجاتے ہوسکتا ہے یوں....." اس نے چٹکی بجائی اور چپ چاپ ہوکر چچا سر کھجانے لگے۔ ان کی پیشانی پر سوچ بچار کی موٹی موٹی سلوٹیں ابھر آئی تھیں۔ "کیوں چپ کیوں ہوگئے چچا جان!" سمی نے ٹھنک کر کہا۔ "ہڈی میں ہڈی اور خون میں خون ملا ہے۔ کیا برائی ہے آخر، میری جالہ اتنی پیاری تو ہے۔ سفی کا جوڑ بھی خوب رہے گا۔"

"لیکن سفی تو....." چچا الجھے۔ "سفی جو نہیں چاہتا ہے"۔

"کیا؟" سمی آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ "سفی نہیں چاہتا؟ وہ سدا کا احمق ہے چچا جان۔ اس کی فکر نہ کیجئے!" اور پھر اس نے مرغی کی ایک ٹانگ پکڑلی۔ "ہائے چچا دیکھئے نہ کتنی پیاری ہے میری جالہ۔ خوبصورت! خوب سیرت..... گھر کی لڑکی گھر ہی میں آئے گی۔ اور میں موتی کا سہرا پڑھوں گی

"ایک ہی باغ سے دو پھول چنے تم نے"

اپنے ہی گھر میں ملا اپنے ہی گھر کا سہرا"

"پاگل ہے" بھائی جان نے جھنجھلا کر کہا۔ اس نے منہ بسور کر بھائی جان کو دیکھا۔ پھر اماں کو دیکھا جو جلدی جلدی چھالیہ پھانک رہی تھیں۔
"دیکھتی ہیں اماں! یہ بھائی جان مجھ سے بیکار کو جھگڑ رہے ہیں۔"
"تم ہمارا ہمیشہ یونہی ننھی چندہ ہی رہنا۔" اماں جیسے بھری بیٹھی تھیں۔ "یہ آخر جمالہ کی سگی بہن کو نسبت قرابت کرنے کس کے کہنے سے بیٹھ گئی تو ....؟"
"کس کے کہنے سے؟" سمی بادام کر بولی۔ "اپنے کہنے سے ..... ! جمالہ میری سہیلی ..... اور وہ سنی ہمارا دشمن ہے ...." آپا نگہت ہنسیں۔
"کیا مطلب؟" وہ حیران تھی۔
"سنی کسی قیمت پر بھی جمالہ کے ساتھ شادی نہیں کرے گا .....!" بھائی جان بولے۔ سمی نے اکڑ کر کہا۔
"یہ بات ہے؟ کچھ بازی لگاتے ہیں آپ؟"
"تم خود اپنی قسمت ہی بازی پر لگا رہی ہو! .... بے وقوف کہیں کی!" آپا بڑبڑائیں۔
چچا فرزانہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بیٹی گھر میں اور بھی تو لڑکیاں ہیں؟"
"پر جمالہ کے برابر کوئی بھی نہیں ......" اس نے بات اچک لی۔
"تم دونوں بچے ہی تھے جب میں نے طے کر لیا تھا کہ ..... !"
سمی نے شور مچایا۔ "واہ چچا جان! بات ہو رہی ہے سنی اور جمالہ کے بیاہ کی۔ یہ ہم دونوں کے بچپن کا ذکر کیا لے بیٹھے ..... مجھے جواب دیجیے ..... !!!"
اماں نے اُٹھ کر چپل پہنی، جھک کر پاندان اٹھایا اور جاتے ہوئے بولیں۔ "اسے جانے دو بھیا۔ سمی تمہاری ہے اور رہے گی ..... جمالہ کو بہو بنا لو ..... !!"
"پھر کہیے ہاں!" سمی نے لاڈ سے کہا۔ "کہیے نا ہاں! میرے اچھے چچا!"
"اچھا بھائی جو تمہاری مرضی .....!"
اور سمی دیوانی ہو کر بھاگی
سنی اس کے کمرے میں مسہری پر سر تھامے بیٹھا تھا۔ اس کی لانبی انگلیاں گھنے بالوں میں چھپی تھیں اور چہرے پر اداسی کی تہیں جم رہی تھیں۔
"سر میں درد ہو رہا ہے؟" سمی آگے بڑھی۔ "لاؤ میں دبا دوں!"
"نہیں نہیں! میں اس قابل کب ہوں کہ تمہارا ایک لمس بھی ....."
"بناؤ مکر زیادہ ....." سمی نے ڈانٹ کر کہا۔ "بہت تیزی آ گئی ہے لکھنؤ میں رہ کر ....."
سنی کچھ نہیں بولا۔ چپ چاپ اپنے دائیں گھٹنے پر بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی ٹکرانے لگا۔ اس کے چہرے کی اداسی اور بڑھ گئی تھی۔
سمی رک کر بولی۔ "جمالہ کے ساتھ تمہاری شادی پکی ہو گئی ہے!"
سنی تڑپ سا گیا۔ "سمی یہ کیا کہہ رہی ہو تم ......؟"
"ٹھیک کہہ رہی ہوں! چاند سی دلہن لا رہی ہوں!"
"خدا کے لیے اس قدر ظلم نہ کرو میرے اوپر ....." سنی لجاجت سے بولا۔ "سمی! سمی میری! آخر تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں .... میں .... میں .... تم ..... میں یہ شادی نہیں کروں گا۔"
"کیا کہا؟" سمی کو جیسے کانٹا چبھ گیا۔ "تم میری خوشی نہیں کرو گے؟ ....."

"تمہاری خوشی !!"

"ہاں میری خوشی!" سنّی نے تیز ہو کر کہا: "میری خوشی! جمالہ میری دوست ہے اور وہ تم کو پسند کرتی ہے ۔۔۔ میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ ۔۔ ۔۔" اور وہ رک کر بولی۔ "لیکن تم ...... اب تم میرا نباہ کرو گے ..... مجھے یقین تھا کہ میری بات رائیگاں نہیں جائے گی ۔۔۔ خیر ... وہ بڑی ۔ تم اپنے بچپن کے ساتھی کا دل دکھایا ہے۔ یہ یاد رکھنا ...... "

"سنّی! سنو تو سنّی! ......" وہ پکارتا ہی رہا۔ مگر سنّی تیزی سے چلی گئی۔ اس کو بے حد غصہ تھا بے حد رنج تھا۔ اپنی بات جانے کا دکھ ہوتا تھا۔ اماں کے کمرے میں گھس کر وہ تخت پر اوندھی گر پڑی۔ اب میں جمالہ کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ بار بار اس کے دل میں خیال آرہا تھا۔ وہ یونہی پڑی پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ کہ سنّی سائے کی طرح اندر آیا۔ اور تخت کے کونے پر بیٹھ گیا۔

- "اب کیوں آئے ہو میرے پاس !" وہ بپھر گئی۔ "میرے خلوص اور دوستی پر بے مروتی کا خنجر بھونک کر اب کیا کرنے آئے ہو؟ ۔۔۔ کوئی سی کسر رہ گئی ہے !..."

"سنو تو سنّی!" سنّی دھیرے سے بولا: "تم غلط سمجھ رہی ہو مجھے! تم میرے بچپن کی ساتھی ہو اور میں ...... اور میری خواہش ہے کہ تم میری .... مطلب ہے کہ ......" وہ ٹھہر گیا۔ اس کی چوڑی پیشانی پر پسینے کے قطرے ڈھلکنے لگے۔ سنّی نے اس کی طرف دیکھا۔

"جہنم میں گئی بچپن کی ساتھی .... بہت خیال ہے تم کو بچپن کے ساتھی کا ......!... جاؤ .... ہٹو میرے پاس سے ......"

سنّی اچانک رو پڑا۔ "مجھے معاف کر دو سنّی! مجھے معاف کر دو! خدا اور رسول کا واسطہ مجھے معاف کر دو۔ تمہاری خوشی پر تو میں اپنی زندگی بھی نثار کر سکتا ہوں ...۔ اگر تم یہی چاہتی ہو! اگر تم ......"

"راضی ہو تم!" سنّی اچھل کر بیٹھ گئی۔

بڑی مشکل سے سنّی نے جواب دیا "ہاں ..... !" اور اس کی آنکھیں ویران ہو گئیں۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔ اس کے چہرے پر ایکدم زردی سی چھا گئی۔ دھیرے سے وہ اٹھا۔ آنسو خشک کئے۔ ایک نظر سنّی پر ڈالی اور چلا گیا ۔۔۔ سر نہوڑائے، ایک ہاتھ کی انگلی کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے توڑے مروڑے بھاری قدم اٹھاتا ہوا وہ چلا گیا۔

اسی رات کو اس کے سینے میں درد اٹھا ۔۔ دورہ سا پڑ گیا۔ سنّی نے اسے دیکھا تو کانپ اٹھی ..... چہرہ ویران آنکھیں۔ بھنچے ہونٹ، تشنجی کیفیت ۔۔۔

"کیا ہوا سنّی؛ کیا بات ہے؟" وہ اس کے اوپر جھک گئی ۔۔ "کچھ نہیں!" سنّی کو اس حالت میں بھی مسکرانا نہ بھولا تھا۔ بڑی عجیب سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آئی اور وہ سرک گئی ۔۔ وہ بڑے درد سے کراہا۔

"ٹھیک ہوں ..... بس یوں ہی ....."

"بس یوں ہی! ذرا مرنے کا ارادہ ہے!" سنّی ہنسی۔ وہ سمجھی تھی واقعی یوں ہی معمولی سا درد ہوگا۔ لیکن دن گزرنے کے ساتھ ساتھ سنّی پر گاہے گاہے ایسے دورے پڑنے لگے۔ شادی کے بعد تو کئی بار سنّی ٹوٹ پھوٹ گیا۔ اور پھر اس روز جبکہ وہ دلہن لایا تھا۔ جب اس نے سنّی کی اداس صورت دیکھی۔ تب تو وہ مچھلی کی طرح تڑپا تھا۔ مچھلی کی طرح ۔۔ دونوں ہاتھوں سے سینہ دبا کر وہ دہرا دہرا ہوا .... ایسا دورہ پڑا کہ دیکھنے والے تڑپ تڑپ گئے۔

"اللہ، ایسا نامراد جان لیوا مرض کسی کو نہ دے ۔۔۔"

"بیچاری جمالہ ....."

"ہائے قسمت پھوٹ گئی نگوڑی کی!"

سمی جدھر نکلتی اسے طرح طرح کی باتیں سننا پڑتیں۔ وہ گھبرا کر کوٹھے پر جانے لگی۔ تو دالانوں کے پاس کھڑی عورتوں کی سرگوشیاں اس کے کانوں کے پردے میں خشخاش کرنے لگیں

"میں تو جانوں بہن! یہ سمی اور سنی میں پہلے سے تعلق رہا ہو گا۔ تب ہی تو دیکھوں وہ الگ رہی جاتی ہے اور یہ الگ ....!"

"اللہ ہی جانے! مگر میں نے تو سنا ہے کہ یہ شادی سمی ہی نے کروائی ہے!"

"اے ہوش بہن! اپنے ہاتھ کوئی اپنے دل کو چھلنی کرے گا۔"

"خاندان کے کسی جھگڑے کی وجہ سے نہیں ہوئی ہوگی!"

"ہوگا ہیں کیا!" مگر سمی اور سنی کی صورتیں دیکھ کر اللہ قسم دل پھٹتا ہے۔ کیسا پیارا تھا، ہاں! پ کی آنکھوں پر تو پردے پڑ گئے تھے، وہ محبت بھرے دلوں کو ......"

سمی سراسیمہ ہو کر بھاگ آئی۔ کتنی عجیب سی بات تھی۔ اس نے تو سوچا بھی نہ تھا۔ کہ سنی ......" ہائے!"

"رہ رہ کر ایک کھٹک سی سینہ میں ہو رہی ہے۔"

اور وہ دونوں ہاتھوں سے دل تھام کر رہ گئی۔

اجڑی، سہمی، خاموش، بیزار سمی نے دس سال کا طویل عرصہ گزار دیا۔ دس سال کا قلیل عرصہ گزار دیا۔ آپا کی شادی ہوئی۔ نسو کی شادی چھوٹے بھائی جان کا گھر بس گیا۔ چچا فراز نے دوسری دنیا بسائی۔ کیا کیا نہ انقلاب ہو گئے۔ سمی جہاں تھی وہی رہی۔ اپنے کمرے میں پڑی پڑی کتابیں پڑھا کرتی تھی۔ یا آنکھیں بند کر کے سوچا کرتی، جانے کیا کیا۔ خیالات تھک جاتے پر وہ نہ تھکتی۔ پگلی سمی! کبھی کبھی سکوت توڑ کر گنگنانے لگتی!

زیادہ اکتاتی تو بھائی جان اور آپا جان کے بچوں کے ہمراہ کھیلنے بیٹھ جاتی۔ سنی کہاں تھا۔۔۔ اس پر کیا گزر رہی تھی! سمی کو علم نہ تھا۔ اس کے منہ سے تو سنی کا نام بھی نہ نکلتا ...... ہاں جالہ کا ذکر اکثر بڑے پیار سے کرتی رہتی اور بس!

لیکن اتنے عرصے کے بعد بالکل اچانک سنی اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

سمی کانپ کر رہ گئی، سمی سن ہو کر رہ گئی۔

نہیں، نہیں! یہ تو میرا سنی نہیں ہے میرا سنی میرا خوبصورت کھلونا!

جسے میں نے اپنی پیاری سہیلی جالہ کو دیا تھا...."

تم کیسے آگئے ایکدم سے سنی؟"

"اے یہ کیا صورت بنالی بیٹا؟ بیمار رہے کیا!"

"ہم تو جیسے مر گئے تمہارے لئے گھوم کر نہ دیکھا، نہ خیریں، نہ خبر دی کہ میں کہاں ہوں!"

سہما سہما سنی باری باری سب کو جواب دیتا ہوا سب کے ہمراہ اندر آگیا۔ اس کی نظریں سمی کی طرف اٹھیں، ہڈیوں کا وہ ڈھانچہ، بے رونق آنکھیں، سفید چہرہ۔ سوکھے سیاہ ہونٹ!

سنی کے لبوں سے ایک آہ نکل گئی۔ وہ آگے کھسکا۔

"سمی! یہ تم ہو؟ یا میری آنکھیں دھوکا کھا رہی ہیں؟"

سمی کے سینہ میں کوئی چیز بڑے زور سے پھڑپھڑا رہی تھی وہ اس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"جالہ کہاں ہے؟"

سنی کی نگاہیں جھک گئیں۔ مجرم کی طرح گردن جھکا کر دھیرے سے بولا۔
"جمالہ ۔۔۔!! وہ تو اب اس دنیا میں نہیں ہے سمی!"
"کیا ؟ ۔۔" سمی چلا پڑی۔ "کیا ہوا تھا اسے!"
سنی کے لب کانپنے لگے، تھوک نگل کر چودی چودی سب کو دیکھ کر اور بھی آہستہ سے کہنے لگا۔" اسے ٹی بی ہوگئی تھی۔ اتنی تندرست، اتنی کھلنڈری، اتنی زندہ دل لڑکی اور یہ روگ !!!"
سمی تڑپ کر کھڑی ہوگئی۔
"لیکن کس طرح ؟ کیسے ؟"
سنی خاموش رہا ۔۔۔۔۔۔ اس کی آنکھیں جھکی رہیں۔ اماں، آپا، بھابی، نشو اور دولہا بھائی ۔۔۔۔۔ تتر بتر ہوگئے۔ سناٹا پاکر سنی ضبا اور سرک آیا پھر شکستہ آواز میں بولا۔
"میں اسے پیار نہ دے سکا سمی! میں اسے دل میں جگہ نہ دے سکا!
میں نے تمہاری خوشی پوری کردی۔ لیکن اسے خوش نہ رکھ سکا! تم ۔۔۔۔۔ مجھے ۔۔۔ تم ۔۔۔ تم سے محبت تھی ۔۔۔۔۔ میں تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔ میرے دل کی گہرائیوں میں تمہارا پیار تھا۔ آنکھوں میں تمہاری تصویر تھی ۔۔۔۔ میں اور کسی کو کیسے اپنے دل میں بساتا ۔۔۔۔۔۔ میں بچپن کی محبت میں کس طرح کسی اور کو ساجھے دار بنالیتا ۔۔۔۔۔۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہوگیا ۔۔۔۔ میں کیا کروں ۔۔۔۔ میں کیا کروں ؟"
"اور وہ اسی غم میں گھل گھل کر مرگئی ۔۔۔۔ ؟" سمی کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔
"بہت علاج کیا لیکن ۔۔۔۔۔"
"یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کا علاج تمہارے پاس ہے ۔۔۔ تم مسیحا تھے اس کے تمہارے ہوتے ہوئے وہ مرگئی ۔۔۔۔۔ تڑپ تڑپ کر جان دے دی اس نے!"
سمی رو پڑی، برسوں کے بعد اس کی آنکھوں میں آنسو آئے تھے۔ وہ بے اختیار ہوکر، بے قرار ہوکر رو پڑی۔ اس کی بے رونق آنکھیں سُرخ ہوگئیں سینہ میں ابلتے ہوئے لاوے کو راستہ مل گیا تھا۔
سنی بے تاب ہوکر اس کے قریب آگیا۔ کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھے ہوئے۔ اس بری طرح روتی ہوئی سمی کو سینہ سے لگالیا۔ برسوں کے بے قرار دل کو سکون مل گیا۔ برسوں کے بعد اس نے اتنی بڑی جرأت کی۔ کہ اس ٹھنڈی، سوکھی، کانپتی، لرزتی سمی کو اپنے کلیجے میں بھر لیا۔
"جی بھر کر رولو سمی۔ جو کچھ بھرا اس ہے نکال ڈالو ۔۔۔۔ جو کچھ ہوا ہے اسے بھول جاؤ ۔۔۔۔۔ آؤ اب ہم نئے سرے سے زندگی گزاریں گے ۔۔۔۔۔ جمالہ مرحومہ کی بھی یہی تمنا تھی ۔۔۔۔۔"
"کیا ؟؟" سمی جھپٹ کر اس کے بازوؤں سے نکل گئی۔
"اس نے آخری وقت مجھ سے کہا تھا کہ میں تم سے ۔۔۔۔۔"
"سنی !! " سمی کا ہلکا پھلکا بدن کانپا جارہا تھا۔ " تم قاتل ہو !!"
"تم مجرم ہو! میں نے تم پر ظلم کیا تھا۔ تو تم نے جمالہ غریب پر ستم ڈھایا ۔۔۔۔ ہائے! اس کا کیا قصور تھا، قصور تو سب میرا تھا ۔۔۔۔ اُف! میں کس طرح اس ظلم کو فراموش کرسکوں گی؟"
"سمی میری!" سنی سراسیمہ ہوگیا۔ "خدا کے لئے بھول جاؤ ۔۔۔۔۔"

"بہت تڑپ چکا ہوں! اب تو رحم کر دو!"

"اگر اس وقت جمالہ ہنسی خوشی مری ہوتی...... اس نے یوں سسک سسک کر جان نہ دی ہوتی، تو میں تمہیں اپنی آنکھوں میں بٹھا لیتی..... تمہیں اپنے دل میں چھپا لیتی...... مگر...... سنی تم نے بے دردی کی حد تمام کر دی...... تم آدمی نہیں پتھر ہو......"

"کاش میں پتھر ہوتا...... میں نے تمہاری خاطر جمالہ جیسی لڑکی کو ٹھکرا دیا۔ اس امید پر کہ تمہاری آنکھوں میں محبت کی جو قندیلیں جل اٹھی ہیں ان کی روشنی سے اپنی راتوں کی سیاہی کو دور کر دوں گا...... لیکن......" اس نے شدتِ کرب سے اپنے ہونٹ بھینچ لئے، لیکن میری قسمت نے مجھے ایسا مسافر بنا دیا جسے کوئی منزل نہ ملتی ہو...... جمالہ چلی گئی...... ابا مر گئے...... آخری سہارا تھا...... اسی سہارے پر اپنی بقیہ زندگی کا سفر شاید...... ہنسی خوشی طے کر سکتا...... وہ سہارا بھی آج ٹوٹ گیا...... سنی! ...... لو میں خود دور ہوا جاتا ہوں۔ تمہاری نظروں سے میں...... لیکن میں جیئوں گا...... ابھی میں جیئوں گا سنی...... دل میں تمہاری یاد لے کر...... جمالہ کا درد لے کر! میں جا رہا ہوں...... ایک بھولے بھٹکے مسافر کی طرح......"

وہ ایک لمحہ کو رکا...... بت کی مانند کھڑی ہوئی سنی کو دیکھا...... اس کی ویران آنکھوں میں...... اس کے کانپتے ہوئے لبوں کو دیکھا......! پھر وہ مڑا...... پھر وہ تیز تیز قدموں سے دروازے کی جانب بڑھ گیا...... سر جھکائے ہوئے، ہونٹ بھینچے ہوئے اور ایک ہاتھ کی انگلیوں سے دوسرے ہاتھ کی انگلیوں کو مروڑتے ہوئے سنی نے ایک طویل سانس کھینچی...... اس کو ایسا لگا۔ جیسے یہ سنی نہ گیا ہو۔ بلکہ اس کا بچپن روٹھ گیا ہو...... دو آنسو ڈھلک کر اس کی گردن پر آ ٹپکے...... دونوں ہاتھ دل پر رکھ کر وہ کراہی۔

"اور...... اور...... میں بھی جیئوں گی سنی!" اپنے آپ کو سزا دینے کے لئے...... جمالہ کی جواں مرگ پر ماتم کرنے کے لئے اور اپنی کھوئی ہوئی منزل کا غم کرنے کے لئے......"

الیاس احمد گدی
افکار، کراچی

پھول یادوں کے!

یہ ۱۹۴۴ء کی بات ہے، جب میں "امپیریل اسٹور" رانچی کا انچارج تھا۔ تین کاؤنٹر تھے۔ دو کے لئے میں نے دو لڑکے لگا رکھے تھے۔ تیسرا کاؤنٹر خود سنبھالتا تھا۔ رانچی ان دنوں بہت بڑا مینا بازار معلوم ہوتا تھا۔ ایسٹرن کمانڈ کا ہیڈ آفس ہونے کے علاوہ کئی امریکن اور اتحادی رجمنٹیں رانچی اور اس کے نواح میں کیمپ لگائے ہوئے تھیں ہر وقت شاہراہوں پر بھاری ٹرکوں یا ٹینکوں کی قطار گذرتی رہتی۔ اکثر ایک سڑک عبور کرنے کے لئے پندرہ پندرہ منٹ تک انتظار کرنا پڑتا تھا۔

سرِ شام ہزاروں کی تعداد میں فوجی نوجوان تفریح کے لئے شہر آتے اور گلی گلی رستہ رستہ بازار اور فاحشہ عورتوں کو تلاش کرتے پھرتے اکثر شراب پی کر شہر کے دکان داروں سے جھگڑ پڑتے۔ کبھی مارتے کبھی مار کھاتے۔ کبھی یوں بھی ہوتا کہ کوئی فوجی نوجوان شراب کے نشے میں دھت ہو کر اپنے بدن کے سارے کپڑے اتار دیتا۔ اور بھری ہوئی سڑکوں پر ٹھاٹھ سے سیٹی بجاتا ہوا چلتا۔ لوگ ہنستے تالیاں بجاتے، ہندوستانی زبان میں فحش گالیاں بکتے مگر وہ شان بے نیازی سے سب کو سلام کرتا۔ لڑکھڑاتا، ڈگمگاتا۔ چلتا ہی رہتا۔ یہاں تک کہ کوئی ایم پی آ کر اسے کسی خالی ٹرک یا جیپ میں لاد کر کمپنی کمانڈر کے پاس پہونچا دیتے۔

خاص خاص چیزیں مثلاً سینٹ، اسنو، پاؤڈر، کریم، وغیرہ، ایسی آرائشی چیزیں جنہیں خرید کر فوجی نوجوان فاحشہ عورتوں کو تحفے میں دیا کرتے تھے۔ تگنے چوگنے داموں پر ملا کرتی تھیں۔ خصوصاً اچھی شراب اور جوان عورتوں کی قیمت بہت زیادہ تھی۔ خود ہمارے اسٹور میں کتنے ہی نوجوان آ کر شراب کے لئے خوشامدیں کیا کرتے تھے۔ اور ہم اُن سے دُگنے اور تگنے دام وصول کرتے۔ کبھی کبھی تو کوئی امریکن نوجوان آ کر کوئی عورت کا بندوبست کرنے کا آرڈر دے جاتا۔ اور ہم اُسے سمجھاتے کہ بھائی یہ اسٹور ہے۔ رنڈی خانہ نہیں۔ مگر وہ بضد رہتا، خوشامدیں کرتا، گڑگڑاتا، یہاں تک کہ ہمیں کسی ایم پی کو بلا کر اسے سپرد کرنا پڑتا۔ وہ ہم پر غصہ ہوتا، فحش گالیاں بکتا، گھونسہ دکھا کر دھمکاتا اور اپنے ایم پی کے ساتھ چلا جاتا۔

اسٹور کی آمدنی بہت تھی لیکن اس میں اپنا حصہ وہی پونے دو سو روپے ماہوار تھے۔ جو تنخواہ کا طے تھا۔ لیکن اوپر کی آمدنی کا ایک اچھا ذریعہ ہم لوگوں نے رکھ چھوڑا تھا۔ کچھ کمپنی کمانڈروں، کارپورلوں اور سارجنٹوں کے نوکر کو ملا رکھا تھا۔ جو اچھی اور قیمتی شرابیں ہمکو یہاں آدھے داموں میں بیچ جاتے تھے۔ پھر اسی شراب کو ہم لوگ دگنے تگنے منافعے پر بیچتے۔ یہ آمدنی ہماری ذاتی ہوتی تھی۔

اس کے علاوہ کچھ فوجی نوجوان مختلف جگہوں سے چرائی ہوئی گھڑی، فونٹین پین اور کبھی کبھی کوئی ریڈیو لاکر فروخت کرجاتے جو ہمارے نجی حساب میں رہتا، اور جس کی خبر مالک کو نہیں ہوسکتی تھی۔

ایسے نوکروں سے اب ہم تقریب تقریب واقف ہوچکے تھے۔ اور اس لئے ایک روز اچانک جب ایک امریکن نوجوان میرے کاؤنٹر کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ اور اپنی وردی کے اندر سے "جان اکس شا" کی لمبی سی بوتل نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔ تو میں کشمکش و پیچ میں پڑگیا کہ اسے خریدوں یا لوٹا دوں۔ آدمی نیا تھا۔ راز فاش ہونے پر خطرہ بھی تھا۔ ادھر کچھ سختی بھی ہوگئی تھی۔ لہٰذا میں نے بوتل اس کی طرف ٹھیلتے ہوئے کہا،

"معاف کیجئے گا۔ یہاں چیزیں خریدی نہیں بیچی جاتی ہیں!"

وہ نا امید ہونے یا گھبرانے کی بجائے بچوں جیسی معصوم شرارت آمیزی سے کان کھجلاتے ہوئے بولا۔

"مگر مجھے رابرٹ نے تو یہی پتہ دیا تھا۔ شاید آپ نیا آدمی دیکھ کر کترا رہے ہیں"

رابرٹ ایک کپتی کمانڈر کا خاص خدمت گار تھا۔ اکثر وہ ہمارے یہاں شراب فروخت کرجاتا تھا۔ اس دھندے میں شاید وہ سب سے پرانا تھا۔ رابرٹ کا نام سن کر میں نے سوچا کہ اب انکار کی کوئی صورت نہیں رہ جاتی۔ میں نے دوسرے کاؤنٹر پر کے لڑکے کو اشارہ کیا کہ بوتل اٹھا کر اندر لے جائے۔ اور خود دراز میں سے پندرہ روپے نکال کر اُس کی طرف بڑھا دیے ــــ اُس نے نوٹ لے کر گنے پھر مسکراتا ہوا بولا ــــ

"بس پندرہ ہی روپے؟ چالیس روپے سے کم میں تو شاید بازار میں چھونے بھی نہ دے گا!"

میں نے کہا۔ "میری جان! خریدنے اور بیچنے میں اگر فرق نہ ہو تو آخر کام کیسے چلے گا۔ ہمارا بھی تو دھندا ہے!"

وہ ہنسنے لگا۔ پھر اسٹول کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ایک گلاس پانی پلوائیے گا۔ بہت پیاس لگی ہے؛"

میں نے لڑکے کو پانی لانے کے لئے سامنے کے ہوٹل میں بھیجدیا۔ کیونکہ ہمارے یہاں پانی نہیں تھا۔ تب میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا ــــ

وہ اکہرے بدن کا خوبصورت نوجوان تھا۔ عمر بیس بائیس سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ چہرے پر ایک عجیب قسم کی تابانی تھی۔ جنگ کے دوران میں اپنے وطن سے ہزاروں میل دور، موت کے دہانے پر ایسی شگفتگی بڑی نایاب چیز تھی۔ خاص طور پر ایک فوجی نوجوان کے چہرے پر جسے کسی بھی وقت موت ڈس سکتی تھی۔ شاید یہی شگفتگی اس کی سب سے زیادہ پرکشش چیز تھی۔ آدمی کا دل موہ لینے کی طاقت اس کی جسمانی خوبصورتی میں نہیں اس کی شگفتہ دل کشی میں تھی۔

میں دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا۔

اُس کا نام مائیکل تھا۔ وہ شمالی امریکہ کے ایک شہر ہلینا کا رہنے والا تھا۔ جنگ سے پہلے ایک فرم میں کلرکی کرتا تھا۔ ایک ماں، دو بہنیں اور ایک چھوٹا بھائی جو ابھی تک اتنا چھوٹا تھا کہ فوج میں نہ آسکتا تھا، امریکہ میں اس کی واپسی کے منتظر تھے۔ اس کی بات چیت میں حیرت انگیز حد تک سنجیدہ مذاق کی چاشنی تھی۔ گفتگو کا یہ انداز بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔

کتنی ہی دیر وہ ہمارے ہاں بیٹھا رہا۔ لوگ آتے رہے جاتے رہے، شام کا وقت تھا۔ بھیڑ بہت زیادہ تھی۔ اس سے بات کا موقع، نہیں مل رہا تھا۔ مجھے تعجب ہو رہا تھا۔ یہ کیسا نوجوان ہے۔ کہ ساری ہنگامہ آرائیوں سے کٹ کر ایک اسٹور میں چپ چاپ خاموشی سے بیٹھا

ہوا ہے۔ خاص طور پر ایسے وقت میں جب اس کی جیبوں میں پیسے بھی ہیں۔ جب ذرا بھیڑ چھٹی تو وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر سامنے کی الماری پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر مسکراتے ہوئے بولا۔

"مجھے ایک چھوٹا سا ٹائیلٹ بکس چاہئے ....!"

میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

"اگر لڑکی ہندوستانی ہو تو کوئی دوسری چیز خرید لو۔ کیوں کہ عام طور پر ہندوستانیوں کے یہاں سنگار کا نہ زیادہ شوق ہوتا ہے اور نہ انہیں اس کا موقع ملتا ہے!"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ جوزفن کو بناؤ سنگار کا بالکل شوق نہیں۔ ایک بار میں نے اسے "بارڈلی" کا سینٹ دیا۔ تو بہت ناراض ہوئی تھی۔ جانتے ہو کیوں؟ کہنے لگی تم بہت زیادہ فضول خرچ ہو۔ ان پیسوں سے دوسرے کام بھی چل سکتے ہیں۔ جوزفن اپنے آپ کو بالکل سمجھدار بیویوں کی طرح خیال کرتی ہے۔ بڑی مشکل سے تو آج اسے تصویر کھنچوانے پر آمادہ کیا ہے۔ بہر حال آپ مجھے ایک ٹائیلٹ بکس دے دیجئے۔"

میں نے ٹائیلٹ بکس دے دیا۔

بل کیش میمو لئے ہی وہ ہاتھ ملا کر اور پھر آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

ذہن میں کئی دنوں تک اس کی تصویر پھرتی رہی۔ یہ جنگ نہ معلوم کتنے اچھے لوگوں کو مٹا ڈالنے پر تُلی ہوئی تھی۔

جہاں تک مائیکل کی خوب صورت اور دل کش شخصیت کو موت کے دروازے پر کھڑا دیکھ کر افسوس ہوتا تھا۔ وہیں جوزفن جیسی ہندوستانی لڑکیوں پر غصہ بھی آتا تھا جو چاندی کے کچھ سکوں کے لئے اور چند دنوں کے عیش کے عوض اپنی عصمت بیچ رہی تھیں۔

کل جب مائیکل یہاں سے چلا جائے گا۔ تو امریکہ کے کسی خوبصورت بار میں بیٹھ کر اپنے ساتھیوں سے ان ہندوستانی لڑکیوں کا دھواں دھار ذکر کرے گا۔ جو ایک معمولی سے ٹائیلٹ بکس کے لئے یا ایک گھٹیا سی تصویر کے بدلے اپنا آپ انہیں سونپ دیتی تھیں۔

پھر اگر کوئی غیر ملکی مصنف یہ لکھے گا۔ کہ ہندوستان ایک بہت بڑا رنڈی خانہ ہے تو ہم مفت میں چراغ پا ہوں گے، قصور کس کا ہے؟ یہ دیکھنے کے لئے ہمیں جوزفن جیسی لڑکیوں کی طرف دیکھنا چاہئے۔ میرے دل میں جوزفن کے لئے سوائے نفرت کے اور کوئی چیز دور دور تک نہیں دکھلائی دیتی۔

مائیکل دوبارہ آنے کا وعدہ تو کر گیا تھا۔ مگر آیا نہیں۔ چار پانچ دن تک میں اس کا انتظار دیکھتا رہا۔ جب کوئی مائیکل کی شکل کا ٹامی سامنے سے گزر جاتا۔ تو دیر تک اس کی شکل آنکھوں میں پھرتی رہتی۔ پھر میں اپنے دھندے میں مصروف ہو گیا۔ اور قریب قریب اسے بھول گیا تھا۔ جب وہ ایک دن اچانک آنکلا۔ اس کے ہاتھوں میں پھولوں کا ایک چھوٹا سا گلدستہ تھا۔ اور چہرہ کافی سے زیادہ بشاش دکھلائی دے رہا تھا۔ اُس نے آتے ہی پھولوں کا گلدستہ میرے ہاتھوں میں تھما دیا۔ اور تپاک سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔

"میں نے جوزفن سے شادی کر لی ہے۔"

مجھے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ ایک امریکن اور ایک آدی باسی کرسچین لڑکی ــــ مغرب اور مشرق ــــ سفید اور سیاہ ــــ اس ناممکن کو ممکن کر دینے والے جذبات کا میں احترام کرتا ہوں ــــ اتنا مین (Mean) بھی نہیں کہ ایسے رشتے کو برا سمجھوں۔ مگر مصیبت ہے کہ یہ ہوا کیونکر ایک فوجی نوجوان سے شادی؛ جسے کسی بھی وقت کوئی نامعقول آرڈر اس سے چھین سکتا تھا۔ جو کسی بھی وقت جنگ کی اس المناک بھول بھلیاں میں کھو سکتا تھا۔ جس میں ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں کھو چکے ہیں۔ آخر اس رشتے کو جوزفن نے منظور کیوں کر کیا ہوگا؟ پھر اس گورے چٹے امریکن کو اس سیاہ فام جوزفن میں کیا بات دکھلائی دی؟

میں دیر تک سکتے کے عالم میں اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے کھڑا رہا۔ پھر اچانک چونک کر سوچا کہ مجھے بھی کچھ کہنا چاہیئے۔
"مبارک ہو! خدا تم دونوں کو خوش رکھے"
میں نے قدرے بزرگانہ انداز میں کہا۔
وہ اسٹول کھینچ کر پھر اسی جگہ بیٹھ گیا، جہاں پہلے بیٹھا تھا۔

"یار اس شادی میں بڑی دقت اٹھانی پڑی۔ جوزفن کے رشتہ دار کسی طرح راضی نہ ہوتے تھے۔ اب بھی وہ ناراض ہیں۔ جوزفن کے لئے اس کے گھر کے دروازے بھی بند ہوگئے ہیں۔ کل ایک گھر کرائے پر لے کر وہیں اُسے منتقل کر دیا گیا ہے۔ اکیلی بہت گھبراتی ہے۔ مگر کیا کیا جا سکتا ہے۔ جنگ ختم ہوجائے گی۔ تو میں اسے امریکہ لے جاؤں گا۔ میری ماں بہت وسیع القلب عورت ہے اسے خوشی ہوگی جب وہ دیکھے گی کہ میں نے اپنے انتخاب میں باطن کی خوبصورتی کو ظاہر کی خوبصورتی پر ترجیح دی ہے!"

میں چپ رہا۔ سوچنے لگا۔ جوزفن بھی ان ہزاروں لڑکیوں میں سے ایک ہے جن کی نظریں مردوں کی خوب صورتی کے ساتھ ان کی دولت پر بھی ہوتی ہیں۔ اور جہاں یہ دونوں چیزیں مل جاتی ہیں۔ جہاں یہ آتش نمرود دکھلائی دے جاتی ہے۔ یہ لڑکیاں بے خطر اس میں کود جاتی ہیں بغیر آگے پیچھے سوچے ہوئے، بغیر یہ سمجھے ہوئے کہ یہ آتش نمرود پھر بھی گلزار خلیل میں نہیں بدلی ہے۔ جوزفن بھی امریکہ جانے اور ایک شاندار زندگی گزارنے کے سنہری دام میں پھنس گئی۔ یہ بھی نہ سوچا، ممکن ہے یہ جنگ کسی دن اس کے سارے خواب چکنا چور کر دے، ممکن ہے وہ امریکہ نہ جا سکے۔ تب کیا ہوگا؟ وہ ہندوستان میں کیا بن کے رہے گی۔ یہ ایک بڑی المناک حقیقت ہے۔

"کچھ لوگوں کو ہماری اس شادی پر تعجب ہوتا ہے"
غالباً اس نے مجھے سوچتا ہوا دیکھ کر کہنا شروع کیا۔
میں چونک سا اٹھا۔ جیسے میرے دل کا چور پکڑا گیا ہو۔ مگر کچھ بولنے کے بجائے اس کی طرف دیکھتا رہا۔
"کچھ لوگ اس شادی سے جلتے بھی ہیں۔ لیکن مجھے ان کی پروا نہیں، کیوں کہ جوزفن میں میں نے وفا کا وہ آدرش دیکھا ہے کہ جی چاہتا ہے کہ اُس کی پوجا کرنے لگوں!"

وہ دیر تک اپنے ساتھیوں کی شکایت کرتا رہا جو اس شادی کا مذاق اڑاتے تھے۔ اور ایک سیاہ فام لڑکی کو رفیقۂ حیات بنانے پر ہنستے تھے۔ ان کو سمجھانے کے لئے مائیکل کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ وہ کیا کرتا، دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر چپ رہتا۔
پھر میں لڑکوں کو اپنا کاؤنٹر دیکھنے کو کہہ کر اُس کے ساتھ باہر چلا آیا۔ صبح کا وقت تھا۔ بھیڑ کم تھی۔ اس نے گھنٹوں ہم دونوں رانچی کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے رہے۔ فردوس میں میں نے اُسے کباب کھلائے۔ مرچوں کی زیادتی سے اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ناک سرخ ہوگئی۔ مگر وہ ہنس ہنس کر کھاتا رہا۔ آج وہ بہت خوش تھا۔ سوچا..... اگر آج اسی وقت جنگ ختم ہوجائے تو کیا ہو؟ جب مائیکل کے لئے ساری دنیا ایک مہکتا ہوا گلاب کا پھول ہو جاتے۔ شاید وہ خوشی سے دیوانہ ہو جائے۔ مگر ایک لمحہ بعد جب یہ خیال ہوا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ تو چونک اٹھا۔ کون کہہ سکتا ہے، جنگ کب ختم ہوگی؟ — کون کہہ سکتا ہے جنگ کبھی ختم بھی ہوگی یا نہیں؟ دل کے کسی نامعلوم گوشے میں ذرا سی تکلیف ہوئی، ذرا سی چبھن ہے.....!
مائیکل کسی دن جوزفن سے ملانے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔
اور جب وہ چلا گیا۔ اور میں اپنے کاؤنٹر پر آگیا۔ اُس وقت بھی میرے ذہن میں اس کا ایک فقرہ گونج رہا تھا۔
"جوزفن میں میں نے وفا کا وہ آدرش دیکھا ہے کہ جی چاہتا ہے اس کی پوجا کرنے لگوں" مجھے مائیکل کی سادگی پر ہنسی آرہی تھی

میں خود عورت اور وفا کا نام ساتھ ساتھ لینے میں ہچکچاتا ہوں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں کوئی غلط بات کہہ رہا ہوں، جیسے میں جھوٹ بول رہا ہوں ــــ

دراصل میرے ایسا سوچنے کے پیچھے ایک کہانی ہے:

حسنہ کو میں نے اپنی زندگی سے بھی زیادہ چاہا تھا۔ ہم دونوں بچپن سے ساتھ رہے تھے، ساتھ کھیلے تھے۔ آپس میں جھگڑے بھی تھے، لڑائیاں بھی کی تھیں۔ رُوٹھے بھی تھے، منائے بھی گئے تھے۔ غرض سارا بچپن ایک دوسرے کی آنکھوں میں، گذارا تھا۔ بڑے ہوئے تو یہ لڑنا جھگڑنا، روٹھنا منانا ایک لازوال محبت میں بدل چکے تھے۔ لیکن میرا یہ خیال کہ ہماری یہ محبت لازوال ہے اور کوئی چیز ہمیں جدا نہیں کر سکتی محض میرا واہمہ تھا۔ کیوں کہ جب اس کی شادی ہونے لگی تو اس نے انکار بھی نہ کیا۔ وہ یہ بھی نہ کہہ سکی کہ میں یہ شادی نہیں کروں گی۔ پھر جب میں نے اس کو اپنے ساتھ بھاگ چلنے کے لئے کہا۔ اور اسے یقین دلایا کہ میں خود تکلیف اٹھا کر بھی اس کو آرام پہونچاؤں گا۔ خود بھوکا رہ کر بھی اسے کھلاؤں گا۔ تو اس نے اپنے ماں باپ کی ناک لا کر بیچ میں کھڑی کر دی۔ میں نے اسے سمجھایا، اُسے اپنی محبت کا واسطہ دیا۔ اُس کو اُس کے وعدے اور قسمیں یاد دلائیں، مگر وہ روتی رہی، بار بار اپنی مجبوریوں کا ذکر کرتی رہی۔ بار بار اپنی مجبوریوں اور بدنامی کا خوف دلاتی رہی بالآخر اُدھر لڑھک گئی جدھر ڈھال زیادہ تھا...... اور میں نے اپنے دل پر سے وفا کا لفظ کھرچ ڈالا.....

شاید اسی لئے جوزفن کا نام سن کر میرے دل میں ایک ہلکی سی جلن ہوئی تھی۔ ہلکا سا حسد، مجھے جوزفن کو دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ میں اس لڑکی کو دیکھنا چاہتا تھا۔ جس میں کم از کم اتنی ہمت تو تھی۔ کہ اس نے اپنی محبت کے لئے سب کچھ تیاگ دیا تھا۔ اگرچہ اس تیاگ کے پیچھے بھی کسی سنہری پرندے کے پر پھڑپھڑا رہے تھے۔

جوزفن کو میں نے دیکھا تو مجھے تعجب نہیں ہوا۔ کیوں کہ اس میں کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی۔ جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتی وہ عام آدی باسی کرسچین لڑکیوں کی طرح تھی۔ اس کا رنگ کالا تھا۔ البتہ چہرے کے نقوش بڑے تیکھے تھے۔ اس کے علاوہ ایک اہم بات جو اس میں تھی۔ وہ اس کی جسمانی دلآویزی تھی۔ اس کا جسم پتھر سے تراشے ہوئے کسی یونانی مجسمے کی طرح دلکش تھا۔ سفید باریک مُلمل کی ساری میں اس کے جسم کا ہر بل، ہر خط نمایاں تھا۔ سوائے اس کی رنگت کے اس میں کوئی عیب نہیں تھا۔ بہرحال اپنی ان دل آویزیوں کی اُس نے جو قیمت وصول کی تھی وہ بہت کافی تھی۔ جوزفن انگریزی بہت کم بول سکتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بیان کرنا بھی اس کے لئے مشکل ہو جاتا۔ میں نے اندازہ لگایا وہ زیادہ پڑھی لکھی نہ تھی

وہ مجھ سے بڑے تپاک سے ملی۔ اندر کمرے میں لے گئی۔ چائے پلائی اور شرما شرما کر باتیں کرتی رہی۔ مائیکل نے اس سے میرا غائبانہ تعارف کرا دیا تھا ــــ شاید ضرورت سے زیادہ تعریف بھی کر دی تھی ــ اسی لئے وہ مجھ سے اس قدر مرعوب معلوم ہوتی تھی۔ بات بات پر کہتی رہی ــــ

مائیکل کہتا ہے آپ بہت نیک دل انسان ہیں۔

مائیکل کہتا ہے آپ بہت ملنسار ہیں۔

مائیکل کہتا ہے آپ کو ہماری اس بے رنگ اور بے جوڑ شادی پر خوشی ہوئی۔ آپ پہلے آدمی ہیں جس نے اس شادی پر ناک بھوں نہیں چڑھائی ــــ

مائیکل کہتا ہے.....!

میں نے کہا ــــ "دیکھئے مائیکل جو بھی کہتا ہو۔ لیکن میں اس لڑکی کا احترام کرتا ہوں جو اپنے اندر اپنے حق کے لئے لڑنے کا حوصلہ رکھتی

ہو تم ان ہزاروں ہندوستانی لڑکیوں سے مختلف ہو جو بے زبان جانوروں کی طرح اپنے آپ کو فرض کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیتی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مجھے تمہاری اس شادی پر دلی مسرت ہوئی ہے ...؟

میں کہتا رہا، لیکن میرے دل کے اندر چور تھا۔ ایک چور جو بار بار کہہ رہا تھا۔ کہ اس حوصلے کے پیچھے، اس بغاوت کے پس پردہ امریکہ کی کشادہ سڑکیں ہیں، امریکہ کی خوبصورت زندگی ہے ..... یہ تیاگ محض تیاگ نہیں۔ ایک لڑکی کبھی اتنی بے وقوف نہیں ہو سکتی۔ دو گھنٹے مائیکل اور جوزفن کی پر لطف صحبت میں گذار کر میں پھر اس کلبۂ احزان میں لوٹ آیا۔ جہاں حسنہ کی یاد ہاتھ میں نشتر لئے میری منتظر تھی۔

تین چار مہینے بیت گئے۔ اس بیچ میں مائیکل اور جوزفن سے برابر ملاقات ہوتی رہی۔ دکان کی سیل گھٹ گئی تھی۔ اس لئے مالک کی نگرانی بڑھ گئی تھی۔ اسی لئے میں اسٹور چھوڑ کر جا نہ سکتا تھا۔ لیکن مائیکل برابر اور جوزفن کبھی کبھی ضرور میرے پاس آتے رہے وہ دونوں بہت خوش تھے۔ وہ جب بھی آتے ہنستے مسکراتے ہوئے آتے، جتنی دیر میرے پاس رہتے، ہنستے مسکراتے رہتے۔ انھیں یوں خوش و خرم دیکھ کر حسنہ بے اختیار یاد آجاتی۔ آہ! اگر کم بخت ذرا سی ہمت کی ہوتی تو آج میں دنیا کا انتہائی خوش نصیب انسان ہوتا۔

ایک دن مائیکل نے مجھے بتایا۔ کہ وہ باپ بننے والا ہے۔ اس روز میں واقعی خوش ہوا۔ رنگ اور نسل کا صدیوں پرانا امتیاز مٹنے والا تھا۔ یقیناً وہ انسان بڑا ہے جو اس زنجیر کو توڑنے میں پہل کرے۔ اسی خوشی میں ہم دونوں نے ایک بار پھر فردوس میں اکٹھے کباب کھائے اور دیر تک ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سڑکوں پر پھرتے رہے۔

لیکن اس واقعے کے کوئی تین ہفتے کے بعد اچانک مائیکل کی کمپنی کو کوچ کا حکم مل گیا۔ مائیکل میرے پاس آیا۔ تو اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ مجھے تعجب ہوا۔ آج پہلی بار میں نے اس کے چہرے کو اس قدر زرد اور پژمردہ دیکھا تھا۔ میرا دل تڑپ اٹھا۔ میں نے لپک کر اس کی باہوں میں باہیں حائل کر دیں۔

"کیا بات ہے میری جان؟ کیوں جوزفن سے جھگڑا ہو گیا؟"

"نہیں!" وہ بڑی گمبھیر آواز میں بولا۔ "ہمیں کوچ کا حکم مل گیا ہے۔ ہم آج رات شہر چھوڑ رہے ہیں۔"

میں چونک سا پڑا۔

"آج رات؟ یعنی کیا آج ہی رات!"

"ہاں!"

"مگر جا کہاں رہے ہو؟" میں نے قدرے پریشانی سے پوچھا۔

"یہ تو کسی کو بھی معلوم نہیں۔ اتنا معلوم ہے کہ برما کی طرف جا رہے ہیں۔ واچ مین (WATCH MAN) کہتا تھا کہ ہمیں سیدھے فرنٹ لائن میں پہونچا دیا جائے گا۔"

اس کے بعد نہ میں نے کچھ پوچھا نہ وہی کچھ بولا۔

بڑی دیر تک وہ میرے پاس بیٹھا رہا۔ اور جب ہاتھ ملا کر اور گلے سے لپٹ کر جانے لگا تو میں نے دیکھا کہ آنسو کا وہ قطرہ، جسے اتنی دیر سے وہ اپنی پلکوں کے پیچھے چھپائے ہوئے تھا۔ اس کی آنکھوں کے گوشے سے ڈھلک آیا۔

میرا دل بھر آیا۔ آہ! ہم سب کس ان جان ہاتھوں کے کھلونے ہیں۔ کس انجان بے رحم ہاتھوں کے جو ہمیں اپنی مرضی کے مطابق نچا رہا ہے۔ اس روز ساری رات میں سو نہ سکا۔ ساری رات آنکھوں میں خار سا چبھتا رہا.....

مائیکل چلا گیا۔ جوزفن کی مسکراہٹ میں غم کی ایک لکیری ابھر آئی۔ مجھے فرصت نہ ملتی تھی۔ کہ اس کے گھر جاتا۔ لیکن وہ اکثر چھوٹی موٹی چیزیں

بیٹھنے کے لئے میرے پاس آتی رہی۔ مائیکل اسے برابر روپے بھیج رہا تھا۔ جب بھی مائیکل کا خط آتا وہ مجھے ضرور بتاتی۔ مائیکل نے لکھا ہے ...... اور چپ چاپ میں سنتا رہتا۔

مجھے معلوم تھا کہ مائیکل بہت اچھی فطرت کا آدمی ہے۔

مجھے معلوم تھا کہ مائیکل کی ماں بہت وسیع القلب عورت ہے۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ جوزفن کو امریکہ لے جائے گا۔

مجھے معلوم تھا کہ اس کا ہونے والا بچہ مستقبل کا ایک عظیم انسان ہوگا۔

مگر یہ جنگ ـــ مائیکل گولیوں اور توپوں اور بمباروں کے سائے میں یہ سنہرے خواب بن رہا تھا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کب کیا ہو جائے۔ کب سنہرے خوابوں کے تانے بانے بکھر جائیں۔ لیکن دل میں اس حقیقت کو جھٹلانے لگتا۔ مائیکل ضرور آئے گا۔ یہ جنگ ضرور ختم ہوگی۔

اور بالآخر وہ حقیقت بھی سامنے آئی۔ جسے میں جھٹلا رہا تھا۔ ایک دن ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے چلتی ہوئی جوزفن آکر سامنے کے اسٹول پہ بیٹھ گئی۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں ـــ بال بکھرے ہوئے تھے۔ سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ چہرہ کسی مردہ انسان کی طرح سفید پڑ گیا تھا۔ میں اچانک چونک اٹھا۔

"کیا بات ہے؟... کیا بات ہے جوزفن؛ اس قدر پریشان کیوں ہو۔

جوزفن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دو موٹی دھاریں بہہ نکلیں۔ ہونٹوں کے گوشے کپکپا اٹھے۔ میں سکتے میں آگیا۔ دل میں کوئی بولا ـــ "آخر وہی ہوا ...... وہی ہوا ...... وہ سنہرا پرندہ اڑ گیا.... کھو گیا..."

"کچھ بتاؤ تو ہوا کیا؟" میں نے اسے شانوں سے پکڑ کر ہلایا۔

کچھ کہنے کے بجائے اُس نے ایک پیلے رنگ کا لفافہ میرے سامنے رکھ دیا۔ جس پر کتنے ہی شہروں کی مہریں لگی ہوئی تھیں، خط کھلا ہوا تھا۔ میں نے نکال کر پڑھا۔

۱۷ اچھاؤنی

۱۲ر نومبر ۴۴ء

مائیکل شا برما کے جنوبی محاذ پہ مارا گیا۔

گذشتہ رات کے اچانک حملے میں سخت زخمی ہوا۔ اور ایک گھنٹے کے اندر مر گیا۔

مائیکل نے جو خدمات اپنے ملک کی انجام دیں، جس جواں مردی سے حملے کا مقابلہ کیا۔ اس نے امریکہ کی شان بڑھائی۔ امریکن ملٹری تاریخ میں اُس کا یہ کارنامہ محفوظ ہوگا۔

کمپنی کمانڈر

گیارہویں امریکن بٹالین

جنگ ختم ہو یا نہ ہو لیکن مائیکل ختم ہو چکا تھا۔ اور میرے سامنے بیٹھی ہوئی جوزفن خوف اور غم سے بالکل سفید دکھلائی دے رہی تھی۔ اُس کا سارا چہرہ پسینے میں شرابور تھا۔ کچھ سوچنے کا موقع نہ تھا۔ فوراً ٹیکسی منگوا کر میں جوزفن کو اس کے گھر لے گیا۔ بہت دیر تک چپ چاپ اُس کے پاس بیٹھا رہا۔ سمجھانے کی کوشش بھی کی۔ مگر خود مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے پاس مناسب الفاظ ہی نہیں۔ آخر تھک ہار کر دو گھنٹے بعد لوٹ آیا

اُس روز رات گئے جب میں اپنے بستر پر لیٹا۔ تو کتنے ہی بے ربط خیال میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ آخر وہ آتش نمرود جس میں جوزفن کود گئی تھی گلزار نہ بن سکی ـــــ اور اب کیا ہوگا۔ یہ سمجھنا کچھ زیادہ مشکل نہ تھا۔ ہزاروں لڑکیوں کی طرح وہ بھی دھیرے دھیرے گناہ کی تیرگیوں میں کھو جائے گی۔ اگر اُس نے سمجھا ہوتا۔ اگر اس نے امریکہ جانے اور مائیکل کے ساتھ زندگی گذارنے کے خواب نہیں دیکھے ہوتے۔ اگر اس کی نظریں سنہرے پرندے کے چمکیلی پروں کے نیچے موت کے بازیگر کو دیکھ سکی ہوتیں۔ تو آج شاید یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ لیکن ہمیشہ ہوتا یوں ہی ہے۔ رنگین خوابوں کے پیچھے دوڑنے والی یہ لڑکیاں ..... لیکن چاہے جو ہو جوزفن سے مجھے ہمدردی تھی ......

اس گراں بار صدمے سے اس کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔

میں اکثر اس کے یہاں جاتا رہا

کئی بار ڈاکٹر بلوا کر دکھلایا۔

کئی بار دوائیں دیں۔

کبھی کبھی تو چار چار گھنٹے اس کے پاس بیٹھا رہا۔

اس بیچ اسٹور کے دونوں لڑکے سامان چرانے کے ساتھ ساتھ مالک سے میری شکایتیں کرتے رہے۔ کہ میں دکان میں موجود نہیں رہتا۔

کئی بار مالک نے خود آکر دیکھا۔ اور مجھے غیر حاضر پایا۔

آخر دوسرے ہفتے جب حساب کیا گیا۔ تو اسٹور سے سات سو روپے کا مال غائب تھا۔ جس کا حساب کسی کھاتے میں درج نہ تھا ـــ سارا الزام میرے سر آیا۔

رانچی سے فوجی گہما گہمی سے بھرے ہوئے ماحول سے ویسے ہی میرا دل کھٹا ہو گیا تھا۔ اس پر یہ غبن کا الزام، میں نے دل برداشتہ ہو کر اسی دن رانچی چھوڑ دیا۔

آتے وقت جوزفن سے بھی نہ مل سکا۔ پتہ نہیں اُس نے مجھے کیا سمجھا ہوگا۔

چھ برس گذر گئے۔ جوزفن کی کوئی خبر نہ ملی۔ اس عرصے میں کول فیلڈ اور ڈاؤن فیلڈ کی کولیری میں مختلف نوکریاں کرتا رہا۔ بیچ میں ایک بار رانچی بھی جانا ہوا ـــ جوزفن کے گھر گیا۔ مگر اس میں ایک سندھی خاندان آباد تھا۔ پوچھا، پتہ لگایا مگر کوئی بات معلوم نہ ہو سکی۔ سب یہی کہتے تھے۔ کہ کہیں چلی گئی کہاں گئی ہوگی ـــ یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں تھا۔ ایک جوان اور تندرست اور پھر یکہ و تنہا لڑکی کا حشر ہندوستان میں صدیوں سے ایک سا ہے۔ یہ چاندی، سونے کے انبار میں کھیلنے کے خواب دیکھنے والی لڑکی جس نے مائیکل سے نہ جانے کتنے وعدے کئے ہوں گے۔ اور جس کی وفا سے متاثر ہو کر مائیکل اس کی پرستش پر آمادہ ہوا تھا۔ مجھے اس پر رحم آتا تھا۔ اور اس سے زیادہ رحم مائیکل اور اس کی سادگی پر آتا تھا۔

پھر کولیری کی گیس اور ہوا نے میرے پھیپھڑوں میں داغ لگا دیا۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا۔ کسی سینے ٹوریم میں چلے جائیے، یہاں علاج ممکن نہیں کچھ پیسہ کمپنی نے دیا کچھ میرے پاس تھا۔ زخمی پھیپھڑے لئے رانچی کے قریب مورا بادی کے علاقے میں ایک پرائیویٹ وارڈ میں آگیا۔ زندگی مجھے ہنوز عزیز تھی اور تعجب ہے یہاں مجھے جوزفن ملی۔ میں نے اُسے جس حالت میں دیکھا اُس نے مجھے ششدر کر دیا۔ میں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ جوزفن کسی زیر تعمیر مکان میں اینٹیں ڈھونے کی مزدوری بھی کر سکتی ہے۔ نوکر کے ذریعے بلوایا۔ وہ آئی اور جب خلاف توقع مجھے دیکھا۔ تو ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ گھڑی بھر پہلے جو تازگی اس کے چہرے پر تھی وہ اچانک اندوہناک کرب میں بدل گئی۔ شاید اسے کچھ پرانی باتیں یاد آگئی تھیں۔

میں نے سوچا شاید وہ رو پڑے گی۔ لیکن وہ روئی نہیں۔ چپ چاپ ایک ہاتھ سے دروازہ تھامے اور دوسرے ہاتھ سے اپنے بچے کی باہنہ پکڑے کھڑی رہی۔ اس کے بال اور چہرے اور کپڑے پر دھول جمی ہوئی تھی۔ ہاتھ سوکھی مٹی میں ڈوبے ہوئے تھے ـــ اس کا جسم ڈھیلا ہو چکا تھا۔ چہرہ

کی آب ماند پڑ گئی تھی۔ خزاں زدہ درخت کی طرح ویران اور سوگوار، وہ چپ کھڑی رہی۔

میں نے پوچھا —

"کیسی ہو؟"

"اچھی ہوں!"

ایک مغموم سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر ابھر آئی۔

"میں نے کئی بار کوشش کی کہ تم سے مل سکوں۔ مگر کوئی صورت نہ پیدا ہوئی۔ ایک بار رانچی بھی آکر تلاش کیا۔ مگر تم نہیں ملیں۔ آج کل کہاں رہتی ہو؟"

"ابھی تو یہیں ہوں۔ مورا بادی میں!"

"پنشن تو ملتی ہوگی؟"

"نہیں، ان لوگوں نے میرا حق تسلیم نہیں کیا۔"

جی چاہا، اُس کے چھ سال پرانے زخم میں ذرا سا نشتر لگا کر دیکھوں کہ وہ زخم ابھی ہرا ہے یا مندمل ہو چکا؟ سوچا، ذرا اس کے دل کے اس گوشے میں جھانک کر دیکھ لینے میں کیا ہرج ہے جس میں مائیکل نے وفا کا قابلِ پرستش آدرش دیکھا تھا۔ اسی خیال سے میں نے ذرا سا جھک کر دھیرے سے پوچھا

"مائیکل کی یاد آتی ہے؟"

"نہیں!" اُس نے پورے اعتماد سے جواب دیا۔ "مائیکل مجھ سے جدا ہی کب ہوا تھا۔ وہ تو آج بھی میرے ساتھ ہے!" اُس نے اپنے بچے کی بانہہ پکڑ کر اُسے آگے دھکیل دیا۔ پھر اپنے مٹی میں ڈوبے ہوئے ہاتھ کو دکھلاتے ہوئے بولی۔

"اور یہ سب اسی کے لئے تو کر رہی ہوں۔"

مجھے ایسا لگا جیسے میرے دماغ کی کوئی رگ پھٹ گئی ہو۔ میں اپنے سامنے کھڑی ہوئی دھول میں لت پت جوزفین منج کی طرف دیکھتا رہا۔ اور پھر نہ جانے کیوں اُس دم مجھے حُسنہ بڑی شدت سے یاد آئی۔۔۔!

دردانہ اختر
منشور۔ کراچی

آخر شب

ایک بار دروازہ بند کرنے کی آواز آئی پھر سناٹا چھا گیا۔ دور تک کوئی آواز نہ تھی۔ خدا جانے ناصرہ آپا اندر کیا کر رہی تھیں۔ جرم اگر صرف دروازہ بند کرنے سے چھپ جائے تو وہ ہمیشہ دروازہ بند کئے اندر ہی رہیں پر آفت تو یہ تھی کہ انہوں نے خود کو بند کیا اور اپنے سارے دکھ اور اپنا یہ جرم باہر چھوڑ گئیں۔ اور تو سب پی جاتے۔ لیکن دادے ابا کو کون سمجھائے کون بتائے کہ ان کے بوڑھے کاندھے جو تیزی سے زمین کی طرف جھکتے جا رہے ہیں یہ بوجھ نہیں سنبھال سکیں گے۔ یوں تو ہم سب ہی اپنے اپنے سایوں تک سے خائف پھرا کرتے تھے۔ پورا گھر ایک قبرستان کی طرح سنسان رہتا تھا۔ اس حویلی کی اونچی اونچی بلند و بالا دیواروں کے اندر زندگی ہمیشہ سوگوار رہتی تھی۔ ڈوبتے سورج کی ہلکی دھوپ کی مانند کسی کے چہرے پر کبھی بے جان سی مسکراہٹ آتی۔ بہت مردہ سی بہت افسردہ سی اور دادا ابا ہم سب کے سروں پر آسمان کی طرح تنے ہوئے تھے ادھر ادھر سر تکنے کی بھی کسی میں تاب نہ تھی۔ زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ لیکن دادا جی اپنے پروں میں سب کو سمیٹے جہاں کے تہاں تھے۔ ایک قدم بھی آگے بڑھنے پر تیار نہ تھے۔ اور آگے بڑھتے بھی کیوں وہ جاگیر دار تھے اور ہم سب پوتڑوں کے رئیس۔ ہم نے ابا اور تائے ابا کو کبھی مسکراتے نہیں دیکھا۔ اس کی وجہ تھی بھی معقول ان کے اندر آزادی حاصل کرنے کی جو تڑپ تھی وہ کبھی کبھار سر اٹھایا کرتی تھی۔ اکثر وہ دادی اماں سے کہا کرتے تھے۔

"ابا جی سے اجازت دلا دیجئے کہیں جا کر چار پیسے کمائیں ایک ایک پیسے کے لئے ابا میاں کے آگے ہاتھ پھیلانا کچھ اچھا نہیں لگتا۔" دادی جی صرف قہر آلود نگاہوں سے انہیں گھورا کرتیں اور ان کے حد سے بڑھتے ہوئے اصرار پر پھٹ پڑتیں۔

"شرم کرو، ماں سے ایسی باتیں کرتے ہو۔ تمہارے باپ نے کبھی نوکری نہ کی۔ تمہارے دادا نے کبھی نوکری کی۔ تمہاری تو پشتوں میں آج تک کسی نے نوکری نہیں کی۔ جب گھر بیٹھے اللہ دونوں وقت کی روٹی دیتا ہے تو کیا ضرور ہے گھر سے باہر جانے کی۔" اور دادا میاں یہ خوب جانتے تھے کہ ابا میاں نوکری کا لفظ بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ ابا میاں نے لوگوں پر بھری محفل میں طنز کئے تھے۔ "بھک منگے، چند ٹکوں کے لئے دوسروں کی خوشامد کرتے ہیں۔ ارے میاں کچھ کھا کر سو رہو پر دوسروں کی خوشامد نہ کرو۔" اور لوگ اتنے کڑوے، تلخ طنز سن کر خاموش ہی ہو لیا کرتے تھے۔ سب ہی جانتے تھے کہ دادا اگر ایسا کہتے ہیں تو اس پر کار بند بھی ہیں۔

امی نے ہمیشہ ابا کو تنگ کیا وہ چاہتی تھیں تیزی سے تغیر پذیر زمانے کے ساتھ وہ بھی اپنا پرانا چولا اتار پھینکیں۔ میری رات کو جب بھی آنکھ کھلتی اکثر ابا اماں کو لڑتا ہوا پاتی۔

"مجھے الگ روپے دو میں اس طرح نہیں رہ سکتی۔" ابا حیران رہ جاتے۔

"بھئی کیا کرو گی روپے لے کر۔ کیا روٹی نہیں ملتی۔ کپڑا ہر سال ابا بنا دیتے ہیں۔ موسم کی ہر چیز ابا منگا کر کھلا دیتے ہیں پھر کیوں چاہئے روپیہ"۔ اماں بھڑک اٹھتیں۔

"مجھے نہیں چاہئے ایسا روٹی کپڑا۔ لڑکیوں کی شادی ہوتی ہے تو وہ اپنی ساری حسرتیں آرزوئیں جی کھول کر پورا کرتی ہیں۔ ایک ہم ہیں چار پیسے ہمارے پاس ہوں تو ہمیں پتہ بھی چلے۔ یہ میاں کی کمائی ہے جس پر صرف ہمارا حق ہے"۔

"ہمارے یہاں رہنا ہے تو اسی طرح رہنا ہوگا"۔ ابا سے کوئی جواب نہ بن پڑتا۔ ہماری اماں نے کبھی ابا سے الگ روپے نہ مانگے نہ ہماری دادی نے۔ غرض ہمیں یاد نہیں کسی عورت نے یہ شور مچایا ہو "ہمیں الگ روپیہ دو۔ جب گھر کی ساری ذمہ داری ایک فرد پر ہے تو کیا ضرورت پڑی ہے ہمیں، خواہ مخواہ نوکریاں کرنے پھریں۔ اکثر یہ جھگڑے طول پکڑ جاتے۔ کئی کئی دن ابا اماں کی بات چیت بند رہتی۔ اماں چپکے چپکے رویا کرتیں۔ تائے ابا تائی جی تو شاید مہینوں اسی بات پر لڑا کرتے۔ ہفتوں تائی جی پھولی پھولی رہا کرتیں۔ دادی جی صبح سویرے کمر بند سے چابیوں کا گچھا کھولتیں سہ دری سے جو لطور گودام استعمال کی جاتی تھی۔ تول تول کر ایک ایک چیز نکالتیں۔ آٹا، دال، مصالحہ، گھی، تیل، لکڑی اور یہ سب باورچی کو دے دیا جاتا جو ان کا اور دادے ابا کا جی چاہتا پک جاتا۔ سب صبر شکر کرکے کھا لیتے۔ ہم نے یہ کشش سنبھال کر ہی دیکھا۔ سال کے سال دادے ابا ہمارے بوڑھے ملازم منشی جی کو ساتھ لے کر بازار جاتے وہاں سے مختلف قسم کے کپڑوں کے تھان خرید کر لے آتے۔ گھر میں کپڑا سب کو برابر بانٹ دیا جاتا، کون پسند کرتا ہے کون ناپسند اس سے کسی کو کوئی سروکار نہیں تھا۔ اماں جی، تائی جی بڑی ہی مردہ دلی سے اپنے حصہ میں آیا ہوا کپڑا اٹھا لیتیں۔ دادی جی جو درمیان میں بیٹھی تھان پھاڑ پھاڑ کر سب کو بانٹتی جاتیں اور سب کی نگاہوں میں چھپا ہوا غم اور غصہ پڑھتی جاتیں وہ خوب سمجھتی تھیں کہ یہ لوگ کیا چاہتے ہیں بالکل اسی طرح، ان کی اپنی خواہشات کو ان کی ساس سسر نے کچلا تھا۔ یہ خود بھی مجبور رہتیں ان کی ساس بھی اب یہی ان کی بہوؤں کے ساتھ ہو رہا تھا۔ کوئی نئی بات تو نہ تھی صدیوں سے یہی ریت چلی آ رہی تھی لیکن دادا ابا کے سامنے لب ہلانے کی کسی میں جرأت نہ تھی۔ ناصرہ باجی ہمیشہ تائی جی کو بھڑکایا کرتیں۔

"امی آپ ابا سے کہہ دیجئے نا یا تو وہ اب اس طرز زندگی کو ختم کر دیں یا آپ کو میکے بھجوا دیں، دیکھئے نا۔ آخر ہم لوگوں کی بھی کچھ خواہشیں ہیں۔ میں اس طرح دادا ابا کے پسند کئے ہوئے کپڑے ہرگز نہیں پہن سکتی۔ میں آپ کی طرح خود کو اس وضع داری کے بھاری بوجھ تلے نہیں دبا سکتی۔ آپ آخر اتنی بزدل کیوں ہیں"۔ تائی جی آنسو بہانے لگتیں۔

"نہیں منو میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتی۔ یہ تو ہمارے خاندان کا صدیوں پرانا دستور ہے۔ نہیں مجھ سے یہ ختم نہیں ہو سکتا"۔

"لیکن امی۔ اب دیکھو نا زمین داریاں ختم ہو رہی ہیں دادا جی اکیلے کہاں سے لاتے رہیں گے سب کے دوزخ بھرنے کے لئے، اعجاز بھائی سوال کرتے۔

"تم کیوں فکر کرتے ہو اعجاز میاں۔ وہ جانیں ان کا کام"۔ تائی جی اپنے بچوں کے سوالات سے گھبرا جاتیں۔ اعجاز اور ربیا اسکول جاتے تو انہیں دو دو پیسے روز ملا کرتے تھے۔ مجھے اور ناصرہ آپا کو کتنی حسرت تھی کہ ہمیں بھی کسی طرح روز دو پیسے ملیں اگر ایسا ہونے لگے؟ ہم یہ سوچ کر ہی کتنے خوش ہوتے تھے۔ مگر دادا ابا کو کہاں فرصت تھی جو ان سے کہہ دیتے وہ تو سارا سارا دن بیٹھک میں بیٹھے منشی جی سے مشورہ کیا کرتے مطمئن بھی اور پریشان بھی مطمئن تو اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ وہ جو جی چاہے کریں کوئی کچھ کہہ نہیں سکتا اور پریشان کیوں تھے شاید اس لئے کہ دبی چنگاریاں کبھی کبھار اڑ کر ان کے دامن تک پہنچ جایا کرتیں۔ تایا ابا اور ابا جی بھی اب فکر مند رہا کرتے تھے۔ بدلتے ہوئے حالات نے انہیں بڑا اداس کر دیا تھا پر دادا ابا سے کبھی ذکر نہ کرتے تھے۔ کبھی اگر سیاست پر گفتگو ہوتے ہوتے بات جاگیرداری نظام کے خاتمہ تک آ جاتی تو دادا ابا بوکھلا جاتے۔

"ختم ہو رہا ہے تو ہونے دو ہمیں کاہے کی فکر۔ اللہ نے پیٹ دیا ہے تو رزق کا وعدہ بھی فرمایا ہے"۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ آسمان سے من و سلوا نہیں اترے گا۔ پھر بھی خدا کی قدرت سے بڑی آس تھی۔

"رب کا بھروسہ کر" دادے ابا کی اس آس کو ابا اور تایا ابا کیونکر توڑ دیتے۔ انہیں بھی باپ کے سامنے نگاہیں اٹھانے کی ہمت نہ تھی پر اعجاز بھائی اور بھیا خدا کی ذات پر بھروسہ نہ کر سکے۔ ادھر خدا دادا ابا کے لئے ڈھال تھا تایا ابا اور ابا جی اسی سکون کی وجہ سے مزے سے پڑے اپنی بیویوں سے لڑا کرتے۔ لیکن بھیا، اعجاز بھائی اور ناصرہ آپا کیسے باغیانہ خیالات رکھتے تھے۔ رات دن انہیں یہ فکر کھائے جاتی۔ سب کچھ ختم ہو رہا ہے تو یہ ٹبر کہاں سے چلے گا۔ اعجاز بھائی اور بھیا نے کالج میں داخلہ لیا تو انہیں دو دو آنے روز ملنے لگے یہ تو اچھی خاصی نوابی تھی پر اس میں بھی ان کا خرچ پورا نہ ہوتا۔ ایک دن پتہ چلا کہ سگریٹ پینے کے لئے پیسے چاہئیں۔ آبا نے کبھی حقہ بھی نہ پیا دادا جی نے حقہ کے سوا سگریٹ کی شکل نہ دیکھی اور ان دونوں کے لئے سگریٹ کی ضرورت تھی۔ دونوں کا مزاج ہر وقت بگڑا رہتا اور ایک دن ان کے کسی دوست نے آکر بتایا دونوں نے کہیں نوکری کر لی ہے۔ اور چلے گئے۔ جس نے سنا دادا ابا کے پاس دوڑا چلا آیا آج تو سب کو موقعہ ملا تھا۔ دادا کے علاوہ گھر میں سب ہی یہ خبر سنکر مسکرا دیئے۔ ایک عجیب سی مسکراہٹ نیند ٹوٹنے سے پہلے جاگنے پر جو کروٹ بدلی جاتی ہے۔ بالکل یہی کیفیت تھی۔ لیکن دادا ابا تو جیسے حرکت کرنا بھول گئے تھے۔

"کیوں۔ آپ کے پوتے چلے گئے نا دوسروں کی خوشامد کرنے چند ٹکوں کے لئے؟" لوگ آ آکر کہتے۔ "رئیسوں کی اولاد کو کیا ضرورت تھی ملازمت کی۔" دادا ابا یہ سب باتیں سنتے۔ جواب دیں تو کیا۔ بس کبھی مردانے سے اٹھکر اندر آجاتے تو سفید داڑھی میں ننھے ننھے شبنمی قطرے ٹکے ہوتے۔ جانے یہ کیسے قطرے تھے احساس ندامت کے یا۔۔۔ ان آنسوؤں نے کلیجہ مسوس کر رکھ دیا۔ وہ ان دونوں کے جانے سے نہیں رو رہے تھے۔ وہ تو اس لئے رو رہے تھے کہ ان کے اجداد کے بنائے ہوئے خاندانی عزت اور شرافت کے ستون لرزنے لگے تھے۔

انہیں دنوں حضرت شاہ ولایت کا عرس آگیا۔ دادا ابا پھر سب چھوڑ چھاڑ کر اس میں مصروف ہو گئے۔ ہر سال کی طرح اب بھی عرس بہت زوروں میں ہو رہا تھا۔ ساری حویلی پر سفیدی ہوئی، ہفتوں سے پہلے سے دعوتیں شروع ہوئیں، قرب و جوار کے سارے صوفیائے کرام کو بلایا گیا تھا مشہور قوالوں کی ٹولیاں باہر سے آئی تھیں۔ یہ عرس ہمارے خاندان میں ہمیشہ سے ہوتا چلا آ رہا تھا۔ ہمیشہ ہی اسی پیمانے پر ہوا ہے۔ لوگ کہتے ہیں شروع سے آخر تک اس میں رتی برابر فرق نہیں ہوا ہے، ہم بھی یہی سوچتے جب ہمارے پاس اتنا پیسہ ہے تو آخر کیا ضرورت تھی بھیا اور اعجاز بھائی کو جو چلے گئے۔ در در کی ٹھوکریں کھانے۔ ہاتھ پاؤں توڑ کر کھائیں گے۔ یہاں جو آرام سے مل رہی تھی وہ قبول نہ کی۔ دادا ابا کو بڑھاپے میں الگ دھکا دیا۔ اب وہ گئے تو ناصرہ آپا ہیں۔ گھر بھر میں مہمان بھرے پڑے ہیں۔ محتاجوں کی فوج حویلی کے پھاٹک پر کھڑی گھر والوں کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہی ہے اور ناصرہ آپا ہیں کہ اس پر خوش نہیں ہوتیں الٹی غصہ سے بھری پھر رہی ہیں۔

"یہ بھی کوئی بات ہوئی گھر والوں کو تو کوڑی کوڑی کو ترساتے ہیں اور اپنی شان دکھانے کے لئے اتنا روپیہ خرچ کر رہے ہیں۔" تائی جی بے چاری چپکے چپکے سمجھایا کرتیں۔

"بٹو اس میں دخل نہ دو۔ یہ تو ضروری چیز ہے جو شروع سے ہوتا آیا ہے اسے کیسے ختم کر دیں۔ خاندانی وقار بھی کوئی چیز ہے۔ انوار اور اعجاز نے کون سے کم دکھ دیتے ہیں جو تم فضیحتا کر رہی ہو۔" ناصرہ آپا بلک جاتیں۔

"انھوں نے اچھا کیا۔ دیکھ لینا ایک دن مجھے بھی نوکری کرنی پڑے گی۔"

"توبہ کر منحوس بے شرم۔ ڈدبمر، ایسی باتیں کرتے ہوئے تجھے غیرت نہیں آتی۔ لڑکی ہو کر نوکری کرے گی۔ اس سے پہلے موت نہ آجائے تجھے۔"

جیسے تیسے عرس گزرا۔ زندگی پھر معمول پر آگئی۔ دادا ابا اب زیادہ وقت عبادت میں گزارتے۔ منشی جی سے مشورے بھی کم ہو گئے تھے۔ گاہے گاہے ان کی زبان سے یہ جملہ نکلتا۔

"اللہ بڑا رحیم ہے۔ اپنا فضل کرے گا۔"

ایک دن جبکہ دادا ابا منشی جی کے ساتھ اپنے کسی بچے کھچے گاؤں گئے ہوئے تھے۔ ابا جی تایا ابا حسب معمول گھر میں تھے۔ چونگی کے محرر کا ملازم آگیا۔

"مالک نے کہلوایا ہے اوپر کا حصہ جلدی خالی کرادیں"

"اوپر کا حصہ ؟"

"کیوں جی کیوں خالی کرادیں!" گھر میں ہر شخص کے چہرہ پر مختلف قسم کے سوالات بکھرے ہوئے تھے۔

"واہ جی واہ" اس آدمی نے عجیب سا منہ بنایا جیسے آپ کو کچھ پتہ ہی نہیں۔

"کیا پتہ نہیں ؟ آخر بات کیا ہے" تایا ابا بہت جوش میں بھر کر گھر سے نکلے۔

"عرصہ سے پہلے آپ کے اباجی نے وہ حصہ ہمارے مالک کے ہاتھ بیچ دیا تھا"

"اچھا!" تایا ابا اور اباجی جیسے پتھر کے بت بن گئے تھے۔ اس کو بمشکل رخصت کر کے اندر آئے تو جیسے زبان بند ہوگئی۔

"اسے کیا کہہ رہا تھا کیوں آیا تھا؟" دادی جی کچھ کچھ بھانپ گئی تھیں۔

"اس لئے آیا تھا کہ آبا کے کرتوت بتائے"۔

"کرتوت کیسے کرتوت ؟ کون سے حرام کئے ہیں تمہارے باپ نے"۔

"اماں جی تم سمجھا کرو۔ اب سر چھپانے کی جگہ بھی نہ رہے گی۔ اباجی نے اوپر کا حصہ فروخت کردیا۔ خالی کرانے کو کہنے کو آیا تھا" ہر فرد اپنی جگہ سہم گیا دادی ایک ایک کے آگے ہاتھ جوڑ رہی تھیں۔

"خدا کے لئے ان سے ذکر نہ کرنا کہ ہمیں مکان کے بیچنے کی بات معلوم ہوگئی ہے۔ ورنہ وہ تو کچھ کھا کر سو رہیں گے۔ تم پھر بھی بچے ہو انہوں نے جو کچھ کیا اچھا کیا"

دادا ابا آئے تو حالات کا رخ دیکھ کر سب ہی سمجھ گئے۔ لیکن صرف اتنا ہی کہہ سکے۔

"وہ ہے نا چنگی کا محرر۔ وہ بے چارہ گھر کے لئے بڑا پریشان تھا۔ میں نے سوچا اوپر خالی پڑا ہے تو اسے ہی کچھ دن کے لئے دے دوں" پھر ایک دن اوپر والا حصہ آباد ہوگیا جن لوگوں نے کبھی ہماری ڈیوڑھی پر قدم رکھنے کی جرأت نہ کی تھی اب بے روک ٹوک اوپر آیا جایا کرتے تھے۔ ہم سب بیٹھے تماشہ دیکھا کرتے۔

اندر ہی اندر یہ لاوا پک رہا تھا تایا ابا اور تائی جی کی لڑائیاں کچھ زیادہ ہی ہوگئی تھی۔ انہیں فکر تھی کہ ناصرہ جوان ہوگئی ہے جتنی جلدی ہو اس کی شادی ہوجائے۔ پر یہ پتہ نہ تھا کہ دادا ابا ناصرہ آپا کی شادی کے لئے کیا کر رہے تھے۔ تائی جی چاہتی تھیں۔ ناصرہ آپا کو فیشن کے مطابق جہیز دیں۔ دادا ابا چاہتے تھے سارا شہر مدعو ہو۔ دونوں پہلے مہمان داریاں شروع ہوں۔ دادی کے سوا سب ہی ان کی اس رائے کے مخالف تھے۔ محمود بھائی کے یہاں سے شادی کے تقاضے بہت زوروں میں ہو رہے تھے محمود بھائی پورے پورے انگریز تھے شادی بالکل سادہ طریقے سے کرنا چاہتے تھے۔ ادھر دادا ابا کی ضد زور پکڑتی جارہی تھی۔ دادا ابا چاہتے تھے شادی کچھ روز ملتوی ہوجائے۔ محمود بھائی اس کے لئے تیار نہ تھے۔ ناصرہ آپا بے چاری چڑچڑی سی ہوگئی تھیں پھر جو ان کی لگی کہ جس کے بوجھ تلے پھل دار درخت کی طرح جھکی جارہی تھیں کبھی روتیں کبھی گھنٹوں جانے کیا سوچا کرتیں۔

سردیوں کی ایک خوفناک سرد شام کو دادا ابا جب گاؤں سے لوٹے تو بڑے پریشان اور اداس سے تھے۔ نہ انہوں نے کسی سے خیریت معلوم کی نہ کسی سے بولے۔ رات گئے تک اپنے کمرے میں ہی رہے۔ دادی نے کئی بار کھانے کے لئے بلایا پر وہ باہر آنے کا نام نہ لیتے تھے۔ بس دوسرے دن اتنا سب ہی نے سنا کہ ناصرہ آپا نے خفیہ طریقہ سے محمود بھائی سے شادی کرلی ہے۔ محمود بھائی انہیں چند دن کے بعد کہیں اور لے جائیں گے۔ سب کے لئے یہ خبر ایٹم بم کی طرح تھی جس کے پھٹنے سے سب ہی دھم سے ہوگئے۔ لیکن دادا ابا پر اس خبر کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ناصرہ آپا خوف کے مارے کمرے کے اندر بند پڑی تھیں۔ اور محمود بھائی یہ خبر سن کر کہیں چلے گئے تھے۔ دادا ابا سارے شہر کا چکر لگا کے آئے۔ راستہ بھر لوگوں نے ان سے طرح طرح کے سوالات کئے۔ لیکن دادا ابا

نے بہت مسکرا مسکرا کر سب کو جواب دیا

"کوئی حرام تو نہیں کیا میری پوتی نے۔ نکاح کر لیا ہے" گھر میں آئے تو دادا ابا کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ خدا جانے غصہ سے یا ندامت سے۔ اولا آنکھیں اللہ۔ مجھے بہت ڈر لگا۔

"ناصرہ کہاں ہے؟" سارا گھر خوف سے کانپنے لگا۔

"وہ۔ وہ" دادی کی آواز کانپ رہی تھی۔ اپنے کمرے میں ہے"

"بلاؤ۔ دادا ابا کی حالت اس سپاہی کی سی ہو رہی تھی جو ساری جنگ میں بہادری اور جوانمردی سے مقابلہ کرتا رہا ہو۔ باوجود اس کے کہ شکست کا یقین ہو۔ ناصرہ آپا خوف اور دہشت کے مارے کانپ رہی تھیں۔ دادا ابا نے ایک نظر انہیں دیکھا اور گلے سے لگا لیا۔

"تو ڈر رہی ہے میری بہادر بیٹی۔ تو نے تو بہت اچھا کیا" دادا ابا کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے" تو ایسا نہ کرتی تو کل یہ مکان نیلام ہو جاتا۔ لیکن یہ لوگ۔ یہ جو میرے پیچھے ہمارے خاندانی وقار اور روایتوں کا جنازہ اٹھائے۔ میرے اوپر ہنستے چلے آ رہے ہیں۔ انہیں کون روکے گا۔ تم۔ الغرض یا العجلز۔ آخر کون۔ جاؤ تم میرا منہ کیا تک رہے ہو۔ جاؤ تم سب نوکریاں کرو میرے پاس کچھ نہیں رہا۔ کچھ بھی نہیں میرے ہاتھ بالکل خالی ہو گئے ہیں۔ دادا ابا چیخ پڑے اور ایک دم اس بوڑھے درخت کی طرح زمین پر آ رہے جو ہزاروں طوفان سہ کر بھی اپنی جگہ مضبوطی سے کھڑا رہا لیکن ایک ذرا سے جھونکے نے اس کو گرا دیا۔ ہم بے تحاشا دوڑے۔ مگر وہ تو سب کے درمیان بے حس و حرکت لیٹے تھے اور اپنی شکست کا اعلان کر رہے تھے۔ اور سب کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک پڑے مگر سب کے چہروں پر ایک عجیب سکون کی سی کیفیت تھی۔ ایک ایسی کیفیت جو بیمار پر تکلیف کی رات گذارنے کے بعد سحر کے قریب طاری ہوتی ہے نئی صبح کی آمد کے انتظار کی کیفیت۔

تین گوش

سریتا - دہلی

ایک قتل جو قتل نہیں تھا!

۹ اکتوبر ۱۹۴۹ء کی بات ہے۔ ویریندر مالویہ نام کے ایک شخص نے ناگپور کے پولیس اسٹیشن میں اطلاع دی کہ کرنی شخص دتو پٹیل جو اس کے مکان کے ایک حصہ میں رہتا تھا، ۸ اکتوبر سے لاپتہ ہے۔ دتو اپنے کنبے اور اپنی ماں کے ساتھ گنج میٹھ، ناگ پور میں رہتا تھا۔ اور آٹھ اکتوبر کو دن کے تین بجے کے قریب اپنے گھر سے سائکل پر گیا تھا۔ اس کے بعد نہ وہ گھر واپس آیا۔ اور نہ اس کے بارے میں کچھ پتہ چلا۔ وہ مدھیہ پردیش میں واردھا ضلع کے تاردوہ گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اور ناگ پور میں اپنی روزی کما رہا تھا۔ مالویہ نے اس کی بہت تلاش کرنے کے بعد پولیس کو اطلاع دی تھی۔

پولیس نے حسب معمول معاملہ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور گم شدہ شخص کے بارے میں تحقیقات کی۔ لیکن اس شخص کا پتہ نہ چل سکا۔ تاردوہ گاؤں میں بھی تحقیق کرنے سے کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ جب ۱۰ تاریخ تک پٹیل یا اس کی سائکل کا کچھ پتہ نہ چلا تو پولیس انسپکٹر چوکنا ہوگیا اور اسے شبہ ہوا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے اور اس بات کے مدنظر کہ پٹیل کے اپنے گھر والوں سے نہایت خوش گوار تعلقات تھے۔ یہ امکان بھی نہ تھا کہ وہ اپنی مرضی سے گھر سے بھاگ گیا ہو۔

اس قسم کی گتھی کو سلجھانے کے لیے پہلا قدم اس سوال کے جواب پر منحصر تھا کہ پٹیل کو اغوا یا ختم کرنے کا ارادہ کس شخص کا ہو سکتا ہے؟ اس کے غائب ہو جانے سے کس کو فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ ان سوالات کا مناسب جواب انسپکٹر کے پاس کوئی نہ تھا۔

اس خیال سے کہ دتو پٹیل کے کمرے کا جائزہ شاید کچھ مدد دے سکے، انسپکٹر اس کے گھر گیا۔ اور اس نے مالویہ سے کہا کہ وہ اسے دتو کے کمرے میں لے جائے۔ وہاں پہنچ کر انسپکٹر نے مکمل اور باقاعدہ جائزہ لیا۔ ایک کے بعد ایک صندوق کھولا گیا۔ الٹے پلٹے گئے اور ان میں جو کچھ پڑا تھا اس کا بغور معائنہ کیا گیا۔ کمرے کے کونے میں لکھنے کی میز پر کچھ کاغذات بکھرے پڑے تھے۔ اور کچھ مزید کاغذات پتھر کے ایک پیپر ویٹ کے نیچے پڑے تھے۔ انسپکٹر نے میز کی دونوں درازیں دیکھیں لیکن ان سے بھی کچھ پتہ نہ ملا۔ اس کے بعد انسپکٹر نے ان کاغذات کو دیکھنا شروع کیا۔

اچانک اسے یوں محسوس ہوا گویا کسی نے اسے گولی دے ماری ہو۔ اور وہ اپنے ہاتھ میں ایک کاغذ لیے سامنے پڑی کرسی میں جا دھنسا۔ یہ ایک خط تھا، جو آدھے فل سکیپ کاغذ پر لکھا ہوا تھا۔ اور خط میں دتو سے خطاب تھا۔ خط کی تحریر یوں تھی:-

"دتو پٹیل کو سلام۔ تم مجھے آج ہی فوراً ملو۔ اور وقت سے آگاہ کرو۔" خط پر آر۔ جی۔ لیسے، کے دستخط تھے۔ اور اس پر ۸ اکتوبر ۱۹۴۹ء کی تاریخ پڑی ہوئی تھی۔ آخر کار ایک ایسا سراغ مل ہی گیا تھا، جس کی بنا پر پولیس اپنا پہلا قدم اٹھا سکتی تھی۔

انسپکٹر نے کمرے کا جائزہ فوراً ہی قلمبند کیا۔ اور باہر بیٹھنے کے کمرے میں آکر آر۔ جی۔ لیسے اور دتو سے اس کے تعلقات کے بارے میں مالویہ سے

تفصیل کے ساتھ پوچھا۔ اُس نے لسے کا ایڈریس نوٹ کیا۔ اور یہ ملاقات ختم کر کے وہ سیدھا لسے کی کوٹھی کی طرف چل دیا۔ وہاں پہنچ کر تحقیق کرنے سے انسپکٹر کو حیران کن حقائق کا علم ہوا۔

رام کرشن جی لسے ناگ پور ہائی کورٹ کا ایک ایڈووکیٹ تھا۔ اور تین منزلہ عمارت میں رہتا تھا۔ اُس کا دفتر دوسری منزل پر تھا۔ جہاں وہ اپنے موکلوں سے ملا کرتا تھا۔ اور اُس کے بیٹے کا کمرہ تیسری منزل پر تھا۔ دتو پٹیل اس کا دوست تھا۔ اور گاہے گاہے اُس سے ملتا رہتا تھا۔ اور اپنی گھریلو مشکلات کے بارے میں بھی اس سے صلاح مشورہ کیا کرتا تھا۔ لسے کے مکان کو شرابیوں اور گانجا پینے والوں کا اڈا بتایا گیا۔ اور دتو اور لسے کے کچھ اور دوست وہاں آ کر گانجا اور شراب پیا کرتے تھے۔

اپنی گمشدگی کے کچھ ماہ پہلے دتو کا لسے سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ اور دونوں کے تعلقات میں بہت زیادہ کشیدگی آ چکی تھی۔ جس کے نتیجے میں دتو نے لسے کے خلاف افواہیں پھیلانا شروع کر دی تھیں۔ اُس نے مالویہ اور دوسرے لوگوں کو بتایا تھا کہ لسے نے دھوکے سے اُس سے ہزاروں روپے وصول کیے ہیں۔ اور نیز یہ بھی کہ وہ چوروں کا ساتھی تھا۔ دوسروں سے چوریاں کرایا کرتا تھا۔ اور چوری اور لوٹ کے مال کا برابر حصہ وصول کیا کرتا تھا۔ لسے نے دتو پر الزام لگایا تھا کہ وہ اُس کی بدنامی کر رہا ہے اور دھمکی دی تھی کہ اگر تم نے اپنا ہتک آمیز پروپیگنڈا بند نہیں کیا تو وہ اُسے مروا بھی دے گا۔

یہ غیر معمولی اطلاع پا کر انسپکٹر ہنگامہ خیز حالات پیدا ہونے کے بارے میں جان گیا۔ اگر دتو اور ایڈووکیٹ کے تعلقات اس حد تک خراب ہو چکے تھے تو پھر اُس نے دتو کو وہ خط کیوں لکھا جس میں [illegible] نے گھر بلایا تھا؟ کیا دتو نے اس خط کا کوئی جواب دیا تھا؟ کیا اُس نے لسے سے کوئی ملاقات کا وقت طے کیا تھا؟ جس کے نتیجے کے طور پر ۸ اکتوبر کو وہ اُس سے ملا ہو؟ یہ وہ اہم سوالات تھے۔ انسپکٹر نے محسوس کیا کہ ایڈووکیٹ سے سوالات کرنے سے پہلے ان سوالات کا جواب جان لینا بہت ضروری ہے۔ اگر دتو کی گمشدگی میں ایڈووکیٹ کا ذرا بھی ہاتھ ہے تو پھر ایک معمولی نوعیت کے شخص سے اس کا پالا نہیں پڑ رہا ہے۔

کچھ گھنٹے بعد انسپکٹر کو عام لباس میں لسے کے گھر کے آس پاس کوٹھی کے قریب بے فکری سے چہل قدمی کرتے دیکھا گیا۔ لگ بھگ ایک گھنٹہ کے قریب گھومنے پھرنے کے بعد اور لسے ہی کچھ پڑوسیوں سے بات چیت کرنے کے بعد انسپکٹر کو ایک بہت بڑے سوال کا جواب مل گیا تھا۔ کہ ۸ اکتوبر کو دتو پٹیل شام کے پانچ بجے کے قریب لسے کے گھر سائیکل پر آیا تھا۔ اور پھر اُسے واپس جاتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ ۸ اکتوبر کی شام کو آٹھ بجے کے قریب ایک گھٹی ہوئی تیز چیخ لسے کے مکان کی تیسری منزل سے سنائی دی تھی۔ جس نے کچھ پڑوسیوں کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ اور وہ محض اشتیاق کے طور پر جاننا چاہتے تھے کہ کیا ہو رہا ہے، لیکن لسے کی ماں نے یہ کہہ کر ان سب کو واپس بھیج دیا تھا کہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔

معاملے کی اس صورت حال نے انسپکٹر کو حیران کر دیا۔ کیونکہ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ جب دتو شام کے پانچ بجے لسے کے گھر میں داخل ہوا تھا، تو اس کا کیا ہوا؟ پڑوسیوں نے کس کی تیز چیخ سنی تھی؟ ان سوالوں کا جواب کون دے؟ یقیناً ان کا جواب کوئی باہر کا شخص نہیں دے سکتا تھا۔ بلکہ وہی دے سکتا تھا جو اُس چھت کے نیچے رہتا ہو۔ اُس نے منطق لڑائی کہ دتو کو غائب کرنے کے لیے لسے کے پاس موقع بھی تھا، اور ارادہ بھی۔ لیکن محض ارادہ اور موقع مناسب کچھ نہیں ہے۔ جرم کے سرزد ہونے کا ٹھوس ثبوت بھی ہونا چاہیے۔ ایک ایسا ٹھوس ثبوت جو جرم کا ارادہ اور موقع تلاش کرنے والے شخص کے جرم سے تعلق قائم کرے۔ انسپکٹر نے واضح طور پر محسوس کیا کہ اس کڑی کو ملانے والا حصہ اُس گھر میں رہنے والا کوئی شخص ہی فراہم کر سکتا ہے۔

اس ضمن میں پڑوسی لوگوں سے متعلقہ اطلاع مل سکی تھی ان میں سے لسے کے گھر والوں کو خارج کر دیا گیا۔ ہاں اگر لسے کا کوئی نوکر ہو تو وہ اس معاملہ میں کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ واقعات کے اس منطقی تجزیے سے بہت مفید نتائج برآمد ہوئے۔ ۱۱ اکتوبر کو پندرہ برس کا ایک نوجوان لڑکا گنپت جو لسے کا نوکر تھا، اُسے ایک پولیس افسر نے انسپکٹر کے سامنے پیش کیا۔ گنپت کا خوفزدہ چہرہ اور حیرت زدہ نظروں نے انسپکٹر پر فوراً واضح کر دیا کہ

وہ کوئی راز چھپائے بیٹھا تھا، اور وہ بھی بڑی مشکل سے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں انسپکٹر وہ سب کچھ جان گیا جو گنپت جانتا تھا۔
۸ اکتوبر کو لسّے دوسری منزل پر اپنے دفتر میں اپنی بیوی کے بھائی کشن راؤ اور اپنے مؤکل سالگ رام کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ پانچ بجے کے قریب دتّو وہاں آیا۔ دتّو کے وہاں پہنچنے کے فوراً بعد وہ لسّے کے ساتھ تیسری منزل والی بیٹھک میں چلا گیا۔ اور پھر وہاں سے باہر نہیں نکلا۔ بعد ازاں شام کے آٹھ بجے کے قریب جب گنپت کچن میں کام کر رہا تھا اُس نے اوپر والے کمرے سے ایک دل دوز چیخ سنی۔ "باپ رے! میں مر گیا!" اور ایک زبردست اشتیاق کے تحت وہ یہ دیکھنے کے لیے اوپر گیا کہ بات کیا ہے؟

لسّے کے دفتر میں کسی کو نہ پاکر گنپت تیسری منزل پر گیا۔ اُس نے بیٹھک کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ لیکن دروازے کو اندر سے بند پایا۔ دروازے کی ایک درز سے اُس نے دیکھا کہ دتّو پیٹھ کے بل فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ کشن راؤ نے اُس کے بال مضبوطی سے پکڑ رکھے تھے۔ سالگ رام نے اُس کی ٹانگیں پکڑ رکھی تھیں۔ اور لسّے ہاتھ میں تلوار لیے فرش پر لیٹے ہوئے آدمی پر جھکا ہوا تھا۔ گنپت اتنا خوفزدہ ہو گیا کہ مزید کچھ نہ دیکھ سکا۔ وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ اس کے بارے میں اُسے کچھ معلوم نہ تھا۔

اُسی دن پولیس نے لسّے کے مکان پر چھاپہ مارا۔ جب یہ پتہ چلا کہ لسّے کچھ دن پہلے ناگ پور سے باہر جا چکا ہے۔ مکان کی نچلی دو منزلوں میں پولیس کو کوئی خاص مشتبہ چیز نہ ملی، لیکن جب وہ تیسری منزل پر پہنچے تو اُنھیں ایک کمرے سے آتی ہوئی گندی سڑاند نے چونکا دیا۔ کمرے کی تلاشی لینے پر انسپکٹر کو اینٹوں اور سیمنٹ سے بنی ہوئی ایک تازہ قبر ملی جس میں سے یہ گندی بدبو آ رہی تھی جب قبر کو کھودا گیا تو اس میں سے ایک گلا سڑا جسم برآمد ہوا جسے دتّو کے بدقسمت اہل و عیال نے شناخت کیا کہ یہ جسم دتّو ہی کا ہے۔ اس طرح دتّو کے غائب ہو جانے کا مسئلہ حل ہو گیا۔
لسّے کا ناگ پور میں کہیں پتہ نہیں چلا۔ پھر بھی ۱۴ اکتوبر کو کشن راؤ گرفتار کر لیا گیا۔ اور وہ پولیس کو اُس کنویں تک لے گیا جہاں سے اُس سائیکل کے کچھ حصّے برآمد ہوئے تھے، جس پر سوار ہو کر دتّو لسّے کے گھر آیا تھا۔ اُسی دن سالگ رام بھی گرفتار کر لیا گیا۔ اور اُس نے سائیکل کے باقی حصّے پیش کر دیے۔
ایڈووکیٹ کے گھر سے اس عجیب و غریب معلومات کی خبر سارے ناگ پور میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اور ہائی کورٹ اور ڈسٹرکٹ کورٹ دونوں کی بار ایسوسی ایشن میں ایک زبردست ہلچل اور سنسنی سی پھیل گئی۔ ایک بہت ہی زبردست ہنگامہ خیز ٹریجڈی ظہور پذیر ہوئی تھی۔ اور دوسرے دن تک یہ سب کو پتہ چل گیا کہ مفرور ایڈووکیٹ کے خلاف گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیے گئے ہیں۔
۱۶ اکتوبر ۱۹۴۹ کو لسّے نے اپنے آپ کو بنارس میں پولیس کے حوالے کر دیا۔ جہاں سے کہ وہ بھاری پولیس گارڈ کے ساتھ ناگ پور لایا گیا۔
مقدمے کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد، لسّے، کشن راؤ اور سالگ رام کا مقدمہ ناگ پور کے سیشن جج کے سامنے پیش کیا گیا۔ اور ان پر ان الفاظ میں الزام عائد کیا گیا: "تم نے ۸ اکتوبر ۱۹۴۹ یا اس کے لگ بھگ ناگ پور میں قتل کیا۔ اور ارادۃً دتّو پٹیل کو موت کے گھاٹ اتار دیا..."
اس لیے مقدمے کے دوران استغاثہ کی طرف سے تیس سے زیادہ گواہوں کو پیش کیا گیا۔ اور انھوں نے جو کہانی بتائی وہ ہم اوپر بتا ہی چکے ہیں۔ لسّے کے گھریلو نوکر گنپت اور مالویہ، مرحوم دتّو کے دوست، یہ دو بہت ہی اہم گواہ تھے۔ مقدمے کے دوران کورٹ کا کمرہ پبلک اور وکیلوں سے کھچا کھچ بھرا رہتا تھا۔
ایڈووکیٹ لسّے، ملزم نمبر ۱ کو جب اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے کہا گیا تو اُس نے بیان دیا: "میں یہاں موجود نہ تھا۔ لہٰذا مجھے کوئی علم نہیں کہ دتّو پٹیل کیسے مرا۔ اور میرے گھر میں اُس کی لاش کیسے دفنائی گئی۔ یہ سارا حادثہ اتفاقیہ موت نظر آتا ہے۔ اور میری غیر موجودگی میں کسی اور شخص نے جان بوجھ کر وہ لاش میرے گھر میں دفنا دی۔"

کشن راؤ ملزم نمبر ۲ نے لسے کی غیر موجودگی کے بیان کی تائید کی۔ اُس نے مزید کہا کہ دتو لسے کی غیر موجودگی میں شام کے وقت چار اشخاص کے ہمراہ لسے کے گھر آیا تھا۔ نیز یہ کہ اُس نے وہاں کھانا کھایا شراب نوشی کی اور اُس کی موت یک لخت واقع ہو گئی۔ اور وہ وہیں زمین ہی پر رہ گیا۔ جب اُسے اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے کہا گیا تو اُس نے کہا ”بھگاگو ری چیل، گنپت اور دوسرے لوگوں نے دتو کو شراب پیتے ہوئے اور دل کا دورہ پڑنے پر اُس کی موت واقع ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے اُنھیں بہت سخت سُست کہا۔ اور نظر آتا ہے کہ ان لوگوں نے اور دو مردوں نے جان بوجھ کر لاش کو اس طرح ٹھکانے لگا دیا ہوگا۔ میں قطعی طور پر بے گناہ ہوں“

ملزم نمبر ۳ سالگ رام نے واقعہ سے متعلق اپنی قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔ اور اس بات سے بھی لاعلمی ظاہر کی کہ مرحوم کی لاش کو وہاں کس طرح دفنایا گیا۔ اُس نے کہا ”میں بالکل بے گناہ ہوں“

اپنی غیر موجودگی کے بیان کی حمایت کرتے ہوئے لسے نے ایک تفصیلی بیان دیا۔ جس کے مطابق وہ آٹھ تاریخ کو وقت دوپہر ناگ پور سے امراوتی کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ دتو اُس کے جانے کے بعد اُس کے گھر پر آیا تھا۔ اور ناگ پور سے جانے کے بعد جب تک لسے نے ۱۹ تاریخ کو بنڈارس میں اپنے آپ کو پولیس کے حوالے نہیں کیا اُس وقت تک وہ واپس ناگ پور نہ آیا تھا۔

لسے کی غیر موجودگی کی اس عذر کو نہ اس عدالت نے تسلیم کیا نہ اپیل کی جانے والی عدالت نے۔ بلکہ اس کے برعکس ریکارڈ میں یہ ثابت کرنے کے لیے بہت سے ثبوت موجود تھے کہ ۱۱ تاریخ کی شام تک اور ۱۲ تاریخ کو وارنٹ تلاشی نکلنے پر لسے اپنے اس گھر میں تھا جہاں دتو کی لاش کو دفنایا گیا تھا۔ اُس نے فی الواقع دتو کو خط لکھ کر بلایا تھا کہ وہ اس تاریخ کو اُس سے ملے۔ اور یہ بات ناقابلِ قبول تھی کہ کسی شخص یا کئی اشخاص نے مل کر اُس کی غیر حاضری میں اُس کی اجازت اور علم کے بغیر ایک مردہ شخص کو وہاں دفنانے کی جرأت کی ہو

ذہین پولیس انسپکٹر پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ لسے غیر موجودگی کی دلیل پیش کرے گا۔ لہٰذا انسپکٹر اس دلیل کو کاٹنے کے لیے لیے تمام ثبوت اکٹھے کرنے کے کام میں لگ گیا جس سے وہ بات غلط ثابت ہو سکے اور انسپکٹر نے یہ کام انتہائی محنت اور ہوشیاری سے کیا۔ لسے چونکہ ایڈوکیٹ تھا۔ لہٰذا کسی نہ کسی عدالت میں ۹ اور ۱۲ تاریخ کے درمیان یقیناً کسی نہ کسی مقدمے کے سلسلے میں پیش ہونا ہوگا۔ بڑی محنت اور باقاعدہ تحقیق کے ساتھ انسپکٹر نے متعلقہ ثبوت حاصل کر لیے اور لسے کی غیر موجودگی کی دلیل کو بے بنیاد ثابت کر دیا۔ لسے نے ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر ناگ پور کی عدالت میں ایک درخواست دی تھی۔ اس عدالت کے سامنے اُسے ۱۱ تاریخ کو ایک مقدمے کی پیروی کرنا تھی۔ اپنی درخواست میں لسے نے لکھا تھا۔ ”مجھے ریونیو اپیل نمبر ۱ تا ۴۴ ل۔ ف ۱۹۴۸۔۴۹ میں مدعی علیہ کی طرف سے ۱۱ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو پیش ہونا ہے۔ پچھلے چار روز سے میری صحت کچھ ٹھیک نہیں ہے لہٰذا آنجناب کی خدمت میں گزارش کرتا ہوں کہ اپیل کی سماعت کسی اور تاریخ کے لیے ملتوی کر دیجیے، میں ممنون ہوں گا“ اس درخواست پر لسے کے دستخط موجود تھے اور اس پر ۱۱ اکتوبر کی تاریخ پڑی ہوئی تھی۔

اِس نقطے پر بحث کرتے ہوئے عدالت نے اپنے فیصلے میں فرمایا۔ کہ ”اس خط میں جو بیان درج ہے وہ اس بات کا ٹھوس ثبوت ہے کہ ۱۱ اکتوبر ۱۹۴۹ء تک لسے اپنے گھر میں تھا جہاں کہ دتو کی لاش کو دفنایا گیا تھا۔

اپنے زبردست اور زوردار بیان میں کونسل کار ڈیفنس نے دعوے کیا کہ واقعاتی ثبوت علاوہ ازیں گنپت کے بیان کے کسی کو بھی اس ناقابلِ تردید بیان کے نتیجے پر پہنچا سکتے ہیں۔ کہ دتو کی موت کسی سازش کے تحت واقع ہوئی ہے۔ لسے کی اجازت کے بغیر دتو کی لاش کو لسے کے گھر میں دفنایا نہیں جا سکتا تھا۔ اور درحقیقت وہ اس کے لئے یقیناً ذمہ دار ہوگا۔ نیز ایسے کسی بھی ثبوت کی عدم موجودگی میں اس نے لاش کو دفنانے کے لیے ایسا غیر معمولی

ہربنس لعل ساہنی

تخلیق - نئی دہلی

مچھلے وال

پشاور ڈسٹرکٹ جیل کی بیرک نمبر ۲ کا پہرے دار بیرک کی فلک بوس مچان کی روباری میں لگے ہوئے اندھے بلب کی برائے نام روشنی میں پول سے لگا بیٹھا تھا۔ کبھی کبھی اس کے ان رٹے رٹائے جملوں "جاگتے رہنا" "سب ٹھیک ہے" وغیرہ سے بیرک کا سکوت ٹوٹ جاتا۔ پہرے داروں کی یہ آوازیں بعض اوقات مل کر عجیب ڈراونا اور خوفناک سا ماحول پیدا کرنے کا باعث بن جاتیں اور کوئی نیا قیدی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا۔

مچھلے وال اپنی بیرک میں سیمنٹ کی بنی ہوئی چارپائی نما چوکی پر جیل کے سیاہ کمبل میں لپٹا ہوا سونے کی سعی کر رہا تھا۔ آج پھر اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس جیل میں اس نے کم و بیش بارہ سال گزارے تھے۔ کبھی دو سال رہا تو کبھی چار سال۔ ان مجموعی اعتبار سے گزارے ہوئے بارہ سالوں میں ایک بالکل نئی شخصیت بن گیا تھا۔ ہر قیدی خواہ وہ اخلاقی قیدی تھا یا سیاسی، اس سے مانوس تھا۔ اس انس میں وہ ڈر بالکل شامل نہیں تھا جو جیل سے باہر شہر میں رہنے والے اس سے رکھتے تھے۔ شہر سے زیادہ سکون اسے جیل میں میسر تھا۔ گر گھر کی یاد کبھی کبھی اس کے لیے وبال جان ہو جاتی۔ ان بارہ سالوں میں چند ایک راتیں ایسی بھی تھیں جیسی کہ آج کی رات ——— آج پھر اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ چار قدم کی دوری پر دوسری سیمنٹ والی چوکی پر شہر کا بزرگ قومی رہنما مولا داد خاں خراٹے لے رہا تھا۔ مولا داد خاں شہر میں ریڑھی اور ٹھیلے والوں کی یونین کا صدر تھا۔ وہ پٹھان تھا۔ مگر اہنسا کا پجاری۔ سچائی اور عدم تشدد کا مضبوط اور توانا ستون۔ مولا داد کو انگریزی سرکار کے خلاف ایک عوامی جلوس کی رہنمائی کرنے کے قصور میں جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔ سیاسی قیدی ہوتے ہوئے بھی مچھلے وال جیسے خطرناک اور بدنام قاتل کی بیرک میں جگہ دی گئی تھی۔ ۔ مچھلے وال کو نیند کیوں نہیں آ رہی تھی؟ پہلے بھی چند ایک راتیں ایسی ہی آئی تھیں۔ جب وہ رات رات بھر جاگتا رہتا تھا۔ ان راتوں میں اسے اپنی بیوی کا خیال آتا تھا، جسے اس نے بڑی چاہ سے اپنے نکاح میں لیا تھا۔ جس کے رشتے کے لیے اس نے اپنے باپ سے مہینوں رات دن ایک کیے تھے، منتیں کی تھیں۔ چونکہ اس کا باپ ایسی لڑکی سے اپنے بیٹے کی شادی گوارا نہیں کر سکتا تھا جس کے آبا و اجداد کے ہاتھ ان کے خاندان کے ایک فرد کے خون سے لال تھے۔ لیکن عائشہ کی محبت نے مچھلے وال کے پٹھانی خون سے انتقام لینے والی گرمی کو سرد کر دیا تھا۔ اس کی محبت کی ضد نے اس کے باپ کو راضی کر لیا تھا۔ وہ عائشہ کو اپنی حویلی میں رکھ کر پھولا نہ سمایا تھا۔ اس کی چھاتی دو بالشت مزید چوڑی ہو گئی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی مونچھوں کے بال اور گھنے ہو گئے تھے۔ اور ان کی نوکیں اور نوکیلی ہو گئی تھیں۔

پہلی بار جیل میں آنے کے بعد ایک رات عائشہ جب اپنے ننھے شیرو کو اپنی گود میں لیے مچھلے والے کے خیال میں آئی تھی تو وہ اس رات اسی طرح کروٹیں لیتا رہا تھا۔ اس کی پلک نہیں جھپکی تھی۔ اسے مطلق نیند نہ آئی تھی۔ اس نے عہد کیا تھا۔ اب وہ اپنے غصے پر قابو رکھے گا۔ اب وہ کوئی قتل نہیں کرے گا۔ اب وہ کبھی جیل نہیں آئے گا۔ وہ شہر میں رہے گا۔ شریف شہری بن کر۔ وہ شہر میں رہے گا اپنے بیٹے شیرو کا مستقبل بنا کر۔ وہ اپنے گھر رہے گا

اپنی عائشہ کی خوشی بن کر ـــــ آج پھر اُسے نیند نہیں آرہی تھی۔ آج پھر عائشہ رہ رہ کر اسے گھور رہی تھی۔ اس سے پوچھ رہی تھی " پہلی بار جیل سے چھوٹ کر تم نے قسم کھائی تھی۔ تم نے وعدہ کیا تھا۔ وہ سب جھوٹ تھا کیا؟ اس درمیان تم مجھے اکیلا چھوڑ کر اور اپنے شیرو کو بے یار و مددگار چھوڑ کر تین بار اپنی جیل کی دنیا آباد کرنے نہیں گئے کیا؟ جیل سے ہر بار لوٹنے کے بعد تم نے جھوٹ کہا کہ اب تم کوئی قتل نہیں کرو گے۔ اب تم شریف بن کر رہو گے۔ اب تم بزدل بننا پسند کرو گے۔ اپنی شلوار کے نیفے میں اُڑسے ہوئے چاقو کو نہیں نکالو گے۔ تم نے کیا اپنی بات کا پاس رکھا؟ کیا تم پٹھان ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہو کیا تم نے بار بار کیے ہوئے عہد کو توڑ کر اپنے بزرگوں کی روح کو ذبح نہیں کیا؟ کیا تم نے شیرو کو بھی اس راہ پر لا کر نہیں چھوڑ دیا جس پر تم خود چل کر جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے تنگ و تاریک کوٹھریوں میں پڑے سڑ رہے ہو؟" مچھلے وال عائشہ کو کوئی جواب نہ دے سکا۔ اُس نے کروٹ بدل لی۔ عائشہ سے منہ چھپا لیا۔ آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن عائشہ تو جیسے اس کی بند آنکھوں میں چپکے سے اس کی پلکیں اُٹھا کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ آج اُس سے پختہ وعدہ چاہتی تھی۔

" مجھے قسم دو اپنے جوان شیرو کی۔ مجھے قسم دو اپنے رسول کی۔ اپنے خدا کی۔ مجھے قسم دو اپنے بزرگوں کی جنھوں نے قسم کا کبھی سہارا نہ لیا تھا۔ جو منہ سے نکلی ہوئی بات کو پورا کرنے کے لیے جان دے دیتے تھے۔ تمھاری طرح کسی کی جان لے کر اپنے عہد نہیں توڑ دیا کرتے تھے۔ مجھے قسم دو میری جان کی کہ اب تم خون نہیں کرو گے۔ اب تم خونی نہیں کہلاؤ گے۔ اب تم جیل میں نہیں رہو گے۔ مجھے قسم دو۔ قسم دو مجھے۔"

عائشہ جیسے سوئی کی نوک بن کر مچھلے وال کی آنکھوں میں چبھ گئی تھی۔ وہ چبھن سے نڈھال ہو کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر اپنی چوکی پر اُٹھ کر بیٹھ گیا ـــ

"یا میرے خدا، آج عائشہ کو ہوا کیا ہے؟"

بیرک کی تیسری منزل سے پہرے دار چیخ رہا تھا۔ " جاگتے رہنا" "سب ٹھیک ہے"۔ "جاگتے رہنا" مچھلے وال جاگ رہا تھا۔ مچھلے وال جاگ پڑا تھا۔ مچھلے وال اب نہیں سوئے گا۔ اُس نے عائشہ کو قسم دے دی تھی۔ اُس نے مولاداد کو شانے سے پکڑ کر ہلایا۔ "مولاداد خاں اٹھو، تم میری قوم کے رہنما ہو۔ تم میرے وطن کی آزادی کے لیے لڑ رہے ہو۔ مولاداد اُٹھو۔ اور اُٹھ کر میرے گواہ بنو۔ تمھارے سامنے میں حلف لینا چاہتا ہوں۔" مولاداد نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ کمبل کو اپنے شانے پر ڈال کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ حیرت زدہ نظروں سے مچھلے وال کو گھورتا ہوا بولا۔ "تمھیں ہوا کیا ہے۔ سوتے کیوں نہیں۔ کیا حلف لینا چاہتے ہو؟ اس وقت؟ کیسا حلف؟"

"میں حلف لینا چاہتا ہوں۔ میں توبہ کر رہا ہوں۔ جیل سے جانے کے بعد اب میں کبھی یہاں نہیں آؤں گا۔ اب کوئی قتل میرے ہاتھوں سے نہیں ہوگا۔ اب کسی کو یتیم نہیں بناؤں گا۔ اب کسی کو بیوگی نہیں دوں گا۔ اب کسی کا شیرا نہیں چھینوں گا۔ اب میں شہر کا امن بن کر رہوں گا۔ شہر میں میری موجودگی پولیس کے لیے مسرورانہ ہوگی۔ میں حلف لیتا ہوں۔ میں سچے دل سے اقرار کرتا ہوں خان، میں عائشہ کا شوہر بن کر رہوں گا۔ میں شیرو کا باپ بن کر رہوں گا۔" مچھلے کی آواز بھرّا گئی ـــ اس کی آنکھیں تر ہو گئیں۔ آج وہ زندگی میں پہلی بار شاید رویا تھا۔ مولاداد نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ مچھلے وال کانپ رہا تھا۔ وہ رو رہا تھا۔ مولاداد کو موت روتی ہوئی معلوم ہوئی مچھلے وال موت سے کم نہ تھا۔ اس کی قہر بھری نظر اپنے حریف کی موت تھی۔ سارے شہر میں وہ موت بن کر منڈلایا ہوا تھا۔ اُس کا سرخ شنگرف چہرہ۔ اُس کی لمبی لمبی مہندی رنگی مونچھیں۔ اُس کا استرے سے گھٹا ہوا سر اور ماتھے پر تنی ہوئی بھنویں اچھے اچھے "رشید دل" کے دل دہلا دینے کی ضامن تھیں۔ شہر کے بچے اُس کے ڈھیلے ڈھالے لباس سے اس لیے ڈرتے تھے کہ وہ بچوں کو اُٹھا کر اپنے کپڑوں میں چھپا لیتا تھا۔ اور انھیں آگ کے شعلوں میں بھون کر کھا جاتا تھا۔ یہ کہانیاں بچوں کو ڈرانے کے لیے اُن کی مائیں سنایا کرتی تھیں۔ ورنہ یہ سو فیصدی جھوٹ کے برابر سچ تھا۔ یہ محض دہشت تھی جو اس کے نام نے شہر میں پھیلا رکھی تھی۔ اس کی وجہ صرف وہ قتل جس مچھلے وال نے متعلق اسکے کے نیفے میں چھپے ہوئے کمانی دار چاقو سے کیے تھے۔ اس کی دہشت کی وجہ صرف

وہ قتل ہی نہ تھے۔ کیونکہ قتل تو پشاور شہر میں اکثر عام حالتوں میں عام لوگ بھی کر دیتے تھے۔ مگر مچھلے وال نے جتنے قتل بھی کیے ان سب کی ایک الگ الگ داستان بن گئی تھی۔ اور شہر میں پھیل گئی تھی۔ ایسی داستان جو ہر گھر میں سنائی گئی۔ ہر محلے اور ہر گلی میں دُہرائی گئی۔ ہر فرد بشر کی زبان پر رہنے لگی۔ اس نے جب پہلا خون کیا تھا تو اُس وقت سے پہلے لوگ اُسے اتنا ہی جانتے تھے کہ وہ ایک معمولی غنڈہ ہے، جو اپنی بیٹھک میں جوا کرواتا ہے۔ قمار باز اس کے یہاں آتے ہیں۔ شراب پیتے ہیں، جوا کھیلتے ہیں۔ اور مچھلے وال نال نکال کر اپنی روزی دھندا بنائے ہوئے ہے۔ ایک روز جب اندر شہر کی نلکے والی گلی میں شور اُٹھا تو سارے شہر میں پھیل گیا۔ اس شور میں سنائی دیا کہ مچھلے وال نے پی کے رہنے والے ایک خان کا خون کر دیا ہے۔ قتل کی وجہ یہ تھی کہ اس خان کا ایک مدمقابل قمار باز سے جھگڑا ہوا جسے وہ خان مچھلے وال کے سمجھانے بجھانے پر بھی ختم نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ اُلٹا مچھلے وال کو گالی گلوچ کرتا ہوا مچھلے وال کے گریبان تک پہنچ گیا تھا۔ مچھلے وال نے بڑے حوصلے اور دلاسے سے اُسے سمجھایا۔ اور اُسے اپنے مکان سے باہر گلی میں لے آیا۔ اپنا چاقو نیفے میں سے نکالا اور خان کی آنتیں اُس کے پیٹ سے نکال کر سڑک پر ڈھیر کر دیں تھیں۔ وہ لوگ کہتے ہیں جنھوں نے اپنی آنکھوں سے یہ قتل دیکھا تھا کہ مچھلے وال نے ایک ہی وار سے خان کا کام خلاص کر دیا تھا۔ کسی کو اُس کے نزدیک جانے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے اپنے گھر گیا تھا۔ اُس نے غسل کیا تھا۔ کپڑے تبدیل کیے اور آ کر اپنی بیٹھک میں جم کر بیٹھ گیا تھا۔ جب تھانیدار بہت پولیس کی ایک ٹکڑی کے ساتھ اُسے گرفتار کرنے اُس کے ہاں گیا تو وہ حقّے کی نے منہ میں دبائے بڑے سکون سے کش پر کش لے رہا تھا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے پولیس کا استقبال کیا تھا۔ اور پھر خاموشی سے پولیس کے ساتھ ہو لیا تھا۔ مچھلے وال کے خلاف کوئی چشم دید گواہ نہ مل سکنے کی وجہ سے خون کا مقدمہ کمزور پڑ گیا تھا۔ اور پہلی بار چار سال کی سزا ہوئی تھی۔ اُس کے جیل سے باہر آنے کے بعد پھر ایک روز صدر بازار کے شراب خانے میں شور بپا ہوا تھا۔ اور اس شور نے بھی چار سو پھیل کر مچھلے وال کے چاقو کے شکار ایک مقتول کی کہانی بیان کی تھی۔ اس قتل کے واقعات بھی پہلے قتل سے ملتے جلتے تھے۔ غرضیکہ مچھلے وال کے قتل کرنے کا ڈھنگ اور قتل کے بعد کی دلیری کے مظاہرے نے ہر بار اُسے کڑی سزا دلانے سے بچایا۔ اس کے ڈر اور دہشت سے کوئی بھی اس کے خلاف عدالت میں گواہی کے لیے کھڑا نہ ہوتا تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اس کے خلاف گواہی نہ ملنے کی وجہ صرف اُس کی دہشت ہی نہیں بلکہ یہ حقیقت بھی تھی کہ شہر کو مجموعی طور پر غنڈہ گردوں سے نجات مل گئی تھی جس کی وجہ مچھلے وال کی شہر میں موجودگی تھی، جو اس بات کی ضامن تھی کہ شہر میں کوئی بھی غنڈہ کسی طرح کی چھوٹی موٹی غنڈہ گردی کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی اپنی بدمعاشی کے بل بوتے پر کسی غریب و نادار کو گالی گلوچ تک نہ کر سکتا تھا۔ کوئی گھٹیا درجہ کا شہدا آتی جاتی اسکول کی لڑکیوں پر آوازیں کسنے کی ذلیل حرکت نہ کرتا تھا۔ چھوٹے موٹے دنگے۔ جگہ جگہ جوا خانے کے اڈے مچھلے وال کے اپنے قمار خانہ اور اُس کے دبدبے کی وجہ سے ٹھپ ہو گئے تھے۔ عام شہری اور امن و امان کے ذمہ دار افسران در پردہ مچھلے وال کے احسان مند تھے۔ انھیں احساس تھا کہ وہ باوجود اس کے کہ خطرناک قسم کا خونی ہے لیکن شہر کے عام امن کا ضامن بھی ہے۔ اس کے کیے ہوئے قتل تقریباً ایسے لوگوں کے ہی تھے جو بذات خود اچھے لوگ نہ تھے۔ مثال کے طور پر نیکو بدمعاش کے قتل کی روداد سنیے۔ نیکو بدمعاش شہر کا پرانا بدمعاش تھا۔ بارہا جیل ہو آیا تھا۔ سیکڑوں چوریوں، اور ڈکیتیوں میں اس کا نام لیا جاتا تھا۔ شریف لوگوں کی پگڑی اچھالنے کے لیے سیاسی دھڑے بند اس کی خدمات خریدا کرتے تھے۔ لیکن جب سے مچھلے والے کا نام پشاور کے گلی محلوں میں خطرناک بدمعاش کے طور پر مشہور ہوا۔ نیکو کی سرگرمیاں قریب قریب ختم ہو گئی تھیں۔ نیکو کی مصلحتاً اختیار کی ہوئی خاموشی بھی اُسے مچھلے وال کے عتاب سے بچا نہ سکی تھی۔ وہ نیکو کے ماضی کے گناہوں کی سزا اُسے دینے کے لیے جیسے بیتاب ہی تھا۔ یہ نیکو کے خون کے واقعات سے صاف ظاہر ہے۔ مچھلے وال سلکی کرتہ شلوار اور سلکی مشہدی کا صافہ سر پہ باندھے پاؤں میں اصلی تلے دار نوک والی جوتی پہنے ہوئے اپنے سات رنگوں والے تانگے میں مشکی رنگ کی گھوڑی جوتے ہوئے بڑی شانِ امتیازی سے ایک روز بازار قصہ خوانی سے گزر رہا تھا کہ ایک چھوٹے موٹے ہجوم کی وجہ سے گھوڑی کی چال دھیمی پڑ گئی۔ راستہ نہ ملنے کی وجہ سے مچھلے وال کو تانگا کچھ دیر کے لیے روکنا پڑا۔ دیکھا تو ہجوم کی وجہ نیکو تھا۔ کسی غریب ہندو دکاندار کے کھانے پینے

پیسے دینے کے عوض بڑی بڑی موٹی گالیوں سے مالامال کر رہا تھا۔ مچھلے وال نے ایک بھرپور نظر نیکو پر پھینکی۔ نیکو کی نگاہیں مچھلے وال کی آتش گیر نظروں سے ٹکرائیں۔ مچھلے وال نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ریشمی پھولوں والی چابک کو ہوا میں لہرایا اور جان بوجھ کر بیچ سڑک میں پھینک دیا۔ وہاں پر جمع سارے ہجوم کی نظریں مچھلے وال پر یوں لگی تھیں جیسے وہ کوئی بازی گر ہو اور چند ہی منٹ میں اپنی بازی گری کے کمالات دکھانے والا ہو۔ لوگوں نے ایک [illegible] دنی پُر رعب آواز سنی اور وہ سہم گئے۔ مچھلے وال نیکو سے کہہ رہا تھا۔ "نیکو چابک اُٹھا کر مجھے دو!" اس کی آواز میں حکم اور رعب تھا۔ نیکو پر اُس کے ماضی کے دبدبے کی شہرت غالب آگئی۔ اُس نے نہایت حقارت سے جواب دیا۔ "مچھلے وال! میں بھی پٹھان ہوں، میری غیرت کو مت للکارو۔" مچھلے وال تانگے سے کود کر نیکو کے سینے پر سوار ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ نیکو اس کی گرفت سے اپنے آپ کو آزاد کراتا۔ نیکو زمین پر ڈھیر ہو چکا تھا۔ اس بار بھی لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ مچھلے وال کا ہاتھ اُس کے نیفے تک گیا۔ کمانی دار چاقو کے کھلنے کی آواز بھی سب نے سنی نیکو کی لاش کو سڑک پر لوٹتے ہوئے بھی سب نے دیکھا لیکن حسب معمول عدالت میں کوئی چشم دید گواہ حاضر نہ تھا۔

آج مچھلے وال کی رہائی کا دن تھا۔ نیکو کے قتل میں اسے چار سال کی سزا ہوئی تھی۔ وہ آج پوری ہو رہی تھی۔ سارے شہر میں چھپی چھپی سی خوشی منائی جا رہی تھی۔ لوگ آپس میں اکٹھے ہو کر اس کی آمد کی خوشی اس طرح بانٹ رہے تھے جیسے کوئی قومی لیڈر لمبی قید کاٹ کر آ رہا ہو۔ عورتیں چپ می گوئیاں کر رہی تھیں۔ "آج مچھلے وال آ رہا ہے۔ اب موے اقبال کی بدمعاشی سے سارے شہر کو نجات مل جائے گی۔" اس چار سال کے عرصے میں سارا شہر اقبال کی غنڈہ گردی سے الامان الامان پکار اُٹھا تھا۔ خصوصاً عورتوں کا تو گھر سے باہر نکلنا دشوار ہو گیا تھا۔ اُس کے گرد کے لچے آتی جاتی عورتوں پر نہ صرف آوازیں ہی کسا کرتے تھے بلکہ بعض اوقات دست درازی سے بھی باز نہ آتے تھے۔ سیاسی پارٹی بازی اور دھڑے بندیوں نے بھی بہت حد تک اقبال کی سرپرستی کی تھی۔ اور اسی وجہ سے پولیس بھی بے دست و پا ہو گئی تھی۔ اقبال کی متوازی حکومت اپنا ڈنڈا سارے شہر میں گھمائے پھرتی تھی۔ اقبال کے ڈنڈے نے وہ شہرت حاصل کی تھی جو مچھلے وال کے نیفے کے کمانی دار چاقو کو بھی نصیب نہ ہوئی تھی جس خان سے جس مہاجن سے اقبال روپیہ وصول کرنا چاہتا تھا اپنے کسی ادنیٰ سے پٹھو کو اپنے ڈنڈے کے ہمراہ کر دیتا تھا۔ وہ ڈنڈا متعلقہ آدمی کی طرف بڑھا دیا جاتا۔ اور مطلوبہ رقم ڈنڈے کو پیش کر دی جاتی تھی۔ اقبال کا ڈنڈا جب تک ساہوکاروں مہاجنوں پر اپنا جادو جگاتا رہا۔ اور روپیہ بٹورتا رہا، تب تک تو اتنی بے چینی شہر میں نہ پھیلی تھی۔ لیکن جب ڈنڈے نے شریف اور باعزت شہریوں کی بہو بیٹیوں کی عزت و ناموس کو ناپنا شروع کیا تو لوگ رو دیے۔ شریف لوگ گھروں میں دبک گئے۔ شہر کی خوبصورت عورتیں اور الھڑ دوشیزائیں جانے کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ اقبال کے ڈر سے عورت شہر میں دکھائی نہ پڑتی تھی۔ جیسے ان کے لیے کرفیو کا نفاذ ہو گیا تھا۔

مولا داد نے مچھلے وال سے گلے ملتے ہوئے الوداع کہی۔ اور اسے اُس کا حلف یاد دلایا۔ مچھلے وال صرف مسکرا کر رہ گیا۔ جیسے اُس کی مسکراہٹ نے اقرار کیا ہو۔ "ہاں، مجھے یاد ہے۔ اب میں نے یہاں نہیں آنا ہے۔ اپنے گھر اپنی بیوی اور اپنے بچے کے لیے خاموش اور پرسکون زندگی بسر کرنی ہے۔ مجھے شریف شہری بن کر رہنا ہے۔" اس کو شاید معلوم نہ تھا کہ شہری اُس کا کس بے تابی سے انتظار کر رہے ہیں۔ اُسے شاید احساس ہی نہ تھا کہ شہر کے لوگ آج اُسے امن پسند شہری بننے کے لیے نہیں، بلکہ وہی پرانا مچھلے وال بنے رہنے کی التجا کر رہے تھے۔ آج شہر اُس کی غیر موجودگی کی وجہ سے اپنے آپ کو بے سہارا سمجھ رہا تھا۔ آج شہر اقبال کی غنڈہ گردی اور شہدے پن کی جکڑ میں تھا۔ مچھلے وال نے جیل سے باہر قدم رکھا تو اُس کے استقبال میں شہر کی چیدہ چیدہ ہستیاں دروازے پر ہی موجود تھیں۔ مچھلے وال نے اقبال کے ظلم و ستم کی کہانی ان سے سنی۔ ان کی خاموش اور پرنم آنکھوں میں اس نے جھانکا۔ اسے محسوس ہوا یہ مجبور اور بے کس آنکھیں اس سے اقبال کے قتل کی بھیک مانگ رہی تھیں۔ ایک بار اُس کی سرخ مونچھیں پھڑکنے لگیں۔ اس کی غصے سے بھری سانسوں کی آمد و شد میں اس کا جیل میں لیا ہوا حلف ہچکولے کھانے لگا۔ وہ تھوڑی دیر خاموش رہا۔ اور پھر اُس کے لب آہستہ سے کھلے۔ "میں اب شہر نہیں جاؤں گا۔ میں اپنی بیوی کے

باقی صفحہ نمبر ۳۰۲

احمد جمال پاشا
افکار کراچی

رہنمائے معمہ کی تصویر

ایک دلچسپ کتاب ختم کر کے گھڑی دیکھی، رات کے تین بجے تھے۔ لہٰذا دن چڑھے تک اطمینان سے سونے کا پروگرام بنا کے لحاف میں خراٹے بھرنے لگا۔ اتنے میں کان میں آوازیں آنے لگیں۔

ٹیلی گرام

تار والا۔

تار لے جائیے!

آنکھ کھلتے ہی جلدی سے ہڑبڑا کر اٹھا۔ دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ہمارے دوست میر صاحب جسٹر پہنے، دستانے چڑھائے کنٹوپ اوڑھے، مفلر لپیٹے، ہاتھ میں ٹارچ لئے کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ جان ہی تو جل گئی۔

میر صاحب کھیسیں نکال چکنے کے بعد بے حیائی کی ہنسی ہنستے ہوئے بولے "معاف کرنا یار، بے وقت جگا دیا۔ بات یہ ہے: میری آج آخری تاریخ ہے۔ ابھی ابھی بمبئی سے میرے پاس ٹرنک کال آیا ہے کہ اس معمے کا ایک اشارہ "مضامین رشید" میں بھی ہے۔ تم سمجھو پورے دو لاکھ روپے کا ایک دم نقد معاملہ ہے۔ یوں پکارتا اور تم نہ کھولتے تو میرا دیوالہ ہی نہ نکل جاتا۔ اس لئے میں نے وہ آوازیں لگائی کہ بستر تو بستر ایسے تو مردہ بھی قبر سے نکل آتا۔"

میرے منہ سے چند وہ جھڑ رہے تھے۔ مگر میر صاحب بغیر میری السائی کی پرواہ کئے اس الماری کی طرف لپکے۔ جہاں کتابیں رکھی رہتی ہیں اور تھوڑی دیر کی الٹ پلٹ کے بعد "یہ رہی" کا نعرہ بلند کر کے ایک کتاب اٹھائی اور بے دھڑک صوفے پر بیٹھ کر کتاب کھولی اور شہادت کی انگلی کتاب کے صفحات پر دوڑانے لگے۔ میر صاحب کتاب پڑھ نہیں رہے تھے۔ بلکہ اس کی نسبت ڈھونڈ رہے تھے۔ ان کی انگلی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ کتاب پر دوڑ رہی تھی۔ اور وہ کتاب دائیں سے بائیں نہیں۔ بلکہ اوپر سے نیچے پڑھ رہے تھے۔ کتاب کے تقریباً چند صفحات دہلائے تھے کہ یکایک ایک مقام پر ان کی انگلی کی حرکت رک گئی۔ انہوں نے جلدی جلدی کچھ نوٹ کیا۔ اس کے بعد ایک دم سے کھڑے ہو کر مجھے گود میں اٹھا لیا اور مارے خوشی کے دیوانہ وار ناچنے لگے۔ وفور مسرت سے ان کا جسم بید مجنوں کی طرح کانپ رہا تھا۔ اس کے بعد بولے:۔

"اس بار دنیا کی کوئی طاقت میرا انعام نہیں روک سکتی۔ جانتے ہو اس بار میں نے پورے دو ہزار حل بھرے ہیں۔ معمہ کیا بھرا ہے زمینداری بانڈ کی قسط کا جوا کھیلا ہے۔ اس ایک اشارے نے راتوں کی نیند حرام کر رکھی تھی۔ پبلک لائبریری کی سینکڑوں کتابیں الٹ پلٹ ڈالی تھیں۔ اب جا کر کمبخت کہیں ہاتھ آیا۔ میرے پاس وقت بالکل نہیں۔ یہاں سے گھر ہوتا ہوا سیدھا ہوائی اڈے جاؤں گا۔ اس بار خود اپنے حل ہوائی جہاز سے لے جا کر

کھلے گا۔ اچھا خدا حافظ!"

مجھے میر صاحب کی بات پر اس لئے بآسانی یقین آگیا کہ اس سے قبل وہ اپنی جائیداد اور بیوی کے زیورمعمے پر قربان کر چکے تھے۔

میر صاحب شوق کی اس منزل پر تھے جس کو زیادہ سے زیادہ خبط یا مراق کے نام سے یاد کر کے کف افسوس ملا جا سکتا ہے۔

لہٰذا میر صاحب کے حال زار پر کف افسوس ملنے کے بعد جو میں بستر پر دراز ہوا تو بڑے ڈراؤنے خواب دکھائی دیئے۔

کیا دیکھتا ہوں کہ گھر میں پنچایت جمی ہوئی ہے۔ والدہ محترمہ خاندان کے انتہائی ثقہ حضرات اور خواتین کے ساتھ بیٹھی معمے کے ممکن الفاظ پر بحث کر رہی ہیں۔ گھر کا گھر اس نیک کام میں معروف ہے۔ حتیٰ کہ بی خانسامن بھی اس غور و فکر میں برابر کی شریک ہیں۔ لہٰذا سب کا کھانا ہوٹل سے آرہا ہے۔

میرا چھوٹا بھتیجا قاعدہ لئے میرے پاس کوئی لفظ پوچھنے آیا۔ لفظ بتانے کے ساتھ جو غور کرتا ہوں تو قاعدے میں الف سے آم اور ب سے بکری کے ساتھ آم اور تصویروں کے بجائے انتہائی دیدہ زیب قسم کے انواع و اقسام کے معمے کے ڈیزائن بنے ہوئے ہیں۔ تاکہ بچے معمولی شدھ بدھ کے ساتھ ہی معمہ بھرنے کے فن اور رموز سے مانوس ہو سکیں۔

دیواروں پر لگے ہوئے کلنڈروں میں مدھو بالا اور ردلیپ کمار کے فلمی پوز کے بجائے معموں میں پہلا انعام پانے والے خوش قسمتوں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔

دروازے پر خوانچے والوں کی صداؤں کے بجائے پھیری والوں کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں:

"معمے کے حل کے خرید لو۔!"

"صحیح حل بھروالو۔!"

"اصلی اشارے بیچیں۔!

اتنے میں پڑوسن کی کھڑکی کھلی اور آپا نے کہا۔

"وہ پوچھ رہے ہیں، آپ نے پانچویں خانے میں نانا بھرا ہے یا کانا۔؟"

خالہ جان لپک کر کھڑکی پر پہونچیں اور بولیں۔

"بہن کانا بھرا ہے۔ اور بہن تم نے۔؟"

پڑوسن بولیں۔

"بہن! بھرنے کو تو ہم نے بھی کانا ہی بھرا ہے۔ مگر دل میں ہول اٹھتا ہے کہ بدشگونی نہ ہو جائے۔!"

میں نے بھائی صاحب سے پوچھا کہ۔

"آپ دفتر نہیں گئے؟"

بھائی صاحب ہنستے ہوئے بولے۔

"ارے گدھے آج سب دفتروں اور کارخانوں میں چھٹی ہے۔ جانتے نہیں کہ معمے بھرنے کی آخری تاریخ کی چھٹی اب گیزیٹیڈ ہالیڈے تسلیم کر لی گئی ہے۔ لہٰذا دفتر جانے کا کیا سوال ہے؟"

مجھے یاد ہے کہ واقعی آج کے دن تو دفتر تو دفتر اسکولوں اور کالجوں تک میں چھٹی ہوتی ہے اور لڑکوں کے حل جمع کرنے کے لئے ماسٹر صاحبان دہلی کلکتہ اور بمبئی وغیرہ جاتے ہیں۔

میں نے دیکھا کہ میرے بال شاعروں سے زیادہ الجھے ہوئے ہیں، بالکل میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے، منہ میں بیڑی دبائے بیٹھا معمہ بھر رہا ہوں

آنکھوں میں کیچڑ بھری ہوئی ہے۔ شیو بڑھا ہوا ہے۔ دین دنیا سے بے خبر بے شمار معموں کے خاکے، حل، ٹوکن اور معموں سے متعلق رسائل و اخبارات کا میرے سامنے ڈھیر ہے۔ بڑے بڑے چارٹ چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ بینک سے اپنا کُل روپیہ نکال کر میں معمہ بھرنے اور حل بھیجنے کے ٹوکن، پوسٹل آرڈر، منی آرڈر فارم اور رجسٹری کے لفافے کیا کیا لے آیا ہوں۔

معمے کا ہر خانہ بھرنے کے بعد میری آنکھوں کے سامنے بالکل صحیح حل پر لاکھوں روپے کا پہلا انعام ناچنے لگا۔

کبھی بے اختیار خوش ہو کر ازراہ ترحم گھر کے ملازم یا مہتر کے لئے جو بے چارے پڑھے لکھے نہ ہونے کی وجہ سے اپنے حل خود نہیں بھر سکتے۔ مگر ان کے پاس معمے کے خاکے اور ٹوکن موجود ہیں۔ ان کے حل بھر کر دیتے ہوئے کہتا ہوں۔

" جاؤ عیش کرو! جھاڑو دینے اور برتن مانجھنے میں کیا رکھا ہے۔ انعام ملنے کے بعد کوئی کاروبار کر لینا تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کسی رئیس سے پالا پڑا تھا۔"

مہتر اور نوکر ہاتھ جوڑ کر بولے۔

" حضور جو آپ کہیں گے وہی ہم کریں گے۔"

" اچھا بھاگ جاؤ، صبح صبح دماغ نہ کھاؤ، ابھی ہم کو بہت سے حل بھرنے ہیں۔"

اتنے میں ہمارے بہت سے دوست آ گئے۔ سب کے سب حلیے سے تقریباً چِڑی مار معلوم ہو رہے تھے۔ سب نے چائے پی اور بیڑی پر بیڑی پینے کے بعد اپنی اپنی بغلوں میں دبائے بستوں میں سے اپنے اپنے حل نکالے۔ اس کے بعد بحث شروع ہو گئی۔

میں نے کہا کہ۔

" قوم"

میرے دوست نے کہا کہ۔

" نہیں "ڈوم" صحیح ہے۔ میں نے "ڈوم" بھرا ہے۔"

دوسرے صاحب چمک کر بولے۔

" واہ صاحب! واہ، آپ کے بھرنے سے کیا ہوتا ہے۔ بھلا کہیں "قوم" کو "ڈوم" بنایا جا سکتا ہے۔"

ہمارے ایک اور دوست نے کہا کہ۔

" بھائی اس میں بگڑنے کی کیا بات ہے۔ آپ مجھے دیکھیں۔ میں نے نہ "قوم" بھرا اور نہ "ڈوم" بلکہ میرے نزدیک "شوم" درست ہے۔ اور مدراس سے جو چشم دید اشارہ آیا ہے۔ اس میں بھی شوم ہی دیا ہوا ہے بتلائیے نا کہ آخر "قوم" کس طرح خبیث ہو سکتی ہے۔ اور "ڈوم" تو بھئی ذات ہوئی۔ بھلا آپ کسی کی ذات کو کیسے برا کہہ سکتے ہیں، البتہ "شوم" خبیث ہو سکتا ہے۔"

بات معقول لگتی تھی۔ لہٰذا کیش نے "شوم" اپنے اپنے حلوں میں بھرا، اور اس خیال سے کہ معمے والے بے ایمانی نہ کر سکیں۔ ایک ایک حل میں احتیاطاً "قوم" اور "ڈوم" بھی بھر دیا۔

میر صاحب نے اس کے بعد نقشے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

" بھائیو! یہ آٹھواں خانہ دیکھئے اور بتائیے کہ خواب، شباب، رباب اور رحباب میں سے کون صحیح ترین ہے؟"

خان صاحب نے بیڑی کا ٹکڑا بجھاتے ہوئے کان سے پنسل نکال کر کچھ حساب لگایا، اور اس کے بعد پنسل رکھ کر آنکھیں بند کر کے دونوں بیچ کی انگلیاں ملائیں۔ اس کے بعد اچھل پڑے اور بولے۔

"شطرنج خواب آرہا ہے۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے اب تو خواب آگیا۔ بھائی تو خواب آرہا ہے!"

میر صاحب نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"میاں، یہ دل نہیں دماغ کا کھیل ہے۔ خواب، شہاب، حباب اور رباب میں سے ایک بھی نہیں آئے گا بلکہ "ثواب" آئے گا۔

میں نے کہا کہ۔

"بچوں کی دنیا کے ایڈیٹر نے اپنے آخری شرطیہ اعلان میں تو "کباب" بتایا ہے۔

ظاہر ہے کہ "بچوں کی دنیا" کے آگے کس کی چل سکتی تھی۔ سب نے خاموشی کے ساتھ "کباب" بھر دیا۔

دن بھر محنت کے ساتھ حسب معمول سب بحث کرتے اور رمعے بھرتے رہے۔ اس کے بعد حلوں کو انتہائی احتیاط کے ساتھ بار بار جانچا گیا۔ ہر ہر چیز سب نے چیک کی۔ اس کے بعد میں اٹھ کر گھر میں آیا۔ گھر والوں نے اپنے اپنے حلوں، پوسٹل آڈروں اور ساتھ کے خالوں کے بہت خوش نما پیکٹ بنا لئے تھے۔ ایک بار ہم سب نے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے اپنے حل ایک دوسرے کو دکھائے۔ آخری ترمیمیں کیں۔ اس کے بعد میں حل جمع کرنے کے لئے ٹیکسی سے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔

بڑی امیدوں اور تمناؤں کے ساتھ حل جمع کئے۔ رسیدیں لیں اور گھر واپس آگئے۔ دن رات صحیح حل کے اعلانات اور انعام کا انتظار رہنے لگا۔

خدا خدا کر کے وہ نیک ساعت بھی آگئی۔

ہم لوگ بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے کہ تار آگئے۔

والدہ صاحبہ، خالہ صاحبہ اور چچی صاحبہ کو آل کریکٹ پر ۲، ۲ لاکھ روپے کے انعامات ملے تھے، اور سب سے زیادہ غلطی پر میرے حصے میں پانچ روپے نو آنے سات پائی کا انعام آیا تھا!

انعام کا تار پڑھنے کے بعد والدہ، خالہ اور چچی بے ہوش ہو گئیں۔

بھائی صاحب نے کہا:

"کوئی بات نہیں، شادیٔ مرگ کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ پانی کا چھینٹا دو۔"

پانی کا چھینٹا جو پڑا تو میری آنکھ کھل گئی، دیکھا کہ۔

سرہانے کھڑی ہوئی والدہ مجھے جگا رہی ہیں۔

میرے بیدار ہونے پر بولیں۔

"اتنی دیر تک کیوں سوتے ہو۔ کیا رات گئے تک معمہ بھرا کرتے ہو۔؟"

جوشؔ ملسیانی — رہنمائے تعلیم دہلی

داغِ دل چمکا تو غم پیدا ہوا
یہ اندھیرا صبحِ دم پیدا ہوا
میں ہوں وہ گم گشتۂ راہِ طلب
میری ہستی سے عدم پیدا ہوا
ہوگئی ہر ایک بیشی میں کمی
جب خیالِ بیش و کم پیدا ہوا
ان کے آنے کی خوشی کیا چیز تھی
اس خوشی سے اور غم پیدا ہوا
میکدے میں شیخ بھی آیا، اگر
گردنِ مینا میں خم پیدا ہوا
حسن میں تخلیق کا جوہر بھی ہے!
اُس کے "مَیں" کہنے سے "ہم" پیدا ہوا
یاد ان کی یوں رفیقِ راہ تھی!
ہر قدم پہ ہم قدم پیدا ہوا
کیا کہوں میں اس ادائے خاص کو
ہر کرم سے اک ستم پیدا ہوا
موت کا کچھ بھی نہ تھا اے جوشؔ غم
اُن کے وعدے سے یہ غم پیدا ہوا

ماہر القادری — شاعر بمبئی

اب تبسم کا ہے یہ رنگ دھواں ہو جیسے
آج نغمہ کا یہ عالم ہے فغاں ہو جیسے
قافلہ مہر و وفا کا یہ کہاں آپہونچا
زندگی راہ میں خود سنگِ گراں ہو جیسے
آدمی موت کے دہانے پہ جب آجاتا ہے
بلبلہ ٹوٹ کے بے نام و نشاں ہو جیسے
واعظِ شہر کی سج دھج پہ ہنسی آتی ہے
یہ بھی مِن جملۂ صاحب نظراں ہو جیسے
کچھ نہ کہنے پہ بھی سب کچھ ہے زمانہ پہ عیاں
خامشی حسن و محبت کی زباں ہو جیسے
آپ بیتی کو بھی اس طرح بیاں کرتا ہوں
میرا افسانہ حدیثِ دگراں ہو جیسے
دردِ دل سخت ہی جانکاہ مگر کیا کہئے
زندگانی کی بھی روحِ رواں ہو جیسے

دل غمِ ہجر سے مانوس ہے اتنا ماہرؔ
خواہشِ وصلِ محبت کا زیاں ہو جیسے

غلام ربانی تاباں
صہبا۔ حیدرآباد (دکن)

جستجو ہو تو سفر ختم کہاں ہوتا ہے
یوں تو ہر موڑ پہ منزل کا گماں ہوتا ہے

ایسے لمحے بھی گزرتے ہیں تری یاد کے ساتھ
دل پہ کمبخت دھڑکنا بھی گراں ہوتا ہے

آئینہ دارِ تکلم ہے مری خاموشی!
کچھ نہ کہنا بھی اِک اندازِ بیاں ہوتا ہے

کیا قیامت ہے کہ ہر مرحلۂ ترکِ طلب
اہلِ دل کے لئے پیغامِ زیاں ہوتا ہے

شدّتِ غم کو تبسم میں چھپانے والے
دل کا ہر راز نگاہوں سے عیاں ہوتا ہے

میری اس شگفتہ کلامی پہ بہت طنز نہ کر
دل کی ہر بات میں اک کرب نہاں ہوتا ہے

عشق وہ دشمنِ تمکیں ہے کہ اکثر تاباںؔ
دوست کا لطف بھی اک آفتِ جاں ہوتا ہے

احمد ہمدانی
سیپ۔ کراچی

یہ وفائیں ساری دھوکے پھر یہ دھوکے بھی کہاں
چند دن کی بات ہے پھر لوگ ہم سے بھی کہاں

پیڑ یہ سوکھے ہوئے کچھ یہ زمیں تپتی ہوئی
چلتے چلتے آج ٹھہرے ہم تو ٹھہرے بھی کہاں

تم کو آنا تھا نہ آئے وقت لیکن کٹ گیا
مضمحل ہوتے تھے کیوں ہم رات روئے بھی کہاں

چند یادیں، چند آنسو، چند شکوے اور عمر
عشق تو کیا تھا مگر اب یہ سلیقے بھی کہاں

آج تو وہ دیر تک بیٹھے رہے خاموش سے
رفتہ رفتہ بن کے حالات پہنچے بھی کہاں؟

دل لہو ہوتا ہے یارو بات یہ آساں نہیں
لحظہ لحظہ روتے گذری اور روئے بھی کہاں

صبا اکبر آبادی — جام نو۔ کراچی

نہ پایا جب کوئی اپنا مزاج داں ہم نے
خود اپنے آپ سے چھوڑا ہے کارواں ہم نے

سنا ہے جرم ہے اُس سرزمیں پہ آج وفا
گذار دی تھی حیاتِ وفا جہاں ہم نے

کچھ ایسے وقت بھی اس زندگی میں آئے جب
کیا تھا یاد تجھے مرگِ ناگہاں ہم نے

جب آئی صبح کو ناقوسِ دیر کی آواز!
سنی حرم کی کڑکتی ہوئی اذاں ہم نے

قریب رہ کے بھی وہ ہم سے دور دور رہے
رکھی تھی ضبط کی تلوار درمیاں ہم نے

ہزار طرح سے ترکِ وفا کا قصد کیا
لیا خود اپنی محبت کا امتحاں ہم نے

پڑے ہیں داغ جو دل پہ تو کیا تعجب ہے
جوانی کاٹی ہے شعلوں کے درمیاں ہم نے

کہاں کہاں نہ ملے حسن کے نقوشِ قدم
کئے نہ عشق میں سجدے کہاں کہاں ہم نے

صبا لکھا تھا عجب طرح خطِ شوق انھیں،
ہر ایک لفظ میں بھر دی تھیں بجلیاں ہم نے

یوسف جمال انصاری — سیارہ۔ لاہور

بطرازِ دلربائی، بطریقِ ساحرانہ!
جو چلے تھے وار کرنے وہی بن گئے نشانہ

مری بزمِ آرزو میں، مرے شوقِ رنگ و بو میں
کوئی مجھ سے کہہ رہا ہے ترے پیار کا فسانہ

بزبانِ بے زبانی غمِ دل کی ترجمانی
کہیں ہو نہ جائے رسوا یہ ادائے محرمانہ

کبھی چاند چھپ گیا ہے تو چمک اٹھا ہے بادل
ترا ہجر عارضی ہے ترا وصل جاودانہ

سرِ شاخِ گل نمایاں کبھی زیرِ خاک پنہاں
یہ خزاں کا ہے دفینہ کہ بہار کا خزانہ

مجھے جب بھی دھیان آیا تجھے اپنے پاس پایا
کہ نہیں ہے تجھ سے خالی کوئی جا کوئی زمانہ

یہ بجا کہ یاد تیری غمِ تازہ لے کے آئی
مرے اشک و آہ بھی ہیں تری یاد کا بہانہ

کبھی خواب میں بھی تو نے مجھے آنکھ اٹھا کے دیکھا
تو حریمِ آشنائی میں چھڑا نیا ترانہ

میں تری وفا کے صدقے مجھے خوف ہے تو یہ ہے
کوئی چال چل نہ جائے کہیں بے وفا زمانہ

سحر انصاری

سیپ، کراچی

ہم اہلِ ظرف کہ غم خانۂ ہنر میں رہے
سفالِ نم کی طرح دستِ کوزہ گر میں رہے

ہے چاک چاک رقم داستانِ گردشِ خاک
وجودِ صورت و اشکال کیا نظر میں رہے

فرارِ مل نہ سکا حبسِ جسم و جاں سے کہ ہم
طلسم خانۂ تکرارِ خیر و شر میں رہے

کسی کو قربِ مسلسل کا حوصلہ نہ ہوا
مثالِ دودِ پریشاں ہم اپنے گھر میں رہے

نہ ہم شرارۂ دل سنگ تھے نہ رنگِ حنا
سخن کی آگ بنے حرفِ تازہ تر میں رہے

نہ سنگِ میل تھا کوئی نہ کوئی نقشِ قدم
تمام عمر ہوا کی طرح سفر میں رہے

وہ لوگ جن کی زباں شعلۂ تمنا تھی
سوال بن کے زمانے کی چشمِ تر میں رہے

مشتاق مبارک

ماہِ نو، کراچی

ظلمت حجابِ دیدۂ بیدار بھی نہیں
لیکن طلوعِ صبح کے آثار بھی نہیں

اس دل کو یوں خرابِ تغافل نہ کیجئے
جو عرضِ مدعا کا گنہگار بھی نہیں

وارفتگانِ شوق کو جنت سے کم نہیں
وہ راہ جس میں سایۂ دیوار بھی نہیں

اے زندگی نویدِ مسرت ہے تجھے کہ ہم!
مجبور اگر نہیں ہیں تو مختار بھی نہیں

دنیا میں اب کہاں ہیں ہم ایسے نیاز مند
جو شکوہ سنجِ بے رخیٔ یار بھی نہیں

اُن کے حضور جرأتِ گفتار کس کو ہے
ان کے بغیر لذّتِ گفتار بھی نہیں

نا آشنائے حسنِ چمن گل بدست ہیں
اپنے نصیب میں خلشِ خار بھی نہیں

اب کون ہوگا سازِ انا الحق پہ نغمہ زن
منصور بھی نہیں رسن و دار بھی نہیں

باقر مہدی

صبا حیدرآباد دکن

پردیسی

چلتے چلتے اک جھٹکے سے ریل رکی
میں یادوں کا بیگ لئے
ریل کے ڈبے سے اترا
اسٹیشن پہ
دھند میں ڈوبا سناٹا تھا
میرے پاس اک سایہ آیا
میں نے ٹکٹ دے کر پوچھا
"کیا یہ میرا وطن ہے یا پھر ؟"
اس نے اپنے لیمپ کی مدھم لو میں میرا چہرہ دیکھا
"میں کیا جانوں، جو آتا ہے یہ کہتا ہے
مجھ کو بس اتنی سی خبر
ٹوٹی پھوٹی دیواروں کے گھیرے جن کو گھر کہتے ہیں
ان میں کتنے بے کس دل اور تنہا روحیں
خاموشی کے لمبے دن اور حسرت کی کالی راتوں کو
اپنا سب کچھ سونپ چکے ہیں"
میں یہ سن کر کیا کہتا
اسٹیشن سے باہر نکلا
پگڈنڈی پہ چلتے چلتے گاؤں میں پہنچا
بوڑھے برگد کی شاخوں نے حیرت سے مجھ کو دیکھا
میرا بچپن اس کے سائے میں گذرا تھا

آخر پہنچا اپنی حویلی کے در پہ
وحشت نے
میرا سواگت بڑھ کے کیا
گھر کے اندر سایوں نے
سرگوشی میں جانے مجھ سے کیا پوچھا
میں گھبرا کر چیخ پڑا
"وقت نے سارے رشتے ناتے توڑ دیئے
کوئی کسی کا اب نہ رہا
میرے بیگ میں برسوں پہلے کی یادیں ہیں
کھول کے دیکھو"
میں نے بیگ کو کھول کے الٹا
کچھ بھی نہ تھا
میں نے آہستہ سے کہا
"جانے کس نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا"
تب وحشت نے اتنا کہا!
"پردیسی خالی بیگ لئے پھرتے ہو
کون ہو تم، جانا ہے کہاں ؟"

شاد امرتسری — ارژنگ پشاور — محسن بھوپالی — سنگ میل کراچی

ماریا' ماریا

اُدھر اک طرف قہقہے کا شرارہ
مری میز سے دور بھڑکا تو میں نے
یہ سوچا کہ یہ بھی کسی ایک لمحے،
کی تخلیق کی ایک صورت بنا ہے
شرارہ کہ جس نے بھڑک کر ابھی ایک
لمحے کو اب دلنشیں شکل دی ہے
اگر پھر اسی طور اک بار بھڑکا
تو اس ہال کی ساری مرمری میزوں
پہ رکھے ہوئے جاتی واکر کے ساغر
تو اس ہال کی کھڑکیوں کے حریری
دمکتے ہوئے نیلگوں زرد پردے
اِک آواز ہو کر ابھی یہ کہیں گے
خدارا نہ تازہ قیامت جگا دُا
بس اب چپ رہو، ماریا، ماریا!
بس اب چپ رہو، ماریا، ماریا!

سعیِ کامراں

کتنا خاموش و پراسرار ہے ویرانۂ غم
کوئی آہٹ کوئی دستک خلل انداز تو ہو
کوئی آوارہ صدا کوئی ہوا کا جھونکا
ایک لمحے کے لئے ہی سہی دمساز تو ہو
نطق ہے مہر بلب چیخ رہا ہے احساس
دل کی دھڑکن ہی سہی کوئی ہم آواز تو ہو
سوچتا ہوں کہ کسی طور سحر ہونے تک
شدتِ یاس ہی امید کا عنواں بن جائے
کچھ تو حاصل ہو مری کوشش لاحاصل کا
غمِ تنہائی ہی تنہائی کا درماں بن جائے
طاق میں سوئی ہوئی شمع کو بیدار کر دوں
میرا سایہ ہی رفیقِ شبِ ہجراں بن جائے

تاج سعید

لیل و نہار، لاہور

مانجھی

(مشرقی پاکستان کی زندگی کا ایک اہم کردار)

جلتے ہوئے جھرنوں کی اگنی دو دریاؤں کے گیت
تنہا مانجھی دکھ ڈُبدا طوفان ہیں اس کے میت
گھور گھٹا جب ٹوٹ کے برسے ناؤ کھائے ہچکولے
گم سم مانجھی بڑھتا جائے منہ سے کچھ نا بولے!
میگھنا کے سینے پر مانجھی ڈولے تیری ناؤ
گائے گیت سہانے پھر بھی چھپیں نہ تیرے گھاؤ
پیار، برہا کے گیت نہ مانجھی تیری بھوک مٹائیں
تیری لوہا لاٹ سی باہیں ٹوٹ کے گر نہ جائیں
اک تہ بند کو باندھے مانجھی ہر موسم تو جھیلے
اک مچھلی کے کارن ساتھی طوفانوں سے کھیلے
کڑی مشقت کرنے پر بھی ایک ٹکا نہ پائے
ایک ٹکا جو ساتھی تیرے پیٹ کی بھوک مٹائے

مانجھی تیرا جیون گھور گھٹاؤں کا ہے مان
مانجھی تیری نوکا جھیلے بڑے بڑے طوفان

طوفانوں میں رہ کر مانجھی تو مسکاتا جائے
جیون کی پھلواری میں نت پھول کھلاتا جائے
ندّی، نوکا، گھاٹ سے مانجھی بنا ہے تیرا جیون
اپنا جیون بیچ کر توڑ دے تو سنکٹ کا درپن
درپن توڑ کہ اس سے ہی مانجھی مُکتی تجھ کو ملے گی
مُکتی کیا ہے مانجھی تیری شکتی تجھ کو ملے گی
شکتی پا کر مانجھی تو بلوان بنا اترائے
تیری کُٹیا، تیرا آنگن آخر کو سکھ پائے

ایک پاتیلی چاول اور اک مچھلی کی سوغات
یہ مل جائے جب تو مانجھی سکھ سے کاٹے رات
رات کہ جس میں اس جیون کے سب دکھڑے چھپ جائیں
رات کہ جس سے آنے والے کل کی فکریں پائیں
آنے والا کل جب آئے نئے نئے دکھ لائے!
دکھ کہ جس نے پھیلائے ہیں بری بھوک کے سائے

عارف حجازی
ماہِ نو۔ کراچی

شعلہ آہنگ

کتنے طوفانوں کو لائی تری یادوں کی بہار
خونِ دل خاک پہ ٹپکا ہے بکھر آنسو بن کر
ذرّے ذرّے سے ترے غم کے شگوفے پھوٹے
آتشِ شوق سے گلنار ہوئی شام و سحر
دمِ اعجاز سے ویرانے بھی آباد ہوئے
پھوٹ نکلی ہے اندھیروں سے اجالوں کی کرن
صفتِ کاہکشاں بن گئی اک راہ گذر
اُڑ گئی ہے شبِ غم بن کے کوئی موجِ غبار
جاگ اٹھی، دلمیں ترے عارضِ سیمیں کی کرن
کتنی پرکیف بھی ماضی کی سنہری گھڑیاں
بہتے لمحوں میں نظر آتی ہے تصویرِ حیات
نغمہ و رنگ سے تابندہ ہے احساسِ جمال!
آج پھر ایک نیا جشن منانے کے لئے۔
لوٹ آئے ہیں تری بزم میں اربابِ جنوں!
یک بیک توڑ کے زنجیرِ گراں بارِ اجل

دل میں اک شعلۂ آہنگ سفر روشن ہے،
اور لگا ہوں میں سلگتے ہوئے ارماں کے چراغ
جیسے نکلا ہے خلاؤں میں ستاروں کا جلوس
سحر کاری ہے یہ فن کی کہ فسونکاریٔ شوق
پھر دمک اٹھا کہیں تابشِ رخسار کا رنگ
پھر فضاؤں سے برسنے لگی صہبائے بہار
دھڑکنیں تیز ہوئیں بڑھنے لگا،
درد کے آتشیں نغموں کا گداز!
پھر تری یاد سے چلنے لگی ہر سمت صبا!
وسعتِ کون و مکاں
دل کی دنیا میں سمٹ آئی ہے
یہ شبِ ہجر، یہ گرداب، یہ طوفانِ بلا
آج آیا ہے مرے گھر تری یادیں لے کر
شہرِ احساس کی رونق ہے یہی
تجھ سے گلبار ہے دنیائے خیال

علاءالدین خالد

کتابی دنیا، کراچی

پاکستان میں پبلشنگ

مسائلِ و مستقبل

ذرا تصور کیجئے وہ زمانہ بھی انسان کے لئے کیسی فراغت کا رہا ہوگا جب درسی کتابوں کی "ترتیب و ترسیل" کا فرض خود قدرت نے سنبھال رکھا تھا۔ یہ کتابیں آسمانی صحیفوں کی شکل میں نازل ہوا کرتی تھیں اور ان کی "نشر و اشاعت" کا کام پیغمبروں کے سپرد تھا ـــــ اگر تمام صحیفوں کو ایک ماہر درسیات کی عینک سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں "بیسک ریڈرز" بھی ہیں "توبۃ النصوح" بھی ـــ اور علم و فکر کے ایسے موضوعات بھی جن کی تفہیم و تفسیر کے لئے بیسویں صدی کا ترقی یافتہ ذہن بھی ناکافی ہے۔

اُس زمانہ میں جب انسانی معاشرہ موجودہ الجھنوں اور آلائشوں سے پاک تھا یہ آسمانی صحیفے نہ صرف اخلاق و انسانیت، امن و آشتی کا درس دیتے تھے بلکہ پوری سماجی زندگی کے لئے مشعل ہدایت بھی تھے۔ اور سچ پوچھئے تو موجودہ علوم کا سرچشمہ بھی یہی الہامی کتابیں ہیں۔ مثال کے طور پر ان میں سماجی انصاف، ہمسایوں کے حقوق، حاجتمندوں کی امداد اور اجتماعی زندگی کی جو تلقین کی گئی ہے کیا وہی موجودہ "عمرانیات" کی اساس و بنیاد نہیں؟ موجودہ علوم و فنون کا منتہائے مقصد یہی ہے کہ انسانی زندگی ذہنی اور مادی طور پر زیادہ آسودہ حال ہو اور اسے روحانی سکون بھی حاصل ہو ـــــ الہامی کتابوں میں بھی آسائش دو عالم کا سامان موجود تھا۔ لیکن پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ قرآن پاک کی شکل میں ایک مکمل ضابطۂ حیات نازل ہوا اور اس کے ساتھ ہی آسمانی کتابوں کے اترنے کا سلسلہ بھی بند ہوگیا۔ اور یوں انسان کو اس مکمل نصاب سے ہدایت حاصل کرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔

شاید قدرت یہ سمجھتی تھی کہ اب انسان خدا کی اس آخری کتاب کے سہارے اپنی زندگی اور ضرورت کے مطابق ہزاروں لاکھوں کتابیں خود تصنیف کرلے گا اور نئی نسلوں کو علم و اخلاق سکھانے کے لئے نئے نئے دانشور پیدا ہوتے رہیں گے ـــ اور یہی وہ دانشور ہیں جنہیں کبھی زمانے نے "سقراط" اور "ارسطو" کے نام سے جانا، کبھی "رومی" اور "غزالی" کے لقب سے پہچانا اور کبھی "سرسید"، "حالی" اور "اقبال" کے روپ میں دیکھا۔

ضرورت ایجاد کی ماں ہو یا نہ ہو لیکن انسانی ذہن یقیناً تمام ایجادات و انکشافات کا سرچشمہ ہے اور اسی ذہن سے علوم و فنون کی نئی نئی راہیں نکلتی رہی ہیں آج ہمارے سامنے مختلف مضامین و موضوعات کی اتنی بے شمار

کتابیں موجود ہیں کہ کوئی فرد واحد اپنی حیات مستعار میں ان سب کو پڑھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا اور دس بیس نولکشور بھی ان کی نشر و اشاعت کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتے۔ اس لئے ضروری ہو گیا کہ علم و دانش کے ان تمام خزانوں کو کچھ خانوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ تاکہ جو شخص زندگی کے جس شعبہ میں قدم بڑھانا چاہے اسی سے متعلقہ علوم کی کتابوں پر توجہ دے سکے۔ اسی طرح نشر و اشاعت میں فنی مہارت کا زمانہ آگیا۔ درسی اور غیر درسی، فنی اور غیر فنی شعبے بنائے گئے۔ اور ہر شعبے کی ضروریات و مسائل پر غور کرنے کے بعد مضامین مرتب ہوئے، کتابیں تصنیف کی گئیں اور شائع ہوئیں۔

آج کی یہ کانفرنس اُردو زبان میں درس و تدریس سے تعلق رکھتی ہے جس میں ہمیں اس بات پر غور کرنا ہے کہ اُردو زبان میں اچھی درسی کتابوں کی اہمیت اور ضرورت کیا ہے؟ اس ضرورت کو پورا کرنے میں کن مسائل و مراحل کا سامنا ہے؟ اور انہیں حل کرنے کے لئے کیا ذرائع اور تدابیر اختیار کی جائیں؟

درسی کتابوں کی ضرورت تو ہر دور میں رہی ہے لیکن اس زمانے میں جب کہ علم و ادب نے ماں کی آغوش اور باپ کے دامن تربیت سے رخصت ہو کر تعلیمی اداروں میں گھر بنا لیا ہے، درسی کتابوں کی ضرورت و اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ اور وہ والدین کا مرتبہ حاصل کر چکی ہیں۔ یہی حال اساتذہ کا ہے۔ کسی زمانے میں باپ پر صرف اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت فرض تھی لیکن آج ہزاروں باپ ایسے ہیں (میری مراد اساتذۂ کرام سے ہے) جو پوری قوم کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے ذمہ دار ہیں۔ ہماری نئی نسل میں اگر کچھ خامیاں اور کمزوریاں ہیں تو اس کی تمام تر ذمہ داری ان ہی نئے والدین پر ہے یعنی درسی کتابوں اور معلموں پر ـــ!

پاکستان میں ایک خوشگوار اور تابندہ مستقبل کی تعمیر اسی طرح ہو سکتی ہے کہ اردو کو فوراً اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنا دیا جائے۔ اس سلسلہ میں کراچی یونیورسٹی کی پہل میں اس کے ارباب حل و اختیار خصوصاً ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے جس بصیرت اور جرأت کا مظاہرہ کیا ہے وہ یادگار رہے گا ـــ اردو کو سائنسی اور فنی مضامین کے لئے ذریعۂ تعلیم بنانا اگر تقسیم سے پہلے بھی ممکن تھا تو اب یہ کام اور بھی آسانی اور خوبی سے ہونا چاہیئے کیونکہ اب اُردو ایک عظیم ملک کی عظیم زبان ہے اور اسے قومی زبان ہونے کا فخر بھی حاصل ہے جس کی وجہ سے وہ قومی بجٹ سے اپنا جائز حق طلب کر سکتی ہے۔ اس ملک میں جن لوگوں نے اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی حمایت کی ہے وہ مخلص ذمہ دار تجربہ کار اور روشن خیال لوگ ہیں ـــ وہ اس راہ کی دشواریوں کو جانتے ہیں۔ لیکن منزل بھی ان کی نظر سے اوجھل نہیں۔ جاپان اور جرمنی جیسے ملکوں کی مثال ہمارے سامنے ہے، اگر وہ اپنی قومی زبان میں اتنی سائنسی اور صنعتی ترقی کر سکتے ہیں تو ہم کیوں ترقی میں پیچھے رہ جائیں گے؟ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اردو میں سائنسی اور فنی مضامین پڑھنے کے بعد ہمارے نوجوان اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ اور امریکہ جا کر کچھ سیکھنے کے قابل نہ رہیں گے۔ میں پوچھتا ہوں کہ علم طبیعات میں تحقیق کے لئے اگر انسان جرمنی جاتا ہے اور پارچہ بافی کی فنی تعلیم حاصل کرنے جب کوئی جاپان جاتا ہے تو کیا وہاں ذریعۂ تعلیم انگریزی ہوتا ہے؟ نہیں بلکہ پہلے وہاں جا کر جرمنی اور جاپانی زبان اس حد تک سیکھنی پڑتی ہے کہ اس میں تعلیم حاصل کی جا سکے۔ یہاں ایک اور اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم تعلیم و تربیت کے لئے بیرونی ملکوں کے کب تک محتاج رہیں گے؟ کیا ہماری آیندہ کی تمام نسلیں بھی ہماری طرح باہر کی ڈگریوں کے چکر میں پھنسی

رہیں گی اور کیا ہم کبھی اس قابل نہ ہوں گے کہ ہمارے یہاں بھی یورپ و امریکہ سے تعلیم و تربیت کے لئے لوگ آئیں ؟ اور کیا جرمنی اور جاپان کے لوگ ہر قسم کی اعلیٰ تعلیم سے محروم ہو گئے ہیں کیونکہ ان کی زبان انگریزی نہیں ہے ؟ اگر میں یہ کہوں کہ اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی مخالفت کرنے والے غلامانہ ذہنیت رکھتے ہیں تو شاید وہ کہیں کہ یہ پرانی دلیل ہے لیکن میں کہوں گا کہ جب تک یہ ذہنیت نہ بدلے گی اس وقت تک یہی بات دہرائی جاتی رہے گی۔

اب تو ہمیں اس پر غور کرنا چاہیئے کہ اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے منصوبے پر کس طرح عمل کیا جائے کہ کسی قسم کے نقصان کے بغیر زیادہ سے زیادہ فائدہ ہو۔ یہ ایک قومی تجربہ ہے جس میں قوم کی حیثیت تماشائی کی نہیں ہے بلکہ اُسے اس بڑے کام میں ہاتھ بٹانا ہے۔ اس تاریخی فیصلہ کو عملی شکل دینے کے لئے ضروری ہے کہ مختلف فنون پر درسی کتابیں، معیاری، اچھی، سستی اور خوبصورت انداز میں ہمارے ملی، سماجی اور اقتصادی پس منظر کے ساتھ ساتھ شائع کی جائیں اور اساتذہ خلوص محنت اور سکون قلب کے ساتھ تدریسی فریضہ معلمی کو مشنری جذبے کے ساتھ انجام دیں۔ لیکن ایسی معیاری کتابیں کیوں کر چھپیں ؟ اور اساتذہ کو سکون قلب کس طرح حاصل ہو ؟ ——— یہ دو چھوٹے چھوٹے سوال ہیں جن کا جواب ہم اکیلے نہیں دے سکتے۔ ناشرین، معلمین، مصنفین، تعلیم کے ماہرین اور حکومت کے وہ ارباب حل و عقد جن کے ہاتھ میں اس کشتی کے پتوار ہیں ——— سب ہی مل جل کر سوچیں اور سمجھیں تب ہی یہ سوال حل ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ نہ تو یہ ریاضی کا سوال ہے نہ اقلیدس کا مسئلہ ——— بلکہ یہ ایک قومی مسئلہ ہے اور ہمارے مستقبل کا سوال ہے۔ "ہمارے مستقبل" سے مراد ناشروں اور معلموں کا مستقبل نہیں ہے بلکہ "پوری قوم" کا مستقبل ——— اور آپ جانتے ہی ہیں کہ ناشر اور معلم و مصنف بھی اسی قوم کے افراد ہیں۔

عام طور پر درسی کتابوں کا مسئلہ تین فریقوں کے باہمی مفاد و تعاون کا مسئلہ ہے ——— مصنف، ناشر اور حکومت (جس کی نمائندگی اب مغربی و مشرقی پاکستان ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور و ڈھاکہ کرتے ہیں) تینوں کا بنیادی مقصد ایک ہے اور اب تک نہیں ہے تو ہونا چاہیئے یہ کہ قوم کے نونہالوں کے لئے جو کتابیں بھی تیار ہوں وہ "ظاہری اور باطنی" اعتبار سے دلکش ہوں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان تینوں فریقوں میں اشتراک عمل کی ایسی کیا صورت ہو جس سے :

۱۔ مصنف اپنا علم و تجربہ درسی کتابوں میں منتقل کرنے کا خوشگوار فریضہ خوش ہو کر خلوص و محنت سے انجام دے اور اس کا جذبۂ تخلیق تسکین پائے۔

۲۔ ناشرین درسی کتابوں کی اشاعت کو ایک علمی اور قومی فرض سمجھ کر ان کے معیار کو اپنے تجربہ سے رفتار زمانہ کے ساتھ بہتر سے بہتر بنانے میں تعاون کریں اور ان کو ان کی سرمایہ اندازی، محنت اور تجربہ کا مناسب صلہ ملتا رہے تاکہ ان میں اچھا کام کرنے کے حوصلے قائم رہیں اور صلاحیتیں اُجاگر ہو سکیں۔

۳۔ حکومت موجودہ صورت میں ٹیکسٹ بک بورڈ، ثانوی تعلیمی بورڈ اور یونیورسٹیاں اس مسئلہ کے انتظامی پہلوؤں پر نظر رکھیں تاکہ لائق و تجربہ کار مصنفین و ناشرین کی دل شکنی نہ ہو کیونکہ اگر انہیں

نظر انداز کیا گیا تو پھر سوچنے کی بات یہ ہوگی کہ ایسا کیوں کیا جا رہا ہے، پانی کہاں مر رہا ہے اور کیا یہ بات وسیع تر قومی مفاد کے خلاف نہیں ہے — نظر اندازی کی صورت میں وہ اپنے علم، تجربے اور سرمائے کو خطاہر ہے کہ ع

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے

پھر دوا سازی ہو یا صابن سازی، مشروبات کا کارخانہ ہو یا فرنیچر کی دکان سب برابر ہیں۔

یہ محض شاعری نہیں ہے ایک سنگین حقیقت ہے۔ یہ طبع کی روانی نہیں ہے تو پھر کیا ہے بعض امداد کی کتابیں اصل امتحان شدہ حکومت کی تیار کردہ درسی کتابوں سے زیادہ مقبول ہیں۔ محض اس لئے نہیں کہ امتحان میں کامیابی کی کنجی ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ ان کے مرتب کرنے والے بعض بڑے ذہین اور سمجھ دار لوگ ہوتے ہیں وہ ہمارے موجودہ تعلیمی نظام، درسی ضروریات اور طلباء کے ذہن سے بخوبی واقف ہوتے ہیں — لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کی صلاحیتوں کا جائز استعمال کیوں نہ ہوسکا؟ آجکل درسی کتابوں کا معیار کیوں روزبروز گرتا جا رہا ہے یہ ہمارا علم و فہم اگر درسی کتب کی تشکیل پر صرف نہیں ہو رہا تو ان کے وجوہ کیا ہیں؟

اب میں ان تینوں فریقوں کے مسائل کا سرسری ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ میرے خیال میں سب سے زیادہ معتوب اور ملعون طبقہ ناشرین کا ہے جنہیں عام طور پر سرمایہ دار، منافع خور، چور، ڈاکو اور بد معاملہ تصور کیا جاتا ہے اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ان تنگ نظر لوگوں کو کاروبار میں مناسب نفع کی افادیت کا اندازہ تک نہیں نفع سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ کاروباری نے اپنے صارفین کا خون چوس کر نفع حاصل کیا ہے بلکہ نفع تو بہت اہم اقتصادی قرض ادا کرتا ہے۔ سرمایہ کاری اور محنت کا واجب ثمر نفع سے ہی ملتا ہے۔ نیز منافع جات ہی سرمایہ کے اصل منبع ہیں جن سے اداروں کے پھیلاؤ، ان کی تجدید و اصلاح کے لئے روپیہ پیسہ آتا ہے ورنہ پھر اقتصادی نظام اجارہ دارانہ ہو جاتے گا۔ ایسی صورت میں کتابوں کو ظاہری اور باطنی طور پر بہتر سے بہتر بنانے کے لئے کوئی اقتصادی دباؤ باقی نہیں رہے گا اور صارفین کو سرکاری تیار کردہ کتب پر ہی تکیہ کرنا پڑے گا۔

دوسرا سبب عوام میں تہذیبی شعور کا فقدان ہے لوگ کتابوں کے کاروبار اور ڈبل روٹی یا تمباکو کی تجارت میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔ وہ ہر کتاب کے بارے میں عموماً یہ سوچتے ہیں کہ ادھر پریس سے نکلی اور ادھر پبلشر کی تجوری بھری، لیکن ناشر کا یہ حال ہوتا ہے کہ یکمشت سرمایہ لگانے کے بعد ایک ایک دو دو زیادہ سے زیادہ پانچ پانچ کتابیں فروخت کر پاتا ہے اور سال بھر امید و بیم کا عالم گزرنے کے بعد اسٹاک رجسٹر جب یہ اطلاع دیتا ہے کہ فلاں بن فلاں کتاب کے ایک ہزار کے ایڈیشن میں سے فقط ایک سو گیارہ کتابیں فروخت ہوئی ہیں تو وہ اس وقت مصنف اور پڑھنے والوں کو تو کیا کہہ سکتا ہے البتہ اپنی عقل کا ماتم ضرور کرتا ہے اور اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ خود ہی مصنف بن بیٹھے جس طرح بہت سے مصنفین نے پبلشنگ کا کاروبار شروع کیا ہے اور تصنیف کے ساتھ اشاعت کے تلخ تجربے سے بھی لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ اس کا احساس تو اب مصنفین کے ادارہ رائٹرز گلڈ کو بھی ہو چکا ہے۔

یہ بات تو بہتوں کو یاد ہے کہ ملٹن جیسے عظیم شاعر کی "فردوس گمشدہ" پانچ پاؤنڈ میں بکی تھی لیکن یہ بات

بھی فراموش نہیں کی جا سکتی کہ جب ڈاکٹر جانسن نے ڈکشنری خود ہی چھاپنے کا منصوبہ بنایا تو کتنے پاپڑ بیلنے پڑے اور بقول اکبر الہ آبادی

مگر سب ہو گئے خاموش جب مطبع کا بل آیا

آجکل ہم سنتے ہیں کہ امریکہ کے فلاں مصنف کو اتنے ملین ڈالر رائلٹی ملی یا فرانس میں فلاں ناول کی فلم بن گئی اور اس کے مصنف کو ہزاروں پاؤنڈ معاوضہ ملا۔ اور پھر ہم پاکستان کو بھی امریکہ اور فرانس سمجھ بیٹھتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ کتاب، ابھی تک ہماری زندگی کا جز نہیں بن سکی۔ بلکہ ایک "فاضل" ہے جو اگر حاصل ہو تو مفت۔ ملک میں تعلیم کا تناسب اور علم دوستی کا جو عالم ہے وہ اپنی جگہ۔ لیکن قیامت تو یہ ہے کہ ہماری نئی ابھرتی ہوئی نسل کو کتابوں سے کوئی لگاؤ پیدا نہیں کرایا گیا، ان میں استادوں نے پڑھنے کا شوق نہیں ابھارا۔ وہ ساڑھے چھ روپے کا نائیلون کا موزہ تو بے تکلف خرید سکتے ہیں لیکن دو روپے کی کتاب خریدنے میں اُن کی معاشی بدحالی سد راہ بنتی ہے۔ اس سلسلے میں کسی سے پوچھئے تو معاشی پستی کے اصول سمجھائے جاتے ہیں —— جب صورت حال یہ ہو تو کتابوں کی بڑے پیمانے پر اشاعت کیسے ہو؟ ہمارے یہاں صرف ایک طبقہ کتابیں خریدتا ہے جو انگریزی اسکولوں سے نکلتا ہے اور اردو کتاب کو چھوت کی بیماری تصور کرتے ہوئے ہاتھ نہیں لگاتا۔ یہ طبقہ اپنی ملی و قومی روایات و اقدار کو تحقیر کی نظر سے دیکھتا ہے۔ غیر ملکی زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا ایک تمغہ جو مل رہا ہے وہ یہ ہے کہ اُسے اپنی تہذیب کو اپنانے میں شرم و ندامت محسوس ہوتی ہے —— وہ اپنی تہذیب کی نشو و نما کرنے کی بجائے غیر شعوری طور پر اُس غیر ملکی تہذیب کی نمائندگی کر رہا ہے جس سے ہمیں ۱۹۴۷ء تک شدید نفرت تھی۔ اس طرح یہ طبقہ اپنی تاریخ سے بھی اپنے کو منقطع کر چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے کردار میں ملی شخصیت اور قومی احساس کا فقدان ہے۔ ہر زبان کی کتابیں اس کی اپنی تہذیب کا آئینہ دار ہوتی ہیں۔ اپنی زبان میں کتابیں پڑھنے اور خریدنے والے بڑی تعداد میں موجود ہوں تو اچھی کتابیں بھی چھپیں اور بکیں —— اور خوب سے خوب تر کی جستجو قائم رہے۔

ہم یہ مانتے ہیں کہ اردو کتب کا ناشر اردو کتاب کے مصنف کو اس کی تخلیقی اور ذہنی کاوش کا صلہ نہیں دے سکتا۔ کیونکہ نہ وہ ہارون الرشید ہے اور نہ جہانگیر بادشاہ! وہ تو مجموعی منافع میں سے ایک مناسب حصہ ہی دے سکتا ہے۔ اسی لئے منافع اگر زیادہ ہوگا تو اس کا حصہ بھی اسی نسبت سے زیادہ اور معقول ہوگا —— مجھے یاد ہے کہ 'غبار خاطر' کے پہلے ایڈیشن پر مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کو مبلغ ۳۲۴۳/۵/۳ روپے رائلٹی خود اس ناچیز نے ادا کی تھی جو ان کا جائز حق تھا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اوروں کو اتنی رائلٹی کیوں نہیں ملتی —— یہ لمحۂ فکریہ ہے مصنفین کے لئے —— تخلیقی ادب کی کمی تہذیبی خلا کی غمازی کرتی ہے —— جو ذہنی بے مائگی اور نفسیاتی تضاد کا نتیجہ ہے۔

ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ بعض ناشرین اس مناسب حصہ میں بھی نامناسب طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں جو بالکل اسی طرح ہوتا ہے جیسے بعض مصنفین معاوضہ پیشگی وصول کرکے بھی مسودہ نہیں دیتے —— یہ عمل قابل مذمت تو یقیناً ہے لیکن اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ قومی زندگی کے ہر شعبہ میں کم و بیش کے فرق سے بعض ناپسندیدہ عناصر کا ہونا ناگزیر ہے۔ لیکن ان کی وجہ سے پوری قومی زندگی میں کیڑے ڈال دینا بڑی ذاتی

اور بھی ناانصافی کی بات ہوگی

پی ڈبلیو ڈی کا محکمہ ہو یا ڈاکٹری کا شعبہ، محکمۂ تعلیم ہو یا ادارۂ ناشرین اچھے اور برے ہر جگہ ہیں ہر زمانے میں رہے ہیں اور ہر زمانے میں رہیں گے ضرورت ہے کہ اچھوں کی حوصلہ افزائی کی جائے، ان کی خدمت اور صلاحیت سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اور بروں کو برا سمجھتے ہوئے بھی ان کی طرف سے مایوس نہ ہوا جائے ـــــ نشر و اشاعت کا کام ٹھیکہ داری کی طرح مختلف درجوں میں مالی اعتبار سے منقسم نہیں کیا جا سکتا۔ ورنہ خوب و ناخوب کا امتیاز قائم نہ رہے گا۔

اردو کی درسی کتابوں کے معاملے میں یہ امتیاز اور بھی ضروری ہے۔ درسی کتابوں کی اشاعت کا کام ہماری تجارت میں ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتا ہے۔ اور اس وقت ملک کے بڑے بڑے ناشر بھی وہی کہلائے جاتے ہیں جن کے کاروبار کا معتد بہ حصہ درسی کتابوں پر مشتمل ہے۔ کیونکہ درسی کتب میں روپیہ کی آرجار ادبی کتب سے کہیں زیادہ ہوتی ہے اور روپیہ کی اس آرجار کے سہارے بہت سی ادبی کتب شائع ہو جایا کرتی ہیں ـــ مگر اب درسی کتب کی اشاعت کا کاروبار بھی محدود کر دیا گیا ہے۔ اس پہ قیود ایسی عائد کی جا رہی ہیں جو کاروبار کی ترقی میں معاون ہونے کی بجائے اس کی تباہی کا موجب ہو رہی ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے جب درسی کتابوں کی تیاری کا فرض حکومت نے خود نہیں سنبھالا تھا تو مختلف ناشرین اپنی توفیق کے مطابق اچھے سے اچھے اساتذہ سے کتابیں مرتب کرا کے محکمۂ تعلیم کو پیش کیا کرتے تھے اور اس معاملہ میں ایک دوسرے سے سبقت اور بازی لے جانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ یاد رہے کہ یہ 'بازی' جوئے یا سٹے کی بازی نہیں تھی بلکہ درسی ضروریات کو سمجھنے اور اشاعت و طباعت کا معیار قائم رکھنے کی بازی تھی ـــــ کتاب منظور ہونے پر مصنف یا مصنفین کو برسوں تک اس کی رائلٹی ملتی رہتی تھی۔ اس کے بعد کتابیں مرتب کرنے والے ارکان کی نامزدگی کا سلسلہ شروع ہوا انہیں ایک بار معاوضہ کی رقم دے کر رخصت کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح انہیں پہلے کے مقابلہ میں بہت کم معاوضہ ملتا ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ ناشروں کی طرح درسی ماہرین میں بھی ایک دوسرے سے بہتر کتاب پیش کرنے کی جو خواہش رہتی تھی وہ باقی نہ رہی پچھلے دو سال سے جو نئی درسی کتابیں آ رہی ہیں انہیں دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ معیار اونچا ہو رہا ہے یا گر رہا ہے۔ اس سلسلے میں ناشر مجبور ہے اسے محکمہ کی ہدایات پر عمل کرنا ہوتا ہے اور اس ارتقائی تنزل کا رخ ہے۔ اصل میں اس سلسلہ میں پہلے فن اور اس کی افادیت کا اندازہ ہونا ضروری ہے۔

مجھے یقین ہے کہ آپ میرے ہم خیال ہوں گے کہ کتابوں کی نشر و اشاعت کا کام محض ایک کاروبار نہیں ہے بلکہ ایک فن بھی ہے جس کے لئے سرمائے کے علاوہ علم، تجربہ اور سلیقہ بھی درکار ہے ـــــ محض سائن بورڈ لگا کر کوئی ناشر نہیں بن جاتا۔ لیکن بعض لوگوں نے ان وسیع و عریض علمی و فنی کاروبار کو سائن بورڈ اور لیٹر پیڈ تک محدود کر لیا ہے۔ کبھی ہماری قوم کو شاعر بننے کا جنون تھا آجکل پبلشر بننے کا ارمان ہے۔ یوں تو ہر شعبے میں نئے لوگ داخل ہوتے رہتے ہیں اور ان کا آنا بھی ضروری ہے مثلاً بوڑھے اور تجربہ کار ڈاکٹر موجود ہوتے ہیں اور نئے نئے نوجوان ڈاکٹر آتے رہتے ہیں لیکن نئے ڈاکٹر بھی ایک خاص عرصہ کی تعلیم و تربیت کے بعد ہی اس عملی میدان میں قدم رکھتے ہیں اسی لئے نئے اور پرانے ڈاکٹروں میں بہر حال فرق رہتا ہے۔ لیکن عطائی بہر حال عطائی ہے وہ ڈاکٹر نہیں بن سکتا۔ مجمع لگانے والے حکیموں کی طرح سٹرک چھاپ، ناشر بھی ہوتے ہیں لیکن میں یہی عرض کروں گا کہ عوام اور حکومت دونوں کو چاہئے کہ نیم ناشر کو بھی نیم حکیم

اور نیم ملا کی صف میں رکھیں۔

درسی کتابوں کا دوسرا پہلو اس کا موجودہ طرز کاروبار ہے۔ اب ان کتابوں کی تصنیف و تالیف اور نشر و اشاعت میں ناشر کا کوئی کردار نہیں ہوتا۔ وہ محض ایک ٹھیکیدار ہوتا ہے۔ جو اپنی صلاحیتوں اور ذہانت کا کہیں استعمال نہیں کر سکتا یہاں تک کہ مسودہ میں اگر زبان ناقص ہو یا تصاویر غلط بنائی گئی ہوں تو وہ انہیں بھی درست کرنے کا حق تک نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ مسودہ حکومت کا خود تیار کردہ ہوتا ہے، ہمارے تحت الشعور میں چونکہ موجودہ افسران اب بھی ۱۹۴۷ء کے حکومت کے افسران کی نمائندگی کرتے ہیں اس لئے ہم میں اور ان میں اب بھی وہی دوری ہے اور ان خیالات کو اس وقت اور تقویت پہنچ جاتی ہے جب ناشر دیکھتا ہے کہ اس کی ترقی کے منصوبوں کی بجائے اس کی تباہی کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ کتابوں کی اشاعت کے لئے ان کا ٹنڈر طلب کیا جاتا ہے جس میں دو طبقوں کے مناسب نفع کی پوری پوری ضمانت ہوتی ہے نمبر اخود محکمہ کی رائلٹی بشرح پندرہ فیصد نمبر ۲ تاجر کتب کیلئے پندرہ فیصد کمیشن ان دونوں لازمی منافع میں ساڑھے بارہ فیصد پبلشر کا نفع شامل کر کے سرکاری قیمت کے تعین کے بعد ناشرین سے اس ساڑھے بارہ فیصد نفع کو اور کم کرنے کے لئے ٹنڈر طلب کئے جانے کا انوکھا طریقۂ کار نکالا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح جن کا کاروبار ہمیشہ سے درسی کتب کا کاروبار رہا وہ اُس کو برقرار رکھنے کے لئے طوعاً و کرھاً اس منافع کو اور کم سے کم حد تک لے جانے پہ مجبور کئے جاتے ہیں۔ پھر عطائی قسم کے سڑک چھاپ ناشر بھی مقابلہ میں ہوتے ہیں جو بلا منافع کام حاصل کر کے شرحوں اور دیگر غیر تعلیمی طریقوں سے اس کمی کو پورا کر لیتے ہیں۔ حکومت ایک خاص مدت کے لئے کتابوں کی ایک مقررہ تعداد شائع کرنے کا ٹھیکہ دیتی ہے اس مقررہ تعداد پہ پیشگی رائلٹی اور زرضمانت وصول کیا جاتا ہے اور طرفہ یہ کہ اگر اس تعداد میں کتابیں فروخت نہ ہوں تو ان غیر فروخت شدہ کتب کی رائلٹی قابل واپسی بھی نہیں۔ مثال کے طور پہ ناشر کو سندھی زبان میں قرآنی قاعدہ تیس ہزار چھاپنے کے لئے ایک ڈیڑھ فیصد منافع پہ ملا۔ اس نے قاعدہ پندرہ ہزار شائع کیا جس میں سے صرف آٹھ ہزار کتاب فروخت ہو سکی اور باقی سات ہزار کتاب میں پڑیاں بھی نہیں بندھ سکتیں اس لئے کہ اس میں جا بجا قرآن کی آیتیں تھیں۔ یہ نقصان اس لئے بھی ہوا کہ مدت ختم ہونے کے ساتھ نئی کتاب میں تھوڑا سا رد و بدل بھی کر دیا گیا تاکہ پرانی کتاب فروخت نہ ہو سکے۔ اس پہ ستم ظریفی یہ کہ غیر طبع شدہ تعداد کی رائلٹی بھی واپس نہیں کی گئی۔ آخر اس صورت حال کی وجہ ؟ قومی تصورات کی کمی ! فرد کے نقصان کو قومی نقصان تصور نہ کرنا ــــ!!

جس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ ہر ناشر غیر محفوظ، نامطمئن اور غیر آسودہ ہے ــــ اس عدم تحفظ کے ماحول نے اس کی صلاحیتوں کو زنگ آلود کرنا شروع کر دیا ہے اور اس کا اس وقت صرف ایک ہی نظریہ ہے کہ وہ خود کو کس طرح محفوظ رکھے ــــ اس جذبہ نے اس کی اقدار کو ملیا میٹ کر دیا ہے، نہ کام سے لگاؤ باقی رہا ہے اور نہ اچھے کام کا ولولہ۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان ناشرین کو اقتصادی بدحالی کی طرف کیوں لے جایا جا رہا ہے اور کیوں ان کے جائز منافع کی ضمانت نہیں دی جاتی ؟ اور کتابوں کی تقسیم میں کام کی نوعیت اور فن کی ترقی کو قابل اعتنا کیوں نہیں سمجھا جاتا ؟

اول تو یہ طریقۂ کار کہ حکومت خود کتاب لکھوائے میں سمجھتا ہوں ترقی میں رکاوٹ ثابت ہو گا۔ آزاد مقابلہ سے جو ارتقائی منازل طے ہوتے ہیں ان کے تمام راستے اس طریقے سے مسدود ہو چکے ہیں اب تو وہی مصنف کتاب لکھ سکتا ہے جسے پیا چاہے۔ اس طرح تخلیق کا گلا گھونٹا جا رہا ہے۔

اس عمارت کا معمار اول مصنف ہے جو اس عمل سے ناشر کے ساتھ بری طرح متاثر ہو رہا ہے۔ کیونکہ یہی وہ اصل چیز ہے — علم و ادب — جسے وہ کتابوں میں محفوظ کرتا ہے اور اسی کے علم کو طلباء تک پہنچانے کے لئے یہ تمام ذرائع اختیار کئے جاتے ہیں، اس لئے مصنف کا حق مقدم ہے مگر اردو درسی کتب کا جو معاوضہ دیا جا رہا ہے۔ وہ اس معاوضے سے بہت ہی کم ہے جو ان کو ملنا چاہئے۔ ویسے ہمارے ملک میں خدا کے فضل و کرم سے ایسے لائق، تجربہ کار اور علم دوست موجود ہیں جنہیں خدمت کا موقع اور محنت کا صلہ دیا جائے تو مثالی کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔ مگر یہ ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا کام نہیں۔ کیونکہ اس دور میں فلسفۂ تعلیم اور علم نفسیات کی بدولت، ذہن و فکر کے نئے نئے گوشے اور رجحانات سامنے آ رہے ہیں اور درسی کتابوں کی تدوین میں نئے ذہن سے کام لیا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہماری معاشرتی زندگی اور روایات کے کچھ ایسے تقاضے بھی ہیں جو غیر ملکی کتابوں کا محض ترجمہ کر دینے سے پورے نہیں ہو سکتے۔ اس لئے درسی کتابوں کی ترتیب کے لئے فلسفۂ تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک تخلیقی ذہن کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک ایسے روشن ذہن کی جس کی نشو و نما پاکستان کی فضا میں ہوئی ہو اور جو اپنی نئی نسل کی صلاحیتوں، دشواریوں اور مجبوریوں سے اچھی طرح واقف ہو۔ اسے ہمارے ملی اور تہذیبی ورثے سے دلی لگاؤ ہو۔ ایسا نہ ہوتا تو ہم ریل کے انجن اور ٹرانسسٹر کی طرح ہر مضمون کی کتاب بھی درآمد کر لیتے اور کتابوں سے لدے ہوئے جہاز کیماڑی پہنچتے ہی ہمارا یہ قومی مسئلہ بھی حل کر دیا کرتے! لیکن درسی کتاب ٹکنیکل ہونے کے باوجود میکنیکل نہیں ہوتی اس لئے اُسے اپنے ہی دیس کے ماہرین درسیات کر سکتے ہیں۔

حضرات آپ کو یاد ہو گا برطانوی عہد میں تحصیلداروں اور ڈپٹی کلکٹروں کی نامزدگی کا رواج تھا اس میں جو خوبیاں اور خامیاں تھیں وہ بھی آپ جانتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس میں خرابیاں کچھ زیادہ ہی ہوا کرتی تھیں اسی لئے اعلیٰ صلاحیتوں کے لوگوں کو عام موقع دینے کے لئے سروس کمیشن قائم کیا گیا تھا اور مقابلے کے امتحان شروع ہوئے — ہماری خواہش تھی کہ محکمۂ تعلیم بھی سروس کمیشن کا کردار ادا کرتا تو اچھی صلاحیتوں کے لوگوں کو اپنے جوہر دکھانے کا کھلا موقع ملتا۔ ہمیں اس بات کا گلہ نہیں کہ حکومت نے درسی کتابیں قومی ملکیت میں لے لی ہیں ہم تو کہتے ہیں کہ حکومت بہت سے ناشروں اور پریس والوں کو بھی قومی ملکیت میں لے لے بشرطیکہ اس میں کوئی اعلیٰ مقصد پوشیدہ ہو اور سب کے ساتھ انصاف کا یہی طریقہ ہو — اور انصاف تو پکار پکار کر یہی کہتا ہے کہ ناشروں کی طرح ہر ادیب کو بھی اپنی خدمت اور صلاحیت پیش کرنے کا موقع حاصل رہنا چاہئے۔ ورنہ کچھ دنوں میں "نامزد ماہرین" کا ایک طبقہ پیدا ہو جائے گا۔ اور اساتذہ اور مصنف سوچنے اور لکھنے کی صلاحیت اجاگر کرنے کی بجائے نامزدگی کے طلسم میں گرفتار ہو جائیں گے۔ برطانوی عہد میں یہی تو ہوتا تھا کہ ہمارے نوجوان بی۔ اے پاس کرنے کے بعد سعی و سفارش کے چکر میں رہی سہی صلاحیت بھی کھو بیٹھتے تھے — جو لوگ کتابیں لکھنے کے لئے نامزد کئے گئے ہیں یا آئندہ کئے جائیں گے وہ یقیناً لائق و فائق ہوں گے لیکن بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو ان سے بھی زیادہ لائق ہیں۔ آخر اُن کو آزمانے میں کیا مضائقہ ہے؟ اس طرح سب کو یکساں موقع دینے میں کیا خطرہ ہے؟ ہر اُستاد کے پڑھانے کا طریقہ اور ہر صاحب قلم کے لکھنے کا اسلوب منفرد ہوتا ہے۔ ہمیں ان تمام انفرادی طریقوں اور سلیقوں کو اجتماعی زندگی کے لئے استعمال کرنے کی صورت پیدا کرنی چاہئے اور لکھنے والوں کو اتنا معاوضہ ضرور ملنا چاہئے جسے وہ ذہنی کاوش اور محنت کا بدل سمجھ سکیں۔

اب جہاں تک تیسرے فریق یعنی حکومت کا تعلق ہے اسے جج کی حیثیت بھی حاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی جج اگر مقدمہ کے کسی فریق کی حمایت یا وکالت خود کرنے پر مائل ہو تو انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔ فیصلہ تو ان ہی کے حق میں ہونا چاہئے جن کے پاس اپنا حق منوانے کی دستاویزی شہادت موجود ہو۔ درسی کتابوں کی اشاعت کے سلسلہ میں بھی محکمۂ تعلیم کے سامنے مدعی اور مدعا علیہ دو نوں پیش ہوتے رہتے ہیں۔ اچھا جج وہی ہے جو ذاتی مفاد، ذاتی تعصب اور اثر ورسوخ کی پرواکئے بغیر انصاف کا پرچم بلند رکھے۔ کہتے ہیں قانون اندھا ہوتا ہے، اُسے انصاف کے سوا کچھ نظر نہیں آتا لیکن جج اندھا نہیں ہوتا۔ وہ بصارت کے ساتھ بصیرت بھی رکھتا ہے اور سب کچھ دیکھتا اور سنتا ہے۔ اس تمثیل کے پردے میں مجھے اتنی سی بات کہنی ہے کہ قانون میں خرابی نہیں ہوتی۔ البتہ اس پر عمل کرنے اور کرانے والوں کی ذات انصاف کے راستے میں حائل ہو سکتی ہے۔ ناشر ہوں یا مصنفین سب کے ساتھ انصاف ہونا چاہئے کیونکہ ایسا نہ ہوا تو اردو درسی کتابوں کی شکل میں جو چیز ہمارے سامنے آئے گی وہ کھری نہیں کھوٹی ہوگی اور اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ساری نسل کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے۔

حکومت کا فرض یہیں ختم نہیں ہو جاتا کہ وہ ناشروں کو منظور شدہ کتابوں کی طباعت کا آرڈر دیدے — بلکہ ناشرین کو ایسی شرطیں اور سہولتیں پیش کی جائیں کہ ان میں "عدم تحفظ" کے جذبہ کا تصور ہی نہ ہو سکے تاکہ وہ اپنا فرض خوبی سے انجام دے سکیں۔ اب جبکہ اعلیٰ تعلیم تک کے لئے ذریعۂ تعلیم اردو کیا جارہا ہے تو یہ از بس ضروری ہوگیا ہے کہ ہم چوکنے ہوکر کام کریں — ہمارے ادب میں سائنسی اور فنی کتابوں کی کمی ہے ان کی تیاری میں عملی تعاون کیا جائے — اور تعاون کرنے والے ناشرین کی حوصلہ افزائی اور ان کا احترام ضروری ہے۔

حضرات! دودھ میں پانی ملانا بری بات ہے لیکن اس زمانے میں خالص دودھ کی فراہمی "جوئے شیر" لانے سے بھی مشکل ہے۔ بہرحال یہ ضروری ہے کہ ہم خالص چیزوں کی تلاش جاری رکھیں آپ نے پرانی کتابوں میں یہ محاورہ پڑھا ہوگا کہ فلاں قاضی نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیا۔ یہ محاورہ بہت پرانا ہے البتہ پرانے زمانے میں پانی کا تناسب اتنا زیادہ نہیں ہوا کرتا تھا جتنا ان دنوں ہے — اس سلسلہ میں مجھے ایک واقعہ یاد آگیا، میں چاہتا ہوں کہ آپ کو بھی سنا دوں — ہمارے ایک دوست برطانیہ کے ایک گاؤں میں گئے جہاں ایک خاتون نے اپنی گایوں کا دودھ مقامی اسکول کے بچوں کو فراہم کرنے کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ گایوں کا دودھ کم تھا اور بچوں کی تعداد زیادہ — اس لئے وہ خاتون دودھ کی کمی دور کرنے کے لئے دوسری جگہ سے خرید کر لاتی تھیں۔ ہمارے دوست کو نازک اندام خاتون کی یہ زحمت دیکھ کر ترس آیا اور انہوں نے یہ مخلصانہ مشورہ دیا کہ آپ دس سیر دودھ میں دو سیر پانی ملا لیا کریں تو پتہ بھی نہ چلے گا اور منافع الگ ہوگا — اس نیک خاتون نے جواب دیا "لیکن میں ایسا کیسے کر سکتی ہوں؟ یہ دودھ تو میں اپنی ہی قوم کے بچوں کے لئے مہیا کرتی ہوں — کیا اپنے بچوں سے بد دیانتی کروں؟"

اس کے برعکس ایک واقعہ خود میرے ساتھ پیش آیا — کچھ ہی عرصہ ہوا کہ ایک دن میں نے اپنے دودھ والے سے شکایت کی کہ دودھ بہت پتلا آرہا ہے — اُس نے ایسا معقول جواب دیا کہ میں سناٹے میں آگیا۔ اس نے کہا کہ " بابوجی! آپ خود سوچئے بھینسیں تو وہی آٹھ کی آٹھ ہیں اور گاہک برابر بڑھتے جارہے ہیں اور مجھ

سب کی ضرورت پوری کرتا ہے۔ آپ ہی بتائیے کیا کروں؟" یہ دو واقعات دو مختلف نقطۂ نظر اور دو مختلف احتیاجی اور انفرادی شعور کا اظہار کرتے ہیں۔ ہمیں ان سے سبق لینا چاہیئے۔ دودھ اور کتاب میں یقیناً بہت بڑا فرق ہے لیکن دونوں کا کاروبار کرنے والے ایک ہی قوم ——— اور ایک ہی ذہن کے افراد ہیں ——— جب تک یہ ذہن نہ بدلے گا اور قومی شعور پیدا نہ ہوگا اس وقت تک ہم خالص چیزوں کو ترستے رہیں گے۔

اور یہ قومی شعور کیا چیز ہے؟ جس کا ان دنوں بہت چرچا ہے۔ کیا یہ بھی کوئی جنس ہے جو باہر سے درآمد کی جاسکتی ہے ——— ؟ قومی شعور کا صرف اتنا ہی مطلب ہے کہ ہم اور آپ سب شریف انسانوں کی طرح سوچیں اور اپنے فائدے کے لئے دوسروں کا نقصان گوارا نہ کریں ——— ! درسی کتابوں کے اوراق میں اور اساتذہ کے ذہن میں قومی شعور کا تصور موجود ہو تو یقیناً ہمارے طلبا میں بھی صحت مند شعور بیدار ہوگا ——— علم و فن کی بڑی بڑی ڈگریاں دنیا کے اعلیٰ اداروں سے ضرور حاصل کی جاسکتی ہیں لیکن قومی شعور ان ہی اداروں میں نشوونما پاتا ہے جو ہماری درسی کتابوں کے سہارے چلتے ہیں ——— اس لئے درسی کتاب کی ضرورت اور اہمیت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

کسی بھی تجارت، صنعت یا فن کے تحفظ اور اس کی ترقی کے منصوبوں پر جب غور کیا جاتا ہے تو اولیت اس کے اقتصادی پہلو کو سنوارنے اور مستحکم کرنے کو دی جاتی ہے۔ حکومت اسی لئے مراعات بھی دیتی ہے تاکہ اس صنعت کی اقتصادی حالت اطمینان بخش ہو جائے۔ ایسی مراعات میں انکم ٹیکس اور بعض اقسام کے ٹیکسوں سے معینہ مدت تک کے لئے مستثنیٰ کیا جانا، قرضوں کا اجراء، وسائل سرمایہ کاری کو بڑھانے کے لئے خصوصی بنکوں کا قیام وغیرہ شامل ہیں۔ حکومت کا یہ اشتراک اور سرپرستی اس وقت تک جاری رہتی ہے کہ جب تک حکومت اس صنعت کو مکمل طور پر مستحکم نہ کرلے۔ ملک میں کتابوں کی کمی دور کرنے کے لئے ایسی ہی اسکیمیں بنانا ہوں گی۔ حکومت کا فرض ہے کہ اس صنعت کو پیروں پر کھڑا کرنے کے لئے مناسب حوصلہ افزا اسکیم جلد از جلد بنائے۔ اس وقت تک اس فن سے مجرمانہ حد تک تغافل برتا گیا ہے۔ اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

حکومت یو۔ پی نے پچیس سال ہوئے کہ توسیع تعلیم کے لئے ایک علیحدہ محکمہ قائم کیا تھا جس کے فرائض میں گاؤں گاؤں لائبریریوں کا قیام بھی تھا۔ ان لائبریریوں کے لئے سالانہ معقول رقم کی امداد دے اردو اور ہندی کتابیں خرید کی جاتی تھیں۔ چھ سات برس سے اسی محکمہ نے ہندی کو مقبول بنانے کے لئے ہر اوسط کتاب کے پانچ ہزار سے دس ہزار نسخے خرید کرنے شروع کئے۔ یہ کتابیں ہر لائبریری کو مفت پہنچائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب ایک عام ہندی کتاب پچیس ہزار کی تعداد میں شائع ہوتی ہے۔ حکومت کی اس پالیسی سے پڑھنے کا ذوق بھی پیدا ہوا اور کتابوں کی مانگ میں بھی خوش گوار اضافہ ہوا۔

اس سلسلے میں اردو ناشرین روز اول کا سا درجہ رکھتے ہیں۔ ہمارے یہاں کتابوں کی نکاسی کے لئے لائبریریوں پر تکیہ کرنا پڑتا ہے گو ان کی تعداد بہت ہی کم ہے ——— ان کا نظام خریداری بھی کچھ مناسب نہیں ہے۔ کتابوں کے انتخاب میں افادیت اور ضرورت کو دخل نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بجٹ کا اکثر صحیح استعمال بھی نہیں ہو پاتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک میں لائبریریوں کا ایک جال بچھا دیا جائے اور دیانت دار سند یافتہ لائبریرین مقرر کئے جائیں تاکہ وہ عوام میں صحیح قسم کی کتابوں کے مطالعہ کا شوق بھی پیدا کرسکیں۔

اُردو کتابوں کی وافر نکاسی پر جب بھی غور کرتے ہیں تو یہ دلیل معقول معلوم ہوتی ہے کہ "کھپت کتابوں کی مانگ کے مطابق ہی تو ہوگی۔ اور مانگ کا انحصار تعلیم کے دائرہ پر ہے۔ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ تعلیم کی توسیع کے ساتھ کتابوں کی زیادہ سے زیادہ کھپت بھی ازخود ہوگی لیکن کیا ہمیں وقت کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا ہوگا؟ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے عناصر کو جن سے ترقی مقصود ہوتی ہے پہلے ہی دائرہ عمل میں کیوں نہ لے آیا جائے؟ یہ کتنی افسوسناک بات ہے کہ "پبلشنگ" کو ابھی تک "قومی پیداوار" کا جزو تصور نہیں کیا جاتا۔ بنکوں کی نظر میں سادہ کاغذ چھپے ہوئے کاغذ (مراد کتاب) سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے اس لئے بنکوں اور انشورنس کمپنیوں کی نظر میں یہ ایسی محفوظ پیداوار نہیں جس کی ترقی کے لئے سرمایہ فراہم کیا جائے۔

کاغذ اور کتاب کی تیاری سے متعلق دیگر اشیا کی گرانی بھی ہمارے مشن میں آڑے آ رہی ہے۔ کتابوں کی قیمتیں قوت خرید سے بڑھ چکی ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ قیمتیں ابھی اور مسلسل بڑھتی رہیں گی کیونکہ جو اجزا کاغذ کتاب کی قیمت پر اثر پڑتا ہے ان میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ خیال تھا کہ پی آئی ڈی سی سے کرنافلی ملز جب ایک ذاتی فرم کے ہاتھ میں آئے گی تو قیمتیں غیر ملکی کاغذ سے کم ہو جائیں گی۔ مگر پچھلے چھ برس کے گراف پر نظر ڈالئے تو پتہ چلے گا کہ کاغذ بائیس روپے رم ملا کرتا تھا اب بتیس روپے میں بھی میسر نہیں۔ صرف پچھلے چھ ماہ میں کتابی سائز کے کاغذ کی قیمت میں تقریباً گیارہ روپے فی رم کا اضافہ ہوا ہے۔ کاغذ کی اس اجارہ داری نے مصنوعی کمی پیدا کر رکھی ہے۔ اسے آزاد تجارت نہیں کہتے۔ منافع کی شرح میں مسلسل اضافہ، پیداوار کا محدود کرنا اور فروخت میں امتیازی سلوک مطلق العنان اجارہ داری ہوتی ہے ـــــ اس قسم کی اجارہ داری دیتے وقت حکومت کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ ان کارخانوں کی نگرانی بھی کرے تاکہ ایسے کارخانہ دار اس خیال سے کہ ان کے علاوہ تو یہ مال پیدا کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے اور ان کے کاروبار کی بنیاد تجارتی مقابلہ پر بھی نہیں ہے۔ مال کی قیمت میں اضافہ نہ کر سکیں۔ نیز پیداوار کا معیار نہ گرانے پائیں مگر کاغذ کے معاملے میں وزارت صنعت و حرفت کی چشم پوشی سمجھ میں نہیں آتی۔

اردو ٹائپ

سائنسی اور فنی کتابوں کی طباعت کے سلسلہ میں خصوصیت سے اچھے ٹائپ کی ضرورت ہوتی ہے اور ٹائپ کے سلسلہ میں جب تک ہم قومی سطح پر کوشش نہ کریں گے اس کی بہتری کی امید کم ہی ہے۔

اردو ٹائپ کے سلسلہ میں ہمارا رویہ کچھ عجیب سا ہے۔ پتہ نہیں کسی زمانہ میں کسی نے یہ کہہ دیا تھا کہ اچھا ٹائپ نہیں بن سکتا اور نستعلیق تو ناممکن ہی ہے بس یہ جملہ گویا مصرع طرح ثابت ہوا اور پھر ہر ایرے غیرے نے اس پر گرہ لگائی اور خوب طبع آزمائی کی۔ مارتے کا ہاتھ تو آدمی پکڑ لیتا ہے مگر کہنے والے کی زبان کس نے پکڑی ہے! جن کو ٹائپ کے متعلق الف بے تے کا بھی علم نہیں وہ اس پر رائے زنی کرتے ہیں ہمیں افسوس ہے کہ بغیر تجربے کے لوگوں نے محض فیشن بنا لیا ہے کہ وہ اردو ٹائپ کے متعلق موشگافیاں کرتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو غیر منقسم ہندوستان میں بھی ماسوائے دو تین مثالوں کے کسی نے اس پر نہ محنت کی، نہ وقت صرف کیا اور نہ ہی سرمایہ لگایا۔ ہمارے سامنے اس وقت اردو کے جتنے بھی قسم کے مروجہ ٹائپ ہیں یہ سب انگلستان اور جرمنی کی مختلف ٹائپ بنانے والی کمپنیوں مثلاً مونو ٹائپ کمپنی اور ہمہ اقسام کمپنیوں کے رہین منت ہیں۔ یہ مروجہ ٹائپ سبھی تجارتی نقطۂ نظر سے بنائے گئے ہیں۔ ان کی بنانے والی کمپنیوں میں سے کسی نے اردو کی خدمت کے لئے کوئی تجربہ نہیں کیا۔ بلکہ وہ ہماری

[illegible] آسانی سے [illegible] اس لئے انہوں نے یہ ٹائپ بنائے اور وہ اس کے ذریعہ خوب روپیہ کما رہے ہیں۔ تقسیم سے پہلے حیدرآباد دکن [illegible]
[illegible] ٹائپ بنانے کی سعی کی [illegible] نزدیک ہمارے رسم الخط کی خوبصورتی بے معنی تھی لہٰذا وہ ناکام رہے۔ دلی میں حشمت اللہ قریشی [illegible]
بعد میں [illegible] ریاضت کی اور زندگی کی کمائی اس میں لگائی۔ انہیں ملک کے نامور خطاط اور رام فن جناب منشی محمد یوسف دہلوی کا تعاون
حاصل تھا۔ عام اندازہ تھا کہ وہ نستعلیق ٹائپ میں کامیاب ہو جائیں گے مگر تقسیم نے ان کے تجربہ کو غالباً پایۂ تکمیل تک پہنچنے نہ دیا
[illegible] لاکھوں بے خانماں انسانوں کی طرح یہاں پہنچے۔ اور کون جانتا تھا کہ انہوں نے اپنی عمر عزیز کا ایک بڑا حصہ ایک لگن میں
صرف کیا تھا۔ خیال [illegible] پاکستان بننے کے بعد قومی سطح پر کوئی تجربہ کیا جائے گا۔ ہمارے دو پنج سالہ منصوبوں میں مچھلی گھر
اور مرغی خانے اور رفاہ خلائق کی اسکیمیں تو رکھی گئیں لیکن اردو ٹائپ کی کوئی جامع اسکیم ان منصوبوں میں شامل نہیں کی گئی۔
اگر ایسا ہوتا تو آج ہم مونو ٹائپ کے دست نگر نہ ہوتے۔ ہم فخریہ کہ سکتے کہ ہماری زبان کا ٹائپ کسی غیر ملک اور کسی غیر زبان
[illegible] تیار نہیں کیا۔ اور اس طرح ہم یقیناً اس قابل ہو جاتے کہ پرانے مصرع طرح پر مزید طبع آزمائی کی [illegible]

اس سلسلہ میں بعض نیم سرکاری قسم کے اداروں نے سب کمیٹیاں بنائی ہیں مگر یہ کام ایسی کمیٹیوں سے انجام پذیر نہ
ہو گا۔ اس کے لئے حکومت کو ایک خصوصی ٹرسٹ بنانا چاہئے۔ تعلیمی بجٹ میں اس کے لئے گنجائش پیدا کر کے ٹائپ
اور اردو ٹائپ رائیٹر کا کام اس کے سپرد کیا جائے تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ مسئلہ خوبی اور آسانی سے حل
ہو جائے گا اور ہم سرخرو ہو سکیں گے۔ لیکن اگر صرف منی آڈر فارم اردو میں چھاپ دینے سے حکومت نے اس غریب
قومی زبان کا حق ادا کر دیا ہے تو ہم یہی کہیں گے کہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔

میں نے چند مسائل کا سرسری ذکر کیا ہے لیکن ہر مسئلے کے متعدد پہلو ہیں اور ان پر تفصیلی غور کرنا اس کانفرنس
کا کام ہے۔ امید ہے کہ کانفرنس مختلف گروپوں اور کمیٹیوں کی شکل میں تمام مسائل کا جائزہ لے کر قابل عمل تجویزیں
پیش کرے گی۔ کانفرنسوں پر "نشستند و گفتند و برخاستند" کا فقرہ اکثر چست کیا جاتا ہے لیکن میری خواہش ہے
کہ یہ کانفرنس نشست کے بعد اور برخاست سے پہلے کچھ ایسی ٹھوس تجاویز منظور کرے جو قابل عمل ہو سکیں اور جن
پر عمل کرنے سے طلبا، اساتذہ، مصنفین، ناشرین اور مجموعی طور پر پوری قوم کو فائدہ پہنچے۔

میں بطور انتباہ کے ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اردو میں اعلیٰ تعلیم تک کے لئے کتابوں کی عظیم
ذمہ داری کا بھاری بوجھ کوئی بھی اکیلے نہیں اٹھا سکتا۔ اس کے لئے صرف سنڈیکیٹ یا بورڈ کا فیصلہ ہی کافی نہیں ہے۔
صرف احکام اور ہدایات اور انتظامی قابلیت ہی درکار نہیں ہے بلکہ علم و فکر، فنی مہارت پیشہ ورانہ تجربہ،
کاروباری صلاحیت، نفع و نقصان اٹھانے کا حوصلہ، باہمی تعاون سب ہی کچھ ضروری ہے۔ اور ہم جلد از جلد
اردو میں کتابوں کی حد تک اسی وقت خود کفیل ہو سکیں گے جب کہ یونیورسٹی ہو یا محکمۂ تعلیم مصنف ہو یا ناشر
سب میں مل جل کر اپنا اپنا کام انجام دینے کا ولولہ، کام کی نزاکت کا قومی احساس، رواداری کا جذبہ اور
نصب العین کے معینہ مدت میں حصول کی لگن ہو۔ اگر چراغ سے چراغ نہ جلایا گیا تو یہ کام دو بھر ہو جائے گا اور
اس کی ناکامی محض چند خود غرض، نافہم لوگوں کی وجہ سے ایک المیہ کی صورت میں ہوگی۔
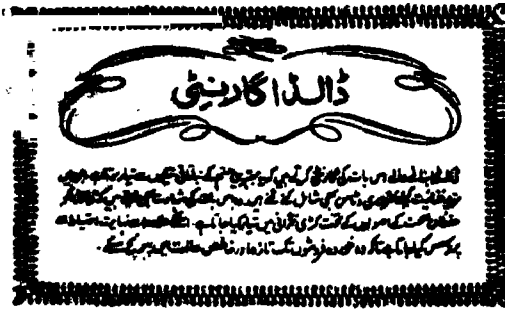
اور بے صبری کا انجام

ایک صاحب نے اپنا انعامی بونڈ بیٹھے بٹھائے بیچ ڈالا اور یہ صاحب اسے خرید لائے۔ اتفاق کی بات کہ اس پر ایک قرعہ اندازی میں انعام نکل آیا! اب گھر بھر کی خوشی کا کیا پوچھنا۔

کاغذ کا ذرا سا ایک پرزہ کس قدر قیمتی ہو سکتا ہے۔ یہ ہے انعامی بونڈ کا کرشمہ۔ دس روپے کے انعامی بونڈ پر سال میں چار بار ۵۰ ہزار روپے کی مالیت کے ۱۳۶ انعامات تقسیم کئے جاتے ہیں۔ پہلا انعام ۲۰٬۰۰۰ روپے۔

قرعہ اندازی میں شامل ہونے کے لئے اس سے کم از کم ایک ماہ پہلے انعامی بونڈ خریدیں۔ انعامی بونڈ کو حسب خواہش بھنایا بھی جا سکتا ہے اور بھنائے ہوئے بونڈ دوبارہ فروخت کر دیئے جاتے ہیں تاکہ ان پر بھی انعام پانے کا موقع حاصل ہے۔ آپ اس سے کیوں فائدہ نہ اٹھائیں؟

دس روپے والے انعامی بونڈ بنکوں اور ڈاک خانوں سے خریدیئے

ملک کے لئے بچایئے کنبے کے لئے بچایئے

آسٹرملک کا زمانہ
مسرّتوں سے بھرپُور ہوتا ہے

وہ زمانہ جب بچے کی پرورش آسٹرملک پر ہوتی ہے ماں اور بچے دونوں کے لئے مسرتوں سے بھرپور ہوتا ہے۔ آسٹرملک بچے کو تندرست اور خوش و خرم رکھتا ہے جس سے ماں بھی مطمئن اور مسرُور رہتی ہے۔

آسٹرملک اعلیٰ اور خاص قسم کے دودھ سے تیار کیا جاتا ہے۔ اِس میں فولاد ملایا گیا ہے تاکہ بچوں کے جسم میں خون کی کمی نہ ہونے پائے۔ ہڈیوں اور دانتوں کو مضبوط بنانے کے لئے ڈامن ڈی بھی مناسب مقدار میں شامل کیا گیا ہے۔ اِس لئے دودھ چھُٹ جانے یا اِس کی کمی پوری کرنے کے لئے دانشمند مائیں پورے اعتماد کے ساتھ بچوں کو آسٹرملک دیتی ہیں۔ جی ہاں! آسٹرملک بچے کی صحت اور مناسب نشو و نما کے لئے مضبوط بنیادیں قائم کرتا ہے۔
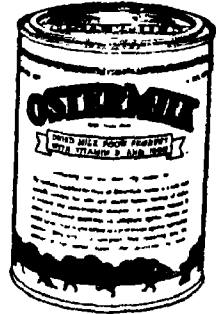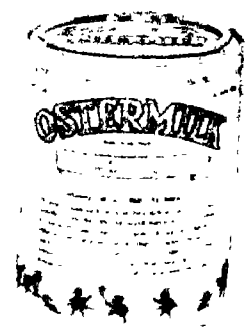
ماں کے دُودھ کا بہترین نعم البدل

اب آسٹرملک "ہاف کریم" بھی دستیاب ہے

بچوں کی پرورش پر ایک مفید کتاب
"آسٹرملک کی کتاب" اردو میں دستیاب ہے۔ ذیل کے پتے پر ۰ آنے پیسے کے ٹکٹ محصول ڈاک کے لئے بھیج دیجئے اور ایک کتاب مفت حاصل کیجئے۔
پوسٹ باکس نمبر ۳۶۷۳ - کراچی ۲

OM-14-193-UD

منظور شدہ محکمہ تعلیمات کراچی بموجب سرکلر نمبر ڈی۔ای/جی ڈی/ ۵۸۰۳ ۔ ۵۱۰۰۲/۶۰ مورخہ ۲۶ ستمبر ۱۹۶۰ء

اُردو ادب کا ڈائجسٹ

نقش کراچی

۱۱ ــ ۶۴

نومبر ۶۴

ادارہ

شاہد احمد دہلوی شمس زبیری

سالانہ	قیمت
بارہ روپے	ایک روپیہ

کاشانۂ اُردو۔ پوسٹ بکس ۷۳۰۲۔ کراچی ۳

فون ۷۰۱۵۶

ترتیب

افسانے

طنز و مزاح

منظومات

مضمون

چند اہم کتابیں!

ہماری داستان۔ کون ہے جو سید وقار عظیم کے نام سے واقف نہیں۔ کسی نے اگر ان کے نقادانہ کمالات کا جائزہ نہیں لیا ہے، تب بھی ان کی کوئی نہ کوئی تحریر ضرور دیکھی ہوگی۔ سید وقار عظیم نے یوں تو مختلف شعبہ ہائے ادب پر قلم اٹھایا ہے۔ لیکن افسانوی ادب ان کا خاص موضوع ہے۔ اس سلسلے میں کتنی ہی تصانیف شائع ہو چکی ہیں اور "ہماری داستانیں" ان کی ایک عظیم کاوش ہے۔ جو نہ صرف مصنف کے وقار کی شایانِ شان ہے بلکہ اُردو ادب کی ایک گرانقدر تصنیف ہے۔ اس کتاب کو داستان گوئی اور داستان نویسی کی تاریخ کا درجہ حاصل ہے۔ جس میں تنقید کے معیار فن پر ہر فن کار کی صحیح جگہ متعین نظر آتی ہے۔ نقاد کے قلم کو بے لاگ ہونا چاہئے اس کا ثبوت وقار عظیم کی ہر تحریر دیتی ہے۔ گر اس کتاب میں تو انھوں نے انصاف پسندی اور معتدل نقد و نظر کی ایک نظیر قائم کر دی ہے اُردو کی داستان ہمیشہ جس کی منت کش رہے گی۔ فن داستان گوئی داستان نگاری کی یہ بیش قیمت دستاویز مصنف کی نظر ثانی کے بعد بار دیگر شائع کی گئی ہے۔ اور حسن کتابت و طباعت کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے — قیمت دس روپے۔

مقدمات عبدالحق۔ بابائے اُردو کی خدمت ادب کا روشن پہلو کسی کی نظر میں کچھ بھی ہو لیکن مرزا محمد بیگ کا کہنا ہے کہ "دوسروں کے کام کو اجاگر کرنا بابائے اُردو کا کارنامہ ہے" اور ڈاکٹر عبادت بریلوی کا قول ہے کہ بابائے اُردو کی صحیح شخصیت دُوسروں کی شخصیتیں اُبھارنے ہی میں نمایاں ہوتی ہے"۔ اور ان کا یہ احسان فن سے زائد فن کاروں پر ہے جن کی قلم کاری کے جوہر — "مقدمات عبدالحق" سے روشنی میں آئے۔

یہ مقدمات عرصہ ہوا دکن میں شائع ہوئے تھے جن کو خود بابائے اُردو کی ترمیم و اضافہ کے بعد ڈاکٹر عبادت بریلوی نے از سر نو ترتیب دیا ہے۔ اور یہ بیش قیمت مجموعہ اُس دمکتے ہوئے آفتاب کے مترادف ہے جو اپنے دامن میں ان گنت ستاروں کی روشنی کے لئے ہے اور اپنی چمک سے ستاروں کی روشنی کم کرنے کے بجائے بڑھا رہا ہے۔ علمی ہمہ گیری اور ادبی جامعیت کی ایک عظیم تالیف۔ اور ادب کا ایک شاہکار۔ قیمت مجلد ۱۷ روپے — پیپر بیک ۵۰-۱۲ روپے

کالج کی تعلیم۔ تعلیم بالغاں پر ایک مفکرانہ اور عالمانہ تصنیف جو معلمین اور متعلمین دونوں کے لئے یکساں طور پر اہم ہے۔ اس کتاب میں طالب علمانہ زندگی کے مختلف ادوار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور نو واردانِ بساط مدرسہ سے کر فارغ التحصیل ہونے والے طلبا تک کے شعور و صلاحیت کا نفسیاتی تجزیہ کیا گیا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ کس عمر میں طالب علم کی درس و تدریس کے لئے کیا انداز اختیار کرنا چاہئے اور طالب علم کے لئے اکتساب علم کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ روجر اینج گاسین کی یہ تخلیق فن تعلیم پر ایک احسان عظیم ہے اور پروفیسر محمد عثمان کا ترجمہ اُردو ادب میں اپنی نوعیت کا بیش قیمت اضافہ — قیمت چار روپے۔

تاریخ اسلام۔ عرب فن تاریخ کے موجد کہے جاتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک افسوسناک حقیقت ہے۔ کہ عربوں کی تاریخی اساس روایات پر رکھی ہوئی ہے جن میں مشرق و مغرب کا اختلاف ہے اسی لئے سید امیر علی نے جب History of Saracens لکھنا شروع کی تو مستشرقین کے ساتھ ساتھ یورپ کے مورخین کی رایوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ اور ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے واقعات کو پانچ چھ سو صفحات میں سمیٹ دیا۔ تاریخ دانوں کا اتفاق ہے کہ اسلام کی مختصر تاریخ اب تک اس سے اچھی لکھی نہیں گئی جو زاویہ نگاہ کے اعتبار سے کسی مکتبۂ خیال کی پابند نہیں بہر صورت ایک غیر جانبدارانہ تحقیق ہے۔ اس تاریخ کے کئی ترجمے اس سے قبل شائع ہو چکے ہیں لیکن وہ سب ناپید ہیں۔ زیر نظر ترجمہ وحشی محمود تہامی نے ایک نئی ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے جس سے واقعات کو سمجھنا آسان ہو گیا ہے۔ قیمت نو روپے

اُردو اکیڈمی سندھ

کرشن چندر
شاعر، بمبئی

ساجھے کا مُردہ

ساڑھے چار بجے کے قریب جب بھاگو کی بیوی اُس کے کمرے میں چائے کا پیالہ لے کر گئی۔ تو اُس نے بھاگو کو اپنے پلنگ پر مُردہ پایا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دوپہر کا کھانا کھا کے قیلولے کے درمیان کسی وقت مر گیا تھا۔ جب کہ بھگوتی اپنے کمرے میں سلائی کی مشین پر اپنا بلاؤز سینے میں معروف تھی۔ بھاگو ایک عرصے سے دل کی بیماری میں مبتلا تھا۔ اور ڈاکٹر اس کی حالت اچھی نہیں بتاتے تھے۔ پھر بھی اُس نے کئی برس گھسیٹ گھسیٹ کے گزار دیئے تھے۔ اور اس کی بیوی بھگوتی کو مطلق یقین نہ تھا۔ کہ آج وہ یوں اچانک چل بسے گا

سب سے پہلے بھگوتی کے دل میں خیال آیا کہ وہ ایک زور کی چیخ مارے اور اپنے رونے پیٹنے سے سارے محلے میں وحشت پھیلا دے پھر یکایک اُسے اس تجوری کا خیال آیا۔ جس کی چابیاں بھاگو ہر وقت اپنی جیب میں رکھتا تھا۔ اور کبھی اپنی بیوی کے حوالے نہ کرتا تھا۔ بھاگو کے چار بیٹے تھے۔ دو انگلینڈ میں، دو افریقہ میں، بھاگو نے اپنی جمع پونجی میں سے اپنے چاروں بیٹوں کو اُن کے حصے کے ڈھائی، ڈھائی لاکھ دے دیئے تھے۔ اور باقی رقم لے کر بمبئی چلا آیا تھا۔ یہاں باندرے کی ایک نئی مضافاتی کالونی میں، اُوشا بلڈنگ میں، تیرہویں سڑک پر، اُس نے پچیس ہزار کی مالیت کا ایک فلیٹ خرید لیا تھا۔ اور اس میں اپنی بیوی بھگوتی کے ہمراہ رہتا تھا۔ اُس کے بیٹوں نے اپنے باپ کے اس اقدام کو پسند نہیں کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے۔ کہ ان کا باپ اپنی بقیہ پونجی بھی اپنے بیٹوں میں بانٹ دے۔ اور خود باری باری ہر ایک بیٹے کے پاس رہا کرے۔ مگر یہ بات نہ بھاگو کو پسند آئی۔ نہ بھگوتی کو۔ اس لئے بیٹے بھاگو سے بدظن ہو گئے۔ اور اپنے اپنے حصے کے ڈھائی لاکھ لے کر انہوں نے صبر کر لیا۔ اور ماں باپ کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

چند لمحوں کی خاموش کشمکش کے بعد بھگوتی نے چیخ مارنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ سب سے پہلے اُس نے بھاگو کی جیب سے تجوری کی چابی نکال کر اپنے قبضے میں کی۔ بھاگو کی جیب سے چابی نکالتے وقت بھگوتی کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ کیونکہ بھاگو بھگوتی کی طرح نہتا خسیس اور محتاط آدمی تھا۔ اور روپے پیسے کے معاملہ میں کسی پر بھروسہ نہیں کرتا تھا۔ ایک لمحے کے لئے بھگوتی کے دل میں خیال گزرا۔ کہ چابی نکالتے وقت بھاگو کا ہاتھ حرکت میں آجائے گا۔ اور وہ بھگوتی کی اس جسارت پر زور کا ایک چانٹا بھگوتی کے رخسار پر رسید کرے گا لیکن جب جیب سے چابی نکالتے وقت بھاگو کے ہاتھ بے حس و حرکت رہے اور جب اُس چابی سے تجوری کھول کر بھگوتی نے نوٹوں کی گڈیاں گنیں۔ اور اس وقت بھی بھاگو اپنے پلنگ سے اُٹھ کر تجوری کی طرف نہ آسکا۔ تو بھگوتی کو کامل یقین ہو گیا۔ کہ اُس کا شوہر مر چکا ہے اُس

[illegible] بند کر کے چابی کو کس کے اپنے کمر بند سے باندھ لیا۔ اور من قریب زور کی چیخ مارنے کو تھی کہ یکایک اس کی چیخ پھر ملتوی ہو گئی کیونکہ اب [illegible] کا خیال اپنے مردہ شوہر کے ہاتھ کی طرف گیا۔ جہاں دو بیش قیمت انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں۔ ایک انگوٹھی نیلم کی تھی۔ اور دوسری ہیرے کی۔ بھگوتی نے سوچا، تھوڑی دیر کے بعد جب سب محلے والے اکٹھے ہو جائیں گے اُس وقت تو میں چیخ پیٹ میں مصروف رہوں گی۔ اُس ہنگامے میں میرے لئے اپنے مُردہ شوہر کی انگوٹھیوں پہ نظر رکھنا ناممکن ہو جائے گا۔ لہٰذا انہیں بھی اتار لیتی ہوں۔ چنانچہ بھگوتی نے جلدی سے اپنے شوہر کی انگلیوں سے دونوں انگوٹھیوں کو اتار کر تجوری میں رکھ دیا۔

پھر اُس نے اپنے بال کھول ڈالے۔ دونوں ہاتھ اوپر اُٹھائے۔ اور ایک لمبی خوفناک چیخ ماری۔ اور زور زور سے دوہتڑ مار کر اپنا سینہ کوٹنے لگی۔ اور چیخ چلا کر بین کرنے لگی۔ اُسی وقت آس پاس کے فلیٹوں کے دروازے کھلنے لگے۔ اور عورتیں اور مرد بھاگے بھاگے بھارگو کے فلیٹ کے اندر آنے لگے۔ اور جب بھگوتی نے دیکھا کہ آٹھ دس مرد عورتوں کا جمگھٹا ہو گیا ہے۔ تو وہ سب کے سامنے روتی پیٹتی اپنے فلیٹ کی بالکونی سے چھلانگ لگا کر خودکشی کرنے کے لئے بھاگی۔ مگر سب لوگوں نے گھیر کر روک لیا۔

بمبئی میں شادی یا موت کا ہنگامہ چند گھنٹوں میں ختم ہو جاتا ہے۔ چند منٹ تک لوگوں کے حواس پر سراسیمگی چھائی رہی۔ کچھ عرصے کے لئے لوگ جوق در جوق فلیٹ کے اندر آ کر اظہارِ افسوس کرتے رہے اور بھگوتی عمدہ موزیک کے فرش پر نیم دراز حالت میں تڑپتی ہوئی بین کرتی رہی۔ لوگوں نے بھارگو کو فرش پر لٹا دیا۔ اور اس کے جسم پہ ایک چادر ڈال دی۔ اور زیرِ لب افسوس کے کلمات بڑبڑاتے ہوئے، چلے گئے۔ گمان کیا، یقین تھا۔ کہ چند گھنٹوں کے بعد بھگوتی کے رشتہ دار یا بھارگو کے رشتہ دار یا دونوں آئیں گے۔ اور بھارگو کی لاش کو ٹھکانے لگا دیں گے۔ اس یقین کے ساتھ سب لوگ واپس اپنے اپنے فلیٹ میں چلے گئے۔ اور کرتے بھی کیا؟ فلیٹوں کی زندگی ہی ایسی ہوتی ہے۔ یہاں کوئی کسی کو نہیں جانتا۔ پھر یہ تو ایک نئی مضافاتی کالونی تھی۔ یہاں تو بالکل ہی کوئی کسی کو نہیں جانتا تھا۔ اس لئے انسانی ہمدردی کی اوپری سطح کو کھرچنے کے علاوہ اور کیا ہی کیا جا سکتا تھا؟

البتہ چند لوگوں کو ضرور پریشانی تھی۔ ایک تو مجھے، کیونکہ جہاں میرا کھانے کا کمرہ تھا۔ اُس کے بالکل اوپر کے کمرے میں بھارگو کی لاش رکھی تھی۔ اور اپنے کمرے میں کھانا کھاتے ہوئے مجھے بجا طور پہ یہ احساس ہو رہا تھا گویا میں ایک لاش کو اپنے کندھے پہ رکھ کر کھانا کھا رہا ہوں۔ مگر مجھے اس لئے بھی پریشانی تھی۔ کیونکہ میں بمبئی میں نو وارد تھا۔ ورنہ بمبئی کے فلیٹوں کی زندگی میں یہ سب کچھ ممکن تھا۔ کیونکہ جہاں میرے سونے کا کمرہ تھا۔ اُس کے بالکل اوپر بغل والے فلیٹ کا باتھ روم ہے۔ اکثر اوقات پلنگ پر لیٹے لیٹے اچانک فلیش کی آواز سے میں چونک کر بیدار ہو جاتا ہوں اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی صاحب میرے سر پہ بیٹھے رفعِ حاجت میں مصروف ہیں۔ حالانکہ مجھے شکایت نہ کرنی چاہیئے۔ کیونکہ آخر میرا باتھ روم بھی تو کسی کے بیڈ روم کے اوپر ہو گا۔ اس لئے مجھے اس قسم کی باتوں کا عادی ہو جانا چاہیئے۔ اب ایک لاش میرے کھانے کے کمرے کے بالکل اوپر پڑی ہے۔ تو پڑی رہے مجھے کیا؟ بھارگو کے رشتہ دار آئیں گے اور اسے ٹھکانے لگا دیں گے۔ جب تک میں ریفریجریٹر کھول کر برف میں لگے ہوئے دو آم الفانزو کے کیوں نہ کھا لوں۔ مجھے زور کی بھوک لگی ہے۔ اور میں نے اکثر دیکھا ہے کہ کسی کے مرنے کی خبر سنتے ہی مجھے زور کی بھوک لگ آتی ہے۔ شاید یہ زندہ رہنے کی خواہش ہے جو زور سے ابھر کر بھوک کی صورت میں نمودار ہوتی ہے! کیا معلوم؟ میں الفانزو کھاتے کھاتے اپنے مزاج کی اس افتاد پہ غور کرنے لگا۔

میرے علاوہ مکن بھائی کیسٹ کو بھی پریشانی تھی۔ کیونکہ اُس کے فلیٹ کا دروازہ بھارگو کے فلیٹ کے بالکل سامنے کھلتا تھا۔ اور آتے جاتے دروازہ کھلتے، اس کی بیوی بچے اپنے فلیٹ سے بھارگو کے ڈرائنگ روم کے فرش پر پڑی ہوئی لاش کو دیکھ سکتے تھے۔

محض چند قدم کے فاصلے پر، لاش پر سے چادر سرک گئی تھی۔ اور بھارگو کے کھچڑی بال اور اس کے زرد گال کی ایک جھلک نظر آ رہی تھی اور اسے دیکھ کر مگن بھائی کے بچوں کے جسم میں ایک عجیب سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ اور مگن بھائی کی بیوی شاردا کو اُبکائیاں شروع ہو گئی تھیں۔ لاش ایک طرح سے موت کی مسلسل یاددہانی ہوتی ہے اور اس یاددہانی کو کون پسند کر سکتا ہے۔ جتنی جلدی اس سے چھٹکارا مل جائے اچھا ہے۔

شام کے سات بجے کے قریب بھگوتی کا ایک ماموں آیا۔ بھگوتی کے ماموں کی شکل پیلے رنگ کے ایک لیمو سے ملتی جلتی تھی۔ ماموں بھی دل کے عارضے میں مبتلا تھا۔ اس لئے وہ بھی لاش کے قریب زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرا۔ اظہار افسوس کرنے کے بعد اس نے بھگوتی سے اس کے بیٹوں کا ایڈریس لیا۔ انھیں ٹیلیگرام بھجوانے کا وعدہ کیا۔ احمدآباد میں بھارگو کے کسی رشتہ دار کو بھی ٹیلیفون کرنے کا وعدہ کیا۔ اور بھگوتی کے پاس اپنا ایک آدمی چھوڑ کر چلا گیا۔ ہم یہ سمجھے کہ تجہیز و تکفین کا بندوبست کرنے گیا ہے۔ مگر جب رات کے دس بج گئے اور بھگوتی کا ماموں نہیں لوٹا۔ تو ہم نے اس کے آدمی سے پوچھا۔ جو لاش کے قریب بیٹھا تھا۔ وہ آدمی افسوس سے سر ہلا کر بولا۔

"ہم کو کچھ مالم نہیں ہے مُردے کا کیا ہوگا؟ ہم کو سیٹھ ادھر بٹھا کے بول گیا ہے۔ ادھر تم اٹھا مات بیٹھے گا۔ مُردے کا جو کوئی سگے والا آئے گا۔ اُس کو مُردے کا منہ دکھائے گا۔ پھر چادر ڈال دے گا۔ ہم کو اس کام کے واسطے دس روپیہ سیٹھ دے گیا ہے۔ صبح چھ بجے ہم چلا جائے گا۔"

"تو کیا آج رات بھر یہ لاش اسی بلڈنگ میں پڑے رہے گی؟" مگن بھائی نے اُس سے پوچھا۔

"ہم کو کیا مالم؟" وہ آدمی خفا ہو کر بولا۔ "ہم کیا مُردے کا سگا والا ہے؟ ہم دس روپیہ رات کا لیتا ہے، جو آدمی آئے اس کو مُردے کا منہ دکھاتا ہے۔ تم کو دیکھنا ہو تو دیکھو جاستی بات مت کرو۔"

صبح چھ بجے وہ چلا گیا۔ ہم نے اسے بہت روکا۔ مگر وہ نہیں رکا۔ ہم نے اس سے بھگوتی کے ماموں کا پتہ مانگا۔ اُس نے نہیں دیا۔ بولا "ہم کو کیا مالوم، سیٹھ نے دکان پر ٹیلیفون کر کے ہم کو منگایا تھا۔ اب ہم جاتا ہے۔"

"لیکن کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"دوسرے مُردے کے پاس!"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

رات تو کسی طرح گزر گئی۔ لیکن اب یہ دن کسی طرح نہ گزر سکتا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ اگر مردے کو جلد ٹھکانے نہ لگایا گیا۔ تو لاش سڑنے لگے گی۔ اس لئے جب دوسرے دن صبح کے دس بج گئے۔ اور بھگوتی یا بھارگو کا کوئی رشتہ دار لاش کو اُٹھانے کے لئے نہ آیا۔ تو ہم سب لوگ پریشان ہونے لگے اور بلڈنگ کے لوگ بھارگو کے فلیٹ کے باہر اکٹھا ہونے لگے۔

بھگوتی نے بتایا کہ اس کا ماموں رات سے اب تک نہیں آیا تھا۔ ہم نے بھگوتی سے ٹیلیفون نمبر لے کر اُسے ٹیلی فون کیا۔ تو معلوم ہوا اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ نہیں آ سکتا۔ دو لڑکے انگلینڈ میں تھے۔ وہ نہیں آ سکتے تھے۔ احمدآباد میں جو رشتہ دار ہے اس کے آنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ کیونکہ بھگوتی کے بیان کے مطابق کچھ روپے پیسے کا جھگڑا تھا۔

دوسرے دن صبح یکایک، بلڈنگ والوں پر انکشاف ہوا۔ کہ اس میت کو انھیں ہی سنبھالنا پڑے گا۔ اس پر سب لوگ پہلے تو پریشان سے ہوئے۔ پھر ایک دم سب کی بشاشت عود کر آئی۔ اور سب لوگ اپنا کام کاج چھوڑ کر میت کو سنبھالنے میں مصروف ہو گئے کیونکہ بے چاری بھگوتی تو عورت ذات تھی۔ اُسے نہ تو کچھ معلوم تھا، نہ اُس سے کوئی کچھ پوچھ سکتا تھا۔ بے چاری کا سہاگ لٹ چکا تھا۔ رات بھر روتے روتے اُس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ اور سرخ انگارہ سی دہکتی تھیں۔

چنانچہ اس کام کو سرانجام دینے کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی۔ جس کا سیکریٹری مجھے منتخب کیا گیا۔ اور خزانچی شرف الدین بوہرہ کو، جو ہماری بلڈنگ کا سب سے امیر آدمی تھا۔ تین آدمی ہماری امداد کے لئے اس کمیٹی میں شامل کئے گئے۔ پنڈت دیارام پراشر، کہ وہ بڑے مذہبی اور بجربہ کار برہمن تھے۔ اب تک کئی درجن میتوں کا کجگتان کر چکے تھے۔ مہاشے بھولا ناتھ کہ اُن کے گھر میں ٹیلیفون تھا۔ اور گمن بھائی کمیٹ کہ لاش کو جلد سے جلد ٹھکانے لگانے میں اُن کی دلچسپی سب سے زیادہ تھی۔ کیونکہ اُن کا فلیٹ بھار گو کے فلیٹ کے بالکل سامنے تھا۔ مجھے اس لئے چنا گیا۔ کہ مجھے ہر مجلس میں سیکریٹری چن لیا جاتا ہے۔ کیونکہ میرے پاس ایک ایسی مشفقانہ سی مسکراہٹ ہے جو ہمیشہ موجود رہتی ہے جس میں ہر کمیٹی ممبر اپنے ڈھب کا مطلب لے لیتا ہے۔ ہر کامیاب سیکریٹری کے لئے ضروری ہے کہ وہ مونا لیزا کی طرح مسکرا سکے۔

مگر مُردے کو ٹھکانے لگانے کے معاملے میں مَیں بالکل کورا تھا۔ اس لئے پنڈت دیارام پراشر نے مجھے بتایا۔ کہ سب سے پہلے کسی ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہئے۔ اور اس سے ڈاکٹری سرٹیفکٹ لینا چاہئے، ورنہ مردہ کسی طرح جلایا نہیں جا سکتا۔"

"مرحوم کس ڈاکٹر کا علاج کرتے تھے؟" میں نے بھگونتی سے بار بار پوچھا۔ مگر وہ بے چاری رونے دھونے میں اس قدر معروف تھی۔ کہ ٹھیک سے کچھ بتا نہ سکی۔ بس اتنا پتا چلا کہ مرحوم نے مرنے سے چند روز قبل اپنا علاج بند کر دیا تھا۔ اور چند روز قبل وہ ڈاکٹر شا آبانی کے زیر علاج تھے۔

میں شرف الدین بوہرے کی گاڑی میں بیٹھ کر ڈاکٹر شا آبانی کے مطب میں گیا۔ تو بھارگو کا نام سنتے ہی وہ بھڑک اٹھا۔ "میں ہرگز ہرگز اُس کے لئے کوئی میڈیکل سرٹیفکٹ نہیں دوں گا۔ میرے تین ماہ کا بل اس نے ادا نہیں کیا ہے۔ ڈھائی سو روپے کا۔"

"آپ کے پیسے ادا ہو جائیں گے۔" شرف الدین بوہرہ کامل اطمینان سے بولا۔ "مرحوم ایک امیر آدمی تھا۔"

"ہم ابھی مرحوم کی بیوی یعنی بیوہ سے آپ کے پیسے لا کے دیئے دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"پہلے میرا پچھلا تین ماہ کا بل کوئی ادا کرے۔ اس کے بعد سرٹیفکٹ مانگنے آئے۔"

ہم لوگ گاڑی میں واپس آئے۔ میں نے اندر جا کر بھگونتی سے استفسار کیا۔ تو بیچاری کراہتی ہوئی رونے لگی۔ "ہائے میں غریب بیوہ، مجھے ابھی سے لوگ لوٹنے لگے۔ مجھے تو کچھ معلوم نہیں، ہائے میرا سہاگ لٹ گیا اور لوگ مجھ سے پیسے مانگتے ہیں۔"

آدھ گھنٹے تک وہ ایسے ہی ننگے فرش پر جھکی بین کرتی رہی۔ مگر تجوری سے اُس نے پیسے نکال کر نہ دیئے۔ ناچار بلڈنگ والوں نے چندہ کیا۔ اور ڈاکٹر شاآبانی کا بل چکایا۔ اور ڈاکٹر شاآبانی کو بھارگو کے فلیٹ میں بلا لائے۔ ڈاکٹر شاآبانی نے بھارگو کی لاش کا معائنہ کرنے کے بعد کہا۔ "بلاشبہ مرحوم کی موت دل کی حرکت بند ہو جانے سے ہوئی ہے۔ میں اس امر کا سرٹیفکٹ دے سکتا ہوں۔"

میں بہت خوش ہوا۔ مارے خوشی کے گمن بھائی کی باچھیں بھی کھل گئیں۔ مگر مہاشے بھولا ناتھ کا منہ لٹک گیا۔ بولے "یہ سرٹیفکٹ نہیں چلے گا۔"

"کیوں نہیں چلے گا؟" پنڈت دیارام پراشر نے ذرا تلخ لہجے میں پوچھا۔ پنڈت دیارام پراشر، جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کٹ سناتنی تھے اور مہاشے بھولا ناتھ پکے آریہ سماجی، دونوں میں تناتنی رہتی تھی۔ مگر دھیمی دھیمی۔

مہاشے بھولا ناتھ بولے۔ "اِدھر اگر سرٹیفکٹ میں ہارٹ فیلور لکھ دیا تو پولس مردہ جلانے نہیں دیتی۔ اُس مردے کا پوسٹ مارٹم ہوتا ہے۔"

"ہمارے سرگودھے میں تو نہیں ہوتا ہے!" پنڈت دیارام پراشر نے حیرت سے کہا۔

"یہ سرگودھا نہیں، بمبئی ہے۔" مہاشے بھولا ناتھ نے فخریہ لہجے میں یوں کہا۔ جیسے کہہ رہے ہوں "ڈن اُپ!"

"ٹھیک کہتا ہے، مہاشے جی! ٹھیک کہتا ہے!" شرف الدین بوہرہ بولا۔
"ادھر بمبئی کا رول یہی ہے!"
"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے جھوٹا سارٹیفکٹ دینا ہوگا؛" ڈاکٹر شادانی بولا۔
"جھوٹا کیوں؟" میں نے پوچھا۔ "بچارا گو مر چکا ہے۔ اس کی لاش تمہارے سامنے ہے۔"
"مگر مجھے مرض تو غلط لکھنا پڑے گا؛" ڈاکٹر شادانی بولا۔ "تاکہ لاش کا پوسٹ مارٹم نہ ہو سکے۔"
"ہاں! یہ تو ہے!" مگن بھائی بولا۔
"تو اس کے لئے الگ فیس ہوگی؛" ڈاکٹر شادانی نے اعلان کیا۔ "پندرہ روپے۔"
میں نے اندر جاکر بھگوتی سے پندرہ روپے مانگے۔ مگر وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ سسک سسک کر، کراہ کراہ کر روتی رہی مگر اس نے مجھے پندرہ روپے نہیں دیئے۔ تو میں نے اپنی جیب سے نکال کے دیے تب ڈاکٹر شادانی نے سرٹیفکٹ دیا تو مہاشے بھولا ناتھ نے پوچھا۔ "مردے کو جلایا کہاں جائے گا؟"
میں نے جواب دیا۔ "سمشان گھاٹ میں!"
"ہاں، ہاں سمشان گھاٹ میں، مگر کس سمشان گھاٹ میں؟" مہاشے بھولا ناتھ نے پوچھا۔ سب سے اچھا سمشان گھاٹ تو میرین ڈرائیو پر ہے۔ شہر کے تمام بڑے بڑے اور امیر آدمی وہیں جلائے جاتے ہیں بھگوتی کا کیا ارادہ ہے؟"
جب بھگوتی سے پوچھا گیا۔ تو وہ زور زور سے رونے لگی۔
"ہائے جب میرا سہاگ ہی لٹ گیا تو اچھے برے کی کیا تمیز؟" ارے کہیں بھی جلا دو اور ہو سکے تو مجھے بھی اس کے ساتھ جلا دو۔"

مہاشے بھولا ناتھ نے میرن ڈرائیو کے سمشان گھاٹ پر ٹیلیفون کیا۔ تو معلوم ہوا کہ گھاٹ پر ہاؤس فل ہے۔ رات تک کے لئے لاشوں کی بکنگ ہو چکی ہے۔ ایک جگہ بھی خالی نہیں ہے۔ مجبور ہو کر ہم لوگ سانتا کروز کے سمشان گھاٹ پر گئے۔ شرف الدین بوہرہ کی گاڑی میں بیٹھ کر۔ معلوم ہوا کہ سانتا کروز کا سمشان گھاٹ بھی فل ہے۔ کل صبح تک ایک سیٹ نہیں مل سکتی!"
"تم ہندوؤں کے یہاں بہت لفڑا ہے جلانے کا!" شرف الدین بوہرہ نے بڑی بے زاری سے اعلان کیا۔ کمیٹی میں شرف الدین کے سوا باقی سب ہندو تھے۔ اس لئے سب کا خون کھول گیا۔ مگر سب چپ رہے۔ کیونکہ گاڑی شرف الدین کی تھی۔
سانتا کروز سے ہم لوگ واپس باندرہ کے اس سمشان کی طرف گئے جو ریلوے اسٹیشن کے یارڈ میں واقع ہے۔ اس سمشان گھاٹ تک پہنچنے کے لئے بیچ میں ریلوے کے دو کراسنگ آتے ہیں۔ جن کے دروازے اکثر ریلوے والوں کی اپنی ضرورت کے مطابق کھلتے اور بند ہوتے رہتے ہیں چنانچہ سانتا کروز سے باندرہ کے اسٹیشن یارڈ تک پہنچتے پہنچتے ایک گھنٹہ اور بیت گیا۔ سمشان گھاٹ کا مہتمم بڑی مشکل سے مانا۔
"آج بہت رش ہے!" وہ سر ہلا کر بولا۔
"کسی طرح سے ہمارا مردہ لے لو، ملت سے سڑ رہا ہے۔" میں نے اس کی منت سماجت کی۔
"چار لاشیں (لاشیں) ابھی آنے والی ہیں۔ اور دو جل رہی ہیں؛" مہتمم میری طرف خشونت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "جگہ کدھر ہے؟ دیکھتے نہیں ہو!"

پنڈت دیارام پراشر اسے ایک کونے میں لے گئے۔ چند منٹ تک اُس سے کچھ کھسر پھسر کرتے رہے آخر وہ رام ہوگیا۔ پنڈت دیارام مہتم کے ساتھ ہمارے گروپ میں واپس آئے تو کامیابی سے اُن کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ بولے۔ "ہوگیا کام!"

مہتم نے سر ہلا کر کہا۔ "لے آؤ۔ مگر دو گھنٹے کے بعد آنا اس سے پہلے لاؤ گے تو اندر گھسنے نہیں دوں گا۔"

جب ہم لوگ سب طے کرکے واپس شرف الدین بوہرہ کی گاڑی میں بیٹھے تو پنڈت دیارام پراشر نے بتایا کہ مہتم اپنی شمشان گھاٹ کا ٹھیلہ بھیج رہا ہے۔ مُردہ اُٹھانے کے لئے۔"

"کیسا ٹھیلہ؟" میں نے پوچھا۔

"چار پہیوں والا ٹھیلہ ہوتا ہے۔ جس پر مُردے کو رکھ کر لے جاتے ہیں!"

"مُردوں کو تو کندھوں پر لے جاتے ہیں نا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ مرگودھے میں لے جاتے ہوں گے؟" مہاشے بھولا ناتھ نے اعلان کیا۔ "بمبئی میں نہیں لے جاتے۔" اور فخریہ انداز سے پنڈت دیارام پراشر کی طرف دیکھا۔

پنڈت دیارام پراشر نے جل کر کہا۔ "ارے کیسا تمہارا شہر بمبئی۔ نہ کرم کا پتہ نہ لوک لاج کی جگہ، شمشان گھاٹ والے کو چار روپے دیئے ہیں جب اُس نے ٹھیلہ بھیجنے کا وعدہ کیا ہے۔"

مہاشے بھولا ناتھ کا چہرہ اتر گیا۔ پنڈت دیارام پراشر نے ٹھیلے کے چار روپے دے کر گویا اُسے چپت مار دی تھی۔ مگر وہ بھی اس کا بدلہ لے کر رہے گا۔ ذرا ٹھہر جا!

ہم لوگ پھر واپس اپنی بلڈنگ میں پہنچے۔ اس وقت دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔ اور مُردے کی سڑاند سے ساری بلڈنگ میں مچھلی کی سی باس پھیل گئی تھی۔ اور مرد عورتیں، بچے گھبرا کر اپنے اپنے فلیٹوں سے باہر نکل آئے۔ اور بلڈنگ کے احاطے میں ٹولیاں بنائے کھڑے تھے۔ اور انتہائی پریشان دکھائی دیتے تھے۔ ہماری گاڑی کو احاطے میں آتا دیکھ کر سب ہماری طرف بھاگے اور ہم پر متوحش نگاہیں ڈالتے ہوئے پوچھنے لگے۔

"کیا ہوا؟"

"کس شمشان گھاٹ میں جگہ ملی؟"

"مردہ کب جائے گا؟"

"مُردہ سڑنے لگا ہے!"

"مُردے کا پیٹ پھول رہا ہے!"

"بڑا واہیات حادثہ ہے صاحب! میں تو سمجھتا ہوں ایسے میں جب متوفی کا کوئی رشتہ دار بھی یہاں موجود نہیں ہے۔ ہمیں سیدھے سیدھے پولیس کو ٹیلی فون کرکے مُردے کو ان کے حوالے کر دینا چاہیئے!"

"نہیں تو میونسپلٹی کو فون کرکے مُردے کو اُن کے حوالے کر دینا چاہیئے۔ عجب مصیبت ہے۔ مرے کوئی بھگتیں ہم!"

سب لوگ بولائے ہوئے تھے۔ اور زور زور سے ہاتھ ہلا ہلا کر بات کر رہے تھے۔ اور وہ لوگ بہت لئیتھنہ معلوم ہوتے تھے۔ مگر جب ہم نے بتایا کہ شمشان گھاٹ ریزرو ہوگیا ہے۔ اور مردہ جلانے کا انتظام ہوگیا ہے۔ تو سب کی جان میں جان آئی۔

"جب تک ٹھیلے والا آتا ہے" پنڈت دیارام پراشر نے کہا۔ "ہم لوگ باقی چیزوں کا انتظام کرلیں۔"

"اب اور کیا چاہیئے؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔ "مُردے کو ٹھیلے پر لاد کر گھاٹ لے جائیں گے اور جلا دیں گے۔"

مہاشے بھولا ناتھ میری طرف دیکھ کر یوں مسکرائے جیسے کسی بھولے بچے کی حماقت پر مسکرا رہے ہوں۔ پچکار نے کے انداز میں بولے۔

"بیٹا! ابھی جلانے کی منزل بہت دور ہے۔"

"ابھی تو سپیل آئیں گے ارتھی کے لئے۔" پنڈت پراشر انتہائی شفقت سے میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بولے۔

"اور گھی آئے گا جلانے کے لئے۔" مہاشے بھولا ناتھ مجھے جلاتے ہوئے بولے۔

"اور کوری چادر آئے گی مُردے پر ڈالنے کے لئے۔" پنڈت پراشر نے مجھے بتایا۔

"اور ایک رنگین ریشمی چادر آئے گی ارتھی پر ڈالنے کے لئے۔"

مہاشے بھولا ناتھ میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

"اور پھر پھول، بتاشے، بادام، چھوارے اور کچھ نقدی چاہئے۔" پراشر بولے۔

"کاہے کے لئے!"

"جب ارتھی چلے گی تو اس پر پیسے وارے جائیں گے۔"

"ایک اور کوری مٹکی آئے گی، کمہار سے۔ وہ شمشان گھاٹ کے باہر توڑی جائے گی۔"

"اور ان سب کاموں کے لئے پیسہ کہاں سے آئے گا؟" میں نے پوچھا۔ "میں ہر فلیٹ والے سے دس روپیہ چندہ لے چکا ہوں۔"

سب لوگ خاموشی سے میرا منہ تکنے لگے۔ مگر اپنے پرامید انداز میں گویا مجھ سے کہہ رہے ہوں۔ ایک مرتبہ پھر کوشش کرکے دیکھو۔"

"اچھا کرتا ہوں!" یہ کہہ کر میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ اندر بھارگو کے فلیٹ کے اندر چلا گیا۔

اندر سخت بدبو تھی۔ ڈرائنگ روم کے فرش پر مردہ اکیلا پڑا تھا۔ دوسرے کمرے میں چند عورتوں نے بھارگو کی بیوی، کو گھیر رکھا تھا اور اسے زبردستی دودھ پلا رہی تھیں۔ وہ سسک سسک کر انکار کر رہی تھی۔ "نہیں میں نہیں پیوں گی۔ میں مر جاؤں گی مگر میں دودھ نہیں پیوں گی، ہرگز نہیں پیوں گی۔"

"کل دوپہر سے بھوکی ہے بے چاری!" چاچی گوپال دیوی نے پنڈت دیارام پراشر کی بیوی سے کہا۔

چنانچہ دو عورتوں نے مل کر بھگوتی کی ٹانگیں پکڑ لیں۔ ایک نے ایک بازو، دوسری نے دوسرا بازو۔ تیسری نے آگے بڑھ کر دودھ کا گلاس بھگوتی کے منہ سے لگا دیا۔ بھگوتی بے چاری ناں ناں کرتی رہی اور دودھ پیتی رہی۔ سوا سیر کا گلاس تھا پنجابی لسی والا۔ تھوڑی دیر میں گلاس خالی ہو گیا۔

جب میں نے اندر آکر سب چیزیں گنائیں۔ جو بازار سے آئیں گی۔ جن کے لئے روپوں کی شدید ضرورت تھی۔ تو بھگوتی نے پھر زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ "ہائے میں تو لُٹ گئی، برباد ہو گئی۔ میرا تو میاں کوئی ہے ہی نہیں۔ کوئی بیٹا ہوتا تو سر، کچھ سنبھال لیتا۔ اب میں کس کے پاس جاؤں؟ کس سے پیسے مانگوں؟ ارے مرنے والے اپنے ساتھ مجھے بھی کیوں نہ لے گئے؟"

میں سر جھکا کر فلیٹ کے باہر چلا آیا۔

مجھے اداسی سے چلتا دیکھ کر ایک صاحب جو غالباً قریب کی کسی بلڈنگ سے افسوس ظاہر کرنے کے لئے آرہے تھے۔ اپنی لمبی ستوتنی اٹھائے میری طرف بڑھے اور دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنی آنکھوں میں آنسو اور آواز میں لرزش لا کر بولے۔ "بڑا افسوس ہے آپ کا باپ مر گیا۔"

"ارے وہ میرا باپ نہیں تھا حرامی!" میں نے گرج کر کہا۔ "وہ بھارگو تھا بھارگو، میرا ہمسایہ!" میں نے زور سے چلا کر کہا "کمبخت بھارگو! جب تک زندہ رہا بکے راگ سنا سنا کر میرا وقت برباد کرتا رہا۔ اُس کی آواز ایسی تھی جیسے کسی کے گلے میں بانس پھنس جائے۔ پاپڑ بیچتا

بھابھی! کم بخت مرنے کے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑتا۔"

میں غم اور غصے میں اپنے سر کے بال نوچنے لگا۔ وہ آدمی شرمندہ ہو کر وہاں سے ٹل گیا

اتنے میں شرف الدین بوہرہ وہاں آگیا۔ اور بولا۔ "بلڈنگ والوں نے پانچ پانچ روپے کا مزید چندہ دیا ہے۔ پنڈت دیارام پراشر اور مہاشے بھولا ناتھ باقی چیزوں کا انتظام کرنے میں مصروف ہیں۔ تم اس قدر گھبراتے کیوں ہو؟"

تین بجے تک سب سامان آگیا۔ ٹھیلے والا بھی ربڑ کے چار پہیوں والا ٹھیلہ لے کر پہنچ گیا۔ ارتھی کے پھول تو آگئے تھے۔ مگر ارتھی سجانے کے لئے بانس کی کھپچیاں سب بھول گئے تھے۔ جلدی سے مگن بھائی کیمسٹ اپنی گاڑی لے کر اندھیری بھاگا۔ اور بانس کی کھپچیاں لے کر جو ٹھیلے کے ارد گرد، چاروں طرف باندھی گئیں۔ پھر ان پر رنگین کاغذ منڈھے گئے۔ رنگین کاغذ منڈھنے کے لئے رنگین کاغذوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور جب وہ ضرورت پوری ہوئی تو منڈھنے کے لئے گوند کی ضرورت پڑی۔ اور جب گوند آگیا تو کسی کو خیال آیا۔ کہ مُردے کو باندھنے کی رسیاں موجود نہیں ہیں۔ اس میں خاصی بھاگ دوڑ ہوئی۔ مگر اب خیریت یہ تھی۔ کہ کمیٹی کے علاوہ بلڈنگ کا ہر فرد وبشر مردے کے سلسلے میں کسی نہ کسی کام میں جٹا ہوا تھا۔ بھاگ بھاگ کر اور ایسی تندہی سے کام کر رہا تھا۔ کہ اگر یہی خلوص اور جذبہ ملکی منصوبے میں صرف ہو تو پنج سالہ پلان تین سال ہی میں مکمل ہو جایا کرے۔ ہم سب لوگ عجیب بحرانی کیفیت میں گرفتار تھے۔ کیونکہ وقت گزر رہا تھا۔ اور مردہ پھول رہا تھا۔ بڑی احتیاط سے مُردے کو نہلایا گیا اس احتیاط سے کسی مغل شہزادی کو بھی نہ نہلایا گیا ہوگا۔ کیونکہ ہر لحظہ یہی ڈر غالب تھا۔ کہیں اس کا پیٹ نہ پھٹ جائے جو اس دوران میں برابر پھولتا جا رہا تھا۔

نہلانے کے بعد جب ہم لوگ میت کو فلیٹ سے باہر نکالنے لگے تو بھگوتی نے زور کی ایک پچھاڑ کھائی اور بھارگو کو اس کے ساتھ ستی ہو جانے کی دھمکی دی۔ جس کا مُردے پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ بہت سی عورتیں آنسوؤں کے بغیر رو رہی تھیں۔ اور جن عورتوں کی آنکھوں میں آنسو تھے وہ شدید بدبو کی وجہ سے تھے۔

دو آدمیوں نے مردے کو سر کی طرف سے پکڑا۔ دو آدمیوں نے ٹانگوں کی طرف سے۔ دو آدمیوں نے بیچ کے دھڑ کو سہارا دیا۔ لاش ہولے ہولے باہر نکلنے لگی۔ تو پنڈت دیارام پراشر بولے: "پہلے سر باہر نکلے گا۔"

"نہیں پہلے ٹانگیں جائیں گی۔" مہاشے بھولا ناتھ نے انکار کیا

"گھر سے نکلتے وقت ہمیشہ میت کا سر آگے ہوتا ہے!"

"بالکل غلط!" مہاشے بھولا ناتھ بڑی سختی سے بولے۔ "پیر آگے ہوتے ہیں۔"

"منش کی آتما اس کے سر میں ہوتی ہے۔" پراشر نے شاستر کا حوالہ دیا۔

"لیکن سورگ تک پہنچنے کے لئے تو پیدل ہی جانا پڑے گا، پاؤں سے۔" مہاشے بھولا ناتھ بولے۔

"تم مجھے سمجھاتے ہو؟" پنڈت پراشر غصے سے چلا کر بولے۔ "بہتر برس کی میری عمر ہو گئی ہے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی ۔ میرا مطلب ہے گھاٹ گھاٹ کا مُردہ جلا چکا ہوں۔ تم مجھے انتم سنسکار کے بارے میں کیا بتا سکتے ہو؟ میں کہتا ہوں کہ اگر اس گھر سے مردہ نکلے گا۔ تو سب سے پہلے اس کا سر نکلے گا۔" پنڈت پراشر نے گرج کر کہا۔

"نہیں! اس کی ٹانگیں نکلیں گی!" مہاشے بھولا ناتھ اپنے ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولے۔

"لڑتے کیوں ہو؟" شرف الدین بوہرہ بولا۔ "ٹاس کر لو!"

لمبی چوڑی بحث و تمحیص کے بعد قرار پایا کہ ڈرائنگ روم سے نکالتے وقت تو مُردے کی ٹانگیں آگے رہیں گی۔ لیکن کوریڈور سے زینہ

اُترتے ہوئے سر آگے کر دیا جائے گا۔ اس سے زینہ اترنے میں آسانی رہے گی۔ اس مفاہمت پر دونوں فریق راضی ہو گئے۔ اور مردہ فلیٹ سے نکل کر زینے پر آگیا۔

مگر زینہ اترنے میں بڑی دقت تھی۔ کیونکہ بمبئی کے فلیٹوں کے زینے مُردوں کے لئے نہیں بنائے گئے ہیں زندوں کے لئے بنائے گئے ہیں ایک وقت میں ایک ہی آدمی اُن پر چل سکتا ہے۔ یہاں مُردے کو چھ آدمی سنبھالے ہوئے تھے۔ دو سر کی طرف سے، دو ہاتھوں کی طرف سے اور دو دھڑ سے۔ اور زینے پر صرف ایک آدمی کے گزرنے کی جگہ تھی۔ اور وہ بھی جب کہ وہ خود زندہ ہو۔ اور اپنے پاؤں سے چل رہا ہو۔ اس لئے اب کیا ہو؟

"بڑی مصیبت ہے" بدری پرشاد پائنیٹ بولا۔ "میرے خیال میں تو ارتھی وہ تھی اولڈ فیشن ہو چکی ہے۔ اب تو مُردے کو سر، دھڑ، ٹانگیں اور بازو سے الگ الگ کاٹ کے بوری میں بھر کے سمندر میں ڈال دینا چاہئے، یہ طریقہ سب سے سائنٹفک ہے!"

"میں نے کہا۔" بہت سے لوگ بمبئی میں یہی طریقہ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ان کا نام دوسرا ہوتا ہے۔"

"کیا؟"

"قاتل!"

میرا جواب سن کر پائنٹ چپ ہو گیا۔ اور ہم لوگ کسی نہ کسی طرح سے لاش کو زینے سے اتار کے نیچے احاطے میں لے آئے۔ اور اُسے ٹھیلے پر باندھ دیا۔ اوپر سے ریشمی چادر ڈال دی اور ارتھی کو پھولوں سے سجا دیا۔ اور "رام نام ست ہے" کرتے ہوئے تیز تیز قدموں سے ٹھیلے کو چلاتے ہوئے سڑک پر بڑھ گئے۔ کیونکہ دھوپ بہت تیز تھی۔ اور ہمارے پاس ارتھی پہ وارنے کے لئے پیسے زیادہ نہیں تھے۔ پھر بھی جو تھے وہ ہم جگہ جگہ راستے میں مٹھی بھر بھر کر وارتے جاتے تھے۔ انہیں لوٹنے کے لئے لڑکوں کا ایک ہجوم غیر ارتھی کے ساتھ ہو لیا۔ ایک دوّنی پر دس دس لڑکے پلے پڑتے تھے کئی بچوں کو چوٹیں آئیں۔ مگران میں جو ثابت قدم تھے۔ انھوں نے آج شام کے پکچر کے پیسے بنا لئے۔ اور سمّی کپور کی فلم "جنگلی" دیکھنے کے لئے آدھے راستے ہی سے لوٹ گئے۔

راستے میں ریلوے کا ایک پھاٹک بند ملا۔ اور پندرہ بیس منٹ انتظار کرنے کے بعد بھی جب نہیں کھلا تو پھاٹک والے کی مٹھی گرم کرنے کے بعد کھلوایا گیا۔ اور ارتھی کو آگے بڑھایا گیا۔ سمشان گھاٹ کے باہر ارتھی کو روک کر کوری مٹکی سے جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ پانی ارتھی کے چاروں طرف گرا کر مٹکی کو توڑ دیا گیا۔ اور ٹھیلے کو سمشان گھاٹ کے اندر ڈھکیل دیا گیا۔

اس سمشان گھاٹ میں چھ لاشوں کو جلانے کی جگہ تھی۔ چھ بڑے بڑے انگیٹھے تھے۔ آدمی کے قد کے برابر، جن کے ارد گرد لوہے کے پول، گڑے تھے۔ اور ان کے نیچے لوہے یا کنکریٹ کے سپورٹ تھے۔ تاکہ جلتے وقت لکڑیاں ادھر اُدھر نہ بکھر جائیں اور لاش کم سے کم لکڑیوں کے سہارے جل سکے۔

"کتنی لکڑیاں درکار ہوں گی؟" مہاشے بھولا ناتھ نے سمشان گھاٹ کے مہتم سے پوچھا۔

مہتمم لاش کو اچھی طرح ٹٹولنے کے بعد شکایتاً کہا "یہ تو بہت موٹا ہے!"

"کیا مطلب؟" لگن بھائی کیسٹ غرّایا۔ کیونکہ وہ خود بھی بہت موٹا تھا۔

"مطلب یہ کہ مردہ موٹا ہے۔" مہتم بڑی رکھائی اور بیزاری سے بولا۔ ایک کھنڈی لکڑی میں ایک مردہ جلتا ہے۔ مگر یہ مُردہ ایک کھنڈی میں نہیں جلے گا۔"

"ایک کھنڈی لکڑی ہوتی کتنی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"چار سو کلو!" مہتم نے کہا۔

"چار سو کلو لکڑی کے پیسے کتنے ہوں گے؟" پراشر نے پوچھا۔

"۳۲۰ روپے۔"

"رام رام!" پراشر اپنے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "ہمارے سرگودھے میں تو سات روپے کی لکڑی کافی ہوتی تھی۔"

"یہ سرگودھا نہیں ہے! بمبئی ہے!" مہاشے بھولا ناتھ نے بڑے فخر سے پراشر کو بتایا۔

پراشر گھبرا کر پیپل کے پیڑ کے نیچے بیٹھ گیا۔ جس کی شاخوں پر بہت سے گدھ بیٹھے ہوئے تھے۔ لاش انگیٹھے کے باہر رکھی تھی۔

میں نے آہستہ سے کہا۔ "میرے پاس تو اب مشکل سے ایک کھنڈی لکڑی کے پیسے ہوں گے۔"

"ایک کھنڈی کافی ہو گی جی۔" مہاشے بھولا ناتھ بولے۔ "بھارگو کو ایک کھنڈی میں جلنا پڑے گا۔ ہم نے بہت کچھ کر دیا ہے اس کے لئے بس! ایک کھنڈی کافی ہے۔"

"تمہاری مرضی۔" مہتمم مکمل بے زاری سے بولا۔ "ہم ایک کھنڈی لکڑی دے کر مردے کو آگ لگاتا ہے۔ اگر مردہ نہیں جلا۔ اور پورا نہیں جلا آدھا ہی جلا۔ تو ہم مُردے کو ایسے ہی چھوڑ دیں گے۔"

"ایسے کیسے چھوڑ دے گا؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"اور کیا کرے گا۔ ابھی دو دن کا بات ہے اِدھر ایک گریب بُڈھی آیا۔ اپنے مَرد کا مردہ لے کر۔ ہم مردہ جلایا۔ مردہ آدھا جلا تھا۔ کہ مون سون آگیا۔ بارش میں لکڑی بجھ گیا۔ مردہ آدھا جلا آدھا باقی رہا۔ بڈھی کے پاس پیسہ نہیں تھا۔ وہ اِدھر دن بھر رگھڑا تا رہا۔ رات کے سمے ایک رحم دل لاش والا آیا۔ اُس نے اپنے سگے والے مُردے کے سنگ اُس بڈھی کے مُردے کا پیسہ بھی دیا۔ تو مردہ جلا۔ اور یہ مردہ تو بہت موٹا ہے۔"

"اچھا تو تم دو کھنڈی لکڑی کا پیسہ لے لو۔ مگر وعدہ کرو۔ کہ مردہ ٹھیک سے جل جائے گا۔" شرف الدین بوہرہ نے قصہ ختم کرتے ہوئے کہا۔

"ارے دو کھنڈی لکڑی میں تو ایسا جلے گا۔ کہ ہڈی تک سُرمہ ہو جائے گی۔" مہتمم لکڑی تولنے کا بڑا ترازو ٹھیک کرنے لگا۔

شام کے چھ بجے تھکے ہارے جب ہم شمشان گھاٹ سے لوٹے تو بلڈنگ کی عورتوں نے بتایا کہ تین دن کے بعد چوتھا، ہوگا۔ اور چوتھے کا خرچہ الگ سے ہوگا۔

یہ خبر سن کر میں نے اُسی وقت میت کمیٹی کے سیکریٹری کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔

"ارے ایسا مت کرو۔" شرف الدین بوہرہ مجھے سمجھانے لگا۔ آخر ایک دن تم کو بھی۔"

"کیا بات کرتے ہو شرف الدین؟" میں نے تیزی سے اُسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ "کیا ہے یہ شہر تمہارا؟" جہاں زندگی اس قدر سستی ہے! اور موت اس قدر مہنگی ہے۔ یہاں اگر آپ کے پاس روپیہ نہیں ہے تو آپ سلیقے سے مر بھی نہیں سکتے۔ میں تو آج ہی اپنا فلیٹ خالی کر کے بمبئی سے باہر جا رہا ہوں۔"

ماہی "سیپ" کا

آئندہ شمارہ خاص نمبر ہوگا۔

راجندر سنگھ بیدی
سیپ. کراچی

یوکلپٹس

بہت ہی مرامرا سادن تھا. جبکہ نومبر کی وہ ٹھٹھری ہوئی رات پیدا ہو رہی تھی جب دھڑا دھڑ ایک وہ سڑک پر ڈھیر ہو رہے تھے. اور مٹی کا وہ ٹیلہ بن رہے تھے جس میں سے یوکلپٹس کا پیڑ پھوٹ کر نکلا تھا.

کندن ایک اعصاب زدہ ٹیلیفون کے جواب میں گھر لوٹی تھی. ایک ہاتھ سے اس نے سائیکل کا ہینڈل تھام رکھا تھا. اور دوسرے سے کتابیں جو خام چمڑے کے فیتے میں کیریر پر ڈھیلی ہو رہی تھیں. یہ کتابیں کندن نے اسی شام ناور ولیم اسکول کی لائبریری سے نکلوائی تھیں. جہاں وہ وائس پرنسپل تھی. قاعدے میں کندن کو گولی کی طرح سے بنگلے میں داخل ہونا چاہیے تھا. مگر پھاٹک کے اندر آتے ہی وہ ہمیشہ کی طرح سرجو کے پاس رک گئی.

سرجو، یوکلپٹس کے پیڑ کا نام تھا.

یہ پیڑ کندن نے تین سوا تین برس پہلے لگایا تھا. جبکہ وہ نئی نئی برس لوس یونیورسٹی سے ٹیچنگ کا ڈپلوما کر کے آئی تھی. جب یہاں کیتھولک چپلن فادر رفینیٹر رہا کرتا تھا. جس نے بنگلے کا آدھا حصہ کماری کندن کو دے رکھا تھا. پھر برس ایک کے بعد وہ مشن کا کام پورا کر کے امریکہ چلا گیا. اور کندن نے تنہائی سے گھبرا کر اپنی بوڑھی ماں کو بلا لیا. سائیکل کو جنگلے کے سہارے رکھ کر کندن سرجو کے پاس آئی اور اوپر کی طرف دیکھنے لگی. جہاں پتے اب تک اندھیرے کا رنگ لے چکے تھے. البتہ نیچے کی سفید، ملائم اور ریزہ ریزہ چھال ابھی تک دکھائی دے رہی تھی. وہ پیارے اس پسا چھیرنے ہی والی تھی کہ ایک طرف برآمدے میں، اسے اپنی حیلی فش ماں کا ہیولا سا نظر آیا. اسی دم جھک کر کندن نے پیڑ کے نیچے سے تازہ گرے ہوئے پتے اٹھا لئے اور ہاتھ میں مسل کر انہیں سونگھنے اور لمبے لمبے سانس لینے لگی. جیسے اسے زکام ہو. اور یوکلپٹس کی بو تنفس اور اس کے رگوں و ریشوں کو ایک طرح کا سکون دے رہی ہو. پھر ماں کی طرف منہ کرتے ہوئے کندن تھوڑا سا کھسیائی "میں تو سرجو کو بڑھتے دیکھ بھی سکتی ہوں، ماں" اور اس نے پیڑ کی طرف اشارہ کیا.

ماں کے چہرے پر سے پسینے کے باریک باریک قطرے برس رہے تھے. جیسے کورے گھڑے میں پانی ڈالنے سے وہ رسنے لگتا ہے. دوپٹے سے ماں اپنا چہرہ پونچھتے ہوئے بولی. "پودے دن کو نہیں رات کو بڑھتے ہیں. کندن!"

"کیوں ــ رات کو کیوں!"

"ایشور کے سب کام پرماتما اندھیرے میں کرتے ہیں!"

اور پھر ماں چپ ہو گئی. کندن کو ماں سے کسی اور بات کی توقع بھی نہ تھی. وہ جانتی تھی ماں ایک پیڑ کے ساتھ اپنی بیٹی کی پیار محبت کو

دیکھکر اکثر پریشان ہو اٹھتی ہے۔ سائیکل کو جنگلے پر سے اٹھا کر کندن برآمدے کے پاس پہنچ رہی تھی۔ کہ ماں نے کہنا شروع کیا۔ "پھر کہا تا دہی غلطی، لکھی نے۔۔۔"

لکھی کندن کی کرسچن نواکرانی تھی۔ کندن نے وہیں رکتے ہوئے کہا۔ "کیا مطلب؟" اور وہ، جیسے اپنے آپ سمجھ گئی۔۔۔ "شروع ہو گیا؟"

"ہاں!"

"کب؟"

"جب پڑوس کے مالی سے تمہیں ٹالی فون کرایا۔"

اور ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے ماں نیچے، فرش ہی پر بیٹھ گئی۔ حالانکہ پاس ہی برآمدے میں ملاقاتیوں کے لئے رکھی ہوئی۔۔۔ آدھی درجن بید کی کرسیاں پڑی تھیں۔۔۔ یہ حرکت عورتیں اس وقت کرتی ہیں۔ جب کوئی مرنے والا ہو یا مر چکا ہو۔

اُدھر لکھی اپنے کوارٹر میں کراہ رہی تھی۔ ادھر ماں گالیاں بکے جا رہی تھی۔ اس کی آخری گالی تھی "چھنار"۔۔ جبھی لکھی کی چیخیں سنائی دیں تو ماں اور کندن دونوں منہ اٹھا کر اندھیرے میں دیکھنے لگیں۔۔۔ جیسے لکھی سامنے تڑپتی ہوئی نظر آ رہی ہو۔۔۔ شاید۔۔۔ زہ کے درد میں مبتلا عورت کہہ رہی ہو۔ دوسری سب عورتوں کو دکھائی دینے لگتی ہے۔

کندن نے ایک دم گھبرا کر ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ماں!"

"سُن رہی ہوں!"

ماں نے اپنے بوڑھے چوخ چوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر مشکل سے اٹھتے ہوئے کہا۔ اور گرتے گرتے بچی۔ "مجھے بھی کان دیئے ہیں پرماتما نے۔" وہ بولی اور سچ مچ ہی اپنی بات کو سچ ثابت کرنے کے لئے دونوں ہاتھ کانوں کی طرف اٹھا دیئے۔

کیا جذبہ تھا کہ دوسری چیخ کے ساتھ ہی ماں بھی چلا اٹھی۔ "مرتی ہے تو مر جائے۔۔۔ کیوں نہیں دن کے وقت بتاتی رانڈ؟۔۔۔ پار سال بھی ایسے ہی کیا تھا۔"

ماں بولے بغیر بھی نہ رہ سکتی تھی۔ "کیسے خون خون ہو گئے تھے میرے ہاتھ پیر اور کپڑے جو نوچنڈی میں بنوائے تھے۔ تم نے پیسے بھیجے تھے۔۔۔ میں اس کے باپ کی دائی ہوں؟"

پھر ماں کے پیر کوارٹر کی طرف اٹھ گئے، پھر وہ لوٹ بھی آئے۔

یہ چیخ جو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد سنائی دے رہی تھی، مسلسل ہو گئی۔ کندن کے پیٹ میں بھی جیسے کوئی آزار پیدا ہو گیا۔ اور طنابیں سی نیچے کھینچنے لگیں۔ سامنے ہاتھ رکھتے ہوئے وہ بولی۔

"تو سمجھتی کیوں نہیں ماں؟۔۔۔ وہ غریب ہے، پیسے والے سو دار ڈاکٹر کر سکتے ہیں۔"

اور کندن آپ ہی کوارٹر کی طرف چلی اور ماں نے لپک کر اسے بازو سے تھام لیا۔ اور دھمکی آمیز لہجے میں بولی۔ "کندنا؟" اور پھر کوارٹر کی طرف جاتے ہوئے کہنے لگی۔ "یہ کام تیرے ایسی کچی کنواری کا ہے؟"

ماں لکھی کے پاس جانا بھی چاہتی تھی۔ اور اپنی اہمیت کو جتانا بھی۔ جاتے ہوئے وہ منہ ہی منہ میں کچھ بکے جا رہی تھی۔۔۔ صرف ایک ہی لفظ کندن کے کان میں پڑا۔ "چھنار!"

کہیں سے کوئی چمگادڑ اڑا، اور ڈرائینگ روم کے اندر پیرا بولا کی شکلیں پیدا کرتا ہوا سامنے پہاڑیوں کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں سے باہر اڑ گیا جس میں ایک روز پہلے کی بارش کی وجہ سے بھینٹ قطار در قطار اندر آ رہے تھے۔ اور رسو واٹ کے بجلی کے ہنڈے سے ٹکرا کر

زمین پر ڈھیر ہو رہے تھے جب وہ گرتے تو پتہ بھی نہ ملتا۔ صرف نیچے دیکھنے سے یوں لگتا جیسے زمین اوپر کی طرف اٹھ رہی ہو۔۔ اور لمحوں کا ایک ٹیلہ بن رہا ہے۔۔۔۔

کندن کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی اور انتظار کرنے لگی۔ روشنی میں تو اونچ نیچ سب نظر آتی ہے۔ مگر اندھیرا ایک عجیب قسم کی یکسانیت پیدا کر دیتا ہے۔ صرف اس کے عادی ہو جانے پر میتوں کے ہلکے خاکے اور گہرے خاکے دکھائی دیتے ہیں۔ جو اس یکسانیت میں اور بھی تائید کا عالم پیدا کر دیتا ہے اور آدمی گھبرا کر کھڑکی چھوڑ دیتا ہے۔ اور ایک بے پناہ حبس سے بچنے کے لئے کسی کا بھی گریبان پھاڑ دیتا ہے۔

کندن واپس آ کر صوفے میں بیٹھی تو یوں معلوم ہوا جیسے صوفے کے بازو اوپر اٹھے اور ایک حسین لڑکی کو آغوش میں لے لیا۔۔۔۔ کندن انتظار کرنے لگی۔

پہلے تو انتظار ٹک ٹک کرتا رہا پھر وہاں کے کیتھولک مشن کے گرجے میں لگے ہوئے گھڑیال کی طرح بجنے لگا۔ چیخیں تھم چکی تھیں۔ شاید ماں کے پہنچ جانے سے نکی کو حوصلہ ہو گیا تھا۔ یا شاید بچہ پیدا ہو گیا تھا۔۔۔ نہیں! بچہ اس دنیا میں آتا تو ضرور روتا۔۔۔۔

شاید ماں کو گرم پانی کی ضرورت پڑے۔۔ کندن نکی کی کھولی تک جا پہنچی۔ لیکن سوائے ماں کے بڑبڑانے کے اور کوئی آواز نہ سنائی دی وہ ضرور گالیاں تھیں جنہوں نے اس سانحے کے پیش نظر بے شکل سی صوت اختیار کر لی تھی۔ بیچ میں کندن کو کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دی جیسے کوئی لکڑی کو چیرنے کے بجائے زمین پر مار مار کر توڑ رہا ہو پھر نکی کے ہونکنے کی آواز جیسے اس نے افیون کھائی ہو۔ اور عمل کی تائید اور نقل کی تردید کرنے کا جتن کر رہی ہو۔ کندن نے اپنے بدن سے کوئی بجلی جھٹکی اور بنگلے کی طرف مڑ آئی۔ راستے میں سرجو کی طرف دیکھا تو اسے ایک بچہ دکھائی دیا۔ جس سے ڈر کر وہ بھاگتی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئی۔

تھوڑے سے حواس بجا ہوئے تو کندن تپائی پر پڑی ہوئی کتابیں الٹنے پلٹنے لگی۔ ان پکھڑکی میں سے آنے والے بے شمار لمحے بکھرے پڑے تھے۔ جن کے پر جلے ہوئے تھے۔ اور بدن مردہ۔ کندن نے اوپر کی کتاب کو صاف کیا جس کا عنوان تھا "مرد عورتوں کے بغیر" اس نے کتاب کھولی۔ پہلی چند سطریں پڑھیں اور پھر بند کرتے ہوئے سوچنے لگی۔ "عورتیں مردوں کے بغیر"

فادر ولیم اسکول کی وائس پرنسپل کماری کندن ایم اے۔ ٹی ڈیپ کے بنگلے میں تین عورتیں تھیں اور تینوں مردوں کے بغیر۔

پہلی ماں۔ سبھاشنی جو اب چھیاسٹھ سال کی ہو چکی تھی۔ اور بے شمار لمحے اس پر ڈھیر ہو کر تہیں جما چکے تھے۔ اس کا نام آج کل کی لڑکیوں کا سا تھا۔ لیکن اب تک اس نام کی سب لڑکیاں بوڑھی ہو چکی تھیں۔ نئے نام پرانے ہو چکے تھے۔ اور نئی طرز کے وضع نہ ہوتے تھے اور لوگ مجبور ہو کر پرانے ناموں پر لوٹ آتے تھے۔ جیسے۔ کندن۔۔۔ جو نام تو بوڑھا تھا مگر اب جوان ہو چکا تھا۔ پچیس چھبیس برس کا۔ اور خوبصورت اور دمکتا ہوا۔ سبھاشنی بدھوا تھی۔ اور کندن یتیم۔ اس نے باپ کی صورت بھی نہ دیکھی تھی اور زندگی بھر اس کے لئے تڑپتی رہی تھی۔ ابھی وہ پیٹ ہی میں تھی کہ ماں کے بیان کے مطابق کندنی کا باپ چل بسا۔ اس صدی کے شروع میں پلیگ پڑی تھی۔ اس نے موت میں سچ اور جھوٹ کو برابر کر دیا تھا۔ عجیب سی یکسانیت پیدا کر دی تھی۔ اس لئے جب مشن میں فادر مائیکل آسمانی باپ کے بارے میں باتیں کرتا تو کندن سوچتی وہ تو مر چکا ہے۔ کسی زمینی پلیگ میں۔ اور جب اسے کہا جاتا آسمانی باپ لافانی ہے وہ کسی پلیگ میں نہیں مر سکتا تو وہ اسے ڈھونڈنے کے سلسلے میں قریب کے کسی بھی مرد پہ عاشق ہو جاتی۔ چاہے وہ کیتھولک چیلن ہی کیوں نہ ہو۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کیتھولک پجاری کبھی شادی نہیں کر سکتے۔

کئی بار کندن نے چچا، تاؤ اور ددھیال کے بارے میں پوچھا۔ لیکن ماں نے ہمیشہ دریچے سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ "سب کھپ گئے دوسرے پلیگ میں۔۔۔۔ تیسری پلیگ کب آنے والی تھی اور پھر ایکا ایکی تجسس سی نگاہیں کندن پہ جھنکتی ہوئی ماں پوچھنے لگتی۔ "تو کیوں پوچھتی ہے؟"

"ایسے ہی!" کندن جواب دے دیتی اور پھر کہہ اٹھتی "ماں! آج ٹیچر نے مجھے یہ ریشمی رومال دیا تھا۔ مجھ سے بہت پیار کرتی ہے"
بھاشنی نے اپنا رنڈاپا اپنے چچیرے بھائی لوک رام کے ہاں کاٹ دیا تھا۔ جو امرتسر میں لاہور اور تبت سے آئے ہوئے کٹھ کا بیوپار کرتا تھا۔ کٹھ جو مرے ہوئے آدمی میں بھی ایک بار تو زندگی کی لہر دوڑا دیتی ہے۔ وہ مرتا ضرور ہے لیکن اس سے پہلے وصیت کر جاتا ہے۔ بھاشنی نے کندن کے ساتھ ساتھ اپنی بھتیجیاں اور بھتیجے کھلائے تھے۔ اور اس کے عوض روٹی کے رکھے سوکھے ٹکڑے پائے تھے۔ اسی لئے کندن کے لئے اس کی لوریاں بھی ہو گئی تھیں۔۔۔ رکھا سوکھا روٹی کا ٹکڑا میٹھا کیا اور سلونا کیا۔۔۔ وہ بھابی کے پھٹے پرانے پہنتی تھی، تو اکثر باہر نہ نکل سکتی تھی، کیونکہ اس کا جسم جوں کا توں بھرا ہوا تھا۔ حالانکہ بھابی کا خرچ۔۔۔۔۔ چاند کی طرح گھٹتا جا رہا تھا۔ بھابی کے کپڑوں میں بھاشنی برہنہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ ایک جرم کے احساس اور اذیت پسندی کے جذبے میں نیچے ٹھنڈے فرش پر سوتی تھی۔ اور ایک راہبانیت اس کے جذبات پر چھائی رہتی تھی جس میں اداسی بھری ایک تسلی تھی۔ اسے اس حدت کا احساس ہی نہ تھا جو مرد کے ساتھ چارپائی پہ سونے سے عورت کے بدن میں اپنے آپ پیدا ہوتی رہتی ہے۔ پھر سوتے میں کبھی تکیہ اور لحاف وغیرہ ہوتے تھے اور کبھی نہ ہوتے تھے، سوائے سردی کے موسم میں، ان کی ضرورت بھی کیا تھی۔۔؟ پھر بھاشنی سوتی ہی کہاں تھی؟ جاگتی بھی کہاں تھی؟ وہ تو خواب اور بیداری کے اعراف میں روتی ہنستی رہتی اور کبھی اس کا سہارا ہوتے جب نینن سے نیند گنوائی اور تکیہ اور بچھونا کیا۔

آخر۔ سمجھ بوجھ کچھ سوچ پیارے، پیار کیا تو رونا کیا؟

بھابی کی گالیوں کو بھاشنی نے گھی کی نالیں سمجھا۔ اور مار پیٹ، دھکوں کو پھولوں کی چھڑیاں، اور یوں کندن کو پڑھایا۔ باقی وہ سرکاری گرانٹوں اور وظیفوں سے آگے بڑھتی بڑھتی امریکہ جا پہنچی۔ وہ خوبصورت تو تھی ہی اس پر تعلیم نے اس کے حسن کو اور بھی صیقل کر دیا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ جن میں بیسیوں شک تھے اور وسوسے۔ ایک عجیب سے ارتقا میں اس کی آنکھیں کانوں تک کھنچ آئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا سامنے جاتی ہے تو پیچھے بھی دکھائی دیتا ہوگا۔ یا وہ ایسے ہی دیکھتے رہتی تھی، جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ باپ نہ ہونے سے لڑکیوں کو کیسی کیسی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔۔ اس کے باوجود بارہ تیرہ برس ہی کی عمر میں کندن کو ایک ایسے مرد کے سلسلے میں تجربہ ہوا تھا کہ وہ جس کے بارے میں کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ شاید وہ مر جاتی۔ مگر کٹھ نے اس کی زندگی بچا لی۔ تاکہ وہ بڑی ہو کر یوکلپٹس کا پیڑ بن سکے۔ یہ سب ایک طرح سے اچھا ہوا، ورنہ کندن پڑھائی ہی کو شادی نہ سمجھتی۔

تیسری عورت لکھی تھی۔ وہ تیس ایک برس کی تھی۔ اور محنتی ہونے کی وجہ سے تندرست۔ اس کا اصلی نام لکشمی رام داس تھا۔ اور راس کے شوہر کا نام سیدھو۔ مگر کمیٹی اور گرجے کے رجسٹروں میں رام داس کا نام کچھ ایسا چڑھا کہ پھر نہ ہٹا، اور لکھی آج تک نہ بتا سکتی تھی کہ رام داس اس کے باپ کا نام تھا یا کسی پہلے شوہر کا۔ کبھی وہ شوہر کا نام بتاتی اور کبھی باپ کا۔ اور پھر ایک ابتری کے عالم میں "میرے باپ کا بھی وہ نام تھا جو میرے مرد کا"

لکھی کا یہ تیسرا مرد۔ سیدھو، وہاں سے اکادن، باون میل دور کسی کلاسٹری میں کام کرتا تھا۔ وہ سال میں صرف ایک دو بار آتا۔ جب اس کے کپڑے کو ٹیلے اور راس کی دھول۔ سے اَٹے ہوتے اور چہرے پر سیاہیاں کینڈی ہوتیں۔ کچھ تو میلے کی اور کچھ ایسے جرائم کی جن کا وہ بے اختیار مرتکب ہوتا۔ ان باتوں کے کارن وہ آپ ہی اپنا نمبردار معلوم ہوتا تھا۔ وہ آتا تو نہایت بدصورت معلوم ہوتا۔ اور جب نہ آتا تو اس سے بھی زیادہ بدصورت۔ سیدھو کا بھوت بنگلے میں دکھائی پڑتے ہی ماں بھاشنی اور بیٹی کندن پنجے جھاڑ کر لکھی کے پیچھے پڑ جاتیں۔

"کیوں تو ہر بار اس کے ساتھ راس رچا بیٹھتی ہے؟"

"جب وہ ذمہ داری لیتا ہے، نہ تیرے بچوں کی اپنے۔۔۔؟"

"مرد ایک ہی رسی سے پھانسی دیئے جانے کے قابل ہیں"

مرد... لکھی بیٹھی بیٹھی نگاہوں سے دیکھنے لگتا۔ کبھی سب غلط اور کبھی سب سچ معلوم ہونے لگتا... ہاں، ہاں! ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے۔ مرد اسی قابل ہیں کہ.... میں ایک اور کروں گی، مگر نہیں... وہ بھی تو... پھر وہ غصے میں بھر جاتی۔ اور اپنا ہاتھ جوتی کی طرف لے جاتی۔ اس کے بعد سیدھو کا ہمزاد اس کی طرف آتا۔ جم سکتیں، ہاتھ جوڑے اور لکھی کا ہاتھ جوتی کی طرف جانے لگتا۔ پھر وہ دیکھتی جب تک سیدھو کا ہاتھ لکھی کے بدن پر پڑتا اور لکھی کی گرفت ڈھیلی ہو جاتی۔ آنکھیں چڑھنے، بند ہونے لگتیں۔ اور وہ بے دم سی ہو کر گر جاتی ــــ اسے جبھی پتہ چلتا، جب اس کے پیٹ میں کیڑا رینگنے لگتا۔

کرسچن ہونے کے ناطے لکھی میں صبر تھا اور رشک بھی، لیکن کندن نہ کرسچین تھی، نہ مسلمان اور نہ ہندو، وہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی تھی جو سوچتی۔ کیا بکواس ہے؟ بچہ ہمیشہ عورت کو اٹھانا پڑتا ہے۔ ایک دن تو آئے گا۔ جب چاند، زحل اور مشتری تک پہنچنے والے عورت کی سوچ بچار تک پہونچیں گے۔ اور مرد کے ہاں بھی بچہ پیدا ہونے کا سامان کریں گے۔ آخر سلسلہ تعلیب ہی کا ہے نا... مگر ایسے میں داڑھی اگ آئے گی۔

ماں گرتی پڑتی چلی آئی۔ اس کے کالے بھورے بال بھیگے ہونے پر بھی بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ منہ پر کچھ جھٹکے جھٹکے شانوں پہ ــــ اس نے کس قدر جلدی میں اپنے ہاتھ پیر خون سے صاف کئے تھے۔ اس پہ بھی بانات کی قمیض پر ایک چھیچھڑا لگا ہوا تھا۔ جس کے بارے میں وہ نہ جانتی تھی۔ وہ گالیاں دے رہی تھی۔ تیز تیز اور بے ربط۔ اس کی آخری گالی تھی ــــ "ایک اور لڑکی چلی آئی"!

کندن چونک گئی۔ بچہ پیدا کر دینے کے بعد سنبھالنے کا کام کندن کا تھا۔ جب وہ لکھی کے کوارٹر کی طرف لپکی۔ تو ماں کہہ رہی تھی۔ "ایک لائسنس (لائسنس) لے لو کندنا... اب کی وہ حرامی آیا تو میں اسے گولی مار دوں گی"!

اور ماں سہاگنی اپنے تخیل میں لاش دیکھ رہی تھی اور رو بھی رہی تھی۔ جیسے ہر عورت اپنے بیٹے کی سرزنش کے بعد رونے بیٹھ جاتی ہے۔ سرجو لہراتا رہا۔ ہر صبح و شام اسکول جانے سے پہلے اور لوٹنے کے بعد کندن اس کے پاس رکتی اور اس کی نرم سی چھال پہ ہاتھ پھیرتی، پیار کرتی رہی۔ اور ماں سہاگنی دیکھتی، پکارتی رہتی "کندنا اب آ بھی جا"!

سرجو اب بیس پچیس فٹ لمبا ہو گیا تھا۔ کہیں سولہ سترہ فٹ اوپر جا کر تو اس کے تنے پھوٹتے تھے اور پتے پھلیوں کی طرح عموداً لٹکے رہتے جس کے کارن دوپہر کے سمے جب سائے کی ضرورت ہوتی۔ تو سرجو بیکار ثابت ہوتا۔ البتہ پہلے اور پچھلے پہر جب چھاؤں یوں ہی بدلا میں کپکپی پیدا کرتی تب یہ بھی لا بنے اور گھنیرے سائے پیدا کرنے لگتا اور لکھی کی تینوں چاروں بیٹیاں ریل دیل کھیلتی ہوئی ایک دوسرے کا فراک تھامے، نیچے سے نکلتی، پیڑ کے نیچے چلی آتیں۔ اس کی آخری بیٹی ریڈری بھی، اپنا گول مٹول اور چنی دار چہرہ لئے، جو پیڑ کے نیچے سے ریت کے لمبے رگڑے کرنے لگتی۔

کندن نے ماں کے کہنے پر بندوق کا لائسنس تو لیا تھا۔ البتہ ایک اور بندوبست کیا تھا جو بندوق سے بھی زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے۔ بندوق تو رات کے وقت بیکار بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ ہتھیار کبھی خالی نہیں جاتا۔ اس نے چاکلیٹ کے رنگ کا ایک کتا رکھ لیا تھا۔ جس کا منہ خوفناک تھا اور منہ جبڑے کالے جن میں سے ایک فٹ کی زبان ہمیشہ باہر لٹکا رہتی تھی۔ جیگوار بہت موڈی کتا تھا۔ سیدھو کو بنگلے میں آنے دینا تو کجا کندن کو بھی اندر آنے کے لئے اس سے اجازت لینی پڑتی تھی۔

بچیوں سے جیگوار البتہ مانوس ہو چکا تھا۔ کیونکہ وہ بیس گھنٹے بنگلے میں رہتی تھیں۔

ایک دن لکھی کو ابکائیاں آنے لگیں اور بہت ادھر ادھر کرنے کے باوجود ماں کو پتہ چل گیا۔ اس کے پیٹ میں بچہ ہے وہ کیسے ہوا؟ لکھی اس کا تسلی بخش جواب نہ دے سکتی تھی۔ اس نے بڑی سی بڑی قسمیں کھائیں کہ وہ اپنے مرد کے پاس نہیں گئی۔

ماں سہاگنی اور کندن جانتی تھیں۔ کہ ریڈری کے بعد سیدھو بنگلے میں نہیں آیا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ کسی نے چوری

پیچھے کوئی اور مرد کر لیا ہو۔ مگر لکھی انکار کرتی تھی۔ وہ یہ بات بھی سچ کہتی تھی کہ اس نے کسی مرد کا منہ بھی نہیں دیکھا — نہیں دیکھا تو یہ پھر سب کیسے ہوا؟

بنگلے میں کہرام مچ گیا۔ لکھی ایک طرف بیٹھی ہوئی تھی۔ اور ماں بیٹی آپس میں . . . . . لڑنے لگیں۔ ماں اس کتیا کو باہر پھنکوا دینا چاہتی تھی۔ مگر کندن اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی۔ اتنے ڈھیر سارے بچے لے کر وہ کہاں جائے۔ ماں نے خود اپنے بھائی امرک رام کے ہاں چلے جانے کی دھمکی دی۔ کندن نے بہت سمجھایا بجھایا پھیر وہ اڑی، لیکن جب ماں، باپ کی بھلائی ہونے کو تیار نہ ہوئی تو کندن نے صاف کہہ دیا "اچھا ماں تم جاؤ تو جاؤ میں لکھی کو نہ نکالوں گی"۔ اس پہ ماں خوب دھاڑیں مار کر رونے لگی "یہ بیٹی میری . . . ماں کا جانا سہہ سکتی ہے لیکن لکھی کا نہیں! لکھی اس کی کیا ہوتی ہے؟" جبھی ماں کو بھابی کے غصے یاد آئے اور اس نے بیٹی کے پیروں پہ سر رکھ دیا۔ اور سفید بالوں کا واسطہ دے کر معافی مانگ لی۔

لیکن پھر لکھی سے وہی پوچھ گچھ شروع ہے۔ "سچ بتا کہاں سے لائی ہے؟"

"کہیں سے نہیں"۔ لکھی کہتی۔ "اگر میں نے پاپ کیا ہو تو خداوند یسوع میری چاروں بیٹیوں کو لے جائیں!"

"بیٹیوں کا کیا ہے؟" ماں کہتی۔ "وہ تو ہر عورت چاہتی ہے"۔

کندن ایک جھٹکے کے ساتھ بات کاٹ دیتی۔ "ماں!"

ماں کندن کی طرف دیکھتی۔

"میں بھی تیری بیٹی ہوں"۔ کندن آنکھوں میں شکایتیں، حکایتیں لئے ہوئے ماں سے کہتی۔ "تو چاہتی ہے پرماتما مجھے لے جائیں؟"

ماں بھاشنی کندن کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی تاکہ وہ اس سے زیادہ اشبھ اور ادگت والی بات نہ کہہ سکے اور پھر اپنی بیٹی سے لپٹ جاتی۔ "کہتی ہوں کندنی" ۔۔۔ اور پھر ۔۔۔ "تو میری بات نہیں سمجھتی۔ میں بھی تو کسی کی بیٹی ہوں۔ میں بھی سوچتی ہوں، میں کیوں اس سنسار میں چلی آئی ۔۔۔ کیوں نہ پیدا ہوتے ہی مر گئی؟"

اس بات کے مہینے ڈیڑھ مہینے کے بعد صبح کا ذب کے قریب جگوا بہت غرآیا، بہت بھونکا، لیکن وہ لوہے کی موٹی زنجیر سے بندھا ہوا تھا۔ برآمدے کے جس ستون کے ساتھ اسے باندھا گیا تھا، اپنی جگہ سے ہل گیا۔ مگر زنجیر نہ ٹوٹی۔ اس کے یوں بے تحاشا بھونکنے سے ماں اور کندن نے لیمپ ہاتھ میں لے کر ایک دو بار باہر جھانکا بھی۔ مگر کچھ نہ دکھائی دینے پہ خاموش ہو گئیں۔ صرف ماں نے کہا "جگا رکو کیا ہوا، آج!"

"جانے بہت ہی بھونکا ہے"۔

"ادھر ہی بھونکتا ہے جس طرف سرجو ہے"۔

کندن نے ایک بار ادھر دیکھ لیا۔ حالانکہ اندھی سی روشنی میں سرجو کی چھال بھی سیاہ دکھائی دے رہی تھی۔ کندن بولی۔ "ہاں ماں! جانوروں کو وہ بھی سب دکھائی دیتا ہے جو ہم انسان نہیں دیکھ سکتے"۔

اور کندن نے پٹے سے گھسیٹتے ہوئے جگوا رکو اندر ڈرائنگ روم میں باندھ کر دروازہ بند کر دیا۔ ہاں اب سید ھو آ بھی جاتا تو کیا بگڑتا ہے؟

لیکن پو پھٹے جب منہ میں برش لئے، کاندھے پر تولیہ رکھے، نائٹ گون میں ملبوس کندن باتھ روم سے بغلی کمرے میں داخل ہونے لگی تو اسے اپنی نگاہوں کے سامنے یوکلپٹس کے نیچے کوئی سفید چیز دکھائی دی۔ وہ پہلے ٹھٹکی اور پھر سنبھلی ہوئی ایک طرف بڑھی۔ معلوم ہوتا تھا۔ کوئی بیٹھا ہوا ہے اور دعا پڑھ رہا ہے۔ جبھی ایک سفید فرغل پورے قد میں سامنے کھڑا ہو گیا۔ کسی آدمی کا چہرہ دھندلا سا دکھائی دے رہا تھا۔

"کون ہے؟" کندن نے فرغل سے چند ہاتھ پرے رکتے ہوئے کہا۔

فرغل نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف پچھم سے آنے والی ہوا سے وہ تھوڑا سا ہلا۔ کندن ایک قدم اور بڑھی اور اپنی نظروں کے گھیرے کا تھوڑا ڈایا فرام کھولتے ہوئے چلائی: "باپ!"

پھر وہ برش تولیہ وغیرہ پھینکتے ہوئے دونوں بازو پورے پھیلا کر باپ کی طرف لپکی۔ باپ ساکت و جامد کھڑا تھا۔ کندن والدے لپٹ گئی: "باپ .... باپ!"

باپ کے ہاتھ فرغل میں تھے نہ وہ ساکت تھا۔ اس نے کہا بھی تو اتنا۔

"KEEP AWAY"

کندن بھونچکی رہ کر تھوڑا پیچھے ہٹ گئی اور نگاہوں میں معنے لئے بابی فشر کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ دن نکلنے لگا تھا۔ اور صبح مشرق کے پرتو میں اس کی آنکھوں کے غمناک کونے دکھائی دے رہے تھے۔ اور چہرے پر گناہوں کے احساس جو بہت ہی غیر فانی چیزوں کی طرح سے کبھی نہیں مٹتے۔

کندن نے پوچھ ہی لیا۔ "امریکہ سے کب آئے؟"

"رات" بابی فشر نے دھیمے سے جواب دیا۔ "پین ایم سے ... پھر مائیکل کی کار میں ..."

کندن ایکا ایکی بھڑک اٹھی۔ غصے اور رقت میں ڈوبی آواز سے بولی: "کیوں؟ کیوں آئے تم؟ کیا ضرورت تھی؟ .... چلے جاؤ یہاں سے"

بابی فشر جوں کا توں کھڑا رہا۔

کندن نے ہانپتے ہوئے پیچھے کی طرف آواز دی: "جیگوار .. !"

جیگوار کندن کے پکارنے سے پہلے ہی بھونک رہا تھا۔ اسے کوئی بو آ گئی تھی۔ اور وہ زنجیر تڑا تڑا کر باہر آنے، اس اجنبی کو کچا چبا جانے کے لئے تڑپ رہا تھا۔ کندن اسے کھول کر فادر فشر پہ چھوڑ دینے کے لئے لپکی۔ لیکن پھر لوٹ آئی۔ اور سامنے دکھائی دینے والی برف کی سل پر یورشیں شروع کر دیں۔ وہ سلیں ٹوٹ رہی تھیں اور چلا رہی تھیں: "باپ ... باپ بولو، کچھ تو بولو ..."

کندن کا جسم ساکت لگتے ہوئے فادر فشر کی پاکیزگی کے حوالے اور اس کے وطن کے اینڈر یخگلنے پسیجنے لگے۔ چند لمحے پہلے سردی میں ٹھٹھرنے والے دو جسموں پہ کوئی لحاف سے چلتے تھے جنہیں اتار ایک طرف پھینک کر باپ بولا: "تم عورتیں سمجھتی ہو، مردوں کی عصمت ہی نہیں ہوتی ..." کندن نے تھوڑا پیچھے ہٹ کر بابی کی روح میں جھانکا اور کانپتی ہوئی منت اور آہ و زاری پر اتر آئی۔

"میں نے عورت ہو کر تمہیں معاف کر دیا۔ جب ... اور تم ..."

"میرے اور تمہارے درمیان ... میں عورت ہوں۔"

اور بابی اپنا آپ چھڑا کر سینے پر کراس پیدا کرتا ہوا چل دیا۔ کندن پھاٹک تک اس کے پیچھے بھاگی پکارتی ہوئی "باپ ... باپ ..."

اور جب باپ نہ پلٹا تو کندن وہیں کھڑی ہو گئی۔ اور اسے جاتے دیکھنے لگی۔ پھر اسے خیال آیا۔ شاید ....

اور اس نے ایک بار پھر بلند آواز میں پکارا: "فا ... د ... ر ..." اور اس کی آواز بے شمار گھاٹیوں اور ان کی سیاہ تہوں میں گرتی، جذب ہوتی ہوئی دکھائی دی۔

ماں نے باپ فشر کو نہ دیکھا تھا۔ "بیٹا تم کس سے باتیں کر رہی تھیں؟" اس نے پوچھا۔

کندن نے اپنی آنکھوں سے مایوسیاں پونچھ ڈالنے کی بیکار کوشش کی اور نیچے دیکھتی ہوئی بولی۔ "اپنے آپ سے"

لکھی پہ اب تک ان سوالوں کی بوچھار ہو رہی تھی۔ "سچ بتا کون تھا؟ ... یہ گانٹھ کہاں سے لائی؟"

"تو یہ مت پوچھو ماں!"

ماں ایکا ایکی ڈر گئی۔ اس نے بیٹی کے چہرے پہ دیکھا۔ اور کچھ مطلب ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ کندن نے بالقصد چہرے پہ ایک معصومیت لاتے ہوئے کہا "ہم عورتیں ہیں... ہمیں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ ماں، کیا۔ یہ کافی نہیں ہے کہ وہ بچہ ہے؟"

"مگر پھر لڑکی ہو گئی تو؟"

"لڑکی کیا انسان نہیں ہوتی...؟"

"ہوتی ہے مگر..."

اور پھر سب باتیں ان چند سوالوں میں گم ہو گئیں جو عورت سے ازل سے پوچھے جا رہے ہیں اور ابد تک پوچھے جائیں گے۔ جن کا وہ کبھی جواب دے گی اور کبھی جواب نہ دے سکے گی۔ اور دے گی بھی تو اس پہ ہزار سوال پیدا ہو سکیں گے... سماجی، اخلاقی اور بچے کو کچھ پتہ نہ ہوگا اور ماں ڈری سہمی رہے گی۔

گرجے میں کیتی نے کنفیشن کیا تو ایک اور صورت پیدا ہو گئی جس سے فادر مائیکل، فادر ویلو، سسٹر پیرا انجیلا کو بھگدڑ میں ڈال دیا۔ فشر ابھی تک چپ اور دم سادھے ساری باتیں سن رہا تھا۔ کیتی نے کہا "وہ خواب میں آیا تھا۔" اس پہ معاملہ اور سا تر ہو گیا۔ "کون؟" سسٹر انجیلا نے پوچھا۔ کندن بھی وہیں تھی۔ اس نے کیتی کی مدد کرنے کی کوشش کی۔ "یسوع؟" اس نے کہا مگر کیتی نے نفی میں سر ہلایا۔ اور سب حیران ہو کر اب کے منتظر ہو گئے۔ کیتی نے پھٹتی ہوئی نظر سے سب کی طرف دیکھا پھر آنکھیں جھپکتی ہوئی بولی "رام داس۔"

کیتی اور گرجے کے رجسٹروں میں رام داس ہی کا نام تھا...

کیتی قسمیں لے رہی تھی جن پہ کوئی یقین کرے تو مرے نہ کرے تو بھی مرے۔

عشائے ربانی کی یہ شرکت ختم ہوئی۔ حیران و پریشان کندن نے سسٹر انجیلا کو ایک طرف لے جاتے ہوئے کہا "خواب میں آیا تھا... کیا یہ ہو سکتا ہے سسٹر؟" سسٹر انجیلا نے خدا کی لاہوت کے عالم میں ایک بھلا سا جواب دے دیا۔

"کیوں نہیں... اگر سچ کہتی ہے... کیتی رام داس!"

فرداً فرداً فادر ویلو، اور فادر مائیکل نے بھی کچھ ایسے ہی جواب دیئے۔ گرجے سے باہر سلیٹ سے بنے ہوئے راستے پہ کندن نے فادر فشر کو پکڑ لیا اور پوچھا "کیا یہ ہو سکتا ہے...؟"

فادر فشر نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر کندن سے کہا "نہیں!"

کندن چونک گئی اور بولی "فادر... تم ایک کیتھولک پادری ہو کر اس بات کو نہیں مانتے؟"

"نہیں..."

"کیوں نہیں؟"

"اس لئے کہ خدا کے بیٹے اور انسان کے بیٹے میں فرق ہے... میرا خیال ہے رات کے وقت سدھو چپکے سے چلا آیا ہوگا۔" کندن کو ماں کا فقرہ یاد آیا۔ "ابیتی کے سب کام پہلے تھا اندھیرے میں کرتے ہیں۔" مگر فادر فشر کو آخر منتک پہنچانے کے لئے کندن بولی "سدھو یا رام داس!"

"سدھو!"

"رام داس کیوں نہیں؟"

"رام داس کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اس کا کوئی وجود نہیں۔ وہ تو صرف نام ہے رجسٹر میں۔"

"ہاں مگر" کندن نے ضد کی۔ "آیا بھی تو لکشمی کو پتہ نہ چلا۔"

"تم تو جانتی ہو" فادر فشر نے کندن کی نگاہوں کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔ "پھر خواب کتنا گہرا ہوتا ہے۔"

کندن جذبات سے مغلوب ہو گئی۔ "باپ..." اس نے کہا۔ "اگر تم ان باتوں کو مانتے ہو تو کیوں نہیں یہ مشن چھوڑ دیتے، کیوں نہیں شادی؟"

باپ فشر نے کندن کو وہیں روک دیا صرف اتنا کہہ کر۔ "نہیں!"

"تم کیوں نہیں سمجھنے کی کوشش کرتے باپ۔ اس دنیا کے سب دھندے کرتے ہوئے آدمی پادری سے بھی بڑا ہو سکتا ہے یسوع۔"

باپ نے پھر ٹوک دیا۔ "تم نہیں سمجھ سکتیں!"

اور فادر فشر ایک قدم سے دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا واپس گرجے میں چلا گیا پھر مریم کے حضور میں دعائیں کرنے، رات کو اپنے مجرد بستر پر سونے اور روز آدھی رات کو اٹھ کر شیو بنانے اور پھر سونے کے لئے اس کے کچھ بعد فادر فشر ہمیشہ کے لئے لیڈسن وس کوسن چلا گیا۔ جہاں گنہگار کو پاک دامن کی ضرورت تھی یا کسی پاک دامن کو گنہگار کی....

اب کی زچگی کے سلسلے کو بہت کڑی ہدایات تھیں بلکہ کندن نے ایک سستی مگر چست چالاک دایا طے کر رکھی تھی۔ شہر پانچ میل دور تھا۔ اور وہاں کے اسپتال کے بیڈز بعض وقت ارجنٹ کیس کے لئے بھی خالی نہ ہوتی تھیں۔ میٹرنٹی کا خرچ برداشت کرنے کی لکشمی میں ہمت نہ تھی۔ کندن مدد کر سکتی تھی مگر ایک حد تک۔

مگر لکشمی زچگی کے سلسلے میں کوئی بھی مصارف کرنے کو تیار نہ تھی۔ ماں شبھاشنی نے ریخ پا ہو کر کہا

"مر جائے گی، کمینی!"

"ٹھیک ہے۔" لکشمی نے گھڑا سر ہلا دیا۔ "چھٹی ہو جائے گی۔"

"ان چھوکریوں کو کون سنبھالے گا۔"

"خدا جس نے پیدا کیا۔"

"انہیں پیدا کرنے میں تیرا کوئی ہاتھ نہیں۔"

"نہیں!"

اندوہناک بھرے ہونے کے باوجود، شرارت سے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے لکشمی مسکرا دی۔ اس کا مطلب تھا یہ بھی ہے جو ہمیں وقت پہ عقل پھرا دیتا ہے، کس لئے ہی کھیل کے دلیج میں۔

اور تو سب ٹھیک تھا۔ مگر چیچک دار چہرے والی ریوڑی ابھی بہت چھوٹی تھی۔ اور کندن کو اس کی طرف دیکھ دیکھ کر رحم آتا تھا۔ وہ اب تک ماں کو مکمل طور پر اپنا سمجھے ہوئے تھی۔ ماں ہی اس کا اوڑھنا بچھونا تھی اور ماں ہی اس کی روٹی۔ اسے کیا معلوم چند ہی دن کے بعد لکشمی اسے نہ پوچھے گی اس لئے نہیں کہ وہ پوچھنا نہ چاہے گی۔ بلکہ دوسرے بچے کے سلسلے میں الجھے رہنے کے کارن اسے فرصت ہی نہ ہو گی۔ اور اگر کہیں لڑکا پیدا ہو گیا تو... نہیں اس بنگلے کا قانون ٹوٹ جائے گا، یہ لکشمی جانتی تھی، اور ماں شبھاشنی اور کندن بھی۔

دایا دو میں ایک دو چکر کاٹ جاتی تھی۔ تاکہ لکشمی کے چہرے پر شکن بھی دکھائی دے تو ماں کو خبر کر دے اس کے ساتھ طے یہ ہوا تھا کہ وقت بنھا گئی تو لکشمی کی تنخواہ سے دس روپے کاٹ کر اسے دیئے جائیں گے۔ اور میم صاحب اکندن بیس روپے اپنی جیب سے دے گی اور ساتھ میں دھوتی، بلاؤز یا فراک کا کپڑا۔ گیدرڈ اسکرٹ۔

ایک دن دوپہر کے قریب دایا آئی تو لکھی ہنس ہنس کر اس کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ دایا کو خود بہت اچنبھا ہوا۔ اس نے تو کوئی ایسی بات نہ کہی تھی۔ جس پر کوئی ہنسے مگر ـــ اس کے تھوڑی دیر بعد لکھی پھر کھل کھلا کر ہنس دی۔ دایا اس کا منہ دیکھنے لگی۔ اور ڈر گئی۔ اس کے پڑوس میں ایسے ہی ایک لڑکی عورت بیٹھے بیٹھے پاگل ہو گئی تھی۔ مگر وہ ہنسنے کے سوا اور کوئی بات نہ کر سکتی تھی۔ لیکن لکھی بات بھی کرتی تھی اور ہنستی بھی تھی۔ لکھی کی ہنسی سے دایا مایوس ہو گئی۔ اور سوچتی ہوئی چلی گئی۔ ابھی ہفتہ بھر کوئی خطرہ نہیں ہے۔

دایا کے جاتے ہی لکھی رونے لگی۔ وہ اتنا ہی روئی تڑپی جتنا وہ ہنسی تھی۔ وہ ایک ایسے جبری پن سے جو عورت ہی کا حصہ ہے، اپنے درد کو دباتی ہوئی تھی کہ شام کے سات بج گئے۔

کندن اسکول سے لوٹ کر ایک کتاب پڑھ رہی تھی اور کھانے کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ماں رسوئی کی طرف سے کوئی ضروری بات کہنے کے لئے آئی کہ ایک دلدوز چیخ سنائی دی۔

"یہ ـــ ؟" ماں نے کہا۔

"لکھی کی آواز ـــ" کندن بولی اور پھر دونوں اندھیرے میں لکھی کے گھر کی طرف دیکھنے لگیں۔ "ہائے سرب آغو" ماں نے ماتھا اور چھاتی پیٹتے ہوئے کہا۔ دایا تو کہہ گئی ہے۔ ہفتہ بھر کوئی خطرہ نہیں۔" اس کے بعد اور بھی ہو ہائے سنائی دینے لگی۔ ماں بھاشنی کی لمبے نقشے کا لیوٹا کا تانتا بندھ گیا۔ بیچ بیچ میں بیگو ارے بے تحاشا جھکنے کی آواز شامل ہو گئی تھی۔

لیکن بھاشنی پھسکڑ مارے بیٹھی تھی۔ اور اس بات کے انتظار میں تھی، کب یہ آواز ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ کندنا زندہ تو اس کنیا کو گھر سے جانے نہ دے گی۔ البتہ مردہ نہ رکھ سکے گی۔ اس نے کندن کو روک لیا۔ "اگر تو جائے تو میرا منہ دیکھے۔"

کندن رک گئی۔ اس کا انگ انگ پھڑک رہا تھا۔ اور چیخیں سن کر اس کے قدم دروازے کی طرف اٹھے اور پھر ماں کے ڈر سے رک گئے۔ اس نے ملتجیانہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔ جو پتھر بنی بیٹھی تھی۔ اندر سے دکھیوں اور کس بات کے خوف سے کانپ رہی تھی۔ اس کا کندن کو بھی اندازہ نہ تھا شاید وہ کبھی سل بنی بیٹھی رہتی۔ لیکن ایکا ایکی کھلے دروازے میں ریوڑی چلی آئی روتی ہوئی متوحش اور مادر زاد ننگی۔

کندن سے نہ رہا گیا وہ بولی "میں جاؤں گی۔"

"کندنا" ماں نے آواز دی ـــ میں کچھ کھا مروں گی۔"

اس پر کندن نہ رکی اور کوارٹروں کی طرف لپک گئی۔ ماں کو وہ دن یاد آیا جب اس نے اپنے بھائی امرلک رام کے ہاں چلے جانے کی دھمکی دی تھی اور کندن ہمیشہ کے لئے اسے بھیج دینے کے لئے تیار ہو گئی تھی۔ آج اسے ماں کے مرجانے کی پروا بھی نہ تھی۔ یہ کیا رشتہ تھا؟ کندن کا اور لکھی کا ہمـ بھاشنی اٹھی اور اپنی کچی کنواری بیٹی کو اس کریہہ منظر سے بچانے کے لئے ریوڑی کو دھکا دے کر باہر نکل گئی۔

دو گھنٹے ماں بیٹی کشتی لڑتی رہیں۔ کہیں نو ساڑھے نو بجے تولید ہوئی ـ "حرامی بچہ پیدا ہو گیا ـــ لیکن مرا ہوا، وہ لڑکا تھا!"

پیدائش کے فوراً بعد حیات و ممات سے بے خبر لکھی ایک تسکین کی میٹھی نیند سو گئی تھی۔ جس کا احساس اس جانکاہی کے بعد ہی ہوتا ہے ـــ

کندن کو یاد آیا ـــ لکھی نے ایک بار کہا تھا ـ "خداوندا! میں ایک لڑکا تو پیدا کر کے دیکھ لوں چاہے وہ مرا ہوا ہی کیوں نہ ہو۔"

نج فادر مائیکل نے بچے کا فاتحہ پڑھنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ وہ کرسچین بنے بغیر ہی مر گیا تھا۔ وہ زندگی میں شراب اور پانی کے ساتھ اس کا بپتسمہ نہ کر سکا تھا۔ لیکن اس کی اصل وجہ نہ فادر مائیکل نے بتائی نہ فادر ردوبیلو نے اور نہ سسٹر انجیلا نے . . . .

ماں نے بنگلے کے دوسرے کونے میں گڑھا کھدوا مردہ بچے کو دبانے کے لئے۔ لکھی گھسٹتی ہوئی قبر تک چلی آئی ـــ گھر سے شراب کی بوتلوں کا کھوکھا لائے ـــ جو بچے کا تابوت ہونا تھا۔ کھوکھے میں ڈالنے سے پہلے لکھی نے بچے کو دیکھا۔ اور جھک کر اس کے لڑکے پن کو چوم لیا۔ اور پیپے دیکھنے لگی۔

باقی ص ۳۴ پر

ڈاکٹر احسن فاروقی

زندگی جہنم

اُس عورت نے میری زندگی جہنم کر دی تھی۔ خدا اُسے جنت نصیب کرے۔ ہاں میری زندگی تو جہنم کر دی تھی اور اسی پر کیا بس تھا۔ میری والدہ نے میرے والد کی زندگی جہنم کر دی تھی اور میری ساس نے میرے خسر کی۔ سب ہی عورتیں ایسا کرتی آئی ہیں۔ سب یہی کرتی تھیں۔ تب ہی تو غالب نے کہا ہے ع بآدم زن بشیطاں طوقِ لعنت۔ خدا نے ہماری عدول حکمی کی یہی سزا مقرر کی تھی۔ ہمارے گلے میں عورت کا طوق شیطان کے گلے میں لعنت کا طوق۔

نہیں وہ مجھ سے نفرت نہیں کرتی تھی۔ آنکھ کھول کر اُس نے مجھے ہی دیکھا تھا۔ کبھی نگاہ بھر کر کسی اور مرد کو نہیں دیکھا۔ مجھے جی اور جان سے چاہتی تھی۔ میری انگلی دکھتی تو اس کا دل لرز جاتا۔ میں بیمار ہوتا تو وہ ایک ٹانگ سے کھڑی رہتی۔ ایسی تیمارداری کرتی تھی۔ کہ کیا کہوں۔ ہمیشہ میری طرف سے لڑتی تھی۔ مجھے کوئی اشارے سے بھی برا کہے تو بگڑ کھڑی ہوتی تھی۔ وفاداری میں اس کا ثانی نہ تھا۔ عصمت میں ایسی کہ کبھی کسی نے اس کا آنچل تک نہ دیکھا تھا۔ ایسی کہ اس کے دامن پر نماز پڑھی جائے۔

مگر زندگی جہنم کر دی تھی۔ .... ہر وقت تُو تُو مَیں مَیں۔ ہر بات میں غصہ، گرمی، رونا، بین کرنا، دامن پھیلا پھیلا کر کوسنا کاٹنا، یہ یوں نہیں یوں۔ وہ وں نہیں وہوں۔ ماں کو یہی کرتے دیکھا تھا۔ ساس کو یہی کرتے دیکھا تھا۔ یہی تعلیم یہی تربیت ہوئی تھی۔ پہلی ہی رات سے جہنم شروع ہو گیا تھا۔ میری والدہ نے ڈیڑھ سو روپئے دیئے تھے۔ کہ یہ سرہانے رکھنا۔ خدا جانے کی پوٹلی بندھی تھی۔ میں نے سرہانے رکھ دی تھی۔ رات ہی میں کوئی دو بجے ہوں گے۔ اُٹھ کر پوٹلی کھولی، روپے گنے۔ بولیں۔ "آئیں! یہ ڈیڑھ سو روپلّی! تم نے مجھے دھوکا دیا ہے" اور روپے پھینک دیئے! کمرے بھر میں پھیل گئے۔ میں اُٹھ کر چننے لگا وہ بکتی رہیں۔ "واہ بڑی باجی کے میاں نے تین سو روپے رکھے تھے۔ چھوٹی کے میاں نے ڈھائی سو۔ یہ لے کے چلے ڈیڑھ سو روپلّی۔"

میں نے کہا۔ "میں کیا جانتا تھا۔ اماں نے ہی دیئے۔"

تڑپ کر بولیں۔ "اُن ہی کو جا کر دو۔ اور ان ہی کے پاس جا کر سو۔"

میں منہ دیکھنے لگا۔ کہ یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ خیر روپے میں نے جمع کر کے پھر پوٹلی باندھی اور ان کے پاس آیا۔ بولیں۔ "دیکھو مجھے ہاتھ نہ لگانا نہیں تو کچا چبا جاؤں گی۔"

کچھ دیر میں خاموش رہا۔ پھر میں نے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ انہوں نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔ "آگ لگے"
میں نے کچھ دیر بعد پیر پر پیر رکھ دیا۔ وہ اٹھ بیٹھیں اور بولیں "بھاڑ میں جائیے!" پلنگ سے اٹھ کر تخت کے ایک کونے پر جا بیٹھیں اور زار و قطار رو رہی ہیں۔ "ہائے مجھے نہیں معلوم تھا کہ قسمت یوں پھوٹے گی۔ ہائے خدا یہ کیا ہوا۔ میں نے کونسا گناہ کیا تھا" جوں جوں میں منانے کی کوشش کرتا۔ وہ اور بگڑتیں۔ یوں ہی صبح ہو گئی۔ میں باہر آ کر سو رہا۔ ان کو ان کے بھائی آ کر لے گئے۔ چوتھی کے بعد جب گھر آئیں تو میں نے پوٹلی میں سو روپے اور شامل کر لئے تھے۔ وہ دی۔ تب ان کو گن کر مسکرائیں۔

دولہاپے کے زمانے میں ہر روز ایسی ہی تُن پھن، غصہ، گرمی، بین، رونا دھونا رہتا تھا۔ آج عطر نہیں لائے، آج ہار لائے تو اس کے پھول سوکھے ہوئے۔ گھر کے پہننے کی جوتیاں نہیں ہیں۔ روزمرّہ کے کپڑے نہیں ہیں۔ کپڑوں کے لئے ہم سو سو پھیرے بازار کے کر رہے ہیں۔ جوتوں کے جوڑے پر جوڑے آ رہے ہیں۔ کوئی پسند نہیں آتا۔ مین میخ نکالی جا رہی ہے۔ زندگی جہنم ہوتی جا رہی ہے۔ والد مرحوم خدا بخشے سب دیکھتے تھے، سب جانتے تھے، ان پر گزر رہی تھی۔ کوئی دو مہینے بعد بولے۔ "بس اب ہو چکا سہاگ۔ اگر اسی طرح زن مرید رہو گے تو پاگل ہو جاؤ گے پاگل، وقت وقت سے گھر میں جایا کرو" بس وہ بہانوں سے مجھے باہر بلوا لیتے۔ گھر سے کہلوا دیتے۔ فلاں مقدمہ میں کچہری گئے ہیں۔ فلاں کرایہ دار سے کرایہ وصول کرنے گئے ہیں۔ فلاں صاحب سے ملنا ضروری تھا۔ وہاں میں نے بھیجا ہے۔ مگر جب گھر میں آتا ان کے پاس، وہی راگ رونی۔ خیر کچھ عادت پڑی۔ کچھ مسکرا کر ٹالا۔ کبھی کبھی ہنسی بھی اڑائی۔ دن کٹتے گئے۔ بچے ہوئے تو کچھ غصہ میں کمی آئی۔ مگر بین کرنے کی عادت بڑھ گئی۔ بچے کے کچھ ہوا اور بین ہونے لگے: "ارے میرے بچے کو کیا ہوا جاتا ہے۔ اے مولا آئیے، بچائیے اور میسر یہ کرتے۔" اسی مردے کو کوئی خبر نہیں ہے۔ ایسا سنگ دل ہے اس کو اڑھائی گھڑی کی موت آئے۔ ایسے مُردوے کو خدا غارت کرے" اور نہ معلوم کیا کیا کوسنے۔ اب تو یاد بھی نہیں رہے۔

اور ایک مصیبت یہ کہ ہر وقت ساس سے نوک جھونک ہونے لگی۔ جب گھر میں جاؤ تو تمہاری ماں نے یہ کہا تمہاری ماں نے وہ کہا۔ "سنو!" ادھر والدہ کہہ رہی ہیں۔ "ایسی بہو نوج ہو کسی کی۔ یہ کیا اور وہ کیا اور یوں کہا اور ووں کہا۔" اب جس کی طرف سے بولو دوسری بگڑ جاتی ہیں۔ عجیب مخمصہ میں جان! ایک منٹ سکون نہیں۔ والد مرحوم آ کر بہو کی پُرچک لیتے اور والدہ کو ڈانٹ دیتے۔ بہو اور شیر ہو جاتیں۔ میں کہہ اٹھتا "اپنے جھگڑے اپنے تک رکھا کرو میری زندگی جہنم نہ کرو" اب رونا شروع ہوتا۔ "ہائے میری تو قسمت پھوٹ گئی۔ میرا تو کوئی نہیں ہے۔ یا اللہ تو ہی انصاف کرے" اور ایسی ہی بک بک اب جو لگتی ہے تو تار ہی نہیں ٹوٹتا۔ خیر۔ قہرِ درویش بر جانِ درویش گزرتی گئی۔ ابا جان کا انتقال ہوا۔ ان کا سیوم بھی نہ ہونے پایا تھا۔ کہ دُھن لگ گئی۔ "اے میں ان کے ساتھ نہیں رہ سکتی گھر الگ کر دیوار کھچوا دو" ان کے چالیسویں تک یہی راگ رونی۔ یہی راگ رونی۔ میرا دشیقہ کھلنے ہی نہ پایا تھا۔ کہ گھر الگ کرنے کے سامان شروع ہو گئے دالان کے سامنے دیوار کھینچ کر میرا حصہ الگ ہو گیا۔ نئی دیوار کے سہارے کھپریلا ڈال کر باورچی خانہ بن گیا۔ ایک نوکرنی کھانا پکانے کے لئے رکھی گئی۔ اب دن رات اس سے بحث تکرار ہے۔ تو نے یہ ہنڈیا یوں بگاڑ دی۔ تو نے یہ چرا لیا۔" میں نے جھنجھٹ ختم کرنے کے لئے کہا "آخر وہ بھی آدمی ہے۔ جیسے تم سمجھاتی ہو ویسے کرتی ہے، غلطی بھی ہو جاتی ہے۔" پھر کیا تھا بولیں "ہاں اس پر نگاہ ہے! یار بنانا چاہتے ہو اس کو پرچک لیتے ہو اس کی، اُسی کو بیوی بنا کر بٹھاؤ۔ میں اپنے میکے چلی جاؤں گی، اپنے بچے لے کر۔ خدا نے مجھے اپنے کھانے بھر کا دیا ہے" عجیب عورت نہ ہاری مانتی نہ جیتی۔ بس اپنی رُٹ تھی۔ اور ایسی رٹ کہ کسی دن کوئی بات ہو جائے۔ بس شام تک اسی کی رُٹ رہے گی۔ بار بار دہرائی جا رہی ہے۔ بات کے بتنگڑ بن رہے ہیں۔ اور ہماری زندگی جہنم ہوتی جا رہی ہے۔ شدید سے شدید جہنم۔ دماغ کی کیا حالت ہوا کرتی تھی کیا بتاؤں۔ جی ڈھونڈتا تھا۔ کہ کہیں سکون ملے مگر کہیں نہ ملتا۔ والدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ اب اٹھ کر والدہ کی طرف

سکیں۔ سارے گھر کا انتظام ہاتھ میں ہو گیا۔ اب ہر وقت دادا کیں بکیں۔ بہنیں تھیں وہ کبھی آجاتیں۔ کچھ دن بڑا سہاگ رہتا۔ مگر پھر ان سے بھی اَن بن۔ وہ بھی اپنی اپنی جگہ پر ان سے کم تھوڑی تھیں۔ آوا کا آوا ہی الٹا تھا۔ جس خاندان میں پوچھو یہی عالم۔ جتنی خاندانی عورتیں تھیں سب اسی رنگ میں رنگی ہوئی۔ والد نے تین شادیاں کیں۔ ایک پہلے ہی مرچکی تھیں۔ دوسری میری ماں تھیں۔ تیسری اور تھیں وہ بھی خاندانی۔ والد نے ایک رنڈی بھی ڈال لی تھی۔ اس کے بھی بچے تھے۔ مگر ان کو رنڈی والا لوگ کہتے تھے۔ مجھے بہت برا لگتا تھا۔ میں نے یہ طے کر لیا تھا۔ کہ ایک کے سوا دوسری نہ کروں گا۔ نہ کوئی بیوی اور نہ کوئی رنڈی۔ چاروں طرف سے زندگی جہنم ہو جاتی۔ زیادہ تر میں گھر سے باہر رہتا۔ دوستوں کے ساتھ۔ کھیلوں میں تماشوں میں باتوں میں دن گزر جاتا۔ گھر میں کھانا کھانے آتا۔ اس کے بعد پھر باہر چلا جاتا۔ باہر ہی کے حصے میں ساری رہائش کر لی تھی۔ حقہ وہیں بھر کر آجاتا۔ خاصدان میں پان لگ کر آجاتے۔ وہ گھر میں ماماؤں سے لڑا کرتیں۔ اور میری شکایت کیا کرتیں: "ان کو تو گھر بار کی کوئی پروا ہے نہیں۔ کھانا کھایا باہر جا کر پڑ رہے۔ حقہ غڑ غڑ کر رہے ہیں۔" کئی برس اسی عالم میں گزر گئے۔

مگر زندگی کچھ عجیب اکیلی اکیلی معلوم ہوتی تھی۔ باتیں کرنے کو دوست بہت تھے۔ مگر یہ جی چاہتا تھا کہ کوئی عورت ہو۔ جو میٹھے لہجے میں بات کرے۔ جس کی باتیں ایسی ہوں جیسے منہ سے پھول جھڑیں۔ نہ معلوم یہ کیسی خواہش تھی، کیوں تھی؟ ایک دن ایک دوست کے یہاں گیا ان کے پاس ایک رنڈی تھی۔ وہ پردہ نہیں کرتی تھی۔ دوست کے ساتھ وہ بھی باہر کے حصے میں آبیٹھا کرتی تھی۔ وہ ہم سب سے کس پیار سے باتیں کرتی تھی کیا بتاؤں۔ ذرا سی تلخی ذرا سی گرمی کا نام نہیں۔ میں زیادہ سے زیادہ ان دوست کے یہاں جانے لگا۔ اکثر ایسا ہوا کہ دوست گھر میں نہیں ہوئے تو رنڈی نے مجھے نہایت احترام سے بٹھایا۔ پان رکھے، حقہ منگوا دیا۔ مسکرا مسکرا کر باتیں کرتی رہی، کبھی کسی میلے کا ذکر کبھی کسی محفل کا حال، بات بات میں شعر پڑھتی تھی۔ مجھے محسوس ہوتا، عورت کی بات چیت بھی عجیب لطیف چیز ہے۔ مرد عورت کا تعلق آخر کتنا کے تعلق کے علاوہ بھی کوئی چیز ہے۔ اور یہ خاندانی تعلق رسم دنیا، گھر داری، امانِ نسل کے لئے ہو تو ہو اور کسی کام کے لئے نہیں ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ رنڈیاں کرنے کی ضرورت محض نفسانی خواہش سے نہیں ہوا کرتی تھی۔ رنڈیوں سے جو ربط میسر آتا تھا۔ اس میں سکون اور تفریح ملتی تھی۔ رنڈیاں، پڑھی لکھی تہذیب یافتہ صاحب ذوق ہوتی تھیں۔ ان کی صحبت میں ذہنی سکون ملتا تھا۔ غصہ، گرمی، بد دماغی ان کے پاس چھو کر نہیں جاتی تھی۔ میں نے کئی اور دوستوں کے یہاں جا جا کر دیکھا۔ جن کے پاس رنڈیاں تھیں۔ اس زمانے میں قریب قریب ہر رئیس زادے کے پاس ایک رنڈی ضرور ہوتی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ رنڈی نہایت ہی دلکش مصاحب ہوتی ہے۔ مگر مجھے خوف تھا کہ رنڈی ڈالوں گا تو اس کے بچے ہوں گے۔ اور پھر وہ رنڈی بچے کہلائیں گے۔ اور ان کی زندگیاں خراب ہوں گی۔ ایسی رنڈی ہو جو بانجھ مان لی گئی ہو۔ ایسی مجھے مل بھی گئی۔ اسے میں نے ادھر لا کر رکھا جدھر میرے والد کی رنڈی رہتی تھی۔ اور ان کے مرنے کے بعد چلی گئی تھی۔ نازنین نام تھا اس کا۔ کچھ ہی عرصے میں مر گئی۔ مگر وہ جو پانچ یا چھ برس اس کے ساتھ گزرے ہیں۔ ان کو جنت کا نمونہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ہر وقت مسکراتا ہوا چہرہ میں غمزدہ اور پریشان گھر میں آیا۔ تو دلاسے دے رہی ہے۔ شعر سنا رہی ہے، سمجھا رہی ہے۔ راتوں کو قصے کہانیاں سناتی۔ اس کی محبت سے مجھے شاعری کا شوق ہو گیا تھا۔ بازار سے دیوان خرید لاتا۔ ہم دونوں پڑھتے سمجھتے غور کرتے۔ حسن و قبح کی باتیں کرتے۔ داستانیں بھی کبھی وہ پڑھتی میں سنتا۔ کبھی میں پڑھتا وہ سنتی۔ دونوں پلنگ پر لیٹ کر پڑھتے سنتے۔ عورت نہ اس لئے بنائی گئی ہے۔ کہ خاندانی بچے بنانے کے اور خاندانی گھر سنبھالنے کے زعم میں میاں کی زندگی جہنم کر دے۔ اور نہ اس لئے کہ کتیا یا بلی ہو کہ جسمانی آسودگی کے بعد آدمی الگ ہو جائے۔ میں سوچا کرتا تھا۔ کہ آدم اور حوا جب جنت میں گیہوں کھانے سے پہلے ہوں گے تو اسی طرح رہتے ہوں گے —— مگر میری بیوی نے اسے جینے نہ دیا روز اس کے یہاں تعویذ گنڈے نکلا کرتے تھے۔ جن میں اس کے بھاگ جانے اس کے چھوڑ جانے، اس کے مر جانے کی دعائیں ہوتیں۔ وہ مجھے دکھاتی اور مسکرا کر کہتی۔ "ان تعویذوں سے ہی سب کچھ ہو جایا کرے تو پھر دنیا میں کوئی کچھ کرتا ہی نہیں:" وہ ذرا بھی توہم پرست نہ تھی۔ مگر

کیا معلوم بیوی نے اسے کچھ کھلوایا۔ یا شاید کوئی ایسا عمل ہوگا۔ جو اثر کر گیا۔ کہ ایک دن اُسے خون کی قے ہوئی۔ اُسی دن میں نے اس کا چہرہ افسردہ دیکھا۔ حکیم کو بلا کر دکھایا۔ انہوں نے کہا کلیجہ کٹ گیا۔ اسی رات کو وہ سوتی کی سوتی رہ گئی۔

میری زندگی پھر جہنم ہو گئی۔ اور بھی جہنم ہو گئی ہے۔ بیوی کے یہاں آمد و رفت بند ہی ہو چکی تھی۔ گھر میں جب کبھی جاتا چپ جاتیں اور آڑے سے ہزاروں کوسنے مجھے اور اس رنڈی کو دیا کرتیں۔ لڑکیاں سیانی ہو چلی تھیں وہ آکر لپٹ جاتیں۔ مگر وہ بھی ماں ہی پر پڑ رہی تھیں لڑکے رنڈی والے گھر میں میرے پاس آیا کرتے تھے۔ رنڈی ان سے بڑا پیار کرتی تھی۔ اور ان کی تربیت میں اس کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس کے مرنے پر لڑکے ایسے روئے جیسے سگی ماں کے مرنے پر روتے۔ لوگوں نے کہا ایک اور ڈال لو۔ مگر اب آگے ہمت نہ پڑی۔ اس کی یاد ہی میں زندگی گزارنے کی ٹھان لی۔ دل کو قلق بہت تھا۔ زندگی سے دل بھر چکا تھا۔ بڑھاپا بھی آچکا تھا۔ ایک دن میں بیمار ہو گیا۔ حکیموں نے بیوی سے نہ معلوم کیا کہلا بھیجا کہ وہ دوڑتی ہوئی باہر کے مکان میں آگئیں۔ اپنا سب غصہ اپنی سب لڑائی بھول گئیں۔ اب جو انہوں نے میری خدمت کی ہے تو اس کا جواب نہیں ہو سکتا۔ اور وہ دونوں لڑکیاں ہر وقت ایک ٹانگ سے کھڑی رہتیں۔ اس زمانے میں مجھے محسوس ہوا۔ کہ اُن کو مجھ سے محبت ضرور تھی۔ اور یہ میری زندگی کو جہنم بنانے والا طریقہ محض ایک رسم تھی۔ ایک خاندانی تہذیب۔ خاندانی عورت کا ایک اخلاقی فرض۔ خیر میں اچھا ہو گیا۔ انھوں نے بہت دھوم سے غسلِ صحت کرایا۔ دعوتیں ہوئیں، ناچ گانے ہوئے۔ جوڑے بنے۔ میری بہنیں بھی آئیں۔ سب ٹھیک ہی ٹھیک ہوا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ بالکل بدل گئیں۔ اب میں گھر کے خاص حصّے میں رہنے لگا۔ انگنائی میں ایک قطار میں پلنگ بچھتے۔ اس سرے پر میرا پلنگ اُس سرے پر بیوی کا۔ بیچ میں بچوں کے۔ سال بھر ہاں وہ لطیف زندگی تو نہیں حاصل ہوئی جو اس رنڈی کے ساتھ تھی۔ مگر پھر بھی پورا سکون رہا۔

مگر یہ سال بھر ہی تک رہا۔ اب بیوی کا ایک پٹّو کا یہ شروع ہوا کہ "ارے لڑکیاں جوان ہو گئی ہیں۔ کہیں بات چیت ٹھہراؤ۔ کیڈی رہ جائیں گی۔" ہر ایک آئے گئے سے کہتیں۔ "وہ ان کو یوں ہی بوڑھا کر دے گا۔ نہ شادی ہوگی نہ بیاہ!"

مجھے محسوس ہوا کہ پھر زندگی جہنم ہونے لگی۔ مگر وہ رنڈی دو باتیں سکھا گئی تھی۔ "ایک تو ہر پریشان کن بات کو ہنس کر ٹالنے کی عادت ڈال گئی تھی۔ اور دوسرے مجھے پڑھنے سے تفریح حاصل کرنا سکھا گئی تھی۔ اب میں بیوی کی باتوں کو ہنس کر ٹالتا۔ کبھی جھوٹ بولتا کہ فلاں فلاں سے ذکر کر رکھا ہے۔ اب شادیوں کے رقعے آئیں گے۔ اور زیادہ حقہ منہ میں لگا کر پڑھنے بیٹھ جاتا۔ گھر میں مشاطائیں آیا کرتی تھیں انہوں نے لڑکیوں کی شادیاں ٹھہرائیں۔ شادیاں ہو بھی گئیں۔ اب دامادوں کے ہٹ کنڈوں کے پٹّو کے شروع ہوئے۔ اب غصے سے زیادہ رونا اور پیٹنا سوار تھا۔ بڑی لڑکی کا میاں ذرا سمنت تھا۔ ایک دن وہ گھر میں آیا۔ اس پر ایسی تان ماری کہ وہ بگڑ کر چلا گیا۔ لڑکی کو روک لیا مگر وہ دیور کے ساتھ چلی گئی۔ اب کیا تھا جو کوئی آتا اس سے یہی رونا تھا۔ "بڑی لڑکی کی تو قسمت پھوٹ گئی۔ ایسا ظالم مردوا ملا ہے' وہ ظلم کر رہا ہے۔ وہ صبر کر رہی ہے باپ ہیں کہ محو ہیں، سرشار ہیں۔ نہ دنیا کی خبر ہے نہ مافیہا کی۔" کبھی بیٹھے بیٹھے رونے لگتیں، "ہائے میری بچی کہاں تیری قسمت پھوٹی۔ ہائے یہ کون سے گناہ کا مجھے بجورا ملا ہے۔" اور روتے روتے ہچکیاں بندھ جاتیں۔ لڑکی کا پنور بیاہ کر گئی تھی۔ اور اس کے بچہ ہونے والا تھا۔ داماد نے ان کو اطلاع دینا مناسب نہیں سمجھا۔ ایک دن انھوں نے شور مچانا شروع کیا۔ "ارے گوشت سے ناخون جدا کر رہا ہے۔ ارے میری بچی جیئے گی بھی یا نہیں۔" خوب دھاڑ دھاڑ کر روئیں۔ سارے محلے کے لوگ جمع ہو گئے۔ مجھے تو یاد بھی نہیں، کیسے کیسے بین کئے۔ ہاں یہ یاد ہے کہ بے قراری انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ آواز آسمان پھاڑے دے رہی تھی۔ اور آنسوؤں سے سارا دوپٹہ بھیگ گیا تھا کیا سماں تھا واللہ! اور میرے دماغ کی کیا حالت ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے ایک دم سے جہنم کی آگ میں پھینک دیا۔ دوسری لڑکی کی شادی بھی کانپور ہی میں ہوئی۔ اب ہر وقت یہ رونا تھا۔ "ارے سب کی لڑکیاں تو یہیں ہیں۔ میری پردیس چلی گئیں۔ میں نے خدا کا

کا کیا گمنا و کیا تھا نہ معلوم ۔ ہائے مرتے وقت آ بھی نہ سکیں گی ۔ بغیر دیکھے مر جاؤں گی ۔ ارے اللہ ! یہ کیا ہو گیا "

لڑکوں کے بیاہ کئے بہویں لائیں ۔ خود جا جا کر دیکھ آئیں ۔ آ آ کر کہا " بڑی کم سخن لڑکیاں ہیں " مگر گھر میں آتے ہی وہ زبان دراز اور بد تمیز ہو گئیں ۔ بہوؤں کی ہر بات پر اعتراض ہو رہے ہیں ۔ چپکے سے میرے کان میں کہہ رہی ہیں " اسے دیکھو کیسی چنڈال ہے ۔ میاں چیزیں لا کر دیتا ہے کسی کو پوچھتی تک نہیں ۔ دن رات میکا ، جب دیکھو میکا ۔ یہ کون طریقے ہیں ۔ گھر کو گھر نہیں سمجھتیں ۔ ماں کا بھرنا بھرتی ہیں " بہویں آخر ان ہی کی طرح خاندانی تھیں ۔ ایک سے ایک ۔ جواب پر چپٹ جواب دیتیں ۔ وہ روتیں " ارے ایسی بہویں مجھے ملی ہیں ۔ کہ خدا دشمن کو بھی نہ دے ۔ اے خدا یہ میری جنم کیسی منحوس تھی ۔ داماد ہیں تو ، بہویں ہیں تو ، مجھے کھائے جاتی ہیں ۔ اب میں مر بھی نہیں چکتی ۔ کسی کتے بلی کی آئی ہو تو مجھے آ جائے ۔ اے خدا مجھے بلا لے اب میں زندہ رہنا نہیں چاہتی " اپنے آپ کو کوستے مجھے کوسنے لگتیں ۔ میں بڈھا ہو چکا تھا ۔ میرا دماغ ماؤف ہو چکا تھا ۔ اب یہ سب باتیں تیر کی طرح دماغ میں گھستیں ۔ میں بھی جھلا اٹھتا ۔ " تم عورت نہیں ہو جہنم ہو ، چالیس برس سے میری زندگی جہنم کئے ہو ۔ میرے سامنے ایسی باتیں بالکل نہ ہوں ۔ نہیں تو میں گھر کے اندر نہ آیا کروں گا " میرے لہجے میں کچھ ایسی سختی تھی ۔ کہ انہوں نے متوجہ کرنا چھوڑ دیا ۔ مگر سٹھیا بیٹھیا کی عادت کہیں جانے والی تھی ۔ وہ مرتے دم تک رہی ۔ نزع کے عالم میں خاموش ہو گئی تھیں ۔ ایک دم سے چیخ کر بولیں " تم نے میرا کلیجہ نکال لیا " اور پھر خاموش ہو گئیں ۔ کیا معلوم کس سے کہا تھا ۔ مجھ ہی سے کہا ہو گا ۔ خیر اللہ ان کو جنت نصیب کرے جو کچھ ہوا یہ ان کی غلطی نہ تھی ۔ وہ پورا ماحول ہی ایسا تھا ۔ ہر بیوی یہی کیا کرتی تھی ۔ خاندانی ہونے کی پہچان یہی تھی ۔ اب دس برس ہو گئے مجھے بھی مرنا ہے دو برس چار برس اور جھیل لوں گا ۔ اب زمانہ بدل گیا ہے ۔ لڑکے ملازمتوں پر ہیں ۔ کبھی کبھی آ جاتے ہیں ۔ لڑکیاں بھی کبھی آ جاتی ہیں ۔ یہ میرا مکان اب گیارہ قطعوں میں تقسیم ہو گیا ہے ۔ میں نے پہلے ہی اس سب کو لڑکے لڑکیوں میں بانٹ دیا ہے ۔ سب اپنے اپنے حصول کا کرایہ لیتے ہیں ۔ میرا وثیقہ میرے بعد سب میں بٹ جائے گا ۔ پوتوں اور نواسوں کی بھی شادیاں ہوئیں ۔ وہ لوگ یہاں آئی تھیں ۔ پڑھی لکھی فیشن ایبل بڑے ادب قاعدے سے بات کرتی تھیں ۔ حالانکہ وہ بھی خاندانی ہیں ۔ اپنوں ہی میں سے ہیں ۔ شاید ہماری ان بیوی مرحومہ کی طرح کی اب عورتیں نہیں ہوتیں ۔ خدا بخشے انہوں نے تو زندگی جہنم کر دی تھی ۔

اب بھی کبھی کبھی خواب میں آ جاتی ہیں ۔ وہی تیوری پر بل ۔ وہی ہونٹ دبے ہوئے ، وہی بک بک جھک جھک ، وہی رونا پیٹنا ، گھبرا کر میری آنکھ کھل جاتی ہے ۔ اکثر میری بہویں بھی آ جاتی ہیں ۔ انھیں اب سن رسیدہ کہنا چاہیے ۔ ان کے سامنے ان کی ساس کا ذکر آ جاتا ہے تو کان پر ہاتھ رکھ کر کہتی تھیں ۔ " ہا ہماری ساس ان کی ارواح نہ شرمائے نتھنوں چنے چبوا دیئے " میں ان کی بہوؤں کا ذکر کرتا ہوں ۔ تو کہتی ہیں ۔ " آج کل کی بہویں اچھال چھکا دیدے کی ۔ گھر میں گھڑی بھر نہیں ٹکتیں ۔ میاں کو ساتھ لیا اور پارٹیاں اور کلب اور بائیسکوپ کا تماشا دیکھنے جا رہی ہیں " ان کی ان باتوں پر میں کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہوں ۔ شاید یہ خاندانی عورتوں کی فطرت ہے کہ ہر بات میں میاؤں پر اعتراض ، بہوؤں پر اعتراض ۔ یہ پڑھی لکھی پوت بہویں جو ہیں یہ ساس کا ذکر بھی نہیں کرتیں ۔ ان کی بھی بہویں جب ہوں گی ۔ تو ان کے ساتھ کیا سلوک کریں گی ۔ کیا معلوم ۔ ہم کہاں جیتے ہوں گے جو دیکھیں گے ۔ مگر یہ قیاس ہے کہ یہ بہوؤں کے ساتھ رہیں گی بھی نہیں ۔ یہ سب جھگڑے ایک ہی گھر میں رہنے سے نکلتے تھے ۔ الگ الگ رہیں ۔ وقت وقت سے ملتے رہیں ۔ تو نفرت نہیں بڑھتی اور زندگی جہنم نہیں ہونے پاتی ۔

میں سوچتا ہوں کہ اس میں ہم مردوں کی بھی خطا تھی ۔ عورت کو ایسا بند کر کے رکھا تھا ۔ کہ میاں کے سوا اس کے سامنے کوئی ہوتا ہی نہ تھا ۔ ہر کام کے سلسلے میں بس میاں ہی دکھائی دیتا تھا ۔ لہٰذا وہ بیوی کے ہر تیر کا ہدف تھا ۔ اس کی زندگی جہنم نہ ہو جاتی تو کیا ہوتا ۔ یہ پوتوں اور نواسوں نے اپنی بیویوں کے ہاتھ میں گھر کا سب کام دے دیا ہے ۔ اپنی سب آمدنی دے دی ہے اور آزادی دے دی ہے

کہ جو ضرورت ہو اپنے آپ لے آئیں۔ ان کو میاں کو پریشان کرنے کی کیا ضرورت۔ اور پھر تفریحات کے لئے بیوی سے ہٹ کر کسی رنڈی کے پاس جانا ہوتا تھا۔ اب میاں بیوی ساتھ تفریحات میں جاتے ہیں۔ ہمارے ساتھی اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ بیٹوں اور دامادوں کو بھی اس روش پر کچھ نہ کچھ اعتراض ہے۔ حالانکہ کچھ کر نہیں سکتے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ تو بہت اچھا ہے وہ زندگی جہنم جو تھی۔ اس سے تو نجات مل گئی ہے:

وہ عجب زمانہ تھا۔ عورت مرد سے سیدھی طرح بات بھی نہ کرتی تھی۔ ہر وقت ایک قسم کی جھلاہٹ یا افسردگی اس کی ہر بات سے نکلتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کوئی بھوت اس میں سمایا ہوا ہے۔ جو زبردستی اُسے بلوا رہا ہے۔ جب کبھی ان کی بولی کا خیال کرتا ہوں۔ تو "ارے یہ کیا کیا" "اے مردے یہ کیا کر دیا؟" "اسے میں بیٹھی تھی میری نہ سنی" "اے نوج ایسا مُردُوا ہو!" جو جو زمانہ گذرتا گیا۔ "ارے" "ہائے" میں بدلتا گیا۔ "ہائے یہ ہو گیا" "ہائے میں بیٹھی تھی۔" "بیٹھی تھی" کس قدر زبان پر تھا ان مرحومہ کے۔ آجکل کی لڑکیاں اس کے مطلب بھی نہیں سمجھتیں۔ چلو اچھا ہوا۔ وہ ہر وقت بیٹھی تھیں۔ ان کو معلوم ہی نہیں بیٹھی تھی کے کیا معنے ہوئے؟ —

بقیہ "یوکلپٹس"

(صفحہ نمبر ۲۸ سے آگے)

وہ رو بھی نہ رہی تھی۔

جب تابوت کو قبر میں رکھ کر اس پہ مٹی ڈالی گئی۔ تو وہ لمحوں کا ایک ڈھیر بن گیا۔ ایک ٹیلہ سا۔ لیکن کندن کہاں تھی۔ تھوڑی دیر میں کندن چلی آئی۔ اس کے ہاتھ میں سرو کا ایک پودا تھا۔ جسے وہ جڑوں سمیت کہیں سے کھود لائی تھی۔

"یہ اسے لگا دو، ماں۔"

ماں کے ہاتھ سے کُھرپی گر گئی۔ اس نے ایک تیز نظر سے یوکلپٹس کے پیڑ کی طرف دیکھا اور پھر بیٹی کی آنکھوں میں — اور پھر اپنے مٹی سے اَٹے ہاتھوں کے ساتھ بیٹی سے لپٹ گئی اور زار زار رونے لگی۔

کچھ دیر بعد سب باتوں سے فارغ ہو کر ماں سہاگن نے کہا "بیٹیا! اب تو شادی کر لے۔"

کندن نے ماں کی نظروں میں نظریں ڈالتے ہوئے کہا "تم نے کیوں نہ کی ماں؟"

"تم جو تھیں — میرا سب کچھ۔"

اور کندن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پرکاش پنڈت

سیپ۔ کراچی۔

بدلو

مہندر کو بمبئی آئے قریب قریب ایک برس ہو چکا تھا۔ لیکن مکان کا مسئلہ اس ایک برس میں حل ہوتا نظر نہ آتا تھا کہ مہینے کی بندھی ہوئی آمدنی اور خرچ متوازن نہ ہو۔ تو ایک ڈاکٹر سے بیماری کا جھوٹا سرٹیفکیٹ لے کر بمبئی کے مجبور شہریوں کی طرح رستم جی مہراب جی کے سینے ٹوریم میں جا بسا، باندرہ میں اس کے دوست رماکانت کے پاس — جو ایک کامیاب پروڈیوسر تھا۔ کافی بڑا فلیٹ تھا۔ اور کئی بار مہندر کو اپنے یہاں اُٹھ آنے کو بھی کہا — لیکن ساتھ رہنے میں دوستی میں فرق آئے گا۔ ایک تو اس خیال سے اور دوسرے اس خیال سے کہ دونوں کے معیارِ زندگی میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ وہ اب تک رماکانت کو ٹالتا رہا تھا۔ لیکن جب سینے ٹوریم کی مدت نکل گئی۔ اور ڈاکٹر نے دوبارہ سرٹیفکیٹ دینے سے انکار کر دیا۔ تو چار و ناچار اس نے کانت کی پیش کش کو قبول کر لیا۔ اور باندرہ کے اس شاندار فلیٹ میں منتقل ہو گیا۔

باندرہ — جیسا کہ بمبئی والے جانتے ہیں۔ ایک طرح سے فلمی لوگوں کی بستی ہے۔ دلیپ کمار یہاں رہتا ہے۔ مینا کماری اور مدھوبالا اور نلا سنہا بھی یہیں رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ ادشا کرن جیسی آرٹ آف ڈیٹ ایکٹریس اور اس کا اپ ٹو ڈیٹ بنگلہ بھی باندرہ کی زینت ہے اور باندرہ میں رہتے ہوئے ان لوگوں سے ملاقات ہونا اور مہندر کا احساسِ کمتری کا شکار ہونا لازم و ملزوم باتیں تھیں۔ لہٰذا معمولی آمدنی کے سٹیل فوٹو گرافر مہندر نے تیسرے دن ہی محسوس کر لیا۔ کہ اسے یہاں نہ آنا چاہئے تھا۔ اور اب آ گیا ہے تو جلد از جلد یہاں سے چلے جانا چاہئے اور اس نے اور بھی شدت کے ساتھ مکان کی تلاش شروع کر دی۔

مکان کی تلاش — دو مہینے کی مزید دوڑ دھوپ کے باوجود مکان کے بجائے مہندر کی تلاش ہی غیب میں رہی۔ البتہ اس غربت میں وہ اپنے پیشے سے اور خود اپنی ذات سے متنفر سا ہو گیا۔ لکھنؤ کی زندگی کیا بُری تھی۔ جہاں وہ فوٹو گرافر نہیں آرٹسٹ کہلاتا تھا۔ رہنے کو معقول گھر اور عام زندگی کی تمام آسائشیں میسر تھیں اور ہر طبقے میں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اور یہاں "پگڑی" اور کئی کئی مہینے کے پیشگی کرائے کی پیش کش پر بھی جب مالک مکان کو پتہ چلتا تھا۔ کہ وہ فلم کے کسی شعبے سے متعلق ہے تو اُسے ایسی مکروہ نظروں کا شکار ہونا پڑتا تھا جیسے وہ کرائے پر دکان نہ مانگ رہا ہو دہلیز پر کھڑا کوئی بھک منگا صاحبِ خانہ کو بد دعائیں دے رہا ہو اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ ایک مہینے کے اندر اندر اگر اسے کوئی مکان نہ ملا تو وہ بمبئی چھوڑ کر واپس لکھنؤ چلا جائے گا۔

لیکن ایک ایک دن کرکے یہ مہینہ بھی نکل گیا۔ لیکن مکان نہ ملا۔ اور رماکانت کے اصرار کے باوجود اس نے سامان باندھنا شروع کر دیا۔ گاڑی شام کو چھوٹتی تھی۔ اور رماکانت وقت سے پہلے آنے کا وعدہ کرکے اسٹوڈیو جا چکا تھا۔ کہ دروازے پر پہلے ہلکی سی دستک دی اور پھر گندمی رنگ کی ایک نوجوان زرشچین لڑکی بے دھڑک کمرے میں گھس آئی۔

گھر میں چونکہ ملازم موجود تھے اور رماکانت لڑکیوں کا شوقین تھا۔ اس لئے مہندر کو زیادہ تشویش نہیں ہوئی۔ سامان باندھتے باندھتے بڑی بے تعلقی سے اس سے کہہ دیا، رماکانت جی گھر پر نہیں ہیں۔

لڑکی نے گویا اس کی بات نہیں سنی۔ بڑی بے تکلفی سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "آپ شاید مکان نہ ملنے کی وجہ سے بمبئی چھوڑ رہے ہیں"

"جی ہاں!" اسی بے تعلقی سے مہندر نے کہا۔ "بمبئی بڑا کیلس شہر ہے۔ ہم جیسے سادہ لوگوں کے رہنے کی جگہ نہیں"۔ اور وہ ہولڈال کی بغلوں میں اپنے میلے کپڑے ٹھونسنے لگا۔

لڑکی مسکرائی۔ مہندر بھی مسکرایا۔ بڑی بے پروائی مسکراہٹ تھی۔ دونوں کی۔ ایسی بے معنی مسکراہٹ کے ساتھ عموماً مرد، مردوں سے اور لڑکیاں لڑکیوں سے پیش آتی ہیں۔ کہ ایکا ایک لڑکی صوفے پر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور دونوں ہاتھوں سے اپنے سکرٹ کا گھیرا اچھالتے ہوئے بولی۔ "یہ سامان ابھی رہنے دیجئے اور میرے ساتھ چلئے"۔

مہندر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ کہ لڑکی کیا کہہ رہی ہے۔ البتہ اس کی سڈول اور چکنی پنڈلیوں پر نگاہ پڑتے ہی ہولڈال کی کسی ہوئی پیٹی اس کے ہاتھ میں ڈھیلی پڑ گئی۔

"رتنا جی کو آپ شاید نہیں جانتے" لڑکی نے پھر کہا۔ "لیکن شام کو جب آپ گھومنے نکلتے تھے۔ تو وہ آپ کو دیکھا کرتی تھیں"۔ اور اس نے اپنے پھیلاؤ دار سکرٹ کو اوپر لچکیں کر کے ہاتھ رکھ دیئے اور مہندر کے ہاتھ کی پیٹی اور بھی ڈھیلی پڑ گئی۔

"جوہو میں ان کے کئی مکان ہیں۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ آپ شریف آدمی ہیں اور آپ کو مکان کی ضرورت ہے۔ تو انہوں نے اپنے ایک کرایہ دار کو ——— جس نے پچھلے آٹھ مہینے سے کرایہ نہیں دیا۔ مکان خالی کرنے کا نوٹس دے دیا"۔

پیٹی چھوڑ کر مہندر اٹھ کھڑا ہوا ——— یہ لڑکی کون ہے؟ یہ رتنا جی کون ہیں؟ یہ سب کیا ہے۔ کیوں ہے اور اس نے خالی خالی نظروں سے لڑکی کی طرف دیکھا۔

لڑکی پھر مسکرائی ——— وہی بے معنی خالی خالی سی مسکراہٹ!

"چلئے!" اس نے دوبارہ کہا۔ "رتنا جی آپ سے ملنا چاہتی ہیں!"

آدمی کتنا ہی پریشان کیوں نہ ہو، سڈول اور چکنی پنڈلیوں اور گداز محسوس کولھوں والی کسی نوجوان اور گندمی لڑکی کی قربت بڑی خوشگوار ہوتی ہے ——— بل کھاتی لہراتی بل کھاتی اور نیچے کو اترتی ہوئی سڑک پر اس اجنبی انجان لڑکی کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے مہندر نے محسوس کیا۔ اور اس کے محسوسات اتنے ہوئیں، اتنے گہرے ہو گئے۔ کہ اسے خبر تک نہ ہوئی۔ کہ کب رتنا جی نامی کسی عورت کا گھر آ گیا ہے۔ کب زینہ طے کرکے وہ ڈرائنگ روم میں جا پہنچا ہے۔ جس چیز پر اسے بٹھایا گیا ہے وہ کوئی کرسی ہے، صوفہ ہے یا کوئی تخت ——— لڑکی جب "بیٹھئے" کہہ کے اندر چلی گئی۔ اور اس کے دماغ نے تنہائی کا جھٹکا محسوس کیا تب اسے محسوس ہوا کہ وہ کسی کرسی، صوفے یا تخت پر نہیں قدیم وضع کی ایک مسہری پر پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔ جس کے ساگوانی پایوں تلے پیتل یا تانبے کی زنگ خوردہ کٹوریوں میں پانی بھرا ہوا ہے۔ تاکہ چیونٹیاں وغیرہ اوپر نہ چڑھ سکیں۔

اس لمبے چوڑے کمرے میں سامان کی اتنی بھرمار تھی۔ کہ پہلی نظر میں کوئی چیز بھی نظر نہ آتی۔ ہر چیز سے خستگی اور پرانا پن ٹپکتا تھا۔ بڑے،

بہت بڑے پیانو کی ایک ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی۔ جس کی جگہ میلی اینٹوں کو اوپر تلے جوڑ دیا گیا تھا۔ پرانی کانسی کے بڑے بڑے فلاور اسٹینڈ تھے لیکن پھول کسی میں نہ تھے۔ کھڑکیوں پر مخمل کے بھاری لیکن بوسیدہ پردے جھول رہے تھے۔ اور سامنے کی دیوار پر نہ جانے کس زمانے کا ایک جاپانی کلاک آویزاں تھا۔ جو کسی سن کی کسی تاریخ کو دن کے یا رات کے گیارہ بجا کر وہیں رک گیا تھا۔ اسی دیوار کے نیچے فرش کے سہارے ایک قد آدم نسوانی تصویر کھڑی تھی جس کا کینوس تو کہیں کہیں سے پھٹ گیا تھا۔ لیکن پھیکے ہوئے رنگوں کی تابناکی برقرار تھی۔

مسہری پر بیوقوفوں کی طرح بیٹھے رہنے کی بجائے وہ اٹھ کر اس تصویر کے پاس جا کھڑا ہوا۔ خوبصورت بیضوی چہرے پر کاغذی بادام کی سی ساخت والی موٹی موٹی آنکھیں شاید اپنے حسن پر فخر سے مسکرا رہی تھیں۔ ستواں ناک کی پھنگی کے نیچے بھرے بھرے رسیلے اور چمکدار ہونٹ کچھ اس طرح پھڑکتے ہوئے سے محسوس ہوتے تھے۔ گویا ابھی اولین بوسے کی آنچ کھائی ہو۔ لمبی گردن کے نیچے۔ جسے کتابی زبان میں صراحی دار گردن کہا جاتا ہے۔ حلقوم کے دونوں طرف مرمر ایسی شفاف جلد میں ابھری ہوئی اور دو پرکشش گڑھے بناتی ہوئی نازک ہڈیوں کی قوسیں۔۔

یکایک اُسے خیال آیا کہ اس عورت کو اس نے کہیں دیکھا ہے۔ دھندلے دماغ پر زور ڈالتے ہی اُس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا

"رتنا؟"

ہاں یہ اس مشہور فلم اسٹار کی تصویر تھی جو کسی زمانے میں ہزاروں لاکھوں دلوں پر حکومت کرتی تھی۔ جس کا نام لے کر نوجوان آہیں بھرتے تھے۔ اور اس کے فوٹو آنسوؤں سے سینچتے تھے۔ اُسے یاد تھا۔ کہ لکھنؤ کے جس سینما ہال میں بھی رتنا کی فلم لگتی تھی۔ بے پناہ ہجوم کی وجہ سے سینما ہاؤس کے دروازے اور کھڑکیاں ٹوٹ جاتی تھیں اور منتظمین کو پولیس کی مدد لینی پڑتی تھی۔

"رتنا!"

ایک بار پھر اُس نے زیر لب دہرایا۔ کیونکہ اُسے یاد آیا۔ کہ چودہ برس کی عمر کے باوجود وہ خود رتنا پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ اور گھر سے پیسے چرا چرا کر رتنا کی ہر فلم کئی کئی بار دیکھا کرتا تھا۔ اور آج بیس برس کے بعد کیا اتفاق تھا کہ اسی رتنا نے خود اسے اپنے گھر بلایا تھا۔

کھٹکا ہونے پر جب وہ مڑا تو عورت قسم کی جس چیز پر اس کی نظر پڑی اُسے دیکھتے ہی وہ بوکھلا گیا۔ کوئی چار من وزنی تھلتھلاتا ہوا دیو ہیکل جسم جس کا انگ انگ بڑے بے ہنگم طریقے سے جڑا ہوا۔ لیکن الگ نظر آتا تھا۔ چہرے پر غازے کی موٹی موٹی تہوں کے باوجود جھریوں کا جال ابھرا ابھرا پڑتا تھا۔ اور خوفناک حد تک بڑی بڑی آنکھوں میں لال ڈورے تیر رہے تھے۔۔ یہ تھی رتنا!

رتنا نے بڑے مضحکہ خیز تحکم سے اُسے مسہری پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور اس کرسچن لڑکی کو جس کا نام لوبو تھا چائے لانے کو کہا اور خود ادھر اُدھر ٹہلتے ہوئے مکان کے سلسلے میں وہی کچھ دہرا دیا۔ جو لوبو اس سے پہلے مہندر کو بتا چکی تھی۔

"تم دوسرے تیسرے دن یہاں آکر پتہ کرتے رہا کرو" اسی بھونڈی تمکنت کے ساتھ ٹہلتے ٹہلتے وہ مہندر کے بالکل قریب آ گئی۔ اتنا قریب کہ الفاظ کے ساتھ ساتھ اُس کے منہ سے نکلا ہوا بدبو کا ایک ہولناک بھبکا سیدھا مہندر کے نتھنوں میں جا گھسا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ تمیز کر سکتا کہ یہ بدبو پائیوریا کی تھی یا کسی نشہ آور مشروب کی۔

رتنا اپنا اوٹ پٹانگ جسم تھلتھلاتی اندر چلی گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی لوبو چائے کی کشتی لئے آ پہنچی۔ سب کچھ بڑے ڈرامائی انداز سے ہو رہا تھا۔ لوبو نے بڑی نفاست سے مہندر کے لئے چائے بنائی۔ صرف ایک چمچہ شکر لینے پر مصنوعی سے تعجب کا اظہار کیا اور ضرورت مندوں کو مکان دلوانے کے سلسلے میں بڑی تفصیل سے رتنا جی کی رحمدلی بلکہ دریادلی کے قصے سنائے۔ چلتے وقت مہندر نے یونہی مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ تو اُس نے بڑی گرمجوشی کا ثبوت دیتے ہوئے رتنا کے الفاظ دہرائے۔ کہ ہر دوسرے تیسرے دن یہاں آکر پتہ کرتے رہئے اور بہت کرکے پندرہ دن کے اندر اندر آپ کو مکان مل جائے گا۔

مکان تو خیر دس پندرہ دن کے اندر نہیں ملا۔ لیکن مکان کے بجائے مہندر کو ایک اور نعمت غیر مترقبہ مل گئی۔ سڈول چکنی پنڈلیوں اور گھاؤ دار بھاری کولھوں والی وہ کرسچین لڑکی، جس کے بدن سے جوانی کی مہک پھوٹی پڑتی تھی۔ اور جس نے دوسری ملاقات میں ہی اپنا اسکرٹ اٹھا اٹھا کر مہندر کو اتنا مشتعل کر دیا تھا۔ کہ مہندر نے بے اختیار اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں بھینچ لیا تھا۔ اور پھر اس ہاتھ کو تابڑ توڑ چومنا شروع کر دیا تھا۔

اگلی ملاقات میں ہاتھوں کی جگہ ہونٹوں نے لے لی۔ رتنا چونکہ پہلے دن کے بعد پھر کبھی ڈرائنگ روم میں نہ آئی تھی۔ اس لیے بے کھٹکے طویل بوسوں اور طویل ہم آغوشیوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ توبو کی باتوں سے اور اس کی مجنونانہ حرکتوں سے اندازہ ہوتا تھا۔ کہ رتنا کے بجائے وہ خود شام کے وقت مہندر کو ٹہلتے ہوئے دیکھا کرتی تھی۔ اور خود اسی نے رتنا سے مکان کی سفارش کر کے یہ ناٹک رچا ڈالا تھا۔ حقیقت کچھ بھی ہو، مہندر نے طے کر لیا۔ کہ مکان ملے نہ ملے اب وہ بمبئی نہیں چھوڑے گا۔

وہ شاید چوتھی پانچویں ملاقات تھی جب گرم اور جوان بوسوں کی سرشاری سے توبو کی آنکھیں مُند گئی تھیں، ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ اور گٹھیلے نمکین بدن کا انگ انگ ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ کہ رک رک کر بڑی وارفتگی سے اُس نے کہا۔ اس طرح ایک دو گھنٹے میں اُس کی طبیعت نہیں بھرتی۔ اس کا جی چاہتا ہے پوری رات اُس کے پاس رہے اور وہ اسی طرح اس کی مضبوط باہوں میں جھولتے جھولتے اس کی بالوں بھری چھاتی پر سر رکھ کر سو جائے۔

مہندر ابھی سوچ بھی نہ پایا تھا۔ کہ اس مقصد کے لئے وہ کسی ہوٹل کا انتخاب کرے یا رما کانت سے درخواست کہ خود توبو نے یہ عقدہ حل کر دیا۔ اسی سرمست آواز میں اُس نے کہا کہ رتنا جی بہت جلد سو جانے کی عادی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ نیند کی گولیاں بھی کھاتی ہیں اگر کل رات کے دس بجے وہ پڑوسیوں کی نظر بچا کر اور آہستہ قدموں سے زینہ طے کر کے اوپر آ جائے تو ڈرائنگ روم کا دروازہ اُسے کھلا ملے گا۔ اور اس کھلے کمرے میں بڑی بے تابی سے انتظار کرتی ہوئی خود ملے گی۔

دوسرے دن مہندر نے صبح سے کیسے شام کی اس کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ایسی کیفیت سے گذرے ہوں۔ دن میں دو بار اس نے کھرچ کھرچ کر حجامت بنائی۔ گھنٹوں کپڑوں کا انتخاب کرتا رہا اور بال سنوارتا رہا اور آنے والی رات کے لذت آمیز تصور سے اپنے خون کی گردش تیز کرتا رہا۔ جیسے تیسے ایک ایک پل گن کر رات کے دس بجے اور وہ بن سنور کر خوشبوئیں لہراتا کوئے جاناں کی طرف روانہ ہوا۔

ہر قدم اطمینان بخش تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی کتا نہیں بھونکا۔ کسی پڑوسی کی نظر نہیں پڑی۔ زینہ چڑھتے وقت جوتے ذرا سا چرچرائے لیکن فوراً اس نے قدم سنبھال لئے۔ پنجے تلے قدموں سے زینہ طے کر کے لمحہ بھر کے لئے وہ دروازے پر رکا۔ اپنے حواس درست کرنے کے لئے نکٹائی کی گرہ ڈھیلی کی۔ اور پھر آہستہ سے دروازے کو دھکیل دیا۔

ہر بات طے شدہ پروگرام کے مطابق ہو رہی تھی۔ کیونکہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ لیکن توبو کے سانسوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ بڑھا۔ آگے اور آگے۔ جہاں دن کے وقت مسہری ہوتی تھی۔

"آؤ میری جان!" کسی نے اُسے کلائی سے کھینچ کر گوشت کے تھلتھلاتے سمندر میں گرا لیا۔ اور اس کے ساتھ ہی بدبو کا ایک ہولناک بھبکا اس کے نتھنے چیرتا ہوا سیدھا دماغ میں جا گھسا۔

مسعود مفتی

سویرا۔ لاہور

عورت!

ایک تو بوڑھا، دوسرے حاجی اور وہ بھی گاؤں کا اکلوتا، نوجوان چھوکروں کی زندگی عذاب میں تھی۔

حاجی صاحب نے حج کیا۔ اللہ نے ان پر رحمت کی۔ مگر وہ اس حج کو بری طرح چپکے، جیسے رحمت سے ایک نقطہ چپک کر اسے زحمت بنا دیتا ہے۔ صبح شام مکے مدینے کا ذکر کرتے۔ اس گھڑی کو کوستے جب وہاں سے چلے تھے اور ان لوگوں کو کوستے جن کے درمیان واپس آئے تھے۔ اپنے لئے تو وہ بلاشبہ رحمت تھے۔ مگر ہمارے چھوٹے سے گروپ کے لئے زحمت بن گئے۔

وجہ یہ تھی کہ وہ اصلاح کے موڈ میں آگئے تھے۔ اور وہ بھی بالکل اسلامی روایت کے مطابق کہ ہر بوڑھا ساٹھ سال پورے کرتے ہی اُن لڑکوں کی اصلاح پر تُل جاتا ہے۔ جو پندرہ سے پچیس برس کے بیچ میں ہوں۔ ستاروں کا لکھا یوں ہوا کہ حاجی صاحب اس روایت کی پہلی شرط پوری کرتے تھے۔ (حج اس کے علاوہ تھا) اور ہم لوگ دوسری۔ چنانچہ وہ جیسے ہی وہ ہم میں سے کسی کو کسی جگہ کسی انداز میں بھی دیکھ پاتے۔ ڈانٹنا شروع کر دیتے۔ اور اگر کہیں پورا گروپ نظر آجاتا۔ تو ان کی دانست میں اسلام خطرے میں آجاتا۔

صدیوں سے باطن کا حال اللہ میاں پر چھوڑ کر ہم لوگ ظاہری اصلاحات میں الجھے رہے ہیں۔ چنانچہ حاجی صاحب نے بھی اس اصلاح کا پہلا سبق اسوۂ حسنہ پڑھانا چاہا۔ اصل فلسفے کا تو ہمیں علم نہ تھا۔ مگر جب کنویں کی منڈیر پر بیٹھ کر انھوں نے ایک گھنٹہ تک ہم سب کو بزورِ شمشیر دوبارہ مشرف بہ اسلام کرنا چاہا۔ تو ہم سمجھے کہ داڑھی، پٹے دار بال، ڈھیلی ڈھالی پگڑی، ٹخنوں سے اونچی شلوار، بغیر کالر کے قمیض اور سرمہ والی آنکھ کا مجموعی نام اسوۂ حسنہ ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں بڑا ڈر لگا۔ جنت تو ناممکن ہو ہی گئی۔ مگر یہ زندگی بھی محال نظر آنے لگی۔ حاجی صاحب نے پہلے تو لکچر جھاڑا۔ پھر ہم سے سچے مسلمان بن جانے کا عہد لیا۔ اسوۂ حسنہ پر عمل کرنے کے لئے ایک ہفتہ کی مہلت دی اور نماز قضا ہونے کا شکوہ کرتے چلے گئے۔

کاتے نے ایک چپٹی سی چپت شفیع کے نئے منڈے ہوئے سر پہ جمائی اور بولا "مومنو! رکھو سر پہ پٹے!"

تیجے نے بھی آگے بڑھ کر شفیع کے سر کی چمکتی ہوئی کالی جلد کو چوما۔ اور پھر سینے سے لگا کر ایسی آہ و فغاں کرنے لگا۔ جیسے کوئی جوان موت ہو گئی ہو۔

مگر شفیع نے اس کے پیٹ میں گدگدی کی اور وہ کھلکھلا کر پیچھے ہٹ گیا۔

کاتے نے ہنستے ہوئے پیچھے کو دبوچ لیا۔ اُس کے کندھے پر سوار ہوا اور بازو لہرا لہرا کر پکارا "حاجی مومن!"
"مُردہ باد!" سب نے پھیپھڑے کھول کر نعرہ لگایا۔
پھر ہم سب کنوئیں کے پیپل کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ گئے اور حاجی صاحب کا نام لے لے کر بڑی بڑی پھڑکدار گالیاں تصنیف کیں ـــــــ

حاجی صاحب سے ہمیں شکایت یہ تھی۔ کہ انہوں نے ہمیں ان چیزوں سے منع کیا تھا۔ جو اُن دنوں ہمارے خاص شوق تھے۔ ہم چار، پانچوں اُس دور میں تھے۔ جہاں کسی کی مسیں پھوٹ رہی تھیں۔ کوئی بازوؤں کے پٹھوں کو گیند بنانے پر تلا تھا۔ کوئی پھوٹتی ہوئی سرسوں کو دیکھ کر شام کے دھندلکے میں بے اختیار ماہیا الاپنے لگتا۔ ہم جیبوں میں کنگھیاں رکھتے تھے۔ اور حجام کا شیشہ ہو۔ ریت سے مانجھی ہوئی چمکیلی گاگر ہو یا ساکن تالاب۔ ہر چمکیلی چیز میں اپنا چہرہ دیکھنے کو دل چاہتا۔ اور ہم نئے نئے انگریزی طرز کے بال ماتھے پر سنوارنے لگتے۔ سوائے شفیع کے جو سر پہ استرا پھروا کر گھنٹوں آم کی گٹھلی رگڑا کرتا اور پھر ہلکا پھلکا سا اڑتا ہوا چلنے لگتا۔ دھوتی تو ہم ہمیشہ سے باندھتے تھے۔ مگر اب چلتے چلتے جسم گھما کر پیچھے دیکھتے۔ کہ نچلا کنارا ایڑی سے چھوتا ہے یا نہیں۔ گلے میں لال ٹپکے باندھتے۔ گریبان کے اوپر والے بٹن کھلے رکھتے۔ اور جب کھلے کھیتوں میں مل کر ماہیا گاتے، تو افق کے پھیلاؤ میں پریاں سرگوشیاں کرتی معلوم ہوتیں۔

پھجا حاجی صاحب پر بہت خفا تھا۔ وہ سب سے کم عمر تھا۔ اور اُس کے چہرے پر ابھی مہاسے نکلنے شروع نہ ہوئے تھے۔ بلکہ نرم نرم ریشمیں بال قلموں کے نیچے پھیلتے پھیلتے رخساروں پر ہلکی سی سبزی لیپ رہے تھے۔ اور اوپر والے ہونٹ پر تھوڑا تھوڑا دھواں جا نظر آتا تھا وہ چوتھے پانچویں روز شریف حجام کی دکان پر جاتا۔ پانی میں انگلیاں تر کر کے چہرے پر رگڑتا رہتا۔ پھر جب شریف استرا لگا کر نرم بال ملائی کی طرح اتارتا۔ تو پھجا سرور سے آنکھیں بند کر لیتا۔ اور سارا دن گھومتے پھرتے رخساروں پر اپنا ہاتھ چلاتا رہتا۔ مگر اب کی جو شریف حجام کی دکان پر کھڑے ہو کر اُس نے چکنے گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ تو انگلیاں دباتے ہوئے اُس نے بے اختیار حاجی صاحب کو گالی دے دی اور بولا۔
"اتنے سالوں کے انتظار کے بعد تو یہ وقت آیا ہے کہ یہ مزے ہیں اور یہ کہتا ہے کہ داڑھی رکھو۔"

مہلت کا ہفتہ گزر گیا۔ اور باقی کئی ہفتے ہم نے ایسے گزار دیئے۔ کہ جہاں حاجی صاحب نظر آئے۔ ہم لپک کر ساتھ والی گلی کی بغل میں۔ گلی نہ ہوتی تو اچک کر قریب ترین درخت پر، اور وہ بھی نہ ہوا تو جو بھی دروازہ ملا۔ اُس میں ایسے گھسے، جیسے گوالا باری میں سپاہی خندقوں میں گھس جاتے ہیں۔ جان بھی بچ جاتی ہے اور کسی ماسی کو سلام کرنے کا ثواب بھی مل جاتا۔ چند ہی دنوں میں ہم نے یہ ثواب اتنا کما لیا۔ کہ حاجی صاحب ہمارے لئے اسوۂ حسنہ کا ثواب غیر ضروری سمجھنے لگے۔

اب ہمارے گروپ اور حاجی صاحب کے درمیان باقاعدہ سرد جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔ جنگ کا صحیح اندازہ ہونے کے لئے طرفین کے جملہ کوائف سے واقفیت ضروری ہے۔ اس لئے اپنے تعارف کے طور پر عرض کر دوں۔ کہ ہمارا چار پانچ افراد کا گروپ گاؤں کے بگڑے ہوئے لونڈوں کی روایت آگے چلانے والا تھا۔ پھجے نے پانچویں جماعت میں سال کے شروع میں اسکول سے بھاگنا شروع کیا تھا۔ اور سال کے اختتام تک پورا بھاگ گیا تھا۔ اُس وقت سے آج تک زندگی کے مطالعے میں مصروف ہے۔ میں اور کاما آٹھویں میں فیل ہونے کے بعد اُس کے ساتھ شامل ہوئے اور شفیع کو اکھاڑے کی گیلی مٹی ایسی بھائی کہ دنیا کے باقی کام دھرے رہ گئے۔ ہم کھیتوں پر واجبی سا کام کرتے یا کبھی مویشیوں کے لئے پٹھے لے آتے۔ باقی وقت اکٹھے گھومتے رہتے، کبھی کنوئیں کے پیپل کی چھاؤں تلے، کبھی پیر چھتّے شاہ کے مزار کے سائیں کے پاس، کبھی یونین کونسل کے دفتر کے گرد۔ اور کبھی لوگوں کے گڈوں میں گھومتے رہتے۔ ہمارے گروپ کا لیڈر شفیع تھا۔ ایک تو عمر میں بڑا ہونے کی وجہ سے اور دوسرے زراعت کے انسپکٹر صاحب سے واقفیت کی وجہ سے بھی کیونکہ اُن کے گھر میں ریکارڈ بجانے والی مشین

تھی۔ اور ہم سب وہاں جا کر گانے سنا کرتے تھے۔ یہ پروگرام شفیع کی دست گیری کے بغیر نہ چل سکتا تھا۔

گاؤں کی رائے عامہ نے ابھی ہمیں لا علاج نہیں مانا تھا۔ لیکن ہمارا ذکر کرتے وقت اللہ کی مرضی اور والدین کے بڑے مقدر کے فلسفہ کا حوالہ ضرور دیا جاتا۔ حالانکہ کسی معترض کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ کہ اپنے والدین کی عمر کو پہنچنے پر ہم ان سے بہتر نہ ہوں گے۔ مستقبل کا حال کسے معلوم۔ بس اسی ایک نقطہ پر ہمارا گاؤں بزرگوں سے اختلاف رائے تھا۔ باقی تو کوئی خاص بات نہ تھی۔

حاجی صاحب سے سرد جنگ تھی۔ تو وہ ہر وقت ہمیں سدھارنے اور اس طرح اپنی عاقبت سنوارنے کی فکر میں رہتے۔ مگر ہمیں اُن سے اتنی چڑ ہو گئی تھی۔ کہ ہم اُن کو جنت میں بھجوانے میں کوئی مدد نہ دینا چاہتے۔ چاہے اس عدم تعاون کی سزا میں ہمیں خود جہنم آباد کرنا پڑے مقابلہ کڑا تھا۔ چند دن اپنے اپنے انداز میں زور آزمائی ہوئی۔ اور جب حاجی صاحب نے تنگ آ کر اسوہ حسنہ کی پیش کش واپس لے لی۔ تو ہم پہلا راؤنڈ جیت گئے۔

مگر دوسرے راؤنڈ میں حاجی صاحب کا حملہ ایسا سخت تھا۔ کہ ہم مات کھا گئے۔ انہوں نے ڈاکٹروں والی ترکیب کی۔ کہ چند جراثیم مارنے کے لئے سارے پانی میں ہی لال دوائی ڈال دو چنانچہ جو لال دوائی انہوں نے تجویز کی وہ یہ تھی۔ کہ گاؤں کے سب لڑکوں کو مولوی صاحب قرأت پڑھایا کریں۔

"بھئی دیکھو نا!" حاجی صاحب بڑی فخریہ عاجزی سے کہتے "کہ اگر ہم لوگ کلام اللہ کا تلفظ ہی درست کر لیں۔ تو چاہے اور کچھ بھی نہ کریں جنت کے حقدار ہو جائیں گے"

پھر وہ اس موضوع پر کتنی ہی حدیثیں سُنا ڈالتے۔ اور ہم حیران ہوتے رہتے۔ کہ حج پر جانے سے پہلے تو اُن کو ایک حدیث بھی نہ آتی تھی۔ نہ معلوم اب زندگی کے ہر مسئلے پر سینکڑوں حدیثیں کہاں سے سیکھ لیں۔ ہم سمجھتے تھے۔ کہ حج پر جا کر دوسرے امتحانوں کی طرح لوگ حدیثوں کا امتحان دیتے ہیں اور حاجی صاحب کی بڑی کاریگری ہے۔ کہ وہ تین ماہ کے عرصے میں اتنا لمبا اور مشکل کورس پاس کر آئے ہیں۔ اور اب انھیں ہزاروں حدیثیں زبانی یاد ہیں۔

بہر حال ہوا یوں کہ کچھ عرصہ بعد گاؤں میں باقاعدہ اسکول جاری ہو گیا۔ جہاں صبح کے وقت مولوی صاحب سب لڑکوں کو قرأت سکھایا کرتے۔ حاجی صاحب خود بھی وہاں آتے۔ اُن کے ہاتھ میں پتلی سی چھڑی ہوتی۔ جو لڑکا "ق" اور "ح" کو حلق سے ادا نہ کر سکتا وہ اُسے مارتے۔ اس کے علاوہ انہوں نے گاؤں میں جبری بھرتی کی ایک مہم شروع کی۔ جس میں لڑکوں کی بجائے ان کے باپ قابو کئے اور ان کے دیہاتی جوتے کے بے دریغ استعمال نے بچوں کو اسکول کا راستہ دکھایا۔ گاؤں کی فضا میں یہ لال دوائی اتنی موثر ثابت ہوئی کہ ہمارے کھلنڈرے پن کے جراثیم بھی مر گئے اور ہم سب سوائے پنچھے کے اسکول میں جا کر باقاعدہ قرأت سیکھنے لگے۔

پنچھا البتہ بڑا باغی نکلا۔ اس پر سب ہتھیار بے سود ثابت ہوئے۔ باپ نے جوتے مارے۔ حاجی صاحب نے حدیثوں سے مارا۔ گاؤں کے لڑکوں سے پٹائی کرائی۔ ہم عمر بچوں سے سوشل بائیکاٹ کرایا۔ ماں کا اسلام کا واسطہ دے کر دو وقت بھوکا رکھا۔ دوکانداروں سے کہا کہ اسے کوئی مٹھائی وغیرہ نہ دیں۔ مگر پنچھا ہر ایک کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑا ہو جاتا۔ اور حاجی صاحب کی ذات شان اور ان کے عقائد اور نصیحتوں کے متعلق ایسی ایسی باتیں کہنے لگا کہ سب لوگ اُسے کافر کہنے لگے۔ اور اگر میں وہ سب باتیں یہاں لکھ دوں تو لوگ مجھے بھی سنگسار کر دیں گے۔ آپ جانتے ہیں۔ کہ مسلمان لوگ اُٹھتے بیٹھتے اسلام کے احکام کی خلاف ورزی کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی زبان سے اسلام کو کچھ کہے تو اُسے قتل کرنے پر تُل جاتے ہیں۔ اس لئے بھلا میں کیوں پنچھے کی کہی ہوئی باتوں پر قتل ہو جاؤں۔ بس آپ سمجھ جائیں کہ اس نے کیا کیا کہا ہو گا۔ کیونکہ اسے بڑی غلیظ گالیاں دینے کی عادت تھی۔

بابا اب بھی ہمارے گروپ میں باقاعدہ شامل تھا۔ ہم کنویں پر اکٹھے نہاتے۔ شفیع کے ساتھ اکھاڑے پر اکثر جاتے شریف حجام کی دکان پر حاجی صاحب بھی داڑھی پر استرا لگوانے جاتا۔ ہم ساتھ ہوتے۔ مگر جب ہم قرأت کے سبق کے لئے جاتے تو وہ ہمارا ساتھی نہ بنتا۔ کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ ہم مکتب کو چلے تو وہ بھی ہنستا کھیلتا ساتھ ہو لیا۔ مگر جیسے ہی اس گلی میں پہنچتے۔ وہ بگٹٹ بھاگ جاتا۔ ایک دفعہ ہم نے مذاق میں اسے پکڑ لیا۔ کہ زبردستی مکتب لے جائیں گے۔ مگر اس نے سچ مچ غصے میں آ کر اتنی لڑائی کی کہ میرا کان چھل گیا۔ شفیع جیسے پہلوان کے گھٹنے پر چوٹ آ گئی۔ کامے کی انگلی کا ناخن ٹوٹ گیا۔ اور خود پھجے کو کئی خراشیں آئیں۔ اس کے بعد ہم اسے وہاں تو نہیں لے گئے مگر وہ کئی دن ناراض رہا اور بعد ازاں مکتب کے وقت پر ہمارے قریب نہ پھٹکتا۔

پھجے کا باپ اس کی وجہ سے بہت تنگ تھا۔ گاؤں کے سارے لوگ اسی پر اعتراضات کرتے۔ کہ وہ اپنے گھر میں اللہ اور رسول کا نام نہیں چلا سکتا۔ اور بیٹے کے لچھنوں کی وجہ سے اسلام کی توہین کر رہا ہے۔ پھجے کا باپ اس وجہ سے بھی زیادہ شرمندہ ہوتا۔ کہ کرنے والے اپنے بیٹوں کے قرأت سیکھنے کا ذکر اس انداز میں کرتے گویا ان کے پاس مومن ہونے کا سرٹیفکیٹ ہے۔ ایک دن کسی ایسے ہی آدمی کی بات پر چڑ کر اُس نے پھجے کو بازار میں پکڑ کر اتنا مارا کہ اس کے جسم پر نیل پڑ گئے۔ حاجی صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ دوسرے لوگ پھجے کو بچاتے تھے مگر حاجی صاحب ان کو روکتے۔ اور کہتے۔ کہ نفس کی اصلاح کے لئے ہر قسم کی سختی جائز ہے۔

ہم اپنے کندھوں پر اٹھا کر پھجے کو گھر لے گئے۔ تو اس کی ماں نے رو رو کر پرانے لحاف سے روئی نکالی اور اس پر ہلدی اور میٹھا تیل لگا کر پھجے کی چوٹوں پر لگایا اور ساتھ ساتھ حاجی صاحب کو برا بھلا بھی کہتی گئی۔ پٹی باندھنے میں ایک دفعہ اُس کا ہاتھ سخت پڑا تو پھجا چلایا ـــــ

"اے ماں! میں مر گیا!"

تو ماں نے جھنجھلا کر ایک دوہتڑ اُس کے سر پر مارا۔ اور چیخ کر بولی "مرتا بھی تو نہیں۔ تجھے موت لے۔ کیوں نہیں مولوی صاحب کے پاس جا کر پڑھتا تو؟"

مولوی اور پڑھنے کا نام سنتے ہی پھجے کی سسکیاں غائب ہو گئیں۔ اور وہ ایسے غرور سے تن کر بیٹھ گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں اور اسے مار پیٹ کی کوئی پروا نہیں۔ اور ہوا بھی یہی۔ چوٹیں ٹھیک ہو کے پر پر کسیوں میں تو کئی مہینے بھرمارہا۔ مگر قرأت پڑھنے نہیں گیا۔

ایک دن مکتب میں ہمیں حاجی صاحب نے بتایا۔ کہ انہوں نے اپنے ایک اور حاجی دوست سے جو شہر میں رہتا ہے کچھ ریکارڈ لئے ہیں۔ یہ ریکارڈ عرب شریف سے آئے تھے۔ اور ان میں بڑے بڑے علماء کی تلاوت بھری تھی۔ اُسی شام مغرب کی نماز کے بعد زراعت کے انسپکٹر صاحب کے ہاں مشین پر بجائے جائیں گے۔

ہم نے شرارت یہ کی کہ پھجے سے جا کر کہا کہ آج شام زراعت کے انسپکٹر صاحب کے گھر مشین پر ریکارڈ بجائے جائیں گے۔ جس میں ہیر وارث شاہ، عبدالستار کی یوسف زلیخا اور جھنگڑے کے گیت ہوں گے۔

پھجے نے گالوں پر ہاتھ پھیرا اور مسکراتا ہوا سر جھٹک کر کہنے لگا:

"ضرور چلیں گے بادشاہو ہم بھی!"

شام کو انسپکٹر صاحب کے گھر کے سامنے کھلی گلی میں چھڑکاؤ ہوا۔ نم نم گیلی مٹی کی سوندھی خوشبو ہر طرف پھیل گئی۔ ایک دری بچھائی گئی جو ہم لڑکوں کے لئے تھی۔ دری کے ایک کنارے پر دو تین چارپائیاں بچھائی گئیں۔ سب سے پہلی پر کھیس بھی بچھا تھا۔ دری کے دوسرے کنارے پر چند کرسیاں رکھی گئیں۔ جن میں کسی کی ٹیک اور کسی کی سیٹ لکڑی کی تھی۔ کسی کا بازو ٹوٹا تھا۔ اور کسی کی سُرخ ٹانگ پر سفید دیار کا

جوڑتھا۔ ایک کرسی پر میلی سی گدی بچھی تھی۔ یہ حاجی صاحب کے لئے تھی۔

یہ سارا کام مکتب کے بچوں نے کیا۔ اور پیجے نے بڑی گرم جوشی سے حصہ لیا۔ کیونکہ اُسے کسی نے نہیں بتایا تھا۔ کہ ریکارڈ کس قسم کے ہیں۔ اور وہ سمجھتا رہا کہ وہ ہیر وارث شاہ سنے گا۔

شام کو جب سب لوگ آگئے اور حقے گڑگڑانے لگے تو انسپکٹر صاحب نے باجا کھولا۔ سبز رنگ کے گول چکر کو برش سے صاف کیا۔ اس پر ریکارڈ جمایا۔ اس کو صاف کیا۔ باجے میں چابی بھری اور جب سوئیوں کی ڈبیا کھولنے لگے۔ تو ہم پیجے کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے۔ اور اُسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔

انسپکٹر صاحب نے سوئی گھوستے ہوئے توے پر رکھی تو ایک لمبی سی سرسراہٹ ابھری اور پھر پایاب ندی کے پھسلتے ہوئے پانی کی سی نرمی کے ساتھ قاری کی آواز فضا میں لہرائی۔

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم !

وقفہ پڑا تو حاجی صاحب جھوم کر بولے۔

"سبحان اللہ!"

قرأت جاری ہی تھی پیجے نے حیرت سے ہم لوگوں کی طرف دیکھا۔ ہم سب سر نیچے ڈال کر ابلتی ہوئی ہنسی کو دبانے کے لئے ہلکورے لینے لگے پھر چند ثانیوں بعد کچھ سمجھ گیا۔ موٹی اُسی گالی اگلتے ہوئے اُس نے اُٹھنا چاہا۔ مگر ہم سب تیار تھے۔ اُسے وہیں جکڑ لیا۔ وہ ہمیں گالیاں دیتا ہوا، چھڑانے کی کوشش کرتا رہا۔ اور ہم اپنے چہروں کو کھڑے گھٹنوں میں دبائے اُس کو روکے رہے۔

"اے ادب سے بیٹھو ملعونو!" حاجی صاحب گرجے۔

"کون ہے شور کرنے والا؟" مولوی صاحب قرأت والے ماحول میں ڈانٹنے کا حق اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔

ہم سب دبک گئے مگر پیجے پر اپنی گرفت ڈھیلی نہ کی۔ اور وہ کچھ دیر مقابلے کے بعد ٹھنڈا ہو کر بیٹھ گیا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ہم سب کو باری باری گالیاں دیتا رہا۔

چند ریکارڈوں کے بعد انسپکٹر صاحب نے نیا ریکارڈ لگایا تو سب چونک اُٹھے۔ اس مرتبہ مرد کی بجائے عورت کی آواز تھی۔ اور وہ بڑی خوش الحانی سے تلاوت کر رہی تھی۔ انسپکٹر صاحب گتے کے ڈبے میں پڑے ریکارڈ اُلٹ پلٹ کر دیکھتے رہے اور پھر ڈبہ بند کرتے ہوئے بولے۔

"باقی سبھی ریکارڈ اسی کے ہیں!"

اگلا ریکارڈ لگایا تو مولوی صاحب بولے: "سبحان اللہ! یہ تو سورۂ رحمان ہے۔"

انسپکٹر صاحب نے بتایا۔ کہ یہ سورہ تین چار ریکارڈوں پر مسلسل ہے۔ "پھر تو مزے آجائیں گے" حاجی صاحب کرسی میں پہلو بدلتے ہوئے بولے، "ایک کے بعد دوسرا لگائے جاؤ جی!"

اور پھر واقعی مزے آگئے اُس عورت کی آواز بڑی سُریلی تھی۔ تلفظ میں بہت نکھار تھا۔ اور آواز کا اُتار چڑھاؤ بہت متناسب تھا سورۂ رحمٰن میں ایک آیت کا تکرار ہے۔

فبای الاء ربکما تکذبٰن

اور جب وہ بار بار اس آیت کو دہراتی تو بہت بھلی لگتی۔ کافی دیر تک ہم لوگ تلاوت سنتے رہے اور پھر رات گئے گھروں کو واپس

آئے۔ راستے میں کئی لڑکے مکتب کے سبق کی بلند آواز میں تلاوت کرنے لگے۔

ہمارا مکتب ہفتے میں دو دن ہوتا تھا۔ اگلے دن باری تھی۔ میں گھر سے دیر میں نکلا۔ اور راستے میں بیلوں کی لڑائی دیکھنے رک گیا۔ اس لئے جب وہاں پہنچا تو چھٹی ہو چکی تھی۔ اور مولوی صاحب باہر نکل کر جوتا جھاڑ رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر میں گلی کے کونے میں چھپ گیا اور جب چلے گئے تو میں مکتب کی طرف گیا۔ کہ شاید وہاں شیفتہ اور کاما موجود ہوں۔

مگر وہاں ایک عجیب ماجرا دیکھنے میں آیا۔ سارا مکتب خالی تھا۔ ایک کونے میں پیجا سر پر رومال باندھے دوزانو بیٹھا تھا اور قرأت کا پہلا سبق بلند آواز میں بڑی تندہی سے پڑھ رہا تھا۔ میں حیرت سے کھڑا دیکھتا رہ گیا۔ پیجے نے مجھے دیکھا مگر اپنے سبق میں مصروف رہا میں تھوڑی دیر تک تماشا کرتا رہا۔ پھر قریب جاکر زور سے ایک دھپ اس کی کمر پر لگائی۔

"ابے پیجے تجھے تلاوت سے کیا کام؟"

پیجا خاموش رہا۔ مگر جب میں نے دوبارہ ٹھوکا دے کر پوچھا۔ تو اس کی آنکھیں شرمیلے انداز میں میری طرف اٹھیں۔ پھر ہولے ہولے بند ہو گئیں۔ وہ اپنے تازہ منڈے ہوئے رخسار پر ہتھیلی پھیلانے لگا۔ اور بڑے سرور بھرے لہجے میں گنگنایا۔

فبای الاء ربکما تکذبن

فہمیدہ اختر

ہم قلم - کراچی

رقصِ تن

ہمیشہ کے بالکل برخلاف اس روز اس راہ پر وہ بے حد افسردہ تھی۔ بے حد سنجیدہ اور سوچوں میں ڈوبی ہوئی سی۔ فضاؤں میں کوئی رعنائی نہیں تھی۔ کوئی جاذبیت نہیں تھی۔ کوئی نغمہ بلند نہیں ہو رہا تھا۔

کشورکشاؤں کے راستے کے یہ پیچ و خم؟ یہ زندگی میں بھی پیدا ہو سکتے ہیں؟ اگر یہ بھول بھلیاں نہ ہوں تو یہ شاہراہ کتنی دلنشین ہو! زندگی کتنی حسین ہو؟ کائنات کتنی رنگین ہو؟!

وہ رات ــــ ؟؟ ہاں وہ رات جو اس نے دریائے سوات کے کنارے مدین ہوٹل میں گزاری تھی۔ اس رات ہی نے تو اس کی زندگی میں گرہیں ڈال دیں؛ ورنہ اس کی زندگی کی رہ گذر کتنی صاف تھی؟ کتنی کشادہ! کتنی منظم! اس پر کوئی [illegible] نہیں تھا۔ کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔

وہ اسکول میں پڑھتی تھی۔ جب کہ اس نے گھر میں شہریار کا نام سنا تھا۔ جب مہربان دادی نے یہ کہا تھا۔ کہ اس کی عمر ہی کتنی ہے؟ تو اسے کتنی خوشی ہوئی تھی؟ ــ کالج کے دور میں اس نے زبیر، نالش، حبیب اللہ، اکرم بھٹہ وغیرہ کے نام لئے تھے جنہیں گھر کے لوگوں نے رد کر دیا تھا۔ اور ہر رد میں اس کے لئے کتنی طمانیت ہوتی تھی ــ :: وہ بی اے کا امتحان ہی تو تھا۔ جس کے اختتام پر وہ تفریح کے لئے اپنے ماضی کے اس محبوب مقام "خیبر" پک نک پر آئی تھی۔ ان پہاڑوں پر پہلے کی طرح اُن دنوں بھی کتنی شان پائی ہوئی تھی کتنی سطوت برس رہی تھی اُن پر، کتنا وقار ٹپک رہا تھا اُن سے۔ نہ جانے اس کے دل میں اس خیال نے کیسے جنم لیا تھا کہ وہ ــ وہ۔ تو پہلے سے موجود ہے۔ اور ان پہاڑوں کے پیچھے ہی تو ہے ــ ؟ ان ہی کی طرح حسین، رنگین و بارعب!

اور پھر کچھ وقفے کے بعد جب گھر میں نخشب اور سلیم، داؤد، اور یوسف وغیرہ کے نام بڑی اہمیت کے لئے گئے تو وہ یہ سمجھتی رہی کہ یہ تو محض ایک مذاق ہے۔ وہ ـ وہ تو ازل سے موجود ہے خیبر کے اُس طرف، دور کسی اجنبی دنیا میں!!

وہ جنوری کا مہینہ تھا۔ سہ پہر کے قریب وہ اپنے کمرے میں گرم صندلی پر بیٹھی تھی۔ کہ دادی جان آگئی تھی۔ اس کے بشرے کے رنگ میں معانی کے رنگ پوشیدہ تھے۔ چند لمحوں تک وہ یوں چپ بیٹھی رہی تھی۔ کہ جیسے کوئی خاص بات کرنے کے لئے موقع کی تلاش میں ہے۔ آخر کو پوچھتے ہوئے بولی۔ "پھر کیا خیال ہے تمہارا؟"

وہ جان بوجھ کر انجان بن گئی تھی۔ "کس سلسلے میں؟"

"وہی نخشب کے سلسلے میں ۔۔ خان بابو کو تو وہ بہت پسند ہے اور خان لالہ کو بھی اور سب کو۔"

اس کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ وہ چپ چاپ کتاب پڑھنے لگی تھی۔

قدرے انتظار کے بعد روحیہ ڈرتے ڈرتے پھر بولی تھی۔ "نہیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ وہ ہر لحاظ سے اچھا ہے۔"

اس نے غصہ سے ورق الٹتے ہوئے جواب دیا تھا۔ "تو پھر اس کے لئے ہر لحاظ سے کوئی اچھی سی لڑکی بھی تلاش کر لو۔"

جب روحیہ چلی گئی تھی تو وہ ہولے سے ہنس دی تھی۔

اگر نخشب اس کے کمرے میں آ جائے تو جانے ان کتابوں اور رسالوں کو کس غیر فنکارانہ طریقے سے اٹھائے اور بے ترتیبی سے رکھ دے اور وہ بھی یقیناً بغیر پڑھے۔ ان کی وہ کوبھی جو جدید تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ اس میں کسی جگہ بھی کوئی کتاب نظر نہیں آتی۔ وہ ایک کامیاب افسر بھی لیکن وہ رومی کو کیا جانتا ہے؟ خیام کو کیا سمجھ سکتا ہے جو غالب کو کیا پہچانتا ہے؟ توبہ توبہ! ایسے انسان کے ساتھ میری زندگی سسکتے ہوئے ہی گذر سکتی ہے۔

اور پھر اس کی نظروں میں خیبر کے پہاڑ تیزی سے گھومنے لگے تھے۔ وہ آئے گا ۔۔ وہ آئے گا ہاتھوں میں خیام کی قبر پر سے زرد آلوؤں کے پھول تھامے ہوئے۔ حافظ کے شعر گنگناتا ہوا اس کی نگاہوں میں رومی اور رحمن بابا کے کلام کی تمام عظمت چھائی ہوگی اس کی پیشانی پر عرفی کے غرور کی ساری چمک موجود ہوگی۔ اس کے انداز میں فیض، بیدل اور نظیری کے فن کی ساری باریکیاں رچی بسی ہوں گی۔ اس کی گفتار پر غزالی، رازی اور ابن سینا کا سا فلسفہ غالب ہوگا۔ اور خوشحال خان خٹک کی روح کا سارا درد رکھنے والے اس کے قدم خاقانی اور سلیمان کے زندانوں کی دیواروں کو گرانے والے ہوں گے۔

اس کا دل پکار اٹھا تھا۔ میں اس کا انتظار کروں گی ۔۔ انتظار ۔۔ ہاں انتظار۔

پھر اسے سلیم یاد آ گیا تھا ۔۔ وہ بڑا زمیندار ۔۔ وہ تلخی سے مسکرا دی تھی۔ سورج جب سر پر آ جائے تو اس وقت اٹھنے والا سلیم ۔۔ کالج میں اس کی بہنیں کتنے فخر سے کہا کرتی تھیں۔ کہ گل لالہ تو اتنے شریف ہیں۔ اتنے نیک ۔ کہ حجرے میں بھی کم جاتے ہیں۔ لوگوں سے بہت کم تعلق رکھتے ہیں۔ بس سارا سارا دن اپنے کمرے میں لیٹے رہتے ہیں۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بے اختیار ہنس دے۔ سلیم بھی بھلا کوئی انسان ہے ۔۔ آباؤ اجداد کی دولت پر سانپ کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھنے والا بے حس، بے حرکت! خدا کے بندوں سے گریزاں! اور پھر فوراً اس کا دل گنگنانے لگتا تھا ۔ اور ۔۔ اور خیبر کے اس پتھریلے سلسلہ ہائے دراز کے پیچھے رہنے والا، عمل اور حرکت کا بندہ محبت اور خلوص کا پیکر ۔۔ ایمان اور نیکی کا مجسمہ! جب تازہ دم سورج مسکرا کر اس پرانی کائنات کو دیکھنا چاہتا ہے۔ اس پر سے سیاہ چادر کھسکنے لگتی ہے اور سپید سا دریا نظر آنے لگتا ہے جس کے پیچھے اجالوں کا سیلاب بہہ نکلنے کے لئے مضطرب ہوتا ہے اس وقت وہ جاگ اٹھتا ہے۔ ایک خاص انداز سے اپنی نورانی پیشانی پر سے بال ہٹاتا ہے۔ اور پھر مسکرا کر فضاؤں کو دیکھتا ہے ....

.... فضائیں بھی مسکرا پڑتی ہیں۔ اناری سورج ایک جھٹکے کے ساتھ اونچے اونچے پہاڑوں کے پیچھے سے نمودار ہوتا ہے اور ہر طرف روشنیاں پھیل جاتی ہیں۔

پھر اچانک اسے یوسف کا خیال آ گیا تھا۔ یوسف، جس کے حق میں گھر کے سب افراد ہیں۔ اور جسے سب بہت زیادہ پسند کرتے ہیں۔ جو ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اونچے مرتبے پر ہے اور جس کے متعلق سب کہتے ہیں۔ کہ وہ بڑا خوبصورت ہے۔ دراز قد ۔ صحت مند جسم پیازی ۔۔ پیازی رنگت۔ سبز سبز موٹی موٹی آنکھیں ۔۔ مگر گھر کے ان لوگوں کو کیا معلوم کہ تعلیم کے زمانے سے اس کے بارے میں

میں کتنے افسانے مشہور ہیں ؟ اس نے بیک وقت کتنی لڑکیوں سے شادی کے وعدے کئے تھے۔ کتنی لڑکیوں کو بے وقوف بنایا تھا۔ اور وہ فرمانہ وہ تو رو رو کر کھلم کھلا زمانے کو بتاتی ہے۔ کہ جب گھر اور گھر سے باہر میرا ٹھکانہ نہ رہا اور میں نے یوسف سے جلد شادی کرنے کو کہا۔ تو بگڑ کر بولا۔ " میں تم جیسی لڑکیوں سے شادی کر سکتا ہوں ؟"

پیاری فرمانہ ــ کتنی نادان لڑکی ہے۔ اپنی زندگی کو کتنا ارزاں کر دیا۔ اور سنا ہے یوسف یورپ سے چھ ایسی البم لایا ہے۔ جن میں خوبصورت خوبصورت لڑکیوں کی تصویریں ہیں۔ اور کہتا ہے یہ سب میرے ساتھ شادی کرنے کے لئے بے چین تھیں۔ مگر میں دامن چھڑا کر آ گیا۔ اسے اپنی شفیق دادی یاد آ گئی تھی ۔ بچاری دادی ــ جوانی پردے میں گزار دی، بڑھاپے میں تسبیح اور مصلّے کو اپنے سے جدا نہ کیا۔ انھیں دنیا کا کیا پتہ ؟ ؟ جب ہی تو کہتی ہیں، کتنا شریف ہے یوسف۔ تین سال ولایت میں رہا اور وہاں سے بیوی نہ لایا اور وہ بشیر۔ زاہد۔ اختر وغیرہ چھ چھ ماہ کے لئے گئے۔ اور سفید سفید بے نمک لڑکیوں کو ساتھ لے آئے۔

جو دوسروں کے جالوں میں پھنس گئے۔ وہ غیر شریف ٹھہرے اور جو دوسروں کے لئے جال بچھاتا رہا وہ شریف رہا۔

اور پھر اس نے سوچا تھا۔ کہ یوسف کی نظریں کتنی آلودہ ہو سکتی ہیں۔ کتنی آلودہ ــ اور چہرے کی فطری آب و تاب کتنی ماند ہو سکتی ہے ؟ وہ خیبر کے ان پہاڑوں سے دور کی دنیا کا باشندہ ہے ؟ وہ جب کسی نہایت خوبصورت لڑکی کے قریب سے بھی گزرتا ہوگا۔ تو کس شانِ بے نیازی سے گزرتا ہوگا ؟ اور اس کے چہرے کی قدرتی چمک میں کتنی توانائی ہوگی، کتنی کشش ؟ کتنی رونق ؟ کتنی معصومیت ؟۔

اس نے قدرے گھبرا کر کار کا جائزہ لیا۔ خان آغا بڑے مطمئن انداز میں کار چلا رہے تھے۔ ان کے قریب اگلی سیٹ پر بیٹھی گلناز لیبول کا جائزہ لے رہی تھی اور اس کے پاس پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا ننھا گل آغا اونگھ رہا تھا۔

ہاں تو اس شام روحیہ کے چلے جانے کے بعد وہ احمد خٹک کو بھی تو نہیں بھولی تھی۔ اس نے غور کیا تھا۔ کہ وہ ایک کامیاب وکیل سہی۔ معزز خاندان سے سہی۔ باذوق اور اچھی سیرت کا سہی ــ لیکن ان کے ہاں خواتین جب گھر سے باہر قدم رکھتی ہیں۔ تو مردوں کی اجازت سے۔ ایک پیسہ خرچ کرتی ہیں تو مردوں کی رضا سے۔ خدا بچائے ایسے گھر سے جہاں زندگی دبی دبی سی رہے۔ اور وہ خیبر کا ہمسایہ ؟ ــ اچانک اس کے دل نے سوال کر دیا تھا۔ اور پھر خود ہی جواب دیدیا تھا۔ وہ زندگی کی تمام اقدار سے کس قدر پیار کرنے والا ہوگا ؟ کس قدر احترام کرنے والا ــ

اس کی فکر نے داؤد کا بھی تو احاطہ کیا تھا۔ بات بات پر غضبناک ہو جانے والا داؤد ــ اس کی خاندانی وجاہت اور علمی شخصیت کس کام کی ؟ اور وہ خیبر کا دوست ؟ جیسے چپکے سے اس کے کان میں کسی نے کہہ دیا تھا۔ اس کی ہر بات میں گلیات کے چشموں کا ترنم ہوگا۔

اس کی نظریں علی مسجد کے پاس گہرائیوں میں بہتے ہوئے چمکیلے پانی پر پڑ گئیں۔ دریائے سوات کا پانی بھی تو اسی طرح چمکتا ہے ؟ آہ وہ اس کے کنارے مدین ہوٹل والی رات

سورج قریب کے اونچے پہاڑ کے پیچھے ڈوب چکا تھا۔ شام کے دھندلکے بڑھنے لگے تھے۔ ہر طرف گہرا سکوت چھا گیا تھا۔ اور دریائے سوات کے پانی کا شور بڑھ گیا تھا۔ ہوا میں خوشگوار ٹھنڈک پھیل گئی تھی۔ وہ اور نزہت دیر تک اوپر جنگلے کے پاس کھڑی رہی تھیں۔ اور پھر نیچے اتر آئی تھیں۔ اور دریا کے کنارے گھومنے لگی تھیں۔ نزہت اسے چپ چپ سی لگی تھی۔ جیسے کسی گہری سوچ میں ہو ــ اُس نے پوچھا تھا۔ " کیا سوچ رہی ہو تم ؟"

" سچ کہوں تو تمہارے متعلق ہی سوچ رہی ہوں "

" میرے متعلق ؟"

"ہاں!"
"کیا؟"
"یہی مستقبل کے بارے میں!"
"کیسا مستقبل؟"
"ہر لڑکی کی زندگی ایک مستقبل رکھتی ہے۔"
وہ بے نیازی سے بولی تھی "اگر اس میں سوچنے کی کیا بات ہے؟"
نزہت نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔ "یہ زندگی کا اہم مسئلہ ہے!"
"اگر موزوں انسان مل جائے تو ٹھیک ہے ورنہ یہ ایسا سوال نہیں ہے جسے اوڑھنا بچھونا بنا لیا جائے۔"
نزہت اصل موضوع کی طرف آ نکلی تھی۔ "موزوں انسان سے تمہاری مراد کیا ہے؟" اس نے مطمئن انداز میں جواب دیا تھا شاید یہ کہ وہ مرضی کے عین مطابق ہو۔"
نزہت نے سامنے اس پکی سڑک پر نظریں جما دی تھیں۔ جو دو پہاڑوں میں سے گزر کر قلام تک جاتی ہے: "تو تمہاری مرضی کیسا انسان چاہتی ہے؟ کیسی شکل و صورت؟ کیسا مزاج؟ ملازمت، تجارت؟ بیکاری؟"
وہ ہونے سے مسکرا دی تھی "یہ بتا کر اس کے سراپا اور کردار کو کیوں آزردہ کروں۔ وہ تمہاری نظروں میں رقصاں ہو جائے گا۔ تم اس کے بارے میں اوروں سے بیان کرتی پھرو گی۔ اور یوں وہ "
نزہت نے اس کے فقرے کو کاٹ دیا تھا۔ "افسانوی باتیں نہ کیا کرو۔ زندگی عمل کا نام ہے عملی گفتگو کرو۔"
چمکیلا چاند پہاڑ کے اُس طرف سے نمودار ہو گیا تھا۔ اور پہاڑ کے اوپر کے حصے پر نورانی دھندسی چھا گئی تھی۔ وہ اس دھند کا نور اپنی روح میں بھرتے ہوئے بولی: "جب اپنے خیال کا اظہار چاہتی ہوں تو تم آگے سے بولنے نہیں دیتیں۔"
نزہت الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولی تھی۔ "یہ خیال کا اظہار ہے یا خواب کی باتیں؟"
"آؤ چاندنی کی باتیں کریں۔ دیکھو پہاڑ کی چوٹی پریوں کا دیس معلوم ہوتی ہے۔"
نزہت کا انداز ناصحانہ تھا۔ زندگی کے چند سال اور موجودہ صورت میں گزرنے دو۔ پھر تم سے پوچھوں گی۔ کہ چاندنی میں کتنا حسن ہے اور پریوں کا حسن کتنی کشش رکھتا ہے۔"
اس نے ہنس کر نزہت کے شانے پر سر رکھ دیا تھا۔
"پھر کیا ہوگا"
"پھر تمہیں خیال آئے گا جس نے اپنا مستقبل قائم نہ کیا، اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ قانونِ فطرت سے روگردانی معیار قائم نہیں کر سکتی۔"
وہ دبدبے سے بولی تھی۔ "میں ملازمت کر لوں گی۔"
نزہت نے ہلکا سا قہقہہ لگایا تھا۔ "اگر خدانخواستہ ملازمت کے دوران کسی دائمی بیماری نے آگھیرا تو پھر کیا کرو گی؟"
اس کے لہجے میں متانت پیدا ہو گئی تھی "تو تمہارا کیا خیال ہے کہ جو سامنے آئے اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیئے جائیں؟"
نزہت کی آواز قدرے بلند ہو گئی تھی۔ "سلیم کی حیثیت سامنے آنے والے کی ہے! یوسف ایرا غیرا ہے، نخشب کوئی راہگیر

ہے ... "

اس کا لہجہ نرم مترنم ہو گیا تھا: "وہ خیبر کے پہاڑ ... "

"کیا کہا؟"

وہ گھبرا گئی تھی۔ "یہ تو میرے ناول کا عنوان ہے:"

"بس تم ناول کی دنیا میں گُم رہنا۔ "خیبر کے پہاڑ اور سوات کے دریا"

وہ ہنس دی تھی۔ "گلیات کے چشمے اور کاغان کے آبشار"

نزہت کا انداز تمسخرانہ تھا۔ "گلزیرہ بیوی آج کل کی حالت کا مطلب ہے۔"

"کوئی خاص نہیں!"

نزہت کی آواز میں جوش بھر گیا تھا۔ "اس کا توانا اور خوبصورت جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کی یہ کیفیت کیوں ہے؟ — یہ محض اس لئے کہ اچھے اچھے رشتے آئے، مگر شادی سے برابر انکار کرتی رہی۔ کہتی تھی۔ خدا محافظ ہو ان کا میرے سات بھائی ہیں۔ میں اُن کے پاس رہوں گی۔ مجھ سے غیروں کی غلامی نہیں ہو سکتی۔ جب تک ماں باپ زندہ رہے گھر میں عزت رہی۔ ان کے بعد ہر بھاوج نے اسے اپنے پر بوجھ تصور کیا۔ بھائیوں نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ اگر بہن کے ہاں رہ رہی ہے اور کہیں اور ہوتی تو دلجوئی بھی بہت کرتے ہیں۔ تو کیا ہوا بہن کے ہاں کا پانی کا ہر قطرہ اس کے لئے بچھو کا ڈنک ہے اور روٹی کا ہر نوالہ زہر سے بھرا ہوا ہے۔"

نزہت کی زبان سے اس حقیقت کو محسوس کر کے وہ پریشان ہو گئی تھی۔ خیبر کے اونچے اونچے پہاڑ وہ رنگین گھے تھے۔ امیدیں ساری کشش کھو بیٹھے تھے۔ اس بار اس کی قائم کی ہوئی دنیا میں زلزلہ آگیا تھا۔ وہ۔ ہمدم ہمدم ہو گئی تھی۔

چاند اور بلند ہو گیا تھا۔

چمکیلی کرنیں ابھرتی ڈوبتی لہروں پر پڑنے لگی تھیں۔ یوں لگنے لگا تھا۔ جیسے بڑی بڑی سنہری مچھلیاں کبھی ڈبکی لگا دیتی ہیں۔ اور کبھی سطح پر آجاتی ہیں۔

کچھ دیر تک وہ دونوں ٹہلتی رہی تھیں۔ گر چپ خاموش پھر وہ دونوں اوپر آگئی تھیں۔ نزہت تو کمرے میں چلی گئی تھی۔ اور وہ جنگلے پر جھک سی گئی تھی۔

پہاڑ کی بلندیوں پہ چند کچے کچے سے مٹی کے مکان تھے۔ اور ان کے قریب ایک لہلہاتا ہوا کھیت اور اس سے نیچے ایک اور — پھر ایک اور کھیت۔ پہاڑ کے سینے میں بنے ہوئے ان اوپر نیچے کھیتوں کو وہ دیکھنے لگی تھی۔ کتنا سکون چھایا ہوا ہے ان کھیتوں پر؟ — مگر یہ اس کی زندگی کس طوفان سے دوچار ہو گئی؟ یہ کیسی قیامت ہے جس سے اس کا ذہن اور دل ہمکنار ہو گئے۔

اسے رحمت، رضیہ اور ممتاز وغیرہ یاد آگئی تھیں۔ کرنل جبار کے گھر جاؤ تو اجنبی کیسے سمجھ سکتا ہے۔ کہ یہ میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس یہ کام کاج میں مصروف رحمت یہ کرنل جبار کی بہن ہے۔ یہ سزا اسے اس لئے مل رہی ہے۔ کہ والدین کو کوئی رشتہ پسند ہی نہیں آتا تھا۔ سو شادی نہ ہو سکی۔ رضیہ کی شادی بیماریاں نے اس لئے نہ کی۔ کہ اس کی تیمارداری کون کرے گا۔ نتیجہ یہ کہ ماں کے مرنے کے بعد ایک ہفتہ انجنیئر بھائی کے یہاں گزرتا ہے۔ تو دوسرا ہفتہ ڈاکٹر بھائی کے یہاں۔ جس کے گھر جاتی ہے اپنے لئے نفرت کے جذبات پاتی ہے۔ لیکن بے غیرت بن کر زندگی گزار رہی ہے۔ اور وہ بیمار ممتاز؟ جس کی شادی جانے کیوں نہ ہوئی۔ اور جسے بھاوجوں کی سختیوں نے ہی بیمار کیا۔ مقامی ہسپتال کے جنرل وارڈ میں پڑی ہے اور کوئی پرسانِ حال نہیں۔ اور اس کے بھائی؟ ایک تو کامیاب بزنس مین ہے۔ دوسرا پروفیسر

ہے اور تیسرا۔ ایس پی ہے

چاند مدین ہوٹل کی چھت پر اپنی چمک برسانے لگا تھا۔ اور دریائے سوات پر تاریکی چھا گئی تھی۔ مچلتی ہوئی چمکیلی لہریں جیسے سوگئی تھیں۔ مگر اس کے احساسات اور شدت کے ساتھ جاگ اٹھے تھے۔ اور شدت کے ساتھ۔

منصور کی شادی ہوگئی۔ طفیل کی بھی منگنی ہوگئی۔ مگر داؤد، سلیم، یوسف اور نخشب وغیرہ ___؟ تو پھر ___؟ ان میں سے نسبتاً کون موزوں ہے؟ کون؟ میرے سر کا تاج کون؟ کون؟؟؟"

وہ جھنجھلا کر کمرے میں آگئی تھی۔ اور پلنگ پر لیٹ گئی تھی۔

چمکتا ہوا چاند مدین ہوٹل کی دوسری طرف جھک سا گیا تھا۔ اور روشندان میں جیسے چمکیلی ریت کے ذرّوں نے ایک ہجوم کی شکل میں اس کے پلنگ پر نور سا پھیلانا شروع کر دیا تھا۔ مگر اس کی زندگی برابر پیچ و خم میں گم رہی تھی۔

چاند اداس ہو کر دور چلا گیا تھا۔ اور وہ چمکیلی ریت کا کارواں الٹ کر رہ گیا تھا۔

کار کی رفتار اچانک مدھم ہوگئی۔

اس کی پریشان نظروں نے چونک کر سامنے دیکھا۔

کار سے آگے سبز رنگ کی ایک بس آہستہ آہستہ چڑھائی چڑھ رہی تھی۔

جن یں سے ن ن پتے سے سر باہر نکلا۔ اور پلہ لاوپ دیا

"محا بخیل لالی با وردی"

کہ ڈینز و پلاسرو لاڑم دی رابل شینہ۔

(مجھے اپنے محبوب پر اعتماد ہے اگر اسے نیزوں کے سروں پر سے بھی گزرنا پڑے تو بھی وہ ضرور آئے گا۔

آواز میں گہرا جادو تھا۔

وہ جادو ضمیر پر چھا گیا۔ اس کی ذات پر چھا گیا۔ اس کے چہرے پر سے آندھی گزر گئی۔ اور وہ پرسکون ہوگیا۔ ضمیر کی فضاؤں پر چھایا ہوا دھواں غائب ہوگیا۔ اور ان کی ساری عظمت، شوکت اور رعنائی ایک بار پھر ہنس پڑی۔ دل و دماغ کو دائمی آسودگی بخشنے والا گیت بلند ہوگیا۔

کتنے قدیم ہیں یہ پیچ و خم؟ یہ پتھریلے سلسلہ ہائے دراز؟ اس مقام کی عظمت اور ہیبت ان ہی پیچ و خم سے ہے۔ ان پتھریلے سلسلوں سے ہے۔ تاریخ کو ان ہی کی وجہ سے ایک خاص موڑ ملا ہے۔ ایک نئی زندگی ملی ہے۔ ایک پرشکوہ روح عطا ہوئی ہے۔ فاتحانہ سی ہنسی اس کی آنکھوں میں برس برس پڑی۔ وہ یوسف، وہ نخشب۔ وہ اسلم وغیرہ وغیرہ ___؟ یہ اس کی زندگی کے پیچ و خم۔ یہ پتھریلی رکاوٹیں ان ہی کی وجہ سے تو اس کی ذات کو بلندی ملی ہے۔

وہ بلندیوں کی طرف لپکے گی۔

وہ انتظار کرے گی۔ اس بلند انسان کا۔ زمین و آسمان کی تمام حفاظت کے پیکر کا۔ جو نامعلوم دنیا سے ان اونچے اونچے پہاڑوں کو عبور کر کے آنے لگا۔ ان پر پیچ راستوں سے گزر کر آئے گا۔ وہ اس کا انتظار کرے گی۔ ہاں انتظار! انتظار! انتظار!

نسیم درانی
تخلیق نئی دہلی

پلاسٹک کی گڑیا!

جس روز وہ پیدا ہوا۔ اس کے دوسرے ہی دن اُس کی امی بھی اُسے اس دنیا میں اکیلا چھوڑ کر اپنے شوہر کے پاس چلی گئیں۔
ساجد کی پیدائش سے ایک مہینہ قبل اس کے ابا پر بازار میں سڑک پار کرتے وقت ایک ٹرک ڈرائیور نے اپنے بریک آزمائے تھے۔ ہسپتال لے جانے کی نوبت ہی نہ آئی تھی۔ اور وہیں اُسی وقت اُس کی امی بیوہ بنا دی گئیں۔
ساجد کی دادی کا کہنا تھا۔ کہ ان دنوں جاڑوں کے ساتھ بڑی سخت سردی پڑ رہی تھی۔ جب گھر میں اُس کی آمد کے چرچے ہو رہے تھے آسمان سے کسی روز تو سارا سارا دن اولے برسا کرتے۔ اور اس کی امی کا اس غضب کی سردی میں اولے چبانے کو دل للچاتا۔ لیکن دادی تو امی کو لحاف چھوڑنے ہی نہ دیتیں۔ بات بھی تو ٹھیک ہی تھی۔ ایسی حالت میں امی کا سردی میں پھرنا، چلنا اور اولے کھانا خود ساجد کے لئے کتنا خطرناک ہوسکتا تھا۔ امی نے اُسی کے لئے تو گرم کپڑے اور اون وغیرہ لینے اس کے ابا کو بازار بھیجا تھا۔ اور جب اس کے ابا اپنے گھر، ایک ننھے منے مہمان کی آمد کے متعلق سوچتے، خوش ہوتے واپس آرہے تھے۔ تو ایک ٹرک ڈرائیور نے بیچ سڑک پر ابا کو اور اس کے لئے خریدے ہوئے تمام سامان کو لال رنگ سے رنگ دیا تھا۔ سڑک پر لال لال خون پھیل گیا۔ اور امی کو وہ لال چوڑیاں بھی سل پر مکا کر بیٹے سے توڑ دینا پڑیں۔ جو ابا بڑے چاؤ اور محبت سے خرید کر لائے تھے۔

امی اور دادی کی حالت تو اس وقت بہت ہی خراب ہوگئی تھی۔ جب ابا کی لاش گھر لائی گئی۔ خاص کر اُس کی امی کی حالت تو بہت ہی خراب ہوگئی تھی۔ وہ ابا کے غم میں پچھاڑیں کھا کھا کر گھڑی گھڑی بے ہوش ہو رہی تھیں ۔۔ امی کو ابا کا غم بھی تھا۔ اور آنے والے مہمان کی فکر بھی ۔۔ چند ہی دنوں میں وہ برسوں کی روگی نظر آنے لگی تھیں۔ ان کا چہرہ زردی مائل ہوگیا تھا۔ آنکھوں میں گہرے گہرے گڑھے پڑ گئے تھے اور ان کا خوبصورت جسم کانٹے جیسا ہوگیا تھا۔ انھیں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کسی بانس کو کپڑے پہنا دیئے گئے ہوں۔ ورنہ پہلے جب کبھی وہ سُرخ ریشمی پھول دار قمیض پر سفید دوپٹہ اوڑھتی تھیں۔ تو انھیں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کسی نے ڈھیر سے گلاب کے پھولوں کو سفید جالی دار دوپٹے سے ڈھانک رکھا ہو۔
ساجد کی دادی تو اپنے جوان بیٹے کا غم اپنی بہو کو خوش رکھنے کے لئے برداشت کر گئیں۔ اب ان کی تمام تر توجہ آنے والے ننھے مہمان

پھر کمزور ہو چکی تھیں۔ جو ان کے جوان بیٹے کا نعم البدل تھا۔ دادی ہر وقت امی کی دلجوئی میں لگی رہتیں۔ لیکن امی کو تو ابا کے خیال میں تمام دن غرق رہنے، رونے اور کمزور ہونے کے سوا کچھ آتا ہی نہ تھا۔

اس کے ابا کے انتقال کو ایک مہینہ گزرا تھا۔ کہ ایک دن وہ خود ننھے منے مہمان کی حیثیت سے آن ٹپکا۔ اس کی آمد کی سب سے زیادہ خوشی تو دادی کو ہوئی تھی۔ جیسے انھیں قارون کا خزانہ مل گیا ہو۔ لیکن امی نے اس کی جانب قطعی توجہ نہ دی۔ وہ پلنگ پر امی کے قریب لیٹا چیخ چیخ کر اپنی موجودگی کا اعلان کرتا رہا۔ مگر اس کی امی اس کے چیخنے چلانے کو بھی خاطر میں نہ لائیں۔ البتہ وہ اُسے دیکھ کر بڑی دیر تک روتی رہیں۔ ان کا رونا ایک طرح سے ٹھیک ہی تو تھا۔ ابھی ان کی شادی کو دو برس بھی نہ ہونے پائے تھے۔ کہ بیوہ ہو گئیں۔ ایک ہی دن انھیں رنڈاپا کاٹنے کی فکر اور اس کی آمد سے ایسا صدمہ پہنچا کہ ان کی طبیعت یکدم بگڑ گئی۔ اور پھر ایسی بگڑی کہ سنبھل ہی نہ سکی اور اس کی آمد کے دوسرے ہی دن امی بھی اُسے یتیم کہلوانے کے لیے چھوڑ کر ابا کے پاس چلی گئیں۔ پھر دادی ہی نے اُسے پالا پوسا اور بڑا کیا۔ دادی کو اس سے بے حد محبت تھی۔ اور وہ خود بھی دادی کو بہت چاہتا تھا۔ آٹھ سال کا ہو جانے کے بعد بھی ہر وقت دادی کی گود میں چڑھا رہتا تھا۔

ساجد بہت ہی کم گو اور تنہائی پسند واقع ہوا تھا۔ ہر وقت اپنے کمرے میں بیٹھا نہ جانے کیا کیا سوچا کرتا۔ اور اسی طرح عمر کے ساتھ ساتھ اُس کی عادات میں بھی بتدریج پختگی پیدا ہوتی گئی۔ وہ اور زیادہ تنہائی پسند، کم گو اور چڑچڑا ہوتا ہو گیا۔ اکیلے گھر میں جہاں دادی کے سوا، اور کوئی نہ تھا۔ وہ کرتا بھی کیا۔ اسکول میں بھی اس کی یہی حالت تھی۔ تفریح کے گھنٹے میں بجائے کھیلنے کودنے کے کلاس میں اپنی بنچ پر بیٹھا رہتا۔ اس کے کلاس فیلو بھی اس کی ان عادتوں سے پریشان تھے۔ عام لڑکوں کی طرح نہ وہ شرارتی تھا۔ نہ کھلاڑی اور نہ ہی وہ بہت زیادہ پڑھاکو قسم کے لڑکوں میں شمار ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے کئی لڑکوں نے اُسے "چپ شاہ جی" کا خطاب بھی دے رکھا تھا۔

دادی بھی اُس کی ان حرکتوں سے تنگ آگئی تھیں۔ لیکن اپنی محبت اور لاڈ کے آگے وہ ان باتوں کو زیادہ اہمیت نہ دیتی تھیں۔ وہ خود سوچتی تھیں، گھر میں اور بچے بھی تو نہیں۔ وہ خاموش نہیں رہے تو کیا کرے۔ اکیلا ہی تو ہے بیچارہ ـــ اور یہیں ان کی ساری مامتا اُمڈ آتی اور وہ ـــ میرا دولھا، میرا لاڈلا کہتے ہوئے اُسے گلے سے لگا لیتیں۔

ایک دن کلاس میں بیٹھے ہوئے نہ جانے کیوں اور کس طرح ساجد کا دل بھی چاہا کہ وہ کسی سے بات کرے۔ "مگر کیا بات کروں" وہ سوچنے لگا۔ اُسے باتیں کرنا تو آتا ہی نہ تھا۔ پھر اُسے خیال آیا کہ کل حامد اسکول بھی تو نہ آیا تھا۔ اور وہ ہمت کر کے حامد سے پوچھ بیٹھا۔

"کل اسکول کیوں نہیں آئے تھے حامد صاحب؟"

"اپنی باجی کے یہاں گیا تھا" حامد نے جواب دیتے ہوئے کہا "کل میری بھانجی کی کن چھیدن تھی"

"باجی کے یہاں!" حیرت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ جیسے چودہ سال کی مدت کے بعد آج کوئی بالکل نئی اور انوکھی بات معلوم ہوئی ہو۔

"ہاں ہاں۔ اپنی بہن کے یہاں! اپنی شاہدہ باجی کے یہاں" حامد نے تصدیق کی۔

اور چودہ سال کے بعد اس روز پہلی بار اُسے یہ احساس ہوا کہ اس کی کوئی بہن کوئی بھائی نہیں۔ وہ اتنی بڑی دنیا میں بالکل اکیلا ہے۔ وہ کسی کو نہ باجی کہہ سکتا ہے۔ نہ بھائی جان! اُس کا کوئی بھی تو نہیں۔ پھر اُسے خیال آیا کہ اُس کی دادی تو ہیں۔ کتنی محبت کرتی ہیں؟

اُس سے گھر — اور وہ اپنی عادت سے مجبور ہو کر انہیں خیالات میں گم ہو گیا۔

اسکول سے گھر لوٹتے وقت اس کا یہ احساس شدید ہو گیا۔ گھر کے دروازے پر پہنچ کر اُس نے سوچا۔ شاید اُس کے چھوٹے بھائی بہن اُسے دیکھ کر "بھائی جان" "آ گئے" "بھائی صاحب" آ گئے۔ چلائیں۔ لیکن اس کا کوئی بھائی، کوئی بہن دروازے سے نہ نکل سکا۔ سوائے دادی کے جو اُسے دیکھتے ہی لپٹ گئی تھیں۔ "آ گیا میرا لال"۔

دن بھر اُسے یہی خیال ستاتا رہا۔ رات کو اُس نے لگاتار کتنے ہی خواب دیکھے۔ خواب وہ کتنے ہی بہن بھائیوں میں گھرا خوش ہوتا رہا۔ کبھی وہ اپنی کسی بڑی بہن کو "آپا جان" کہہ کر پکارتا۔ اور کبھی کسی کو زور سے "بھائی جان" کہہ کر آواز دیتا۔ تو کبھی وہ اپنے چھوٹوں کو ڈانٹنے بھی لگتا

اس دوران میں اس کی دادی کی کئی بار آنکھ کھلی اور وہ خاموشی سے ان ہچکیوں کی یاسیت پر سسکیاں بھرتی رہیں۔ دادی خود مجبور تھیں۔ وہ بیچاری کر بھی کیا سکتی تھیں۔ اُن کے خاندان میں کوئی ایسا بھی تو نہیں تھا۔ جہاں اتنے بچے ہوں کہ وہ ایک بچے کو ساجد کی دلجوئی کے لئے اپنے گھر بلوا لیتیں۔ اور پھر خاندان کے لوگوں نے اس کے ابا کے مرنے کے بعد جائیداد کے جھگڑوں کی وجہ سے ملنا جلنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اور اب دادی کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ کہ وہ ساجد کی اس آرزو کو یونہی خوابوں میں دم توڑتا دیکھتی رہیں۔ کراہتی رہیں

اُس دن کے بعد سے تو اس کی یہ حالت ہو گئی۔ کہ اسکول جاتے اور آتے وقت ہر چھوٹے بڑے لڑکے اور لڑکیوں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا کرتا۔ چھوٹے بچوں کو اپنے بڑوں کے ساتھ جاتے دیکھ کر اُس کے دل پر ایک بوجھ سوار ہو جاتا۔ اور اسے اپنے اکیلے ہونے کا شدید طور پر احساس ہونے لگتا۔ اور وہ اس وقت تک وہیں کھڑا رہتا۔ جب تک بچے اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتے۔ اس کی حالت روز بروز پاگلوں کی سی ہوتی رہی۔ یہ دیکھ کر دادی دل ہی دل میں خون کے آنسو روتیں۔ اور جب وہ گھر آجاتا۔ تو اپنے پاس بٹھا کر اس کے بچپن کے قصے سنا سنا کر خوش کرنے کی کوشش کرتیں۔ ساجد کو وہ کھلونے دکھاتیں۔ جن سے وہ بچپن میں کھیلا کرتا تھا۔ اور جن کو اس کی دادی نے اتنے عرصے تک اقتیاط اور حفاظت سے رکھ چھوڑا تھا۔

پھر اچانک ساجد میں ایک نئی تبدیلی ہوئی — حالانکہ اس کی عمر کھلونوں سے کھیلنے کی نہ تھی۔ اس کے باوجود وہ کھلونوں سے دلچسپی لینے لگا تھا۔ وہ ایک ایک کھلونے کو ہاتھ میں لے کر بڑی دیر تک یونہی تکتا رہتا۔ اور پھر ایک اداس مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھر جاتی یہ دیکھ کر دادی سناٹے میں آ گئیں۔ ان کا چودہ سال پرانا زخم ایک بار پھر ہرا ہو گیا تھا۔ دادی نے اس کا علاج کرانا شروع کیا۔ علاج ہوتا رہا۔ لیکن ساجد کی حالت میں کوئی کمی نہ ہوئی اور پھر ایک دن اُس نے دوا پینے سے بھی انکار کر دیا۔ اس روز پہلی بار دادی نے ساجد کو سختی سے ڈانٹا۔ اور ساجد کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ وہ کچھ نہ بولا۔ دوا پی لی اور خاموشی سے بیٹھا خالی خالی چھت کو تکتا رہا۔

دوسرے دن صبح اس کی دادی جب ساجد کو اٹھانے اُس کے کمرے میں پہنچیں۔ تو انہوں نے دیکھا وہ چادر تانے سو رہا تھا۔ دادی نے قریب جا کر اس کے چہرے سے چادر ہٹائی۔ اُس کے چہرے پر آنسوؤں کے گہرے گہرے نشان تھے۔ اس کے قریب ہی ایک گڑیا رکھی ہوئی تھی پلاسٹک کی گڑیا۔ جس سے وہ بچپن میں کھیلا کرتا تھا۔ ساجد کا ایک ہاتھ قریب لیٹی ہوئی گڑیا کے سر پر رکھا ہوا تھا۔ اور وہ — وہ مر چکا تھا!

عفت موہانی

جامعہ نو۔ کراچی۔

بھنور

اونچی دیواروں اور لمبے محرابوں والا شاندار محل یک بیک سکوت اور خاموشی میں دفن ہوگیا تھا۔ سارے ہی لوگ یوں چل پھر رہے تھے۔ جیسے خواب میں حرکت کر رہے ہوں۔ ممی اور خالہ امی بڑے دنوں بعد ایک دوسرے سے ملی تھیں۔ لیکن مسرت کا اظہار اور خوشی کے جذبات پاپا کی طویل اور گہری علالت میں کھو گئے تھے۔

رضیہ!— آپا جی!!۔ دم گھٹتی گھٹتی چیخوں نے مدتوں کے رکے ہوئے احساسات کا اظہار کر دیا تھا۔ ممی اُن کے سینے سے لگی، دھیمے دھیمے رونے لگی تھیں۔

بڑے ہال میں سب اکٹھا تھے۔ پاپا بے داغ سفید بستر پر لیٹے ہلکی ہلکی خاموش ہوجانے والی سانس لے رہے تھے۔ عذرا ان کے سرہانے تھیں، دنیا و مافیہا سے بے خبر.... اللہ کیا یہ چراغ اب گل ہونے کو ہے؟ ان کا چہرہ سفید تھا۔ نوشینہ گھبرائی ہوئی وحشت زدہ نگاہوں سے ایک ایک کو تک رہی تھی۔ جیسے پوچھتی ہو۔ تم سب لوگ۔ کون ہے مہمان کا خیر مقدم یوں احترام سے کرنے لگے ہو۔

طاہر کی دلدوز چیخ سے پتہ چلا کہ..... پاپا نے دنیا چھوڑ دی۔

عذرا باجی کو مدتوں بعد ہوش آیا۔ تو نوشینہ حیران حیران در و دیوار کو تکنے لگی۔ وہی محل تھا۔ وہی صبح و شام تھے۔ مگر پاپا..... وہ سسکیاں بھرنے لگی کھلنڈری نوشی، جس نے اپنی زندگی کے اٹھارہ سال، چند خوشیوں بھرے لمحوں کی طرح گزارے تھے۔ جسے یہ بھی خبر نہ تھی کہ غم کسے کہتے ہیں۔ دُکھ کیا ہوتا ہے۔

خالہ امی کی ضیافت یونہی رہ گئی۔ مہمانوں کے بیٹھنے کے لئے لان پر جو کرسیاں لگائی گئی تھیں۔ ان پر وہ لوگ بیٹھے جو پاپا کے جنازے میں شریک ہونے کے لئے آئے تھے..... دعوت کی وہ لمبی چوڑی فہرست جس پر طاہر للچائی نظریں ڈال چکے تھے۔ پاپا کے تکیے کے نیچے ہی پڑی رہ گئی تھی ......

خالہ امی اپنی بہن کے سوگ میں شریک تھیں۔ ان سب سے دور طاہر باغ کی سنسان روشوں پر عذرا اور نوشینہ کے ساتھ رہا کرتے وہ خالہ امی کے اکلوتے بیٹے تھے۔ خوش مزاج ہنس مکھ اور نیک نفس، خالہ امی کو ان پر ناز تھا۔

"یوں غم کرنے سے کیا حاصل۔ عذرا" وہ عذرا باجی کو بچوں کی طرح سمجھا رہے تھے۔ "اس طرح تو تم خالو پاپا کی روح کی بیقراری کا باعث

بن رہی ہو..... نہ رو پیاری عذرا! وہ ہم میں نہ ہوں۔ ہماری آنکھیں اُن کے جسم کو نہیں دیکھ سکیں۔ مگر وہ تو ہمیں دیکھ رہے ہیں ـــ ان کی روح یہیں کہیں آس پاس ہوگی۔ وہ زندگی میں تمہیں آنسو بہاتے نہیں دیکھ سکتے تھے..... عذرا ..... عذرا دیکھو میں بھی تمہارے ساتھ رونے لگوں گا۔"

اور عذرا باجی خاموش ہونے کے بجائے شدت سے رونے لگتیں۔ نامعلوم سے غم سدا انہیں سوگوار ہی رکھتے۔ جانے کیا بات تھی۔ اُن کی زندگی موہوم دکھوں کی نذر ہو کر رہ گئی تھی۔ بچپن سے لے کر اب تک ان کی آنکھیں روتی ہی رہی تھیں۔ ان کی پیدائش پر ایک ہفتہ کے اندر اندر ممی کے والدین ناگہانی طور پر ختم ہو گئے تھے۔ اور ممی نے نفرت و حقارت سے منہ بنا کر اپنی ننھی بچی کو اپنے پہلو سے الگ کر دیا۔

منحوس!

انھیں کسی کا پیار نہ ملا۔ وہ خود ہی سب سے بھاگتی رہیں۔ جس کا پیار چاہتیں وہ منہ بنا لیتا۔ ان کی ساری ہستی دکھ اور جلن کی آگ میں بھسم ہو گئی۔

ممی یوں بھی بڑی پُر وقار لگتیں، سفید لباس اور کھلے بالوں میں ان کی شخصیت اور زیادہ پُرکشش ہو گئی تھی۔ ابھی ماتمی اثرات زائل نہیں ہوئے تھے۔ کرنل شاہد نے دبی زبان میں کہنا شروع کیا۔

"بیگم ہارون! ابھی آپ کے بیوگی کے دن تو نہ تھے۔"

"ہونہہ!" نوشی کی غصیلی نگاہیں ان پر پڑتیں۔ "یہ کون ہوتے ہیں۔ اس گھر میں یہ آتے ہی کیوں ہیں؟ ان کی دوستی پاپا کے ساتھ ہی ختم ہو گئی تھی!" وہ اتنی ناسمجھ بھی نہ تھی۔ جوان کی نظریں ان کا غیر معمولی التفات نہ پہچانتی۔ ممی کی پُروقار شخصیت اسے یک لخت ایک ایسا ننھا منا خوبصورت دیا لگی۔ جو ہوا کے ایک ہی جھونکے سے گل ہو سکتا تھا۔

محل میں از سر نو چہل پہل ہو گئی تھی..... لوٹ غم ہی سہی! نوشی کو یہ فکر کھائے جاتی۔ جب خالہ امی اور طاہر چلے چلے جائیں گے تو پھر کیا ہوگا۔ اس حادثے نے اسے اور طاہر کو بہت قریب کر دیا تھا۔ نوشی ان سے ہمیشہ الگ ہی رہی تھی۔ ممی ایسی تقریبات کے بھی خلاف رہتیں، جن میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو قریب آنے کا موقع ملتا..... دونوں اتنے وسیع و عریض محل میں تنہا تھیں! آپ اپنی انجمن..... مایوس اور اداس۔ جیسے کسی نے سزا بھگتنے کو چھوڑ رکھا ہے۔ آہستہ آہستہ عذرا باجی نے اداسی اور تنہائی میں زندہ رہنا سیکھ لیا تھا۔ نوشینہ اپنے خلاف لڑا کرتی۔ مایوس ہوتی تو ہنس دیتی۔ فکروں کے ہجوم میں مسکراتی۔ اسے اپنی باجی پر ترس آتا۔ اتنی بودی، ایسی ڈرپوک جنہیں نہ تو زندگی ہی راس آئی تھی نہ ہی دنیا۔ اسے ممی پر بے تحاشا غصہ آتا۔ سنجیدگی اور وقار کا مطلب یہ تو نہیں۔ کہ ماں اپنے بچوں ہی سے غافل ہو جائے۔

وہ رات یوں ہی اداس تھی۔ گھنگھور بادل سارے باغ پر محیط تھے۔ تیز و تند ہوائیں چل رہی تھیں۔ عذرا باجی اور طاہر کب سے دریچے میں کھڑے خلا میں دیکھ رہے تھے۔ نوشینہ دور کھڑی انہیں مسلسل دیکھے جا رہی تھی۔ جیسے کوئی تجزیہ کرنا چاہتی ہے۔

"عذرا ـــ!" اچانک طاہر نے انھیں پکارا۔

"جی!" باجی چونک پڑیں۔

"ہم کل پرسوں تک چلے جائیں گے!" وہ رنجیدہ لہجے میں کہنے لگے۔ "خالہ بی سے تمہارے لئے کہا تھا۔ کہ کچھ دنوں عذرا کو ہمارے ساتھ رہنے کی اجازت دیدیجئے۔ مگر"

"مگر؟" ـــ باجی نے دھیرے سے کہا۔ "ممی نے اجازت نہیں دی۔"

"نہیں! پتہ نہیں وہ کیا سوچتی ہیں۔ کیا ہم تم ہمیشہ ساتھ نہیں رہے تھے؟ کیا انھیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے؟۔ عذرا میں ایسے رشتوں کا بہت احترام کرتا ہوں۔"

"ممی ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ میں منحوس ہوں۔ نہیں چاہتیں کہ ان کی لڑکی کا منحوس سایہ کسی اور ہستی پر پڑے۔"
"بیکار کی بات!" نوشینہ نے منہ بنا لیا۔
"منحوس ہو تم!" طاہر ہنس دیئے۔ "اچھا بہانہ بنایا ہے ساتھ نہ چلنے کا۔ تم چاہو تو اس ماحول سے نکل بھی سکتی ہو۔"
"میں نے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ طاہر بھائی! — وہ آنسو دنیا دیکھتی ہے جو آنکھوں سے بہتے ہیں۔ وہ آنسو کوئی نہیں دیکھتا جو دل سے بہتے ہیں! یہ ماحول میری ذات میں رچ بس گیا ہے۔ طاہر بھیا — میں اگر نکلنا چاہوں تو بھی نہیں نکل سکتی۔"
"تم لوگ یہاں ہو؟" خالہ امی دریچے میں آئیں۔ عذرا باجی زبردستی مسکرانے لگیں۔
"آئیے خالہ امی!"
"خدا غارت کرے کرنل شاہد کو۔ ارے ابھی شوہر کا کفن بھی میلا نہ ہوا ہوگا — یا خدا!" خالہ امی کے چہرے پر غصہ کے آثار تھے۔
"کیا ہوا امی؟" طاہر مضطرب ہو گئے۔
"خدا ان لڑکیوں کا مستقبل سنوار دے۔ میں یہاں دوبارہ نہ اپنی شکل دکھاؤں گی، نہ کسی کی دیکھوں گی۔ میری چھوٹی بہن ہے لوگ مجھی کو تو کہیں گے۔ ابھی محسن کے یورپ سے آنے میں بہت دن باقی ہیں۔" خالہ امی کہہ گئیں۔ "ویسے نوشینہ کی مجھے کوئی فکر نہیں۔"
طاہر کا چہرہ گلابی ہونے لگا۔ نوشینہ سرخ ہو گئی — اف! وہ ناحق یہاں کھڑی رہی۔
"خاموش!" اس نے لبوں پر انگلی رکھ کے طاہر کو اشارہ کیا۔
"کچھ مجھ سے کہا؟" طاہر نے بھولپن سے پوچھا۔
نوشینہ بوکھلا گئی — خالہ امی ہنس پڑیں۔
"شریر لڑکے! میں سنجیدگی سے کچھ کہہ رہی ہوں۔"
"سنجیدگی یہاں کون ہے امی!" طاہر نے معصومیت سے سوال کیا۔
عذرا باجی ہنس دیں۔ "طاہر بھیا! آپ خالہ امی کو بہت ستاتے ہیں۔"
"خدا تم کو یونہی خوش رکھے میرے بچے! جب سے تمہارے خالو بابا دنیا سے سدھارے تم لوگوں کے سوا اور میرا ہے ہی کون!"
"امی!" طاہر نے بات اُچک لی۔ "آخر عذرا کو ہمارے ساتھ کر دینے میں کیا حرج ہے؟"
"یہ تو وہی جانیں!" خالہ امی کو پھر غصہ آنے لگا۔ "عذرا — تم ایک بڑی معیوب بات سے دوچار ہونے والی ہو بیٹی۔ یہ دنیا بڑی گھناؤنی ہو گئی ہے۔ لوگ خلوص و محبت نہ کریں! محبت کا ڈھونگ بھی نہیں رچاتے — تمہاری ماں . . . . ."
"یہ سب ان سے کہنے کی کیا ضرورت ہے امی!"
"بیٹے تم نہیں جانتے، میں شروع ہی سے رضیہ سے واقف ہوں۔ اس کی سی ضدی اور سرکش لڑکی ہمارے خاندان بھر کوئی نہ تھی۔ اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے مگر اس کی ضد پوری ہو! تم نے کرنل شاہد کو دیکھا ہے نا؟ — یا خدا! یہ کہتے ہوئے میری زبان نہیں اٹھتی — شوہر کی موت کو ابھی عرصہ ہی کتنا ہوا ہے!" خالہ امی نے منہ پھیر لیا۔ "شریف لوگ ناکردہ گناہوں سے ہی ڈر جاتے ہیں۔ لیکن رضیہ — ایک برائی کرتے ہوئے بھی چاہتی ہیں۔ کہ دنیا انھیں کچھ نہ کہے۔ غضب خدا کا۔ جوان بچیاں سامنے ہیں۔ اور وہ دوسری شادی رچانے والی ہیں!"
عذرا نے ہلکی سی چیخ مار کر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ نوشینہ کے دل کی دھک کنپٹیوں میں گونج رہی تھی . . . . یہ کیا ہوا؟ — لوگ . . . . خاندان — اور دنیا — ممی اندھی تو نہیں ہو رہی ہیں۔

بڑی دیر تک کوئی کچھ نہ کہہ سکا!
"آپ سب کو چائے کے لئے اندر بلا رہے ہیں!" خادمہ سوسن نے دستے میں جھانک کر کہا۔
"چلو عذرا!" طاہر کو جیسے بہانہ مل گیا "چھوڑو ان واہیات باتوں کو۔ امی۔ انہیں سمجھائیے!"
"ہاں بیٹی۔ چلو!"
"خالہ امی۔ اگر آپ کو ہم سے تھوڑی بہت محبت بھی ہے تو آپ ہمیں زہر دیدیجئے!"
"بیٹی نادان نہ بنو۔ محسن کے یورپ سے آنے میں تھوڑے ہی دن اور رہ گئے ہیں۔ پھر اللہ نے چاہا تو تم اپنے گھر آباد ہو جاؤگی۔ اور نوشی ــــ"
"نوشی کہاں جائے گی؟" طاہر چپ نہ رہ سکے!
"وہ ہمارے ہاں آجائے گی۔ میری بہو بن کر!" خالہ امی مسکرائیں۔
"آپ سے میں سمجھ لوں گی!" نوشینہ دل ہی دل میں سلگی۔
"آئیے نا، آپا بی!" اچانک ممی ادھر آگئیں! اور ماحول باضابطہ سا بن گیا۔
"آرہے تھے!" خالہ امی بے رُخی برت رہی تھیں۔
"یہ کیا؟ عذرا تم رو رہی تھیں؟" دفعتاً انہوں نے پوچھا۔
"ممی؟ نہیں تو۔ ممی!"
"کبھی میری سمجھ میں نہیں آتا۔ جو گیا وہ گیا، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔"
ممی کہنے لگیں۔ "جو لوگ مر چکے ان کے لئے مرجانا تو دانشمندی نہیں ہے۔"
"رضیہ! یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"
"آپا بی، میں کنگال نہیں۔ اتنی وسیع و عریض جاگیر کا انتظام مجھ سے تنہا نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ایک ہمدرد کی ضرورت ہے وہ کرنل شاہد سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکے گا۔"
طاہر ہکا بکا ان کی شکل تکنے لگا۔ چالیس سال کی خاتون، دو لڑکیوں کی ماں ـــ یہ معاشرہ انھیں کیا کہے گا۔ اف خدایا۔
خالہ امی کا دل سینے میں دھکنے لگا۔ عذرا اور نوشی ممی کی دلیری پر دم بخود اور پشیمان۔ "ممی!" وہ چلا چلا کر کہنا چاہتی تھی۔ ممی پہلے اپنے ہاتھوں سے ہمارے گلے گھونٹ دیجئے۔ سمجھئے! یہی آپ کے نئے سہاگ کی مہندی ہے۔ خدا کی پناہ کوئی یوں بھی کرتا ہے۔ اب ممی کو ضرورت کس بات کی ہے۔ اتنا عالیشان محل، وسیع جائداد۔ اولاد۔ ان گنت خادم! ـــ
"ممی!" چیخ نوشینہ کے حلق میں پھنس گئی ـــ
چائے کی میز پر کرنل شاہد بھی تھے۔ خوبرو اور وجیہہ۔ ہلکے کریم کلر سوٹ میں وہ اور زیادہ دلکش لگ رہے تھے۔ عمر کی پچاس منزلیں طے کرنے پر بھی وہ بہت کم بوڑھے لگتے۔ نوشینہ کو یاد تھا وہ ان کے گلے میں باہیں ڈال کر جھولتی تھی۔ پیچھے سے آکر انہیں موند لیتی تھی۔ وہ تب بھی ایسے ہی تھے۔
تو یہ ناگ مدتوں سے اس دولت پر پھن پھیلائے ہوئے تھا۔
یک لخت اُسے سب سے نفرت ہو گئی "جو اپنے حق کے لئے جدوجہد نہ کر سکے۔ اس سے بڑھ کر بزدل اور کون ہے؟"

"خوش آمدید!" کرنل شاہد نے مسکرا کر سرخم کیا۔ "بڑی دیر لگا دی ..... اور عذرا تو بالکل موم کی گڑیا لگ رہی ہیں" خالہ امی قہر آلود نظروں سے انھیں گھور کر رہ گئیں۔ طاہر چائے پی کر باہر نکل گئے۔ عذرا کے آگے چپس کی پلیٹ جوں کی توں پڑی رہی۔

ایسی چائے پہ لعنت! نوشینہ ابلتی ہی رہی۔ وہ سب جلد ہی تتر بتر ہو گئے۔

باجی کے لئے کیا کروں؟ اُف خدا۔ وہ کیوں زندہ رہیں گی! نوشینہ کا دل جل رہا تھا۔

کیسے کیسے غم انھوں نے سینے میں چھپا رکھے ہیں۔ سب کی نفرت کا ناسور۔ اپنی بے مائگی کا احساس۔ اب یہ نئی شرمندگی۔

"باجی خوش رہنا سیکھئے!" نوشینہ کہتی۔

"کیسے نوشی؟" فوراً ان کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔

اب تو نوشینہ انھیں خوش رہنے کو بھی نہ کہہ سکتی۔ یہ نئی افتاد جو پڑی تھی۔ طاہر بھی نوشی کے ہم آواز تھے۔

"نوشینہ! امی بہت متفکر ہیں۔ میں نے انھیں بہت سمجھایا۔ مگر نوشی برا نہ ماننا۔ تمہاری والدہ نے ایسا حیران کن قدم اُٹھایا ہے جس کے لئے ہم سب شرمندہ ہیں! خدا جانے عذرا پہ کیا اثر ہوگا۔ اگر یہی وطیرہ رہا، تو تمہاری کم سن اور نیک نفس بہن ....."

"بتلایئے! میں اُن کے لئے کیا کروں؟ نوشینہ کو یہی جواب سوجھتا۔ وہ ان سے ڈھنگ کی بات ہی نہ کر سکتی تھی ..... ایسی حرکتوں کو بے حد ذلیل سمجھتی جب کوئی کسی کے قریب آنے کا موقعہ ڈھونڈھے۔ انسان کی اپنی نظروں میں عزت ہونی چاہیے۔

"سمجھ میں نہیں آتا" طاہر سر پکڑ لیتے۔

"اگر ان کے لئے جان بھی کام آئے!"

"ان کے لئے کسی کا مرجانا اتنی ہمدردی نہیں ہے۔ ان کے لئے زندہ رہنے کی کوشش کرو۔" آہ! کاش میں کچھ کر سکتا۔ دن رات رونا، غم کھانا، نوشینہ کیا انھیں محسن بھائی کی جدائی کا غم ہے؟"

"اندازہ تو نہیں لگایا۔"

"کاش وہ جلد آسکیں۔ تمہاری باجی کو صرف باپ کا غم نہیں۔ اپنی زندگی کا بھی دُکھ ہے تمہاری ممی نے انہیں محبت نہیں دی۔ یہ ایسا گھاؤ ہے جو قیامت تک عذرا کی رُوح کو تڑپاتا رہے گا۔ کوئی ماں کیا اس لئے اپنے بچے سے نفرت کر سکتی ہے کہ اس کی پیدائش میں اُس کے ماں باپ ختم ہو گئے تھے۔ کتنی لغو اور مہمل بات ہے۔

"آپ پھر کب آیئے گا؟" نوشینہ یہی پوچھ سکی۔

"آتا رہوں گا نوشی! کاش مجھے اتنا یارا ہوتا میں عذرا کو اپنے ساتھ لے جاتا۔ اب تم ہی کرو کہ ان کے دل سے تمام پریشانیاں دور کر دو"

"ممی کو ایسی حرکت سے باز نہیں رکھا جا سکتا" نوشینہ کا لہجہ شرم اور حجاب سے ڈوب ڈوب گیا۔

"کیا وہ خود نہیں سوچ سکیں" طاہر کی طنز یہ مسکراہٹ نوشینہ کو پسینہ پسینہ کر گئی۔

"خدا تم سب کا مددگار ہو"

وہ چلے گئے۔

"چائے تو پی لیجئے" اس کی آواز گھٹ گئی۔ دیر تک ان کے قدموں کی دھمک اس کے دل میں گونجتی رہی۔ شام تک محل سونا ہو گیا۔ طاہر اور خالہ امی چلے گئے۔ ممی کرنل شاہد کے ساتھ نئے باغات کا معائنہ کرنے دوپہر کے کھانے کے بعد ہی چلی گئی تھیں۔ خالہ امی اپنی یہ توہین برداشت نہ کر سکیں۔

"خالامی جب سنیے گا کہ ہم مر گئے تو پرسہ دینے آئیے گا" نوشینہ روتی روتی بولی۔ اور عذرا باجی کے لاتعداد آنسو خالامی کے شفیق سینے میں جذب ہو گئے۔

در و دیوار سے اداسی برسنے لگی تھی۔ شام میں کوئی دلکشی نہ تھی۔ کتنی دیر سے وہ بالکونی میں کھڑی تھیں۔

"باجی!" نوشینہ نے آواز دی۔

وہ مڑیں۔ ہلکے نیلے لباس میں ملبوس۔ اس بے کیف شام میں عذرا کا وجود کتنا دلکش لگ رہا تھا۔ وہ یوں بھی کتنی پیاری تھیں معصوم اور سوگوار حسن۔ خاموش لب، مغموم قیافہ۔ نوشی کو اپنی بہن سے بے پناہ پیار تھا۔

"چلیے باغ میں چلیں!" اس نے ان کا ہاتھ تھاما اور گھبرا کر چھوڑ دیا۔ "آپ کو تو بخار ہے"

وہ مسکرائیں۔ "تم بہت ڈرتی ہو نوشی۔ فکر نہ کرو۔ چاہے بخار آ جائے۔ چاہے دِق ہو جائے۔ مگر موت نہیں آئے گی"

"خدا نہ کرے!" نوشی برا ماننے لگی! "آپ ایسی باتیں کریں گی تو میں آپ سے نہیں بولوں گی"

"ایسا ستم نہ کرو نوشینہ"

"میں ڈاکٹر کو فون کروں؟"

"ڈاکٹر روح کا علاج نہیں کر سکتا نوشی ..... وہ صرف جسم کا علاج کر سکتا ہے"

"باجی آپ فلسفہ بول کر مجھے زندہ درگور کر دیجئے گا۔ خدا کے لیے سوچیے۔ یہ آپ کیا کر رہی ہیں۔ جس کا جو جی چاہے کرے ... دوسروں کے اعمال کا خمیازہ ہم کیوں بھگتیں"

"کون بھگت رہا ہے؟"

"آپ!"

وہ ہنسنے لگیں۔ "نہیں نوشی، جب تک تم سکھی نہیں ہو جاؤ گی۔ میں نہیں مروں گی، میرا وعدہ ہے"

"باجی!" نوشینہ کو غصہ آنے لگا۔

"ہاں نوشی پہلے تمہاری شادی ہو گی"

"اونہہ! میں جا رہی ہوں ڈاکٹر کے پاس!"

ابھی وہ باہر نہ نکلی تھی۔ کہ ڈرائنگ روم میں ملے جلے قہقہوں کی آوازوں نے دونوں کو دم بخود کر دیا۔ دوسرے لمحے ممی نے اسے پکارا۔ تنہا وہ باہر آئی۔ ممی پرنیا نکھار تھا۔ انگ انگ سے مسرت پھوٹی پڑ رہی تھی۔ پاس ہی کرنل صاحب کھڑے تھے۔

"کیا ہے ممی!" اس نے بہت ضبط کر کے پوچھا۔ اور کرنل کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ "عذرا اور تم دونوں تیار ہو جاؤ، ایک جگہ ڈنر ہے!" وہ بولیں۔

"باجی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے!"

"آخر ہوا کیا ہے اسے!" ممی جھلائیں۔

"بیگم! پلیز..." یہ کرنل صاحب کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

"بیگم؟؟؟" نوشی پر اگر بم پھٹ پڑتا۔ تو وہ یوں نہ چونکتی۔ تو یہ نوبت آ گئی ہے۔ پاپا۔ اچھا ہی ہوا آپ مر گئے۔ آج یہ قیامت اٹھانے کو ہم ہی زندہ رہ گئے۔

"آج کرنل صاحب بحیثیت تمہارے والد کے تم سے متعارف ہو رہے ہیں۔" ممی دلآویز انداز میں مسکرا رہی تھیں۔
نوشینہ کو اس قدر مضطرب اور بے قرار دیکھ کر باجی دھک سے رہ گئیں۔
"کیا کوئی نئی قیامت ہے نوشی! تم اتنا پریشان کیوں ہو؟"
"باجی آپ کو خبر نہیں! آج سے کرنل صاحب نے ہمارے باپ کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔"
"نہیں!"
"یہ سچ ہے۔ آج ماں کی ساری داستانیں۔ محبت کی تمام کہانیاں مجھے جھوٹی لگ رہی ہیں۔ کیا ہم ممی کو معاف کرسکیں گے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ کیا منہ دکھائیں گے محسن بھائی کو۔ طاہر صاحب کو، میرے خدا؛" نوشی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
ہزار چاہنے پر بھی ان کے لبوں سے پاپا کا خطاب نہ نکلا۔ ویسے وہ صرف ممی کے شوہر تھے۔ اور بس..... گھر سے اور عذرا سے اور نوشینہ سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ بہت دنوں تک ممی پر انگلیاں اٹھتی رہیں۔ دبی دبی ہنسی سنائی دیتی رہی، فقرے کسے گئے، اور پھر صبح و شام کی گردش نے سب کچھ فراموش کردیا۔
نوشینہ جلد ہی اپنے دکھ بھول گئی۔ خوش رہتی اور خوش رکھنے کی کوشش کرتی۔ عذرا باجی جیسے کسی مزار کی لوح..... جامد و ساکت کرنل صاحب کی موجودگی کے احساس سے ممی کی نظر التفات بھی ہو جاتی۔
"کرنل صاحب آپ سے بڑی محبت کرتے ہیں۔" وہ طنز سے ہنستی۔
"مجھے کسی کی محبت کی پروا نہیں ہے۔"
"آپ عجیب ہیں باجی! پیار نہ کرنے پر شاکی ہوتی ہیں، پیار نہ کرو تو خفا ہوتی ہیں۔"
"ضرورت بھی کیا ہے؟"
"تو پھر شکایت کیوں کرتی ہیں؟"
"کبھی نہیں کی ــ نوشی!"
"ہنہ میں سب جانتی ہوں۔"
"بھلا کیا؟"
"یہی کہ اس طرح آپ کی شخصیت سے دوسرے مرعوب ہو جائیں!"
"میں کسی کی محبت نہیں چاہتی نوشی کسی کی نہیں۔ مجھے صرف ایک پیار کی حسرت رہی۔ ممی کے پیار کی۔ لیکن وہ بھی نہ ملا۔ سبھی کہتے ہیں میں نے گورنوں کی آغوش میں آنکھ کھولی۔ آیاؤں کے نرغے میں پلی، بڑھی۔ بیماری میں موت کی دعائیں مانگی گئیں۔ دکھ میں میری نجات چاہی گئی۔ آہستہ آہستہ میرا احساس مضبوط ہوتا گیا۔ ایسی زندگی کس کام کی جو کسی کو اچھی نہ لگے۔"
اور پھر وہ کرسمس کی چھٹیوں میں پروفیسر جیلانی سے متعارف ہوئیں۔ بھاری بھرکم جسم، فارغ البال اور خبطی جیسے، ممی ان کے استقبال میں آگے آگے تھیں۔
"یہ کون سٹری سودائی ہیں!" نوشینہ نے قہقہہ لگایا۔
"خبردار!" ممی نے آنکھیں نکالیں۔ "اگلی گرما کی چھٹیوں میں عذرا کا بیاہ ہو جائے گا۔"
"اچھا!" وہ خوشی کے مارے بے حال ہوگئی۔

"محسن جواب نہیں آسکتے!" ممی بدستور کسی سے مخاطب تھیں۔ "پروفیسر جیلانی اور عذرا۔" یک بیک ساری روشنیاں گل ہوگئیں۔ اندھیرے گھپ اندھیرے میں نوشینہ بے آواز چلانے لگی۔ جتنے سہارے تھے سب دور بھاگنے لگے۔ یہ کیا خدا خدا — یہ کیا ستم ہے۔

مدتوں باجی اپنے کمرے سے نہ نکلیں۔ پروفیسر صاحب گھر کے ایک فرد بن گئے تھے۔ ڈرائنگ روم میں وہ اور کرنل صاحب گھنٹوں شطرنج میں کھوئے رہتے۔ نوشینہ سوچتی۔ آخر باجی کتنی قسطوں میں بھینٹ چڑھائی جائیں گی۔ تقدیر ان کے پیچھے کیوں لگ گئی ہے۔ بیکار — بے وجہ.... وہ سر پٹخا کرتی۔ اور اسے کوئی راہ نہ سوجھتی۔ پروفیسر صاحب میں ممی نے کیا خوبی دیکھی تھی۔ وہ مرد... ... اور پتہ — نوشی کو وہ ہمیشہ ہی خبطی لگے۔ ایک تو پروفیسر دوسرے فلسفہ کے — دوہرے پاگل — یا خدا جلدی سے محسن بھائی آجائیں۔ اس کے تخیل میں ان کا سراپا ابھرتا — دلکش، خوبرو اور متین..... مرحوم پاپا نے اپنے مصارف پر انھیں یورپ بھیجا تھا۔ وہ ان کی بہن کے لڑکے تھے۔ پھوپی اماں اپنی زندگی میں دونوں کی منگنی کرگئی تھیں۔

ایک عرصہ سے ممی ان کے اخراجات سے غافل تھیں۔

نوشینہ وہ صبح کبھی نہ بھول سکی۔ طاہر ملنے آئے تھے۔ باجی سے باتیں کرتے ہوئے بہت محتاط رہتے۔ کیا پتہ کون سی بات سے یہ نازک آبگینہ ٹوٹ جائے۔ اس دن عذرا کچھ زیادہ ہی پریشان لگ رہی تھی۔

طاہر دیر تک بیٹھ کر جانے کے لئے اٹھے۔ دفعتاً باجی نے ان کی شیروانی کا دامن تھام لیا۔

"طاہر بھائی —" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔

وہ مڑے کچھ حیران سے تھے۔

"اگر — اگر آپ کو ناگوار نہ ہو۔ یہ سب فروخت کرکے یورپ بھجوا دیجئے۔" انہوں نے اپنے سارے زیورات طاہر کے آگے رکھ دیے۔

طاہر متاثر ہوگئے۔

"یہ تمہاری ملکیت ہے۔ عذرا تم بالکل بے فکر رہو۔ آج ہی میں بھجوا دوں گا۔"

"طاہر بھائی۔ میرا کچھ جی چاہتا ہے۔"

طاہر بھائی کی پلکوں میں دو موتی الجھ کر فرش پر گرے۔ بکس لے کر وہ باہر نکل گئے۔

خالہ امی نے طاہر کی شادی کے لئے ممی کو کہلوا بھیجا۔

"پہلے عذرا کی ہوگی۔ انھیں جلدی ہے تو کہیں اور کر دیں۔"

ہوا کا ایک تیز پرشور جھونکا آیا۔ اور ننھے منے آشیانے کے سارے تنکے بکھر گئے۔

"پروفیسر۔" نوشینہ آگ بگولہ ہوگئی۔ "میں انھیں مار ڈالوں گی۔"

"لڑکی۔ ہوش کی دوا کرو۔" ممی بھی بپھر اٹھیں۔ "اگلے ماہ کی پہلی تاریخیں! — سمجھیں! تمہارا انکار ہماری بدنامی ہوگی — اور بس!"

"اور آپ کا بھرم ہماری موت ہوگی۔" نوشینہ سلگ رہی تھی۔

"بیٹی! عذرا کی ہمدرد تم ہی نہیں، ہم بھی ہیں۔" کرنل شاہد نے نرم زبان میں کہا۔

اس کی ہمت نہ پڑی۔ وہ عذرا سے آنکھیں چار کرسکی۔

"نوشینہ! تم نوحہ کی نہیں ... ہے۔" باجی بڑبڑائیں!

"ممی نے محسن کے لگاؤ اور میری الفت کا بھی پاس نہ کیا۔"

ساری رات نوشینہ انھیں تسلی دیتی رہی۔
اور جب اگلی صبح غیر متوقع طور پر خالہ امی کے ہاں پہنچی تو وہ مسرت سے بے قابو ہوگئیں۔
"عذرا کیسی ہے نوشی؟"
یک بیک اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔
"خالہ امی! باجی کو بچائیے!"
"خدا کے لئے بتاؤ انھیں کیا ہوا ہے؟" طاہر نے بے چینی سے سوال کیا ہے نوشینہ کو شرم و حجاب کا احساس بھی نہ رہا۔۔من و عن ساری داستان کہہ سنائی۔ خالہ امی! سکتہ زدہ رہ گئیں۔
"محسن کا کیا ہوگا طاہر بیٹے۔ میں حیران ہوں ۔۔ رضیہ کی عقل پر کیا پتھر پڑ گئے ہیں۔"
"محسن بھائی کو تو بعد میں ہوگا، جو بھی ہوگا۔ عذرا کا کیا ہوگا؟"
"خالہ امی! باجی رات بھر روتی رہیں۔"
"اس کے آنسو خدا دشمن کی آنکھوں میں بھر دے۔"
"ابھی ایک ماہ باقی ہے۔ اللہ کوئی نہ کوئی راہ نکالے گا۔" طاہر نے کہا۔
سر شام وہ طاہر کے ساتھ واپس آرہی تھی۔ کار کے اندر اندھیرا چھا جانے میں اُس نے چپکے سے انھیں دیکھا۔ وہ بے حد اداس اور پریشان لگ رہے تھے۔ نوشی کا دل دکھ گیا۔
"نوشی!" اچانک طاہر نے مدھم آواز میں کہا۔
"جی!" نوشینہ نے ہولے سے کہا۔
"نوشینہ!" بڑی بے چینی اور اضطراب سے وہ پھر بولے۔
"جی!" نوشینہ متحیر نظر آنے لگی۔
"کیسے کہوں؟ میرے اللہ۔ میں بہت ڈرتا ہوں!"
"کچھ تو کہئے۔ میں اُسے بہت کچھ سمجھ لوں گی!"
"تم سے ڈر لگتا ہے!"
"مجھ سے؟"
"ہاں نہ جانے تم کیا سوچو۔"
کاش وہ ان کی دلجوئی کرسکتی۔ اُن کے تمام دکھ سمیٹ سکتی۔ وہ چپ چاپ کڑھتی رہی۔
"نوشینہ! ایک بات پوچھوں! سچ سچ بتاؤ گی؟"
"پوچھئے!"
"جھوٹ نہ بولنا۔" وہ بڑی بڑی ملتجی نگاہوں سے اُسے تکنے لگے۔ "تم مجھے کتنا چاہتی ہو!؟"
"ہائے اللہ!" وہ کیا بولتی۔ پلکیں بوجھل ہوگئیں۔ ہونٹ کانپنے لگے۔
"بولو نا۔ نوشی۔ تم نے سچ سچ کہنے کا وعدہ کیا تھا۔"

"جی!"

"بہت چاہتی ہونا؟"

"پتہ نہیں!"

"تم اپنی باجی کو بھی بہت چاہتی ہو؟"

"جی ہاں!"

"نوشینہ کیا تم اپنی بہن کے لئے ایثار نہیں کرسکتیں۔ اپنی محبوب ہستی اپنی باجی کو بخش دو۔ انھیں بچالو نوشی! اپنے دل پر قابو پانا نسبتاً آسان ہے۔ لیکن دکھی دلوں کو مسرت بخشنا دشوار ہے بہت دشوار!"

جانے کیسی آوازیں تھیں، گریہ و بکا کی، دلخراش قہقہوں کی مکروہ آوازیں۔ جو نوشینہ کے دل میں سمانے لگی تھیں۔ کار۔ سڑک۔ سب ویران ہوگیا۔ طاہر کی پیاری اور دلکش صورت مدھم ہونے لگی۔ اس کے لبوں سے ایک مدھم کراہ نکلی۔ اگر وہ پٹ کا سہارا نہ لے لیتی تو چکرا کر گر ہی پڑتی۔

طاہر خاموش تھے جیسے شرمندہ ہوں۔ یا پرسکون تھے اس آتش فشاں کے مانند جس نے اپنا لاوا پھینک کر آبادیاں ویران کردی ہوں اور خود پرسکون ہوگیا ہو۔ نوشی کو چپ لگ گئی۔ وہ کچھ کہنے کے قابل ہی کب تھی۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے آج اپنا سارا سرمایہ کہیں ہار دیا ہو۔ بے آس بے سہارا رہ گئی ہو۔ بے نام آنسو اس کی آنکھوں میں چھلک آئے۔ گرد و پیش ایک گہری تاریکی میں مدغم ہوگیا۔

ممی دالان میں قیمتی ملبوسات پھیلائے۔ اپنی سہیلیوں سے ان کا انتخاب کرا رہی تھیں بوڑھی اور امیر خواتین کے قہقہے سُن کر نوشینہ جھکنے لگی۔

شادی کے دن بھی قریب تھے۔

"نوشی دیکھو بھلا یہ لباس اور یہ زیورات۔"

مرمرسا اس کے گلے تک اُمڈ آیا۔

"یہ آپ کا خط!" سوسن نے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ لائبریری میں مڑ گئی۔ زمین سے لے کر چھت تک الماریوں میں کتابیں چنی تھیں۔ بیچوں بیچ مرحوم پاپا کی کرسی تھی۔ اب وہ شاہد صاحب کی ملکیت تھی۔ سامنے میز پر اُدھ جلا سگار پڑا تھا۔ برا سا منہ بنا کر اس نے سگار اٹھایا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

"کافی یہیں لے آؤ!" خادمہ کو حکم دے کر وہ پاپا کی کرسی پر آبیٹھی۔

محسن بھیا کا خط تھا۔ نوشینہ کے نام۔

"نوشی!

یقیناً تم مجھ سے خفا نہ ہوگی۔ میں تم سے سب سے اتنی دور محض عذرا کی پر فریب محبت پر زندہ تھا۔! اف قوہ! عذرا کی محبت اور ماضی کی یادیں۔ کس بیدردی اور سفاکی سے سابقہ بیگم ہارون نے اطلاع دی ہے کہ عذرا کی شادی پروفیسر جیلانی سے ہوگئی۔ اب میں وطن کبھی واپس نہ آؤں گا۔ پچھلے ہفتہ میں نے اپنی کلاس فیلو مس ورنا سے شادی کرلی ہے۔ یورپ سے جا رہا ہوں نہیں بتا سکتا کہ کہاں جاؤں گا۔

بے وفا عذرا کو میری مبارکباد پہنچ چکی ہوگی۔

محسن !!"

کئی چیخیں یک بیک اس کے حلق میں پھنس گئیں۔

"خداوندا! وہ نجات جو موت میں پنہاں ہے۔ کہاں ہے — کہاں ہے!"

وہ بڑی تلخ اذیتوں سے دوچار تھی۔

"نوشینہ!" یکایک عذرا نے پکارا۔ اور اس نے خط چھپا لیا۔ یہ زہر آلود خط دکھا کر وہ باجی کی ہستی کو نیستی میں بدلنا نہیں چاہتی تھی!

"آیئے باجی!" وہ بڑی خوش دلی سے مسکرائی — ویسے وہ چاہ رہی تھی ان سے لپٹ کر خوب روئے — خوب روئے — کہدے — باجی اگر آپ نے محسن بھائی کو کھو دیا ہے۔ تو میں نے بھی آج سب کچھ کھو دیا ہے۔ بڑی دیر تک وہ ان کا افسردہ چہرہ دیکھتی رہی۔

"تم نے میرے کفن دیکھے نوشینہ" دفعتاً وہ ہنس دی۔

"نہیں" وہ تڑپ گئی۔ "محسن بھائی ایک دن!"

"محسن؟" ان کے لب کانپنے لگے۔ جیسے وہ دھیرے دھیرے بڑبڑائیں۔ "بگولوں کے پیچھے سرگرداں ہونا عقلمندی نہیں ہے۔ مگر یہ بھولپن اور خود فراموشی کیسی دلکش ہے۔ بے خبری ایک نعمت ہے۔ مجھ ایسوں کے لئے۔ جو صرف خواب ہی دیکھ کر زندگی گزار سکتے ہیں۔ اگر خواب چھن جائیں۔ خوبصورت تصورات بھیانک ہیولوں کا روپ دھار لیں۔ جس ہستی کے لئے جی چاہے وہ اپنی پہنچ سے دور ہو۔ بڑی دور تو — خدا کی پناہ!"

انہوں نے دھکتی ہوئی کنپٹیاں جکڑ لیں۔

اور اسی ایک لمحے میں، نوشی نے فیصلہ کر لیا۔ وہ کہدے گی۔ ضرور کہدے گی۔ سب کچھ! اس کے لہجے میں عزم تھا۔ دھیرے دھیرے جیسے کسی کو زندگی اور حیات نو کا مژدہ سنائے جیسے اجڑے گلستان کو باغبان بہار کی آمد کا پیغام دے۔ نوشینہ نے طاہر کا سارا پلان بلا کم و کاست سنا دیا۔

"نوشی۔ نوشی۔ تم خواب تو نہیں دیکھ رہیں!"

"میری زندگی ایسی قیمتی نہیں ہے۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"یہ میں کبھی نہیں کر سکتی۔ خواہ کچھ بھی ہو۔"

"آپ کو مجھ سے محبت نہیں ہے باجی!"

"یہ میری اپنی پسند کی بات ہے — نوشی۔ ویسے تمہاری محبت میں میں مر بھی سکتی ہوں۔ میرے لئے ایک قربان گاہ نہ سہی۔ کوئی اور سہی —"

"تو آپ نے ہنسی خوشی خودکشی قبول کر لی۔"

"خودکشی نہیں۔ قتل۔"

محسن کا خط دیکھ کر طاہر سناٹے میں رہ گئے۔

"ابھی شادی ہوئی نہیں اور خالہ امی نے یورپ خبر بھجوا دی۔ اور وہ خط کہاں ہے جو انہوں نے الگ عذرا کو بھیجا ہے۔"

"وہ ابھی نہیں پہونچا۔"

حالات ایک ہی رُخ پر چل رہے تھے۔ نوشینہ اداس باجی قتل پر تیار۔ طاہر نتیجے کے منتظر اور ممی مطمئن تھیں۔ خالہ امی اب بھی خفا تھیں۔

باجی بے حد پرسکون تھیں۔ گہرے سمندر کی طرح، جس کی تہہ میں کتنے لرزہ خیز طوفان ہوتے ہیں۔ شادی کی تیاریاں زور شور سے ہو رہی تھیں۔

"باجی ابھی بھی وقت ہے۔ میں ممی سے لڑ جاؤں گی۔ میں اور طاہر آپ کو لے کر کہیں دور چلے جائیں گے۔"

"نہیں... بہن! جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ ٹھیک ہے۔ پہلے تو کوئی موہوم سی آس بھی تھی۔ اب تو وہ بھی نہیں۔"

"میں مجبور ہوں نوشینہ۔ کیا کروں۔ ورنہ عذرا اور تمہارے لئے جان تک دے سکتا ہوں۔ مگر عذرا کو یہ بھی منظور نہیں۔" طاہر کہتے عمر بھر میں پہلی اور آخری بار نوشی نے شاہد صاحب سے التجا کی۔

"آپ یہ شادی ملتوی نہیں کرا سکتے... !"

"کیوں؟" وہ بے حد متحیر ہوئے۔ "کیا تمہاری دانست میں یہ شادی نامناسب ہے۔ واہ بھئی۔ ان میں برائی کیا ہے۔ بے انتہا دولت، متعدد کاریں، ان گنت کوٹھیاں۔ سب سے شاندار کو ٹھی وہ عنقریب تمہاری بہن کے نام کرنے والے ہیں۔"

"جی ہاں! نوشینہ مایوس ہو گئی۔ کوٹھیاں کاریں بہت قیمتی ہوتی ہیں۔ انسانی زندگی سے زیادہ قیمتی۔ ایک محل برسوں میں بنتا ہے۔ انسان روز ہی مرتے رہتے ہیں۔"

"تم بھی صبر کرو۔ نوشینہ۔ جب عذرا ہی راضی ہیں تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔" طاہر کہتے۔

"ممی یہ شادی نہیں ہو گی۔" ایک دن نوشی فیصلہ کن جنگ پر تل گئی۔ "اگر یہ منحوس شادی ہوئی تو باجی زہر کھا لیں گی۔"

"تم کیا بک رہی ہو؟" ممی قہر مجسم بن گئیں۔

"آپ ہماری سوتیلی ماں بن گئی ہیں۔ باجی کو آپ نے پیدا کیا ہے۔ آپ ہی ان کے دکھ درد کا احساس نہ کریں گی۔ تو اور کون کرے گا۔"

"عذرا سے پوچھنے میں کیا حرج ہے۔" کرنل صاحب نے فرمایا۔

"کیوں۔ عذرا۔ کیا یہ سچ ہے؟" انہوں نے عذرا سے پوچھا۔ وہ دالان کے ایک گوشے میں نماز پڑھ رہی تھی۔

"یہ ظلم ہے، صریحاً ظلم"! نوشینہ چیخی۔

"کیا تم اس شادی کے خلاف ہو؟"

"نہیں ! ممی۔" وہ رک رک کر بولیں۔ اور دعا کے پیرائے میں خدا کے سامنے ہاتھ پھیلا دیئے.... گھٹی گھٹی کراہیں تھیں جنہوں نے اس رات نوشی کی نیند اڑا دی تھی۔ دھیرے سے ان کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ اور ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

"پاپا کو خواب میں دیکھا تھا۔" وہ بہانا بنانے لگیں۔ "رونا آ گیا۔"

"نوشینہ!" وہ دھیرے دھیرے بول رہی تھیں۔ "میں نے بہت سے خواب دیکھے تھے۔ پیارے پیارے خواب۔ مگر مجھے تعبیر بہت بھیانک ملی۔ اُف نوہ! ایک تھکی ہاری پیاسی روح۔ جو ازل سے ابد تک، پانی کے دھوکے میں سراب کے پیچھے ماری ماری پھرتی رہی ہو۔ آخر اس کی منزل کہاں ہے؟ جو نیکی کی سزا میں عذاب بھگتے۔ جو ہمدردی کے بدلے میں دکھ سہے۔ جو پناہ کی آرزو میں دربدر بھٹکے۔ جسے کوئی پناہ نہ دے حتیٰ کہ خدا بھی نہیں۔ پھر وہ کہاں جائے۔ پھر وہ کیا کرے۔"

شادی کے دن نزدیک آ گئے۔

سہیلیوں کے جھرمٹ میں گھری وہ ہنسنے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتی۔ کسی کی خاطر ہنسنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ زندگی ہر دم اُن کے پاس رہی بڑے دنوں بعد طاہر کو اس دن موقع ملا تھا۔ وہ عذرا کے سرہانے بیٹھے بڑے پیار سے ان کے بال برابر کر رہے تھے۔ نئی نئی خوشبوؤں میں رچی بسی سجے زرد لباس میں عذرا، طاہر کو کوئی نئی مخلوق لگ رہی تھی۔

"کتنی جلدی یہ عذرا پرائی ہو جائے گی۔"

تھکی ہوئی عذرا پل بھر کے لئے سو گئی تھیں۔ طاہر کے شفیق ہاتھوں کے لمس نے انھیں غافل کر دیا تھا۔

نوشینہ اندر آئی۔ اس کے ہاتھوں میں چائے کی ٹرے تھی۔ کب طاہر کو تھما کر وہ جلدی جلدی دلہن کا بستر ٹھیک کرنے لگی۔ اس کا ہاتھ کسی چیز سے ٹکرایا۔

"یہ کیا؟" طاہر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

محسن بھائی کا خط۔ مگر تم نے تو پہرے بٹھا رکھے تھے۔ پھر یہ کب پہونچا۔

"پڑھئے۔ پہلے پڑھئے" وہ بے ضبط ہو گئی۔

"بے وفا غدار، مبارک باد قبول کرو!

تم نے مجھے ٹھکرا دیا۔ اچھا ہی کیا۔ میں یوں بھی تمہارے قابل نہ تھا۔ لیکن تم مجھے اپنی محبت کا فریب تو نہ دیتیں۔ تم مجبور تو نہیں تھیں عذرا۔۔

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے   تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی!

جہاں رہو خوش رہو۔۔ دعا کرو۔ کہ میں تم کو بھول سکوں۔

یہ سن کر تمہیں خوشی ہوگی۔ کہ پچھلے ہفتے میں نے مس درنا سے میرج کر لی ہے۔ اور اب یورپ سے جا رہا ہوں۔ الوداع ۔۔ الوداع ۔۔

جو کبھی تمہارا تھا۔ محسن!!"

بڑی دیر تک دونوں ایک دوسرے کو تکتے رہے۔

"یہ خط شاید باجی کو اسی دن مل گیا تھا جس دن مجھے ملا تھا۔ لیکن انہوں نے مجھے بتایا نہیں۔ وہ اس صدمے کو مجھ سے پوشیدہ رکھنا چاہتی تھیں اسی لئے وہ پروفیسر صاحب سے شادی پر راضی ہو گئیں۔"

"کوئی یوں بھی مجبور ہوتا ہے" طاہر کو تسلی دینی بھی نہ آئی۔

مہمانوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ طاہر نے خالہ امی کو اطلاع دی۔ عذرا بیمار تھی۔

خالہ امی کی ماتما بلکنے لگی۔ کتنے دنوں سے یہاں قدم نہ رکھا تھا۔ اتنی سی خبر سنتے ہی دوڑی آئیں۔ بہت پہلے انہوں نے عذرا کو دیکھا تھا۔ اب وہ ایک ہنس مکھ خوبصورت زندگی کا بھیانک عکس دیکھ رہی تھیں۔

"میری بچی!" وہ رونے لگیں۔

"خالہ امی آپ مجھے اپنے سینے سے لگا لیجئے۔ میرے سارے دکھ دور ہو جائیں گے" خالہ امی نے جھک کر ان کے پژمردہ لب چوم لئے۔

دکھوں پر باجی نے ہنسنا سیکھا تھا۔ خالہ امی کے پیار پر رو پڑیں۔

بڑی دھوم دھام سے بارات آئی۔

شادیانے بجنے لگے تھے۔ شہنائی کی گونج دور رہی تھی۔۔ عذرا دلہن بنائی گئی تھی۔ جس نے دیکھا وہ دیکھتا ہی رہ گیا۔ خالہ امی انہیں سینے سے چمٹائے بیٹھی تھیں۔

"یہ ماں نہیں دشمن ہے" خالہ امی کہہ رہی تھیں "اس وقت بھی زبان سے کلمۂ خیر نہیں نکلتا"

"ان کا یہی سلوک اچھا ہے۔ خالہ امی میں ان کا رونا نہیں دیکھ سکتی" باجی جدائی کے تصور سے بلک رہی تھیں۔ وداعی کے وقت سب رو رہے تھے۔

"رضیہ۔ تمہارے دل کا پتھر نہ پگھلا۔ ہائے تم ماں نہیں ڈائن ہو۔ اب تو آہیں نہ لو۔ صبر نہ سمیٹو۔ عذرا جا رہی ہے۔ کچھ کہہ لو۔ کچھ سن لو۔ پھر نہ جانے کب آئے رضیہ! اس کے دل میں آگ بھڑک رہی ہے۔۔ رو لے۔۔ بدنصیب۔ تیری بچی کا کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے۔ وہ یہاں سے ماں کی نفرت کی سوغات لئے جا رہی ہے"

ممی کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

"نہیں۔ نہیں۔ میرے اللہ نہیں!" باجی تھر تھر کانپنے لگیں۔

باجی!"

"جی گھبرا رہا ہے نوشی۔ طاہر بھائی۔ دل گھبرا رہا ہے"

اور زندگی میں پہلی اور آخری بار ممی عذرا کو گلے سے لگائے رو رو کر کہہ رہی تھیں۔

"میری بچی مجھے معاف کرنا۔۔ میں تمہاری ماں ہوں۔ میں نے کبھی تمہارا برا نہیں چاہا۔ میری دعا ہے تم سکھی رہو۔ آباد رہو۔ بیٹی تم جا رہی ہو۔ یہ گھر آج تمہارے لئے پرایا ہو گیا ہے جاتے ہوئے ایک بار۔۔ صرف ایک بار! مجھے ماں کہہ کر پکار لو۔۔ میری عذرا۔۔ مجھے معاف کر دینا۔۔ لا"

"ماں!" ایک درد آلود تڑپتی ہوئی چیخ عذرا کے منہ سے نکلی۔ دوسرے لمحے وہ ممی کی باہوں سے پھسل کر فرش پر آ رہیں۔

شور و غل، چیخ و پکار، ساز و آہنگ جب تھم گئے۔ تب نبض ہستی بھی تھم گئی۔

ڈاکٹر نے تاسف انگیز طریقہ پر ان کی نبض چھوڑ دی۔

"عذرا کیسی ہے۔ اسے کیا ہوا ہے؟" خالہ امی بے قرار تھیں!

"صبر کیجئے بیگم صاحبہ! اچانک کسی صدمہ یا خوشی سے دل کی حرکت بند ہو گئی"

ڈاکٹر کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کے لب ہل رہے تھے۔ نوشینہ کو کچھ بھی سنائی نہ دیا۔ ایک ایک کر کے ساری بردمی زندگی مٹ گئی۔ عظیم الشان محل کے در و دیوار کو موت کے بلیغ سکوت نے نگل لیا۔ ساری دنیا میں بہت ہیبت ناک ویرانی چھا گئی۔

نوشی نے جھک کر ان کے سرد اور بے جان رخسار پر اپنے لب رکھ دیئے۔ اور خود بھی غافل ہو گئی۔

طاہر اور نوشینہ روز صبح عذرا کی قبر پر پھول چڑھاتے گھنٹوں بلا مدعا مٹی کے اسی ڈھیر کو دیکھتے رہتے۔ جس کے نیچے ان کی پیاری محبوب ہستی ابدی خواب میں غافل تھی۔ کبھی کوئی موہوم آہٹ ہوتی اور نوشی چونک کر قبر کو اس انداز میں دیکھنے لگتی جیسے بھولے سے عذرا نے آواز دی ہو۔

انہوں نے سب کو معاف کر دیا تھا۔

لیکن نوشینہ کبھی فیصلہ نہ کر سکی۔ معافی مانگنے والے عظیم ہوتے ہیں۔ یا معاف کرنے والے۔ جو تمام ظلم و ستم بھول کر کسی کو معاف کر دیتے ہیں ۔۔۔!!

جو ہستی اس الجھن کو دور کر سکتی۔ وہ تو سدھار چکی تھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ...!!!

غیاث احمد گدی
پیکر۔ حیدرآباد (دکن)

جھولی ہوئی شاخ

لوگ اب کانے چچا کو دیکھ کر ہنستے ہیں!

لیکن یہ بات بہت پہلے کی ہے۔ جب کانے چچا کانے نہیں تھے۔ کانے تو خیر اب بھی نہیں ہیں۔ البتہ ذرا ایک آنکھ بھینگی ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ شاخ جب جھول جاتی ہے تو اسے ہرا بھرا کھینچ کر، جھنجھوڑ کر چلا جاتا ہے — مگر ان دنوں شاخ جھولی نہیں تھی، تنی تھی۔ کانے چچا کے پٹھوں میں زور تھا۔ گردن اور رانوں پر سیر دن گوشت یوں بھرا پڑا تھا۔ جیسے لوہے کے پتھر لگے ہوں۔ بھاری چہرے پر ذرا ذرا سی مونچھ۔ سارے بدن میں ہر وقت اکھاڑے کی مٹی لگی رہتی۔ گھر میں گٹے بھینسیں بھری پڑی تھیں۔ اکھاڑے سے آکر سیر دن، دودھ غٹ غٹ چڑھا جاتے۔ کام ان کا کچھ خاص نہیں تھا۔ دو چار بھینسوں کی سانی لگانی، دس پانچ ناڑے پوال کے گنڈاسے سے کاٹے اور دن بھر چارپائی پر پڑے لمبے لمبے خراٹے لیا کرتے۔ کبھی... ان کی اماں برآمدے میں سے اوپلے لے کر گزرتی ہوتیں تو یوں کھاٹ پر سلک کی رنگین لنگی باندھے ننگے بدن پڑے ہوئے چیتے جیسے بیٹے کو دیکھتیں تو دنگ رہ جاتیں... پہلے تو انہیں یقین ہی نہیں آتا کہ اس چٹان کو انہوں نے جنم دیا ہے۔ مگر یکبارگی جب انہیں اپنے شوہر کی یاد آتی تو وہ چونک پڑتیں۔ کیا شیروں جیسی چھاتی ہے نگوڑے کی۔ تب بڑھ کر بے خبر سوئے ہوئے بیٹے کی بلائیں لیتیں۔ کچھ دیر تک دیدے پھاڑ پھاڑ کر بیٹے کے وجود کو گھورتیں اور اچانک ایک دوہتڑ چھاتی پر لگاتیں۔

"ارے اٹھ رے سرمیا، تو کب سے سو رہا ہے؟"

سرمیا چھاتی پر یوں ہاتھ پھیرتا گویا کوئی چوہیا گر پڑی ہو۔ اور آہستہ سے اوں ہنہ کہہ کر کروٹ بدل لیتا۔ یا کبھی ماں کے ہاتھوں کو پکڑ کر دھکا دے دیتا۔ یہ دھکا کانے چچا اپنی دانست میں آہستہ سے دیتے۔ مگر چچا کی ماں گیند کی طرح کونے میں پڑے پوال کے ڈھیر پر جا گرتیں پھر اٹھتیں تو درجنوں کوسنے دے ڈالتیں جو دراصل کوسنے نہیں دعائیں ہوتی تھیں۔ پھر چچا پر ٹوٹ پڑتی تھیں۔ "ارے بھڑوا کا جنا اٹھ حرام کور... کمڈھیا... نربیا... اٹھ اٹھ..." اور چچا کے لمبے لمبے بالوں کو جنہیں وہ اکھاڑے لڑنے کے باوجود دن بھر میں تین بار آملے کا تیل اور پانی لگا کر کنگھا کیا کرتے تھے دونوں ہاتھوں سے نوچتیں۔ "ارے اٹھ رے سانی لگانے کا بکھت ہوگیا۔ اٹھ رے سرمیا..." پھر چچا بڑے تساہل سے اٹھتے، ماں کو حسب عادت اور حسب روایت گالیاں دیتے، منہ پر پانی کے چھینٹے مارتے۔ گوبر اور بھینسوں کے پیشاب میں سندھی رنگین لنگی کے کونے سے منہ پونچھتے بھینسوں کو سانی لگانے جٹ جاتے۔ لوہے کے بھاری بھاری ٹب جو چنی، کھلی اور کٹی سے بھرے ہوئے ہوتے دو

جھٹکوں میں لٹو کی طرح نچاتے ہوئے بھینسوں کے آگے رکھ دیتے۔ سبحان میاں، چچا کے ابا بیٹے کی پھرتی دیکھ کر من ہی من میں بہت خوش ہوتے۔ اکثر وہ لوگوں کے درمیان کالے چچا کا ذکر یوں کرتے گو یا شہر میں دوسرا جوان ہے ہی نہیں ان کے جوڑ کا۔ پھر چچا بھی بزعم خود اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتے تھے۔ اسی لئے اکثر طاقت اور جوانی کے نشے میں کوئی نہ کوئی ایسی حرکت کر جاتے جس کی وجہ سے چچا کے ابا میاں کو پریشانیاں اٹھانی پڑتیں۔

ایک دن باتوں باتوں میں محلے کے جوانوں کو کالے چچا نے للکارا کہ جو کوئی سانی سے بھرے ہوئے لوہے کی کے ناند کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنے سر سے اوپر اٹھائے گا اسے چچا اپنی نئی تھان بھینس انعام میں دیدے گا۔ اگر کوئی نہ اٹھا سکا تو وہ خود اٹھا کر دکھلا دے گا۔ بات بظاہر معمولی تھی۔ مگر غور کیا جائے تو پہاڑ جیسے چچا نے تو جوانی کے جوش میں آکر چیلنج کر دیا، مگر سانی سے بھری ہوئی ناند کو سر سے اوپر اٹھا لینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ سبحان میاں نے سنا تو جھٹ چچا کی گردن پکڑ لی اور پیٹھ پر ایک بھرپور دھول جماتے ہوئے ماں کی گالی دی "ابے سونڈ کے پلے ای تو نے کیا کر دیا؟ کوئی اٹھا لیا تو مفت میں تھان بھینس ہاتھ سے جاتی ہے اور اگر کوئی نہ اٹھا سکا تو محلے بھر میں تو کہاں کا گاما پہلوان ہے جو ایسا کر سکے گا؟" چچا نے گردن پر سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے آہستہ سے اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا جس کے وقوع پذیر ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے اور جس میں چچا پانچ پانچ سیر کی دودھ سے بھری ہوئی بالٹی دونوں ہاتھوں میں لے کر کھڑی بھینس پھاند گئے تھے۔ اور یوں کہ دودھ کی ایک بوند بھی نہ چھلکی تھی...!

"ابے وہ اور بات تھی بہادر۔ اس میں طاقت کی کم بات تھی اور ترکیب کی زیادہ... اس میں تو طاقت چاہئے طاقت..."

تھوڑی دیر کے لئے چچا بھی پچھتائے کہ ناحق اتنی بڑی ڈینگ ہانک دی۔ کہیں وہ واقعی ناند نہ اٹھا سکے تو؟ یا پھر اس سے پہلے محلے کے کسی اور نوجوان نے اٹھا لیا تو، اس کے بعد انہوں نے ناند کو اٹھا بھی لیا تو کیا فرق پڑتا ہے؟۔ مگر یہ خیال ان کے دل میں سائے کی طرح ایک لمحے کے لئے آیا اور گذر گیا۔

جس روز ناند اٹھانے کا مقابلہ ہونے والا تھا اس دن سارے نوجوانوں میں ایک امنگ سی جاگ اٹھی۔ صاف ستھرے رنگین کپڑوں میں ملبوس لوگ ایک دائرے کی شکل میں کھڑے تھے۔ ایک طرف دو تین چار پائیوں پر چند بوڑھے اور ادھیڑ عمر بیٹھے حقے کے کش کے ساتھ یا تو اپنے وقتوں کے کارنامے دہرا رہے تھے یا پھر گالیاں بک رہے تھے۔ بلا وجہ گالیاں، چارپائیوں کے پیچھے چند عمر رسیدہ عورتیں بھی اکھڑی ہوئی تھیں اور ان کے درمیان جہاں تہاں دو چار نوجوان خوبصورت چہرے یوں جگمگا رہے تھے جیسے پانی بنے دودھ کی سطح پر مکھن کے ڈھیلے تیر رہے ہوں۔ مقابلہ شروع ہوا۔ کھلی، چنی اور کٹی سے بھری ہوئی ناند سامنے لائی گئی۔ ایک بوڑھے نے ایک ایک جوان کا نام لے کر پکارنا شروع کیا، رجینا، الفتوا، صیدعا، مجیدا، اختر دا....

بعض تو صرف ناند کو گہری نظر سے دیکھ کر اس کے گرد گھوم کر چل دیئے۔ بعضوں نے زور آزمائی بھی کی۔ مگر گھٹنوں تک بھی نہ اٹھا سکے تو لوگ زور زور سے قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔ جب کوئی جوان کوشش کر کے تھک جاتا اور گردن سے پسینہ پونچھتا ہوا کھسکنے لگتا تو لوگ چیخ چیخ کر ہنستے اور تالیاں بجانے لگتے اور وہ جوان جھینپتے ہوئے چپکے سے ہنستا ہوا بھاگ جاتا۔ پھر دوسرے کی باری آتی۔ اس طرح ایک ایک کر کے سبھی نکل گئے تو میدان میں دو رہ گئے۔ حشموا اور علیا۔ یعنی کالے چچا۔ اب مجمع کی حالت دیکھنے کے لائق تھی۔ لوگوں کے تنفس تیز ہو گئے تھے اور آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ دلوں میں ایک طرح کی سرسراہٹ سی شروع ہو گئی۔ چچا ر دلا طرف دیکھتے ہوئے حشموا نے کہا "لے بھائی علیا اللہ علی کا نام لیکر..."

چچا نے جواب دیا "نہیں یار، میں تو آخر میں اٹھاؤں گا۔ تیری باری ہے"...

لوگوں نے کہا "ہاں ہاں علیا آخر میں اٹھائے گا۔"

مگر ناند، حمزا سے بھی نہ اٹھ سکی۔ سینہ تک لاتے لاتے اس کی سانس اکھڑ گئی۔ اب چچا کی باری تھی۔ چچا نے سنتے ہی کرتا ایک طرف اتار کر پھینک دیا۔ لنگی کو ایک جاگہ کساچھی طرح رانوں کے درمیان سے لا کر کمر میں اڑس لیا پھر دو بار جلدی جلدی ڈنڈ لگائے۔ [illegible] پھر یا جرأت علی کہتے ہوئے ناند کو اٹھانے لگا۔ دھیرے دھیرے تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں نے گھٹنے کو پار کیا۔ اس وقت چچا کا سارا جسم دکانپنے لگا۔ بازوؤں کی مچھلیاں الٹ الٹ گئیں۔ پاؤں تھرانے لگے۔ چچا پسینے سے شرابور ہو گئے۔ مگر ہمت نہیں ہاری۔ اب ناند چھاتی تک پہنچی۔ چچا کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اب جہاں سے ہاتھ کو پلٹ کر ناند کے تلے کو پکڑنا تھا ان کا دم پھول گیا۔ انہوں نے ہڑبڑا کر بے اختیارانہ ناند کو زمین پر پھینک دیا۔ اور گردن جھکائے لمبی لمبی سانس لیتے ہوئے ایک طرف کو ہو لیے۔ مگر مجمع میں اس بار سناٹا ہی رہا۔ کہیں ہنسی چھوٹی نہ فقرے کسے گئے۔ ایک ساعت کے لئے کھیل کے اس میدان میں موت کا سا سناٹا طاری ہو گیا۔ پھر اچانک ناند کے قریب کانچ کی دو چوڑیاں چھن کرتی گر کر بکھر گئیں اور عورتوں کا زوردار قہقہہ امڈ پڑا۔ لوگوں نے پلٹ کر دیکھا۔ انوریا منہ میں آنچل دیئے ہنسی روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور باقی عورتیں کھل کھلا کر ہنس رہی تھیں۔ اب مردوں نے بھی ہنسنا شروع کر دیا۔ سارے جوانوں کی خفت گویا چچا ہی کے سر پڑ گئی۔ ناند کے قریب ایک نحیف و نزار جوان نے چوڑیوں کے ٹکڑوں کو چن کر آہستہ سے چچا کی طرف بڑھا دیا۔ "لو یار جوڑ کر پہن لو۔۔۔ دینے والا اگر پہنا دیتا تو کیا ہی اچھا ہوتا۔۔" چچا کو یکایک محسوس ہوا گویا اس کے بدن میں چیونٹیاں سی لگ گئی ہوں۔ اس نے تڑپ کر بیٹھے ہوئے دبلے پتلے جوان کو اٹھا کر ناند پر رکھا اور بیچارگی ناند کو نانا یوں سر سے اوپر اٹھا لیا کہ لوگ بھونچکا رہ گئے۔ پھر زور زور سے تالیاں بجیں اور ادھر ناند پر بیٹھا ہوا نوجوان چیخنے لگا

"ارے بچاؤ۔۔۔ بچاؤ رے۔۔۔ مر گیا ارے باپ۔۔۔"

(۲)

جس روز مقابلہ ختم ہوا۔ سارے محلے میں چچا کا ذکر ہو رہا تھا۔ اسی روز شام کے جھٹپٹے میں محلے کی گلی کے نکڑ پر چچا نے انوریا کو اپلے بھری ٹوکری لے کر آتے ہوئے دیکھا تو بیچ گلی میں سینہ پھیلا کر کھڑے ہو گئے۔ "ماں نے دودھ پلایا ہو تو دھکے دے کر گذر جا۔۔۔!"

یوں انوریا کمزور لڑکی نہیں تھی۔ گوالے کی بچی تھی۔ دودھ اور گھی میں پرورش ہوئی تھی اس کی، مگر عورت ذات تھی۔ اگر چچا کی جگہ اس وقت محکمانہ مرزا رمضانیاں ہوتا تو اس اکیلے میں اس کا دل ضرور کانپ جاتا۔ کوئی دیکھ لے گا تو۔۔۔ اور عین اسی وقت اس کے ہونٹوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ یوں آئی کہ چچا کا فولاد جیسا وجود موم کی طرح پگھلنے لگا۔ وہ ہڑبڑا کر ادھر کچھ کہنے لگے، ادھر انوریا نے جب دیکھا موقع غنیمت ہے تو آہستہ سے چچا کے جسم کو دھکا دے کر اوپلوں سے بھری ٹوکری کو سنبھالتی ہنستی ہوئی گذر گئی۔ "دیکھ لیا نا علیا، کیسے دھکا دے کر نکل گئی۔۔۔" اور چچا کنپٹیوں سے پسینہ پونچھتے رہ گئے۔

اس روز کے بعد سے چچا کی نیند اڑ گئی۔ دن تو دن رات کو بھی دو پہروں کھلے آسمان کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھا کرتے۔ کام دھام میں من نہیں لگتا۔ موقع بے موقع انوریا کے پیچھے بھاگتے اور انوریا ہمیشہ ٹھینگا دکھا کر ہنستی ہوئی بھاگ جاتی۔ ویسے چچا کو علم تھا کہ انوریا بڑی تیز لڑکی ہے اور شہوا کی منگیتر بھی۔ راستے سے اکثر ملا کرتی ہے۔ محلے بھر میں سرگوشیاں ہوتی تھیں۔ مگر کسی میں اتنی جرأت نہ تھی کہ اسے ٹوک سکے۔ چچا جانتے تھے کہ انوریا ان کے مقدر میں نہیں، مگر پھر بھی ایک نامعلوم سی طاقت انہیں کھینچے پھرتی تھی۔

ادھر حشمو جو محلے بھر میں اپنے کو بے جوڑ سمجھ بیٹھا تھا۔ ناند والے مقابلے کے بعد بڑا پژمردہ گردن جھکائے سوچ میں گم رہا کرتا۔ جب کبھی چچا کا سامنا ہو جاتا تو پشیمانی تر ہو جاتی۔ انوریا سے ملاقات ہوتی تو وہ بھی چٹکیاں لیتی "کوئی بات نہیں۔ اب کی بھوری بھینس کا دودھ پینا پھر علیا سمیت ناند اٹھا لینا۔۔۔!" اس پر حشمو تلملا کر رہ جاتا۔

"تجھے بھری ہری کا سوجھے ہے کیا" حشمو نے اس کی چوٹی پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا "ادھر یہاں میری جان پر بنی ہے۔"

"ارے میری چوٹی چھوڑ... چھوڑ...!"
"پہلے وعدہ کر کہ [illegible] نہیں کرے گی...!"
"نہیں پہلے چوٹی چھوڑ...!"
"نہیں پہلے...!"
"اچھا باوعدہ کرتی ہوں۔"

حشمو نے اس کی چوٹی چھوڑ دی اور اب چپ چاپ املی کے پیڑ تلے پھیل کر بیٹھ گیا۔ چپ چاپ گم صم... انوریا اپنے بالوں کو درست کرتی جاتی تھی۔ اور منہ ہی منہ میں گالیاں بکتی جا رہی تھی۔ پھر وہ بھی خاموش ہو کر اس کے قریب ایک اینٹ پر بیٹھ گئی۔

"ایک ترکیب بتاؤں!"
"پھر وہی بات۔"
"نہیں، اللہ قسم، ایک بڑی اچھی ترکیب ہے، اگر سنے تب...!"
"کھا میرے سر کی قسم مذاق نہیں کرے گی۔"

انوریا نے گویا تڑپ کر جواب دیا۔ "کیوں تیرے سر کی قسم کھاؤں، تو میرا کون ہوتا ہے؟"
"میں؟ تیرا گھر والا، آج نہیں تو کل تو ہوں گا ہی...!"

انوریا یکایک سرخ ہو گئی، اس نے جلدی سے اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھک لیا۔ ایک قہقہہ گونج اٹھا۔ حشمو نے اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے آہستہ سے اس کے کان کے پاس لے جا کر کہا "خدا کی قسم یہی ادا تو قتل کر ڈالے ہے... اچھا بتا، وہ اپنی ترکیب تو بتا؟"

کچھ دیر بعد انوریا نے اس کے کان میں آہستہ آہستہ کچھ باتیں کہیں، جنہیں سن کر وہ ایکدم سے اچھل گیا "کمال کر دیا میری بلو نے ایسا ہی کرونگا مگر..." مگر انوریا ہنسی ہنسی میں تو کہیں علیا کو تو اپنا دل نہ دے بیٹھنا... ہاں...؟"

"ارے ہٹ، میں کیا تیری بہنوں جیسی ہوں...!" انوریا نے اپنے رشتے کی رعایت سے مذاق کیا۔

دوسرے روز حشمو نے ڈھول پٹوا کر یہ اعلان کروا دیا کہ پرسوں سہ پہر نا ندوالا مقابلہ پھر ہوگا۔ جس کو حصہ لینا ہو وہ آجائے ساتھ ہی چائے پانی کا انتظام بھی حشمو کی طرف سے ہوگا۔

اور یہ بات مقابلے سے ایک روز پہلے کی ہے۔ ابھی کوئی زیادہ رات نہیں گئی تھی۔ چاندنی دور دور تک پھیل چکی تھی۔ علیا چچا، انوریا کے پلال والی کوٹھری کے پچھواڑے چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ قریب ہی دروازے پر کھڑی انوریا "نہیں نہیں" کر رہی تھی اور دھیرے دھیرے ہنس رہی تھی۔ گویا اسے کوئی گدگدی کر رہا ہو۔ پھر یکایک اس نے آگے بڑھتے ہوئے چچا کو گھور کر سنجیدگی سے کہا "نہیں علیا! یوں نہیں... ہرگز نہیں...!"

"تو پھر؟" چچا کا دل دھڑکتا دھڑکتا اچانک تھم گیا۔
"پہلے ایک شرط ہے...!"
"بول بول.... ذرا اللہ قسم، جلدی ذرا...!"
"تو میری ایک چھوٹی سی بات بھی تو نہیں مانتا۔ میں کیوں مانوں تیرا کہنا...!"
"ارے بول نا سالی... تو کہے تو جان بھی دے دوں...!"

"جان کا کیا کروں گی... میری جان اپنے ذو بھر ہے۔ بڑی چھوٹی سی بات ہے۔"

"مگر کیا بول تو سہی!"

"میں کہوں تو کیا اس کے سامنے والے درخت پر چڑھ جائے گا؟"

"چڑھ جاؤں گا۔"

"رات بھر یہاں کھڑا رہے گا؟"

"رہوں گا... تو کہہ تو تارے لے آؤں گا آسمان سے، پر تو کہہ بھی..."

"تارے نہیں، اس کا کیا کروں گی میں... اس سے اچھے اپنے اوپلے ہی ہیں جنہیں جلا کر آگ تاپتے ہیں لوگ جاڑے میں۔ تو صرف کان پکڑ کر سو بار اٹھو بیٹھک... کرے گا؟"

"ضرور کروں گا۔"

"تو پھر کر!" انوریا نے لاپروائی سے حکم صادر کیا۔

مگر چچا ٹھٹک گئے۔ "یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔ اور اگر کسی نے دیکھ لیا تو...؟"

"تیرے لئے جان... دے دوں گا، تارے توڑ لاؤں گا... ہُنہ... دیکھ لیا تیرا پیار۔" انوریا نے طعنہ دیا اور منہ بنا کر کوٹھری کی طرف چلی۔

"ارے بات تو سن انوریا؟"

"کیا فائدہ؟" انوریا نے رک کر جواب دیا۔ "تجھ سے کچھ نہیں ہوگا۔ تو گھر جا۔"

"مگر اس سے تجھے کیا ملے گا؟"

"بس کچھ نہیں۔ ذرا آزمائش!"

"اچھا یہ بات ہے تو بھی دیکھ لے آج اپنے علیا کو۔" یہ کہہ کر چچا نے بڑے جوش و خروش سے اٹھک بیٹھک شروع کر دی۔ ایک... دو... تین... چار... ٹھیک اسی وقت زوردار قہقہوں سے سارا چوپال گونج اٹھا۔ علیا چچا نے پلٹ کر دیکھا تو چھ سات اور جوان کھڑے ہنس رہے تھے۔

"کیوں بھائی! کیا بات ہے۔ کس قصور کی سزا مل رہی ہے!"

انوریا نے موقع غنیمت دیکھ کر کہا۔ "یہ علیا بیٹھک لگا رہا ہے۔ کل مقابلے میں جانا ہے نا۔ اسی لئے" یہ کہتی ہوئی اندر کمرے میں چلی گئی۔

کانے چچا نے محسوس کیا، گویا منوں مٹی پڑ گئی ہو ان پر۔ ان کی گردن اچانک خمیدہ شاخ کی طرح جھک گئی۔

دوسرے دن مقابلہ ہوا۔ نا نذر سے اوپر تو کیا گھٹنوں تک بھی نہ اٹھ سکی... اس بات کو بہت دن ہوئے، برسوں گزر گئے۔ علیا چچا کی شادی بھی ہوئی۔ بچے بھی ہوئے ــــ مگر وہ تنی ہوئی شاخ جو جھکی تو جھکتی ہی چلی گئی!

بشیشر پردیپ

شبستان۔ لاہور

مصنوعی آنکھ

یہ تو میں کبھی سوچ ہی نہیں سکتی تھی۔ کہ اپنی مصنوعی آنکھ کی وجہ سے جو اداسی میرے من پر بچپن سے چھائی چلی آ رہی تھی۔ وہ ایک دن یوں اچانک جاتی رہے گی۔ اور یہ آج ہی ہوا ہے۔ ابھی ابھی کوئی دو گھنٹے پہلے۔ دو ماہ ہو چکے ہیں میری شادی کو۔ لیکن مجھے آج تک سچی خوشی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اور اب — اب میں کتنی خوش ہوں۔ کتنی خوش۔

میں ڈیڑھ برس کی تھی جب میری دائیں آنکھ جاتی رہی تھی۔ اس حادثے کی یاد تو بھلا مجھے کیا رہی تھی۔ لیکن اپنی بدقسمتی کا احساس مجھے میری ممی کی سرد آہوں نے بچپن ہی میں کرا دیا تھا۔ جہاں تک ایک آنکھ سے دکھائی دینے کا سوال ہے۔ تو یہ کمی اس وقت جب میں نے ہوش سنبھالا۔ مجھے بالکل محسوس نہیں ہوئی۔ اس وقت میں یہی سمجھتی تھی۔ کہ میرے ساتھ کے بچوں کو، منوج کو، درشی کو۔ آشا کو بھی اسی طرح نظر آتا ہے۔ ایک طرف روشنی اور ایک طرف اندھیرا۔ لیکن ان سب کو دائیں طرف دیکھنے کے لئے اس قدر سر کو گھمانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس بات پر بھی میں نے زیادہ غور نہیں کیا۔ اس وقت مجھ میں اتنی صلاحیت ہی کہاں تھی۔ اور پھر میری مصنوعی آنکھ بھی تو اتنی عمدہ تھی۔ کہ اصل کا گمان ہوتا تھا۔ میری مصنوعی آنکھ میرے ڈیڈی نے ایک جرمن ڈاکٹر سے بہت بڑی رقم دے کر لگوائی تھی۔ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے پر مجھے اپنی دونوں آنکھوں میں کوئی فرق نظر نہ آتا۔ دونوں میں گلابی ڈورے تھے۔ سفیدی تھی۔ تھوڑا سا بھورا پن لئے ہوئے سیاہی تھی۔ دونوں موٹی موٹی اور خوبصورت تھیں۔ اور فرق کو سمجھنے کا مجھ میں شعور نہیں تھا۔ اور پھر جلد ہی اپنا یہ نقص مجھ پر ظاہر ہو گیا۔ یا یوں کہئے کہ ظاہر کر دیا گیا۔ اور وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ میری آدھی دنیا پر اندھیرا چھا گیا۔ میری شوخیاں میری شرارتیں ختم ہو گئیں۔ اور میں اچانک ایک سنجیدہ اور خاموش طبع لڑکی میں بدل گئی۔ اب مجھے دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل کود زیادہ اچھا نہ لگتا تھا۔ میری خواہش ہوتی کہ میں ان سب سے الگ تھلگ رہوں۔ مجھے ہر وقت ڈر رہتا کہ کوئی بچہ میرے اس نقص کی طرف اشارہ نہ کر دے۔ مجھے یہ جتا دے کہ میں صرف ایک آنکھ رکھتی ہوں۔ میرا اتنا خوبصورت چہرہ ایک آنکھ کے مصنوعی ہونے کی وجہ سے خوبصورت نہیں کہلا سکتا۔ عورت کے اندر اپنی خوبصورتی کو خود پرکھنے کا اور دوں سے اس کی تعریف سننے کا شوق شروع ہی سے ہوتا ہے اور میرا یہ شوق مجروح ہو گیا تھا۔

اور پھر لڑکی تو پرایا دھن ہوتی ہے۔ میری ممی کی سرد آہیں مجھے اور بھی بے چین کر دیتیں۔ ہے بھگوان! یہ تیری کیسی لیلا ہے؟ تو نے میری بچی کو گورا رنگ دیا۔ تیکھے نقش دیئے، لمبے گھنے بال دیئے۔ دو موٹی موٹی بادام سی آنکھیں دیں۔ اور پھر ایک آنکھ چھین لی۔ اس کے لئے

کوئی اچھا لڑکا مل سکے گا ہمیں؟"

میرے بال گوندھتے وقت، مجھے کپڑے پہناتے وقت، وہ میرے چہرے کو ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگتیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگتے

"کیا بات ہے ممی؟"

"کچھ نہیں — کچھ نہیں بیٹی!" وہ آنسو پی جاتیں۔

اور میں اداس سی۔ حیران سی۔ سہمی ہوئی سی ان کی طرف دیکھنے لگتی۔ ان سے کچھ نہ کہہ سکتی۔

بچپن میں جس بچے سے مجھے سب سے زیادہ ڈر لگتا تھا۔ جو میرا سب سے زیادہ مذاق اڑایا کرتا تھا۔ وہ تھا منوج — منوج جو میرے ڈیڈی کے دوست کا لڑکا تھا — میرا پڑوسی تھا۔ اور ہر وقت ہمارے ہی گھر رہتا تھا۔ جب میں ایک برس کی تھی تو وہ تین برس کا تھا — ممی کہتی ہیں۔ وہ اپنے گھر سے ٹافیاں بسکٹ لے آتا۔ اور میرے منہ میں ٹھونس دیا کرتا۔ مجھے وہ اٹھائے رکھ، گود میں لینے کی بہت کوشش کرتا اور اس کی یہ کوشش مجھے رلا رلا دیتی۔ میری آنکھ کے ضائع ہو جانے کے بعد اس کی اس کوشش کی ناکامی ہی نے جیسے اس کے دل میں میرا مذاق اڑانے کے انتقامی جذبہ کی شکل اختیار کر لی ہو۔ وہ بات بات پر مجھے "کانی" کہتا۔ سب کے سامنے نقلی آنکھ والی کہتا۔ ہم کانی کو نہیں کھلائیں گے۔ میرا منہ چڑاتا۔ میں روہانسی سی ہو جاتی۔ اور اسے رحم نہ آتا — اور میں بہت روئی تھی — میں اس کے ساتھ نہیں کھیلوں گی۔ میں نے اپنے تئیں فیصلہ کر لیا اور میں اس سے کترانے لگی۔ اپنے کھلونوں سے آپ ہی آپ کھیلتی رہی۔ اور اسے یہ بھی ناگوار گزرا۔

"ککو! تم کیا سمجھتی ہو۔ میں تمہارے بغیر کھیل نہیں سکتا۔"

"تو جاؤ نا کھیلو جا کر!"

"جاتا ہوں! کانی کہیں کی۔ زیادہ رعب نہ جتایا کرو ککو! نہیں تو میں تیری دوسری آنکھ بھی پھوڑ دوں گا۔"

کہا تو اس نے بچپنے کی معصومیت کے ساتھ تھا۔ لیکن میں کانپ گئی۔ اور اب میں کوئی بھی ایسی بات نہ کرتی۔ جس سے اسے غصہ آ جائے یہاں تک کہ کبھی کبھی بے دلی سے اس کے ساتھ کھیلتی بھی رہتی۔ اور اسی طرح وقت گزرتا رہا۔

میری ممی میرے اس نقص کو اپنی نظروں سے یا میری نظروں سے تو نہیں چھپا سکتی تھیں۔ لیکن انہوں نے دوسروں کی نظروں سے اُسے چھپانے کی پوری کوشش کی۔ انھوں نے شروع ہی سے مجھے اعلیٰ تعلیم دینے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ اسکول کے بعد گھر پر بھی دل لگا کر، پڑھاتیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ میرا یہ نقص میری زندگی کے راستے کی رکاوٹ نہ بنے۔ اگر میری شادی نہ ہو۔ تو میں خود اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکوں دراصل انھیں یقین تھا۔ کہ میری شادی نہیں ہو سکتی۔ لیکن ڈیڈی کا خیال دوسرا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہ دولت سے میری اس کمی کو پورا کر دیں گے۔ ایک اچھا لڑکا دولت سے بھی تو خریدا جا سکتا ہے۔

ممی کی کوششوں سے اتنا تو ضرور ہو گیا۔ کہ میں ہمیشہ اپنی جماعت میں اول رہی۔ اپنے اس نقص کے احساس نے مجھے تنہائی پسند بے شک بنا دیا تھا۔ لیکن وہ میری ذہانت پر پردہ نہ ڈال سکا — ہاں البتہ میرے اندر ایک جذبہ ضرور نشو و نما پاتا رہا۔ نفرت کا جذبہ! ان لڑکوں کے خلاف نفرت جو ظاہری خوبصورتی ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ اور مجھے اپنے گرد سب ایسے ہی لڑکے نظر آتے تھے۔ اور میں سوچنے لگتی۔ میں شادی کروں گی ہی نہیں۔ میری شادی کی زندگی خوشگوار کیسے رہ سکتی ہے؟ دولت میرے اس نقص پر وقتی طور پر ہی تو پردہ ڈال سکتی ہے۔ بعد میں میرا یہ نقص پھر میرے جیون ساتھی کی نظروں کے سامنے آ جائے گا۔ اس وقت اسے چھپانے کے لئے میں دولت کہاں سے لاؤں گی؟ — ڈیڈی سے —؟ نہیں نہیں میں شادی کروں گی ہی نہیں۔

منوج سے بھی اب میری ملاقات رسمی طور پر ہوتی تھی۔ محض ایک پڑوسی کی طرح ہمارے درمیان باتیں ہوتیں۔ تو یہی سکول، پڑھائی کی

امتحانات کی باتیں — کلفٹ میں لپٹی ہوئی اور بس! میری سنجیدگی اور بھی بڑھ گئی تھی۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی۔ کہ بچپن کا شیطان طبیعت منوج بھی اب خاموش طبع ہوگیا تھا۔

اسکول کے بعد کالج میں میں نے میڈیکل گروپ لیا۔ اس وقت وہ دوسرے سال آرٹس میں تھا۔ بعد میں میں میڈیکل کالج میں داخل ہوگئی۔ اور اس نے ایم اے نفسیات میں داخلہ لے لیا۔ ڈیڈی نے ایک دن خواہش ظاہر کی۔ کہ وہ کسی طرح منوج کے والدین کو تیار کریں۔ تو میری شادی اس سے کردیں۔ لیکن میں نے سختی سے منع کردیا۔ شادی اور پھر منوج سے؟ — بچپن کی وہ تمام باتیں ایک ایک کرکے میرے سامنے آنے لگیں اور میں کانپ گئی۔ نہیں نہیں، کبھی نہیں۔ میں شادی کروں گی ہی نہیں۔

لیکن مجھے پتہ چلا کہ ڈیڈی نے میرے منع کرنے کے باوجود منوج کے والدین کو اشاروں ہی اشاروں میں جتایا تھا کہ وہ میری شادی میں ایک بہت بڑی دولت جہیز میں دیں گے۔ اور اس کے والدین نے اشارہ سمجھتے ہوئے بھی خاموشی اختیار کرلی تھی۔ مجھے ڈیڈی پر تو غصہ آیا ہی لیکن ان کی خاموشی سے میرے نسوانی وقار کو بھی ٹھیس پہنچی۔ کیا عورت کی کوئی بھی خوبی اس کی خوبصورتی کے داغ کو نہیں چھپا سکتی۔ عورت کا چہرہ ہی سب کچھ ہے۔ میں نے منوج سے ملنا جلنا بالکل ترک کردیا۔ ڈیڈی اور ممی نے بھی اس کے والدین سے قطع تعلق کرلیا۔

میں ڈاکٹری کے امتحان میں پاس ہوگئی۔ اس وقت منوج اپنے کالج میں نفسیات کا پروفیسر تھا۔ اس کی ذہانت کے چرچے مجھ تک بھی پہنچتے تھے۔ اور ایک دن سنا کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے سرکاری وظیفہ لے کر انگلینڈ جارہا ہے۔ وہ انگلینڈ چلا گیا۔ اور میں اپنے ہسپتال کے کام میں مصروف ہوگئی۔ ڈیڈی اب بھی مجھے شادی کے لئے مجبور کیا کرتے۔ اور میرے انکار پر ٹھنڈی آہیں بھر کر رہ جاتے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ جو دو تین لڑکے انہوں نے میرے لئے دیکھے تھے۔ وہ محض ان کی دولت کی وجہ سے یا میری ڈاکٹری کی تعلیم کی وجہ سے میرے ساتھ شادی کے لئے رضامند تھے۔ میں ان کی نظروں میں سونے کا انڈا دینے والی مرغی تھی۔ اور کچھ نہیں۔ مجھے ڈیڈی کے احساسات سے بے پرواہ ہونا پڑا۔ میں کر بھی کیا سکتی تھی۔

ایک روز ڈیڈی نے ممی کو بہت خوش ہوتے ہوئے ایک خبر سنائی۔

"کمو کی [illegible]؟ — منوج کو انگلینڈ میں کار کا حادثہ پیش آیا ہے اور اس کی ایک آنکھ جاتی رہی ہے۔ ابھی ابھی ایک تار آیا ہے اس کا۔ اس کے گھر پر تو بھیڑ لگی ہے"

"اچھا — اوہو!" ممی بھی بہت خوش تھیں۔ لیکن مجھے ان کی خوشی بہت عجیب سی لگی۔ یہ کیسی خوشی تھی؛ وہ اس لئے خوش تھے۔ کہ ان کی اپنی بیٹی کی بھی ایک آنکھ تھی۔ اس لئے خوش تھے۔ کہ ان لوگوں نے ان کی ایک آنکھ والی بیٹی کو ٹھکرا دیا تھا۔ یا اس لئے کہ منوج کی ترقی ان سے دیکھی نہیں جارہی تھی۔ آخر وہ کس لئے خوش تھے؟ ایک دکھی آدمی کسی کو دکھی دیکھ کر خوش نہیں ہوتا۔ ایک سکھی آدمی کسی کو سکھی دیکھ کر بھلے ہی جلنے لگے۔ ممی اور ڈیڈی ان کے ہاں افسوس کا اظہار کرنے کے لئے گئے۔ دکھ میں تو دشمن کی بھی خیر و عافیت پوچھ لی جاتی ہے۔ شاید اسی جذبہ سے —

منوج کی آنکھ کے حادثے نے اس کے والدین کا غرور ختم کر ڈالا تھا۔ اس کی ماں اب اکثر ہمارے ہاں آتی۔

"کمودنی کی ماں — منوج کا خط آیا ہے۔ اس نے مصنوعی آنکھ لگوالی ہے"

اور مجھے منوج کی دو آنکھوں میں سے ایک آنکھ ساکن اور بے جان سی نظر آنے لگی۔

"ارے کمودنی کی ماں۔ ولایت میں تو ایسی عمدہ مصنوعی آنکھ بنتی ہے۔ کہ کوئی دیکھے تو حیران رہ جائے۔ منوج نے لکھا ہے کہ اس نے سب سے لائق ڈاکٹر سے آنکھ بنوائی ہے ہاں!"

اور میں سوچنے لگی۔ کہ انگلینڈ میں پلاسٹک کی آنکھ بننے لگی ہے۔ پلاسٹک پر آنسوؤں کی فلورین کچھ اثر نہیں کرتی۔ شیشے کی آنکھ کی طرح وہ جلدی ہی بے رونق نہیں ہوجاتی۔ کیوں نہ میں بھی انگلینڈ جاکر ایسی ہی آنکھ بنوا لاؤں؟

"کمودنی کی ماں ـــ اب تمہیں کمودنی کی شادی کر دینی چاہیے۔ اب اس فرض سے بھی سبکدوش کیوں نہیں ہو جاتیں؟"

اور ـــ تو یہ بات تھی جس کی وجہ سے ممی اور ڈیڈی خوش ہوتے تھے۔ شاید اسی بات کے انتظار میں تھے۔

"کیا کروں، منوج کی ماں! کمودنی نے تو شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے!"

میں اندر بیٹھی ان کی گفتگو سن رہی تھی۔ ممی کی بات سن کر مجھے ہنسی آ گئی۔ کس خوبصورتی سے انھوں نے بات کو نیا الجھاؤ دیا ہے! ماں کے جانے کے بعد لگیں مجھ سے اصرار کرنے۔

"بٹیا۔ تو اب ہاں کر دے۔ ہاں کر دے بٹیا۔ منوج جیسا لڑکا تمہیں ملے گا نہیں۔ اور پھر اب تو منوج بھی!..."

وہ کہتے کہتے رک گئیں۔ شاید انھیں اپنی یہ دلیل بہت کھوکھلی سی لگی تھی۔ لیکن ان کی اس دلیل نے میرے سوچنے کا انداز بدل دیا تھا۔ اس وقت تو میں نے ممی کو ڈانٹ دیا۔ لیکن ان کے جانے کے بعد میں سوچنے لگی۔ اب جبکہ منوج کی بھی ایک آنکھ جاتی رہی ہے۔ وہ میرے برابر ہی تو ہے۔ کسی قسم کا احساسِ برتری اب اس میں نہیں ہوگا۔ اس سے شادی کرنے میں ہرج ہی کیا ہے؟ اب انھیں جہیز کا لالچ بھی کیا ہو سکتا ہے اور میں نے بھی "اچھا ممی جیسے تمہاری مرضی!" کہہ کر ممی اور ڈیڈی کی اداسی کو خوشیوں میں بدل دیا۔

دو ماہ ہو چکے ہیں ہماری شادی کو۔ لیکن پہلے ہی دن میرے دماغ میں یہ خیال بیٹھ گیا۔ کہ یہ شادی محض ایک سودا ہوا ہے ـــ دو مجبوروں کا دو محرومیوں کا آپس میں سودا۔ ایک مصنوعی آنکھ کا دوسری مصنوعی آنکھ سے رشتہ۔ انہوں نے اس وجہ سے میرے ساتھ شادی کے لیے رضامندی دی تھی نا۔ کہ ان کی اپنی آنکھ بھی جاتی رہی تھی۔ انھیں میرے سوا کوئی اچھی لڑکی مل نہیں سکتی تھی۔ انھوں نے اس وجہ سے میرے ساتھ شادی نہیں کی۔ کہ میں انھیں اچھی لگتی تھی۔ ایک عورت کے لئے یہ کتنی خوشی کی بات ہوتی ہے کہ اس کے شوہر نے اسی کے لیے شادی کی ہے۔ لیکن میری قسمت میں یہ خوشی نہیں تھی . میری قسمت میں تو ایک اداسی تھی۔ ایک بوجھ ہے ویسے وہ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ کالا چشمہ پہنے ان کا چہرہ مجھے بہت خوبصورت لگتا ہے۔ اور انھوں نے بھی بارہا میرے چہرے کی تعریف کی ہے۔

"تم کیا جانو کمو۔ تمہارے گورے چہرے پہ یہ کالا چشمہ مجھے کتنا پیارا لگتا ہے!"

لیکن ان کی اپنی آنکھ کے جاتے رہنے سے پہلے بھی تو میرے چہرے پر کالا چشمہ تھا۔ یہ کالا چشمہ تو مدت سے میرے چہرے کا حصہ ہے لیکن اس وقت انھیں ایک پیچھے میری مصنوعی آنکھ بھی نظر آ جاتی تھی۔ مصنوعی آنکھ جسے وہ بچپن سے جانتے ہیں۔ اور اب۔ اب انھیں وہ نظر نہیں آتی! یہ محبت نہیں۔ محبت کا آرٹ ہے اور یہ آرٹ وہ خوب جانتے ہیں۔ ان کے پیار بھرے جملے بھی میرے من پر سے اداسی دور نہ کر سکے۔ میری خوشیاں دب دب جاتیں۔

میں نے بتایا کہ یہ کالا چشمہ ہم دونوں کی زندگی کا ایک اہم جزو ہے اسے ہر وقت پہنے رہنا میری بھی عادت ہے اور ان کی بھی ہاں البتہ وہ کچھ ضرورت سے زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ چوبیس گھنٹوں میں سے صرف سونے کے چھ سات گھنٹوں کو نکال کر باقی ہر وقت اسے پہنے رہتے۔ سونے لگتے تو اتار کر سرہانے کے نیچے رکھ لیتے ہیں جیسے یہ کالا چشمہ نہ ہو پاور گلاسز بھی ہوں۔ کہ جن کے استعمال سے ان کی دوسری آنکھ کی روشنی بھی تیز ہو جاتی ہو آج جب وہ نہانے کے لئے غسل خانے میں گئے۔ تو حسب معمول اپنا کالا چشمہ پہنے ہوئے تھے غسل خانے کے ساتھ کا کمرہ ہمارا ڈریسنگ روم ہے میں اس وقت وہاں کھڑی ڈریسنگ ٹیبل کا سامان ٹھیک کر رہی تھی۔ وہ نہا کر باہر نکلے تو اچانک دہلیز میں لگے کسی کیل سے ان کا چپل الجھ گیا۔ اور وہ بری طرح گرے۔ میں ان کی طرف دوڑی ـــ ان کا چشمہ گر کر چکنا چور ہو گیا تھا۔ اور وہ گھبرائے ہوئے زمین پر سے اس کے ٹکڑے بٹور رہے تھے۔ "چوٹ تو نہیں آئی؟" میں نے دوبارہ پوچھا۔

"نہیں؟ ـ نہیں نہیں۔ بالکل نہیں" انھوں نے میری طرف دیکھا۔ اور میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ان کی دونوں آنکھیں ٹھیک تھیں۔

ہربنس لعل ساہنی — پیکر۔ حیدرآباد دکن۔

بھوک

مجھے اس کمپنی میں ملازم ہوئے دو مہینے سے بھی اوپر ہو گئے تھے۔ اور یہ محض اتفاق تھا کہ بھٹناگر میرا دن رات کا ساتھی تھا۔ کمپنی کے
جس سیکشن میں ڈیوٹی دی گئی تھی۔ بھٹناگر بھی دس روز بعد اسی سیکشن میں تبدیل ہو کر آیا تھا۔ رہائش کے لئے شہر کی سب سے عمدہ آبادی ماڈل ٹاؤن
میں واقع ایک کوٹھی میں مجھے جگہ دی گئی تھی۔ کوٹھی میں دو ہال کمرے تھے جس میں میرے سمیت چھ آدمی رہتے تھے۔ بھٹناگر بھی ہم چھ میں سے ایک
تھا۔ ان دو مہینوں میں، میں نے بھٹناگر کی شخصیت کے کئی پہلوؤں کا مطالعہ کیا تھا۔ اس کی شخصیت اتنی عجیب تھی کہ ایک نظر میں اس کا اندازہ لگانا محال
ہی نہیں ناممکن تھا۔ پہلی ملاقات میں جتنا میں نے اسے جانا وہ اس کی شخصیت کا ایک پہلو تھا۔ اب میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ اس کو پوری طرح سمجھنے کے
لئے ابھی کچھ مہینے اور درکار تھے۔ اس کی شخصیت اس گٹھے ہوئے بڑے پیاز کے مانند تھی جس کا ایک ایک چھلکا اتارنے پر بتدریج مختلف رنگوں اور
جلدوں کا پتہ چلتا ہے۔ بالکل پیاز کے چھلکوں کی طرح میں نے بھٹناگر سے روزانہ ایک ایک چھلکا اتارا کہ اس کی شخصیت کی جلد پر نیا رنگ، نئی بات، نئی
نئی زندگی اور نئی کہانی کا احساس کیا۔ وہ یو پی کا رہنے والا تھا۔ یہاں پنجاب میں اسیر ہو کر رہ گیا تھا۔ تقریباً دو سال سے وہ اس موٹر کمپنی میں پہنچا دیا گیا تھا۔ کمپنی
کے نوے فی صد ملازمین پنجابی تھے اور بھٹناگر ان میں اس طرح گھل مل گیا تھا کہ اس کا یو پی یا پن کہیں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا تھا۔ پنجابی زبان
وہ بخوبی سمجھ لیتا تھا اور جب پنجابی بولنے کی کوشش کرتے ہوئے مجھ سے پوچھ لیتا "کیا گل ہے؟ دسو ساہنی صاحب تو سی تو بولتے ہی نہیں" چھوٹے
چھوٹے ٹکڑوں میں وہ اس چالاک دستی سے پنجابی کے ایک دو موٹے موٹے لفظ ٹھونس دیتا کہ مجھے اس میں اور ان ملازمین جو شاید جالندھر اور ملتان وغیرہ
سے آئے ہوئے رفیوجی تھے میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا۔ بھٹناگر کے مزاج میں ایک مخصوص قسم کا پنجابیوں کا سا اکھڑ پن موجود تھا جو شاید اس کی ناکامی
کی ایک بڑی وجہ تھی۔ دفتر میں ہر آدمی اس کے اکھڑ پن کا شکار بن چکا تھا حتیٰ کہ افسر لوگ بھی اس کے مزاج کی کرختگی کی زد سے نہ بچ سکے تھے اور اسی لئے
دو سال گزر جانے پر بھی وہ صرف نوے روپیہ ماہانہ وصول کر رہا تھا۔ کمپنی نے اس کی ترقی پر غور کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی تھی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ
بھٹناگر نے بھی اس مسئلہ پر کبھی غور نہ کیا ہو۔ اس نے تو ملازمت ملنے کے دن سے ہی محسوس کر لیا تھا کہ نوے روپوں میں وہ بیوی کو بیوی بنا کر اپنے
پاس نہ رکھ سکے گا۔ اپنے چھوٹے بھائی کی تعلیم جاری نہ رکھ سکے گا۔ اپنی جوان بہن کے ہاتھ پیلے کرنے کے لئے رنگ نہ جٹا سکے گا اور ان چند سکوں سے
وہ ان سب کے علاوہ اپنے بوڑھے ماں باپ کی ان امیدوں کو پروان نہ چڑھا سکے گا جن کو اس کے ماں باپ نے اس کی پیدائش سے لے کر
آج تک اسی کے ساتھ ہی پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ ان کی ان امیدوں اور بھٹناگر کی عمر میں اب تک چنداں فرق نہیں تھا۔ لیکن اب شاید امیدیں آہستہ آہستہ
دم توڑ رہی تھیں اور بھٹناگر انہیں زندہ رکھنے کی ناکام کوششوں میں مصروف تھا۔ وہ اپنی ملازمت سے مطمئن نہ تھا اور اسی لئے وہ اپنے سارے حالات

سے نالاں تھا۔ اس میں درتی بھر شبہ نہیں کہ وہ اپنے اقتصادی حالات کو سنوارنے بنانے اپنے ماحول کو خوشگوار بنانے کے لئے بالکل ناقابل تھا۔ میں اسے بیشتر ظاہر ہنستے ہوئے دیکھتا تھا۔ لیکن میں نے اس کی مسکراہٹ کے پردے میں ایک بے اندازہ غم آہوں کا سیلاب بہتے ہوئے محسوس کیا ہے۔ تھرکتے بدن کو لہراتے ہوئے جب وہ ناچ ناچ کر تالی بجاتا اور ساتھ ہی میری جان خوب بجاتا میری جان پہرے والا میری جان ساڑھے بارہ وغیرہ کی صدائیں لگاتا تو کمرے میں رہنے والے دیگر ساتھیوں کے لئے تفریح کا سامان بن جاتا کوئی اسے تیرہ صنف سے منسوب کرتا تو کوئی اسے موٹی سی گالی دے کر اور اس کی مراسی خاندان سے وابستگی کا اعلان کر کے قہقہہ لگا دیتا۔ لیکن میں اسے ایسی حرکتیں کرتا ہوا دیکھ کر اس کی زندہ دلی کا مداح بنتا جا رہا تھا۔ مجھے اس کا بغور اور مسلسل مطالعہ کرنے پر یہ احساس ہوا کہ بھٹناگر جب اپنے مصنوعی قہقہوں سے یہ ظاہر کرتا ہے تو رونے کی بجائے زور زور سے ہنستا ہے حتیٰ کہ ہنستے ہنستے اس کے آنسو امڈ آتے تو دیگر سب لوگوں کے لئے وہ ہنسی کی شدت سے نکلے ہوئے آنسو ہوتے تھے لیکن مجھے وہ ہمیشہ اس سیلاب کی مانند دکھائی دیتے جو بہر کو توڑ کر اور بناوٹی ہنسی کے باند بہاتے ہوئے نکلنے کی کوشش میں کامیاب ہو گئی ہو۔

بھٹناگر کمیں رہتے تھا اس عرصہ میں کبھی فضول خرچ تو کیا ضروری اخراجات بھی کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اس کی تنخواہ کچھ معمولی ہی نہیں بلکہ بلا نا گیا جا سکتی تھی کہ کھانا ایک وقت صرف دوپہر کو کھاتا تھا۔ رات کو کبھی کبھی چائے پی لیا کرتا ایک وقت کھانا کھانے کے متعلق میں نے اسے اکثر یہ کہتے سنا کہ اس سے طبیعت ہلکی رہتی ہے۔ تھوڑا کھانے سے معدہ اچھی طرح کام کرتا ہے۔ ہمارا جسم بالکل ایک مشین کی مانند ہے اگر اسے صاف رکھا جائے اور کم کم لیا جائے تو زیادہ دن چلے گا۔ پڑھے لکھے لوگوں پر بھی بار اس کی اس منطق کا جادو چل گیا اور مجھے علم ہے کہ دو تین اور کلرکوں نے بھی ایک وقت کھانے کا فیصلہ کر لیا اور دو دن عمل بھی کیا لیکن تیسرے دن ہی انہوں نے ان دو دنوں کے حصے کا بھی کھانا کھایا اور پھر دونوں وقت پر آ گئے۔ شاید بھٹناگر نے بھی ان کی پیروی نہ کر سکتے تھے۔ مگر مجھے اس کی مجبوری کا آہستہ آہستہ پتہ چل رہا تھا۔ دفتر کے دیگر لوگوں سے وہ اصلیت چھپا سکتا تھا لیکن مجھ سے اس کی حقیقت پوشیدہ نہ رہ سکی۔

پیٹ کی بھوک کہ جسے وہ ایک وقت کھانا کھا کر منا سکتا تھا۔ صحت کے لئے ایک وقت کے کھانے کو مفید بتا کر چھپانے میں قدرے کامیاب تھا۔ لیکن جنسی بھوک کو مٹانا اس کے بس میں اس لئے نہ تھا کہ اس کی بیوی اس سے کوسوں دور تھی جسے وہ اقتصادی مجبوریوں کے طفیل اپنے پاس ایک الگ گھر بسا کر نہ رکھ سکتا تھا اس کی ننھی نویلی بیوی ان دو سالوں میں اپنے شوہر کا قرب بھی دو دن مسلسل سے زیادہ حاصل نہ کر سکی تھی۔ بھٹناگر اپنی اس بھوک کو پوشیدہ رکھنا بھی نہیں چاہتا تھا بلکہ اسے اور زیادہ شدید بنا کر اپنے ساتھیوں سے اس کا اظہار کرنا اس کی عادت میں شامل تھا کیونکہ اپنے عشق کے من گھڑت قصے سنا کر وہ جنسی آسودگی حاصل کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ ایک رات اس نے اپنے بعض عشق سنائے جو اس کے مطابق سو فی صدی کامیاب تھے جن کا محل وقوع کبھی علی گڑھ۔ خورجہ کا سگنج تھا تو کبھی امروہہ، مراد آباد اور چندوسی لیکن اس بات کا اسے اعتراف تھا کہ جب سے وہ یہاں آیا ہے باوجود کوشش کے بھی کہیں کامیابی نصیب نہ ہوئی تھی۔ اس کی اس کمزوری سے اس کے دفتر کا چپراسی رام لعل اچھی طرح واقف تھا اور اس سے تفریح لینے کی غرض سے بڑی سنجیدگی سے اسے شہر کی کئی حسین عورتوں کے اتے پتے بتایا کرتا جو تھوڑی سی کوشش سے ہی رام کی جا سکتی تھیں۔ رام لعل نہ صرف پتے ہی بتایا کرتا بلکہ اسے اس نیک کام میں اپنی امداد کا یقین بھی دلایا کرتا تھا۔ میں نے اکثر دفتر میں اسے بھٹناگر سے کھسر پھسر کرتے دیکھا تھا۔ ایک روز معلوم کرنے پر اس نے خود ہی بڑے رازدارانہ لہجہ میں انکشاف کیا کہ اس سالے رام لال کے ہاتھ میں بڑے بڑے رنگین معشوق ہیں، بس ذرا سی کمند پھینکنے کی ضرورت ہے۔

اور ایک روز بھٹناگر رام لال کے بتائے ہوئے پتہ پر اس سندھی سینا والے کے گھر پہنچ گیا جس کی لڑکی کے متعلق اسے رام لال نے بتایا تھا کہ اپنی کمپنی کے کئی منچلے اس سے کامیاب عشق لڑا چکے ہیں۔ اور اس تک رسائی حاصل کرنے کا سب سے سہل طریقہ اس سندھی کی اس بلڈنگ میں کرایہ پہ کمرہ لینا ہی ہے ۔۔۔ اس سندھی لڑکی کی زیارت کرنے کے بعد جب وہ لوٹا تو اس کا چہرہ ایک نامعلوم مسرت سے

دمک رہا تھا کیونکہ اسے اس کی بلڈنگ میں کمرہ کرایہ پر مل گیا تھا۔ آتے ہی اس نے اپنی کامیابی کی اُن منازل کا ذکر کیا تھا جنہیں وہ ایک ہی جست میں پھلانگ آیا تھا۔ کمرہ دس روپے ماہانہ پر اسے مل گیا تھا اور وہ ہمیں چھوڑ کر فوراً ہی اپنے نئے مکان میں چلا جانا چاہتا تھا اور وہ سچ مچ دوسرے ہی روز اپنا بوریا بستر باندھ اپنے نئے کمرے میں منتقل ہو گیا۔ ایک ہفتہ تک بھٹناگر سے سوائے آفس کے کہیں اور ملاقات نہ ہو سکی اور آفس میں اس کے متوقع عشق کے بارے میں بات کرنے کا وقت نہ تھا۔ ایک روز مختصر سے عرصے کے لئے دوپہر کے کھانے کے وقت کینٹین ہال میں مل گیا اور میں نے پہلا سوال اس کے عشق کے متعلق ہی کیا۔ ایک مسکراہٹ اس کے چہرے پر مچلی اور چاروں طرف دیکھتے ہی بولا۔

" وہ سینما والی لیلےٰ تو بیمار پڑی ہے جانے کیا بیماری ہے اسے۔ کچھ پتہ نہیں چلا۔ اتنا سنا ہے کہ دو تین مہینے کے لئے کسی پہاڑ پر جا رہی ہے "۔

" تو وار خالی گیا ؟" میں نے آہستہ سے اس کی ہمدردی میں جملہ ادا کیا۔

" وار خالی کیوں جاتا ؟" بھٹناگر کا وار کبھی خالی نہیں گیا۔ اس بیماری کو گلے لگانے سے بہتر تو وہ ریل بابو کی تندرست بیوی ہے جو میرے کمرے کے عین سامنے والے کمرے میں رہ رہی ہے۔ دانہ ڈال دیا ہے۔ بس اپنے دام میں ہی سمجھو"۔ یہ سب کہہ کر وہ ایک میکانیکل انداز سے سائیکل پر سوار ہو گیا اور پھر ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا۔

بھٹناگر نے جب سے دوسرا کمرہ لے کر مجھ سے علیحدگی اختیار کی۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میرے ہاتھ سے کسی نے وہ کتاب جھپٹ لی ہو جسے میں دو مہینے سے پڑھ رہا تھا اور جس سے ابھی بہت کچھ پڑھنا باقی رہ گیا ہے۔ جیسے میرے ہاتھ سے وہ پیاز کا گٹھا چھین لیا گیا ہو جس کا ہر روز میں ایک چھلکا اتار کر آخری چھلکے کا آخری رنگ روپ دیکھنا چاہتا تھا۔ اور پھر اس خاکے میں بکھرے ہوئے رنگوں پر آخری بار برش لگانے کا تجسس مجھے اس کے نئے کمرے تک کھینچ کر لے گیا۔ کمرہ اندر سے بند تھا۔ ہیشتر اس کے کہ میں دستک دیتا۔ کانوں نے کچھ سنا کسی عورت کی آواز تھی جو بھٹناگر سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھی۔ کچھ کہہ رہی تھی۔ کیا کہہ رہی تھی ؟ یہ سننے کے لئے دل بے چین ہو اٹھا۔ دروازے پر کان لگا کر چوروں کی طرح سانس روک کر سننے لگا۔ کچھ کچھ سنائی دے رہا تھا۔

" میری شادی ہوئے دو سال ہو گئے، لیکن میں نے اپنے پتی کا منہ دو دن بھی جی بھر کر نہیں دیکھا۔ شادی سے پہلے میرے پتی یہاں اسی موٹر کمپنی میں ساٹھ روپے کے ملازم تھے۔ شادی کے کچھ دنوں بعد ہی انہیں ریلوے میں اسی روپے کی ملازمت مل گئی اور یہاں سے ایک سو میل دور چلے گئے۔ ان دو سالوں میں چار پانچ بار یہاں آئے لیکن چالیس روپے کا منی آرڈر ہر مہینے کی پانچ تاریخ کو میرے بھائی کے نام ضرور آ جاتا ہے۔ میری شادی سے پہلے میرا بھائی میری شادی کیلئے پریشان رہا کرتا تھا اب اسے کوئی پریشانی نہیں اس نے اپنی پہاڑ سی جوان بہن کا بیاہ رچا لیا۔ میری شادی سے پہلے میرا بھائی ساٹھ روپے ماہانہ پر اس کمپنی میں ملازم تھا وہ اب بھی ساٹھ روپے کا مزدور ہے لیکن اب ہر مہینے چالیس روپے ان ساٹھ روپوں میں مل کر سو ہو جاتے ہیں اب وہ اپنی بوڑھی ماں اور بہن کی اچھی طرح دیکھ بھال کر سکتا ہے۔ گھر میں کسی کے بھوکوں مرنے کا ڈر نہیں ہے۔ تین آدمیوں کی بھوک مٹانے کیلئے سو روپے کافی ہیں بھٹناگر بابو ٹھیک ہے کیا ؟ بولو صرف سو روپے ہونے پر ہی بھوک مٹ جاتی ہے.... کیا مٹ جاتی ہے۔ مٹ جاتی ہے ؟"

آواز بند ہو گئی۔ باتیں سنائی نہیں دے رہی تھیں جو اپنی کہانی سنا رہی تھی اور میں چوروں کی طرح سن رہا تھا۔ اب کہانی سسکیوں میں ڈوب گئی تھی اور شاید بھٹناگر کی کہانی کو بھی اختتام مل گیا تھا۔ دوسرے دن وہ آفس سے غیر حاضر تھا اُس سے اگلے دن بھی غیر حاضر تھا اور تیسرے دن معلوم ہوا کہ وہ اپنے گھر چلا گیا ہے، اپنی بیوی کے پاس اُس نے استعفیٰ بھیج دیا تھا۔ یہ سن کر میں سوچ رہا تھا کیا سچ مچ اس کی کہانی ختم ہو گئی۔ شاید اُس نے نوکری کھو کر اپنی زندگی کی نئی کہانی شروع کی تھی اور شاید جیون کی یہ کہانیاں کبھی ختم نہیں ہوں گی، وہ چاہے بھٹناگر کی بیوی ہو یا ریل بابو کی۔

الیاس احمد گدی

پیکر۔ حیدر آباد (دکن)

دل کا تاوان

رات کا کھانا کھاتے ہوئے ریاض کی امّی نے پوچھا۔

"آج وہ لڑکا کون تھا تمہارے ساتھ۔ بہت گندہ اور بدتہذیب دکھتا تھا!"

ریاض نے اپنی ماں کی طرف دیکھا، جن کے چہرے پر بیزاری کے اثرات تھے۔

"ماں وہ ایک غریب لڑکا ہے۔ میرا دوست ہے نا صادق، اسی کا بھتیجا ہے۔ بے انتہا خودسر اور نافرمانبردار ہے۔ صادق ہر جتن کر کے ہار گیا کہ یہ کسی طرح لکھ پڑھ لے۔ آخر ہار مان کر اس نے میرے سپرد کر دیا کہ ممکن ہے ہمارے یہاں کے ماحول میں ہی اس کا جی لگ جائے۔ میں نے بھی سوچا۔ شاید فیاض کے ساتھ رہ کر اس کے دل میں پڑھنے لکھنے کا شوق جاگ جائے۔ دراصل امّی اس لڑکے کے ساتھ ایک عجیب طرح کی ٹریجڈی ہوئی ہے۔ جب وہ بہت چھوٹا تھا تو اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ ماں کچھ دنوں تک تو ٹھیک سے رہی۔ پھر شادی کر کے کلکتہ چلی گئی اور یہ لڑکا ایک دم سے بے سہارا ہو گیا!"

ریاض کی امّی بولیں۔ "اس کی ماں کو دوسری شادی نہیں کرنی چاہئے تھی اور اگر کر ہی لی تھی تو اپنے لڑکے کو ساتھ رکھنا چاہئے تھا۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک عورت کے لئے کیا اس کے لڑکے سے بڑھ کر بھی کوئی چیز ہوتی ہے!"

اُس نے زور سے سر اٹھا کر ریاض اور فیاض اپنے دونوں لڑکوں کو دیکھا جو چپ چاپ کھانے میں مصروف تھے۔ شاید اسے بیوگی کے وہ چودہ سال یاد آ رہے تھے جن کی تمام تر اذیتیں اس نے اپنے ان دونوں لڑکوں کے منہ دیکھ کر اٹھائی تھیں۔

چند ہی دنوں میں شاہد کی حالت سدھرنے لگی۔ اب وہ سارا سارا دن فیاض کے ساتھ رہتا اس کے ساتھ مل کر کھیلتا۔ ساتھ مل کر پڑھتا گھر کے سارے افراد کے ساتھ مل کر ناشتہ کرتا۔ لیکن بات اب بھی وہ بہت کم کرتا۔ بہت ضروری بات ہوتی تو بولتا ورنہ چپ رہتا۔ ہنسنا تو گویا وہ جانتا ہی نہیں تھا۔ اگر بہت ہنسنے کی بات ہوتی تو صرف مسکرا دیتا۔ ضدی پن اب بھی اس میں باقی تھا۔ کپڑے لتّے کی طرف دھیان دینا اس نے ابھی تک نہ سیکھا تھا۔ قمیض میلی ہے تو میلی ہو، پتلون کے پائنچے اگر پھٹ گئے ہیں تو پھٹ گئے ہوں بال اگر بکھر کر چہرے پر جھول رہے ہیں تو جھول رہے ہوں۔ اسے ذرا پروا نہ ہوتی۔

کئی مہینے یونہی چپ چاپ گذر گئے۔ شاہد اب بلاناغہ آ رہا تھا۔ چاہے جتنا بھی ضروری کام ہو وہ ریاض کے گھر ضرور جاتا اور دن کا زیادہ وقت یہیں گذارتا۔ یہ گھر اب اس کے لئے ایک پناہ گاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن ایک دن ایسا ہوا کہ وہ نہیں آیا۔

وہ دوسرے دن بھی نہیں آیا۔

تیسرے دن بھی نہیں آیا۔

ریاض جب اس کے یہاں گیا تو صادق سے معلوم ہوا کہ وہ بھابی سے جھگڑا کر کے سو رہا ہے۔ تین دن سے اس نے کھانا کھایا ہے نہ پانی پیا ہے۔ بلکہ چارپائی سے اٹھا تک نہیں۔ . . . . معلوم ہوا کہ وہ بھابی سے اپنی ماں کا پتہ پوچھ رہا تھا۔ بھابی نے بتانے سے انکار کر دیا۔ اسی وجہ سے بگڑ کر اس نے یہ سینہ گرہ مچائی ہے۔ ریاض نے صادق کی طرف دیکھا تو وہ کچھ متفکر سا تھا۔

"دیکھو ریاض، اس کی ماں کا شادی کرنا ہم لوگوں کے خاندان کی بدنامی کا باعث ہوا ہے۔ پھر اس کا اپنی اولاد کو ٹھکرا کر اس طرح چلا جانا تو گویا ایک تازیانہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس تازیانے کی چوٹ خاندان کے ہر فرد نے محسوس کی ہے۔ خاندان بھر میں کوئی بھی اس کی ماں کی شکل تک دیکھنا گوارہ نہیں کرے گا۔ ایسی حالت میں شاہد کا اس کی ماں کی طرف جھکاؤ بہت عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ اس سے ان کی نفرت کچھ اور ہم لوگ سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں لیکن یہ کبھی برداشت نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی ہمارے زخم پر انگلی رکھے۔۔۔!"

"میرا خیال ہے وہ اپنی ماں کے پاس جانا تو نہیں چاہتا ہوگا۔ پھر پتہ بتلانے میں کیا حرج ہے؟"

"تم نہیں سمجھ سکتے ریاض۔ اس کی ماں کا نام ہم لوگوں کے خاندان پر کلنک کا دھبہ ہے۔ خاندان بھر میں کوئی اس نام کو سننا تک برداشت نہیں کر سکتا!"

ریاض نے کوئی بات نہیں کی۔ شاہد کو بہلا پھسلا کر کسی طرح اپنے ساتھ لیتا آیا۔ بہت پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس نے بھابی سے صرف ماں کا پتہ پوچھا تھا۔ اور وہ بھی اس لئے کہ اب اس کو لکھنا آ گیا تھا اور وہ اپنی ماں کو خط لکھنا چاہتا تھا۔ اتنی سی بات پر بھابی چراغ پا ہو گئیں۔ کبھی آج تک انہوں نے شاہد سے ترشی سے بات نہیں کی تھی۔ لیکن اس بات کو سنکر وہ ایکدم سے بپھر گئیں۔ انہوں نے سختی سے کہا۔

"دیکھو میں تم کو منع کر دیتی ہوں کہ آج کے بعد کبھی اس کا نام بھی اس گھر میں نہ لینا۔"

شاہد کو سب سے زیادہ چوٹ اس لئے لگی تھی کہ یہ بات بھابی نے کہی تھی۔ وہ بھابی جنہوں نے اسے پالا پوسا تھا اور ہر طرح اس کی ناز برداری کرتی تھیں۔

"اچھا یہ بتاؤ تم اپنی ماں کو خط کیوں لکھنا چاہتے تھے اور کیا لکھنا چاہتے تھے؟"

شاہد نے کوئی جواب نہ دیا۔ شاید وہ خود بھی نہ جانتا تھا کہ اسے کیا لکھنا تھا۔

ریاض اس کے متعلق بہت رات گئے تک سوچتا رہا۔ بن ماں کا بچہ، کیا اس کے دل میں یہ خواہش نہ اٹھتی ہوگی کہ وہ کسی کو ماں کہہ کر پکارے۔ کتنے چھوٹے چھوٹے ارمان ہوں گے جن کا اظہار وہ اپنی ماں سے کرنا چاہتا ہوگا۔ صرف اپنی ماں سے وہ عورت یقیناً کتنی سنگدل ہوگی، جس نے اپنے دل کے ٹکڑے کا تاوان دے کر اپنے جسم کے آتش کدے کو ٹھنڈا کیا ہوگا۔

دو چار دنوں کے بعد حالات پھر اعتدال پر آ گئے۔ شاہد ویسے ہی پڑھنے لگا۔ کھیلنے لگا۔ البتہ اب وہ اپنے گھر بہت کم جاتا۔ ریاض کے یہاں جب کوئی موجود نہ بھی ہوتا تب بھی وہ خالی کمروں میں اور سونے برآمدوں میں ٹہلا کرتا۔ امی کے سامنے وہ ایکدم سے مودب ہو جایا کرتا اس لئے امی اس کی قربت سے احتراز کرتیں۔

صادق کی چھوٹی بہن کی شادی تھی۔ بڑی ہنگامہ آرائی تھی۔ سر شام شامیانہ لگا دیا گیا تھا جہاں محلے بھر کے بچے جمع ہو کر دھما چوکڑی مچائے ہوئے تھے۔ مہمان آنا شروع ہو گئے تھے۔ ہر آدمی تیزی سے کام کرنے میں مصروف نظر آ رہا تھا۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔ ریاض کے

ذمہ آنے والے مہمانوں کے خیر مقدم کا کام تھا۔ وہ بری طرح مصروف تھا کہ اچانک ایک بچے نے اس کے کوٹ کا دامن کھینچا۔
"شاہد لڑائی کر رہا ہے!"

ریاض جلدی سے بھاگا۔ لیکن تب تک لڑائی ختم کرا دی گئی تھی۔ شاہد کی نئی قمیض جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ اس کا سارا چہرا لہولہان ہو گیا تھا۔ گردن اور ہاتھوں پر لمبی لمبی خراشیں پڑی تھیں۔ جلدی سے گھبرا کر ریاض نے شاہد کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کیا ہوا، کیا بات ہوئی؟"

"یہ لوگ مجھے گالی دیتے ہیں۔" وہ غصہ میں تمتمایا ہوا بولا۔

پانچ چھ لڑکوں کی ایک ٹولی الگ کھڑی تھی۔ ریاض نے سب کو ڈانٹ کر بھگا دیا۔ اور اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے ساتھ لیتا آیا۔

"کیا ہوا تھا؟" اس نے بھیڑ سے باہر آ کر شاہد سے پوچھا۔

"یہ لوگ مجھ کو چڑا رہے تھے کہ اس کے دو باپ ہیں!"

ان لڑکوں میں سے ایک آدھ کو معلوم تھا کہ اس کی ماں نے دوسری شادی کر لی ہے۔ اس بات پر سب اسے چڑانے لگے۔ شاید انہیں امید نہیں تھی کہ وہ اکیلا ان چھ سات لڑکوں کے مقابلے میں آ ئے گا۔ لیکن خلاف توقع وہ ایکدم سے ان لڑکوں پر ٹوٹ پڑا تھا۔

ریاض بہت دیر تک اسے اپنے پہلو میں دبائے رہا۔ پھر فیاض کو بلا کر کہا کہ اس کو لے جاؤ اور اپنے گھر سے کپڑے بدل کر اور منہ ہاتھ دھلا کر لے آؤ۔

آدھ گھنٹہ بعد فیاض اکیلے واپس آیا۔ اس نے ریاض کو بتلایا کہ شاہد نے آنے سے انکار کر دیا ہے۔

ریاض کچھ بولا نہیں۔ مہمانوں کی آمد و رفت بڑھ گئی تھی۔ اس لئے وہ بری طرح مصروف ہو گیا۔ نکاح کے بعد کھانے سے فارغ ہوتے ہوتے آدھی سے زیادہ رات گذر گئی۔ اور وہ وہیں پڑ کر سو گیا۔

دوسری صبح امی سے معلوم ہوا کہ شاہد ساری رات سسکیاں لے لے کر روتا رہا۔ اس نے اندر سے کمرے کا دروازہ بند کر رکھا تھا۔ اس لئے وہ اندر جا بھی نہ سکیں۔ لیکن جب ریاض نے اس کو دیکھا تو وہ مطمئن تھا۔ اگرچہ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

اس واقعہ کے بعد شاہد نے گھر جانا بہت ہی کم کر دیا تھا۔ وہ صبح سویرے ہی ریاض کے یہاں آ جاتا اور پھر رات گئے واپس جاتا۔ اس نے اپنے آپ کو پڑھائی میں غرق کر دیا تھا۔

بڑی سخت سردی پڑ رہی تھی۔ جب امی کو بخار آیا۔ بخار معمولی تھا۔ اس لئے انہوں نے کوئی خاص احتیاط نہیں برتی۔ اور بدستور کام کرتی رہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو دن بعد اتنے زوروں کا بخار چڑھا کہ انہیں چارپائی پکڑ لینی پڑی۔ ڈاکٹر آیا دیکھ کر بتایا کہ بخار بگڑ کر ٹائیفائڈ ہو گیا ہے اور اگرچہ خطرہ کی کوئی بات نہیں تاہم بہت اچھی طرح دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔

ریاض اور فیاض دونوں بھائی بری طرح اپنی ماں کی تیمارداری میں مصروف تھے۔ کوئی دوا دے رہا ہے کوئی سر پر برف کی تھیلی رکھے ہوئے ہے۔ کوئی پاؤں کے تلوے آہستہ آہستہ کپڑے سے رگڑ رہا ہے۔ دونوں کو تن من کا ہوش نہ تھا۔

اور اس افراتفری میں شاہد یونہی گھومتا رہا اس کمرے سے اس کمرے میں، اندر کے برآمدے سے باہر کے برآمدے میں کبھی چھت پر چلا گیا کبھی پارک تک ٹہل آیا۔ وہ ہر تھوڑی تھوڑی دیر میں دبے قدم رکھتا ہوا امی کے کمرے میں آتا اور دو مصروف بھائیوں کو دیکھ کر چپ چاپ کمرے سے نکل جاتا۔ امی سے بظاہر اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ پھر بھی ان کی بیماری سے وہ بری طرح پریشان تھا۔

امّی کا بخار بہت تیز تھا۔ فیاض اس کے سرہانے اس کی ہتھیلی پکڑ کر بیٹھا تھا اور ریاض تپائی پر بیٹھا امی کے تلوؤں پر آہستہ آہستہ کپڑا رگڑ رہا تھا۔ جب شاہد آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ چند لمحوں تک کھڑا وہ چپ چاپ ریاض کو دیکھتا رہا پھر بڑی آہستگی سے چلتا ہوا ریاض کے بغل میں جاکر بیٹھ گیا۔

"لائیے میں امّی کے پاؤں جھاڑتا ہوں۔ اس نے ریاض کے ہاتھ سے کپڑا لیتے ہوئے کہا۔ ریاض نے اس کی طرف محبت سے دیکھا۔ آج تین چار دنوں کی پریشانیوں میں وہ شاہد کو یکدم سے بھول گیا تھا۔

چند لمحوں تک شاہد آہستہ آہستہ امّی کے پاؤں جھاڑتا رہا۔ پھر اچانک ہی اس نے ریاض کی طرف مڑ کر پوچھا۔

"میری ماں بھی بیمار پڑتی ہوگی، اس کو کون دیکھتا ہوگا؟"

ریاض نے چونک کر اس کو دیکھا۔ اس کا چہرہ یکدم سے تاریک ہوگیا تھا اور آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی جھلک اٹھی تھی۔

ریاض افسردگی سے مسکرایا۔ شاہد تمہاری ماں کو دیکھنے والے بھی ہوں گے تمہارا سوتیلا باپ ہوگا۔ پھر ممکن ہے اس کے لڑکے بھی ہوں گے پھر وہ کلکتہ شہر ہے جہاں چھوٹے بڑے بے شمار ہسپتال ہیں۔۔"

شاہد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ سے کپڑا امّی کے پیروں پر رکھ کر اٹھا۔ اور آہستہ آہستہ کمرے سے باہر ہوگیا۔ ریاض نے سوچا کہ کیا اس کی ماں بھی اس کو اسی طرح یاد کرتی ہوگی؟

دو دن بعد جب اماں کی حالت کچھ بہتر ہوئی تو ریاض کو احساس ہوا کہ دو دن سے شاہد نہیں آیا ہے۔ آخری بار اس سے جو بات چیت ہوئی تھی اس حقیقت سے شاہد سے اس کو بے انتہا ہمدردی ہوگئی تھی۔ اس لئے سب سے پہلے وہ شاہد کو دیکھنے اس کے گھر چلا گیا لیکن وہاں معلوم ہوا کہ شاہد تو دو دن سے گھر ہی نہیں آیا۔ ان لوگوں نے سوچا کہ چونکہ ریاض کی امی کی طبیعت خراب ہے اس لئے شاہد وہاں رک گیا ہے۔ ایک لمحہ کے لئے ریاض کے دماغ میں کوئی چیز بڑے زور سے سنسنائی۔

دو دن اور بیت گئے۔ شاہد کا کوئی پتہ نہ تھا۔ صادق اور وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر پریشان ہوگئے۔ پولیس میں ڈائری دی گئی۔ تمام ریلوے اسٹیشنوں کو خبر کی گئی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ریاض جانتا تھا کہ وہ اپنی امی کے پاس کلکتہ گیا ہوگا۔ لیکن صادق سے یہ بات وہ کہتے ہوئے ڈرتا تھا۔

تیسرے دن ریلوے والوں نے اطلاع دی کہ فلاں نام اور حلیہ کا لڑکا آسنسول میں بغیر ٹکٹ سفر کرنے کے جرم میں حراست میں ہے۔ ریاض اور صادق نے پہلی گاڑی پکڑی اور آسنسول جا پہنچے۔ وہاں معلوم ہوا کہ وہ سرکاری ہسپتال میں بیمار ہے۔

دسمبر کی سردی میں وہ صرف ایک قمیض پہن کر نکلا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے ٹھنڈک لگ گئی۔ بخار اس قدر شدید تھا کہ شاہد پر بے ہوشی کا عالم طاری تھا۔ وہ بار بار بڑبڑا رہا تھا۔ ماں۔۔ ماں۔۔۔ تم کہاں ہو دیکھو میں آگیا۔۔ دیکھو ماں۔۔۔ دیکھو ماں۔۔"

ایک دن اور ایک رات ریاض کا منتظر رہا کہ کسی طور شاہد کی حالت سدھر جائے۔ لیکن بجائے افاقہ کے اس کی حالت روز بروز دگرگوں ہوتی گئی۔ آخر کار جب ضبط کی انتہا ہوگئی تو ریاض نے صادق سے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "دیکھو صادق، مجھے اس کی ماں کا پتہ چاہئے مجھے معلوم ہے تم اس کے پتہ سے آگاہ ہو۔ میں کبھی یہ برداشت نہیں کروں گا کہ ایک جھوٹی عزت کی قربان گاہ پر شاہد کو بھینٹ چڑھا دیا جائے۔" صادق نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ سے ایک کاغذ پر اس کی ماں کا پتہ لکھا اور اٹھ کر کمرے سے باہر ہوگیا۔ پتہ لیکر ریاض نے شاہد کی ماں کو جوابی تار دیا کہ اس کا لڑکا قریب المرگ ہے۔ اگر وہ آخری بار ملاقات کرنا چاہتی ہے تو فوراً چلی آئے۔

تار کا جواب رات کے آٹھ بجے آیا۔ صرف ایک لائن لکھا ہوا تھا "[illegible] انتقال کر چکی ہے۔!"

رات بڑی تاریک تھی اور ہوا بڑی سرد تھی اور چاروں طرف بڑا گہرا اور المناک قسم کا سکوت چھایا ہوا تھا۔ صادق جا چکا تھا اور ریاض سامنے ٹیلیگرام کو رکھے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے بیٹھا ہوا تھا۔ اور شاہد آہستہ آہستہ بڑبڑا رہا تھا۔

"ماں! میں آگیا۔۔۔ دیکھو ماں۔۔۔ دیکھو ماں۔۔۔!"

شمیم نکہت
صبا۔ حیدرآباد۔ دکن

گھروندے

ہنہ ۔۔ اماں تم گھر کیوں نہیں بنواتیں ۔۔ بتاؤ ۔۔ بتاؤ نا اماں ۔۔

زینب آج پھر ہمیشہ کی طرح ضد کر رہی تھی۔ رات کے مہیب سائے اس کے چھپر سے باہر پھیلے ہوئے تھے۔ اور ماں کے ساتھ کونے میں دھان کے پیال پر لیٹی ہوئی زینب کی آنکھیں چھپر سے باہر مختلف بھوت پریت تلاش کر رہی تھیں۔ وہ ماں کے سینے سے اور چپک گئی۔ چولھے پر رکھا ہوا ننھا سا مٹی کے تیل کا چراغ چھپر کو روشن کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ چھپر کے دروازے میں ابھی تک ٹٹی نہیں لگی تھی۔ کیونکہ خیراتی اس وقت تک کام سے واپس نہیں آیا تھا۔

اماں ۔ بولو۔ بولو نا ! تم گھر کیوں نہیں بنوا لیتیں ؟

کیا یہ گھر نہیں ہے۔ بُری بات ۔ ہر بات کی ضد نہیں کرتے۔

ماں زینب کو بہلا کر سلانا چاہتی تھی۔ مگر ننھی زینب روز کی طرح آج بھی گھر کے لئے الجھ رہی تھی۔ اسے یہ گھر بالکل پسند نہیں تھا۔ وہ سوچتی ہمارے ابا آخر گھر کیوں نہیں بنواتے۔ یہ بھی کوئی گھر ہے۔ ایک چھپر اور دور تک ٹیٹوں سے گھری آنگن اور بس! نہ گھر نہ دالان، نہ آنگن، نہ بیٹھک۔ کوئی ملنے آئے تو املی کا سایہ بیٹھک بن جاتا ہے۔ اور پھر اسے یہ تو بالکل اچھا نہ لگتا۔ کہ ایک ہی چھپر میں چولھا، چکی، اوڑھنا، بچھونا اور منہ لوٹے ہوئے اناج کے گھڑے۔ بھلا یہ کوئی گھر ہوا۔

اسے چودھری صاحب کا گھر بہت پسند تھا۔ باہر بیٹھک پھر آنگن، پھر دالان اور دالان کے اندر کمرہ۔ چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں۔ آنگن کے ایک طرف چھوٹا سا باورچی خانہ ۔ اور ایک کوٹھری جس میں بڑی بڑی بکھاریں لگی ہوئی۔ اسے بہت تعجب ہوتا۔ کہ چودھری صاحب کے یہاں اتنے بہت سے دروازے کیسے لگے ہیں ۔۔ جب کہ اس کے یہاں ایک بھی دروازہ نہیں تھا۔ بس نرکل کی موٹی سی ٹٹی ۔۔۔

جب بھی وہ چودھری صاحب کے گھر جاتی۔ اسے ایک انجانی۔ جھجک کا احساس ہوتا۔ ڈیوڑھی میں پہنچتے ہی اس کے قدم ٹھٹھک جاتے۔ یہ گھر کتنا اچھا ہے۔ وہ چپکے سے کھڑی ہو جاتی۔ جیسے یہ اس کا اپنا گھر ہو۔ اور پھر وہ چودھرائن کی طرح اعتماد انہ قدم اٹھاتی ہوئی آہستہ آہستہ صدر دروازے کی طرف لوٹ جاتی۔ دروازے کو تھوڑا سا بند کر کے پٹ کی اوٹ سے باہر جھانکتی۔ جیسے اس گھر کی مالکن

کو اکثر اس نے کرتے دیکھا تھا۔ پھر وہ دھڑ کر بیٹھک میں گھس جاتی ۔۔۔ اور وہاں پڑے ہوئے سینٹھے کے مونڈھے ادھر ادھر کھینچنے لگتی جیسے وہ اپنی بیٹھک ٹھیک کرنے میں منہمک ہو۔ بیڑی کے ٹکڑے چن چن کر باہر پھینکتی جاتی۔ اور بڑبڑاتی رہتی۔

بدتمیز ۔۔۔ بیڑی جلتی پھینک دی۔ اگر آگ لگ جاتی گھر میں تو ۔۔۔ تو ان کے باپ کا کیا بگڑتا ۔۔۔ اور جہاں تو بربادی لگ جاتی۔ وہ چودھرائن کے الفاظ دہراتی جاتی۔ اور اس کی آنکھیں بار بار ہر آہٹ پہ اٹھ جاتیں ۔ کہیں کوئی اسے یہ سب کرتے ہوئے دیکھ نہ لے۔ پھر وہ اندر چلی جاتی سلمہ کو بلانے۔ اور جب سلمہ کمرے میں سے کودتی ہوئی دالان میں آتی تو اس کا دل دھڑک اٹھتا۔ کمرے کے دروازے سے نکلتی ہوئی سلمہ اُسے بہت بھلی لگتی۔ اور سلمہ کو دالان ہی میں چھوڑ کر وہ جھٹ سے کمرے میں گھس جاتی۔ اور پھر وہاں سے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی دالان میں آتی۔ جیسے وہ اپنے گھر میں چل رہی ہو۔ اور ایسا کرتے ہوئے وہ اپنے کو بالکل بھول جاتی۔ وہ غرور سے اونچی اونچی دیواروں کو دیکھتی۔ جیسے وہ سب اس کی ملکیت ہوں۔ اور پھر سلمہ اسے خوابوں کی دنیا سے جھنجھوڑ دیتی۔ زینب چلو کھیلیں۔ اور زینب چونک اٹھتی ۔ اوں ۔ ہاں چلو ۔ چلو گھروندا۔ گھروندا کھیلیں ۔

وہ اپنے گھر کے سامنے والی املی کے نیچے کھیلنے بیٹھتی۔ سب ہی لڑکیاں گھروندے بناتیں ۔ گلیارے کی زمین پہ پیر پھیلا کر بیٹھ جاتیں۔ اور ایک پیر کو مٹی میں توپ کر اوپر سے دونوں ہاتھوں سے مٹی کو پیٹتی رہتیں۔ اور منہ سے کہتی جاتیں۔

چینٹی چینٹی گھر بناؤ۔ گھر بنا کر گھر بساؤ۔

سب کے گھروندے بن جاتے۔ زینب خوش ہو کر سب سکھیوں کو دکھاتی۔ میرا گھروندا دیکھو۔ دیکھو یہ کمرہ ۔۔۔ ایسے یہ ہر طرف تھا۔ یہ اتنا بڑا آنگن ۔ ۔ اور یہ رہا باہر کا بیٹھک ۔ کونے میں بنا ہوا چھوٹا سا باورچی خانہ اور کوٹھڑی۔ مٹی کے گھروندے میں دیکھنا ہی کیا بس ایک خوب بڑا سا چھپرا، اور دور تک دیوار کھینچ کر بنی ہوئی آنگن۔ ہاں سلمہ کا گھروندا وہ غور سے دیکھتی۔ اور پھر ہنستے ہنستے دوہری ہو جاتی۔ نہ جانے کتنے کمرے ۔ برآمدے اور ڈیوڑھی، وہ مذاق اڑاتی ۔۔۔ آہا ان کو دیکھو بالکل بدھو ۔۔۔ بھلا گھر میں کہیں اتنے خانے ہوتے ہیں۔ اور سلمہ منہ بناتے ہوئے چڑھ جاتی۔ ہٹ تجھے کیا معلوم ۔۔۔ دیکھ ۔۔۔ یہ دیکھ سونے کا کمرہ ۔۔۔ یہ کھانے کا کمرہ، یہ دوستوں سے ملنے کا کمرہ اور یہ پڑھنے کا کمرہ ۔۔۔ چچا جان کا گھر بس بالکل ایسا ہے .... میں تو شہر میں ایسا ہی گھر بنواؤں گی۔ اور، زینب، سلمہ کی باتوں پر یقین نہ کرتے ہوئے اسے بے وقوف سمجھ کر پھر اپنے گھروندے میں لگ جاتی۔ شام کے سرمئی پردے، گاؤں کے ذرے ذرے کو دھندلا کر دیتے ..... اور سب لڑکیاں اپنے گھروں کو چل دیتیں۔ زینب کا گھروندا رات تک بنا رہتا۔ اور جب وہ سونے جاتی۔ تو اپنے گھروندے کا دروازہ مٹی کی پتلی سی دیوار بنا کر بند کر جاتی۔

روزانہ رات کو وہ ماں سے لڑتی۔ ماں تم گھر بنوا لو ۔۔۔ میں اس میں نہیں رہوں گی اور ماں کے سمجھاتے اس کی آنکھیں بند ہو جاتیں۔ پھر وہ اپنے کمرے اور دالان والے گھر کی رانی بن جاتی۔ رات بھر وہ چودھرائن کی طرح اپنے گھر کے کاموں میں مشغول رہتی کبھی مرغیاں ہنکا رہی ہے۔ کبھی باورچی خانہ صاف کرتی۔ کبھی کوٹھڑی بند کرتی۔ اور کبھی کمرے میں تخت پہ بیٹھ کر پان چباتی۔ مگر جب صبح آنکھ کھلتی۔ تو کوٹھری میں گھسا ہوا منہ اور پیروں میں الجھا ہوا پیال اسے بتا دیتا کہ وہ گھر کے بجائے صرف چھپر میں ہے۔ وہ جلدی سے آنکھیں بند کر لیتی۔ مگر پھر اُسے اٹھنا ہی پڑتا۔ قریب ہی گھر گھر کرتی ہوئی چکی اسے کب سونے دیتی۔ وہ اٹھ بیٹھتی اور پھر اپنے گھروندے کو دیکھنے کے لئے جلدی جلدی باہر بھاگ جاتی۔ کہیں رات میں کسی نے گھروندا تو نہیں گرا دیا ۔۔۔ اور یہ دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ جاتا۔ کہ صبح گلیارے سے گزرتے ہوئے جانوروں نے اس کے گھر کو کیسے اپنے کھروں سے تباہ کر دیا۔ وہ تھوڑی دیر تو افسوس کرتی مگر پھر جلدی سے دوبارہ بنانے بیٹھ جاتی۔ وہ ڈرتی کہیں سلمہ اور منی وغیرہ نہ دیکھ لیں۔ کہ اس کا گھروندا مٹ گیا ہے۔

دلی بیٹیوں اور جیتے برسوں میں تبدیل ہو گئے۔ اور زینب کا سپنا گئے تو سے سب پیدا کر بننے والا گھروندا اس کے ذہن میں بننے لگا مٹی کو ماں سے ضد کرنے کے بجائے۔ وہ پیال کے کونے میں دبک کر چپکے سے اپنے گھر کے بارے میں سوچتی رہتی۔ گھر کے بارے میں سوچتے سوچتے اس کا دل دھڑک اٹھتا۔ اس کے بدن میں گدگدی ہونے لگتی ۔۔ اس کے خیالوں میں اب گھر میں ایک کمرے ایک دالان ایک آنگن کے علاوہ ایک گھر ملا بھی آ چکا تھا۔

سلمہ سے اس کی دوستی اب بھی تھی۔ مگر اب وہ گھروندے بنا کر سلمہ سے اپنی برتری کا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔ سلمہ کے خرد کے آگے وہ سر جھکا دیتی ۔ کہ اگر سلمیٰ ناراض ہو گئی تو پھر وہ کس بہانے اپنے خیالوں میں بسے ہوئے گھر میں آ سکے گی۔ اکثر وہ چودھری صاحب کے گھر میں دن بھر رہتی۔ سارے باورچی خانے کی دیواریں چھت تک پوتتی۔ چولہا ٹھیک کرتی۔ فرش دھوتی اور یہ سب کام وہ اس لگن سے کرتی۔ کہ چودھرائن خوش ہو کر سلمیٰ کو ڈانٹنے لگتیں۔

دیکھ زینب : سب کام کیسے سلیقے سے کرتی ہے ۔۔ بچاری کے نہ گھر بار تب بھی ..... اور زینب کے چلتے ہوئے ہاتھ یہ سنتے ہی ٹھٹھک جاتے ۔۔ نہ گھر نہ بار ...... وہ تصور کے سنہرے جھولے میں حقیقت کی چٹان پر دھڑام سے جا گرتی۔ ہاں ٹھیک ہی تو ہے ۔ وہ سلمہ کے گھر میں کام کر رہی تھی ۔ وہ تو بالکل بھول ہی گئی تھی ۔ کہ یہ اس کا اپنا گھر نہیں ہے۔ وہ خاموشی سے کام پورا کرتی اور چپکے سے اپنے ایک چھپر والے گھر میں چلی جاتی ۔۔ ایک چھپر اور ٹٹیوں والے گھر میں....

اس کی کنول جیسی شفاف آنکھوں میں شبنم کے قطرے ابھر آتے ۔ اور وہ چپکے سے کونے میں بیٹھ کر انھیں اپنے آنچل میں چھپاتی رہتی ۔ ماں اپنے کاموں میں لگی رہتی اور باپ تو صبح ہوتے ہی مزدوری پر چلا جاتا ۔۔ اور اسے تنہائی میں سب کچھ سوچنے کے لئے کافی وقت مل جاتا ۔

اب وہ اٹھارہ انیس سال کی ہو چکی تھی ۔ مگر جوانی کے سارے رنگین سپنے اس لئے مٹی اور چونے کے بنے ہوئے ایک چھوٹے سے گھر کے ہی اردگرد تھے ۔ چھوٹا سا صاف ستھرا سلمہ جیسا گھر ، وہ فاقے کر سکتی تھی ۔ اسے زیور کا بھی شوق نہیں تھا ۔ اسے پروا نہیں تھی کہ اس کی اوڑھنی میں کتنے پیوند لگے ہیں ۔ لیکن ایک لمحہ کے لئے بھی اس کے ذہن کو گھر کے تصور سے چھٹکارا نہ ملتا ۔ وہ زمین پر بیٹھی اپنی سکھیوں سے باتیں کرتی رہتی اور ننھی سی کنکری اٹھا کر زمین پر بے خیالی میں لکیریں کھینچتی رہتی ۔ اور وہ لکیریں آخر چودھری صاحب کے گھر کا پورا نقشہ بن جاتیں ۔

اس کی سکھیاں شادی کی بات کرتیں ۔۔ مگر زینب ہمیشہ گھر کے بارے میں بولتی ۔۔ جب اس کی کوئی سکھی شادی کے بعد سسرال سے واپس آتی تو زینب سب سے پہلے سوال کرتی ۔ تیرا گھر کیسا ہے ؟ لڑکیاں ہنس دیتیں ۔ گھر کی بات پوچھتی ہے بے وقوف گھر والے کی پوچھ ۔۔ اور زینب مسکرا دیتی ۔ سب لڑکیاں دولہا کے بارے میں پوچھتیں اور زینب کمرے کے بارے ۔۔ تو جہاں بیٹھی تھی وہ چھپر ۔ آنگن تو ضرور ہو گی ۔

اور جب زینب کے باپ نے اس کی شادی کی بات پکی کر دی تو اسے بے حد فکر ہوئی ۔ پتہ نہیں سسرال میں گھر ہے یا چھپر اور پھر اس نے ایک رات خواب میں دیکھا ۔ وہ دلہن بنی ڈولے سے اتر رہی ہے ۔ اونچی سی دہلیز کے بعد جب اس نے اندر قدم رکھا تو کمرہ تھا ۔ کمرے کے بعد نہ جانے کتنی بڑی آنگن سے چل کر دالان میں بٹھائی گئی ۔ بالکل حامد بھائی کی دلہن کی طرح ۔ گھر بھی بالکل سلمہ کے گھر سے ملتا جلتا ہی تھا ۔ پھر نہ جانے کتنی رسموں کے بعد جب رات آئی ۔ تو اسے دالان سے اٹھا کر کمرے میں بٹھایا گیا ۔ اس نے موقع ملتے ہی چھت کو جھانک لیا موٹی موٹی دھنیوں والا سفید سفید کمرہ اور وہ مسرت سے پھول گئی ۔۔ وہ رانی ہے ۔۔ چودھرائن ۔۔ اس کے بنائے ہوئے بچپن کے نہ جانے کتنے گھروندے مٹے تھے ۔ اور ۔۔ اور آج اس کا یہ گھر ۔۔ کتنا شاندار ہے ۔ وہ سلمہ کو ضرور بلائے گی ۔ اور چودھرائن کو بھی ۔۔ اس کے کانوں میں ، چودھرائن کے الفاظ گونج اٹھے ۔۔ نہ گھر نہ بار ۔۔ وہ مسکرا دی ۔۔ ہوں ۔۔ اب تو میں بالکل ..... چودھرائن کی طرح رہوں گی ۔ سارا کام میں خود کر دوں گی ۔۔ کوئی کام ساس کو نہ کرنے دوں گی ۔۔ روزانہ آنگن دھو ڈالوں گی ۔ پتہ نہیں مرغیاں ہیں یا نہیں وہ اپنے ذہن میں پورے

گھر کے انتظام کا خاکہ بنا رہی تھی۔ کہ باہر زور زور سے باجے بجنے لگے۔ پھر وہ آوازیں آہستہ آہستہ تیز ہوتی گئیں — اور پھر گھرر گھرر کرتی ہوئی چکی کی آواز میں منتقل ہو گئیں — اس کے پیر میں الجھے ہوئے پیال نے اُسے بتا دیا کہ وہ ابھی اس چھپکے بندھن کو توڑ نہیں سکی ہے۔ وہ اُٹھ بیٹھی اور آنکھیں ملتی ہوئی ماں کے ساتھ چکی پر بیٹھ گئی۔ اُس کے ہاتھ چکی گھیٹتے رہے اور وہ اپنے خوابوں میں بھٹکتی رہی — چکی سے اُٹھ کر دوسرے کام کرتی رہی۔ آج وہ بے حد خوش تھی۔ اُس نے سسرال والے گھر کو خواب میں دیکھا تھا۔ اب اس کے تصور میں اس کے گھر کی واضح شکل موجود تھی وہ ایک لمحہ بھی اپنے گھر کو نہ بھول پاتی۔

ڈولے میں بیٹھتے ہی زینب رخصتی کا رونا دھونا بھول گئی۔ اب وہ ایسی جگہ جا رہی تھی۔ جہاں اس کے بچپن کے خواب پورے ہوں گے مٹی کے بنائے ہزاروں گھروندے مٹ کر اُسے ایک گھروندا مل رہا تھا۔ اس کا اپنا گھروندا۔ کمرے دالان اور بڑی سی آنگن والا گھروندا — اب اسے کوئی جانور اپنے پیروں سے روند کر تباہ نہ کر سکے گا — وہ مالکن بننے جا رہی ہے۔ مالکن — شاید ساس مالکن نہ بننے دے۔ مگر ہے تو وہ بہو ہی — اور پھر بہو کا گھر ہوتا ہی ہے۔

ڈولا رُکا۔ عورتوں کا شور و غل سنائی دیا۔ چھم چھم زیور چھنکے اور کسی نے جھک کر اُسے ڈولے سے باہر نکالا۔ اس نے جان بوجھ کر پیر زمین پر ٹکا دیا۔ کچی مٹی کی ٹھنڈک نے اس کو تلووں سے بتا دیا۔ کہ زمین کچی ہے۔ اس کا منہ گھونگھٹ میں بالکل لپٹا ہوا تھا۔ ایک عورت کی گود میں وہ کہیں جا رہی تھی۔ اس نے سوچا شاید وہ آنگن سے گزر رہی ہے۔ پھر اسے ایک پلنگ پر بٹھا دیا گیا۔ وہ سنبھل کر بیٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ گھونگھٹ ذرا ہلکا ہوا۔ اور اس کی نظریں سامنے کی دیوار پر جم گئیں — نرکل سے بنی ہوئی ٹٹی — اس نے جلدی سے دوسری طرف مڑ کر دیکھا دوسری ٹٹی۔ اور جب اس نے گردن پیچھے موڑی تو کچی سی دیوار نظر آئی۔ چھوٹی مٹی سے پتی ہوئی صاف ستھری دیوار — اس کا سر گھومنے لگا۔ اور جب ایک عورت نے اس کی بگڑتی ہوئی حالت کا اندازہ کر کے اسے اپنے گھٹنے پر سر رکھ کر لٹا لیا۔ تو اس کی آنکھیں چھپر سے لٹکے ہوئے پتاور پر جم گئیں — دھوئیں سے کالا چھپر — اس کے دل و دماغ پر جیسے اندھیرا چھا گیا۔ گھور اندھیرا، پھر اسے کچھ نہیں معلوم اس نے کتنی رسمیں کرائی گئیں۔ اور کب رات ہو گئی۔ بس اس کے کانوں میں کبھی کبھی دور سے ایک آواز ابھرتی محسوس ہوتی — بچاری کے نہ گھر نہ بار — پھر وہ نہ جانے کہاں کھو جاتی۔

صبح اسے صرف یہ یاد تھا۔ کہ حنیف نے اُسے یقین دلا دیا تھا کہ وہ شہر میں اس کے ساتھ مکان لے کر رہے گی۔ اسے یہ کچھ نہیں معلوم تھا۔ کہ وہ کب اور کس طرح حنیف سے پہلی ہی ملاقات میں ایک گھر کے بارے میں کہہ سکی تھی۔ صبح اُس نے آنگن سے دیکھا۔ باہر نیم کی چھاؤں میں ایک طرف دو ناندیں گڑی تھیں — جن میں دو مریل قسم کے بیل چارہ کھا رہے تھے۔ اس نے ذرا ہٹ کر دوسری طرف دو بانس کی چارپائیاں پڑی تھیں۔ جن پر کچھ لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اس کے گھر کا بیٹھک بھی نیم کی چھاؤں تھی۔ بالکل اس کے میکے کی طرح، وہاں املی کا سایہ تھا۔ اور یہاں نیم کا — اس کا دل بھر آیا۔ اور آنکھوں میں آنسو چھلک گئے۔ اس کے گھروندے سے بالکل مختلف بیٹھک — وہ خاموش کوٹھری میں لوٹ گئی۔ وہ اپنے دل کو لاکھ سمجھا رہی تھی۔ کہ وہ تو شہر ہی جا کر رہے گی۔ مگر امڈے ہوئے آنسو کے دھارے کو کسی طرح نہ روک سکی۔

کئی دن بیت گئے۔ آج وہ میکے جا رہی تھی۔ کیسے وہ اپنے گھر کے بارے میں بتائے گی۔ کہ اُس کے خیالوں میں بسا ہوا گھر بھی اس کے گھروندوں کی طرح مٹ چکا تھا — وہ بے حد پریشان تھی۔ اور آخر حنیف آخری وعدے کے بعد کہ شہر جاتے ہی وہ مکان، تلاش کر کے اُسے جلد ہی لے جائے گا۔ وہ میکے چلی گئی۔

چھ سات مہینے گزر گئے۔ حنیف دن بھر شہر میں رکشا چلاتا۔ اور ساتھ ہی مکان کی تلاش میں سرگرداں رہتا۔ اسے زینب سے کئے ہوئے وعدے دھندلے نظر آنے لگے تھے۔ بہت کوشش کے بعد آخر اسے ایک کرایہ کا چھوٹا سا مکان مل گیا۔ اور پھر وہ جلد ہی گاؤں چلا گیا۔ زینب

اپنے مکان کے بارے میں جان کر پھولے نہ سمائی۔ ساس اور ماں دونوں ہی نے منع کیا۔ کہ وہ ابھی شہر نہ جائے۔ وہ ماں بننے والی تھی۔ شہر میں اکیلی کیسے رہے گی۔ اُس نے خود تو کوئی جواب نہ دیا۔ مگر حنیف کو اپنے ارادہ پر اٹل رکھنے میں کامیاب ہوگئی۔

جب وہ اپنے شیش محل میں داخل ہوئی۔ تو اُس نے محسوس کیا جیسے وہ پریوں کی شہزادی ہے جو اپنے جادو کے محل کی پوری طرح مالک ہے۔ اُس نے فخر سے گردن اُٹھا کر سارے مکان پر نظر دوڑائی۔ اور پھر اپنے مختصر سے سامان کو باقاعدہ سجانے لگی۔ اس کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ اتنی بڑی آنگن، کوٹھری، کمرہ، کیسے وہ سلہ، چو دھرائن، منی سب کو بلاکر دکھا دے۔ کہ وہ اب اس مکان میں رہے گی..... وہ بے حد خوش تھی۔ لیکن اس کی خوشی دیکھنے والا صرف حنیف ہی تھا۔ یہ سوچتے ہی اس کی خوشی میں جیسے بہت بڑی کمی ہوگئی ہو۔ مگر تھوڑی دیر میں ہی وہ اس گھر کی مالکن کے تصور میں جیسے کھوگئی۔ حنیف رکشا لے کر چلا گیا۔ اور وہ اپنے بچپن کے خوابوں کی تعبیر میں کھوگئی۔ اس کا اپنا یہ گھر کتنا اچھا تھا۔ بالکل اس کے گھروندے سے ملتا جلتا۔

چند ہی دنوں میں زینب نے محلے میں اچھی خاصی دوستی کرلی۔ سب کو ہی تعجب ہوتا کہ دیہات کی یہ لڑکی کس سلیقے سے گھر سجائے رکھتی ہے۔ اس طبقہ کی دوسری لڑکیاں اور عورتیں دن بھر سودے والے سے کچھ نہ کچھ خرید کر کھاتی رہتیں یا پھر سستی چیزیں خریدتی رہتیں پیتل کے زیور، موتی کے بُندے، ناخونوں کی لالی، پوڈر وغیرہ مگر زینب ان سب چیزوں کی طرف کبھی نظر بھی اٹھا کر نہ دیکھتی۔ اس کا شیش محل ابھی پوری طرح کہاں سج سکا تھا۔ ابھی اسے تخت، پلنگ اور نہ جانے کتنی چیزیں خریدنا تھیں۔ اور چھوٹی چھوٹی کتنی ہی چیزوں کی فہرست اس کے ذہن میں موجود تھی۔ جسے پورا کرنے کی وہ ہر ممکن کوشش کرتی۔ وہ بھوکی رہتی۔ اس نے ایک کپڑا ابنوانے کا نام نہیں لیا۔ وہ اپنے سنگھار کی بھی کوئی چیز کبھی نہ خریدتی۔ جب اس کی مٹھی سے کبھی کچھ روپے کھسک جاتے۔ تو گھر میں کوئی نئی چیز سج جاتی۔ کبھی کوئی دری، کبھی کوئی چادر اور کبھی چوکی یا مونڈھا۔ کچھ ہی دنوں میں اس نے اچھا خاصا سامان اکٹھا کرلیا تھا۔

برسات گزر چکی تھی۔ اور آسمان کی بلندیوں سے بکھرے ہوئے ننھے ننھے قطرے دھرتی کے منہ میں پہنچ کر ابدی نیند سو چکے تھے۔ دور تک پھیلے ہوئے آسمان نے مہینوں کے اوڑھے ہوئے بادلوں کے سفید اور سیاہ لبادوں کو دور پھینک دیا تھا۔ اور چمکتا ہوا نیلا آسمان بڑے بڑے بھیانک داغوں سے یکسر صاف ہو چکا تھا۔ برسات کے بعد ہی زینب کی ساس ایک ننھے منے مہمان کا استقبال کرنے آنے والی تھی۔ اور اب زینب کو اپنی ساس کا انتظار رہتا۔ وہ سوچتی جب ساس آئے گی تو کتنی خوش ہوگی۔ اس نے چند ہی مہینوں میں کتنا بہت سامان اکٹھا کرلیا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں اس کا گھر بھی چودھری صاحب کے گھر سے کچھ کم نہ رہ جائے گا۔ وہ دن بھر گھر میں ہی لگی رہتی۔ کبھی دیوار کی مرمت ہو رہی ہے۔ کبھی فرش برابر ہو رہا ہے۔ حنیف جب بھی گھر آتا۔ زینب کو گھر میں لگا پاتا۔ اُسے زینب کا یوں ہر وقت مشغول رہنا برا لگتا۔ مگر زینب تیز ہو کر جواب دیتی۔ مَردوں کو کیا معلوم گھر بنانے میں کیا کیا پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔ انھیں بس کمانے سے مطلب۔ گھر عورتیں بناتی ہیں عورتیں۔ وہ پوری طرح دھاک جاتی۔ اور حنیف خاموش ہو جاتا۔ وہ جانتا تھا۔ کہ اس کی تھوڑی آمدنی میں کتنی جلدی اس کا گھر دلہن کی طرح سجتا رہا تھا۔ اور پھر اُسے اس کا بھی احساس تھا۔ کہ نہ جانے کیسے وہ اپنے ساتھیوں میں اب ذرا بھاری بھرکم مانا جانے لگا تھا۔

اور پھر اس نے ایک دن چوراہے پر سنا گومتی میں سیلاب آ رہا ہے۔ برسات کے بعد یہ بے وقت کا سیلاب کیسا۔ کسی نے کہا ارے سیلاب نہیں خدا کا قہر کہو قہر۔ دن بھر شہر میں سنسنی پھیلی رہی، گومتی کی دھیمی دھیمی مستانی چال قہر و غضب میں تبدیل ہوگئی تھی۔ دوپہر میں جب کھانا کھانے گھر آیا تو اس نے زینب کو خبر دی کی شہر میں سیلاب کا پانی پھیل رہا ہے۔ شہر کے بچوں بیچ، پگڈنڈی بناتی ہوئی ناگ اندام گومتی چنگھاڑ چنگھاڑ کر خدا کی خدائی کو للکار رہی ہے اور اپنے کناروں کو نگلتی ہوئی انسانی آبادی میں گھس آئی ہے۔ لوگ بے گھر ہو کر اِدھر اُدھر بھاگ رہے ہیں۔ اور جب حنیف واپس چوراہے پر آیا تو خبروں نے دوسرا رخ اختیار کرلیا تھا۔ ریل کے پل پر سے لوگوں نے

دیکھا ـــ عورتیں، بچے اور ہزاروں جاندار پانی کے طوفان میں ڈھلکتے ہوئے موت کی گود میں جارہے ہیں ـــ کوئی عورت اپنے بچے کو سینہ میں دبائے پانی میں ڈوبتی ابھرتی دور نکل گئی ـــ تو کوئی بڑھیا اپنی جنم بھر کی گٹھری پیٹھ پر باندھے لہروں کے ساتھ کروٹیں لیتی، نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ نہ جانے کتنا سامان ان طوفانی لہروں میں ہلکورے لیتا ہوا چلا جارہا تھا۔ ان بھیانک تباہیوں کی خبروں سے محفوظ جگہوں پر رہنے والے بھی، ہراساں نظر آرہے تھے۔ دوسرے دن پانی اور بھی پھیل گیا۔ سڑکیں انسانوں سے بھر گئیں۔ اور گھر پانی سے، خبر آئی امام باڑے میں پانی ہی پانی ہے۔ آرٹ اسکول اور ندوہ پانی میں ٹاپو نظر آرہے ہیں ـــ یونیورسٹی کا زیادہ حصہ پانی میں غرق ہو چکا ہے۔ یونین بلڈنگ ڈھارے کی نذر میں ہے۔ اس کی خیریت نہیں۔ اور سکندر باغ کی عمارت کی برجی تو فاتح سکندر اعظم کی اس تلاش کی نشاندہی کررہی تھی۔ جہاں اسکا نصب کردہ جھنڈا لہرا لہرا کر سمندر کی راہ پر چلنے والوں کو آگاہ کررہا تھا۔ ادھر مت آنا۔ یہاں سمندر کی تھاہ نہیں ہے۔

اور اب اس کے محلے والوں نے بھی خطرے کا احساس کیا۔ رات تک پانی ضرور اس محلے میں بھی پھیل جائے گا۔ غراتی ہوئی لہریں ابھرتیں اور زمین کا تھوڑا سا خشک حصہ ان کی تہہ میں پہنچ جاتا۔ اور قدم قدم پر بڑھتے ہوئے اس طوفان سے گھبرا کر لوگ محلہ خالی کرنے لگے۔ زینب سے بھی حنیف نے مکان چھوڑنے کو کہا۔ مگر وہ جانے پر راضی نہ ہوئی۔ بھلا وہ کیسے خالی کردے یہ گھر ـــ کتنی منتوں اور دعاؤں کے بعد تو یہ ملا تھا۔ نہ معلوم کتنے خواب اس نے اس گھر کے دیکھے تھے۔ اور اب تعبیر سے یوں منہ موڑ لے۔

مغرب کے وقت سارا محلہ خالی ہوگیا۔ حنیف کو زینب کی ضد کے آگے سر جھکانا پڑا۔ اور اسے بھی رات گھر میں ہی رہنا پڑا۔ پانی اچانک تیزی سے بڑھنے لگا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے محلے میں پھیل گیا۔ زینب کے شیش محل کے درشن کے لئے اس نے نالی کا راستہ اختیار کیا۔ تیز لہروں کی ڈراؤنی آواز محلے میں گونجنے لگی۔ اور اس بھیانک گونج کے ساتھ ہی اکا دکا مکان پانی میں گھم گھما کر گرنے لگے۔ زینب کا پچھلا کمرہ ایک دھماکے کے ساتھ گرا اور زینب کانپ گئی۔ اب حنیف نے زینب کو زبردستی گھر چھوڑنے پر راضی کیا۔ اور زینب خاموش ہوگئی۔ باہر ایک دو سرکاری ناویں انسانوں اور ان کے سامانوں کو باہر نکالنے میں مشغول تھیں۔ کبھی کبھی شور و غل سنائی دیتا کہ ناؤ والا لوگوں کو کنارے سے اتار کر سامان لادے ہی واپس جارہا ہے۔ شور و غل اور لہروں کی گڑگڑاہٹ میں ناویں غائب ہوجاتیں۔ اور لوگ سامان کا غم بھول کر جان بچ جانے پر ہی خدا اور گورنمنٹ دونوں کا شکر ادا کرتے۔

حنیف اور زینب ایک پلنگ اور کچھ سامان اپنے سروں پر لاد کر، گھٹنوں تک پانی میں کچھ دور چلے اور پھر بڑی مشکل سے کسی رحمدل ملاح کو ان کی جانوں کی قیمت کا احساس ہوا۔ اور یہ لوگ سڑک پر پہنچا دیئے گئے۔ جہاں سیلاب کی سیر کرنے والوں اور سیلاب کے شکاروں کا میلہ لگا ہوا تھا۔ کچھ دور تک تو سڑک کے اوپر بھی پانی لہریں لے رہا تھا۔ اور آگے سڑک بالکل بند ہوچکی تھی۔ شاید گومتی سڑکوں اور گلیوں میں گھوم گھوم کر شہر کی تمام غلاظت کا جائزہ لے رہی تھی۔ اور ہزاروں بے گھر لوگ فٹ پاتھ پر پڑے تھے۔ کارپوریشن کی طرف سے بانسوں کے سہارے ٹین کے سائبان ان تباہ حالوں کے لئے ڈال دیئے گئے تھے۔ زینب اور حنیف نے بھی ایک کونے میں قبضہ کرلیا تھا۔ یوں ہی تین دن گزر گئے۔ بھوک پیاس، خوف اور غم سے زینب کا دم گھٹا جارہا تھا۔ ہیلی کاپٹر نے کھانے کے بڑے بڑے تھیلے برسائے۔ موٹی موٹی، لوہے کی تجوریوں میں سے پوریاں ابل پڑیں۔ مگر یہ سب نگلنے کے لئے حلق بند ہوچکا تھا۔ ہزاروں گھروں کے ساتھ ہی اس کا گھر بھی مٹ چکا تھا۔ جس گھر کا کونہ کونہ اس نے بھوک اور پیاس کی شدت برداشت کرکے سنوارا تھا۔ اس کا ایک ایک حصہ زمین پر ڈھیر ہوچکا تھا۔ کرایہ کے اس گھر کو اس نے اپنا سمجھ کر سجایا تھا ـــ اب وہ کیا کرے گی۔ اس کا سارا سامان برباد ہوچکا تھا۔ اور پھر اسے تو بہت جلد ہی سر چھپانے کے لئے ایک پناہ گاہ کی ضرورت تھی ـــ اس کا ننھا مہمان ـــ وہ سوچتے سوچتے تڑپ کر رہ گئی۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اور اس کی پھٹی ہوئی آنکھوں کے سامنے سڑک کے دوسرے کنارے پر ایک کوٹھی چمک رہی تھی۔ سفید چاندنی میں نہائی، بہت بڑی کوٹھی۔ زینب کی نگاہیں

اس پیچ گھیں — اتنی بڑی کوٹھی میں کتنے کمرے ہوں گے، کتنے دالان ہوں گے۔ اس نے سوچا شاید سلمیٰ کا گھروندا بھی ٹھیک ہی تھا۔ جس کا اس نے ہمیشہ مذاق اڑایا۔ اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی۔ اس کوٹھی کے اندر دیکھے۔ کیسی بنی ہے، کتنے خانے ہیں اس میں! ایک دن جب کوٹھی کے دروازے پر سیلاب زدوں کو دال اور آٹا ڈبوں سے ناپ ناپ کر بٹ رہا تھا۔ وہ بھی لینے گئی تھی۔ اس نے ڈیوڑھی میں بڑھ کر اندر جھانکنے کی کوشش کی مگر اندر دوسری ڈیوڑھی کی موٹی اونچی دیوار سامنے تھی۔ اور وہ اندر نہ دیکھ سکی۔ رات کو وہ ٹین کے سائبان تلے لیٹے لیٹے کوٹھی کے روشندانوں سے پھوٹتی ہوئی برقی روشنی تکا کرتی۔ کھڑکیوں پر لٹکتے پردوں میں اس کی آنکھیں الجھ جاتیں اور پھر سوچتی کتنا بڑا ہے یہ گھر۔ نہ معلوم کتنے کمرے تو بند پڑے ہوں گے۔ اور جب رات کی بھیگی بھیگی ٹھنڈی ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی۔ اس کے بدن میں چبھ جاتی۔ تو اس کی نگاہیں روشندانوں سے نکلتی ہوئی گرم گرم روشنی پر جم جاتیں۔

حنیف خراٹے لے کر سوتا رہتا۔ اور وہ سوچتی رہتی۔ اس گھر کے بارے میں جو اجڑ گیا۔ اس کے گھر کے بارے میں جو نہ بن سکا اور پھر جس روز کارپوریشن کے مزدور سائبان کی ٹین اور بانس ٹھیلوں پر لاد رہے تھے۔ اسے چکر آگیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور اس کا سر حنیف کے سینے سے ٹک گیا۔ بانس کے چاروں طرف پرانے ٹاٹ کے پردے جواس نے لٹکائے تھے۔ ایک طرف کنارے ڈھیر تھے اور سامان نیلے چمکتے ہوئے آسمان کے نیچے بکھرا پڑا تھا۔ اس نے سوچا اس کا گاؤں کتنا اچھا تھا۔ ایک چھپر — صرف ایک چھپر اور مٹی کے گھر آنگن، مٹی کا گھروندا — کتنوں کو پناہ دیتا تھا — میرا گھروندا، ایک کمرہ اور ایک دالان والا جو بہہ گیا — مٹ گیا۔ اور — اور پھر سلمیٰ کا گھروندا — نہ جانے کتنے کمروں اور دالانوں والا — گھر — مگر سب دروازے مقفل۔

سُوز ۔ کلکتہ

نریندر ناتھ مترا

شہزاد منظر

مینتی

مینتی ، ڈکسن لین کی ایک سہیلی کے یہاں جانے کی دعوت میں شرکت کے بعد گیلف اسٹریٹ کی ٹرام پر اکیلی آ رہی تھی۔ اس کا شوہر اس کے ساتھ دعوت میں نہیں آ سکا تھا کیوں کہ اسے اچانک ایک ضروری کام آ پڑا تھا۔ اس کا چار سال کا بچہ سنتو اس کے ساتھ آنے کیلئے کافی ضد کر رہا تھا۔ لیکن وہ اسے اپنے ساتھ نہیں لائی۔ اور اسے ساس کے پاس چھوڑ آئی۔ آتے وقت وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ لیکن نئے نوجوان سہیلی کے یہاں شوہر کے ساتھ تو جایا جا سکتا ہے۔ لیکن لڑکے کو ساتھ لے جانے سے نہ جانے کیوں شرم آتی ہے اس سے کیا ہوتا ہے۔ علاوہ بیلا کو بھی ابھی تک بچہ نہیں ہوا ہے نہ جانے وہ کیا سوچتی ! لیکن مینتی لوٹتے وقت کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ بچے کو اپنے ساتھ لانا ہی بہتر تھا۔ مینتی کی نظروں کے سامنے بار بار اس کے بچے کا چہرہ آ رہا تھا۔ اور اس کے کانوں میں اس کے متواتر رونے کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ جیب آنے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس وقت اس کا بیٹا اس کے ساتھ جانے کے لئے اپنے رنگین کپڑے اور چھوٹے سے جوتے کو لے کر خود سے تیار ہونے لگا تھا اُسے اپنی ماں کے ساتھ باہر جانے کی کتنی خواہش تھی۔ مینتی نے دل میں سوچا۔ وہ اگر چاہتی تو اسے اپنے ساتھ لا سکتی تھی۔ اروِن اور بیلو دونوں ہی بچوں کو بہت پیار کرتے ہیں۔ اگر وہ اپنے بابلو کو ساتھ لاتی وہ دونوں بہت خوش ہوتے۔

مینتی نے ٹرام پر چڑھنے سے پہلے ہی اپنے بچے کے لئے نکڑ کی دکان سے چاکلیٹ کا ایک بکس خرید لیا تھا۔ بابلو چاکلیٹ بہت شوق سے کھاتا ہے۔ وہ چاکلیٹ دیکھ کر بہت خوش ہوگا۔ اور وہ اس کا خوشی سے دمکتا ہوا چہرہ پیار سے دیکھتی رہ جائے گی۔ لیکن پتہ نہیں وہ کب تک گھر پہنچے گی۔ ٹرام کس قدر سست رفتاری سے چل رہی ہے جیسے بیل گاڑی ہو ! ہر اسٹاپ پر دیر ہو رہی ہے۔ نہ جانے اور کتنے لوگ اس پر چڑھیں گے۔ ٹرام لوگوں سے لدی ہوئی تھی۔ اور تل رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ لیکن لوگ ہیں کہ چڑھتے ہی جا رہے تھے اور کنڈکٹر انھیں کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔

راجہ بازار کے اسٹاپ پر ٹرام زیادہ دیر نہیں ٹھہری اور فوراً چل پڑی۔ ٹرام تیز رفتاری سے چلتی رہی۔ وہ اگر جلد گھر نہیں پہنچ گئی تو بابلو سو جائے گا۔ زیادہ رونے سے بچے عام طور پر جلد سو جاتے ہیں۔

"ٹکٹ !" مینتی نے قدرے چونک کر بیزاری سے مڑ کر دیکھا۔ کنڈکٹر بالکل اس کے سامنے کھڑا تھا۔ صرف کھڑا ہی نہیں تھا بلکہ ایک ٹک اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ یہ کس قدر بدتمیزی تھی۔ مینتی نے منہ پھیر کر اپنے چھوٹے سے بیگ کو کھولا اور چونی نکالی۔ اس نے ٹکٹ

لینے کے لئے کنڈکٹر کی جانب دیکھا۔ لیکن وہ جا چکا تھا۔ کنڈکٹر پھر آیا اور پھر اغل بغل کے لوگوں کو ٹکٹ دے کر واپس چلا گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹکٹ لینے کی کوشش کی۔ لیکن کنڈکٹر بالکل انجان بنا ہوا تھا۔ اور اس کی جانب دیکھ تک نہیں رہا تھا۔ اور وہ دوسری جانب جا کر ٹکٹ کاٹنے لگا۔ منیتی کو بڑی کوفت محسوس ہوئی۔ کنڈکٹر کی اس حرکت سے وہ اپنی توہین محسوس کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر کنڈکٹر اس کے قریب آیا اور اس کی جانب ایک ٹک تکتا رہا۔

منیتی دل ہی دل میں مسکرائی۔ اب وہ بات سمجھ رہی تھی۔ دراصل کنڈکٹر اسے بار بار دیکھنے کے لئے اس کا ٹکٹ نہیں لے رہا تھا۔ وہ اگر پہلی بار ٹکٹ دے دیتا۔ تو پھر اسے اس جانب آنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن عجیب بات ہے اس آدمی کی عمر کافی تھی۔ پچاس سے تو کسی حال میں کم نہیں ہوگی۔ سر کے بال پک چکے تھے۔ چہرے پر جھریاں پڑ چکی تھیں۔ اس کے باوجود لڑکیوں کو گھورنے کی عادت نہیں گئی تھی۔ شاید مردوں کو گھورنے کی عادت مرنے کے بعد بھی ختم نہ ہوگی۔ کسی لڑکی کی جانب گھورتے وقت مرد اپنے بارے میں سوچتے تک نہیں ہیں۔ سامنے آئینہ تو ہوتا نہیں ہے اور نہ اپنی آنکھوں سے اپنا چہرہ دیکھا جا سکتا ہے اگر دیکھ پاتے تو بڑے بڑے شہوت پرست اور شہدے بھی شرم محسوس کرتے۔

منیتی ٹرام میں ہر عمر کے مردوں کی اِن نظروں کو دیکھنے کی عادی سی تھی۔ وہ کافی خوبصورت اور صحت مند تھی۔ دیکھنے پر وہ پچیس چھبیس سال سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ صرف اس کا شوہر ہی نہیں۔ اس کے دفتر کے دیگر ساتھی بھی اسے محو ہو کر دیکھتے تھے۔ اس احساس سے اسے ایک طرح کی مسرت بھی ہوتی تھی۔ لیکن یہ شخص بدتمیزی کی حد تک پہونچ چکا تھا۔ بار بار آ جا رہا تھا۔ لیکن اسے ٹکٹ نہیں دے رہا تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں جب بھی آتا جاتا تھا۔ اس کی جانب ضرور دیکھتا تھا۔ منیتی کو ایسا محسوس ہوا جیسے کنڈکٹر کو اس بات کا اندیشہ ہے کہ وہ اگلے اسٹوپیج پر اُتر جائے گی۔ اگر وہ اتر سکتی تو ضرور اتر جاتی۔ لیکن یہ اس کی بدقسمتی ہے۔ کہ اسے ڈپو تک جانا ہی ہوگا۔ وہ اتر کر ٹرام بدل سکتی تھی۔ لیکن اس بھیڑ میں چڑھنے اور اترنے میں کافی پریشانی تھی۔

منیتی اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اور اس نے اس کے بالکل سامنے جا کر کہا "ٹکٹ دو۔ ٹکٹ کیوں نہیں دے رہے ہو؟"

کنڈکٹر چند لمحوں تک اس کی جانب دیکھتا رہا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد بولا۔ "ٹکٹ کی ضرورت نہیں ہے۔ ٹکٹ میں تم سے نہیں لوں گا بیٹی!"

منیتی حیرت زدہ رہ گئی۔ "بیٹی!" کیا کہہ رہا ہے یہ شخص؟ بیٹی؟"۔

لیکن دوسرے ہی لمحہ منیتی کو ہنسی آئی۔ یہ مرد ایسے ہی بزدل اور موقع پرست ہوتے ہیں سخت عورتوں کے سامنے وہ اسی طرح نرم ہو جاتے ہیں۔ منیتی نے کہا۔ "کیوں، ٹکٹ کیوں نہیں دو گے؟"

کنڈکٹر تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد بولا۔ "میری لڑکی ٹھیک تمہاری ہی عمر کی تھی۔ دیکھنے میں بھی تمہاری جیسی ہی تھی۔ تین دن پہلے اُس کی موت ہوگئی۔"

اور کنڈکٹر کی دونوں آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اور وہ قمیض کی باہوں سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگا۔ ٹرام آکر ڈپو میں کھڑی ہوگئی۔ اور وہ دونوں خاموشی سے نیچے اتر گئے۔ منیتی کھڑی ہوگئی۔ کنڈکٹر نے کہا۔ "میری ڈیوٹی ختم ہوگئی ہے۔" وہ اور کیا کہنا چاہتا تھا۔ منیتی سمجھ گئی۔ وہ کہنا چاہتا ہے کہ تم ابھی مت جاؤ۔ تھوڑی دیر تک کھڑی رہو۔ تمہارے چہرے میں میں اپنی مری ہوئی لڑکی کی ایک اور جھلک دیکھنا چاہتا ہوں۔

منیتی کھڑی رہی۔ اُسے زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چند منٹوں کے اندر ہی وہ آفس میں چمڑے کا بیگ رکھ کر باہر نکل آیا۔ اس اثنا میں منیتی نے سوچا۔ "اسے اس بوڑھے کنڈکٹر کے بارے میں ایسی گندی اور بےہودہ باتیں نہیں سوچنی چاہئے تھیں۔ اسے معصوم چہرہ دیکھتے ہی پہچان لینا چاہئے تھا۔ اس نے سخت لہجے میں اس سے باتیں کیں اور اس کی توہین کی۔" وہ دل ہی دل میں اس کے بارے میں سوچ کر شرمندہ ہوئی۔ اس نے سوچا وہ اس سے معافی مانگ لے گی۔

"تم ابھی تک کھڑی ہو بیٹی؟" کنڈکٹر اس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔

"آپ کا ہی انتظار کر رہی تھی۔ اُس کی کس طرح موت ہوئی؟"

دونوں آگے کی جانب چل پڑے۔ کنڈکٹر نے جواب دیا "تپ دق کی وجہ سے۔ لیکن تم مجھے آپ مت کہا کرو۔ وہ بھی مجھے تم ہی کہتی تھی۔ وہ بڑے لاڈ سے پالی ہوئی تھی۔ وہ میری اکلوتی بیٹی تھی۔ میں اُسے تھوڑی دیر کے لئے بھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ایسا ہو۔ اب میں کیسے رہوں گا بیٹی؟"

اس بوڑھے کنڈکٹر کا بیٹی کہہ کر پکارنا۔ "بچے کی ماں" کہہ کر پکارنے سے بھی زیادہ پیارا تھا۔ منیتی کا دل ممتا سے بھر آیا۔ اور اسے اپنا بچہ یاد آگیا۔ بچہ کو آنکھوں سے اوجھل کرنا بہت مشکل ہے۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے اپنے بچے کو چھوڑ کر آئی تھی۔ اور وہ اس کے لئے کس قدر بے چین تھی۔

ایک پتلی سی گلی کے سامنے آکر کنڈکٹر نے کہا۔ "تم کس طرف جاؤ گی؟"

منیتی نے کہا: "میں بھی اسی گلی میں رہتی ہوں!"

"اگر بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں! پاس ہی میرا گھر ہے۔ میں نے تمہیں تو دیکھ لیا ذرا اس کی ماں کو بھی دکھا دیتا۔"

"منیتی ٹھٹھر گئی اور تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد اس نے کہا" اچھا چلئے!"

کنڈکٹر نے کہا۔ "میری لکشمی روپ اور اور گُن میں میری لکشمی کی ہی طرح ہے۔ لیکن چلئے نہ کہو بیٹی، 'چلو' کہو۔ وہ بھی یہی کہتی تھی۔ لیکن کہیں بھی چپ چاپ کھڑی نہیں رہ سکتی تھی۔ تمہاری آواز میں اس کی آواز سن پا رہا ہوں بیٹی!"

سامنے ہی اس کا پرانا ایک منزلہ گھر تھا۔ اور دو کمرے اغل بغل تھے۔ ایک کا دروازہ بند تھا اور دوسرے کا کھلا تھا۔ اس کے سامنے آتے ہی کنڈکٹر نے پکارا۔ "آکر دیکھو کیا لایا ہوں۔ کسے لایا ہوں؟"

"کسے لائے ہو؟" ایک ادھیڑ عمر کی عورت کمرے سے نکلی۔ عورت تھوڑی دیر تک منیتی کی جانب ایک ٹک دیکھتی رہی۔ پھر اس نے کہا "ارے میری لکشمی! تم کیا پتھر کے ہوئے ہو؟ کیا تمہارے دل میں ذرا سا بھی رحم یا دیا نہیں ہے؟ تم اسے یہاں کیوں لائے ہو؟ اسے تم نے مجھے پھر کیوں دکھایا۔ جسے میں پھر کبھی بھی دیکھ نہیں پاؤں گی؟"

کنڈکٹر کو اس کی قطعی امید نہیں تھی۔ کہ بات اچانک بگڑ جائے گی۔ کنڈکٹر کمرہ میں داخل نہیں ہوا۔ اور الٹے پاؤں باہر نکل گیا۔ جیسے اسے اپنی بیوی کی وہ نگاہیں برداشت نہ ہو رہی ہوں۔ منیتی بھی واپس جا رہی تھی۔ لیکن کنڈکٹر کی بیوی نے اسے جانے نہیں دیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے آنسو پونچھتے اور دوسرے ہاتھ سے منیتی کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا!

"جب آئی ہی ہو تو کمرے کے اندر آؤ اور تھوڑی دیر بیٹھو۔"

منیتی کمرے کے اندر داخل ہوئی۔ چاروں جانب پھیلے ہوئے اسباب کو دیکھا، تمام چیزوں پر غربت کی چھاپ تھی۔ منیتی کو اس کی بہت ساری باتیں سننی پڑیں۔ اُس کے روپ اور گُن کی باتیں۔ اور پھر آخر میں اس کی بیماری کی باتیں۔ کہ وہ کس طرح آہستہ آہستہ گھل گھل کر مری۔ وہ مرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

"کس سے بات کر رہی ہو دادی؟" چار پانچ سال کی ایک گدری سی خوبصورت لڑکی دوڑتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ اور فوراً ٹھٹھک کر رہ گئی۔ کنڈکٹر کی بیوی نے کہا "لوٹی یہاں آؤ!"

لیکن لوٹی دادی کے پاس نہیں آئی۔ منیتی کی گود میں جا کر بیٹھ گئی۔

"تو کیا تم نہیں مریں۔ یہ اتنے دنوں تک کہاں چھپی ہوئی تھیں؟"

منیتی پر نم نگاہوں سے خاموشی کے ساتھ اس کی پیٹھ سہلاتی رہی اور اس نے چاکلیٹ کا پورا بکس اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ چاکلیٹ کے سوا ڈولی کو دینے کے لئے اس کے پاس تھا ہی کیا؟ ڈولی جب چاکلیٹ پاکر خوش ہوگئی۔ اور ادھر ادھر کھیلنے لگی تو وہ جانے کے لئے کھڑی ہوئی ڈولی کی نظر اس پر پڑی: "امی بھاگ رہی ہو؟ ابا تمہیں نہیں دیکھیں گے کیا۔ وہ ابھی آہی رہے ہوں گے۔"

منیتی کا چہرہ اچانک شرم سے سُرخ ہوگیا۔ اور وہ دونوں برآمدے میں نکل آئیں۔ ڈولی کی دادی نے کہا۔ "داماد بغل والے کمرے ہی میں رہتا ہے۔ بیٹی کو آنکھوں سے اوجھل نہ کرنے کے لئے ہی قریب رکھا تھا۔ ان لوگوں کا کمرہ دیکھوگی؟"

"نہیں نہیں، مجھے دیر ہو رہی ہے۔ میں اب جاؤں گی!"

ڈولی کی دادی نے کہا: "ذرا دیکھ ہی لو!"

منیتی نے کہا: "چلئے!"

کمرے میں آنے کے تھوڑی دیر بعد ہی منیتی جانے کے لئے اصرار کرنے لگی۔

ڈولی کی دادی نے کہا: "اگر تم تھوڑی دیر اور ٹھہر جاتیں تو ڈولی کے بابا بھی آجاتے۔ بہت ہی خوبصورت لڑکا ہے۔ میں نے بڑی دوڑ دھوپ کے بعد چاند سا لڑکا تلاش کیا تھا۔"

"کیا کام کرتا ہے؟"

"وہ ٹرام میں کنڈکٹری کرتا ہے۔"

"کنڈکٹر! وہ بھی کنڈکٹر ہے؟"

"ہاں انہوں نے ہی اُسے نوکری دلائی تھی!"

منیتی اور وہاں ایک لمحہ بھی نہیں ٹھہری اور گلی میں نکلتے ہی تیز قدموں سے چلنے لگی۔ کہیں راستے میں اُس سے ملاقات نہ ہو جائے۔ لیکن کسی نہ کسی دن تو ملاقات ہو سکتی ہے۔ شیام بازار سیکشن کی ٹرام سے تو اسے روز آنا جانا ہوتا ہے۔ کسی ایک دن خاکی کپڑے میں ملبوس ایک خوبصورت نوجوان کنڈکٹر اس کے پاس ٹکٹ کاٹنے آئے گا۔ اور اسے دیکھ کر اچانک چونک پڑے گا۔ آڑ سے چھپ کر اسے دیکھے گا۔ اور ٹکٹ نہ کاٹ کر وہ بھی چلا جائے گا۔ قریب آنا چاہے گا۔ لیکن نہیں آسکے گا۔ منیتی سب کچھ محسوس کرے گی۔ سمجھے گی۔ پھر بھی وہ کچھ نہیں کر سکے گی۔

م سلیم انور

جامِ نو۔ کراچی۔

زرد پتّے

جیسے ہی رآفے الاسکا میں داخل ہوا بیشمار نگاہیں اُس کی سمت اُٹھ گئیں۔ اُٹھنا بھی چاہیئے تھیں کیونکہ اُس کے ہمراہ سیمیں تھی سیمیں جس کا رنگ روپ چاندنی کی مانند سرد انگیز اور نشہ آور تھا۔ اس کے اعضا متناسب اور خدوخال تیکھے تھے۔

وہ دونوں ایک گوشے میں خالی میز پر جا بیٹھے۔ ہال میں تقریباً تمام میزیں پُر ہو چکی تھیں۔ اور فضا ملی جلی خوشبوؤں کی وجہ سے بوجھل سی ہو رہی تھی۔ ملی جلی خوشبوؤں کی اس بوجھل فضا میں بکھرتے ہوئے سریلے قہقہے ذہن پر عجیب سا تاثر چھوڑ رہے تھے۔ باہر شہر روشنیوں میں نہا رہا تھا۔ اور ابتدائی شب کی نشیلی ہوا کے جھونکے اس سرے سے اُس سرے تک چل رہے تھے۔ رآفے نے ویٹر کو جھینگے اور سینڈوچز کا آرڈر دینے کے بعد سیمیں کو دیکھنے لگا۔ آج وہ بے انتہا حسین لگ رہی تھی۔ سبز رنگ کی ساڑی میں اس کا چہرہ یوں لگتا تھا۔ جیسے دھان کے کھیت میں چاند نکل آیا ہو۔ اس نے اپنے بال سمیٹ کر اُوپر جوڑا لگایا تھا۔ جوڑے کے گرد چنبیلی کے پھولوں کا ہار لپیٹ رکھا تھا۔ اور جوڑے کے اوپر ایک بڑا سا سُرخ رنگ کا گلاب گویا آگ لگا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہمیشہ کی مانند آج بھی اتنی ہی شوخی تھی۔ کہ وہ سکوت کے عالم میں بھی بولتی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ "رآفے۔ رآفے یہ رنگ روپ، یہ زیب و زینت تمہارے لئے ہے صرف تمہارے لئے۔"

اور رآفے سوچ رہا تھا۔ یہ تو سچ ہے کہ میرے لئے تمہارا یہ رنگ روپ، یہ زیب و زینت اس چنگاری کی مانند ہے جسے تاریکی کی کوکھ میں دیکھ کر بے ساختہ چومنے کو جی چاہتا ہے۔ مگر چوما نہیں جا سکتا۔ اب وہ اسے کیوں کر بتاتا۔ کہ وہ اسے اپنا کر، امی بیگم کا دل نہیں توڑ سکتا۔ وہ امی بیگم جنہوں نے اسے اپنی کوکھ سے جنم دیا۔ اور اس کے جنم لینے کے دو ماہ بعد وہ بیوہ ہو گئیں۔ ان کا سہاگ اُجڑ گیا۔ پھر بھی وہ اس سبز قدم کو اپنے سینے سے لگائے پالتی رہیں۔ اس کے لئے اپنی تمام جوانی ایک گرلز کالج میں لیکچرر ہو کر گذار دی۔ اور اب جب کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا تھا۔ ایک سرکاری محکمہ میں فرسٹ کلاس آفیسر ہو گیا تھا۔ تو بھی وہ کس طرح ان کی قربانی کو فراموش کر سکتا تھا۔ کس طرح ان کا دل توڑ کر اپنے قدموں تلے روند سکتا تھا۔ وہ بخوبی جانتا تھا۔ کہ امی بیگم اسے اپنے بیٹے سے زیادہ اپنے مرحوم شوہر کی نشانی سمجھ کر چاہتی ہیں

ویٹر آرڈر لے کر آ گیا۔ تو اس نے چونک کر اُسے دیکھا۔ سفید وردی میں ملبوس سانولے رنگ کا تھل تھلا بدن والا ویٹر اسے عجیب لگا۔ اُسے ہال میں بیٹھے ہوئے مرد اور عورتیں بھی عجیب لگیں۔ جیسے وہ سب آزاد ہیں قطعی آزاد، چرند و پرند کی مانند۔۔۔ پھر صرف اس پر یہ قانون کیوں نافذ کر دیا۔ کہ ماں ہی تمہاری مجازی خدا ہے۔ مگر یہ قانون اس پر زبردستی تو عائد نہیں کیا گیا۔ اگر وہ چاہے تو آج ہی امی بیگم

کی منشا کے خلاف سیمیں کو اپنا سکتا ہے مگر وہ ایسا کیوں کر کر سکتا تھا۔ کس طرح کر سکتا تھا۔ مگر دوسری طرف سیمیں بھی اس کی زیست کا لازمی عنصر بن کر رہ گئی تھی۔ ہر لمحہ، ہر ثانیہ اسے سیمیں کی یاد لاتا تھا۔ اس صورت میں وہ سیمیں سے بھی دست بردار نہیں ہو سکتا تھا۔ امی بیگم کے لئے نفرت کی ایک لہر نامعلوم کہاں سے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ابھری۔ اُس نے دونوں ہونٹ سکوڑ کر منہ بنایا۔

"رآفے کہاں ہو؟" سیمیں نے آہستہ سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ تب وہ پیشانی پر ہاتھ پھیر کر آہستہ سے مسکرایا۔

"کہیں نہیں سیمیں تمہاری اسی دنیا میں ہوں۔"

"میری دنیا! مگر میری دنیا اس قدر پریشان کن نہیں۔" سیمیں کی آنکھوں کی شوخی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ "اسی لئے تو میں اس جنت میں گم ہو جاتا ہوں۔" رآفے نے آہستہ سے قہقہہ لگایا۔ پھر وہ بولا۔ "چھوڑو۔ آؤ ذرا میرا ساتھ تو دو۔" رآفے نے جھینگے کی پلیٹ اس طرف سرکا دی۔

امی بیگم کی عمر ساٹھ سال سے کسی طرح کم نہ تھی۔ ان کے چہرے پر وقت نے جھریوں کا ہلکا سا جال بن دیا تھا۔ آنکھیں دھندلا گئی تھیں مگر جن سے اب بھی مترشح ہوتا تھا۔ کہ وہ کسی زمانے میں بڑی ذہین عورت رہی ہوں گی۔ اُن کے بال لانبے اور سیاہ تھے۔ جن پر عمر کی زیادتی بھی اثر انداز نہ ہو سکی تھی۔ وہ شادی کے تیسرے سال بیوہ ہو گئی تھیں۔ اشرفی انھیں اپنے عوض ایک پیارا اور گول مٹول بچہ دیکر اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ اور انھوں نے اس بچے پر اپنی تمام جوانی نچھاور کر دی تھی۔ اور اب وہ جوان ہو گیا تھا۔ تو ایک بار پھر وہ اپنے تصور میں خود کو اشرفی کے ہمراہ دیکھ رہی تھیں۔ اس ندی کے کنارے جس کا شفاف پانی لہریں لیے کر بہہ رہا تھا۔ جہاں کنارے پر بہت سے حباب بن اور بگڑ رہے تھے اور وہ تصور ہی میں اشرفی کو مخاطب کر کے کہہ رہی تھیں۔ "اشرفی ۔ اشرفی ۔ تم کہاں سو گئے تھے۔ دیکھو میں تمہارا کتنی دیر سے انتظار کر رہی تھی" اور اشرفی جواب میں کہہ رہے تھے۔ "بانو مجھے کچھ لمحات کے لئے نیند آ گئی تھی۔ وہ دیکھو اس درخت کے نیچے جو ندی کے دوسرے کنارے پر کھڑا ہے جہاں حباب صرف بنتے ہیں بگڑتے نہیں۔" امی بیگم کو رآفے کا قد و قامت، اس کے خد و خال، اس کے عادات و اطوار بالکل اشرفی کی طرح لگتے تھے وہ چاہتی تھیں۔ رآفے ان کی آنکھوں کے سامنے بیٹھا ان سے ہنس ہنس کر باتیں کرے۔ اور وہ ماضی کے تمام پھول اپنی جھولی میں سمیٹ لیں۔ لیکن جب انھیں علم ہوا کہ رآفے سیمیں کو چاہتا ہے۔ تو انھیں ایک دھچکہ سا لگا۔ اور انھیں محسوس ہوا جیسے ان کے سینے کے وہ تمام زخم جو آہستہ آہستہ بھرتے گئے تھے۔ وہ یکلخت پھر تازہ ہو گئے ہیں اور ان سے پیپ اور لہو رسنے لگا ہے۔ انھوں نے سوچا جب رآفے سیمیں کا ہو جائے گا۔ تو ان کی محبت رآفے کے لئے ایک تنکے کی مانند ہو گی۔ جس کو سیمیں کی تند و تیز محبت کی لہریں بہا کر لے جائیں گی۔ اور اس وقت جب کہ زندگی کی شام ہو چکی ہے۔ سورج ڈوب چکا ہے تو وہ اس وسیع و عریض سمندر کے کنارے تنہا رہ جائیں گی۔ ایک ٹھنڈ کی مانند جس کے تمام پتے جھڑ چکے ہیں۔ لیکن یہ تو فطرت کا قانون ہے جیسے چاند جنم لیتا ہے۔ اور سورج اسے ایک ماں کی طرح اپنی زندگی سے پرورش کرتا ہے اور ایک دن یہی چاند سورج سے نالاں ہو کر زمین پر اپنی کرنیں اپنی زندگی نچھاور کرنے لگتا ہے بالکل اسی طرح بچہ جنم لیتا ہے اور ماں کے سینے سے زندگی کا رس چوستا ہے۔ اور جوان ہو کر سب کو یکسر فراموش کر دیتا ہے۔

رآفے نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی اور لانبے لانبے ڈگ بھرتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

"امی! امی!" اس نے تاریک کمرے میں آواز دی۔ "ہوں!!" امی کی آواز دھیرے سے ابھری۔

"ارے آپ گرمی اور تاریکی میں کیا کرتی رہتی ہیں۔" رآفے نے لائٹ آن کر کے کہا۔ "چلئے چلئے باہر۔ یہاں گرمی ہے۔" امی بیگم نے بستر پر لیٹے لیٹے آہستہ سے آنکھیں کھول کر اُسے دیکھا۔ "نہیں رآفے مجھے یہیں پڑا رہنے دو۔ اس تنگ و تاریک کمرے میں۔ جہاں میرا ماضی بازو کھولے کھڑا ہے۔ یہاں اس کمرے میں ہماری محبت جوان ہوئی تھی۔ یہیں ہم نے تا ابد ساتھ رہنے کا عہد کیا تھا۔ مگر وہ بے وفا تھا۔ وہ

بے وفا تھا۔ رافے مجھے اس تنگ و تاریک کمرے میں چھوڑ کر چلا گیا۔ اور میری کوکھ سے ایک پھل نے جنم لیا۔ میں اس میں اشرفی کا عکس دیکھتی ہوں۔ مجھے سرتاپا وہ اشرفی ہی نظر آتا ہے۔ رافے نے ایک طرف منہ کرکے دو ہونٹ سکوڑے۔ آخر وہ کب تک ان کی موت کے انتظار میں اپنی جوانی کو گھن لگاتا رہے۔ کب تک آخر کب تک ؟

"چھوڑیئے امی! آپ کیسی باتیں کرتی ہیں۔ باہر چلئے.... وہاں روشنی ہے، ہوا ہے!" امی بیگم نے کھوکھلی ہنسی کے ساتھ کہا۔ "اور تم میرے پاس نہیں بیٹھو گے کیونکہ تمہارا دل اس تنگ و تاریک جگہ میں نہیں لگتا۔ تو جاؤ باہر جاؤ۔ میں نے تمہیں روکا تو نہیں۔ وہاں روشنی ہے، ہوا ہے۔ اور.... سیمیں ہے۔ کیوں ہے نا سیمیں؟ ۔ ارے تم خاموش ہو گئے پگلے۔ میں اس سے نفرت تھوڑا ہی کرتی ہوں۔ تم نے کئی بار اس کا نام میرے منہ سے سن کر عجیب سا منہ بنایا ہے۔ مگر میں نے کبھی برا نہیں مانا۔ کبھی کچھ نہیں کہا۔ مگر آج کہتی ہوں۔" کچھ ثانیہ کے لئے وہ اس کے چہرے کو غور سے دیکھتی رہیں۔ پھر انہوں نے دوسری طرف منہ کرکے جیسے کچھ حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔ "ہاں آج کہتی ہوں تم اسے اپنا لو۔ کیونکہ یہی ہوتا آیا ہے۔ کہ جب درخت پر نئی کونپلیں نکلیں۔ تو زرد پتے جھڑ کر زمین پر گر پڑیں اور بچے جب جوان ہو جائیں تو انہیں مستقبل کے حوالے کر دیا جائے۔ میں نہیں چاہتی۔ تم مجھ سے صرف اس لئے نفرت کرنے لگو۔ کہ میں تمہارے اور سیمیں کے درمیان دیوار بن گئی ہوں۔ لیکن رافے! تم دیکھ رہے ہو۔ کہ اس کمرے کی دیواروں پر بہت سی تصاویر آویزاں ہیں اس میں کچھ زیادہ پرانی کچھ کم۔ تمہارے ابا جب نئی تصویریں یہاں آویزاں کرتے تھے۔ تو پرانی تصاویر کو ان کے مقام سے ہٹاتے نہیں تھے۔ جاؤ بس مجھے تم سے یہی کہنا تھا۔"

رافے کے گھر میں سیمیں کیا آئی گویا بہار آ گئی۔ ایک وقت تھا کہ پورے گھر سے سنجیدگی ٹپکتی تھی۔ اور اب یہ عالم تھا کہ گھر کے در و دیوار آنکھوں کی مانند محسوس ہوتے تھے۔ آہستہ آہستہ بہاریں گزرتی گئیں۔ امی بیگم کے لئے رافے کا وجود ختم ہوتا گیا۔ اس کی جگہ اب دوسرا رافے پیدا ہو گیا تھا۔ وہ رافے جو صرف سیمیں کا تھا۔ جو گھنٹوں ہنس ہنس کر اس سے باتیں کرتا رہتا۔ اور وہ تنگ و تاریک کمرے میں تنہا ان کے قہقہے سنتی رہتیں۔ اب انہوں نے اپنے کمرے سے نکلنا بہت کم کر دیا تھا۔ کبھی کبھار رافے انہیں زبردستی اپنے ہمراہ ڈائننگ ٹیبل پر بٹھا لیتا۔ اور بس! اب رافے کے دل میں امی بیگم کے لئے وہ پیار وہ انس نہ رہا تھا۔ امی بیگم ایک بار پھر اپنے تصور میں اشرفی کو دیکھ رہی تھیں۔ جو ایک وسیع و عریض دریا کے کنارے کھڑا تھا وہ چلا چلا کر اس سے کہنا چاہ رہی تھیں۔ اشرفی اشرفی! ادھر مت آنا، میں خود آ رہی ہوں۔ دیکھو یہ دریا کس قدر وسیع ہے مگر اس کا پانی اس قدر گندا ہے۔ ہم دونوں ساتھ اس ندی کے کنارے پر جائیں گے۔ جو چھوٹی سی ہے مگر جس کا پانی شفاف ہے۔

رافے اور سیمیں اپنی محبت میں مست تھے۔ ایک شمع تھی جو فانوس میں روشن تھی۔ اور ایک فانوس تھا جو شمع کی روشنی سے جگمگا رہا تھا مگر جس کی روشنی امی بیگم کے تنگ و تاریک کمرے تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ امی بیگم اس فانوس کو کھڑکی کی راہ سے دیکھتی اور سوچتی تھیں۔ وہ جو میری زندگی کی تنہائیوں کا آخری سہارا تھا۔ وہ جو میری محبتوں کی آخری کرن تھی۔ وہ کرن بھی میرے قبضے سے نکل چکی ہے۔ اب میں ایک پالتو بلی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ جس سے رافے بچپن میں محبت کرتا تھا۔ اور اب اسے اس بلی کی قطعی پروا نہیں۔ کوئی خیال نہیں۔

دوسرے دن جب رافے اور سیمیں ناشتہ کی میز سے اٹھ رہے تھے۔ نوکر امی کا ناشتہ لے کر ادھر سے گزرا۔ رافے نے اس کے ہاتھ سے ٹرے لے لی۔ جب وہ ٹرے لئے ہوئے کمرے میں پہنچا۔ تو اندر نیم تاریکی تھی۔ دیواروں پر آویزاں تصویریں دھندلی نظر آ رہی تھیں اور پلنگ پر لیٹی ہوئی امی بیگم اسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ "امی اٹھئے! ناشتہ کر لیجئے!" اس نے جھک کر کہا۔ مگر وہ اسے مسلسل گھورتی رہیں۔ پلکیں جھپکائے بغیر اور کمرے میں صرف اس کی آواز گونج کر رہ گئی۔ "امی! اٹھئے! ناشتہ کر لیجئے!!"

فکر تونسوی — فنون ۔ لاہور

بھارت رتن چند کا وصیّت نامہ

یہ وصیت نامہ بھارت رتن چند لوئر ڈویژن کلرک کی جیب سے برآمد ہوا۔ بھارت رتن چند نے سیکریٹریٹ کی تیسری منزل سے چھلانگ مار کر خودکشی کر لی تھی۔ وصیت نامہ نہایت خوبصورتی سے ٹائپ کیا گیا تھا۔ دفتر کے ایک اعلیٰ افسر نے (بعد از مرگ واویلا مچاتے ہوئے) کہا "مرحوم ایک باکمال ٹائپسٹ تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے بھی ٹائپ کر سکتا تھا"

اب جبکہ اُس کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو چکی ہیں یہ وصیت نامہ باقی ماندہ لوئر ڈویژن کلرکوں کی رہنمائی کے لئے شائع کیا جا رہا ہے۔

—"میں مسمی بھارت رتن چند یو۔ ڈی۔ سی۔ ولد (ایسے باپ کا نام لکھتے ہوئے شرم آتی ہے جو صرف کلرک بیٹے پیدا کرتا ہو) — عمر چونتیس سال سات مہینے ایک دن۔ ساکن آٹھ سی۔ کوارٹر بابو کالونی کا ہوں اور بقائمی ہوش و حواس اپنے ٹائپ رائٹر کو حاضر ناظر جان کر یہ وصیت نامہ لکھ رہا ہوں۔

سب سے پہلے میں پولیس حکام سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ میرا کیس رجسٹر نہ کریں۔ کیونکہ میں اب زندہ نہیں رہا۔ مُردوں پر کیس چلانا بے معنی ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ میری بجائے کسی زندہ چیز کا چالان کریں (مثلاً کسی بائیسکل کا چالان کر دیں) پھر یوں بھی مر جانا خلاف قانون نہیں۔ زندہ رہنا خلاف قانون ہے۔ احتیاطاً یہ بھی عرض ہے کہ مجھے کسی دوسرے کلرک نے دھکا نہیں دیا۔ اس لئے شبہ میں کسی دوسرے کلرک کو گرفتار نہ کریں۔ اور کسی پولیس افسر کو میری موت کی تحقیقات پر بھی مامور نہ کیجئے گا۔ کیونکہ میں اسمگلر نہیں ہوں۔ لیڈر نہیں، دشمن کا جاسوس نہیں ہوں۔ بلکہ سرتاپا کلرک ہوں۔ میری قمیص کے پھٹے ہوئے کالر کو دیکھئے اور سوچئے کہ کیا پھٹے ہوئے کالر کی تحقیق کی جا سکتی ہے۔ کیا آپ اس بات کی انویسٹی گیشن کریں گے، کہ ایڑیوں سے پھٹی ہوئی میری بدبودار جراب کس ہوزری فیکٹری نے تیار کی تھی۔ اور میرے بغیر تسمے کے بوٹوں کی پالش میں وارنش کیوں کم ہے؟ — نہیں جناب اس قسم کی تحقیقات سے کچھ حاصل نہیں ہوگا — آپ کالر کو قید نہیں کر سکتے، جراب کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا نہیں کر سکتے، بوٹ فیکٹری پر یہ الزام نہیں لگا سکتے۔ کہ وہ لوئر ڈویژن کلرکوں کے لئے گھٹیا کوالٹی کے بوٹ کیوں بناتی ہے؟ جو اس کی خودکشی کے لئے میدان تیار کر دیتے ہیں — اور نہ ہی آپ ان تمام چیزوں کو کسی جج کے سامنے بطور گواہان

استغاثہ پیش کر سکتے ہیں۔ کیونکہ تمام چیزیں گواہ ہیں۔ بلکہ عدالت انھیں گواہ ہی تسلیم نہیں کرے گی۔ اور اس لئے پولیس پر تہمت لگا دے گی۔ کہ پولیس بھارت رتن چند کے حقیقی قاتلوں کے بجائے معصوم اور بے گناہ قاتلوں کو گرفتار کر لائی ہے۔

اور میری دوسری عرضداشت یہ ہے کہ میری لاش کا پوسٹ مارٹم بھی نہ کرایئے گا۔ کیونکہ اس میں سے کوئی زہر نہیں نکلے گا۔ کوئی گھاؤ دکھائی نہیں دے گا۔ کسی چوٹ کی بو محسوس نہ ہوگی۔ دنیا کا کوئی ڈاکٹر میرے زہر، میرے گھاؤ، میری چوٹ کا تجزیہ نہیں کر سکے گا کیونکہ یہ چیزیں میری رگ رگ میں یوں تحلیل ہو چکی ہیں۔ جیسے آٹا پراتا میں گھل مل جاتی ہے۔ ڈاکٹری سائنس رگ پٹھوں کی تعداد تو بتا سکتی ہے مگر یہ معلوم نہیں کر سکتی کہ بھارت رتن چند کے ان میں وہ ایٹمی ذرے کہاں ہیں جنہیں جوڑ کر وہ اپنے بیٹے کی نیکر کے بٹن بنا سکتا۔ کیونکہ ڈاکٹر کہے گا۔ کہ بٹن تو مارکیٹ میں ملتے ہیں لہو میں تھوڑے ہی شامل رہتے ہیں۔ گذشتہ ماہ میری بیوی نے کہا تھا کہ تمہارا خون سفید ہو گیا ہے تم اپنے بیٹے کے بٹن بھی نہیں لا سکتے۔ میں بیوی کے اس کیمیکل سوال کا جواب نہیں دے سکا۔ بلکہ اس کے بجائے خودکشی کر لی۔ تاکہ لیبارٹری میں میرے لہو کا تجزیہ کر کے دیکھا جائے کہ اگر اس کے قطروں میں بٹن چھپے ہوئے ہوں، اگر ان میں فروٹ کی خوشبو آتی ہو۔ اگر ان میں کرایہ مکان کے روپوں کی مہک موجود ہو۔ اگر ان میں بیوی کی ساڑھی، بچوں کی کتابیں، گھی کی بوندیں، کینٹین کے سموسے، دودھ کی سفیدی اور سگریٹوں کی راکھ گھلی ملی ہوئی تو ڈاکٹر حضرات ان سب چیزوں کو میرے لہو سے الگ کر لیں۔ اور میرے گھر والوں میں بانٹ دیں۔

اور اگر ڈاکٹر یہ نہیں کر سکتے۔ تو پھر خدا کے لئے میرا پوسٹ مارٹم نہ کریں اور میرے لہو، میری رگوں اور میری ہڈیوں کو سنسار کے سامنے رسوا نہ کریں۔ اور میری لاش کو میرے لواحقین کے حوالے کر دیں۔ تاکہ کم از کم میری ارتھی تو اٹھے۔ میرے بیوی بچے روئیں، کرلائیں۔ اور میری موت پر انھیں پروٹسٹ کرنے کا موقع ملے۔ اور وہ سارے سماج کو سنائیں۔ کہ بھارت رتن چند بزدلی کی موت مرا۔ اور وہ ملک کے یتیموں میں اضافہ کر گیا اور پھر یتیم خانوں کے منتظمین انہیں تسلی دیں۔ کہ تمہارا باپ مر گیا مگر یتیم خانہ تو ابھی زندہ ہے اور پھر لوگ کفن بنا کر مجھے شمشان بھومی میں جلا آئیں۔ میری ہڈیوں کو، میرے لہو کو، میری رگوں کو ـــ ہر چیز کو جلا آئیں۔ تاکہ جلانے کے بعد انھیں محسوس ہو کہ بھارت رتن چند کو نہیں جلا آئے بلکہ اپنی پھٹی ہوئی نیکروں کے ٹوٹے ہوئے بٹن جلا آئے ہیں۔ اپنی ساڑھیاں، کتابیں، روٹیاں، سبزیاں آگ میں جھونک آئے ہیں

(۲)

اب میں اپنی وصیت کے دوسرے دلچسپ حد تک دردناک حصے پر آتا ہوں۔ یعنی یہ کہ میرے بعد میری جائداد کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے (جائداد میں میرے بال بچے بھی شامل ہیں) میں نے یوم تنخواہ سے ایک دن پہلے خودکشی کی ہے اس لئے اگر مُردے کو بھی تنخواہ دینے کا رواج ہو تو میری آخری تنخواہ میری بیوی کو نہ دی جائے۔ بلکہ کسی ایسے کلرک کو دی جائے جو میری طرح خودکشی کا ارادہ کر رہا ہو۔ اور اگر یہ خطرہ لاحق ہو کہ تنخواہ نہ ملنے سے میری بیوی خودکشی کرے گی۔ تو پھر مجبوراً یہ تنخواہ میری بیوی کو ہی دے دی جائے۔ میرا مطلب ہے میری تنخواہ ضائع نہ کی جائے۔ یعنی کسی دھرم شالہ، یتیم خانہ یا مذہبی ٹرسٹ کو نہ دی جائے۔

میں اپنے پیچھے کچھ قرضہ بھی چھوڑے جا رہا ہوں۔ قرضہ میں کچھ تو روپیہ ہے اور کچھ احسانات ہیں، جیتے جی میں یہ دونوں چیزیں نہیں چکا سکا۔ اگر اور جیتا رہتا تو بھی نہ چکا سکتا۔ (کیا خودکشی کے لئے یہ وجہ آپ کو پسند آئی)

میں نہیں جانتا کہ میرے قرض خواہ اپنا قرضہ کس طرح وصول کریں گے۔ مثلاً ایک چپڑاسی رام دھن سے میں نے ساٹھ روپیہ قرضہ لیا تھا۔ میری وصیت ہے کہ اُسے میرا پرانا سائیکل دے دیا جائے۔ ممکن ہے چپڑاسی نمبر ۲ ہربنس لال اعتراض کرے۔ کہ بائیسکل اُسے دیا جائے ـــ (ہربنس لال سے میں نے پچاس روپیہ قرض لے رکھا ہے)۔ بعد ازاں خوف ہے کہ کہیں بائیسکل نامی جائداد پر دو چپڑاسیوں میں سر پھٹول نہ ہو جائے۔ بہتر رہے گا۔ کہ یہ بائیسکل، شنکر بائیسکل کمپنی کے مالک شنکر پرشادجی کو دے دیا جائے۔ کیونکہ اس کی بائیسکل کی چار قسطیں ابھی مجھ پر واجب الادا

ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ میرا چھوٹا لڑکا بائیسکل پر سوار ہو کر اسکول جانے کے لئے ضد کرے گا۔ اور ممکن ہے کہ وہ بائیسکل کو باپ کی جدی جائداد سمجھ کر اس پر موروثی حق جتلائے۔ اور قرض خواہوں کے ساتھ غنڈہ گردی دکھائے۔ لیکن میں اپنے بڑے لڑکے کو مشفقانہ مشورہ دوں گا۔ کہ وہ خاندانی اخلاق کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ بلکہ اخلاق کا تقاضا تو یہ ہے۔ کہ وہ بائیسکل کے ساتھ ساتھ پڑھائی بھی ترک کر دے۔ ایک بائیسکل کی خاطر اخلاق سے دست کش ہو جانا۔ اور تعلیم کا شوق قائم رکھنا اچھا نہیں ہے۔ شرفا کی یہ روایت نہیں ہے اس کی بجائے اگر وہ لنڈے یوں اور ریوڑیوں کا خوانچہ لگالے تو قرض خواہ بھی داد دیں گے۔ اخلاق بھی محفوظ رہے گا۔ میری روح کو بھی سکون ملے گا۔ اور وہ بھگوان کے سامنے سر بلند کر کے کہہ سکے گی۔ کہ اے بھگوان تو نے مجھے پیدا کیا۔ اور میں نے اپنا بیٹا پیدا کیا۔ مگر دیکھ لے میری تخلیق، تیری تخلیق سے زیادہ بہتر، اور معیاری نکلی۔

قرضے اس کے علاوہ اور بھی ہیں۔ اور شکر ہے کہ بائیسکل کے علاوہ کچھ چیزیں اور بھی میرے گھر میں موجود ہیں۔ مثلاً ادھورے ٹی سیٹ دو تین کرسیاں، میرا ایک گرم سوٹ، کچھ کتابیں، تین چار پائیاں (چوتھی چارپائی کا میں نے آرڈر دے رکھا ہے اسے کینسل کرا دیا جائے) سیکنڈ ہینڈ ٹیپ ریکارڈر، بیوی کے زیور، گھر کے برتن، ڈیڑھ سوٹ کیس (کیونکہ ایک سوٹ کیس سالم ہے دوسرا بغیر ڈھکنے کے ہے) غرض اس قسم کی چند چیزیں میری جائداد کے طور پر شمار کی جا سکتی ہیں۔ ان میں سے اکثر چیزیں قرض لے کر خریدی گئی تھیں۔ قرض واپس کرنے کی بجائے یہ چیزیں ہی واپس کر دی جائیں۔

لہٰذا میں اپنی بیوی کو وصیت کرتا ہوں۔ کہ فراخ دلی دکھائے اور ان چیزوں سے قرضے چکا دے۔ کیونکہ ہندوستانی فلاسفی کی رُو سے یہ سنسار مایا ہے۔ اس سنسار کی کوئی چیز ہماری اپنی نہیں ہے۔ ہم نے ہر چیز مانگ رکھی ہے، ہماری محبت، غصہ، نفرت، حسد، تمنائیں، امنگیں، غم، زخم، آنسو، مسکراہٹیں — ہر چیز دوسروں کی ہے — دوسروں نے ہمیں دی ہے اور وقت آنے پر دوسروں کو ہی لوٹا دینی چاہیے۔ جیسے آتما، پرماتما کو لوٹا دی جاتی ہے۔ ویسے ہی کرسی ہی لوٹا دینی چاہیئے۔ توا بھی، بالٹی بھی، بائیسکل بھی، اس سے اگرچہ تکلیف ضرور ہوگی۔ لیکن تکلیف تو قسمت کے کولہو کی سرسوں ہے۔ اسے کولہو میں ڈال دیجیئے۔ اور اس میں سے جو تیل نکلے اسے دھرم سمجھ کر چہرے پر مل لیجئے تو چہرے پر ایک عجیب تیج سا آجائے گا۔

لیکن اگر میرے لواحقین دھرم کا پاس نہ کر سکیں تو میرے قرض خواہ براہ کرم میرے دوسرے جنم کا انتظار کریں۔ کیونکہ دوسرے جنم میں میرا ارادہ اسمگلر بننے کا ہے۔ میں نہ صرف پرانا قرض چکا دوں گا۔ بلکہ دوسروں پر قرضہ چڑھا بھی دوں گا۔

قرضے کے علاوہ کچھ احسانات ہیں جو لوگوں نے مجھ پر کئے تھے بہتر تو یہ ہے کہ میرے محسن نیکی کر کے دریا میں ڈوب مرتے۔ لیکن شاید دریا دور تھا اور میں نزدیک۔ اس لئے تو مجھے ہی اپنا احسان یاد دلاتے رہے۔ مثلاً ایک شخص سے میں نے چھ نئے پیسے کا ایک کارڈ لیا جسے وہ کبھی نہیں بھولا، میں نے کارڈ کے بدلے اسے کئی بار دفتر سے اسٹیشنری چرا کر لا دی۔ مگر وہ پھر بھی محلہ بھر میں کہتا پھرتا ہے "اجی! ہم نے بھارت رتن چند کی ہمیشہ مدد کی۔ پوچھ لو۔ ایک بار تو اسے اپنا پوسٹ کارڈ تک دے دیا تھا۔"

ایک اور دوست ہیں۔ مانگے رام جی ایک مرتبہ انھوں نے مجھے بلیک میں ایک بوری سیمنٹ دی تھی۔ کئی بار میرا جی چاہا کہ بلیک میں سے سیمنٹ لے کر اُسے لوٹا دوں۔ لیکن اُس نے میری یہ حسرت کبھی پوری نہ ہونے دی۔ مجھے ڈر ہے کہ میری موت کے بعد تو وہ اس احسان کا پراپیگنڈہ تیز کر دے۔ مگر میری وصیت ہے کہ اس پراپیگنڈے کو روکا نہ جائے۔ آزادیٔ خیال ہر فرد کا حق ہے چاہے تو بلیک مارکیٹیا ہی کیوں نہ ہو؟

ایک احسان مجھ پر میرے دفتر کے افسر کا ہے۔ جس نے مجھے نوکری عنایت کی تھی۔ اگرچہ اس کے عوض میں نے اس کے گھر جھاڑو دیا

اُس کی بیوی کی نا دیدہ گالیاں سنیں۔ صاحب کے کئی گناہوں کو اپنے سینے کے قبرستان میں دبائے رکھا۔ حتیٰ کہ ایک بار صاحب کے ننھے بچے نے مجھے گدھا تک کہہ دیا تھا۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں۔ کہ میں نے یہ سب کچھ برداشت کرکے گویا احسان کا بدلہ چکا دیا۔ لیکن اگر صاحب آرڈر دے کر ابھی احسان کی فائل داخل دفتر نہیں ہو سکتی ــــ تو میں صاحب کے ننھے بچے کو اجازت دیتا ہوں کہ میری سمادھ پر آکر ہر روز ایک بار مجھے "گدھا" کہہ دیا کرے اور میری سمادھ میں سے احتجاج کا ایک لفظ بھی باہر آئے۔ تو اس لفظ کو "متروک" سمجھ کر خارج کر دیا جائے۔

قرضے کی طرح احسانوں کی بھی پوری فہرست مجھے یاد نہیں آرہی۔ لیکن سب سے بڑا اور آخری احسان مجھ پر اُس آدمی کا تھا۔ جس نے میری چھبیس سالہ کنواری بہن سے بیاہ کرنے کا وعدہ اس شرط پر کیا تھا۔ کہ میں اسے دس ہزار روپے کا جہیز دوں۔ یہ پانچویں بار تھی جب میری بہن کی منگنی جہیز کی وجہ سے چھوٹ گئی۔ اور آخری منگنی ٹوٹنے سے پہلے ہی میں نے خودکشی کر لی۔ کیونکہ اگر خودکشی میں نہ کرتا۔ تو میری بہن کر لیتی۔ آخری بار دس ہزار روپیہ کا جہیز مانگنے والے نے مجھ پر یہ احسان کیا۔ کہ مجھے زندگی سے نجات دلا دی۔ اس کا یہ احسان میں کبھی نہیں چکا سکتا۔ والد صاحب قبلہ نے مرتے وقت نصیحت کی تھی۔ "بیٹا، بہن کے ہاتھ پیلے کر دینا۔" اور اب میں مرتے وقت اپنی بہن کو وصیت کرتا ہوں کہ پیاری بہن! "ہاتھ اگر پیلے نہ ہوئے تو نہ سہی۔ میرے خون سے لال کر لینا۔ کیونکہ لال رنگ بھی سہاگ کی نشانی ہوتا ہے۔"

(۳)

اب میں آخر میں اپنے پسماندگان کے بارے میں کچھ کہوں گا۔ میری ایک بیوی ہے (جسے اب بیوی نہ کہا جائے، بیوہ کہا جائے) چار بچے ہیں ــــ ونود۔ بملا، شیلا اور پپو ــــ ایک بڑھیا ماں ہے۔ جو لاوارث عورتوں کے سرکاری کیمپ میں رہتی ہے۔ بہو نے اسے جوتے مار مار کر گھر سے یوں نکال دیا۔ جیسے کہ کوڑا کرکٹ باہر پھینک دیتی تھی۔ میری ماں کو میری موت کی اطلاع نہ دی جائے۔ کیونکہ سنا ہے کہ وہ دن رات بھگوان کی پوجا کرتی ہے۔ میری موت کی اطلاع سے بھگوان کی پوجا میں خلل پڑے گا۔ اور بھگوان کے بارے میں مجھے شبہ ہے کہ وہ میری خودکشی برداشت کر جائے گا۔ مگر اپنی پوجا میں خلل برداشت نہیں کرے گا۔

اور جو میری جوان کنواری بہن ہے اسے میں وصیت کرتا ہوں کہ اب وہ کسی ودھوا آشرم میں داخل ہو جائے۔ اور اگر ودھوا آشرم والے استفسار کریں۔ کہ تمہارے مرحوم خاوند کا کیا نام تھا۔ تو وہ کہہ دے کہ کچھ عورتیں شادی کئے بغیر ودھوا ہو جاتی ہیں۔ یہ نئی قسم کا سماج ہے اس لئے اس میں ودھوا بھی نئے قسم کی پیدا ہو رہی ہیں۔

باقی رہے میری بیوی اور میرے بچے ــــ اگر یہ سبھی جنٹلمین میرے نقشِ قدم پر چل کر خودکشی کرنا چاہیں تو سماج کا فرض ہے کہ انھیں خودکشی کے لئے مناسب آسانیاں بہم پہونچائے۔ اور اگر انھیں ابھی زندگی عزیز ہو تو میں بیوی کو اجازت دیتا ہوں کہ وہ جو چاہے کرے وہ آزاد ہے۔ کیوں کہ اب وہ بیوی نہیں رہی۔ میں اسے اب کبھی نہیں ٹوکوں گا۔ کبھی یاد نہیں کروں گا۔ کبھی گالیاں نہیں دوں گا۔ کبھی روٹھوں گا نہیں، مناؤں گا نہیں۔ نہ میں اس کا خاوند نہ وہ میری بیوی ــــ یہ رشتے جسم کے ہوتے ہیں روح کے نہیں۔

اور میں اپنے چاروں بچوں کو بھی وصیت کروں گا۔ کہ اپنے آپ کو یتیم کہلانے میں عار محسوس نہ کریں۔ تعلیم وغیرہ کے امیرانہ تکلف سے نجات حاصل کریں۔ باپ کا نام پہلے بھی کوئی خاص روشن نہیں تھا۔ اس لئے میرے نام کو روشن کرنے کی بورژوا روایت پر وقت ضائع نہ کیا کریں ــــ یتیم خانوں، کشکول گدائی اٹھانے سے لے کر جوئے بازی اور ڈاکہ زنی تک ہر کام وہ کر سکتے ہیں۔ اگرچہ مجھے خطرہ ہے۔ کہ میرے لہو کی تاثیر انھیں کلرک نہ بنا ڈالے لہذا میں سرکارِ عالیہ کو وصیت کرتا ہوں کہ انھیں سیکریٹریٹ کی عمارت کے قریب پھٹکنے نہ دے۔ ورنہ سیکریٹریٹ کی چوتھی منزل سے گر کر مرنے میں بڑی کشش ہے اور تاریخ ان معاملات میں اپنے آپ کو دہرانے میں ید طولیٰ رکھتی ہے۔

میرے پاس ایک مکان ہے جو میرا نہیں ہے بلکہ مالک مکان سیٹھ ڈھوی پرشادجی کا ہے۔ میں وصیت کرتا ہوں کہ یہ مکان مالک مکان کو دیا جائے تاکہ وہ کسی دوسرے لوئر ڈویژن کلرک کو زیادہ کرایہ پر دے سکے۔ کیونکہ یہ اس کی پرانی اچھا ہے۔

اے بھگوان سب کی اِچھا پوری کر!

اے بھگوان! اپنی اِچھا بھی پوری کر!

اے بھگوان! میری اِچھا بھی پوری کر!

۔۔۔ اور مجھے سیکریٹریٹ سے کود جانے کی طاقت عطا فرما!!!!

جوگی
سریتا۔ دہلی

قصہ تھانیدار اور دینو کمہار کا

آبادی سے بھاگ کر جس جنگل میں تھانیدار نے پناہ لی، وہ بہت گھنا تھا۔ اور اس میں واقعی سورج کی شعائیں زمین تک نہیں پہنچتی تھیں۔ لیکن پیشتر اس کے کہ تھانیدار چھپنے کے لئے کوئی موزوں جگہ مل جانے پر اطمینان کا اظہار کر سکے، اس نے کچھ فاصلوں پر درختوں کی اوٹ میں انسانی شکل والے ایک جاندار کو جلدی جلدی بھاگتے اور پھر غائب ہوتے دیکھا۔

نوکری سے برخاست اور کئی ایک مقدموں میں ماخوذ ہونے کے باوجود تھانیدار میں ابھی کچھ تھانیداری باقی تھی۔ اُس نے بچاؤ کی بجائے مدِمقابل پر حملہ کرنے کی ٹھانی۔ لیکن تھانیدار ابھی مدِمقابل کی جنس اور نسل کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا۔ کہ ایک درخت کی اوٹ سے اُسے جھانکتے ہوئے دیکھا۔ وہ اس جیسا ہی ایک آدمی تھا۔ تھانیدار کی تھانیداری ایک لمحے میں ہی بحال ہوگئی۔ اور اس نے کڑکتی ہوئی آواز میں مدِمقابل کو للکارا، اور ہاتھ اوپر اُٹھا کر سامنے آنے کا حکم دیا۔ اُس شخص نے چھپنے کی کوشش کی۔ تو تھانیدار جھاڑیوں کو روندتا اور درختوں سے پہلو بچاتا ہوا، اس کی طرف تیزی سے بڑھا۔ اور مسلسل پکارتا گیا۔

"ہاتھ اوپر رکھو۔ سامنے آؤ۔ اگر حرکت کی تو گولی مار دوں گا"

جب تھانیدار چکر کاٹ کر اُس درخت کے سامنے جا پہنچا۔ اور گردن بڑھا کر دیکھا۔ تو اُسے ایک مسکین صورت شخص نظر آیا۔ تھانیدار نے آگے بڑھ کر اُسے گریبان سے پکڑ کر سیدھا کھڑا کیا۔ اور اس کی انٹی ٹٹولنے لگا۔ تو وہ شخص ہنس پڑا۔

"اگر میرے پاس پیسہ ہوتا تو میں بستی ہی میں رہتا۔ جنگل میں کیوں آتا؟"

"چور، اچکے، بزدل، بدمعاش، مجھے دانت نکال کر دکھاتا ہے۔ میرے آگے بڑے بڑے مجرموں کا پتّا پانی ہو جاتا ہے، تو کس کھیت کی مولی ہے؟" تھانیدار نے اس کے گریبان کی پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

"جناب! میں کسی کھیت کی مولی نہیں ہوں۔ شامل پور گاؤں کا دینو ورکس ستری ہوں۔ آپ کون ہیں؟" اُس شخص نے گریبان، چھڑانے کی کوشش کئے بغیر کہا۔

تھانیدار اس کی مسکین صورت دیکھ کر، اور اسے اپنے علاقے کا پاکر ڈھیلا پڑ گیا۔ اور ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے رعب سے بولا۔

"میں تھانیدار جونک سنگھ ہوں۔ تم اپنا حسب نسب ذرا تفصیل سے بتاؤ۔"

دینو ورکس مستری زمین پر بیٹھ کر بولا۔

"میرا نام دینو ہے! بارہ سال کی عمر تک دینو کمہار کے نام سے پکارا جاتا رہا ہوں۔ بارہ سے بیس برس کی عمر تک صرف دینو۔ اور اس کے بعد آج تک دینو ورکس مستری کے نام سے یاد کیا جاتا ہوں۔ باپ کا اصلی نام تو مجھے معلوم ہی نہیں ویسے سب لوگ اُسے فتو کمہار کہتے تھے۔"

تھانیدار دینو کمہار کے بیان کے بعد بالکل ڈھیلا پڑ گیا۔ اور اُس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

"اس جنگل میں کیا کرنے آئے ہو؟"

"گدھے چرانے!"

"گدھے کہاں ہیں؟"

"اپنے باپ کے مرنے کے بعد بیچ دیئے!"

"جھوٹ بولتے ہو!"

"دراصل مَیں لکڑیاں چننے آیا ہوں!"

"پھر جھوٹ!" تھانیدار کڑکا اور خوف سے اُس کا چہرہ زرد ہو گیا۔

"آپ تھانے دار ہیں!" آپ کے آگے سچ بول کر میں خوامخواہ پھنسنا نہیں چاہتا!"

"تم سی آئی ڈی کے آدمی معلوم ہوتے ہو؟"

"وہ کیا ہوتی ہے؟"

"میں تمھیں جان سے مار دوں گا!" تھانیدار گرجا اور دینو ورکس مستری اُس کے پاؤں کی طرف لپکا۔ تھانیدار گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن دینو گھٹنوں اور ہتھیلیوں کے بل چلتا ہوا اُس کے پاؤں کی طرف بڑھتا ہی رہا۔

"سچ جانیے! میں اسی لئے اس جنگل میں آیا تھا۔ کہ آپ کے ہاتھوں مارا گیا تو مقدمہ بھی نہیں چلے گا۔"

"سچ سچ بتاؤ تم کون ہو؟" تھانیدار نے چیخ کر کہا۔

"میں آپ بیتی سُناتا ہوں بشرطیکہ آپ مجھے جان سے مار ڈالنے کا وعدہ کریں!" دینو نے کہا۔

تھانیدار نے ہاں کہدی تو دینو کمہار بولا۔

"جیسا کہ میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں، میں شاہ پور کا رہنے والا ہوں۔ میرے باپ کا نام فتو کمہار تھا۔ بارہ برس کی عمر تک میں نے اپنے باپ کے گدھے چرائے اور کچے برتنوں کے آوے کو آگ دکھاتا رہا۔ اس کے بعد میرے باپ نے ریلوے ورکس کے ایک مستری کے پاس شاگردی کے لئے مجھے چھوڑ دیا۔ کیوں کہ وہ نہیں چاہتا تھا۔ کہ میں ساری عمر گدھوں کے ساتھ بسر کردوں۔ میرا اُستاد بہت سخت طبیعت لیکن ہنرمند آدمی تھا۔ آٹھ سال تک میں نے اُس کی چلمیں بھریں۔ ساری ساری رات اُس کے پاؤں دبائے۔ اس کی جھڑکیاں اور ڈنڈے کھاتے ہنر سیکھا۔

"میرا اُستاد اپنے کام میں بہت ماہر تھا۔ بڑے بڑے انجینئروں کے کان کترتا تھا۔ ریل کی پٹڑی بچھانی ہو یا پل بنانا ہو، عمارتوں کی تعمیر ہو یا اُن کی مرمت، استاد کا مشورہ ہمیشہ سچا اور اچھا ہوتا تھا۔ اس لئے وہ زندگی میں ترقی نہ کر سکا۔ جہاں دو پیسے کا کام ہوتا۔ وہاں وہ دو ہی پیسے خرچ کرتا۔ زمانہ اچھا تھا۔ اس لئے وہ نوکری پوری کر کے ہی مرا۔

"جب میں ورکس مستری کا کام بخوبی سیکھ گیا۔ تو اُس نے مجھے رخصت کرنے سے پہلے نصیحت کی کہ کام ہی عبادت ہے۔ اور میں اپنا

کام اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں نے اُستاد کی بات گرہ باندھ لی۔ سفارش کرا کے میں ریلوے میں ورکس مستری بھرتی ہو گیا۔ تاکہ اپنا ہنر دکھا سکوں اور اپنے استاد کا نام روشن کر سکوں۔ مجھے ریلوے کی عمارتوں پر سفیدی کرنے کا کام سونپا گیا۔ کام ختم ہونے کے بعد میں نے حساب لگایا اور بل بنا کر بڑے صاحب کے پاس بھیج دیا۔ اگلے ہی دن میری پیشی ہو گئی۔ صاحب مجھے دیکھتے ہی لال پیلا ہو گیا۔ اور کڑک کر بولا۔

"تمہیں کس گدھے نے ریلوے میں ملازم رکھا؟"

"حضور نے ایک دوست کی سفارش پر خود ہی یہ کرم فرمایا تھا" میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

اس کے بعد صاحب نے مجھے گدھا نہیں کہا۔ کیونکہ وہ میرا افسر تھا اور اسے اس بات کا بخوبی احساس تھا۔ ہاں، صاحب کا غصہ کافی بڑھ گیا تھا۔ لیکن وہ اپنے غصے کو روکتے ہوئے بولے۔

"تمہیں اتنا بھی پتہ نہیں۔ کہ سفیدی کا بل بنانے سے پہلے کل رقبے سے دروازوں، کھڑکیوں اور روشن دانوں کا رقبہ گھٹا دیا جاتا ہے"

"حضور کتابوں میں شاید ایسا ہو، لیکن میں نے دیکھا ہے، کہ دروازوں، کھڑکیوں اور روشن دانوں کے آگے بڑھی ہوئی چھتوں کا رقبہ اُن کے رقبے کے برابر ہوتا ہے۔ اس لئے میں نے اُسے گھٹایا نہیں"

صاحب کے پاس میری دلیل کا کوئی خاطر خواہ جواب نہ تھا۔ اس لئے اُس نے مجھے کچھ نہ کہا۔ میرے سامنے ہی فرش پر تھوکا۔ اور مجھے واپس بھیج دیا۔ اگلے دن دفتر آنے پر مجھے ایک چھٹی ملی جس میں نااہلیت کی بنا پر مجھے نوکری سے برخاست کئے جانے کا حکم درج تھا۔ پھر میں ایک سال تک اپنے ہنر کو ہتھیلی پہ رکھ کر دفتروں کے چکر کاٹتا رہا۔ لیکن ہر جگہ ہنر نہیں چھٹی درکار تھی۔ آخر کار اپنے اُستاد کے ایک دوست کی سفارش سے میں ریلوے میں دوبارہ ورکس مستری بھرتی ہو گیا۔ اس بار مجھے پُلوں کی مرمت کا کام سونپا گیا۔

ایک پل کے بارے میں جو کافی خستہ حالت میں تھا۔ اور جس کی مرمت کا کام سارا سال چلتا رہتا تھا۔ میں نے افسرانِ بالا کو تجویز بھیجی کہ اس کی جگہ نیا پل تعمیر کیا جائے۔ صاحب نے مجھے بلایا اور بتایا۔ کہ اس قسم کی تجویزیں بھیجنا میرے دائرہ اختیار سے باہر ہے اور یہ بھی کہا۔ کہ اس پل کو تعمیر ہوئے صرف پانچ سال ہوئے ہیں اور بطور میعاد ابھی دس سال باقی ہیں۔ میں نے کاغذوں کی پڑتال کی۔ تو اُس پل کو بنے واقعی پانچ سال ہوئے تھے۔ میں نے پل پہ لگے پتھر کا معائنہ کیا تو اس پر ٹوٹی ہوئی عبارت میں لکھا تھا۔ کہ پل بیس سال پرانا تھا۔ میں نے معاملہ بڑے صاحب کو پیش کر دیا۔ اور مجھے ایک ہفتے کے اندر اندر نوکری سے جواب مل گیا۔

لیکن دو سال بیکاری اور بیماری میں کاٹ کر میں ایک بار پھر ریلوے میں ورکس مستری بن گیا۔ اس بار مجھے پٹری ٹھیک ٹھاک رکھنے کا کام دیا گیا۔ میرے حصے کی پٹری پر آٹھ گینگ منظور تھے ہر گینگ کی نفری بیس تھی۔ چار گینگ عملی تھے۔ اور چار کاغذی۔ کاغذی گینگوں کے فرضی مزدور صرف پہلی تاریخ کو تنخواہ لینے آتے تھے۔ اس کام کے عوض میں انھیں دس روپے ملتے تھے۔ اور باقی رقم ورکس مستری اپنے پاس رکھ لیتا تھا۔

جب پہلی تاریخ آئی تو میں نے سب گینگوں میں تنخواہ بانٹ دی۔ کاغذی گینگوں کے مزدور میرے پاس آئے۔ لیکن میں نے انھیں واپس بھیج دیا۔ اگلے دن اورسیئر نے مجھ سے دو ہزار آٹھ سو روپے کا مطالبہ کیا تو میں حیران رہ گیا۔ کیوں کہ میں نے اپنی زندگی میں اتنی بڑی رقم کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اگلے ہی دن مجھے جواب مل گیا۔ اور میرے خلاف سرکاری روپیہ غبن کرنے کے الزام کی تحقیقات ہونے لگی۔ میں ڈر کے مارے بھاگ آیا۔ کیونکہ سچے کو سو ڈر ہوتا ہے۔ اب میں اس جنگل میں آ گیا ہوں تاکہ خدا کی دی ہوئی نعمت، جسے ہم زندگی کہتے ہیں۔ اُسے

لوٹا دوں ۔" یہ کہہ کر دینو در کس مستری چپ ہو گیا۔ اور تھانیدار ہنسنے لگا۔

اب تھانیدار جوگنگ سنگھ نے اپنی رام کہانی شروع کی ؛

" میرا باپ کھیتی باڑی کا کام کرتا تھا۔ نیک آدمی تھا۔ ساری عمر چار کھیت زمین کا پیٹ کھودتا رہا۔ اور پرماتما کا نام لیتا رہا۔ اُس نے بہت کوشش کی۔ کہ میں آٹھ دس جماعتیں پڑھ ڈالوں، لیکن مجھے پڑھائی کے بجائے لوگوں کے کھیت اجاڑنے میں زیادہ مزہ آتا تھا۔ میرا باپ مجھ سے بہت تنگ آ گیا۔ اور اُس نے اٹھارہ سال کی عمر میں مجھے پولیس میں بھرتی کرا دیا۔

ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد مجھے پولیس لائنز میں ڈپٹی صاحب کا اردلی بنا دیا گیا۔ یہاں میرا کام ڈپٹی صاحب کا بوٹ وغیرہ پالش کرنا، بازار سے سودا سلف لانا، ڈپٹی صاحب سے جھڑکیاں کھانا اور بچوں کو ہوا خوری کرانا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں مَیں اُن کے گھر کا بھید پا گیا۔ اور جب ڈپٹی صاحب اور اُن کے کارندوں کے حساب میں بھی داخل ہو گیا۔ تو انہوں نے میرا تبادلہ ایک تھانے میں کرا دیا۔ اس تھانے کا انچارج کوئی بہت پرانا گھاگ تھا۔ افسران بالا اس پر مہربان تھے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ انھیں خوش رکھتا تھا۔ بالائی باقاعدہ بھجواتا تھا۔ بلکہ اکثر وصول ہونے سے پہلے ہی بھجوا دیتا تھا۔ اس تھانے میں رواج تھا کہ کسی سپاہی کو بالائی والا کام سونپنے سے پہلے ہی اس سے بالائی وصول کر لی جاتی تھی۔ تاکہ وہ وہاں جا کر زیادہ سے زیادہ رشوت لے سکے۔

اسی تھانے میں مجھے گارد اور گشت کی ڈیوٹی کے علاوہ جو کام سونپا گیا وہ یہ تھا کہ قریبی گاؤں میں جا کر ایک شخص کو اطلاع دے آؤں۔ کہ اس کا لڑکا جو جیل میں عمر قید کاٹ رہا تھا فوت ہو گیا۔ منشی کے پاس روزنامچے میں اپنی روانگی درج کرا کے میں جانے ہی والا تھا کہ تھانیدار صاحب کا بلاوا آ گیا۔ میں پیش ہوا تو مجھے بالائی پیشگی جمع کرانے کا حکم ہوا۔ یہ حکم سن کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میں نے فریاد کی۔ کہ میں وہاں موت کی خبر سنا رہا ہوں۔ شادی کا پیغام لے کر نہیں جا رہا جو وہ لوگ مجھے نذرانہ دیں گے۔ تھانیدار نے مجھے اناڑی سمجھ کر خود جانے کا فیصلہ کیا۔ اور تربیت کی خاطر مجھے بھی ساتھ لے لیا۔

" گاؤں پہنچ کر انھوں نے نمبردار کے گھر پہ کچہری لگائی اور متوفی قیدی کے باپ کو طلب کیا۔ ایک بڈھا قریب المرگ شخص لاٹھی ٹیکتا ہوا اس کے قدموں میں آ بیٹھا۔ تھانیدار نے بھرائی ہوئی آواز میں اُس کے بیٹے کی موت کی خبر سنائی۔ تو وہاں رونا دھونا شروع ہو گیا۔ جب رونا دھونا کم ہوا۔ تو تھانے دار بولا۔ کہ موت کی خبر کے بعد اُسے ایک اس سے بھی بری خبر سنانی ہے۔ وہ یہ کہ متوفی کو اٹھارہ سال کی قید ہوئی تھی اور اس نے ابھی گیارہ سال ہی پورے کئے تھے۔ کہ اُسے موت نے آ دبایا۔ اب مجھے اُس کے کسی رشتہ دار کو باقی سات سال کے لئے قید خانے میں بند رکھنا پڑے گا۔ تاکہ سرکار کے حساب میں گڑبڑ نہ ہو۔ متوفی کا باپ اور اس کے رشتے دار گڑگڑائے، تھانیدار کے پاؤں پکڑے متوفی کے یتیم بچوں اور بیوہ کا واسطہ دیا۔ مگر تھانیدار کسی صورت بھی سرکار کے حساب میں خیانت کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔

بہ آخر کار بڑی منت، سماجت کے بعد تھانے دار اس بات پہ رضامند ہوا۔ کہ وہ اس کی جگہ کسی اور شخص کو باقی ماندہ عرصے کے لئے جیل میں رکھے گا۔ اور متوفی کے وارث اُس شخص کے بیوی بچوں کا خرچہ دیتے رہیں گے۔ تھانیدار ایک ڈیڑھ گھنٹے میں متوفی قیدی کے وارثوں کی ساری پونجی سمیٹ کر چل دیا۔

" گاؤں کے باہر نکلتے ہی اُس نے ایک حاملہ عورت کو سر پہ پانی کا گھڑا اُٹھائے ہوئے جاتے دیکھا۔ تھانیدار نے حاملہ کے خاوند کو طلب کیا۔ اور بیوی کے ساتھ سنگدلانہ برتاؤ کرنے کے الزام میں اس کی گرفتاری کا حکم دیا۔ جب لوگوں نے بہت منت سماجت کی۔ تو جرمانے کی وصولی پہ بات طے ہو گئی۔ آگے بڑھتے ہی تھانیدار پھر رک گیا اور کہنے لگا۔ کہ ابھی ایک مجرم روپوش ہے اور وہ گاؤں کا کمہار ہے

اُسے بھی فوراً گرفتار کیا جائے۔ گرفتاری کے بعد کمہار کو تھانیدار کے سامنے پیش کیا گیا۔ تھانیدار نے اُس کا قصور بتاتے ہوئے کہا کہ حاملہ عورتوں کے لئے بڑے بڑے گھوڑے بنانے کے جرم میں تم پر جرمانہ کیا جاتا ہے۔ عدم ادائیگی کی صورت میں تمہارے تمام گھوڑے توڑ دیئے جائیں گے۔ وہاں بھی جیسے تیسے جرمانہ وصول ہو گیا۔ اور دن ڈھلنے سے پہلے ہی ہم تھانے میں واپس پہنچ گئے۔ میں نے راستے میں ہی سارا سبق پکا کر لیا اور ایک سال کے اندر اندر تھانیدار کا منظور نظر بن گیا۔"

تھانیدار یہاں تک بیان کر کے رک گیا۔ اور دیو دکس ستری کی طرف دیکھنے لگا۔

"تھانیدار صاحب! یہ تو آپ نے اپنے اُستاد کے فن کا حال بیان کیا ہے۔ آپ اپنے کمالات کے بارے میں تو بتائیے!" یہ کہہ کر دیو تھانیدار کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔"

تھانے دار پھر بولا۔

"میں بہت جلدی ترقی کی منزلیں طے کرنے لگا۔ سپاہی سے حوالدار، حوالدار سے چھوٹا تھانے دار اور چھوٹے تھانیدار سے بڑا، تھانیدار بننے میں مجھے اتنا ہی وقت لگا۔ جتنا کہ عام لوگوں کو سپاہی سے سپاہی ہی رہنے میں لگتا ہے۔ یوں تو میرے کمال اور فن کے کئی قصے ہیں لیکن میں صرف ایک ہی سناؤں گا۔ میں نے اپنے فن کا کمال اپنے استاد کے خاندان کو بھی دکھایا۔ کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ میرے اُستاد آخری عمر میں جیل بھیجا، رشوت اور قتل کے مقدمات میں ماخوذ ہو کر نوکری سے برخاست ہو گئے۔ بالترتیب تین پانچ اور آٹھ سال کی سزائیں پائیں۔ سب سزائیں بیک وقت شروع ہوئیں۔ لیکن خدا کے حکم سے میرے استاد صرف ایک سال سزا کاٹنے کے بعد وفات پا گئے۔ اُن کا گاؤں میرے تھانے ہی میں تھا۔ اور اُن کے وارثوں کو اس جانکاہ حادثے کی خبر دینے کے لئے میں خود گیا۔ افسوس کے اظہار کے بعد میں نے انھیں بتایا۔ کہ استاد مرحوم کی تینوں سزائیں ایک ساتھ شروع ہوئی تھیں۔ لیکن ان میں سے ایک بھی پوری نہیں ہو پائی تھی۔ کہ موت نے انھیں اُٹھا لیا۔ اب مجھے ان کے خاندان کے تین افراد کو جیل میں بند رکھنا ہوگا۔ تاکہ سرکار کا حساب ٹھیک رہے۔ پہلی سزا کے عوض میں تھانے دار صاحب کی کمائی میری جیب میں آ گئی۔ دوسری سزا کے عوض میں ان کی جواں سال بیوہ اور چھوٹا لڑکا افسران بالا کے پاس بالائی صورت میں پہنچا دیئے گئے۔ اور تیسری سزا کا حساب پورا کرنے کے لئے تھانے دار صاحب کی پہلی شادی سے جوان لڑکی کو میں نے اپنے پاس رکھ لیا۔

"جواں سال بیوہ نے افسرانِ بالا کی خوب سیوا کی اور اس کا لڑکا بڑا ہو کر تھانیدار بن گیا۔ اور میں رشوت اور کچھ دوسرے سنگین الزامات کی پاداش میں معطل اور بعد میں برخاست کر دیا گیا۔ اب وہ لڑکا ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑا ہوا ہے اور میں اپنا گھر بار لٹا کر صرف اپنی جان بچانے کے لئے مارا مارا پھر رہا ہوں!"

دیو دکس ستری نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور درخت کے تنے کا سہارا لے کر دراز ہو گیا۔ جنگل میں خوفناک آوازیں اٹھنے لگیں تھانے دار ڈر کے مارے درخت پر چڑھ گیا۔ تھوڑی دیر میں ہی دیو دکس ستری کے خراٹوں کی آواز آنے لگی۔ لیکن تھانے دار درخت پر بیٹھا محسوس کر رہا تھا۔ کہ وہ سولی پر لٹکا ہوا ہے ••

جوش ملیح آبادی فنون۔ لاہور

جوانی و پیری!

جوانی

یہ پیر جہاں باختہ، اے خیلِ جواناں
کیا تجھ سے کہیں قصۂ لمحاتِ خروشاں
اللہ ری گرجتی ہوئی گھنگھور جوانی،
رقاصہ و قتالہ و جوالہ و جولاں
سرمست و سمن چہرہ و مہ جلوہ و مے رنگ
جنبان و خروشان و فروزان و درخشاں
رشکِ چمن، آشوبِ وطن، فتنۂ سوسن
آہوئے ختن، دُرِّ عدن، لعلِ بدخشاں
پرکار و دغا پیشہ و عیار و فسوں کار
نوجلوہ و ناسوختہ و نورس و ناداں
تسکینِ زلیخا و تپِ سینۂ یعقوب
عشرت کدۂ مصر و سیہ خانۂ کنعاں!
دیوانہ و فرزانہ و پروانہ و قندیل
مے خانۂ رقصان و صنم خانۂ جولاں
طوفاں بہ نمِ چہرہ و گرداب بہ گیسو
نے بر لب و مے در سر و ہنگامہ بہ داماں
خود رفتہ و خود بین و خود افروز و خود آزار
ژولیدہ گماں، زود غضب، دیر پشیماں
سرگوشیِ حوّا و خود آگاہیِ آدم
فرماں شکن و باغی و پیغمبرِ عصیاں!
گہوارہ سخن، قوس جبیں، زمزمہ رفتار
کج فیصلہ و راست قد و آئینہ پیماں
گیتی کو مروڑے ہوئے گردوں کو لپیٹے
غلطیدہ و آوارہ و گردان و گریزاں
مکھڑے پہ گہر تابیِ صبحِ سرِ کہسار،
سینے میں خروشندگیِ موجۂ باراں
اک جست خطرناک بہر جنبشِ ابرو،
اک حملۂ پُرہول بہر لرزشِ مژگاں
جوّالہ ترنگوں کے تھپیڑوں سے دمادم
ہر سانس میں اپنی ہی پہ غلطیدہ و پیچاں

اک گام پہ آسودہ تو اک گام پہ بیتاب — اک بات میں افسردہ تو اک بل میں شاداں
ناموں کے جوابا کبھی پرزے تو کسی روز — تحریرِ حسیناں مع تصویرِ حسیناں
پُروا کی بہاروں میں کبھی نغمۂ کوکو — برکھا کی پھواروں میں کبھی خندۂ یاراں
بجتی ہوئی گھڑیوں میں کبھی اشکِ گہربار — بھیگے ہوئے قطروں میں کبھی قطرۂ نیساں
شعلوں کے تلاطم میں کبھی سلکِ جواہر — بوندوں کے ترنم میں کبھی رشتۂ سوزاں
بربط میں کبھی آہ، کبھی آہ میں بربط — درماں میں کبھی درد، کبھی درد میں درماں
آنکھوں میں کبھی صولتِ شاہانِ جہاں کوب — چہرے پہ کبھی مسکنتِ خاک نشیناں
باتوں میں کبھی معجزۂ عیسیٔ مریم — تیوری میں کبھی دبدبۂ موسیٔ عمراں
کانوں میں کبھی زمزمۂ مختصرِ وصل — گردن پہ کبھی خنجرِ طولِ شبِ ہجراں
پہلو میں کبھی ارض و سما بستۂ شیون — زانو پہ کبھی ثابت و سیار غزل خواں
محرابِ تبسم میں کبھی مومن کا مصلیٰ — گردابِ تصادم میں کبھی منکرِ یزداں
خوش ہو تو مسلمان جو ناخوش ہو تو کافر — اور موج میں آئے تو نہ کافر نہ مسلماں
چھنتی ہوئی گھونگھٹ سے رخِ تازہ کی سرخی — گویا شفقِ صبحِ شبِ آلودۂ باراں
وحشت کرۂ کوہ و بیاباں کی ہوا میں — کانٹوں پہ جو دامن، تو گلوں میں گریباں
بڑھتی ہوئی اک الجھن، گھٹتی ہوئی اک آن — کچھ سن کے پریشان تو کچھ کہہ کے پشیماں
ٹوٹے ہوئے بالوں میں شکایاتِ کشاکش — اُلجھے ہوئے بالوں میں حکایاتِ شبستاں
ہر آن کو عطرِ ابدیت میں بسالو — ایک ایک دقیقے میں لپیٹے ہوئے صدیاں
ڈھونڈو تو بہت پاس، مناؤ تو بہت دور — منڈلاؤ تو بشاش، قریب آؤ تو نالاں
باہوں کے چمن میں کبھی نکہتِ تجدیدِ وعدے — بستر کی شکن پر کبھی ٹوٹے ہوئے پیماں

کس طرح کہیں جوشِ جواں کار کے ہاتھوں
رہتے ہیں کن آفات میں شبیر حسن خاں

(۲)

پیری

اور اب کہ میسر ہے بہ فیضانِ مہ و سال — آسودگیٔ خاطرِ صبحِ شبِ طوفاں
بیٹھا ہوں سرِ مسندِ اندیشہ و ادراک — زانو سے دبائے ہوئے آفاق کا داماں

پلکوں میں پروئے ہوئے افکارِ اکابر — سینے میں لگائے ہوئے آیاتِ حکیماں
زانو پہ بٹھائے تبِ خوردانِ شرربار — کاندھے پہ اٹھائے کرۂ برفِ بزرگاں
ادراک میں پھینکے ہوئے کیفِ دمِ آفاق — مژگاں پہ اٹھائے ہوئے پیچ و خمِ دوراں
کھولے ہوئے ہر پردۂ طنبورۂ الحاد — توڑے ہوئے ہر زمزمۂ بربطِ ایماں
گل فرش پہ کل رقص میں تھی عشرتِ نے کار — پہلو میں ہے اب حیرتِ انگشت بدنداں
یوں سر کی سفیدی سے کرن پھوٹ رہی ہے — قندیل ہے گویا شبِ یلدا میں فروزاں
اترا ہے مرے جہلِ گریزاں کے دھوئیں میں — فانوس بہ کف، قافلۂ علم فراواں
ہلتی ہوئی چٹکی سے نقابوں کو اٹھائے — محرابِ تأمل میں ہیں اسرار غزل خواں
احساس کے ساحل پہ جو کل گونج رہا تھا — خاموش ہے جذبات کا وہ بحرِ خروشاں
گو دھوم سے رخشندہ ہوئی لیلیٔ آفاق — اب یاد بتا زہرہ جبینوں کے ثناخواں
ٹکر کی تمنا ہے تو خم ٹھونک کے آ جا — یہ رن ہے، یہ جنگاہ، یہ جنگل ہے، یہ میداں
رخشندہ خیالات کے چھٹکے وہ ستارے — ہمت ہو تو اب سامنے آ میرِ چراغاں
کیوں خوب گھمایا تھا مجھے کوئے بتاں میں — جرأت ہو تو اب آنکھ ملا گردشِ دوراں
کل کھینچ کے مارے تھے مرے دل پہ کھلونے — اب روک مرے وار کو اے قاسمِ خوباں
کل تمکنتِ عقل پہ ہنستی تھی جوانی — پیری ہے اب آوارگیٔ عشق پہ خنداں
کل سیج پہ حوروں کو سلانے کی ہوس تھی — اب خاک پہ انساں کو جگانے کا ہے ارماں
کل خال و خد و چشم پہ تھی چشمِ طربکار — اب ثابت و سیار پہ ہے دیدۂ حیراں
کل رشتۂ مقیش پہ غلطیدہ تھیں نظریں — اب جوہرِ شمشیر پہ اندیشہ ہے جولاں
کل شور تھا دستِ من و دامانِ جوانی — اب غلغلہ ہے دوشِ من و گیسوئے دوراں
کل عشق بہاتا تھا مہ و سال کی دولت — اب عقل ہے اک ایک دقیقے کی نگہباں
اب زینتِ آغوش ہے پہنائیٔ دارین — کل زیرِ تصرف تھا فقط شہرِ نگاراں
کل فرق پہ چترِ شبِ مہ گھوم رہا تھا — اب ذہن میں گہوارۂ آفاق ہے گرداں
اب مصحفِ خوباں کے عوض بہرِ تأمل — زانو میں جو انجیل تو ہے رحل پہ قرآں
کل ناظرِ نعلین تھا، اب ناقدِ قوسین — کل خستۂ آناں تھا اور اب بستۂ ایناں
کل دورِ طرب پر تھیں کہانت کی گھٹائیں — اب موسمِ بعثت پہ نبوت ہے پرافشاں
وہ دل جو پئے نقدِ بتاں گرمِ سفر تھا — اب جادۂ تحقیقِ خدا پر ہے خراماں

کل دوش پہ تھیں گیسوئے شب رنگ کی لہریں — اب علت و معلول کی زنجیر ہے جنباں
اصنام تھے کل خیمۂ عشرت میں ادا کار — افکار ہیں اب مسندِ قرطاس پہ رقصاں
کل ساغرِ درم پر صفِ ترکاں تھی مغنی — اب نوکِ قلم پر مہ و اختر ہیں غزل خواں
کل منزلِ تفتیش میں تھی نسلِ گل و مل — اب معرضِ تحقیق میں ہے خونِ رگِ جاں
اسرار ہیں ڈھلکے ہوئے سینے سے ضیا بار — انوار ہیں مسکے ہوئے بادل سے نمایاں
تاباں افقِ دل پہ ہے خورشید کی مانند — ہر آن ابھرتی ہوئی پیشانیٔ دوراں
پازیب زمیں کی ہے دلِ زندہ میں جھنکار — جھنکار میں ہے زمزمۂ ذرہ و کیواں
ذرے کے دلِ پختہ کی ٹھوکر پہ ہے صحرا، — قطرے کی سن رشد کی مٹھی میں ہے طوفاں
اب دانشِ بالیدہ کے سائے میں ہے طوبیٰ، — اب جودتِ بالغ کے نشانے پہ ہے ایماں
سرکار درایت میں روایت کی ہے پسپائی، — تنقیہ کے پنجے میں ہے تقویم نیاگاں
کاندھوں پہ عدالت میں صحائف کو اٹھائے — حاضر ہیں وکالت کو فقیہان دبستاں
اب عقل ہے معمورہ تحقیق میں گلپوش — اب عشق ہے منطق کدۂ جرح میں عریاں
اب "ممکن" و "واجب" کے مباحث ہیں عناں گیر — اب "علتِ اولیٰ" کے مسائل ہیں پرافشاں
اب پیشِ نظر ہیں عمل ذہن کی مسلیں — وجدان ہے برہان کے اجلاس میں حیراں
اس نہج سے "منقول" کو "معقول" بنائیں — اقطاب ہیں ششدر، متکلم ہیں پریشاں

اوراد و عبادت میں شرمندہ و مبہوت
اوہام و اساطیر میں لرزاں و ہراساں

جوش ملیح آبادی — افکار - کراچی

دو رباعیاں

جب تک کہ نہ ہو عدل پہ قائم دستور
دوزخ مجھے منظور، نہ جنت منظور
انصاف کی دشمن ہیں یہ دونوں شکلیں
معصوم سزا پائے کہ بھڑے مغفور!!

موتی کو شقی چھوئیں تو آنسو بن جائیں
شیروں کی طرح غزال لاگو بن جائیں
ان اہلِ شقاوت کے لہو میں ہے وہ زہر
جونکیں ان کے لگیں تو بچھو، بن جائیں

اختر الایمان

ایک لڑکی کے نام

ہمارے بچے، تمہارے بچے
جو کل کی دنیا سے بے خبر ہیں
جو کل کی دنیا کے بال و پر ہیں
ہماری دنیا سے اُن کی دنیا
حسین تر سے حسین ہوگی
بہشت کیا جو زمین ہوگی
ہماری آنکھوں سے جو نہاں ہے
وہ ان پہ سب آشکار ہوگا
وہ ان کی رہ کا غبار ہوگا
ہمارے بچے، تمہارے بچے،
نہ اجنبی ہوں گے ہم تھے جیسے
نہ پتھروں کے صنم تھے جیسے
یہ کل کی دنیا کے جسم و جاں ہیں!

سیپ — کراچی

تسکین

اِک محقق نے انسان کو بوزنہ جب کہا
میں وہیں سجدۂ شکر میں گر گیا!
اپنی کوتاہیوں، خامیوں کے لیے،
آفرینش سے ابتک جو شرمندہ تھا
آج وہ بوجھ بارے ذرا کم ہوا!!

ساقی فاروقی سیپ۔ کراچی

کینسر

ویرونیکا روتی کیوں ہو
بات کرو دل ڈوب رہا ہے
اپنی پاگل آنکھیں کھولو
میرے ہونٹوں کے سائے میں
نیلی شمعیں جلنے دو
میری روح پہ اپنی روح کا
میٹھا جادو چلنے دو

آج خدا سے وعدہ کرتا ہوں
جس کے بسوں کا مہلک ڈیزل
جس کی ملوں کا اندھا کاجل
ویرونیکا کی سانسوں سے گزر رہا ہے
ویرونیکا کے سینے میں اتر رہا ہے
جس کے ہاتھوں کی جنبش میں
ہنگاموں کی دھوپ چھاؤں ہے
اُسے اکیلا کر دوں گا !!

منظر ایوبی افکار۔ کراچی

فاصلہ

تیرے میرے بیچ کھڑی اک پتھر کی دیوار
اس دیوار کو کب توڑے گا یہ پاگل سنسار
تو وہ باغ کھلے ہیں جس میں مستقبل کے پھول
میں وہ دشت کہ جس کے چہرے پر ماضی کی دھول
تو ایسی وادی جس پر ہر بادل مینہہ برسائے
میں وہ شعلہ زار کہ جس سے دریا بھی کترائے
تو ایسی شہنائی کہ جس کے لب پر مچلے راگ
میں وہ ساز بھری ہے جس کے ہر پردے میں آگ
میں دھرتی کا سینہ چیر کے بھی ہوں تشنہ کام
تو اِک تاج کا ہیرا بن کے چمکے صبح و شام
دنیا کے بازار میں کھوٹے کھرے کی کیا پہچان
رہنے دے تو میرے خوابوں کی نگری ویران
پہلے ہی سے تیرے میرے بیچ کھڑی دیوار !
اس دیوار کو کب توڑے گا یہ پاگل سنسار

جوشؔ ملسیانی

جیسویں صدی۔ دہلی

کیوں تغزل کا نگہباں نہ رہے فن میرا
یہی پونجی ہے مری اور یہی دھن میرا

باغ میں کوئی ٹھکانہ نہیں ملتا نہ سہی
بجلیاں خود ہی بنا دیں گی نشیمن میرا

دوستوں کی بھی کہیں قدر نہ گھٹ کر رہ جائے
دشمنی ترک کئے جاتا ہے دشمن میرا

دے دیئے گریۂ خونیں نے مجھے پھول ہی پھول
تم تو کانٹوں ہی سے بھرتے رہے دامن میرا

چشم ظاہر میں تو اک خاک نشیں ہوں لیکن
عرشِ اعظم سے بھی اونچا ہے نشیمن میرا

کوئی نعمت جو ملی بھی تو سنبھالی نہ گئی
اس قدر چاک ہوا عشق میں دامن میرا

سر پٹکتی ہی رہیں خاک اڑاتی ہی پھریں
آندھیوں کو نہ ملے گا کبھی گلشن میرا

گرم آہوں کو تو روکوں گا مگر خوف یہ ہے
گرم اشکوں سے نہ جل جائے نشیمن میرا

باغ ہو، دشت ہو، یا راہ گذر ہو، کوئی،
جس جگہ بیٹھ گیا، ہے وہی مسکن میرا

توبہ کرنے پہ بھی آیا ہے ریا کا الزام
تر ہوا، اشکِ ندامت سے بھی دامن میرا

ترکِ الفت پہ بھروسا تھا بہت مجھ کو جوشؔ
بدنصیبی ہے کہ اب وہ بھی ہے دشمن میرا

غلام ربانی تاباں — سیپ کراچی

سوادِ غم میں کہیں گوشۂ اماں نہ ملا
ہم ایسے کھوئے کہ پھر تیرا آستاں نہ ملا

یہ اتفاقِ زمانہ ہے اس کا رونا کیا
ملا ملا کوئی دل کا مزاج داں نہ ملا

غموں کی بزم کہ تنہائیوں کی محفل تھی
ہمیں وہ دشمنِ تمکیں کہاں کہاں نہ ملا

عجیب دورِ ستم ہے کہ دل کو مدت سے
نویدِ غم نہ ملی، مژدۂ زیاں نہ ملا

یہ نارسائیٔ قسمت کہ ناتمامیٔ شوق
بھری بہار میں بجلی کو آشیاں نہ ملا

اِدھر وفا کو گلا ہے کہ دل لہو نہ ہوا
اُدھر ستم کو شکایت کہ قدرداں نہ ملا

کسے ہے یاد کہ سعی و طلب کی راہوں میں
کہاں ملا ہمیں تیرا نشاں کہاں نہ ملا

لبوں کو نطق کا اعجاز تو ملا تاباںؔ
مگر سکوت کا پیرایۂ بیاں نہ ملا

شکیل بدایونی — شمع۔ نئی دہلی

ہر قدم زحمتیں، ہر نفس الجھنیں، زندگی وقف ہے دردِ سر کے لئے
پہلے اپنے ہی درماں کا غم تھا ہمیں اب دوا چاہئے چارہ گر کے لئے

آج اِک اجنبی سے نگاہیں ملیں، صرف اِک لمحۂ مختصر کے لئے
زندگی اس طرح مطمئن ہو گئی، جیسے کچھ پا لیا عمر بھر کے لئے

زندگی تپ رہی ہے کڑی دھوپ میں کوئی سایہ نہیں آج سر کے لئے
پھر بھی شکوہ سرایانِ شامِ الم مضطرب ہیں طلوعِ سحر کے لئے

سب تری جستجو میں ہیں کھوئے ہوئے، کوئی ممنون ہے کوئی محروم ہے
آخرش اس نتیجے پہ پہنچے ہیں ہم تیرا جلوہ نہیں ہر نظر کے لئے

میں نے بخشی ہے تاریکیوں کو ضیا اور خود اک تجلی کا محتاج ہوں
روشنی دینے والے کو بھی کم سے کم اک دیا چاہئے اپنے گھر کے لئے

رائگاں کیجئے آپ سجدے مرے میرا کیا ہے میں اُٹھ کر چلا جاؤں گا
کل کہیں آپ ہی کو نہ کہنا پڑے اِک جبیں چاہئے سنگِ در کے لئے

اے شکیلؔ اُن کی محفل میں بھی کیا ملا، اور کچھ بڑھ گئیں دل کی محرومیاں
سب کی جانب رہی وہ نگاہِ کرم، ہم ترستے رہے اِک نظر کے لئے

سلطان زبیری سفینہ۔ کراچی عرش صدیقی کامران۔ سرگودھا

محیطِ جاں رہے گا ابرِ خود ناآگہی کب تک
نہ ہوگی دل پہ مہرِ حق کی جلوہ گستری کب تک
نہ اُٹھنا تھا نہ اُٹھا جلوۂ مستور سے پردہ
جھکی رہتی ترے در پر جبینِ بندگی کب تک
کبھی تو رُو در رو بھی آپ سرگرمِ تکلم ہوں
حریمِ جاں میں گونجے گا پیامِ سرمدی کب تک
بکھرتا جا رہا ہے شاہدِ معنیٰ کا شیرازہ
رہے گی محوِ آرائش عروسِ زندگی کب تک
بہاروں کا تبسم ہے رہینِ گریۂ شبنم
گلوں کی تازگی کب تک چمن کی دلکشی کب تک
گلوں کی نکہتوں نے کر دیا دامن کو آلودہ،
بچی رہتی نسیمِ صبح کی دوشیزگی کب تک
ہمیں مانوس ہونا ہی پڑا شامِ غریباں سے
نظر میں گھومتی صبحِ وطن کی روشنی کب تک
سوا نیزے پہ سورج آگیا سائے نہیں جاتے
رہے گی تیرگی آخر حریفِ روشنی کب تک
بہاروں پر خزاں اک روز افسوں پھونک دیتی ہے
لبوں کی نغمگی کب تک جبیں کی چاندنی کب تک
کوئی دیوار بھی سلطاں بیاباں میں نہیں ملتی
وبالِ جاں رہے گی دل کی شوریدہ سری کب تک

ہم اس لئے بن مے پیئے، بیٹھے ہیں ادب سے
مستی میں کوئی بات نکل جائے نہ لب سے
مانا کہ وہ آئیں گے ستاروں کے جلو میں
یہ دن — یہ شبِ دشت تو گذرے کسی ڈھب سے
اک بار تو مل جائے وہ گذرا ہوا لمحہ،
ہے منتظرِ دوش نہ جانے کوئی کب سے
آنکھیں نہ اُٹھائیں سوئے مہتاب نہ دیکھا
دیکھا ہے تصور نے ترا راستہ جب سے
یہ صبر، یہ ناموسِ طلب، دادطلب ہے
اک وعدۂ فردا پہ جئے جاتے ہیں کب سے
کیا کیا نہ بہاروں نے یہاں جشن منائے
طوفانِ الم دب نہ سکا شورِ طرب سے
خواہش تو ہے چھٹ جائے یہ تاریکیٔ تقدیر،
ہے مہر بہت دور مگر منزلِ شب سے
بنتے ہیں وہی عرش سراغِ رہِ منزل
جوں شعلہ فروزاں ہیں جو کچھ لوگ عجب سے

ڈاکٹر اسیدہ جعفر
جامعہ۔ دہلی

جگر مراد آبادی

جگر مجسّم غزل تھے۔ تغزل جیسے جان کے عوض ہر رگ و پے میں جاری ہو۔ غزل نے جگر کو بہت کچھ دیا۔ اور جگر نے غزل کو بہت نوازا۔ جگر کا ایک کارنامہ یہ بھی تھا۔ کہ انھوں نے اس صنف کی اس وقت لاج رکھ لی۔ اور اس کی کھوئی ہوئی ساکھ قائم کرنے کی کوشش کی، جب اس پر طرح طرح کے الزام لگائے جارہے تھے۔ جگر حسن و عشق کا نغمہ گانے والے شاعر ہیں وہ بنیادی طور پر رومانی شاعر تھے۔ ان کے نزدیک زندگی کا سب سے خوبصورت محرک، سب سے عظیم حقیقت جمال ہے۔ جگر کے یہاں حسن اور رومانیت محض پرچھائیاں اور دھندلکے نہیں، زندگی کی حقیقت بن کر سامنے آتے ہیں۔ ان کے ذکر سے زندگی اور کائنات کی وسعتیں سکڑتی نہیں، حیات کی بصیرت مٹتی نہیں، زندگی گذارنے کا حوصلہ کم نہیں ہوتا۔ ان سے زندگی زیادہ پرکیف، زیادہ حقیقی، زیادہ وقیع اور سرشار دکھائی دیتی ہے۔

"شعلۂ طور" کی اکثر غزلیں ہلکی پھلکی اور رسیلی ہیں۔ یہ گلابی حسن اور شرابی عشق کی رنگین داستانوں کا زمانہ تھا۔ ان غزلوں میں چاندنی راتوں کی تابناکی، ساغرِ مئے کی سرشاری اور شاخِ گل کا حسن سمٹ آیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جگر کا تصورِ جمال جامِ صہبا میں ڈوب کر، زیادہ روشن، زیادہ ہوش ربا، اور رنگین بن گیا تھا۔ جگر کی بعض ابتدائی غزلوں میں بڑی شادابی، سرمستی، وجد آگیں کیفیت، ترنم ریزی اور شگفتگی ملتی ہے۔ داغ اور ریاض کی شاعری بھی اکثر جگہ اس خالص رومانی، بے لوث اور بے داغ رنگینی سے خالی نظر آتی ہے۔ حسن و عشق کے تجربات برسوں سے غزل کے متعلقات رہے ہیں۔ لیکن ان تجربات میں تنوع پیدا کرنے، ان کو ایک سچائی کے روپ میں پیش کرنے، انھیں زندگی کی ناگزیر حقیقت بنا دینے، ان میں لطافت اور مٹھاس کا اضافہ کرنے اور ان میں کھو جانے کا جو انداز جگر کے یہاں ہے۔ اُس کی مثال اُردو شاعری میں مشکل سے ملتی ہے۔ غزل کے جمالیاتی تقاضوں کا ایسا ادراک، یہ نفگی اور مذاقِ جمال کی یہ لطافت بھی کم نظر آتی ہے ؎

وہ چمن میں جس روش سے ہو کے گذرے بے نقاب — دفعتاً ہر ایک گل کا رنگ گہرا ہو گیا
سفّاک چتونیں بھی ہیں قاتل نظر بھی ہے — کیا چیز ہو گئے ہو تمہیں کچھ خبر بھی ہے
کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھیں اے واعظ — میں اپنا جام اُٹھاتا ہوں تو کتاب اٹھا

یہ ترا جمالِ کامل، یہ شباب کا زمانہ　　دلِ دشمناں سلامت، دلِ دوستاں نشانہ
ایک تجلی، ایک تبسم، ایک نگاہ بندہ نواز　　اس سے زیادہ ملے غمِ جاناں دل کی قیمت کیا کہئے

جگر نے غزل کی مخصوص رومانی فضا، تاثراتی انداز، احساس کی لطافت اور عہد شباب کے لطیف ہیجان کی بڑی اچھی مصوری کی ہے۔ جگر کے عشق میں تندرست اور صحت مند جنسی کشش کا دبا دبا میلان بھی پوشیدہ ہوتا ہے۔ لیکن وہ معاملہ بندی، ادابندی یا غیر متوازن خارجیت کے تند دھارے میں بہہ نہیں نکلتے۔

جگر کا عشق ناکامیوں اور محرومیوں کا ماتم نہیں اس میں تلخیٔ زیست سے زیادہ لذتِ زیست ملتی ہے جگر کے تجرباتِ عشق میں ایک وقار اور متانت ہے، ان کے یہاں عاشق کا کردار حد سے بڑھی ہوئی روایتی خاکساری، پستی اور بے غیرتی کا پیکر نہیں۔ اس میں خودداری، خود اعتمادی اور "پاسِ ناموسِ عشق ہی نہیں" "پندارِ حسن" بھی ہے، وہ حسن سے شکست کھانے والا، عاشق نہیں، حسن کو مسحور کر لینے والا عاشق ہے ؎

دل کے معاملات میں ناصح شکست کیا　　سو بار حسن پر بھی یہ الزام آگیا

عاشق کے اس کردار نے جگر کی عشقیہ شاعری میں سرمستی، سربلندی، پندار اور رجائیت کی خصوصیات پیدا کر دی ہیں حسرت کی طرح جگر کا عشق دو طرفہ ہے۔ اور حسن بھی مبتلائے عشق نظر آتا ہے دونوں جانب شعلوں کی لپک ہے سوز دروں اور خلشِ پنہاں کا احساس ہے۔ اس لئے جگر کا عشق بڑا بھرپور اور مکمل محسوس ہوتا ہے چاہے اور چاہے جانے کی رنگارنگ کیفیات اور متنوع تجربات نے ان کے عشق کو زیادہ پراثر، صداقت پسند اور حقیقی بنا دیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

اِدھر سے بھی ہے سوا کچھ اُدھر کی مجبوری　　کہ ہم نے آہ تو کی اُن سے آہ بھی نہ ہوئی
کیا خبر تھی خود وہ نکلیں گے برابر کے شریک　　دل کی ہر دھڑکن کو اپنی داستاں سمجھا تھا میں
وہ خود تسکین خاطر کر رہے ہیں!　　مگر دل ہے کہ ڈوبا جا رہا ہے
مرگِ جگر پہ کیوں تری آنکھیں ہیں اشک ریز　　اک سانحہ سہی، مگر اتنا اہم نہیں
جگر وہ بھی ز سر تا پا محبت ہی محبت ہیں!　　مگر ان کی محبت صاف پہچانی نہیں جاتی
جب کوئی حسین ہوتا ہے سرگرمِ نوازش　　اُس وقت وہ کچھ اور بھی آتے ہیں سوا یاد
چھپ کے پردوں سے اے دیکھنے والے یہ بتا　　مجھ میں کیا بات نہیں جو مری تصویر میں ہے

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دو برابر کے کھلاڑیوں کا مقابلہ ہے، فتح کبھی اس کے حصے میں آتی ہے کبھی اس کے، اس لئے شکست کوئی آہ و فغاں کرنے، رونے، بسورنے یا زندگی سے بیزار ہو جانے کی بات نہیں۔ یہ معاملاتِ عشق کی ایک وسعت اور پہنائی ہے اور عشق انھیں گوناگوں تجربات کا نام ہے۔ جگر نے محبت کی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اسی لئے دوسرے غزل گو شعرا کے مقابلے میں ان کے تجرباتِ عشق زیادہ ہمہ گیر، زیادہ رنگارنگ، زیادہ گہرے اور سچے معلوم ہوتے ہیں ؎

کوئی نہ دیکھ سکا جن کو دو دلوں کے سوا　　معاملات کچھ ایسے بھی درمیاں گذرے
مدت ہوئی اک حادثۂ عشق کو لیکن　　اب تک ہے ترے دل کے دھڑکنے کی صدا یاد
ہاں ہاں تجھے کیا کام مری شدتِ غم سے　　ہاں ہاں نہیں مجھ کو ترے دامن کی ہوا یاد
یہ کیا مقامِ عشق ہے ظالم کہ ان دنوں　　اکثر ترے بغیر بھی آرام آگیا۔

کیا لطف کہ میں اپنا پتا آپ بتاؤں — کیجے کوئی بھولی ہوئی خاص اپنی ادا یاد

چپکے سے تک آستیں وہ لاکر چلے گئے — کیا راز تھا کہ جس کو چھپا کر چلے گئے

جب سے اس نے پھیرلیں نظریں رنگِ تباہی آہ نہ پوچھ — سینہ خالی، آنکھیں ویراں دل کی حالت کیا کہئے

خطا معاف! زمانے سے بدگماں ہو کر، — تری وفا پہ بھی کیا کیا ہمیں گماں گزرے

محبت کے یہ تجربات، کتنے حقیقی، کتنے سچے، دو دھڑکتے ہوئے دلوں کے کیسے سچے ترجمان، زندگی اور حقیقت سے کتنے قریب اور زندگی سے کس قدر معمور نظر آتے ہیں، معاملاتِ عشق کی یہ گرمی، یہ صداقت اور رنگا رنگی بھی جگر کو اُردو کے اچھے غزل گو شعرا کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے۔ یہ صحت مند جذباتِ عشق زندگی کے مثبت پہلوؤں کے ترجمان ہیں۔ معاملاتِ عشق میں جتنا باریک اور لطیف مشاہدہ جگر کے کلام میں ہے۔ اس کی مثالیں اُردو شاعری میں زیادہ نہیں ملتیں۔ حسرت کی شاعری میں بھی حسن ایک جیتی جاگتی حقیقت نظر آتا ہے۔ اور حسرت ہی کی طرح جگر نے حسن کی عظمت اور عشق کی پاکیزگی پر زور دیا ہے اور وہ "دیکھنا بھی تو انھیں دور سے دیکھا کرنا" والی روش پر گامزن نظر آتے ہیں۔ جگر نے عشق کے تصور کو اقبال کی طرح نئی وسعتیں نہیں بخشیں، اسے کون ومکاں کی پہنائیوں کا امین نہیں بنایا۔ اور اصغر کی طرح مابعد الطبیعاتی انداز بھی عطا نہیں کیا۔ لیکن حسرت کے عشق کی سی طہارت اور لطافت فرور بخشی عشق صدیوں سے کوچۂ قاتل اور بازار رسوائی میں بھٹک رہا تھا۔ حسرت نے اسے بازار سے نکالا۔ اور گھر کی چار دیواری کی صاف ستھری اور دلکش فضا میں کھو جانا سکھایا۔ حسن کی معصومیت کا یقین دلایا۔ اور "حسنِ خانہ نشیں" اور تہذیبِ رسمِ عاشقی کا بول بالا کیا۔ انھوں نے عشق کو آدابِ خودی اور آدابِ زندگی سکھائے۔ جگر نے اس پاکیزہ تصورِ عشق میں یہ اضافہ کیا۔ کہ عاشق کی روایتی بیچارگی اور مفروضہ حرماں نصیبی نے تصور کو جو حسن کی سفاکی، سوقیت، اور ہرجائی طینت کا غماز تھا، ترک کر دیا۔ حسرت اور جگر کی شاعری میں پہلی دفعہ حسن وعشق دوش بدوش زندگی کی دشوار گزار، راہوں پر گامزن نظر آتے ہیں۔ جگر کے یہاں عشق ارضی زیادہ اور ماورائی کم ہے۔ لیکن اس ارضیت اور ماورائیت نے اس کی عظمت، وقار اور رفعت میں کمی نہیں کی۔ جگر کے ہاں عشق ایسی آنچ ہے۔ جس میں شاعر کا وجود آہستہ آہستہ سلگتا رہتا ہے۔ اور بالآخر وہ روشنی پا لیتا ہے جو زندگی کی راہوں کو منور کر دیتی ہے۔ اصغر کے یہاں یہی روشنی نور بن گئی ہے اور جگر کے یہاں زندگی کی چمک اور تابندگی ؎

ایمان وکفر اور نہ دنیا و دیں رہے — اے عشق شاد باش کہ تنہا ہمیں رہے

شادمان و زندہ باش اے عشق خوش سودائے من

تجھ سے پہلے اپنی عظمت بھی کہاں سمجھا تھا میں

عشق ہے اُس مقام پر کہ جہاں — زندگی نے شکست کھائی ہے!

توہینِ عشق دیکھ نہ ہو اے جگر نہ ہو — ہو جائے دل کا خون مگر آنکھ تر نہ ہو

جگر کا عشق اصغر کے عشق سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ جگر کے فن کی کائنات اسی آب وگل کے محبوب کا جمال، اسی کا افسوں، اسی کا جلوہ اور نیرنگ ہے۔ اصغر کی آنکھ بھی جلوؤں کی تمنائی ہے لیکن وہ صورت سے معنی کی طرف مائل پرواز نظر آتے ہیں۔ اور جلوۂ جانانہ کو "سرگرمِ تجلّی" ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ جگر میں ارضی عشق کے جانگدازانہ تجربات اور سخت لمحات سے گزر جانے کا حوصلہ ہے، حسن کے مجرد تصور سے اصغر کی والہانہ وابستگی انھیں زندگی بسر کرنے کا وہ سلیقہ اور عشق کے معرکے سر کرنے کا وہ عزم عطا نہیں کرتی۔ جو جگر کے یہاں نظر آتا ہے، جگر حسن کو دیکھتے اور اس کی موہنی، اس کی عشوہ طرازی، اس کی کائنات رنگ و بو

اور اس کی مہک میں گم ہو جاتے ہیں۔ اصغر حسن کو دیکھتے اور دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں۔ اور یہ حیرت انھیں تصوف کا شاعر بنا دیتی ہے۔ جگر کا احساسِ رنگ اور احساسِ ترنم ان کی غزل کو روحانی عنصر، جمالیاتی شعور اور جمالیاتی اقدار کا ادراک عطا کرتا ہے۔ جگر نے اصغر سے بہت فیض اٹھایا ہے۔ اور انھوں نے اس کا اعتراف کیا ہے ؎

یوں تو ہونے کو جگر اور بھی ہیں اہلِ کمال — خاص ہے حضرتِ اصغر سے ارادت مجھ کو

نگاہ حضرتِ اصغر کی ہر ودیعت خاص — قرابن کے جگر کے دلِ حزیں میں رہی

حریمِ حسنِ معنی ہے جگر کاشانۂ اصغر — جو بیٹھو با ادب ہو کر تو اٹھو باخبر ہو کر

جگر کی شخصیت اور ان کا شعور ایک ایسے ماحول میں ابھرا جس میں صداقت، احترام، انسانیت، شرافت نفس اور اخلاقی و روحانی قدروں اور خلوص کی کمی نہ تھی۔ شباب کے تقاضوں نے ابتدا میں انہیں مے و مینا، عہدِ ماہتاب، اور دورِ آفتاب، کا شاعر بنا دیا تھا۔ یہ رنگ ان کے تغزل کا سب سے گہرا رنگ ہونے کے باوجود ان کی غزل گوئی کا واحد رنگ نہ تھا۔ اصغر سے وابستگی اور عبدالغنی منگلوری سے عقیدت نے ان سے اس قسم کے شعر بھی کہلوائے ہیں ؎

بیکار رہے اے مجنوں، یہ بیکراں آپ تک — قیس جنوں کا طالب بن جو اصل میں لیلیٰ ہے

اٹھا نہ دیجئے بلبل سے پردۂ غفلت — ہلاک ہو گئی کمبخت رنگ و بو کے لئے

یہ زیبِ جلوہ ہے سر بسر مجھے ڈر ہے دلِ بے خبر — کہیں جم نہ جائے تری نظر انھیں چند نقش و نگار پر

بھلا ہوا کہ نظر حیرتوں میں ڈوب گئی — کہاں کہاں نہ ترا حسن رائیگاں ہوتا

بہارِ لالہ و گل، شوخیِ برق و شرر ہو کر — وہ آئے سامنے لیکن حجاباتِ نظر ہو کر

شش جہت آئینۂ حسنِ حقیقت ہے جگر — قیس دیوانہ تھا، محو روئے لیلیٰ ہو گیا

"شعلۂ طور" سے "آتشِ گل" تک فکر و احساس کی بہت سی منزلوں کے نشان ہیں۔ اور یہ سب رجحانات جگر کی نجی زندگی اور ان کے ماحول کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مشرقیت کے رنگ میں رنگے ہوئے جس گھرانے میں ان کی شخصیت کا خمیر اٹھا تھا۔ اس پر شرافت، رکھ رکھاؤ اخوت اور اس سے زیادہ خلوص و انسان دوستی کی روایتوں کی گہری چھاپ تھی۔ اور یہی انسان دوستی جگر کو خارجی ماحول، عصری مسائل اور سماجی مظاہر سے اثر پذیر ہونے پر مجبور کر دیتی ہے۔ جگر اور اصغر دونوں نے زندگی کے بدلتے ہوئے انداز دیکھے تھے۔ (اصغر نے کم اور جگر نے بہت زیادہ) قدروں کو بنتے اور مٹتے دیکھا تھا۔ انسان کو رسوا ہوتے اور ابلیس کو کامیاب ہوتے دیکھا تھا۔ نار و نور کی اس جنگ کو، بیگہ کر اصغر مادی زندگی کو اور زیادہ قابلِ ترک اور بے مایہ سمجھنے لگے تھے۔ جگر ایک باشعور فن کار کی طرح سماجی حالات کی ناہمواری پر تڑپ اٹھتے ہیں۔ ان کے نغمے فریادوں میں ڈھل جاتے ہیں اور وہ کہہ اٹھتے ہیں ؎

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل — شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آجکل

روحانی قوتوں پر ایمان رکھنے والا شخص بھی جب گرد و پیش کے ماحول میں گندگی اور عفونت محسوس کرتا ہے اور جب اپنے ارد گرد بسنے والوں کو دکھ درد سے تڑپتا اور سسکتا ہوا دیکھتا ہے۔ تو وہ اپنی ہمدردی اور انسان دوستی کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جگر کا آخری عہد میں سماجی مسائل کی طرف رجوع کرنا اور انھیں در خورِ اعتنا سمجھنا۔ دراصل ان کی انسان سے بے پناہ محبت اور آدمیت کے احترام کا ثبوت ہے۔ سیاست کا میدان ان کے لئے نہ کوئی دلچسپی رکھتا تھا۔ نہ اس "کا گہ مکر" کو ان کی افتادِ طبع سے کوئی مناسبت تھی۔ وہ انسانیت کے درس کے سہارے اور "جیو اور جینے دو" کے اصول کے پیشِ نظر، شرافت اور انسانیت کا پرچار کرنا چاہتے تھے۔ محبت اور

خلوص کی پیر سے ماحول کی زہر میں بجھی ہوئی تلواروں کو روکنا چاہتے تھے ؎

کام جہاں کا ہے وہ اہل سیاست جانیں — میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

انھیں انسان سے انسانیت کو کھو دینے، اپنی قدر و منزلت کو نہ پہچاننے اور اپنے منصب سے غافل ہو جانے کی شکایت ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ انسان نے زمین و آسمان، چاند ستاروں، سمندروں اور فضاؤں کے بارے میں حیرت انگیز تحقیقات کیں اور بیشمار معلومات حاصل کرلی ہیں۔ لیکن وہ اپنی ذات اور اپنے نفس کو پہچاننے کی کوشش نہیں کرتا۔ انسان اس دنیا سے بے خبر ہے ؎

باہمہ ذوقِ آگہی ہائے رے پستئ بشر — سارے جہاں کا جائزہ اپنے جہاں سے بے خبر

وہ وقت ہے کہ علم حق ہے علم شیطنت میں گم — وہ وقت ہے کہ آدمی کا آدمی شکار ہے

کیا قیامت ہے کہ اس دورِ ترقی میں جگر — آدمی سے آدمی کا حق ادا ہوتا نہیں

جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے — گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

جگر کے یہاں دورِ آخر کی شاعری میں حیات کی رمز شناسی، دیدہ وری، انسانی عظمت کا یقین اور سماجی بصیرت کا احساس ملتا ہے انسانیت سے بے پناہ محبت ان کی توجہ، "خدمتِ دار و رسن" کی طرف منعطف کر دیتی ہے ؎

سلامت تو، ترا میخانہ، تیری انجمن ساقی! — مجھے کرنی ہے اب کچھ خدمتِ دار و رسن ساقی

"شعلۂ طور" اور "آتش گل" کا جو زمانی فاصلہ ہے۔ اس کو ہم جگر کی شاعری کے ارتقا سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ جگر کی شاعری آخر تک فکر و فن کے اعتبار سے مائل بہ ارتقا رہی۔ "آتش گل" جگر کے ذہنی انقلاب کی ترجمان ہے۔ لیکن یہ انقلابی شاعری نہیں ہے زندگی کی سنگین حقیقتوں سے نظریں ملا کر بھی جگر حیات کے رنگین پہلوؤں کو نظر انداز نہ کر سکے۔ حسن پرستی، شگفتگی اور رنگینی، ان غزلوں میں بھی موجود ہے۔ جو خارجی حقائق کی ترجمان ہیں۔ "آتش گل" میں بعض اشعار ایسے بھی ہیں۔ جو محض حوادث و مسائل کے انعکاسات ہیں۔ ان میں شعریت کا رنگ زیادہ گہرا نہیں ہے۔ وہ اشعار جن میں خارجی حقائق اور سماجی میلانات کو غزل کے میلانات سے ہم آہنگ بناکر پیش کیا گیا ہے۔ دورِ حاضر کی غزل گوئی میں ایک خوبصورت اضافہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان اشعار میں غزل کی قدیم علامات اور پرانے استعاروں ہی کے ذریعے سے زندگی کی نئی دھڑکنوں اور نئی آہٹوں کی ترجمانی کی گئی ہے اور ان اشعار میں روحِ عصر کا سارا عطر کھینچ آیا ہے ؎

بھری بہار میں تاراجئ چمن مت پوچھ — خدا کرے نہ پھر آنکھوں سے یہ سماں گذرے

چمن چمن ہی نہیں جس کے گوشے گوشے میں — کہیں بہار نہ آئے کہیں بہار آئے

صیاد کی نظر میں وہ نشتر سے کم نہیں — اک لرزشِ خفی جو مرے بال و پر میں ہے

کھلا بابِ زنداں تو کیا اس سے حاصل — کہ خود زندگی بن گئی قید خانہ!

کہاں کے لالہ و گل، کیا بہار توبہ شکن! — کھلے ہوئے ہیں دلوں کی جراحتوں کے چمن

آج کل میخانے میں تقسیم ہوتے ہیں جگر — زہر کے ساغر شرابِ زندگی کے نام سے

سماجی اور سیاسی شعور کی بالیدگی کے باوجود دورِ آخر میں جگر کی رومانی اور جمالیاتی حس کمزور، مضمحل اور کند نہ ہو سکی۔ جگر کے عشق نے انھیں حسن کا رمز شناس تو بنا ہی دیا تھا۔ زندگی کا مبصر اور حیات کے رنگا رنگ جلووں کا تماشائی بھی بنا دیا۔ اسی لئے ان کی شاعری میں تہذیبِ نفس، احترامِ آدمیت اور عصمتِ شاعر سب ہی باتیں مل جاتی ہیں۔ جگر کے تصور میں شاعری کی وقعت اور عظمت اس لئے ہے۔ کہ وہ کائنات کی ادا شناس نباض اور بار کہ ہے اسی لئے وہ شاعر کے متعلق کہتے ہیں ؎

راز جو سینۂ فطرت میں نہاں ہوتا ہے
سب سے پہلے دلِ شاعر پہ عیاں ہوتا ہے

جب کوئی حادثہ کون و مکاں ہوتا ہے
ذرہ ذرہ میری جانب نگراں ہوتا ہے

وہ ہمی ہیں کہ جن کے ہاتھوں نے
گیسوئے زندگی سنوارے ہیں!

حسین و سادہ ہے کس درجہ فطرتِ شاعر
ہنسے تو غنچہ و گل، رو پڑے تو شبنم ہے!

جگر کی بعض ابتدائی غزلیں سطحی، کھوکھلی، اور بے مغز نظر آتی ہیں۔ لیکن یہ غزلیں بھی بے کیف اور بے رنگ نہیں ہیں: نظر ملا کے مرے پاس آ کے لوٹ لیا۔ ستم کامیاب نے مارا۔ شباب حسن کا سنو شباب دیکھ لیا۔ ہر دم دعائیں دینا، ہر لحظہ آہیں بھرنا۔ کس نظر سے آج وہ دیکھا کئے؛ اور جوانی آتے ہی ان پر قیامت کی بہار آئی؛ ایسی غزلیں ہیں، جو تہہ دار اور پر مغز شاعری یا معنویت اور گہرائی رکھنے والے کلام کی تعریف میں نہیں آ سکتیں۔ ان میں ہلکے پھلکے جذبات کو سادہ زبان اور براہِ راست پیرایۂ ادا میں پیش کر دیا گیا ہے لیکن یہ غزلیں بھی مشاعروں میں خراجِ تحسین حاصل کر چکی تھیں۔ اور اس میں جگر کی خوش گوئی سے زیادہ ان کی خوش گوئی کا حصہ تھا۔ جگر اتنے مقبول اور پسندیدہ شاعر تھے۔ کہ ان کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ ان کے عقیدت مندوں اور پرستاروں کے لئے وجد آفریں ثابت ہوتا اور پھر جگر کے ترنم کا حسن اور مٹھاس اور ان کی مخصوص لَے معمولی معمولی اشعار کو بھی چار چاند لگا دیتی۔

جگر کی بعض غزلیں بادی النظر میں داغ کے تغزل کی یاد دلاتی ہیں۔ جس کی ظاہری وجہ اندازِ بیان کی شگفتگی، شیرینی اور رنگینی تھی۔ لیکن در اصل، جگر اور داغ کے فکر و احساس کی سطح، ان کے میلانات اور افتادِ طبع میں خاصا اختلاف تھا۔ داغ بنیادی طور پر معاملات چھیڑ چھاڑ اور جرأتِ رندانہ کے شاعر تھے۔ اور جگر کیفیاتِ عشق اور تاثراتِ محبت کے۔ ان کے کلام میں نہیں وہ طراری، چھین، جھپٹ محبوب پر چھا جانے کا جذبہ اور وہ "تو تو میں میں یا" "دیکھ زادہ ہے داغ آپ کا غلام نہیں!" والی انانیت نہیں ہے۔ داغ کی دہلوی زبان اور روزمرہ و محاورات سے غیر معمولی دلچسپی اور لفظی بازی گری جگر کے یہاں دکھائی نہیں دیتی۔ ایسے شعرا کو جو محض زبان کی صحت یا نمائش اور روزمرہ اور محاورے کی خاطر شعر کہتے تھے۔ جگر نے "کاریگرانِ شعر" کے نام سے یاد کیا ہے۔ بعض نقادوں نے جگر کی زبان اور ان کی طرزِ ادا پر اعتراضات کئے ہیں۔ اور اصلاحیں بھی دی ہیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان اصلاحوں سے شعر کی تھوڑی بہت تصحیح ہوئی ہو تو ہو لیکن ان سے اصل شعر کی لطافت، شادابی اور ترنم ضرور مجروح ہو گیا ہے یہ صحیح ہے کہ زبان و بیان کے اعتبار سے جگر کوئی استادانہ حیثیت نہیں رکھتے۔ لیکن جگر کو زبان کے استاد کی حیثیت سے جانچنا بھی زیادہ درست نہیں معلوم ہوتا۔ جو لوگ محبت کے لطیف جذبات اور نازک احساسات اور ادب میں جمالیاتی قدروں کے کم قائل ہیں۔ وہ جگر کے اشعار کو زیادہ سراہ نہیں سکتے۔ اس میں نہ جگر کا قصور ہے۔ نہ ان کا، ویسا کا۔ اگر زبان میں روزمرہ کا استعمال بھی ہو، بیان کی مادی خوبیاں بھی موجود ہوں، صنائع اور بدائع کی حسن کاری بھی ہو۔ لیکن، کیف، رس، رچاؤ، نکھار اور مہک نہ ہو تو، ایسے اشعار زبان و بیان کی صحت کے باوجود پھیکے اور بے مزہ معلوم ہوتے ہیں۔

کاریگرانِ شعر سے پوچھے کوئی جگر
سب کچھ تو ہے مگر یہ کمی کیوں اثر میں ہے

جگر کی غزلوں میں الفاظ کا انتخاب، مصرعوں کی موزونیت اور پر معنی و خوبصورت ترکیبیں ایک خاص حسن پیدا کر دیتی ہیں۔

قریبِ سرحدِ حرماں جگر ٹھہر جاؤ
سنا ہے قافلۂ غم ادھر سے گذرے گا۔

جگر وہ خاک ہی تو سرمۂ چشم دو عالم ہے
میسر ہو جسے ظرفِ جمالِ یار ہو جانا!

ہاں اس طرف بھی اک نگہِ نیشتر نواز،
کب سے تڑپ رہی ہے رگِ جانِ آرزو

لطافت مانعِ نظارۂ صورت سہی لیکن
دھڑکتا دل کا کہتا ہے وہ گذرے ہیں ادھر ہو کر

حسرتِ نیم طلب، رحمتِ عاجز نواز، برقِ جمالِ یار، شعبدہ نرگسِ مخمور، نگہِ فتنہ کار، طوفانِ قیامت نما، سلسلۂ جنبانِ اضطراب اور حسن بیعت دشمن ایسی ترکیبیں نہیں جو [illegible] کے اسلوب میں قابلِ نظر انداز ہوں۔

جگر کے یہاں اصغر، حسرت، یگانہ، اور فراق کی سی فکری گہرائیاں نہیں۔ تخیل کی اونچی اڑانیں نہیں، انسانی سیرت کی پراسرار پہنائیاں نہیں۔ ان کی غزلیں گمبھیر کیفیت، سنجیدہ فکر اور آفاقی ذہن کی ترجمانی نہیں کرتیں۔ اس کے باوجود جگر کی غزلیں اپنے مخصوص رنگ میں بڑی دلکش، پیاری اور دل موہ لینے والی ہیں۔ داغ کے بعد اردو داں طبقے نے ایک مدت کے انتظار کے بعد اتنی چنچل، اتنی رسیلی اور ایسی حسین غزلیں سنی تھیں ؎

عرصہ ہوا کہ رسمِ محبت بدل گئی — دامن سے وہ معاملۂ چشمِ تر کہاں

آکہ تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں — جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں!

اس گھڑی کی شرم رکھ لے لے نگاہِ ناز دوست — ہر نفس کو جیب حیاتِ جاوداں سمجھا تھا میں

نہ پہنچی آنچ دامن تک کسی کے — بڑا احساں ترا اے سوزِ خاموش

لہو آتا نہیں کھنچ کر مژہ تک — نہ آئے گی بہار اب کے برس کیا

ترکِ تعلقات کو مدت گزر چکی — ظالم ترے خیال سے پھر بھی مفر کہاں

گناہ گار کے دل سے نہ بچ کے چل زاہد! — یہیں کہیں تری جنت بھی پائی جاتی ہے

قریب منزلِ آخر ہے الفراق اے جگر — سفر تمام ہوا نیند آئی جاتی ہے

یہ اشعار محض ہلکی پھلکی "جذباتی شاعری" کے ترجمان نہیں۔ ان میں بہت سی قابلِ قدر اور کمیاب خصوصیتیں بھی موجود ہیں۔ ان کا مطالعہ ہمیں زندگی سے گریز نہیں سکھاتا۔ زندگی میں ڈوب جانا سکھاتا ہے۔ ان سے زندگی کا نشہ اور عزمِ حیات کچھ اور بڑھ جاتا ہے۔ ان میں شعورِ جمال اور حیات کی لطافتوں کا احساس ہے۔ جگر کے یہاں لذت پرستی نہیں حسن و عشق کی چاشنی ہے۔ جگر کی مہذب رندی و سرمستی، نغمگی و شیرینی، ان کے لطیف اشارات، حسین کنایات اور شگفتگی و سرشاری نے اردو غزل کی تاریخ میں کچھ ان مٹ نقش ضرور چھوڑے ہیں۔

ناشر .. .. شمس زبیری۔

سرورق .. .. اختر ہلال زبیری۔

کتابت .. .. چراغ الہ آبادی

طباعت .. .. انٹرنیشنل پریس کراچی

اشاعت .. .. نومبر ۱۹۶۴ء

مقامِ اشاعت

کاشانۂ اردو - ۲/۶ - اکبر روڈ - صدر کراچی ۳

تبت
سنو اور کولڈ کریم
کوہِ نور کیمیکل کمپنی لیمیٹڈ۔ کراچی۔ ڈھاکہ

منظور شدہ محکمہ تعلیمات کراچی بموجب سرکلر نمبر ڈی۔ای/جی۔وی/۵۰۸۰۳-۲-۵۱۰۰۲/۶۰ مورخہ ۲۶ ستمبر سنہ ۶۰ء

اُردو ادب کا ڈائجسٹ

نقش کراچی

۱۲ — ۶۴

دسمبر ۶۴

ادارہ

شاہد احمد دہلوی۔ شمس زبیری

قیمت	سالانہ
ایک روپیہ	بارہ روپے

کاشانۂ اُردو۔ پوسٹ بکس ۷۳۰۲۔ کراچی ۲

فون:- ۷۰۱۵۶

ترتیب

افسانے

طنز و مزاح

منظومات

مضمون

اکیڈمی لائبریری سیریز کی نئی کتابیں

مسدس ۔ حالی ، افقِ مشرق کے ادبی آفتاب کی ایسی کرن تھے ۔ جس نے اُردو نظم و نثر دونوں کو جگمگا دیا ۔ ڈاکٹر بجنوری " دیوانِ غالب کو " وید ول " کے بعد ہندوستان کی دوسری الہامی کتاب کہتے ہیں ۔ لیکن غالب کے اس شاگرد رشید نے مسدس لکھ کر بتا دیا کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ۔ مسدس کا صدی ایڈیشن صحت کے التزام کے ساتھ شایع کیا گیا ہے ۔ قیمت دو روپیہ پچیس پیسے ۔

ترکی حور ۔ اُردو میں تمثیل نگاری کا نقش اول امانت کی اندر سبھا ہو یا کوئی اور کتاب ، لیکن اب تو آغا حشر کا نام اُردو ڈرامہ سے منسلک ہو کر رہ گیا ہے ۔ اور ان کے ڈرامے آج بھی اتنے ہی مقبول ہیں جتنے اپنے عروجی دَور میں ہوں گے ۔ " ترکی حور " آغا حشر کا ایک کامیاب ڈرامہ ہے جو افادۂ عامہ کے خیال سے سستے ایڈیشن میں شایع کیا گیا ہے ۔ قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے

سحر البیان ۔ " مثنوی " نے جس طرح عالمی ادب میں اُردو کو ایک امتیاز بخشا ہے ۔ اسی طرح اردو مثنوی کے تصور کے ساتھ میر حسن کا نام زبان پر آجاتا ہے ۔ بلاشبہ " سحر البیان " زبان و بیان کا ایک معجزہ ہے ۔ اور سلاست وصفائی کے لحاظ سے اردو کی کوئی مثنوی اس کے پایہ کو نہیں پہنچتی ۔ " میر انیس " کے دادا کا یہ ادب پارہ سستے ایڈیشن میں شائع کیا گیا ہے ۔ قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے

مختصر تاریخ ادب اُردو ۔ اُردو ادب کی تاریخ ، ہندوستان کی تمدنی اور انقلابی تاریخ کے ساتھ چلتی ہے جس پر ملک کے اکثر اہلِ قلم نے قلم اُٹھایا ہے ۔ اور اُردو میں کئی مکمل اور جامع تاریخیں موجود ہیں ۔ لیکن ڈاکٹر اعجاز حسین نے جس اختصار کے ساتھ یہ تاریخ مرتب کی ہے وہ اپنی افادیت کے لحاظ سے طلبا اور اہلِ ذوق دونوں کے لیے یکساں طور پر اہم ہے اور اسی لیے اساتذہ کرام اس کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں ۔ چند سو صفحات میں سموئی ہوئی زبان اُردو کی سرگزشت میں تقسیم کے بعد کا دَور بھی شامل کر دیا گیا ہے ۔ اور حال و ماضی کا یہ آئینہ ضروری صحت کے بعد بار دیگر پیش کیا جا رہا ہے ۔ قیمت صرف پانچ روپیہ

آپ نے ووٹ کسی کو بھی دیا ہو

مگر انتخابی سیاسیات کا جاننا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے بیسک ڈیموکریٹس کے انتخابات ہو جانے کے بعد صدارت کے انتخاب کے وقت ایک معلومات آفریں کتاب ہے ۔ امریکہ اور پاکستان کے نظامِ مدن اور

امریکی انتخابات :۔ ایک سیاسی جائزہ اصولِ انتخابات کی مماثلت نے کتاب کی اہمیت کو بہت بڑھا دیا ہے اس کتاب میں تمام ضروری معلومات مثلاً ووٹر کے حقوق ، امیدوار انتخابات کیسے ہوں ؟ تام زدگیاں ، سیاسی اداروں کی کشمکش ، امیدوار صدارت ، صدارتی انتخاب کی مہم اور صدارتی انتخاب کیسے کیا جاتا ہے ؟ سب درج ہے ۔ کراچی یونیورسٹی کے تین استادوں نے اردو میں منتقل کیا ۔ اکیڈمی لائبریری اُردو میں اس موضوع پر پہلی کتاب پیش کر رہی ہے ۔ قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے

اپنے علاقہ کے بک اسٹال سے خرید یے ۔ یا براہ راست منگائیے

اُردو اکیڈمی سندھ ۔ کراچی ۔ حیدر آباد ۔ لاہور

کرشن چندر

فنون - لاہور

چاندی کا کمربند

چورنگی کے پیرز میں رہنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے۔ کہ وہاں شکار مل جاتا ہے۔ کلکتے کے کسی ہوٹل میں اتنا شکار نہیں ملتا۔ جتنا پیرز میں، اور جتنا اچھا شکار کرسمس کے دنوں میں ملتا ہے اُتنا کسی دوسرے سیزن میں نہیں ملتا۔ میں اب تک سات بار کلکتے آچکا ہوں۔ صرف دو بار خالی ہاتھ لوٹا ورنہ ہمیشہ مزے کئے اور بنک بیلنس الگ بڑھایا۔ میں صرف چالیس برس سے اوپر کی عورتوں پر نظر رکھتا ہوں۔ جو صاحبِ جائیداد ہوں۔ بیوہ ہوں تو اور اچھا ہے۔ مزید یہ کہ ہیروں کے ہار مجھے بہت پسند ہیں۔

میرا قاعدہ یہ ہے کہ میں کرسمس سے ماہ ڈیڑھ ماہ پہلے کلکتے آجاتا ہوں۔ اور پیرز میں قیام کرتا ہوں۔ ہر سال نہیں آتا تیسرے چوتھے سال آتا ہوں۔ اور صرف بڑا شکار کھیلتا ہوں۔ لومڑی اور خرگوش ملنا بڑا کام نہیں ہے۔ میں صرف شیرنی کا شکار کرتا ہوں۔

اس سال مجھے پیرز میں ٹھہرے بیس روز ہو چکے تھے۔ مگر اب تک شکار کا دور دور کوئی پتہ نہ تھا۔ نیپال کی ایک امیرزادی آئی تھی۔ مگر صرف پانچ دن ہوٹل میں رہ کر چلی گئی۔ ابھی جال بچھایا ہی تھا کہ پنچھی اڑ گیا۔ ایسے معاملات میں بڑے صبر سے کام لینا پڑتا ہے۔ دیر ہے سو ہے۔ اور اندر سے عجلت کرتے ہوئے بھی یوں ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ کسی طرح کی عجلت نہیں ہے۔ ورنہ پنچھی بدک جائے گا۔

پھر بیرونس ٹوبی ہوفن سے کچھ امید پیدا ہوئی تھی۔ روبی امریکی شہری تھی۔ اُس کا مرحوم خاوند جرمن تھا۔ مگر اُس نے بہت سا روپیہ اور بہت سی جائداد اپنی بیوہ کے لئے چھوڑی تھی۔ بیرونس ہوفن میں ایک عمدہ شکار کی ساری خصوصیات تھیں۔ عمر پچاس سے اوپر۔ ڈھلتی ہوئی خوبصورتی اور بڑھتی ہوئی خواہش۔ مشرقی فلسفے اور آرٹ کی دلدادہ۔ مہاتما بدھ سے اُسے عشق تھا۔ میں نے جلدی جلدی بدھ ازم پر بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں مگر ابھی صرف دو ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ کہ وہ جاپان چلی گئی۔ زین فلسفے کا مطالعہ کرنے کے لئے وہاں ۔۔۔ کسی بودھی سوسائٹی نے اُسے دعوت دی تھی۔ اُس نے مجھے اپنا ایڈریس بھی دیا تھا۔ اور دوبارہ کلکتے آنے کا خیال بھی ظاہر کیا تھا۔ مگر امید نہیں دوبارہ آئے۔ زین فلسفے کا شکنجہ بڑا مضبوط ہوتا ہے ساری جائیداد دھروا لیتا ہے۔

جب کرسمس میں صرف تیرہ دن رہ گئے تھے۔ ایسا لگا اب کے خالی ہاتھ لوٹ جانا ہوگا اور چھ سات ہزار کی چپت الگ پڑے گی۔ ہوٹل کے بل کی صورت میں۔ مگر بڑے کھیل میں ایسا تو ہوتا ہی ہے۔ خطرہ تو مول لینا پڑتا ہے۔

پھر ارچنا مل گئی۔

میں پارک اسٹریٹ کے فلوری رستوران میں لنچ کھانے کے لئے جا رہا تھا۔ کہ رستوران کے باہر ایک تازہ ترین ماڈل کی کیڈلک آ کے رکی۔ اور اس میں سے ایک سترہ اٹھارہ برس کی ایک لڑکی نکلی۔ سیاہ بال کٹے ہوئے اور شانوں تک آراستہ۔ بیضوی چہرہ۔ زیتونی رنگت۔ اُس نے فیروزی رنگ کی ایک بیش قیمت ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اور کمر میں چاندی کی ایک پتلی سی بیلٹ باندھ رکھی تھی۔ جو اس کی کمر کی نازکی اور کولہوں کے ابھار کو بڑی شگفتگی سے واضح کر رہی تھی۔ اُس نے میری طرف ایک اُڑتی ہوئی نگاہ سے دیکھا۔ پھر منہ پھیر کر اندر چلی گئی۔ اور میں اس کی ڈھلتی ہوئی چال کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ بلا مبالغہ میں نے ایسی حسین لڑکی آج تک نہ دیکھی تھی۔ چند لمحوں کے لئے میں بھول گیا۔ کہ میں کلکتے کس مقصد سے آیا تھا۔ عورتوں سے اس قدر واسطہ پڑ چکا ہے میرا، کہ میرا دل اب اُن کے جسم کے لئے نہیں دھڑکتا۔ دھڑکتا ہے تو ان کے گلے کے زیور کے لئے، ان کے ہاتھ کی انگوٹھیوں کے لئے۔ اُن کی پاس بک کے لئے۔ عشق کی باتیں سب بہت اچھی طرح کر لیتا ہوں۔ مگر عشق کی باتیں میرے حلق سے یوں نکلتی ہیں جیسے مچھلی پکڑنے والی ڈور گراری سے پھسلتی ہے۔ اُن میں کوئی ایسا جذبہ نہیں ہوتا جو خود میرے دل کو دھڑکا دے۔ اسی لئے چند لمحے مبہوت رہنے کے بعد مجھے اپنی کمزوری پر افسوس ہوا۔ میں نے اپنے آپ پر لعنت بھیجی اور پھر جی کڑا کر کے رستوران میں داخل ہو گیا۔

اتفاق سے مجھے ایک ایسی میز مل گئی۔ جہاں سے میں اُسے بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ لیکن وہ مجھے اچھی طرح سے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی کو دیکھنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتی۔ حالاں کہ اِدھر اُدھر کی کئی عورتیں مجھے دیکھ کر چونکی تھیں۔ وجہ یہ کہ میری صرف شکل ہی اچھی نہ تھی۔ میں اپنی صحت کا بھی بہت خیال رکھتا ہوں اور صبح چار میل کی دوڑ لگاتا ہوں اور سپیٹ کی ورزش بھی کرتا ہوں۔ اور بہترین کپڑے پہنتا ہوں۔ اور چیتے کی طرح چلتا ہوں۔ اس لئے جب میں کسی نئی جگہ میں داخل ہوتا ہوں تو لوگ ایک لمحے کے لئے ضرور چونک کر مجھے دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی نہ ہو تو آدمی بڑا شکاری نہیں بن سکتا۔

میں نے بڑے اطمینان سے اپنا لنچ کھایا۔ دھیمی دھیمی موسیقی کے ساتھ، چکن ریشمی کباب بے حد لذیذ تھے۔ تیتر کے بھنے ہوئے مصالحے دار تکے بھی عمدہ تھے۔

علاوہ ازیں اِدھر اُدھر کوئی دوسری شے قابل توجہ نہ تھی۔ چند سیٹھ لوگ اپنی بدصورت بیویوں یا خوبصورت داشتاؤں کے ساتھ بیٹھے دو ماہر کی بڑے جوڑے تھے۔ چند درمیانے طبقے کے ٹیڈی لڑکے لڑکیاں۔ چند بزنس اینگلو اور دو اعلیٰ درجے کی طوائفیں بیٹھی تھیں۔ غرضیکہ اُس لڑکی کے سوا کہیں نگاہ نہ ٹکتی تھی۔ مگر کس قدر اداس اور مغموم وہ بیٹھی تھی۔ جیسے کسی ویرانے میں کسی ندی کے کنارے پاؤں لٹکائے بیٹھی ہو۔ اور ایک بار اُس نے بڑی عجیب ادا سے اپنے شانے جھٹک دیئے۔ اپنے بالوں پر انگلیاں پھیر کر انھیں سنوارا۔ اور میں اس کی انگلی میں پڑی ہوئی انگوٹھی کے سالم ہیرے کو دیکھتا رہ گیا۔ انگلیاں بے حد خوبصورت تھیں۔ ہیرا بہت بڑا تھا۔ مگر لڑکی کی عمر کسی طرح سترہ اٹھارہ انیس برس سے زیادہ نہ تھی۔ اور میں چالیس برس سے اِدھر دیکھتا تک نہیں۔ تجربے نے بتایا ہے کہ ایسا کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ الٹی مصیبت گلے پڑ جاتی ہے۔ اس لئے میں نے اپنی تمام تر توجہ اپنے لنچ پر مرکوز کر دی۔ ہاں، کبھی کبھی اُسے دیکھ لیتا تھا۔ کیونکہ ایسا نہ کرنا ناممکن تھا۔ وہ کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی اپنی بے پناہ خوبصورتی سے غافل تھی کبھی چھوٹی چھوٹی آہیں بھرتی۔ کبھی ایک نوٹ بک پر پنسل سے کچھ لکھنے لگتی۔ بیچ بیچ میں سیب کا شربت پیتی۔ دو دفعہ وہ اپنے لنچ کا آرڈر بدلوا کر، نیا آرڈر دے چکی تھی۔ معلوم ہوتا ہے بہت پریشان ہے۔ اپنے عاشق کی منتظر معلوم ہوتی ہے جو ابھی تک نہیں آیا۔ بلاؤز کے کنارے سے لے کر نیچے ساڑھی کے کنارے تک اس کا کسا ہوا جسم کسی خوبصورت صراحی کی طرح خمدار معلوم ہوتا تھا۔ اور اس کے نیچے کولہے کی نیم گولائی! میں نے جلدی سے نظر ہٹا لی۔ کم بخت اس دل کی حرکت پھر تیز ہوئی جاتی ہے اور وہ شکاری ہی کیا جو اپنے اوسان بجا نہ رکھے۔

لنچ کھا کر میں نے چاندی کے کٹوروں میں ہاتھ دھوئے۔ بل ادا کیا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ایک لحظہ کے لئے اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ اور ہم دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ ایک لحظہ کے لئے مجھے ان نگاہوں میں ایک گہری التجا نظر آئی۔ ممکن ہے یہ میرا واہمہ ہو۔ کیوں کہ دوسرے

ہی لمحے اُس لڑکی نے اپنی آنکھیں مجھ سے چرالی تھیں اور اسکارج بلکدار پوشاک کی مہک میں چھپ گیا تھا۔ کیسی غزالی آنکھیں تھیں وہ۔ بڑی بڑی پھیلی پھیلی گہری، سیاہ، سیال پتلیاں، مچھلیوں کی طرح تیرتی ہوئی۔

مجھے جھٹکا سا لگا۔ مگر میں نے فوراً ہی اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ اور بڑی تکنت سے بیرے کو ٹپ دیتا ہوا، اپنے مرا کو چمڑے کے بٹوے کو اندر کی جیب میں رکھتا ہوا نیلوفر سے باہر نکل گیا۔

دوسرے دن ایک اسپینی خاتون کو شیشے میں اتارنے میں مصروف رہا۔ مگر کچھ کامیابی نہ ہوئی۔ بڑھی بے حد امیر تھی۔ مگر عمر پینسٹھ برس سے اوپر ہی تھی۔ میں نے اُس کے خون کو گرمانے کی بہت کوشش کی۔ مگر اس باوقار خاتون پر اگلی دنیا کا ہول کچھ ایسا طاری تھا۔ کہ اس دنیا میں وہ زیادہ دلچسپی لینے پر تیار نہ تھی۔ ہم لوگ دیر تک بائبل کی خوبیوں پر سر دھنتے رہے اور مسئلہ تثلیث پر بحث کرتے رہے آخر میں جب اُس بڑھی نے مجھ سے کسی راہبہ گھر کے لئے چندہ مانگ لیا تو میں نے پسپائی اختیار کی۔ میں بالعموم اس عمر کی بڑھیوں کو منہ نہیں لگاتا مگر کیا کیجئے۔ کلکتے آئے ہوئے ایک ماہ ہو چکا تھا۔ اور کرسمس قریب آ رہا تھا۔

اس لئے مجھے اس روز لنچ پر جانے میں، اس قدر دیر ہو گئی۔ میں جب نیلوفر کے پاس پہنچا تو وہی حسینہ سانولے رنگ کے ایک نوجوان کے ساتھ باہر نکل رہی تھی۔ ہلکے گلابی رنگ کی سادہ سی ریشمی ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ کانوں میں یا کلائی پر کوئی زیور نہ تھا۔ صرف گلے میں پکھراج کا ایک بیش قیمت گلوبند تھا۔ جو اس کی زیتونی رنگت پر اس طرح جم جاتا تھا جیسے ایک شفاف ہیرے پر دوسرا شفاف ہیرا رکھا ہو۔ مجھے دیکھتے ہی، اُس کی آنکھوں میں دلچسپی اور شناسائی کی ایک جھلک پیدا ہوئی اور اس سانولے نوجوان نے کھلی گاڑی کے پٹ کی طرف اشارہ کیا اور وہ نیلے رنگ کی مرسڈیز میں بیٹھ گئی۔ جسے وہی کل والا ڈرائیور چلا رہا تھا۔ تو اس کے پاس یا اُس سانولے رنگ کے نوجوان کے پاس دو گاڑیاں ہیں۔ ایک کیڈی لیک دوسری مرسڈیز۔ جانے کون ہیں یہ لوگ؟ معلوم ہوتا ہے مجھے اپنا دستور توڑنا پڑے گا اور چالیس برس سے نیچے اترنا پڑے گا۔ شیر بھوکا ہو تو کیسے صبر کرے؟

نیلوفر میں لنچ کھا کر میں سپر میں آ گیا۔ اور اپنی بیوی کو محبت بھرا خط لکھنے لگا۔ نرملا ایک لکھ پتی باپ کی بیٹی ہے اور خود بھی بمبئی کے ایک مشہور و معروف ایڈورٹائزنگ فرم میں پندرہ سو روپے ماہانہ پر ملازم ہے۔ اُسے کام کرنے کا شوق ہے اور مجھے کام نہ کرنے کا۔ دراصل مجھے کوئی کام آتا ہی نہیں سوائے عورتوں کے شکار کے۔ اور میری شادی بھی دراصل اسی عادت کا نتیجہ ہے۔ نرملا کے باپ نے ہماری ازدواجی زندگی کو مالی الجھنوں سے نکال کر اسے بے حد خوش گوار بنا دیا ہے شادی میں اُس نے مجھے ایک عالی شان فلیٹ دیا۔ ایک گاڑی دی۔ بمبئی کے سب سے مہنگے کلب کی ممبر شپ دی۔ اور منجملہ ہر طرح کے لباس فاخرہ اور سامان تعیش کے، ایک خوبصورت بیوی بھی دی۔ اور کیا چاہیئے میرے ایسے آدمی کو؟ — مگر عادتیں بگڑی ہوئی ہیں۔ پورا نہیں پڑتا۔ اور کام کوئی آتا نہیں۔ جہیز کب تک ساتھ چلتا ہے وہ تو اچھا ہوا شادی سے پہلے ہی میں نے نرملا سے کہہ دیا تھا کہ میرا دھندا غیر ملکی سیاحوں کو ہندوستان کے جنگلوں میں شکار کھلانے کا ہے۔ باہر سے غیر ملکی شکاریوں یا شکار کے خواہش مندوں کی جو ٹولیاں ہمارے دیس میں آتی رہتی ہیں میں انھیں ڈیڑھ دو، تین ماہ کے لئے کبھی کم، کبھی زیادہ عرصہ کے لئے، کماؤں، کورگ، دنڈیا چل کے جنگلوں میں شکار کھلانے لے جاتا ہوں۔ اور ان سے دو تین ماہ میں پچیس پچاس ہزار پیٹ لیتا ہوں۔ نرملا بیچاری کو اس طرح کے کیا، کسی طرح کے شکار سے دلچسپی نہیں ہے اس لئے وہ میرے ساتھ لمبے سفروں پر کہیں نہیں جاتی ہے۔ البتہ اُسے میری بات کا سو فیصدی یقین ہے کہ میں واقعی غیر ملکی سیاحوں کو شکار کھلانے کا دلچسپ دھندا کرتا ہوں۔ اور پھر روپے بھی تو گھر لا کے دیتا ہوں۔ پچیس ہزار۔ پچاس ہزار۔ لاکھ۔ ڈیڑھ لاکھ۔ دو لاکھ۔ پھر ہم لوگ مزے سے بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ سال دو سال۔ پھر میں اپنے شکار کو نکلتا ہوں ویسے نرملا کو کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے میں ایک ہی ہلے میں گھر میں اتنا لے آتا ہوں۔ مگر کام کرنے والی بیوی کے بہت سے فائدے ہیں

جھوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بے چاری اپنے کام سے لگی رہتی ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ سوکھے موسم میں ہریالی کا کام دیتی ہے اور بہترین سے بہترین شکاری کو بھی اپنی زندگی میں سوکھے موسم سے واسطہ پڑ ہی جاتا ہے۔

میں نے نرملا کو ایک محبت بھرا خط لکھا۔ اور اس سے دس ہزار روپے منگالئے۔ کیونکہ میں سیاحوں کی ایک بڑی ٹولی کو لے کر آسام کے جنگلوں میں شکار کے لئے جا رہا تھا۔ تین چار ماہ بعد آؤں گا۔

خط لکھ کر اور ڈاک سے بھجوا کر میں قیلولہ کرنے کی نیت سے کمرے میں لیٹ گیا۔ اور سونے سے پہلے بہت دیر تک اپنا پروگرام بناتا رہا۔ اور اس میں خود ہی ترمیم پیش کرتا رہا۔ اور دل ہی دل میں بحث کرتا رہا کیونکہ اب میرے شکار کی نوعیت دوسری تھی۔ اس لئے دوسری طرح سے کام کرنا ہوگا۔

رات کو ڈنر کھانے کے لئے پھر نیلوفر پہنچ گیا۔ میرا خیال صحیح نکلا۔ میری طرح ارچنا کا پسندیدہ ریستوران بھی نیلوفر معلوم ہوتا تھا۔ اس نے سنہرے اور کاسنی رنگوں والی بنارسی بانک ساڑھی پہن رکھی تھی۔ کانوں میں کبوتر کی آنکھ کی طرح سرخ یاقوت سے جھم جھلاتے ہوئے آویزے تھے اور گلے میں لعل بدخشاں کا ایک ہی پرانا اور کلاسیکی طرز کا گلوبند۔ جس کی قیمت کم سے کم پانچ لاکھ ضرور ہوگی۔ آج ارچنا کا سلگتا ہوا حسن اور اس کی نگاہوں کا مغنطیسی لہجہ اور اس کے جسم کے چنچل خم بے حد خطرناک معلوم ہوتے تھے۔ صرف میں ہی اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ ریستوران میں بیٹھے ہوئے ہر خوش ذوق مرد کی نگاہ اس پر تھی۔ یہ نگاہ جو بظاہر اپنی بغل میں بیٹھی ہوئی بیوی کو ہر طرح سے اپنی توجہ کا یقین دلا کے ادھر ادھر پلٹ جاتی تھی اور ارچنا پر مرکوز ہو جاتی تھی، اور ارچنا سب سے بے نیاز ہو جاتی تھی۔ کئی مردوں نے اسے ڈانس کے لئے کہا مگر اس نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔ اس کی آنکھیں! — ایسا لگتا تھا۔ جیسے ابھی رو دیں گی۔ یا کسی کو کھا جائیں گی۔ جب فلور پر ناچنے والے جوڑوں کی بھیڑ بہت بڑھ گئی۔ اور ایک بہت ہی سلو فاکس ٹراٹ چلنے لگا۔ اور جب مجھے محسوس ہوا۔ کہ ارچنا کا انکار کسی کو میری طرف متوجہ نہیں کرے گا تو میں اپنی میز سے اٹھ کر ارچنا کی میز پر گیا۔ جھکا۔ اپنی بہترین اور دلکش ترین مسکراہٹ سے مسکرایا اور اسے ناچنے کو دعوت دی۔

ارچنا نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ ایسا لگا جیسے ایک لمحے کے لئے وہ میرے مردانہ حسن کی مقناطیسی کشش سے مسحور ہو گئی ہے۔ ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھوں میں گہری قربت اور شناسائی کی وہی پرانی چمک نمودار ہوئی۔ یہ چمک جو آدم اور حوا کے زمانے کی طرح پرانی ہے۔ پھر جیسے اس کا چہرہ ایک دم اداس اور غمزدہ ہو گیا۔ اس نے مجبور نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور سر انکار میں ہلا دیا۔

میں نے ہار نہ مان کر اپنی مسکراہٹ کی لَو کو اور تیز کر دیا۔ بولا۔ "کیا آپ نے قسم کھائی ہے کہ اپنے اس سانولے بوائے فرینڈ کے سوا کسی کے ساتھ نہ ناچیں گی؟"

یکایک وہ میری غلطی پر مسکرا پڑی۔ "وہ میرا بھائی ہے۔ بوائے فرینڈ نہیں ہے۔"

میں نے فوراً کہا۔ "یہی تو میں سوچتا تھا کہ ایسی دلربا صورت کے ساتھ وہ اکھڑی اکھڑی سانولی صورت پیچ نہیں کرتی ہے۔ اچھا ہے، وہ آپ کا بھائی ہے، بوائے فرینڈ نہیں ہے، ورنہ میرا ارادہ آج اسے جان سے مار دینے کا تھا۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور ساتھ کر میری باہوں میں آگئی۔ اور مجھے ایسا لگا۔ جیسے وہ بنی ہی میری باہوں کے لئے تھی۔ سر سے پاؤں تک مجھے مکمل کرتی ہوئی۔ ناچتے ناچتے میری انگلیوں کے لمس کے زیر اثر اس کی کمر کے نیچے کولہے کسی متناسب لے پر دھیرے دھیرے ڈولتے تھے۔ جیسے جھیل کی ہلکی لہروں پر کنول کے پھول ڈولتے ہیں۔ اگر میں نوجوان، نا تجربہ کار اور احمق ہوتا تو ضرور اس سے عشق کر بیٹھتا۔ مگر میری آنکھ اس کے یاقوتی گلوبند پر تھی۔ میری تیسری آنکھ... ورنہ چہرے کی دونوں آنکھیں تو اس کے چہرے ہی پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ مجھ سے نظر چرا اور گھبرا کر ادھر ادھر دیکھ لیتی تھی۔

"کس کا انتظار ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بھائی کا!" وہ ایک اضطراری سرگوشی میں بولی "میرا بھائی مجھے کسی کے سنگ ناچنے نہیں دیتا۔"

"بہت ہی قدامت پرست ہے؟"

"نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"پھر کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں ہے۔" وہ یکایک چپ ہو گئی۔ پھر نظریں جھکا کر بولی۔ "تم بہت اچھا ناچتے ہو۔"

"اپنے بھائی سے اس قدر ڈرتی کیوں ہو؟" گھبراؤ نہیں۔ اطمینان سے ناچتی جاؤ۔ میں تمہارے بھائی پر نگاہ رکھوں گا۔ اُس کے آتے ہی تمہیں چھوڑ دوں گا۔"

میری بات سن کر اُس نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا۔ پھر اُس نے اپنے جسم کو میرے جسم کے سپرد کر دیا۔ چند لمحوں کے لئے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اُس کا سر میرے شانے سے لگ گیا۔ اور چند لمحوں کے لئے ہاتھ اس کی کمر پر رکھے رکھے میں نے محسوس کیا جیسے میرا ہاتھ اُس کی کمر پہ نہ ہو گل کے چاک پر ہو۔ جہاں پر میں ایک خواب ناک اور آرزو مند مٹی کے بطن سے خیام کی ایک صراحی کی تخلیق کر رہا ہوں۔ ویسے ان کانوں کے آویزے بھی ایک لاکھ سے کم کے نہ ہوں گے۔

پہلا ناچ ختم ہو گیا۔ مگر اس کا بھائی نہیں آیا۔ اور ہم وہیں فلور پر کھڑے کھڑے دوسرے رقص میں شامل ہو گئے۔ یہ ایک امریکی لوک نرت تھا۔ جس میں جوڑے ایک دوسرے کو چھوتے ہوئے الگ ہو جاتے تھے۔ اور رقص کرتے ہوئے بار بار تالی بجاتے تھے۔ اس رقص کے دوران مجھے بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔

ارچنا کے ماں باپ مر چکے تھے۔

(تالی)

ان کی میگنیز کی کانیں تھیں، آسام میں۔

(تالی)

اور کلکتے میں بہت سی جائیداد تھی۔

(تالی)

اس جائیداد کے صرف دو وارث تھے۔ بھائی اور بہن۔

(آدھی تالی)

بھائی شادی شدہ تھا۔ اور بہن کنواری۔

(پر زور تالی)

ارچنا نے مجھ سے وعدہ کر لیا کہ وہ دو روز کے بعد مجھ سے پھر مل سکے گی۔ کارنیشن ریستوران میں۔ دوپہر کو۔ لنچ سے ایک گھنٹہ پہلے۔ اس کے بعد لنچ کے ٹائم پھر نیلو فر چلی جائے گی۔ اپنے بھائی کے ساتھ لنچ کھانے۔

(سب سے اونچی تالی)

کارنیشن میں کیبن کا بھی انتظام ہے۔ کارنیشن میں پہلی بار ارچنا نے میرے ہاتھ سے شراب پی۔ ایک ہلکی سی مارٹینی۔ لعل بدخشاں کی طرح

درخشندہ! بے حد جھجک جھجک کر اور بے حد اصرار کے بعد اُس نے پہلے دو گھونٹ لئے۔ چھوتے ہوئے اس کے رخسار تمتمانے لگے اور ہونٹ کسی نامعلوم جذبے سے بوجھل ہو کر بار بار کانپنے لگے۔ دوسری ملاقات میں وہ بہت کچھ کھل گئی۔ اس کا بھائی اس سے پیار نہیں کرتا، نفرت کرتا تھا کیونکہ وہ آدھی جائیداد کی مالک تھی۔ اگر آج جائیداد کے حصے الگ الگ ہو جائیں تو ارچنا کو ڈیڑھ کروڑ روپے ملیں گے۔ مگر ارچنا پر کڑی پابندیاں تھیں۔ ہر لمحہ اس کی نگرانی کی جاتی تھی کیونکہ اس کا بھائی، اس کا حصہ بھی ہڑپ کر لینا چاہتا تھا۔ اور اس سے کاغذات پر دستخط کرا لینا چاہتا تھا۔ وہ ابھی تک انکار کئے جا رہی تھی

"میں اکیلی ہوں۔ تنہا ہوں، کوئی نہیں ہے میرا اس دنیا میں۔ اگر میں نے زیادہ دیر تک انکار کیا تو ممکن ہے لوگ مجھے زہر دے دیں یا کسی سے مروا ڈالیں۔ تم نہیں جانتے کسم کو، کسم میرے بھائی کی بیوی ہے۔ کبھی کبھی وہ ایسی عجیب نگاہوں سے مجھے دیکھتی ہے۔ جیسے میری گردن پر چھری رکھ رہی ہو۔ تم بتاؤ میں کیا کروں؟"

ارچنا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

تیسری سے چوتھی ملاقات میں وہ اور بھی بجھ گئی۔ ہر وقت متوحش اور دہشت زدہ سی دکھائی دینے لگی۔ ذرا سی آہٹ پر چونک جاتی۔ اپنے بھائی کی آمد کا شبہ ظاہر کرتی۔ کوئی اجنبی اگر اسے غور سے دیکھتا تو اسے فوراً اپنے بھائی کا مخبر سمجھ لیتی۔ مگر اس پر بھی ہم ملتے رہے۔ ملتے رہے اور میں نے اُسے صلاح دی۔ کہ وہ کورٹ میں درخواست دے کر اپنی جائیداد کا حصہ الگ کرا لے۔ مگر وہ بے حد گھبرائی ہوئی تھی۔ اس کے بھائی، بھاوج کو غالباً اس پر شبہ ہو گیا تھا۔ کیونکہ بھاوج نے بہن کے سارے زیور اپنی تحویل میں لے لئے تھے۔ صرف ہاتھ کا ایک کنگن بچا تھا۔ جواہرات سے مرصع، اُس نے اپنے بیش قیمت بٹوے سے کانپتے ہوئے وہ کنگن نکالا اور میرے ہاتھ میں دے کر بولی۔ "اسے تم اپنے پاس رکھ لو۔ اگر زندہ رہ گئی تو تم سے لے لوں گی۔"

میں نے اصرار کر کے اُسے کنگن واپس کر دینا چاہا مگر اس نے واپس نہیں لیا۔ کنگن واپس کرنے کی کوشش میں بار بار میری انگلیاں اس کی انگلیوں سے چھو گئیں۔ اور پھر دیر تک ایک دوسرے کی گرفت میں تڑپتی رہیں۔ پھر اس کی انگلیاں بالائی کی طرح نرم پڑ گئیں، اور اس نے اپنے ہاتھ کو میرے ہاتھ میں بالکل ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اور میرے سینے سے لگ کر دھیرے دھیرے سسکنے لگی۔ مجھے ایسا لگا جیسے ڈیڑھ کروڑ روپیہ میرے سینے سے لگ کر مجھے دھیرے دھیرے تھپک رہا ہو۔ ایک لمحے کے لئے میرے دل میں نرملا کا خیال آیا۔ اونہہ! کیسا احمق ہوں۔ جو ایسے موقعہ پر نرملا پر غور کر رہا ہوں۔ نرملا بھی کوئی غور کرنے کی چیز ہے!

اس لئے میں نے سب سوچ ساچ کر ارچنا کے اداس، کانپتے ہوئے، رس سے بوجھل ہونٹ چوم لئے۔ کسی تیز شراب کے پہلے گھونٹ کی طرح اس بوسے نے میرے دل و دماغ پر نشہ طاری کر دیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا، میں ارچنا سے شادی کروں گا۔ اسے اپنی بنا کر اس کی جائیداد کا حصہ الگ کروا کے کہیں دارجلنگ، شلانگ کی طرف نکل جاؤں گا۔ میں ساری زندگی اس کے ساتھ گزار دوں گا۔ ڈیڑھ کروڑ روپیہ بہت ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے شکار کرنے سے بہتر ہے کہ وہ ایک ہی ہلے میں ایک شکار پر ہاتھ صاف کر جائے۔ "ڈارلنگ، اپنی ہر تکلیف بھول جاؤ" میں نے اسے اپنی باہوں میں لے کر کہا۔ "اب تم اکیلی اور بے یار و مددگار نہیں ہو۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ دل و جان سے تمہاری مدد کروں گا۔"

"مگر کیسے؟ کس رشتے سے؟"

وہ آزردہ ہو کر بولی۔ "لوگ کیا کہیں گے؟"

"لوگ یہی کہیں گے۔ کہ میں تمہارا خاوند ہوں۔"

"کیا؟ — کیا؟ —" اُس کی زبان رک گئی۔ اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"ہاں پیاری!" میں نے اپنی دونوں آنکھوں کی مکمل کشش سے اُسے مسحور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں چاہتا ہوں تم سے شادی

کرنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں۔ نہیں!" وہ دونوں ہاتھ زور سے ہلاتے ہوئے بولی۔ "یہ جھوٹ ہے۔ تمہیں محض مجھ سے ہمدردی ہے۔ اور ہمدردی کی خاطر تم مجھ سے شادی پر آمادہ ہو۔ لیکن میں تمہیں تباہ نہ کروں گی۔ مقدمہ جانے کتنے سال تک لڑنا پڑے۔ نہیں۔ نہیں۔ مجھے کوئی حق نہیں ہے اپنی تکلیف تم پر لادنے کا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے اسے دلاسا دیا۔ بار بار اپنی محبت کا اظہار کیا۔ بڑی مشکل سے متواتر کئی دن سمجھانے کے بعد وہ مجھ سے شادی پر تیار ہوئی۔

"مگر تین دن ٹھہر جاؤ۔"

"تین دن کیوں؟ آج کیوں نہیں؟" میں نے بے چین ہو کر کہا۔

"تین دن کے بعد میرا بھائی شلانگ جانے والا ہے۔ ایک ہفتے کے لئے پھر مجھ پر پہرہ بھی کم ہو جائے گا۔"

یکایک اس کی روتی ہوئی آنکھوں سے مسکراہٹ چھلک پڑی۔ اس نے میری باہنہ کو زور سے پکڑ لیا۔ اور اپنے گال اس سے لگا کر اس نے ایک میٹھی اور طویل سانس لی۔ اور دھیرے سے بولی۔ "تین دن کے بعد میں تمہاری ہو جاؤں گی۔"

اس بیچ میں ہم دونوں فیملی کے سالسٹر سے ملے۔ مکھال مکرجی۔ وہ ایک بے حد خشک، بے حد باقاعدہ، مگر بے حد جہاندیدہ اور تجربہ کار سالسٹر مجھے معلوم ہوئے۔ وہ بھی ارچنا سے بے حد ہمدردی رکھتے تھے۔ مگر اس کے بھائی کے سالسٹر ہونے کی وجہ سے در پردہ ہی ارچنا کی مدد کر سکتے تھے۔ ہائی کورٹ میں لڑنے کے لئے یوں تو اتنے بڑے مقدمے کے لئے کئی لاکھ کی ضرورت تھی۔ مگر وہ ارچنا کو اپنا ایک دوست سالسٹر دے دیں گے جو صرف پچیس ہزار میں ہمارا کیس لڑے گا۔ مگر پچیس ہزار نقد ادا کرنے ہوں گے۔

ہم دونوں بیحد پریشان ہوئے۔ اب پچیس ہزار کہاں سے آئیں گے؟

"وہ میرا کنگن بیچ دو۔" ارچنا نے صلاح دی۔

مگر میں کنگن ایک جوہری کو پہلے ہی دکھا کر اس کے دام پوچھ چکا تھا۔ وہ بارہ ہزار لگا رہا تھا۔ اور ہمیں پچیس ہزار چاہئیں اور میں کنگن بیچنا نہ چاہتا تھا۔ بڑی سُبکی ہوتی۔ زندگی بھر کے لئے ارچنا کی نگاہ میں ذلیل ہو جاتا۔

"نہیں۔ نہیں۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "وہ کنگن کبھی نہیں بکے گا۔ میں کہیں نہ کہیں سے پچیس ہزار کا بندوبست کر لوں گا۔"

اُسی دن میں نے نرملا کو تار دے کر پندرہ ہزار روپیہ اور منگا لیا۔ اور سالسٹر کو پچیس ہزار روپے ادا کر دیئے۔

تین دن کے بعد میں نے اور ارچنا نے خفیہ شادی کر لی۔ گو پکی اور باقاعدہ پھیروں سے یہ میری بارہویں شادی تھی۔ اس سے پہلے میں ہر شادی پر ہمیشہ دل ہی دل میں ہنستا تھا۔ مگر اس بار نہیں ہنسا۔ اب کے میں نے اپنی باقی زندگی ارچنا کے ساتھ گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

جب ہم شادی کر کے ہوٹل کو لوٹ رہے تھے۔ تو میرے دل میں ایک خیال آیا۔ میں نے ارچنا سے کہا۔ "تمہارا بھائی تو ایک ہفتے کے بعد واپس آئے گا۔"

"ہاں۔ مگر کیوں؟"

"اور وہ تمہارے زیورات کا ڈبہ۔ تمہاری بھاوج کے پاس۔"

"ہاں۔ مگر کیوں؟ کیوں پوچھتے ہو؟"

"کیا تم کسی طرح اپنے زیورات کا ڈبہ نہیں نکال سکتیں؟ آخر وہ تمہارا ہے ڈارلنگ!"

"ہاں ہے تو سہی۔" وہ سوچ سوچ کر کہنے لگی۔ "مگر کیسے نکالوں گی؟"

"کسی پارٹی میں جانے کا بہانہ کرو۔ بھاوج کو ساتھ لے آؤ۔ اور پھر اُسے جُل دے کر اور سارا زیور پہنے ہوئے سیدھی میرے پاس ہوٹل میں آجاؤ۔"

"مگر ۔۔۔!"

"نہیں۔ نہیں۔ کوئی اگر مگر نہیں۔" میں نے ذرا سختی سے کہا۔ "لاکھوں کے زیوریوں چھوڑ دیں گے ہم! پاگل ہوئی ہو؟"

میں نے گاڑی اُس کے گھر کی طرف موڑ دی۔

"میں نہیں جاؤں گی۔" وہ مجھ سے چمٹ کر بولی۔ "میں ایک لمحے کے لئے بھی تم سے الگ نہیں رہ سکتی۔" وہ تیز تیز سانسوں والی سرگوشی میں بولی۔

"ہوش میں آؤ۔ جیسا میں کہتا ہوں۔ ویسا کرو۔ پارٹی میں جانے کے لئے بھاوج زیور ضرور دے دے گی۔ جب کہ وہ تمہارے ساتھ جا رہی ہوگی اُسے شبہ تک نہ ہوگا۔ کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ بس ذرا سی چالاکی سے اپنا کام بنتا ہے۔ ہمارا کیا جاتا ہے؟"

میں نے اس کے گدگدی کی۔ وہ بچوں کی طرح کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ میں نے اُسے اُس کے گھر سے ذرا دور فاصلے پر اتار دیا۔

تین دن تک وہ نہیں آئی۔ مگر مجھے برابر ٹیلیفون کرتی رہی۔ موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ بھاوج کسی طرح راضی نہ ہوتی تھی۔ میرا خیال ہے، میں نے اُسے ٹیلیفون پر نصاحت لہجے میں ڈانٹا ہوگا۔ کیونکہ وہ ٹیلی فون ہی پر رونے لگی تھی۔ چوتھے دن اُس نے ٹیلیفون پر مژدہ سنایا۔ کہ آج دوپہر کو وہ اپنی بھاوج کے ساتھ ایک سہیلی کے گھر پر اپنے سارے زیور پہن کر جا رہی ہے۔ اور وہاں سے تیسرے پہر کے قریب میرے کمرے میں آجائے گی۔

میں نے اسی وقت تیسرے پہر کے بعد دارجلنگ جانے کے لئے دو سیٹیں بک کرالیں اور ہوٹل والے کو بل تیار کرنے کے لئے کہہ دیا۔

تیسرے پہر کو وہ سارے زیورات پہنے ہوئے ایک دلہن کی طرح سجی سنوری، میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ میں اُسے گلے سے لگا لینے کے لئے آگے بڑھا۔ کہ ٹھٹھک کر کھڑا ہوگیا۔ اُس کے پیچھے پیچھے اس کا بھائی بھی داخل ہو رہا تھا۔

"اپنے بھائی کو ساتھ کیوں لائیں؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔ "کیا صلح ہوگئی؟"

وہ مجوب نگاہوں سے اپنے بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "ہاں صلح ہوگئی ہے!" پھر میری طرف دیکھ کر بڑی معصومیت سے بولی۔ "یہ میرے بھائی نہیں ہیں!"

"بھائی نہیں ہیں؟" میں نے چیخ کر پوچھا۔

"میں ارچنا کا شوہر ہوں!" وہ سانولا نوجوان بڑے میٹھے لہجے میں بولا۔

میں حیرت سے اُن دونوں کو تکے جاتا تھا۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ "یہ کیا فراڈ ہے؟"

"فراڈ تو آپ نے مجھ سے کیا ہے۔" ارچنا اپنی ساڑی کے پلّو سے کھیلتے ہوئے بولی۔ "پہلی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی مجھ سے کرلی۔"

"یہ جھوٹ ہے!"

"آپ کی بیوی نیچے میری گاڑی میں بیٹھی ہے۔" ارچنا بولی۔ "میں نے اُسے تار دے کر بلوالیا تھا۔ آپ یقیناً اپنی بیوی سے ملنا چاہتے ہوں گے۔"

"میرے پچیس ہزار روپے؟" میں نے چیخ کر سوال کیا۔

وہ زور سے ہنسی ۔۔۔ اُس کی ہنسی سُن کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

"میں تم دونوں کو اندر کرا دوں گا۔ اور اُس بے ایمان سالسٹر کو بھی!" میں نے غصّے سے لرزتے ہوئے کہا۔

وہ سانولا نوجوان بولا۔ "اگر آپ اس سالسٹر کے دفتر جائیں گے تو وہ سالسٹر آپ کو نہیں ملے گا۔ بلکہ اس کا دفتر بھی آپ کو وہاں نہیں ملیگا۔"

"اور جہاں تک ہمیں جیل میں ڈالنے کا تعلق ہے۔ میرا خیال ہے اس کا فیصلہ آپ کی بیوی کے ساتھ ہو جائے تو اچھا ہے۔" ارچنا نے جواب دیا۔

"گیٹ آؤٹ!" میں نے غم اور غصے سے دھاڑتے ہوئے کہا۔

"پہلے وہ میرا کنگن واپس کر دیجئے" ارچنا بولی۔ "ہم نے ایک ماہ کے لئے ایک جوہری سے ادھار لیا تھا۔ احتیاطاً ہم اس جوہری کو بھی اپنے ساتھ لیتے آئے ہیں، نیچے لاؤنج میں بیٹھا ہے۔ آپ نہ دیں گے تو بڑا فساد ہوگا۔ آپ کی بیوی سے"

"گیٹ آؤٹ۔ گیٹ آؤٹ!" میں نے جلدی سے وہ کنگن بھی ارچنا کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

ارچنا مسکرا کر وہ کنگن اپنی کلائی میں پہننے لگی۔

"مگر میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟" میں نے غصے سے تقریباً نڈھال ہو کر کہا۔ "تم نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا ارچنا؟"

"بات یہ ہے کہ" وہ کنگن پہن کر اُسے بجاتے ہوئے بولی۔ "اپنا بھی وہی دھندا ہے جو آپ کا ہے"

میں حیرت سے اس بیس برس کی اس چھوکری کی طرف پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"اچھا میں جاتی ہوں" وہ کنگن بجاتے بجاتے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ "آپ کی بیوی کو آپ کے پاس بھیج دیتی ہوں۔ بڑی پیاری عورت پائی ہے تم نے — مگر میں نے اُسے کچھ بتایا نہیں ہے۔ بے چاری کا دل برا ہوتا۔" چلتے چلتے وہ میری طرف دیکھ کر رُکی۔ اور ہاتھ ہلا کر بے حد شیریں لہجے میں بولی۔ "اچھا میں چلتی ہوں۔ گوڈ بائی اور گوڈ لک! — کل کرسمس ہے!"

کنگن بجاتے بجاتے وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ چاندی کا وہ کمربند ابھی تک اُس کی نازک کمر سے جھول رہا تھا۔

علی عباس حسینی

ہنستے ہی گھر بستے ہیں

سمن حد درجہ پریشان تھی۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے، کیا نہ کرے۔ دو طرح کی محبتوں میں کشمکش تھی۔ ایک جانب جان سے پیارا ہندر تھا، دوسری طرف اس پر جان چھڑکنے والی بوڑھی ماں اور باپ کی نشانی چھوٹا بھائی راجو۔ کس کو چھوڑے کس کا ساتھ دے۔ وہ جانتی تھی وہ کوئی خوبصورتوں میں نہیں۔ نہ اُس کے گال چاند سورج، نہ اُس کی آنکھیں چشم آہو۔ نہ اُس کے ہونٹ گلاب کی پنکھڑیاں، نہ اُس کی گردن ہنس کی سی، نہ اُس کا قد سرو شاداب جیسا، اور نہ اُس کے پاؤں کھلتے کنول کی مانند۔ بس وہ ایک گندمی رنگ کی، اوسط قد والی تندرست جوان لڑکی تھی۔ اس شکل و صورت کی ہندو عورت کے لئے اپنے ذات والوں میں صرف ایک ہی صورت میں بر مل سکتا ہے اور وہ یہی کہ باپ یا بڑا بھائی دولہا کے قدموں پر اشرفیوں کا ڈھیر لگا دے۔ لیکن سمن کے معاملے میں تو اشرفیاں خواب میں بھی نظر نہ آئی تھیں۔ اپنے باپ کی زندگی ہی میں وہ جوان ہو چکی تھی۔ ہائی اسکول پاس کر کے اس نے انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لے لیا تھا۔ ماں نے کئی بار اس کے ہاتھ پیلا کرنے کا شوہر سے ذکر چھیڑا۔ مگر ڈیڑھ سو پانے والے اسکول ماسٹر نے یہ کہہ کر بات ٹال دی تھی۔ کہ اُسے تعلیم حاصل کر لینے دو۔ پھر دیکھا جائے گا۔ اسے امید تھی۔ کہ سمن اعلیٰ تعلیم حاصل کر لے تو شاید کوئی پڑھا لکھا الو کا اتنا سمجھدار نکل ہی آئے جو علم کو زر و جواہر پر ترجیح دے۔ جو حسن سیرت کو حسن صورت سے زیادہ قابل قدر سمجھے۔ مگر باپ کو خواب کی تعبیر نہ مل سکی۔ وہ اسکول جاتے ہوئے ایک دن ایک ٹرک سے کچل کر مر گیا۔ سمن پر مصیبتوں کا پہاڑ گر پڑا۔ اسے کالج سے نام کٹوانا اور دمے کی مریض ماں اور چھوٹے راجو کا بوجھ اپنے نازک کندھوں پر اٹھانا پڑا۔ لیکن یہ بوجھ اٹھانے کے لئے نہ تندرستی کافی ہوتی ہے نہ جوانی، اس طرح کا ستون بننے کے لئے روپیوں کی سیمنٹ درکار ہے۔ وہ بغیر کسی طرح کی مزدوری اور چاکری کے ممکن نہیں۔ مزدوری کرنا اُس کے بس کی بات نہ تھی۔ نوکری ملنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ایسے زمانے میں جب سیکڑوں بی اے۔ ایم اے مارے مارے پھرتے ہیں ایک ہائی اسکول پاس، سترہ برس کی بے یار و مددگار، لڑکی کو کون سی جگہ مل جاتی۔ مگر اس کے باپ کا مقدمہ جس مجسٹریٹ کے سامنے پیش تھا۔ اُس کے دل میں خدا نے نیکی ڈال دی۔ اُس کی سفارش پر سمن کو باپ کے مرنے کے دو ہی مہینے بعد بس کنڈکٹری مل گئی۔ ڈوبتے خاندان کو تنکے کا سہارا ہو گیا۔

مگر ڈوبتے ہوئے دل کا سہارا کہاں تھا؟ سمن خوبصورت اور حسین نہ سہی جوان تو تھی۔ اور جوانی خود ہی سب سے بڑا حسن ہے۔ بس کے مسافر طرح طرح کے لوگ ہوتے تھے۔ بوڑھے بھی جوان بھی، نیک بھی شریر بھی، با اخلاق بھی، بد تہذیب بھی، انسان بھی، جانور بھی، کوئی اُسے

بیٹی کہہ کر بزرگانہ شفقت ظاہر کرتا، کوئی اسے بہن جی کہہ کر نرم لب و لہجہ میں گفتگو کرتا، بعض ایسے بھی ہوتے جو اُسے دیکھتے ہی سیٹی بجاتے، سب کی آنکھ بچا کر آنکھ ملتے اور بس پر چڑھتے یا اس سے اترتے میں شانے سے شانہ ضرور لڑاتے۔ خیر۔ بس تو بس ہی تھی۔ اس پر سوار ہونے والے سب ہی مسافر تھوڑی دیر کا ساتھ، راہ چلتوں کی ملاقات، ان کی چھچھوری حرکتیں تو انگیز ہو جاتیں، مگر دفتر والے، ہیڈ ڈرائیور، انسپکٹر اور وہ جو اس کی ملازمت سے وابستہ تھے۔ یا جن کے ہاتھوں میں اس کی مستقلی یا ترقی تھی۔ ان میں سے کچھ چڑچڑے تھے۔ کچھ من چلے تھے۔ کچھ خود میں تھے۔ کچھ نفس پرست تھے اور کچھ رشوت خور۔ ہر طرح کی رشوت کا مطالبہ تھا۔ روپیوں کا، چیزوں کا، جسم کا، ان سب سے سمن کا نپٹنا مشکل ہی تھا۔ اُسے قدم قدم پہ کمزوری محسوس ہونے لگی۔ پاؤں کانپنے لگے۔ سہارا بننے کے لئے جس پامردی اور استقلال کی ضرورت ہے وہ کافور ہونے لگا۔ مارے پھر بخت نے یاوری کی، بہتے سہارے کو تنکا نا مل گیا۔ اس کا نام تھا مہندر۔ وہ اسی بس کا ڈرائیور تھا جس کی وہ کنڈکٹر تھی۔ اس کی شکل و صورت بھی کسی اُردو ناول کے ہیرو جیسی نہ تھی۔ پانچ فٹ دس انچ قد، سانولی رنگت، جواب دھوپ اور محنت سے سیاہی مائل ہوتی جاتی تھی۔ بھوری آنکھیں، چوڑے کلّے کی ہڈیاں ابھری ہوئی۔ پھیلی ناک، بڑا دہانہ، موٹے ہونٹ، نوکیلی ٹھوڑی، بھری بھری گردن چوڑا سینہ، مضبوط بازو، ایک جفاکش محنتی مزدور جیسے ہاتھ پاؤں، اس کی سب سے بڑی خوبصورتی اس کی ہنسی تھی۔ اس ہنسی میں اتنی خود اعتمادی تھی۔ اتنا مشکلوں کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ تھا۔ اتنی انسانی ہمدردی تھی۔ کہ دوست دشمن سب ہی اس کی ہنسی میں شریک ہو جاتے اور اپنا غم و غصہ بھول جاتے۔ کوئی نہ جانتا تھا کہ وہ کس قوم و قبیلے کا ہے۔ اس کی نجی زندگی کیا ہے۔ کہاں رہتا ہے۔ کیا کھاتا پیتا ہے۔ لیکن ہر ایک کو اس پر اس قدر اعتماد تھا۔ کہ سارے ڈرائیور، کنڈکٹر، بلکہ انسپکٹر اور بعض بڑے افسر تک اسے اپنے خفیہ رازوں میں شریک کر لیتے تھے وہ سب کی باتیں خاموشی سے سن کر ہنس دیتا۔ اور کہتا۔ "واہ! یہ بھی کوئی پریشانی کی بات ہے! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ گھبرائیے نہیں!" اور اس کی ہنسی دوسروں میں بھی خود اعتمادی پیدا کر دیتی۔ اسی مہندر کی پیدا کی ہوئی خود اعتمادی نے سمن کو اس قابل بنا دیا تھا۔ کہ وہ مسافروں کے جھمیلے جھیل گئی تھی۔ دفتر والوں کے نخرے ڈٹ کے سہہ گئی تھی۔ اور دل پھینک ساتھیوں کی فقرے بازیاں اور بے موقع چھیڑ چھاڑ مسکرا مسکرا کر برداشت کر گئی تھی۔

مہندر کی اسی ہنسی نے اور اس کی بر وقت ہمدردیوں نے جس طرح سمن کو خود اعتمادی دی تھی اسی طرح دل کے مندر میں مہندر کو ایک دیوتا بھی بنا کر بٹھا دیا۔ مگر یہ دیوتا نہ تو غیر مرئی تھا۔ کہ جسے وہ روز نہ دیکھتی ہو۔ نہ پتھر، لکڑی یا مٹی کا بنا ہوا تھا۔ جس میں نہ نرمی ہو نہ گرمی بلکہ ایک جوان تھا دوسری جنس کا۔ اسی کی طرح کا گوشت پوست والا انسان۔ اسی لئے یہ دیوتا محبوب بھی بنا، معشوق بھی، اور تحت الشعور کی تہوں میں چھپا ہوا پتی بھی۔

مگر عورت ذات، سب کچھ دل میں چھپائے رہی۔ حیا کی دیوی تھی اپنے جذبات کیسے ظاہر ہونے دیتی؟ نہ جانے مہندر کے کیا خیالات تھے وہ بھی اُسے پسند کرتا تھا یا نہیں؟ اس کی مروت، اس کی ہمدردی تو عام تھی۔ وہ اپنی ہنسی تو ہر طرف بکھیرتا پھرتا تھا۔ اس نے تو اشاروں کنایوں میں بھی کبھی کسی خصوصیت کا اظہار نہیں کیا۔ پھر یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ شادی شدہ تھا یا بن بیاہا۔ اچھے چال چلن کا ایسا سجیلا جوان کاہے کو اب تک بن بیاہا بیٹھا رہا ہوگا۔

بیوی بھی ہوگی، بچے بھی ہوں گے۔ غرض وہ دل ہی دل میں سوچتی۔ اور جی مارے، خاموش پرستش ہی پہ رضامند رہی۔ لیکن مہندر نے پچھلی شام کو ایک بات کہہ کر دل میں طوفان اٹھا دیا تھا۔

وہ ہمیشہ کی طرح اس کو گھر تک پہنچانے کے لئے ساتھ ہو لیا تھا۔ مگر گھر والی گلی کے موڑ پر دفعتاً رک کر اس نے کہا: "میں آج ماتا جی سے ملنے نہ جاؤں گا۔ ایک ضروری کام ہے۔" لیکن جب سمن "اچھا تو رام رام!" کہہ کر آگے بڑھی تو وہ اُسے روک کر اپنی مخصوص ہنسی کے ساتھ بولا۔ "تم سے

ایک مزہ مشابہت بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ جس طرح ہم ایک ساتھ روز سرکاری بس چلاتے ہیں، اسی طرح ہم زندگی کی گاڑی بھی ساتھ ساتھ چلائیں تو کتنا اچھا ہو! وہ شرم سے پسینے پسینے ہو گئی۔ اُس نے گردن میں پڑے ہوئے ساڑی کے پلو کو سر پر گھونگھٹ نما ڈال لیا۔ مہندر ہنسا۔ "تم ہاں کہو تو میں سب انتظام کر ڈالوں؟"

سمن نے نیچی نظریں کئے کئے کہا، "میں کیا جانوں؟ ماتا جی سے پوچھئے!" — "ارے ان کو تو میں چٹکی بجاتے بجاتے راضی کر لوں گا۔ تم اپنی کہو۔" اُس نے چٹکی بجا کر ہنس کر کہا۔

وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ اُس نے مہندر کو ایک ہتھیار ڈالے ہوئے مفتوح کی نظر سے دیکھا اور تیز بھاگ کر اپنے گھر میں گھس گئی۔ مہندر اس کے اس طرح بھاگ جانے پر پھر ایک بار ہنسا تھا۔ اور وہ ہنسی سمن کے جسم و جان میں اُس وقت تک قند گھولتی رہی تھی۔ جب تک اُس نے یہ نہ سوچا کہ مہندر سے شادی میں کیا دقتیں ہیں۔ وہ اس کی ذات، اس کے خاندان سے واقف نہ تھی۔ اور ماں کو سب سے زیادہ اسی کا خیال تھا۔ وہ مر جائے گی، مگر کسی دوسری ذات والے سے شادی کی اجازت نہ دے گی۔ خود سمن کو بس کی نوکری نے اونچ نیچ ذاتوں کے فرق سے بالاتر کر دیا تھا وہ روزانہ مسافروں کے ریل پیل میں اونچی ذات والوں کو نیچی حرکتیں اور نیچی ذات والوں کو اونچے افعال کرتے دیکھتی تھی۔ وہ جانتی تھی۔ سیرت ذات سے نہیں بنتی، کردار سے بنتی ہے اور اس کی نظر میں مہندر کا کردار فرشتوں جیسا تھا۔ اُس کا دل کہتا تھا مہندر کسی ایسی ویسی ذات کا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کے ہاتھ پاؤں، اس کی خود اعتمادی، اس کی نڈری، اس کا کسی سے مرعوب نہ ہونا۔ اس کا بے جھجک اونچی ذات والوں سے ملنا جلنا، یہ ساری باتیں اُسے یقین دلاتی تھیں کہ وہ کسی چھوٹی ذات کا فرد نہیں وہ شادی میں پڑنے والی اس گتھی کو سلجھا کر ذرا مطمئن ہوئی۔ لیکن ذات پات کے ہیر پھیر سے نکلی ہی تھی۔ کہ وہ خاندان کنبے والوں کی بھول بھلیاں میں جا پھنسی۔ نہ جانے مہندر کے ماں باپ بھائی بہن، خاندان، کنبے والے بھی اُس کی جیسی غریب لڑکی سے رشتہ کرنا پسند کریں گے یا نہیں۔ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں پورے پورے خاندان ایک کمانے والے کے سر کھاتے اور پلتے ہیں۔ خاندان، بیوی اور معشوقہ سے بھی زیادہ اہم ہوتا ہے پرورش پانے والے افراد چاہتے ہیں کہ اُس کی بیوی جب آئے۔ تو اپنے ساتھ بہت سا جہیز لے کر آئے۔ سونے چاندی سے گھر بھر دے۔ اور یہاں سمن کے پاس کیا تھا۔ اسکول ماسٹر باپ کے زمانے ہی میں تنخواہ کھانے کپڑے ہی کو مشکل سے اُٹھتی تھی۔ وہ بچا کر رکھتے کیا؟ سو پچاس، جو ماں نے پیٹ کاٹ کاٹ کر بچا رکھے تھے وہ ان کے جسم کے ساتھ شمشان نے کھائے۔ بس کنڈکٹری میں اُسے مشکل سے پچاسی ملتے تھے۔ اتنے میں تینوں جانوں کا کھانا، کپڑا اور راجو کی تعلیم — کتنی مہنگی ہوتی جاتی تھی۔ روز بروز اس ملک میں تعلیم۔ ہر سال بدلنے والی نئی نئی ڈھیروں کتابیں، کاپیاں، پنسلیں، فاؤنٹین پین طرح طرح کی فیسیں، چندے اور سب سے بڑھ کر یونی فارم۔ چاہے تن ڈھانکنے کو کپڑا نصیب نہ ہو، لیکن اگر اسکول میں پڑھنا ہے۔ تو تین جوڑے یونیفارم والے ضرور بنواؤ۔ پچاسی روپے کی تنخواہ میں یہ سب اُٹھائے نہیں اُٹھتا۔ وہ بچائے کہاں سے پیسہ؟ خیر، مہندر یہ سب جانتا تھا۔ اس پر بھی اُس نے یہ تجویز پیش کی تھی۔ اس خیال نے ڈھارس بندھائی۔ مگر ایک قدم آگے ہی وہ دلدل تھی جس سے نکلنا محال تھا۔ لڑکی کے لئے شادی کے معنی ہوتے ہیں اپنا گھر چھوڑ کے دوسرے کے گھر جانا۔ سمن اگر یہاں سے چلی جائے گی۔ تو ماتا جی اور راجو کا کیا حشر ہوگا؟ اس کے کمزور اور نازک سہارے کے علاوہ ان کا اور کیا سہارا ہے؟ — مانا کہ سر ڈھانکنے کو اپنا گھر ہے۔ مگر تن ڈھانکنے اور پیٹ پالنے کا تو اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں۔ وہ مہندر کی بن کر اس کے ساتھ چلی جائے گی۔ تو ماں اور چھوٹا راجو کیا کھائیں گے؟ کیا پہنیں گے؟ — بس لاکھ بہنے کی کوشش کی دُ اس دلدل میں گڑتی ہی، دھنستی ہی چلی گئی۔ اس کے لئے سہاگ نہیں، تیاگ ہی تیاگ تھا۔ لیکن جب جسم کی پکار سے دماغ و دل گونج رہے ہوں جب مہندر کی شیریں ہنسی سے کان بج رہے ہوں تو تیاگ کوئی آسان چیز نہیں۔ دم گھٹنے لگا۔ حلق میں کانٹے پڑ گئے۔ اُٹھ کر صراحی سے پانی انڈیل کر پیا۔ صرف ماں کے کمرے میں تھی۔ وہ بیٹی فریں لگا رہی تھی۔ اُس کی دمے کی دھونکنی چل رہی تھی۔ اُس نے گھٹنے سے سر اٹھا کر پوچھا۔ "کیا ہے سمن؟"

کیا نیند نہیں آئی ؟" وہ بولی۔ "نہیں، پیاس لگی تھی۔" اُس نے پھر گھٹنے پر سر رکھا اور یہ کمرے سے نکل کر صحن میں آ گئی۔

اکتوبر کا مہینہ تھا۔ جاڑے شروع ہو گئے تھے۔ صحن کی ٹھنڈک اس کے گرم جسم کو بھلی معلوم ہوئی۔ دالان سے ایک کرسی اٹھا کر وہیں بیٹھ گئی اور آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔ اندھیری رات تھی۔ آسمان پر تارے خوب چھٹکے ہوئے تھے۔ سوچنے لگی۔ وہ ہماری زمین سے کتنی دور ہیں۔ پھر بھی ایک دوسرے کی کشش پر قائم ہیں۔ اگر ان میں سے کسی کی کشش کم ہو جائے۔ اور کسی کی زیادہ تو پھر کیا ہو ؟ ایک دوسرے سے ملیں گے اور اس گرمجوشی سے ملیں گے کہ پاش پاش ہو جائیں گے۔ معاً خیال آیا۔ اسی طرح وہ بھی تو دو کششوں کے درمیان ہے۔ ماں اور راجو کی کشش، اور ہنستے ہوئے مہندر کی کشش، وہ کسی ایک کی ہو کر رہ جائے گی، تو ان کا ٹکڑے ٹکڑے ہونا یقینی ہے ویسے ہی ایک ستارہ ٹوٹا، اور دور تک ایک چمکتی سڑک دکھاتا، نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اُس نے ایک جھرجھری سی لی۔ دو موٹے موٹے آنسو پلکوں سے نکل کر گال پر بہہ آئے۔ اُس نے انگلی سے انہیں پونچھ کر آنگن کی مٹی پر پھینک دیا۔ بڑے عزم سے اُٹھ کر کرسی دالان میں رکھی اور اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر سو رہی۔

حسب معمول جب صبح سویرے اُٹھ کر ماں کے لئے دودھ گرم کرنے اور اپنے اور راجو کے لئے چائے بنانے کی غرض سے اسٹو جلایا، تو یاد آ گیا۔ آج ڈیوٹی سات بجے کی جگہ دو بجے سے ہے کام کی تیزی میں ذرا سستی پیدا ہو گئی۔ اور سستی پیدا ہوتے ہی مہندر کا وہی سوال یاد آ گیا۔ جس نے رات کی نیند حرام کر دی تھی۔ وہ الجھنے لگی۔ ماں دودھ پی کر چولہے کی طرف چلی تو اُس نے روک دیا۔ "تم بیٹھو ماتا جی، میں کھانا پکاؤں گی۔" اور رسوئی گھر یا جا کر کاموں پر پل پڑی۔ نو بجے کے بعد جب راجو کھا پی کر اسکول جانے لگا۔ تو ماں نے پکار کر کہا۔ "سمن اسے میری دوا کے دام دے دو وہ واپسی میں خریدتا لائے گا۔" اُس نے اپنے کمرے میں آ کر پرس سے روپیہ نکالا اور ماں کو دینے کے لئے اس کی طرف بڑھی۔ ویسے ہی راجو نے لپک کر کہا۔ "دیدی، دو کاپیوں کے دام بھی دے دینا، آج ماسٹر جی نے منگائی ہیں۔" اُس نے ایک اٹھنی نکال کر چھوٹے بھائی کے ہاتھ پر رکھ دی۔ اور جب راجو دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔ تو وہ آپ ہی آپ بڑبڑائی۔ "تم جو کچھ چاہے کہو مہندر، میں 'ہاں' نہیں کر سکتی !۔ میں 'ہاں' نہیں کہہ سکتی" اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر سسکنے لگی۔

وہ یونہی اتھاہ مایوسی کے سمندر میں ڈوبی سسک رہی تھی۔ کہ دروازے پر کسی موٹر کے آنے اور رکنے کی آواز سنائی دی۔ اور راجو ہانپتا ہوا آ کر چیخا۔ "دیدی ! دیدی ! مہندر بھیا موٹر پر آئے ہیں۔ اپنے ساتھ سوٹ کیس اور ہولڈال بھی لائے ہیں۔ اور ایک بڑے سے ٹوکرے میں مٹھائی اور موٹے موٹے ہار بھی لائے ہیں اور ایک پنڈت جی بھی اُن کے ساتھ ساتھ آئے ہیں۔" وہ سب کچھ ایک سانس میں کہہ گیا۔ سمن گھبرا کر ماں کے ساتھ اس معمے کو سمجھنے آنگن میں نکلی ہی تھی۔ کہ مہندر ایک بغل میں سوٹ کیس، دوسرے میں ہولڈال دبائے اور دونوں ہاتھوں میں مٹھائی کی ٹوکری اور ہار لئے آ پہنچا۔ اور اس کے پیچھے ایک تلک دھاری پنڈت جی ایک پوتھی ہاتھ میں لئے داخل ہوئے۔

سمن کی ماں نے تعجب سے مہندر کو دیکھا۔ وہ اپنی خاص دلکشی سے ہنسا۔ ماں نے پوچھا۔ "کیا بات ہے مہندر ؟ یہ کس کا سامان لے کر آئے ہو ؟"

وہ ہنس کر بولا۔ "یہ سامان میرا ہی ہے ماتا جی۔ میں نے کل سمن سے کہا تھا۔ "بس میں تو ساتھ رہتا ہی ہے اب گھر پر بھی ساتھ رہے تو کیسا ہو ؟" وہ بولی۔ "میں کیا جانوں، ماتا جی سے پوچھو۔"

میں جانتا ہی تھا۔ آپ کو ایک جوان بیٹے کی سخت ضرورت ہے آپ بھی ٹھاکر، میں بھی ٹھاکر، میرے نہ پتا نہ ماتا، نہ بھائی نہ بہن۔ اب جو کچھ ہیں آپ ہی لوگ ہیں۔ بھلا آپ اپنے چرنوں میں جگہ نہ دیں گی۔ تو کون دے گا؟" اور پھر ہنسا، وہی دلکش ہنسی جو دلوں کو موہ لیتی تھی۔ ماتا جی نے گھبرا کر کہنا چاہا۔ "مگر..... مگر.....!"

وہ بولا۔ "آپ یہی تو کہنا چاہتی ہیں۔ کہ بیاہ کی کوئی تیاری نہیں۔ دن تاریخ ساعت گھڑی نہیں دیکھی گئی۔ تو اس کے لئے صبح سویرے ہی

لا پنڈت جی کے پاس گیا تھا۔ انھوں نے سب کچھ وچار کرکے بتایا کہ آج کے دن دس بجے سے پہلے کی گھڑی میری اور سمن کی کنڈلی میں اس کام کے لئے سب سے شبھ گھڑی ہے۔ اس لئے میں نے اپنے اسباب کے ساتھ ان کو بھی لادا، اور جو کچھ انھوں نے ایسے کاموں کے لئے مال مسالا بتایا وہ بھی لیا اور بھاگا ہوا، آپ سے سمن کی بھیک مانگنے چلا آگیا۔"

اور قبل اس کے کہ وہ کچھ اور کہہ سکیں اُس نے مٹھائی کا ٹوکرا میز پہ رکھا، اٹیچی اور ہولڈال دھم دھم زمین پر گرائے۔ اور ماتا جی کے پاؤں پکڑ کر کہا "جیون کی بس پر سوار ہونے کے لئے دیر تک سوچنے کا موقع نہیں ملتا ماتا جی۔ آپ جلدی سے ہاں کہہ دیں تو میں بھی اس گھر کی گاڑی میں لٹک چلوں۔"

وہ بے چاری گھبرا کر زمین پہ اکڑوں بیٹھ گئیں وہ ہنسا۔ اُس نے جلدی جلدی ہولڈال کھولا۔ بالکل نیا مخملی قالین اور ایک لال ہٹو کا شال چادر نکالی۔ ماتا جی کو اس کی ایک طرف بٹھایا۔ سمن کو جو بت بنی یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ شال چادر اڑھا کر بیچ میں بٹھا دیا۔ اور خود بھی اس پہ بیٹھ کر کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ پھر مصنوعی گھبراہٹ سے بولا۔ "ارے دس بجنے میں پندرہ ہی منٹ رہ گئے ہیں، پنڈت جی، جلدی کیجئے جلدی! شبھ گھڑی نکلی جاتی ہے۔"

پنڈت جی بغل میں دبی پوتھی کھول کر منتر پڑھنا شروع کرنے والے ہی تھے۔ کہ ماتا جی نے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ جلدی جلدی رسوئی گھر سے ایک پیالی میں گھی اور ایک توے میں بہت سی آگ لا کر پنڈت جی کے سامنے رکھ دی۔ پھر آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے سمن سے بولیں۔

"اس کے گلے میں ہار ڈال دے بیٹی۔"

مہندر نے گردن جھکا کر کانپتے ہاتھوں سے اپنے گلے میں ہار ڈلوایا اور خود ہنستے ہوئے سمن کے گلے میں ہار ڈال دیا۔ پنڈت جی نے اس کے کرتے اور سمن پر پڑی ہوئی چادر کے کونے پکڑ کر ایک گرہ دے دی اور آگ پر گھی ڈال ڈال کر منتر پڑھنا شروع کر دیا۔

جب پنڈت جی بہت سی مٹھائی اور روپے لے کر جا چکے تو مہندر بولا۔ "ارے راجو تو کھڑا کیا دیکھتا ہے؟ جوان آدمی اور یہ سستی! بس یہ سوٹ کیس اور یہ ہولڈال اپنی دیدی کے کمرے میں ڈال آ۔ اب آج سے ہم بھی تو ماتا جی کے داس بن کر اسی گھر میں رہیں گے۔" اور اس طرح ہنسا کہ راجو ہی کے دانت نکل آئے۔ بلکہ سمن بھی مسکراتی اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔ اور ماتا جی کے سوکھے چہرے پر بھی مسرت ہی نہیں زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

سہیل عظیم آبادی

سیپ کراچی

بدصورت لڑکی

"ڈیڈی پرنام"

موہنا نے اچانک کمرے میں آکر سلام کیا۔ چندرا چونک پڑی۔ "ارے موہنا" کہتی ہوئی پلنگ سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور میرا "پپو" کہہ کر ہاتھ پھیلائے اس کے بچّے کی طرف بڑھی۔ پپّو ڈر کر چیخ اٹھا۔ اس کی ماں تیزی سے کمرے میں آئی۔ اور پپّو کو موہنا کی گود سے لے کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ جب پپّو اور زیادہ چیخنے لگا تو موہنا بھی ماں کی پکار پر باہر چلی گئی اور بچے کو چپ کرنے لگی۔ چندرا کا سر چکرا گیا۔ اور آنکھوں کے سامنے موٹا پردا سا چھا گیا، نگاہوں سے ہر چیز اوجھل ہوگئی۔ ایک پل کے لئے اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ کہ یہ سب کیا ہوا اور وہ کہاں ہے زمین پر یا ہوا میں۔ لیکن اس کی یہ حالت زیادہ دیر تک نہیں رہی۔ وہ جلد ہی سنبھل گئی۔ اور ساری باتیں صاف صاف سمجھ میں آگئیں۔ وہ اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹی لیٹی ڈھائی تین گھنٹوں سے ایک ناول پڑھ رہی تھی۔ اس کی چھوٹی بہن اپنے بچے کو لئے اچانک آگئی تھی۔ اس نے بچے کو پیار کرنا چاہا تھا۔ مگر بچہ ڈر گیا تھا۔ اور اس کی ماں بچے کو باہر لے کر چلی گئی تھی۔ پھر موہنا بھی چلی گئی۔ اور بچے کو چپ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر بچّہ اب بھی روئے جا رہا تھا۔ کتاب تکیے کے پاس اسی طرح ادھ کھلی پڑی تھی جس طرح ذرا تھوڑی دیر پہلے اس نے رکھی تھی۔ تھوڑی ہی دیر پہلے وہ ناول میں کھوئی ہوئی تھی۔ اور ایسی جگہ پہنچی تھی۔ جہاں ناول میں الجھن اور دلچسپی دونوں ہی اپنی آخری حد تک پہنچ چکی تھی۔ چندرا چپ چاپ پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اور ناول کی کہانی اس کے دماغ میں چکر کاٹنے لگی۔

کامنی جوان تھی اور بیاہ کا پھل بھوگنے سے پہلے بیوہ ہوگئی تھی۔ ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ رواج کی پابندی اور پیار میں اس کا بیاہ اسی وقت کر دیا گیا تھا جب وہ دس سال کی تھی۔ اور اسکول میں پڑھتی تھی۔ مگر ایک سال کے اندر ہی بیوہ ہوگئی تھی جب جوان ہوئی تو بیوہ بھی اور ماں باپ کی چھاتی کا بوجھ۔ کل کی ریت کے مطابق اسے ساری زندگی بیوہ رہنا تھا۔ اسے کامنی نے سمجھا اور زندگی کا مقابلہ کرنے کی تیاری کرتی رہی۔ اسکول کے بعد کالج میں پڑھتی رہی۔ کہ زندگی میں کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے اور اس نے بی اے کر لیا۔ سوچا تو اس نے یہ تھا کہ کسی اسکول میں پڑھانے کا کام کرے گی۔ لیکن اس کے باپ پنڈت نروتم لال کو فالج ہوگیا۔ اور وہ پلنگ پر پڑ گیا۔ اور دو چار مہینے گذارنے کا بھی سہارا نہ رہا۔ پنڈت نروتم لال کے بچپن کے ساتھی اور اس کارخانے کے مالک جہاں وہ کام کرتا تھا پنڈت امر چند کو خیال ہوا۔ اور وہ نروتم لال کو سمجھا بجھا کر کامنی کو اپنے کارخانے میں لے آئے۔ اور اپنا سکریٹری بنا لیا۔ وہ چاہتے تھے کہ نروتم لال کو کوئی تکلیف نہ ہو اور کامنی ان کی نگرانی میں رہے۔ نروتم لال کے بعد یوں بھی ان کو ایک بھروسے کے آدمی کی ضرورت تھی۔ جو ہر چیز کی نگرانی رکھے۔ خاص کر کا غذات پر۔ نروتم لال کی بیماری سے وہ بالکل اکیلے پڑ گئے

تھے۔ ان کا بیٹا چار سال سے امریکہ میں تھا۔ اور ابھی اس کے آنے میں دیر تھی۔

اتول جب کام سیکھ کر واپس آیا۔ اور اپنے والد کے کارخانے کی دیکھ بھال کرنے لگا۔ تو کامنی پنڈت امرچند کی سیکریٹری بن چکی تھی۔ کارخانے کے ایک طرف دوسری منزل پر کئی کمرے تھے۔ ایک کمرے میں پنڈت امرچند بیٹھتے تھے اور اس کے بغل والے کمرے میں کامنی جس میں اس سے پہلے اس کا باپ بیٹھا کرتا تھا۔ کمرہ بھی ایسا بنا ہوا تھا۔ کہ بیچ کا دروازہ کھلنے سے ایک ہو جاتا تھا۔ اور وہ ہر وقت پنڈت جی کی نظر کے سامنے رہتی تھی۔ اور جب اتول آیا۔ تو پنڈت جی کے پاس ہی اس کے بیٹھنے کا انتظام کر دیا گیا۔ اس طرح پنڈت امرچند، اتول اور کامنی پاس پاس ہی بیٹھتے تھے۔ کامنی نے سارے کاموں کو سمجھ لیا تھا۔ اور سارے دفتر پر چھا گئی تھی۔ پنڈت امرچند اور اتول کے سوا کارخانے کے سارے لوگ اسے بہن جی کہتے تھے۔ اس لئے بھی کہ وہ پنڈت نروتم لال کی بیٹی تھی۔ اور کارخانے کے ہر آدمی کو ان کی مہربانیاں یاد تھیں۔ ایک بوڑھا لال محمد مستری تھا جو اسے کمّو جی کہتا تھا وہ بھی اس لئے کہ پنڈت نروتم لال نے اسے نوکر رکھا تھا۔ اور کامنی جب چھوٹی سی تھی تو اسے گودی میں کھلایا تھا۔

کامنی کارخانے کے لئے اور اس سے بھی زیادہ پنڈت امرچند اور اتول کے لئے ضروری بن گئی تھی۔ جس طرح وہ ہر کاغذ کو جان گئی تھی اسی طرح پنڈت امرچند اور اتول کو بھی۔ اور اسی طرح دونوں کا خیال رکھتی تھی۔ پنڈت امرچند کو اس پر بڑا بھروسہ تھا۔ ان کے لئے سگار کے پیکٹ سے لیکر ناشتے کے لئے مکھن اور جام تک وہی منگاتی تھی۔ اور انھیں جس چیز کی بھی ضرورت ہوتی تھی تو کامنی سے کہتے تھے۔

اتول کو پہلے تو یہ بات بہت کھٹکی لیکن کچھ دنوں کے بعد وہ کامنی کی ضرورت کو سمجھنے لگا۔ دفتر کے لئے بھی اور اپنے لئے بھی۔ دونوں چھ چھ، گھنٹے ساتھ رہتے تھے۔ اور کام سو بار دفتر کی باتیں کرتے تھے۔ لیکن اور کوئی بات نہ ہوتی تھی۔ کبھی کبھی کامنی نے محسوس کیا تھا۔ کہ جب وہ کوئی کاغذ لیکر اتول کے پاس گئی تھی۔ تو اتول نے اُسے ایسی نظر سے دیکھا تھا۔ جو عام نظروں سے الگ ہوتی تھی۔ اور کبھی کبھی اتول کی زبان بولتے بولتے لڑکھڑا جاتی تھی۔ اُس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ کبھی کبھی اتول اُسے خالی نظروں سے تک رہا ہے۔ اور جب دونوں کی نظر مل گئی تو گھبرا گیا ہے۔ جلدی سے نظر جھکالی ہے اور سٹپٹا گیا ہے۔ کبھی کبھی اُس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ اتول اُسے کن آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور اس نے بھی اپنے دل میں گدگدی محسوس کی تھی۔ لیکن دونوں کے بیچ میں پنڈت امرچند بیٹھتے تھے۔ جو پہاڑ کی طرح دونوں کو دو طرف رکھے ہوئے تھے۔ دونوں کے دل ایک دوسرے سے نزدیک ہوتے جا رہے تھے لیکن دونوں دور تھے۔

پنڈت امرچند دولت مند آدمی تھے۔ اور ان کے پاس پہلے بھی کئی سیکریٹری کام کر چکے تھے۔ لیکن کامنی والی بات کسی میں نہ تھی۔ وہ پنڈت امرچند اور اتول کو اس قدر جان گئی تھی کہ اُسے کچھ پوچھنے کی ضرورت بھی نہ ہوتی تھی۔ اگر وہ پنڈت جی یا اتول کو کاموں میں الجھا دیکھ لیتی اور اندازہ کر لیتی کہ کھانے کے لئے گھر جانے کا وقت نہیں ہے یا زیادہ دیر میں چھٹی ملے گی تو آدمی بھیج کر گھر سے کھانا منگوا لیتی۔ اور وقت پر کھانا کھلا دیتی۔ اگر شام کے وقت انھیں کہیں جانا ہوتا۔ اور وہ سمجھ لیتی۔ کہ گھر جانے کا وقت نہیں ملے گا۔ تو آدمی بھیج کر اُن کے لئے کپڑے منگوا لیتی۔ اور وہ صاف کپڑے بدل کر چلے جایا کرتے۔ جب تک وہ دفتر میں رہتی۔ دفتر کے کاغذات اور دونوں باپ بیٹے کے آرام کے خیال میں الجھی رہتی۔ اور اتول کی بھی عادت تھی کہ ہر کام کامنی پر چھوڑ دیتا۔ خواہ وہ ضروری خطوں کو ٹائپ کرا کے ایک نظر دیکھنے کے بعد پنڈت امرچند سے دستخط کرانے ہوں۔ یا کسی کے لئے کپڑے خریدنے ہوں اور کامنی سارے کام خوشی سے کرتی۔ ایسے کام بھی جو اس کی ذمہ داری نہیں تھی اور اس طرح وہ پنڈت امرچند اور اتول کی زندگی میں رس بس گئی تھی۔ دونوں ایک ہی بات محسوس کرتے تھے۔ اور وہ یہ کہ کامنی کو الگ نہیں کر سکتے۔ لیکن اتول اُس سے زیادہ محسوس کرنے لگا تھا۔

پنڈت امرچند دن بھر دفتر میں رہتے تھے۔ اور دونوں پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ انھوں نے کبھی کوئی ایسی بات بھی نہ دیکھی تھی۔ جو دو میں سے کسی پر کوئی شک ہوتا۔ انھوں نے دونوں کو بے ضرورت باتیں کرتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ کامنی دن بھر اپنی میز کے سامنے بیٹھی کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھا کرتی تھی۔ اور بے ضرورت کمرے سے باہر بھی نہیں نکلتی تھی۔ یا کاغذ پر سے نظر اُسی وقت ہٹاتی۔ جب کوئی اُس سے کچھ پوچھتا۔ پنڈت امرچند بہت

خوش تھے۔ ان کا سارا کام کامنی کی وجہ سے ہلکا ہو گیا تھا۔ لیکن اتول تو سمجھنے لگا تھا کہ اگر کسی وجہ سے بھی کامنی نہ رہی۔ تو پھر اس کے لئے کوئی کام کرنا بھی ناممکن ہو جائے گا۔ اتول جو کچھ چاہتا تھا۔ وہ کارخانے کے بارے میں، دفتر کے بارے میں اُسے کچھ بھی نہ معلوم تھا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ یہ کہ اتول کبھی کبھی سوچنے لگتا تھا۔ کہ کیا کامنی جیسی دوسری سمجھدار عورت اور بھی مل سکتی ہے جسے وہ اپنی جیون ساتھی بنائے۔ نیک سادہ، سمجھدار اور خوبصورت۔ کچھ نہ بولنے پر بھی کامنی نے اتول کے دل میں اپنے لئے جگہ بنالی تھی۔ اور کامنی بھی سوچا کرتی تھی۔ کہ ان دونوں باپ بیٹوں کی طرح سیدھا سادہ اور شریف کوئی اور بھی ہوگا! ۔ پنڈت امرچند تو خیر بوڑھے آدمی تھے لیکن اتول نوجوان تھا۔ اور وہ جانتی تھی۔ کہ آج کل کے جوان کیسے ہوتے ہیں، ہر روز بہت سے جوانوں کو دیکھتی تھی اور ان کی نظر کو پہچانتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے اپنے دل میں گرمی محسوس کرتے تھے۔ لیکن کامنی شرم سے کچھ نہ بولتی تھی۔ اور اتول باپ کے ڈر سے۔

ایک دن کامنی ذرا دیر کر کے آئی۔ ایک ضروری خط پر پنڈت امرچند دستخط کر چکے تھے۔ اور اتول نے بھی اُسے دیکھا تھا۔ مگر وہ خط بھیجا نہیں گیا تھا۔ کامنی آگئی تو اُس نے دیکھا اور فوراً پنڈت جی کے پاس پہنچی، انھیں سمجھایا۔ کہ اس خط کو بھیجنے سے ہزاروں کا گھاٹا ہو جائے گا۔ اور خط کو روک کر دوسرا خط بھجوایا۔ اُس دن پنڈت امرچند نے خوش ہو کر کہا تھا۔ کامنی تم نوکر نہیں، میرے بچپن کے ساتھی کی بیٹی ہو، میری بھی بیٹی ہو، میرے بعد بھی تم ساری زندگی کہیں اور کام کرنے کی بات نہ سوچنا۔ اتول تمہارا بھائی ہے۔ ساری زندگی اپنے بھائی کے ساتھ رہنا۔ اور اس کی خبر گیری کرنا۔ اتول بڑا سیدھا سادہ اور بے پرواہ ہے۔

لیکن کامنی نے ان کی بات سن کر محسوس کیا تھا کہ پنڈت امرچند نے اس کے دل پر گھونسہ مارا ہے۔ اور اس کا سر جھک گیا تھا۔ یہی بات وہ تین چار مہینے پہلے کہتے تو وہ خود کو سنبھال لیتی۔ مگر اس وقت انھوں نے کہا تھا۔ جب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ دو ڈھائی مہینے پہلے جب پنڈت جی کو بخار آگیا تھا۔ اور پندرہ دنوں تک کارخانے نہیں آئے تو بات بہت آگے بڑھ چکی تھی اور دونوں کے دلوں کے بند ٹوٹ چکے تھے۔ جس بات کو دونوں بہت دنوں تک دل کی گہرائی میں چھپا رکھا تھا۔ وہ ایک دن ایک دم اوپر آگئی تھی۔ ایک دن بہت سے ضروری خط بھیجنے تھے۔ کارخانے میں نیچے چند آدمی کام کر رہے تھے۔ اور سارے لوگ جا چکے تھے۔ بس اتول بھی خطوں پر دستخط کر کے جانے والا تھا۔ جب کامنی سارے خط لیکر اُس سے دستخط کرانے آئی تو اتول نے پاگلوں کی طرح اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اپنی محبت کا اظہار کر دیا تھا۔ اور یہ بھی بتا دیا تھا۔ کہ اس کے بیاہ کی باتیں چھڑتی ہیں۔ لیکن وہ برابر انکار کرتا جا رہا ہے۔ پہلے تو کامنی نے اُسے بہت سمجھایا۔ کہ وہ بیوہ ہے اور کل کی ریت کے مطابق اس کا دوسرا بیاہ نہیں ہو سکتا۔ اور اگر وہ کل کی ریت کو ٹھکرا کر تیار بھی ہو جائے تو نہ تو اس کا باپ تیار ہوگا۔ اور نہ پنڈت جی دونوں پرانے خیال کے آدمی ہیں۔ اور وہ دوستی سے کسی کو بھی دکھ پہونچانا نہیں چاہتی۔ کام کی وجہ سے ماننا اور بات ہے لیکن پنڈت امرچند اُسے کیسے پسند کر سکتے ہیں۔ کہ اُن کا اکلوتا بیٹا ایسی لڑکی سے بیاہ کرے جس کا باپ ان کے ہاں نوکر تھا اور وہ خود نوکر ہے اور بیوہ بھی ہے پنڈت جی کسی دولت مند گھر کی کنواری لڑکی کو اپنی بہو بنائیں گے جو اپنے ساتھ لاکھوں کا سامان لائے لیکن اتول پر اس کی کسی بات کا اثر نہیں ہوا۔ اور اس نے کامنی کا ہاتھ اُس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک اُس نے محبت کا اقرار نہ کر لیا۔ اتول نے اُس سے کہا تھا۔ کہ موقع پا کر ماں باپ سے اپنے دل کی بات کہے گا، اور انھیں رضامند کرے گا۔ اور اگر وہ نہ مانے تو بیاہ کی بات کو ٹالتا ہی جائیگا اور اُس کا انتظار کرے گا۔ جب وہ آزاد ہو جائے گا۔ اور اُس وقت اُس سے بیاہ کرے گا۔ اور اُس نے بھی سوچا تھا۔ کہ جس طرح بھی ممکن ہوگا اتول کے ساتھ زندگی گزار دے گی۔ اتول نیک اور شریف تھا۔ اور اس سے محبت کرتا تھا۔ اگر اتول جوانی کے ترنگ میں کوئی غلط فائدہ اٹھانا چاہتا تو ضرور ایسی ویسی باتیں کہتا۔ لیکن اس نے کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن سینما دیکھنے جاتا تھا۔ مگر کبھی سینما چلنے کو بھی نہیں کہتا تھا اُسے یقین تھا کہ اتول سچ مچ اس سے محبت کرتا ہے اور اس سے بیاہ کرنا چاہتا ہے اور وہ دل میں سوچا کرتی کہ وہ بالکل بے سہارا نہیں ہے لیکن جب پنڈت امرچند نے اُس سے کہا کہ اتول کو نہ چھوڑے گی اور بھائی کے ساتھ ساری زندگی گزار دے گی۔ اُس دن اس نے فیصلہ کر لیا۔ کہ وہ ساری زندگی

اتول کے ساتھ رہے گی۔ لیکن اور ساری باتیں دل سے نکال دے گی۔ وہ اپنی محبت کو قربان کردے گی اور اتول کی راہ سے ہٹ جائے گی۔ بلکہ بہت جلد ہی بیاہ، کرلینے پر آمادہ کرے گی پھر سوچے گی کہ زندگی کے باقی دن کس طرح کاٹے۔ ہوش سنبھالتے ہی وہ ایک آگ میں جل رہی تھی۔ اب دوسری آگ میں جلنے کے لئے بھی خوشی سے تیار تھی۔ اسے صرف ایک فکر تھی۔ اور وہ اتول کی۔ کوئی ایسا کام کرنا نہیں چاہتی تھی۔ جو اسے دکھ پہنچے۔ اس نے بڑی عقلمندی کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اتول کے بیاہ کی باتیں کئی جگہ سے آئیں اور وہ کسی نہ کسی بہانے سے انکار کرتا گیا۔ ماں باپ تھک گئے تھے۔ جب شہر کے بڑے کاروباری پنڈت ادنکا ناتھ کی بیٹی سمترا سے اتول کے بیاہ کی بات چلی تو پنڈت امرچند نے کامنی سے بھی مشورہ کیا۔ اس نے پسند کیا اور یہ بھی کہہ دیا۔ کہ ابھی اتول سے بات نہ کی جائے کہیں پھر وہ پہلے کی طرح کوئی بہانہ نکال کر انکار نہ کر دے۔ اور پنڈت جی سے کہا تھا۔ کہ یہ بات اس پر چھوڑ دی جائے۔ وہ اتول کے مزاج کو سمجھتی ہے اور اسے رضامند کرلے گی۔ پنڈت جی کو کامنی کی عقل پر بڑا بھروسہ تھا۔ اور انھوں نے ہر کام کامنی پر چھوڑ دیا تھا۔ اور کامنی نے طے کرلیا تھا کہ بیاہ کرا کے رہے گی اور اپنے کل کی مریادا کو بچا کر الگ ہو جائے گی۔

سمترا کا بھائی ارجن اتول کا دوست تھا۔ ہر روز شام کے وقت دونوں ساتھ سیر کرنے جایا کرتے تھے۔ کامنی نے اس سے کہا کہ کلب کے بدلے اتول کو اپنے گھر لے جایا کرے اور وہیں تاش کھیلا کرے۔ اس طرح اتول اور سمترا کو ایک دوسرے کو جاننے کا موقع مل جائے گا۔ سمترا خوبصورت بھی تھی اور پڑھی لکھی بھی۔ کامنی کو یقین تھا کہ اتول سمترا کو جان لے گا۔ تو اس سے بیاہ کی بات مان لے گا۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے دل کو دھکا سا تو ضرور لگتا مگر وہ فوراً سنبھل جاتی۔ اور سوچتی ایک چیز کو بنانے کے لئے دوسری چیز بگاڑنی ہی ہوتی ہے۔ اور اتول کی زندگی کو بنانے کے لئے اسے اپنے دل پر ایک اور زخم کھانا ہی پڑے گا۔ اب اس کی زندگی ہی کیا تھی۔ جو تھی وہ بگڑ چکی تھی۔ اور اگر وہ اسے دوبارہ بنانے کی کوشش کرے گی۔ تو کل کی مریادا بگڑ جائے گی۔ اور اگر کل کی جاتی رہی۔ تو پھر زندگی بنی کیا، بربادی بربادی رہی۔

وہ ہر روز اتول کو راجن کے ساتھ زبردستی بھیجدیتی۔ اور راجن گھما پھرا کر اپنے گھر لے جاتا۔ پھر وہاں اپنی پتنی اور سمترا کے ساتھ بیٹھ کر تاش کھیلتا۔ یا اور کوئی پروگرام بنتا تو سب کے ساتھ۔ اور ایک ڈیڑھ مہینہ کے بعد جب اس نے اتول سے پوچھا۔ کہ سمترا کیسی لڑکی ہے۔ اور وہ مسکرا کر رہ گیا تو کامنی کو بڑا اطمینان ہوا تھا۔ اس نے طے کرلیا تھا کہ اب پنڈت جی سے کہدے گی۔ کہ بات پکی کرلیں۔ مگر پھر بھی وہ کئی دنوں تک نہ کہہ سکی۔ ہر روز سوچتی اور ہر روز اس کی زبان بند رہ جاتی اپنے طور پر اس نے طے کرلیا تھا۔ کہ وہ پنڈت جی سے کہنے کے بعد ماں باپ کو لے کر بنارس چلی جائے گی۔ جہاں اُس کی دولت مند پھوپھی اس لئے رہتی تھی۔ کہ وہاں مرے اور گنگا کے کنارے جلائی جائے۔ اس نے بھی کئی بار بھائی اور بھاوج کو بلایا تھا۔ مگر کامنی راستے میں رکاوٹ تھی۔ اب کامنی تیار تھی اس نے سوچا تھا کہ اس سے اچھی زندگی اور موت کیا ہوگی؟ کہ جب تک زندہ رہے۔ صبح شام بھگوان کے درشن ہوں اور جب مرے تو گنگا کے کنارے جلائی جائے۔ اور اس کی راکھ کو گنگا کی موجیں سمیٹ لیں۔ کوئی نیک ہندو عورت اس سے اچھی زندگی اور موت اور سوچ بھی کیا سکتی ہے۔ پھر بھی یہ سوچ کر سہم جاتی۔ کہ اس طرح چلے جانے کا اثر اتول پر کیا ہوگا اور کیا سمترا بھی اسے اتول کے دل سے نکال سکے گی؟ وہ اتول کے راستے سے الگ ہونا چاہتی تھی۔ مگر خود اپنے نکلنے کا کوئی راستہ اُسے نظر نہیں آتا تھا۔ اور اس کے لئے ناممکن تھا۔ کہ ایک بار اتول سے محبت کا اقرار کرلینے کے بعد پھر اس کے لئے بہن کا جذبہ دل میں پیدا کرے اور اس کے ساتھ رہے، نہ جانے کتنی راتوں کو اتول کے ہاتھوں کو اس نے اپنے گلے میں محسوس کیا تھا۔ اور اس کی گرم سانسیں اپنے گالوں پہ۔ تھا تو یہ سب خیال لیکن وہ دل ہی دل میں اتول کو اپنے دل کا مالک مان چکی تھی۔ .... لیکن اس کا دل اور دماغ کیا سوچ رہا تھا۔ دل ایک طرف تھا اور دماغ دوسری طرف

چندر انادل پڑھتی جا رہی تھی۔ اور یہ جاننے کے لئے بے چین تھی۔ کہ آگے کیا ہوتا ہے۔ کامنی اس الجھن سے کس طرح نکلتی ہے اور اتول کیا کرتا ہے کہانی کہاں اور کس طرح ختم ہوتی ہے۔ کامنی نے پہلے بھی دو بار ایسا فیصلہ کیا تھا۔ ایک بار تو اس نے رات کو فیصلہ کیا۔ لیکن دوسرے دن خود ہی اُٹھ کر دفتر میں آگئی تھی اور ایک بار اُس نے استعفیٰ لکھ کر بھیجدیا۔ تو خود پنڈت جی جا کر لے آئے۔ اور اُس دن اتول اس سے دن بھر نہ بولا۔ اور وہ اتول سے الگ بھی نہ ہو سکی۔ بھاگنے کے سارے راستے بند تھے۔ ایک طرف اتول تھا اور دوسری طرف پنڈت جی اور اس کے ماں باپ اور کل کی مریادا۔

چندرا کو افسوس ہوا کہ موہنا ایسے وقت میں کیوں آگئی۔ اور آئی تو بچے کو لیکر کیوں آئی۔ اس کا پڑھنا بھی حرج ہوا۔ اور بچہ بھی ڈر گیا۔ اور اب تک رو رہا تھا۔ وہ گھر کے سارے لوگوں سے الگ کمرے میں لیٹی ناول پڑھتی رہتی تھی۔ اور سب نے اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ جس طرح چاہے زندگی کے دن کاٹے۔ اور ناول پڑھنے سے اُسے سہارا ملا تھا۔ اور ایک بات سمجھ میں آگئی تھی۔ کہ دکھوں کا خیال کرنا بھی بیکار ہے۔ آدمی دکھوں کی گود میں پیدا ہوتا ہے اور جب تک زندہ رہتا ہے۔ طرح طرح کے دکھ اسے گھیرے رہتے ہیں۔ زندگی نام ہی دکھوں کو جھیلنے اور ان کا مقابلہ کرنے کا اور خوشی ان پلوں اور گھڑیوں کا نام ہے جب آدمی ان دکھوں پر قابو پالیتا ہے اور دکھوں کے پنجوں سے نکل بھاگتا ہے۔ اس دنیا میں وہ اکیلی دکھی نہیں ہے۔ ہر آدمی دکھی ہے۔ کسی کو کوئی دکھ ہے اور کسی کو کوئی دکھ دکھوں سے کوئی بچا ہوا نہیں ہے۔ اور ان دکھوں میں سے خوشی کا کچھ وقت نکال لینا ہی انسان کی بڑی کامیابی ہے۔

چندرا کی زندگی دکھوں کی ندی میں تنکے کی طرح بہتی جا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں ہی نہ آتا تھا کہ کب اور کس طرح کنارے لگے گی۔ یا اسی طرح بہتے بہتے کسی دن بیچ دھارے میں ڈوب جائے گی۔ لیکن جب سے اُس نے ناول پڑھنا شروع کیا تھا تو اپنے کو بھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ ایک ہی نتیجے پر پہنچی تھی کہ اگر آدمی اپنے دکھوں کو بھول کر دوسرے کے دکھوں میں شریک ہو جائے تو اپنے دکھوں کو بھول کر خوشی حاصل کر سکتا ہے۔ اُس نے اپنے آپ کو بھولنا شروع کر دیا تھا۔ اور اپنے دکھوں میں کمی پاتی تھی۔ اُس کے دل کے اندر دوسرے آدمیوں کے لئے اتھاہ ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ اور کبھی کبھی محسوس کرنے لگی تھی۔ کہ اُسے کوئی دکھ نہیں ہے وہ دوسروں کے ساتھ ہمدردی کر سکتی ہے جو سچ مچ دکھوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ دکھ بھی انسان کے لئے ہوا اور پانی اور اناج کی طرح ضروری ہے۔ اس سے چھٹکارا ہی نہیں۔ دنیا کا سب سے دکھی آدمی وہی ہے جسے کوئی دکھ نہیں رہ جائے۔

چندرا کی زندگی عجیب تھی۔ شہر کے نامی وکیل کی سب سے بڑی بیٹی تھی۔ تین اور چھوٹی بہنیں تھیں۔ بچپن ہی سے بدصورت تھی۔ جب تک چھوٹی تھی کوئی نہ کوئی بیماری دبوچے رہتی تھی۔ کالی تو تھی ہی۔ ایک بار چیچک نکل آئی۔ تو رہی سہی کمی بھی پوری ہو گئی۔ سارے بدن پر بڑے بڑے داغ پڑ گئے۔ ناک کچھ بیٹھ گئی۔ آنکھیں کمزور ہو گئیں۔ ماں باپ پر فکر کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اس لڑکی کا کیا ہوگا۔ تینوں بہنیں صورت شکل کی اچھی تھیں، مگر یہ سب کی راہ کا پتھر بن گئی تھی۔ پڑھنے لکھنے میں تو بہت اچھی تھی مگر پڑھنا لکھنا تو سب کچھ نہیں، اور وہ بھی لڑکی کے لئے۔ جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی، ماں باپ کے دل کا بوجھ بھی بڑھتا گیا۔ اور ایک دن ایسا آیا کہ خود کو اس بوجھ کے نیچے دبی ہوئی محسوس کرنے لگی۔ ماں باپ اور رشتہ داروں نے کوشش کی۔ کہ یہ بوجھ اٹھا کر کسی اور کندھے پر ڈال دیں۔ مگر ساری کوششیں بیکار گئیں۔ اس بوجھ کو اٹھانے کے لئے کوئی بھی کندھا بڑھانے کے لئے تیار نہ ہوا۔ بلکہ جس کی طرف لوگ بڑھتے۔ وہ ہٹ جاتا۔ مجبور ہو کر ماں باپ نے دوسری بیٹی للتا کا بیاہ کر دیا آخر ایک کے لئے دوسری کو کب تک بٹھائے رہتے۔ پھر دو سال بعد تیسری بیٹی اُما کا بھی بیاہ ہو گیا۔ اور ایک سال بعد سب سے چھوٹی موہنا کا بھی۔ لیکن وہ سب سے بڑی تھی۔ جو بیٹھی رہ گئی۔ چندرا کو کوئی بر نہیں ملا۔ اور چندرا پر جوانی آئی تو ساون بھادوں کے بادل کی طرح بس ٹوٹ کر برس جانے کو بے چین۔ نہ جانے بچپن کی، ساری بیماریاں اب کہاں چلی گئی تھیں۔ اس کا سانولا بدن تازہ منڈھے ہوئے ڈھول کی طرح تنا ہوا تھا۔ ذرا سی چوٹ لگے اور ٹن ٹن بول اُٹھے۔ جب وہ بلاؤز پہنتی، تو کہنیوں سے اوپر پھنس جاتا۔ اور آستین میں پھنس کر بازوؤں کی مچھلیاں تڑپنے لگتیں۔ اور وہ عجیب سی بے چینی محسوس کرتی۔ جب ذرا سا سانس لیتی تو ایسا لگتا۔ کہ بلاؤز کے سارے بٹن تڑ تڑ ٹوٹ جائیں گے۔ اس کی چھاتی پھٹ جائے گی۔ اور دل تڑپ کر باہر نکل آئے گا۔ اس وقت وہ عجیب سی بے چینی محسوس کرتی۔ اور اس کا جی چاہتا کہ سارے کپڑے اتار پھینکے اور جوڑ جوڑ کو آزاد کر دے۔ وہ سانس روک لیتی۔ اور اس کا جی چاہتا۔ سچ مچ چھاتی پھٹ جائے۔ اور ساری الجھن ختم ہو جائے مگر نہ چھاتی پھٹتی تھی اور نہ الجھن ختم ہوتی تھی۔

ماں باپ نے کیا کوشش نہیں کی۔ مگر چندرا کے لئے کوئی بر نہیں ملا۔ ماں باپ نے تو اسی وقت اس کے بیاہ کی بات شروع کر دی تھی۔ جب وہ ٹھیک سے جوان بھی نہیں ہوئی تھی۔ انھیں اندازہ تھا کہ دولت ہوتے پر بھی چندرا کے لئے بر ڈھونڈ لینا۔ پہاڑ کاٹ کر نہر نکالنے سے کم کٹھن کام نہیں۔ ایک تو یہ ہی کالی کلوٹی اور معمولی صورت کی پیدا ہی ہوئی تھی۔ بیماریوں نے اسے اور بھی بدصورت بنا رکھا تھا۔ مگر ماں باپ کو امید تھی۔ کہ جوان ہو کر کچھ نہ کچھ صورت نکھر آئے گی اور بدصورتی دب جائے گی۔ مگر چندرا جیسے جیسے جوان ہوتی گئی اس کی بدصورتی نکھرتی گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ اسے بدصورتی کا نمونہ بنا کر پیدا کیا گیا ہے کالا کلوٹا رنگ چہرے

پھر چیچک کے بڑے بڑے چمکیلے داغ، چھوٹی پیشانی، چپٹی ناک، چھوٹی چھوٹی دھنسی ہوئی آنکھیں، موٹے موٹے اور کچھ الٹے ہوئے ہونٹ۔ ایسی لڑکی سے بیاہ کون کرتا لڑکیوں کا کال تو نہیں۔ بات چلتی اور ختم ہو جاتی۔ تینوں چھوٹی بہنوں کا بیاہ بھی ہوا۔ اور سب کے بچے بھی ہوئے۔ مگر وہ بیٹھی رہی۔ ماں باپ نے تھک کر کوشش کی۔ کہ کوئی معمولی آدمی یا کوئی رنڈوا ہی مل جائے۔ تو اس کا بیاہ تو ہو جائے۔ انہوں نے روپے کا لالچ بھی دیا۔ مگر کوئی بر ملا ہی نہیں۔ حد تو یہ تھی کہ چکر دھر بابو اس کے باپ کے کلرک تھے اور دن بھر مقدموں کا بستہ اٹھائے پھرتے تھے۔ اور اس کے باپ کو حضور کہتے کہتے منہ سوکھتا تھا۔ عمر بھی پچاس سال سے کم نہ تھی۔ چار چار بچے تھے ان کی پتنی گئی تو اس کے باپ نے خود ہی اُن سے کہا۔ مگر انہوں نے بات بنا کر انکار کر ہی دیا۔

چندرا کو سب کچھ معلوم تھا۔ اس کے ماں باپ اس کے بیاہ کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار تھے۔ انہوں نے غریب اور معمولی گھر کے لڑکے کو ہزاروں کا تلک اور جہیز دینے کو کہا تھا۔ ہر طرح کا لالچ دیا تھا۔ مگر چندرا کی صورت کیسے بدل دیتے۔ یہ اُن کے بس سے باہر بات تھی۔ چندرا خود بھی اسے سمجھتی تھی۔ اسکول سے کالج تک لگاتار کئی برسوں تک وہ ہر روز باہر جایا کرتی تھی۔ اور دیکھتی تھی کہ جوان لڑکے دوسری لڑکیوں کو کن آنکھوں سے دیکھتے تھے۔ اس کی ساتھی سومنگلا تھی۔ گوری چٹی اور خوبصورت رکمنی تھی۔ کھڑے نقشے کی سانولی سی لڑکی، پربھا تھی معمولی صورت کی لڑکی، ان میں سے کوئی بھی بھرپور جوان نہیں تھی۔ مگر گھر سے نکلنے کے بعد اسکول کے دروازے تک نوجوانوں کی نگاہیں ان کے قدم چومتی تھیں۔ لیکن اسے کوئی پلٹ کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ البتہ کئی مرتبہ راستے میں اسکول اور کالج کے لڑکوں نے اس پر پھبتیاں ضرور کسی تھیں۔ ایک دن وہ سومنگلا کے ساتھ اسکول جا رہی تھی۔ تو راستے میں کئی لڑکے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ "ارے دیکھو چاند کے ساتھ ساتھ کالی بدلی بھی ہے۔" اور سارے لڑکے ہنس پڑے تھے۔ اُس دن اُس کے بدن میں دیر تک چنگاریاں سی چھوٹتی رہی تھیں۔ ایک دو بار نہیں سینکڑوں بار لڑکوں نے اس پر پھبتیاں کسی تھیں۔ اور اس کا خون کھول کر رہ گیا تھا۔ ایک دن کالج جا رہی تھی تو ایک لڑکے نے سامنے آکر ہاتھ جوڑے، پرنام کیا اور بولا۔ "کالی میا مری پرارتھنا مان لے۔ ایسے مت نکلا کر ہم لوگوں کو ڈر لگتا ہے۔" اُس دن وہ خوب روئی تھی۔ اور رنج اور غصے سے کھانا بھی نہیں کھا سکی تھی۔

لیکن جب موہنا کا بچہ اُسے دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تو اسے محسوس ہوا کہ اب اس کا کلیجہ سچ مچ پھٹ جائے گا۔ وہ موہنا کے کمرے سے چلے جانے کے بعد دیر تک پلنگ پر پڑی روتی رہی۔ یہ تو آخری حد تھی۔ کہ وہ بچے کو پیار کرنے کو بڑھی اور وہ ڈر گیا۔ جب دل ذرا ہلکا ہوا۔ تو اس نے پھر ناول پڑھنا چاہا، مگر جی نہ لگا۔ نہ اُسے کامنی یاد رہی تھی نہ اتول اور نہ سمترا۔ اس میں اتنی طاقت بھی نہیں رہ گئی تھی۔ کہ وہ موہنا کو پکارے اور اس سے باتیں کرے۔ مگر موہنا خود ہی کمرے میں آگئی اور بولی۔

"بڑا نٹ کھٹ ہے دیدی، میرے سوا کسی کے پاس نہیں رہتا۔ اور کوئی زبردستی لینا چاہے تو رو رو کر گھر سر پہ اٹھا لیتا ہے۔ چندرا موہنا کی بات سن کر مسکرا دی۔ وہ سمجھ رہی تھی۔ کہ موہنا اس کا دل رکھنے کو باتیں بنا رہی ہے۔ ورنہ بچہ ہنس مکھ تھا۔ اور اب کمرے سے باہر نانی کی گود میں کلکاریاں بھر رہا تھا۔ چندرا نے بات ہی بدل دی اور دوسری باتیں کرنے لگی۔ ایسے اچانک کیسے آگئی۔ موہنا نے بتایا کہ اس کی جٹھانی کسم بہت بیمار ہے اور اس کا پتی گھر کرایہ پر لینے کو آیا ہے کہ وہ لوگ آجائیں اور علاج ہو۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ کسم کی آنت میں زخم ہے اور آپریشن ضروری ہو گیا ہے۔ آپریشن پٹنہ ہی میں ہو سکتا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا۔ کہ اس کے باپ نے پاس والا مکان دے دیا ہے اس کا پتی رات کی گاڑی سے گھر واپس جائے گا۔ اور دوسرے دن شام تک مراری بابو کسم کو لے کر آجائیں گے۔ پھر علاج ہو گا اور آپریشن ہو گا۔

چندرا کسم کو جانتی تھی۔ دونوں اسکول میں ساتھی تھیں۔ کسم خوبصورت نیک اور سیدھی سادی لڑکی تھی۔ جو دن بھر ذرا ذرا سی بات پر ہنستی رہتی تھی۔ دوسری لڑکیوں کی طرح نہ شور ہنگامہ کرتی تھی اور نہ کسی سے لڑتی تھی۔ اور نہ ہر لڑکی سے زیادہ ملتی تھی۔ عمر میں اس سے چھوٹی تھی۔ مگر دونوں میں دوستی تھی۔ لیکن کالج جانے سے پہلے ہی اس کا بیاہ ہو گیا تھا۔ اور اس لئے پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ بچے تو کئی ہوئے تھے۔ لیکن صرف دو چھوٹے بچے رہ گئے تھے۔ چندرا کو یہ جان کر بڑا دکھ ہوا کہ کسم کو بڑی خطرناک بیماری نے پکڑ لیا تھا۔ علاج آپریشن کے سوا اور کچھ نہیں اور اتنی کمزور ہے کہ فوراً آپریشن بھی نہیں ہو سکتا اور آپریشن کسی وقت بھی ہو خطرناک ہو سکتا ہے۔ چندرا کو بہت سی پچھلی باتیں یاد آگئیں۔ اور یہ سوچتے ہی اس کا دل ڈوبنے لگا۔ کہ اگر کسم مر گئی، تو

اس کے بچوں کا کیا ہوگا۔ مراری بابو کو دوسری پتنی مل جائے گی۔ لیکن بچوں کو ماں کہاں ملے گی۔ زیادہ رنج یہ ہوا کہ بہت سے ناولوں میں اس نے سوتیلی ماؤں کے بارے میں پڑھا تھا اور سچے واقعات بھی سنے تھے۔ کہ سوتیلی ماؤں کے آنے کے بعد بچوں کی زندگی کس طرح برباد ہوگئی۔ اس کے دل میں بچوں کے لئے ہمدردی کا جذبہ ابھرنے لگا۔ جن کے سر پر دکھ کے بادل منڈلا رہے تھے۔

دوسرے ہی دن مراری بابو کسم اور بچوں کو لے کر آگئے۔ چندرا اس سے ملنے گئی۔ اور اسے معلوم ہوا کہ مراری بابو بچوں کو لانا نہیں چاہتے تھے۔ مگر کسم نہ مانی۔ اس نے یہ بھی کہہ دیا۔ کہ بچے نہیں جائیں گے تو وہ علاج کرانے نہیں جائے گی۔ پہلے دو بچے مر چکے تھے۔ اور وہ موت اور زندگی کی کھینچ تان میں بچوں کو اپنی نظر سے دور کرنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر بچوں کو ساتھ لانے کے بعد دوسرا سوال بھی پیدا ہوگیا تھا۔ کہ ان کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ مراری بابو کی ماں بوڑھی تھیں۔ اور اوپر کا کام کرنے کے لئے ایک بوڑھی عورت تھی۔ ایک عورت اور بھی تھی۔ مگر بالکل گنوار۔ چندرا جب کسم سے ملی تو اس نے اطمینان دلایا۔ کہ بچوں کی طرف سے مطمئن رہے وہ ضرور دیکھ بھال کرے گی اور بچوں کو تکلیف نہیں ہونے دے گی۔ اور کسم نے احسان مند نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔ اور باتیں کرتے کرتے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

نولو اور پولٹو بڑے پیارے بچے تھے۔ بھولے بھالے اور ہنس مکھ کسم نے دونوں کو پاس بلایا اور کہا "یہ ماسی ہیں۔ پرنام کرو۔ اور دونوں بچوں نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ نولو چار سال کا تھا۔ اور پولٹو دو سال کا۔ چندرا نے ذرا چمکارا تو دونوں بچے اس کے پاس آگئے۔ پولٹو نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے چندرا کے چہرے کو ٹٹولنا شروع کیا تو وہ ڈر گئی۔ کہ کہیں یہ لڑکا بھی ڈر کر چیخ نہ اٹھے۔ مگر پل بھر بعد ہی وہ مسکرا دیا۔ اور توتلی زبان میں بولا ــــ

"ماچی تم بلی اچھی ہو"

اور چندرا کا دل پھول کی طرح کھل اٹھا۔ اس نے دونوں بچوں کو سمیٹ کر سینے سے لگا لیا۔ اور نولو نے اس کی عینک کو چھوتے ہوئے کہا۔

"ماسی اپنا چشمہ ہم کو دے دو"

کسم نے کمزور آواز میں کہا۔

"نہیں بیٹے بچے چشمہ نہیں لگاتے"

اور نولو نے عینک چھوڑ دی۔ کسم بولی۔

"ارے تم دونوں نے ماسی کو پیار تو کیا ہی نہیں"

اور دونوں بچوں نے دو طرف چندرا کے گالوں پر اپنے منہ رکھ دیئے اور چندرا کو ایسا محسوس ہوا کہ اب تک وہ جس چیز سے محروم تھی۔ وہ اسے مل گئی۔ دونوں بچوں کے لئے اس کے دل میں محبت اور ہمدردی کا چشمہ پھوٹ پڑا۔

چندرا کو خود اپنے دکھ نے اس طرح گھیر رکھا تھا کہ اس سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں نظر آتی تھی۔ اور دکھوں کو بھول جانے کے لئے اس نے ناول پڑھنا شروع کیا تھا۔ ناولوں کو پڑھنے کے بعد زندگی کو نئے نئے پہلوؤں سے دیکھنے اور ان مسئلوں پر نئے ڈھنگ سے سوچنے کا اسے موقع ملا تھا۔ اور اس نتیجے پر پہنچی تھی۔ کہ غموں پر اختیار حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اگر آدمی اپنی خواہشوں کو دل سے نکال دے اور دوسروں کے غم کو اپنا لے۔ دوسروں کے دکھ کو دور کرنے کی کوشش میں آدمی خود اپنے دکھوں کو بھول سکتا ہے۔ اور چندرا نے دوسروں کے دکھوں کو کچھ اس طرح محسوس کرنا شروع کیا تھا کہ خود اپنے غم اسے غم معلوم ہی نہیں ہوتے تھے۔ اکثر وہ سوچتی رہتی تھی۔ کہ آخر اسے غم ہی کیا ہے صرف ایک یہ کہ اس کا بیاہ نہیں ہوا مگر اس ایک غم نے اسے بہت سے غموں سے بچا لیا ہے۔ اسے کسم اور اس کے بچے یاد آرہے۔ جن کی ہر سانس اسے موت کی طرف کھینچے لے جا رہی تھی اور بچوں کے لئے کسم کی پریشانی۔ اور وہ بے چین ہوگئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا۔ کہ ایک غم نے اسے ہزاروں غموں سے بچا لیا ہے۔ اور اپنے ایک غم کو کسم کے غموں کو

اپنا کر بھلا سکتی ہے۔ یوں بھی اپنے ایک غم کو بڑی حد تک بھول چکی تھی اور ناولوں کی دنیا میں کھو کر اپنے غم کو بھول گئی تھی۔

چندرا نے کئی مرتبہ سوچا تھا کہ اپنی زندگی دوسروں کے غموں کو دور کرنے میں لگا دے اور اس طرح اپنے غم کو بالکل ہی بھول جائے۔ لیکن اس کا موقعہ بھی نہ تھا۔ کئی بار اُس نے سوچا تھا۔ کہ بیماروں کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد بنالے۔ صبح اُٹھ کر ہسپتال جائے اور وہاں کام کرتی رہے لیکن وہ جانتی تھی۔ کہ ماں باپ اس کی اجازت نہیں دیں گے۔ باپ شہر کے بہت بڑے وکیل تھے اور یہ کام بہت چھوٹا تھا۔ اگر وہ یہ کام شروع کرتی تو ان کے نام کو بٹہ لگتا۔ اور وہ چپ چاپ کمرے میں لیٹی لیٹی ناول پڑھتی رہتی۔ اور دوسروں کے دکھوں کو محسوس کرتی رہتی۔ کسم کی بیماری نے موقع دیا تھا۔ کہ دوسرے کی سیوا کر کے اپنے غم کو بالکل بھول جائے۔

دوسرے ہی دن چندرا کی زندگی بدلنے لگی۔ صبح سویرے اُٹھ کر کسم کے پاس چلی جاتی۔ دونوں بچوں کو اُٹھاتی، نہلاتی دھلاتی، کپڑے پہناتی، ناشتہ کھلاتی۔ تھوڑی دیر کسم کے پاس بیٹھتی۔ اُس سے باتیں کرتی، دلاسے دیتی۔ وقت پر دوا کھلاتی۔ پھر اپنے گھر آجاتی، نہا دھو کر ناشتہ کرتی پھر کسم کے پاس چلی جاتی۔ بچوں کو اپنے پاس بٹھاتی۔ ان سے باتیں کرتی، کہانی سناتی۔ پھر وقت پر کھانا کھلاتی اور ان کو کمرے میں کھیلنے کے سامان دے کر اپنے گھر آجاتی۔ بچے بھی اُس کی بات مانتے تھے۔ اور گھوم پھر کر اُس کے پاس رہتے تھے۔ کسم پلنگ پر پڑی پڑی سب کچھ دیکھتی اور ٹھنڈی سانس لے کر رہ جاتی وہ تو شروع ہی سے جانتی تھی کہ چندرا کی شکل جتنی خراب تھی۔ دل اس کا اتنا ہی اچھا تھا۔ اُس کے دل میں محبت اور ہمدردی کے سوا کچھ نہ تھا۔

چندرا جب بچوں کی طرف سے مطمئن ہو جاتی تو کسم کے پاس آکر بیٹھتی اور گھنٹوں اُس سے باتیں کرتی۔ بچپن کی کہانیاں دہراتی۔ اور اس سے ایسی باتیں کرتی۔ جو کسم اپنی تکلیف اور اپنی بیماری کو بھول جائے۔ اور کسم کا بھی دل لگ جاتا تھا۔ مراری بابو خوش تھے۔ کہ ایسے وقت میں کسم کی بچپن کی ایک سہیلی مل گئی تھی۔ جو اس کا خیال رکھتی تھی اور بچوں کا بھی۔ اور ان کے دل میں چندرا کے لئے احسان مندی کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچتے تھے۔ کہ یہ عورت ہے یا دیوی جو اس لگن سے کسم اور اس کے بچوں کی دیکھ بھال میں لگی ہوئی ہے۔ اور وہ جتنی بار چندرا کے بارے میں سوچتے ان کے دل میں چندرا کے لئے زیادہ عزت پیدا ہوتی جاتی۔

شام کا وقت تھا۔ چندرا نے بچوں کو ناشتہ کھلا کر دائی کے ساتھ میدان میں بھیج دیا تھا۔ اور خود کسم کے پاس آکر بیٹھ گئی تھی۔ اور اس سے باتیں کر رہی تھی۔ اور یقین دلا رہی تھی۔ کہ وہ بہت جلد اچھی ہو جائے گی۔ لیکن وہ روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ مہینوں سے علاج ہو رہا تھا۔ مگر کمزوری بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ آپریشن کا اس وقت تک سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ جب تک بدن میں طاقت نہ آجائے۔ کسم کو اپنی حالت کا اندازہ تھا۔ باتیں کرتے کرتے اُس نے چندرا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور بولی۔

"چندرا بہن میں تو تمہارا احسان کبھی نہ بھولوں گی۔ اگر زندہ رہ گئی تو ساری زندگی تمہارا احسان سر پہ لئے پھروں گی۔ اور اگر مر گئی تو سر پہ لئے جاؤں گی۔ تمہاری وجہ سے میرے بچوں کو کوئی تکلیف نہیں۔"

اور اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے تھے۔ چندرا اسے دیر تک سمجھاتی۔ اور یقین دلاتی رہی۔ کہ وہ اچھی ہو جائے گی۔ اور اسے اپنے بچوں کی طرف سے بالکل بے فکر رہنا چاہئے۔ لیکن کسم دیر تک ایک ہی بات کو دہراتی رہی تھی۔

ساتھ رہنے سے چندرا کو بچوں سے محبت ہو گئی تھی۔ دونوں بچے بھی اُس سے لپٹے رہتے تھے۔ اور کسم کی حالت سُدھرنے کا نام نہیں لیتی تھی علاج جاری تھا۔ لیکن اُس کے بدن میں اتنی طاقت ہی پیدا نہ ہوتی تھی۔ کہ آپریشن ہو۔ بلکہ روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ چندرا کبھی کبھی یہ سوچ کر پریشان ہونے لگتی تھی۔ کہ اگر کسم مر گئی تو دونوں بچوں کا کیا ہوگا۔ مراری بابو کی عمر چالیس سال بھی نہ تھی۔ اور صحت اچھی تھی۔ گرہستی کو باقی رکھنے کے لئے بیاہ ضرور کریں گے۔ مگر وہ عورت کیسی ہوگی اور بچوں کے ساتھ کیسا سلوک کرے گی۔ ان بچوں کا کیا ہوگا۔ اور یہ سوچ کر وہ پریشان ہو گئی۔

ایک دن چندرا اور کسم بہت دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ مراری بابو ڈاکٹر کے پاس گئے تھے۔ دونوں بچے چندرا کے پاس کھڑے تھے۔ اور کہتے

تھے۔ کہ دوسرے کمرے میں چل کر کوئی کہانی سنائے۔ کسم دیکھ کر مسکرادی اور بولی

"چندرا ابھی معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے جنم میں نولو اور پولو تمہارے ہی بچے تھے۔ جب ہی تو تم دونوں کے لئے اتنی تکلیف اٹھاتی ہو۔ ان سے اتنا زیادہ پیار کرتی ہو اور یہ دونوں بھی تمہارے ساتھ ویسے ہی گھل مل گئے ہیں۔ کہ کبھی گھر کے کسی آدمی سے نہیں ملے۔

چندرا نے دونوں بچوں کو اپنی گود میں سمیٹ لیا اور پولو سے بولی۔

"کہانی رات کو کہی جاتی ہے بدھو مت بنو"

اور پولو اٹھ بیٹھ گیا تو چندرا بولی۔

"دن کو کہانی کہنے اور سننے سے راہی راہ بھول جاتا ہے اور بچارے کو بڑا دکھ ہوتا ہے"

نولو بولا۔

"تو پھر ہم ابھی کہانی نہیں سنیں گے۔ جاتے ہیں اپنی موٹر چلانے"

اور پولو بولا۔

"تو ہم بھی اپنی ریل چلانے جاتے ہیں"

اور دونوں بچے سائبان میں بھاگ گئے۔

چندرا مسکرادی۔ واقعی دونوں بچے اتنے گھل مل گئے تھے۔ اسے خود بھی حیرت ہوتی تھی۔ اس کی اپنی بہنوں کے بچے تو اس سے بھاگتے تھے۔ اور یہ دونوں بچے اس سے اتنے گھل مل گئے تھے۔

کسم کا علاج ہو رہا تھا کہ بدن میں طاقت آجائے تو آپریشن ہو۔ مگر کوئی فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔ اور وہ روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ دونوں بچے چندرا میں الجھتے جا رہے تھے۔ اور اتنے زیادہ گھل مل گئے تھے کہ اس کے بغیر کھانا بھی نہیں کھاتے تھے۔ جب کوئی بات ہوتی تو ماسی ماسی پکارتے اور وہ بڑی خوشی سے ان کے کام کرتی۔ بچوں میں دلچسپی پیدا ہو جانے سے اس کی اداس زندگی میں نئی امنگ پیدا ہو گئی تھی۔ اور وہ دل کے اندر محسوس کرنے لگی تھی۔ کہ اس کی زندگی بیکار نہیں ہے اس کی اپنی زندگی چاہے جیسی بھی ہو۔ لیکن وہ دوسروں کے کام آسکتی ہے اور سکھی بھی بنائی جا سکتی ہے۔ دوسروں کو خوشی پہنچا سکتی ہے اور اس احساس کے ساتھ ہی اس میں ایک نئی زندگی ابھرنے لگی۔ اور خوشی کا نیا سوتا پھوٹ پڑا۔

گھر پر چندرا کو کوئی کام نہ تھا۔ دن بھر کمرے میں بند ناول پڑھا کرتی تھی۔ کسم کے بچوں میں الجھی تو ان کے پاس رہنے لگی۔ کسم سے باتیں، اور بچوں کی دیکھ بھال، جب مراری بابو آجاتے تو ہٹ جاتی اور جب بچے بھی کھیل میں کھوئے رہتے موقع نکال کر کچھ دیر پڑھ لیتی۔ اس کے ماں باپ یا گھر کے کسی آدمی کو بھی اعتراض نہیں تھا۔ سب سمجھتے تھے۔ کہ اس زندگی میں کچھ تو دلچسپی پیدا ہو گئی ہے بلکہ ایک دن اس کے باپ نے دل بڑھانے کو بڑی تعریف کی تھی اور کہا تھا۔ اصل دھرم یہی ہے کہ آدمی آدمی کے کام آئے اور سیوا کرے اور چندرا نے محسوس کیا تھا کہ وہ سچ مچ کوئی بڑا کام کر رہی ہے مگر دوسرے ہی پل اس خیال سے کانپ اٹھی تھی۔ کہ اگر کسم اچھی نہ ہوئی مر گئی تو ان بچوں کا کیا ہوگا۔ اور وہ کیسے رہیں گے۔ بچے اس سے اتنے گھل مل گئے تھے کہ انھیں ذرا تکلیف ہوتی تھی۔ تو چندرا کو تکلیف ہوتی تھی۔ کبھی کبھی وہ سوچا کرتی۔ کہ ابھی کسم بیمار ہے۔ علاج ہو رہا ہے۔ بچے سامنے ہیں لیکن جب وہ اچھی ہو جائے گی تو گھر چلی جائے گی۔ بچے بھی چلے جائیں گے۔ تو پھر کیا ہوگا۔ دل بہلانے کو جو کھلونے مل گئے ہیں وہ چھن جائیں گے۔ اس وقت کیا کرے گی۔ بچے تھوڑی دیر کے لئے بھی اس کی نظر سے دور ہو جاتے تو وہ خود گھبرانے لگتی تھی۔ اور بچے چلے جائیں گے تو کیا ہوگا۔ یہ سوچ کر اس کا دل بیٹھنے لگتا تھا۔

ایک دن چندرا کسم کے پاس بیٹھی تھی۔ بچے سائبان میں کھیل رہے تھے۔ مراری بابو آگئے۔ اور باتیں کرنے لگے۔ اور باتوں باتوں میں بولے۔

چندرا جی آپ تو بچوں سے ایسا پریم کرتی ہیں اور ان کی ایسی سیوا کرتی ہیں۔ کہ کسم بھی نہ کر سکیں۔ آپ دیوی ہیں۔ جو اپنے کٹھن وقت میں بچوں کو اس

طبلہ پریم دے رہی ہیں۔

اور یہ کہتے کہتے مراری بابو کی آواز بھرا گئی۔ اور وہ اُٹھ کر کمرے سے چلے گئے تھے۔

ایک دن چندرا بچوں کے ساتھ سائبان میں تھی۔ بچے کھیل رہے تھے۔ اور وہ بیٹھی ناول دیکھ رہی تھی۔ مراری بابو کسُم کے پاس بیٹھے تھے۔ اس نے سُنا مراری بابو کہہ رہے تھے۔

"دنیا بھی کیسی عجیب جگہ ہے۔ صورت کو سب دیکھتے ہیں۔ دل کو کوئی نہیں دیکھتا۔ صرف صورت نہ اچھی ہونے کی وجہ سے چندرا جی کا بیاہ نہ ہوا۔ مگر سوچو۔ جس کا بیاہ چندرا جی سے ہوتا وہ مرد کتنا بھاگوان اور سکھی ہوتا۔ ایسی دیویاں تو ہر دم دھرتی پر نہیں اترتیں۔"

اور چندرا سوچ رہی تھی مراری بابو کے لئے رحم اور عزّت کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ ایسے آدمی ابھی ہیں جو خوبیوں کو دیکھتے اور سمجھتے ہیں اور اسکی قدر کرتے ہیں اور اسے کسُم پر رشک آیا تھا کسُم کتنی خوش نصیب ہے جو اسے اتنا شریف پتی ملا جب ہی تو اس خراب بیماری میں بھی اس کا چہرہ پھول کی طرح کھلا رہتا ہے۔ بدن روز بروز گھلتا جا رہا ہے۔ لیکن چہرے پر دمک ہے اور وہ کس لگن سے اس کا علاج کرا رہے ہیں۔ اور کسی چیز کی فکر ہی نہیں۔ دنیا میں اور کسی چیز سے کوئی مطلب ہی نہیں۔ اور اس کا دل مراری بابو کی طرف کھنچنے لگا۔

وہ برابر دیکھ رہی تھی۔ کہ جب مراری بابو اور کسُم اکیلے بیٹھتے تو اس کی باتیں چھیڑی جاتیں۔ اور دونوں اس کی تعریف کرتے۔ پھر ایک دن ایسا ہی ہوا، اور مراری بابو اس کی اتنی تعریف کرنے لگے۔ کہ دوسرے کمرے میں بیٹھی بیٹھی چندرا کو پسینہ آنے لگا۔ جب وہ چپ ہو جاتے تو کسُم اپنی کمزور آواز میں باتیں کرنے لگتی۔ اور اس کی تعریف کرنے لگتی۔ مراری بابو کہہ رہے تھے۔

"صورت کوئی چیز نہیں۔ اصل چیز آدمی کی اچھائیاں ہیں۔ ایشور کے نزدیک بھی اسی کا دام ہے اور آدمی کے نزدیک بھی۔ صورت تو ایک دن مٹ جاتی ہے لیکن اچھائیاں کبھی نہیں مٹتیں اور سدا یاد رہتی ہیں۔ اور چندرا جی میں تو اتنی اچھائیاں ہیں کہ ان کو گننا بھی مشکل ہے۔"

اور کسُم نے کمزور آواز میں کہا تھا۔

"ایک بات کہوں! آپ مانیں گے؟"

اور مراری بابو بولے تھے۔

"تمہاری کوئی بات آج تک میں نے اٹھائی ہے۔"

اور کسُم بولی تھی۔

"اگر میں مر جاؤں تو آپ چندرا سے بیاہ کر لیجئے گا۔ وہ میری بچپن کی ساتھی ہے اور بچوں سے بہت پیار کرتی ہے میرے بعد ان کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ آپ کو چندرا سے اچھی پتنی ضرور مل سکتی ہے مگر بچوں کو اس سے اچھی ماں نہیں مل سکتی ہے۔

مراری بابو نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ مگر کسُم نے ان کا ہاتھ ہٹا کر کہا تھا۔

میں سچ کہہ رہی ہوں میری پرارتھنا ہے۔

اور چندرا دیر تک نہیں سمجھ سکی تھی۔ کہ وہ اپنے پتی کو دلاسا دے رہی ہے یا سچ کہہ رہی ہے یا مراری بابو اس کی تعریف کر رہے ہیں تو وہ اس کا مذاق اڑا رہی ہے۔ پھر کئی دنوں کے بعد کسُم نے اُس سے کہا تھا۔

بہن اگر میں مر جاؤں تو میرے بچوں کو اپنے سے الگ نہ کرنا۔ میں اُن سے کہوں گی۔ کہ میرے بچوں کو چندرا سے الگ نہ کرنا۔ ورنہ چندرا کا دل ٹوٹ جائے گا اور بچوں کا بھی۔

اور چندرا نے کسُم کو رو کر دیا تھا اور بولی تھی۔

"تم اچھی ہو رہی ہو۔ تھوڑے دن اور، بالکل اچھی ہو جاؤ گی بے کار باتیں نہ سوچا کرو۔"

لیکن کسم کی بات سننے کے بعد چندرا مراری بابو کو اپنے سے اور بھی نزدیک محسوس کرنے لگی۔ جو اُسے دیوتا نظر آتے تھے۔ جب ان پر نظر پڑتی تو عقیدت سے اس کی نظر جھک جاتی۔ اور اپنے دل میں کسک سی محسوس کرتی۔ جب وہ اکیلی بیٹھی رہتی تو مراری بابو کے بارے میں گھنٹوں سوچا کرتی۔ کبھی کسی مرد نے اسکی طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھا تھا۔ اور اگر دیکھا تو منہ بنا لیا تھا۔ لیکن مراری بابو کو اس میں صرف اچھائیاں ہی اچھائیاں نظر آتی تھیں۔ اس نے کئی بار دیکھا تھا مراری بابو اسے کن انکھیوں سے دیکھ رہے تھے اور جب بھی موقع ملتا تھا۔ تو مسکرا مسکرا کر اس سے باتیں کرتے تھے۔ اور دل بڑھانے والی اور ایسی کہ تین حصہ اس کی بڑائی ہوتی۔ کتنی بار چندرا کے دل میں خیال آیا تھا۔ کہ اگر مراری بابو جیسا پتی اسے مل جاتا۔ تو اس کی زندگی اتنی اداس نہ ہوتی۔ اس کے اپنے بچے ہوتے اپنا گھر ہوتا۔ اطمینان اور خوشی کی زندگی گذارتی۔ کاش مراری بابو پہلے ہی اسے جان لیتے۔ تو اس کی زندگی آج کچھ اور ہوتی۔ اس نے کسم اور مراری بابو کی باتیں بار بار سُنی تھیں۔ اور جان چکی تھی۔ کہ مراری بابو کے دل میں اس کے لئے بڑی نرم جگہ ہے مگر کبھی ایک پل کے لئے بھی اس کے دل میں یہ بات نہ آئی تھی۔ کہ کسم مر جائے گی۔ اور مراری بابو اسے اپنا لیں گے۔ جب بھی وہ کسم کے بارے میں سوچتی تھی۔ تو اس کا رواں رواں دعا کرتا تھا کہ کسم اچھی ہو جائے اور دونوں بچے پھر اس کی محبت پائیں۔

کسم کا علاج ہوتا رہا۔ قیمتی قیمتی دوائیں دی جاتی رہیں۔ کہ بدن میں طاقت آئے۔ دو آپریشن ہو سکے لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ زخم اندر ہی اندر بڑھتا ہی گیا۔ کسم کمزور ہوتی گئی۔ اور زندگی کی طرف سے مایوس بھی۔ جب مراری بابو باہر چلے جاتے تو چندرا سے باتیں کرتی۔ اور پاس کھڑے ہو کر بات ایک ہی جگہ پر آ کر رکتی نوّا اور پوٹو کو نہ چھوڑنا۔ انھیں اپنے ہی بچے سمجھنا کہ میری آتما کو شانتی ملے۔ اور کبھی مراری بابو کا خیال رکھنے کو کہتی۔ چندرا اسے سمجھاتی۔ اور دلاسا دیتی۔ اور جیسے دکھوں کے سمندر میں ڈوبنے لگتی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے اور کبھی کبھی اپنی بے بسی پر رو دیتی۔

کسم کی حالت خراب ہوتی گئی۔ ایک دن اُسے تین بار بیہوشی کا دورہ پڑا۔ اس دن اُسے یقین ہو گیا۔ کہ اب اس کی زندگی کے دن پورے ہو گئے ہیں اس نے بچوں کو بار بار بلا کر پیار کیا اور بار بار چندرا سے وعدہ لیتی رہی کہ اسکے بعد بچوں کو نہ چھوڑے گی اور اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ وہ دونوں بچے اسے دیکر جا رہی ہے۔ اتنے میں مراری بابو آ گئے ان کے چہرے پر پریشانی تھی۔ چندرا باہر چلی آئی اور بے چینی کے ساتھ سائبان میں ٹہلتی رہی اُس نے کسم کی باتیں سنیں وہ کہہ رہی تھی۔

"آپ نے بہت لڑائی کی لیکن مجھے موت سے نہیں بچا سکتے میری آخری پرارتھنا ہے" وہ تھوڑی دیر چپ رہی کمزوری سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ پھر بولی۔

"دیکھئے بچوں کو چندرا کو دے چکی ہوں۔ کبھی الگ نہ کیجئے گا۔ بلکہ آپ اُن سے بیاہ کر لیجئے گا۔ میں خوش مروں گی۔"

اس سے زیادہ وہ کچھ نہ بول سکی۔ چندرا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور مراری بابو بڑی مشکل سے بولے تھے۔ "ایشور کی جو مرضی۔"

دوسرے ہی دن کسم مر گئی۔

چار دن بعد مراری بابو گھر لوٹنے کی تیاری کر رہے تھے گھر کے سارے لوگ اکٹھا تھے۔ طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔ مراری بابو کی ماں بولیں۔

"مراری تم نے سوچا ہے تمہارے بچوں کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ میں بوڑھی ہوں تمہارے تینوں بھائی اپنی اپنی نوکری پر ہیں اور دور دور ہیں۔"

مراری بابو کچھ بھی نہ بولے تو ان کی ماں پھر بولیں۔

"تم نے کچھ سوچا ہے بچوں کو دیکھنے والا بھی کوئی نہیں تم کو جلد ہی فیصلہ کرنا پڑے گا۔ یہاں تو چندرا بیٹی نے سنبھال دیا لیکن سدا تو وہ نہیں دیکھ سکے گی۔"

مراری بابو کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اور وہ بولے۔

"ماں۔ کسم دونوں بچے چندرا بہن کو دے گئی ہے وہ انھیں کے ساتھ رہیں گے۔ چندرا بہن کے رہتے ہوئے مجھے بچوں کی طرف سے اطمینان ہے۔"

چندرا کا سر چکرا گیا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ مگر وہ سنبھلی، اٹھی اور دونوں بچوں کا ہاتھ پکڑے کمرے کے اندر چلی گئی۔

حمید کاشمیری
نگارش۔ کراچی

روشن اندھیرے

صبح دس گیارہ بجے کا وقت تھا جبکہ رنگینی کی نہایت ہی فیشن ایبل دکان کے سامنے ایک کشادہ جاذب نظر سیاہ رنگ جاگیردارانہ وضع کی کار آن کھڑی ہوئی۔ سفید یونیفارم میں ملبوس ڈرائیور نے پھرتی سے نیچے اتر کر دروازہ کھولا تو پچھلی سیٹوں سے ایک خوبصورت جوڑا نمودار ہوا۔ ایک پاکستانی خوبرو نوجوان کار سے اترا۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک سنہرے بالوں والی خوبصورت سرو قد غیر ملکی جو وضع قطع سے فرانسیسی معلوم ہوتی تھی اپنی گوری گوری چکنی چکنی اور چمکدار پنڈلیاں تنگ اسکرٹ کے اندر سمیٹ کر باہر نکلی۔ اس نے نوجوان کا بازو پکڑا۔ اور نوجوان نے پشت کی جانب سے ہاتھ گھما کر اس کے بلوز کے نیچے چاندنی کی طرح شفاف پیٹ پر اس طرح رکھا کہ انگلیاں جیسے جلد میں دھنسی ہوئی معلوم ہونے لگیں۔ عورت نے بھی جواباً گرمجوشی سے اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں محصور کر لیا اور دونوں اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ چپاں ہو گئے کہ یک جان و یک قالب معلوم ہونے لگے۔

"واہ کیا خوبصورت جوڑا ہے"۔ ایک راہگیر نے دیکھتے ہی زیر لب سراہا۔

نوجوان کے ہونٹوں پر تبسم کی ایک ہلکی سی فاتحانہ لکیر کھنچ گئی۔ اور وہ پہلے سے زیادہ پر وقار معلوم ہونے لگا۔ اس نے اس وقت اطالوی نوک کا سیاہ جوتا۔ گبا ڈین کی بیڈی نما پتلون اعلیٰ درجے کی پاپلین کی سفید قمیص اور گلے میں بو لگا رکھی تھی۔ اس کا جسم گٹھا ہوا اور کسرتی معلوم ہوتا تھا۔ چہرے کا رنگ صاف بال گھنیرے اور آنکھوں پر گہرہ سیاہ چشمہ لگانے سے اس کی شخصیت اور زیادہ ابھر گئی تھی۔ اس نے کلائی میں بڑے سائز کی خوشنما گھڑی باندھ رکھی تھی جس کی سونے زنجیر پارے کی طرح اس کے بازو میں اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ اس کے مقابلے میں فرانسیسی عورت بہت سادہ لیکن اتنی ہی حسین اور دلکش تھی۔ وہ تنگ اسکرٹ اور نیم کھلے سامنے کا بلوز پہنے ہوئے تھی۔ جس میں سے اس کے بلوریں پیٹ کے علاوہ سینے کے نصف دائروں کے زیر و بم طلسماتی کیفیت پیدا کر رہے تھے۔ اس کے ہونٹوں پر ایک انمٹ مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی اور مشرقی وضع کی نیلی اور کٹیلی آنکھوں میں سمندر کی سی وسعت اور گہرائی معلوم ہو رہی تھی۔ اور گہرے سنہری بال مچھلیوں کی طرح اس کے شانوں پر آگے پیچھے بہار رہے تھے۔

فیشن ایبل دکان کی طرف روانہ ہونے سے پیشتر وہ اس طرح ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے۔ جیسے ایک اکائی میں ضم ہو جانا چاہتے ہوں۔ قریب قریب ہر راہ گیر نے ان کے متعلق اپنی ایک رائے قائم کر لی تھی۔ کوئی نظر انداز کر کے سیدھا گذر گیا۔ تو کسی نے ایک بار مڑ کر دیکھا۔ کسی کو بار بار مڑ کر دیکھنے سے بھی تسکین نہ ہوئی۔ کسی کے حلق میں ایک آہ دم گھٹ کے رہ گئی تو کوئی ہائے کر کے پھٹ پڑا۔ کوئی حسد کی آگ میں لمحہ بھر کے لئے بھڑکا تو کوئی رشک کی لہروں پر ہلکورے کھا کر نکل گیا۔ اور کوئی بیزاری سے جسم کے حصوں کو مضبوطی سے تھامے رال ٹپکا کر اپنے ساتھی سے کہنے لگا۔

" لالہ رناں تے اِناں لوکاں کول نئیں اساں تے کھوتیاں والے آں"۔

مگر وہ گرد و نواح کی تمام کیفیت سے بے نیاز ایک دوسرے میں مدغم ہو کر قدم سے قدم ملائے فیشن ایبل دکان کی طرف آہستہ آہستہ چلنے لگے۔

" فارچون پلیز نوجوان کے کان میں ایک نجومی نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ نوجوان ایک بار پھر فاتحانہ طریقے سے مسکرایا اور خاتون کو اپنی گرفت میں مزید کستے ہوئے فخریہ انداز میں آہستہ سے بولا۔

" فارچون تو میرے پہلو میں ہے نجومی صاحب"۔

نجومی اپنا سا منہ لے کر پیچھے ہٹ گیا۔ اور وہ دونوں خمار آلود طریقے سے ایک دوسرے سے چپکے الٹی وی (۸) کی شکل میں آہستہ آہستہ دکان کی طرف بڑھنے لگے۔

" اکھیاں والو اکھیاں بڑی نعمت ہے"۔ اچانک قریب سے ایک بھکاری نے نہایت ہی کرخت آواز میں صدا لگا کر ان کی ردمان پرور چال کو غیر متوازن بنا دیا۔ وہ لمحہ بھر کے لئے رک گئے۔

" اللہ خوبصورت جوڑی سلامت رکھے۔ اندھے مسکین کی مدد کرو"۔ اندھے مسکین نے ایک اور دردناک آواز بلند کر کے خوبرو نوجوان کے پیر پکڑ لئے۔

" اسے کچھ دے دو" نوجوان نے از راہ ہمدردی کہا۔ خاتون نے ایک روپیہ کا نوٹ اندھے کی طرف بڑھا دیا۔ اندھا شست باندھ کے عقابی انداز میں نوٹ کی جانب لپکا اور نوٹ لے کر جب واپس پیچھے پلٹا تو اس کی جیب سے بہت سی ریزگاری گر گئی۔ وہ فوراً آنکھیں کھول کر زمین پر جھکا اور اس طرح ریزگاری چننے لگا۔ جیسے بھوکا مرغ دانہ چگتا ہے۔ لیکن حسین جوڑا اندھے کی آنکھیں منکشف ہونے سے بے نیاز اپنی دھن میں مگن آگے دکان کی طرف بڑھ گیا۔

دکان میں داخل ہونے سے پیشتر وہ رنگا رنگ اشیاء سے مزین شو روم کے باہر کھڑے ہو کر بڑے انہماک سے اشیاء کو دیکھنے لگے۔ وہ ہنوز ایک دوسرے سے گتھم گتھا سے تھے اور ان کی اس قربت اور جذبات کی شدت کو دیکھنے کے لئے کتنے ہی منچلے ہوئے شائقین کیلئے تماشے منتشر طریقے سے سڑک پر ادھر ادھر جمع تھے۔ ایک مولوی صاحب نے قہر آلود طریقے سے اپنی نظریں ان پر مسلسل گاڑے رکھیں۔ پھر نفرت آمیز لہجے میں بولے۔

" لاحول ولا قوۃ بے حیائی کی انتہا ہو گئی ہے"۔

ایک دل جلے نے فوراً ہی مولانا کو جواب دیا:

" اماں مولانا، اپنی قسمت میں نہیں تو نا سہی۔ اوروں کو تو مزے کرنے دو۔ آخر حوروں سے اور کیا کام لیا جائے گا"۔

" استغفار... استغفار" مولانا بڑبڑاتے ہوئے آگے چلے گئے۔

لیکن وہ لوگوں کی توجہ کے احساس سے بے نیاز شو روم کے باہر بدستور ایک دوسرے سے چپاں کھڑے رہے۔ ہوا کے جھونکے قدرے تیزی سے چلنے لگے تھے۔ اور مغرب زدہ عورت کے نرم و ملائم بال اڑا اڑا کر نوجوان کے چہرے سے اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ نوجوان نے محبت سے بھرپور انداز میں پھونک مار کر بالوں کی ایک لہر کو خلا میں اڑا دیا۔ اور جواباً خاتون نے دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے خوف اور ڈر سے بے نیاز ہو کر خوبرو نوجوان کے رخسار پر آہستہ سے اس طرح ہونٹ رکھ دیئے جیسے وہ پیرس کے کسی جنت نظیر پارک میں داد عیش دے رہے ہوں۔ اس پر کتنے ہی راہگیروں کی دبی دبی سسکیاں طوفان کی شکل میں چاروں طرف پھیل گئیں۔ لیکن حسرتوں کے طوفان سے بے نیازی کے مظاہرے کو جاری رکھتے ہوئے خاتون نے نوجوان سے کہا۔

" دیکھو ڈارلنگ یہ پرس کتنا اچھا ہے"۔
" کونسا؟" نوجوان نے دلچسپی ظاہر کی۔
" یہ جو نیچے تمہارے پیروں کے پاس رکھا ہے۔ شیشے کے اندر"۔
" او ہو یہ تو بہت خوبصورت ہے"؛ نوجوان نے نیچے کی جانب جھک کر کہا۔
" میں ہمیشہ خوبصورت چیزیں پسند کرتی ہوں"۔ خاتون قدرے زعم سے بولی۔
" خوبصورت... لیکن ..." نوجوان طنزیہ انداز میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔
خاتون رنجیدہ ہوگئی۔ اور نوجوان کے چہرے کا رنگ بھی جیسے پلٹ گیا اور تاسف کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ کچھ دیر تک دونوں نے ایک لمحا چپ سادھ لی۔ پھر خاتون نے کہا:
" تمہیں یہ بات نہیں کہنی چاہئے تھی"۔ وہ دل شکستہ انداز میں شکایت کر رہی تھی۔ نوجوان چپ رہا۔
تمہیں یہ بات سوچنی بھی نہیں چاہئے تھی"۔ خاتون دوبارہ رقت آمیز لہجے میں بولی۔
نوجوان خفت اور معذرت کے انداز میں بات کا رخ بدلتے ہوئے بولا۔
" آؤ ڈارلنگ اندر چل کر اور چیزیں دیکھ لیں"۔
خاتون نے چہرے پر دوبارہ ایک دلکش تبسم بکھیر دیا۔ جیسے وہ اس بات کی شدت کو قطعی طور پر بھول گئی ہو۔ اس نے نوجوان کو اور مضبوطی سے اپنے بازو کے حلقے میں بھینچا اور دونوں فیشن ایبل دکان میں اتراتے ہوئے داخل ہوگئے۔ ایک سیلز مین جو کچھ دیر سے دروازے پر کھڑا ان کے اندر داخل ہونے کا منتظر تھا مشینی طریقے سے دانت نکال کر مسکرایا اور سر کو جاپانی انداز میں دو چار دفعہ جھکا کر آداب بجا لایا۔ ایکا ایکی پوری دکان میں ہلچل سی مچ گئی۔ تمام سیلز مینوں کی نگاہیں دوسرے گاہکوں سے ہٹ کر ان کا طواف کرنے لگیں جیسے کسی فرانسیسی فلم کا کوئی عشقیہ اور عریاں سین پردۂ سیمیں پر چل رہا ہو۔ وہ سلسلہ وار تمام اشیاء کو دیکھتے ہوئے دکان کے اگلے سرے پر پہنچ گئے۔ پھر خاتون ایک مقام پر رک گئی اور ایک پرس کو نہایت پسندیدگی سے دیکھتے ہوئے بولی۔
" ڈارلنگ یہ وہی پرس ہے نا جو ہم نے باہر دیکھا تھا"۔
" کہاں"؛ نوجوان نے پوچھا۔
" تمہارے دائیں ہاتھ کے نیچے شیشے میں"۔
نوجوان نے ہاتھ اٹھایا اور سیاہ چشمے کے اندر ہی سے پرس کی جانب قدرے غور سے دیکھا اور کہنے لگا
" غالباً وہی ہے"؛ پھر سیلز مین سے مخاطب ہوا۔
" ذرا یہ پرس تو دکھائیے"۔
سیلز مین نے پرس نکال کر سامنے میز پر رکھ دیا۔
" وہی ہے نا"؛ نوجوان نے پھر پوچھا۔
" ہاں"؛ خاتون بولی۔ " بہت پیارا ہے"۔
" تم ہمیشہ پیاری چیزیں پسند کرتی ہو"۔ نوجوان شوخی سے بولا۔
" اوں ہوں۔ آگے کچھ نہیں کہنا"؛ خاتون نے نہایت محبت سے نوجوان کے ہونٹوں پر نرم نرم مخروطی انگلیوں کا پھاہا رکھ دیا۔ اور

نوجوان نے خاتون کی انگلیوں کو یوں لذت آمیز طریقے سے ہونٹوں میں دبا لیا جیسے وہ میٹھے انگور رہوں خاتون کے نیم کھلے گریبان کے بھرے سے اس کا تنفس کسی قدر تیز معلوم ہونے لگا۔ اور اس کی تیزی کی شدت بجلی کی لہر کی طرح ساری دکان میں گشت کر رہی تھی۔!

"لوگ دیکھ رہے ہیں۔ اور ترس بھی رہے ہیں" خاتون نے زیر لب احتیاط کا نوٹس دیا۔

نوجوان نے چپکے سے انگلیاں ہونٹوں کی گرفت سے آزاد کر دیں اور دونوں دوبارہ اشیاء کو دیکھنے میں معروف ہوگئے۔ خاتون نے پرس کے علاوہ کچھ سامان آرائش و زیبائش خریدا اور ہر چیز خریدنے سے پہلے اس نے نوجوان کی پسند کا خاص خیال رکھا۔ جو رنگ جو ڈیزائن جو سائز نوجوان کو پسند آگیا، وہ خاتون نے خرید لیا اور جس پر نوجوان نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا اُسے خاتون نے چھوڑ دیا۔ اور اس طرح ان کا اچھا خاصا وقت اس ایک دکان کے اندر صرف ہوگیا۔ اس دوران میں سیلزمین نے بچاسوں چیزیں انہیں دکھائیں اور ہر چیز کو انہوں نے نہایت غور اور دلچسپی سے دیکھا پسند اور ناپسند کیا۔ لیکن ایک لمحے کے لئے بھی ایک دوسرے کے جسم سے الگ نہیں ہوئے۔ بدستور پنڈلی سے پنڈلی۔ پہلو سے پہلو اور شانے سے شانہ ملائے ایک جسم اور ایک روح میں تحلیل رہے۔ سیلزمین نے ان کی تمام اشیاء باندھ کر باہر گاڑی میں پہنچا دیں۔ اور بل ان کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ خاتون نے بل دیکھ کر نوجوان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ نوجوان نے سرسری سی نظر دیکھ کر پھر خاتون کو واپس کر دیا۔ ایک لمحے کے لئے خاتون نے نوجوان کو اپنی گرفت سے آزاد کیا۔ منی بیگ کھول کر بل کی رقم ادا کی اور فوراً نوجوان کو دوبارہ اپنے پہلو سے لگا لیا۔ اور دونوں جپس پھنسا کر چلتے ہوئے دکان سے باہر چلے آئے۔ کچھ بیشتر درمشتاقان دید اب بھی باہر ایک آدھ جھلک اور دیکھنے کے منتظر کھڑے تھے۔ راہگیروں میں از سر نو ایک ہلچل سی پیدا ہوئی اور دبی دبی سسکیوں اور آہوں کی ایک ایسی انجان اور نامعلوم سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ جیسے خاتون کے سر و پا۔ لب و رخسار۔ چشم و ابرو۔ جسم کے پیچ و خم اور نیم کھلے گریبان کی چاند نما ہیئت سے بجلی کی لہریں یا آگ کے شعلے نکل رہے ہوں۔ لیکن وہ ماحول سے بدستور بے نیاز ایک دوسرے سے چپکے چپکائے چلتے ہوئے کار کے پاس پہنچ گئے۔ ڈرائیور نے نہایت ادب اور مستعدی سے دروازہ کھولا اور دونوں ایک ساتھ اس طرح کار میں داخل ہوئے جیسے دونوں جُڑے میں بجتے ہوئے ہوں۔ خاتون نے نوجوان کو اپنی گرفت سے آزاد کر کے کار کے سیاہ شیشے اوپر چڑھا دئیے۔ پھر ڈرائیور کو گاڑی چلانے کا حکم دے کر ڈرائیور اور اپنی سیٹوں کے درمیان بھی پردہ گرا دیا۔ اور گاڑی اس طرح آرام دہ طریقے سے روانہ ہوگئی۔ جیسے مخملیں سیج پر کوئی دوشیزہ ننگے پاؤں چل رہی ہو۔

"ڈارلنگ" نوجوان آہستہ سے پکارا۔

"جی!" ڈارلنگ میٹھے اور معصوم لہجے میں بولی۔

"کیا گاڑی سب طرف سے بند کر دی؟" نوجوان نے تھکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں ـــ سب طرف سے" خاتون نے جواب دیا۔

نوجوان نے قدرے اطمینان اور آزادی کے ساتھ ایک لمبی اور تھکن سے چُور سانس لی اور نڈھال ہو کر پیچھے کی طرف سیٹ سے ٹیک لگالی۔ جیب سے سگریٹ نکال کر منہ میں رکھا پھر لائٹر جلایا اور اس کے لو کے قریب ہتھیلی رکھ کر آہستہ آہستہ لائٹر کو سگریٹ کے ساتھ لگا کر سلگا دیا۔ لمبے لمبے دو چار کش لگائے اور مایوس لہجے میں بولا۔

"ڈارلنگ اب میں تھک گیا ہوں ـــ اور نہیں چل پاؤں گا!"

خاتون تڑپ کر اس کے ساتھ لپٹ گئی اور درد میں ڈوبی ہوئی سسکیاں لے کر کہنے لگی۔

"ایسا مت کہو میری جان نہیں تو جینے کا وہ سلیقہ آتا ہے جو بے شمار آنکھ والوں کو بھی نصیب نہیں!"

"یہ سلیقہ، میں نے تمہارا جینا حرام کر کے ہی تو سیکھا ہے ـــ مجھے تنہا چھوڑ دو ڈارلنگ اور کہیں دور چلی جاؤ۔ بہت دور جہاں میرا

یہ دیوقامت سایہ بھی تم پر نہ پڑ سکے۔ اور اپنی خوشیوں کو واپس سمیٹنے کی کوشش کرو۔"

وہ کہتے کہتے خاموش ہوگیا۔ اور اسے محسوس ہوا کہ خاتون کی آنکھیں آبدیدہ ہیں۔ اس نے اپنے ہاتھوں پر آنسوؤں کے ننھے ننھے گرم موتی سے محسوس کئے۔

"کیوں رو رہی ہو ڈارلنگ"۔ اس نے محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"تم دل دکھانے والی باتیں کرتے ہو جانِ من"۔ خاتون کے لہجے میں درد تھا "میں صرف تمہارے قریب اور تمہیں خوش دیکھ کر ہی خوش رہ سکتی ہوں"۔

"مجھے معاف کر دو ڈارلنگ"۔ نوجوان ندامت کے انداز میں بولا۔ "آئندہ کوئی دل دکھانے والی بات نہیں کروں گا"۔ وہ ایک لمحہ خاموش رہا اور پھر موڈ تبدیل کرتے ہوئے قدرے شوخی سے بولا۔

"اچھا یہ تو بتاؤ تم نے آج کپڑے کیسے پہن رکھے ہیں"۔

"سرخ بلاؤز اور سیاہ اسکرٹ"۔ خاتون آنسو پونچھ کر بولی۔

"اوہ یہ رنگ تو تم پر بہت جچتے ہیں، میں انہیں اکثر محسوس کرتا ہوں"۔ نوجوان چہک کر بولا۔

"یہ دونوں بہت اچھے رنگ ہیں۔ مجھے ان کی آمیزش بہت پسند ہے"۔ خاتون نے رائے ظاہر کی۔

"مجھے بھی۔۔۔"۔ نوجوان نے پھر موڈ تبدیل کیا۔ اور درد میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔

"یہ تمہارے اور میرے رنگ ہیں۔ سرخ و سیاہ۔ روشنی اور اندھیرا۔ تم اور میں"۔

وہ پتہ نہیں اور کیا کچھ کہتا۔ لیکن اس کے منہ پر جیسے مہر لگ گئی۔ خاتون نے کسی نشانچی کے تیر کی طرح گرم گرم ہونٹ اس کے منہ میں ڈال کر اس کی زبان کو کفگیر کی طرح ہونٹوں کی گرفت میں لے لیا۔ نوجوان کے جسم کا تار تار ساز کی طرح بج اٹھا۔ ریشے ریشے میں حرکت پیدا ہوئی۔ اور جیسے سمندر کی مچلتی لہروں پر ہلکورے کھاتے ہوئے۔ اس کی آنکھوں کی روشنی لوٹ آئی اور اس نے تنگ و تاریک کائنات میں بھی ایک ایسا منور راستہ تلاش کر لیا جو آنکھ والوں کو بھی نصیب نہیں۔ وہ اس راستے کے گداز اور کشادگی میں جیسے غوطہ لگا کے ڈوب گیا۔ چاروں جانب سے متصل کار درختوں کی چھاؤں میں یوں نرم روی سے بہہ رہی تھی۔ جیسے کوئی نازک حسینہ پھولوں کی سیج پر ننگے پاؤں چل رہی ہو۔

جمیلہ ہاشمی

سیپ، کراچی۔

بجھے دیئے

میں گھڑی گھڑی اپنے سیدھے ہاتھ کو دیکھ رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا دو سال کے بعد میں اب اس سے رُوٹی کھا سکوں گا۔ دو سال کے مہینے دو سال کی گھڑیاں، دو سال کے ہفتے اور دو سال کے پل یوں ہولے ہولے میرے سامنے سے کھسک رہے تھے۔ جیسے برسات کے بادل جو چھا جائیں تو لگتا ہے کہ اب آکاش کبھی نہیں دِکھے گا۔ اور اندھیرا گہرا ہوگا اور بڑھے گا۔ اور گرد کی ہر شے ہماری نظروں سے چھپ جائے گی۔

ہری سنگھ چاچا نے اپنی گھوڑی کی باگ کھینچ لی۔ اور میں جو اپنے خیالوں میں ڈوبا الگوں کی طرف جانے والے اکھڑے بکھڑے راہ سے اُس کے پیچھے آ رہا تھا، گرتے گرتے بچا، میرا بازو پکڑ کر اُس نے زور سے ہلایا اور کہنے لگا۔

"یہ سپنے دیکھنے کی عادت عورتوں کو ملی ہے۔ مرد کام کرتا ہے چوٹ کھانا جانتا ہے اور چوٹ مارنا۔ جیت سنگھ کو گرا کر تم ایسے اداس ہو گئے ہو۔ کیوں یار بس یہی بل تھا۔ اگر اتنا چھوٹا دل ہوتا ہے تو عورتوں کے کپڑے پہن کر گھر بیٹھا کرو۔ میلوں ٹھیلوں میں آنے اور یاروں سے بیر کمانے کی کیا ضرورت ہے؟"

میں نے بے بس ہو کر کہا۔ "چاچا تم جانتے ہو میں نے اُس سے بیر نہیں کمایا تھا۔"

ہری سنگھ نے میرا بازو چھوڑ دیا اور چھڑی کو زور سے سر کے اوپر گھما کر گھوڑی کی گردن پر مار کر کہنے لگا۔ "بیر کی ماں بہن کی ایسی تیسی نگھوڑی بے چین ہو کر ذرا سا گھومی اور تیز چلنے لگی۔ "کیا تم سوچتے ہو کہ دوستوں یاروں کے ساتھ بیر کمانا بری بات ہے۔ بات کے لئے جان دے دینا بھی کوئی بڑی بات نہیں۔ پر تمہاری اداسی کی ایسی تیسی تم اداس کیوں ہو۔ تم سپنے کیوں دیکھنے لگتے ہو۔ مرد تو اپنے بیری کو مار کر جان سے ختم کر کے خوش ہوتا ہے اور تمہاری شکل ایسی ہے جیسے جوتے کھا کر آئے ہو۔ میں کہتا ہوں تم اپنی پگڑی کو ہوا میں اچھالو، زور زور سے گاؤ۔ ناچو، اوئے میں پوچھتا ہوں کیا جیت سنگھ کوئی جگ سے نرالا تھا یا تو نرالا ہے، بھتیجے یہ ہوتا ہی آیا ہے۔ ہماری طرف دیکھو ہم نے زندگی میں کیا کچھ کیا ہے پر کبھی نہیں پچھتائے۔"

میں نے پھر اپنی طرف داری کرتے ہوئے کہا۔ "چاچا جیت سنگھ سالا تو یونہی مجھ سے جھگڑ پڑا تو جانتا ہے اُس کا میرا کتنا جوڑ تھا۔ تُو تو خود ہمیں دیوں کی جوڑی کہا کرتا تھا۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" ہری سنگھ نے پھر زور سے چھڑی گھما کر گھوڑی کو مارتے ہوئے کہا۔ "میں کب کہتا ہوں تو اور جیت سنگھ دیوں کی جوڑی نہیں تھے۔ پر جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اس کی موت تیرے ہاتھ سے لکھی تھی۔ اور بھلا تقدیر اگر اتنی زور آور نہ ہوتی تو تیری اور اس کی،

لڑائی ہی کیوں ہوتی۔ تو یہ قسم کیوں اٹھاتا۔ کہ جب تک اُسے مار نہ لے گا سیدھے ہاتھ سے کھانا نہیں کھائے گا۔"
چاچے نے مڑکر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔" ہاں بتا تقدیر کے سامنے کس کا زور چلا ہے۔" بھاؤ تقدیر کے سامنے کسی کا زور نہیں چلتا
جو ہونی ہے اس کو کون روک سکتا ہے۔ دریا کے کنارے بیٹھی دونوں ڈھیریوں میں سے تاگے نکال کر بٹتی اور پانی میں پھینکتی جاتی ہے۔ ہونی
دیوی کے سامنے کس کی پیش گئی ہے۔ مرد کو تو ہونی کے لکھے کو کرنے کے بعد سپنا دیکھنا اور اداس ہونا اچھا نہیں لگتا۔"
میں نے پھر کہا۔ میں اداس کب ہوں چاچا سوچ رہا ہوں جیت سنگھ اگر مجھے خوامخواہ غصہ نہ دلاتا میں اور وہ لڑنہ پڑتے تو آج
میں ان اکھڑے بکھرے راہوں سے پولیس کے ڈر کے مارے بھاگ نہ رہا ہوتا۔ مجھے معلوم ہے ہوگا تو وہی نہ پھر کہیں آکر مجھے پکڑ لے جائے گی۔ مقدمہ
چلے گا۔ سال دو سال چار سال ہم کچہریوں کے چکر کاٹیں گے۔ سختیاں سہنی ہوں گی۔"
ہری سنگھ نے اپنی گھوڑی میرے برابر روک کر کہا۔" سختیوں کے باوجود کوئی شے ہے جسے انسان جیت کہتا ہے اور جو اس کی آنکھوں میں
نشہ اور دل میں غرور بن کر سدا رہتی ہے اور جس کی سمجھ تم لوگوں کو نہیں ہے۔ چلو گھوڑی بڑھاؤ اور تیز چلو۔"
میں اور ہری سنگھ چاچا دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔
شام کے نیلے دھندلکے میں ڈوبتی ہوئی آوازیں ہمارے گرد سونے لگی تھیں۔ گھوڑیوں کے ٹاپوں کی آواز گونج بن کر پھیل رہی تھی۔ اور ٹٹولوں
کی چوچر میرے جی کی اُداسی کی طرح ہر شے کو چھو کر پلٹ رہی تھی۔ کھڑی فصلوں میں سے گزرتے اور چاند کی بکھری کرنوں کی طرح کھیتوں میں گم ہوتی
پگڈنڈیوں کو ڈھونڈتے ہم نامعلوم راہ پر آگے ہی آگے جا رہے تھے۔ جب بالیں گھوڑیوں کے جسموں سے چھوتیں تو وہ کانپ کر آگے بڑھ جاتیں
اور سرسر کرکے بہتی ہوا اپنی جگہ انھیں پھر لوٹا دیتی۔ ہم کھیتوں میں ڈوبی گھوڑیوں پر بیٹھے ہوئے دور دور تک پھیلی اور آکاش کو چھو کر آتی خاموشی
میں دنیا کے آخری انسان لگ رہے تھے، چپ چاپ کسی منزل کے بنا چلتے ہوئے۔
ہری سنگھ چاچا پتہ نہیں مجھے کہاں لئے جاتا تھا۔ وہ بات بہت کم کرتا ہے اور کم بولنے والے سے لوگ یونہی دبنے لگتے ہیں۔ مگر اس کی
چپ سے نہ جانے کیوں میرا جی گھبرا رہا تھا۔ شام کا اکیلا تارا ایک انگارے کی طرح ہمارے سروں سے دور آم کے درختوں کے اوپر چمک رہا تھا
اور کوئل کہیں کوہو کوہو بولتی میرے جی کو دھچکے دے رہی تھی۔ پتہ نہیں ان راہوں سے لوٹنا کب نصیب ہو۔ کبھی کبھار آدمی کے پیچھے اس کے قدموں
کو ہونی مٹا دیتی ہے۔ پھر وہ ان راہوں سے کبھی پلٹ نہیں سکتا۔ مجھے جیت سنگھ یاد آرہا تھا۔ میں حیران تھا اور سوچ رہا تھا کہ اتنے سالوں اس
کے لئے میں نے جو نفرت اپنے جی میں محسوس کی ہے وہ کہاں تھی؟ کیا جیت سنگھ کے اور میرے درمیان وہ بیر نہیں تھا۔ جو دشمن کی موت کے بعد جی
کو ٹھنڈک دیتا ہے۔ اور جیت کی خوشی میں اپنی پگڑی اچھال کر خون سے بھرے ہاتھوں کو سر سے اوپر نچا کر ماہیا گا سکتا ہے؟ کیا میں عورتوں کی طرح
سینے دیکھ رہا تھا۔ میں گھبرا کیوں رہا تھا؟
ہری سنگھ نے کھلے میدان میں سے گزرتے ہوئے کہا۔ سال چھ مہینے بیکانیر میں رہوگے تو لوگ جیت سنگھ کی موت کو بھول جائیں گے وقت
وقت کے دکھ کو بھلا دیتا ہے پھر تم پلٹ سکتے ہو۔
میں نے کہا۔ وقت وقت کے دکھ کو بھلا دیتا ہے چاچا پر بیر کو نہیں۔
ہری سنگھ نے پھر ہولے سے کہا۔ تم شاید ٹھیک کہتے ہو بیر کو بھلا کر ہم لوگ زندہ نہیں رہ سکتے۔ قول کی طرح بیر کا پالن کرنا بھی ہمارے
خون میں ہے۔ پر چھ مہینے سال میں گاؤں کی لڑکیاں اور جوش سے بھرے برادری کے جوان اب تیرے خون کے پیاسے ہیں۔ امن سے اپنے کاموں
میں لگ کر دشمنی کو پرانا سمجھ لیں گے۔ پھر غصہ بھی کم ہو جائے گا۔ تب تم آجانا۔
چاند نکل آیا تھا۔ اور رات کی میٹھی ہوا شام کی نیلی دھول کو کب کی بٹھا چکی تھی۔ اور پانی سے بھری ٹھنڈک جسم کے ساتھ چھو جاتی تو،

سردی کی چادر سی بالنوں میں جھول اٹھی۔ دل کو آپ سے آپ ایک تسلی ہونے لگی۔ دور کے گاؤں کی روشنیاں چاند کی روشنی میں پھیکی اور بجھی بجھی لگ رہی تھیں۔ آبادی کے قریب سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آتی۔ حویلیوں میں ٹمٹماتے دیئے آکاش میں دور دور چمکتے تاروں کی طرح لگ رہے تھے۔ نیلاہٹ میں ڈوبے ہوئے اور ہولے ہولے ڈولتے ہوئے جیسے پانی پہ ناؤ ہچکولے سے کھانے لگے۔

ہری سنگھ نے پھر کہا: "اگر ہم ساری رات یونہی چلتے رہے تو دو دن میں بھی بیکانیر نہیں پہنچ سکیں گے۔ بھاؤ گھوڑی کو ذرا تیز بھگاؤ۔ اب تو راہ بھی سیدھا ہو گیا ہے۔"

مگر پتہ نہیں کیوں مجھ میں تھوڑی سی ہمت بھی باقی نہ رہی تھی۔ میلے کے آخری دن اکھڑتی رونق میں ہم نے سارا دن مل کر شراب پی تھی۔ اور ہاٹ ہاٹ پھر کر میلے میں گھومتی سوانیوں کو جی بھر کر تاکا تھا۔ اور نئے سُنے ہوئے رسیلے گیتوں کو بار بار گایا تھا۔ بھنگڑا ڈالتے ڈالتے تھک گئے تھے۔

جیت سنگھ میری ماسی کا پوت اور گاؤں کا سب سے چھیلا جوان تھا۔ وہ میرے ساتھ اکھاڑے میں اترنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اس کے یاروں کی ٹولی نے اُسے بھی آگے کر دیا تھا۔ وہ اسے دھکیلتے ہوئے لائے تھے۔ سارے گاؤں کو پتہ تھا۔ کہ دو سال پہلے اسی میلے کے دن اس کی اور میری لڑائی ہو گئی تھی میری ٹولی والوں نے اُسے للکارا تھا شراب کے نشے نے ہمیں دگنا بہادر اور نڈر کر دیا تھا۔ اور پھر ہم گتھم گتھا ہو گئے تھے۔ اصل میں اسے جان سے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ جس دن سے میں نے قسم اُٹھائی تھی۔ اور اپنے سیدھے ہاتھ سے روٹی کھانی چھوڑی تھی۔ میرا دل کبھی کبھی اداس ہو جاتا۔ مجھے اپنے کیے پر افسوس ہوتا تھا۔ جیت سنگھ کی اور میری یاری بہت پرانی تھی۔ وہ اور میں چھٹپنے سے ہی ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ عورت کے لئے لڑنا کتنی بیکار سی بات ہے اور پھر بھی اس کا اور میرا جھگڑا ایک عورت کے لئے ہوا تھا۔

بھلا سکھو اچھی تھی یا بری تھی۔ تو اس سے ہم دونوں کو کیا فائدہ۔ سکھو گاؤں کی کھاری اور بڑی طرحدار مٹیار تھی۔ اس کی صورت پر کبھی چاند نہیں چمکا پر تہبند کو ڈھنگ سے باندھ کر پھنسی پھنسی کرتی پہن لیتی تو اس کے جسم میں سے آگ نکلنے لگتی۔ جیت سنگھ اور میں دونوں بہت دنوں اس کی آنکھ سے بچ کر رہے۔ پھر اس کی نظر جیت سنگھ کو کھا گئی۔

ہم دونوں میں سے کوئی بھی سکھو کے لئے لڑنا نہیں چاہتا تھا۔ "پر ہونی کو کون روک سکتا ہے۔" میرے جی میں گرہ پڑ گئی۔ ہم نے ایک دوسرے سے بولنا چھوڑ دیا ہے جوانوں کی دو ٹولیاں بن گئیں۔ گاؤں بٹ گیا۔ میری ماں اور جیت سنگھ کی ماں بہت فکرمند رہنے لگیں۔ پہلے کھیتوں کو جاتے ہوئے وہ میرے گھر میں آتا۔ مجھے آواز دے کر ساتھ لے جاتا۔ گاؤں کی مٹیاریں دروازوں کی درزوں میں سے ہمیں جھانکتیں۔ بہوئیں گھونگھٹ کی اوٹ سے ہمیں دیکھتیں۔ "پر ہماری یاری کو دنیا کی نظر لگ گئی۔"

جب جیت سنگھ کو بچھاڑ کر میں نے اپنی چھری اُس کے پیٹ میں اتاری ہے تو میرا دل ڈوب سا گیا۔ ہری سنگھ نے میری بانہہ پکڑ کر مجھے گھسیٹ لیا۔ اور شور کرتے گالیاں بکتے لوگوں کی بھیڑ میں سے نکال کر وہ مجھے میلے سے باہر لے آیا۔ دونوں گھوڑیاں سرسے راتیاں کی پچھلی طرف سے ہو کر انجھے راہوں سے ہوتی بیکانیر کو جا رہی تھیں۔

چاند اونچا ہوتا جاتا تھا۔ اور کبھی کبھی کوئی اکیلی گونج زور سے چیخ اٹھتی۔ ماہیا گانے اور ڈھولک کے ساتھ اوپر اٹھتے گیتوں کی آواز ادھر ادھر سے آ کر ہمارا راستہ کاٹتی گزر جاتی۔ پھر کوئل بولنے لگتی۔ اور اس کی کوہو کوہو ہچکیوں کی طرح میرے دل کے اندر ڈوب جاتی۔ میرا دل بہت اداس تھا مجھے جیت سنگھ یاد آ رہا تھا۔

ہری سنگھ چاچا کی گھوڑی راہ میں کئی بار ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے بچی۔ اور دن ہوتا تو وہ راہ کی ماں بہن کو گالیاں دیتا مگر آج رات جب میں اور وہ بیکانیر جا رہے تھے۔ اس کو گالی یاد نہ تھی۔ پتہ نہیں اسے کیا کیا یاد آ رہا تھا۔ مجھے گھر یاد آ رہا تھا۔ آنگن میں سے پلٹ پلٹ کر جاتی اور پھر لوٹ کر آتی اپنی ماں یاد آ رہی تھی۔ گلی کا دروازہ کھول کر باہر جھانکتی جیتو اور ما سے بلاتی ہوئی دادی اور اس کا سفید بالوں سے بھرا سر یاد آ رہا تھا۔ سنتو جو کوٹھری

میں باہر کی ہر آہٹ پر کان لگائے بچوں کو سلا رہی ہوگی۔ اور مٹی پر ہاتھ دھرے دھرے کانپ کانپ کر سوچ رہی ہوگی۔ "میلے سے پلٹنے والے پتہ نہیں کب گھر پہنچیں گے۔ اُسے کیا پتہ اب میں کب گھر آؤں گا؟"

مجھے ماں اور جیتو، دادی اور سنتو سب پر رحم آرہا تھا۔ پتہ نہیں ان کا کیا حال ہوگا۔ ریتے والا اور کاتیاں کے درمیان بہنے والی نہر کے پاس پہنچ کر میں نے کہا۔ "چاچا کیوں نہ ہم پلٹ چلیں۔ اور آدمیوں کی طرح کئے ہوئے کام کا نتیجہ بھگتیں؟"

ہری سنگھ نے زور سے میرا بازو پکڑ لیا۔ اور میرا کندھا ہلا کر کہنے لگا۔ "تم کو ان حرفوں نے خراب کیا ہے جو منشی جی کے پاس تم نے مدرسے میں پڑھے۔ تم گاؤں کو نہیں بدل سکتے۔ تم زندگی اور پرانی ڈگر کو نہیں بدل سکتے۔ سب کچھ ویسے ہی رہے گا بھتیجے۔ بدلہ لینا اور آپ کو بچانا یہ دونوں کام ہمیں کرنے ہوں گے بچے۔ چپکے میرے پیچھے چلے آؤ۔ تمہاری عقل کی ماں کی ایسی تیسی تم اب گاؤں میں میری ہنسی اڑواؤ گے۔ میرا بھتیجا اور جیت سنگھ کی ٹولی کے ہاتھ بری موت مرے۔ نہیں بھاؤ یہ نہیں ہوسکتا۔ ہم نے بہت کچھ سہا ہے تم سے زیادہ کڑی زندگی گزاری ہے۔ بہت کچھ آن کی بھینٹ کیا ہے پوری زندگی، چند گھوڑیوں کی بھینٹ ہے۔ ایک بری نظر کا بدلہ بھی لیا ہے۔ ہم نے بہت کچھ کھو دیا ہے بھاؤ۔ اور تم ایک دوستی کو رُو رہے ہو۔ تم لوگ بیر کا پالن نہیں کر سکتے۔ تو قول کا کیا کرو گے۔ تم لوگ مرتے جاتے ہو۔ تمہارا خون بہے ہوئے ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ تمہارے جی کو نہ یاری کا خیال ہے اور نہ دشمنی کا۔ میں نے مل کر کہا۔ "چاچا کیا آج میں نے جیت سنگھ کو نہیں مارا؟"

ہری سنگھ نے مڑ کر کہا اور پھر سوانیوں کی طرح آنسو بہا رہے ہو۔ واپس جا کر اس کی ارتھی کو کندھا دے کر شمشان لے جانا چاہتا یہ کیا ہوا؟

میں نے کہا چاچا تم غلط کہتے ہو۔ ہم ہر شے سے لڑ جاتے ہیں۔ میں آنسو نہیں بہا رہا۔ مجھے گھر چھٹنے کا دکھ ہے۔

ہری سنگھ نے پھر ذرا سا ہنس کر کہا۔ "گھر کی محبت! گھر میں تمہاری ماں ہوگی۔ بہن ہوگی، بیوی ہوگی؟"

میں نے سر ہلا دیا۔

ہری سنگھ نے پھر کہا۔ "اور اگر میں تمہیں ایسے ایسے آدمیوں کا نشان دوں جنھوں نے بہنوں ماؤں اور بیویوں کو قتل کر دیا۔ گھر کو آن پر قربان کر دیا۔"

سنو چاچا۔ میں نے کہا۔ "آج میں بیکانیر کی طرف نکل جاؤں گا۔ اور پھر پتہ نہیں کب پلٹ کر آؤں۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ پیار اور لگاؤ سمیت کسی کو مارنا کٹھن نہیں ہے؟"

"کٹھن۔ کٹھن؟ یہ تم مجھ سے پوچھتے ہو بھاؤ۔ یہ تم مجھ سے پوچھتے ہو؟" ہری سنگھ چاچا نے اپنے دل پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔ اتنی یادوں کا بوجھ دل پر لئے زندہ رہنا کبھی کبھار بہت کٹھن لگتا ہے بھتیجے۔ تمہیں کیا پتہ میں نے زندگی میں کیا کچھ سہا ہے۔ کیا کچھ کھویا ہے کتنے پیار اپنے ہاتھوں دھرتی میں ملائے ہیں۔ تمہیں کیا پتہ ہے جاتن تمہیں کیا پتہ ہے۔ تمہارے پاس یہ آس تو ہے۔ کہ سال چھ مہینوں کو لوٹ کر آؤ گے تو تمہارے گھر کے دروازے کھلے ہوں گے۔ حویلی میں تمہاری ماں اور دادی تمہیں دیکھ کر سینے سے لگا لیں گی۔ تمہاری بہن تم پر سے واری ہونے کے لئے اپنا دل بھی نکال کر تمہارے قدموں میں رکھ دے گی۔ تمہاری بیوی گھونگھٹ کو ماتھے تک کھینچے کھینچے آنگن میں آکر تمہیں ایک نظر دیکھے گی۔ تمہاری لڑکیاں تمہاری ٹانگوں سے چمٹ جائیں گی۔ تم مر نہیں سکتے جاتن دنیا کے رستے بستے دل میں تمہارا حصہ ہے۔ پر میری طرف دیکھو۔"

میں نے چاند کی کرنوں کے بہتے دھارے میں ہری سنگھ چاچا کی طرف دیکھا۔ اس کی سفید داڑھی پر آنسو چمک رہے تھے۔ اور آنکھیں اندر دھنسی ہوئی اور بے نور لگتی تھیں۔ اُس نے باگیں چھوڑ دی تھیں اور گھوڑی اَن مَنے دل سے اجنبی راہوں پر بیگانوں کی طرح ایک ایک قدم چل رہی تھی۔ اور چاچا یوں بیٹھا تھا جیسے اُسے کہیں جانا نہ ہو۔ میلے کا شور بہت دور پیچھے رہ گیا تھا۔ پہلے میلے سے پلٹتے ہمارے ساتھ نئی خریدی ہوئی گھوڑیاں ہوتی تھیں۔ ہانپتی اور تیز دوڑتی ہوئی ایک ایک دو دو کی ٹولیوں میں بٹ کر ہم باتیں کرتے اور شراب کی بوتلیں بانٹ بانٹ کر پیتے اور ٹھٹھا کرتے ہوئے گاؤں کو لوٹتے۔ آج میں اور ہری سنگھ چاچا گاؤں سے الٹی طرف جا رہے تھے۔ چاچا بھی اُداس تھا۔

"چانن تمہاری ماں کی طرح اگر میری ماں بھی ہوتی تو آج دل پر ہاتھ دھرے ڈوبتی جان کے ساتھ تمہیں بیساکھی کی راہ دکھاتا اور مردوں کی طرح ہر مصیبت کا مقابلہ کرنے کی نصیحت کرتا۔ آپ اتنا اداس نہ ہو جاتا۔ تم بھی کہو گے میں اتنا بوڑھا ہو کر بھی ماں کو یاد کر رہا ہوں۔ سفید بالوں اور بیتے سالوں کا بوجھ اٹھائے اٹھائے ایک زمانہ گزر گیا ہے چانن اور پھر بھی میں ماں کو یاد کر رہا ہوں۔ تم اس کو میرے دماغ کی خرابی کہو گے۔ تم سوچو گے میں پاگل ہوں۔

میں نے ہولے سے کہا "نہیں چاچا میں تمہیں پاگل نہیں سمجھتا۔ میں تمہیں غلط بھی نہیں کہتا۔ مجھے تمہاری بات پر اعتبار ہے۔"

ہری سنگھ نے پھر کہا "اعتبار کرو یا نہ کرو بھتیجے۔ پر یہ باتیں میں تمہیں ضرور کہوں گا۔ تاکہ تمہیں معلوم ہو کہ زندگی میں کیا کچھ سہنا پڑتا ہے اور کسی کسی آتما میں گہرے گھاؤ ہوتے ہیں جسے نہ خوشی بھر سکتی ہے اور نہ ہی گزرتا وقت۔

"چاچا!" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ دھر کر کہا۔ "میں نے زندگی کا ابھی کچھ نہیں دیکھا پر پتہ نہیں کیوں جیت سنگھ کا پیار میرے جی میں لوٹ آیا ہے وہ نہیں ہے اور میں سوچتا ہوں اگر وہ ہوتا تو آج ہم سکھو کو بیچ میں سے نکال کر پھر صلح کر لیتے۔ پچھلے دنوں کی طرح پھر گلے میں باہیں ڈال کر چلتے۔ اور دیوں کی جوڑی کہلاتے۔"

ہری سنگھ نے ٹھنڈی سانس بھری کہنے لگا ابھی رات باقی ہے سرحد کوٹھی دور ہے آؤ اس اجاڑ کھوہ کی منڈیر پر بیٹھ جائیں۔ میں تمہیں اپنا دکھ سنا ہی دوں۔ تاکہ تمہارے جی کو تسلی ہو کہ لوگ جیت سنگھ سے بھی پیاری چیزیں اپنے ہاتھوں برباد کر سکتے ہیں۔

میں کھوہ کی منڈیر پر بیٹھ گیا۔ جو کہیں کہیں سے اینٹوں کے اکھڑے ہونے کی وجہ سے بہت پرانی لگ رہی تھی۔ درزوں میں اُگے پیپل کے پتے چاندی میں چمک رہے تھے۔ اور ہوا شاخوں میں سن سن کرکے گزر رہی تھی۔ ہم نے گھوڑیوں کے رسے گرے ہوئے ستون کی ایک مضبوط اینٹ میں پھنسا دیئے۔ ایک الو چیختا ہوا ہمارے سروں پر سے گزر گیا۔ گھوڑیاں ڈر کر ستون کے گرد چکر کاٹنے لگیں۔

ہری سنگھ نے کہا۔ "کھوہ اور گھر تب اجڑتے ہیں۔ جب ان کو چلانے والا باقی نہ رہے ماں کے بعد ہمارے گھر کا بھی یہی حال ہوا تھا۔ پرتیو کو پالنے اور سنبھالنے کا سارا بوجھ میرے اور باپو کے سر پہ آ پڑا۔ میری ماں نے بہت دکھ سہے ہیں۔ پر وہ دیئے کی لو کی طرح بھڑک کر بجھ نہیں گئی۔ چپکے چپکے، ہولے ہولے گھل گئی۔ باپو کی طبیعت کی سختی نے اُسے برباد کیا ہے اُس کی طبع بڑی نازک تھی۔ بیل بیمار ہوتے تو وہ پریشان ہو جایا کرتی تھی۔ کسی کی تکلیف اُس سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ آپ دکھ اٹھاؤ تو دوسرے کے دکھ کی قدر ہوتی ہے پر کئی تکلیفیں انسان کو پتھر بنا دیتی ہیں۔ ماں کا دل سونا بن گیا تھا۔ میری ماں بہت بڑی عورت تھی چانن بڑی اور اونچی عورت۔ اس نے کبھی کسی سے شکایت نہیں کی۔ کبھی روئی نہیں۔ باپو کی جوانی میں اُس نے سوکنوں کے نخرے اٹھائے ہیں۔ رات رات بھر کھڑی رہی ہے دھوپ کی سختیاں سہی ہیں۔ پوہ کی راتیں باہر بیٹھ کر کاٹی ہیں۔ اور جب میں جوان ہوا تو پرتیو کو چھوڑ کر وہ چلی گئی جیسے اس ستون کے پیچھے چھپ گئی ہو۔ مجھے آج بھی یقین نہیں کہ وہ مر گئی تھی۔ اُس نے بہت کچھ سہا ہے اُس میں اور بہت کچھ سہنے کی طاقت تھی۔ میں کیسے مان لوں کہ وہ مر گئی۔ اگر تمہیں میں ماں کی تکلیفوں کا حال سنانے بیٹھوں تو یہ رات بہت بیت جائے گی۔ اُس سے اگلی رات بیت جائے گی اور اُس سے اگلی بھی۔ پھر اُس کے دکھ کی کہانیاں مجھے سچی نہیں لگتیں۔ وہ باتیں میں نے دوسروں سے سنی ہیں۔ بھلا اکیلی اور کمزور سی کم بولنے والی عورت کتنا کچھ سہہ سکتی ہے پرتیو کو چھوڑ کر وہ مری ہے تو میں اور باپو دونوں اکیلے رہ گئے۔ اور دونوں کے کندھوں پر پرتیو کو پالنے کا بوجھ پڑ گیا۔ ماں کے مائکے گھر کے لوگ لڑکی کو لے جانا چاہتے تھے۔ پر باپو کا دل پتہ نہیں کیوں ایکا ایکی اتنا نرم ہو گیا تھا۔ اُسے ماں کو دی ہوئی تکلیفیں یاد آتی تھیں اور وہ پرتیو کو اپنے سے جدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پرتیو ہمارے سامنے بڑی ہوئی ہے میری پوروں میں اُس کے جسم کی نرمی ہے میرے دل میں آج بھی اس کا پیار ہے۔ ایسا نہیں جیسا ایک بھائی کو عام زندگی میں ایک بہن سے ہوتا ہے۔ مجھے لگتا تھا میرا جسم ایک درخت تھا اور وہ میری ایک شاخ تھی۔ اس کے ٹوٹ جانے کا گھاؤ کبھی نہیں بھرے گا۔ چانن سنگھ وہ شاخ ٹوٹ کر اپنا نشان چھوڑ گئی ہے۔ پرتیو ایک چاند تھی جس سے میری زندگی کی تپت میں ذرا سی ٹھنڈک ہوتی تھی۔ میں ماں کا بدلہ باپو سے نہیں لے سکتا تھا۔ ہمارا بھی کیا رشتہ تھا! میں نے پرتیو کو پوجا ہے۔ گرنتھ کی طرح پوتر اور آتما کی طرح میرے سانس کی ڈوری اُس میں اٹکی ہوئی تھی۔

وہ بڑی ہوتی گئی۔ تو ہمارے گھر میں مانو بہار آنے لگی۔ باپو سکھ کا سانس لینے لگا۔ میں باہر سے آتا تو وہ دوڑ کر میری ٹانگوں سے لپٹ جاتی۔ میں

چاہے کہ گھٹنا زمین پر ٹیک کر سب سے پہلے اُسے اپنے بازوؤں میں اُٹھا لیتا۔ اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر میرا دل کیسا ہلکا ہلکا لہروں پر ڈولتا لگتا۔ جانتن تمہیں کیا بتاؤں وہ کیا شے تھی۔ اس کی باتیں ذرا ذرا سی ساری مجھے ایک ایک کر کے یاد ہیں۔ چاہو تو میں تمہیں ایک ایک دن کی ساری باتیں سنا دوں۔

ذرا سی اونچی ہوئی تو گھر میں ساری چیزیں ٹھکانے سے نظر آنے لگیں۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے روٹیاں پکا کر جب وہ مجھے اور باپو کو کھلاتی تو ہمیں اپنے سے زیادہ خوش اور کوئی دکھائی نہ دیتا۔ چھوٹی چھوٹی انگلیوں میں تاگے کا تار پکڑے اُس نے چرخہ بھی کاتا ہے۔ کمزور بانہوں سے دودھ بھی بلویا ہے جانتن پتہ نہیں اُس میں اتنی طاقت کہاں سے تھی۔ بھلا دس سال کی لڑکی کیا کچھ کر سکتی ہے؟

اور بڑی ہوئی تو اس نے بڑا روپ نکالا۔ تتلی سی آنگن میں ادھر سے ادھر گھومتی پھرتی اور کام کرتی رہتی۔ رات کو وہ کر لیٹتی تو اب مجھ سے کہانیاں بھی نہ سنتی۔ میں کہتا "پریتو تو اب پریوں کی کہانی نہیں سنے گی؟" تو ہنس کر کہتی "ویر بھلا اب میں کہانیاں سننے جتنی ہوں۔ اب تو میں بہت بڑی ہو گئی ہوں" میلے پر جاتا۔ تو میں اس کے لئے رنگ برنگ چوڑیاں مٹھائی اور کوئی کام کی شے ضرور لاتا۔

چوڑیاں بھی کیا شے ہے جانتن۔ عورت پہن لے تو وہ گیت بن جاتی ہے۔ ہولے ہولے چھن چھن کرتی۔ ایک دوسرے سے ٹکرا کر راگ پیدا کرتی چوڑیاں عجیب چیز ہیں۔ کانچ کی چوڑیاں جیسے بات شروں کو کسی نے بانہہ میں پرو دیا ہو۔

ہری سنگھ چپ ہو گیا۔ جیسے بہت سی باتوں کے بوجھ تلے دبا سسک رہا ہو۔ رات بیتی جا رہی تھی۔ چاند کے سامنے سے سفید بادلوں کے ٹکڑے ذرا ذرا سے پرندوں کی طرح اڑ اڑ کر ہوا کے زور سے بکھر رہے تھے۔ "میلے پر جانے کی ایک شام مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے۔ پریتو نے حلوہ پکایا تھا اور پراٹھے پکا کر میرے لئے اپنے ہاتھوں سے کاڑھے ہوئے ایک رومال میں باندھے تھے۔ جب میں نے پگڑی کو کس کس کر باندھا تو میرے پاس کھڑی ابرق کو اکٹھا کرتی رہی۔ پھر اس نے میرے سر پر سے اشق وارے۔ میں نے کہا پریتو تجھے یہ باتیں کہاں سے آتی ہیں تو کہنے لگی" مجھے اور بھی بڑی باتیں پتہ ہیں ویر اس طرح سے نظر نہیں لگتی"۔

میں نے شام سے پہلے پہلے ہی گھوڑیاں تیار کر کے اور سامان لاد کر اونٹوں کو بیوپاریوں کے ساتھ میلے میں بھجوا دیا تھا۔ پریتو کہنے لگی ویر میرے لئے میلے میں سے ڈھیر ساری رنگ برنگی چوڑیاں لانا مٹھائی بھی اور ایک پینگوں والی چنری بھی۔ جب میں دروازے میں سے نکلا ہوں تو بوڑھی ماسی نے پیچھے سے آواز دے کر کہا۔" وے جانتن میرے لئے کرتے کا کپڑا لانا" پریتو کو میں نے ماسی سے کبھی زور سے بولتے نہیں سنا پر اس دن چیخ کر کہنے لگی "ماسی بھلا جاتے ہوئے کسی کو پیچھے سے آواز دیتے ہیں تو بھی پاگل ہی ہے سکھ سے میرا ویر گیا ہے سکھ سے لوٹ کر آئے"۔ میں نے مڑ کر دونوں کو دیکھا۔ اور ہنس پڑا۔ پریتو کو کتنی عقل آگئی تھی۔ شام نے مجھے سکھ کھیڑے سے ادھر ہی آ لیا۔ کالے بادل آگے پیچھے بڑھتی فوجوں کی طرح اکٹھے ہو گئے اور جب میں اپنے گاؤں سے دو کوس گیا تھا۔ تو مجھے یاد آیا۔ کہ میں نے جلدی میں اپنا کھیس بھی نہیں لیا۔ اور نہ ہی بڑی کرپان لی ہے۔ یہ سوچتے سوچتے میں سکھے کھیڑے جا پہنچا۔ میلے میں جانے والے لوگ گڈوں پر گھوڑیوں پر اونٹوں پر ایک ایک دو دو چار چار جا رہے تھے۔ گھوڑیوں کے پاؤں میں پڑے گھنگرو چھن چھن کرتے ہوئے ماہیا گانے والوں کی لے میں رس سا گھولتے۔ اونٹنیاں بھاری قدموں سے تیز تیز چلتی ہوئی مستانی چال سے جھولتی ہوئیں اوپر بیٹھے اونٹ والوں کو بہنے والے دھارے میں لہر پیدا کرتی ہوئی آگے ہی آگے جا رہی تھیں۔ گڈوں کے نیچے بتیاں جل رہی تھیں اور جوان بیلوں کے دو دو سیاہ پنڈے بادلوں کو چیر کر چاند کی کرنوں میں جگ مگ کرتے جیسے کسی لڑکی کا دمکتا ہوا بدن ہو۔ جوان ہوتے لڑکے شور کر رہے تھے۔ اور جانوروں کی بولیاں بول رہے تھے۔ گھوڑے دوڑا کر آگے نکلنے والے لڑکوں کو میلے کی خوشی اور زندگی کا نیاپن شراب کے نشے کی طرح مدہوش کر رہا تھا۔ اُجاڑ راہیں آباد تھیں۔ اور گرو کے نام کا نعرہ درختوں کے نیچے کچے راستوں اور چھوٹی راہوں پر زور سے گونج اٹھتا۔

میں نے سوچا کیوں نہ واپس جا کر کھیس لے آؤں۔ کرپان کے بنا میلے میں جانا بھی بھلا نہیں لگتا۔ لوگوں سے یونہی ٹکرا جانا ذرا ذرا سی باتوں پر لڑنے لگنا، میری عادت نہیں۔ اور پھر یہ کوئی مردمی تو نہیں۔ کہ کرپان ہاتھ میں ہو تو ساری دنیا تمہیں کیڑے مکوڑے کی طرح لگے۔

میں نے کہا چاچا میں نے تو ایسا نہیں سوچا تھا۔ جیت سنگھ مجھ سے تکڑا جوان تھا اور تمہیں پتہ ہے اس نے کبھی کسی سے پچھاڑ نہیں کھائی۔ کسی سے دبا نہیں۔

ہری سنگھ نے میرے کندھے پر ہاتھ دھر کر کہا۔ پر جوان میں نے یہ کب کہا ہے کہ تو نے جیت سنگھ کو کمزور سمجھ کر مارا ہے۔ میں تو اپنی بات کر رہا تھا۔ پہلے میں کرپان نہ ہو تو آدمی خالی خالی لگتا ہے جیسے سوتے سے اُٹھ کر چلا آیا ہو۔ پگڑی کا ابرق اور تہبند کے لڑ کرتے کے رنگ اور دھوتی کی ادرک آگے نوک سب کمین کی اکڑ لگتے ہیں۔ سکھتے کھیڑے میں میرے پہنچنے سے پہلے ہی میرے یار میلے کے لئے جا چکے تھے۔ حویلیوں میں دیئے جل رہے تھے۔ اور بوڑھے کہار آگ تاپتے ہوئے ایک ایک دو دو پرانے سرداروں کے قصے سنا رہے تھے۔ عورتیں باہر سے لوٹ رہی تھیں۔ اور جوان لڑکیاں زور زور سے باتیں کرتی کھلکھلا ہنس رہی تھیں۔ میں نے اپنی باگیں کھینچیں اور گھوڑی کو دوڑاتا گاؤں پلٹ آیا کہ کھیس اور کرپان لیکر پھر جاؤں گا۔

گلیوں میں خاموشی تھی۔ تیز ہوا کے ساتھ پتے اور گرد اڑ رہی تھی۔ بادل سکھتے کھیڑے کی طرف چلے گئے تھے۔ اور ہمارے گاؤں پر چاند ہولے ہولے نیلے پانی میں کشتی کی طرح تیر رہا تھا۔ سفید بطخ۔ اکیلی جوہڑ کے میلے پانی پر ہو پتہ نہیں کونسی طاقت تھی جو مجھے واپس لائی تھی۔ گھر کی دیوار کے ساتھ نیم کا ایک پرانا درخت ہے اب تو اس کی شاخیں آنگن میں بہت اندر کی طرف جھک آئی ہیں اور دیوار میں بڑی درز پڑ گئی ہے۔ ان دنوں نیم کی ڈالیاں دیوار سے اندر کی طرف جھکی جھکی اور نرم تھیں۔ اور آدمی آرام سے اُس پر سے کود کر بنا آواز پیدا کئے۔ آنگن میں اتر سکتا تھا۔ میں نے گھوڑی کو نیم کے ساتھ باہر باندھ دیا اور دیر ہو جانے کے ڈر سے کود کر اندر چلا گیا۔ بوڑھی ماسی رضائی میں منہ دیئے باریک خراٹے لے رہی تھی۔ سانس کے ساتھ اُس کے گلے میں بلغم غرغر کرتی۔ دیا جل رہا تھا اور پریتو کا پلنگ خالی تھا۔ پہلے میں نے سوچا ماسی کو جگا کر اُس سے اتا پتہ پوچھوں۔ میں نے چاروں طرف دیکھا دیا بجھا کر دوسری کوٹھڑی میں رکھ دیا اور آپ اُسی راہ سے باہر آ گیا۔

میرا خون کھول رہا تھا۔ میرا دل پاگل ہو رہا تھا۔ سردی کے باوجود مجھے پسینہ آ رہا تھا۔ پریتو کے لئے پیار کی تہوں میں چھپا پتہ نہیں کب کا دبا غصہ میری نس نس میں گھوم رہا تھا۔ میں کھیتوں کی طرف چلا گیا۔ میں پریتو کو زور سے پکارنا چاہتا تھا۔ اتنی زور سے کہ میلے کو جاتے لوگ رک جائیں۔ اور مجھ سے پوچھیں کیوں کیا بات ہے؟

کھیتوں کی اونچی منڈیروں اور شہتوت کے خوشبودار مٹھاس سے بھرے درختوں سے ٹکرا کر میری آواز لوٹ آئے اور پریتو اُس کے ساتھ ساتھ اُڑتی میرے پاس آ جائے۔ کبھی کبھار دماغ بھی کیسی انہونی باتیں سوچتا ہے

گھوڑی کو میں نے ایک اجاڑ کھوہ پر باندھ دیا۔ میں دوڑ رہا تھا۔ میرا سانس پھول رہا تھا۔ پتہ نہیں کون شے تھی جو مجھے آگے بڑھا رہی تھی۔ میں زندہ تھا میرا سانس چل رہا تھا۔ کیوں چاننی کیا تو نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ ایسی گھڑی تمہارے سر پہ ہے جب اُس کے بوجھ سے تمہارا دم بند ہو سکتا ہے تم موت اور جینے کے درمیان کسی ایسی حد پہ تڑپ رہے ہوتے ہو جو حد تم چھو نہیں سکتے اُس حد کا کوئی نام نہیں۔

پھر میں نے پریتو کو دیکھا۔" وہ اور جوالا سنگھ ایک درخت کے پاس کھڑے تھے جو ذرا اوٹ میں تھا اور اونچے کھیت کی وجہ سے نظر بھی کم ہی آتا تھا۔ پریتو کے بعد میں نے وہ درخت آپ کاٹ دیا تھا"

کون جوالا سنگھ۔ میں نے جلدی سے پوچھا۔

اوئے بھئی وہی جوالا سنگھ جو میری ماسی کا پوت تھا۔ جس کا گھر تمہارے گھروں کے ختم ہوتے ہی گلی کے دوسرے سرے پر ہے جس میں چنت کور رہتی ہے۔" ہری سنگھ نے بڑی بیزاری سے جواب دیا۔

" اچھا اچھا سمجھ آ گئی میں وہ دوسرا جوالا سنگھ سمجھ رہا تھا۔ ہرنام سنگھ کا سالا۔ میں نے بڑی آسانی سے جواب دیا۔ تم سوچتے ہو میری بہن سے بات کرنے والا میری چوری چھپے اُس سے ملنے والا آدمی آج تک زندہ ہو سکتا ہے۔ تم مجھے کیا سمجھتے ہو بھتیجے؟ کیا تم کو یہ یقین ہے کہ اُس رات جب میں

میلے پر جانے کے لئے گھر سے چلا گیا تھا۔ اور پرتیو اُس سے ملنے اُس شرین کے پاس کھڑی تھی۔ میں نے جوالا سنگھ کو زندہ رہنے کے لئے چھوڑ دیا ہوگا۔ پرتیو اُسے کہہ رہی تھی " جوالا سنگھ تو میرے ویری کی طرح سندر نہیں اور نہ ہی میرے باپو کی طرح بہادر ہے پر پھر بھی تو مجھے اچھا لگتا ہے۔

جوالا سنگھ نے کہا " ایسی باتیں تو ہر عورت کسی نہ کسی مرد سے کہتی ہے۔ مزہ تو تب ہے کہ تو زندگی میں ہی نہیں موت میں بھی میرا ساتھ دے سدا سدا کے لئے مجھ سے نباہ کرے "

اور پرتیو نے اس کے بازو پر ہاتھ دھر کر کہا " اچھا جوالا سنگھ میرا تیرا قول رہا۔ میں موت میں بھی تیرا ساتھ دوں گی "

وہ موت سے کتنے قریب تھے۔ میں کھیت کی اوٹ میں اُن کے پیچھے کھڑا رہا۔

پہلے میرا جی چاہا کہ میں کرپان کا ہاتھ لمبا کر کے ماروں اور اُن دونوں کو وہیں گرا دوں۔ پھر میں کچھ سوچ کر پلٹ آیا۔ میں گھر میں پرتیو کے پلنگ میں لیٹ کر اُس کا انتظار کرنے لگا۔ ایک ایک آہٹ پر میں چونک چونک جاتا۔ وقت جوں کی چال چل رہا تھا۔ کھسکتا ہوا بھی نہیں لگتا تھا۔

بہت دیر کے بعد ذرا سا کھٹکا ہوا۔ جیسے کوئی بلی آنگن میں کودے۔ پھر سانس روکے پنجے کے بل چلتی پرتیو اندر آئی۔ اُس نے ٹٹول ٹٹول کر اپنا پلنگ ڈھونڈا۔ جس پر موت اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ موت بھی محبت کی طرح زبردست ہے۔

جب میں نے اُس کا ہاتھ پکڑا ہے تو وہ ٹھنڈا تھا۔ میں اُسے گھسیٹتا ہوا دوسری کوٹھڑی میں لے آیا۔ وہ میرے ساتھ یوں کھنچی چلی آئی جیسے اُس میں جان نہ ہو۔ دیئے کی لو کو اونچا کر کے میں نے اُسے کہا۔

" سچ بتا تو کب سے جوالا سے ملتی ہے ؟ "

مگر اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سر نیچا کئے بیٹھ گئی اور آخر تک اُسی طرح بیٹھی رہی۔ میرا جی دم دم آگ ہو رہا تھا۔ میں اونچی آواز سے بول بھی نہیں رہا تھا۔ کوٹھڑی میں ہماری آواز کی گونج نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا۔ ہم دونوں سانس بھی نہیں لے رہے تھے۔ جب میں نے کہا۔ " اُس جوالا سنگھ سے بھی نمٹ لوں گا " تو پرتیو نے سر اونچا کر کے مجھے دیکھا اور کہنے لگی " ویر اُس کا کوئی قصور نہیں "

میں نے دانت پیس کر کہا " اچھا اُس کا کوئی قصور نہیں تو نہ سہی " پھر میں نے کرپان کے ایک ہی ہاتھ سے اُس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ اُس کا جسم تھوڑی دیر تڑپا اور پھر ہولے ہولے ٹھنڈا ہو گیا۔ میں نے اُس کے ٹکڑے کئے اور بوری میں بند کر کے اناج کی کوٹھڑی میں رکھ دیئے۔ آنگن میں دبے قدموں چلتا میں نیم کے راستے گلی میں آ گیا۔

چنت کور کے گھر میں جو پیپل ہے وہ اُن دنوں اتنا اونچا نہ تھا۔ دیوار کے برابر اگر کسی طرح باہر کی طرف سے چڑھ جاؤ تو اندر جانے میں آسانی رہتی ہے۔ جب میں نے اندر جا کر جوالا سنگھ کی کوٹھڑی کا دروازہ کھٹکھٹایا ہے تو میرا دل بڑا شانت تھا، ٹھنڈا اور کام کرنے کے لئے تیار۔ جوالا سنگھ نے کرتا نہیں پہنا ہوا تھا۔ دونوں بغلوں میں ہاتھ دیئے جب اُس نے " کون ہے ؟ " کہہ کر دروازہ کھولا۔ تو میں موت بن کر اُس پر جھپٹ پڑا۔ میں نے اُسے ہلنے اور بولنے کا وقت بھی نہ دیا۔ اپنی پگڑی سے میں نے اُس کے ہاتھ پیر اچھی طرح جکڑ دیئے۔ منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ کہ وہ ہل اور بول نہ سکے۔

بخشی ابھی تک سو رہی تھی۔ بخشی میری پرتیو کی بڑی سہیلی تھی۔ جوالا سنگھ کی ماں کے مرنے کے دوسرے مہینے برادری کی سب سے چھوٹی لڑکی کو چاچے کرتار سنگھ نے جوالا سنگھ کے لئے مانگا تھا۔ اُس کا گھر سونا تھا۔ سارے لوگوں کو اُس سے ہمدردی تھی۔ اور بخشی کے باپ نے کہا تھا " میں نے تجھے اپنی لڑکی دان دی ہے۔ بخشی بڑی الھڑ تھی۔ وہ گھر کو سنبھالنے کے قابل نہ تھی۔ یوں بھی پرتیو جیسی سوجھ بوجھ ہر لڑکی میں کہاں ہوتی ہے۔ بخشی کی عادتوں میں ابھی بچپنا تھا۔ اور اسی لئے جب اُس کے پاس ہی میں نے جوالا سنگھ کو باندھا ہے تو بھی وہ نہ جاگی۔

پھر میں نے اُسے جگا کر باندھ دیا۔ وہ بندھی ہوئی بھی اونگھ رہی تھی۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سارا تماشا کیا ہو رہا ہے وہ بڑی بڑی آنکھیں کھولے، میلے بالوں میں گندی سی گڑیا لگ رہی تھی۔ جو یونہی کسی مصیبت میں پڑ گئی ہو۔

پھر میں نے بوڑھے کرتار سنگھ کو بھی رسیوں سے جکڑا اور اُسے بھی اُس کوٹھڑی میں لے آیا۔

پھوس کے ڈھیر میں نے پہلے سے ہی کھسکا کر کوٹھڑی کے دروازے کے قریب کر لئے تھے۔ پھر میں نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "جوالا سنگھ! میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا۔ تو میری ماسی کا پوت تھا۔ تو نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے تجھے اس کا بدلہ دینا ہوگا۔ جوالا سنگھ کی آنکھوں میں خوف تھا۔ جیسے اُس کھیل کا ایسا آخر اس کی سمجھ میں نہ آرہا ہو۔ ایک بچے کی طرح جس نے کھیلتے کھیلتے اپنی سب سے پیاری شے کھو دی ہو۔ اور اب افسوس بھی نہ کر سکتا ہو۔ پر اُس کی آنکھوں میں زندگی مانگنے کی بھیک نہ تھی۔

میں نے کہا۔ "تم دونوں نے زندگی اور موت میں ایک دوسرے کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا یہ قول نبھانا ہوگا۔" پھر میں نے بخشی سے کہا۔ "بخشی تو نے میرا قصور نہیں کیا۔ میرا تیرا کوئی جھگڑا نہیں۔ تو اگر چاہے تو بچ سکتی ہے۔ تو جوالا سنگھ کے ساتھ کیوں آگ میں پڑے۔ بول بخشی! تیری اور میری بہن کی بڑی پریت تھی۔ اب وہ پریت نہیں رہی۔ وہ بھی نہیں رہی۔ پر مجھے تجھے کچھ نہیں کہنا بول!"

جب میں نے بخشی کا منہ کھول دیا تو وہ کہنے لگی۔ "ہری سنگھ گرنتھ کے سامنے میرے اور جوالا سنگھ کے پھیرے ہوئے تھے۔ اور میں نے بھی آخر تک اُس کا ساتھ دینے کا قول کیا تھا تب واہ گرو بھی وہاں تھا۔ اب بھلا میں اسے چھوڑ کر کہاں جاؤں گی اس کے پیچھے زندہ رہ کر کیا کروں گی بتا؟"

وہ چھوٹی اور الھڑ سی لڑکی کہاں تھی۔ وہ لڑکی جو تھوڑی دیر پہلے بڑی چھوٹی سی گندی میلی گڈی لگ رہی تھی۔ اور یہ عورت جو جوالا سنگھ کے ساتھ موت قبول کر رہی تھی۔ یہ یقیناً بخشی نہ تھی۔

میں نے کہا۔ "اچھا جو تیری اور واہ گرو کی مرضی ہو۔ اور میں نے اس کا منہ پھر باندھ دیا۔

پھر میں نے چاچے کرتار سنگھ سے کہا۔ "چاچا تیری میری کوئی لڑائی نہیں۔ میرا باپو تیرا بھائی ہے تو ہماری برادری کا سب سے عقلمند آدمی ہے۔ تیری بات چوپال میں کسی نے کبھی رد نہیں کی۔ بتا میں کیا کروں۔ جوالا سنگھ نے میری عزت پہ ہاتھ ڈالا ہے۔ میں اسے چھوڑ نہیں سکتا چاچا، پر تیری زندگی تیرے اپنے ہاتھ میں ہے اگر تو کہے تو میں تجھے چھوڑ دوں۔

چاچے نے کہا۔ "ہری سنگھ پوت یہ زندگی کی ڈگر ہے جس کو ہم میں سے کوئی بدلنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ تو نے جو کچھ کیا اگر نہ کرتا تو تو مرد نہ ہوتا۔ تیری راہ سیدھی ہے میں تجھے دوش نہیں دوں گا۔ پر میں بھی بہت بوڑھا ہوں اور جوالا سنگھ کے بعد مجھ سے اُس کی موت کا بدلہ لینے کے قابل نہیں۔ میری ہڈیوں میں اب نہ وہ جوش ہے اور نہ طاقت۔ جوالا سنگھ کے بعد میں زندہ رہ کر کیا کروں گا۔ ہری سنگھ اچھا ہے تو جو کچھ اُس کے ساتھ کرنا چاہتا ہے کرے پر ہم اس کا ساتھ دیں گے۔ میں بھی اور بخشی بھی پھر اس نے پہلی بار اپنی ننگے سر بیٹھی بے بس بہو کو دیکھا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

میں نے پھوس کے ڈھیر ہوتے ہوئے اُن کے گرد چن دیئے۔ مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگا دی۔ اور کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے باہر نکل آیا۔

اناج کی کوٹھڑی میں سے پرپتو کے ٹکڑوں سے بھری بوری اٹھا کر میں جب تیزی سے گلیوں میں سے گذرتا نہر کے پل کی طرف جا رہا تھا۔ تو گاؤں میں واویلا مچا ہوا تھا۔ لوگ جوالا سنگھ کے گھر کے گرد اکٹھے ہو رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا وہ تینوں کب کے جل چکے تھے۔ تینوں جنہوں نے الگ الگ مرنے اور بہت دنوں ایک دوسرے کا انتظار کرنے کی بجائے ایک ساتھ مرنا قبول کیا تھا۔

نہر پانی سے بھری ہوئی اور بادلوں کے سیاہ ٹکڑوں کے پھٹے کناروں سے جھانکتی روشنی میں سیاہی اور سفیدی سے بنا دور تک پھیلا کپڑا لگ رہی تھی۔ پل کے نیچے اندھیرا تھا۔ اور پانی گھمر گھمر کر کے ستونوں کے ساتھ ٹکرا رہا تھا۔ اچھل رہا تھا اور بھنوروں میں گھوم رہا تھا۔ اندھیکار جس کا رشتہ پتہ نہیں کس پاتال اور کس ساگر کے ساتھ تھا۔ میں نے بوری کو سر سے اوپر اٹھایا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے لگا جیسے میں آپ بھی اپنے سر سے اونچا اُٹھ گیا ہوں اور اب بوری کے ساتھ نہر میں گر جاؤں گا۔ مگر میرے قدم دھرتی پر تھے اور ابھی کتنے ہی گناہوں کا بوجھ میں نے اٹھانا تھا۔ پرپتو کے سپنے اور اس کی آشائیں سارے اندھیرے میں اپنا راہ ڈھونڈنے میں کسی نئی پاتال میں اتر گئے۔ اُس گھڑی مجھے یاد آیا۔ کہ میلے پر جانے سے چند دنوں پہلے سے میں نے اُسے آپ ہی آپ ہنستے

دیکھا تھا چوکے میں بیٹھی ہے۔ روٹی پکا رہی ہے اور من ہی من مسکرا رہی ہے۔ ہونٹ آدھے کھلے ہیں اور آنکھیں پتہ نہیں کیا دیکھ رہی ہیں۔ جیسے وہ اس دنیا میں نہ ہو
میں اور بابو چارپائی پر بیٹھے ہیں اور پانی پکڑانے میں بے دھیان سے وہ گلاس میری جگہ بابو کو روٹی میرے تھال میں رکھ رہی ہے۔ ماسی بھی اُن دنوں بھولے
بھٹکے آتی رہتی۔ مگر پریتو کسی بات وہ برا نہ مناتی۔ اُس کی چنری میں اُن دنوں رنگ بھی گہرا ہوتا تھا۔ اور میں نے سوچا تھا۔ جوان ہوتی لڑکیاں رنگوں اور سپنوں
اور پھول سے آنے والے دنوں کا سواگت کرتی ہیں۔ پل پر کھڑے میں نے کہا تھا "ماں ہوتی تو اس طرح پریتو کا اور میرا رشتہ ٹوٹ نہ جاتا۔ پریتو کے بعد اُس آنگن
میں کبھی ہنسی کی جھنکار سنائی نہیں دی۔ کبھی چوڑیوں کی جھنکار نہیں گونجی، کبھی سپنوں بھری آنکھیں دیواروں پر نہیں پڑیں۔ چانن سنگھ اُن دنوں مجھے پتہ چلا
تھا۔ کہ سپنے دیکھنے عورت کے حصے میں آئے ہیں۔ عورت آپ بھی ایک سپنا ہے۔ پھول کے اندر خوشبو میں بند۔ رنگ کے اندر اُس کی اُڑان میں بند۔ عورت
ماں ہو۔ بہن ہو۔ بس سپنے دیکھتی ہے اور اُن کو سچ سمجھنے میں اپنی ساری زندگی بتا دیتی ہے۔ پریتو کا سپنا چھوٹا سا تھا۔ برسات میں اڑنے والی چیونٹیوں
کی طرح۔ اُس سپنے کے پر نکل آئے۔ وہ روشنی کی تلاش میں گیا اور تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ اور اُس کے ساتھ وہ دیا بھی بجھ گیا۔

اُسی رات میں میلے میں پہنچ گیا۔ میں نے سارے سودے کھارے کر لئے۔ پیارا سنگھ نے میری شکل دیکھ کر کہا۔ "سردار تیری صورت اتنی پھیکی اور
رنگ اتنا اڑا اڑا کیوں ہے۔ کیا تیرا جی اچھا نہیں؟ بابو مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔ اور میں نے اُسے کھوجنے کی بھی کوئی کوشش نہ کی۔ میری آنکھوں کے سامنے دھند
سی آجاتی۔ میلے میں پھیلے دور دور تک لگے ہاٹ مجھے زہر لگتے۔ چوڑیوں کی دکانوں پر اپنی باہیں بھرواتی سوانیاں مجھے بہت بُری معلوم دیتیں۔ ساری عورتیں
ہی ایسی ہو سکتی ہیں۔ اپنے سپنوں کو لیکر دیوں کی کھوج میں گھومتی ہوئیں۔ مجھے کسی پر اعتبار نہ رہا۔ دنیا کی ساری روشنی سکڑ کر میرے لئے ایک نکتہ بن گئی —
خوشیاں دکھوں میں مل گئیں۔ پریتو کے بعد سے مجھے کسی شے کی کھوج نہیں رہی چانن سنگھ۔ مجھے آج تک کسی شے کی کھوج نہیں ہے پر ایک بات کا پتہ نہیں
چلتا چانن سنگھ، انسان اتنا خود غرض کیوں ہے وہ سارے پیار اپنے لئے ہی کیوں سمیٹنا چاہتا ہے؟ میں نے کہا شاید یہی بات تھی۔ میری اور جیت سنگھ
کی خود غرضی ہی تھی۔ جو ہمارے درمیان دیوار بن کر کھڑی ہو گئی۔

ہری سنگھ نے کہا: "نہیں بھتیجے مرد عورت کے سارے سپنوں کا دیا آپ بننا چاہتا ہے۔ سالوں کے بعد یہ بات مجھے جب سمجھ آئی ہے تو پریتو نہیں ہے
اُس غصے میں جو پیار کو پیچھے چھوڑ گیا۔ یہ بھی قصور تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا۔ پریتو میرے سوا کسی اور میں اتنا وشواش کرے۔

"شاید یہ بات ہو" میں نے کچھ سمجھتے ہوئے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

کونجوں کی ڈار چاند کے سامنے سے اُڑ کر آکاش اور دھرتی کے ملتے کناروں کی طرف چلی گئی۔ کھوہ پر ٹوٹی اینٹوں میں سے پھدک پھدک کر مینڈک
باہر نکل آئے۔ اور پیپل کی شاخوں پر پرندے کبھی کبھی نیند میں چونک چونک کر بولنے لگتے۔ میں سوچ رہا تھا۔ بیکانیر پتہ نہیں کتنی دور ہے؟

ہری سنگھ نے کہا: "میلے میں ہاٹ ہاٹ گھومتے جب ہمیں یہ خبر ملی۔ کہ رات کسی نے میری بہن پریتو کو مار دیا ہے۔ جوالا سنگھ کا گھر جل گیا ہے۔ اور وہ
سارے اندر جل کر مر گئے ہیں۔ تو میں پریتو کے لئے چوڑیاں لئے بنا پینگوں والی چنری اور ماسی کے لئے کُرتے کا کپڑا خریدے بغیر واپس آگیا۔ آس پاس ہمیں کو ہی
شک کیا جاتا تھا۔ شہر میں سختیاں سہتا اور پولیس کے چکر میں پڑا رہا۔ تین سال بعد مقدمہ خارج ہو گیا۔

کسی عورت کو چوڑیاں پہنے دیکھ لوں تو مجھے پریتو یاد آجاتی ہے۔ پینگوں والی چنری میں مجھے پریتو کا دل اٹکا لگتا ہے۔ میں نے تب سے آج تک کبھی
مٹھائی نہیں چکھی چانن سنگھ۔ زندگی کی ساری خوشیاں میرے لئے اُس دن ختم ہو گئی تھیں جب پریتو سر جھکائے میرے سامنے بیٹھی تھی۔ اور جی میں سوچ
رہی تھی۔ کہ سارا قصور اُس کا ہے جوالا سنگھ کا نہیں۔ عورت اپنے سپنوں کی خاطر یوں چپ چاپ بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ ہم عورت کے سپنوں میں کہیں نہ کہیں روک
بن جاتے ہیں۔ ہم اُسے سپنے بھی نہیں لینے دیتے۔ ہم سب کے سب تم اور میں اور باقی دنیا اُس کے سپنوں کے ہی خلاف ہیں۔

پریتو کے مرنے کے بعد سونے گھر کو بسانے کے لئے بابو نے میری منت کی۔ دل ہی دل میں اپنے پر اور بابو پر اور باقی گاؤں پر ہنسا۔ میں نے [illegible]
بات مان لی۔ آخر کہاں تک کوئی بنا بات کے انکار کرتا جائے۔ جن دنوں برادری کی عورتیں ہلے گھر میں ڈھولک لے کر بیٹھتیں تو میں باہر نکل جاتا۔ اُس

راتوں میں میں نے پرتیو اور جوالا سنگھ دونوں کو دیکھا ہے۔ درختوں کے تنوں کے پاس کھڑے چاندنی کرنیں اُن کے آر پار ہوتی جاتیں۔ ہنستے ہوئے تصویروں کی طرح ہوا کے ساتھ اڑتے وہ میرے پاس آتے اور پھر دور چلے جاتے، میں آنکھیں مل کر دیکھتا تو وہاں کچھ نہ ہوتا۔ پر میری بہن نے کبھی میری طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا تھا۔ وہ مجھ سے روٹھی ہوئی تھی۔ آخری رات کے بعد جب وہ میرے سامنے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اُس نے کبھی میری طرف نہیں دیکھا۔ عورت رنگ روپ اور سپنا ہے۔ چانن سنگھ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

وقت وقت کے دکھوں کی دوا ہے پر وہ میرے لئے کچھ نہ کر سکا۔ پتہ نہیں کون شکتی ہے جو آج تمہارے سامنے مجھے اپنے آپ کو اس طرح ننگا کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ ورنہ ہم ساری عمر لپیٹے لپٹائے اپنی مورتی کو اپنے کندھے پر اُٹھائے گھومتے ہیں اور آج جب میں تمہیں اتنا کچھ بتا رہا ہوں یہ کیوں نہ بتا دوں کہ سرجیت کو بھی میں نے مار دیا تھا۔

سرجیت جیسے سر ہو گیت کا بہتا دھارا ہو۔ جیسے کسی راگنی کا روپ ہو۔ اتنی کومل کہ ہوا پر تصویر کی طرح لگتی۔ چاندنی میں اُس کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا۔ وہ روشنی کے ساتھ اوپر اُٹھتی لگتی۔ کرنوں کی سی نرمی سے دل کے اندر اتر جانے والی میری سختی کے سامنے اُس کے روپ نے ہار مان لی، پر میں غلط کہہ رہا ہوں۔ وہ مجھ سے جیتنا کب چاہتی تھی۔

میرے لئے ساری عورتیں پرتیو ہیں۔ اگر وہ اتنا سپنا لے سکتی تھی۔ تو ہر عورت غلط ہے اس کے بعد دنیا میں کیا باقی رہا ہے اور اگر ہے تو میں اس پر وشواس کیسے کر سکتا ہوں؟

دکھی دل کے ساتھ میں نے سوچا میں سرجو کو ساری عمر گھر نہیں لاؤں گا۔ مگر اس کا باپ سفید پوش تھا۔ دس گاؤں میں اُس کی عزت تھی۔ ان کے ڈر سے میرے انکار کے باوجود باپو نے بیاہ کے چار ماہ بعد مجھے اُسے بلانے کے لئے اُس کے میکے گھر زبردستی بھیج دیا۔

"بہار کی سہانی رُت تھی۔ سرد ہوا میں آموں کے بور کی خوشبو تھی" ہری سنگھ چاچا ایک دَم چپ ہو گیا۔ دور کہیں کوئل کو ہو کو ہو بول رہی تھی۔ چاند نیچے جھکتا جاتا تھا اور میں سوچ رہا تھا۔ بیکانیر کی سرحد پار کرنا اب کبھی ہو نہ سکے گا۔ جیت سنگھ بے آواز قدموں سے سدا میرا پیچھا کرے گا۔ میں کہاں جا سکوں گا۔

ہری سنگھ چاچا یکایک کھڑا ہو گیا۔ اور بولا "چانن یہ قصے میری ساری زندگی پر پھیلے ہیں۔ آؤ چلیں۔"

میں نے کہا۔ "نہیں چاچا بہار کی رُت کی بات سن کر بھی بڑا وقت باقی ہے۔ تم کہو پھر سرجیت کا کیا بنا؟"

"سرجیت کو میکے گھر سے لانے جاتے ہوئے میں جوان تھا" چانن میں تم سے بھی جوان تھا۔ میری نئی جوتی دھوپ میں چمکتی اور چک میرے ہاتھوں میں مہندی کی باس میں مل کر میرے گرد پھیل رہی تھی۔ میں اپنی اصیل گھوڑی پر اکڑ کر بیٹھا تھا۔ پر میری آنکھوں میں سرجو سے ملنے کی خوشی کا نشہ تھا مجھے پرتیو یاد آ رہی تھی۔ جس نے کہا تھا۔ جوالا سنگھ کا کوئی قصور نہیں۔ وہ کیوں جوالا سنگھ کو بچا کر سارے الزام اپنے سر لینا چاہتی تھی۔ کیا محبت موت سے بھی زبردست ہے؟ اور اس دن پہلی بار میرا جی چاہا، میں بھی کسی کو چاہوں۔ کسی کے لئے اپنے گلے پر چھری رکھوا لوں اور اف نہ کروں۔

مگر سرجو کو میکے سے لینے جاتے میں نے سوچا تھا میں اسے کب اٹھا سکوں گا۔ اُسے دینے کے لئے میرے پاس کیا ہے۔ اُس سے لینے کی بھی میرے دل میں کوئی خواہش نہ تھی۔ میرے دل میں کسی چاہت کا خیال نہ تھا۔

میں نے دھوکا بازی کی طرح چھوٹی مسکراہٹ کا پردہ سا اپنے اوپر کر لیا۔ سسرال گھر میں نواڑی پلنگ پر بیٹھا جھکی جھکی آنکھوں سے سب طرف دیکھتا میں ساس اور سسر کے باپ اور بھائیوں کی میری دلداری کرنے کی کوششوں کو دل ہی دل میں ہنس کر دیکھ رہا تھا۔ وہ سارے میرے آگے پیچھے پھر رہے تھے گاؤں کی عورتیں اور لڑکیاں دم دم چوکھٹ میں کھڑی ہو کر اندر جھانکتیں۔ کچھ یاں منہ پر پلو کئے مجھے پنکھا جھلتیں۔ میں اُس گھر کی زندگی تھا۔

سسرال گھر سے ہم چلے ہیں تو سامان کا بھرا گڈا زوں زوں کرتا سرجو کی ڈولی کے ساتھ تھا۔ اور میں سوچ رہا تھا اگر پرتیو زندہ ہوتی تو سویرے ساتھ وہ بھی یونہی وداع ہو کر کسی گاؤں جاتی۔ کوئی بانکا چھیلا ہمارے بھی آنگن میں آتا۔ ہم سب گیتوں سے اُس کی تواضع کرتے۔ اُس پر سے روپے وارتے

اُسے لال پایوں والے نواڑ کے پلنگ پر بٹھاتے اُس کے آگے پیچھے پھرتے۔

سایوں میں یونہی جگہ بہ جگہ ٹھہرتے میں نے کہاروں کو تھکا دیا۔ شام ہمیں گاؤں سے دو چار کوس ادھر ہی مل گئی۔ نہروں میں پانی ہولے ہولے بہنے لگا۔ ہوا تھک کر آہستہ چلنے لگی۔ بادلوں کی سُرخی پانی میں گھل گئی۔ چارے کے گٹھے اٹھائے عورتیں اور بیلوں کو ہنکاتے چھوٹے لڑکے اندھیرے کے نکتوں کی طرح بن گئے۔ کھیتوں میں ڈوبے درختوں پر چڑیاں۔ کوے بیٹھنے لگے۔ دور تک پھیلے کھیتوں کی ہریالی میرا جی اداس کر گئی۔ نئی دھرتی کی باس ہل سے نکلتی ہوئی چاروں طرف سے مجھے جکڑنے لگی۔

میں نے کہاروں سے کہا۔ تم ڈولی لے کر آگے چلے جاؤ۔ میں اور سرجو نہر کے کنارے چلتے ہیں۔ وہ سارا دن بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہوگی۔

میں نے جب ڈولی کا لال پردہ اٹھایا تو سرجو کی آنکھیں جھک گئیں وہ رنگین شلوار کو سنبھالتی اور مہندی سے رنگے پیروں کو آگے کرکے اُترنے لگی۔

اُس کے گلے میں پڑے زیور اور رانی ہار کے رنگوں پر روشنی دھنک کے سارے رنگ بن رہی تھی۔ نتھ میں لگے سُرخ موتیوں کا عکس اُس کے ہونٹوں کو اور بھی سُرخ کر رہا تھا۔ اپنی پلکیں جھکائے، گوٹے سے بھرا دوپٹہ ماتھے تک کھسکاتی وہ باہر آگئی۔ جب کہار ڈولی لے کر دور چلے گئے۔ اور وہ اپنی قمیض کو ہاتھ پھیر کر گھٹنوں پر سیدھا کر چکی تو سُرخ رومال سے اپنا منہ ڈھانپتی ہوئی وہ میرے پاس کھڑی ہوگئی۔

اُس کے گرد شام کی ساری خوشبوئیں تھیں۔ اور دن بھر کے مُسلے ہوئے کپڑوں میں انوکھی باس تھی۔ دھرتی کی باس۔ جیسی ہل چلا کر میں نے کبھی کبھی نئی زمین میں محسوس کی تھی۔ سونگھی تھی۔ پوتر تا۔ نرمی اور اپنے اندر بچھے خوابوں سے مل کر بنی ہوئی وہ باس بھی میرے ارادے کو بدل نہ سکی۔

میں نے کہا سرجو کچھ بولو کچھ کہو۔

وہ شرم سے دوہری ہوگئی۔ اور میری طرف پیٹھ پھیر کر کھڑی ہوگئی۔ اُس کے بالوں میں گندھے سونے کے پھول کانوں کے دونوں طرف ذرا ذرا اوپر تھے۔ اور دوپٹے میں سے چمک رہے تھے۔ اُس کے پراندے میں پڑے سُرخ پھُندنے جس میں سونے کے تاگے تھے: نیچے اور نیچے لٹکتے بڑے بھلے لگ رہے تھے۔ اور وہ آپ جیسے کوئی سندر سا سپنا ہو۔ میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ دھرا تو وہ کانپ گئی۔ اُس کی کپکپاہٹ میری انگلیوں کی پوروں میں سے ہوتی ہوئی میری جان کو ٹھنڈا کر گئی۔ جیسے میری موت نزدیک ہو۔ بیٹھے ہوئے دل کے ساتھ جب میں نے اُسے کہا سرجو میری طرف دیکھو تو اس نے ہولے ہولے گھوم کر بہت آہستہ اپنی آنکھیں اٹھائیں۔ مگر وہ نگاہ نہ تھی۔ وہ پھول کی نازک پنکھڑی کی خوشبو تھی۔ جو میرے کٹھور دل کو چھو کر واپس چلی گئی۔ میرے اندر پتھر کا دل بھلا کہیں پگھل سکتا تھا۔

میں نے کہا سرجو آؤ اس نہر کے کنارے لیٹ جاؤ۔ تم تھک گئی ہو ذرا دم لے لو۔ اُس نے نہ تو میری طرف حیرت سے دیکھا اور نہ ہی خوف سے وہ ہری گھاس پر گٹھڑی سی بن کر پڑی رہی۔ میں نے سوچا بس یہ رنگ ہے اور روپ ہے۔ میں اس کو اکٹھا کر لوں گا۔ اور سرجو کو نہر میں بہا دوں گا۔ ہر عورت میرے لئے پریتو کی طرح تھی۔ پتہ نہیں اس رنگ اور روپ سے پرے کونسے سپنے ہیں جو ان آنکھوں میں کروٹیں لے چکے ہیں۔ اس نرمی اور چاند کی سی ٹھنڈک کو کون ہاتھ چھو چکے ہیں؛

پھر میں نے کہا دکھاؤ سرجو تمہارے ہاتھوں میں چوڑیاں ہیں؟

سرجو نے سُرخ چوڑے سے بھری باہیں میرے سامنے کر دیں۔ جیسے ایک جھونکے سے کوئی نئی شاخ ایک لمحے کے لئے جھول جائے۔ میں نے اُس کے ہاتھ پکڑ لئے۔ اس کی انگلیوں میں سارے جسم کی نرمی آگئی تھی۔ میں نے پور پور کرکے انھیں چوما جیسے کوئی فرض ادا کر رہا ہوں۔ اور کوئی سچ کہہ رہا ہو جیسے آگ کے سامنے کھڑا ہوں۔ اور صرف ٹھیک بات کہنے پر مجبور ہوں۔ وہ اپنا منہ چھپائے لیٹی رہی۔ اس کا جسم رہ رہ کر کانپ اٹھتا۔

میں نے جب اُسے بال کھولنے کو کہا۔ تو تب بھی اُسے حیرت نہ ہوئی۔ اُس نے ہولے ہولے مینڈھیاں کھولیں۔ گندھے ہوئے زیور کھولے۔ اور انھیں قریب رکھ دیا۔ جب وہ بال کھولے بیٹھی تھی۔ تو مجھے لگا وہ اڑ جائے گی۔ شام کی سُرخی میں چھپ جائے گی اور میں ہاتھ ملتا رہ

باقی صفحہ ۹۴ پہ

واجدہ تبسم
دورِ حیات. بمبئی

چاندنی

عورت تھی یا ایٹم بم ؟ — حواسوں پہ — ذہن پہ، ہوش پر، سارے وجود پر یوں گری کہ سب کچھ تہس نہس ہوگیا — راکھ ہوگیا۔ سکندر دیوانہ ہوگیا — اُن معنوں میں دیوانہ نہیں کہ پتھر اُٹھا کر دے مارے، کسی کو جانے پہچانے نا، بلکہ اِن معنوں میں کہ اپنا آپا بھول گیا — ایک سڑی ماری عورت کے پیچھے۔

عورت بھی مگر کون ؟ — رنڈی !

مگر بھئی کیا عورت تھی کہ واہ واہ — بدن کی چمڑی یوں کسی کسی کہ کوئی چہرہ دیکھنا چاہے تو آئینہ سمجھ کر دیکھ لے چھاتیاں یوں تنی تنی کہ کوئی کنکری دے مارے تو ٹن سے بج اُٹھیں — کمر تو مٹھی میں سما جائے۔ بال ایسے گھنگھور گھور کہ سارے بدن سے ننگی ہو کر بیٹھ جائے اور بال کھلے چھوڑ دے تو کسی کو پتہ نہ چلے کہ اس سیاہ پردے کے پیچھے کون سی آگ دہک رہی ہے۔ کیسی دمادم بجلیاں کوندرہی تھیں — قد بس بالکل اتنا کہ نخرے میں آکر مرد کے کندھے سے سر ٹکرائے تو گردن کے خم میں پہنچ کر اونچائی فٹ ہو جائے۔ اور مرد کو بس یہی تو اچھا لگتا ہے — کہ عورت اُس سے نیچی رہے، دبتی رہے، اور بس سکندر بھی یہی کچھ تھا — جو کہ ایک مرد ہوتا ہے۔ جان تو اس کے ایک ہی تھی۔ مگر وہ ایک چھوڑ ہزار جانوں سے عاشق ہوا — مٹ گیا — کیسے کیسے چاہا کہ اُسے زندگی بھر کے لئے اپنے گلے کا تعویذ بنالے۔ مگر وہ جو کسی نے کہا ہے — کہ رنڈی کا دل سدا ہنڈی ہیں — ایک کے گلے سے عمر بھر کے لئے لپٹ کر کیا اُسے اپنی زندگی تباہ کرنی تھی ؟ چکیلی، چکنی ناگن کی طرح خود ہی لپٹا کیا — لیکن جہاں مُڑ کر ہاتھ میں اُٹھانا چاہا، سُل سلا کر چھوٹ گری ! دغا دے گئی —

ساری داستان یہ تھی — کہ وہ طوائفہ جس کا نام چاندنی تھا۔ کسی شادی کی محفل میں بلوائی گئی تھی — شادی کریم بھائی زرتش مین کی تھی۔ کہ جس کی کپڑے کی چار چار ملیں تھیں — پھر اناج کی دکانیں — پھر زیورات کی دکانیں — پھر دواؤں کی دکانیں — پھر جنرل اسٹور تھے — اور پھر — بس اس پھر پھر کی روداد ہی یہ تھی۔ کہ پیسہ پھرکی کی طرح پھر پھر پھرتا تھا — اور جب بیٹی کی شادی ہوئی تھی تو کون سی بات چھوٹی ؟ ہر ہر قسم کے اعلیٰ سے اعلیٰ انتظامات تھے — اور اسی میں ایک انتظام یہ بھی تھا کہ ناچ اور گانے سے بھی باراتیوں اور حاضرینِ جلسہ کو محظوظ کیا جائے۔ اب ان چاندنی بیگم کے یہ ٹھاٹ تھے۔ کہ وہ ایسی ویسی محفلوں میں قدم بھی نہ دھرتی تھیں — دو سو، پانچ سو کی ان کی پاس کون بساط تھی۔ وہ جب بھی اور جس محفل میں بھی گئیں — رات بھر کے ٹھن ٹھن پانچ ہزار روپئے گنوائے اور وہ بھی اس صورت اور اس شرط

میں کہ کوئی ان کے انگلی بھی نہ لگائے۔ اُن کا جسم انگلی لگانے کے لئے نہ بنا تھا، وہ تو صرف آواز بیچتی تھیں اور بس چلبلے جسم کی چلت پھرت سے پیسہ جمع کیا کرتیں۔

شادی کا ہنگامہ، نکاح خوانی کا دھوم دھڑکا کھانے دانے سے فراغت، جب سب مرحلے طے ہوگئے تو محفل سجی۔ اگلی قطار بے حد رئیس زادوں کی تھی۔ وہ جو ایک ایک ادا پر خزانے خالی کر دیتے ہیں۔ اس کے پیچھے لٹے ہوئے اور بگڑے ہوئے نواب۔ جن میں اکثریت جدی آبائی کے برباد نوابوں کی تھی۔ اس کے بعد ایسے ہی جیب خالی رکھنے والے اور پٹاپٹ آنکھیں مارنے والے، جیسے اُن کی آنکھ مارنے سے رنڈی ان کی گود ہی میں تو آ بیٹھے گی۔ پھر تو محلّے ٹولے کے لوگ، خانساماں لوگ، بیرے، ڈرائیو شوفر لوگ، جو صرف کھڑے کھڑے ترسی ترسی نگاہوں سے نظارۂ محبوب کرتے ہیں۔ اگلی والی صف میں ظاہر ہے سکندر بھی تھا۔ کیونکہ وہ خود بھی کپڑے کی چھ ملوں کا مالک تھا۔

گانا شروع ہوا۔ چاندنی نے پہلے تو حاضرین شادی پر ایک چھلتی سی نظر ڈالی۔ اور پھر شاید محفل کا رنگ دیکھ کر شروع ہوگئی ؎

ہم بھی پئیں اُنہیں بھی پلائیں تمام رات
جاگیں تمام رات جگائیں تمام رات

سُننے والوں نے پہلو بدلنے شروع کئے۔ چاندنی ڈائس پر تھی۔ اور سکندر ڈائس سے بمشکل دو تین قدموں کے فاصلے پر۔ اُس نے پھر ادا سے تان لگائی ؎

دابے رہے پروں میں نشیمن کو رات بھر — ان گیسوؤں کی لی ہیں بلائیں تمام رات

اور کم بخت نے اپنے سیاہ اور لانبے بال کھول کر خود بلائیں لے ڈالیں ـــ کتنے کٹے، کتنے مرے، کتنے گھائل ہوئے، اس کا لحاظ کئے بنا وہ چالو تھی ؎

شب بھر رہے بہم وہ ہم آغوشیوں کے لطف — ہوتی رہیں قبول دعائیں تمام رات

سننے والوں نے اس قدر بے چین ہو کر، یوں بے کل ہو ہو کر صوفوں پر کروٹیں بدلیں جیسے صوفوں میں کن کھجورے گھس پڑے ہوں۔

سیاہ گھٹاؤں میں سے چاند ایسا چمکتا چہرہ ـــ کافر شباب، صحیح معنوں میں کافر کر دینے والا ـــ غضب خدا کا نائلون کا پھنسا ہوا بلاؤز کہ یہ پتہ ہی نہ چلے کہ کپڑا کدھر ہے اور بدن کی جلد کدھر۔ اور پھر اُس نے تان ملائی۔ سکندر ہی کو دیکھ کر ؎

مدّت سے آرزو ہے یہ دل میں بسی ہوئی — اے کاش تم کو ساتھ سُلائیں تمام رات

ایک دم محفل میں پٹس پڑ گئی۔ سب نے بوکھلا بوکھلا کر ایک دوسرے کو دیکھنا شروع کیا۔ سکندر صوفے پر سے کودا۔ اور اُس کے قریب جا کر

"غضب کرتی ہیں آپ بھی۔ غزل میں اس شعر کا پتہ ہی نہیں۔ کچھ بھی الٹ پلٹ گا رہی ہیں آپ!"

وہ ایک عورت کی نشیلی اور دل جیتنے والی ہنسی ہنس کر بولی۔

"میں کب کہتی ہوں غزل میں تھا۔ یہ تو میں نے اپنے دل سے جوڑا ہے۔"

سکندر صوفے پر واپس آ گرا۔ اب اس میں کچھ پوچھنے، سوچنے سمجھنے، کسی بات کی صلاحیت نہیں رہ گئی تھی۔ ابھی ابھی تو چاندنی ایک خوبصورت دیئے کی مانند تھی ـــ جھلملاتی شمع کی مانند کہ جس کی طرف دیکھنے سے آنکھوں کی جوت ماند نہیں پڑتی۔ بلکہ خود آنکھوں میں جگمگاہٹ مچل اٹھتی ہے لیکن ابھی ابھی ایک شعر "دل سے جوڑ دینے" کے بعد اُسے ادا سے پڑھنے کے بعد، ایک بجلی بن گئی تھی۔ ایسی بجلی جس کی طرف دیکھو تو نہ صرف یہ کہ بینائی سے ہاتھ دھونا پڑے۔ بلکہ جو تن من سب کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔

رنڈی پر دل آجانا ایسی کوئی بات نہیں ــــ وہ بھی تو دال، آٹے بھاجی کی طرح ایک سودا ہوتی ہے۔ کہ پیسے پھینکو اور من بھاتی چیز حاصل کرلو ــــ اور سکندر نے یہی کیا۔ وہ تو لاکھوں میں کھیلتا تھا۔ اُس کے لئے پیسہ بے معنی چیستر بن چکا تھا۔ بمبئی جیسے شہر میں مالا بار ہل پر کوٹھی اور وہ بھی ذاتی کوٹھی ــــ کیا بات ہے جناب ــــ ایسی ایسی کوٹھیاں زمینیں اور ذاتی جائداد اُس کی قسمت سے بمبئی میں پھیلی ہوئی تھیں۔ نام کا ہی سکندر نہ تھا، قسمت کا بھی سکندر تھا۔ اُسے پتہ لگ چکا تھا کہ چاندنی بھی اُس کے قرب وجوار میں ایک چھوٹی سی خوبصورت سی کوٹھی میں رہتی ہے۔ جس کا نام اُس نے "چاند نگر" رکھ چھوڑا تھا ــــ اُس نے یوں کئی بار آتے جاتے اس نام کو دیکھا ہوگا۔ لیکن یہ پتہ نہ تھا۔ کہ چاند نگر میں واقعی کوئی چاندنی بھی چھپی ہوگی۔

ایک دن وہ بڑے ٹھاٹھ کے ساتھ وہاں پہنچ ہی گیا ــــ ڈرائنگ روم میں ایک سڑیل سی بوسیدہ بڑھی نے جب اُس کا استقبال کیا تو وہ حد درجہ بور ہوگیا ــــ یہ کیا مصیبت ہے سالی۔ یہ اس قسم کی ماڈرن اور مہذب خواتین اپنے ساتھ نانکہ کیوں چپکا لیتی ہیں۔ کم سے کم السیشین ڈاگ سے تو یہ کام نکل ہی سکتا ہے۔ اشارہ کیا۔ کہ وہ دوڑا ــــ اب آپ فرض کیجئے میں آپ کی بیٹی، یا پوتی یا نواسی جو کچھ بھی وہ ہیں انھیں بھگاؤں اور کار میں بٹھا کر چھو ــــ تو آپ میرا کیا سدھار لیں گی؟ ــــ وہ ہنسا اور بے حد مہذب مسکراہٹ ہونٹوں پہ لاکر اور دل کی ساری تلخی اور بوریت دل میں گھا کر بولا۔

"میں مس صاحبہ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

پھر اس ایک جملے سے گفتگو کی جو ابتدا ہوئی تھی۔ اُس کے انت میں جاکر اُسے یہ پتہ چلا تھا۔ کہ یہ جو چاندنی بیگم ہیں، چاندی کی کرن کی طرح، شیتل، سنہری، پاک اور ہاتھ میں نہیں آنے والی ہیں۔ اس لئے کہ وہ رنڈیوں کے اس خاندان سے تعلق رکھتی تھیں جو صرف گلا، یعنی آواز اور جسم کی چلت پھرت، یعنی رقص کا ہی سودا کیا کرتی ہیں۔

"ادھر وہ سب کچھ نہیں چلتا جو آپ سوچ کر آئے ہوں گے۔" اور بھی ایک رات کے پانچ ہزار، سکندر نے اپنا سر ٹھونک لیا ــــ پھر دل نے سمجھایا ــــ

"نکو میاں! اپنا راستہ پکڑو ــــ رات بھر کے ۵ ہزار دے کر بھی اخیر میں کیا لے گا بوں کے!"

لیکن اب سکندر کا عشق اُس حد پر پہنچ چکا تھا۔ کہ اور کچھ نہیں تو نہ سہی، خالی نگاہوں کی پیاس ہی بجھتی رہے۔

چلتے چلتے اُس نے بڑے ملائم الفاظ اور میٹھے لہجے میں اتنی بات کہدی ــــ

"آپ کیوں اُن کے ساتھ آنے کی تکلیف گوارا فرمائیں؛ میں خود شام کو آکر انھیں لے جاؤں گا۔"

شاید بڑھیا کو اپنے مال کے "پکے پن" کا یقین تھا یا سکندر ہی اُسے گھا مڑ نظر آیا ہو۔ بہر حال وہ اس بات پر راضی ہوگئی۔ کہ چاندنی اُس کے ساتھ تنہا ہی جائے۔

وہ رات بجائے بارہ گھنٹوں کے بارہ صدیوں میں آئی ــــ اور سکندر نے کچھ یوں سوچا کہ ممکن ہے قیامت ایسے ہی آتی ہو ــــ!

سکندر نے اُسے بے حد آرام دہ نرم صوفے میں لاکر بٹھایا۔ اور بعید قریب بیٹھ کر، بالکل بچوں کے سے انداز میں اُسے گھورنے لگا ــــ بچے ایسے ہی گھورتے ہیں ناکہ پلک تک نہ ماریں ــــ اُن بے چاروں کو بھلا محفل کے طور اطوار، آداب لحاظ کیا معلوم! وہ تو بس جس چیز پہ نگاہ جم جاتے، دیکھے ہی جاتے ہیں۔ اور سکندر بھی کہ اُس وقت اپنے جذبات کے ہاتھوں بچہ سا بن کر رہ گیا تھا۔ بڑی بے باکی، بڑی طاقت بڑے بھولپن سے اُسے نگاہ بھر بھر کے دیکھے گیا۔ چاندنی کھل کھل کھل کھل کر بڑی شفاف ہنسی ہنس پڑی۔

"یوں کیا گھور رہے ہیں آپ!"

"تم بڑی خوبصورت ہو" وہ بے حد سچائی سے بولا۔
"آپ کا تعریف کرنے کا انداز بھی خوب ہے"
اور جیسے کانچ کی چھوٹی چھوٹی بہت سی کٹوریاں، بہت سی کٹوریوں سے ٹکرا گئیں۔
"مجھ سے شادی کرو نا،" سکندر بالکل اس انداز سے بولا۔ جیسے کوئی بچہ اپنے دوست سے بڑی معصوم سی بے تکلفی سے کہے۔ "تمہاری یہ پتنگ مجھے دیدو نا"
چاندنی نے ذرا حیرت سے اُس کی طرف دیکھا، ذرا سا ہنسی پھر بولی۔
"شادی کرو تو بچے ضرور پیدا ہوتے ہیں"
سکندر حیرت سے بولا۔
"پھر؟ یہ تو بیحد سہانی بات ہے!" وہ ہنس دیا۔
"ابھی جناب!" چاندنی نے بہت دور جا کر بات کا سلسلہ جوڑا۔" میں نے ایسی بھی کئی خواتین دیکھی ہیں۔ جن کا حسن ایک دو بچوں کے بعد ناک تک لٹکنے لگتا ہے۔ ظاہر ہے میرا پیشہ ایسا ہے۔ کہ جب تک جسم ساتھ دیتا ہے پیسہ آتا رہتا ہے۔ بعد میں تو بس ـــ جی ہاں! ـــ معاملہ ختم!"
وہ یکلخت بے حد اداس ہوگئی۔
سکندر مارے جوش کے دوسرے صوفے پر جا بیٹھا۔
"یہ تم کیا کہتی ہو، جسم پیسے کا دروازہ ہے، ایک رات کے پانچ ہزار ہی تو لیتی ہو نا۔ اب تم ذرا حساب جوڑ کر کے مجھے بتاؤ کہ اندازاً تمہاری عمر کتنی ہے اور ابھی آگے کے دن زندہ رہنے کا سوچ سکتی ہو۔ چلو زندگی بھر، پانچ ہزار روپے روزانہ کے حساب سے دے دیئے تمہیں منہ کی سکتے"
چاندنی بے حد بھرپور ہنسی ہنسی۔
"جنا۔ چار دن بعد جب عشق کا خمار اُتر جائے گا۔ اور حضور ٹھنڈے پڑ جائیں گے تو پانچ ہزار تو کدھر ـــ پانچ نئے پیسے بھی پھینک کر نہ ماریں گے"
سکندر جھلا کر بولا ـــ
"یہ الزام ہے!"
"ہو بہو الزام!" وہ پھر ہنسی۔ "جب تک یہ کھال آئینے کی طرح چمکتی ہے اور جب تک یہ جسم تنا ہوا رہتا ہے، تبھی تک مرد کی محبت بھی قائم رہتی ہے۔ ورنہ تو بس ـــ" وہ پہلی بار بگڑ کر بیٹھی۔ "آپ یہ سب سننے سنانے کے لئے ہی مجھے یہاں لائے ہیں۔ یا کچھ سنیئے گا بھی؟"
سکندر چاپلوسی سے بولا۔
"آج تو وہ سب کچھ کرنے کو جی چاہتا ہے جو تم نے اپنے دل سے شعر میں جوڑا تھا۔ یاد ہے نا؟" اور سکندر نے ہاتھ بڑھایا کہ اُسے اپنے قریب کرلے۔
"چیں ـــ ایں ـــ اوں"
باہر آؤٹ ہاؤس سے کسی مریل سے بچے کے رونے کی آواز آئی۔ اور سکندر جھلا گیا۔ اک دم وہ اُٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا۔ باہر دو ایک منٹ جھانکتا رہا پھر گرجتا ہوا واپس آکر صوفے میں دھم سے گر پڑا۔
"کم بخت نے چین حرام کر دیا ہے۔ جب دیکھو تب چیں چیں، چیں ـــ بچے کو اٹھا کر پھینکوا نہیں دیتیں اماں بی"

چاندنی نے از خود پہلی بار بات کی۔

"آپ حیدرآباد کے نواب ہیں؟"

سکندر نے اُس کی طرف ذرا حیرت سے ہنس کر دیکھا پھر بولا۔

"کیوں؟ — تمہیں کیونکر احساس ہوا؟" پھر خود ہی بولا۔ "نواب تو خیر کہاں ہوں ہاں بھگوڑا ضرور ہوں؟"

"بھگوڑا؟" چاندنی حیرت سے ہونٹ دبانے لگی۔

"ہاں الیکشن کے وقت کچھ عقل ساتھ دے گئی۔ تھوڑا بہت اثاثہ حضور ابا مرحوم کا پاس تھا، لیکر بمبئی بھاگ کھڑا ہوا۔ اماں بی کو بھی ساتھ لے آیا۔ اوپر والے نے قسمت میں آرام لکھ دیا تھا نا۔ کاروبار میں وہ ترقی ہوئی کہ بس نوابی پیچھے پڑ گئی۔ اور ایسی ایسی کوٹھیاں خدا نے دے دیں۔ کہ حیدرآباد میں رہ کر خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ کبھی ملیں گی۔" وہ رکا — "لیکن یہ سوال تمہیں کیسے سوجھا کیا بات چیت سے میں حیدرآبادی لگتا ہوں؟ میری اماں بی تو مگر یو۔پی۔ کی ہیں؟"

وہ ہنس دی —

"نہیں یہ بات نہیں — دراصل وہ آپ کا خاندانی دبدبہ اور گرجنے برسنے کی ادا؟"

وہ پھر کھل کھل کر کے ہنسی — "غریبوں کے بچوں کو محض رونے کی سزا یہ کہ اٹھا کر پھینکوا دیئے جائیں — صرف نواب ہی دے سکتے ہیں؟" اُس نے قدرے رک رک کر بڑی ادا سے سر اُٹھا کر پوچھا۔ "کیوں غلط کہا میں نے؟"

سکندر بے حد جھلا گیا۔

"قسم خدا کی — حد ہوگئی۔ جس رات کو سہاگ رات کی طرح حسین اور خوش گوار گذرنا تھا۔ وہاں کس درجہ بدذوقی ہو رہی ہے کوئی تک ہے بھلا —!!"

چاندنی تنک کر بولی۔

"واہ — یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ آج کی رات سہاگ رات تھی؟ آپ کس وعدے پر مجھے یہاں لائے تھے؟ گیت سننے اور رقص دیکھنے کے وعدے پر نا — آپ تو تیسری ہی بات سوچ رہے ہیں؟"

"اور جو میں زبردست بن جاؤں؟"

چاندنی اسی اطمینان سے بولی —

"میں ایسا سمجھتی ہوں کہ دو مرد مل کر تو ایک عورت کو زیر کر سکتے ہیں۔ لیکن ایک مرد — ہونہہ —؟" اس نے کچھ حقارت سے اور نفرت سے سکندر کو دیکھا۔

سکندر ہنسا۔

"نام کا ہی سکندر نہیں ہوں۔ قسمت کا بھی ہوں۔ وہ جس نے سارا ہندوستان فتح کیا تھا؟"

"ضروری نہیں کہ عورت کے دل کو بھی فتح کر سکے؟" چاندنی نے جملہ پورا کر دیا۔

"اُوں — اُوں — اِیں —؟"

پھر اُسی آواز نے بات کا سلسلہ ختم کر دیا۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر سکندر گویا ہوا؟

"اماں بی کو بڑا شوق ہے بچے پالنے کا — کتے کے بچے، بلی کے بچے، خرگوش کے بچے — اس کے بچے — اُس کے بچے؟"

اس کے اندازِ بیان پر چاندنی کو ہنسی آنے لگی۔ وہ ساتھ ہی گنگنانے لگی۔

سکندر ذرا جوش سے اُٹھ بیٹھا۔

"ظاہر ہے انسان کے بچے ۔۔۔ یعنی میرے بچوں کی بھی انہیں تمنا ہوگی ہی ۔۔۔ لیکن جسے انہوں نے پسند کیا۔ میں نے رد کر دیا۔ اور جسے میں نے پسند کیا۔ اُس نے مجھے ناپسند کر دیا۔"

اُس نے بڑے معنی خیز انداز سے چاندنی کو ہنس کر دیکھا۔ اور ہنس کر ذرا بے باکی سے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

چاندنی خطرہ بھانپ کر کچھ پیچھے ہٹی اور دونوں ہاتھ اپنے سینے پر باندھ لئے۔

سکندر خالص بدمعاشی کے موڈ میں تھا۔ لہک کر بولا ۔۔۔ "چاند ۔۔۔ داغ جی کی چیز ہو جائے۔

وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

چاند کسمسا کر بولی۔ "یہ باتیں کوئی اچھی باتیں نہیں، اب میں آپ سے صفا صفا کہتی ہوں کہ میرے مذہب میں جسم کو کسی کا ہاتھ لگنے دینا، حرام ہے۔"

"ہٹاؤ بھائی جسم وسم کے جھگڑے کو، مجھے احتراماً صرف جنت کے کنگوروں کو چھونے کی اجازت دیدو۔"

چاندنی ڈھیٹ بن کر بولی۔

"کنگورے، برجیاں۔ گنبد۔ سنگ مرمر کی چٹانیں، یہ سب چیزیں ناقابلِ حصول ہیں حضور! بس کیجئے نظارہ دور دور سے۔" وہ گنگنانے لگی ۔۔۔ گنگناتے گنگناتے وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔

"دیکھئے سکندر صاحب ۔۔۔ میں جس انداز سے سوچتی ہوں آپ نہ سوچ پائیں گے۔ میری ماں کا حشر میرے سامنے ہے ۔۔۔ میری خالہ کا حالِ تباہ میں نے دیکھا ہے۔ میری کئی پہچان والیاں ہیں جنہوں نے جسم کی تجارت کی۔ نتیجے میں انہیں کیا ملا؟ مرد کی ذات بجد کمین ہوتی ہے۔ وہ صرف دو لمحے کی لذت کے بارے میں سوچتا ہے۔ اس کے لئے اتنے جتن کرتا ہے۔ ہزاروں لاکھوں تک لٹانے سے نہیں چوکتا، عورت کو چوس چوس کر پھوک بنا دیتا ہے۔ دنیا میں سارا جھگڑا پیٹ اور پیسے کا ہے۔ آج آپ میرے جسم کی خوبصورتی سے مسحور ہو کر مجھ سے شادی تک کرنا چاہتے ہیں، لیکن چار چھ راتوں میں ہی جب میرا کس بل نکل جائے گا۔ میں قدموں تلے کی دھول بنا دی جاؤں گی۔ میں ممکنہ حد تک جوان رہنا چاہتی ہوں کہ زندگی کا کچھ تو مزہ لے سکوں۔ جسم کا سودا کروں گی تو ربر کے ہوا نکلے غبارے کی طرح میرا حشر ہو کر رہ جائے گا ۔۔۔ ورنہ دل کو کیا کیا نہیں چاہتا ۔۔۔ اور کیوں نہ چاہے ۔۔۔ کیا عورت نہیں ہوں میں؟"

وہ تنا کے ساتھ اُٹھی۔

"چھئے آپ کیوں اپنا وقت برباد کر رہے ہیں اور ساتھ ہی میرا دماغ بھی خراب کر رہے ہیں۔ مجھے نہ چاہئیں آپ کے پانچ ہزار دس ہزار ۔۔۔ مجھے جانے دیجئے۔ پانچ ہزار کی میرے پاس کیا اوقات ہے۔ اُسی رات جب آپ سے پہلی بار بھینٹ ہوئی ہے میں نے بجائے پانچ کے سترہ ہزار بنا لئے تھے۔ آپ اتراتے کس بات پر ہیں؟"

"واہ بھئی واہ ۔۔۔ تم عورت ہو کہ پٹاخہ، پٹ پٹ بولے ہی چلی جاتی ہو تمہیں تقریر کرنے تو نہیں بلایا تھا۔"

"تو گانا سنئے۔ رقص دیکھئے ۔۔۔ لیکن جو میری راہ نہیں اُس پر نہ چلوائیے۔"

سکندر ذرا کمینے پن سے ہنسا۔ "یہ ساری باتیں یہاں تک تو ٹھیک ہیں۔ لیکن اگر میں یہ کہوں کہ تم اتنی رات گئے، ایسی تنہائی میں ایک مرد کے ساتھ آئی ہو۔ تو؟؟"

اُس نے ادا کے ساتھ مصرع پڑھا۔

"عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں —— یہ آپ اچھی طرح سوچ رکھیں۔ کہ میں ایک ہی نظر میں بھانپ لیتی ہوں۔ کہ کون مرد کس قماش کا ہے۔ اور جب مجھے خطرہ نظر آئے تو میں تنہا قدم نہیں اٹھاتی —— آپ کا رویہ کہیں بھی ہو، میں رنڈی سہی، تنہا سہی، لیکن اتنا پھر بھی یقین ہے کہ آپ دست درازی نہ کریں گے۔ مجھے خون کی پہچان ہے۔" وہ صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔ "نیند ہے کہ کم بخت آئے جا رہی ہے اور آپ ہیں کہ بس۔" اُس نے ہنس کر انگڑائی لی ——

سکندر نے نئے نئے روٹھے ہوئے دولھے کی طرح منہ پھیر لیا۔ چاندنی نے بغیر ساز کے ایک گھریلو سی لوری گنگنانی شروع کر دی۔ سکندر کے اندر کا سرکش مرد میٹھی میٹھی مدھر تان سنتا سنتا سونے پر آ گیا۔

"چیں —— یاں —— یاں —— اُوں۔ آں۔"

باہر سے پھر اُسی مریل سی آواز نے مداخلت کی۔ اور سکندر سوتا سوتا پھر اُٹھ گیا۔ اور اب کی بار ایسا بھنایا۔ کہ دروازہ کھول کھٹاک سے باہر۔ واپس پلٹا تو اُس کے ہاتھوں میں چیں چیں کرتا، ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ وہ تیزی سے اُسے لئے لئے اندر گھس ہی رہا تھا۔ کہ چاندنی، تیزی سے اُس کی راہ میں آ گئی۔

"غصے میں مار ہی ڈالیں گے کیا آپ؟"

"نہیں اماں بی کے حوالے کر رہا ہوں، یا تو اسے سنبھال لئے یا اپنے ہاتھوں مار ڈالئے۔ قسم خدا کی کوٹھیوں میں یہ آؤٹ ہاؤس والا سسٹم ہونا ہی نہیں چاہیے۔ اور پھر ان کم بختوں کو اتنی تمیز بھی تو نہیں۔ کہ دور لے جا کر بہلائیں —— یہیں میری ناک کے پاس ہی لے کر ٹہلیں گے ——۔۔۔"

ڈر سے کانپتا مگر محبت سے مجبور مالی اُسی دم کمرے کے دروازے پر نمودار ہوا۔ اور روتا ہوا بولا۔

"کا کریں سرکار —— گھر والی کو مرے دِن ہی کتے ہوئے۔ بچے ہی کی تو بات ہے۔ نہ اوپر کا دودھ منہ میں پکڑے نہ بہلائے بہلے۔ ہم تو مجبور ہو گئے۔ بیچاری دھوبن بہلائے تو ذرا دیر سو جائے۔ تنک سو کر وہی ٹھان ٹھان ہے۔ ہم تو ہار گئے۔"

"ہار گئے ہو تو اسے زہر پلا کر ختم کر دو۔ یا پھر لے جاؤ اسے بڑی بیگم صاحبہ کے پاس وہی کچھ بندوبست کریں گی۔" اُس نے گیند کی طرح بچے کو اچھالا۔ "لے جاؤ یہاں سے!"

اکدم چاندنی نے بچے کو ہاتھوں پر جھیل لیا۔ ڈرے ہوئے چوہے جیسے بچے نے اور زور زور سے چیخیں مارنی شروع کر دیں۔ جس کمرے کو رقص و سرود سے، پایل کی چھم چھم اور مدھر تانوں سے گونجنا تھا وہاں بے وقت کی بھیروں ہو رہی تھی۔

جب اس کی رُوں رُوں کسی طرح نہ رکی تو چاندنی نے اُسے اپنے سفید سفید بازوؤں میں بیحد ماہرانہ انداز سے جھکولے دیئے اور صوفے کے ایک کونے پر ٹک کر اپنے بلاؤز کے بٹن کھول کر بیحد محبت اور پیار کے ساتھ اپنی گوری گوری اور تنی ہوئی چھاتی اُس کے منہ سے لگا دی۔

سکندر نے حد درجہ حیرت کے ساتھ دیکھا۔

"ارررے تم ہاتم تو غالباً کنواری ہو —— تمہارے دودھ اُترے گا؟ اور پھر تمہارا حسن۔۔۔! ناف تک نہ لٹک جائے گا۔؟؟ —— اور تمہارے۔۔۔۔" چاندنی نے بات کاٹ دی۔ "تم کیسے مسلمان ہو —— تمہیں بی بی مریم کی داستان بھی نہیں معلوم ——؟؟ خدا بغیر شوہر کے بچہ دے سکتا ہے۔ تو بغیر بچے کے دودھ کیوں نہیں دے سکتا؟؟"

سکندر نے حیرت سے دیکھا۔ دیکھتا ہی رہا۔ اُس وقت چاندنی کے چہرے پر دنیا بھر کی ماؤں کا نور ایک ساتھ جمع ہو گیا تھا۔

گربچن سنگھ

قبرستان کے چہرے

میں نے اُسے پانچ روپئے کا ایک نوٹ دیا۔ اور اُس نے خوشی سے اُسے قبول کر لیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک برگزیدہ چمک پیدا ہوئی اور اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے پھول کھلنے لگے۔ شاید اُسے مجھ سے یہ اُمید نہیں تھی۔ کہ میں امداد کے طور پر اُسے کچھ رقم پیش کر دوں گا۔ وہ بولی "شکریہ مسٹر سنگھ.... میں..... میں آپ کی بہت مشکور ہوں۔"

میری نظریں نیچے جھک گئیں۔

اتنے میں نوکر چائے لے آیا۔ ہم دونوں چائے پینے لگے۔ چائے کے دوران وہ بولی۔ "وہ پرانے بابا کہاں گئے؟"

"کون سے بابا؟" میں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے پوچھا۔

"وہی جن سے انکل بہت ڈرا کرتے تھے۔"

"اوہ!" میں کچھ سنجیدہ ہو کر بولا۔ "وہ بابا وہیں چلے گئے جہاں تمہارے انکل گئے ہیں۔"

"کیا اُن کا انتقال ہو گیا؟" جیسے اُسے میری بات کا یقین نہیں ہوا۔ اس لئے اُس نے دوبارہ پوچھا۔ "کیا واقعی ان کا انتقال ہو گیا؟"

میں نے کہا۔ "کیا کسی کے مرنے پر بھی شک کیا جا سکتا ہے میری؟"

"نہیں!" میری نے فوراً جواب دیا۔ اور افسوس ظاہر کرتی ہوئی بولی۔

"مجھے یہ سن کر دُکھ ہوا مسٹر سنگھ!"

میں نے کہا۔ "دکھ کس بات کا میری۔ وہ تمہارے انکل کی طرح کیا تیزاب کم پیتے تھے۔ اور پھر عمر کا تقاضا۔ کافی بوڑھے بھی تو ہو چکے تھے!"

میری جذبات کی رو میں بہہ کر بولی: "لیکن وہ بڑے بھلے آدمی تھے۔ مجھے اپنی بچی سمجھ کر پیار کرتے تھے۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے ایک مرتبہ انہوں نے تمہیں کتابیں رکھنے کے لئے ایک خوبصورت بستہ خرید کر دیا تھا۔"

"ہاں! لیکن وہ انکل کو بہت ڈانٹا کرتے تھے۔ انکل ڈرتے بھی اُنہیں سے تھے!"

"ایک واقعہ میں ابھی تک نہیں بھولا..." میں نے کہا۔ "انکل ایک دن بہت شراب پی کر گھر آئے تھے۔ اور آنٹی نے اس کی شکایت بابا سے کر دی تھی۔ تو بابا نے انکل کو خوب ڈانٹا تھا۔ وہ ہمیشہ انہیں زیادہ شراب پینے سے منع کرتے رہتے تھے۔"

"لیکن مے نوشی کے پیچھے ہی انکل کی جان گئی۔" میری نے دکھی لہجے میں کہا اور چائے کا آخری گھونٹ نگل کر خالی پیالی ٹیبل پر رکھ دی۔

میں بھی اپنے ہاتھ کی پیالی ایک طرف رکھتے ہوئے بولا: "انھیں مرے دس سال ہونے کو آئے وہ میرے استاد تھے اور مجھے اُن کی موت کا بہت رنج ہے وہ مجھے بہت پیار کرتے تھے جس دن شام کے وقت شراب پی کر گھر پلٹتے۔ مجھے بہلا پھسلا کر ٹانی اور کیک کھانے کو دیتے اور کہتے دیکھ بابا سے مت کہنا کہ میں نے شراب پی تھی۔ اور انٹی عین اس کے برعکس مجھ سے کہتیں۔ نہیں سنگھ تم اپنے بابا سے ضرور کہنا۔ کہ ماسٹر شراب پی کر میم صاب سے جھگڑتا تھا۔ لیکن میں انٹی کی بات نہیں مانتا تھا۔ مجھے انکل بڑے اچھے لگتے تھے۔ وہ مجھے خراب تبھی لگتے تھے جب وہ تمہیں بے رحمی سے اپنی پتلون کی بیلٹ سے پیٹا کرتے تھے۔"

"مجھے تو اتنا یاد ہے، انکل مجھے بہت بڑا بنانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔" میری ماضی کی یادوں میں کھو گئی۔ "وہ چاہتے تھے میں اپنی زندگی میں ایک اچھی مسٹریس ایک بہترین مغنیہ بنوں۔"

"تو کیا تم مغنیہ بن گئیں . . . ؟" میں نے کچھ دلچسپ انداز سے پوچھا

وہ بولی۔ "ہاں میں گاتی گاتی ہوں۔ لیکن ایک عجیب سی جگہ میں۔ کبھی تم میرے گھر آؤ گے تو میں تمہیں اچھے اچھے گیت سناؤں گی۔"

میں نے مشکور نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آؤں گا!" چند لمحات کے لئے ہم خاموش ہو گئے۔ اور پھر میں کچھ سوچتا ہوا بولا۔ "مجھے یاد ہے۔ جب میں شام کے وقت انکل کے یہاں پڑھنے آیا کرتا تھا۔ تمہیں لوبان جلائے منہ ہی منہ میں دعائیں گنگناتے ہوئے مختلف کمروں میں گھومتے ہوئے دیکھتا۔ تمہاری دعاؤں کے الفاظ گھر کے ماحول کو بالکل متبرک بنا دیتے تھے۔ مجھے تمہارا گنگنانا بہت اچھا لگتا تھا۔"

اور میں نے دیکھا۔ اس وقت بھی شام چھا چکی تھی۔ میرے گھر کے سامنے میٹھے اور کٹہل کے گھنے گول مول درختوں پر کہر کی مہین سی چادر تن گئی تھی۔ اور جھکنے والے اندھیرے نے سارے ماحول کو اداس بنا دیا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے میں لوٹ کر پھر ماضی کے اُسی ماحول میں پہنچ گیا ہوں جہاں میرے دل میں کبھی حساسیت نے جنم لیا تھا۔ میری آنکھیں ہر شے میں ایک درد کی چھاپ دیکھنے لگی تھیں۔ جس نے میرے خیالات کو بدل دیا تھا . . .

میں نے پوچھا۔ "میری! انکل تمہیں اتنی بے دردی سے کیوں پیٹا کرتے تھے؟"

"کچھ یاد نہیں۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "پھر بھی یہی کہوں گی کہ وہ مجھے کامیاب بنا دینے کی فکر میں تھے۔ مار کھانا۔ مار پیٹنا میری عادت بن گئی تھی!"

میں نے پھر پوچھا۔ "کیا تم ان کی موت پر خوب روئی تھیں؟" اور اس نے سر کے اشارے سے کہا۔ "ہاں!"

کچھ دیر بعد میری نے جانے کی اجازت چاہی۔ میں اُسے گھر کے پھاٹک تک چھوڑنے آیا۔ جاتی ہوئی وہ مجھ سے وعدہ لیتی گئی۔ میں اس کے گھر اُس سے ملنے ضرور آؤں گا۔

میں پھاٹک کے قریب کھڑا بہت دیر تک اُسے جاتا دیکھتا رہا۔ شام کا اندھیرا گھنا ہو چکا تھا۔ سڑک پر بتیاں روشن ہو چکی تھیں۔ اور سردی کا دباؤ بڑھ گیا تھا۔

میں واپس گھر کے برآمدے میں کرسی پر آ بیٹھا، بابا اور انکل پیٹر، یہ دو چہرے میری آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ بابا جس مل میں فورمین تھے انکل پیٹر وہیں ایک فٹر کا کام کرتے تھے۔ وہ بابا کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ان سے ڈرتے بھی تھے۔ بابا کا صاحبزادہ اور میں انکل پیٹر کے یہاں انگریزی پڑھنے جایا کرتے تھے۔ انکل شام کے وقت کام سے لوٹ کر ایک آدھ گھنٹے کے لئے ہمیں انگریزی پڑھایا کرتے تھے۔ وہ ٹھیک وقت پر بہت کم گھر واپس لوٹا کرتے تھے۔ کبھی شراب کے نشہ میں چور ہو کر لوٹتے تو پڑھنا لکھنا سب دھرا رہ جاتا۔ اس دن وہ ہمارے لئے کھانے کی اچھی اچھی چیزیں لے کر آتے۔ اور

ہمارے ساتھ بہت پیار جتاتے۔

اسکول سے بڑے دنوں کی چھٹیاں تھیں۔ ہمارا خیال تھا۔ انکل کے یہاں سے بھی ہمیں چھٹیاں رہیں گی لیکن اس دن انھوں نے ہمیں خاص طور پر اپنے یہاں بلایا اور طرح طرح کی چیزیں کھانے کو دیں۔ اتنا ہی نہیں وہ بڑے فخر سے ہمیں اپنے عزیزوں کے یہاں لے گئے۔ وہاں بھی ہمیں بہت کچھ کھانے کو ملا۔ انکل پیٹر سے میں بہت خوش ہوا۔ کرسمس کا تہوار کھانے پینے کا تہوار ہے؟ بہت دنوں تک میرے ذہن میں یہی خیال بیٹھا رہا۔

اس دن انکل نے بہت زیادہ شراب پی تھی۔ یہاں تک کہ دوسرے دن بھی انھیں اپنے آپ کا ہوش نہیں تھا۔ نتیجے کے طور پر ہماری پانچ دنوں کی چھٹی ہوگئی۔ پانچ دنوں تک میری سے بھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ بڑا عجیب سا لگا تھا۔ چھٹے دن جب ہم پڑھنے گئے۔ انکل پیٹر کو چارپائی سے لگے دیکھا۔ ہم کچھ دیر اُن کے کمرے میں بیٹھے رہے، پھر واپس لوٹ آئے۔

دوسرے دن ان کی طبیعت اور زیادہ خراب تھی، ہم جب انھیں دیکھنے گئے تو پتہ چلا انھیں اسپتال میں بھرتی کروا دیا گیا ہے۔ میری گھر میں مقدس عیسیٰ کی تصویر کے سامنے موم بتی جلائے انکل کی خیریت کی دعا مانگ رہی تھی۔ وہ بہت اداس اور پریشان نظر آ رہی تھی۔ انکل کے سوا اس کا اور کوئی نزدیکی رشتہ دار نہیں تھا۔ میں بیٹھا اس سے کچھ دیر باتیں کرتا رہا۔ وہ بولی "انکل کو اسپتال، دیکھنے نہیں چلوگے؟"

میں نے کہا "ہاں چلوں گا!"

اور اس دن صرف میں اور میری، انکل پیٹر کو دیکھنے گئے۔ وہ ہوش میں نہیں رہتے۔ پتہ نہیں، انھوں نے ہمیں دیکھا یا نہیں اور دیکھا بھی تو ہمیں پہچانا یا نہیں۔ کچھ پتہ نہیں چلا۔ بس وہ آنکھیں بند کیے لیٹے ہوئے تھے۔ انٹی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

انکل کو بس وہی آخری مرتبہ دیکھا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا، کیسے ہوا؟ بس اتنا ہی سُنا تھا۔ کہ انہیں خون کی قے ہوئی اور وہ چل بسے انھیں گورستان میں تابوت میں بند کرکے دفنا دیا گیا۔ بابا بڑے دردناک لہجے میں بولے تھے، "بڑا اچھا آدمی تھا بیچارہ۔ میرا کہنا مانتا تھا۔ مجھ سے ڈرتا تھا۔ بس ایک بات اُس نے نہیں مانی، یعنی شراب پینا بند نہیں کیا اور ......"

ہم سوچتے تھے۔ انکل پیٹر نہیں رہے تو اب ہمیں انگریزی کون پڑھائے گا۔ ہمیں ٹافیاں کھانے کو کون دے گا۔ کیک کون کھلائے گا.... اور میری!"

آج کئی برسوں کے بعد اچانک اسے دیکھا تھا۔ تو پہلے پہچان ہی نہ سکا۔ سانولے رنگ کی اس لڑکی کا رنگ اب کچھ کھل سا گیا تھا۔ تب اسے ہمیشہ ایک فراک پہنے دیکھا تھا۔ اور اب ساڑھی میں پھب رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر وہی حسن تھا اور وہی بھولا پن۔ پریشانی کے عالم میں بھی اس کے ہونٹوں پر ایک معصوم سی مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔ میرے ذہن میں ماضی کے کئی خاکے اُبھر رہے تھے۔ آج نہ بابا تھے نہ اُن کا لٹھ کا اور نہ انکل پیٹر ہاں انٹی کے بارے میں تو میری سے کچھ پوچھنا بھول ہی گیا تھا۔ سوچا جب اتوار کے دن میری سے ملاقات ہوگی تو ان کے متعلق ضرور کچھ پوچھوں گا۔ انٹی بیچاری بھی مجھے بہت پیار کرتی تھیں، ان کا چہرہ بھی میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔

شام کی اس ملاقات کے بعد اتوار کے دن میں میری سے ملنے اس کے گھر گیا۔ وہ بہت خوش ہوئی۔ وہ قبرستان کے ایک گوشے میں ایک چھوٹے سے گھر میں رہتی تھی۔ میں قبروں کے درمیان سے ہوتا ہوا میری کے ساتھ جنوب کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اور ہر قبر کو اداس نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہاں کی ہر شئے پر ایک اداسی چھائی ہوئی تھی۔ اور بے حس دکھائی دیتی تھی۔ جیسے ان کی سانسیں رک گئی ہوں۔ صرف درختوں کے پتے ہوا کے جھونکوں سے سرسرا رہے تھے۔ اچانک میری ایک قبر کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ اور میری طرف دیکھتی ہوئی بولی "ادھر دیکھو انکل یہاں سو رہے ہیں!"

میں نے کتبہ پر کندہ الفاظ پڑھے۔ انکل کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس قبر پر پیشتر اس کے کہ میں میری سے انٹی کے بارے میں کچھ پوچھوں، وہ بغل کی ایک قبر کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی "اور انٹی یہاں آرام فرما رہی ہیں"

ہم کچھ دیر تک وہاں خاموش کھڑے رہے اور پھر رفتہ رفتہ آگے بڑھنے لگے۔ میری کے رہنے کا گھر قبرستان کے ایک گوشہ میں تھا۔ گھر کے سامنے کچھ کیاریوں میں بہت سے رنگ برنگے خوبصورت پھول کھل رہے تھے۔ اسی باغیچہ میں ایک معصوم بچہ کھیل رہا تھا۔

ہم گھر کے اندر ایک کمرہ میں آ بیٹھے۔ وہاں صلیب پر ٹنگے خداوند مسیح کی بڑی سی تصویر لٹک رہی تھی۔ اور دوسری طرف ایک بڑا سا فوٹو دیکھ کر سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ کہ وہ انکل پیٹر کے کنبے کا ایک گروپ فوٹو تھا۔ میری اس میں ایک ننھی بچی کے روپ میں دکھلائی دے رہی تھی۔ انکل پیٹر کے کوٹ کے کالر میں ایک گلاب کا پھول ٹنکا ہوا تھا۔ میں چند لمحات تک اس فوٹو کو دیکھتا رہا۔ پھر میرے ذہن میں ماضی کی کئی یادیں ابھرنے لگیں میں نے میری سے پوچھا۔ "تمہارا یہاں جی کیسے لگتا ہے میری۔ کیا اس حسین لیکن ویران تنہائی میں تمہارا دل نہیں گھبراتا؟"

"نہیں!" اطمینان بخش لہجے میں وہ بولی۔ "یہاں تو میرے دل کو سکون ملتا ہے!"

"مردوں کی دنیا میں رہ کر....؟"

"ہاں!" وہ اس انداز میں بولی۔ "مُردے کسی کی محبت کو نہیں ٹھکراتے۔ کسی کا حق نہیں چھینتے۔ اس دنیا میں دشمنی نفرت اور بے عزتی کو دخل نہیں ہے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" میں نے کہا۔ "ایک بات تو تم سے پوچھنا بھول ہی گیا۔ میری کیا تم شادی کر چکی ہو....؟"

اُس کے ہونٹوں پہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔ "ٹانی کو شاید تم بھولے نہیں ہوگے۔" وہ شیطان لڑکا جو ہمارے یہاں آیا کرتا تھا۔ اور مجھ سے اکثر جھگڑا بیٹھتا تھا۔"

"ہاں ہاں!" میں نے کہا۔ "وہ جس نے ایک مرتبہ تمہیں پتھر پھینک کر مارا تھا۔"

"اس کا داغ اب بھی میرے ماتھے پر موجود ہے۔ وہ آج بھی مجھے اسی طرح ستاتا ہے۔ اس نے زبردستی مجھے اپنا لیا ہے۔ اور میں۔ میں مجبور ہوں۔ اس کی بن گئی ہوں۔ انکل اور آنٹی کے مرنے کے بعد مجھے اس کے والدین کے یہاں سہارا لینا پڑا تھا۔ انہی نے بھی ایک دن ٹانی کو سونپ دیا تھا۔ میں ان ہی کی زبان رکھ رہی ہوں۔" میری نے گہری سانس لی۔

"اوہ!" جانے کیسا لگا مجھے۔ "مجھے اس کا علم نہیں تھا میری!"

"تم اس سے مل کر جانا۔ وہ آتا ہی ہوگا۔"

پھر ہم اِدھر اُدھر کی پرانی باتوں میں کھو گئے۔ تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد ایک شخص اس کمرہ میں آیا۔ اس کا پہناوا کچھ عجیب سا تھا۔ اس کی قمیص کا کچھ حصہ پتلون میں تھا۔ اور کچھ باہر۔ سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں سرخ تھیں۔ اور ان میں بھوک اور بیزاری کی جھلک تھی۔ اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ ڈپٹتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "کیا تمہیں ابھی فرصت نہیں ملی۔ کہو تو کچھ دیر اور باہر ٹھہر جاؤں.... اچھا لاؤ ایک روپیہ دو۔ میں منہ کا سواد بدل آؤں۔ لاؤ۔"

میری چیخ اٹھی۔ "ٹانی یو ڈرم!"

"شٹ اپ!" ٹانی نے آگے بڑھ کر میری کے گالوں پر ایک تھپڑ کس دیا۔ "تم سے جب بھی پیسے مانگوں بس بہانے بنانے لگتی ہو۔ تمہیں رونے اور چیخنے کے لیے کون کہتا ہے۔"

میں حیران سا سب کچھ دیکھتا رہا۔ پل بھر میں کمرے کا ماحول بدل گیا تھا۔ ٹانی کمرہ سے باہر جانے لگا۔ جاتے جاتے بولا۔ "اچھا میں جاتا ہوں میری۔ میری باتوں کا برا نہ مانا کرو۔ اور بیکار مجھ سے مت جھگڑا کرو۔ تم تو جانتی ہی ہو کہ میں.... میں تمہیں کتنا پیار کرتا ہوں۔" وہ جیسے آیا تھا۔ اسی طرح کمرے سے باہر نکل گیا۔ میری ساڑھی کے آنچل سے اپنی آنکھوں کے آنسو پونچھنے لگی۔ میں سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔

کچھ دیر تک وہ اسی طرح روتی رہی۔ پھر مجھ سے بولی: "تمہیں یہ سب کچھ دیکھ کر برا لگا نا....؟"

میں چپ رہا۔

پھر وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولی: "ایسا تو وہ روز کرتا ہے۔ وہ شراب کے نشہ میں ایسی ہی واہیات باتیں کرتا ہے اور ہوش میں آنے پر مجھ سے گڑگڑا کر معافی مانگا کرتا ہے۔ میں اس کے برے برتاؤ اور سختی کو بھول جاتی ہوں۔ تم اپنے دل میں غلطی کوئی خیال مت کرنا۔"

میں نے پوچھا: "شانی کیا تم سے ہمیشہ اسی طرح پیسے مانگا کرتا ہے؟" اس کا سر جھک گیا۔

"کیا وہ ہمیشہ تمہیں اسی طرح مجبور کیا کرتا ہے....؟"

میرے اس سوال کے جواب میں بھی وہ خاموش رہی۔

اس کے بعد میں نے اس سے اور کچھ نہیں پوچھا۔

کچھ دیر تک ہم خاموشیوں میں گھرے بیٹھے رہے، قبرستان کا ماحول گہری اداسیوں میں کھو گیا تھا۔ میری کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی صاف نظر آرہی تھی۔ شاید وہ اور بھی رونا چاہتی ہو۔ میں جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے مجھے اور کچھ دیر بیٹھنے کو نہیں کہا۔ گھر کے سامنے والے چھوٹے سے باغیچے میں کھیلتے ہوئے میری کے چھوٹے بچے کو گود میں لے کر میں نے پیار کیا۔ اور میری سے بولا۔ "یہ بچہ بہت پیارا ہے۔ معصوم ہے بیچارہ فرشتوں کی طرح" اور میں نے بچے کے ہاتھ میں دس روپے کا ایک نوٹ تھما دیا۔ لمحہ بھر کو میری کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اس کی آنکھوں میں مجبوریوں کے سائے ڈھل گئے۔ پھر بھی جانے کہاں سے ایک انکار اس کی زبان میں ابھر آیا۔ اور وہ بولی: "نہیں مسٹر سنگھ یہ نہیں ہو سکتا۔ اور میرا وہ نوٹ اس نے بچے کے ہاتھ سے لیکر مجھے واپس کرنا چاہا۔

میں نے کہا: "نہیں میری۔ یہ میں اس معصوم بچے کو دے رہا ہوں" اور وہاں سے چل دیا۔

میری کھڑی دیکھتی رہ گئی۔

قبرستان کے خاموش ماحول میں درختوں کے جھڑے ہوئے خشک پتے میرے پیروں تلے روندے جاکر سسک رہے تھے۔ انکل پیٹر اور انی کی قبریں خاموش لیٹی ہوئی تھیں۔ اور میں سر جھکائے خاموش آگے بڑھا چلا جا رہا تھا۔

غلام الثقلین نقوی
ادبی دنیا۔ لاہور

سنہری دھول

اُس نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی!

ذرا دیر بعد دروازہ کھلا، تو اس نے پوچھا "کیوں جی! آج گھر میں اتنی گمبھیر خاموشی کیوں ہے؟"

اُسے کوئی جواب نہ ملا۔ نیم وا دروازے میں ایک لجائی شرمائی اجنبی لڑکی کو دیکھ کر وہ حیران ہوگیا۔

اُس نے ٹوٹے ٹوٹے الفاظ میں کہا۔ "اوہ ہو، میں۔۔۔ نہیں۔۔۔"

شکیلہ نے باورچی خانہ میں سے پکار کر کہا: "آئیے نا اندر! ابّا جان آپ کا انتظار کر رہے ہیں!"

وہ شکیلہ کے ابا جان یعنی میاں سُسر کے سامنے ادب سے جھکا۔ انہوں نے اس کی پیٹھ پر پیار سے تھپکی دیتے ہوئے پوچھا۔ "ماجد میاں! خیریت سے تو ہو؟"

"جی ہاں آپ کی دعاؤں سے!"

"شکیلہ کو گھر کا کام کاج نبٹانے میں بڑی زحمت ہوتی تھی۔ میں سائراں کو ساتھ لے آیا!"

"سائراں!"

"میرے ایک مزارع کی بیٹی ہے!"

"بڑا اچھا کیا آپ نے۔" ماجد نے کہا اور کپڑے اتارنے کے لئے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

رات کے کھانے پر ماجد اور اس کے ماموں ایک میز پر بیٹھے۔ شکیلہ نے خود میز پر کھانا چنا۔ پانی کا جگ اور گلاس سائراں لے کر آئی۔ ماموں کی موجودگی میں ماجد کو شرم محسوس ہوتی کہ سائراں کو نگاہ اٹھا کر دیکھ لے۔ البتہ جب سائراں نے گلاس میز پر رکھے تو ماجد کی نگاہیں اُس کے ہاتھ کی مخروطی انگلیوں پر پڑ گئیں۔ اُسے حنائی پوروں میں گلاب کی نوخیز کلیوں کی نرمی اور حدت کا احساس ہوا۔

سائراں جگ اور گلاس رکھ کر چلی گئی تو ماموں نے کہا۔ "سائراں ایک سال سے ہمارے ہاں کام کر رہی ہے اب خاصی تمیز دار ہوگئی ہے۔"

"مجھے ڈر ہے، شہر کی بند فضا میں اُس کا دل نہ لگا تو کہیں۔۔۔۔"

"ماجد میاں! شکیلہ بیٹی کی باتوں میں بڑی مٹھاس ہے، وہ اُسے دو دن میں رام کرلے گی۔"

دوسرے دن اُس نے حسبِ معمول دروازے پر دستک دی۔ تو پھر دروازہ دیر سے کھلا۔
اُس نے بڑی بے تکلفی سے کہا "سائزاں! ذری لیک کر آیا کرو نا!"
اس کے جواب سائزاں قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ سائزاں اور قہقہہ! چند لمحے وہ حیران رہا۔ پھر اُس نے کہا "شکیلہ! یہ تو پروفیسر والا لطیفہ ہوگیا"
"کون سا؟"
"ایک پروفیسر صاحب بڑے بدحواس اور غیر حاضر دماغ واقع ہوئے تھے"
"اندر آکر سنائیے گا!"
"نہیں، یہیں سن لو، پھر مزہ جاتا رہے گا۔ بھرے بازار میں اُن کی کسی چیز سے ٹکر ہوگئی۔ گھبرا کر کہنے لگے: معاف کیجئے گا بیگم صاحبہ: ایک قہقہہ بم کی طرح پھٹا۔ انہوں نے جز بز ہو کر نگاہ اٹھائی۔ تو سامنے ایک پروقار قسم کی گائے کو کھڑا دیکھ کر حیران ہوگئے۔ دوسری بار پھر فلسفے کی گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے جا رہے تھے۔ کہ کسی شے سے ٹکرا گئے۔ غصے سے کانپ کر بولے۔ "بڑے بدتمیز ہیں یہ لوگ کہ انہیں بازاروں میں کھلا چھوڑ دیتے ہیں" ایک قہقہہ پھر بم کی طرح پھٹا تو پروفیسر صاحب آنکھ اٹھا کر دیکھنے پر مجبور ہوگئے۔ سامنے ایک فیشن ایبل خاتون ہاتھ میں پرس اور نگاہوں میں غصے کی چمک لئے کھڑی تھی"
شکیلہ نے ننھا سا قہقہہ لگا کر اس لطیفے کی داد دی۔

ماجد اکثر کھانا باورچی خانے میں بیٹھ کر کھایا کرتا تھا۔ لیکن اگر کبھی کبھار کوئی اچھی سی کتاب ہاتھ لگ جاتی تو وہ کھانا اپنے کمرے میں منگوا لیا کرتا تھا۔ ایک ہاتھ میں لقمہ، دوسرے ہاتھ میں کتاب۔ کبھی کبھی لقمے کو منہ تک پہنچنے میں بہت اینچ پینچ کھانے پڑتے۔ اور آج تو اسے دنیا کی بہترین کہانیوں کا ایک مجموعہ عاریتاً مل گیا تھا۔
اُس نے اپنے کمرے میں سے پکار کر کہا۔ "شکیلہ! آج کھانا یہیں لے آؤ"
شکیلہ نے اُس کے سامنے تپائی پر کھانا لگا دیا۔ اور مسکرا کر پوچھا "آج پھر کوئی کتاب ہاتھ لگ گئی؟"
"جی ہاں! ایک ہفتے کے اندر اندر پڑھ کر واپس کرنی ہے!"
ماجد نے ایک لقمہ توڑ کر شوربے میں بھگو لیا۔ دوسرے ہاتھ سے کتاب کا ورق الٹا۔ پھر لقموں اور لفظوں میں جنگ شروع ہوگئی۔ کبھی کوئی لقمہ گلے میں پھنستا، کبھی کوئی لفظ اٹک جاتا اور ساری سطر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی۔ پھر ایک لقمہ نے گلے میں پھنس کر کہا "پانی!"
شرر — شرر — شرر — اس کی نگاہیں خود بخود اٹھ گئیں۔ ایک اجنبی لڑکی ذرا جھک کر جگ سے گلاس میں پانی انڈیل رہی تھی اس کے سر سے دوپٹے کا ایک کونہ کھسک گیا تھا۔ اور ایک لٹ گندم کے پکے ہوئے اس سنہری خوشے کی طرح دمک رہی تھی۔ جس پر ڈوبتے سورج کی ایک کرن آتشیں بوسہ بن گئی ہو۔ لقمہ گلے میں از خود اتر گیا۔ کالے کالے لفظ پھر سے اڑے اور کتاب کا صفحہ سفید مَل مَل کی طرح دھل کر رہ گیا۔

آج خوابگاہ میں اُسے معمول کے خلاف کچھ تبدیلی محسوس ہوئی۔

حسب معمول اُس کے اور شکیلہ کے پلنگ ساتھ ساتھ پڑے ہوئے تھے۔ شکیلہ کے پلنگ کے پاس ننھے کا پنگھوڑا بھی تھا۔ لیکن امجد اور شاہدہ کی چار پائیاں کہاں گئیں۔ یہ عقدہ جلد حل ہو گیا۔ شکیلہ نے ننھے کو پنگھوڑے میں لٹاتے ہوئے کہا۔ "اس کمرے میں سائراں کا سونا مناسب نہیں تھا۔ اور اکیلے میں سوتی وہ ضرور گھبراتی میں نے امجد، شاہدہ اور سائراں کو دوسرے کمرے میں الگ کر دیا۔"

"بچوں نے الگ ہونے کا برا تو نہیں مانا۔"

"نہیں تو سائراں بڑے مزے مزے کی کہانیاں سناتی ہے۔"

ماجد نے شب خوابی کا لباس پہنا اور بستر پر لیٹ کر لحاف اوڑھ لیا۔ شکیلہ مکان کے دوسرے کمروں کو بند کرنے کے لئے چلی گئی۔ تو ماجد نے سوچا۔ "میں کتاب خوامخواہ دوسرے کمرے میں رکھ آیا۔ ایک کہانی اور پڑھ لیتا۔ جب تک بجلی نہ بجھے گی مجھے نیند نہ آسکے گی۔ کتاب کی ایک ایک کہانی کتنی دلچسپ ہے۔ میں کھانا کھاتے ہوئے بھی کتاب ہاتھ سے نہ دھر سکا۔ ایک ہاتھ میں لقمہ، دوسرے میں کتاب کا صفحہ، لقمہ گلے میں پھنس کر اٹھ گیا۔ اور صفحہ دھل کر رہ گیا۔

کالے کالے لفظ پھر سے کیوں اڑ گئے؟

شکیلہ اُس کے سامنے کھڑی ہے۔ وہ اپنے بالوں میں سے پِن نکال رہی ہے۔ لمبے لمبے سیاہ بال کندھوں پر بکھر رہے ہیں۔ شکیلہ کو ان بالوں کی طوالت اور سیاہی پر بہت ناز ہے۔ قدرت کی طرف سے شکیلہ کو ان بالوں کے علاوہ ایک خوبصورت جسم بھی عطا ہوا ہے۔ لیکن شکیلہ ان کے باوجود کبھی خوبصورت نہیں رہی۔ گندمی پھیکا پھیکا رنگ۔ رخساروں کی ہڈیاں ذرا ابھری ہوئیں۔ ناک تھوڑی چپٹی سی، آنکھیں کچھ اندر کو دھنسی ہوئیں، لیکن ان آنکھوں میں ذہانت کی چمک ہے۔ اس چمک میں آگ نہیں۔ فولاد کی ٹھنڈی ٹھنڈی تیز روشنی ہے۔ شکیلہ نے ایک ایسے گاؤں میں پرورش پائی ہے جہاں کوئی اسکول نہیں تھا۔ اُس نے اُردو، فارسی کی کچھ کتابیں پڑھیں، شادی کے بعد تھوڑی سی انگریزی سیکھی۔ شہر کی دس سالہ رہائش میں میں عملی طور پر اُس نے اپنی تعلیمی کمی کو پورا کر لیا۔ اب وہ بڑی اچھی اُردو بول سکتی ہے۔ عورتوں کے رسالے پڑھتی ہے۔ خانہ داری میں ماہر ہے۔ بچوں کی بڑی صحیح تربیت کر رہی ہے۔ پڑھی لکھی عورتوں میں بیٹھ کر ذرا سی کمتری بھی محسوس نہیں کرتی اس کی گفتگو میں شہری تہذیب کا لوچ ہے، لہجے میں دھیما پن، نرم نرم الفاظ کی بارش میں ننھی ننھی بوندوں کی راگنیاں ٹپکتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ اس کی رفاقت میں زندگی کتنی اچھی گزر رہی ہے، اس میں کوئی اتار چڑھاؤ نہیں، ایک نرم خرام ندی کا پرسکون بہاؤ ہے .... نرم خرام ندی .... پرسکون بہاؤ .... ایک منزل ایسی بھی آتی ہے جب پانی رک جاتا ہے اور حرکت میں جمود پیدا ہو جاتا ہے، ٹھہرے ہوئے پانی سے بو آتی ہے اور راگنیاں بھی باسی ہو جاتی ہیں۔

کیا یہ منزل آ تو ....

نہیں ....

میں کن خیالات میں کھو گیا۔ ابھی شکیلہ جوان ہے۔ تین بچوں کو جنم دے کر جسم اپنی دلکشی کھو بیٹھتا ہے .... وہ کھچن وہ تناؤ کہاں باقی رہتا ہے ... مجھے شکیلہ سے پیار ہے ... اس کے جسم سے؟ .... نہیں .... اس میں حرج بھی کیا ہے ... جسم پیار کا مادی پہلو ہے ... اور پھر شکیلہ کی آنکھوں میں چمک موجود ہے۔ اس کے بال ابھی تک شب دیجور کی سیاہیاں لئے ہوئے ہیں ...

یہ بال جو سردیوں کی کالی ابر آلود راتوں کا عطر ہیں ...

ان میں سنہری جھلک ہے ....

سنہری جھلک .... نہیں تو ... انگور کے پکے خوشوں کا رنگ ــــ خوشبو ــــ مستی ــــ کیف ــــ ٹپکتی ہوئی ارغوانی شراب ... سورج کی آخری کرن کا آتشیں بوسہ۔

"آپ سو گئے؟" شکیلہ نے پوچھا۔
ماجد نے کوئی جواب نہ دیا۔ تو شکیلہ نے بتی بجھا دی۔

سہ پہر کی چائے کے انتظار میں ماجد تپائی کے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔
کہانیوں کی کتاب سامنے کی الماری کے خانے میں پڑی تھی۔ ماجد بڑے صبر سے کام لے رہا تھا۔ دو تین کہانیاں باقی رہ گئی تھیں۔ اگر اس نے اب پڑھ لیں۔ تو سونے سے پہلے رات کا وقت کیسے گزرے گا۔ شکیلہ برآمدے میں سلائی کی مشین رکھ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ کٹ۔ کٹ۔ کٹ۔ مشین چل رہی تھی۔ شکیلہ اپنے پرانے سوٹ میں کاٹ چھانٹ کر رہی تھی۔
"سائراں، چائے کا پانی ابل گیا؟"
"جی، بی بی جی!"
مشین کی آواز بند ہو گئی اور خاموشی طاری ہو گئی۔
چند منٹوں کے بعد شکیلہ مسکراتی ہوئی آئی اور اُس کے سامنے کرسی بچھا کر بیٹھ گئی۔
"چائے نہیں آئی شکیلہ؟"
"بس ابھی آیا چاہتی ہے!"
"خود بخود؟"
"نہیں سائراں لائے گی!"
"سائراں.... کیوں؟"
"اُسے میز پر چائے پلانے کی تربیت دے رہی ہوں!"
"نہیں، یہ بات نہیں شکیلہ، اب تم میم صاحبہ بننا چاہتی ہو۔ اتفاق سے مفت کی نوکرانی جو ہاتھ لگ گئی!"
"چلئے یہی سہی۔ اب ہم صاحب بہادر کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیا کریں گے۔"
باورچی خانے میں برتن کھٹکے کھڑ کھڑ۔ ایک پیالی رطے پر سے لڑھکی اور فرش پر گر کر چھن سے ٹوٹ گئی۔ شکیلہ بگولہ بن کر اُٹھی۔ اور آندھی کی طرح باورچی خانے کی طرف لپکی۔
"سیٹ کی ایک پیالی توڑ دی کم بخت نے" شکیلہ کی آنکھوں کی فولادی چمک برف کی سل بن گئی تھی۔
"یہ تمہیں بڑا بننے کی سزا ملی ہے شکیلہ!"
"آپ کیا جانیں۔ ایک پیالی کے ٹوٹنے سے میرے دل میں کتنا بڑا گھاؤ پڑ گیا ہے۔"
"اتنی تنگ دل نہ بنو شکیلہ، برتن ٹوٹتے رہیں گے، دل نہیں ٹوٹنے چاہئیں۔ ورنہ شکستہ دل سائراں چند سال تو کیا چند گھڑیاں بھی اس گھر میں نہ ٹھہر سکے گی۔"
"میری بلا سے" شکیلہ نے شکر دانی تلاش کرتے ہوئے کہا۔
"شکر دانی تو لاؤ سائراں" شکیلہ غضب ناک آواز میں پکاری۔
سائراں نے کانپتے ہاتھوں سے شکر دانی تپائی پر رکھ دی۔ جھکی ہوئی سائراں کی بڑی بڑی آنکھوں میں ندامت کے ساتھ ساتھ خوف زدہ

وحشت بھی تھی۔ ماجد دل مسوس کر رہ گیا۔ ایک لمحے کے بعد سائراں کا جھکا ہوا سر اٹھا یا تو دوپٹے کا ایک کونہ سرک گیا۔ اور نہ جانے روشندان کی ایک جھری میں کب سے ایک کرن اس لمحے کی منتظر تھی۔ کہ تتلی کی طرح اڑی اور اس زلف میں الجھ کر، جگنو کی لرزتی کانپتی چمک بن گئی۔

چائے کا ایک گھونٹ بھر کر ماجد شکیلہ کی موجودگی کو بھول گیا۔

اس نے محسوس کیا۔ کہ زمین ایک چکر لگا کر آسمان سے جا ملی۔ کچھ ستارے ٹوٹ کر کہکشاں کی دھول میں بکھر گئے ہیں۔ کہکشاں کی دھول کا رنگ سنہرا تھا۔ سائراں کے سنہری بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ تیز ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ سائراں کے قدموں پہ دریائے ڈی کی طوفانی لہریں ٹوٹ رہی تھیں اس کی آنکھوں میں کسی رمیدہ آہو کی وحشت تھی۔ دریائے ڈی...... سینڈز آف ڈی .... او میری! گو اینڈ کال دی کیٹل ہوم۔ اینڈ کال دی کیٹل ہوم۔

شکیلہ نے حیران ہو کر پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"کچھ بھی نہیں.... مہترانی ہو کہ رانی مسکرائے گی ضرور......

یہ جوانی ہے جوانی گنگنائے گی ضرور......"

"تو گویا آپ کی جوانی گنگنا رہی تھی۔"

"ایک بہت پرانی انگریزی کی نظم کا ایک مصرعہ یاد آگیا۔"

"ذرا اونچی آواز سے سنایئے۔ ہمیں محظوظ ہونے سے کیوں محروم فرما رہے ہیں آپ۔"

"نہیں بھئی!" اس نے پیالی خالی کرتے ہوئے کہا۔ "پھر کبھی سہی، اب تو ہم سیر کے لئے جائیں گے!"

وہ لمبے لمبے ڈگ بھر کر باہر نکل گیا۔

میری اس کے ساتھ چلتی رہی۔ سنہری بالوں والی میری۔ جس کے قدموں پر طوفانی لہریں لوٹ رہی تھیں۔ جس کے سنہری بال تیز ہوا کے جھونکوں میں اڑے جا رہے تھے۔ میری جو دریائے ڈی کے ریتیلے پاٹ کو عبور کر کے اپنے مویشیوں کو بلانے جا رہی تھی۔

میری جو طوفانی لہروں میں ڈوب گئی۔

اور مچھیروں کے جال میں پھنس گئی۔

سنہری بالوں والی جل پری، مچھیروں کے جال میں نہیں اس کے تخیل کے جال میں پھنس کر رہ گئی تھی۔

میری اور سائراں!

وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔

اس نے سوچا۔ میں جب کبھی سائراں کو دیکھتا ہوں ایک سنہری دھول میں کھو جاتا ہوں۔ سائراں کے سنہری بال اور حیران حیران سی آنکھیں تصویر کی میری سے ملتی ہیں۔ اور یہ تصویر لڑکپن کی یادوں کے البم پہ چپک کر رہ گئی ہے۔ مجھے اس سنہری جال کو اپنے گرد تنے اور بُننے جانے سے ضرور روکنا چاہئے سائراں آہستہ آہستہ میری زندگی کے معمول کا ایک جزو بن گئی۔ تو یہ کیفیت ضرور جاتی رہے گی۔

ماجد نے اپنے گرد ایک مضبوط حصار کھڑا کر لیا۔

اس نے اس حصار میں کوئی درز، کوئی روزن، کوئی جھری باقی نہ رہنے دی، ایسا نہ ہو کہ کوئی سنہری کرن در آئے اور اس کی پرسکون زندگی کے پرخچے اڑ جائیں۔ وہ طوفانوں سے نبرد آزما ہونے کی جرأت نہ رکھتا تھا۔

چند دن ماجد بڑا خوش خوش رہا۔
سائراں دن میں کئی مرتبہ اُس کے سامنے آتی اور اسے کوئی دھچکا نہ لگتا۔ اس نے سمجھا کہ سائراں اُس کے ماحول کا جزو بن گئی ہے۔
اُس نے کتنا کامیاب نفسیاتی تجزیہ کیا تھا اپنا؟
ایک ہفتہ، دو ہفتہ، تین ہفتے گزر گئے۔ وہ اور شکیلہ حسب معمول ساتھ ساتھ جڑے ہوئے پلنگوں پر سوتے رہے۔ لیکن عجیب بات تھی۔ کہ وہ ان دنوں خوب گہری نیند سوتا۔ اور شکیلہ جاگتی رہتی۔ ان تینوں ہفتوں میں اس نے شکیلہ کے جسم کی آگ کو ایک بار بھی محسوس نہ کیا تھا۔ ایک صبح جب شکیلہ سو کر اٹھی اور پلنگ سے نیچے اتری تو اس کی بھی آنکھ کھل گئی۔ ابھی کمرے میں ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ شکیلہ نے بتی جلا دی۔ بکھرے ہوئے بالوں، سوئے سوئے چہرے والی اور ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں لپٹی شکیلہ نے انگڑائی لی۔ تو اس نے کروٹ بدل لی۔
شکیلہ نے جھنجھلاتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اُٹھئے! کب تک سوتے رہیں گے آپ؟"
"میں تو کب کا جاگ رہا ہوں!"
"جھوٹ! ساری رات تو میں جاگتی رہی۔ میں نے جب بھی دیکھا آپ کو سویا ہوا پایا، اور آپ کے خراٹوں نے نیند دو بھر کر دی۔"
"یہ شکایت آج پہلی بار میں نے سنی!"
"یہ میری شرافت تھی۔ کہ آج تک میں نے شکایت نہ کی۔"
"میں تمہاری شرافت کی داد دیتا ہوں۔"
شکیلہ رات کا لباس اتارنے لگی تو بجلی کی تیز روشنی میں اسے شکیلہ کی یہ حرکت بڑی تیز اور عریاں محسوس ہوئی۔ لحاف میں برفانی لہروں کا ریلا آیا اور اس کا تن بدن سن ہو کر رہ گیا۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ دیر تک بستر پر بے حس و حرکت پڑا۔
باورچی خانے سے برتنوں کے کھنکنے کی آوازیں آتی رہیں۔
ناشتے پر شکیلہ اس کے ساتھ شامل نہ ہوئی۔
سائراں نے چائے کی ٹرے میز پر رکھتے ہوئے کہا: "بی بی پوچھ رہی تھیں آج شام انھیں نمائش پر لے چلنے کا نا؟"
"ضرور ضرور — کون کون چلے گا؟"
"بی بی نے نہیں بتایا۔ پوچھ کر آؤں؟"
ماجد نے پیالی میں چینی ڈالی۔ چائے کا پانی انڈیلا۔ دودھ ملا کر چینی ہلائی۔ سائراں دبے پاؤں آئی۔ اور تپائی پر تلے ہوئے انڈوں کی پلیٹ رکھ کر کہنے لگی۔ "بی بی کہہ رہی تھیں ہم سب جائیں گے۔"
"تم بھی چلو گی سائراں؟"
"جی..... میں..... مجھے کیا معلوم..... میں بی بی جی سے پوچھ آؤں؟"
"نہیں تو..... بی بی تمہیں ضرور ساتھ لے کر جائیں گی۔ گاؤں سے آئی ہو تو تمہیں شہر کی رونق بھی دیکھنی چاہئے۔"
سائراں بے اختیار مسکرا اٹھی۔ ماجد مسکرا پڑا۔ وہ حصار جو ماجد نے اپنے گرد کھڑا کر رکھا تھا۔ اس کی ایک ایک دیوار مست مہو ہو کر جھومنے لگی۔ اس نے کانپ کر سوچا۔ "سائراں ابھی تک میری زندگی کے معمول کا مردہ جزو نہیں — بن سکی — میں کیا کروں مجھے حصار کو اور زیادہ مضبوط کر لینا چاہئے۔"
"سائراں تم چلو گی نا؟" سائراں مسکرائی جیسے کہہ رہی ہو۔

جی! میں ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔ پر کہاں تک ... نہ جانے سفر کی کس منزل پر آپ میرا ساتھ چھوڑ جائیں۔
یہ کون تمہارے ساتھ چلنے کی دعوت دی جا رہی تھی؟"
"سائراں؟ ماجد چونک گیا۔" اوہ! تم ہو شکیلہ؟"
"جی ہاں! میں ہوں شکیلہ!"
"اگر اکیلے میں چائے پی جائے تو اسی قسم کی ہم کلامی سے جی بہلایا جا سکتا ہے۔"
"سچ؟" شکیلہ نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔
ماجد کو شکیلہ کی آنکھوں سے آنکھیں ملانی پڑیں۔ شکیلہ کی ذہین آنکھوں میں شک کی ایک دھیمی سی گھٹا چھا رہی تھی۔ جیسے دن کی روشنی پر کالی رات کی پرچھائیں۔
"آج آپ چائے میں شامل کیوں نہ ہوئیں؟"
"جس گھر میں تین بچے ہوں اور ان میں سے دو کو تیار کر کے اسکول بھی بھیجنا ہو، وہاں میم صاحب اور صاحب بہادر ایک بستر پر تو اکٹھے ہو سکتے ہیں لیکن ایک میز پر بیٹھ کر چائے پینے کا وقت نہیں نکال سکتے۔ میرا مطلب ہے ...."
"شکیلہ!" ماجد نے چیخ کر کہا:
"چھوڑیئے اس قصے کو۔ اگر آج شام نمائش پر جانے کا ارادہ ہو تو گھر کے سارے کام جلد نپٹا کر تیار ہو جاؤں!"
"ضرور ـــ ضرور ـــ لیکن کون کون جائے گا؟"
"سوچنے کی بات ہے، فی الحال آپ دفتر جائیں۔ میں فرصت کے اوقات میں اس مسئلے پر غور فرماتی رہوں گی۔ جب آپ آئیں گے تو اپنا فیصلہ سنا دوں گی۔

دفتر میں سارا دن ایک عجیب سی بے کلی میں گزر گیا۔
واپس آ کر اُس نے چائے پی۔ آرام کیا۔ دو تین بار بہانے بہانے شکیلہ سے ملا بھی، لیکن شکیلہ نے اپنے چہرے سے اپنا عندیہ عیاں نہ ہونے دیا۔ رات کا کھانا اُس نے شام ہونے سے پہلے کھا لیا۔ شام ہوئی کمروں میں قمقمے روشن ہوئے۔ اور شکیلہ بن سنور کر آ گئی۔ شاہدہ اور امجد اسکے ساتھ تھے۔
شکیلہ نے کہا۔ "اللہ، آپ بھی کتنے سست ہیں۔ ابھی تک تیار نہیں ہوئے۔"
"بس جانِ من! آپ ہی کا انتظار تھا۔ دیکھئے ابھی ایک منٹ میں تعمیلِ ارشاد ہوتی ہے۔"
جب وہ کپڑے پہن کر تیار ہو گیا۔ تو شکیلہ نے کہا۔ "ننھے کو دودھ پلا کر سلا دیا ہے۔ بوتل بھر کر رکھدی ہے۔"
"لیکن؟" ماجد نے حیران ہو کر پوچھا۔ "ننھا؟"
"اکیلا نہیں رہے گا۔ سائراں کو گھر چھوڑے جا رہی ہوں۔" شکیلہ کے لہجے میں بھولپن تھا پر ماجد نے محسوس کیا کہ شکیلہ کے الفاظ زہر کی بوندیں ہیں۔ جو اس کی رگ رگ میں ٹپک رہی ہیں۔
جب وہ نمائش سے لوٹے تو ماجد تھک کر چور ہو چکا تھا۔ لیٹتے ہی اس کو نیند آ گئی۔ آدھی رات کے بعد اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ شکیلہ جاگ رہی ہے۔ اُس نے آہستہ سے کروٹ بدل لی۔ تو شکیلہ نے کہا۔ "سنئے تو!"
وہ خاموش رہا

"میری ایک بات سُن لیجئے پھر گھوڑے بیچ کر سویئے گا۔"
"کہو!"
"کل شاہدہ کے اسکول میں مینا بازار ہے۔"
"بڑی خوشی سے جاؤ!"
"شاید دیر ہو جائے۔ آپ سہ پہر کی چائے باہر سے پی آئیں۔"
"لیکن سائراں تو گھر پہ رہ سکتی ہے؟"
"میں سائراں کو ساتھ لے جاؤں گی۔ ننھے کو خود اٹھائے اٹھائے پھروں گی تو مینا بازار کا کیا خاک لطف آئے گا؟"
"یہ بات آپ صبح بھی کر سکتی تھیں!"
شکیلہ نے کوئی جواب نہ دیا۔
ماجد کے دل میں ایک پھانس سی چبھ گئی۔
ایک میٹھا سا درد جاگ اٹھا۔
دیر تک یہ درد جاگتا رہا.... شکیلہ عجیب عجیب باتیں کرتی ہے..... رات کو جگا کر یہ بات کرنے کی کیا ضرورت تھی بھلا.... سائراں گھر رہے یا ساتھ جائے مجھے اس سے کیا.... اب مجھے سونا چاہیئے.... سو جانا چاہیئے.... نیند میں کتنی راحت ہے.... اس کے سنہ پروں میں عطر بیز، شراب آمیز ہواؤں کے سانس ہیں.... پھول سے نازک خواب.... شاخ گل سے جھڑنے والی پتیوں کا دھیما راگ.... سنہری پتیاں.... سنہری خواب سینڈز آف ڈی.... او میری! گو اینڈ کال دی کیٹل ہوم.... ہوا کے طوفانی جھونکے.. گرد سے اٹا ہوا راستہ.... دھول کے بگولے... ڈوبتے سورج کی شعلہ بداماں کرنیں.... ایک شعلہ لپکا اور دھول میں آگ لگ گئی.. میری کے ہاتھ میں چھڑی تھی.... مویشیوں کے گلے میں گھنٹیاں بج رہی تھیں.... میری کے بال اڑے جا رہے تھے..... اُس سنہری دھول میں اٹا ہوا کالج کا ایک لڑکا ہاتھ میں سوٹ کیس اٹھائے ہوئے اپنے ننھیال آ رہا تھا۔ اس رستے کے دونوں طرف خالی کھیت تھے۔ جن میں نئی نئی کٹی ہوئی گندم کے ٹھنٹھ چمک رہے تھے۔ اُس لڑکے نے دھول اور مویشیوں میں سے رستہ بنا کر گذر جانا چاہا۔ تو میری نے اُسے موٹی موٹی حیران آنکھوں سے دیکھا۔ اور پھر کہا۔ "گوری کو سینگ مارنے کی عادت ہے۔"
"گوری! کون گوری؟" کالج کے لڑکے نے پوچھا۔
لڑکی نے اشارے سے کہا۔" وہ جو سب سے الگ الگ چل رہی ہے!"
لڑکے نے اس سمت میں دیکھا۔ "گوری بھرے بھرے گدرائے ہوئے جسم کی خوبصورت گائے تھی۔ جو سارے گلے سے الگ اٹھلا اٹھلا کر چل رہی تھی۔
وہ لڑکا رستے سے ذرا ہٹ کر کھیت میں سے ہو کر گذر گیا۔ کچھ دور جا کر رکا۔ اُسے میری نظر نہ آئی۔ میری اور اس کے درمیان دھول کی دیوار حائل ہو گئی تھی..... سنہری دھول... سینڈز آف ڈی.... سمندر کا تلاطم... موجوں کا شور... کف بر لب لہروں کے جھومتے لہراتے ہوئے پہاڑ اُس کی دنیا، دھنکی ہوئی روئی کے گالوں کی طرح اڑ گئی...
اور اس کی آنکھ کھل گئی۔
اُس کا جسم سرد تھا۔ اس کی پیشانی تپ رہی تھی۔
پیشانی پر پسینے کے قطرے برف کی طرح جم گئے تھے۔

شکیلہ دھیمی دھیمی آواز میں کھانسی۔

دھیمی، میٹھی، پراسرار سُریلی آواز میں جیسے تخلیق پر آمادہ قمری اپنے رفیقِ زندگی کو بلا رہی ہو۔

ماجد اس پکار کو سمجھ گیا۔

ایک لمبی یکساں اکتا دینے والی متاہل زندگی کے ساز پر کبھی کبھار یہ نغمہ بیدار ہوتا ہے۔

حیا آلود نسائیت سب سے بڑا تحفہ... اُس کی ایک تان پر کوثر و سلسبیل کے چشمے پھوٹ بہا کرتے ہیں اور ان میں جہنم کی سیال آگ بھی مل جاتی ہے۔ آگ اور پانی، شعلہ و نور کی آمیزش، مگر آج اس نو لائے سردی کے فردوس میں صرف برفانی ہوا کے جھکڑ چلے اور ماجد منجمد ہو کر کروٹ بھی نہ بدل سکا۔ اُس نے اندھیرے میں شکست خوردہ نسائیت کے جلتے پھکتے آنسو نہ دیکھے۔ لیکن جب بوجھل نیند تلے پسا ہوا چور چور جسم جاگا۔ تو ماجد نے دیکھا کہ شکیلہ پلنگ کے پاس کھڑی ہو کر بکھرے ہوئے بال سنوار رہی ہے اور اس کی آنکھوں میں رات کے آنسو انگاروں کی طرح جل رہے ہیں۔

ماجد دفتر سے سیدھا گھر کی طرف لوٹا۔

گھر کے قریب اُسے خیال نہ آیا کہ آج شکیلہ نے اُسے گھر آنے سے پہلے کسی ہوٹل میں چائے پی آنے کو کہا تھا۔ اس کا چائے پینے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ کسی دوست کے ہاں جا کر سہ پہر گزارنے کو بھی دل نہیں مان رہا تھا۔ اور سڑکوں پر آوارہ پھرنے کی اُسے عادت نہ تھی۔

اُسے شکیلہ پر غصہ آیا۔

وہ گھوما اور کمپنی باغ کی طرف چلا گیا۔ یہاں ایک تنہا کونے میں اُسے گھاس پر لیٹنے کی جگہ مل گئی۔ اور نرم ٹھنڈے فرش پر لیٹتے ہی اُس کی آنکھ لگ گئی۔ جب اُس کی آنکھ کھلی۔ تو سڑکوں پر قمقمے روشن ہو چکے تھے۔ وہ اٹھا اور سیدھا گھر کی طرف ہو لیا۔

اُس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

دروازہ کھلا۔ اور آج اُسے دروازہ کھولنے والی پر شکیلہ کا دھوکا نہ ہوا۔ حالانکہ سائراں شکیلہ کے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ یہ لباس شکیلہ کے جسم پر بھی پھبتا تھا اور سائراں کو اس لباس میں ملبوس دیکھ کر نہ جانے اُسے وہ رفعت محسوس کیوں نہ ہوئی جو اسے اٹھا کر عنبر کی نیلاہٹوں میں تحلیل کر دیا کرتی تھی۔

"سائراں؟ تمہاری بی بی آ گئیں؟"

"جی ہاں! آئی تو تھیں، پر ابھی ابھی ایک اور بی بی کے ساتھ تماشا دیکھنے چلی گئیں۔"

"شاہدہ اور امجد؟"

"وہ بھی ساتھ جانے کے لئے مچل گئے تھے۔"

"اور ننھی؟"

"پنگھوڑے میں سو رہا ہے۔ کھانا لاؤں؟"

"نہیں... ابھی نہیں.... پہلے پانی کا ایک گلاس لاؤ!"

کرسی پر بیٹھ کر اس نے سوچا۔ شکیلہ مینا بازار کے بعد تماشا دیکھنے کیوں گئی۔ اور پھر سائراں کو گھر میں اکیلا چھوڑ کر....

یہ سوال ننھی سی لہر کی طرح اٹھا اور اس کے ذہن کے کناروں سے ٹکرا کر لوٹ گیا۔ اور لوٹ کر ٹکراتا رہا۔ لہروں میں طوفان آ گیا۔ کنارے ٹوٹتے رہے اور لہریں چیختی رہیں۔ "بولو!"

"بولو! شکیلہ سائراں کو اکیلا چھوڑ کر سنیما کیوں دیکھنے گئی؟"

"میں کیا جانوں!"

"نہیں! تم جانتے ہو۔ شکیلہ نے آج زندگی میں پہلی بار زہر کا ایک قطرہ چکھا ہے۔"

"زہر کا ایک قطرہ!"

زندگی کی چٹان سے ایک چشمہ پھوٹا۔

ٹپ... ٹپ... ٹپ۔

زہر کے قطرے ٹپکے۔

پھر ایک دھارا پھوٹ بہی۔

شر... شر... شر

پیالہ کناروں سے چھلک گیا۔ تو کسی نے اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

اُس نے تلچھٹ تک پی کر پیالہ دور پھینک دیا۔

چھن سے پیالہ ٹوٹا اور دور دور تک فرش پر کرچیں بکھر گئیں۔

"یہ کیا ہوا؟"

ایک گھبرائی ہوئی آواز نے پوچھا۔

"ایک پیالہ اور!"

"گلاس نہ لاؤں، پیالہ لاؤں؟"

"ہاں!"

چند لمحوں بعد ایک کانپتے ہاتھ نے پیالہ اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"اسے زہر سے لبالب بھر دو۔"

"زہر سے!" کانپتی ہوئی آواز پکاری۔

ماجد قہقہہ لگا کر ہنسا، سائراں چونک کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"سائراں! میں نے یونہی مذاق میں پانی کو زہر کہہ دیا تھا۔ تو اس پیالے میں پانی ڈالو۔"

سائراں دوڑ کر گئی، ایک جگ پانی کا لے آئی۔ اور ماجد کے پیالے کو لبالب بھر دیا۔ ماجد غٹ غٹ پی گیا۔ سائراں نے جھک کر پیالہ اُس کے ہاتھ سے لیا۔ تو اس کی انگلیاں ماجد کی انگلیوں سے مس کر گئیں اور سنہری لٹ اُس کی پیشانی کو چھو گئی۔ ماجد نے حیران ہو کر سائراں کو دیکھا۔ پُرانے ریشمی سوٹ کی نیلاہٹ چمک اُٹھی۔ یکایک وہ فرش سے اٹھا۔ اور دھلے دھلے آسمان کی گہری نیلی پہنائیوں میں کھو گیا۔

چند لمحوں بعد ایک آواز نے کہا۔ "میں نے کھانا لگا دیا ہے۔"

ماجد عرش سے فرش پر گر پڑا۔ اُس نے کہا۔ "سائراں! مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"کچھ تو کھائیے۔ بی بی پوچھیں گی تو میں کیا جواب دوں گی؟"

ماجد کو یہ معصوم اصرار بہت بھلا لگا۔ اُس نے سائراں کو ایک نظر دیکھا اور وہ مسکرا پڑا۔ یہ مسکراتی ہوئی نظر سر سے پاؤں تک سفر کر گئی۔ سائراں

کے جنوری چہرے پر جہاں سرخی اور سفیدی کو یوں ملا دیا گیا تھا جیسے شعلوں میں نور، اسے ایک عجیب گداز کا احساس ہوا۔ پلکوں کے گھنے سایوں میں اسے پگھلی ہوئی چاندنی نظر آئی۔ اور چاندنی میں پلکوں کے سائے رقص کر رہے تھے۔ جیسے ایک اتھاہ جھیل کے کناروں پر بید لرزاں کے جھکے ہوئے پودے لہرا رہے ہوں۔ یہ جھیل جو خوابوں کی دنیا تھی.... اور اس کی تہہ میں سے ایک دھندلا خواب نکل کر بولا۔ "سائراں! آج سے پندرہ سال پہلے میں تمہارے گاؤں گیا تھا۔ اور تمہیں دھول بھری سڑک پر ملا تھا:

"مجھے؟..... پندرہ سال پہلے؟.... نہیں تو.... وہ میں نہیں تھی۔"

"نہیں! وہ تم ہی تو تھیں۔ ذرا مجھے پہچانو تو سہی۔ نہیں تم مجھے پہچان نہ سکوگی۔ میرے اور تمہارے درمیان دھول کی ایک سنہری دیوار حائل ہوگئی تھی۔ میں اس دیوار کو پار کرکے تم تک نہ پہنچ سکا تھا اور پھر تم دھول کے سمندر میں ڈوب کر میرے خیال کے جال میں پھنس گئی تھیں۔"

حیرت کے مارے سائراں کی پلکیں اٹھیں، چاندنی میں ارتعاش پیدا ہوا۔ اور حیرت میں وحشت بھر گئی۔ سائراں کا رواں رواں کانپ گیا۔ جھیل کی مرتعش لہروں میں سے ایک لہر کنارے سے چپک گئی۔

سائراں رم خوردہ آہو کی طرح بھاگی۔ اور باورچی خانے میں جاکر چھپ گئی۔ دیر کے بعد ڈری ڈری سہمی سائراں پھر آئی۔ اس نے فرش پر سے ٹوٹے ہوئے گلاس کی کرچیں اکٹھی کیں، برتن اٹھائے اور واپس چلی گئی۔

جب شکیلہ سینما سے لوٹی تو خواب گاہ میں روشنی تھی۔ اور ماجد بوٹوں سمیت پلنگ پر سویا ہوا تھا۔ شکیلہ نے دھیرے دھیرے اس کے بوٹ اتارے اور اسے لحاف اوڑھا کر کپڑے بدلنے لگی۔ تو سوئے ہوئے ماجد نے کروٹ بدل لی۔ اور قمقمے کی پوری روشنی اس کے چہرے پر پڑی۔ تو شکیلہ نے محسوس کیا۔ کہ ماہ و سال نے الٹی زقند لگائی ہے۔ ماجد سترہ سال کا لڑکا بن گیا ہے۔ جو اپنی بچپن کی منگیتر شکیلہ کو دیکھ کر شرما جایا کرتا تھا۔ شکیلہ کو ماجد کی یہ ادا بہت بھایا کرتی تھی۔ آج اس لمحے شکیلہ کو ماجد پر بڑا پیار آیا۔ اس کا دل پگھل گیا۔ اس نے جھک کر ماجد کی پیشانی پر ہونٹ رکھ دیئے۔ اور ماجد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک تتلی ناچی۔ صبح کے ستارے کی ایک کرن نے رقص کیا۔ دھیرے دھیرے ماجد کے ہونٹ کھلے جیسے کوئی کلی چٹک رہی ہو۔ اور نغمہ بن کر بکھر رہی ہو.... ایک دھیما سا نغمہ.... شکیلہ نے کان لگا کر سنا۔ تو نغمے نے سرگوشی کی۔

"او میری! گو اینڈ کال دی کیٹل ہوم۔"

شکیلہ چونک کر پیچھے ہٹ گئی۔

ایک لمحے نے کہا: "ماجد بچپن کا کوئی خواب دیکھ رہے تھے۔"

دوسرے لمحے نے پوچھا۔ "یہ خوابوں کی میری کون ہے؟"

اور یکایک شکیلہ کا پگھلا ہوا دل پھر پتھر کا بن گیا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کا زہر بھر گیا۔

وہ لپک کر اٹھی اور اس نے بتی گل کر دی۔

مسلسل تین دن اور تین راتیں ماجد نے سوتے جاگتے۔ ایک خواب کی سی حالت میں بسر کی۔ جیسے اس پر نیند کی پریاں اپنے پروں کا سایا کئے ہوئے ہیں۔

وہ دفتر جاتا اور دفتر سے سیدھا گھر آتا۔ لیکن گھر میں وہ اور شکیلہ آپس میں کوئی بات چیت نہ کرتے۔ اور اس کا کھانا اور چائے سائراں لے کر آتی۔ تیسری رات کا کھانا تپائی پر رکھ کر سائراں چند لمحے ٹھٹک کر کھڑی رہی۔ تو ماجد نے اسے کنکھیوں سے دیکھا۔ سائراں محویت کے عالم میں

اُسے تکے جا رہی تھی۔

ماجد نے بغیر کسی تمہید کے کہا: "سائراں سچ جانو میں پاگل نہیں ہوں"۔

سائراں سر سے پاؤں تک لرز گئی۔

"تمہاری بی بی بھی پاگل نہیں ہیں، سائراں! ہم دونوں کے درمیان ایک لمحہ حائل ہوگیا ہے، صرف ایک لمحہ، میں اس 'لمحے' پر غالب آگیا تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا"۔

وہ جانتا تھا کہ سائراں اس کی بات نہیں سمجھ سکی۔ اس لئے اُس نے گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے کہا۔ "سائراں! ایک بات پوچھوں؟ سچ سچ بتا دو گی نا!"

سائراں کے اوپر کے ہونٹ پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمکے۔ اس نے گھبرا کر ٹوٹے ٹوٹے لہجے میں کہا۔ "میں کچھ نہیں جانتی۔ میں سچ کہتی ہوں آج سے پندرہ سال پہلے میں اتنی بڑی نہ تھی۔ جتنی اب ہوں۔ نہ جانے ہمارے گاؤں میں آپ کیسے ملے تھے!"

ماجد نے مسکرا کر سائراں کی طرف دیکھا اور کہا: "نجانے کیسے؟"

سائراں نے دوپٹے کے پلّو سے چہرے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "سچ جانئے وہ میں نہیں تھی"۔

"ہاں سائراں! تم سچ کہہ رہی ہو"۔ ماجد نے آہ بھر کر کہا۔

تب ماجد نے کمرے میں ایک لباس کی غضبناک سرسراہٹ سنی!"

"ماجد صاحب! اس بیچاری لڑکی کو آپ کیوں پریشان کر رہے ہیں؟ جاؤ سائراں"۔

سائراں چلی گئی تو شکیلہ برفانی لہجے میں بولی: "ماجد صاحب! مجھ سے پوچھئے۔ آج سے پندرہ سال پہلے سائراں بیچاری گھٹنوں چلتی ہی ہوگی۔ وہ کیا بتا سکتی ہے؟ مجھے وہ قصہ سنایئے نا۔ شاید ـــ"

"نہیں شکیلہ! تم نہ سُن سکوگی"۔

"مجھ پر اعتماد کیجئے۔ میں سننے کے لئے تیار ہوں۔ آپ کہیں ۔۔۔"

ماجد نے شکیلہ کی آنکھوں میں کوئی ایسی چیز دیکھی کہ وہ بے اختیار کہہ اُٹھا۔ "آج سے پندرہ سال پہلے جب میں سترہ سال کا تھا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں اپنے ننھیال یعنی تمہارے گاؤں گیا تھا۔ شام ہونے والی تھی۔ اور کچے راستے پر دھول اڑ رہی تھی ـــ وہ لڑکی مویشیوں کو ہانک رہی تھی۔ اُس کے سنہری بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔۔۔ پھر میرے اور اس کے درمیان سنہری دھول کی ایک دیوار حائل ہوگئی تھی"۔

"وہ آپ کے خوابوں کی دنیا کی میری کون ہے؟"

"ساتویں جماعت کی نیلسن ریڈر میں ایک نظم تھی۔ اُس کے سامنے ایک سرخ بالوں والی میری کی تصویر تھی۔ جو سینڈز آف ڈی کے پار اپنے مویشیوں کو بلانے گئی تھی۔ اور طوفان میں گھر گئی تھی۔ اور۔۔۔"

"ماجد صاحب"! شکیلہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "آپ کو علم ہے کہ اس وقت آپ کی عمر کیا ہے؟"

"ہاں!"

"اور یہ بھی جانتے ہیں کہ آپ تین بچوں کے باپ ہیں"۔

"کہو! تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"یہی کہ اس عمر میں تین بچوں کے باپ کو اس قسم کے خواب کے دیکھنے سے اجتناب کرنا چاہئے۔ اور میں آپ کو باخبر کر دوں۔ کہ وہ میری جو

آپ کو میکے گاؤں سنہری دھول میں نظر آئی تھی، اسی سائراں کی بڑی بہن تھی۔"
"بڑی بہن!" ماجد نے اچانک کرسی سے اُٹھ کر پوچھا۔
"جی ہاں! وہ میری ہم عمر تھی۔ یہ اچھا ہوا کہ آپ کے اور اس کے درمیان سنہری دھول کی دیوار حائل ہو گئی۔"
"دیوار!"
"اگر یہ دیوار کھڑی نہ ہوتی۔ تو آپ کو رانجھے کی طرح جوگ لینا پڑتا۔"
"شکیلہ!"
"اب میں کہانی کو انجام تک پہنچا دوں تو بہتر رہے گا۔ وہ لڑکی گاؤں والوں کے لئے ایک مسئلہ بن کر رہ گئی تھی۔ گاؤں کے سارے نوجوان اُس کی محبت کا دم بھرنے لگے تھے۔ اُس کے ماں باپ پریشان ہو گئے تھے۔ اور وہ ابھی رشتے کا فیصلہ بھی نہ کر پائے تھے۔ کہ آپ کے خوابوں کی پری نے خود ہی مسئلہ حل کر دیا۔"
"شکیلہ! ... بس ... !"
"ایک جیالا بڑھا اور اس جواں مرد نے ایک ہی ضرب سے سنہری دیوار کو مسمار کر دیا۔ اور سونا برجیت کر سنجوگتا کو اڑا لے گیا۔"
ماجد لڑکھڑا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس کی پیشانی پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے چمکے۔
شکیلہ نے آواز دی، "سائراں!"
سائراں دوڑ کر آئی۔
"میرا کھانا بھی یہیں لے آؤ، آج صاحب اور میم اکٹھے کھانا کھائیں گے۔"
"نہیں شکیلہ، میں نہیں کھا سکوں گا۔" ماجد نے آنکھیں کھول کر کہا۔
سائراں سامنے کھڑی تھی۔ ماجد کی نگاہیں ایک اڑتے ہوئے لمحے کے لئے سائراں کے چہرے پر ٹک گئیں، شکیلہ دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہی۔
"جاؤ سائراں!"
شکیلہ نے اس انداز میں کہا جیسے ڈرامے کے ایک منظر پر پردہ گرا رہی ہو۔

اس سے اگلے دن ماجد نے سردرد کی شکایت کی۔
شکیلہ خاموش رہی۔
اس سے اگلے دن ماجد نے جسم کو ٹوٹتا ہوا پایا۔
شکیلہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔
تیسرے دن جب ماجد دفتر سے لوٹا تو اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ لیکن شکیلہ نے ماجد کی رسمی مزاج پرسی کرنے سے بھی گریز کیا۔
وہ کپڑے بدلے بغیر بستر میں گھس گیا۔ شکیلہ دبے پاؤں کمرے میں آئی تو لیٹے ہوئے ماجد کو ایک نظر دیکھ کر لوٹ گئی۔
یکایک ماجد نے کروٹ بدل کر کہا۔ "شکیلہ! پانی کا ایک گلاس تو بھجوا دینا۔"
"سائراں کے ہاتھ؟" شکیلہ کے لہجے میں طنز کا نشتر تھا۔

"سائراں ؟"

"پر سائراں یہاں ہو بھی تو !"

"کیا مطلب ؟"

"آج اباجان آئے تھے، وہ سائراں کو لے گئے !"

"کیوں لے گئے ؟"

"میں اپنے گھر میں سو بمبر نہیں رہنا چاہتی تھی !"

"کس کا سو بمبر ؟"

"ماجد پیا کا !"

"شکیلہ ! پانی لاؤ ۔"

شکیلہ گلاس بھر کے لے آئی اور ماجد کے سرہانے کھڑی ہو گئی۔ ماجد کی آنکھیں بند تھیں۔ لیکن پلکوں کے پیچھے سے آنسو ابل ابل کر تمتماتے گالوں پر بہہ رہے تھے۔

"ماجد صاحب ! پانی پیجیے ۔"

ماجد پانی پینے کے لئے نہ اٹھا تو شکیلہ نے اُس کی تپتی ہوئی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ پیشانی کی جلد یوں سکڑی جیسے سانپ کے پھن نے چھو لیا ہو۔ شکیلہ

شکیلہ کو جھٹکا سا لگا۔ پانی گلاس میں سے چھلک کر ماجد کی پیشانی پر گرا۔ تو اُس نے آنکھیں کھول دیں۔

"شکیلہ ! وہ زہر کا پیالہ میں پورے کا پورا پی گیا۔ جس کا ایک قطرہ چکھ کر تم پاگل ہو گئی تھیں۔ تم نے معصوم سائراں کو خوامخواہ گھر سے نکال دیا، پہلے میرے ظرف کا امتحان تو کر لیا ہوتا۔ یہ تم نے ظلم کیا، بہت بڑا ظلم...."

نقش کراچی

سویرا۔ لاہور

بلراج مینرا

وہ

جب اُس کی آنکھ کھلی، وہ وقت سے بے خبر تھا۔
اُس نے دایاں ہاتھ بڑھا کر بیڈ ٹیبل سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا اور سگریٹ نکال کر لبوں میں تھام لیا
سگریٹ کا پیکٹ پھینک کر اُس نے پھر ہاتھ بڑھایا۔ اور ماچس تلاش کی۔
ماچس خالی تھی۔
اُس نے خالی ماچس کمرے میں اچھال دی۔
خالی ماچس چھت سے ٹکرائی اور فرش پر آن پڑی۔
اُس نے ٹیبل لیمپ روشن کیا۔
بیڈ ٹیبل پر چار پانچ ماچسیں الٹی سیدھی پڑی ہوئی تھیں۔
اُس نے سب کو باری باری دیکھا۔
سب خالی تھیں۔
اُس نے لحاف اتار پھینکا اور کمرے کی بتی روشن کی۔
دو بج رہے تھے۔
فرش برف ہو رہا تھا۔
ابھی دو بجے ہیں، میں وقت سے بے خبر تھا! میں سمجھ رہا تھا، صبح ہونے کو ہے!
آج یہ بے وقت آنکھ کیسے کھل گئی!
ایک بار آنکھ کھل جائے، پھر آنکھ نہیں لگتی!
اُس نے تمام کمرہ چھان مارا۔
کتابوں کی الماری، ویسٹ پیپر باسکٹ، پتلون کی جیبیں، جیکٹ کی جیبیں۔ ماچس کہیں نہ ملی۔

اُس نے ایک ایک کتاب اُلٹ دی۔ کوئی دیاسلائی نہ ملی۔
کمرے کی بُری حالت ہوگئی تھی۔
کتابیں اُلٹی سیدھی پڑی ہوئی تھیں، کپڑے اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے، ٹرنک کھلا ہوا تھا۔
کوئی آجائے اِس سمے؟
رات کو دو بجے، کمرے کی یہ حالت؟
سلگتے سگریٹ اور دھڑکتے دل میں کتنی مماثلت ہے!
ماچس کہاں ملے گی؟
ماچس نہ ملی تو کہیں ......
تو کہیں ....
کہیں میرا دل خاموش نہ ہو جائے؟
آج یہ بے وقت آنکھ کیسے کھل گئی؟
میں وقت سے بے خبر تھا،
ایک بار آنکھ کھل جائے، پھر آنکھ نہیں لگتی!
ماچس کہاں ملے گی؟
اُس نے چادر کندھوں پر ڈال لی اور کمرے سے باہر آگیا۔
دسمبر کی سرد رات تھی، سیاہی کی حکومت اور خاموشی کا پہرہ۔
کسی ایک طرف قدم اُٹھانے سے پہلے وہ چند لمحے سڑک کے وسط میں کھڑا رہا۔
جب اُس نے قدم اُٹھائے وہ راستے سے بے خبر تھا۔
رات کالی تھی، رات خاموش تھی اور دور دور تاحدِ نظر، کوئی دکھلائی نہیں دے رہا تھا۔
لیمپ پوسٹوں کی مدھم روشنی، رات کی سیاہی اور خاموشی کو گہرا کر رہی تھی اور ــــــ
چوراہے پر اس کے قدم رک گئے۔
یہاں تیز روشنی تھی کہ دودھیا روشنی کی ٹیوبیں چمک رہی تھیں، لیکن خاموشی جوں کی توں تھی کہ ساری دکانیں بند تھیں۔
اُس نے حلوائی کی دکان کی جانب قدم بڑھائے۔
ممکن ہے بھٹی میں کوئی کوئلہ مل جائے، دہکتا کوئلہ، دم بلب کوئلہ؟
حلوائی کی دکان کے چبوترے پر کوئی لحاف میں گٹھڑی بنا سو رہا تھا۔
وہ بھٹی میں جھانکا ہی تھا۔ کہ چبوترے پر بنی گٹھڑی کھل گئی۔
کون ہے؟ کیا رہے ہو ـــ؟
میں بھٹی میں سلگتا ہوا کوئلہ ڈھونڈ رہا ہوں!
پاگل ہوگیا ہے؟ بھٹی ٹھنڈی پڑی ہے!

تو پھر!
تو پھر کیا، گھر جاؤ!
ماچس ہے آپ کے پاس ؟
ماچس ؟
ہاں مجھے سگریٹ سلگانا ہے!
تم پاگل ہو! جاؤ، میری نیند خراب مت کرو، جاؤ!
تو ماچس نہیں ہے آپ کے پاس؟
ماچس سیٹھ کے پاس ہوتی ہے، وہ آئے گا اور بھٹی گرم ہوگی، جاؤ تم!
وہ پھر سڑک پر آگیا۔
سگریٹ اُس کے لبوں میں کانپ رہا تھا۔
اُس نے قدم بڑھائے۔
چوراہا پیچھے رہ گیا، تیز روشنی پیچھے رہ گئی، کیا کیا کچھ نہ پیچھے رہ گیا۔
اُس کے قدم تیزی سے اُٹھ رہے تھے۔
لیمپ پوسٹ، لیمپ پوسٹ، لیمپ پوسٹ، اَن گنت لیمپ پوسٹ پیچھے رہ گئے، دھیمی روشنیوں والے لیمپ پوسٹ جو رات کی سیاہی اور خاموشی کو گہرا کرتے ہیں۔
یکایک اس کے قدم رک گئے۔
سامنے سے کوئی آرہا تھا۔
وہ اُس کے قریب آکر رک گیا۔
ماچس ہے آپ کے پاس؟
ماچس؟
مجھے سگریٹ سلگانا ہے! — نہیں میرے پاس ماچس نہیں ہے، میں اس علّت سے بچا ہوا ہوں۔
میں سمجھا!
کیا سمجھے؟
شاید آپ کے پاس ماچس ہو؟
میرے پاس ماچس نہیں ہے، میں اس علت سے بچا ہوا ہوں، اور اپنے گھر جا رہا ہوں تم بھی اپنے گھر جاؤ!
اُس نے قدم بڑھائے۔
سگریٹ اُس کے لبوں میں کانپ رہا تھا۔
وہ دھیمے دھیمے قدم اُٹھا رہا تھا۔ کہ تھک گیا تھا۔
وقت سے بے خبر، اس کے قدم اُٹھ رہے تھے۔

لمپ پوسٹ آتا، مدھم روشنی پھیلی ہوئی دکھائی دیتی اور پھر سیاہی۔
لمپ پوسٹ، مدھم روشنی اور پھر سیاہی۔
وہ لبوں میں سگریٹ تھامے، دھیمے دھیمے قدم اٹھا رہا تھا،
اس کی پھیپھڑوں تک دھواں کھینچنے کی طلب شدید ہوگئی تھی۔
اُس کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔
شب خوابی کے لباس اور چادر میں اُسے سردی لگ رہی تھی۔
وہ کانپ رہا تھا۔ اور کانپتے قدموں سے دھیمے دھیمے بڑھ رہا تھا، وقت سے بے خبر، لمپ پوسٹوں سے بے خبر۔
ایک بار پھر اُس کے قدم رک گئے۔
اُس کی نظروں کے سامنے خطرے کا نشان تھا۔
سامنے پل تھا، مرمت طلب پل!
حادثوں کی روک تھام کے لئے سُرخ کپڑے سے لپٹی ہوئی لالٹین سڑک کے بیچوں بیچ ایک تختے کے ساتھ لٹک رہی تھی۔
اُس نے لالٹین کی بتی سے سگریٹ سلگانے کے لئے قدم اٹھایا ہی تھا کہ ــــ
کون ہے؟
وہ خاموش رہا۔
سیاہی کی ایک لچائی تہ کھول کر سپاہی اس کی طرف لپکا
کیا کر رہے تھے؟
کچھ نہیں!
میں کہتا ہوں کیا کر رہے تھے؟
آپ کے پاس ماچس ہے؟
میں پوچھتا ہوں کیا کر رہے تھے اور تم کہتے ہو ماچس ہے، کون ہو تم؟
مجھے سگریٹ سلگانا ہے آپ کے پاس ماچس ہو تو ــــ
تم یہاں کچھ کر رہے تھے؟
میں لالٹین کی بتی سے سگریٹ سلگانا چاہتا تھا۔
آپ کے پاس ماچس ہو تو.....
تم کون ہو، کہاں رہتے ہو؟
میں.....
کہاں رہتے ہو؟
ماڈل ٹاؤن!
اور تمہیں ماچس چاہئے ــ ماڈل ٹاؤن میں رہتے ہو ـ ماڈل ٹاؤن کہاں ہے؟

ماڈل ٹاؤن!
اُس نے گھوم کر اشارا کیا
دُور دُور، تا حدِ نظر سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔
چلو میرے ساتھ تھانے تک.....
ماڈل ٹاؤن....؟ ماڈل ٹاؤن یہاں سے دس میل کے فاصلے پر ہے..... ماچس چاہیئے نا! تھانے میں مل جائے گی!
سپاہی نے اس کا بازو تھام لیا۔
وہ سپاہی کے ساتھ چل پڑا۔
تھانہ اُسی سڑک پر تھا جو ختم ہونے کو نہ آتی تھی۔
وہ سپاہی کے ساتھ تھانے کے ایک کمرے میں داخل ہوا۔
کمرے میں کئی آدمی ایک بڑی میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔
سب سگریٹ پی رہے تھے۔
میز پر کئی پیکٹ اور کئی ماچسیں پڑی ہوئی تھیں۔
صاحب! یہ شخص پل کے پاس کھڑا تھا، کہتا ہے، ماڈل ٹاؤن میں رہتا ہوں اور ماچس ماچس کی رٹ لگائے ہوئے ہے!
کیوں بے؟
اگر آپ اجازت دیں تو آپ کی ماچس استعمال کروں، مجھے اپنا سگریٹ سلگانا ہے!
کہاں رہتے ہو؟
ماڈل ٹاؤن؟
کیا میں آپ کی ماچس لے سکتا ہوں؟
کیا کرتے ہو؟
میں مسافر ہوں! کیا میں ماچس.....
ماڈل ٹاؤن میں کب سے رہتے؟
تین ماہ سے! ماچس.....
ماچس..... ماچس کا بچہ..... مسافر.... جاؤ اپنے گھر.... ورنہ بند کر دوں گا.... ماچس؟
وہ تھانے سے باہر آیا، وہ بری طرح تھک چکا تھا۔
اُس نے نا ختم ہونے والی سڑک پر دھیمے دھیمے چلنا شروع کر دیا۔
اُس کی ناک سوں سوں کرنے لگی تھی اور اس کا بدن ٹوٹنے لگا تھا۔
سگریٹ پینا ایک علت ہے!
میں نے یہ علت کیوں پال رکھی ہے
ماچس کہاں ملے گی؟

نہ ملی تو؟

وہ وقت سے بے خبر تھا، لیمپ پوسٹوں سے بے خبر تھا، سڑک سے بے خبر تھا، اپنے بدن سے بے خبر تھا۔

وہ گرتا پڑتا بڑھ رہا تھا۔

اس کے لغزش زدہ قدموں میں نشے کی کیفیت تھی۔

پو پھٹی اور وہ دم بھر کو رکا۔

سنبھلا اور اس نے قدم اُٹھانا ہی چاہا، کہ

سامنے سے کوئی آرہا تھا۔ اور اُس کے قدم لغزش کھا رہے تھے۔

وہ اُس کے قریب آکر رکا۔

اُس کے لبوں میں سگریٹ کانپ رہا تھا۔

آپ کے پاس ماچس ہے؟

ماچس؟

آپکے پاس ماچس نہیں ہے؟

ماچس کے لئے تو میں.....

وہ اُس کی بات سُنے بنا ہی آگے بڑھ گیا۔

آگے، جدھر سے وہ خود آیا تھا۔

اُس نے قدم بڑھایا

آگے، جدھر سے وہ آیا تھا۔

غلام محمد فنون-لاہور

سفر نصیب

ہری پور ڈھاکے سے ۱۸ میل دور کے فاصلے پر واقع ہے۔ سبھی جانتے ہیں کہ بہار کے دنوں میں ہری پور خوش گلو پرندوں کی چہکار سے گونجتا تھا۔ اور خوش رنگ پھولوں سے مہکتا تھا۔ کرشنا چورا کے سرخ سرخ پھول اونچے اونچے درختوں پر مثل انگاروں کے دہکتے تھے اور رجنی گندھ کی ہری ہری پتیاں اس فوارے کے چلتے ہوئے پانی میں ایسی معلوم پڑتی تھیں۔ جو چلتے چلتے یکلخت منجمد ہو جائے۔ اور ان پتیوں میں سے ایک لمبی سیدھی ڈنٹھل پر اُجلے اُجلے پھول تاج ایسے لگتے تھے۔

تالاب چاندی ایسے چمکتے تھے۔ اور کھیت سونے ایسے۔

پانچ جگ پہلے کی بات ہے۔ کہ ہری پور کے لوگ بڑے خوش حال تھے۔ بہت امن چین سے زندگی گزارتے تھے۔ نہ چوری نہ ڈاکا نہ دلدر نہ تھے صبح ہوئی درختوں پر چڑیاں چہچہانے لگیں۔ مرغے اپنے پر پھڑپھڑاتے ہوئے دیواروں پر چڑھ گئے۔ اور لگے اپنی گردن اٹھا اٹھا کر بانگ دینے۔ لوگ خوابوں سے بیدار ہوئے اور نمک مرچ کے ساتھ پنتھا بھات کھایا۔ اور ہنسی خوشی اپنے بیلوں کو ہانکتے ہوئے کھیتوں کی طرف چل دیئے۔ دکھ سکھ پہلے بھی تھے مگر ایسے نہ تھے۔

وہ بھی کیا دن تھے جب ہر شخص اپنے اپنے کھیتوں سے ایسی محبت کرتا تھا جیسے بچے اپنی ماں سے۔ اُن دنوں زمین بھی اپنے بچوں پر بہت مہربان تھی زمین سے محبت کرو وہ غلہ دے گی۔ وہ ماں ہے اُسے اپنے بچوں سے پیار ہوتا ہے۔ مگر لعنت ہے ایسے بچوں پر جو اپنی ماں کی چھاتی سے دودھ چوسنا بھول جائیں۔ ماں بیچاری اُس بدنصیب کے لئے کیا کرے۔ وہ دن تھے۔ کہ ماں کی خدمت اور کھیتوں پر محنت برابر سمجھی جاتی تھی۔ اور زمین کی سوندھی سوندھی خوشبو ماں کی دعا کا درجہ رکھتی تھی۔ صاحب علی برگد تلے بیٹھا ناریل کا حقہ پیتا تھا اور سوچتا تھا۔ کہ ایک طرف یہ مصیبت ہے کہ ہری پور اجڑتا جا رہا ہے اور دوسری طرف یہ کہ مشینوں کی یلغار ہے جس کے ساتھ کچھ اجنبی چہرے دکھائی دیتے ہیں۔ قربان علی کی مالی حالت بہت اچھی تھی۔ وہ اپنے لڑکے کو ڈھاکے میں تعلیم دلوا رہے تھے۔ پچھلے دنوں یہ سننے میں آیا۔ کہ ایک لڑکا سی ایس پی افسر ہو گیا ہے اور دوسرا انجینئر۔ ظاہر ہے وہ لوگ واپس نہیں آئیں گے۔

یہ برگد کا درخت بہت پرانا ہے۔ صاحب علی اسے بچپن سے دیکھ رہا ہے۔ یہ درخت اپنی جگہ ایستادہ ہے اس میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ اسی درخت کے نیچے صاحب علی نے گلی ڈنڈا کھیلا۔ اس کی شاخوں پر اچھلا، کودا، جھولا، اُس کے تنے پر چاقو سے نشانات بنائے۔ پھر چلچلاتی ہوئی دوپہر کو، اسی درخت کے نیچے شانو سے اس کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ تب شانو جوان تھی۔ اور صاحب علی بھی جوان تھا۔ دونوں کی رگیں بہت گرم تھیں اور بدن گٹھیلے تھے۔ اور ان کے دل چوہے کی مانند سینے میں اچھلتے تھے۔ اور جب شادی کے پچیسویں برس شانو پانچ بچے چھوڑ کر مر گئی تو وہ اس درخت کے نیچے بیٹھ

کہ بہت رویا تھا۔ اور اسے لگا تھا جیسے یہ بے زبان درخت ہی اس کا واحد راز داں ہے۔

اور اب کہ اس کے قوی جواب دے گئے تھے۔ اور وہ نحیف و نزار ہو گیا تھا۔ اور اس میں چلنے پھرنے کی سکت نہ تھی۔ بدن پلپلا ہو گیا تھا۔ وہ لاٹھی ٹیکتا ہوا یہاں آ تا تھا۔ اس کے پوتے حقہ بھر جاتے تھے۔
اور وہ بیٹھا کچھ سوچا رہتا تھا۔

اب کے یہاں وقت پر بارش نہ ہوئی۔ اور پٹ سن کی کھڑی فصل تباہ ہو گئی۔ اور کاشت کاروں کے ہونٹ لٹک گئے۔ صاحب علی کے لڑکے ڈھاکے میں ملازمت کرتے تھے۔ ایک بڑھئی ہو گیا تھا اور دوسرا ایک جوٹ مل میں مزدور تھا۔ صاحب علی کے پاس ڈھاکے سے کچھ روپے آ جاتے تھے۔ کھیتوں سے کھانے بھر دھان رحیم الدین کے ساجھے سے مل جاتا تھا۔ سبزی، ترکاری، مرچ کا یہ حال کہ مکان کے پاس ایک باغ تھا جس میں عورتیں مختلف ترکاریاں اگا لیتی تھیں۔ اور تالاب سے گاہے گاہے مچھلیاں پکڑی جاتیں۔ ویسے مچھلیاں کبھی تازہ کبھی سوکھی بازاروں سے خریدی جاتیں۔ چناں چہ بارش کے ہونے یا نہ ہونے سے صاحب علی پر کوئی اثر نہ پڑتا تھا۔ اس کے باوجود ہمسایے کے بارے میں سوچتا تھا اور افسوس کرتا تھا۔

ایک دن صاحب علی برگد تلے بیٹھا ہوا تھا اور حقہ پی رہا تھا۔ کہ ادھر سے موتی گذرا۔ سر جھکائے ہوئے تھا اور بے انتہا اداس۔ صاحب علی نے اُسے روکا۔ "موتی کیا بات ہے؟"
موتی نزدیک آ بیٹھا۔ اور گھٹنے پر ٹھوڑی ٹیک دی۔ "کھیتوں میں کھڑے جوٹ بیچ کر میں نے چودھری سے روپے لئے تھے۔ اور یہ شرط تھی کہ فصل تباہ ہو گئی تو اس کا ذمہ دار میں!"
"تم نے یہ ذمہ داری کیوں لی؟"
"میں برسوں سے یہ ذمہ داری لے رہا ہوں، مجھے اعتماد تھا صاحب بھائی! تم سے کیا ڈھکا چھپا ہے۔ کئی برسوں سے یہی دھندا چلا آ رہا ہے کہ جوٹ کٹائی سے پہلے اونے پونے بیچ دینا پڑتے ہیں۔ نہیں بیچیں گے تو بھوکوں نہ مر جائیں؟ کیا کھائیں گے؟ میں نے پندرہ روپے کے حساب سے چودھری کے ہاتھ کھیتوں کھڑے جوٹ بیچے۔ مگر فصل تباہ ہو گئی۔ اور اب چودھری پیسے مانگتا ہے۔ کہتا ہے کہ نہیں دو گے تو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔
"پھر؟"
پھر کیا۔ اس کے پاس پیسے ہیں۔ اس نے پچھلے برس جو فصل پندرہ روپے کے حساب سے خریدی تھی۔ اب وہی فصل اسّی روپے کے حساب سے بیچ رہا ہے وہ عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹائے گا تو کیا ہم لوگ کھٹکھٹائیں گے؟ میں کھیت بیچ رہا ہوں۔"
صاحب علی کے دل پر چوٹ لگی۔ "موتی کھیت بیچ رہے ہو؟"
"چودھری کے پیسے چکا کر کچھ پیسے بچ رہیں گے۔ میں وہ پیسے لے کر ڈھاکہ چلا جاؤں گا۔ مولا چٹاگانگ میں ہے کہتا ہے کہ وہاں بندرگاہ پہ بوجھ اٹھانے والے قلیوں کی آمدنی یہاں کے کاشت کاروں سے زیادہ ہے۔ بھوکوں نہیں مرنا ہے صاحب بھائی۔ کاشت کاری کوئی عبادت تو نہیں۔"
"ٹھیک کہتے ہو موتی۔"

کچھ لوگ ہری پور سے نکلے اور افسر یا انجینئر ہو گئے۔ اور واپس نہیں آئے۔ کچھ لوگ ہری پور سے نکلے۔ کھیتوں پر ہل چلانا چھوڑا۔ اور ڈھاکہ اور چٹاگانگ

کی سڑکوں پر رکشا چلانے لگے۔ وہ بھی واپس نہیں آئے گاؤں میں کون رہ گیا ہے!

چودھری ــــ جو جوٹ کی کھڑی فصل پندرہ روپے کے حساب سے خریدتا ہے اور اسی روپے کے حساب سے بیچ دیتا ہے۔

وہ لوگ جو پندرہ روپے کی فصل اگاتے ہیں ــــ وہ جو قبروں میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔

پھر کچھ اجنبی چہرے ــــ اور چھوٹی بڑی مشینیں ــــ!

اب کے ہری پور میں سوکھا پڑ گیا ہے، وقت پر بارش نہ ہوئی۔ اور کھیتوں کھڑی فصل تباہ ہونے لگی۔ بادل گھر گھر کر آتے تھے۔ اور بن برسے اڑ جاتے تھے۔ اور لوگ بارش کے لئے دعائیں مانگتے تھے۔ پھر ایک روز یہ ہوا کہ دکھن سے پاگل ہوا چلی اور اسی روز ندی کا پانی اونچا ہو گیا۔ یہ دیکھ کر ہری پور کے لوگ پریشان ہو گئے۔ اور اللہ اللہ کرنے لگے۔ کیا مسلمان کیا ہندو جسے دیکھئے وہ خدا کے حضور میں دست بستہ اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہا ہے۔ ضعیف العمر لوگ جو کاشت کاری کرتے کرتے ضعیف الاعتقاد ہو گئے تھے۔ آسمانی صحیفے لے کر بیٹھ گئے مگر پانی کی سطح روز اونچی ہوتی چلی گئی۔ پہلے تالاب، چھوٹے چھوٹے گڑھے اور نالے جل تھل ہو گئے پھر پانی کھیتوں میں در آیا۔ اس کے بعد گاؤں کی باری آئی۔ لوگوں نے کشتیوں اور مچانوں پر بسیرا کر لیا۔ مکانات ڈوب گئے۔ مویشی مرنے لگے۔

صاحب علی اپنے کنبے سمیت کہاں پناہ گزیں ہوا۔ کوئی نہیں جانتا۔ نفسی نفسی کا عالم تھا۔ لوگ اپنی اپنی جان بچانے کی فکر میں تھے۔ جہاں سینگ سمائے چلے گئے۔ ریلوے اسٹیشن کے ادھر زمین اونچی تھی۔ اور سیلاب کی زد سے بچی ہوئی تھی۔ وہاں پناہ گزینوں کا ہجوم تھا۔

اسٹیشن پر لوگ ــ درختوں پر لوگ ــ کشتیوں پر لوگ ــ

انہی دنوں ایک شخص ڈھاکے سے آیا۔ اور صاحب علی کو پورے کنبے کے ساتھ ایک کشتی پر پایا۔ اور کہا کہ بیٹے نے شہر بلایا ہے۔ صاحب علی بھوک پیاس سے نڈھال تھا۔ عورتوں کی آنکھیں چہرے میں دھنس گئی تھیں۔ بچے بیمار تھے۔ اس کے باوجود وہ ذہنی طور پر ہری پور چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوا۔

"جناب علی نے ٹکٹ کے پیسے دیئے ہیں۔ اور بہت کہا ہے کہ جیسے بھی ہو انھیں فوراً لیتے آؤ۔"

"مگر بیٹا! یہ میرے بڑکھوں کی زمین ہے!" صاحب علی کی آنکھیں بھر آئیں۔

"چلئے اب کیا کیا جائے؟"

"مگر یہ قیامت تو مجھ پر تنہا نہیں آئی ہے، سبھوں پر آئی ہے:"

"آپ ان عورتوں اور بچوں کا خیال کیجئے۔ ضد نہ کیجئے۔ خدا کے لئے ــ چلئے:"

ہری پور۔ جو بہار کے دنوں میں خوش گلو پرندوں کی چہکار سے گونجتا تھا۔ اور خوش رنگ پھولوں سے مہکتا تھا۔ اور کرشنا چورا کے سرخ سرخ پھول مثل انگاروں کے اونچے اونچے درختوں پر دہکتے تھے۔ اور رجنی گندھا کے اجلے اجلے پھول تاج ایسے لگتے تھے۔ وہ ہری پور سیلاب میں ڈوبا ہوا تھا۔

مکانات ڈوبے ہوئے تھے۔

برگد کا تنا ڈوبا ہوا۔ صاحب علی نے اسی برگد کے نیچے بیٹھ کر سوچا تھا۔ کہ وہ لوگ کیسے بیدرد ہوتے ہیں۔ جو گاؤں سے منہ پھیر کر چل دیتے ہیں۔ زمین کی سوندھی سوندھی خوشبو ان کے لئے کوئی کشش نہیں رکھتی۔ وہ لوگ شوتانی لتا ایسے زمین پر معلق ہو کر جی رہے

ہیں۔ کشتی ہوتے ہوئے اسٹیشن کی جانب چلی جا رہی تھی۔ برگد اس کی یادوں کا درخت نظروں تلے پھر رہا تھا۔ اسی کے سائے میں اُس نے زندگی کے کچھ ایسے شدید لمحات گزارے تھے۔ جو اب درخت کے رگ و ریشے میں تحلیل ہو چکے ہیں۔ اور ایک ایک پتّے میں اس کا اپنا لہو رواں تھا وہ بے زبان درخت بظاہر کتنا بے چارہ ہے۔ مگر کتنا عظیم ہے۔ اس کی جڑیں زمین کے اندر پیوست ہیں وہ اپنی زمین سے منقطع ہو کر نہیں جی سکتا۔ اس نے موسم کے کیسے کیسے تیور نہ دیکھے۔ کیسے کیسے دکھ نہ اٹھائے۔ کیسے کیسے حالات سے نہ گذرا۔ مگر وہ کبھی نراس نہ ہوا۔ وہ عظیم ہے۔ صاحب علی نے برگد تلے پہنچ کر کشتی روکی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ کمر تک پانی میں اتر کر برگد سے لپٹ گیا۔ اور اس کے تنے پر بوسے دیئے اور جذباتی طور پر ایسا بے ترتیب ہوا۔ جیسے وہ اپنے عزیز ترین دوست سے بچھڑ کر جا رہا ہو۔

فطرت کی تاریک راہوں میں لٹا ہوا یہ قافلہ پانی کی سطح پر بہتے ہوئے اسٹیشن کی جانب رواں تھا۔

اسٹیشن، جہاں سے گاڑی ڈھاکے جاتی ہے۔

ڈھاکا، جو ایک شہر ہے۔

رتن سنگھ

کتاب۔ لکھنؤ

سکینہ کی ماں کو مرے اب ڈیڑھ مہینہ ہو رہا تھا۔ پھر بھی پورے گھر پر افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ خود سکینہ کی آنکھوں سے پہلے کی طرح آنسوؤں کی دھار تو نہیں بہہ رہی تھی۔ لیکن چہرے پر اداسی اسی طرح قائم تھی۔ بڑی خاموشی سے وہ گھر کے کام کاج میں معروف رہتی۔ کالج جانے کا وقت بھی نہیں ملتا تھا۔ ماں کی موت کے ساتھ ہی شوخ و چنچل سکینہ کی موت ہو گئی تھی۔ جو گھر کی ہر بات میں صرف اپنی بات ہی منوانا جانتی تھی۔۔۔

ابا کہتے "بیگم سنتی ہو۔ آج بازار جاؤ تو ہری اچکن کے لئے کالا کپڑا لیتی آنا۔"

اور سکینہ بول اٹھتی۔ "امی جان! آئے گا تو سوٹ کا کپڑا آئے گا۔۔ اچکن وچکن کچھ نہیں۔"

یا پھر بڑے بھیا کہتے۔ "امی جان! اس سکینہ کی بچی کو سمجھا لیجئے۔ یہ بنا برقعہ کے گھر سے باہر نہ نکلے۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

برقعے کا نام سنتے ہی بڑی بی کے کان بھی کھڑے ہو جاتے۔ اس لیے وہ اپنے سروتے سے چھالیہ کترتی ہوئی رک کر کہتیں۔ "پتہ نہیں کیسن حیا نہ آئے گوا ہے۔ ای لگوڑی تو بچھیڑی کی طرح آجا و پھرے ہے سکینہ کے ابا کو تو پتہ نہیں لاگے ہے کہ بٹیا جوان ہوئی گئی ہے۔"

ایسے موقعے پر ابا کا ایک ہی جواب ہوتا۔ "ہم کیا کریں۔ بیگم نے بہت چھوٹ دے رکھی ہے۔"

بیگم کا ذکر آتے ہی چاروں طرف سے طعنوں کا حملہ شروع ہو جاتا۔ تو بیگم وہاں سے روہانسی ہو کر نکلتیں۔ اور پھر اپنے کمرے میں جا کر اتنا روتیں اتنا روتیں کہ آنکھیں سوج جاتیں۔ اگلے دن پھر کالج جاتے ہوئے سکینہ جب برقعہ پہنے بغیر کمرے سے تیار ہو کر نکلتی تو اسے روکنے کے لئے ابا آواز دیتے۔ "سکینہ!"

عین اسی وقت سکینہ کی اماں برآمد ہوتیں۔ "دیکھئے جی! میری بیٹی کو آپ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ میں خود سمجھا لوں گی۔" اور پھر وہ قریب آتی ہوئی سکینہ کو کہہ دیتیں۔ "کچھ نہیں۔ تم کالج جاؤ۔ دیر ہو رہی ہے۔"

سکینہ کے برقعے کے سوال کو لے کر روز نہیں تو دوسرے تیسرے روز جھگڑا ضرور ہو جاتا۔ اور جس دن بڑی بی اڑوس پڑوس والیوں کو بھی ناک پر انگلی رکھ کر اور منہ بگاڑ بگاڑ کر سکینہ کی بے پردگی کی باتیں کرتی ہوئی سن لیتیں۔ اُس دن تو گھر میں کہرام ہی مچ جاتا۔ اس دن بڑی بی نہایت ہی غصے میں ہوتیں۔ اپنے چہرے پر ایک طوفان لئے سارا گھر سر پر اٹھا لیتیں۔ اس طوفان سے بچنے کے لئے سکینہ کے ابا شعوری

کھیلنے کے لئے گھر سے جلد ہی نکل پڑتے۔ اور بیگم جائے نماز پر بیٹھی اُس وقت تک کلام پاک کی تلاوت کرتی رہتیں جب تک کہ بڑی بی کھانسی کا دورہ پڑ جانے سے چارپائی پر لیٹنے کے لئے مجبور نہ ہو جاتیں۔

وہ دن اب بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ سکینہ کی ماں کا چالیسواں ہو چکا تھا۔ لیکن گھر میں اسی طرح خاموشی تھی۔ گھر کا کوئی فرد کسی سے بغیر کسی کام کے کوئی بات نہ کرتا۔ ہر شخص بیگم کے لئے اپنا غم دل میں سمیٹے اپنے ہی میں کھویا رہتا۔ بڑی بی تو پہلے سے آدھی رہ گئیں ان کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو ہر وقت تیرتے رہتے۔ وہ بار بار یہی کہتیں۔ "قبر میں پیر لٹکائے تو میں بیٹھی تھی اور موت نگوڑی غلطی سے میری بیگم کو لے گئی۔ ہائے اللہ تو نے مجھے کیوں نہ اُٹھایا پہلے۔" سکینہ کے ابا نے شطرنج کھیلنا بالکل بند کر دیا تھا۔ اب وہ اپنے کمرے میں، خاموشی سے حقہ گڑگڑایا کرتے۔ اکثر حقے کی نے منہ میں لئے پتہ نہیں کس سوچ میں کھو جاتے۔ کہ کش لینا ہی بھول جاتے۔ سکینہ کے بھیا کا تو گھر سے تیار ہو کر باہر نکلنا ایک مصیبت ہوتا تھا پہلے۔ "یہ سکینہ کی بچی تو گھر پہ بیٹھتی ہی نہیں۔ قمیض کا بٹن کون ٹانکے یہ دیکھو امی، میری نانی سے سکینہ کی بچی، کتابوں کا بنڈل باندھ کر لے جاتی ہے۔ آئے تو خبر لوں۔ میں کچھ کہتا ہوں تو اُلٹا مجھے ہی برا بھلا کہتی ہیں آپ!" اور اب وہی راشد میاں قمیضوں پر بٹن ٹکوائے بنا ہی گھر سے چپ چاپ چلے جاتے۔ واپس آتے تو سیدھے اپنے کمرے میں جا کر کتابوں میں کھو جاتے ناشتہ یا کھانا وقت پر ملے یا نہ ملے، شکایت کا ایک حرف بھی زبان پر نہ آتا۔

رہی سکینہ کی بات سو وہ باورچی خانے اور گھر کی دیکھ ایکھ میں سارا وقت گزارتی۔ کالج سے تو چھٹیاں لے ہی رکھی تھیں۔ محلے کی بیبیاں پہلے کی طرح اظہار افسوس کے لئے تو نہیں آتی تھیں۔ لیکن پھر بھی اگر کوئی آجائے تو اس کے پاس سکینہ ہی کو بیٹھنا پڑتا تھا۔ بیگم کی باتیں یاد کر کے دہرانا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی کالج کی سہیلی آجاتی۔ تب بھی وہی بیگم کی باتیں۔ سکینہ کے کمرے میں رکھا ہوا ریڈیو اب بھی بند تھا۔ ریڈیو سننے کو اس کا دل ہی نہیں چاہتا۔

اس خاموشی کو آخر سکینہ کے ابا نے توڑا۔ "بیٹی اب تم کالج جانا شروع کر دو۔ نہیں تو سال ضائع ہو جائے گا"

ابا کے زور دینے پر سکینہ نے ہاں تو کر دی۔ لیکن اپنے کمرے میں آ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کا گھر سے باہر قدم رکھنے کو دل ہی نہ چاہتا تھا۔ اگلے دن وہ کالج نہیں گئی۔ دوسرے روز بھی۔ چوتھے روز ابا صبح ہی صبح اس کے کمرے میں آگئے۔ "آج کالج چلی جانا بیٹی" اور انھوں نے خود اس کی کتابوں کی الماری کا تالا کھول دیا۔

نو بجے تک سکینہ نے ماما سے کھانا پکوا لیا اور پھر زندگی میں پہلی بار وہ برقعہ پہن کر کالج کو چلی۔ بڑی بی نے سکینہ کو برقعہ پہنے دیکھا تو دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ لیکن ابا نے اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے سکینہ کو برقعہ پہنے دیکھا تو ان کے دل میں کچھ ہونے لگا۔ کیا ہو رہا تھا۔ اس بات کا اندازہ انھیں نہیں تھا۔ گھبراہٹ میں انھوں نے آواز دی "سکینہ"

"جی ابا۔ آئی"

اور جب سکینہ ابا کے کمرے میں پہونچی تو اس نے دیکھا۔ روتے روتے ان کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ سکینہ بھی صبر کھو بیٹھی۔ کافی دیر تک باپ بیٹی ایک دوسرے سے لپٹے روتے رہے۔ جب طوفان تھما۔ تو ابا نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"کالج ویسے ہی جاؤ۔ جیسے پہلے جاتی تھیں ــــ برقعہ پہن کر نہیں۔ بیگم نہیں رہیں۔ تو کیا ہوا۔ میں تو زندہ ہوں"

انیس مرزا
بانو ۔ نئی دہلی ۔

صغرا خالہ

کبھی کبھی پودوں پر بہار کے دنوں میں اتنے پھول آجاتے ہیں کہ ذرا سا ہاتھ لگاؤ تو جھڑ جھڑ کے دامن بھر دیتے ہیں، لیکن انہی ہرے بھرے پودوں میں جو خوشنما پھولوں سے لدے کھڑے رہتے ہیں، کوئی پودا ایسا بھی ہوتا ہے جس میں پھول نام کو بھی نہیں آتے ۔ یہ ٹنڈ منڈ پودا اپنا ڈھانچہ لئے ہلکے ہلکے کانپتا رہتا ہے اور اپنی بے نور آنکھوں سے کلیوں کو پھول بنتے اور پھول کو سر چڑھتے یا گلے کا ہار بنتے دیکھتا رہتا ہے۔

صغرا خالہ کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا!

وہ بھی ایک ایسا ہی سوکھا ساکھا بے برگ و بار پودا تھیں جو ہرے بھرے پودوں میں تنہا کھڑا اپنی اجاڑ اور ویران زندگی پر خشک آنسو بہائے۔ ان کی زندگی میں وہ بہار کبھی نہیں آئی جو ان کو شاداب بناتی، پھول کھلاتی وہ ازل سے خزاں اپنے ساتھ لائی تھیں۔

صغرا خالہ کو میں نے بارہ تیرہ برس پہلے دیکھا تھا۔ جب میں بہت چھوٹا تھا اور پانچویں کلاس میں پڑھا کرتا تھا۔ ان دنوں میں پہلی بار علی گنج گیا تھا جہاں صغرا خالہ رہتی تھیں۔ قائم گنج کے چھوٹے سے اسٹیشن پر اتر کر میں نے علی گنج تک کا فاصلہ یکّے سے طے کیا تھا۔ جو تقریباً سات آٹھ میل تھا

وہ حویلی جس کی دیواریں بڑے بڑے پتھروں سے اٹھائی گئی تھیں۔ بہت کشادہ تھی۔ کئی چوڑے مستطیل کمرے تھے اور لمبے لمبے دالان تھے۔ خوب پھیلا ہوا آنگن تھا اور باہر ایک بھاری ایک آہنی دروازہ تھا جو ہمیشہ بند رہتا تھا۔

اسی حویلی میں صغرا خالہ سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

وہ سانولی رنگت اور تیکھے نقوش والی ایک سُبک سی لڑکی تھیں۔ ڈھیلا ڈھالا غرارہ اور جمپر پہنے وہ ساری حویلی میں چکر لگاتی پھرتیں۔ ماں کا کافی عرصہ ہوا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک بھائی اور باپ تھے جو زیادہ تر باہر مردانے میں رہا کرتے تھے اور اپنی زمینداری کے انتظام میں معروف رہتے۔ ایک بیوہ بھاوج تھیں جو ان کے ساتھ حویلی میں رہا کرتی تھیں۔ صغرا خالہ کے ہاتھ میں پوری حویلی کا انتظام تھا۔

اس چھوٹی سی عمر میں انہیں میں نے سارے گھر کا انتظام کرتے دیکھا تھا۔ مہمانوں کے لئے ماما کے ساتھ مل کر کھانا خود پکاتیں۔ کھیتوں سے اناج آتا تو اسے سلیقے سے رکھواتیں اور نکلواتیں۔ ذرا ذرا سا حساب رکھتیں۔ دل ٹراسخی پایا تھا۔ خدمت ان کا شعار تھا اور اس خدمت کا عوض انہوں نے کوئی صلہ نہیں مانگا۔ نہ کبھی ستائش کی پروا کی۔ ہر سوالی کی جھولی میں کچھ نہ کچھ ضرور ڈال دیا، لیکن خود سوالی بن کر انہوں نے اپنا دامن کبھی نہیں پھیلایا۔

کاش وہ ایک بار اپنا دامن باپ یا بھائی کے آگے پھیلا دیتیں۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ پھر بھی ان کی زندگی میں بہار آ ہی جاتی۔ ممکن تھا انہیں

باپ اور بھائی کی سرکار سے خالی ہاتھ آنا پڑتا۔

اسی لئے وہ اس حویلی میں ایک گائے بن کر رہیں جو زبان رکھتے ہوئے بھی بے زبان ہوتی ہے۔ وہ مجھ سے بہت محبت سے ملیں اور میری خوب مدارات کیں۔ وہ میری سگی خالہ نہیں تھیں۔ خاندان کے جانے کون سے رشتے سے وہ میری خالہ لگتی تھیں۔ یہ مجھے علم نہیں، لیکن میں انہیں خالہ ہی کہہ کر مخاطب کرتا تھا اور انہوں نے بھی اپنی نوازشات کا سلسلہ برابر جاری رکھا اور ایک خالہ جیسا ہی برتاؤ کیا!

میں نے وہاں چند روز رہ کر جو اندازہ لگایا وہ یہ تھا کہ صغرا خالہ باپ اور بھائی کی آنکھ کا تارا تھیں۔ وہ دونوں ان کے لئے اپنی جان بھی نچھاور کر سکتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ صغرا خالہ کو وہ نہیں دے سکتے تھے جو ان کا پیدائشی حق تھا۔ ایسا حق قانوناً اور مذہباً صرف صغرا خالہ کو ہی نہیں بلکہ ہر جوان لڑکی کو ملنا چاہئے۔

صبح سویرے جب میری آنکھ کھلتی تو مجھے سب سے پہلی آواز جو سنائی دیتی، صغرا خالہ کی ہوتی۔ میں چپکے سے آنکھیں کھولتا۔ وہ سامنے انار کے درخت کے قریب چوکی بچھائے اور سر کو دوپٹے سے ڈھکے ہوئے قرآن شریف کی تلاوت کرتی ہوتیں — وہ نقرئی آواز — جیسے چار سو اجالے بکھر رہے ہوں۔

جب سورج اوپر چڑھ آتا تو وہ اٹھتیں اور ماما کو پکار پکار کر پوچھا کرتیں — "ارے انو کو ناشتہ بھجوا دیا یا نہیں — اور یہ بڑے بھیا صبح صبح کدھر نکل گئے۔ ہائے نہار منہ ایک پیالی چائے بھی حلق سے نیچے نہیں اتاری — افوہ یہ گھڑے سوکھے پڑے ہیں۔ رحیم سے کہہ کر بھروا دے — اور کوئی بازار بھی گیا ہے یا نہیں۔ کچھ پکانے کھانے کا بھی کسی کو ہوش ہے۔ جا باہر جا کر کریم قصائی سے قیمہ کے لئے تو کہہ دے —!"

دن بھر ان کی آواز حویلی کے سارے آنگن میں گشت کرتی رہتی۔ میں نہیں جانتا اتنی چھوٹی سی عمر میں وہ دنیا بھر کا انتظام کیسے کر لیتی تھیں۔ شاید وہ خدا کے حضور سے اپنے مقدر میں سنجیدگی اور بڑھاپا لکھا کر ہی آئی تھیں۔ یہ بات نہیں کہ صغرا خالہ کے دل میں کوئی ارمان ہی نہیں تھا۔ سب کچھ تھا۔ ارمان بھی، اور خواب بھی۔ رنگ و نور کی دنیا بھی اور دل کی اُچاٹی، ان کو بھی دھڑکنیں بھی۔ لیکن انہوں نے اپنے اوپر سنجیدگی کا نقاب چڑھا رکھا تھا۔ اور یہ نقاب اتنے ڈھنگ سے چڑھایا تھا کہ کیا مجال جو کسی پر ان کے پیاسے جذبوں یا خواہشوں کا راز فاش ہو جاتا۔ دولت کی کوئی کمی نہیں تھی جو چاہتیں کھاتیں اور جو چاہتیں پہنتیں، ویسے باپ اور بھائی بھی دنیا بھر کی چیزیں لا لا کر دیا کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ صغرا خالہ کا ایک ارمان پورا کرنے سے قاصر تھے، اور خود صغرا خالہ نے بھی اس ارمان کا ذکر کبھی نہیں کیا۔

اس ارمان کا ذکر وہ کر بھی کیسے سکتی تھیں — وہ ایک ارمان جو ہر جوان لڑکی کے دل میں ضرور پیدا ہوتا ہے۔ بھلا ایک خالص مشرقی لڑکی اپنی زبان سے یہ بات کیسے کہہ سکتی تھی کہ "مجھے دلہن بنا دو"!

زمیندار طاہر علی خاں کا شمار علی گنج کے نوابوں میں ہوتا تھا۔ دولت عزت خدا کا دیا ہوا سب کچھ موجود تھا۔ لیکن ایک دل نہیں تھا جس میں درد ہوتا ہے، محبت ہوتی ہے۔ شاید بنانے والے نے ان کے سینے میں دل کی جگہ ایک پتھر رکھ دیا تھا۔ وہ سارے قصبے میں بھی چڑچڑے اور بددماغ مشہور رہتے۔ ان کے کارندے ان کے سامنے آتے ہوئے کتراتے تھے، بات کرتے ہوئے گھبراتے تھے وہ ایک مرتبہ جو بات زبان سے کہہ دیتے پتھر کی لکیر بن جاتی۔

چنانچہ ایک مرتبہ انہوں نے غصے میں صغرا خالہ کے متعلق اعلان کر دیا۔ "ہماری بیٹی بیاہ کر کہیں نہیں جائے گی — وہ ہم پر بھاری نہیں ہے کیا کچھ نہیں ہمارے پاس۔ اور میں یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ ہماری بیٹی کسی کا ہاتھ تھامے —"

اور یہ محض اس لئے ہوا تھا کہ دو چار جگہ سے صغرا خالہ کے لئے پیغام آئے۔ لیکن طاہر علی خاں کو کوئی رشتہ پسند نہیں آیا، کیونکہ کوئی بھی لڑکا ان کے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔ سب کو انکار کر دیا۔ ایک صاحب نے ان سے کہہ دیا "کیا اپنی لڑکی کو گھر میں بٹھائے رکھیں گے —" بس ان کا پارہ

چڑھ گیا اور انہوں نے کہہ دیا ۔"ہاں میری بیٹی گھر ہی میں رہے گی۔ دنیا کی ہر چیز اس کے قدموں میں ہے ۔

صغرا خالہ کے کنوارے جذبوں پر ہمیشہ کے لئے مہر لگ گئی۔ باپ کا یہ حکم بیٹی کے لئے تابوت کی آخری کیل ثابت ہوا۔ صغرا خالہ نے اپنے سارے ارمانوں، سارے سپنوں اور ساری خوشیوں کی لاش اپنے جسم کے تابوت میں کفن لپیٹ کر دفن کر دی تھی اور اس تابوت پر زمیندار طاہر علی خان کی عزت اور وقار کی کیل بڑی مضبوطی سے جڑی ہوئی تھی!

ان کی زندگی کا سب سے بڑا قصور یا گناہ یہی تھا کہ وہ لڑکی تھیں اور زمیندار طاہر علی خان کے گھر میں پیدا ہوئی تھیں، جو یہ بات ہرگز برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ان کی بیٹی کا بیاہ ہو۔ زمانۂ جاہلیت میں عرب اپنی بیٹیوں کو زندہ زمین میں گاڑ دیا کرتے تھے۔ زمیندار طاہر علی خان نے اپنی بیٹی کو حویلی میں زندہ دفن کر دیا تھا ۔۔ زمانے نے بس اتنی ترقی کی تھی۔

میں تعلیم اور اس کے بعد ملازمت کے سلسلے میں پردیس میں رہا۔ کئی برس گزر گئے۔ اسی دوران میں مجھے اطلاع ملی کہ زمیندار طاہر علی خان کا انتقال ہو گیا ۔۔ مجھے فوراً صغرا خالہ کا معصوم چہرہ یاد آ گیا اور اس چہرے کی وہ جوت یاد آ گئی جس سے چاروں سو روشنی بکھری رہتی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب صغرا خالہ کے ہاتھ مہندی سے ضرور رچ جائیں گے ۔۔ اور میں نے تصور ہی تصور میں صغرا خالہ کو دلہن بنا دیکھ لیا۔

لیکن یہ میرا وہم تھا۔ صغرا خالہ کے ہاتھ پیلے نہ ہو سکے۔ کیونکہ وہ اس وقت عمر کے اس دور میں پہنچ گئی تھیں۔ جب کوئی بھی انہیں دلہن بنا کر نہیں لے جا سکتا تھا۔

ایک مدت کے بعد جب وطن جانا ہوا تو ایک تقریب کے سلسلے میں مجھے بہر علی گنج کا سفر اختیار کرنا پڑا۔ مجھے تقریب سے زیادہ صغرا خالہ کی یاد علی گنج کھینچ لے گئی۔ حسب دستور قائم گنج کے اسٹیشن پر اترا۔ وہاں سے یکّہ کی بجائے بسیں چلنے لگی تھیں۔ بہت کچھ بدل چکا تھا۔ مجھے صغرا خالہ سے اپنی پہلی ملاقات یاد آ رہی تھی۔ پتہ نہیں کہ حالات نے انہیں بھی بدل دیا تھا یا نہیں۔

اسی خیال میں حویلی کے پھاٹک تک پہنچ گیا ۔۔ وہ آہنی پھاٹک جو صغرا خالہ کے نکلنے کے لئے کبھی نہ کھلا۔ مجھے آغوش میں لینے کے لئے کھل گیا۔ میں اندر داخل ہوا تو اچانک ٹھٹھک کر رک گیا ۔۔ میرے دماغ پر ایک دھچکا سا لگا۔ اور دل زیر و زبر ہو کر رہ گیا۔ صغرا خالہ میرے سامنے کھڑی اجالے بانٹ رہی تھیں۔ لیکن اس حالت میں کہ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو کر رہ گئی تھیں۔ حالات کی چکی نے جہاں ان کی صحت کو پیس ڈالا تھا وہاں عمر نے بھی ان سے بے وفائی کی تھی۔ کنپٹیوں کے پاس سے بال سفید تاروں کی طرح چمک رہے تھے اور چہرے پر غم ـ جھریوں کی صورت میں نمایاں تھے۔

ان باتوں کے سوا ان میں اور کوئی فرق نہیں ہوا تھا۔ وہی زندگی تھی اور وہی مرحلے۔ وہی صبح و شام۔ ویسے ہی حالات تھے۔ جائداد کا گھر کا سارا انتظام۔ حساب کتاب۔ لینا۔ دینا سب کچھ وہی تھا ۔۔ بس صرف ایک عمر آگے بڑھ گئی تھی۔

ایک دن باتوں کے دوران میں میں نے ان کا ہاتھ دیکھنا شروع کر دیا۔ چند منٹ تک خاموش رہیں۔ پھر مترنم آواز سے جس میں گہری اداسی اور گمبھیر تا تھی کہا ۔" انو میاں کیا دیکھ رہے ہو۔ میری ہتھیلی پر شادی کی کوئی ریکھا نہیں ہے!"

میں تڑپ سا گیا۔ اور میری آنکھیں گیلی ہو گئیں۔ وہ ہنس کر کہنے لگیں ۔"ہاں اس گھر سے ڈولی تو نہ اٹھی، اب جنازہ ہی نکلے گا"۔

اس دن پتہ نہیں کیوں انہوں نے مجھ سے اتنا بھی کہہ دیا، حالانکہ بعد میں مجھے اپنے گھر والوں اور خاندان کے دیگر افراد سے معلوم ہوا کہ آج تک انہوں نے اپنی زبان کسی کے سامنے نہ کھولی تھی۔

پھر مجھے وہ اپنے کمرے میں لے گئیں اور ایک بھاری صندوق کھول کر اپنے سہاگ کے کپڑے دکھانے لگیں۔ میں نے ایک سرخ جوڑا جو اٹھا کر کھولا تو بھر بھرا کر کئی ٹکڑے ہو گیا ۔۔ شاید کپڑوں کو کبھی دھوپ نہ دکھائی گئی تھی اور کپڑے نموں سے گل گئے تھے یا انہیں کیڑا کھا گیا تھا۔

زندگی کا اس سے بڑا المیہ میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

صغرا خالہ نے مجھے اپنے گہنے بھی دکھائے جو بڑے بڑے اینچ چک دمک کھو چکے تھے۔ سنگھار کا سامان بھی دکھایا جس پر منوں مٹی جم چکی تھی۔ افشاں کی ڈبیہ میں خاک دھول بھی رل مل گئی تھی۔ بیتے سونے چاندی کے گوٹے گرد سے اٹے گئے تھے۔

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے تھوڑی دیر اس کمرے میں اور ٹھہرا تو میرا دم گھٹ جائے گا۔ میں گھبرا کر جلدی سے باہر نکل آیا۔

صغرا خالہ بے زبان تھیں مگر زمانے والوں کے تو زبانیں تھیں۔ جب کوئی اجنبی مہمان آجاتا تو خاموش نہ رہتا۔ ایک دن ایسا ہی واقعہ ہوا ایک مہمان بی بی نے صغرا خالہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھ لیا۔ "کیوں بیٹا تمہارے کتنے بچے ہیں ـــــ؟"

میں نے دیکھا یہ ایک سوال نہ تھا۔ ایک شدید قسم کا زلزلہ تھا۔ جیسے سوال کرنے والی بی بی نے ان کے موہنہ پر تھوک دیا تھا اور وہ گھبرا گھبرا کر آنگن میں چاروں طرح یوں تکنے لگیں۔ جیسے اپنے بچوں کو کھوج رہی ہوں۔ اور جب کوئی نشان نہ ملا تو ایک ایک کا چہرہ دیکھنے لگیں۔ جیسے پوچھ رہی ہوں۔ "بتاؤ میرے بچے کہاں ہیں ـــ"

اس وقت جیسے سب کی زبانوں پر تالے پڑ گئے تھے ـــــ لیکن صغرا خالہ کی روح جیسے چیخ چیخ کر ان سے فریاد کر رہی تھی مجھے سہارا دو۔ مجھے پستیوں سے اٹھا کر بلندیوں پر پہنچا دو ـــ مجھے دلہن بنا دو۔ میری مانگ میں افشاں چن دو۔ میرے ہاتھ مہندی سے رنگ دو۔ مجھے سرخ جوڑا پہنا کر گہنوں سے لاد دو۔ اور اور ـــ میری کوکھ میں کسی گول مٹول گلابی سے بچے کو چھپا دو ـــ"

لیکن کون تھا جو ان کا درد سمجھتا۔ ان کا دکھ بانٹتا۔ سب جانتے بوجھتے انجان بنے ہوئے تھے ـــــ اور صغرا خالہ ـــ وہ تو ایک قبر ہیں۔ ایک اجاڑ ویران مقبرہ جس میں ان کے ارمانوں خوابوں کی لاش دفن ہے۔ اور اس تاریک مقبرے پر ان کے دل کا دیا چپ چاپ جلا کرتا ہے۔ اس چراغ میں تیل کی جگہ خود ان کا لہو جلتا ہے۔

دنیا والوں نے انہیں دار پر لٹکا رکھا ہے اور وہ سولی پر چڑھی ہوئی اجلی اجلی بکھر رہی ہیں ـــ اور گزرنے والا ہر دن اور ہر سال ان کی روح پر ایک کیل ٹھونک دیتا ہے۔ پتہ نہیں وہ کب تک یوں ہی صلیب پر لٹکتی رہیں گی۔!!!

ایم۔ امجد ورک

قندیل۔ لاہور

سراب

آج اتنی مدت کے بعد بھی جب کبھی میں ماضی کی اتھاہ گہرائیوں میں غوطہ زن ہوتا ہوں تو مجھے وہاں نہ صرف اپنی زندگی کے بہترین لمحات ہی ملتے ہیں، بلکہ کچھ ایسی یادیں بھی میرے بڑھتے ہوئے جذبات سے ہم آغوش ہو جاتی ہیں۔ جنھیں انتہائی کوشش کے باوجود بھی میں اپنے سے علیحدہ نہیں کر سکتا۔ شاداں کی یاد بھی میرے لئے ایک انمول موتی بن کر رہ گئی ہے۔ وہ موتی جس کے لئے میں ان اتھاہ گہرائیوں میں غوطہ زن تو ہوتا ہوں لیکن جسے میں بہتے وقت کی ہروں سے ہمکنار نہیں کر سکتا۔ وہ وہاں دور اندھیرے میں اپنی روشنی سے مجھے اندھا کر دیتی ہے اور جب میں سطح پر آتا ہوں تو زندگی کی راحتیں ایک درد بن کر مجھ سے چمٹنے کی کوشش کرتی ہیں اور میری روح... میری زخمی روح مجھے پھر انہیں اتھاہ گہرائیوں میں کشاں کشاں لئے چلتی ہے۔

شاداں میری زندگی میں ایک چھلاوے کی طرح داخل ہوئی اور اسی طرح چپکے سے بھاگ گئی۔ لیکن میری زندگی میں ایک درد، ایک خلش چھوڑ گئی جسے میں آج تک مٹا نہیں سکا۔ کہتے ہیں چھلاوہ انسان کو صرف تنگ کرنے کے لئے مختلف اشکال میں اس کے سامنے آتا ہے اور پھر ایک سراب کی طرح نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ شاداں بھی میرے سامنے کئی صورتوں میں نمودار ہوئی۔ لیکن ہر دفعہ ایک انمٹ نقش میرے ذہن پر چھوڑ گئی۔ ظاہری نظروں کے سامنے وہ ہیر اور صاحباں کا حسین روپ دھارتی، خوابوں میں میری شہزادی ہوتی اور خیالوں میں میرے دل کی رانی لیکن وہ کہاں تھی؟ اس کے لئے مجھے زیادہ جستجو نہ کرنی پڑی۔

گرمیوں کی تعطیلات میں عموماً گاؤں میں گزارتا تھا۔ نہ جانے کیوں شہر کی مصنوعی آب و ہوا اور ماحول میرے فارغ اوقات میں مجھے کھانے کو دوڑتے اور میں بوریا بستر اٹھا چچا کے ہاں گاؤں آجاتا۔ ان دنوں بھیا اکبر بھی اپنی تمام دواؤں بڑی بڑی کتابوں اور انسانی ہڈیوں سمیت وہاں آپہنچے اور اپنا ساز و سامان ایک الماری میں رکھ کر اور باہر "ڈسپنسری" لکھ کر پریکٹس کرنے لگے۔ یوں تو ڈاکٹر بننے میں ابھی کافی عرصہ تھا۔ لیکن انہوں نے اپنی شفا کا سکہ ابھی سے گاؤں والوں پر بٹھانا شروع کر دیا تھا۔ دوپہر کو جب بڑی بوڑھیاں ہمارے سامنے والی حویلی کے بوڑھے شہتوت کے درخت کے نیچے اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹ جاتیں تو اچھی بھیا کا کوئی "ذوٹ" کہہ دیتا۔ "بہنو! او کرم دین وے بچے ڈاکدار دے ہتھ وچ بڑی شفا ہے، کل حاجی نوں تپ چڑھ گیا سی۔ ڈاکدار نے ایک بوتل نال ای اتوں اتار دتا اے۔ اللہ او دھا بھلا کرے"۔ اور ماں توت والی اپنے سر کے اوپر درخت میں اونگھتے کوؤں کو اڑا کر کہتی۔

"پر ہے وڈھا بدید، پرسوں میں ادھی شیشی دوائی دی موڑن گئی تے کہن لگا ماں اے تے واپس نہیں ہوندی، بھلا اے دی کوئی گل اے!"

اور ہم دونوں اوپر اپنے چوبارہ میں بیٹھے رات کو کسی کھیت پر حملہ کرنے کا پروگرام بنا رہے ہوتے یا پھر چچا احمد دین سے پنجابی بیتے سننے کا جنہیں سنکر مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی مٹیار میرے لئے بھی انتظار کی گھڑیاں سہہ سہہ کر میری آمد پر گا رہی ہے۔

باریں برسیں کھٹن گیا تے کھٹ کے لیایا کلیاں   پلکاں دی جھالر نال اکھیاں دیاں بجھیاں گلیاں

اس سال میں کچھ لیٹ ہی گاؤں پہنچا۔ ایف۔ ایس۔ سی کے پریکٹیکل چھٹیوں میں آ گئے، اور میں پروگرام کے مطابق بھیا اچھی کا لاہور اسٹیشن سے گاؤں تک کا ساتھ نہ دے سکا۔ حویلی کے صحن تک پہنچتے پہنچتے میری بری حالت ہو چکی تھی۔ میرے کپڑے پسینے میں شرابور تھے اور میں ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے دہلیز میں داخل ہوا۔ اسی وقت مجھے شاداں باہر نکلتی دکھائی دی۔ ایک سال کے قلیل عرصہ میں شادو۔ شاداں بن چکی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ایک خمار سا تھا جسے اس نے لمبی لمبی پلکوں سے اندر ہی چھپا رکھا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے جوانی کے استقبال نے مجھے ایک پل میں اپنے خواب و خیال کی حقیقت سے روشناس کر دیا ہے۔ مجھے ایک پیہ آ دانکا روپ بدلنے کی سعی کرتے محسوس ہوا۔ اس کے ہاتھ میں دوا کی شیشی تھی۔ شاداں نے مجھے دیکھا دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے مسکرائی اور پھر اندر بھاگ گئی۔ میری زبان تیزی سے میرے تشنہ لبوں پر بل کھانے لگی۔

" بی بی جی۔ شاہی بابو آ گئے۔ اور اگلے لمحہ گھر کے تمام افراد میرے گرد گھیرا ڈال چکے تھے۔ چچی نے بلائیں لیتے ہوئے میرے دیر سے آنے پر ناراضی کا اظہار کیا۔ اچھی بھیا اپنی عینک کی کھڑکیوں سے مسکرا مسکرا کر میرا پر جوش استقبال کرنے لگے۔

شاہی بھیا۔ واپس کب جاؤ گے"۔ یہ بلو تھا۔ وہ ہمیشہ میرے جانے کے دن کے متعلق پوچھتا۔ اسے اس دن کچھ پیسے ملتے اور وہ پھر سامنے سائیں کی دوکان سے ادھار ٹکیوں اور ریوڑیوں کا حساب بے باق کر دیا کرتا۔ میں نے جب اسے جانے کے دن کے متعلق بتایا تو وہ بھاگتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ ضرور سائیں کے پاس گیا ہوگا۔ اور اس سے اس نے کہا ہوگا" دیکھ سائیں، زیادہ گلاں نہ بنائیں، بھادوں کے آخیر تک تیرا حساب ٹھیک کر دوں گا۔ لا اب کچھ منہ تو میٹھا کرا دے"۔ ... جب میں اس شور و غل سے فارغ ہوا تو میری نظریں کسی کو ڈھونڈنے لگیں۔ لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ شاداں کا باپ فضلو ترکھان سخت بیمار ہے۔

پہلے کچھ دن میں دیہاتی زندگی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ میرے تھکے ہوئے ذہن میں شاداں کہیں جا کر چھپ گئی۔ میں صبح سویرے ناشتہ کر کے باہر نکل جاتا اور دوپہر کو سخت گرمی اور لو سے بچنے کے لئے ایک آم کے درخت کی ٹہنیوں میں اپنا بسیرا بنا لیتا اور تمام دن وہاں بیٹھا ناول سامنے کھولے میں رکھے ہر آنے جانے والے کے سر پر کچے پکے آم پھینکتا رہتا... کچھ ہی فاصلہ پر چلتے ہوئے رہٹ کی چر، چر چراہٹ کی آواز بیلوں کی گھنٹیوں کی آواز میں مدغم ہو کر ایک ایسا ذہنی ارتعاش پیدا کر دیتی کہ میں دیر تک اس سے لطف اندوز ہوتا رہتا۔ اور جب وہاں بیٹھے بیٹھے بھوک ستانے لگتی تو نیچے اتر کر رہٹ کی طرف چل پڑتا، جہاں چچا کرم کے ساتھ میرا کھانا بھی پہنچا ہوتا... دور دور تک اکیلا اور اداس ماحول آگ کی چتا میں جل جل کر اپنے دل کا غبار شعلوں کے روپ میں نکالتا اور جوں جوں میں اس کی اداس دھڑکنوں میں اپنا پاؤں رکھتا اس کا سلگتا ہوا جسم ٹھنڈا ہو جاتا لیکن جوں ہی میں مڑ کر اپنے کھوئے ہوئے راستہ پر نظر دوڑاتا مجھے وہ شعلے پھر نظر آنے لگتے۔ رہٹ کی نسار میں ٹھنڈا پانی یوں تیزی سے بہتا ہوا اس آگ کی پیاس بجھانے کے لئے آگے دوڑتا جیسے کسی پیر نے اُسے اسی انجام کی بددعا دی ہو۔ میں اس پانی کے سامنے اس طرح اپنا سر جھکا دیتا جیسے میرا اور اس کا جرم ایک ہی ہو۔ میری زندگی بھی کسی کی تلاش میں سرگرداں ہو اور شاید کسی روح کی پیاس بجھا کر ہی اپنے ناکردہ جرم کا کفارہ کر سکے...

پھر جب مجھے اکیلے پن سے اکتاہٹ ہونے لگی تو میں حویلی کے چوبارے میں آ گیا... ایک دن میں کھڑکی سے ٹانگیں باہر نکالے بیٹھا تھا کہ میں نے شاداں کو دیکھا۔ میرے ذہن کی مختلف تاروں میں ایک سرسراہٹ ہوئی اور شاداں ایک کونے سے نکل کر تمام ذہن پر چھا گئی۔ یہ گاؤں کی مٹیاروں کا پنگھٹ پر جانے کا وقت تھا۔ سہ پہر کو گاؤں کی مختلف اونچی نیچی گلیوں سے لڑکیوں کے غول کے غول سر پر تنور رکھے اور گاگریں اٹھائے ہمارے سامنے والی گلی سے نکل کر گاؤں کے ٹھنڈے کنوئیں کی طرف روانہ ہو جاتے۔ ان کی گاگریں دور سے یوں لگتیں جیسے بہت سے چمکیلے موتی خود بخود ایک نقطہ پر سمٹ رہے

ہیں. آتے جاتے یہ ملیاریں، بارش کے بعد باہر نکلی ہوئی چیونٹیوں کی طرح جو ایک دوسرے سے پوچھ کر سفر جاری رکھتی ہیں، آپس میں باتیں کرتیں مسکراتیں اور اٹھلاتی ہوئی ٹکرا کر نکل جاتیں. میں یہ حسین اور دلربا منظر دیکھ کر بہت لطف اندوز ہو رہا تھا. حسن کتنا دلفریب اور قدرتی تھا. لیکن ساتھ ہی کتنا بے باک اور نڈر. شہر کی خوفناک فضا مفقود تھی. اور پھر ان الھڑ دوشیزاؤں کو اپنے آپ اور ماحول پر کتنا اعتماد تھا!

میں یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ سامنے والی گلی سے شاداں گاگر اٹھائے ٹھمک ٹھمک کر چلتی نکلی جیسے کوئی ملکہ سر پر تاج رکھے اپنے محل کی چار دیواری سے باہر پھونک پھونک کر قدم رکھ رہی ہو. میں نے اسے دیکھا. اور پھر دیکھتا ہی رہا... اس نے صرف اپنی دراز پلکیں اٹھائیں اور پھر خاموشی سے آگے بڑھ گئی. میرے لاشعور سے ایک احساس بیدار ہوا اور مجھے یوں لگا جیسے کسی نے دبے پاؤں میرے دل میں جھانک کر دیکھا ہو. اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ رقصاں تھی. وہ میرے لٹکتے ہوئے پاؤں کے نیچے سے گزری تو میں نے پاؤں اندر کر لئے. وہ اسی شاہانہ چال میں قدم اٹھاتی دور لڑکیوں کی ایک لمبی قطار میں اپنی انفرادیت کھو کر گم ہو گئی. میں اپنے حسین خوابوں میں کھو گیا اور تبھی لوٹا جب وہ واپس آرہی تھی. اب کے وہ پانی سے بھری گاگر کی وجہ سے قریب آکر اوپر نہ دیکھ سکی. میں نے ایک کنکر اٹھایا اور اس کی گاگر میں عین اس وقت پھینک دیا. جب وہ کھڑکی کے نیچے سے گزر رہی تھی. پانی اچھلا اور اس کی گالوں پر ننھے ننھے قطرے بہہ گئے. گلی میں مڑنے سے پہلے وہ رکی. آہستہ سے سر کو گھمایا. نم آلود پلکیں اٹھائیں اور پھر خاموشی سے آگے بڑھ گئی. مسکراہٹ کے بغیر وہ مجھے عجیب سی لگی. میں یوں ہی گھبرا سا گیا. اور نیچے ڈسپنسری میں آ گیا. بھیا کے پاس چلا گیا وہ ہڈیوں کو جوڑنے اور پھر توڑنے میں مصروف تھے.

"آؤ بھئی شاہی! تمہیں ایک نئی بات بتاؤں"۔ انہوں نے نیم مکمل انسانی پنجر کو توڑ دیا.

"جی بھیا" میں اور کچھ بھی نہ کہہ سکا.

"دیکھو یہ کولہے کی ہڈی ہے. اور اس طرح ٹانگ میں جڑی ہوتی ہے. ویسے یہ ایک عورت کی ہڈی ہے"۔ انہوں نے مجھے چپٹی سی اور سوراخ والی ہڈی دکھلائی. جس کے ساتھ وہ ایک لمبی سی ہڈی جوڑنے کی کوشش کر رہے تھے.

"یہ اس طرح ٹانگ سے ملی ہوتی ہے اور جب یہ عورت چلتی ہوگی تو ہڈی اس طرح حرکت کرتی ہوگی"۔ بھیا آپ ہی ہڈیاں دکھاتے اٹھ کھڑے ہوئے. اور نقل کرتے ہوئے چلنے لگے. ان کی چال دیکھ کر مجھے شاداں پھر یاد آگئی. میں پھر گھبرا گیا. میں نے کھوپڑی کی طرف دیکھا. مجھے یوں لگا جیسے شاداں مجھے گھور رہی ہے.

جب میں باہر نکلا تو شام کا دھندلکا دن کی گرمی کو اپنے میں سمو چکا تھا. سامنے مسجد میں نمازی کنوئیں سے پانی نکال نکال کر وضو کر رہے تھے. آسمان پر ہزاروں کوّے اڑتے ہوئے گاؤں سے باہر پیپل کے بوڑھے درخت کی طرف جا رہے تھے. ان کی ایک منزل تھی لیکن میں... میں آہستہ آہستہ چلتے اپنی اکیلی چارپائی پر جا لیٹا. مجھے آج کی چاندنی سے کوئی سروکار نہ تھا. بھیا آپی اور رحیم ہی سے مل کر تربوز چوری کرنے کا پروگرام بھی میں نے ختم کر دیا. چچا احمد دین کے چٹکلے مجھے بے جان سے لگے اور آکاش کی جھیل پر تیرتے اور ڈوبتے چندا کو گھورتے ہوئے میں خوابوں کی دنیا میں کھو گیا.

وقت کو موں کے غول میں چھپ کر اڑتا رہا. میں شاداں کو دیکھتا رہا. وہ اپنی ازلی مسکراہٹ بکھیرتی رہی لیکن میں اسے اپنا حال دل سنانے سے گریز کرتا رہا. اس کا معصوم حسن، اس کی خود اعتمادی اور شرم و حیا میری زبان کو بند کئے رہی. میرا پیار صرف خوابوں تک محدود رہا. کبھی کبھی مجھے یوں لگتا جیسے شاداں مجھے دور چچا رحمت کے آسیب زدہ رہٹ سے پکار رہی ہے. اور کہہ رہی ہے.

"شاہی تم کب آؤ گے؟ دیکھو تو تمہارے بغیر میری مسکراہٹ بھی پھیکی پڑتی جا رہی ہے. میں تو تمہارا انتظار کر کے تھک چکی ہوں. اب تو یہ ٹوٹا ہوا رہٹ بھی چلنے لگا ہے"۔ اور میرے کانوں میں اداس اداس سسکیوں کی آواز آنے لگتی... دن کو میں دیکھتا شاداں کھوئی کھوئی سی گاگر اٹھائے آہستہ آہستہ قدم اٹھائے گلی میں گم ہو جاتی.

اور پھر تعطیلات ختم ہونے سے کچھ دن پہلے میں چوبارے سے اٹھ کر ایک سہ پہر اس کے پیچھے ہولیا۔ میں نے دو روحوں کی پیاس بجھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ ایک ہچکچاہٹ اور خوف میرے اظہارِ محبت میں حائل نہیں ہوں گے۔۔۔ وہ مجھ سے بے خبر پانی سے بھری ہوئی گاگر اٹھائے اپنی دل رُبا چال میں مدہوش اپنے گھر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں نے اسے اندر داخل ہوتے دیکھا اور پھر میں ایک کنواں بنتے دیکھنے لگا۔ جس میں لکڑی کا چک پھینکنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ میں آگے بڑھ گیا۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ فضلو ترکھان گھر پر نہیں تھا۔ باہر دالان میں کچھ لکڑی کی اَن بنی چیزیں پڑی تھیں۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ شاداں گاگر انڈیل کر ایک کٹورے میں پانی پینے لگی تھی۔ اس کا جسم یوں جھکا ہوا تھا، جیسے کوئی پیراکی کی ماہر حسینہ تالاب میں کودنے کو تیار کھڑی ہو۔ اس نے مجھے دیکھا کٹورے کو وہیں رکھا اور آہستہ سے مسکراتے ہوئے میرے قریب آگئی۔

"آؤ۔ شامی!" اس کی آواز میں بلا کی شیرینی تھی۔ میں شرما سا گیا۔ اس نے مجھے ایک چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جس کے قریب ہی ایک کھرل میں کچھ مرغیاں بچا۔ ہوا۔ چارہ چگ رہی تھیں۔

"لسی پیو گے۔ شکر والی۔ تمہیں وہی پسند ہے نا" وہ مسکرائی۔

"تمہیں کیسے معلوم ہے" مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ مجھے بہت چاہتی رہی ہے۔ اسے میرا بہت انتظار رہا ہے۔

مجھے اپنی لاپروائی اور اپنے دیر سے آنے پر غصہ سا آنے لگا۔

"کسی نے بتایا تھا" وہ پھر مسکرائی۔

"شاداں! میں تم سے ایک بات کرنے آیا ہوں" میں اس سے آنکھیں نہ ملا سکا۔

"میں جانتی ہوں" جذبات میں آکر میں نے اپنے سامنے پڑے ہوئے تیشہ کو اٹھایا اور اس سے زمین کھرچنے لگا۔

"بھلا کیا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہاں مسکراہٹ کی بجائے اداسیاں عود کر آئی تھیں۔

"یہی نا کہ آج بھی اپنی غلطی کی معافی مانگتا ہے۔ میں تو اب کبھی بھی اس سے نہ بولوں گی، نہیں شامی"

میں چونکا، میرا تیشہ ایک مرغی کی چونچ پر پڑا۔ اور وہ چیختی ہوئی دور اڑ گئی۔ دور ایک اور چیخ بلند ہوئی۔ اور کنوئیں میں پھینکے ہوئے چک نے میری زخمی روح کو بھی اپنے ساتھ کنوئیں کی گہرائیوں میں دھکیل دیا۔

دوسری صبح میں لاہور واپس جا رہا تھا اور بھیا آچھی کی درخواست بر لئے رخصت میری جیب میں پڑی تھی۔ وہ کچھ دن اور گاؤں ٹھہر گئے تھے۔ گاڑی میں میرے سامنے بیٹھا ایک مسافر گا رہا تھا۔

بار بر بر سیں کھٹن گیا سے۔۔۔۔

اور میں نے آہستہ سے آنکھیں بند کر لیں۔

بقیہ۔ "نہ بجھے دیئے"

جائے گا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور تیز دھار والی کرپان سے اسے کاٹنے لگا۔ میں نے اس کے ٹکڑے نہر میں بہا دیئے۔ پانی میں بادلوں کی سرخی کے ساتھ ساتھ سرجو کی مہندی کی سرخی تھی۔ اس کا سہاگ پانی کے قطروں میں مل گیا۔ اس کے جسم کی نرمی ہوا میں رچ گئی۔

میں نے اٹھ کر گھوڑیاں کھولیں۔ ہری سنگھ چاچا اور میں دونوں چپ چاپ بیکانیر کی طرف جانے والی راہ پر جا رہے تھے۔ اور میں اپنے سیدھے ہاتھ کو دیکھ کر سوچ رہا تھا۔ دو سال کے بعد اب اس ہاتھ سے سُودی کھا سکوں گا۔

رقیہ پروین
شرمیتا. دہلی

بیچ جنگل میں

سیتا پور کے پاس ملاکھولی ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ وہاں رام لال کسان رہتا تھا۔ میاں بیوی اور بیٹی۔ بس اتنا ہی خاندان تھا بیٹی منگلا جوان ہو چکی تھی۔ رام لال کو اس کے بیاہ کی بہت فکر تھی۔ پچھلے دو برسوں سے وہ منگلا کے لئے لڑکے کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ اُس نے بہت دوڑ دھوپ کی مگر ہر بار نا امیدی ہی ہاتھ لگی۔

یہ بات نہیں کہ آس پاس کے گاؤں میں لڑکوں کی کمی تھی۔ یا منگلا میں کوئی عیب تھا۔ رام لال تو اپنی بیٹی کا روپ اور گُن دیکھ کر پھولا نہ سماتا تھا۔ کبھی کبھی منگلا کی ماں کو بیٹی کی بڑی طرح کھٹکتی تھی۔ مگر رام لال نے اس بارے میں سوچا تک نہ تھا۔ منگلا کو وہ بہت پیار کرتا تھا۔ منگلا گھر میں ماں کا کام سنبھالتی تھی۔ اور کھیتوں میں باپ کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ نرائی، گوڑائی، جیسے ہر کام وہ مردوں سے بڑھ کر کرتی تھی۔ اس کا گورا چہرہ خون کی بہتات کے سبب ایسا لال بھبوکا تھا۔ کہ لگتا ہاتھ لگانے سے لہو ٹپک پڑے گا۔ قدرت کی گود میں پل کر وہ جوان ہوئی تھی۔

جب فصل پک کر تیار ہو جاتی، اور اُس کی رکھوالی کے لئے رام لال کھیت میں مچان باندھ کر سوتا۔ تو لاکھ منع کرنے پر بھی منگلا باپ کے ساتھ رات بھر جاگ کر کھیت کی رکھوالی کرتی۔ وہ باپ کو زبردستی سلاتی اور خود تمام رات جاگ کر گذار دیتی۔ خوف تو اُسے چھو تک نہ گیا تھا۔ چال میں ایسی تیزی اور لاپروائی تھی۔ کہ گاؤں کے نوجوان اُسے دیکھ کر اپنے دھڑکتے سینے تھامنے لگے تھے اور کئی عورتوں کے دلوں میں تو حسد کی آگ سلگ اُٹھی تھی۔

ایسی بیٹی کو رام لال کس دل سے ایسے ویسے نوجوان کے ہاتھ میں سونپ دیتا۔ وہ اپنے ہیرے کو کسی اناڑی کے ہاتھ میں نہیں دینا چاہتا تھا۔ جسے شیشے اور ہیرے کی پہچان نہ ہو۔ اُس کے اس رویہ کو دیکھ کر لوگ اس پر ہنسنے لگتے تھے۔ لوگ کہتے کہ وہ تو اپنی بیٹی کسی راج کمار سے بیاہے گا۔ لیکن رام لال سُنی اَن سنی کر ٹال جاتا۔

آخر ایک دن اُس کی محنت بر آئی۔ وہ منگلا کا بیاہ چھ گاؤں آگے، سکھن لال کسان کے اکلوتے بیٹے شنکر دیال سے طے کر آیا تھا۔
شنکر دیال سب طرح منگلا کے لائق تھا۔ گھر بھی کھاتا پیتا تھا۔ رام لال اس رشتے سے بہت مطمئن تھا۔

پھر جب گاؤں والوں نے ... دولہا کو بیاہ منڈپ میں موڑ اور پیلی ریشمی دھوتی میں سجا ہوا دیکھا۔ تو انھیں رام لال کی خوشی اور فخر بے وجہ نہیں معلوم دیا۔ ہاتھوں میں چاندی کے کڑے چار چاند لگا رہے تھے۔ وہ راج کمار سا لگ رہا تھا۔ سب نے ایک آواز میں کہا کہ دونوں کی جوڑی بہت حسین رہے گی۔

ماں باپ کو روتا چھوڑ منگلا شوہر کے دیس چلی گئی۔ رام لال کا کلیجہ دُکھ سے پھٹا جا رہا تھا۔ مگر بیٹی کو اتنا اچھا شوہر ملا تھا۔ جسے سارا گاؤں سراہ رہا ہے — یہ سوچ کر اُس کے دل کو ڈھارس بندھی۔ میاں بیوی منگلا کی رخصتی کا دکھ بھول کر اب اُس کے واپس آنے کی امید میں ایک ایک دن گن گن کر کاٹنے لگے۔

رواج کے مطابق پندرہ دن بعد منگلا شوہر کے ساتھ سرخ ساڑی پہنے مائکے آئی۔ اُس کا چہرہ تازہ گلاب کی طرح کھل اُٹھا تھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں شوخی کی جگہ حیا نے لے لی تھی۔ شنکر اُسے چھوڑ کر دو دن بعد اپنے گاؤں چلا گیا۔ رام لال نے مہینے بھر بعد منگلا کو واپس پہنچانے کا وعدہ کیا تھا۔

بیٹی ماں باپ کے گھر کتنا بھی رہے اُن کا دل کبھی نہیں بھرے گا۔

آج منگلا سسرال جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ اُس کی ماں آنکھوں میں آنسو لئے بیٹی کے لئے گڑ والے چاول کی روٹیاں سینک رہی تھی۔ وہ منہ اندھیرے اُٹھی تھی۔ پھر منگلا کو، جو مستقبل کے رنگین خوابوں میں کھوئی ہوئی تھی، جگایا تھا۔ اُسے غسل کے لئے کہہ کر وہ روٹی بنانے بیٹھی تھی۔

رام لال نے اگر جلدی مچائی تو ماں بیٹی مل کر سامان ٹھیک کرنے لگیں۔

جلدی کرتے کرتے بھی بہت دیر ہوگئی۔ سورج چڑھ آیا تھا۔ منگلا اور رام لال جلدی جلدی قدم بڑھا رہے تھے۔ کچھ دور جا کر وہ عام راستے سے ہٹ کر ایک چھوٹی سی پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ عام راستہ کافی چکر دار تھا۔ اُدھر سے جانے پر رات دس بجے سے پہلے وہ نہیں پہنچ سکتے تھے۔ لیکن پگڈنڈی کے راستے دیا بتی کے وقت تک پہنچ جانے کی امید تھی۔

پتلی سی پگڈنڈی سانپ کی طرح بل کھاتی بہت دور تک چلی گئی تھی۔ اُس سنسان راستے پر باپ بیٹی اپنے ہی خیالوں میں مگن، چلے جا رہے تھے۔ زیادہ تر لوگ اس راستے سے جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ یہ راستہ بیچ جنگل سے ہو کر گذرتا تھا۔ جہاں جنگلی جانوروں کا کافی خطرہ تھا۔

جنگل میں سناٹا تھا۔ کبھی کبھار کسی پرندے کے بول اُٹھنے سے سناٹا ٹوٹ جاتا۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے گئے۔ راستہ اور تنگ ہوتا گیا ڈھاک کے بڑے بڑے درخت کسی دیو کی مانند سر اٹھائے کھڑے تھے۔ چاروں طرف کا سناٹا اور گہرا ہو گیا تھا۔ ہوا چلتے چلتے تھم گئی تھی۔ اُسے بھی کسی آنے والے خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ خاموش اور اداس تھی۔

منگلا کو یکایک گرمی محسوس ہوئی۔ رک کر اُس نے ساڑی کے پلو سے پسینہ پونچھا اور پھر جیسے ہی قدم اٹھایا۔ سامنے دیکھ کر اُس کے جسم میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ اُس کے منہ سے چیخ نکلی۔ پاؤں پر کسی نرم و نازک چیز کا لمس محسوس کرتے ہی اُس نے گھبرا کر پاؤں کھینچ لیا۔

اُس نے جھک کر نیچے دیکھا۔ ہری گھاس پر ایک سانپ سیدھا پڑا تھا۔ اُس کی چیخ کی آواز سن کر بھی وہ نہ ہلا نہ سرکا۔ منگلا نے دوبارہ غور سے دیکھا۔ سانپ کا صرف پچھلا حصہ دکھائی دے رہا تھا۔

سامنے ڈھاک کے دو بڑے بڑے درخت آپس میں بالکل سٹے ہوئے تھے۔ درمیان میں صرف اتنی جگہ تھی۔ کہ سانپ جیسی کوئی پتلی چیز

نکل سکتی تھی۔ دونوں تنے اتنے چوڑے تھے۔ کہ اُس پار کی کوئی چیز دکھائی نہ دے رہی تھی۔ منگلا کے دل میں کچھ شک پیدا ہوا۔ ڈرتے ڈرتے اس نے دونوں پیڑوں کے بیچ میں جھانک کر دیکھا۔ اور اس کی آدھی جان نکل گئی۔

رام لال خراماں خراماں آ رہا تھا۔ وہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ منگلا کی چیخ سنی۔ تو وہ بدحواس سا دوڑتا دوڑتا آ پہنچا۔ منگلا کا زرد ہوا پژمردہ چہرہ دیکھ کر اُس نے ایک ہی سانس میں کتنے سوال کر ڈالے۔

کچھ دیر منگلا تذبذب میں کھڑی رہی۔ پھر اُسے حالات کا صحیح علم ہوا جھپٹ کر اُس نے باپ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ رام لال چکر میں پڑ گیا۔ کہ ماجرا کیا ہے۔ اُس نے منگلا کی طرف دیکھا اور منگلا نے سامنے دونوں درختوں کی طرف اشارہ کیا۔ رام لال نے جھک کر دیکھا اور دوسرے ہی لمحے اُس کا بھی چہرہ منگلا کے چہرے کی طرح زرد پڑ گیا۔

درختوں کے اُس پار ایک خوفناک شیر سو رہا تھا۔ سورج کی روشنی میں اس کا پیلا جسم چمک رہا تھا۔ ایک ادا سے وہ محو خواب تھا۔ اُس کی دم دونوں پیڑوں کے بیچ سے نکل کر باہر پگڈنڈی پر پڑی تھی۔ اُسی دم کو منگلا نے سانپ سمجھ لیا تھا۔ اب بات صاف ہونے پر منگلا اور رام لال ایک طرف آنکھ پھاڑے کھڑے تھے۔ جیسے سچ مچ انھیں سانپ نے سونگھ لیا ہو۔ اپنی پچپن سال کی عمر میں لال رام نے کبھی ایسا منظر نہیں دیکھا تھا۔ آج اچانک ایسے خطرناک حالات سامنے آ گئے۔ تو اس کا مضبوط کلیجہ بھی دہل گیا۔

بہت دیر بعد دونوں کو ہوش آیا۔ کہ اس وقت ایک ایک لمحہ بہت قیمتی تھا۔ کسی طرح وہاں سے بھاگ کر ہی وہ اپنی جان بچا سکتے تھے لیکن اب تو شیر جاگ چکا تھا۔ بھاگنا ممکن نہیں تھا۔ وہیں رہ کر کوئی ایسا طریقہ سوچنا تھا۔ جس سے اُن کی جان بچ سکے۔

رام لال کے پاس اُس وقت کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا۔ وہیں رہ کر کوئی ایسا طریقہ سوچنا تھا جس کے سہارے وہ شیر سے بھڑ جاتا۔ صرف ایک لاٹھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ لاٹھی کتنی ہی مضبوط ہو اُس سے شیر کا مقابلہ تو نہیں کیا جا سکتا۔

رام لال منہ پھیرے کھڑا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہ کیا کیا جائے۔ اپنے سے زیادہ فکر اُسے منگلا کی تھی۔ وہ بالکل گم سم سی کھڑی تھی۔ اُس کے چہرے سے لگ رہا تھا۔ کہ وہ کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ مگر یہاں سوچنے سمجھنے کا وقت کہاں تھا۔ شیر کی نیند ٹوٹ چکی تھی۔ جاگتے ہی اُس نے شاید آدم بو بھی پالی تھی۔

اپنی آنکھوں کو جھپکاتے ہوئے اُس نے انگڑائی لی۔ اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کے منہ سے ہلکی سی غرّاہٹ نکلی۔

اس سے پہلے کہ شیر ایک بھی قدم آگے بڑھاتا۔ منگلا نے جھپٹ کر اُس کی دُم پکڑ لی۔ رام لال چند لمحے تو ہکا بکا رہ گیا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہ منگلا کیا کرنا چاہ رہی ہے۔

منگلا نے اپنی پکڑ مضبوط کرتے ہوئے ٹانگوں کو پھیلا کر دونوں پیڑوں کی جڑوں سے ٹکا لیا۔ پھر اُس کے منہ سے گھٹی ہوئی آواز نکلی "جلدی کرو بابو! لاٹھی سے شیر کے سر پر وار کرو!"

منگلا کی آواز اس قدر بدلی ہوئی تھی۔ کہ ایک لمحے کو تو رام لال بھی چونک گیا۔ منگلا کی اس دلیری پر رام لال کا کلیجہ دہل رہا تھا۔ اُس نے جی کڑا کر کے سامان ایک طرف پھینکا۔ اور لاٹھی کو ہاتھ میں تھام لیا۔ گھوم کر وہ شیر کے سامنے آ گیا تو اس کا غصّہ اور دھاڑ دیکھ کر رام لال کا کلیجہ منہ کو آ گیا۔

جنگل کا راجہ غصہ سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر پکے کلیجے کا آدمی تو وہیں پر دل توڑ دیتا۔ لیکن رام لال نے ہمت کر کے لاٹھی کا ایک بھر پور ہاتھ شیر کے سر پر دے مارا۔ دوسرے ہی لمحے شیر بھیانک گرج کے ساتھ زور سے اچھلا۔ رام لال گھبرا کر دھڑام سے چاروں شانے چت زمین پر جا پڑا۔ اس نے سانس روک لیا تھا۔ شیر اس پر اب آیا کہ تب آیا۔ لیکن شیر تو کھونٹے سے بندھے بندر کی طرح اچھل کر رہ گیا۔ خود کو چھڑانے کی اُس نے بہت کوشش کی مگر بے کار۔

رام لال نے جھپٹ کر اپنی لاٹھی پھر سنبھالی۔ شیر کا غصہ دیکھنے لائق تھا۔ اس کے ساتھ ایسی گستاخی کرنے کی کس نے جرأت کی اُس کے تیور بتا رہے تھے۔ کہ اب اس کے پنجے سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ رام لال گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

شیر اپنے جسم کو تولتے ہوئے ایک بار زور سے گرجا۔ سارا جنگل کانپ اٹھا۔ ہوا رک گئی تھی۔ گرمی یکایک بڑھ گئی تھی۔ ہر چیز کو جیسے انتظار تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ شیر نے اس بار دھاڑ کر اپنی دم چھڑانے کی کوشش کی۔ کہ منگلا کو لگا، اس کے ہاتھ کی ہڈیاں، چڑ چڑا کر ٹوٹ جائیں گی۔ درد سے اس کا چہرہ مسخ ہو گیا تھا۔ دُم کو چھوڑتے ہی موت سر پر آجائے گی۔ یہ وہ جانتی تھی۔

شیر نے ایک بار پھر ساری طاقت اکٹھی کر کے چھلانگ لگانے کی کوشش کی۔ مگر وہ انچ بھر بھی آگے نہ بڑھ سکا۔ جنگل کا راجہ بے بس ہو گیا تھا۔ رام لال پوری طاقت سے لاٹھی برسا رہا تھا۔ خون کی دھاریں شیر کے منہ سے بہہ رہی تھیں۔

گھائل شیر نے ایک بار پھر پیچھے ہٹ کر اپنے ساتھ گستاخی کرنے والے کو دبوچنا چاہا، مگر دونوں پیڑ آپس میں اس طرح سٹے ہوئے تھے۔ کہ ان کے اندر شیر تو کیا کتا بھی نہیں نکل سکتا تھا۔

رام لال کی لاٹھی کی چوٹ کھا کھا کر شیر اَدھ مرا ہو گیا تھا۔ سارا جنگل اس کی چیخوں سے کانپ رہا تھا۔ منگلا تو جیسے پتھر بن گئی تھی کسی بات کا اسے ہوش نہیں تھا۔ اپنی انگلیاں وہ شیر کی دم پر کستی جا رہی تھی۔ اُس میں نہ جانے کہاں کی فوق البشری قوت آگئی تھی۔ وہ اس گھائل اور غصیلے شیر کے ہر جھٹکے کو برداشت کر رہی تھی۔ دانتوں کو نچلے ہونٹ پر اس نے کس کر دبا لیا تھا۔ دو بوند خون بھی ٹپک پڑا تھا۔ اس کا سلونا چہرہ مسخ ہو چکا تھا۔ سارے جسم کا خون اس کے ہاتھوں کی طرف دوڑ رہا تھا۔ پیشانی کی رگیں اس قدر گرم ہو گئی تھیں۔ کہ اُسے لگا ابھی پھٹ جائیں گی۔ شیر غصے سے دھاڑ رہا تھا۔ رام لال کی لاٹھی اس پر برستی رہی۔ رام لال نے ایک بھرپور وار شیر کے منہ پر کیا۔ اور اس کی لاٹھی کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ درد سے تڑپتے ہوئے شیر نے ایک بار رام لال کی طرف دیکھا اور اس کا جسم زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

کچھ دیر رام لال شیر کے مردہ جسم کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا۔ جب اُسے یقین ہو گیا۔ کہ وہ مر گیا ہے۔ اور اب اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا پھر وہ منگلا کی طرف بڑھا وہ اسی حالت میں بیٹھی تھی۔ رام لال نے کہا۔ "اُٹھو منگلا، مصیبت ٹل گئی ہے"

آواز سن کر منگلا نے چونک کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے رام لال کی طرف دیکھا۔ اُس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔ وہ بت بنی بیٹھی رہی رام لال نے دوبارہ پکارا، منگلا نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

اُس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا ہونٹ تھر تھرا رہے تھے۔ ایک بار اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا اور پھر آنکھیں موند لیں۔ دوسرے لمحے وہ رام لال کی گود میں لڑھک گئی۔

رام لال گھبرا گیا، منگلا کو اس نے کئی آوازیں دیں مگر وہ گٹھڑی سی پڑی رہی۔ رام لال نے چاہا۔ کہ دھیرے سے اُس کی انگلیوں سے دم کو الگ کر دے مگر وہ اُسے الگ نہ کر سکا۔

رام لال کا جی بھر آیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے، کبھی سوچا، کہ گاؤں جاکر کسی کو بلا لائے اور منگلا کو شیر سمیت اٹھاکر لے جائے لیکن بے ہوش منگلا کو اس جنگل میں تنہا چھوڑ کر جانے کو بھی اس کا دل نہ مانتا تھا۔

بہت دیر تک وہ اسی ادھیڑبن میں پڑا رہا۔ پھر اسے ایک طریقہ سوجھا۔ اُس کی جیب میں ایک چھوٹا سا چاقو تھا۔ رام لال نے اُسے نکال کر شیر کی دُم کو درمیان سے کاٹ دیا آدھا حصہ اب بھی منگلا کی مٹھیوں میں بھچا ہوا تھا۔

اُس نے بیٹی کو کندھے پہ اٹھایا اور گاؤں کی طرف چل پڑا۔

رام لال کی بیوی نے بیٹی کی یہ حالت دیکھی تو پاگل سی ہوگئی۔ اس کا تڑپنا دیکھا نہیں جاتا تھا۔ رام لال منگلا کو چارپائی پہ ڈال سیدھا باہر بھاگا۔ کچھ دیر بعد وہ ڈاکٹر کو لئے آپہنچا۔

ڈاکٹر نے آکر منگلا کا معائنہ کیا اور کہا "اب دوا کی ضرورت نہیں ہے یہ مرچکی ہے، زیادہ شفقت کرنے سے موت ہوئی ہے۔"

فکر تونسوی

فنون۔ لاہور

ایک اور الہ دین چراغ

"تم جلد ہی کروڑ پتی بن جاؤ گے!"

۱۹۳۰ء میں آج سے پچیس برس پہلے میں نے یہ فقرہ ایک مشہور جنتری میں پڑھا تھا۔ جنتری کا نام "پرشد گھنڈی جنتری تھا" جسے ملک کے مشہور و معروف جیوتشی پنڈت گھنڈی دیال جی شائع کرتے تھے۔ اور صرف اس لئے شائع کرتے تھے کہ اُن کے والد صاحب قبلہ پا گھنڈی دیال جی بھی ہر سال جنتری ہی شائع کرتے تھے۔ کرسیاں نہیں بُنا کرتے تھے۔

اور انھیں پنڈت گھنڈی دیال جی نے ۱۹۳۰ء کی پرشد گھنڈی جنتری میں میری قسمت کا حال لکھتے ہوئے پیش گوئی تحریر کی تھی۔ کہ تم جلد ہی کروڑ پتی بن جاؤ گے۔ چنانچہ پورے پچیس سال تک میں نے کروڑ پتی بننے کا انتظار کیا (بعد میں اکتا کر لکھ پتی بننے کا بھی انتظار کیا) لیکن میری بجائے جب سوسائٹی کے دوسرے رذیل اور ادنٰی صفت آدمی کروڑ پتی بنتے گئے۔ تو میں طیش میں آ گیا۔ اور فیصلہ کیا کہ پنڈت گھنڈی لال کے علم جوتش کے خلاف ایک زبردست مضمون لکھ ڈالوں۔

اور اس مضمون کے سلسلے میں مجھے ۱۹۳۰ء کی اُس جنتری کی ضرورت ہوئی

ایک دن اُس جنتری کی تلاش میں، میں شہر کے مشہور کباڑی بازار میں چلا گیا۔ ہمارے شہر کے اس کباڑی بازار کی یہ منفرد خصوصیت ہے کہ یہاں قدیم سے قدیم اشیا بھی بالکل نئی حالت میں مل جاتی ہیں اور پھر یہاں کے کباڑیوں کے پاس دنیا کی ہر نایاب اور نادر چیز موجود رہتی ہے۔ مثلاً ایک دوست نے مجھ پر یہ عجیب و غریب انکشاف کیا تھا۔ کہ جاپان سے انہوں نے ایک تخت خریدا تھا۔ جس پر سکندر اعظم بیٹھا کرتا تھا لیکن بالکل وہی تخت ہندوستان کے اس کباڑی بازار میں بھی اُسے دکھایا گیا۔ جس پر سکندر بیٹھ کر حکومت کرتا تھا۔

غرض یہ کباڑی بازار نوادرات دنیا سے بھرا پڑا تھا۔ مثلاً یہاں وہ ترکش بھی موجود تھا۔ جس سے ارجن نے مہابھارت کی جنگ لڑی تھی۔ وہ کوزہ بھی تھا جس سے محمد بن قاسم پانی پیا کرتا تھا۔ وہ بہی کھاتہ بھی تھا۔ جس میں ہیمو بقال اپنی فوج کا روزانہ حساب کتاب لکھا کرتا تھا اس کباڑی بازار میں ایسی انسانی کھوپڑی بھی دستیاب ہو جاتی تھی۔ جسے ایک کباڑی بکرماجیت کی کھوپڑی کہہ کر بیچتا تھا۔ اور دوسرا کباڑی اسے علاء الدین خلجی کی کھوپڑی کے طور پر فروخت کرتا تھا۔

اس کباڑی بازار کے متعلق ایک لطیفہ بہت مشہور تھا۔ کہ ایک بار ایک بوڑھا آدمی ایک کباڑی کی دکان پر پہنچا۔ اور بولا۔ "کیا آپ کے پاس

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی کھوپڑی موجود ہے؟" کباڑی نے بڑے تمکنت کے ساتھ کہا۔ "کیوں نہیں! ابھی حاضر کرتا ہوں۔" چنانچہ سے اندر سے جا کر وہ ایک کھوپڑی اٹھا لایا۔ بوڑھے نے کھوپڑی کو غور سے دیکھ کر کہا۔ "معاف کیجئے میں نے خود مہاراجہ رنجیت سنگھ کو دیکھا تھا۔ ان کا سر تو بہت بڑا تھا۔ مگر یہ تو چھوٹا سا سر ہے۔ کباڑی نے جھٹ جواب دیا۔ "جناب! یہ اُن کے بچپن کی کھوپڑی ہے!"

چنانچہ ایسے عالمگیر قسم کے کباڑی بازار میں کوئی وجہ نہیں تھی۔ کہ مجھے پچیس سال پہلے کی پرشدہ گمشدہ جنتری دستیاب نہ ہوتی۔

۲

اس کباڑی بازار کی دکانیں چوبی کھوکھوں کی بنی ہوئی ہیں۔ شکستہ اور میلے کچیلے کھوکھوں کی یہ لمبی قطار دور سے یوں دکھائی دیتی ہے۔ جیسے کسی یتیم خانہ میں یتیموں کی فہرست لٹکی ہوئی ہو۔ میں نے یہ فہرست ساری کی ساری دیکھ ڈالی۔ مگر جنتری نہ ملنا تھی نہ ملی۔ کباڑی بازار کی آخری دکان سے جب میں مایوس ہو کر لوٹ رہا تھا۔ تو کباڑیئے نے میرا کندھا پکڑ کہا۔ "جناب اگر جنتری نہ ملی نہ سہی کچھ اور لے جائیے مگر میری دکان سے خالی ہاتھ نہ لوٹئے۔ میرے ہاں جنتری سے زیادہ نادر چیزیں موجود ہیں۔"

"مثلاً!" میں نے جل بھن کر کہا۔

"مثلاً...." کباڑیئے نے ایک لوٹے پھوٹے گراموفون پر رکھا ہوا۔ ایک میلا کچیلا پیتل کا چراغ دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہ چراغ لے جائیے۔ یہ ایک تاریخی چراغ ہے شہنشاہ اکبر اس کی روشنی میں بیٹھ کر مطالعہ کیا کرتے تھے۔"

کچھ ہنستے ہوئے اور کچھ روتے ہوئے میں نے عرض کیا۔ "مگر جناب! معاف کیجئے۔ شہنشاہ اکبر تو اَن پڑھ تھے۔"

"تو پھر اکبر نہیں ہوگا، شاہجہاں ہوگا۔" کباڑیئے نے کاروباری وقار کی خاطر اپنی غلطی کی فوراً تصحیح کر ڈالی۔

اگرچہ جنتری کی بجائے چراغ لے جانے میں کوئی تک نہیں تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں چراغ مجھے پسند آ گیا۔ جیسے انسان کو کئی چیزیں خوامخواہ پسند آجاتی ہیں مثلاً شادی سے پہلے ایک لڑکی مجھے خوامخواہ پسند آگئی تھی۔ جو بعد میں میری بیوی بن گئی۔ اور عمر بھر کے پچھتاوے کا باعث بنی۔

میں نے کباڑیئے سے اس چراغ کی قیمت پوچھی۔ اور اُس نے شاید یہ سمجھ کر کہ میں کوئی ریسرچ اسکالر ہوں "مغل سیاست میں چراغوں کا رول" پر ایک تھیسس لکھ رہا ہوں۔ چراغ کی قیمت پچاس روپے بتا دی۔ لیکن جب اکبر بادشاہ سے نیچے اُتر کر شاہجہاں سے بھی نیچے گرتی پڑتی آخری مغل بادشاہ تک سودے کی بات پہنچی۔ تو قیمت گر کر پچاس روپے سے پچاس پیسے تک آ پہنچی اور سودا طے ہو گیا۔

۳

میری بیوی نے چراغ کا استقبال بڑی سردمہری سے کیا۔ بالکل ایسے جیسے وہ ہر شام میرا استقبال کیا کرتی تھی۔ چراغ دیکھ کر اُس نے طعنہ دیا کہ تمہارا انتخاب ہمیشہ غلط ہوتا ہے۔ تم زندگی میں کبھی کوئی صحیح چیز گھر نہیں لائے۔

میں نے کہا۔ "میں تمہیں لایا ہوں۔ ہندوستان کی کروڑوں عورتوں میں سے منتخب کر کے۔ کیا یہ میرا انتخاب غلط تھا؟"

بیوی کے لئے اس کی تردید مشکل ہو گئی۔

اور پھر اُس نے اِس چراغ میں ایک عجیب خوبی ڈھونڈ نکالی کہ الیکٹرک سپلائی کمپنی کی نالائقی کی وجہ سے جب کبھی بجلی فیل ہو جائے گی۔ تو اس بحران میں چراغ بڑا سود مند رہے گا۔

اس خوبی کو دریافت کرنے کی دیر تھی۔ کہ بیوی کو ایک دم جیسے چراغ سے محبت ہو گئی۔ اُس نے اعلان کیا کہ میں اسے ابھی مانجھ کر شیشے کی طرح چمکا دیتی ہوں۔ میری بیوی کو سگھڑاپے کا مرض لاحق ہے۔ بلکہ اُس کے میکے والے دنیا بھر میں پروپیگنڈا کرتے پھرتے ہیں۔ کہ ہم نے ایک سگھڑ بیٹی ایک نالائق آدمی سے بیاہ دی۔ ورنہ اس نالائق خاوند کا گھر تو آج تک نیلام ہو چکا ہوتا۔ (اور یہ بات پروپیگنڈہ کے باوجود صحیح تھی۔)

مگر جونہی بیوی نے آنگن میں جاکر اُپلوں کی راکھ سے شہنشاہ اکبر کے اس چراغ کو رگڑنا شروع کیا۔ اچانک ایک دہشت ناک سا دھماکا ہوا۔ اور آنگن کی زمین پھٹی، زمین سے دھوئیں کا ایک طوفان اٹھا اور اس دھوئیں میں سے تقریباً پندرہ فٹ لمبا، ساڑھے سات فٹ چوڑا ایک خوفناک مکروہ صورت دیو نمودار ہوا۔ اور گرج کر بولا۔ "اے الہ دین! میں تمہارا غلام ہوں، بتا میرے لئے کیا حکم دیتا ہے؟"

میں اس وقت برآمدہ میں ایک آئینہ کے سامنے کھڑا اپنی داڑھی کے چند تازہ تازہ سفید بال گن رہا تھا۔ دھماکے اور دھوئیں سے گھبرا کر میں اپنی اکلوتی بیوی کی طرف دوڑا۔ جو اس وقت تک دو تین گز دور جا پڑی تھی۔ اور کراہ رہی تھی۔ اور دیو اُس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ سچ مانئے تو میرے اپنے ہاتھ پاؤں اتنے بڑے گھناؤنے دیو کو دیکھ کر پھول گئے تھے۔ لیکن اس خیال سے کہ بیاہ کے وقت میں نے سات پھیرے لئے تھے۔ اور ہر پھیرے میں بیوی کی حفاظت کا عہد کیا تھا۔ میں نے لپک کر بیوی کو اٹھایا اور دیو کی آنکھ بچا کر دیو سے کہا۔ "تم کون ہو؟ کیا چاہتے ہو"

دیو بدستور ہاتھ جوڑے ہوئے گرج کر بولا۔ "میں الہ دین چراغ کا دیو ہوں اور یہ عورت الہ دین ہے اور میں اس کا غلام ہوں۔"

"معاف کیجئے، یہ تو ساوتری دیوی ہے، الہ دین نہیں ہے۔ الہ دین کمہار کا گھر اگلے چوک پر ہے۔ آپ غلطی سے الہ دین کی بجائے ساوتری دیوی کے گھر آگئے ہیں۔"

دیو نے میری تشریح کو کلیتاً رد کرتے ہوئے کہا۔ "میں کچھ نہیں جانتا جس شخص کے پاس یہ چراغ ہوگا وہ الہ دین ہوگا۔ اس لئے یہ عورت بھی الہ دین ہے۔ اس نے مجھے بلایا ہے اور یہ مجھے جو حکم دے گی۔ میں اس کی تعمیل کروں گا۔"

مگر حکم دینے والے الہ دین کی گھگھی بندھ چکی تھی۔ اُس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ اور وہ مارے خوف کے مجھ سے یوں چمٹ گئی تھی۔ جیسے کسی فلمی تھیٹر میں کوئی محبوبہ اپنے عاشق سے چمٹی ہوتی ہے مجھے فوری خطرہ یہ لاحق ہو رہا تھا۔ کہ کہیں میرے بچوں کی اس واحد ماں کا ہارٹ فیل نہ ہو جائے۔ کیونکہ وہ گزشتہ پانچ برس سے ضعف قلب کا شکار تھی۔ اور ڈاکٹر کا آخری بل ادا کئے ہوئے ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے

بیوی کے ہارٹ فیل ہونے کے احساس سے میرا اپنا ہارٹ دھڑکنے لگا۔ اور مجھے شک ہونے لگا۔ کہ میری بیوی کے بیوہ ہونے میں صرف ایک آدھ منٹ کی کسر باقی ہے۔ مگر نہ جانے میری بیوی کے کون سے اچھے کرموں کا پھل تھا۔ کیونکہ میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور دیو سے کہا۔ "جاؤ تمہیں حکم دیا جاتا ہے۔ کہ ڈاکٹر شانتی پرکاش گولڈ میڈلسٹ کو بلا لاؤ۔"

مگر دیو ٹس سے مس نہ ہوا۔ جا کھڑا رہا۔

"جاؤ جاتے کیوں نہیں اے غلام نمک حرام۔"

نمک حرام نے دھمکی دی۔ "جس کے پاس چراغ ہے میں صرف اُسی کا حکم مانوں گا۔ تم کون ہوتے ہو حکم دینے والے۔" دیو کی سماجی سوجھ بوجھ پر مجھے سخت افسوس ہوا۔ اس کم بخت کو تو اتنا بھی معلوم نہیں۔ کہ تم جس کے غلام ہو وہ خود میری غلام ہے۔ جب وہ میرا حکم مان لیتی ہے۔ تو تم کیوں نہیں مانتے۔ لیکن صورت حالات چونکہ انتہائی نازک تھی۔ اور سوشل رشتوں پر بحث و مباحثہ سے میرا اور بیوی کا رشتہ ٹوٹ جانے کا خطرہ تھا۔ اس لئے میں نے فوراً بیوی کے ہاتھ سے چراغ چھین لیا۔ اور اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور کہا۔ "اب میں الہ دین ہوں چراغ میرے پاس ہے۔"

مگر دیو شاید کچھ بااصول واقع ہوا تھا۔ بڑے باوقار لہجہ میں بولا۔ "پہلا حکم پہلے الہ دین کا۔ دوسرے الہ دین کا حکم بعد میں!"

مجبور ہو کر میں الہ دین نمبر ایک کے تلوے ملنے لگا۔ اور کہا۔ "جان من! ہوش میں آجاؤ، خدا کے لئے کوئی حکم دے دو، کوئی سماجی حکم، کوئی اُنٹ شُنٹ اوٹ پٹانگ سا حکم۔"

اور میری بیوی میں نہ جانے کیسے ایکا ایکی ہمت پیدا ہو گئی۔ اور نہ جانے اُس نے مجھ سے کہا یا دیو سے کہا۔ "دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"
اور پھر ایک دم زمین شق ہوئی اور دیو دفع ہو گیا۔

۴

کچھ دن تک ہم میاں بیوی حواس باختہ رہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کہ ہمارے ساتھ یہ کیا سلوک روا رکھا گیا ہے۔ کہ ہم اپنی خالص اور نتھری ستھری محنت کی کمائی کے عادی تھے۔ مگر ہمیں حرام کی کمائی دلانے والا یہ چراغ عنایت کر دیا گیا۔ اس لئے ہمارے حواس کا مختل ہو جانا قدرتی تھا کیونکہ اس سے ہماری عادات و خصائل میں بڑی گڑبڑ کا اندیشہ ہو گیا تھا۔ ہم اپنی نارمل زندگی میں اس امر کے عادی ہو چکے تھے۔ کہ نئی جرابیں نہ خریدی جا سکیں تو پھٹی ہوئی پرانی جرابیں پہننے میں بھی ایک لطف ہوتا ہے۔ ہم اپنے بچوں تک کو یہ سکھا چکے تھے۔ کہ باپ کی پرانی پتلون سے بنائی نیکر پہننا ہندوستانی کلچر ہے۔ اور ہمیں اپنے کلچر کی ہر قیمت پر حفاظت کرنی چاہیئے۔

اس لئے جب الہ دین کے چراغ کے تصور سے ہمیں یہ احساس ہوا کہ ہم تو ایک منٹ میں امیر کبیر بن سکتے ہیں۔ تو ہمارے کلچر کو ایک اچانک صدمہ سا ہوا۔ اور ہم اپنے ہوش اس حد تک گنوا بیٹھے۔ کہ پورا ہفتہ ایک دوسرے سے کھل کر بات بھی نہ کر سکے۔

سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اس چراغ کو کہاں رکھا جائے؟ تاکہ نہ یہ بچوں کے ہاتھ لگے اور نہ اسے چور اٹھا کر لے جائیں۔ اس معاملہ میں چراغ اور بچوں دونوں کو ہم نے ایک ہی سطح پر رکھا۔ اور طے کیا کہ اس کو زمین کے اس حصے میں دبا دیا جائے۔ جہاں بیوی کے طلائی زیورات کا ڈبہ دبا ہوا ہے۔ مگر اس میں ایک قباحت تھی۔ کہ ممکن ہے چراغ نکالنے کی کئی بار ضرورت پڑے اس لئے اسے ٹرنک میں رکھا جائے جہاں پتاجی کی وصیت اور بیوی کے جہیز کی باقی ماندہ نشانیاں اور میری کلب کے خفیہ فوٹو رکھے ہوئے ہیں۔ بڑی مشکل سے بیوی اس بات پر رضامند ہوئی۔ کہ ٹرنک کی دو چابیاں رکھی جائیں۔ ایک میرے پاس رہے اور ایک بیوی کے پاس۔

یہ پہلا واقعہ تھا کہ میرے اور بیوی کے اعتماد کی دیوار میں دراڑ پڑ گئی۔ ورنہ اس سے پہلے ہم دونوں شاستروں کی ہدایات کے مطابق ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ مجھے پہلی بار شبہ ہوا۔ کہ شاستر اور بیوی دونوں ناپائیدار ہیں۔ اور اس چراغ کے ساتھ شاستر کا سورج نہیں چل سکتا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے بیوی سے زیادہ چابی پر یقین آیا۔

چند دن بے معنی طور پر گزر گئے۔

ایک دن میں (چوری چھپے) الہ دین چراغ کا مشہور قصہ میسرز ڈنگا رام بھنگا رام بک سیلر کے ہاں سے خرید کر رات بھر اسے پڑھتا رہا۔ اس کے دوسرے دن جب شام کو گھر لوٹا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بیوی بھی الہ دین کے قصے کی کتاب دوپٹے کے پلو میں چھپائے پڑھ رہی ہے۔

میں نے کہا۔ "کیا پڑھ رہی ہو جانِ من!"

"بھجنوں کی ایک پستک ہے، ایشور بھگتی کے بڑے بڑے سندر گان لکھے ہیں اس میں۔"

میں نے مردانہ جرأت سے کام لے کر کتاب چھین لی۔ "یہ تو الہ دین کا قصہ ہے جناب!" میں نے طنزاً عرض کیا۔

(خطا ہر ہے) بیوی مشتعل ہو گئی۔ بالکل ایسے ہی، جیسے سبزی میں نمک زیادہ پڑ جائے تو اس کا الزام کول ڈپو پر لگا دیتی ہے۔ کہ وہ گیلا ایندھن مہیا کرتی ہے، میں جانتی ہو تمہیں اب مجھ سے محبت نہیں رہی۔ بلکہ اب تم اس نگوڑی کالی کلوٹی چھوکری کے پیچھے گھومتے ہو۔ میں پوچھتی ہوں۔ وہ کیوں آتی ہے ہمارے گھر؟ اب کے آئی تو ٹانگیں توڑ دوں گی اس کی!"

میں نے کہا۔ "دیکھو میری بیوی۔ بھجن اور الہ دین کے درمیان محبت کو مت گھسیٹو! محبت ایک مقدس اور عظیم جذبہ ہے اور میری محبوبہ جمعدارنی کا رنگ کالا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ محبت نہیں کر سکتی۔ باقی رہا ٹانگیں توڑنے کا معاملہ، تو میں اپنی محبوبہ کی ٹانگوں کا تحفظ اب زیادہ معقول طریقے سے کر سکتا ہوں۔ کیونکہ میرے پاس دیو موجود ہے۔"

یہ ایک ایسی کھلی دھمکی تھی۔ جو بہت کم خاوند بہت کم بیویوں کو دے سکتے ہیں۔ عام حالات میں شاید میں یہ کہنے کی جرأت کبھی نہ کرتا۔ بلکہ

اُس کالی کلوٹی چھوکری سے بدستور خاموش اور محفوظ محبت کئے جاتا کہ محبت کی یہ دھڑکن ہمارے کانوں کو بھی سنائی نہ دیتی۔ لیکن جب سے الہ دین کا چراغ میرے قبضہ میں آیا تھا۔ میرے اندر ایک حیرت انگیز تبدیلی آ رہی تھی۔ گذشتہ آٹھ دس نسلوں سے جتنی نجابت، شرافت اور بزدلی میرے ورثے میں آئی تھی۔ وہ میری گرفت سے نکلتی جا رہی تھی۔ اور اس کی بجائے وہ وحشیانہ قوت اور جارحانہ بربریت میرے اندر داخل ہو رہی تھی۔ جو انسان کو بھیڑ، گیدڑ اور گدھا وغیرہ سمجھتی ہے۔ اور اس طرح وہ تاریخی حالات پیدا کر دیتی ہے، جب ایک انسان دوسرے انسان کا اور ایک قوم دوسری قوم کا خون پی کر مورخین کے لئے مواد مہیا کرتی ہے۔

"میں اس چراغ کے اس دیو سے جو چاہے کروا سکتا ہوں!" میں دن بھر حسین ترین خواب دیکھا کرتا۔ "میں اگر چاہوں تو آگرہ کے تاج محل کو اکھڑوا کر اپنے کوچہ گھاسی رام میں نصب کروا سکتا ہوں!" "میں اگر چاہوں تو پورے دہلی شہر کو یہاں سے جزیرۂ انڈیمان میں منتقل کروا سکتا ہوں۔ میرے ہاتھ میں جادو ہے، طلسم ہے، طاقت ہے، دولت ہے، میں عظیم ہوں۔ میں بلند ہوں، میں شہنشاہ ہوں، میرے قدموں پر ساری دنیا جھک سکتی ہے (اس ہندوستانی بیوی کی کیا بساط ہے)"۔

میری بیوی مجنوں کی پتنگ یعنی قصہ الہ دین چراغ کا، میرے منہ پر پٹخ کر اندر چلی گئی۔ معلوم ہوتا تھا۔ اُس کے اندر بھی وہی شہنشاہ جاگ چکا تھا جو میرے اندر جاگ رہا تھا۔ اُس میں بھی وہی وحشیانہ قوت اور جارحانہ بربریت جنم لے چکی تھی۔ جو میرے اندر۔ میرا ماتھا ٹھنکا یہی بیوی کتنی نرم دل، وفادار اور محکوم ذہنیت کی مالک ہوا کرتی تھی۔ لیکن اب یقیناً اُسے یہ بھی احساس ہو چکا ہے کہ الہ دین کا چراغ اس کے پاس ہے۔ اس لئے اس دیو کے مقابلے پر میرے اس فاوند کے سے آدمی کی کیا ہستی ہے: میں تو دیو سے کہہ کر اسے بحر ہند میں ڈبو سکتی ہوں۔

چنانچہ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر چلا گیا۔ اندر جاتے ہی وہ پلنگ پر جا گری۔ اور منہ چھپا کر مظلوم بیویوں کی طرح بسورنے لگی، مگر میں انتہائی طیش میں تھا۔ متاثر نہ ہو سکا۔ ورنہ مظلوم بیویوں کا رونا ہمیشہ رومانٹک لگتا ہے۔ میں نے تیزی سے ٹرنک کے تالے کی چابی گھمائی اور چراغ نکال لیا۔

میرا پروگرام صریحاً یہی تھا۔ کہ دیو کو بلاتے ہی اُسے پہلا حکم یہ دوں گا۔ کہ میری بیوی کو اٹھا کر ماؤنٹ ایورسٹ پہ پھینک آؤ اور واپسی پر میری کالی کلوٹی محبوبہ کو لیتے آنا۔

میں نے جلدی جلدی فرش پہ چراغ رگڑا۔ میں غصے میں اپنے آپ کو پاگل سی محسوس کر رہا تھا۔ لیکن انتہائی دانشمند بھی۔ کیونکہ جس بیوی پر سے اعتماد اُٹھ جائے۔ اُسے اپنے گھر میں رکھنا انتہائی پاگل پن تھا۔

چراغ رگڑا گیا۔

کچھ بھی نمودار نہ ہوا۔

نہ دھواں نہ دیو نہ دھماکا۔

صرف فرش پر ایک ہلکی سی رگڑ کا نشان پڑ گیا۔

شاید چراغ کے رگڑنے میں کوئی ٹکنیکل نقص رہ گیا ہو۔ میں نے سوچا۔ اس لئے دوسری بار میں نے اُسے پوری جوانمردی سے رگڑا یہ ایک ایسی زوردار رگڑ تھی۔ جیسے کوئی بڑھئی آری سے لکڑی چیر رہا ہو۔

مگر دیو اس بار بھی نمودار نہ ہوا۔

یہ دیو کو کیا ہو گیا؟ کمبخت کہیں دوسری جگہ مصروف نہ ہو۔ کہیں ہسپتال میں بیمار نہ پڑا ہو۔ کہیں مجھ سے ناراض نہ ہو گیا ہو۔ مگر الہ دین کے قصے والا دیو کبھی بیمار نہ ہوتا تھا۔ خاصی اچھی ہیلتھ تھی اُس کی۔ شاید وہ اصلی دیو ہوگا۔ اور میرے چراغ والا دیو اُس کا ہندوستانی ایڈیشن ہوگا

قریب قریب مایوس ہو کر میں نے چراغ کو زمین پہ دے مارا۔ کہ وہ ٹوٹتے ٹوٹتے بچا۔ لیکن میرے اس غلام دیو کا جو تاج محل کو اٹھا کر کچھ گھاسی رام میں نصب کر سکتا تھا۔ دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔

میں نے بیوی سے کہا۔ "دیو کیوں نہیں آتا ؟"

اُس نے جل بھن کر جواب دیا۔ "میں کیا جانوں ؟ تمہاری اُس کالی کلوٹی چھوکری سے عشق کرنے میں مصروف ہوگا۔"

یہ طعنہ عین میرے کلیجے میں لگا۔ میرے سارے خواب چکنا چور ہو گئے۔ آج کا دن مجھ پر عدم اعتماد کا دن تھا۔ پہلے بیوی پر اعتماد ٹوٹا۔ اب دیو پر، دونوں میں اخلاق و کردار کی کمی دردناک تھی۔ اب کوئی کس پر اعتبار کرے۔ سچ ہے اس دنیا میں کوئی کسی کا نہیں۔ سب اکیلے ہیں۔ کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا، نہ دکھ میں نہ سکھ میں! ہر دکھ تنہا ہے ہر سکھ اکیلا ہے۔ درد اور بیراگ کی اس کیفیت میں میری عجیب حالت ہوگئی۔ صاف ثابت ہو رہا تھا کہ یہ دنیا صرف مایہ ہے یعنی سرمایہ ہے۔ سرمایہ مردہ باد! انقلاب زندہ باد! دنیا بھر کے دکھی لوگو! تنہا ہو جاؤ، اکیلے ہو جاؤ ایک دوسرے سے الگ ہو جاؤ۔ دنیا بھر کی بیویو! اپنے خاوندوں کے ساتھ دغا کا فراڈ چھوڑ دو، اور اے الہ دین کے چراغ، میری آنکھوں سے دور ہو جا، نہیں تو میں اپنی آنکھیں پھوڑ لوں گا۔

میں رونے لگا۔

بیوی پہلے ہی رو رہی تھی۔

لیکن ہم دونوں الگ الگ وجہ سے رو رہے تھے۔ بچے ہمیں روتا دیکھ کر دوڑے آئے اور وہ بھی رونے لگے۔ اُن کے رونے کی وجہ ہم دونوں سے الگ تھی۔

۵

ایک ہفتہ بعد ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔

میں تو اس دوران میں کچھ شعرا کی غزلیں پڑھ پڑھ کے اپنے گھاؤ مندمل کر چکا تھا۔ میں جو دنیا بھر پر اقتدار قائم کرنے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ ان کی تعبیر کو رُوئی کے ٹکڑوں کی طرح پھینک چکا تھا۔ اور زندگی بے حد نارمل ہوگئی تھی۔ یعنی معمول کے مطابق نہایت عام سے خواب دیکھنے لگا تھا جیسے یہ کہ صاحب سے جھڑپ ہوگئی اور نوکری سے نکال دیا گیا ہوں۔ کالی کلوٹی چھوکری کے ساتھ ایک کونے میں باتیں کرتا ہوا پکڑا گیا ہوں۔ اور پڑوسی کے ساتھ جھگڑے میں تھانے پہنچ گیا ہوں۔ وغیرہ وغیرہ

الغرض ایک ہفتہ پہلے ۱۹۳۶ء کی پرشدہ گھمنڈی جنتری کی جو پیش گوئی صحیح ثابت ہونے لگی تھی۔ اب پھر غلط محسوس ہونے لگی تھی۔ اور میرا غرور قطعی طور پر ٹوٹ چکا تھا۔ اور میں ہر راہ چلتے آدمی کے سامنے جھک کر آداب بجا کر چلنے لگا تھا۔ کہ اس دوران میں ایک عجیب سا واقعہ رونما ہوا۔

اُس رات کو بارہ ایک بجے کے قریب اچانک میری نیند کھل گئی۔ میں نے ایک غلیظ خواب دیکھا تھا۔ کہ ایک کیلا چرانے کے جرم میں خدا کے فرشتے مجھے پکڑ کرلے جا رہے ہیں۔ اور ایک اُبلتے ہوئے کڑھاؤ میں پھینک دینا چاہتے ہیں۔ کڑھاؤ کے قریب پہنچ کر ایک دم میری چیخ نکل گئی۔ اور میں ہڑبڑا کر جاگ اٹھا اور مدد کے لئے بیوی کو پکارا (بیوی کے ساتھ بھی حالات رسمی طور پر نارمل ہو چکے تھے)

مگر بیوی کہاں گئی ؟

وہ اپنی چارپائی پر موجود نہیں تھی۔

ڈر کے مارے پسینہ میں شرابور میں نے گھبرا کر اُسے آواز دی۔ مگر جواب ندارد۔ "ببّو، کندن، بِلّا، شیلا، کملا، غرض گھبراہٹ میں جتنے

بچوں کے نام یاد آسکے اُن سبھوں کو پکار کر پوچھا کہ بتاؤ تمہاری ممی کہاں گئی؟ سب نے سوتے سوتے لاعلمی کا اظہار کیا۔ میرے ذہن میں شک کا سانپ پھنکارنے لگا۔ فوراً اٹھا۔ لپک کر اس ٹرنک کو کھولا۔ جس میں چراغ رکھا تھا۔ مگر چراغ بدستور موجود تھا۔

دوڑا دوڑا چھت پر گیا۔ باتھ روم میں گیا۔ اسٹور روم میں جھانکا، باہر آنگن میں نکل کر نظر دوڑائی تو کیا دیکھتا ہوں بیوی سامنے موجود ہے آنگن کے مشرقی کونے میں نل کے پاس وہ کھڑی تھی۔ اور آہستہ آہستہ شاید کوئی فلمی گیت گنگنا رہی تھی۔ اس کے پاؤں میں بہت سے کرنسی نوٹ بکھرے پڑے تھے۔ وہ بہت سے طلائی گہنے پہنے جیسے دلہن کی طرح جگ مگ جگ مگ کر رہی تھی۔ اور ایک بالکل نئی بیش قیمت ساڑی ہاتھ میں لئے اس پر پیار سے ہاتھ پھیر رہی تھی۔

یا مظہر العجائب! یہ کیا صورت حالات ہے؟

اور پھر میں نے کیا دیکھا۔ کہ نل کی منڈیر پر ایک چراغ رکھا ہے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے دیو کی طرح بیوی سے گرج کر کہا۔

مجھے دیکھ کر وہ ایک دم اُسی طرح گھبرا گئی۔ جیسے پہلی مرتبہ دیو کو دیکھ کر پیلی پڑ گئی تھی۔ بولی: "کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔ کچھ بھی...."

یہ کہہ کر وہ چراغ اٹھانے کے لئے لپکی

میں بھی چراغ کی طرف لپکا۔

اور بیوی کی مشہور و معروف نازک کلائی مروڑ دی۔ اُسے دھکا مار کر دور پھینک دیا۔ اور چراغ اپنے قبضہ میں کر لیا اور کہا مگر سنو شریمتی جی! وہ چراغ تو بدستور ٹرنک میں رکھا ہے۔ یہ دوسرا چراغ کہاں سے آگیا؟"

"میں کیا جانوں؟" بیوی خالص عورتوں والا جواب دے کر بکھرے ہوئے نوٹ سمیٹنے لگی۔

"کیا دیو آیا تھا؟" میں نے ہکلا کر پوچھا۔

"ہوں!"

"کیا یہ زیور اور کرنسی نوٹ اسی کی معرفت منگوائے ہیں؟"

"ہوں!"

میں نے چراغ جیب میں ڈال کر گویا چھپا لیا۔ یقینی بات تھی کہ اصلی چراغ یہی تھا۔ اور ٹرنک والا چراغ نقلی تھا۔ بیوی نے اُس سے ملتا جلتا پیتل کا کوئی چراغ خرید کر ٹرنک میں رکھ دیا ہوگا۔

بیوی کی بے وفائی اور غداری پر میں غصہ سے تھر تھر کانپنے لگا۔ میں نے کہا "اے نمک حرام تمہارے لئے یہ مناسب نہیں تھا!"

وہ بولی: "میرا چراغ واپس کر دو!"

"ورنہ ۔۔۔ ورنہ کیا کرو گی؟" میں نے چیلنج دیا۔

"یہ چراغ میرا ہے!"

"مگر اس وقت میرے قبضہ میں ہے، اور چراغ جس کے قبضہ میں ہو، دیو اسی کا غلام بن جاتا ہے۔ اگر تم نے کوئی چوں چرا کی تو دیو کو بلا کر، تمہارے یہ زیور اور نقدی اور کپڑے سبھی چھنوا سکتا ہوں۔ بولو ۔ بلاؤں دیو کو؟"

بیوی تھر تھر کانپنے لگی۔ ایک منٹ پہلے جو دولت اور طاقت کے نشہ میں آنکھ تک نہیں ملاتی تھی۔ اب میرے پاؤں پکڑے ہوئے گڑگڑا رہی تھی: "میرے سرتاج! میرے پتی دیو، مجھے معاف کر دو۔"

کم بخت، نا ہنجار! تم نے اپنا پتی برتا دھرم توڑ دیا ہے۔ تم نے اپنے جیون ساتھی سے غداری کی ہے۔ صرف چند روپلی سکوں اور زیوروں کی خاطر، تم انسان نہیں ہو! بلکہ... بلکہ.... لومڑی ہو!

میں نے اشتعال میں اسے ایک ٹھوکر لگائی۔ وہ چیخنے لگی۔ میں نے ایک اور ٹھوکر لگائی۔ وہ چیخنے لگی۔

دل نے کہا یہ سنسار جھوٹا ہے۔ رشتے ناطے، جھوٹے ہیں۔ تیاگ دو یہ دنیا توڑ دو یہ ناطے:

اور پھر آخری ٹھوکر مار کر میں نے تیزی سے آنگن کا دروازہ کھولا۔ اور رات کی اتھاہ تاریکی میں گھر سے باہر نکل گیا۔ بیوی پیچھے سے کراہتی ہوئی آواز میں بلاتی رہی۔ لیکن میں نے تیاگ کے راستے پر قدم رکھ دیا تھا۔ اس لئے بگٹٹ بھاگتا چلا گیا۔ اور گھر سے ہمیشہ کے لئے یوں نکل گیا۔ جیسے کوئی جنازہ نکل جاتا ہے۔ اور لاکھ بلاؤ واپس نہیں آتا۔

غلام احمد فرقت

بیسویں صدی۔ دہلی

چندہ

بھیک مانگنے والوں سے چندہ مانگنے والوں تک اور سڑکوں پر دوا بیچنے والوں سے ریل کے ڈبوں میں چنا جور گرم منجن اور چورن بیچنے والوں تک داؤ پیچ اور ہتھکنڈوں کا ایک سلسلہ چلا گیا ہے جنہیں جانے بغیر کوئی شخص اس قسم کا کاروبار کامیابی کے ساتھ نہیں چلا سکتا۔ ان میں چندہ مانگنے والوں کا کام تو اور بھی لوہے کے چنے ہیں، کیونکہ ان میں پاس سے کوئی چیز دیئے بغیر دوسرے سے پیسہ وصول کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس میں چرب زبانی اور قیافہ شناسی کے علاوہ انسانی نفسیات یعنی سائیکالوجی کا سمجھنا ضروری ہے۔ اور بے غیرتی تو بہرحال اس کی لازمی شرط ہے۔ اس میں بڑے پتے ماری اور دل گردوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وہ کوچہ ہے جس کے بارے میں چچا غالب فرما گئے ہیں۔

"گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا"

اگر کسی شخص میں یہ ساری خوبیاں موجود ہیں تو اُسے ساری زندگی چندہ جمع کرنے میں صرف کر دینی چاہیئے۔ چنانچہ "اس چندہ بازی" کے سلسلے میں ایک آپ بیتی ملاحظہ ہو،

ایک دن ہم اور ہمارے دو دوست جو ہماری ہی طرح عرصے سے بیکار تھے، بیٹھے گپ بازی میں مصروف تھے کہ ایک صاحب جو اب ماشاء اللہ چوٹی کے شاعر، ادیب اور قومی کارکن ہیں اور جن سے اُس وقت ہماری بے تکلفی بھی تھی۔ آ گئے اور بولے۔ "اماں۔ کہو، کیا کر رہے ہو؟..." ہم نے کہا۔

"وہی رفتار بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے"

وقت ضائع کر رہے ہیں۔ صبح سے چار پیکٹ سگریٹ اور مبلغ ایک عدد دیاسلائی کا بکس پھونک چکے ہیں۔ اور اب۔

"صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا"

بولے۔ "تو چلو۔ ہم ایک کام دلاتے ہیں۔" ہم نے کہا۔ "مگر کام تو آج تک ہم نے کوئی کیا ہی نہیں؟ اس لئے پہلے کام کی نوعیت بتاؤ۔" بولے "کام وہ ہے جس میں ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔" ہم نے کہا۔ "شہتیر تو نہیں اٹھواؤ گے؟" بولے۔ "بالکل نہیں۔" دوسرے صاحب بولے۔ "سڑک کی بجری تو نہیں کوٹنا پڑے گی؟" بولے۔ "نہیں۔" تیسرے صاحب نے پوچھا "گرہ کٹی؟" بولے۔ "تقریباً ایسا ہی نہیں۔ مگر اس سے کچھ ملتا جلتا کام ضرور ہے۔" ہم نے کہا۔ "ترسا کیوں رہے ہو بتاتے کیوں نہیں؟" بولے۔ "ذرا چھری کے نیچے دم لو۔" اس کے بعد سگریٹ کا ایک لمبا کش لیتے ہوئے بولے۔ "بھائی! بات یہ ہے کہ ہم لوگ چندہ سے ایک مشاعرہ کر رہے ہیں۔ اور اس کے لئے چندہ جمع کرنا ہے۔" اس پر ہم نے کہا، کہ اس کے

معنی یہ ہیں کہ آج کل آپ بھی ہماری طرح بیکار ہیں۔ بولے۔ ایسا تو نہیں ہے۔ میں اس کا باتنخواہ سکریٹری ہوں۔ ہم نے کہا۔ خیر تمہارا معاملہ تو ٹھیک ہے۔ مگر ہم لوگوں کی کیا پوزیشن ہوگی؟ بولے۔ یہی، جو اس وقت ہے۔ ہم نے کہا۔ یعنی چندہ جمع کرنے کے بعد بھی مفلس کے مفلس رہیں گے۔

بولے۔ روپیہ وصول ہوگیا تو روزی نہیں تو روزہ۔ پچاس پچاس فی صدی بے کاری اور باکاری کے امکانات ہیں مگر چندہ وصول ہونے پر پچیس فی صدی کمیشن گلے گلے پانی تک ملے گا۔

ہم نے کہا چندہ وصول نہ ہونے کی صورت میں کیا پوزیشن رہے گی؟ بولے۔ کھانا پینا اور جیب خرچ ہمارے ذمّے۔

ہم نے کہا۔ زیادہ امکانات تو چندہ نہ ملنے ہی کے ہیں۔ بولے۔ یہ بات نہیں کیونکہ جو صاحب یہ مشاعرہ کر رہے ہیں ان پر عوام کو بہت اعتماد ہے۔ اس لئے چندہ نہ ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شہر کے لئے انتظام ہوگیا ہے اب قریب کے دو شہروں میں کام کرنا ہے۔ امید ہے وہاں سے بھی کافی چندہ جمع ہو جائے گا۔ لیکن روانگی سے قبل آپ حضرات کو اس سلسلہ میں کچھ باتیں نوٹ کرانا ضروری ہیں۔ کیونکہ چندہ لینے سے پہلے کچھ داؤں پیچ دکھانا ہوتے ہیں اس کے بعد کہیں حرف مدّعا زبان پر لانا ہوتا ہے۔ اس پر ہمارے دوست بولے۔ پھر اس کا ریہرسل کیوں نہ کر لیا جائے؟ بولے جی ہاں۔ روانگی سے پہلے کان دھر کر سن لیجئے کہ سب سے پہلے تو آپ کو یہ دیکھنا ہوگا کہ جس کے پاس آپ گئے ہیں اور جس سے آپ مخاطب ہیں۔ اس کی مزاجی کیفیت کیا ہے؟ مقصد یہ کہ وہ اپنی بیوی ریوی سے لڑ کے تو نہیں بیٹھا ہے۔ اگر اس کا پتہ چل جائے تو مناسب ہے آپ ایسے کیس کو چھوڑ دیں کیونکہ اس سے بات کرنے میں خطرہ ہے۔ ایسے لوگ اگر دھوبی سے نہیں جیت پاتے تو گدھے کے کان اینٹھنے پر اتر آتے ہیں۔ دوسری بات یہ دیکھنا ہوتی ہے۔ آپ جس شکار کی خدمت میں روانہ ہوئے ہیں اس کا لباس اور شکل و صورت کیسی ہے؟ مثلاً آپ کسی داڑھی زدہ کے پاس گئے ہیں تو آپ کو داڑھی کی افادیت پر گفتگو کرنا ہوگی۔ اگر داڑھی خضاب زدہ ہے تو خضاب کی خوبیوں پر روشنی ڈالنا ہوگی اور دو چار ایسے خضابوں کے نام گنانا ہوں گے جن سے زندگی بھر کے لئے بال سیاہ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر وہ شخص تہمد باندھتا ہے تو تہمد کی تاریخی اہمیت اور اس کے باندھنے والے کی صحت اور بعض رشی اور صوفی بزرگوں کے تہمدوں کی خوبیوں کا ذکر کرنا ہوگا اور آخر میں اسے پانی پلاتے پلاتے چندہ تک لانا ہوگا۔ یاد رکھئے کہ آخر میں آپ کو نہایت رقّت آمیز لہجے میں اپنی تان چندے پر توڑنا ہوگی۔ اب یوں سمجھ لیجئے کہ جیسے آپ کو کسی ادبی کانفرنس کے سلسلہ میں چندہ لینا ہے اور آپ ایک ایسے صاحب کے پاس گئے ہیں جو نیا جوتا پہنے بیٹھا ہے تو آپ علیک سلیک اور مزاج پرسی کے بعد کلام کو دلچسپ بنانے کے لئے کہہ سکتے ہیں کہ "صاحب محاورات بھی بعض اوقات مزہ دے جاتے ہیں۔ اب دیکھئے نا! جوتوں کے بارے میں وضع کرنے والوں نے کیا کیا محاورات وضع کر دیئے ہیں۔ جوتا چلنا۔ جوتے چرانا۔ جوتیوں میں دال بٹنا۔ جوتے کھانا وغیرہ وغیرہ" اس کے علاوہ مخاطب کو شاعروں اور ادیبوں سے کتنی ہی نفرت کیوں نہ ہو، آپ کو اس کی ادبی خوبیوں کی ایسی تعریف کرنا ہوگی کہ وہ خود اپنے بارے میں شک و شبہ میں مبتلا ہو جائے۔ مثلاً اگر وہ کہے کہ میں اخبار پڑھنا تضیع اوقات سمجھتا ہوں تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہاں صاحب اب آپ تضیع اوقات نہ سمجھیں گے تو کیا ہم سمجھیں گے آپ جوانی میں اتنے اخبارات پڑھے بیٹھے ہیں کہ اب آپ کو اس ضعیفی میں اخبار پڑھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اگر وہ کہیں کہ میں رسائل اور میگزین پر روپیہ نہیں ضائع کرتا تو آپ فوراً کہیں کہ آج کل کے غیر معیاری رسائل اسی قابل ہیں کہ ان پر لعنت بھیجی جائے۔ مگر حضور! گستاخی معاف۔ آپ کے بارے میں ایک صاحب نے ایک ایسی بات کہی ہے کہ کم از کم میں تو آپ کی درویشی اور پیغمبری کا قائل ہوگیا۔ لیکن وہ کہتے تھے کہ ہرگز انہیں اطلاع نہ ہو ورنہ وہ بگڑ جائیں گے۔ کہتے تھے کہ صاحب وہ تو رسائل اور تعلیمی و ثقافتی اداروں کی اس طرح مدد کرتے ہیں کہ ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ کی خبر نہیں ہونے پاتی لہٰذا حضور! فارسی شاعر نے آپ جیسے لوگوں کے لئے غلط نہیں کہا ہے کہ

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش   من انداز قدت را می شناسم

اور اس کے بعد جیب سے سگریٹ کا ڈبیہ نکال کر پیش کرنا ہوگی یا اور کچھ نہیں تو مکان کی صفائی ستھرائی اور ماحول کی خوبیاں بیان کرنا ہوں گی۔

خواہ وہ کسی گھونسے ہی پر کیوں نہ واقع ہو۔ اتفاق سے باتوں کے دوران میں اگر صاحب خانہ کا کوئی گول مٹول سا بچہ کہیں دور کھیلتا دکھائی پڑ جائے تو آپ انجان بن کر باتوں باتوں میں پوچھ سکتے ہیں۔ کیوں صاحب! کیا آپ نے اپنے گھر کا کچھ حصہ کسی انگریز کو کرایہ پر دے رکھا ہے اور جب وہ انکار کریں تو آپ نہایت سنجیدگی سے ایک عدد جھوٹی قسم کھا کر کہیں کہ صاحب! ابھی ابھی آپ کے صحن میں ایک انگریز کا بچہ دکھائی پڑا تھا۔ اگر موٹے تازے ہوں تو تندرستی بزلہ نعمت ہے جیسے موضوع پر گفتگو شروع کر دیجئے۔ اگر دبلے پتلے ہوں تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ۔۔۔" رستم سہراب، اور اسفندیار بھی بظاہر آپ ہی جیسے دبلے تھے مگر طاقت یہ تھی کہ خدا کی پناہ اللہ ہم جیسے کمزوروں کو ان کے قہر سے بچائے۔ مگر چونکہ آپ کو بہت سے لوگوں کے پاس جانا ہے۔ اس لئے ہر ایک کو کم سے کم وقت دینا ہوگا۔

ان تمام وصیتوں اور ہدایتوں کے بعد وہ ہمیں قریب کے ایک شہر میں لے گئے۔ وہاں کے بعض رئیسوں اور ٹھیکیداروں کے نام پتے ولدیت اور مزاجی کیفیت کا کارڈ پہلے سے اُن کے پاس موجود تھا۔ روانگی سے پہلے ہمارے ایک دوست بولے! ایسا کیجئے کہ اچھے قسم کی سگریٹ کے دو ٹن خرید لیجئے۔ تاکہ چندہ مانگنے سے قبل چندہ دینے والے کو پٹانے اور رام کرنے کے لئے انہیں کام میں لایا جاسکے۔ ایک صاحب بولے کہ بھائی ایک ایک سگریٹ پی کر دیکھ لو۔ ایسا نہ ہو کہ پرانی سگریٹ ہو اور تمباکو خراب ہو۔ چنانچہ گولڈ فلیک کے دو ٹن خرید لئے گئے اور ایک ٹن کاٹ کر سب نے ایک ایک سگریٹ کی بانگی لی۔ اسٹیشن پہ پہنچنے پر ہمارے ایک دوست بولے۔ دیکھئے، ٹکٹ فرسٹ کلاس کے لے لیجئے گا کیونکہ تھرڈ اور سکنڈ کلاس میں اول تو جگہ ہی نہیں ملتی دوسرے ممکن ہے کہ فرسٹ کلاس ہی میں دو چار کیس مل جائیں قومی کارکن صاحب راضی ہوگئے۔ ٹرین میں بیٹھنے کے بعد ہمارے مقابل کی سیٹ پر ایک سوٹڈ بوٹڈ صاحب بیٹھے تھے جن کا شیو کچھ بڑھا ہوا تھا۔ ان کو دیکھ کر ہمارے دوسرے دوست بولے صاحب میر تقی میر کے ایک شعر کی کسی شاعر نے کیا خوب پیروڈی کی ہے فرماتے ہیں۔

بڑھتے بڑھتے بڑھے گی داڑھی   داڑھی ہے کوئی ہنسی نہیں ہے

اس پر باقی تینوں صاحبان نے تعریف شروع کر دی اور وہ صاحب جو سامنے بیٹھے تھے۔ ہم لوگوں کی ہنسی میں شریک ہو کر بولے۔ معاف کیجئے گا۔ دو روز سے سفر میں تھا اس لئے شیو بنانے کا موقعہ نہیں ملا۔ آپ لوگ شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست بولے "شاعر تو خیر کیا ہیں لیکن اسی سے ملتا جلتا ایک کام کرنے یعنی ایک آل انڈیا مشاعرہ کے لئے چندہ جمع کرنے جارہے ہیں۔ تیسرے صاحب بولے۔ یہ کیا بدمذاقی آپ فرمارہے ہیں آپ انہیں کوئی بڑھیا شعر سنا دیجئے آپ کے چندے ونسے سے انہیں کیا واسطہ؟ اس پر ہمارے دوست ان صاحب سے مخاطب ہوئے۔ حضور! ایک دوسرے شاعر نے شراب کے بارے میں کیا خوب کہا ہے ؎

میں نے پکڑی تھی کہ ساقی نے کہا جوڑ کے ہاتھ   آپ للہ چلے جائیے مے خانے سے

واہ، واہ کے شور سے ٹرین کی چھت اڑی جارہی تھی کہ ایک صاحب جو چہرے سے کسی شراب خانے کے منیجر معلوم ہوتے تھے اور ایک صاحب کو مختلف صوبوں میں شراب کی خرید و فروخت کے اعداد و شمار بتا رہے تھے، اس شعر کو سن کر سامنے والی سیٹ پہ شعر و شاعری سے لطف لینے آگئے، اور بولے یہ شعر جو آپ نے ابھی پڑھا تھا ایک بار پھر پڑھ دیجئے۔ ہمارے دوست اس شعر کو ترنم سے پڑھنے میں مصروف ہی تھے کہ شیو زدہ صاحب نے اپنے بٹوے سے ایک دس روپے کا نوٹ نکال کر پیش کرتے ہوئے کہا "یہ حقیر چندہ میری طرف سے قبول کیجئے"۔ اور جس وقت ہمارے قومی لیڈر صاحب اس کی رسید بنا کر دے رہے تھے تو سامنے کی صف میں ایک صاحب سے جن کی چندیا بالکل ٹینس لان بنی ہوئی تھی مخاطب ہو کر ہمارے دوسرے دوست نے کہا، حضور یہ شعر سنئے شاید کسی قابل ہو اور کام آسکے۔ اس پر ہمارے دوسرے ساتھی بولے کہ صاحب یہ کام آسکنے کی بھی آپ نے خوب کہی گویا آپ کو ہر شخص چندہ ہی دیتا رہے گا۔ انہوں نے بغیر جواب دئے ایک تان مار کر جھوم جھوم کر پڑھنا شروع کر دیا۔

ٹیپ جو اس نے جھاڑ دی کس کے ذور ناز میں   برق سی اک چمک گئی میرے سر نیاز میں

اس پر واہ واہ کا شور ختم نہیں ہوا تھا کہ ایک صاحب کو جن کی سفید داڑھی تھی اور چہرے سے کچھ صوفی منش معلوم ہوتے تھے، اور سامنے اوپر کی برتھ پر

جاگا نیندی کی حالت میں تھے مخاطب کرکے ہمارے دوست نے کہا کہ یہ شعر بھی کیا حسب حال ہے۔

سنکھ بجا کے سو گیا دیر کا پاسباں اُدھر ۔۔۔ شیخ کو دیکھئے اِدھر اونگھ گیا نماز میں

اس شعر پر ابھی قہقہے لگ ہی رہے تھے کہ ایک لالہ صاحب، جو نیچے کی پوتھی برتھ پر استراحت فرما رہے تھے۔ اور ران کا زکر انگ پچھے سے مکھیاں جھل رہا تھا۔ اور لالہ صاحب بھی کبھی کبھی ہم لوگوں کے اشعار پر دانت نکال دیتے تھے کی طرف اشارہ کرکے میں نے کہا کہ بھائی اسی بحر اور قافیہ ردیف میں یہ شعر بھی خاصا کام کا معلوم ہوتا ہے۔ اس پہ لالہ صاحب نے کہا سنایئے۔ سنایئے۔ میں نے عرض کیا

نیں کہاں ہے دیکھئے عشق کے مرتبے یہ ہیں ۔۔۔ مکھیاں جھل رہا ہوں میں، یار ہے خواب ناز میں

واہ! واہ کا شور ابھی ختم بھی نہ ہوا تھا کہ اسٹیشن آگیا۔ جب ہم لوگ شعر سنانے میں مصروف تھے ہمارے ایک ساتھی نے بیرے کو نہ جانے کس وقت اشارہ کر دیا اور وہ توس مکھن چائے اور دو تین پلیٹوں میں کئی طرح کے حلوے اور مٹھائیاں لے کر آگیا۔ ایک صاحب چائے بنا کر تقسیم کرنے لگے اور ہم نے چائے کی پیالیاں اور پلیٹیں تمام بیٹھنے والوں میں ایک ایک کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیں۔ اس کے بعد گاڑی ہمارے دوست کے گنگنانے ہی کی حالت میں چل دی۔ اتنے میں وہ اوپر والی برتھ کے صاحب بولے "اس کی رسید کاٹ دیجئے"۔ اور ہمارے قومی کارکن صاحب جب اللہ سے پانچ روپے کا نوٹ حوالے کر رہے تھے تو ہمارے دوسرے ساتھی ایک صاحب کو جو جانگھیا پہنے "صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں" والی حالت میں آدھی آنکھیں کھولے اور آدھی بند کئے دھیمے سروں میں خراٹے لے رہے تھے دیکھ کر بولے۔ منظر کشی کا ایک شعر پیش کرتا ہوں ملاحظہ ہو ؎

افسوس کہ دنیا سے سفر کر گئے بدھو ۔۔۔ آنکھیں تو کھلی رہ گئیں اور مر گئے بدھو

واہ وا اور قہقہوں میں سونے والے صاحب کی آنکھ کھل گئی۔ اور ہمارے دوست جھوم جھوم کر پھر اس شعر کو مکرر پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ اتنے میں جس جگہ ہم کو جانا تھا، وہ اسٹیشن آگیا اور جب ہم لوگ ڈبے سے اتر رہے تھے تو ایک صاحب جو اونگھنے والے صاحب کے بائیں جانب بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ قومی کارکن صاحب کی طرف ایک روپیہ کا نوٹ بڑھاتے ہوئے بولے۔ یہ چندہ میری طرف سے قبول فرمایئے۔ رسید کی ضرورت نہیں!

شہر میں جہاں جہاں ہم لوگ گئے اور جس قدر کامیابی ہوئی اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ جب واپسی پر ہم لوگ اسٹیشن کے ریسٹوران میں پانچویں مرتبہ چائے پینے بیٹھے تو قومی کارکن نے مردہ آواز میں کہا "ذرا سوچ سمجھ کر آرڈر دیجئے گا کیونکہ اس چائے کے دام ہمیں اپنی گرہ سے ادا کرنے پڑیں گے۔!!"

علی سردار جعفری

منشور کراچی۔

تن کی چاندی، من کا سونا

ہم نے بیچی تن کی چاندی
ہم نے بیچا من کا سونا
آنکھ کے ہیرے
ہاتھ کے دریا
بازاروں میں لے کر نکلے
پھر بھی مفلس اور کنگال
اور انہوں نے
ہم سے خریدی تن کی چاندی
ہم سے خریدا من کا سونا
چھین لئے آنکھوں کے ہیرے
پی لئے ہاتھوں کے دریا
اور کہلائے

صاحبِ دولت، صاحبِ مال
لیکن اک دن
تن کی چاندی
من کا سونا
آنکھ کے ہیرے
ہاتھ کے دریا
سب واپس آجائیں گے
اور زمانہ ہوگا نہال
اور دنیا ہوگی خوشحال
شامِ تمنا رنگیں ہوگی
روشن ہوگی صبحِ جمال

مصطفیٰ زیدی

نئی قدریں - حیدرآباد

حال احوال

ایک اکیلے ہم ایسے جو آدھی رات ڈھلے
چھوڑ کے کاہکشاں کا رستہ انگاروں پہ چلے

سچّائی کی منزل جگ مگ جگمگ کرتی ہے
لیکن اُس تک کیسے پہنچیں راہ میں آگ جلے

عہدوں کے وہ پودے آئے کچھ لوگوں کے ہاتھ
صبح کو جن کا بیج لگے اور شام کے وقت پھلے

کیسے کیسے سنگھاسن لے کر بیٹھ گئے عیار
مُلاّ، پنڈت، ڈاکو، افسر ایک سے ایک بھلے

کوئی خرد کی محفل کے اقوال و کمال بتائے
کوئی بزمِ جمال سجاتے جام پہ جام ڈھلے

اک پرچم کا نشاں کبوتر، اور اک کا شہباز
وہی زمیں کے خون کے پیاسے ہر پرچم کے تلے

انسانوں کے لُطف کے پیچھے رُوتی ہوئی تاریخ
ظلم کی تلواروں کے نیچے مظلوموں کے گلے

زیدی اب سنیاسی بنکر ہم لے لیں بن باس
ماتھے پر سیندور لگائے منہ پر راکھ ملے

عبدالعزیز خالد

سیپ۔ کراچی

کفِ گلفروش

ابر و باراں کو پپیہا ترسے
عاشقِ نورِ سحر ہے سرخاب
چاند کے جلوے کا دیوانہ چکور
ایک دوجے کے لئے ہم بے تاب

(۲)

شام ہو گی تو میں، در وازہ کھلا،
چھوڑ کے راہ تکوں گا اُس کی
مرے خوابوں میں ملاقات کا جس
دشمنِ جاں نے کیا تھا وعدہ

(۳)

اس انتظار میں کہ خواب میں
تم آؤ گی!
میں ساری رات جاگتا رہا

(۴)

ترکِ مے ممکن ہے ترکِ عشق بھی
شاعری لیکن ہے میری زندگی

(۵)

اقلیمِ شراب و عشق و بربط،
کے بدلے کبھی نہ میں قبولوں!
ملکِ فرعون و مالِ قارون

(۶)

میں خالدِ آخر الزماں ہوں

رات

قمر جمیل

میری تمناؤں کا طاؤس تھا
چاند کبھی شہر کا فانوس تھا

آج کسی درد کا ہم راز ہے
رات کسی روح کی آواز ہے

آج تمنا سے نہ فریاد سے
میری پلک نم ہے تری یاد سے

آنکھ ستاروں کو اڑاتی نہیں
رات ہواؤں کو سلاتی نہیں

میری طرح آپ کبھی رات کو
دیکھئے بکھرے ہوئے حالات کو

سیپ - کراچی

کتب خانے میں...

بلراج کومل

کسی لمحۂ بے اماں سے لپٹ کر
مری ایک دیرینہ اُلجھن نے
اک روز
مجھ سے کہا تھا
"مرے زخم ہائے دریدہ کا کچھ تو
مداوا کرو تم"

یہاں اک ہجومِ پریشاں
مجھے اس طرح سے ملا تھا
کہ میں ان کا برسوں کا کھویا ہوا
کوئی دشمن تھا، کمزور، تنہا
مجھے گھیر کر
اس ہجومِ پریشاں نے یوں نوچ ڈالا
کھلونا تھا میں جیسے، بے جان مردہ

کہاں میری اُلجھن؟
کہاں جستجو چارہ سازوں کی باقی؟

یہاں سو برس بعد
میرا فسانہ
لکھے گا سسکتا ہوا کوئی لمحہ

ادبی دنیا - لاہور

عبدالحمید عدم

تمنا تو خیر کیا ہے کہ سیلِ رواں ہوں میں
یہ سوچنے کی بھی نہیں فرصت کہاں ہوں میں
مجھ کو مری وفا نے مرتّب نہیں کیا
تیرے ستم کی لکھی ہوئی داستاں ہوں میں
یزدان و اہرمن کو نہیں اب مجالِ شر
دونوں کو اس کا علم ہے کیوں درمیاں ہوں میں
دیکھی ہیں جب سے تیرے بدن کی بشاشتیں
بت خانۂ مجاز میں محوِ اذاں ہوں میں
مجھ کو کبھی لے چلو مرے اصلی مقام تک
اے قاتلو فریفتۂ امتحاں ہوں میں
ڈھانپا ہے میں نے غم کو لباسِ نشاط میں
دنیا سمجھ رہی ہے بہت شادماں ہوں میں
میں تو نہیں ہوں مجھ کو یقیں ہے نہیں ہوں میں
تو خود تلاش کر کے بتا دے کہاں ہوں میں
ہنس تو پڑا ہوں عالمِ وحشت میں اے عدم
محسوس ہو رہا ہے مگر نوحہ خواں ہوں میں

ہم قلم کراچی

خلیل الرحمٰن اعظمی

سیپ۔ کراچی

کہوں یہ کیسے کہ جینے کا حوصلا دیتے
مگر یہی کہ مجھے غم کوئی نیا دیتے
شبِ گزشتہ بہت تیز چل رہی تھی ہوا
صدا تو دی پہ کہاں تک تجھے صدا دیتے
کئی زمانے اسی پیچ و تاب میں گزرے
کہ آسماں کو ترے پاؤں پر جھکا دیتے
یہ سکتے لوحِ جبیں پر ہے داغِ رسوائی
زمانے والے ہمیں خاک میں ملا دیتے
ہوئی تھی ہم سے جو لغزش تو تھام لینا تھا
ہمارے ہاتھ تمھیں عمر بھر دعا دیتے
بھلا ہوا کہ کوئی اور مل گیا تم سا
وگرنہ ہم بھی کسی دن تمھیں بھلا دیتے
کوئی ہو لمحۂ فرصت کہ بیٹھ کر ہم بھی
ذرا عروسِ تمنا کو آئینا دیتے
زباں پہ کس لیے یہ حرفِ ناگوار آتا
ہمارے زخم ہمارا اگر پتا دیتے
ملا ہے جرمِ وفا پر عذابِ مہجوری
ہم اپنے آپ کو اس سے کڑی سزا دیتے
ذرا سی دیر ٹھہرتی جو گردشِ ایام
اسے شبابِ گریزاں کا واسطا دیتے

صبا اکبرآبادی — نئی قدریں حیدرآباد — احمد ہمدانی — ہم قلم۔ کراچی

ملتا ہے جب تو کیوں مجھے پہچانتا نہیں
یہ راز کوئی میرے سوا جانتا نہیں

ہم آپ سے خفا ہیں حقیقت ہے یہ مگر
ہم آپ سے خفا ہوں یہ دل مانتا نہیں

جو خوب جانتا تھا مجھے وہ زمانہ ساز
ایسے ملا کہ جیسے مجھے جانتا نہیں

آنکھوں میں بس گئی ہیں کسی کی تجلیاں
اب پردہ درمیاں میں کوئی تانتا نہیں

کس کو وکیلِ حشر کروں کشمکش میں ہوں
تیرے سوا کوئی مجھے پہچانتا نہیں

پڑ جاتے پائے اہلِ طلب میں ہزار زخم
دل خاکِ کوئے دوست اگر چھانتا نہیں

سمجھے گا آدمی کو وہاں کون آدمی
بندہ جہاں خدا کو خدا مانتا نہیں

یہ جستجوئے شوق بھی کیا خوب ہے صبا
اُس کی تلاش ہے جسے پہچانتا نہیں

دکھوں کی بات میں ہر لمحہ تازگی کیسی
ہم اُس گلی سے اٹھا لائے یہ خوشی کیسی

صدا نہیں تو کوئی گونج ہی صداؤں کی
فضا میں آج یہ پھیلی ہے خامشی کیسی

جلے ہیں دُور کہیں درد کے دیے شاید
ہمارے گھر تلک آئی یہ روشنی کیسی

ردائے خواب میں لپٹے ہوئے سے دیوانے
تمھارے شہر کی صورت یہ ہو گئی کیسی

ہمارے واسطے خوئے ملال کیا کم تھی
عطا ہوئی یہ زمانے کی دشمنی کیسی

زباں پہ حرفِ تمنا ہے رنج کاہے کا
ابھی سے لہجے میں آئی فسردگی کیسی

کرشن موہن — تحریک۔ دہلی

دنیا تو آخر دنیا ہے، کوسے گی، الزام دھرے گی
اپنے چاہنے والوں کو بھی زموہی بدنام کرے گی
میرا من تھا کتنا چنچل، اندھیارے کو سمجھا کاجل
دھیان کہاں تھا عقل کی مایا پلکوں کی چھایا سے ڈرے گی
ایسا وقت بھی آنے کو ہے جس میں اجیارا جیتے گا
بیت کی نرمل جوت جلے گی، نفرت اپنی موت مرے گی
مست پون چلتی ہے بن بن، گلشن گلشن، آنگن آنگن
پیار بھرا ہے اس کا جوبن، پیار کیا ہے، پیار کرے گی
پیار کی جوت ہو تیرے اندر تو سارا سنسار ہے مندر
بیرن دھوپ بھی کومل چھایا بن کر تیرے من کو ہرے گی
اس بیری سنسار میں کچھ دن پیار کا اک اوتار آیا تھا
جس کے برہ میں سندر رچنا لندن ٹھنڈی آہیں بھرے گی
جس کا تن تھا موہت بھوگی، جس کا من رمتا جوگی
اک البیلا شاعر جس کو دنیا برسوں یاد کرے گی

اطہر نفیس — سیپ۔ کراچی

نہ منزل ہوں نہ منزل آشنا ہوں
مثالِ برگ اُڑتا پھر رہا ہوں
وہ ایسا کون ہے جس سے بچھڑ کر
خود اپنے شہر میں تنہا ہوا ہوں
مری آنکھوں کے خشک و تر میں جھانکو
کبھی صحرا کبھی دریا نما ہوں
چمن میرا نہیں پھر بھی چمن میں
میں تنہا رنگ و نکہت آشنا ہوں
نہ جانے کس لیے ہے ناز مجھ کو
نہ تجھ سا ہوں نہ تجھ سے کچھ سوا ہوں
مرے انفاس کی توقیر کرنا
بڑی مشکل میں میں زندہ ہوا ہوں
ہوائے کوئے جاناں ملتفت ہے
سو اپنے رنج کہنے آ گیا ہوں
سلا دو اے ہواؤ اب سلا دو
بہت راتوں کا میں جاگا ہوا ہوں

تمہید الاسلام سید

افکار۔ کراچی

شام غربت کو سحر کہتے ہیں
ہم کہ ویرانے کو گھر کہتے ہیں

روز و شب روح میں تحلیل ہوئے
وقت کو گردِ سفر کہتے ہیں

تو بہ تو پھول کھلاتی ہے بہار
ہم اسے حسنِ نظر کہتے ہیں

نہ یہ آکاش نہ دھرتی ہوگی
سہمے سہمے سے کھنڈر کہتے ہیں

کتنی صدیوں کی دکھاتی ہے جھلک
آنکھ کو شیشہ نگر کہتے ہیں

جسم ہے جیسے مہکتا ہوا پھول
سرخیِ لب کو شرر کہتے ہیں

ہر قدم کانٹے بچھے ہیں تمہید
ہم اسے راہ گزر کہتے ہیں

تاب اسلم

افکار۔ کراچی

ہر جانب سے رنگ برنگے پتھر برسے
جب بھی گزرا ہوں میں تیری راہ گزر سے

یہ کس بھولے بسرے خواب کی پرچھائیں ہے
دیتی ہے جو مجھ کو آوازیں چاند نگر سے

ماہ و انجم بن کر چمکا خاک کا ذرّہ
کیا کیا نکھرا ہوں تیرے حسنِ نظر سے

کون سا مہماں، خانۂ دل میں رات آیا تھا
لپٹ لپٹ کر روتا ہوں دیوار و در سے

یادوں کے ساحل پر بیٹھا سوچ رہا ہوں
موجِ ہوا کی صورت تم آؤ گے کدھر سے

دل سے چل کر موتی پلکوں تک آ پہنچے
لو یہ طوفاں بھی گزرا اپنے سر سے

کہتے ہیں اک ہنگامہ ہے بازاروں میں
آؤ تھوڑی دیر کو نکلیں ہم بھی گھر سے

شہر کا شہر نظر آتا ہے بیگانہ سا
جب سے لوٹ کے آیا ہوں میں تاب سفر سے

م م راجندر

ہم قلم ۔ کراچی ۔

بیس[۲۰] برس پہلے اُردو کے رسالے

بیس سال کا عرصہ قوموں کی ادبی زندگی میں کوئی بڑا عرصہ نہیں ہوتا لیکن بعض مرتبہ وقت کی ایک دو دہائی ہی ایک ایسا دلچسپ اور اہم مطالعہ مہیا کر دیتی ہیں کہ ان پر ایک طائرانہ نظر بھی دو مختلف صدیوں کو ملاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اور ہم اپنے آپ کو ایک ایسے پل پر کھڑا پاتے ہیں جہاں سے ہم ایک منزل سے دوسری منزل کو دیکھ سکتے ہیں، وہ منزل جو ہم چھوڑ آئے ہیں اور وہ منزل جس پر ہم پہنچ گئے ہیں۔ اردو ادب میں گزشتہ بیس برس ایسی ہی دو دہائیاں ہیں۔

تقریباً بیس برس پہلے یعنی ۴۲ ۔ ۱۹۴۰ء کے گرد و پیش اردو ادب ایک شاندار دور میں سے گزر رہا تھا۔ ۱۹۳۶ء کی ادبی تحریک نے، اس کے مقاصد سے قطع نظر، ہمارے ادیبوں کے ذہنوں کو جھنجھوڑ دیا تھا اور نئے ادیبوں کی ایک بڑی تعداد بڑے جوش و خروش سے لکھنے میں مصروف تھی۔ اس دور کو صحیح معنوں میں اردو ادب کا رومانی دور کہا جا سکتا ہے۔ ہمارے ادیب اور شاعر پرانی روایتوں کو چھوڑ کر ہیئت، موضوع اور تکنیک کے نئے نئے تجربے کر رہے تھے۔ یہ نیا ادب جتنی تیزی اور کثرت سے ہمارے پڑھے لکھے نوجوان کو متاثر کر رہا تھا۔ اس کی مثال اردو میں اس سے پہلے نہیں ملتی، اس کا ایک براہ راست نتیجہ یہ ہوا کہ کتابیں اور رسالے کثیر تعداد میں شائع ہونے لگے۔ مگر جہاں تک معیار کا تعلق ہے، اعلیٰ پائے کے ادبی رسالے اس دور میں بھی گنے چنے ہی تھے۔

دہلی کے "ساقی" کانپور کے "زمانہ" بمبئی کے "نیا ادب" بھوپال کے "افکار" لکھنؤ کے "نگار" آگرہ کے "شاعر" اور لاہور کے "ادبی دنیا"، "ہمایوں" "ادب لطیف" "شاہکار" "نیرنگ خیال" اور "عالمگیر" کا شمار اس وقت کے معیاری ادبی رسائل میں ہوتا تھا۔ یہ سب کے سب رسالے اپنے اپنے مدرسۂ فکر سے وابستہ تھے اور ادب میں ایک خاص نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتے تھے۔ ایک بات جو ان سب رسالوں میں مشترک تھی وہ تھی ایک ادبی وضعداری ان میں شائع ہونے والی سب چیزیں عام طور پر معیاری تو ہوتی ہی تھیں لیکن ان میں لکھنے والوں کا حلقہ بھی بڑا محدود تھا۔ بیشتر رسالوں میں وہی نام بار بار دہرائے جاتے تھے اگرچہ بلاشبہ وہ سب کے سب کسی نہ کسی زاویئے سے اچھے لکھنے والے تھے۔

مندرجہ بالا رسالوں کے علاوہ، اس دور کے دو اور رسالے اپنی نوعیت کے اعتبار سے قابل ذکر ہیں۔ ایک دہلی سے شائع ہونے والا خواجہ حسن نظامی کا رسالہ "منادی" اور دوسرا لاہور سے شائع ہونے والا ماسٹر جگت سنگھ کا رسالہ "رہنمائے تعلیم"۔ "منادی" کو محض

ایک مذہبی رسالہ کہنا غلطی ہوگی. خواجہ حسن نظامی ایک اعلیٰ پائے کے صاحب طرز انشا پرداز تھے اور منادی میں شائع ہونے والی ان کی تحریریں طبن کا تصوف سے بھی کوئی خاص تعلق نہیں تھا. ادب میں ایک خاص مقام رکھتی ہیں. دراصل منادی کے پڑھنے والوں میں سنجیدہ مزاج ادیبوں کی ایک خاص تعداد شامل تھی۔ اسی طرح "رہنمائے تعلیم" محض اسکولوں میں لگنے والا ایک تعلیمی رسالہ نہیں تھا. ادبی پہلو سے بھی اس پرچے کا شمار ہندوستان کے اچھے رسالوں میں ہوتا تھا اور اس میں منشی پریم چند کے علاوہ، اردو کے دوسرے چوٹی کے ادیب بھی باقاعدگی سے لکھتے تھے.

"ساقی" دہلی کا شمار ان ودتین ادب ساز رسالوں میں تھا جو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے. اس کے ایڈیٹر شاہد احمد دہلوی اعلیٰ پائے کے ادیب ہیں اور ادیبوں کے ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس نے اپنی تحریروں اور تصنیفات سے اردو ادب کو بڑا مالا مال کیا ہے چنانچہ "ساقی" کی حیثیت ایک کلاسیکی رسالے کی سی تھی اور اس میں ہر مکتب خیال کے مشہور مصنف لکھتے تھے. ترقی پسند مصنفین کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو اور شاعروں میں فیض، راشد، علی سردار جعفری وغیرہ کے علاوہ پرانے مکتب خیال کے لکھنے والے مثلاً نواب جعفر علی خاں اثر، جگر مراد آبادی. حامد اللہ افسر، نوح ناروی اور راثر صہبائی وغیرہ بھی اس میں ہوتے تھے. "ساقی" نے اردو کے نئے مصنفوں کی کتابیں شائع کرنے میں بھی پہل کی اور کئی مشہور مصنفوں کی پہلی کتاب چھاپنے کا فخر ساقی کو ہی حاصل ہے.

منشی دیا پرشاد نگم کا "زمانہ" اس وقت کے مشہور ترین رسالوں میں سے تھا. اگرچہ اس کی باقاعدہ اشاعت میں کافی فرق آگیا تھا. "زمانہ" میں زیادہ تر پرانے مکتب خیال کے ادیب اور شاعر لکھتے تھے جن کی تحریروں میں بڑی پختگی اور رتاثر تھا. اس میں شائع ہونے والی سب چیزیں پاکیزہ اور معیاری ہوتی تھیں. پنڈت آنند نارائن ملا، فراق گورکھپوری اور سلطان حیدر جوش اس میں باقاعدہ لکھتے تھے.

"نگار" اور "شاعر" ایک منفرد حیثیت کے رسالے تھے. اہل علم کی نظروں میں "نگار" کا درجہ بہت اونچا تھا. مولانا نیاز فتحپوری کی تحریروں میں سنجیدگی اور فکر ملتا تھا. "نگار" میں لکھنے والوں کا حلقہ محدود رے چند عالم، فاضل حضرات تک محدود تھا. اس رسالے میں ادبی موضوعات پر شائع ہونے والی تحریروں میں بڑی گہرائی، سنجیدگی اور اصلیت ہوتی تھی. سیماب اکبرآبادی کا "شاعر" بھی اچھا معیاری پرچہ تھا اور انہوں نے بڑی محنت اور محبت سے اس پر کام کیا تھا. اگرچہ "شاعر" میں نثر کی اچھی چیزیں بھی شائع ہوتی تھیں. مگر زیادہ تر یہ رسالہ شعری ادب کے لئے مخصوص تھا اور اس وقت اس میں لکھنے والوں کی اکثریت پرانے مکتب خیال کے شاعروں کی تھی.

"نیا ادب" اور "ادب لطیف" مارکسی نقطۂ نظر رکھنے والے ادیبوں کے رسالے تھے. ترقی پسند تحریک کو مضبوط کرنے اور اس کے اثر کو بڑھانے میں ان رسالوں کا بڑا ہاتھ ہے. جہاں تک "ادب لطیف" کا تعلق تھا اس کا درجہ ایک ادب ساز رسالے کا تھا. چالیس پچاس صفحے کا یہ خوبصورت رسالہ ہر مہینے ہمارے مشہور اور نئے لکھنے والوں کی تحریرات کو خوبصورت طباعت میں پیش کیا کرتا تھا. ادبی رسالوں میں اس کی اشاعت سب سے زیادہ تھی اور مالی طور پر اس کی پوزیشن بڑی مضبوط تھی. ہندوستان کے مشہور لکھنے والے اس میں فخر سے لکھتے تھے اور ہندوستان کے چوٹی کے نئے مصنفوں کو ان کی موجودہ شہرت دینے میں اس رسالے نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے. اس رسالے کا اپنا مکتبہ "مکتبۂ اردو" تھا جس نے ہندوستان بھر کے مشہور مصنفوں کی کتابیں بڑی خوبصورتی سے شائع کیں. منٹو اور عصمت نے اپنے بدنام افسانے اسی رسالے میں لکھے اور ۱۹۴۲ء میں بھی "ادب لطیف" پر لاہور میں مقدمہ چل رہا تھا.

"شاہکار" "نیرنگ خیال" اور "عالمگیر" کا شمار بھی معیاری ادبی پرچوں میں ہوتا تھا. علامہ تاجور نجیب آبادی کی ادارت اور سرپرستی میں "شاہکار" نے کافی ترقی کی تھی اور حکیم یوسف حسن... میر محمد اختر کی ادارت میں بھی یہ رسالہ اچھا ادبی مواد پیش کر رہا تھا. ان رسالوں میں بھی لکھنے والوں کی اکثریت پرانے مکتب خیال کے شعرا اور ادبا کی تھی.

"ادبی دنیا" اور "ہمایوں" اس دور کے شائع ہونے والے معیاری ادبی رسائل میں سب سے زیادہ ممتاز حیثیت کے مالک تھے.

ادبی دنیا اس وقت جس صورت میں، کافی بڑے سائز میں چھپتا تھا۔ اور سنجیدہ مزاج حضرات اور اہل علم و ذوق کی نظروں میں اس کی حیثیت اونچا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اعلیٰ پائے کے ادب کی تخلیق میں اس رسالے نے ایک عظیم اور ناقابل فراموش کام کیا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے طوفانی بہاؤ اور "ادب لطیف" جیسے مقبول اور طاقتور ہم عصر رسالے کے باوجود "ادبی دنیا" کی حیثیت ایک چٹان کی طرح تھی۔ میراجی "ادبی دنیا" سے ساتھ ہی وابستہ تھے، جن کی جدید معرّا نظموں نے اردو شعری ادب میں ایک نئے اسکول کی بنیاد ڈالی اور میراجی کے نقش قدم پر چلنے والے شاعروں کی ایک بڑی تعداد چل پڑی۔ اردو افسانے کو جو عظمت اس رسالے نے عطا کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت وغیرہ اپنے ترقی پسند عقائد کے باوجود "ادبی دنیا" جیسے رسالے سے علیحدہ نہ ہو سکے اور اس میں باقاعدہ لکھتے رہے۔ بلاشبہ "ادبی دنیا" کا نام اردو کے معیاری رسالوں میں سرفہرست رہے گا۔ "ادبی دنیا" کے ایڈیٹر مولانا صلاح الدین احمد اعلیٰ پائے کے نقاد اور انشا پرداز تھے اور انہوں نے ادیبوں کے فن کو سنوارنے میں ایک اتالیق کا کام کیا تھا۔ یہ رسالہ بہت حد تک ۱۹۳۹ء میں لاہور میں حلقۂ ارباب ذوق کے قیام کے لئے بھی ذمہ دار تھا۔

"ہمایوں" کا درجہ بھی اردو میں ایک کلاسیکی رسالے کا تھا۔ خالص ادبی اور علمی موضوعات پر اس رسالے نے بڑا معیاری اور قیمتی مواد پیش کیا۔ خان بہادر میاں عبدالعزیز فلک پیما کی دل افروز تحریریں صرف اس رسالے میں پڑھنے کو ملتی تھیں۔ حسن طباعت بھی حسن معیار کے مطابق تھا۔ علمی اور ادبی نقطۂ نظر سے بلاشبہ ہمایوں ایک عظیم رسالہ تھا۔

اور اب بیس بائیس سال بعد ادبی رسالوں کی ایک بڑی مختلف تصویر ہمارے سامنے ہے۔ شاید اس دنیا کی ہر شئے تغیّر پذیر ہے اور وقت کا ہاتھ اس کا چہرہ بدلتا رہتا ہے جو تذکرے دس بیس برس پہلے تھیں۔ اب نہیں ہیں اور جو اب ہیں وہ چند برس بعد نہیں رہیں گی۔ یہ بیس بائیس برس اس ملک کے لئے تاریخی طور پر بڑے اہم رہے ہیں۔ جنگ آزادی نے جو شدت اختیار کرلی تھی، آخر تک رہی۔ دوسری جنگ عظیم کے اقتصادی اثرات نمودار ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں اس برصغیر کو آزادی ملی۔ اردو کے معیاری ادبی رسالے اب بھی موجود ہیں۔ کچھ رسالے جو پہلے تھے اب نہیں ہیں اور کئی رسالے سامنے آگئے ہیں۔ کئی ایسے رسالے بھی ہیں جو نہ بیس برس پہلے تھے اور نہ اب ہیں یعنی جو درمیانی عرصہ میں شائع ہوئے مگر زندہ نہ رہ سکے۔ سر عبدالقادر کا رسالہ "مخزن" بیس برس سے پہلے تھا۔ اور ۱۹۴۶ء میں اور پھر ۱۹۵۰ء میں اس کا نئے سرے سے اجرا ہوا مگر ایک نصف صدی کی تاریخی حیثیت کے باوجود آج اس کا نام و نشان نہیں۔ "زمانہ" "نیا ادب" "شاہکار" وغیرہ بند ہو گئے ہیں۔ "ادبی دنیا" دو تین مرتبہ بند ہوا مگر پھر نکل آیا۔ "ہمایوں" کو بند ہی سمجھنا چاہئے۔ "ادب لطیف" "ساقی" "نگار" وغیرہ شائع ہو رہے ہیں۔ مگر وہ پہلا سا معیار کہاں۔ اس دوران میں جو نئے ادبی پرچے اس انجمن میں شامل ہوئے اور جو آج موجود ہیں ان میں آج کل "نقوش" "نقش" "ماہ نو" "ہم قلم" "شب رس" "سوغات" "نیا دور" "تحریک" وغیرہ چند قابل ذکر نام ہیں۔

ناشر .. .. شمس زبیری

سرورق .. .. اختر جلال زبیری

کتابت .. .. چراغ الہ آبادی

طباعت .. .. انٹرنیشنل پریس کراچی

اشاعت .. .. دسمبر ۱۹۶۴ء

مقام اشاعت — کاشانۂ اردو۔ ۲/۱۸ اکبر روڈ۔ صدر۔ کراچی ۳

نیشنل
بینک
آف پاکستان
قومی ترقی
میں
معاون
فراخ دلی سے
قرضے دیکر
چھوٹا کاروبار کرنیوالوں
کی مدد
کرتا ہے
united N.B.49/161